سید الملت مولانا سید محمد میاں دیوبندیؒ سابق ناظم عمومی جمعیۃ علماء ہند
کی حیات و خدمات پر پیش کئے گئے مقالات و مضامین کا مجموعہ

بموقع

مولانا سید محمد میاںؒ سیمینار (زیر اہتمام جمعیۃ علماء ہند)

منعقدہ ۷-۸ ربیع الآخر ۱۴۴۰ھ مطابق ۱۵-۱۶/ دسمبر ۲۰۱۸ء نئی دہلی

جمعیۃ علماء الہند

جمعیۃ علماء ہند
Jamiat Ulama-i-Hind
जमीअत उलमा-ए-हिन्द

بموقع

مولانا سید محمد میاںؒ سیمینار

(زیر اہتمام جمعیۃ علماء ہند)

مرتب

مولانا ضیاء الحق خیرآبادی

کنوینر مولانا سید محمد میاںؒ سیمینار

تذکرہ سید الملتؒ

سید الملت مولانا سید محمد میاں دیوبندیؒ سابق ناظم عمومی جمعیۃ علماء ہند
کی حیات وخدمات پر پیش کئے گئے مقالات ومضامین کا مجموعہ

بموقع

''مولانا سید محمد میاںؒ سیمینار'' (زیر اہتمام جمعیۃ علماء ہند)
منعقدہ ۷-۸؍ربیع الآخر ۱۴۴۰ھ مطابق ۱۵-۱۶؍دسمبر ۲۰۱۸ء نئی دہلی

مرتب

مولانا ضیاء الحق خیرآبادی

کنوینر مولانا سید محمد میاںؒ سیمینار

ناشر

جمعیۃ علماء ہند

۱- بہادر شاہ ظفر مارگ نئی دہلی

تفصیلات

نام کتاب	:	تذکرہ سید الملتؒ (مجموعۂ مقالات مولانا سید محمد میاںؒ سیمینار)
مرتب	:	مولانا ضیاء الحق خیر آبادی
صفحات	:	***1184***
طبع اول	:	رجب ۱۴۴۰ھ مطابق مارچ ۲۰۱۹ء
ناشر	:	جمعیۃ علماء ہند، ا۔ بہادر شاہ ظفر مارگ نئی دہلی
قیمت	:	1000/=

ملنے کے پتے

- ☆ الجمعیۃ بک ڈپو، گلی قاسم جان، دہلی
- ☆ فرید بک ڈپو پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی
- ☆ مکتبہ ضیاء الکتب، خیر آباد، ضلع مئو (یوپی) 9235327576
- ☆ کتب خانہ نعیمیہ دیوبند
- ☆ مکتبۃ الحرمین نزد مظاہر علوم سہارن پور 7896886868
- ☆ مکتبہ الفہیم صدر چوک مئوناتھ بھنجن 9236761926

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فہرست مقالات

سید الملت کی علمی خدمات:

ذکر تخصصات سید الملت:

سید الملت کی ملی و جمعیتی خدمات:

سید الملت کی صحافتی خدمات:

سید الملت کی نثری جہات:

تعارف وتجزیہ تصنیفات وتالیفات سید الملت:

تعلقات سید الملت یعنی سید الملت کی تدریسی ودعوتی وابستگیاں:

ماتم گساران سید الملت:

حصہ دوم (قدیم مقالات ومضامین)

حصہ سوم (منتخب تحریریں)

☆☆☆☆☆

حصہ اوّل

مقالات سیمینار

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

ضیاء الحق خیرآبادی (کنوینر سیمینار)
zeyaulhaquekbd@gmail.com
Mob: 9235327576

۲۰۱۹ء میں جمعیۃ علماء ہند نے پورے وقار کے ساتھ اپنے قیام کے سو سال پورے کر لئے ۔ یہ اللہ رب العزت کی خصوصی نصرت واعانت کا مظہر ہے۔ **یـد الله عـلـی الجماعة** کا مصداق اس جماعت کی ایک صدی پر محیط ایک روشن تاریخ ہے۔ تحریک آزادی سے لے کر وطن کی آزادی تک اس جماعت کا قائدانہ کردار ہے، آزادی کے بعد فسادات کے طویل اور بھیانک سلسلے کے دوران جمعیۃ علماء ہند کی رفاہی وملی خدمات کی ایک طویل داستان ہے۔ علوم اسلامیہ کی ترویج واشاعت، مکاتب ومدارس کے قیام اور مسلمانوں کے دینی وملی مسائل کے حل کرنے میں اکابر جمعیۃ کی جدوجہد اور قربانیاں، اور ملک گیر سطح پر دیگر ہمہ جہت خدمات میں اس جماعت کا کردار مسلمانان ہند کی تاریخ کا تابناک باب ہے ۔ جس کو نسلِ نو تک منتقل کرنے کی ضرورت بھی تھی اور جمعیۃ کے بلند کردار و بے لوث قائدین وعلماء اور صدور ونظماء کی شخصیات اور کارناموں سے روشناس کرانے کی حاجت بھی، تا کہ آج کے پُر آشوب دور میں ان کے پیش کردہ خطوط کی روشنی میں راہ عمل طے کی جاسکے۔

اس لئے جمعیۃ کی مجلس عاملہ نے یہ فیصلہ کیا کہ صد سالہ اجلاس سے پہلے مرکزی سطح کی اہم شخصیات کی حیات وخدمات کے تعارف میں ملکی پیمانے پر سیمینار کرائے جائیں، جو اُن شخصیات کے لئے سب سے بہتر خراج عقیدت ہوگا اور ملت اسلامیہ ہند جان سکے گی کہ آج آزاد ہندوستان میں اقلیت میں ہونے کے باوجود تمام دستوری وآئینی حقوق حاصل

ہونے میں ان بزرگوں کا کتنا زبردست احسان مسلمانان ہند پر ہے۔

اس سلسلہ کا پہلا پروگرام ۱۵/۱۶/دسمبر ۲۰۱۸ء کو دارالحکومت دہلی میں منعقد ہوا، یہ جمعیۃ علماء ہند کی دو اہم شخصیات مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد اور مولانا سید محمد میاں پر ہوا۔ مولانا سید محمد میاں پر ہونے والے پروگرام کا کنوینر مجھے بنایا گیا۔

''**مولانا سید محمد میاں** ملت اسلامیہ ہند کے بیدار مغز قائد، تحریک آزادی کے جانباز سپاہی، اسلاف کی امانت کے پاسبان، جمعیۃ علماء کے بے لوث ترجمان، حضرت شیخ الاسلام کے افکار ونظریات کے حامل ونگہبان، حضرت مجاہد ملت کے معتمد علیہ معاون ومددگار، تعمیر ملت کے معمار اور میدان درس وتدریس کے شہ سوار تھے۔ ایسے افراد صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں اور صدیوں کا کام سالوں میں کر جاتے ہیں، انھوں نے اپنی حیات مستعار کو ملت اسلامیہ کی بقا وترقی کی راہ میں کھپا دیا اور اپنے کارناموں کی ایک تاریخ چھوڑ گئے، تصانیف کا بیش بہا ذخیرہ ہمیں دے گئے، دینی تعلیمی تحریک کو ہندوستان کے گوشے گوشے اور گھر گھر میں پہنچانے کا کام کر گئے۔ وہ واقعی اقبال کے اس شعر کا مصداق تھے

نگہ بلند، سخن دلنواز، جاں پرسوز یہی ہے رخت سفر میر کارواں کے لئے''

اس سیمینار کو کامیاب بنانے میں مجھ سے جو کچھ ممکن ہو سکا میں نے اس سے دریغ نہیں کیا، اور اب اس سیمینار کا حاصل مجموعۂ مقالات کی صورت میں آپ کے سامنے ہے، اب فیصلہ آپ کو کرنا ہے کہ مجھے اس میں کس قدر کامیابی حاصل ہوئی۔ میرے لئے سب سے بڑی دشواری یہ تھی کہ مولانا سید محمد میاں پر ان کی وفات کے بعد سے اب تک کوئی کام نہیں ہوا سوائے مولانا مسعود عزیزی ندوی کی کتاب ''تذکرہ مولانا سید محمد میاں'' کے، جو دو سو صفحات پر مشتمل ہے اور بیحد تشنہ ہے۔ اس لئے مقالہ نگار حضرات کو معلومات فراہم کرنے کے لئے اخبارات ورسائل کی فائلیں (خصوصاً روزنامہ وہفت روزہ الجمعیۃ کی فائلیں) اور جمعیۃ کے قدیم لٹریچر کو کھنگالنا پڑا اس طرح تنکے تنکے جمع کر کے یہ آشیاں تعمیر ہوا ہے، اور ان شاء اللہ آئندہ مولانا کی شخصیت پر کام کرنے کے لئے یہ سنگ میل ثابت ہوگا۔ ان مقالات کی

اشاعت کے وقت یہ رائے ہوئی کہ سیمینار سے پہلے مولانا کی حیات وخدمات پر جو کچھ لکھا گیا ہے اسے بھی اس میں شامل کر دیا جائے تاکہ مولانا پر کام کرنے والوں کو ساری معلومات یکجا دستیاب ہو جائیں، مجھے یہ خیال ہوا کہ اخیر میں مولانا کی کچھ اہم تحریروں کے نمونے بھی دینا چاہئے، چنانچہ شخصیات، مکاتیب، تقریظات، اور خطبات میں سے چند ایک نمونے پیش کئے گئے ہیں۔ یہ مجموعہ تین حصوں پر مشتمل ہے، پہلا حصہ سیمینار میں پیش کئے گئے مقالات پر مشتمل ہے۔ دوسرا حصہ سیمینار سے پہلے لکھے گئے قدیم مقالات پر مشتمل ہے۔ تیسرا حصہ مولانا کی تحریروں کے انتخاب پر مشتمل ہے۔

سیمینار کی تیاری سے لے کر مجموعہ مقالات کی ترتیب واشاعت تک بہت سے لوگوں کا تعاون مجھے حاصل رہا، جن میں سے بعض حضرات کا شکریہ ادا کرنا میں اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ اول وآخر سب سے زیادہ میں شکر گزار ہوں مولانا معزالدین صاحب گونڈوی (ناظم امارت شرعیہ جمعیۃ علماء ہند) کا، انہیں کی پیشکش پر میں نے یہ ذمہ داری قبول کی اور انہیں کے تعاون اور رہنمائی میں اس راہ کے بیشتر مراحل طے ہوئے۔ اس کے بعد مولانا سید محمد میاں کے صاحبزادے مولانا ساجد میاں اور ان کے پوتے مولانا محمود میاں بن مولانا حامد میاںؒ (شیخ الحدیث جامعہ مدنیہ لاہور) نے بے حد تعاون کیا، مولانا ساجد میاں نے رسالہ قائد مرادآباد کی مکمل فائل مہیا کی، نیز دوسری بہت سی اہم معلومات فراہم کیں اور خود بھی ایک مبسوط مقالہ لکھا۔ مولانا محمود میاں نے پاکستان کے کئی اہل قلم سے مقالات لکھوائے اور خود بھی ایک مقالہ لکھا اور مولانا پر بہت سی تحریریں ارسال کیں۔ لاہور سے جناب شبیر احمد میواتی کی رہنمائی بھی مجھے حاصل رہی۔ مواد کے حصول میں میرے رفیق درس مولانا عبدالملک رسولپوری (منتظم محمودیہ لائبریری جمعیۃ علماء ہند) اور مولانا محمد اللہ صاحب (شعبہ انٹرنیٹ دارالعلوم دیوبند) نے بہت مدد کی، میں وقت ناوقت ان لوگوں کو زحمت دیتا رہا اور یہ حضرات پوری بشاشت کے ساتھ مطلوبہ مواد فراہم کرتے رہے۔ الجمعیۃ کی فائلوں سے مطلوبہ مواد کو تلاش کرنے میں مفتی منظور احمد صاحب کانپوری کے صاحبزادے مولانا منصور

احمد صاحب قاسمی کی مسلسل معاونت مجھے حاصل رہی۔ مجموعہ مقالات کی کتابت کے بعد میرے استاذ زادے اور عزیز شاگرد مولانا عرفات اعجاز اعظمی نے اس کا ایک ایک حرف پڑھا اور اغلاط کی تصحیح کی اور بہت سے مشورے دئے، جن کی روشنی میں یہ مجموعہ مرتب ہوا۔ اللہ تعالیٰ تمام معاونین ومحسنین کو اپنے شایان شان اجر عطا فرمائیں۔

میں حد درجہ شکر گزار ہوں جمعیۃ علماء کے تمام اراکین ومتعلقین بالخصوص صدر جمعیۃ علماء ہند استاذ محترم مولانا قاری محمد عثمان صاحب دامت برکاتہم اور جمعیۃ کے متحرک وفعال جنرل سکریٹری مولانا سید محمود مدنی دامت برکاتہم کا جنھوں نے جمعیۃ علماء ہند کے قیام کے سو سال پورا ہونے پر اکابر جمعیۃ کے کارناموں کو دستاویزی شکل میں محفوظ کر دینے کا خاکہ تیار کیا اور سیمینار کی شکل میں اس کو عملی جامہ پہنانے کا تاریخی قدم اٹھایا، اور مجھے بحیثیت کنویز اس کی ذمہ داری سونپی۔ ان حضرات کی دلچسپی اور توجہ سے یہ جمعیۃ کی تاریخ کا ایک کامیاب سیمینار ثابت ہوا۔ فجزاهم الله احسن الجزاء

اس مجموعہ کی جمع وترتیب میں مَیں نے اپنی تمام ممکنہ صلاحیت وقوت صرف کر دی، اور اسے خوب سے خوب تر بنانے میں کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا، لیکن ایک بشری کوشش خامی ونقائص سے کب خالی رہ سکتی ہے، اس لئے اگر کوئی کمی اور خامی نظر آئے تو مرتب کو مطلع فرمائیں۔ میں اپنی بات ادیب شہیر مولانا عبدالماجد دریابادی کے ان جملوں پر ختم کرتا ہوں:

”جو باکمال اس میٹھی پھیکی غذا پر منہ بنائیں گے وہ محض اپنی خوش ذوقی اور حقیقت سنجی کا ثبوت دیں گے اور جو پردہ پوشی سے کام لیں گے وہ کرم فرمائی اور صفت ستاری کا نقش بٹھا دیں گے۔ مقامِ عدل ومقامِ فضل دونوں اپنی جگہ خوب ہیں، لیکن کہنے والے کہتے ہیں کہ دوسرا پہلے سے خوب تر ہے اور اس سے اعلیٰ وبرتر۔“

ضیاء الحق خیرآبادی، ایڈیٹر مجلّہ رشد وہدایت
ومدرس دارالعلوم تحفیظ القرآن، سِکھٹی، مبارکپور اعظم گڈھ
۲؍جمادی الاخریٰ ۱۴۴۰ھ مطابق ۸؍فروری ۲۰۱۹ء جمعہ

کلمات تشکر وامتنان

سید محمود اسعد مدنی جنرل سکریٹری جمعیۃ علماء ہند

میرا دل بارگاہ رب العزت میں تشکر وامتنان کے جذبات سے لبریز ہے کہ محض اسی کے فضل اور توفیق سے جمعیۃ علماء ہند کی صدسالہ تقریبات کی پہلی کڑی بعنوان ''سیمینار مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد اور مولانا سید محمد میاں'' بحسن وخوبی اختتام کو پہنچی۔ سیمینار کی پہلی نشست ۱۵ر دسمبر ۲۰۱۸ء کو ماؤلنکر ہال نئی دہلی میں منعقد ہوئی۔ ۱۶ر دسمبر ۲۰۱۸ء کو مدنی ہال مرکزی دفتر جمعیۃ علماء ہند میں صبح نو بجے سے ظہر تک سیمینار کی آخری نشست منعقد ہوئی، جس میں حضرات اہل علم نے مولانا سید محمد میاں پر لکھے گئے مقالات کا خلاصہ پیش کیا، یہ کل ۳۷ مقالات تھے، مقالہ نگار حضرات کا تعلق ملک کے اہم اداروں اور جامعات سے تھا۔

یہ مجموعہ سیمینار میں پیش کئے گئے مقالات پر مشتمل ہے، جن کو سیمینار کے کنویز مولانا ضیاء الحق صاحب خیرآبادی نے بڑی محنت وکاوش کے ساتھ کتابی شکل میں مرتب کیا ہے۔ یہ بات پیش نظر رہنی چاہئے کہ ان مقالات میں پیش کی گئی آراء مقالہ نگار حضرات کی ذاتی آراء ہیں، جن سے جمعیۃ علماء ہند کا اتفاق ضروری نہیں ہے۔ ہم نے دیانتاً ان کو باقی رکھا ہے اور کہیں کہیں ان پر نوٹ اور حواشی لکھ دئے گئے ہیں، لیکن ہر جگہ اس کا التزام نہیں کیا گیا ہے۔

میں تمام مقالہ نگار حضرات کا ممنون ومشکور ہوں جن کی بلند پایہ تحقیقی نگارشات نے سیمینار کو کامیابی سے ہمکنار کیا، اور اس سیمینار کے کنویز مولانا ضیاء الحق صاحب خیرآبادی کی عمدہ کارکردگی، محنت وکاوش اور توجہ ولگن کو سراہتا ہوں اور ان کے علمی، قلمی اور عملی تعاون کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

محمود اسعد مدنی

یکم ر جمادی الاخریٰ ۱۴۴۰ھ مطابق ۷ر فروری ۲۰۱۹ء جمعرات

پیغامات:

پیغام برائے سیمینار

''سید الملت مولانا سید محمد میاں دیوبندی (رحمۃ اللہ علیہ)

سابق ناظم جمعیت علماء ہند''

منعقدہ ۱۶/دسمبر ۲۰۱۸ء بمقام دہلی

زیرِ اہتمام جمعیتِ علماءِ ہند

از (مولانا) سید محمد رابع حسنی ندوی
ناظم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

الحمد للّٰہ رب العالمین ، و الصلاۃ و السلام علی أشرف الأنبیاء و المرسلین سیدنا محمد بن عبد اللّٰہ الأمین ، و علیٰ آلہ و صحبہ أجمعین ، و بعد :

ہمارے ملک ہندستان کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ یہاں کے مسلمانوں نے اپنے مسائل کو حل کرنے کی ہمیشہ خود فکر کی اور اس کے لیے عملی جدو جہد اور فکری و سیاسی رہنمائی کا کام بھی کیا۔ جب اس ملک میں انگریزوں نے عمل دخل شروع کیا تو حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ نے اس خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے ایسی جماعت تیار کی جو ایمان و یقین اور عملِ صالح کی صفات سے متصف ہو اور سب سے بڑا کام اس جماعت نے یہ کیا کہ مسلمانوں کے اندر دینی حمیت، ملی غیرت، ایمانی و اخلاقی جرأت اور دعوت و تبلیغِ دین و اصلاحِ امت کا ایسا جذبہ پیدا کیا کہ اس کے ذریعے پورے خطۂ برصغیر میں ایمان کی بادِ

بہاری چل پڑی' اور عہد بہ عہد علماءِ دین میں وہ جذبہ کام کرتا رہا جو اس جماعت نے پیدا کیا تھا' اور اس کے لیے یہاں کے مسلمانوں نے بڑی قربانیاں بھی پیش کیں' اور اپنا ایسا نظامِ تعلیم جاری کیا جس سے ایک طرف مسلمان پکے مسلمان بنیں' اور اس کے ساتھ رہنمایانہ صلاحیت بھی پیدا کریں۔

اس سلسلے میں دار العلوم دیوبند کا قیام عمل میں آیا' اور اس کے فضلا حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی' مولانا عبید اللہ سندھی' مولانا مفتی کفایت اللہ دہلوی' مولانا سید حسین احمد مدنی نے عزیمت کا راستہ اختیار کیا' اور ملک کی آزادی کی جدوجہد میں نمایاں کردار پیش کیا' اور اس بات کی پوری کوشش کی کہ ملک تقسیم کی راہ پر نہ جائے' اور ملک باہر کی طاقتوں کے قبضے سے نکل جائے' اس میں ملک کی دوسری عظیم شخصیتوں نے بھی ساتھ دیا جن میں مولانا ابو الکلام آزاد کا نام سرِ فہرست لوگوں میں ہے۔ وہ اگرچہ کانگریس کے قائدین میں تھے لیکن جمعیۃ العلما کی فکر سے پورے ہم آہنگ اور اس کے رہنماؤں کے شریکِ کار تھے۔

ملک کی آزادی کے وقت جمعیۃ العلما کے قائدین و رہنماؤں میں حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی کو بہت امتیاز حاصل ہوا۔ ان کے دیگر رفقاء وشرکاء کار میں مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی اور مولانا سید محمد میاں صاحب دیوبندی کے نام نمایاں ہیں۔ ان میں مولانا سید محمد میاں رحمۃ اللہ علیہ خاموش طبیعت اور علمی مزاج کے حامل تھے، ان کی اہم کتابیں بھی ہیں، جن سے ہندوستانی مسلمانوں کی روشن تاریخ کے نقوش سامنے آتے ہیں، اور علمی کاموں کی انجام دہی بھی ہوتی ہے، وہ جمعیۃ العلما کے پروگراموں میں نمایاں نظر آتے تھے، اور ملک کی آزادی میں ان کا جو کردار رہا' وہ بھی نمایاں ہے، ان کا تعلق مسلمانوں کے تعلیمی اداروں سے بھی رہا، اور ندوۃ العلما کے ذمہ داروں سے بھی ان کا ربط رہا، جن میں مولانا ڈاکٹر سید عبد العلی حسنی اور ان کے بھائی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ مولانا سے میری بھی اچھی ملاقاتیں رہیں اور میں نے ان کو ہمیشہ ایک بزرگ عالم اور رہنما کی حیثیت سے دیکھا۔ دین وملک کے لیے جمعیۃ العلما کے پلیٹ فارم

سے ان کی جو خدمات رہیں وہ کسی سے مخفی نہیں۔ جمعیۃ العلما کا ایک بڑا اجلاس ۱۹۴۸ء میں لکھنؤ میں ہوا، اور اس کی اہم مجلسیں ندوۃ العلما میں ہوئیں، اس کے باعث اور قریب سے دیکھنے کے مواقع ملے، اور اچھی دینی فکر کے ساتھ ملک کی آزادی اور ملک کی تقسیم کے بعد یہاں کے مسلمانوں کے مسائل کے حل کے لیے دردمندی اور دلسوزی دیکھنے کو ملی اور واقفیت حاصل ہوئی۔

ظاہر ہے کہ امت مسلمہ کے لیے ان کی تعمیری کوششوں کے اچھے نتائج سامنے آئے، جس سے ہندوستان میں مسلمانوں کے اقلیت میں ہونے کے باوجود عظمت اور حسنِ ظن کا مقام حاصل ہوا، اور ان غلط فہمیوں کے ازالے کا بھی کام کیا گیا، جو فرقہ وارانہ منافرت سے پیدا ہوگئی تھیں، جو مسلم اقلیت کے تعلق سے بھی تھیں، اور اسلام کے تعلق سے بھی تھیں۔ اس لیے بھی ہم مسلمانوں کی ذمہ داری بنتی ہے کہ ان غلط فہمیوں کا ازالہ کریں، اور برادرانِ وطن کا ذہن صاف کریں۔ یہ کام ملاقاتوں اور میٹنگوں اور جلسوں کے انعقاد سے بھی ہوسکتا ہے، جس کے لیے جمعیۃ العلما سرگرم رہتی ہے۔ اور پیامِ انسانیت کے عنوان سے کام اس کا معاون ہے، جو حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے ملک کے حالات اور یہاں کے اکثریتی طبقے کے رجحانات کو دیکھ کر بڑی دردمندی سے شروع کیا تھا۔

حضرت مولانا سید محمد میاں دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ کا تعلق دیوبند ضلع سہارنپور سے تھا، جہاں وہ پروان چڑھے، اور ان کو بڑے علما کی سرپرستی حاصل ہوئی۔ پھر ان کا مرکز عمل دہلی بنا۔ جہاں جمعیت کے پلیٹ فارم سے اور مدرسہ امینیہ دہلی میں اپنی تدریسی خدمت کے ذریعے رجال سازی کا کام کیا۔ مدرسہ امینیہ میں وہ شیخ الحدیث بھی رہے اور اچھی شہرت و مقام حاصل کیا۔ بعض اپنے خاص شاگردوں کو عربی میں اچھی قدرت ومہارت پیدا کرنے کے لیے دارالعلوم ندوۃ العلما بھی بھیجا۔

مولانا سید محمد میاں صاحب دیوبندی کو اللہ تعالیٰ نے اچھا تصنیفی ملکہ عطا کیا تھا، زبان وادب اور علم وتحقیق کے اعتبار سے انھوں نے معیاری کتابیں تصنیف کیں، جن میں

سیرت نبوی (ﷺ) اور سیرت صحابہ اور تاریخ اسلامی اور مسلمانان ہند کی تاریخ کے علاوہ علوم دینیہ سے متعلق بھی کتابیں اور حدیث شریف کے انتخابات و مجموعے ہیں جن کا فائدہ عام ہو رہا ہے، اور ان کی شخصیت اس کے ذریعے زندہ ہے۔ ان کی یہ تصانیف ورسائل سو (۱۰۰) کے قریب پہنچتی ہیں، جب کہ انھیں ملک کی سیاسی حالت اور اکابر علماء دیوبند کی اس میں عملی شرکت کی وجہ سے خود بھی حصہ لینا پڑا اور جیل کی صعوبت بھی اٹھانی پڑی تھی، اور ان کی بعض کتابوں پر پابندی بھی لگائی گئی، لیکن وہ اس سے متاثر نہ ہوئے اور ان کی علمی و ملی مشغولیت جاری رہی۔ جمعیۃ العلما کی طرف سے حضرت مولانا سید محمد میاں دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ پر سیمینار کا انعقاد ایک مبارک اور لائقِ تہنیت اقدام ہے، جو اُن کی شخصیت کے مستور و مخفی پہلوؤں کو سامنے لانے کا اور ان کی خدمات کا دنیا میں جزا کا ایک عمل بھی ہے۔ میں بھی ان سطروں کے ذریعے اس میں شرکت کی سعادت حاصل کر رہا ہوں، فالحمد للّٰہ علی ذلك۔

اس سیمینار میں جو بہت مناسب وقت اور مناسب جگہ پر ہو رہا ہے، میرے لیے شرکت بڑی سعادت کی بات ہے، لیکن اپنے بعض اعذار اور مجبوریوں کی وجہ سے شرکت نہیں ہو پا رہی ہے۔ البتہ پیغام کے ذریعے شرکت کا شرف حاصل کر رہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ اس کو بہت مفید اور نئی نسل کے لیے ان کے اسلاف کے ورثے کی حفاظت اور نقشِ قدم پر چلنے کا بہتر ذریعہ بنائے۔ و ما ذلك علی اللّٰہ بعزیز۔

محمد رابع حسنی ندوی
ناظمِ ندوۃ العلماء، لکھنؤ
۰۲/۰۴/۱۴۴۰ھ/ ۱۰/۱۲/۲۰۱۸ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اظہار مسرت

حضرت مولانا نور عالم صاحب خلیل امینی تلمیذ رشید حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب
استاذ ادب دار العلوم دیو بند و چیف ایڈیٹر ''الداعی''

حضرت مولانا سید محمد میاں دیو بندی ثم الدہلوی (۱۳۲۱ھ/۱۹۰۳ء/ ۱۳۹۵ھ/ ۱۹۷۵ء) علامہ سید محمد انور شاہ کشمیریؒ کے شاگرد رشید، شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے دست گرفتہ، تربیت یافتہ اور خلیفہ تھے۔ عرصے تک وہ جمعیۃ علماے ہند کے ناظم رہے۔ تاریخ جمعیۃ کا زیادہ تر سرمایہ ان ہی کے پُر نویس قلم کی دین ہے۔ وہ ایک بلند پایہ محدث، دقیق النظر فقیہ، ژرف نگاہ مؤرخ، کثیر التصانیف مصنف اور کثیر التحریر اہل قلم تھے۔ انھوں نے اپنے سیاسی شعور کی زندگی جمعیۃ کے تازہ دم، اولوالعزم، بلند حوصلہ اور انتہائی فعّال سپاہی کی حیثیت سے گزاری۔ اُن کی شناخت علمی و سیاسی اور ملی زندگی کے میدانوں میں ایک خاموش سپاہی کی تھی۔ انھوں نے اپنے اساتذہ و مشائخ کی طرح امت و ملت کے لئے جو کچھ کیا وہ ستایش کی تمنا اور صلے کی پروا کے بغیر کیا۔

ضرورت تھی کہ اس مخلص سپاہی کے کارناموں کو اُجاگر کیا جائے؛ تاکہ آنے والی نسل ان سے روشنی حاصل کر کے دین و ملت کے لئے اپنی سرگرمیوں کی سمت درست کر کے اپنے مولیٰ کی سرخ روئی حاصل کر سکے۔ جمعیۃ علماے ہند کے ذمے یہ کام حقیقتاً قرض تھا، خواہ دیر سے سہی، ان کے کام اور نام و مقام کے تعارف کے لئے از شنبہ۔ یک شنبہ ۷۔۸/ ربیع الآخر ۱۴۴۰ھ مطابق ۱۵۔۱۶/ دسمبر ۲۰۱۸ء نئی دہلی میں سیمینار کا انعقاد کیا۔

مولانا سید محمد میاں دہلویؒ پر مقالات آخر الذکر تاریخ کو مدنی ہال، مرکزی دفتر جمعیۃ علماے ہند میں پڑھے گئے۔ یہ کل ۳۷؍مقالات تھے، جو اہل علم وقلم ونظر نے بڑی محنت سے لکھے تھے۔ مولانا سید محمد میاں دہلوی پر منعقدہ مجلس مذاکرہ کے روحِ رواں مولانا ضیاء الحق خیرآبادی قاسمی نے اس سلسلے میں جو محنت وجاں فشانی کی وہ ایک تاریخی کارنامے کی حیثیت رکھتی ہے، اب ان ہی کی کوشش سے یہ قیمتی مقالات کتابی ودستاویزی شکل میں شائع ہورہے ہیں؛ تاکہ ان کا فائدہ زیادہ عام اور باعث دوام ہو۔

راقم کی محرومی کی بات ہے کہ وہ اپنی مسلسل بیماری اور مستزاد مشاغل کی وجہ سے اس مبارک سیمینار میں تحریری یا جسمانی طور پر شریک نہ ہوسکا، لیکن وہ اپنی کتاب ''پسِ مرگ زندہ'' کے درازنفس مقالے میں حضرت مولانا سید محمد میاں پر جو کچھ وہ لکھ چکا تھا، توقع ہے کہ اس ناچیز کی ساری کوتاہیوں کے لئے کفارہ ثابت ہوگا۔(۱)

مولانا ضیاء الحق صاحب خیرآبادی قاسمی کو اور جمعیۃ علمائے ہند کو اس عظیم کام کی انجام دہی کے لئے مبارکباد دیتا ہوں۔ جن لوگوں نے اس کارِخیر میں کسی طرح کا بھی حصہ لیا اللہ انھیں دنیا وآخرت کی ساری بھلائیوں سے نوازے۔

نور عالم خلیل امینی

۱۱؍بجے صبح، بہ روز: جمعرات ۳؍جمادی الاولیٰ ۱۴۴۰ھ

۱۰؍جنوری ۲۰۱۹ء

☆☆☆☆☆

(۱) یہ مقالہ اس مجموعے میں شامل ہے، دیکھئے: صفحہ: ۱۰۰۶

بسم اللہ الرحمن الرحیم

خطبۂ افتتاحیہ

بموقع ۲؍روزہ سیمینار

برحیات وخدمات

مفکرِ اسلام اَبوالمحاسن حضرت مولانا محمد سجادؒ

ومؤرخِ ملت حضرت مولانا سید محمد میاں دیوبندیؒ

بتاریخ: ۷-۸؍ربیع الثانی ۱۴۳۹ھ مطابق ۱۵-۱۶؍دسمبر ۲۰۱۸ء بروز ہفتہ اتوار

پیش کردہ:

امیر الهند

حضرت مولانا قاری سید محمد عثمان صاحب منصور پوری دامت برکاتہم

صدر جمعية علماء هند واُستاذِ حديث دارالعلوم ديوبند

شائع کردہ:

شعبۂ نشر واشاعت جمعیۃ علماء ہند

۱- بہادر شاہ ظفر مارگ، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۲

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمده و نصلي علىٰ رسوله الكريم، أما بعد!

حضرات علماء کرام و دانشورانِ قوم وملت! جمعیۃ علماء ہند کے قیام کے سو سال مکمل ہونے پر اکابر جمعیۃ کی خدمات کو اُجاگر کرنے کی غرض سے منعقدہ پہلے سیمینار میں آپ حضرات کو خوش آمدید کہتے ہوئے مسرت ہورہی ہے۔

اور ساتھ میں دل جذبات شکر سے معمور ہے کہ آپ حضرات نے موسم کی ناموافقت اور مصروفیات کے باوجود جمعیۃ علماء ہند کی دعوت پر سفر کی صعوبتیں برداشت کیں، اللہ تعالیٰ سبھی شرکاء کو جزائے خیر سے نوازیں، آمین۔

بالخصوص جن حضرات نے پوری محنت اور تن دہی سے متعینہ موضوعات پر تحقیقی مقالے تحریر فرمائے، اُن کی خدمت میں ہدیۂ تشکر پیش کرنا احقر ضروری سمجھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سبھی مقالہ نگاروں کی محنتوں کو قبول فرمائیں، اور ہم سب کو اکابر و اسلاف کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائیں، آمین۔

سیمینار کا مقصد

حضراتِ گرامی! اِس طرح کے سیمیناروں کا مقصد محض ایک اِجلاس یا اجتماع کا انعقاد نہیں ہے؛ بلکہ شخصیات کی خدمات کے ضمن میں اپنی تاریخ کی یاددہانی اور اُس کا مذاکرہ مقصود ہوتا ہے۔

اور نازک موڑ پر ان حضرات نے جس طرح ملت کی رہنمائی کی اور قربانیاں پیش فرمائیں، اُن کے تذکرے سے خود اپنے اندر جذبۂ عمل پیدا ہوتا ہے، اور جماعت کی فکر اور اُس کا نظریہ اُجاگر ہوتا ہے۔

اِسی غرض سے جمعیۃ علماء ہند کی مجلس عاملہ نے صد سالہ تقریبات کے پروگراموں میں منتخب اہم شخصیات پر سیمیناروں کے انعقاد کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ سیمینار اِس سلسلہ کی پہلی کڑی ہے، اِن سیمیناروں میں جہاں زبانی تأثرات پیش کئے جائیں گے، وہیں ایک اہم فائدہ یہ بھی ہوگا کہ اِس بہانے سے ہر شخصیت کے بارے میں اہم مقالات ومضامین جمع ہوجائیں گے، جن کی مرحلہ وار اِشاعت کا بھی ارادہ ہے، اِس طرح ایک بڑا مستند سوانحی وتاریخی ذخیرہ جمع ہوجائے گا، اِن شاءاللہ تعالیٰ۔

اِس سیمینار میں ابوالمحاسن حضرت مولانا محمد سجاد بہاریؒ اور سید الملت حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب دیوبندیؒ کی شخصیت اور خدمات کو موضوع بنایا گیا ہے۔

یہ دونوں شخصیات جمعیۃ علماء ہند کی تاریخ میں ممتاز حیثیت کی حامل ہیں، ایک طرف ابوالمحاسن حضرت مولانا سید محمد سجاد صاحبؒ کی ذات ہے جو جمعیۃ کے لئے بنیاد کے پتھر کی حیثیت رکھتی ہے۔ دوسری طرف حضرت سید الملتؒ کی شخصیت ہے، جن کے رواں دواں قلم گہر بار نے اکابر جمعیۃ کی تاریخ کو سمیٹنے اور مرتب کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے، اور اِس خدمت میں پوری جماعت میں اُن کا کوئی بدل نہیں ہے۔

اَب یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم اِن دونوں شخصیات کے چھوڑے ہوئے روشن نقوش کو اپنے لئے مشعل راہ بنائیں۔ اور اپنی صلاحیتوں کو دین وملت کی فلاح وبہبود کے لئے صرف کرنے کا عزم واِرادہ کریں؛ تاکہ اِس طرح کے اجتماعات کا صحیح فائدہ سامنے آسکے۔

ابوالمحاسن حضرت مولانا محمد سجاد بہاریؒ

حضراتِ گرامی! ابوالمحاسن حضرت مولانا محمد سجاد صاحب بلاشبہ اپنے دور کی عبقری شخصیات میں شامل تھے، اللہ تعالیٰ نے بے مثال ذکاوت وفطانت، علمی رسوخ اور گیرائی اور سیاسی سوجھ بوجھ اور فہم وبصیرت سے مالا مال فرمایا تھا، آپ کا دماغ نہایت مرتب اور منصوبہ ساز تھا۔ عزم کے بڑے پکے اور رائے کے بڑے صائب تھے، بے باکی اور جرأت سے خمیر اُٹھایا

گیا تھا، غیرتِ اِیمانی اور جوش ولولہ بھی بہت خوب تھا۔

جس وقت دنیا میں جنگ عظیم چل رہی تھی، اور انگریز خلافت عثمانیہ کو تار تار کرنے کے درپے تھے، اور ہندوستان میں اِس بات کی شدت سے ضرورت محسوس کی جارہی تھی کہ سب علماء متحد ہوکر تحریک آزادی میں حصہ لیں، تو ابوالمحاسن حضرت مولانا محمد سجاد صاحبؒ نے ملک کے مختلف علاقوں کے دورے فرمائے، اور علماء کو ایک پلیٹ فارم پر لانے کی جدوجہد فرمائی، اور ملکی سطح پر جمعیۃ علماء ہند کے قیام سے قبل آپ نے اولاً صوبہ بہار کی سطح پر جمعیۃ علماء بہار قائم فرمائی، اور کام شروع کردیا۔

حضرت مولانا شاہ سید محی الدین صاحب قادری رحمۃ اللہ علیہ اَمیر شریعت ثانی اِمارت شرعیہ بہار اِس بارے میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

''جمعیۃ علماء ہند کے قیام کے لئے ہندوستان کے اکثر صوبوں میں سفر کرکے علماء میں اس کی تبلیغ کی اور لوگوں کو آمادہ کیا؛ لیکن عمل کی طرف پہلا قدم مولانا رحمۃ اللہ علیہ کا تھا، اور پہلا اجلاس ہندوستان میں جمعیۃ کا بنام ''انجمن بہار شہر بہار'' میں منعقد ہوا، اس کے بعد جمعیۃ علماء ہند قائم ہوئی اور اس کے بعد مختلف صوبوں میں شاخیں قائم ہوئیں، اور پھر علماء نے مستعد ہوکر کام شروع کردیا، اور الحمد للہ آج ہندوستان کے ہر صوبہ میں جمعیۃ علماء قائم ہے، اور جس قدر جمعیۃ نے اسلام اور مسلمانوں کا کام انجام دیا ہے، وہ دنیا پر ظاہر ہے۔ (ماخوذ اَز: حیاتِ سجاد ۶۹)

یکم جنوری ۱۹۲۰ء کو جمعیۃ علماء کے اِجلاس امرتسر میں آپ کو مرکزی منتظمہ کا رکن نامزد کیا گیا۔ (شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کی سیاسی ڈائری ۹۸/۲)

نومبر ۱۹۲۰ء میں جمعیۃ علماء ہند کا دوسرا اِجلاسِ عام دہلی میں حضرت شیخ الہندؒ کی صدارت میں منعقد ہوا، جس میں انگریز سے عدمِ تعاون کی تجویز منظور کی گئی، اور اِس سلسلہ میں جو مبسوط فتویٰ مرتب ہوا، وہ حضرت مولانا ابوالمحاسن سید محمد سجاد صاحبؒ کا مرتب فرمودہ تھا، جو پانچ سو علماء کے دستخط سے بعد میں شائع ہوا۔ (حیاتِ سجاد ۱۰۲)

۱۹۲۱ء میں جمعیۃ علماء ہند کا تیسرا اِجلاسِ عام حضرت مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ کی صدارت میں لاہور میں منعقد ہوا، جس میں حضرت مولانا سید محمد سجاد صاحبؒ کی کوششوں سے ہی ''امارتِ شرعیہ'' کے قیام کی تجویز منظور کی گئی۔ بعد میں حضرت مولانا ہی نے نظامِ امارت کا مسودہ پیش کیا، اور جب مرکزی سطح پر بعض وجوہ سے اُس کا قیام نہ ہوسکا، تو آپ نے بہار کی سطح پر اِمارتِ شرعیہ قائم کی، اور تادمِ وفات اِمارتِ شرعیہ بہار کے نائب اَمیر رہے۔

۱۹۲۲ء میں جمعیۃ علماء ہند کا چوتھا اِجلاسِ عام شہر گیا بہار میں منعقد ہوا، جس کے نظم وانتظام کی ساری ذمہ داری حضرت مولانا سید محمد سجاد صاحب کی تھی۔ یہ اِجلاس خود اپنے حسن انتظام کے اعتبار سے بے نظیر ثابت ہوا۔ حتیٰ کہ مولانا حکیم ابوالبرکات عبدالرؤف صاحب قادری داناپوریؒ جو اِس اجلاس میں مجلس استقبالیہ کے صدر تھے، اُنہوں نے مولانا سجادؒ کی انتظامی صلاحیت کا اعتراف کرتے ہوئے کھلے اِجلاس میں فرمایا تھا کہ: ''مولانا سجاد نے مسلمانوں کی عظیم الشان تنظیمی اور سیاسی کارروائی کا جوثبوت دیا ہے، وہ اس درجہ بلند ہے کہ سوراج ملنے کے بعد مولانا کو ہندوستان کا گورنر اور گورنر جنرل بنانا موزوں ہوگا؛ کیوں کہ وہ ایک نئے ہندوستان کے نئے خیالات واُصول کے مطابق تعمیر کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں''۔ (محاسن سجاد ۱۰۲)

۱۹۲۵ء میں جمعیۃ علماء ہند کا چھٹا اجلاسِ عام مرادآباد میں منعقد ہوا، جس کی صدارت آپ نے فرمائی۔

جمعیۃ علماء ہند کے اِجلاس پشاور منعقدہ دسمبر ۱۹۲۷ء میں ملک بھر میں محاکم قضاء کے قیام کے لئے ایک سب کمیٹی بنائی گئی، جس میں خصوصی طور پر حضرت مولانا محمد سجاد صاحبؒ کا نام شامل تھا۔

اِسی طرح مسودہ قانون فسخ نکاح کی تیاری کے لئے ۱۹۳۶ء میں مرادآباد کے اِجلاس میں آپ کو ذمہ داری دی گئی، اور آپ نے نہایت عرق ریزی کے ساتھ مسودہ پیش فرمایا۔

علاوہ اَزیں آزاد ہندوستان کے دستورِ اَساسی کے بارے میں جمعیۃ علماء ہند کا مشہور فارمولہ تیار کرنے میں بھی حضرت مولانا موصوف کی کاوشیں شامل تھیں۔

اورنہرو رپورٹ (جس میں مسلمانوں کے مذہبی اَحکام میں دخل اندازی کی گئی تھی) کی مخالفت میں بھی آپ کا کردار ممتاز رہا، اور آپ نے اِس بارے میں جمعیۃ علماء ہند اور ملت اِسلامیہ کی طرف سے بھرپور وکالت کی، جس کی بنا پر ''انڈین نیشنل کانگریس'' کو یہ رپورٹ بالآخر رد کرنی پڑی، وغیرہ۔

جولائی ۱۹۴۰ء میں آپ کو باقاعدہ جمعیۃ علماء ہند کے مرکزی ناظم عمومی کے منصب پر فائز کیا گیا؛ لیکن افسوس کہ آپ کی عمر نے وفا نہ کی اور نومبر ۱۹۴۰ء میں آپ کی وفات کا سانحہ پیش آیا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اِس طرح کل ۶ رمہینے آپ نظامت عمومی کے منصب پر فائز رہے۔

مولانا موصوف بے نفسی اور سادگی کے ساتھ جرأت وحمیت میں بھی اپنی مثال آپ تھے۔ اللہ تعالیٰ آپ کے درجات کو بے حد بلند فرمائیں، آمین۔

سید الملت حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب دیوبندیؒ

حضراتِ گرامی قدر! آج کے سیمینار کا دوسرا موضوع سید الملت حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب دیوبندیؒ کی ذاتِ گرامی ہے۔ موصوف دیوبند کے خانوادۂ سادات رضویہ کے چشم وچراغ تھے۔ اور جامع الکمالات شخصیت کے مالک تھے۔ علمی رسوخ، نظریہ کی پختگی، سلامت روی، بے نفسی اور تواضع جیسی عظیم صفات سے آپ کا خمیر اُٹھایا گیا تھا، اُس پر طرہ یہ کہ زبان کے ساتھ ایسا اَشہب قلم بھی نصیب ہوا، جو تادم آخر چلتا ہی رہا، اور مختلف دینی، علمی اور سیاسی وتاریخی موضوعات پر مفید اور قیمتی تصانیف وجود میں آنے کا سبب بنا۔

بالخصوص تحریک آزادیٔ ہند میں علماء حق کی قربانیوں پر آپ کی بلند پایہ تصانیف سند کا درجہ رکھتی ہیں، جن میں ''علماء ہند کا شاندار ماضی'' ۴ر جلد، ''علماء حق اور اُن کے مجاہدانہ کارنامے'' ۲ر جلد، ''اسیرانِ مالٹا''، ''جمعیۃ علماء کیا ہے؟'' اور ''تحریک شیخ الہند'' خاص طور پر

قابل ذکر ہیں۔

آپ دارالعلوم دیوبند کے ممتاز فاضل اور شیخ الحدیث اِمام العصر علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے خاص شاگرد تھے۔ دارالعلوم دیوبند سے ۱۹۲۵ء میں فراغت کے بعد ''مدرسہ حنفیہ آرا بہار'' میں تدریسی خدمات پر مامور ہوئے۔

پھر ۱۹۲۸ء میں ''جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مرادآباد'' سے وابستہ ہوئے، اور یہیں پر آپ نے جمعیۃ علماء ہند کی ابتدائی ممبرسازی قبول فرمائی، اور جلد ہی مقامی اور صوبائی جمعیۃ میں سرگرم خدمات انجام دینے لگے۔ اور یہ تعلق ایسا مضبوط ہوا کہ جمعیۃ علماء آپ کا اوڑھنا بچھونا بن گئی، اور تدریس کے علاوہ پورا وقت جمعیۃ علماء کی تحریکات اور انتظامی مصروفیات میں گذرنے لگا۔

تا آں کہ ۱۹۴۴ء میں جب آپ کو جمعیۃ علماء ہند کا مرکزی ناظم بنادیا گیا تو آپ مرادآباد سے دہلی منتقل ہوگئے، یہ تحریکات کے عروج کا دور تھا، آپ نے اِس دور میں مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ کا دست راست بن کر عظیم الشان خدمات انجام دیں۔

۱۹۶۲ء تک آپ مرکزی ناظم رہے، اُس کے بعد ایک سال تک ناظم اعلیٰ کے منصب پر بھی فائز رہے۔ جمعیۃ علماء سے آپ کا تعلق کیسا تھا؟ اِس بارے میں ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہاں پوری لکھتے ہیں:

''جمعیۃ علماء ہند، اُس کی سیاست، اُس کے رہنماؤں، اُس کے مقاصد اور اُس کے اُصول سے لے کر فروع تک سے مؤرخ ملت کا تعلق جسم وجان کا سا تھا۔ جمعیۃ علماء ہند کے ایک دور کی کہانی مولانا محمد میاں کی کہانی تھی۔ مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ کی حیات (اگست ۱۹۶۲ء) تک جمعیۃ کے روحِ رواں رہے، اُن کے انتقال کے بعد ایک سال تک وہ جمعیۃ کے ناظم اعلیٰ کے منصب پر فائز رہے تھے، اُس کے بعد بھی منصب کی ذمہ داری کے بغیر جمعیۃ سے اُن کا تعلق اِسی طرح ذوق وخدمت کا تعلق رہا''۔

اُس دور میں جمعیۃ کے ذریعہ جتنی بھی تحریکات چلائی گئیں، اُن میں حضرت مولانا محمد میاں صاحبؒ کا مرکزی کردار رہا، خاص طور پر دینی تعلیمی بورڈ کا قیام اور اُس کے لئے نصاب کی تیاری اور اِرتداد زدہ علاقوں میں مکاتب کا قیام مولانا موصوف کے یادگار کارناموں میں شامل ہے۔

اِسی طرح جدید فقہی مسائل کے حل کے لئے ''اِدارۃ المباحث الفقہیہ'' کا قیام بھی حضرت مولانا موصوف کا مرہونِ منت ہے۔

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی نور اللہ مرقدہٗ سے آپ کو بے انتہاء عقیدت تھی اور حضرت کا کامل اعتماد بھی آپ کو حاصل تھا، جس کا اندازہ آپ کی مختلف تحریرات سے لگایا جاسکتا ہے۔

حضرت شیخ الاسلامؒ کی وفات پر ''الجمعیۃ'' کا شہرۂ آفاق ''شیخ الاسلام نمبر'' آپ ہی کا ترتیب دادہ ہے، جو اپنی نظیر آپ ہے۔

الغرض حضرت موصوف کی ذات انتہائی قابل قدر، لائق اتباع اور بعد والوں کے لئے بہترین نمونہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

ضروری ہے کہ اُن کی زندگی سے ہم سبق حاصل کریں، خاص کر اُن کی تحریروں کا اہتمام کے ساتھ مطالعہ کریں اور جمعیۃ کی فکر اور نظریات سے وابستہ رہیں۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق سے نوازیں، آمین۔

اظہار تشکر

اخیر میں ایک مرتبہ پھر احقر دل کی گہرائیوں سے آپ حضرات کا شکریہ اَدا کرتا ہے کہ آپ نے جمعیۃ علماء ہند کی دعوت پر اپنی مصروفیات میں سے قیمتی وقت فارغ کیا اور جمعیۃ علماء ہند کی دعوت پر تشریف لاکر سیمینار کو رونق بخشی۔ اللہ تعالیٰ ہمارے مل بیٹھنے کو قبول فرمائیں، اور اکابر واَسلاف کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائیں، آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کلماتِ استقبالیہ

سیمینار کی افتتاحی نشست میں بحیثیت کنوینر مہمانوں اور شرکاء کی خدمت میں
بطور خیر مقدم و استقبال یہ ''کلمات استقبالیہ'' پیش کیا۔ (ضیاء الحق خیر آبادی)

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی محمدٍ خاتم النبیین وعلیٰ آلہ واصحابہ اجمعین أما بعد!

فقد قال اللہ تعالیٰ: لئن شکرتم لأزیدنکم

ہم اللہ تعالیٰ کے اس فضل وانعام پر اس کا شکر بجالاتے ہیں کہ محض اس کی توفیق سے ہم آج کا یہ تاریخ ساز سیمینار بہ عنوان ''مولانا سید محمد میاں: حیات وخدمات'' منعقد کررہے ہیں، اس کے لئے لائق تحسین وقابل مبارکباد ہیں جمعیۃ علماء کے تمام اراکین ومتعلقین بالخصوص صدر جمعیۃ علماء ہند استاذ محترم مولانا قاری محمد عثمان صاحب دامت برکاتہم وجنرل سکریٹری مولانا سید محمود مدنی دامت برکاتہم جنھوں نے جمعیۃ علماء ہند کے قیام کے سو سال پورا ہونے پر اکابر جمعیۃ کے کارناموں کو دستاویزی شکل میں محفوظ کردینے کا خاکہ تیار کیا اور سیمینار کی شکل میں اس کو عملی جامہ پہنانے کا تاریخی قدم اٹھایا۔

حضرات گرامی قدر!

جمعیۃ علماء ہند کی خدمات سے واقفیت، اس کے اکابر سے قلبی تعلق وعقیدت تو بچپن سے ہے، لیکن جب اس سیمینار کے تیاری کے سلسلے میں جمعیۃ کا لٹریچر پڑھا، خصوصاً روزنامہ الجمعیۃ کی فائلیں جب نگاہ سے گزریں، اور اس وقت کے ملکی حالات کا تفصیل سے علم ہوا تو آنکھیں کھلی رہ گئیں، کہ جو کچھ ہم لوگ جانتے تھے وہ تو نفس واقعہ کا عشرعشیر بھی نہیں ہے، واقعی یہ جمعیۃ کے مخلص رہنماؤں کی قربانیوں کا صدقہ ہے کہ ہم لوگ ہندوستان میں

اپنے دینی شعائر کے ساتھ رہ رہے ہیں۔اس تلاش وتحقیق کے نتیجہ میں اس پاکیزہ جماعت اوران قدسی صفات ہستیوں سے عقیدت ومحبت کے نئے باب واہوئے۔ع

وہ کیا لوگ تھے جوراہ وفا سے گزر گئے

''جمعیۃ علما ہند'' ہندی مسلمانوں کی ایک ایسی جماعت ہے جس کی بے مثال قربانیوں اور سنہرے کارناموں سے تاریخ بھری پڑی ہے۔اسی جماعت نے انگریزی حکومت کے جبر واستبداد کے پنجوں کو مروڑا ہے،اسی تحریک نے وطن عزیز کو غلامی سے آزادی دلائی ہے،اسی تنظیم نے اپنے خون جگر سے گلستان وطن کو شادابی بخشی ہے۔

وطن والو! ہمیں ہیں ہاں ہمیں معمار آزادی

ہمارے رہنمائے دیں سپہ سالار آزادی

مجھے کہنے دیا جائے کہ اس جماعت سے وابستہ مخلصین ''رہبان باللیل وفرسان بالنہار "کے حقیقی مصداق تھے۔ہونا تو یہ چاہئے تھا اس جماعت اوراس سے وابستہ افراد کو ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا،قوم انھیں اپنی پلکوں پر بٹھاتی،ان کی خاک پا کو آنکھوں کا سرمہ بناتی مگر افسوس!اس جماعت کی مخالفت کی گئی،اوراس تنظیم پر ایسا وقت بھی آیا جب اس سے عداوت کی انتہا کردی گئی،اس تحریک کے تئیں نفرتوں کے بازار گرم کردئے گئے،غیر تو غیر اپنوں نے ان ذوات قدسیہ کے ساتھ وہ حوصلہ شکن اور تحقیر آمیز رویہ اختیار کیا جنھیں بیان کرنے سے زبان گنگ،قلم ساکت اور ذہن ماؤف ہوجاتے ہیں۔

اس جگہ آکر بے ساختہ میری نگاہوں میں وہ منظر آجاتا ہے جسے سوچ کر کلیجہ حلق کو آجاتا ہے۔حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ صوبہ سرحد کے دورہ سے واپس آرہے تھے، جالندھر اسٹیشن پر بعض لیگی نوجوانوں نے ان کے ساتھ انتہائی گستاخی اور بدتمیزی کا معاملہ کیا،ان کی پگڑی اتار کر روند دی،طمانچہ مارا،گالیاں دیں،منہ پر تھوک دیا۔اور یہ بھی کہا گیا کہ ان پر شراب انڈیل دی۔

شورش کاشمیری نے اپنی خودنوشت سوانح ''بوئے گل .....'' میں لکھا ہے کہ اسی وقت ایک جلسے میں عطاء اللہ شاہ بخاری ننگے سر آئے،کسی نے وجہ پوچھی تو فرمایا:

''جب سے میری قوم نے حسین احمد کی پگڑی اتاری ہے میں نے عہد کیا ہے آئندہ سر پرٹوپی نہیں رکھوں گا۔''(بوئے گل...ص:۲۷۶)

چنانچہ شاہ صاحب کی جوتصویریں اس وقت دستیاب ہیں، اس میں وہ ننگے سر ہی نظر آتے ہیں،اس کی وجہ یہی ہے۔

اس واقعہ پرغور کیجئے ،اللہ اللہ! یہ کیسے لوگ تھے !انھوں نے اپنی پامالی دستار کوکن حوصلوں سے سہا ہوگا؟؟؟

کس دل گردے سے اپنی داڑھی میں ناپاک شراب کی آمیزش برداشت کی ہوگی؟؟

کس حوصلے سے اسلام کی مخالفت اورکفر کی چاکری کے طعنے سنے اور سہے ہوں گے؟؟

آخر یہ لوگ کس مٹی سے بنے تھے؟؟؟ کیا ان کے اندر جذبات وخواہشات نہیں تھیں؟؟؟

ان سب واقعات کو پڑھ کرسوال یہ بھی ابھرتا ہے کیا یہ لوگ اسی دنیا کے رہنے والے تھے یا کسی دوسرے عالم کے مکیں؟؟

ان سوالوں کے جوابات تلاش کیجئے!!!!

اگرآپ کے اندر عدل وانصاف ،امانت ودیانت اخلاق وانسانیت اوراحساس ذمہ داری کی کچھ بھی رمق باقی بچی ہےتواس مخلوق کی مظلومیت پرآپ کی چیخ نکل جائے گی، ان بزرگوں کے جبالی حوصلوں اورفولادی عزائم پر بےاختیار صدائے آفریں نکلے گی،آپ کا دل ان کی عقیدت ومحبت سے یقیناً سرشار ہوجائے گا۔ان اکابرین کی زندگی کا حیرتناک اور انتہائی تعجب خیز پہلو یہ بھی نظرآتا ہے کہ باوجود حوصلہ شکنی کے، ہزارظلم وزیادتی کے، لاکھ مخالفت وعناد کے کبھی اپنے مخالفین کیلئے ان کی زبان سے ایک حرف شکایت نہ نکلا،نہ دل سے کوئی آہ نکلی!!!

واقعی یہ قدسی صفات بزرگ **اللھم اغفر لقومی فانھم لایعلمون** کے اسوۂ نبوی پر پوری طرح کاربند تھے۔

آج کا یہ پروگرام اسی متحرک وفعال دینی وملی اورسماجی تنظیم جمعیۃ علماء ہند کے ان

مایہ ناز بانیوں، صدور ونظماء اور عظیم المرتبت، تاریخ ساز وانقلاب آفریں شخصیات کے دینی وملی، ملکی وقومی خدمات کے تعارف اور ان کے گراں قدر کارناموں سے نسل نو کو متعارف کرنے کے لئے منعقد کیا جارہا ہے۔

حضرات سامعین!

حضرت مولانا سید محمد میاںؒ جن کی طرف آج کی یہ نشست منسوب ہے، ملت اسلامیہ کے بیدار مغز قائد، تحریک آزادی کے جانباز سپاہی، اسلاف کی امانت کے پاسبان، جمعیۃ علماء کے بے لوث ترجمان، حضرت شیخ الاسلام کے افکار ونظریات کے حامل ونگہبان، حضرت مجاہد ملت کے معتمد علیہ معاون ومددگار، تعمیر ملت کے معمار اور میدان درس وتدریس کے شہ سوار تھے۔ ایسے افراد صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں اور صدیوں کا کام سالوں میں کرجاتے ہیں، انھوں نے اپنی حیات مستعار کو ملت اسلامیہ کی بقاوترقی کی راہ میں کھپادیا اور اپنے کارناموں کی ایک تاریخ چھوڑ گئے، تصانیف کا بیش بہا ذخیرہ ہمیں دے گئے، دینی تعلیمی تحریک کو ہندوستان کے گوشے گوشے اور گھر گھر میں پہنچانے کا کام کرگئے۔ وہ واقعی اقبال کے اس شعر کا مصداق تھے ؎

نگہ بلند، سخن دلنواز، جاں پرسوز   یہی ہے رخت میر کارواں کے لئے

مولانا نے تو اپنے قلم کے ذریعہ جمعیۃ علماء کا تعارف پوری دنیا میں کرادیا، لیکن مولانا کی شخصیت اور ان کی خدمات جلیلہ کا تعارف جمعیۃ کے ذمہ ایک قرض تھا کہ ان کی خدمات کو دستاویزی شکل دی جائے اور ان کی شخصیت کے مختلف گوشوں اور عام نگاہوں سے پوشیدہ ان کے کارناموں کو جمع کیا جائے، جس کی مؤثر اور کامیاب شکل یہی تھی کہ ملک کی اہم شخصیات، دانشوروں اور صاحب قلم حضرات سے مدد لی جائے۔

حضرات گرامی!

اب آپ اسے قدرت کا کرشمہ کہئے گا یا نیرنگی زمانہ سے تعبیر کیجئے گا کہ جس وقت آسمان علم وعمل کا یہ آفتاب غروب ہورہا تھا، میدان تاریخ وتذکرہ کا یہ عظیم شہ سوار آخرت کے لیے رخت سفر باندھ رہا تھا، ٹھیک اس سے ۱۸؍دن پہلے اس گلستان رنگ وبو میں قدم

رکھنے والے اس بچے کے دوش ناتواں پر اس وقت اس تاریخی سمینار کی ذمہ داری ہے، جس کا تعلق حضرت مولانا محمد میاں صاحب دیوبندی کی ہمہ جہت خدمات اور کارہائے نمایاں سے ہے۔ یہ میری خوش نصیبی ہے کہ میں نے مولانا سید محمود مدنی مدظلہ کی سرپرستی اور مولانا معزالدین احمد صاحب گونڈوی مدظلہ کی رہنمائی میں، اس خدمت کو اپنے دل کی آواز سمجھ کر بحسن وخوبی انجام دینے کے لیے اپنی پوری توانائی صرف کی ہے۔ میں اس کوچہ میں بالکل نووارد ہوں، لیکن ان حضرات کی سرپرستی ورہنمائی کی وجہ سے الحمد للہ منزل مقصود تک پہنچنے میں کسی قسم کی کوئی دشواری نہیں پیش آئی اور آج ہماری درخواست پر ملک کے اہم حضرات نے لبیک کہا اور منتخب موضوعات پر اپنی نگارشات سے ہمارے دامن طلب کو مالا مال کیا۔ ہم نے مولانا سید محمد میاں کی شخصیت اور خدمات پر وسیع اور جامع تر موضوعات کی ایک فہرست مرتب کی، کوشش یہ رہی کی کوئی پہلو چھوٹنے نہ پائے۔ اور اسے آپ حضرات کی خدمت میں بھیجا گیا، آپ کے اس فراخدلانہ قلمی تعاون پر میں دل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کرتا ہوں، یہ خود مولانا سید محمد میاں کی شخصیت کی عظمت ومحبوبیت کی دلیل ہے، اور ''علماء ہند کے شاندار ماضی'' کے مصنف کو ''موجودہ علماء ہند کا شاندار خراج عقیدت'' ہے۔

محترم حضرات:

آپ ہمارے معزز مہمان بھی ہیں، معاون وکرم فرما بھی ہیں، آپ نے اپنی ملی وتدریسی اور انتظامی مصروفیات کے باوجود سیمینار میں تشریف آوری کی زحمت برداشت کی ہے، ملت کے مفاد اور جمعیۃ علماء ہند کے مشن کو اپنے دیگر امور پر ترجیح دی۔ میں اپنی جانب سے اور جمعیۃ علماء ہند کی طرف سے اپنے سبھی مؤقر ومحترم مہمانوں، مقالہ نگاروں اور مشاہدین وشرکاء کا تہ دل سے استقبال کرتا ہوں، ارمغان تشکر وامتنان پیش کرتا ہوں اور اللہ رب العزت کے دربار عالیشان میں سر نیاز وجبین شکر خم کرتا ہوں کہ اس نے ہمیں اس کامیاب پروگرام کے انعقاد کی توفیق بخشی۔ اللہ تعالیٰ اسے نافع بنائیں اور شرف قبولیت سے نوازیں۔

آمین یارب العالمین بحرمة سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم

وآخر دعوانا ان الحمدللّٰہ رب العالمین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مختصر روداد سیمینار

ضیاء الحق خیرآبادی

تحریک آزادی اور ملک وملت کی تعمیر وترقی میں جمعیۃ علماء ہند (سن تاسیس ۱۹۱۹ء) کی جو زرّیں خدمات رہی ہیں، وہ کسی صاحب نظر سے مخفی نہیں، جمعیۃ علماء ہند نے اپنی ان خدمات کے تعارف کے لئے صد سالہ تقریبات کے انعقاد کا فیصلہ کیا اور ان تقریبات کو یادگار بنانے اور ان کو نقش دوام بخشنے کے لئے جمعیۃ نے اپنے بانیان، اولین معماروں اور اپنے ممتاز قائدین ورہنماؤں کو بھی خراج عقیدت پیش کرنا اپنا فرض اولیں خیال کیا، یہ جمعیۃ کے وہ اکابر ورہ نما ہیں جن کے اخلاص وعمل، ایثار وقربانی اور مقرر کردہ خطوط کی بدولت وہ ایک صدی کا سفر مکمل کرنے میں کامیاب ہوسکی ہے۔

جمعیۃ کے ذمہ داروں کی خواہش تھی کہ ان اکابر کی دینی وملی، سیاسی وسماجی، تدریسی وتصنیفی، تحریکی اور دعوتی وتبلیغی خدمات کو جو مختلف کتابوں، مضامین اور اخبارات ورسائل کے صفحات میں دفن ہیں، ان کو یکجا کر کے دستاویزی شکل دیدی جائے، تاکہ ان کے روشن کارنامے اور ہمہ جہت خدمات لوگوں کے سامنے آئیں۔ اس سے ایک طرف جمعیۃ کی سوسالہ تاریخ بھی محفوظ ہوجائے گی اور اکابر جمعیۃ کی خدمات کا ریکارڈ بھی مرتب شکل میں موجودہ اور آنے والی نسل کے سامنے ہوگا، جو ان کے لئے مشعل راہ ہوگا۔

لہٰذا جمعیۃ علماء ہند کی صد سالہ تقریبات کے پیش نظر عملی اقدامات کئے گئے اور منتخب شخصیات پر ملکی سطح پر سیمینار کا فیصلہ کیا گیا۔ پہلے مرحلہ میں مولانا ابوالمحاسن سجاد بہاری اور مولانا سید محمد میاں دیوبندی پر دہلی میں سیمینار طے ہوا۔ اول الذکر کا کنویز مشہور صاحب قلم عالم

مولانا مفتی اختر امام عادل صاحب کو بنایا گیا۔ اور ثانی الذکر مولانا سید میاں سیمینار کا کنوینر راقم سطور بنایا گیا۔ مولانا اختر امام عادل صاحب تو ان چیزوں دیکھے اور برتے ہوئے تھے، ان کے لئے یہ کچھ مشکل نہ تھا، لیکن میں! میرے لئے تو ایک بڑا امتحان تھا، اجلاس، کانفرنس اور سیمینار کرانے کا تجربہ تو درکنار! میں تو جلسوں، کانفرنسوں اور اس طرح کے پروگرام میں شرکت سے بھی گریز کرتا تھا، لیکن میرے مشفق ومہربان کرم فرما مولانا معز الدین صاحب گونڈوی نے جب اس کی پیش کش کی اور کہا کہ ہر طرح کے عملی تعاون کے لئے میں موجود ہوں تو میں نے بنام خدا اس ذمہ داری کو قبول کرلیا۔ مولانا موصوف کے علاوہ استاذ گرامی قدر مولانا ضیاء الدین صاحب قاسمی ندوی اور معروف محقق اور صاحب قلم عالم مولانا نور الحسن راشد صاحب کاندھلوی مدظلہما کا علمی وعملی تعاون مجھے حاصل رہا، جن کی روشنی میں لائحہ عمل طے کیا، خطوط ونقوش وضع کئے، موضوعات وعناوین کی فہرست بنائی۔ اللہ نے مدد کرنے والوں کی ایک ٹیم فراہم کردی، میرے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ اتنے مخلص اور قربانی دینے والے افراد واحباب از خود تعاون کے لئے تیار ہوجائیں گے، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ خود ناظم عمومی مولانا سید محمود مدنی صاحب بنفس نفیس اس میں دلچسپی لے رہے تھے، ان کی ذاتی دلچسپی، خصوصی توجہ اور حوصلہ افزائی میرے حوصلوں میں قوت وتوانائی کا باعث تھی۔

ملک کے اہم ترین اصحاب فکر ونظر دانشوروں، مفکروں اور اہل قلم کو دعوت نامے ارسال کئے گئے، سب نے ہماری دعوت پر مسرت کا ظہار کیا اور پوری فراخدلی کے ساتھ لبیک کہا۔ ملکی پیمانے پر جمعیۃ علماء ہند کے اس فیصلہ کو سراہا گیا اور اس کی تائید وحمایت کی گئی۔

ناچیز اور اس کے علمی معاونین نے سید الملتؒ کی ہمہ گیر خدمات کے ہر پہلو کو سامنے رکھا، اور متعلقہ مواد کی تلاش وجستجو میں جو ممکن کوشش ہوسکتی تھی اس سے دریغ نہیں کیا گیا۔ اس کے لئے متعدد بار مختلف مقامات کا سفر کیا اور معلومات کے حصول کے لئے بہت سی اہم شخصیات ملاقات کی۔ اس سلسلہ میں دار العلوم دیوبند کے کتب خانہ سے خصوصی استفادہ کیا گیا، مولانا محمد میاں خود دیوبند کے رہنے والے تھے، اور ان کی پوری تعلیم دار العلوم دیوبند

میں ہوئی تھی، اس لئے ان کے بارے میں بیشتر ابتدائی معلومات یہیں سے حاصل ہوئیں۔ اس کے بعد دوسرے نمبر پر جمعیۃ علماء ہند کی محمودیہ لائبریری تھی، جہاں سے ان کی سیاسی زندگی کے علاوہ تصنیفی زندگی کی معلومات اور اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ملا، جس کو بھی مولانا پر کوئی کام کرنا ہو وہ ان دونوں (کتب خانہ دارالعلوم دیوبند اور محمودیہ لائبریری) سے بے نیاز نہیں ہوسکتا۔ اس کے علاوہ مدرسہ شاہی، مدرسہ امینیہ، ندوۃ العلماء لکھنؤ کے کتب خانوں اور مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی لائبریری مرقاۃ العلوم مئو سے بھی فائدہ اٹھایا، کہیں خود جاکر تو کہیں بالواسطہ اپنے احباب کی مدد سے۔

یہ کام تھا تو دلچسپ مگر محنت طلب اور جانفشانی کا طالب! ابتدائی چند ماہ تک تو صورتحال مایوس کن رہی لیکن تلاش وجستجو جاری رہی، پھر رفتہ رفتہ مواد فراہم ہوتے گئے، ہمارے مخلص بزرگوں، دوستوں اور شاگردوں نے حق تعاون ادا کیا۔ جب مقالہ نگار حضرات کی جانب سے مثبت پیغامات آنے لگے اور عملی شکل میں گرانقدر مقالات ای میل پر پہنچنے لگے تو دلی مسرت اور منزل کے قریب ہونے کا فرحت بخش احساس ہونے لگا کہ ان شاء اللہ یہ ایک کامیاب سیمینار ہوگا۔ اس سلسلہ میں سید الملت کے خانوادے کی وہ شاخ جو لاہور میں مقیم ہے یعنی مولانا سید حامد میاں کی اولاد واحفاد، میں نے ان سے بھی رابطہ کیا، ان حضرات نے بھی ہر ممکن تعاون کیا۔ اس طرح اتنے لوگوں کے تعاون اور دعاؤں کے طفیل یہ دشوار گزار منزل طے ہوئی۔ فجزاهم الله احسن الجزاء

۱۵/دسمبر ۲۰۱۸ء شنبہ کے روز نئی دہلی کے ماؤلنکر ہال میں اس دوروزہ سیمینار کا افتتاحی اجلاس منعقد ہوا، یہی سیمینار کی پہلی نشست تھی۔ (یہ افتتاحی نشست مولانا سید محمد میاں اور مولانا ابوالمحاسن سجاد بہاری دونوں پر مشترکہ نشست تھی) اجلاس کی صدارت امیر الہند مولانا قاری سید محمد عثمان منصور پوری صدر جمعیۃ علماء ہند نے کی، جب کہ نظامت کے فرائض مولانا محمود مدنی جنرل سکریٹری جمعیۃ علماء ہند، مفتی محمد سلمان منصور پوری، مفتی محمد عفان منصور پوری نے مشترکہ طور پر انجام دیے۔ بحیثیت کنوینر میں نے اور مولانا اختر امام

عادل نے مہمانوں اور شرکاء کے سامنے کلمات تبریک وتشکر پیش کئے ۔ پروگرام میں ہندو پاک کے ممتاز علماء کرام، دانشوران ملت اور ارباب قلم موجود تھے، ملک کے طول وعرض سے مدارس اسلامیہ اور مراکز علمیہ کے موقر علماء وذمہ دار حضرات تشریف فرما تھے۔ ہم نے جن بزرگوں کو مدعو کیا تھا تقریباً سبھی حضرات شریک ہوئے، جن اکابر نے کسی وجہ سے شرکت نہیں فرمائی تو اپنے حوصلہ بخش پیغامات نمائندوں کے ذریعہ ارسال فرمائے۔ مقالہ نگار حضرات میں سے بھی اکثر حضرات افتتاحی اجلاس میں شریک ہوئے۔ پورا ہال شرکاء سیمینار اور دیگر مہمانوں سے بھر گیا تھا۔

اس پہلی نشست کی تفصیلی روداد یہ ہے:

اس موقع پر اپنے خطبہ افتتاحیہ میں **صدر جمعیۃ علماء ہند مولانا قاری سید محمد عثمان منصور پوری نے کہا** کہ اِس سیمینار میں ابوالمحاسن حضرت مولانا محمد سجاد بہاریؒ اور سید الملت حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب دیوبندیؒ کی شخصیت اور خدمات کو موضوع بنایا گیا ہے۔ یہ دونوں شخصیات جمعیۃ علماء ہند کی تاریخ میں ممتاز حیثیت کی حامل ہیں۔ ابوالمحاسن حضرت مولانا سید محمد سجاد صاحبؒ اپنے دور کی عبقری شخصیات میں سے تھے، اللہ تعالیٰ نے بے مثال ذکاوت وفطانت اور فہم وبصیرت سے مالا مال فرمایا تھا، آپ عزم کے پکے اور رائے کے بڑے صائب تھے۔ جمعیۃ علماء ہند اور امارت شرعیہ کے قیام میں ان کا بنیادی اور کلیدی کردار تھا۔ دوسری طرف حضرت سید الملت مولانا محمد میاںؒ کی شخصیت ہے، جن کے قلم گہر بار نے اکابر جمعیۃ کی تاریخ کو سمیٹنے اور مرتب کرنے میں اَہم کردار ادا کیا ہے، اور اِس خدمت میں پوری جماعت میں اُن کا کوئی بدل نہیں ہے۔ جمعیۃ علماء ہند کے ایک دور کی کہانی مولانا محمد میاں کی کہانی تھی۔ صدر جمعیۃ علماء ہند نے کہا کہ اَب یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم اِن دونوں شخصیات کے چھوڑے ہوئے روشن نقوش کو اپنے لئے مشعل راہ بنائیں تاکہ اِس طرح کے اِجتماعات کا صحیح فائدہ سامنے آسکے۔

مولانا رابع حسنی ندوی ناظم دارالعلوم ندوۃ العلماء نے اپنے پیغام میں کہا کہ جمعیۃ علماء ہند نے اپنی سو سالہ خدمات کا تعارف کرانے کیلئے سیمینار منعقد کرنے کا جو قدم اٹھایا ہے وہ قابل تحسین ہے، ضرورت ہے کہ نئی نسل کو اپنے بزرگوں کی خدمات سے متعارف کرایا جائے تاکہ ان میں ہمت وحوصلہ اور جرأت وحمیت دینی کا وصف پیدا کیا جائے۔ اپنے خطاب میں **مولانا سید ارشد مدنی صدر جمعیۃ علماء ہند**

نے اکابر پر منعقد ہو رہے سیمیناروں کے لیے مولانا محمود مدنی کی ستائش کی اور کہا کہ جمعیۃ علماء ہند کی یہ خصوصیت ہے کہ اسے ہمیشہ اللہ والوں کی قیادت اور سرپرستی حاصل رہی ہے۔ جمعیۃ علماء ہند درحقیقت حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کی جماعت ہے، جسے ان کے شاگردوں نے جذبہ حریت کے تحت قائم کیا تھا۔ چنانچہ جیسے ہی وہ مالٹا سے واپس آئے تو ان کو جمعیۃ علماء ہند کا پہلا مستقل صدر بنا دیا گیا، لیکن حیات نے وفا نہ کی اور صرف بارہ یوم کے بعد انتقال فرما گئے، بعد میں ان کے متوسلین جن میں مولانا محمد سجادؒ اور مولانا سید محمد میاںؒ بھی تھے، نے جمعیۃ علماء ہند کی تحریکوں کو بلندی تک پہنچایا۔ مولانا محمد سجادؒ کی فقہی بصیرت کا مرتبہ یہ تھا خود حضرت علامہ کشمیریؒ نے ان کو فقیہ النفس کہا تھا۔ انھوں نے اپنی حیات میں جمعیۃ علماء ہند کی تحریکوں کی بنیاد رکھی، وہ جمعیۃ کا دماغ کہلاتے تھے۔ **مولانا محمود مدنی جنرل سکریٹری جمعیۃ علماء ہند** نے کہا کہ آج مسلمانوں کے جو حالات ہیں، ان میں ہمیں حضرت سید الملت مولانا محمد میاں دیوبندیؒ کی یاد آتی ہے، جنھوں نے تقسیم وطن کے بعد ارتداد کی لہر کا سینہ سپر ہو کر مقابلہ کیا۔ آج ہمارے بچے اور بچیوں کی بڑی تعداد ارتداد کے کنارے پر ہے۔ ایسے میں ہمارے اوپر کام بہت زیادہ بڑھ گیا ہے۔ اگر ہم اس پر کام نہیں کریں گے تو ہماری نسلیں ہمیں معاف نہیں کریں گی۔ اس موقع پر مولانا محمود مدنی نے صد سالہ تقریبات کو لے کر اعلان کیا کہ مرکز کی طرف سے ابھی چھ مزید سیمینار ہوں گے، نیز جمعیۃ علماء ہند پورے ملک میں اس نوعیت کے پانچ سو اجلاس کرے گی۔ انھوں نے یہ بھی اعلان کیا کہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ، حضرت شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ اور فدائے ملت مولانا اسعد مدنیؒ پر بھی مشترکہ اجلاس جلد کیا جائے گا۔ انھوں نے کہا کہ ہم پروگرام اس لیے کر رہے ہیں تاکہ ہم اپنے اکابر سے سیکھ کر مستقبل کا لائحہ عمل طے کریں۔

مولانا عتیق احمد بستوی استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء نے کہا کہ جمعیۃ کے بانیان پر سیمینار کا فیصلہ بہت ہی لائق تحسین ہے، اس کے ذریعہ نئی نسل اپنے بزرگوں کی قربانیوں سے واقف ہوگی۔ یہ سیمینار صرف ماضی کی تاریخ مرتب کرنے کے لیے نہیں ہے بلکہ سو سالہ سفر میں جو حالات پیش آئے ہیں، اس کی روشنی میں نئی منصوبہ بندی کی جائے۔ **مولانا خالد سیف اللہ رحمانی سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ** نے کہا کہ جب کوئی شخص اس ملک میں تاریخ لکھے گا تو جمعیۃ کی تاریخ آب زر سے لکھی جائے گی۔ **پاکستان کے معروف عالم دین اور قومی رکن اسمبلی مولانا عطاء الرحمٰن** نے کہا کہ گرچہ تقسیم وطن کے بعد خطے بدل گئے اور مگر نظریات کی تقسیم نہیں ہوئی۔

اس موقع پر مذکورہ حضرات کے علاوہ مولانا اختر امام عادل (کنویز سیمینار مولانا ابوالمحاسن سجادؒ) مولانا ضیاء الحق خیرآبادی (کنویز سیمینار مولانا سید محمد میاں دیوبندی، مولانا نورالحسن راشد کاندھلوی ،مولانا ندیم الواجدی، پروفیسر اختر الواسع صدر مولانا آزاد یونیورسٹی جودھپور، مولانا اسعد محمود رکن قومی اسمبلی پاکستان، مولانا محمد سفیان قاسمی مہتمم دارالعلوم وقف دیوبند، مولانا عبداللہ معروفی استاذ دارالعلوم دیوبند، ڈاکٹر سعود عالم قاسمی ، پروفیسر ابوبکر عباد، مولانا رحمت اللہ کشمیری رکن شوری دارالعلوم دیوبند نے خطاب اور مقالات پیش کیے۔ ان کے علاوہ اسٹیج پر مولانا برہان الدین سنبھلی استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء، مولانا سید ساجد میاں بن مولانا سید محمد میاں دیوبندیؒ، مولانا عبدالشکور رکن قومی اسمبلی پاکستان سمیت جمعیۃ علماء ہند کے عہدیداران وذمہ داران موجود تھے۔ آج کے اجلاس میں ڈاکٹر ماجد دیوبندی نے نظم پیش کیا جب کہ مولانا امین الحق اسامہ کانپوری نے ہدیہ نعت اور جمعیۃ علماء کا ترانہ پیش کیا۔ اس نشست میں دونوں سیمینار کے پانچ پانچ مقالات پیش کئے گئے۔ (پریس ریلیز منجانب جمعیۃ علماء ہند)

دوسری نشست مغرب بعد شروع ہوئی اور پانچ گھنٹے تک چلی، یہ نشست مولانا ابوالمحاسن سجاد پر لکھے گئے مقالات کے لئے مخصوص تھی، اس نشست کی صدارت مولانا رحمت اللہ کشمیری رکن شوریٰ دارالعلوم دیوبند نے کی، اور نظامت کے فرائض اس سیمینار کے کنویز مولانا اختر امام عادل صاحب نے انجام دیئے۔ اس نشست میں تقریباً ۳۷؍اصحاب قلم نے اپنے مقالات کی تلخیص پیش کی۔

تیسری اور اختتامی نشست ۸؍ربیع الآخر ۱۴۴۰ھ مطابق ۱۶؍دسمبر ۲۰۱۹ء اتوار کو صبح نو بجے سے پونے دو بجے تک مدنی ہال مرکزی دفتر جمعیۃ علماء ہند میں جاری رہی۔ جس کی صدارت مولانا اشہد رشیدی مہتمم جامعہ قاسمیہ شاہی مرادآباد نے کی، اور نظامت کے فرائض اس حقیر نے انجام دیئے۔ اس میں مولانا محمد میاں دیوبندی کی حیات وخدمات پر لکھے گئے ۲۷؍مقالات کا خلاصہ پیش کیا گیا۔ وقت کی کمی کی وجہ سے چند مقالات پیش نہ کئے جا سکے۔ مقالہ نگاروں نے بالخصوص مولانا مرحوم کی تعلیمی خدمات پر روشنی ڈالی، ان کے ذریعہ تیار کردہ بچوں کے نصاب کی کتابوں اور ان کی دیگر تصانیف کا تعارف کرایا۔ مولانا محمد میاںؒ دارالعلوم سے زیادہ مکاتب کے قیام پر زور دیتے تھے۔ لکھنا پڑھنا ان کی عادت خاصہ تھی، تاہم ان کی

تحریر پر اسلامی تربیت کا رنگ غالب تھا۔ کئی مقالہ نگاروں نے ان کی سیاسی خدمات کو اپنے مقالہ کا موضوع بنایا۔

مقالہ نگار حضرات کے علاوہ جن لوگوں نے اس مجلس کو خطاب کیا، ان میں مولانا متین الحق اسامہ کانپوری صدر جمعیۃ علماء اتر پردیش، مفتی محمد سلمان بجنوری استاذ دارالعلوم، مولانا امان اللہ قاسمی نائب صدر جمعیۃ علماء ہند، مفتی شبیر احمد قاسمی، مولانا رحمت اللہ کشمیری، مولانا اشہد رشیدی (صدر اجلاس)، اور مولانا محمد قاسم صاحبؒ (۱) پٹنہ وغیرہ کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ اسٹیج پر جمعیۃ علماء ہند کے صوبائی صدور اور اہم عہدیداران موجود رہے۔

جمعیۃ علماء ہند کے جنرل سکریٹری مولانا محمود مدنی نے آخر میں مولانا ابوالمحاسن سجادؒ سیمینار کے کنوینر مولانا مفتی اختر امام عادل صاحب، مولانا سید محمد میاں سیمینار کے کنوینز اس حقیر، اور مولانا معزالدین احمد ناظم امارت شرعیہ جمعیۃ علماء ہند اور مقالہ نگاروں کا شکریہ ادا کیا۔ سیمینار کا اختتام صدر جمعیۃ علماء ہند مولانا قاری سید محمد عثمان صاحب کے پُر مغز خطاب اور ان کی دعا پر ہوا۔

☆☆☆☆☆

(۱) اللہ تعالیٰ مولانا موصوف کو غریق رحمت فرمائیں، سیمینار کی ہر نشست میں شریک رہے۔ ایک مختصر علالت کے بعد ۲۲ / جمادی الاخریٰ ۱۴۴۰ھ مطابق ۲۹ / جنوری ۲۰۱۹ء سہ شنبہ کو داغ مفارقت دے گئے۔ رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ

مختصر سوانحی خاکہ

ضیاءالحق خیرآبادی

نام: محمد میاں، تاریخی نام: مظفر میاں

خاندان: آپ کا تعلق دیوبند کے قدیم خاندان سادات رضویہ سے تھا، جو دیوبند کے سادات خاندان میں سب سے بڑا ہے۔

والد کا نام: سید منظور محمد عرف اچھے میاں (م: ۱۹۴۴ء)

والدہ کا نام: اکرام النساء بنت سید ریاض احمد (م: ۱۹۵۱ء)

ولادت: ۱۲؍رجب ۱۳۲۱ھ مطابق ۴؍اکتوبر ۱۹۰۳ء

جائے ولادت اور وطن: محلّہ پیرزادگان دیوبند ضلع سہارن پور

تعلیم: تعلیم کی ابتداء گھر سے ہوئی، نانی صاحبہ نے تعلیم کی ذمہ داری سنبھالی اور بسم اللہ کرائی۔ قرآن ختم ہونے کے بعد فارسی شروع کی۔

دارالعلوم دیوبند میں: فارسی مع دینیات سے لیکر دورۂ حدیث تک مکمل تعلیم دارالعلوم دیوبند میں ہوئی۔ دارالعلوم کی سالانہ روداد ۱۳۳۱ھ میں آپ کا نام درج ہے، ''محمد میاں پسر منظور محمد'' اس سال آپ نے دو کتابوں کا امتحان دیا۔ ''لکھائی ہندسہ میں ۵۰ نمبر اور ''مفید نامہ'' میں ۴۵ نمبر۔ پھر ۱۳۳۵ھ (۱۹۱۶ء) کی سالانہ روداد میں ہے کہ درجہ فارسی وریاضی کا امتحان دیا۔ شعبان ۱۳۴۳ھ (فروری ۱۹۲۵ء) میں آپ دورۂ حدیث سے امتیازی نمبرات سے کامیاب ہوئے۔ اس وقت شیخ الحدیث علامہ انور شاہ کشمیری (م: ۱۳۵۲ھ) تھے۔

دورۂ حدیث کے نمبرات: آپ کے دورۂ حدیث کے نمبرات یہ ہیں: بخاری شریف، ترمذی، طحاوی اور نسائی میں: ۵۱۔ مسلم شریف، ابن ماجہ، موَطا امام مالک، موَطا امام محمد، شمائل ترمذی: ۵۰۔ ابوداؤد شریف: ۴۸۔ بیضاوی شریف: ۵۲۔ رشیدیہ: ۴۴۔

اساتذہ کرام: محدث العصر علامہ کشمیریؒ کے علاوہ علامہ شبیر احمد عثمانیؒ (م: ۱۳۶۹ھ) مفتی

اعظم مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی (م:۱۳۴۷) شیخ الادب مولانا اعزاز علی امروہویؒ (م:۱۳۷۴) عارف باللہ مولانا سید اصغر حسین دیوبندیؒ (م:۱۳۶۴ھ) امام المعقولات حضرت مولانا غلام رسول خاں ہزارویؒ (م:۱۳۳۷ھ) مولانا عبدالسمیع دیوبندی وغیرہ جیسے اساطین فضل وکمال خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

حفظ قرآن کریم: بچپن میں حفظ کلام اللہ کی دولت حاصل نہ ہوسکی، پھر درس وتدریس کی مشغولیات نے موقع نہ دیا، آخر جہادِ آزادی کے زمانے میں متعدد جیل خانوں میں قیام کے دوران یہ سعادت حاصل ہوئی اور ۱۹۶۴ء میں تکمیل ہوئی۔

درس وتدریس: تین اداروں سے آپ کا تدریسی تعلق رہا، اور کل مدت تدریس تقریباً ۳۲؍ سال۔ (۱) مدرسہ حنفیہ آرہ، ۱۹۲۶ء تا ۱۹۲۸ء (یہاں پر زیر درس کچھ اہم کتابیں: ابوداؤد شریف، دلائل الاعجاز، دیوان حماسہ، دیوان متنبّی، مقامات حریری وغیرہ) (۲) مدرسہ شاہی مرادآباد ۱۹۲۸ء تا ۱۹۴۵ء۔ (ترمذی ومسلم شریف، بیضاوی شریف، جلالین، ہدایہ اخیرین، دیوان حماسہ اور ملاحسن وغیرہ، اور یہاں آپ نے افتاء کا باقاعدہ نظام قائم کیا) مدرسہ امینیہ دہلی ۱۹۶۳ء تا ۱۹۷۵ء (بخاری وترمذی شریف، ہدایہ اخیرین، اور فتویٰ نویسی بحیثیت صدر مفتی)

ممتاز تلامذہ: مولانا قاضی اطہر مبارکپوری، مفتی محمود صاحب (پشاور، کستان) مولانا اسیر ادروی، مولانا قاری صدیق احمد باندوی، مولانا حامد میاں، اور مولانا اشفاق حسین، مولانا نور عالم خلیل امینی، مولانا سید احمد بخاری امام شاہی مسجد دہلی۔

اصلاحی تعلق: اصلاحی تعلق حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ سے تھا، ان کے دست حق پرست پر بیعت ہوکر سلوک واحسان کی منزلیں طے کیں۔

رسالہ قائد: مولانا نے مدرسہ شاہی کے زمانہ قیام میں ایک اہم دینی، علمی اور ادبی رسالہ ''قائد'' کے نام سے جاری کیا، جو محرم، صفر ۱۳۵۷ھ مطابق مارچ، اپریل ۱۹۳۸ء، سے رجب، شعبان ۱۳۵۸ھ مطابق ستمبر ۱۹۳۹ء تک بڑی آب وتاب سے نکلا، اس کے مضامین سے اس کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے۔

جمعیۃ علماء ہند سے وابستگی اور تحریک آزادی میں شرکت: ۱۹۲۸ء میں جمعیۃ علماء کے ممبر بنے اور ۱۹۲۹ء میں پہلی بار عملی سیاست میں قدم رکھا۔

قید وبند: تحریک آزادی کے دوران قید وبند کے متعلق مولانا نے فرمایا: گرفتار ہوا پانچ مرتبہ، ایک بار تا اختتام عدالت۔ ایک بار ایک ہفتہ کی سزا ہوئی، اور تین بار بالترتیب ایک سال، چھ مہینہ اور اٹھارہ مہینہ جیل میں رہا۔ (ہفت الجمعیۃ: ۸؍مئی ۱۹۷۰ء) ایک جگہ مولانا اس کی تفصیل بیان کرتے

ہیں:''کانگریس کا باقاعدہ ممبر بننے کے چند ہفتے بعد ہی احقر گرفتار ہوا، اس وقت حضرت مولانا سید فخر الدین احمدؒ سابق صدر جمعیۃ علماء ہند نے بھی احقر کا ساتھ دیا، اس کے بعد احقر ۱۹۳۲ء میں پہلے دہلی پھر مرادآباد میں گرفتار ہوکر سزایاب ہوا، پھر ۱۹۴۰ء میں یہ شرف حاصل ہوا، ۱۹۴۲ء کی تحریک میں آخری بار گرفتار ہوا۔''[الجمعیۃ: خصوصی اشاعت: ص:۱۳۰]

جمعیۃ علماء کے سکریٹری وجنرل سکریٹری: سہارنپور میں جمعیۃ علماء ہند کا اجلاس ۲۱تا ۲۵/جمادی الاولیٰ ۱۳۶۴ھ/۴/مئی تا ۷/مئی ۱۹۴۵ء میں آپ کو''ناظم جمعیۃ علماء ہند'' چنا گیا، جس پر آپ ۱۷/سال رہے، اور نہایت حسن وخوبی کے ساتھ تمام نظم کو چلایا۔ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کے انتقال کے بعد ۸/ستمبر ۱۹۶۲ء کو منعقدہ مجلس عاملہ نے آپ کو جنرل سکریٹری مقرر کیا۔ ایک سال کے بعد آپ اس عہدہ سے مستعفی ہوگئے، لیکن جمعیۃ علماء ہند سے تعلق باقی رہا، اور اس کی مجلس عاملہ کے رکن، ادارۃ المباحث الفقہیہ کے نگراں اور جمعیۃ ٹرسٹ کے چیرمین اخیر زندگی تک رہے۔

آزادی کے بعد جمعیۃ کے پلیٹ فارم سے کچھ اہم خدمات:

روزنامہ الجمعیۃ: آزادی کے بعد جب الجمعیۃ کا دوبارہ اجرا ہوا تو مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ نے آپ کو تار دے کر دہلی بلایا اور اخبار کی ذمہ داری اور نگرانی آپ کے سپرد کردی۔ مولانا عثمان فارقلیط ایڈیٹر مقرر ہوئے، اداریہ وہی لکھتے تھے، لیکن مولانا محمد میاں صاحب نگراں اور ذمہ دار ہونے کی حیثیت کا پورا حق ادا کرتے تھے اور اخبار میں شائع ہونے والا ہر مضمون اور مقالہ ان کی نگاہ سے گذرنے کے بعد ہی پریس میں جاتا تھا۔ الجمعیۃ کے خصوصی نمبرات جیسے مفتی اعظم نمبر (مفتی کفایت اللہ نمبر) شیخ الاسلام نمبر، مولانا آزاد نمبر اور مجاہد ملت نمبر خصوصاً آخر الذکر سب کے سب مولانا ہی کی کاوشوں کے مرہون منت تھے۔

دینی تعلیمی تحریک: آزادی کے بعد جمعیۃ علماء نے جو دینی تعلیم تحریک شروع کی، آپ اس کے روح رواں تھے، اس سلسلہ کے تمام پروگرام خود بناتے تھے، اساتذہ کی ٹریننگ کا سلسلہ شروع کیا، مسئلہ تعلیم اور طریقۂ تعلیم اور طریقۂ تقریر اور کئی رسالے تحریر فرمائے، بچوں کے لئے''دینی تعلیم کا رسالہ''۱۲/ حصوں میں لکھا جو بے حد مقبول ہوا، اور اب تک نصاب میں داخل ہے۔

فتنہ ارتداد میں مسلمانوں کو دین پر باقی رکھنا: ۱۹۴۷ء میں جب مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد پنجاب، راجستھان اور ہماچل پردیش سے ہجرت کرگئی تو باقی ماندہ مسلمانوں کے اندر ارتداد کی وبا پھیلنے لگی، اس سلسلہ میں مولانا نے اپنی جان کھپادی اور امراض وعوارض کے باوجود ان تمام دشوار گزار علاقوں

کے دورے کیے وہاں مدارس ومکاتب قائم کیے، اپنی تقریروں کے ذریعہ ان کو تسلی دی اوران کے ٹوٹے ہوئے حوصلوں کو زندہ کیا، اور وہ لوگ دوبارہ حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔

ادارۃ المباحث الفقہیہ کی ذمہ داری: جدید پیش آمدہ مسائل میں اجتماعی غور وفکر اور بحث وتحقیق کے ذریعہ مسئلہ کا شرعی حل دریافت کرنے کے لئے ۱۹۷۰ء میں جمعیۃ علماء ہند نے مولانا سید محمد میاں کی نگرانی میں ایک مستقل ادارہ ''ادارۃ المباحث الفقہیہ'' قائم کیا۔ مولانا تاحیات اس کے مدیر اور نگراں رہے اور رویت ہلال، حق تصنیف کی بیع اور کوآپریٹو سوسائٹیوں کے مسائل پر تنقیح وتحقیق کا کام انجام دیا۔

وفات: ۱۶/ شوال المکرّم ۱۳۹۵ھ مطابق ۲۲/ اکتوبر ۱۹۷۵ء بہ روز چہارشنبہ چوہتر سال کی عمر میں آپ کی وفات ہوئی، دہلی میں تدفین عمل میں آئی۔

تصانیف: مختلف موضوعات پر مولانا سید محمد میاں کی پچاسوں کتب ورسائل ہیں، جن میں سے چند درج ذیل ہیں:

☆ علمائے ہند کا شاندار ماضی (چار حصے)
☆ علمائے حق اوران کے مجاہدانہ کارنامے (دو حصے)
☆ مشکوٰۃ الآثار ومصباح الابرار (انتخاب حدیث)
☆ نور الاصباح (ترجمہ نور الاصباح)
☆ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (سیرت)
☆ صالح جمہوریت اور تعمیر جمہوریت
☆ جمعیۃ علماء کیا ہے؟ (دو حصے)
☆ صحابہ کرام کا عہدِ زریں (دو حصے)
☆ اسلام اور انسان کی حفاظت
☆ ہماری اور ہمارے وطن کی حیثیت اور ترکِ وطن کا حکم
☆ دین کامل، حیاتِ مسلم
☆ تحریکِ شیخ الہند ☆ حیاتِ شیخ الاسلام ☆ اسیرانِ مالٹا
☆ مختصر تذکرہ خدمات جمعیۃ علماء ہند (چار حصے)
☆ شواہد تقدس
☆ ہندوستان شاہانِ مغلیہ کے عہد میں

☆ مسئلہ تعلیم اور طریقۂ تعلیم
☆ سیاسی واقتصادی مسائل اور اسلامی تعلیمات
☆ تاریخ اسلام (تین حصے)
☆ دینی تعلیم کے رسائل (بارہ حصے) ☆ روزہ زکوٰۃ
☆ ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم

اولادیں: مولاناؒ کی اولاد میں چار صاحبزادگان اور تین صاحبزادیاں ہوئیں۔ ۱۔ مولانا سید حامد میاں (م: ۱۹۸۷ء) ابتدائی تعلیم مدرسہ شاہی مرادآباد، فراغت دارالعلوم دیوبند، اجازت بیعت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ، آزادی کے بعد پاکستان چلے گئے، لاہور میں ایک ادارہ جامعہ مدنیہ کے نام سے قائم کیا۔ ۲۔ حافظ سید خالد میاں (م: ۱۹۹۳ء) اپنے والد کی کتابوں کی اشاعت کے لئے ایک ادارہ ''کتابستان'' قائم۔ کمپیوٹر کی تعلیم حاصل کر کے جرمنی چلے گئے، وہیں قیام تھا، رمضان میں گھر دہلی آئے تھے، یہیں ۲۹ رمضان ۱۴۱۳ھ کو انتقال ہوگیا۔ ۳۔ مولانا سید ساجد میاں، الحمدللہ بقید حیات ہیں، درس نظامی سے فراغت کے بعد دہلی یونیوسٹی سے ماسٹر اور ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی، سعودی سفارت خانہ دہلی میں ۴۵ سال ملازمت کے بعد چند سال قبل سبکدوش ہوئے اور قیام دہلی میں ہے۔ ۴۔ چوتھے صاحبزادے سید شاہد میاں ہیں جو گریجویٹ اور کمپیوٹر پروگرامنگ میں تقریباً تیس سال سعودی عرب میں آرامکو کمپنی کے ایک شعبہ میں کام کر کے سبکدوش ہوئے ہیں۔ صاحبزادیوں میں اول نمبر خالدہ سلطانہ تھیں جو قاری سعید عالم استاذ شعبہ قراءت دارالعلوم دیوبند کے نکاح میں تھیں۔ رمضان المبارک ۱۴۲۳ھ (۲۰۰۴ء) میں وصال ہوا۔ قبرستان قاسمی میں تدفین ہوئی۔ دوسری صاحبزادی عائشہ سلطانہ ہیں جن کا نکاح مولانا محمد اسلم صاحب صاحبزادے حضرت مولانا قاری محمد طیب رحمہ اللہ سے ہوا۔ مولانا اسلم صاحب کا ۲۰۱۷ء میں وصال ہوگیا، اور ابھی ۸ جنوری ۲۰۱۹ء کو ان کا بھی انتقال ہوگیا۔ تیسری صاحبزادی کا نکاح جناب بذل الرحمٰن صاحب صاحبزادے مولانا فضل الرحمٰن صاحب مفتی وشیخ الحدیث مدرسہ حسین بخش دہلی کے ساتھ ہوا۔

☆☆☆☆☆

خودنوشت تحریریں:

اشتات سوانح (مولانا سید) محمد میاںؒ

خودنوشت سوانح حضرت مولانا سید محمد میاں رحمۃ اللہ علیہ

اس مضمون کو مولانا نور عالم صاحب نے اپنے مقالہ کا تکملہ بنایا تھا، ہم مولانا کی خود نوشت تحریریں آغاز میں دے رہے ہیں اس لئے اس مضمون کو بھی یہیں دیا جارہا ہے، مولانا نور عالم صاحب کی تمہید، عناوین اور حواشی کو بعینہٖ باقی رکھا گیا ہے۔ مرتب

یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حضرت الاستاذؒ کا اپنے سلسلے میں اپنے قلم سے لکھا ہوا مضمون، مکمل طور پر درج کردیا جائے، جس میں حضرتؒ کے سلسلے میں اصل اور بنیادی معلومات آگئی ہیں، اِس کی حیثیت دستاویز کی ہے؛ کیوں کہ اُن کی سیرت اور سوانح کے سلسلے میں، جتنا اعتماد اِس پر کیا جاسکتا ہے کسی اور تحریر پر نہیں کیا جاسکتا۔ حضرت نے اِس کا عنوان اپنے قلم سے ''اشتاتِ سوانح محمد میاں'' رکھا تھا، اُن کی وفات کے بعد، اُن کے صاحب زادۂ گرامی مولانا سیّد ساجد میاں مدظلہٗ نے دارالعلوم دیوبند کے اردو ترجمان رسالہ ''دارالعلوم'' میں اِشاعت کے لیے بھیجا تھا اور وہ مئی ۱۹۷۶ء کے شمارے میں ۱۱ تا ۱۷ صفحات پر شائع ہوا تھا، ذیلی عناوین کا اضافہ راقم نے کیا ہے تاکہ قاری کے لیے پڑھنے میں سہولت ہو: (مولانا نور عالم خلیل امینی)

خاندان اور ولادت:

محمد میاں ولد سید منظور محمد صاحب عرف ''اچھے میاں'' مرحوم، والدہ محترمہ کا نام ''اِکرام النساء'' بنت سید ریاض احمد، تاریخ پیدائش ۱۲/ رجب ۱۳۲۱ھ مطابق ۴/ اکتوبر ۱۹۰۳ء۔ مسقط راس: محلّہ پیرزادگان، دیوبند، ضلع سہارنپور۔

تعلیم کی بسم اللہ

والد صاحب محکمۂ نہر میں ملازم تھے، قیام دیہات میں رہتا تھا، احقر بھی مع والدہ

محترمہ اُنھی کے ساتھ رہتا تھا۔ پانچ یا چھ برس کی عمر ہوئی تو احقر کی تعلیم کی فکر ہوئی، موضع ''بچولہ''، ضلع ''بلند شہر'' جو والد صاحب کا ہیڈکوارٹر تھا چھوٹا سا گاؤں تھا، جہاں کوئی تعلیمی اِدارہ نہیں تھا، تو محترمہ نانی صاحبہ نے شفقت فرمائی اور والدین کی درخواست پر اُنھوں نے بسم اللہ کرادی، نانی صاحبہ بہت صالحہ وصابروشاکر خاتون تھیں، میری والدہ اور میرے ماموں سید بشیر احمد (مولانا حافظ سید محمد اَعلیٰ صاحب کے والد) یہ دو بچے ہی ہوے تھے کہ نانا صاحب کا انتقال ہوگیا، بیوگی کے دور میں بھی، اُن دونوں بچوں کی پرورش کی، صوم وصلاۃ کے علاوہ اوراد کی بھی پابند تھیں، سونے سے پہلے سورۂ ملک اور غالبًا سورۂ واقعہ کے علاوہ ایک طویل مناجات پڑھنے کا معمول تھا، جس میں اللہ تعالیٰ کے ۹۹ نام ہیں۔

آگے کی تعلیم اور دارالعلوم سے فراغت

والد صاحب مرحوم، اس تاریک قریہ میں تھوڑے عرصے رہے، پھر موضع ''ٹنڈھیڑہ''، ضلع مظفرنگر اُن کا تبادلہ ہوگیا، جہاں دینی تعلیم کا مکتب تھا، احقر مکتب میں داخل کردیا گیا، پھر والد صاحب کا قصبہ ''بسونہ'' تبادلہ ہوا وہاں ایک صاحب تھے، خلیل احمد صاحب اُن کا اسم گرامی تھا، پیشہ چرم دوزی تھا؛ مگر فارسی کی قابلیّت بہت عمدہ تھی، یہ احقر قرآن شریف ختم ہونے پر موصوف کے حوالہ کیا گیا کہ فارسی پڑھائیں؛ مگر یہ عارضی انتظامات تھے اور چوں کہ تقریباً چھ ماہ بعد والد صاحب کا تبادلہ ہوتا رہتا تھا، تو یہ انتظامات بھی ناکافی رہتے تھے، تو اَب والد صاحب مرحوم نے متعلقین کو دیوبند ہی بھیج دیا کہ احقر کی تعلیم کا انتظام ہوسکے، خاندان کے نئے رواج کے مطابق، احقر کو انگریزی پڑھانے کے لیے سرکاری اسکول میں داخل کرانا چاہیے؛ مگر انگریزی تعلیم کے مصارف ناقابلِ برداشت سمجھے گئے اور احقر دارالعلوم دیوبند کے درجہ فارسی میں داخل کردیا گیا، جہاں تعلیم مفت تھی، یہ غالبًا ۱۹۱۶ء کا واقعہ ہے، درجاتِ فارسی کی تکمیل کے بعد احقر درجاتِ عربی میں داخل ہوا ۱۳۴۳ھ / ۱۹۲۵ء میں احقر فارغ ہوا۔ دورۂ حدیث میں میرے گرامی قدر استاذ حضرت علامہ سید محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ ہیں، جن کے فیضِ علمی سے مجھ پر علم وحقیقت کی راہ کھلی۔

تدریسی سلسلہ اور اُس کی تقریب

مارچ ۱۹۲۶ء میں کلکتہ میں جمعیۃ علماے ہند کا دوسرا اجلاس زیرِ صدارت علامہ سیّد سلیمان ندوی(۱) رحمۃ اللہ علیہ ہوا تھا، حضرت علامہ مولانا محمد انورشاہ صاحب صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند اور دارالعلوم دیوبند کے جملہ اکابر اِس میں شامل ہوے، واپسی پر ''آرہ شاہ آباذ'' کے اسٹیشن پر مدرسہ حنفیہ آرہ شاہ آباد کے ارکان نے صدرالمدرسین دارالعلوم دیوبند: حضرت علامہ کشمیری سے ایسے مدرس کی فرمایش کی، جو عربی تقریر وتحریر کی مشق اور خصوصاً فنِ ادب کی اونچی کتابیں پڑھا سکے، حضرت موصوف دیوبند واپس ہوے، تو حضرت شیخ الادب مولانا محمد اعزاز علی صاحب کے مشورے سے اِس خدمت کے لیے احقر کو منتخب کیا گیا، احقر نے تقریباً ساڑھے تین سال آرہ میں قیام کیا، اول اول کچھ مشکلات پیش آئیں، پھر نہ صرف مدرسے کے حضرات؛ بل کہ شہر کے بھی بہت سے حضرات احقر سے مانوس ہوگئے، صوبہ بہار کے دوسرے اضلاع کے علما اور بزرگوں سے بھی کچھ تعارف ہوگیا؛ مگر احقر اس مدرسے سے خاطر برداشتہ رہا؛ کیوں کہ اِس مدرسے کو سرکاری ایڈ ملتی تھی اور بہار یونیورسٹی کے درجاتِ فاضل وغیرہ کی تیاری بھی یہاں کرائی جاتی تھی، یہ دونوں باتیں دارالعلوم دیوبند کے اصول کے خلاف تھیں، احقر کے اکابر جو دارالعلوم کے بااثر اور بارسوخ حضرات تھے، اُنھوں نے اگرچہ وقتی طور پر احقر کا انتخاب فرمادیا تھا اور اس میں شک نہیں کہ اگر احقر وہاں کچھ عرصے اور قیام کرتا تو ''شمس الہدیٰ'' پٹنہ میں پروفیسر ہوسکتا تھا اور یہ بھی ممکن تھا کہ پروفیسر ہونے کے بعد پرنسپل بھی ہوجاتا؛ کیوں کہ احقر کے تعلقات وسیع ہوگئے تھے اور وہاں پرنسپل شپ کے لیے کسی ڈگری کی ضرورت نہیں تھی، اُس زمانے میں مولانا محمد سہول صاحبؒ (۲) پرنسپل تھے جو صرف دارالعلوم دیوبند کے فاضل تھے اور دیوبند وغیرہ میں بااثر استاذ رہ چکے تھے، اُن کے پاس کوئی ڈگری تو کیا ہوتی، وہ بہ ظاہر انگریزی کے حروف سے بھی واقف نہ تھے؛ لیکن احقر کسی ایسے مدرسے کی خدمت کا خواہاں تھا، جو دارالعلوم دیوبند کی طرح سرکاری امداد اور سرکاری اثرات سے پاک ہو۔

مدرسہ شاہی مرادآباد میں

حسنِ اتفاق کہ جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مرادآباد میں ایک ایسے استاذ کی ضرورت ہوئی، جو درجاتِ علیا کی تعلیم دے سکے اور دیوبند کے اکابر خصوصاً حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مہتمم (۳) دارالعلوم دیوبند نے احقر کی سفارش فرمادی، حضرت مولانا محمد اعزاز علی صاحب نے، اِس سفارش کی تائید فرمائی اور مجھے تحریر فرمایا کہ اب ایسے مدرسے میں بھیجا جارہا ہے، جو علم کا مرکز ہے۔

احقر ۱۹۲۸ء کے مارچ میں مدرسہ شاہی پہنچا، یہ وہ زمانہ تھا کہ سائمن کمیشن ہندوستان پہنچ کر ناکام واپس ہوا تھا (۴)۔ مدرسہ شاہی کی فضا احقر کے مزاج کے مطابق تھی، دارالعلوم دیوبند کی طرح یہ مدرسہ بھی سرکاری امداد اور سرکاری اثرات سے پاک تھا، اِس مدرسے کے صدر المدرسین حضرت مولانا فخر الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ (۵) تھے جو بعد میں دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث اور جمعیۃ علماے ہند کے صدر ہوے۔

مولانا موصوف شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب کے خاص شاگرد اور سیاسی خیالات میں اُن کے پختہ معتقد تھے (آپ کو حضرت علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ سے بھی شرف تلمذ حاصل تھا اور حضرت علامہ کی تحقیقات علمیہ کا بڑا ذخیرہ آپ کے سینے میں محفوظ تھا) تحریکِ خلافت میں اگرچہ جیل نہیں گئے؛ مگر کام بہت کیا، زیادہ تر آپ ہی کی خدمات تھیں، جن کی وجہ سے مدرسہ شاہی نے، سیاسی تحریک کے سلسلے میں خاص امتیاز حاصل کیا۔

سیاسی تحریک میں شرکت کی ابتدا

یہی وہ زمانہ تھا جب تقریباً سات سال کی خاموشی کے بعد تحریک نے پھر کروٹ لینی شروع کی تھی ''بارڈولی'' (۶) میں ولبھ بھائی پٹیل (۷) نے لگان نہ ادا کرنے کی تحریک چلائی ۱۹۲۹ء شروع ہوا تو بیداری اور بڑھی، کلکتے میں بدیشی کپڑوں کو اکٹھا کر کے آگ لگائی گئی اور مارچ کے مہینے میں گاندھی جی نے نمک سازی کی تحریک کا اِعلان کردیا اور ''ڈانڈی'' (۸) کے مشہور مارچ سے تحریک میں تازہ روح پھونک دی، اُس وقت سوال یہ تھا

کہ مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیے۔ جمعیۃ علماے ہند نے اِس سوال پر غور کرنے اور مسلمانوں کی صحیح رہ نمائی کے لیے، امروہہ میں اجلاس کیا، مولانا معین الدین صاحب اجمیری رحمۃ اللہ علیہ اِس اجلاس کے صدر تھے۔

مسلمانوں میں ایک جماعت وہ تھی جو تحریکِ آزادی میں شرکت سے پہلے ہندو مسلم معاہدہ کو ضروری سمجھتی تھی؛ لیکن دوسری جماعت، جن کی سربراہ جمعیۃ علماے ہند تھی، اُس کا یقین یہ، تھا کہ جدوجہد آزادی ایسا فرض ہے، جو دوسرے برادرانِ وطن سے زیادہ مسلمانوں پر عائد ہوتا ہے، برادرانِ وطن اِس کو صرف سیاسی مسئلہ سمجھتے تھے؛ مگر مسلمانوں کے لیے اِس کی نوعیّت مذہبی مسئلے کی بھی ہے، جس کا مدار کسی معاہدے پر نہیں ہے، علاوہ ازیں وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ برطانیہ کے سیاسی اقتدار؛ بل کہ اُس کی سیاسی جبروت کے دور میں کسی متفقہ معاہدے کا تصور جوے شیر کے تصور سے کم نہیں ہے؛ چناں چہ جیسے ہی جمعیۃ علماے ہند نے امروہہ میں اِجلاسِ عام کا اِعلان کیا، دوسری جماعت، جمعیۃ علماے اسلام کے نام سے کھڑی ہوگئی اور اُس نے بھی اُنھی تاریخوں میں امروہہ میں اپنی جمعیۃ کا اِجلاس کیا۔

بہ ہر حال اِجلاسِ امروہہ نے مسلمانوں کو ہدایت کی کہ وہ کانگریس کے دوش بہ دوش تحریکِ آزادی میں گرم جوشی سے حصہ لیں اور اِس کے لیے کسی قربانی سے دریغ نہ کریں۔

جمعیۃ علما مرادآباد کی ذمے داری

احقر کو مدرسہ شاہی مرادآباد میں کام کرتے ہوے، ابھی ایک سال ہی ہوا تھا کہ سیاسی فضا میں یہ گرمی پیدا ہوگئی، اُس سال جمعیۃ علما مرادآباد کا بھی انتخاب ہوا تو احقر نائب ناظم بنایا گیا، کچھ دنوں بعد جمعیۃ علماے ہند نے شاردا ایکٹ کی تحریک چلائی، تو احقر نے پوری سرگرمی سے اُس میں حصہ لیا، حتیٰ کہ موٹو وغیرہ خود اپنے ہاتھ سے لکھے، ضابطہ کے لحاظ سے احقر جمعیۃ علماے ہند کے اِجلاس میں شریک نہیں ہوسکتا تھا؛ کیوں کہ اُس کا رُکن نہیں تھا؛ مگر احقر نے سفارشوں کے ذریعے پاس حاصل کرلیا اور اِجلاس میں شریک ہوکر علما کی بحث

سنی، کچھ قانون داں، وکیل اور ایک بیرسٹر صاحب اور ایک بڑے عالم جو سرکار کے حامی تھے، صدر کی اِجازت سے وہ بھی اِجلاس میں شریک ہوے اور جناب صدر نے اُن کو بھی بحث میں حصہ لینے کی اِجازت دی، اُنھوں نے کانگریس کے خلاف تقریریں کیں اور یہ کہ مسلمانوں کو اُس میں حصہ لینا نہیں چاہیے، اُن کے پیش کردہ دلائل اُن کی نظر میں مضبوط ہوں گے؛ مگر احقر کو نہایت لچر معلوم ہوے، جمعیۃ علما کے ارکان میں سے حضرت مولانا سید سلیمان صاحب ندوی اور مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب (۹)، حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی کی تقریروں نے احقر کو مُتأثر کیا، سید صاحب کی تقریر تاریخی اور سیاسی نوعیت کی تھی اور شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی نے مذہبی حیثیت سے روشنی ڈالی تھی، مولانا حفظ الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ اُس تجویز کے محرک تھے، آخر میں اُن کی تقریر بھی ہوئی؛ مگر وہ اُس وقت اتنے اونچے درجے کے مُقرِّر نہیں تھے، رات کو جلسۂ عام ہوا جس میں مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری صاحب کی تقریر ہوئی، غالبًا تین گھنٹے تک وہ تقریر جاری رہی، معلوم ہوتا تھا کہ آگ کے شعلوں کی بارش ہو رہی ہے، چیئرز نہیں ہوتے تھے؛ بل کہ مضطربانہ نعرے بلند ہوتے تھے، کچھ پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی، بہ ہر حال احقر جذباتی لحاظ سے اُس تقریر سے مُتأثِّر ہوا۔

اِجلاسِ امروہہ کے بعد سیاسی سرگرمیوں میں سرگرم حصہ

اِجلاس ختم ہوا اور احقر مرادآباد واپس ہوا اور حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ بھی مرادآباد تشریف لائے، احقر نے چاہا کہ اِجلاس اور جلسہ کی ہما ہمی کے علاوہ سکون اور اِطمینان کی صورت میں بھی حضرت شیخ سے استصواب کرے، چناں چہ احقر نے تنہائی میں حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ سے عرض کیا کہ کیا مجھے کانگریس میں شریک ہو جانا چاہیے اور تحریک میں حصہ لینا چاہیے؟ مولانا کا جواب لامحالہ اِثبات میں تھا، مزید فرمایا: یورپ خصوصاً گورنمنٹ برٹش نے، دنیا کے بہت سے ممالک کو اپنے تسلط اور چیرہ دستی کے شکنجے میں کس رکھا ہے اور برٹش کی یہ طاقت ہندوستان کی وجہ سے ہے، ہندوستان پر برٹش کی

گرفت کچھ بھی ڈھیلی پڑتی ہے، تو اُن کم زور ممالک پر بھی اِس کا اثر پڑتا ہے اور اُنھیں سانس لینے کا موقع ملتا ہے۔

حضرت شیخ کے اِس ارشاد کے بعد احقر کو پوری طرح انشراح ہوگیا؛ چناں چہ حضرت مولانا فخر الدین صاحب کا دست و بازو بن کر تحریک میں کام شروع کر دیا۔ چند روز میں پورے مراد آباد پر تحریک چھا گئی اور صوبہ سرحد کے بعد صرف شہر مراد آباد کی یہ خصوصیت تھی کہ یہاں کانگریس پر مسلمان چھائے ہوئے تھے، کچھ عرصے بعد مراد آباد میں یوپی کونسل کا ضمنی الیکشن ہوا، تو اس سے بائیکاٹ کی تجویز منظور کی گئی، اُس وقت انتخاب جداگانہ ہوتے تھے امیدوار ایک مسلمان صاحب تھے، تو ووٹر بھی مسلمان ہی تھے، جب پولنگ شروع ہونے کا وقت آیا تو ٹاؤن ہال کے راستوں پر ایک طرف مسلح پولیس کے پیادہ اور سوار جوان تھے دوسری جانب جمعیۃ علما کے رضا کار۔

احقر نے نمازِ فجر کے وقت سے شہر کا گشت کر کے اُن رضا کاروں کو بھیجا تھا، پولنگ شروع ہوا، تو دو گھنٹے بھی نہیں گزرے تھے کہ ہڑبونگ شروع ہوگئی، بے قابو مجمع میونسپلٹی کے دفتر میں گھس گیا، پولیس کو بہانہ مل گیا، اُس نے فائرنگ شروع کر دی، پھر لاٹھی چارج کے بہ جائے گھوڑے دوڑا دیے، احقر میدان میں تھا اور آخر تک وہاں رہا اور عجیب وغریب طرح سے گھوڑوں کی ٹاپوں اور فائرنگ کے چھروں سے بچا، فائرنگ بند ہوگئی، تو زخمیوں کو اُٹھوایا، عبد النبی ایسا مجروح ہوا کہ جاں بر نہ ہوسکا، دوسرے زخمی اچھے ہوگئے، پشاور میں قصہ خوانی بازار کی فائرنگ کے بعد، یہ یوپی میں پہلی فائرنگ تھی، اِس کے تقریباً دو ہفتے بعد احقر کو نیز حضرت مولانا فخر الدین صاحب کو گرفتار کرلیا گیا، ایک ایک سال کی سزا ہوئی؛ مگر مارچ ۱۹۳۰ء میں گاندھی، ارون پیکٹ ہوگیا، جس کی ایک شرط عام رہائی بھی تھی، چناں چہ تمام سیاسی اسیر رہا کر دیے گئے، ہم بھی سال ختم ہونے سے پہلے صرف ساڑھے پانچ ماہ بعد رہا ہوگئے۔

معاہدے کے بعد صرف ایک سال تک سیاسی فضا خاموش رہی؛ لیکن گول میز

کانفرنس کی ناکامی کے بعد گاندھی جی ابھی تک ہندوستان پہنچنے نہیں پائے تھے کہ نئے وائسرائے لارڈ لنگڈن کی تشدد پسند پالیسی کی وجہ سے تحریک پھر شروع ہوگئی، کانگریس کی طرح جمعیۃ علماے ہند کے ذمہ دار حضرات مولانا محمد کفایت اللہ صاحب مفتیِ اعظم ہند وصدر مولانا احمد سعید صاحب ناظم عمومی وغیرہ بھی گرفتار کر لیے گئے، کانگریس خلاف قانون قرار دی گئی، جمعیۃ علماے ہند خلاف قانون تو نہیں قرار دی گئی؛ مگر معاملہ اُس کے ساتھ ایسا ہی کیا گیا، دفتر پر بار بار چھاپا مارا گیا۔ تلاشی لی گئی، کانگریس نے ورکنگ کمیٹی اور صدر کے بہ جائے ڈکٹیٹر شپ جاری کی تھی، اسی طرح مرکزی جمعیۃ علما نے بھی ڈکٹیٹر بنانے کا سلسلہ شروع کر دیا، مرکزی جمعیۃ علما کے آٹھ ڈکٹیٹر گرفتار ہو چکے، تو احقر کو بھی اِس منصبِ جلیل پر فائز کیا گیا، ادھر پراونشل کانگریس کمیٹی نے صوبائی کانگریس کا ڈکٹیٹر احقر کو بنا دیا۔

مرادآباد سے دہلی آ کر جامع مسجد میں ہر جمعہ کو تقریر کی ڈیوٹی کی انجام دہی اور گرفتاری

اُس زمانہ میں ڈیوٹیاں مقرر کر دی گئی تھیں، جمعیۃ علما کے ہائی کمانڈ حضرت مولانا سجاد صاحب نے احقر کی ڈیوٹی یہ مقرر کی تھی کہ ہر جمعہ کو مرادآباد سے آ کر نماز جمعہ کے بعد جامع مسجد (دہلی) میں تقریر کرے اور فوراً واپس ہو جائے۔ کئی ہفتے اسی طرح کرتا رہا، بالآخر پولیس نے قابو پالیا اور احقر کو کوتوالی کے سامنے سے گرفتار کر کے حوالات میں بند کر دیا، یہ اگست کا مہینہ تھا، بارشیں ہو رہی تھیں، مگر تب بھی گرمی سخت تھی بالخصوص اُس ہال میں جس میں صرف ایک طرف دروازہ تھا، احقر کے علاوہ ۸ مولوی صاحبان اور طلبۂ عربی اور بھی تھے جو اس ہال میں بند کر دیے گئے تھے، صرف ایک گھنٹے کے لیے صبح کو ضروریات کے لیے باہر لایا جاتا تھا، وضو وغیرہ سب اندر کرنا ہوتا تھا، نالی نہیں تھی، تو آدھے ہال میں پانی بھر گیا، آدھے ہال میں فرشِ زمین پر آٹھ آدمیوں کے بستر ے تھے، اس وقت مقدمہ نہیں چلایا گیا؛ بل کہ ایک ہفتہ بعد نوٹس تعمیل کرایا گیا کہ چھ ماہ تک دہلی نہیں آ سکتے اور پولیس کی حراست میں

شاہدرہ پہنچا دیا گیا، رہائی کے بعد احقر مرادآباد پہنچا اور چند روز بعد کانگریس اور جمعیۃ علما کے پروگرام کے بہ موجب ایک ہاتھ میں کانگریس کا اور دوسرے میں جمعیۃ علما کا جھنڈا لگا کر دفعتاً چوک میں نمودار ہوا، کانگریس اور جمعیۃ علما کے ممبر اور رضا کار جو اِدھر اُدھر مکانوں اور دوکانوں میں چھپے ہوے تھے، وہ بھی نکل آئے اور جلوس بنا کر مارچ شروع کر دیا، یہ جلوس تقریباً دو فرلانگ چلا تھا کہ پولیس نے آ کر قائدِ جلوس (احقر) کو گرفتار کرلیا، پھر لاٹھی چارج کر کے جلوس کو منتشر کر دیا؛ لیکن اگلے روز سترہ کارکن گرفتار کر لیے، جو کانگریس کے لیڈر تھے۔ مقدمہ جیل میں بھی چلا؛ مگر پالیسی یہ تھی کہ پیروی نہ کی جائے؛ لہٰذا کیدار ناتھ صاحب بیرسٹر جو اَز راہِ ہمدردی پیروی کے لیے تشریف لے آئے تھے، اُن کو بھی ہم نے واپس کر دیا، اِس کے بعد جب رہائی ہوئی، تو تحریک نے نیا رنگ اختیار کر لیا تھا، اُس وقت جو اختیارات ہندوستان کو دیے گئے تھے، اگر چہ وہ اطمینان بخش نہیں تھے؛ مگر کانگریس کی اکثریت نے الیکشن میں حصہ لینا طے کر لیا تھا، چناں چہ اِسی کے نتیجے میں غالباً ۱۹۳۷ء میں کانگریس کی وزارتیں قائم ہوگئیں؛ لیکن تقریباً دو سال بعد ہٹلر نے حملہ کر کے یوروپ میں جنگ شروع کر دی، برٹش اس کا حریف تھا، برطانیہ عظمیٰ نے ہندوستان کی رائے لیے بغیر، ہندوستان پر بھی جنگ مسلط کر دی، کانگریس اور جمعیۃ علماے ہند دونوں جماعتوں نے اِس کی مخالفت کی اور عملی طور پر گاندھی جی نے، انفرادی ستیہ گرہ کا پروگرام تجویز فرما دیا۔

''علماے ہند کا شان دار ماضی'' کی اِشاعت اور ضبطی

اُسی زمانے میں احقر کی کتاب ''علماے ہند کا شان دار ماضی'' طبع ہوئی، جو ضبط کی گئی، پریس بھی ضبط کر لیا گیا، مصنف کو گرفتار کر کے معمولی ضمانت پر رہا کر دیا گیا، احقر محمد میاں انفرادی ستیہ گرہ کے سلسلے میں نہیں؛ بل کہ اُس کتاب کے سلسلے میں گرفتار ہو کر سزایاب ہوا۔ مرادآباد کانگریس نے احقر کی سزایابی کو تحریک کے سلسلے میں شمار کیا۔

''شان دار ماضی'' کی تصنیف کے مقصد دو تھے: اول یہ کہ سیاسی تحریک میں علما کی شرکت کو علما کی شان کے خلاف ایک طرح کی بدعت قرار دیا جا رہا تھا۔ اس کتاب میں ظاہر

کیا گیا ہے کہ علما نے ہر دور میں اُس دور کی سیاست کے مطابق عملی حصہ لیا اور سزائیں بھگتی ہیں؛ لہٰذا اِس دور میں اِس دور کے تقاضے کے مطابق، تحریک میں حصہ لینا علما کی شان کے خلاف نہیں؛ بل کہ اُن کی تاریخی روایات کو زندہ کرنا ہے، دوسرا مقصد تحریکِ آزادی کو تقویت دینا تھا؛ اِسی لیے اُن مظالم کی تاریخ بیان کی گئی تھی، جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے آغاز سے اِس وقت تک انگریزوں نے کیے تھے، اِس مقدمہ میں، طویل سزا ہوسکتی تھی مگر چوں کہ جو کچھ لکھا گیا تھا، وہ شائع شدہ کتابوں کے حوالے سے لکھا گیا تھا اور وکلا صاحبان نے مجسٹریٹ صاحب کو یہ ذہن نشین کرادیا تھا کہ مطبوعہ اور شائع شدہ مستند حوالے سے جو بات بیان کی جائے وہ تاریخی حیثیت رکھتی ہے، وہ قابلِ اعتراض نہیں۔ اِس کے علاوہ چند الفاظ جو فی الواقع مُہَذَّب تصنیف میں آنے کے قابل نہیں تھے اور جذبات کی رو میں احقر سے لکھ گئے تھے، اُن الفاظ سے احقر نے تحریری معذرت پیش کردی تھی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صرف تابرخواست اجلاس احقر کو سزا دی گئی، اِس طرح پولیس کی بات بھی رہ گئی۔

۱۹۴۲ء میں گرفتاری اور جیل اور ۱۹۴۴ء میں رہائی

۸/اگست ۱۹۴۲ء کو وہ تحریک شروع ہوئی، جس کا نام کوئٹ انڈیا، والی تحریک مشہور ہوا۔ اُس وقت پالیسی یہ تھی کہ کام خفیہ طور سے کیا جائے اور جہاں تک ممکن ہو، اپنے آپ کو بچایا جائے، چناں چہ جیسے ہی احقر کو معلوم ہوا کہ مرادآباد میں گرفتاریاں ہورہی ہیں، احقر مرادآباد سے باہر نکل آیا، اول ایک گاؤں میں رہا، پھر دہلی پہنچ کر مجلسِ عاملہ کے اجلاس میں مدعو خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی، پھر مجلس عاملہ کی تجویز جس میں تحریکِ آزادی میں شرکت کے لیے مسلمانوں کو اُبھارا گیا تھا، چھپوا کر اُس کی تقسیم کرنے کے لیے، یوپی کا دورہ کیا، بہار جانے کا ارادہ تھا؛ مگر بارش اور تحریک کے کارکنوں نے ریلوے لائن کو اِس درجہ خراب کردیا تھا کہ مغل سرائے سے آگے گاڑیاں نہیں جارہی تھیں، مجبوراً واپس ہوا، دہلی میں قیام مشکل تھا خصوصاً اِس بنا پر کہ یہاں کی پولیس کو احقر کے متعلق خیال ہوگیا تھا کہ بم بنانے والی پارٹی سے میرا تعلق ہے؛ لہٰذا دوسرے مقامات سے گم نام ہینڈ بل اور پمفلٹ شائع

کرنے شروع کیے، کچھ کاربن سے لکھ کر خاص خاص مرکزوں میں بھیجا کرتا تھا، اِسی طرح کا ایک پمفلٹ پشاور پہنچ گیا، وہاں کالج کے نوجوانوں نے میرے نام کے حوالے سے، اس کو چھپوا کر تقسیم کیا، وہ مضمون یوپی کی پولیس کو مل گیا، یا صوبہ سرحد کی پولیس نے بھیجا، بہ ہر حال اِس طرح کی سرگرمیوں کی بنا پر اکتوبر ۱۹۴۲ء میں گرفتار کرلیا گیا۔

شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی ایک تقریر کی بنا پر جو آپ نے بچھراؤں، ضلع مرادآباد میں کی تھی، اپریل ۱۹۴۲ء میں گرفتار کر لیے گئے تھے، اُس وقت کانگریس کی پالیسی یہ تھی کہ گرفتاری کے خلاف مقدمہ کی پیروی کی جائے، حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی مرادآباد جیل کی حوالات میں تھے، نہ صرف اِس مقدمہ؛ بل کہ اِس طرح کے تمام مقدمات کی پیروی احقر نے اپنے ذمے لے رکھی تھی، اِس پیروی کا نتیجہ کچھ بھی نہیں ہوتا تھا؛ کیوں کہ جج حکومت کی منشا کے مطابق فیصلہ کیا کرتے تھے؛ مگر یہ نتیجہ ظاہر تھا اور مقصود تھا کہ لوگوں میں جذبات پیدا ہوں اور بڑھیں۔ حضرت مولانا کے مقدمے میں بحث کے لیے مسٹر آصف علی سے احقر نے درخواست کی، اُنھوں نے منظور فرمالی اور مرادآباد پہنچ کر کٹہرۂ عدالت میں تقریباً چار گھنٹے مسلسل تقریر کی، مرادآباد کے تمام وکلا اس بحث کو سننے کے لیے، اس عدالت میں سمٹ آئے تھے، بہ ہر حال اس شان دار بحث کے باوجود فیصلہ میں چھ ماہ کی سزا با مشقت تجویز کی گئی۔ ابھی حضرت شیخ کی یہ سزا ختم نہیں ہوئی تھی کہ ۸/اگست آ گیا اور مجاہدِ ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب، حافظ محمد ابراہیم صاحب نگینوی (جو کانگریس گورنمنٹ کے وزیر رہ چکے تھے اور آیندہ وزیر ہونے والے تھے) قاری عبداللہ صاحب مرحوم مولانا محمد اسماعیل سنبھلی، منشی معین الدین صاحب سنبھلی، محمد ابراہیم صاحب مالک کارخانہ بیڑی مرادآباد وغیرہ، حضرت شیخ کے پاس پہنچ گئے، پھر احقر حاضرِ خدمت ہوگیا، تھوڑے دنوں یہ مجمع مرادآباد جیل میں رہا، پھر کچھ کو رہا کر دیا گیا، جو باقی رہے اُن کو منتشر کر دیا گیا، حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی کو نینی سینٹرل جیل اور مولانا حفظ الرحمٰن صاحب اور احقر محمد میاں کو بریلی سنٹرل جیل بھیج دیا گیا، تقریباً دو سال گزارنے کے بعد

۱۹۴۴ء کے اکتوبر میں رہائیاں شروع ہوئیں، پہلے احقر پھر مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب، پھر حضرت مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ رہا ہوے، اِس کے بعد گرفتاری کی نوبت نہیں آئی، تقریباً دو سال تک صوبائی کونسلوں پھر مرکزی اسمبلی کے انتخابات رہے، جو مسلم لیگ کے شدید مقابلے کی بنا پر نہایت سخت تھے، مسلم لیگ کے مقابلے کے لیے جمعیۃ علما اور نیشنلسٹ مسلمانوں نے مسلم پارلیمنٹری بورڈ قائم کیا، جس میں جمعیۃ علما کے علاوہ مجلسِ احرار اسلام، مسلم مجلس، صوبہ سرحد کے خدائی خدمت گار، مومن کانفرنس وغیرہ آزادی پسند جماعتیں شریک تھیں۔ احقر کبھی کسی سیٹ کا امیدوار تو نہیں بنا؛ مگر تمام امیدواروں کی خدمت دفتری حیثیت میں احقر کی زیرِ نگرانی تھی، یہ ہنگامے ۱۵/اگست ۱۹۴۷ء کے یومِ آزادی پر ختم ہو گئے، جس کے بعد فرقہ واریت کے وہ ہنگامے شروع ہو گئے، جو آج تک ختم نہیں ہوے، اُن کی داستان طویل بھی ہے اور دردناک بھی، اُن ہنگاموں نے خدمات کا ایک نیا باب قائم کیا، جس کا عنوان ریلیف ہے، یعنی کشتگانِ ستم کو دفنانا، مجروحوں کے جسم پر دوا کی پٹیاں باندھنا اور زخمی دلوں پر تسکین اور دل داری کا مرہم لگانا، اُجڑے ہوؤں کو بسانا اور ان کاموں کے لیے لوگوں سے بھیک مانگنا، پھر مظلوموں اور اُن کی ضرورتوں کو پہنچانا اور بہ تقاضاے حالات، اُن کی امداد کرنا۔ احقر نے ان خدمات میں بھی حصہ لیا؛ مگر ان کو کہاں تک بیان کیا جائے:

عمر بگذشت وحدیثِ دردِ ما آخر نہ شد
شب آخر شد اکنوں کوتاہ کنم افسانہ را

مختصر تذکرہ خدمات جمعیۃ علماے ہند کے متعدد نمبروں میں، اس کے علاہ علماے حق جلد دوم میں اِن سب واقعات کا تذکرہ ہے، جو ملاحظہ فرمایا جائے۔

حواشی

(۱) پیدائش: ۱۳۰۲ھ/۱۸۸۴ء۔ وفات: ۱۴/ربیع الاول ۱۳۷۳ھ مطابق ۲۲/نومبر ۱۹۵۳ء

(۲) مولانا مفتی محمد سہول بھاگل پوریؒ شیخ الہند کے شاگرد تھے، دارالعلوم میں بھی تین سال صدر

مفتی رہے تھے، وفات ۱۳۶۷ھ/ ۱۹۴۸ء۔ (امینی)

(۳) متوفی ۴/رجب ۱۳۴۸ھ۔

(۴) برطانوی حکومت کا یہ کمیشن ۳/فروری ۱۹۲۸ء کو ممبئی کے ساحل پر اُترا، اور ۳۱/مارچ ۱۹۲۸ء کو ناکام واپس ہوا۔

(۵) پیدائش: ۱۳۰۷ھ/ ۱۸۸۹ء، وفات: ۲۰/صفر ۱۳۹۲ھ مطابق ۵/اپریل ۱۹۷۲ء۔ (امینی)

(۶) گجرات کے ''سورت''، ضلع کا ایک قصبہ۔

(۷) سردار ولبھ بھائی پٹیل (۱۸۷۵-۱۹۵۰ء)

(۸) ضلع ''نوساری''، صوبہ گجرات کا ایک قصبہ۔

(۹) پیدائش: ۱۲۹۲ھ/ ۱۸۷۵ء، وفات: ۱۳/ربیع الثانی ۱۳۷۲ھ مطابق ۳۱/دسمبر ۱۹۵۲ء

خودنوشتِ بےنوا

حضرت مولانا سیّد محمد میاں صاحب، شیخ الحدیث مدرسہ امینیہ دہلی

محترم مدیر(ا) روزنامہ الجمعیۃ کا اصرار اور شدید اصرار ہے کہ ”محمد میاں“ کچھ حالات لکھے، کیونکہ جمعیۃ علماء ہند کے ناظمِ عمومی حضرات کے چیدہ چیدہ حالات وہ اس نمبر میں شائع کررہے ہیں اور ناظمِ عمومی صاحبان کی فہرست میں ایک نام ”محمد میاں“ بھی ہے، یہ فرمائش ہے میرے کرم فرما کی، مگر محمد میاں حیران ہے کہ کیا لکھے! ایک بےنوا بے مایہ کے ایسے حالات کیا ہیں کہ اُن کو زیبِ قرطاس کیا جائے پھر نظامت عمومی کے منصب کو صرف ایک سال کی عمر نصیب ہوئی، یہ پورا سال انتخابات جمعیۃ علماء کی ہنگامہ خیزیوں کی نذر ہوگیا، تعمیر کی توفیق تو کیا ہوتی اس پورے سال میں کوئی تخریبی حادثہ بھی پیش نہ آیا جس میں کوئی قابلِ ذکر خدمت کی جاتی ! !

البتہ مقامِ شکر ہے کہ اِس کمزور ونحیف کو اپنی کمزوریوں کا احساس میسر آیا اُس نے اپنے عہدہ سے چمٹے رہنے کے لیے اپنی کمزوریوں پر پردہ ڈالنا گوارہ نہیں کیا بلکہ اصرار کرکے اس منصب سے سبکدوشی حاصل کی، پھر یہ منصب اُس کے سپرد کیا گیا جس کو اللہ تعالیٰ نے اس کی اہلیت عطا فرمائی تھی، حضرات اراکین اگرچہ احقر کے بھی مخالف نہیں تھے مگر ان کے جذبات اس کے ساتھ تھے جس کو جنابِ صدر نے اس منصب کے لیے نامزد فرمایا یعنی نوجوان صالح مولانا اسعد صاحب زادت مزایاہ، بہرحال یہ درست ہے کہ نظامت کا لیبل احقر پر تقریباً ۳۵ سال تک چسپاں رہا۔

تبلیغ اور جمعیۃ :

۱۹۲۹ء میں جمعیۃ علماء ہند کا اجلاس امروہہ ہوا جس میں شرکتِ کانگریس کا

ریزورلیشن پاس کیا گیا اس اجلاس سے کچھ پہلے جمعیۃ علماء شہر مراد آباد کی مجلسِ منتظمہ کا اجلاس ہوا جس میں احقر کو جمعیۃ علماء شہر مراد آباد کا نائب ناظم منتخب کیا گیا کچھ دنوں بعد نائب کے بجائے ناظم بنا دیا گیا۔ اُس وقت نظامِ جمعیۃ علماء میں صوبہ آگرہ الگ تھا اور اودھ علیحدہ اور اُس زمانہ میں تبلیغ کا سلسلہ بھی جمعیۃ علماء سے وابستہ کیا گیا تھا تو احقر کو جمعیۃ علماء صوبہ آگرہ کا ناظم تبلیغ بنا دیا گیا۔

لطیفہ :

اس موقع پر ایک لطیفہ قابلِ ذکر ہے :

''سید طفیل احمد صاحب علیگ (۲) احقر کے خاندانی بزرگ تھے اگر چہ رشتہ دُور کا تھا مگر وہ میرے عم بزرگ ہوتے تھے، ایک کانفرنس میں وہ تشریف لائے تھے اور احقر بھی وہاں پہنچا تھا، احقر نے اپنے مشاغل بیان کرتے ہوئے کسی قدر فخر کے ساتھ اپنے منصب کا ذکر کیا کہ احقر ناظم تبلیغ ہے، توقع تھی کہ عم محترم خوش ہوں گے، خدمتِ تبلیغ کو احقر کے لیے سعادت قرار دیں گے، مگر خلافِ توقع سیّد صاحب یہ بات سنتے ہی برافروختہ ہو گئے۔

''یہ زمانہ جنگِ آزادی کا ہے، تم تبلیغ لیے پھر رہے ہو ''

لیجئے، جڑ ہی کٹ گئی نخلِ آرزو کی ''

اسی طرح ایک اور لطیفہ یاد آ گیا یہ ۱۹۳۸ء کا واقعہ ہے جب حضرت مولانا عبید اللہ سندھی پر سے پابندی ہٹی تھی اور وہ تقریباً بیس سال بعد ہندوستان واپس ہوئے تھے، اُس وقت احقر کی زیرِ ارادت مراد آباد سے رسالہ ''قائد'' نکلتا تھا اُس میں حضرت مولانا محمد میاں منصور انصاریؒ کے مضامین بھی شائع ہوتے تھے۔ مولانا منصور انصاریؒ بھی ان میں تھے جو'' ریشمی رومال'' کی خفیہ تحریک کے سلسلہ میں جلاوطن تھے، ہندوستان میں ان کا داخلہ تو بند تھا البتہ مختلف ذرائع سے ان کے مضامین پہنچ جاتے تھے جو حکومتِ الٰہیہ کے متعلق ہوتے تھے آپ نے اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ایک دستور بھی مرتب فرمایا تھا جس کا عنوان تھا ''امامتِ اُمت کا دستورِ اساسی'' یہ رسالہ ''قائد'' میں شائع ہوا۔ احقر نے یہ رسالہ حضرت

مولانا سندھی کی خدمت میں پیش کیا اوّل وہ رسالہ کی کتابت اور طباعت وغیرہ کی تعریف کرتے رہے مگر جیسے ہی ان کی نظر اس مضمون پر پڑی، غصہ میں رسالہ کو پٹک دیا اور فرمایا:

''انگریز جانتا ہے کہ نہ اس عنوان میں انقلاب برپا کرنے کی طاقت ہے نہ اس طرح کے دستور میں، حکومتِ الٰہی محض جذباتی تصور ہے اس سے صرف یہ کام لیا جاسکتا ہے کہ تحریکِ آزادی میں شریک ہونے سے لوگوں کو روکیں، اس کے ذریعہ آزادی ہرگز نہیں حاصل کی جاسکتی اسی لیے انگریز بھی ایسے مضامین کی گرفت نہیں کرتا۔''

گرفتاریاں :

بہر حال ناظمِ تبلیغ کے بعد احقر جمعیۃ علماء صوبہ آگرہ پھر پورے صوبہ متحدہ کی جمعیۃ علماء کا ناظم ہو گیا کانگریس کا باقاعدہ ممبر بننے کے چند ہفتے بعد ہی احقر گرفتار ہوا اُس وقت حضرت مولانا سیّد فخر الدین احمدؒ (سابق صدر جمعیۃ علماءِ ہند) نے بھی احقر کا ساتھ دیا۔

اس کے بعد احقر ۱۹۳۲ء میں پہلے دہلی پھر مراد آباد میں گرفتار ہو کر سزایاب ہوا پھر ۱۹۴۰ء میں یہ شرف حاصل ہوا۔

۱۹۴۲ء کی تحریک میں آخری بار گرفتار ہوا اور مراد آباد جیل میں پہنچا تو وہاں حضرت شیخ الاسلام مولانا سیّد حسین احمد مدنی، مجاہد ملت مولانا محمد حفظ الرحمٰن، حافظ محمد ابراہیم صاحب سابق وزیر حکومت ہند مولانا قاری عبد اللہ صاحب، حاجی محمد ابراہیم صاحب (بیڑی نمبر ۷۸۸) منشی معین الدین صاحب سنبھلی وغیرہ پہلے سے موجود تھے یہ اجتماع بہت بہتر تھا مگر افسوس زیادہ عرصہ نہیں رہا تقریباً چھ ماہ بعد مختلف ریاستوں کی جیلوں میں ہمیں منتقل کر دیا گیا۔
اُس زمانہ میں احقر جمعیۃ علماء صوبہ کا ناظم تھا اور مجاہدِ ملت ناظمِ عمومی، جیل خانہ میں حضرت کی ڈاک کا سلسلہ متوسلین کی کوششوں سے برابر جاری رہتا تھا حضرت احقر کو ''گورنر'' اور مجاہدِ ملت رحمت اللہ کو ''وائسرائے'' لکھا کرتے تھے مراد آباد کے اجتماع پر ''چرخِ کج رو'' کو رشک آیا چنانچہ پہلے حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کو نینی جیل الہ آباد منتقل کیا گیا یعنی ہم سب کے مشفق مربی کو ہم سے جدا کر دیا جس کا صدمہ ہر ایک کو حتی کہ حافظ محمد ابراہیم صاحب مرحوم کو بھی ایسا ہوا کہ

چیخیں نکل گئیں پھر حافظ صاحب، قاری صاحب وغیرہ رفقاء رہا کردیے گئے۔

محمد میاں اور مجاہدِ ملت کو بریلی سنٹرل جیل بھیج دیا گیا، جب تقریباً ڈیڑھ سال بعد رہائی کا وقت آیا تو حکومت نے گویا رہائی میں چھوٹے بڑے کی پوری رعایت کی، سب سے پہلے سب سے چھوٹے شخص محمد میاں کو رہا کیا گیا، تقریباً دو ماہ بعد حضرت مجاہدِ ملت کو پھر تقریباً ایک ماہ بعد حضرت شیخ الاسلام قدس اللہ سرہ العزیز کو جیل سے رہائی ہوئی تو کرپس مشن کی آمد اور لیگ اور کانگریس کی گفتگو کے ہنگامے رہے پھر انتخابات کا دور آ گیا۔ مجاہدِ ملت زمانۂ اسارت میں احقر سے اتنے مانوس ہو گئے تھے کہ پھر احقر کو اپنی قید سے رہا کرنا گوارا نہ کیا۔

دلی آمد :

۱۹۴۵ء میں حضرت شیخ الاسلامؒ کو ساتھ لے کر مراد آباد پہنچے اور مدرسہ شاہی کے مہتمم حضرت مولانا عبدالحق صاحب مدنی (۳) اور صدر مدرس حضرت مولانا سیّد فخر الدین احمد صاحب رحمہما اللہ سے اصرار کر کے مدرسہ شاہی سے چھ ماہ کی رُخصت دلوائی اور دہلی لے آئے۔ حضرت مجاہدِ ملت (۴) تیار نہیں تھے مگر احقر کو سلسلہ درس ترک کرنا گوارا نہیں تھا لہٰذا چھ ماہ بعد واپس ہو گیا۔

افضل ترین جہاد :

لیکن چند روز بعد ۱۹۴۷ء کا مشہور ہنگامہ ہو گیا، ابتداء ہنگامہ میں تو حالت یہ تھی کہ دہلی میں کسی طرف سے بھی کسی مسلمان کا آنا خودکُشی کے مرادف تھا لیکن جیسے ہی دہلی پہنچنے کا موقع ملا، احقر دہلی آ گیا اور یہاں آ کر محسوس کیا کہ اِس وقت جو خدمت مجاہدِ ملت انجام دے رہے ہیں وہی بہترین خدمت بلکہ افضل ترین جہاد ہے اور اس وقت مجاہدِ ملت کی مدد کرنا درس و افتاء سے کہیں زیادہ افضل ہے لہٰذا احقر نے دہلی ہی میں اُس وقت تک قیام کا ارادہ کر لیا جب تک مجاہدِ ملتؒ کو ضرورت ہو، اس طرح تقریباً چودہ سال گزر گئے۔

مجاہدِ ملتؒ نے بارہا فرمایا کہ وہ نظامتِ عُلیا سے سبکدوش ہونا چاہتے ہیں یہ ذمہ

داری احقر منظور کر لے مگر احقر کا جواب یہی ہوتا تھا کہ احقر اپنی اُفتادِ طبع کے لحاظ سے مدرس ہے آپ کی امداد کے لیے خدمتِ درس ترک کیے ہوئے ہے نظامت سے طبعاً دلچسپی نہیں ہے آپ کو اگر امداد کی ضرورت نہیں ہے تو احقر کا مقام مدرسہ شاہی ہے نظامتِ عُلیا نہیں، بہرحال نتیجہ یہ ہوا کہ " آں قدح بشکست وآں ساقی نماند "

ناظم اعلیٰ :

حضرت مجاہد ملت ملتؒ نے زمانہ مرض میں از خود احقر کے متعلق قائم مقامی کا اعلان کرا دیا تھا، مرحوم کی وفات کے بعد احقر نے ایک سال تک اس اعلان کا احترام کرتے ہوئے یہ خدمت انجام دی پھر اللہ تعالیٰ نے یہ صورت پیدا کر دی کہ احقر اسی منصب پر واپس ہو گیا جس منصب سے ہٹا کر حضرت شیخ الاسلامؒ اور حضرت مجاہدِ ملتؒ احقر کو لائے تھے۔

تدریس:

احقر کا پیشہ مدرسی رہا اگرچہ بیس سال ایسے گزرے کہ قید و بند یا جمعیۃ علماء کی خدمت کی وجہ سے احقر اس پیشہ پر قائم نہیں رہ سکا مگر پھر خدا نے توفیق عطا فرمائی کہ **قال اللّٰہ و قال الرسول** کے حلقہ میں احقر حاضر ہو گیا۔ بہت بڑا اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم یہ بھی ہے کہ احقر کو اپنے پیشہ کے لیے کبھی درخواست نہیں، کرنی پڑی، دارالعلوم دیوبند کا طالب علم رہا فراغت ہوئی۔تو حضرت الاستاذ و مولانا اعزاز علی صاحب، حضرت علامہ سیّد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند نے احقر کو آرہ شاہ آباد صوبہ بہار بھیج دیا وہاں مدرسہ حنفیہ آرہ میں مدرس کی حیثیت سے احقر نے خدمت انجام دی وہاں تین سال قیام رہا۔

مدرسہ شاہی مرادآباد میں:

پھر ان بزرگوں نے مدرسہ شاہی مرادآباد کی خدمت کے لیے مرادآباد بھیج دیا جہاں سولہ سال قیام رہا اور حضرت شیخ الاسلام اور حضرت مجاہدِ ملت رحمہما اللہ احقر کو جمعیۃ علماء ہند کی خدمت کے لیے دہلی لے آئے۔

مدرسہ امینیہ دہلی میں:

آخری سال جب حضرت مجاہدِ ملت بیمار تھے مدرسہ امینیہ کے مہتمم مولانا حفیظ الرحمٰن صاحب واصف نے احقر سے مدرسہ امینیہ کے لیے مدد چاہی کہ مدرسہ کے صدر مدرس بیمار ہیں ایک مدرس حج کے لیے تشریف لے گئے ایک رُخصت پر پاکستان گئے ہوئے ہیں مدرسہ میں درس حدیث کے لیے کوئی نہیں ہے احقر سے فرمائش کی کہ یہ خدمت احقر انجام دے، احقر نے اعزازی طور پر یہ خدمت منظور کر لی اور درس شروع کرادیا یعنی بلا جدوجہد اللہ کے فضل وکرم سے اپنے سابقہ پیشہ پر لوٹ آیا، ایک سال تک اعزازی خدمت انجام دیتا رہا پھر جناب مہتمم صاحب اور حضرات اراکین نے اصرار فرما کر دوامی خدمت کا وعدہ لے لیا الحمدللہ احقر یہ وعدہ پورا کررہا ہے۔

یہ تحریر طویل ہوگئی، مدیر محترم ''الجمعیۃ'' کی فرمائش پوری کرنے کے لیے کافی ہے باقی حالات زندگی لکھنا احقر کا کام نہیں ہے، اگر کوئی لکھنا چاہے گا تو وہ احقر کے مندرجہ ذیل مضامین دیکھ لے۔

حضرت شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق مضمون جو ''شیخ الاسلام نمبر'' میں شائع ہوا، نیز مجاہدِ ملت رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق مضمون جو ''مجاہدِ ملت نمبر'' میں شائع ہوا۔ اور حضرت مولانا فخر الدین رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق مضامین جو ''مسلم محبانِ وطن'' کے سلسلہ میں شائع ہوا اور احقر کی بیاض۔ وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ.

حواشی

(۱) مولانا محمد عثمان فارقلیط (۲) مصنف ''مسلمانوں کا روشن مستقبل''

(۳) یہ مدرسہ شاہی کے مہتمم اور حضرت دادا جانؒ کے ''سمدھی'' ہوئے، حضرت والد صاحبؒ کے ''خسر'' (محمود میاں غفرلہٗ) [نبیرہ مولانا سید محمد میاں وشیخ الحدیث جامعہ مدنیہ لاہور]

(۴) حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ

(اشاعت خصوصی روزنامہ الجمعیۃ دہلی، اجلاس بست وسوم جمعیۃ علماء ہند دلی ۲۹/اپریل ۱۹۷۲ء)

نقوش حیات سید الملت :

تذکرہ سید الملت حضرت مولانا سید محمد میاں دیوبندیؒ

مولانا سید ساجد میاں بن مولانا سید محمد میاں دیوبندیؒ

خاندان وولادت

دارالعلوم کے شہر دیوبند سے باہر ریلوے اسٹیشن کے قریب ایک بستی ''سرائے پیر زادگان'' کے نام سے واقع ہے۔ بستی کے کنارے ''دادے پیر کی قبر'' ہے۔ یہ ''دادے پیر'' سلسلہ قادریہ کے ایک سید خاندان کے بزرگ ''سید محمد ابراہیم'' ہیں جو گیارہویں صدی ہجری کے اوائل میں بعض اہل اللہ کے مشورے سے دیوبند تشریف لائے اور تبلیغ ورشد وہدایت کا کام شروع فرمایا۔ آپ کی شخصیت جانی پہچانی اور مرجع خلائق تھی۔ آپ کے دادا ''سید محمد قلندر'' مغل بادشاہ بابر کے زمانہ میں فرغانہ (افغانستان) سے تشریف لاکر لکھنؤ میں مقیم ہوئے تھے۔ لکھنؤ میں ''ٹیلہ والی مسجد'' کے پاس آپ کا مزار ہے۔ سید ابراہیمؒ کے قیام اور تعلیم کے لیے دہلی کی مرکزی حکومت نے مسجد اور خانقاہ تعمیر کرائی، بعد میں مغل بادشاہوں شاہجہاں، جانگیر اور اورنگ زیبؒ کی طرف سے طلباء کے مصارف کے لیے زمینیں دی گئیں جن کی تصریح شاہی فرامین میں موجود ہے۔ سید محمد ابراہیم نے ۱۰۴۲ھ میں وفات پائی۔

سید محمد ابراہیمؒ اور سیدنا حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے درمیان ۳۰ واسطے ہیں۔ سید صاحبؒ کے خاندان میں جو دیوبند کے سادات خاندانوں میں سب سے بڑا ہے۔ سیدؒ کی ساتویں پشت میں سید منظور محمد تھے جو سرکاری ملازم اور سرائے پیرزادگان میں مقیم تھے، ان کے گھرانہ میں ۱۲؍رجب ۱۳۲۱ھ (مطابق ۴؍اکتوبر ۱۹۰۳ء) ایک صاحبزادے کی ولادت ہوئی۔ نام محمد میاں رکھا گیا۔ تاریخی نام مظفر میاں نکلا۔ سید منظور صاحب کا سرکاری ملازمت

کے سلسلہ میں مختلف علاقوں میں تبادلہ ہوتا رہتا تھا۔ اہلِ خانہ ساتھ ہوتے تھے۔ تبادلہ ہر چھ ماہ کے بعد ہوتا تھا۔ صاحبزادے جب پانچ چھ سال کے ہوئے تو تعلیم کی فکر ہوئی۔ جس گاؤں میں والد صاحب کی ڈیوٹی تھی وہاں کوئی مکتب نہیں تھا، اس لیے نانی صاحبہ نے یہ ذمہ داری سنبھالی اور بسم اللہ کرا دی۔ نانی صاحبہ بیوہ اور دو بچوں کی ماں تھیں۔ شوہر کا انتقال ہوا تو بچے چھوٹے تھے، بیوگی کے عالم میں دونوں بچوں کی پرورش کی۔ یہ دو بچے ایک لڑکی جو صاحبزادے کی والدہ اور دوسرے ماموں سید بشیر احمد تھے۔ نانی صاحبہ صالح اور صابر و شاکر خاتون تھیں۔ صوم وصلٰوۃ کی پابندی کے علاوہ اوراد وظائف کا بھی معمول تھا اور رات کو سونے سے پہلے سورہ الملک اور غالباً سورۃ الواقعہ اور ایک طویل مناجات پڑھنے کا معمول تھا جس میں اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام آتے ہیں۔

ابتدائی تعلیم

کچھ عرصہ بعد سید منظور صاحب کا تبادلہ ضلع بلند شہر کے موضع ٹنڈ ھیرہ، ہوگیا جہاں ایک مکتب میں صاحبزادے کو داخل کیا گیا، پھر دوسرے قصبہ میں تبادلہ ہوا تو یہ مکتب بھی چھوٹ گیا۔ وہاں ایک خلیل احمد صاحب تھے جو فارسی کی بہت اچھی استعداد رکھتے تھے، اگر چہ پیشہ سے چرم دوز تھے۔ ان کے پاس رہ کر فارسی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ یہ سب انتظامات عارضی اور غیر کافی تھے، اس لیے سید منظور صاحب نے صاحبزادے کی تعلیم کی خاطر اہلِ خانہ کو مستقل طور پر دیوبند میں ہی بھیج دیا۔ اگر چہ گھر کا ماحول ایسا تھا جس کے پیش نظر صاحبزادے کو انگریزی سرکاری اسکول میں داخل کیا جاتا، لیکن سید منظور محمد صاحب کی آمدنی اتنی نہیں تھی کہ اسکول کی تعلیم کے مصاریف کی متحمل ہوسکتی، اس لیے صاحبزادے کو دارالعلوم کے درجہ فارسی میں داخل کر دیا گیا جہاں کوئی فیس نہیں تھی۔ یہ ۱۹۱۶ء کا واقعہ ہے۔ ۱۳۴۳ھ/ ۱۹۲۵ء میں دورہ حدیث سے فراغت ہوئی۔ دورہ حدیث حضرت العلامہ مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ (م: ۱۳۵۲ھ) سے پڑھا۔ آپ مولانا کشمیریؒ کے ممتاز تلامذہ میں شمار ہوتے تھے اور علمی ذوق وشوق استاد محترم سے ورثہ میں ملا تھا۔ حضرت علامہ کی شخصیت کا اثر

ساری زندگی پر محیط رہا۔ حتی کہ تصنیف وتالیف کے انداز میں بھی یہ اثر نمایاں ہے۔ دورہ حدیث میں امتیازی نمبر حاصل ہوئے اور دو کتابیں ''انوار احمدیہ'' اور ''شرح ملا جامی'' انعام میں ملیں۔ سند امتحان پر مہتمم دارالعلوم حضرت مولانا حبیب الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ کے دستخط کی مہر ہے اور ۱۵؍رجب ۱۳۴۵ھ تاریخ مرقوم ہے۔

اصلاحی تعلق

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ نہ صرف استاذ تھے بلکہ ان سے اصلاحی تعلق بھی قائم ہوا۔ حضرتؒ کی شفقت بے انتہا تھی، بعد میں یہ شفقت شاگرد کے صاحبزادے مولانا سید حامد میاںؒ کی طرف خلافت کی شکل میں منتقل ہوگئی۔

تدریسی خدمات

مارچ ۱۹۲٦ء میں جمعیۃ علماء ہند کا دوسرا اجلاس عام کلکتہ میں ہوا۔ علامہ کشمیریؒ دوسرے اکابر دارالعلوم کے ساتھ اجلاس میں شریک ہوئے۔ واپسی کے سفر کے دوران مدرسہ حنفیہ آرہ، شاہ آباد (بہار) کے ذمہ دار حضرات خدمت میں حاضر ہوئے اور ایک ایسے مدرس کی فرمائش کی جو عربی تحریر وتقریر میں مشق کرا سکے اور خصوصاً فن ادب کی اونچی کتابیں پڑھا سکے۔ علامہ کشمیریؒ دیوبند واپس تشریف لائے تو شیخ الادب مولانا اعزاز علیؒ کے مشورہ سے اس جگہ کے لیے ہونہار شاگرد سید محمد میاںؒ کا انتخاب فرمایا۔ حضرت الاستاذ کے حکم کی تعمیل میں سید محمد میاں مدرسہ حنفیہ آرہ تشریف لے گئے اور تقریباً ساڑھے تین سال وہاں کام کیا۔ شروع میں کچھ مشکل پیش آئی جو غالباً حالات کی ہم آہنگی نہ ہونے کی وجہ سے تھی لیکن بعد میں اراکین مدرسہ اور معززین شہر اتنے مانوس اور متاثر ہوگئے کہ استاذ مولانا سید محمد میاں صاحب کی بات کو دلیل وحجت کا درجہ دینے لگے۔ لیکن مولانا موصوف شروع سے ہی اس مدرسہ کے نظام سے دل برداشتہ رہے، کیونکہ مدرسہ سرکاری امداد یافتہ تھا، نیز یہاں دوسری یونیورسٹیوں کے امتحانوں کے لیے تیاری کرائی جاتی تھی۔ یہ دونوں باتیں دارالعلوم دیوبند

کے مزاج اور ماحول سے بالکل مختلف تھیں۔ اگرچہ مدرسہ حنفیہ میں رہتے ہوئے ترقی کے مواقع تھے اور یہ بھی ممکن تھا کہ کچھ عرصہ بعد کسی بڑے مدرسہ مثلاً مدرسہ شمس الہدیٰ میں استاد بلکہ پرنسپل کی جگہ بھی مل جاتی، کیونکہ اس کے لیے صرف درس نظامی کی فراغت کافی تھی، لیکن جو دل بچپن سے ہی صبر وقناعت کے ماحول میں جوان ہوا اور جس نے دارالعلوم کے خالص علمی ماحول میں تربیت پائی وہ ایسے ماحول میں کیسے خوش رہتا۔ صرف حضرت استاذ کے حکم کی تعمیل تھی کہ اتنا عرصہ وہاں گزرا۔ پھر شاید اضطراب قلب ہی تھا کہ حسن اتفاق سے مدرسہ شاہی مرادآباد میں درجات علیا کے لیے ایک استاذ کی ضرورت ہوئی اور اب مولانا حبیب الرحمٰن مہتمم دارالعلوم اور شیخ الادب مولانا اعزاز علیؒ کی تجویز اور سفارش سے آپ کا تقرر مدرسہ شاہی میں ہوگیا۔ اور مولانا موصوف کو لکھا گیا ''اب آپ کو ایسے مدرسہ میں بھیجا جارہا ہے جو علم کا مرکز ہے۔''

مولانا سید محمد میاں صاحب مارچ ۱۹۲۸ء میں مدرسہ شاہی پہونچے۔ جامعہ قاسمیہ عرف شاہی مرادآباد میں حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ نے ۱۲۹۶ھ/ ۱۸۷۸ء میں قائم فرمایا تھا۔ اس کا نام مولانا نانوتویؒ نے ''مدرسہ الغرباء'' رکھا تھا، جس کی ایک وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ جب مدرسہ کے لیے چندہ کی اپیل کی گئی تو جس شخص نے سب سے پہلے چندہ دیا وہ کوئی نیک بخت مسافر تھا۔ پھر حضرت نانوتویؒ کی نسبت سے اس کا نام 'جامعہ قاسمیہ' ہوگیا، پھر چونکہ یہ شاہی مسجد میں قائم کیا گیا تھا اس لیے اس کو 'مدرسہ شاہی' کہا جانے لگا۔ اب مدرسہ کا نام اس طرح کندہ ہے ''مدرسۃ الغرباء جامعہ قاسمیہ واقع شاہی مسجد''۔ اس مدرسہ کے اول مدرس مولانا سید احمد حسن امروہوی تھے جو مناظر اسلام مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کے شاگرد رشید تھے۔ مولانا سید محمد میاں مدرسہ شاہی میں تشریف لائے تو مدرسہ کے صدر مدرس مولانا فخر الدین احمدؒ تھے جو بعد میں دارالعلوم کے شیخ الحدیث اور جمعیۃ علماء ہند کے صدر ہوئے۔

نوجوان استاذ کو اس مدرسہ کی فضا بہت مانوس معلوم ہوئی، کیونکہ یہ سرکاری اثرات سے پاک تھا۔ آپ نے مدرسہ شاہی میں ترمذی شریف، بیضاوی شریف، جلالین، ہدایہ

آخرین اورادب کی سب کتابیں نیز منطق میں ملاحسن پڑھائی۔آپ کا حافظہ بہت قوی تھا۔ غیر متعلق کتابیں بھی یاد تھیں،مقامات حریری پر تعلیقات جوزیادہ تر **فقه اللغة للثعالبی** سے لی گئی ہیں یہ سب از بر تھیں اور دوران درس تمام تفاصیل دہرادیا کرتے تھے۔دوسری درسی کتابوں میں بھی اسی طرح تعلیقات وحواشی میں نیز الگ سے یادداشتیں ہیں جونوٹ بکس میں درج ہیں۔ساراعلمی ذخیرہ مطبوعہ ہے۔صاحبزادے مولانا سید حامد میاںؒ کا بیان ہے کہ دوپہر کا وقت والد صاحب گھر جانے کے بجائے مدرسہ میں ہی گزارتے ،میں گھر سے کھانا لاتا اور کھانے کے دوران بھی مطالعہ جاری رہتا اور شام کے درس کے لیے تیاری ہوجاتی۔دوران طعام کامختصر مطالعہ پورے درس کے لیے کافی ہوتا۔ظہر کے بعد مدرسہ میں افتاء کا کام کرتے۔مدرسہ شاہی میں باقاعدہ شعبہ افتاء نہیں تھا۔مولانا نے اس کو منظّم کیا اور باقاعدہ شعبہ افتاء قائم کیا۔صبح کے درس کے لیے مطالعہ فجر کی نماز کے بعد تسبیح واوراد سے فارغ ہوکر صبح کی چائے پینے کے دوران فرماتے۔

تدریسی مشغولیت اس وقت موقوف ہوگئی جب ۱۹۴۴ء میں سیاسی حالات کے پیش نظر اور جمعیۃ علماء ہند کی ذمہ داریوں کوسنبھالنے کے لیے آپ کو دہلی آنا پڑا،لیکن یہ سلسلہ دوبارہ ۱۹۶۳ء میں قائم ہوگیا جب جمعیۃ علماء ہند کی ذمہ داری سے سبکدوشی کے بعد مدرسہ امینیہ دہلی میں درس حدیث شروع کیا۔یہاں بخاری شریف پڑھائی اور تاحیات شیخ الحدیث کے منصب پر فائز رہے۔

کتب خانہ فخریہ شاہی کمپنی،مرادآباد:

والد صاحب کے مرادآباد کے قیام کے زمانہ میں کتب خانہ فخریہ شاہی کمپنی کوایک مشترک تجارتی فرم کے طور پر ۱۹۳۷ء میں قائم کیا گیا تھا،جس کے پندرہ سو حصے تھے اور چھ روپے فی حصہ قیمت مقرر ہوئی تھی۔اس کی ایک مجلس منتظمہ تھی جوکل کاروبار کی ذمہ دار تھی، جس کے ناظم مولانا سید محمد میاںؒ تھے۔کتب خانہ سے مختلف کتابیں شائع اور فروخت ہوتی رہیں،اس کے اشتہارات اور مطبوعہ کتب کی فہرست رسالہ''قائد''کے شماروں میں بکثرت

موجود ہے، لیکن غالباً ملکی حالات اور دوسرے اسباب سے خسارہ ہوتا رہا اور آخر کار مجلس منتظمہ کی رائے اور حصہ داران کی منظوری سے کمپنی کو بند کر کے کسی فرد واحد یا متعدد افراد کو کتب خانہ فروخت کرنے یا مضاربت پر دینے کا فیصلہ ۱۹۵۱ء میں ہوا، اور قانونی کارروائیوں کے بعد اپریل ۱۹۵۴ء میں کمپنی بند کر دی گئی۔

حصہ داران میں اول شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ تھے، جن کے نام پر بنی رسید ہمارے پاس محفوظ ہے، نیز حصہ داران کے مکمل حساب کے رجسٹر بھی موجود تھے۔

سیاسی مشغولیت

مرادآباد میں پہلے سے سیاسی بیداری موجود تھی۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد جن مجاہدین حریت کو مرادآباد میں پھانسی دی گئی مقامی روایات کے مطابق ان کی تعداد تقریباً ساڑھے سولہ ہزار تھی۔ مرادآباد میں ایک محلّہ بھی ''گل شہید'' کے نام سے ہے جہاں شہداء جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے مزارات ہیں۔ ادھر جامعہ قاسمیہ کے بانی مولانا نانوتویؒ خود ایک مجاہد تھے اور شاملی کے میدان میں انگریزی فوجوں سے ٹکر لی تھی۔ جامعہ کے صدر مدرس مولانا فخر الدین احمدؒ صاحب جو شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ، کے شاگرد رشید اور ان کے خیالات کے پکے معتقد اور خود سیاسی میدان میں بہت کام کر چکے تھے ان کی سیاسی خدمات ہی تھیں جن کی وجہ سے مدرسہ شاہی کو سیاسی تحریکات میں امتیاز حاصل ہوا۔ مولانا محمد میاں صاحب کو مدرسہ شاہی پہنچے ہوئے ایک سال ہی ہوا تھا کہ کئی سال کی خاموشی کے بعد ملک کے سیاسی افق پر سرگرمی شروع ہوئی۔ ولبھ بھائی پٹیل نے لگان ادا نہ کرنے کی تحریک چلائی۔ کلکتہ میں بدیشی کپڑوں کو اکٹھا کر کے آگ لگا دی گئی۔ گاندھی جی نے نمک سازی کی تحریک کا اعلان کر دیا اور ڈانڈی کے مشہور مارچ کے ذریعہ تحریک آزادی میں نئی روح پھونک دی۔ اس وقت یہ سوال تھا کہ مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیے۔ جمعیۃ علماء ہند نے اس سوال پر غور کرنے اور مسلمانوں کی صحیح رہنمائی کرنے کے لیے امروہہ میں اجلاس کیا۔ مولانا معین الدین اجمیریؒ

اس کے صدر تھے۔

مسلمانوں میں ایک جماعت وہ تھی جو تحریک آزادی میں شرکت سے پہلے ہندو مسلم معاہدہ کو ضروری سمجھتی تھی، لیکن دوسری جماعت جس کی سربراہ جمعیۃ علماء ہند تھی اس کا یقین یہ تھا کہ جدوجہد آزادی ایسا فرض ہے جو دوسرے برادران وطن سے زیادہ مسلمانوں پر عائد ہوتا ہے۔ برادران وطن اس کو صرف سیاسی مسئلہ سمجھتے ہیں لیکن مسلمانوں کے لیے اس کی نوعیت مذہبی مسئلہ کی بھی ہے جس کا دارومدار کسی معاہدہ پر نہیں ہے۔ علاوہ ازیں وہ یہ سمجھتے تھے کہ برطانیہ کے سیاسی اقتدار بلکہ سیاسی جبروت کے دور میں کسی متفقہ معاہدہ کا تصور جوئے شیر کے تصور سے کم نہیں ہے۔ چنانچہ جیسے ہی جمعیۃ علماء ہند نے اجلاس امروہہ کا اعلان کیا دوسری جماعت نے بھی جمعیۃ علماء اسلام کے نام سے انھیں تاریخوں میں امروہہ میں اجلاس کا اعلان کردیا۔ بہرحال اجلاس نے مسلمانوں کو ہدایت کی کہ وہ کانگریس کے دوش بدوش تحریک آزادی میں گرمجوشی سے حصہ لیں اور اس کے لیے کسی قربانی سے منہ نہ موڑیں۔

اسی سال جمعیۃ علماء مرادآباد کا انتخاب ہوا اور مولانا محمد میاں صاحب کو نائب ناظم منتخب کیا گیا۔ کچھ دن بعد جمعیۃ علماء ہند نے شاردا ایکٹ کے خلاف تحریک چلائی تو مولانا نے پوری سرگرمی سے حصہ لیا حتی کہ موٹو وغیرہ بھی اپنے ہاتھ سے لکھے۔ ضابطہ کے مطابق جمعیۃ علماء ہند کے اجلاس میں شرکت اس لیے ممکن نہیں تھی کہ کیونکہ مولانا اس کے کارکن نہیں تھے۔ پھر بھی کسی طرح انھوں نے اجلاس میں داخلہ کی اجازت حاصل کرلی اور علماء و دانشوران کی تقریریں اور بحثیں سنیں۔ مولانا کا بیان ہے کہ کچھ قانون داں، وکیل اور ایک بیرسٹر اور ایک بڑے عالم جو سرکار کے حامی تھے صدر کی اجازت سے اجلاس میں شریک ہوئے اور بحث میں بھی حصہ لیا۔ انھوں نے کانگریس کے خلاف تقریریں کیں اور یہ کہا کہ مسلمانوں کو اس میں حصہ نہیں لینا چاہیے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ ان کے دلائل خود ان کی نظر میں مضبوط ہوں گے لیکن مجھے نہایت لچر معلوم ہوئے۔ جمعیۃ علماء کے اکابر میں سے حضرت مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب اور حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کی

تقریروں نے بہت متاثر کیا۔ سید صاحب کی تقریر سیاسی وتاریخی نوعیت کی تھی۔ شیخ الاسلام مولانا مدنی نے مسئلہ کے مذہبی پہلو کو اجاگر کیا۔ مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب اس تحریک کے محرک تھے لیکن اس وقت تک وہ کوئی اچھے مقرر نہیں تھے۔ بعد میں شاہ عطاء اللہ بخاری کی تقریر تقریباً تین گھنٹے تک جاری رہی، اس تقریر سے سید محمد میاں جذباتی طور پر بہت متاثر ہوئے۔ مرادآباد واپس آنے کے بعد مولانا نے تنہائی میں حضرت شیخ الاسلام سے تحریک آزادی اور کانگریس میں شامل ہونے کے بارے میں استصواب کیا۔ حضرت شیخ کا جواب اثبات میں تھا مزید فرمایا:

''یورپ خصوصاً برٹش نے دنیا کے بہت سے ممالک کو اپنے ظلم وستم کے پنجے میں جکڑ دیا ہے۔ برٹش کی یہ طاقت ہندوستان سے ہے اور اگر ہندوستان پر برطانیہ کی گرفت کچھ ڈھیلی پڑی تو ان کمزور ممالک پر بھی اس کا اثر پڑتا ہے اور انھیں سانس لینے کا موقعہ نہ ملتا ہے۔''

مولانا محمد میاں صاحب فرماتے ہیں کہ حضرت شیخ کے اس ارشاد کے بعد احقر کو پوری طرح انشراح قلب ہوگیا۔ چنانچہ حضرت مولانا فخر الدین احمد کا دست وبازو بن کر تحریک میں شامل ہوگئے۔ چندروز میں ہی تحریک پورے مرادآباد پر چھا گئی اور صوبہ سرحد کے بعد صرف شہر مرادآباد کی یہ خصوصیت تھی کہ یہاں کانگریس پر مسلمان چھائے ہوئے تھے۔ کچھ عرصہ بعد مرادآباد میں یوپی کونسل کا ضمنی الیکشن ہوا تو اس سے بائیکاٹ کی تجویز منظور کی گئی اس وقت انتخاب جداگانہ ہوتے تھے، امیدوار ایک مسلمان تھے تو ووٹر بھی مسلمان ہی تھے، جب پولنگ شروع ہونے کا وقت آیا تو ٹاؤن ہال کے راستوں پر ایک طرف مسلح پولیس کے پیادہ اور سوار جوان تھے اور دوسری جانب جمعیۃ علماء ہند کے رضا کار۔ مولانا محمد میاں کا بیان ہے:

''احقر نے نماز فجر کے وقت سے شہر کا گشت کر کے رضا کاروں کو بھیجا تھا پولنگ شروع ہوئی تو دو گھنٹے بھی نہ گزرے تھے ہڑبونگ شروع ہوگئی۔ بے قابو مجمع میونسپلٹی کے دفتر میں گھس گیا۔ پولیس کو بہانہ مل گیا، اس نے فائرنگ شروع کردی، پھر لاٹھی چارج کے

بجائے گھوڑے دوڑائے۔احقر میدان میں تھا اور آخر تک وہاں رہا اور عجیب وغریب طریقے سے گھوڑوں کی ٹاپوں اور فائرنگ کے چھروں سے بچا۔ فائرنگ بند ہوئی تو زخمیوں کو اٹھوایا، ایک ساتھی عبدالنبی تو زخموں کی تاب نہ لاکر جاں بحق ہوا۔ دوسرے زخمی اچھے ہوگئے۔ پشاور کے قصہ خوانی بازار کی فائرنگ کے بعد یوپی میں یہ پہلا فائرنگ کا واقعہ تھا، اس کے تقریباً دو ہفتوں کے بعد سید محمد میاں نیز مولانا فخر الدین احمد صاحب کو گرفتار کرلیا گیا، ایک ایک سال کی سزا ہوئی مگر مارچ ۳۰ء میں گاندھی ارون پیکٹ ہوگیا جس کی شرطوں کے تحت تمام سیاسی قیدی رہا کردیئے گئے اور اس طرح ایک سال کے بجائے ساڑھے پانچ ماہ کے بعد رہائی ہوگئی۔ معاہدہ کے بعد ایک سال تک سیاسی فضا میں خاموشی رہی، لیکن گول میز کانفرنس کی ناکامی کے بعد ابھی گاندھی جی ہندوستان واپس بھی نہیں پہنچے تھے کہ نئے وائسرائے لارڈ ولنگڈن کی تشدد پسند پالیسی کی وجہ سے تحریک دوبارہ شروع ہوگئی۔ کانگریس کی طرح جمعیۃ علماء ہند کے اکابر مولانا مفتی کفایت اللہ مفتی اعظم ہند وصدر جمعیۃ علماء ہند، مولانا احمد سعید دہلوی ناظم عمومی وغیرہ گرفتار کرلئے گئے۔ کانگریس خلاف قانون جماعت قرار دی گئی۔ جمعیۃ علماء کو خلاف قانون تو نہیں قرار دیا گیا مگر اس کے ساتھ معاملہ ایسا ہی کیا گیا۔ دفتر پر بار بار چھاپہ مارا گیا، تلاشی لی گئی۔ کانگریس نے ورکنگ کمیٹی اور صدر کے بجائے ڈکٹیٹر شپ کا نظام بنایا تھا۔ مرکزی جمعیۃ علماء میں بھی یہی نظام تھا۔ اس کے آٹھ ڈکٹیٹر گرفتار ہوگئے تو سید محمد میاں کو اس منصب جلیل پر فائز کیا گیا، ادھر پراونشل کانگریس کمیٹی نے صوبائی کانگریس کا ڈکٹیٹر بنادیا۔

اس زمانہ میں ڈیوٹیاں مقرر کردی گئی تھیں۔ جمعیۃ کے ہائی کمانڈر حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ نے سید محمد میاں کی ڈیوٹی یہ لگائی تھی کہ ہر جمعہ کو مرادآباد سے آکر نماز جمعہ کے بعد جامع مسجد میں تقریر کریں اور فوراً واپس ہوجائیں۔ کئی ہفتہ ایسا ہی ہوتا رہا لیکن پھر پولیس نے قابو پالیا۔ مولانا کو کوتوالی کے سامنے سے گرفتار کرکے حوالات میں بند کردیا گیا۔ ساتھ میں دوسرے آٹھ مولوی صاحبان گرفتار کئے گئے اور سب کو ایک ہی ہال میں رکھا گیا۔

اگست کا مہینہ تھا۔ بارشیں ہورہی تھیں لیکن سخت گرمی اور حبس تھا اور اس کمرے میں بہت براحال تھا۔مزید یہ کہ کمرے سے پانی کے نکاس کے لیے نالی نہیں تھی۔صرف ایک دروازہ تھا،صبح کوصرف ایک گھنٹہ کے لیےضروریات سے فارغ ہونے کے لیے باہر لایا جاتا۔وضو وغیرہ کمرہ کے اندر ہی کرنی ہوتی تھی جس کا پانی کمرہ میں بھرتے بھرتے آدھے کمرے تک آگیا تھا۔ باقی حصہ میں حوالاتیوں کے بستر تھے۔اس وقت مقدمہ نہیں چلا گیا بلکہ ایک ہفتہ کے بعد نوٹس دیا گیا کہ چھ ماہ تک دہلی نہیں آسکتے۔ پھر پولیس کی حراست میں شاہدرہ پہنچا دیا گیا۔ رہائی کے بعد مولانا مرادآباد پہنچے۔ چندروز بعد کانگریس اور جمعیۃ علماء کے ایک مشترکہ پروگرام کے تحت ایک جلوس کی قیادت کرنے کے لیے اس شان سے باہر نکلے کہ ایک ہاتھ میں کانگریس کا جھنڈا تھا اور دوسرے ہاتھ میں جمعیۃ کا۔ گلے میں حمائل شریف آویزاں اور سر پر والدین رحمہا اللہ کی دعائیں سایہ فگن۔مولانا کو دیکھ کر رضا کار جو ادھر ادھر چھپے ہوئے تھے، باہر نکل آئے اور جلوس روانہ ہوا۔ابھی دو فرلانگ چلا ہوگا کہ پولیس نے آکر قائد جلوس مولانا موصوف کو گرفتار کرلیا اور لاٹھی چارج کر کے جلوس کو منتشر کر دیا۔لیکن اگلے روز سترہ کارکن گرفتار کر لئے گئے جو کانگریس کے لیڈر تھے۔جیل میں مقدمہ چلا لیکن پالیسی یہ طے ہوئی کہ پیروی نہ کی جائے۔ بیرسٹر کیدار ناتھ جو محض از راہ ہمدردی پیروی کرتے آئے تھے، ان کو شکریہ کے ساتھ واپس کر دیا گیا۔اس کے بعد جب رہائی ہوئی تو تحریک نے ایک نیا رنگ اختیار کرلیا تھا۔اس وقت جو اختیارات ہندوستانیوں کو دیئے گئے تھے وہ اگر چہ اطمینان بخش نہیں تھے،مگر کانگریس کی اکثریت نے الیکشن میں حصہ لینے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ چنانچہ اس کے نتیجہ میں غالباً ۳۷ء میں کانگریس کی وزارتیں قائم ہوگئیں۔لیکن تقریباً سال بھر بعد ہٹلر نے حملہ کر کے یورپ میں جنگ شروع کردی۔ برطانیہ اس کا حریف تھا۔ برطانیہ عظمی نے ہندوستان کی رائے لئے بغیر اس پر جنگ مسلط کر دی۔ کانگریس اور جمعیۃ علماء ہند دونوں جماعتوں نے اس کی مخالفت کی اور عملی طور پر گاندھی جی نے انفرادی ستیہ گرہ کا پروگرام تجویز کر دیا۔ اسی زمانہ میں مولانا محمد میاں صاحب کی تصنیف ''علماء ہند کا شاندار ماضی'' طبع

ہوئی۔ جو ضبط کر لی گئی۔ پریس بھی ضبط کر لیا گیا۔ مصنفؒ کو گرفتار کر کے معمولی ضمانت پر رہا کر دیا گیا۔ اگر چہ یہ گرفتاری کتاب کے سلسلہ میں ہوئی تھی لیکن مراد آباد کانگریس نے اس سزایابی کو تحریک ستیہ گرہ میں شمار کیا۔ ''شاندار ماضی'' کی تصنیف کے دو مقصد تھے: اول یہ کہ سیاسی تحریک میں علماء کی شرکت کو علماء کی شان کے خلاف ایک بدعت قرار دیا جا رہا تھا، اس کتاب میں یہ ظاہر کیا گیا کہ علماء نے ہر دور میں اس دور کی سیاست کے مطابق عملی حصہ لیا اور سزائیں بھگتی ہیں۔ لہٰذا اس دور میں اس دور کے تقاضے کے مطابق تحریک میں حصہ لینا علماء کی شان کے خلاف نہیں بلکہ ان کی تاریخی روایات کو زندہ کرنا ہے۔ دوسرا مقصد تحریک آزادی کو تقویت دینا تھا۔ اسی لیے ان مظالم کی تاریخ بیان کی گئی تھی۔ جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے آغاز سے اس وقت تک انگریزوں نے کئے تھے، اس مقدمہ میں طویل سزا ہو سکتی تھی۔ مگر چونکہ جو کچھ لکھا گیا تھا وہ شائع شدہ کتابوں کے حوالے سے لکھا گیا تھا اور وکلا صاحبان نے مجسٹریٹ کو یہ ذہن نشین کرا دیا تھا کہ مطبوعہ اور شائع شدہ مستند حوالہ سے جو بات بیان کی جائے وہ تاریخی حیثیت رکھتی ہے اور قابل اعتراض نہیں ہے۔ بہر حال چند جملے جو فی الواقع اس تصنیف میں آنے کے قابل نہیں تھے اور جذبات کی رو میں لکھ دیئے گئے تھے اور قابل اعتراض تھے، ان کے بارے میں مصنفؒ نے تحریری معذرت پیش کر دی، اس کے نتیجہ میں سزا صرف اتنی ہوئی کہ عدالت کے برخاست ہونے تک قید رکھا گیا اور اس طرح مقدمہ دائر کرنے والی پولیس کی بھی بات رہ گئی۔

۸/اگست ۱۹۴۲ء کو کویٹ انڈیا (انڈیا چھوڑو) کی تحریک شروع ہوئی۔ اس وقت پالیسی یہ تھی کہ کام خفیہ طور پر کیا جائے اور جہاں تک ممکن ہو اپنے آپ کو بچایا جائے۔ چنانچہ جیسے ہی معلوم ہوا کہ مراد آباد میں گرفتاریاں ہو رہی ہیں، مولانا سید محمد میاںؒ مراد آباد سے باہر نکل آئے۔ اول ایک گاؤں میں رہے پھر دہلی پہنچ کر مجلس عاملہ کے اجلاس میں مدعو خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی۔ پھر مجلس عاملہ کی وہ تجویز جس میں تحریک آزادی میں شرکت کے لیے مسلمانوں کو ابھارا گیا تھا، چھپوا کر یوپی میں تقسیم کرنے کے لیے دورہ کیا۔ بہار جانے کا ارادہ

تھا لیکن بارش اور تحریک کے کارکنوں نے ریلوے لائن کو اس طرح خراب کر دیا تھا کہ مغل سرائے سے آگے جانا ممکن نہ ہوا۔ دہلی واپسی ہوئی لیکن یہاں قیام مشکل تھا، کیونکہ مولانا کے بارے میں پولیس کا خیال ہو گیا تھا کہ ان کا بم بنانے والی پارٹی سے تعلق ہے۔ لہٰذا دوسرے مقامات سے گمنام ہینڈ بل اور پمفلٹ شائع کرنے شروع کئے۔ کچھ کاربن سے کاپی کر کے خاص خاص مرکزوں میں بھیجے، اس طرح کا ایک پمفلٹ پشاور پہنچ گیا جہاں کالج کے جوانوں نے مولانا کے نام کے حوالہ سے اس کو چھپوا کر تقسیم کیا۔ وہ مضمون یو پی کی پولیس کو مل گیا یا صوبہ سرحد کی پولیس نے بھیجا، بہرحال اس طرح کی سرگرمیوں کی وجہ سے اکتوبر ۴۲ء میں مولانا کو گرفتار کر لیا گیا۔

شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ ایک تقریر کی بنا پر جو آپ نے بچھراؤں ضلع مرادآباد میں کی تھی، اپریل ۴۳ء میں گرفتار کر لئے گئے تھے اور مرادآباد جیل کی حوالات میں تھے۔ اس وقت کانگریس کی پالیسی کے مطابق مقدمات کی پیروی کی گئی، ان سب مقدمات کی پیروی کی ذمہ داری مولانا نے اپنے اوپر لے رکھی تھی۔ اس پیروی کے نتیجہ میں کچھ بھی نہیں ہوتا تھا، کیونکہ جج حضرات حکومت کی منشاء کے مطابق فیصلے کرتے۔ مگر مقدموں کی پیروی کا اصل مقصد لوگوں میں جذبات بیدار کرنا تھا اور یہ مقصد حاصل ہوا۔ حضرت شیخ الاسلامؒ کے مقدمہ میں بحث کرنے کے لیے مولانا صاحب نے مسٹر آصف علی بیرسٹر سے درخواست کی جو انھوں نے منظور کی اور مرادآباد پہنچ کر عدالت میں تقریباً چار گھنٹے مسلسل تقریر کی۔ مرادآباد کے تمام وکلا اس بحث کو سننے کے لیے اس عدالت میں سمٹ آئے تھے۔ بہرحال اس شاندار بحث کے باوجود فیصلہ میں چھ ماہ کی سزا با مشقت تجویز کی گئی۔ ابھی ان حضرات کی یہ سزا ختم نہیں ہوئی تھی کہ ۸/اگست آ گیا، مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰنؒ، حافظ محمد ابراہیم نگینویؒ (جو کانگریس عارضی گورنمنٹ کے وزیر رہ چکے تھے) قاری عبداللہؒ مولانا محمد اسمٰعیل سنبھلی، منشی معین الدین سنبھلی، حاجی محمد ابراہیم مالک کارخانہ بیڑی مرادآباد جیل میں تھوڑے دن ہی رہے پھر منتشر کر دیئے گئے۔ کچھ کو رہا کر دیا گیا۔ حضرت مدنیؒ کو نینی

سنٹرل جیل اور مولانا محمد میاںؒ اور مجاہد ملتؒ کو بریلی جیل بھیج دیا گیا۔ تقریباً دو سال کے بعد ۴۴ء میں رہائیاں شروع ہوئیں۔ پہلے محمد میاںؒ پھر مجاہد ملتؒ اور پھر حضرت شیخ الاسلامؒ رہا ہوئے۔ اس کے بعد گرفتاری کی نوبت نہیں آئی۔ تقریباً دو سال تک صوبائی کونسلوں اور اس کے بعد مرکزی اسمبلی کے انتخابات ہوئے۔ جو مسلم لیگ کے شدید مقابلہ کی بنا پر بہت سخت تھے۔ مسلم لیگ کے مقابلہ کے لیے جمعیۃ علماء نے مسلم پارلیمنٹری بورڈ قائم کیا جس میں جمعیۃ علماء ہند کے علاوہ مجلس احرار الاسلام، مسلم مجلس، صوبہ سرحد کے خدائی خدمتگار، مومن کانفرنس وغیرہ آزادی پسند جماعتیں شریک ہوئیں۔ مولانا سید محمد میاںؒ کا مراد آباد میں قیام تقریباً سولہ سال رہا۔ تدریسی خدمات کے علاوہ اکثر تصنیفی اور جماعتی کام اسی دوران ہوئے۔ اسی لئے لوگ ان کو مراد آبادی ہی سمجھنے لگے تھے۔ اہل مراد آباد سے تعلق کا یہ حال تھا کہ مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰنؒ ان کو مراد آباد کا بے تاج بادشاہ فرماتے تھے۔ ۴۳ء میں جیل جانا ہوا۔ رہائی کے بعد مراد آباد میں مکان کرایہ پر لیا اور اہل خانہ دیو بند سے مراد آباد منتقل ہو گئے۔

آزادی کی آمد تصور کے خلاف ہوئی۔ تصور تھا ہندو مسلم بھائی بھائی اور متحدہ ہندوستان سب کا وطن، مگر بڑی شدت سے شور مچایا گیا کہ- ہندو مسلم دو قوم- ہندوستان کو تقسیم کرو۔ اب تک مسلم محبان وطن کا مقابلہ غاصبان وطن سے تھا اب خود برادران وطن سے ہو گیا۔ اسی دوران انتخابات کا مرحلہ پیش آیا اور مسلم محبان وطن کو سر ہتھیلی پر رکھ کر انتخابات میں حصہ لینا اور خود اپنوں سے مقابلہ کرنا پڑا۔ مجاہد ملت پلیٹ فارموں پر رہتے تھے اور مولانا محمد میاں جمعیۃ علماء ہند اور مسلم پارلیمنٹری بورڈ کے دفاتر کے ذمہ دار کے طور پر دن رات ایک کئے ہوئے تھے۔ گویا شب و روز معتکف۔ صرف نماز کے لیے مسجد جانا ہوتا تھا۔

پاکستان بنا۔ ہندو مسلم بھائی بھائی کے بجائے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوئے، جس کی وجہ سے تبادلہ آبادی ضروری سمجھا گیا۔ برادران ملت نے پاکستان کا رخ کیا، لیکن اکابر جمعیۃ نے فرمایا ’ہم نے ہندوستان آزاد کرایا ہے۔ یہ ہمارا وطن ہے ہم نہیں ہٹیں گے۔ اس ’’دارالحرب‘‘ کو ’’دارالامن‘‘ بنائیں گے۔ علمی مرکزوں کو ترقی دیں گے۔ مساجد

کے مینارے اور گنبد بلند کریں گے۔' مجاہد ملت اور شیخ الاسلام رحمہ اللہ کی خدمات جلیل القدر تھیں۔ مولانا سید محمد میاں صاحب ان کے معاون اور مشیر خاص تھے۔ ان کا خاص کام تحریری تھا، یہاں تک کہ حضرت شیخ الاسلام نے از راہِ شفقت و محبت آپ کو 'حیوان کاتب' کا خطاب دے دیا تھا۔ آزاد ہندوستان میں انتخابات کا مرحلہ آیا۔ مولانا کا حلقہ اور میدان عمل مرادآباد تھا اور بڑی آسانی سے اسمبلی اور پارلیمنٹ کی سیٹوں کے لیے کامیابی مل سکتی تھی، لیکن مولانا نے اب دوسرا راستہ اپنے لیے چن لیا تھا۔ تقسیم ہند نے ایک بڑی جماعت یا قوم کا نظریہ بنادیا تھا کہ پاکستان بننے کے بعد مسلمانوں کو یہاں رہنے کا حق نہیں ہے۔ ان کو ختم کردینا چاہیے، جس کے لیے نسل کشی کی کوششوں کے ساتھ دین و مذہب پر حملے ہو رہے تھے۔ مولانا کا خیال تھا کہ اس کا مقابلہ حسن تدبیر سے کرنا چاہیے جس کے لیے سب سے اہم اور بنیادی میدان میں مدارس و مکاتب کا قیام اور ان کے لیے نصاب کی ترتیب تھی۔ مولاناؒ نے تقسیم کے فوراً بعد سے یہ کام شروع کردیا۔ سب سے مشکل اور دشوار کام مشرقی پنجاب اور ہماچل پردیش کے دور دراز دیہاتی علاقوں میں جہاں مسلمانوں کی آبادی کا تناسب ایک فی ہزار تھا اور تقسیم کے بعد پیش آنے والے واقعات سے انتہائی دہشت زدہ اور پست ہمت ہو چکے تھے، ان میں گھوم پھر کر ان میں حوصلہ پیدا کرنا اور اس مقصد کے لیے جگہ مسجدوں کی واگذاری اور مکاتب کا قیام تھا۔ مولاناؒ نے اس کام کو اپنی زندگی کا سب سے بڑا مقصد بنالیا اور تن من دھن سے اس میں اس طرح لگے کہ اپنی صحت کی بھی پرواہ نہیں کی۔ اور اس کام کو اپنے لیے الیکشن لڑنے یا کوئی سیٹ حاصل کرنے پر ترجیح دی۔ اگرچہ سیاسی میدان سے کنارہ کشی نہیں کی بلکہ مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن کے لیے الیکشن لڑا، اور چونکہ مجاہد ملت کا حلقہ مرادآباد تھا جس میں مولانا کی محبت بہت بارآور ہوئی تھی، اس لیے مجاہد ملت اس حلقہ سے کامیاب ہوتے رہے اور مصارف بہت کم ہوئے۔ مولاناؒ کا خیال تھا کہ مسلمان ممبر پارلیمنٹ کا فرض ہوگا کہ کلمۂ حق بیبا کی اور جرأت کے ساتھ ادا کرسکے اور کسی سے مرعوب نہ ہو بلکہ دوسروں کو متاثر کرسکے۔ مولانا کے خیال میں مجاہد ملت ان خصوصیات کے حامل تھے

اوران کے لیے الیکشن لڑنا فرض تھا۔ جبکہ مولاناؒ کے خیال میں خود ان کے اپنے لیے امیدوار بننا ناجائز تھا۔ اسی لیے ۱۹۵۲ء اور ۱۹۵۷ء کے انتخابات کے موقعوں پر حافظ ابراہیم مرحوم کے اصرار کے باوجود معذرت کر دی۔ کسی منصب یا اعزاز لینے کے بارے میں بھی مولانا کا یہی موقف تھا کہ تحریک آزادی میں مشغولیت کسی انعام و اعزاز کے لالچ میں نہیں تھی۔ اس لیے کسی منصب کو قبول نہیں کیا۔ البتہ بعض مخلصین نے جب یہ اصرار کیا کہ اگر بطور مجاہد آزادی کوئی سٹیفکیٹ یا اعزاز حاصل نہ کیا تو مسلم مجاہدین آزادی کی فہرست میں ایک نام کم ہو جائے گا۔ اس لیے ''تامرپتر'' ضرور حاصل کیا جو ایک اعزاز تو تھا لیکن اس کے ساتھ کوئی مالی فائدہ نہیں تھا۔ تقسیم کے بعد مسلمانوں کے مکانوں پر جائز اور ناجائز قبضوں کے لیے محکمہ کسٹوڈین بہت سرگرم تھا۔ اس سلسلہ میں کسٹوڈین کے قبضوں سے مکان نکلوانے میں کوششیں کیں لیکن اس موقع سے کوئی فائدہ اٹھا کر اپنے لیے کوئی مکان حاصل نہیں کیا اور تاحیات کرایہ کے مکان میں رہے۔

تقسیم ہند کے بعد جمعیۃ علماء ہند کی تعلیمی پالیسی یہ تھی کہ پرائمری درجہ کے مکاتب جگہ جگہ قائم کئے جائیں، جہاں ابتدائی دینی تعلیم کے ساتھ بچے کو اس قابل بنا دیا جائے کہ وہ فارغ ہو کر سرکاری یا غیر سرکاری اسکولوں میں داخلہ لے سکے۔ اس مقصد کے لیے جہاں ایک طرف جسمانی بھاگ ڈور تھی وہاں دوسری طرف نصاب تعلیم کی ترتیب بھی ایک بڑا اہم اور مشکل کام تھا۔ مولانا محمد میاںؒ صاحب نے اس کام کو ایک ماہر تعلیم کی مہارت کے ساتھ انجام دیا اور شروع میں ایک قاعدہ اور چار حصوں پر مشتمل ''دینی تعلیم کا نصاب'' مرتب فرمایا جو بعد میں درسی ضرورت کے پیش نظر دس حصوں میں پھیلا دیا گیا۔ حروف شناسی کے لیے رنگین تصویروں والا قاعدہ مرتب کیا جس کے ساتھ تعلیمی کارڈ جن سے حروف شناسی میں آسانی ہوتی نیز رنگین تصویروں والے دیواری چارٹ، غرض ابتدائی تعلیم کے جدید طریقوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ نصاب مرتب کیا گیا جس میں زبان کی صحت و ترقی کے ساتھ مختلف مضامین جو پرائمری درجات کے لیے ضروری ہیں، شامل کئے گئے۔ بعد میں ضرورت سمجھتے

ہوئے ان کو ہندی میں بھی شائع کیا گیا تا کہ جن علاقوں میں اردو رسم الخط بالکل ختم ہو چکا ہے وہاں بچے ہندی رسم الخط میں ہی ان رسالوں سے استفادہ کرسکیں۔ یہ نصاب جمعیۃ علماء ہند کی پالیسی کے تحت قائم ہونے والے مدارس میں جاری کیا گیا اور تا حال ان مکاتب میں رائج ہے۔ یہ رسائل مولانا کی تعلیم کے میدان میں مہارت کا ثبوت ہیں اور اس بات کی مثال ہیں کہ درس نظامی کا فارغ مولوی اتنا بیدار ذہن بھی ہوسکتا ہے۔ ان کی افادیت کو دیکھتے ہوئے جمعیۃ علماء برطانیہ نے اپنے مدارس میں ان کو رائج کیا لیکن بعض الفاظ کو مشکل سمجھتے ہوئے مصنف کی اجازت سے آسان الفاظ داخل کیے گئے۔

مولانا سید محمد میاں نے ۱۹۴۴ء سے ۱۹۶۳ء تک جمعیۃ علماء ہند کے ناظم اور ناظم اعلیٰ کی حیثیت سے ذمہ داری سنبھالی۔ یہ دور انتہائی جدوجہد اور پر مشقت تھا۔ جمعیۃ علماء پر مسلمانوں نے پورا اعتماد کیا تھا اور اس لیے یہ جماعت ہی ہر مشکل وقت مرجع خلائق ہوتی تھی۔ تقسیم ہند کی تلخ یادوں نے ملکی آبادی کے ایک بڑے حصے کو غصہ ونفرت میں مبتلا رکھا جو فرقہ وارانہ فسادات کی شکل میں بار بار سامنے آتا رہا۔ مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن کی قیادت میں جماعت اپنا کام ہر محاذ پر پورا کرتی رہی۔ مولانا سید محمد میاںؒ مجاہد ملت کے دست راست تھے اور ان کے خیالات کے ترجمان۔ جمعیۃ کے ترجمان روزنامہ 'الجمعیۃ' کے انتظامی امور کے نگراں ہونے کے ساتھ مولانا کا قلمی اشتراک اور اخبار کی ترتیب واشاعت میں تعاون و سرپرستی پورے عرصہ اور بعد میں بھی جاری رہی۔ مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰنؒ کی وفات (اگست ۱۹۶۲ء) کے بعد نظامت اعلیٰ کے لیے مولانا محمد میاں کا انتخاب ہوا۔ اسفار اور مراجعت میں شدت آتی چلی گئی۔ تصنیف وتالیف کا کام بھی ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ مولانا صبح آٹھ بجے کے قریب دفتر کے لیے روانہ ہوتے، وہاں ملاقاتیوں سے ملنے کے ساتھ ساتھ دفتری کام اور خطوط کے جوابات بھی چلتے رہتے۔ لکھنے میں مدد کے لیے کوئی سکریٹری یا مختصر نویس نہیں بلکہ تکیہ سے پشت لگا کر ایک گھٹنا کھڑا کر کے اس پر گتے کے بورڈ پر کاغذ ہوتا اور غالباً زیڈ سائز کے نب والا ہولڈر پوری مستعدی کے ساتھ کاغذ پر اپنی جولانی بکھیرتا رہتا۔ خطوں کے

جواب کے ساتھ ساتھ مختلف حضرات کے نام ہدایتیں بھی چھوٹے چھوٹے کاغذوں پر تحریری دی جاتیں۔ نیا کاغذ تو شاذ و نادر ہی استعمال ہوتا، اکثر تحریریں خواہ دفتر سے متعلق ہوں یا کسی تصنیف کا حصہ ہوں اخبار 'الجمعیۃ' میں آنے والے ایمبیسیوں کے اطلاعاتی سرکلروں یا سرکاری خبر رساں ایجنسیوں کے خبر ناموں کی پشت پر ہوتیں، جو سادی ہوتی ہے۔ دفتری مصروفیات باجماعت نماز سے مانع نہیں تھیں۔ چنانچہ پانچوں نمازیں باجماعت مسجد میں ادا ہوتیں۔ جہاں مغرب کے بعد اوابین اور عشاء کے بعد بھی طویل قرأت والی نفلیں (جو تہجد کے علاوہ) ہوتیں۔ صبح کو اشراق کی نفلوں کی بھی پابندی تھی۔ تقریباً تین بجے دوپہر کا کھانا ہوتا پھر تھوڑی دیر آرام (جو غالباً سنت کے اتباع میں تھا کیونکہ بہت مختصر ہوتا) پھر عصر کے بعد دوبارہ دفتر میں۔ رات کو عموماً گیارہ بجے کے قریب دفتر سے واپسی ہوتی، پھر کھانا، تھوڑی چہل قدمی اور پھر رات کی محفل جم جاتی جس میں ساتھ کتابیں قلم اور کاغذ ہوتا۔ بقول ناز انصاری مرحوم: "قلم کی صرصراہٹ کمرے کی خاموشی میں گونجتی رہتی"۔ کبھی کبھی آنکھ بھی آجاتی تو حروف لمبے یا ٹیڑھے ہوجاتے لیکن یہ اونگھ جو بہت مختصر ہوتی۔ تھوڑا نشاط ہی پیدا کرتی، قلم مزید سرگرمی سے دوڑنے لگتا۔ اور اسی طرح رات کو بارہ اور ایک کے درمیان ہی بستر کو رونق نصیب ہوتی۔ دوپہر کو کھانے کے دوران کبھی کبھی زیرِ تعلیم صاحبزادے کو کسی کتاب کا درس دیا جاتا یا سنا جاتا۔ صبح کو فجر کی نماز کے بعد معمول تھا کہ کمپنی باغ تک چہل قدمی کے لیے جاتے، واپسی میں چھوٹے بھائی مولانا سید احمد میاں صاحبؒ کے مکان پر محض دومنٹ کے لیے جاتے اور خیریت و عافیت معلوم کرکے آجاتے۔

۱۹۶۳ء میں منعقد ہونے والے اجلاس عام میں جو میرٹھ میں ہوا کچھ ایسے ناخوشگوار واقعات پیش آئے کہ مولانا محمد میاںؒ صاحب نے نظامت اعلیٰ سے استعفیٰ دے دیا۔ البتہ جمعیۃ علماء سے قدیمی اور قلبی تعلق کے پیش نظر مختلف خدمات کی ذمہ داری قبول فرمائی۔ اہم ذمہ داری جمعیۃ ٹرسٹ کی تھی جس کے تحت الجمعیۃ اخبار اور الجمعیۃ پریس و بکڈپو تھے۔ اگرچہ یہ ذمہ داریاں پہلے سے تھیں۔ اس کے علاوہ مختلف جدید مسائل پر بحث کرنے

اوران سے متعلق شرعی وفقہی نقطۂ نظر طے کرنے کے لیے 'ادارہ المباحث الفقہیہ' کا قیام عمل میں آیا۔ اس ادارہ نے مختلف مواقع پر سوال نامے مرتب کر کے ملک بھر کے علماء کرام کے پاس بھیجے اوران سے رائے طلب کی۔

ایک صاحب نے لندن سے تحریک ریشمی رومال سے متعلق برطانیہ کے خفیہ محکمہ کی خفیہ رپورٹوں کی فوٹو کاپی بھیجی جو کہ وہ وہاں کے قاعدہ کے مطابق ایک مدت گزر جانے کے بعد استفادۂ عام کے لیے رکھ دی گئی تھیں۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کی تحریک ریشمی رومال پہلے سے متعارف تھی لیکن پولیس کی خفیہ رپورٹیں دلچسپی سے خالی نہیں تھیں۔ مولانا نے پہلے ان کا اردو میں ترجمہ کرایا پھر ایک مبسوط مقدمہ کے ساتھ کتابی شکل میں الجمعیۃ بکڈپو سے شائع کیا۔

ایک دوسرا اہم کام مسلم محبان وطن کے حالات جمع کرنے کا تھا۔ آزادی کی تحریک میں مسلمانوں کا حصہ جتنا بڑا تھا، ملک کی فرقہ وارانہ ذہنیت اس کو اتنا ہی کم ثابت کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ مولانا اخبار میں اپیلیں کر کے کے ملک بھر سے محبان وطن کے حالات منگاتے۔ کسی علاقہ کے لوگ اپنے مجاہدین آزادی کے حالات بھیجتے تو ان کی ضروری تصحیح واصلاح کا کام مولانا کے ذمہ تھا۔ یہ حالات جمع ہوتے رہے لیکن ان کو کتابی شکل میں جمع کر کے شائع کرنے کی نوبت نہیں آئی۔

یہ کام بظاہر اتنے مشکل نظر نہیں آتے لیکن مولانا کی احتیاط پسند طبیعت اس کی اجازت نہیں دیتی تھی کہ سرسری طور پر مواد اکٹھا کر دیا جائے۔ مضامین کی نوک پلک درست کرتے اوران کو حتی الامکان قابل اعتبار بنانے کا کام آسان نہیں تھا۔ جبکہ تدریسی وتصنیفی مشغولیات ساتھ ساتھ تھیں۔ تحریک ریشمی رومال اور محبان وطن کے حالات کی ترتیب میں ایک بہت مخلص اور محنتی معاون مولانا تیسیر الدینؒ تھے جو اخبار الجمعیۃ میں ملازم تھے۔ اور انتہائی خوش اسلوبی سے مضامین کو اکٹھا کرتے اور مسودات کی تبییض کا کام انجام دیتے تھے۔

ایسی ہی بے لوث خدمتوں میں سے ایک 'فتاویٰ رحیمیہ' کی اشاعت تھی۔ مولانا مفتی

سید عبدالرحیم لاجپوری راندیری ایک جید عالم اور مفتی تھے۔ انھوں نے مولانا سے درخواست کی کہ وہ اپنی نگرانی میں مفتی صاحب کے فتاویٰ شائع کرادیں۔ مصارف اگرچہ مفتی صاحب نے ہی برداشت کئے لیکن فتاویٰ کی ترتیب وکتابت کا کام خود مشکل اور طویل تھا اور ایسے مواقع بھی آئے کہ کسی فتویٰ کے بارے میں مفتی صاحب سے تبادلہ خیال کیا گیا۔ فتاویٰ کا یہ مجموعہ نہ صرف مرتب ہوا بلکہ مولانا محمد میاںؒ کی نگرانی میں دو تین مرتبہ شائع بھی ہوا۔ مجموعہ ان کی زندگی میں چھ جلدوں پر مشتمل تھا، بعد میں مزید فتاویٰ شامل کئے گئے۔ تصنیف وتالیف کی تاریخ کم ازکم چالیس سال پر پھیلی ہوئی ہے، جس کا تذکرہ عنقریب آئے گا۔

مولانا کا جسم اکہرا لیکن مضبوط تھا۔ صحت عام طور پر اچھی تھی۔ لیکن تقسیم وطن کے بعد دیہاتی اور پہاڑی علاقوں اور مدارس ومکاتب قائم کرنے کی جدوجہد میں ضروری آرام نہیں رہا تھا، خود اس کی اہمیت کے بارے میں لکھا ہے:

> ''احقر کسی سیٹ کا امیدوار تو نہیں بنا مگر تمام امیدواروں کی خدمت دفتری حیثیت میں احقر کے زیرِ نگرانی تھی۔ یہ ہنگامے ۱۵راگست ۴۷ء کے یوم آزادی پر ختم ہوگئے جس کے بعد فرقہ واریت کے وہ ہنگامے شروع ہوگئے جو آج تک ختم نہیں ہوئے۔ ان کی داستان طویل بھی ہے اور دردناک بھی۔ ان ہنگاموں نے خدمات کا ایک نیا باب قائم کیا جس کا عنوان ریلیف ہے۔ یعنی اجڑے ہوؤں کو بسانا، کشتگان ستم کو دفنانا، مجروحوں کے زخموں پر دوا اور ہمدردی کی پٹیاں باندھنا اور تسکین اور دلداری کا مرہم لگانا اور ان کاموں کے لیے لوگوں سے بھیک مانگنا اور ان کی ضرورتوں کو پہچاننا۔ احقر نے ان خدمات میں بھی حصہ لیا مگر ان کو کہاں تک بیان کیا جائے:
>
> عمر بگذشت وحدیث درد ما آخر نشد
> شب آخر شد کنوں کوتہ کنم افسانہ را

شب وروز کی بھاگ دوڑ میں نہ آرام کا نظم تھا نہ کھانے کی ترتیب، پھر دفتر میں مسلسل نشست نے آخر صحت پر برا اثر ڈالا اور بواسیر کا مرض لاحق ہوگیا۔ جب شدت ہوتی تو کافی مقدار میں خون نکل جاتا اور کمزوری ہوجاتی۔ اس مرض سے تاحیات چھٹکارا نہ

ملا۔لیکن انتہائی کمزوری کے باوجود معمولات جن میں مدرسہ امینیہ میں درس حدیث جس کے لیے ایک لمبا راستہ پیدل اور سیڑھیاں چڑھ کر جانا ہوتا تھا، جاری رہا۔ وصال سے دو ہفتہ پہلے عید الفطر کی نماز کے لیے ترکمان گیٹ کے باہر مسجد فیض الٰہی میں ادا کرنے کے ارادے سے تشریف لے گئے لیکن وہاں جماعت ختم ہو چکی تھی تو قریب کی کلاں مسجد میں جانے کی ہمت کر لی۔ اس مسجد میں جانے کے لیے تقریباً تیس پینتیس سیڑھیاں ہیں جو غیر معمولی طور پر اونچی ہیں اور ایک جوان آدمی بھی اوپر تک پہنچنے میں تھک جاتا ہے۔ عید الفطر ۱۳۹۵ء کی نماز کے لیے آخری بار گھر سے نکلنا ہوا تھا۔ پھر کمزوری بڑھتی رہی اور آخر ۱۶رشوال ۱۳۹۵ھ مطابق ۲۲ر اکتوبر ۱۹۷۵ء کو وقت موعو آپہنچا۔ تدفین کی جگہ طے کرنے کے دوران گھر کے اندر سے پیغام آیا کہ حضرت کی وصیت تھی کہ عام قبرستان میں تدفین کی جائے۔ چنانچہ دہلی گیٹ کے باہر عام قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔

وراثتِ نسبی

مولاناؒ کی اولاد میں چار صاحبزادگان اور تین صاحبزادیاں ہوئیں۔ صاحبزادوں میں سب سے بڑے مولانا سید حامد میاںؒ تھے جو تقسیم وطن کے فوراً بعد پاکستان ہجرت کر گئے تھے۔ مولانا دارالعلوم سے فارغ التحصیل اور حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ مجاز تھے۔ نوعمری میں ہی تعلیم اور سلوک کے مراحل بہت تیزی سے طے کئے تھے، جس کا اعتراف واستحسان حضرت شیخ الاسلام کو بھی تھا۔ ایک خط میں مولانا محمد میاںؒ کے نام تحریر فرمایا:

> ''محترما! موصوف نے اس مدت میں سلوک میں نہایت بیش بہا ترقی کی ہے جو لوگوں کو سالہا سال میں حاصل نہیں ہوتی ہے۔ اگر وہ اسی رفتار پر رہا تو قریب ہے اس کو اس معیار پر مجاز ہونے کا فخر حاصل ہو جائے جو کہ حضرت گنگوہی قدس سرہ اللہ سرہ العزیز کا تھا۔''

لاہور میں انارکلی کی مسجد نیلا گنبد میں درس حدیث وخطابت کا کام شروع کیا۔

لاہور کے ماحول میں ایک دیوبندی عالم کے لیے بہت مشکلات تھیں لیکن موصوف کی قابلیت اوراخلاص کی بدولت ان کو بہت جلد مخلصین ومحبین کی ایک جماعت مل گئی اور جلد ہی مسجد ایک منارہ میں جامعہ مدنیہ کا قیام عمل میں آیا جس نے جلد ہی بہت ترقی کی اور پاکستان کے ممتاز علماء میں مولانا کا شمار ہونے لگا۔ ۱۹۸۷ء میں مولانا کا ترسٹھ سال کی عمر میں وصال ہوگیا۔''

دوسرے صاحبزادے حافظ سید خالد میاں تھے جنھوں نے ۱۹۵۹ء میں والد صاحب کی کتاب 'علماءِ حق اوران کے مجاہدانہ کارنامے' کی اشاعت جدید کے ساتھ کتابستان کوقائم کیا۔ اس ادارہ کا مقصد یہ تھا کہ مولانا محمد میاںؒ کی تصانیف کے ساتھ دوسرے مصنفین کی کتابیں معیاری انداز میں شائع کی جائیں۔ خود حافظ سید خالد میاں صاحب نے نماز کی کتاب مرتب کی جس کو بہت خوبصورت کتابت اور رنگین طباعت میں شائع کیا، جس میں نماز کی دعاؤں اوران کے ترجمے کے ساتھ نماز سے متعلق مسائل ایسے آسان اور عام فہم انداز میں سمجھائے جن کی وجہ سے وہ کتاب اب تک منفرد ہے۔ لیکن ۱۹۶۳ء میں خالد میاں جرمنی چلے گئے جہاں کمپیوٹر کی تربیت حاصل کی اور ایک ماہر پروگرامر بنے۔ جرمنی میں قیام کے دوران انھوں نے محسوس کیا کہ عام طور پرلوگ اسلام کے بارے میں کچھ باتیں جانتے یا بہت کم علم رکھتے ہیں یا غلط فہمیوں میں مبتلا رہتے ہیں، ایک مختصراور سادہ تعارف کرانے کی نیت سے خالد میاں نے کچھ عنوانات مقرر کرکے قرآن مجید کی آیات اور متعلقہ احادیث جمع کیں اور انگریزی میں ان کے ترجموں کواس طرح مرتب کیا کہ ایک عام قاری کو اسلام کے بارے میں کافی معلومات حاصل ہوجائیں۔ افسوس ہے کہ یہ مجموعہ پوری طرح تیار نہ ہوسکا۔ مولانا محمد میاںؒ کی حیات میں اور بعد میں بھی کئی مرتبہ ملاقات کے لیے آئے۔ ان کی خواہش تھی کہ رمضان مبارک کا عشرہ اخیرہ یہاں گزاریں اور قرآن مجید کی تلاوت سنیں۔ اسی غرض سے سنہ ۱۴۱۳ھ (۱۹۹۳ء) کے رمضان شریف میں دہلی آئے۔ ابھی دو روز ہی تراویح میں شریک ہوئے تھے کہ ہارٹ اٹیک ہوا اور ۲۹؍رمضان المبارک کی شب میں اٹھاون سال کی عمر میں واصل بحق ہوگئے اور تیس سال دور رہنے کے بعد والدین کے قدموں میں

دفن ہوئے۔

صاحبزادوں میں تیسرے نمبر پر مرتب مضمون ساجد میاں ہے جو درس نظامی کا فارغ التحصیل اور دہلی یونیورسٹی سے عربی ادب میں ماسٹر اور ڈاکٹریٹ کا سند یافتہ ہے۔ تقریباً ایک سال وزارت خارجہ کے شعبہ ترجمہ میں عربی کا ترجمان رہا پھر سعودی عرب کے سفارت خانہ واقع دہلی میں مختلف شعبوں میں تقریباً ۴۵ سال کی خدمات انجام دینے کے بعد سبکدوش ہوا۔

چوتھے صاحبزادے سید شاہد میاں ہیں جو گریجویٹ اور کمپیوٹر پروگرامنگ میں تقریباً تیس سال سعودی عرب میں آرامکو کمپنی کے ایک شعبہ میں کام کر کے سبکدوش ہوئے ہیں۔سید خالد میاں صاحب نے جو کتابستان قائم کیا تھا ان کے جرمنی جانے کے بعد ان دونوں بھائیوں کی زیرِ نگرانی رہا اور مولانا سید محمد میاںؒ کی تمام تصانیف حسب معمول شائع ہوتی رہیں۔

صاحبزادیوں میں اول نمبر خالدہ سلطانہ تھیں جو قاری سعید عالم استاذ شعبہ قراءت دارالعلوم دیوبند کے نکاح میں تھیں۔ رمضان المبارک ۱۴۲۳ھ (۲۰۰۴ء) میں وصال ہوا۔ قبرستان قاسمی میں تدفین ہوئی۔ دوسری صاحبزادی عائشہ سلطانہ ہیں جو مولانا محمد اسلم صاحبزادے حضرت مولانا قاری محمد طیب رحمہ اللہ کے نکاح میں ہیں۔مولانا اسلم صاحب کا ۲۰۱۷ء میں وصال ہوگیا۔تیسری صاحبزادی کا نکاح جناب بذل الرحمٰن صاحب صاحبزادے مولانا فضل الرحمٰن صاحب مفتی وشیخ الحدیث مدرسہ حسین بخش دہلی کے ساتھ ہوا۔

وراثت علمی

یہ ایک حقیقت ہے کہ تلامذہ یا تصانیف کی شکل میں ایک عالم کا ورثہ ہی زندہ رہنے والا ہوتا ہے۔مولانا محمد میاںؒ کی حیات مبارکہ کا یہ باب بہت وسیع، اہمیت کا حامل اور لائق اہتمام ہے جو زندگی کے ایک بڑے حصے یعنی کم از کم پچاس سال پر پھیلا ہوا ہے۔دارالعلوم سے فراغت کے فوراً بعد تدریسی سلسلہ شروع ہوگیا تھا جو وفات سے کچھ قبل تک جاری رہا۔

اس میں کچھ عرصہ ایسا گزرا جب بلاواسطہ تدریسی سلسلہ بظاہر منقطع رہا، یعنی جو زمانہ تقسیم کے دوران اور فوراً بعد سے ۱۹۶۳ء تک تھا، لیکن اس دوران جمعیۃ علماء ہند کی تعلیمی پالیسی کے تحت مکاتب کے قیام کا کام بھی بالواسطہ ایک تدریسی خدمت ہی تھی جو بہت دشوار اور تھکانے والی تھی۔ ہماچل پردیش اور مشرقی پنجاب کے دور دراز علاقوں میں مکاتب کا جاری کرنا اور ایسی جگہوں کا سفر جہاں آسانی سے پہنچنا ممکن نہیں تھا، ایک ایسی محنت تھی جس نے بلاشبہ مولانا کی صحت پر اثر ڈالا۔ بہرحال اس پورے عرصہ میں تلامذہ کی جس بڑی تعداد نے جن میں بہت سے نامور شخصیات بھی ہوئیں، زانوئے تلمذ تہہ کیا اور بعد میں علمی میدان میں اپنے جوہر دکھائے اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

تصنیف وتالیف کا اصل دور تو ۱۹۲۸ء سے ۱۹۶۲ء تک کا معلوم ہے، لیکن ہوسکتا ہے طالب علمی کے زمانہ میں بھی اس طرف توجہ رہی ہو۔ افسوس ہے کہ طالب علمی کے زمانے کے ہمعصروں میں سے کوئی اب بظاہر موجود نہیں ہے۔ بظاہر سب سے پہلی تصنیف مولانا کے شفیق استاد مولانا اعزاز علیؒ شیخ الادب دارالعلوم دیوبند کی ہدایت کے بموجب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ مبارکہ بچوں کے لیے لکھی گئی ''ہمارے پیغمبر'' تھی۔ اس کے بعد اسی موضوع پر بچوں کے لیے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ پر تین حصوں پر مشتمل ''تاریخ الاسلام'' اور درس نظامی کی مشہور کتاب ''نور الایضاح'' کا ترجمہ وشرح ہے۔ طالب علمی اور بعد میں درس کے دوران مختلف کتابوں کے حاشیوں اور جلد کے اندرونی صفحات پر اپنی آسانی کے لیے اشارات اور مختلف کتابوں کے حوالے اور مختصر جملے جو صرف اپنی یادداشت کے لیے لکھ لئے ہوں گے، ایک الگ قیمتی سرمایہ ہے، لیکن اس سے استفادہ اسی کے لیے ممکن ہے جو بحر علم کا غواص ہو۔

مولانا کی ایک تحریر کے مطابق تصانیف کی تعداد کم وبیش ستر ہے جن میں ضخیم کتابیں بھی ہیں اور مختصر رسالے بھی۔ بعض وقتی ضرورت کے مطابق لکھی گئی تھیں، جو بعد میں ناپید ہوگئیں۔ کچھ وہ ہیں جو مولانا کے نام سے شائع نہیں ہوئیں بلکہ کسی دوسرے نام سے کسی

دوسرے ادارے سے شائع ہوئیں جن کی تصریح نہ پہلے مناسب تھی نہ اب ہے۔ چند کتابوں کے نام اور مختصر تعارف حسب ذیل ہے:

سیرتِ مبارکہ

۱۔ **سیرت مبارکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم** چھ سو صفحات کی اس کتاب کے مضامین کا اصل ماخذ قرآن مجید کی آیات ہیں، جن کی مزید تشریح احادیث صحیحہ اور اقوال صحابہ کے ذریعہ کی گئی ہے۔ اس وجہ سے سرور کائنات حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ شخصیت سامنے آئی جو قرآن مجید نے پیش فرمائی ہے۔ کتاب کے شروع میں ایک مبسوط مقدمہ ہے جس میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے عرب معاشرہ کی تفصیل پیش کی گئی ہے۔ تاریخی حقائق کے دلچسپ تذکرہ کے ساتھ مصنف کی زبان کی ادبی چاشنی نے کتاب کو بار بار مطالعہ کرنے اور ساتھ رکھنے کے قابل بنا دیا ہے۔

۲۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کا عہد زریں اور مثالی حکومتیں

اس کتاب کا اصل ماخذ **ازالة الخفاء عن خلافة الخلفاء**، مصنفہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ہے جس کا اردو ترجمہ مصنف نے زمانہ اسارت میں شروع کیا تھا، لیکن بعد میں مضامین کے پھیلاؤ اور کثرت کی وجہ سے ایک مستقل کتاب بن گئی ہے۔ دو جلدوں اور تقریباً نو سو صفحات پر مشتمل اس کتاب میں یہ وضاحت کی گئی ہے کہ حضرات صحابہؓ رضوان اللہ علیہم واجب الاحترام کیوں ہیں۔ صحابہ کرام اہل اسلام کی آنکھ کا تارا ہیں۔ یہ محض ایک عقیدت ہے یا حقیقت۔ کلام الٰہی نے اس جماعت کے کیا فضائل بتائے۔ خلافت راشدہ اور اس کے مراتب، تاریخ اسلام میں خلافت راشدہ اور خلفاء راشدین کی اہمیت اور قرآن وحدیث سے اس اہمیت کے دلائل وشواہد۔ بلاشبہ یہ کتاب جس کا نام عہد زریں ہے، مصنف کی زندگی کے عہد زریں کی بہترین علمی صلاحیتوں کا نچوڑ اور شاہکار ہے، اور کتاب کا بنیادی مقصد حضرات صحابہ کی مقدس جماعت پر تنقید و تنقیص کے دروازے کو بند کرنا ہے جو تحقیق کے نام پر کھول دیا گیا ہے۔ مصنف کا طرزِ تحریر نہ صرف حقائق کو بیان کر کے حضرات صحابہ کی مبارک شخصیات

سے غبار کو صاف کرتا ہے بلکہ قاری کے دل کو ان کی محبت وعقیدت سے سرشار کر دیتا ہے۔

۳۔تاریخ الاسلام: بچوں کے لیے سوال وجواب کے انداز میں لکھی گئی یہ کتاب تین حصوں پر مشتمل ہے: پہلا حصہ سرور کائنات حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی، دوسرا مدنی زندگی اور تیسرا حصہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق وعادات کے ذکر میں ہے۔ یہ کتاب مدارس کے نصاب میں شامل ہے۔ زبان انتہائی سادہ اور انداز دلچسپ لیکن معتبر ہے۔

۴۔ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم: یہ سب سے پہلی تصنیف ہے جو استاذ محترم مولانا اعزاز علی صاحب کے حکم کی تعمیل میں بچوں کے لیے لکھی گئی۔ بچوں کے لیے لکھی گئی اس مختصر کتاب میں سیرت مبارکہ کو آسان انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ بھی داخل نصاب ہے۔ کتاب کے دوسرے حصہ میں اسلامی عقائد کی وضاحت کی گئی ہے۔ اس کا انگریزی ترجمہ بھی شائع ہوگیا ہے۔

۵۔شواہد تقدس: علمی تحقیق وجستجو کے نام پر جن صحابہ کرامؓ کو ہدف تنقید بنایا گیا ہے ان میں خلیفہ ثالث حضرت عثمان بن عفان ذی النورین رضی اللہ عنہ کا اسم مبارک سرفہرست ہے۔ اس کتاب میں ناقدین کے حوالوں اور دعوؤں کی حقیقت بیان کی گئی ہے اور حضرت ذی النورینؓ کی مقدس شخصیت کے شواہد پیش کیے گئے ہیں۔

سیاسی تاریخ اور تحریک آزادی

۶۔علماء ہند کا شاندار ماضی: مصنفؒ کی شہرۂ آفاق اور بےنظیر کتاب ہے جس کی پہلی اشاعت پر کتاب ضبط ہوگئی، پریس بند کر دیا گیا اور مصنف پر مقدمہ چلا۔ چار جلدوں پر مشتمل اس کتاب میں مجدد الف ثانیؒ جن کی زندگی میں تین بادشاہ، اکبر، جہانگیر اور عالم گیر سریر آرائے سلطنت ہوئے اور بادشاہ اکبر کے زمانہ میں دین الٰہی کی شکل میں جو کفر والحاد کا فتنہ اٹھا تھا، اس کا سدباب کیا اور اس جدوجہد میں قید وبند کی مصیبت برداشت کی۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ کی جدوجہد وقربانیوں کے نتیجہ میں بادشاہ عالمگیرؒ کے زمانہ تک اس فتنہ کا قلع

قمع ہو چکا تھا۔ حضرت مجدد الف ثانی، ان کے خلفاء اور خلفاء کے خلفاء کے سوانح، ان کے معاصرین کے حالات اور سیاسی کارنامے اور اس زمانہ کا سیاسی وحکومتی نظام نہایت خوبی سے پیش کیا گیا ہے۔

دوسرا حصہ: حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے سیاسی نظریات، ان کی تعلیم و تربیت کے مراکز، حضرت سید احمد شہید ان کے رفقاء کے مجاہدانہ کارنامے اور قربانیاں۔

تیسرا حصہ: علماء صادق پور اور ان کے پراسرار مجاہدانہ کارنامے، سکھوں کی حکومت کا زوال وغیرہ۔

چوتھا حصہ: برطانوی استعمار کے خلاف علماء کرام کی جدوجہد کی تاریخ پر مشتمل ہے، اور علماء کی جدوجہد کی چارسوسالہ تاریخ کے سب سے خونیں دور سے متعلق معلومات کا انسائیکلوپیڈیا ہے۔ یہ تمام واقعات انتہائی مستند اور قابل اعتبار حوالوں سے ماخوذ ہیں۔ مصنف کی یہ کتاب بہت مشہور ہے اور اسے اپنے موضوع پر ایک ریفرنس مانا جاتا ہے۔

۷۔ علماء حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے: تحریک آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد برطانوی حکومت کے دوران علماء کا کردار اور جدوجہد اور اس کے نتیجہ میں ہونے والی قربانیاں۔ اس کتاب کے دوسرے حصے میں ملک کی آزادی اور تقسیم کے بعد کے حالات اور اس دور میں جمعیۃ علماء ہند کی خدمات کا ذکر ہے۔

۸۔ ہندوستان شاہان مغلیہ کے عہد میں: بقول مصنف یہ 'علماء ہند کا شاندار ماضی' کا تتمہ ہے۔ دوسرے الفاظ میں وہ شاندار ماضی کی داستان تھی اور یہ 'داستان بربادی' ہے۔

۹۔ پانی پت اور بزرگان پانی پت: حضرت شاہ قلندرؒ اور آپ کے معاصرین اور پانی پت کی تاریخ پر ایک دلچسپ اور معلوماتی کتاب ہے۔

۱۰۔ دورِ حاضر کے سیاسی واقتصادی مسائل اور اسلامی تعلیمات کے اشارے۔

۱۱۔ ہمارا وطن اور اس کی شرعی حیثیت۔

۱۲۔ اسلام اور حفاظت جان۔

۱۳۔مسلم سوشلسٹ۔
۱۴۔صالح جمہوریت اور معتبر جمہوریت۔
۱۵۔سورہ فاتحہ کی سیاسی تفسیر۔اقامت امت کا دستور اساسی۔
۱۷۔اسلام اور اسلامی فکر کیا ہے؟
۱۸۔دین و دنیا کا سنگم۔
۱۹۔حیات مسلم۔مسلمان کی زندگی مہد سے لحد تک۔
۲۰۔اسلام کیوں؟
۲۱۔قرآن حکیم اور تفسیر انسانیت۔
۲۲۔انسان اور انسانیت منزل بمنزل۔
۲۳۔مراد آباد جیل میں درس قرآن کی سات مجلسیں (شیخ الاسلام کی تقاریر)
۲۴۔آنے والے انقلاب کی تصویر۔
۲۵۔خطرناک نعرے۔
۲۶۔دو منشورہ (بسلسلہ مودودیت)
۲۷۔حواشی بر تقریر دل پذیر (از حضرت مولانا نانوتویؒ)
۲۸۔حواشی بر انتصار
۲۹۔مشکوۃ الآثار۔احادیث مبارکہ کا ایک مختصر مجموعہ جو درس نظامی میں مشکوۃ سے پہلے پڑھایا جاتا ہے۔دارالعلوم دیوبند کے نصاب میں شامل ہے۔
۳۱۔اسلامی تعلیمات کا مرقع۔ایک چارٹ کی شکل میں ابتدائی تعلیمات درجہ کی گئی ہیں۔
۳۲۔مسنون دعائیں۔دعاؤں کا ایک مختصر مجموعہ ہے جس کے شروع میں ایک مفید مقدمہ ہے۔
۳۳۔اربعین۔چالیس احادیث کا مجموعہ ہے ترجمہ و شرح۔

۳۴۔مجموعہ خطبات ماثورہ ومنقولہ: جمعہ وعیدین کے لیے خطبات کا مجموعہ جس کا ترجمہ تقریر کےانداز میں پیش کیا گیا ہے۔

۳۵۔روزہ وزکوۃ۔

۳۶۔اسلامی تقریبات بچوں کے لیے

۳۷۔رویت ہلال رمضان وعید: رویت ہلال کے بارے میں جمعیۃ علماء ہند کا فتویٰ

۳۸۔چاند تارے، زمین وآسمان، تسخیر کائنات کی کوششوں کے ساتھ جو سوالات پیدا ہوتے ہیں ان کے بارے میں شرعی رہنمائی۔

۳۹۔حیات آدم-دنیا کی پہلی آبادکاری۔

دینی تعلیم وتربیت

بطور معلم اور ماہر تعلیم مولانا سید محمد میاں کا ایک بڑا کارنامہ وہ تعلیمی تصانیف ہیں جو آپ نے مرتب فرمایا، جس میں نہ صرف طلباء کے لیے ٹیکسٹ بکس ہیں بلکہ استادوں کی تربیت کے لیے بھی مواد موجود ہے۔

۴۰۔دینی تعلیم کے رسائل، ۱۲حصوں میں جمعیۃ علماء ہند کے مکاتب میں رائج ہیں۔

۴۱۔طریقہ تقریر۔دو حصوں میں

۴۲۔تعلیمی چارٹ اور تعلیم کارڈ

۴۳۔مسئلہ تعلیم اور طریقہ تعلیم۔

☆☆☆☆☆

اس مضمون کی تیاری میں مندرجہ ذیل مآخذ سے مدد لی گئی:

۱۔ تذکرہ سادات رضویہ، مرتبہ مولانا محبوب رضوی

۲۔ خودنوشتہ یادداشتیں، مولانا سید محمد میاںؒ

۳۔ مضمون مولانا سید حامد میاںؒ: مطبوعہ رسالہ بینات کراچی

مرتب: ساجد میاں

حضرت داداجانؒ کی کچھ یادیں کچھ باتیں

حضرت مولانا سیّد محمود میاں صاحب مدظلہم
شیخ الحدیث جامعہ مدنیہ لاہور

حضرت داداجان مولانا سیّد محمد میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہندوستان میں ہی تھے، حضرت والد صاحبؒ پاکستان تشریف لا چکے تھے۔ والد صاحب کا جو عقدِ ثانی ہوا وہ پاکستان میں ہماری والدہ سے مئی ۱۹۵۴ء میں ہوا اور جولائی ۱۹۵۶ء میں میری پیدائش ہوئی ہے اور ۱۹۵۷ء میں جب میں گیارہ ماہ کا تھا تو حضرت والد صاحبؒ ہندوستان تشریف لے گئے تھے، والدہ صاحبہ بھی ہمراہ تھیں۔ یہ ہمارے شعور سے پہلے کی باتیں ہیں۔

پھر حضرت والد صاحب کا جو دوسرا سفر ہوا، وہ فروری ۱۹۶۰ء میں ہوا ہے اور اُس سفر میں میں بھی ساتھ تھا اور اُس وقت میری عمر تقریباً چار سال تھی۔ میری دو چھوٹی بہنیں بھی اس سفر میں ہمراہ تھیں۔ اس دوسرے سفر کی کچھ چیزیں مجھے یاد ہیں۔ داداجانؒ کا گھر تھا بلی ماران میں کرایہ کا تھا، بلی ماران قدیم دلی میں ہے جیسے ہمارے ہاں قدیم لاہور ہے۔ اس گھر کا نقشہ ابھی بھی میرے ذہن میں ہے۔ دروازہ سے داخل ہوتے ہی صحن ہے اور صحن کے بعد پھر ایک دالان نما کمرہ ہے، اس کے اندر سونے بیٹھنے کے لیے چار پائیاں بچھی تھیں اور بائیں ہاتھ کی طرف کچھ کمرے تھے۔

قلم دان، تصنیف وتالیف:

دروازے سے داخل ہوتے ہی سامنے والے دالان میں جو صحن کی طرف کا کونہ ہے، داداجان رحمۃ اللہ علیہ کا تخت ہوتا تھا اور اُس پر اُن کا قلمدان اور کتابیں وغیرہ رکھی رہتی

تھیں۔وہیں بیٹھ کر وہ تصنیف وتالیف فرماتے تھے۔آنے جانے والے ہر ایک پر ان کی نگاہ بھی پڑتی تھی، وہاں پر ہمیں اپنا کھیلنا، کودنا، اُٹھنا، بیٹھنا، دادا جان سے باتیں کرنا اوران کا ہر وقت لکھنے میں لگے رہنا، یاد ہے۔

میرے ذہن میں دیوبند کا بھی نقشہ ہے کہ ہم دیوبند بھی گئے تھے۔اب تو دیوبند کی آبادی بہت ہوگئی، اُس وقت چھوٹی پتلی سی ایک سڑک تھی، آبادی سے دُور دُور کھیتوں میں تانگا کھڑا تھا۔ والد صاحب اور والدہ صاحبہ اندر دیوبند کی بستی میں گئے، ہم تانگے میں ہی بیٹھے رہے۔ہمارے پاس سے گاڑیاں اور گنے کے ٹرک کبھی کبھی گزرتے تھے اور ہم یہ منظر دیکھ رہے تھے۔

پاکستان کا سفر:

۱۲رشعبان ۱۳۸۷ھ/نومبر ۱۹۶۷ء میں حضرت دادا جان رحمۃ اللہ علیہ پاکستان تشریف لائے تھے اور رمضان سے قبل واپس تشریف لے گئے۔ہمارے کھیل کی عمر تھی۔ ۱۹۶۷ء میں ہماری عمر گیارہ بارہ سال تھی۔ہم بھی گنڈا سنگھ والا بارڈر والد صاحب کے ساتھ مکہ پریس والے حاجی رشید صاحب مرحوم کی گاڑی میں گئے۔واہگہ بارڈر پر دادا جان رحمۃ اللہ علیہ تشریف لائے تو ان کا چہرہ فرط مسرت سے دمک رہا تھا۔ان سے ملاقات ہوئی، سامان وغیرہ رکھا گیا، ان کے سامان سے ایک عجیب طرح کی خوشبو آرہی تھی، جس سے ہم بڑے نہال ہورہے تھے اور ان کے سامان پر ہماری للچائی نظریں پڑ رہی تھیں۔یہ خوشبو تھی ''چیکو'' کی! چیکو بڑا خوشبودار پھل ہے، یہاں پاکستان میں ہوتا ہی نہیں تھا، اب چند سالوں سے آنے لگا ہے، ورنہ آتا ہی نہیں تھا۔شروع میں یہاں کے لوگ اسے آلو سمجھتے تھے۔ہم حضرت دادا جان رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ واپس ہوئے اور جب فیروز پور روڈ پر ماڈل ٹاؤن کے قریب پہنچے تو گاڑی خراب ہوگئی، اُس میں کافی وقت لگا۔سڑک کے کنارے کپڑا اچھا کر والد صاحب، دادا جان بیٹھے اور ہم بھی ان کے پاس ہی بیٹھے۔گاڑی ٹھیک ہوئی تو گھر پہنچے۔ اس سفر میں جہاں بھی دادا جان رحمۃ اللہ علیہ کی لاہور میں آمد و رفت ہوتی ہم بھی

ان کے ساتھ ہوتے۔

شیرانوالہ کی دعوت:

اس میں جو دعوتیں مجھے یاد ہیں، اُن میں سب سے بڑی دعوت شیرانوالہ میں حضرت مولانا عبیداللہ صاحب انور رحمۃ اللہ علیہ نے کی تھی۔ وہ بہت پروقار، بہت شاندار، پرتکلف اور بڑی دعوت تھی! میں شیرانوالہ کی دعوتوں میں جاتا رہا ہوں، مگر اتنی پرتکلف دعوت اور اتنی بڑی دعوت میں نے شیرانوالہ میں نہیں دیکھی۔ بہت انواع واقسام کے کھانے اور مٹھائیاں تھیں، دسترخوان بہت زیادہ پرتکلف تھا۔

حضرت مفتی صاحبؒ لاہور تشریف لے آئے:

پھر مفتی محمود صاحب رحمۃ اللہ علیہ حضرت دادا جان کے شاگرد تھے، جب ان کو پتہ چلا تو وہ بطور خاص لاہور تشریف لے آئے اور دادا جانؒ کی خدمت میں دو دن لاہور ہی میں رہے۔ مفتی صاحب دادا جان کو تاریخی مقامات کی سیر کرانے کے لیے لے گئے۔ شالیمار باغ کا ہمیں اچھی طرح یاد ہے۔ میں اور وحید میاں بھی ساتھ تھے۔ شالیمار باغ میں ہم بہت دیر تک رہے، وہیں ہم نے عصر یا ظہر کی نماز بھی پڑھی۔ مجھے یاد ہے کہ وہیں باغ میں جو تالاب بنے ہوئے تھے اُن میں سے ایک تالاب سے مفتی محمود صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے وضو کیا، اُس کے بیچ میں ایک چوہا مرا ہوا تیر رہا تھا، تو ہم نے شور مچاتے ہوئے مفتی صاحب سے کہا کہ اس میں یہ چوہا مرا ہوا ہے اور آپ اس سے وضو کر رہے ہیں؟ مفتی صاحب نے فرمایا کہ یہ بڑا تالاب ہے، بڑا ہونے کی وجہ سے یہ ناپاک نہیں ہوا۔ اور مرا ہوا چوہا تھا بھی بہت دُور، اُسے ہاتھ سے پکڑ کر یا کسی چیز سے دھکیل کر نکالا بھی نہیں جا سکتا تھا۔

اُس زمانے میں ہمارے ہاں مہمان داری بہت رہی۔ جامعہ کے مہمان خانہ کی بیٹھک میں دادا جان کا انتظام کیا گیا تھا۔ مہمانوں کی کثرت سے آمد ورفت تھی۔

پوتی کی شادی میں شرکت:

حضرت دادا جان رحمۃ اللہ علیہ کے اس سفر کی ایک غرض یہ تھی کہ ہماری ایک ہمشیرہ

کی شادی طے تھی، جس میں شرکت کی غرض سے آپ تشریف لائے تھے۔

اپنا اُگالدان خود مانجھا:

مولانا حبیب الرحمٰن اشرف صاحب عرف پیر صاحب جامعہ مدنیہ کے قدیم فضلاء میں سے ہیں۔ حضرت دادا جانؒ کے بارے میں مجھے بتلایا کہ جن دنوں حضرت پاکستان تشریف لائے ہوئے تھے تو میزبانی کی غرض سے میں حاضر باش رہتا تھا۔ ایک دن کیا دیکھتا ہوں کہ غسل خانہ میں اپنا اُگالدان خود مانجھ کر دھو رہے ہیں! میں حیران رہ گیا، میں نے بہت کچھ عرض ومعروض کی مگر سب بیکار!

بعد فجر تن تنہا سیر:

دوسری بات یہ بتاتے ہیں کہ لاہور جس دن تشریف لائے، اُس سے اگلی صبح ناشتہ سے پہلے میں نے عرض کیا کہ آج آپ کو بادشاہی مسجد اور قلعہ کی سیر کرائیں گے تو فرمانے لگے کہ میں دونوں جگہوں کی سیر کر چکا ہوں! میں نے حیرت سے پوچھا کہ کب؟ تو فرمایا کہ فجر کی نماز کے بعد چہل قدمی کے لیے گیا تھا تو یہ مقامات بھی دیکھ آیا! پیر صاحب کہتے ہیں میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ اتنا بڑا آدمی پردیس میں، وہ بھی تن تنہا، خادم ہمراہ نہ کوئی عزیز، بے اطلاع چپکے سے؟ پیر صاحب فرماتے ہیں کہ میں نے بعد میں یہ باتیں مولانا عبیداللہ انور صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو سنائیں تو اُن پر رقت طاری ہوگئی اور روتے رہے اور فرماتے رہے کہ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں!

حج کا تحفہ: بندوق پھر ترازو:

دادا جان رحمۃ اللہ علیہ ١٩٧٠ء میں حج پر تشریف لے گئے، ہم یہاں پاکستان میں تھے۔ ہمیں جب اطلاع ملی تو بہت خوشی ہوئی کہ دادا جان حج پر گئے ہیں۔ دادا جان کا خط والد صاحب کے پاس آتا تھا تو اس میں ڈھیر ساری دعائیں ہم لوگوں کے ہوتی تھیں جو زندگی کا اصل سرمایہ ہیں۔ لیکن جب واپس آئے تو میرے لیے اور وحید میاں کے لیے ''کھلونا بندوق'' لائے، جس کے شروع میں ربڑ کا ایک کاگ تھا، ڈوری بندھی ہوئی تھی، تاکہ وہ گم نہ

ہو جائے۔ ہم لوگ ڈوری لگا لیتے تھے اور چلا لیتے تھے۔ اس تحفے پر ہم بہت خوش اور بے حد شادمان تھے۔ اسی طرح انہوں نے ایک دفعہ تحفے میں ہمیں ''ترازو'' بھیجی۔ ''ترازو'' میں بھی ایک سبق ہے کہ اس میں عدل اور انصاف کی طرف اشارہ ہے اور ''بندوق'' میں بھی ایک سبق ہے کہ یہ انصاف اور عدل کی محافظ ہوتی ہے۔ ان تحائف میں بھی ایک قسم کی تربیت ان کے پیش نظر رہی ہوگی۔

''نکھٹو'' کو پائلٹ بنا دو:

جب میں نے پڑھنا شروع کیا تو بڑا ہی نکھٹو تھا، چلتا ہی نہیں تھا اور شوق جنگی پائلٹ بننے کا تھا۔ میں نے وہ خط تو نہیں دیکھا لیکن والدہ نے بتایا کہ حضرت والد صاحب نے دادا جان کو لکھا کہ یہ تو پڑھتا ہی نہیں ہے، سالوں ہو گئے عمر ضائع ہو رہی ہے اور کہتا ہے کہ پائلٹ بننا ہے۔ اس پر حضرت دادا جان رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا تھا کہ اگر اس کو پائلٹ بننے کا شوق ہے تو روکیں نہیں، بننے دیں!

۱۹۷۵ء میں حضرت دادا جان رحمۃ اللہ علیہ کی وفات ہوئی ہے تو میں اُس زمانے میں طالب علم تھا، کراچی گیا ہوا تھا۔ ایک ونگ کمانڈر منور صاحب حضرتؒ کے دوست تھے، ریٹائر ہو چکے تھے، اُنہیں میرے شوق کا پتہ چلا تو انہوں نے کہا کہ میں اسے جہاز دکھاؤں گا۔ کراچی کا جو پی اے ایف بیس ہے ڈرگ روڈ پر، مجھے وہاں لے گئے اور جہاز دکھائے۔ انھوں نے کہا کہ اگلے دن آپ کو جہاز کے اندر بٹھا کر بھی دکھائیں گے۔ مگر افسوس کہ اگلے دن مجھے کراچی میں اطلاع ملی کہ دادا جان رحمۃ اللہ علیہ کی وفات ہو گئی ہے۔ دہلی میں بیمار چل ہی رہے تھے، وفات سے تقریباً چوبیس گھنٹے قبل دہلی کے جی پی ہسپتال (جے پرکاش نارائن ہسپتال، اس سے قبل اس کا نام غاصب فرنگیوں کی کسی لیڈی ''اِروِن'' سے موسوم تھا) میں داخل کرایا گیا تھا مگر جانبر نہیں ہو سکے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

شاگردوں سے کام نہیں لیتے، خود انجام دیتے:

مفتی [محمود] صاحبؒ مراد آباد میں زیر تعلیم تھے اور حضرت دادا جانؒ کی خدمت

میں رہتے تھے۔ اُس زمانہ کی ایک بات میں نے حضرت والد صاحبؒ سے خود سنی ہے یا حضرت مفتی صاحبؒ والد صاحب کو سنا رہے تھے اور میں سن رہا تھا کہ حضرت دادا جان کی عادت تھی کہ اپنا کام خود کیا کرتے تھے، شاگردوں سے نہیں کرواتے تھے۔

حضرت مفتی صاحبؒ نے یہ بھی فرمایا کہ اگر کوئی چیز اُن سے دُور اور میرے قریب پڑی ہوتی تب بھی یہ نہیں فرماتے تھے کہ یہ مجھے دے دو بلکہ خود اُٹھ کر لے لیا کرتے تھے۔

بچوں کی تربیت:

میں نے یہ دیکھا کہ دادا جان رحمۃ اللہ علیہ بچوں کی اور خاص طور پر عزیز و اقارب کی تربیت اور روک ٹوک کے معاملے میں بالکل دیر نہیں کرتے تھے۔ پیار سے سمجھاتے اور اگر سختی کی، ترش لہجہ کی ضرورت پڑتی تو ترش لہجہ بھی استعمال فرماتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ہمارے خاندان کے ایک نوجوان جو اٹھارہ اُنیس سال کے رہے ہوں گے، وہ دادا جان رحمۃ اللہ علیہ کے پاس آئے ہوئے تھے۔ چار پائیوں پر مہمان بیٹھے ہوئے تھے، جس چار پائی پر دادا جانؒ بیٹھے تھے اُس کی پائینتی کی طرف جگہ خالی تھی تو وہ نوجوان پائینتی کی طرف بیٹھ گئے اور دادا جان رحمۃ اللہ علیہ کی طرف پشت کر لی۔ دادا جانؒ نے ان کو تنبیہ کہ آپ کیسے بیٹھیں؟ جب اُنہیں سمجھ میں نہ آیا تو دادا جانؒ نے ان کو پیچھے کمر سے پکڑ کے قدرے تلخ لہجہ میں کہا کہ بڑوں کی طرف پشت کر کے نہیں بیٹھا کرتے، یوں بیٹھو۔ پھر انہیں سمجھ میں آیا اور وہ اُٹھے اور ٹھیک ہو کر بیٹھے۔

دانتوں کی صفائی، آداب وسلیقہ:

ہمیں یہ بھی یاد ہے والد صاحبؒ اور دادا جانؒ اُٹھنے، بیٹھنے اور کھانے پینے کے آداب وتمیز پر بڑی گہری نظر رکھتے تھے اور اس پر ڈانٹتے بھی تھے۔ ہمیں یاد ہے کہ بچپن میں اگر دانت کسی دن صاف نہیں کیے، گندے رہ گئے تو پھر گھورتے تھے اور کبھی چپت بھی لگاتے تھے کہ یہ کیسے دانت ہو رہے ہیں؟ گندے لڑکے! جاؤ صاف کرو۔ اسی طرح بچپن میں اگر

کھانے میں چپ چپ کی آواز نکلتی تھی تو یہ بھی چھڑائی جاتی، بعض دفعہ مجھے یاد ہے کہ منہ پر ہلکا سا چپت بھی لگاتے تھے۔

''مخمل'' پر نہیں بیٹھے:

لاہور میں قاری عمر صاحب مرحوم حضرت والد صاحبؒ کے ساتھیوں میں تھے۔ یہ اصل میں افغانستان کے سردار خیل قبیلہ کے تھے، اب بھی افغانستان کا جو بادشاہ ہے وہ سردار خیل قبیلہ کا ہے۔ قاری صاحب میرے رضاعی والد ہوتے ہیں، کیونکہ ان کی اہلیہ نے مجھے بچپن میں دودھ پلایا تھا۔ اس لیے وہ رضاعی والدہ تھیں اور یہ رضاعی والد تھے۔ یہ حضرت والد صاحبؒ کے ساتھی بھی تھے اور بہت زیادہ حضرتؒ کے قریب تھے۔ جب شروع شروع میں حضرت دادا جان لاہور تشریف لائے تھے تو انہوں نے بھی دعوت کی تھی۔ قاری صاحبؒ نے بتایا کہ جب وہ تشریف لائے تو میں نے مخمل کی بڑی عمدہ نئی رضائی پیٹی سے نکال کر ان کے لیے بچھائی، جب تشریف لائے تو اس پر بیٹھنے کے بجائے کنارے کھڑے ہو گئے اور اس کے دونوں پلوں کو پکڑا اور دوسری طرف جو آدمی تھا اس سے بھی پکڑنے کے لیے کہا پھر اسے اُلٹا کر دیا یعنی استر اُوپر کر دیا مخمل نیچے کر دیا، پھر فرمایا: ''مخمل جنت کے لیے ہے، یہاں کے لیے نہیں ہے، یہاں ہم اس پر بیٹھیں گے۔''

اس سفر میں دادا جان رحمۃ اللہ علیہ کے اور بھی بہت سے اسفار ہوئے تھے۔ گوجرانوالہ کا بھی سفر کیا، لیکن اس کی باتیں مجھے یاد نہیں ہیں، اس معاملے میں مولانا زاہد الراشدی صاحب نے اپنے کسی مقالہ میں لکھا ہے، لیکن وہ محفوظ میرے پاس نہیں ہے۔

دو شادیاں:

حضرت والد صاحبؒ چند ماہ کے تھے یا چند دن کے کہ اُن کی والدہ رحمۃ اللہ علیہا کی وفات ہو گئی تھی۔ اُن کا نام ''فاطمہ'' تھا۔ پھر دادا جان رحمۃ اللہ علیہ کی باقی جتنی اولاد ہیں، وہ ہماری دادی مرحومہ کے بعد دوسری شادی جو کی تھی، اُن سے ہیں۔

خوف وخشیت، بیٹے سے معافی:

حضرت والد صاحبؒ نے مجھے خود یہ بات سنائی کہ ہندوستان میں کسی بات پر دادا جان کو بھائی جان کے ایک معاملے میں میرے بارے میں غلط فہمی ہوئی اور اس میں انہوں نے مجھ کو غلط اور قصور وار ٹھہرا کر بہت خفگی کا اظہار کیا اور بہت ڈانٹ ڈپٹ کی۔ بات آئی گئی ہوگئی تھی، لیکن مدتوں بعد لاہور میں اب مجھ کو ابا کا خط آیا کہ

''فلاں بات جو ایسے ہوئی تھی اُس پر میں نے تمہیں ڈانٹا تھا تو وہ میں نے تمہیں غلط ڈانٹا تھا، تم مجھے اب معاف کردو۔''

دادا جان کی یہ بات والد صاحب نے بڑی مشکل سے دوہرائی، ان پر بکا (رونے) کا غلبہ تھا۔ حضرت والد صاحب نے فرمایا ''انہیں ضرورت نہیں تھی کہ مجھے یہ معافی کا لکھیں، کیونکہ میں نے تو اس بات کو دل میں نہیں رکھا، میرے والد ہیں، ڈانٹ دیا، کوئی حرج نہیں۔''

بیٹے کی سعادت:

لیکن بیٹے کی بھی سعادت تھی کہ انہوں نے اُس وقت باوجود اس کے کہ یہ قصور وار نہیں تھے، اس کو سہہ گئے، اپنی نہ صفائی دی نہ کچھ بولے، بس ادب سے خاموش رہے! اور اس سے بڑی بات یہ ہے کہ اتنی مدتوں بعد والد اپنے بیٹے سے معافی طلب کر رہا ہے حالانکہ بیٹے کے ساتھ تو ایسے معاملات ہوتے ہی ہیں۔ اللہ کے ہاں بظاہر ایسی چیزوں میں مواخذہ بھی نہیں ہے کہ والدین جو بھی اولاد کے ساتھ کرتے ہیں خیر کی نیت سے ہی کرتے ہیں، لیکن اس کے باوجود ان کی بڑائی ہے کہ وہ اپنے بیٹے سے معافی طلب کر رہے ہیں!

عین وفات کی حالت اور والد صاحبؒ کی مسرت:

حضرت دادا جانؒ کی عین وفات کے وقت کی حالت جاننے کا حضرت والد صاحب کو بہت شوق تھا۔ کسی نے یہ لکھا تھا والد صاحب کو کہ وہ آپ کو بھی یاد کرتے رہے!

والد صاحب کو یہ بات سن کر کوئی خاص خوشی نہ ہوئی ! جیسے عام طور پر بیٹوں کو خوشی ہوتی ہے کہ مجھے یاد کیا۔لیکن بعد میں جب تفصیل آئی تو معلوم ہوا کہ وفات سے ایک رات پہلے یاد کیا تھا۔اور جب یہ پتہ چلا کہ وفات کے وقت یہ آیت تلاوت کر رہے تھے:

﴿ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ اَنْتَ وَلِيّٖ فِى الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ تَوَفَّنِىْ مُسْلِمًا وَّ اَلْحِقْنِىْ بِالصّٰلِحِيْنَ ﴾ سورہ یوسف : ۱۰۱

اور صرف اللہ کو یاد کر رہے تو اس پر حضرت والد صاحب باغ باغ ہو گئے۔وفات کا صدمہ تو فطری ہوتا ہی ہے، وہ تو تھا ہی،لیکن اچھی موت کی تو ہر مومن کو خوشی ہوتی ہے کہ ہمارے فلاں کی موت اچھی ہوئی۔رحمهما الله تعالٰی رحمة واسعة

﴿ رَبَّنَا اغْفِرْلِىْ وَ لِوَالِدَىَّ وَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ يَوْمَ يَقُوْمُ الْحِسَابُ ﴾ سورہ ابراہیم : ۴۱

☆☆☆☆☆

بندۂ ناچیز محمود میاں غفرلہٗ بن سیّد حامد میاں بن سیّد محمد میاں رحمہما اللہ تعالیٰ
خادم جامعہ مدنیہ جدید و خانقاہِ حامدیہ رائیونڈ روڈ لاہور پاکستان
دوشنبہ ۲؍ربیع الثانی ۱۴۴۰ھ/۱۰؍دسمبر ۲۰۱۸ء

ملاحظہ: بمقام دہلی جمعیۃ علماءِ ہند کے زیر اہتمام منعقدہ سمینار مورخہ ۱۵،۱۶؍دسمبر ۲۰۱۸ء میں پیش کیا گیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حضرت مولانا محمد میاں دیو بندیؒ
ملت کی ایک بڑی کارگزار اور ناقابل فراموش شخصیت

(مولانا سید) محمد واضح رشید حسنی ندوی، معتمد تعلیم ندوۃ العلماء

آج جب یہ مجموعہ مقالات پریس میں جا رہا ہے، حضرت مولانا سید محمد واضح رشید حسنی (وفات: ۹/ جمادی الاولیٰ ۱۴۴۰ھ مطابق ۱۶/ جنوری ۲۰۱۹ء بروز بدھ) زمرہ اسلاف میں شامل ہو چکے ہیں، میری ان سے صرف ایک ملاقات ہے، ستمبر میں اسی سیمینار کے تعلق سے برادر مکرم مولانا فیصل ندوی بھٹکلی کی معیت میں حضرت مولانا سے ملاقات کی، انھوں نے جس شفقت و محبت اور حوصلہ افزائی کا معاملہ کیا، میں اسے کبھی نہیں بھول سکتا۔ انھوں نے فرمایا کہ میں مقالہ بھی لکھوں گا اور طبیعت ٹھیک رہی تو شرکت کی بھی کوشش کروں گا، انھوں نے مقالہ لکھ کر اپنے پوتے مولانا منصور حسنی صاحب کو بھیجا اور انھوں نے اسے سیمینار میں پیش کیا، اور سیمینار کے بعد انھوں نے مجھے ایک خط لکھا جو میرے لئے فخر اور سعادت کی بات ہے، ذیل میں اس خط کو ملاحظہ فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ حضرت کو اپنے شایانِ شان اجر عطا فرمائیں اور اعلیٰ علیین میں جگہ دیں۔ آمین (ضیاء الحق خیر آبادی)

عزیز القدر جناب مولانا ضیاء الحق خیر آبادی صاحب   حفظکم اللہ تعالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید ہے کہ بخیر و عافیت ہوں گے، عزیزی منصور حسن حسنی ندوی اور عزیزی محمد امین حسنی ندوی نے آپ کے سیمینار بعنوان ''مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد بہاریؒ'' و

''مولانا سید محمد میاں دیوبندیؒ'' کی روداد سنائی ، بڑی خوشی ہوئی ، ماشاء اللہ سیمینار بہت کامیاب رہا اور اس میں ملک و بیرون ملک سے اصحاب علم وفضل کی بڑی تعداد نے شرکت کی ، آپ نے بڑی محبت اور تعلق کا اظہار کیا اور سیمینار میں میرے مضمون کو پیش کرنے کا موقع دیا ، یہ آپ کے تعلق کی بات ہے ، جمعیت علمائے ہند نے صدی تقریبات کا جو سلسلہ شروع کیا ہے یہ بڑا خوش آئند قدم ہے ، اس طرح نئی نسل ہمارے اسلاف کی تاریخ اور ملک وملت کیلئے ان کی عظیم قربانیوں سے واقف ہوگی ۔ میں دعا گو ہوں کہ اللہ تعالی اس سلسلہ کو کامیاب بنائے اور آپ کو صحت وعافیت سے رکھے اور دنیاو آخرت دونوں جہاں میں سرخ رو فرمائے والسلام ۔

دعا گو
محمد واضح رشید حسنی ندوی
ندوۃ العلماء لکھنو
۱۰/ربیع الثانی/۱۴۴۰ھ/ ۱۹/دسمبر/۲۰۱۸

☆☆☆☆☆

برطانوی سامراج سے ہندوستان کی آزادی میں جن علماء ومشاہیر کا بڑا کردار رہا ہے ، ان میں زیادہ تر کا تعلق جمعیت علمائے ہند سے تھا ، جس میں آزادی کے وقت ہندوستان میں رہنما شخصیات میں سرفہرست شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ ، مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ اور حضرت مولانا محمد میاں دیوبندیؒ کی خدمات زیادہ نمایاں رہیں ۔ دوسری طرف کانگریس کی سربراہی مولانا ابوالکلام آزاد کر رہے تھے ، جنہیں ''امام الہند'' کہا جا رہا تھا ۔ لیکن آزادی کے بعد چوں کہ ہندوستان کا مغربی حصہ پاکستان کے طور پر ایک الگ ملک مسلم شناخت کے ساتھ بن چکا تھا ، اس لیے اس ہندوستان میں مسلمانوں کے ساتھ کھل کر امتیازی سلوک کیا جا رہا تھا ۔ ان حالات میں مولانا ابوالکلام آزادؒ ، حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ ، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ اور مولانا محمد میاںؒ نے جو قربانیاں دیں اور حکمت وتدبر سے کام لیا ، اس نے یہاں کے مسلمانوں کو ایک نئی زندگی دی جس سے

یہاں کے مسلمانوں نے اپنے مستقبل کو سنوارا اور رفتہ رفتہ پھر اپنا کھویا مقام حاصل کرلیا۔

آزادی کے فوراً بعد لکھنؤ میں مولانا ابوالکلام آزادؒ نے مسلم کانفرنس کا انعقاد کیا جس میں آئندہ کے لیے لائحۂ عمل طے کرنا تھا اور یہ فیصلہ ہوا تھا کہ جمعیۃ العلماء سیاست میں حصہ نہیں لے گی۔ جمعیۃ العلماء نے بڑا اجلاس منعقد کیا تھا جس کی مجلس استقبالیہ کے صدر ہمارے ماموں ناظم ندوۃ العلماء مولانا ڈاکٹر حکیم سید عبدالعلی حسنی (متوفی ۱۹۶۱ء) تھے۔ اور یہ اجلاس ایسے حالات میں ہوا تھا جب یہاں کے مسلمان مایوسی کا شکار ہو رہے تھے، ان کو اس اجلاس سے بڑا حوصلہ ملا۔ ندوۃ العلماء بھی اجلاس کے میزبانوں میں ایک میزبان تھا، اور ہم لوگ بھی اس کو کامیاب بنانے میں اپنے بڑوں کے ساتھ حصہ لے رہے تھے۔ اس وقت ہم دارالعلوم ندوۃ العلماء میں طالب علم تھے اور اسی موقع پر ندوۃ العلماء میں ایک یادگار علمی ثقافتی نمائش بھی لگائی گئی تھی جس میں دکھایا گیا تھا کہ اس ملک کو مسلمانانِ ہند نے مختلف حیثیتوں سے کب اور کیا کیا دیا؟۔

۱۹۵۳ء میں میرا قیام دہلی میں رہنے لگا، میرا جہاں قیام تھا، اس کے قریب ہی جمعیۃ کا دفتر تھا، جہاں حضرت مدنیؒ تشریف لایا کرتے تھے۔ ہم اور برادر معظم مولانا سید ابوبکر حسنی صاحب مرحوم حضرت سے ملنے کے لیے جاتے۔ مولانا محمد میاں صاحب سے بھی رابطہ بڑھنے لگا اور قریب سے ان کو دیکھنے کے مواقع ملنے لگے۔ وہ مدرسہ امینیہ دہلی میں حدیث کے استاد بھی تھے، وہ بھی ہماری قیام گاہ سے قریب تھا۔ یہ مولانا کا کمال تھا کہ انہوں نے تدریس، تصنیف وتحقیق اور نظم ونسق کی صلاحیت کو جمع کیا تھا جس کے لیے ان کو دورے بھی کرنے ہوتے اور پروگرام مرتب کرنے پڑتے اور یہ سارے کام وہ بڑے اچھے انداز سے کرتے تھے۔ ان کو حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ اور ان کے بڑے بھائی مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنیؒ سے بڑا تعلق تھا۔ ان دونوں کی تعلیم کا کچھ زمانہ دارالعلوم دیوبند میں گذرا تھا۔ چونکہ وہ دونوں میرے ماموں تھے، اس لیے مولانا محمد میاں صاحب اس نسبت سے بھی بڑا خیال فرماتے تھے۔

مولانا محمد میاں صاحب کی اصل شہرت ان کی کتابوں سے ہوئی جو کہ زیادہ تر سیرت اور تاریخ کے موضوع پر ہیں۔ سیرت پر ان کی کتاب ''سیرت مبارکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن اور تاریخ کے آئینہ میں'' ایک شاہکار کتاب ہے جو بہت مقبول ہوئی اور تاریخ ہند پر ان کی کتاب ''علماء ہند کا شاندار ماضی'' بڑی اہم تصنیف ہے، جس کے ہندوستان اور پاکستان سے بار بار ایڈیشن شائع ہوتے رہے ہیں۔ انہوں نے اس عنوان سے ہندوستان میں مغلیہ سلطنت اور سامراج کی تاریخ اور سیاسی، ثقافتی، علمی اور دعوتی تاریخ بھی بیان کردی ہے، جو ایک اہم مرجع کے طور پر سامنے ہے۔

مولانا محمد میاں صاحب کی زندگی بڑی ورع وتقویٰ کی زندگی تھی اور اس میں وہ سلف کا ایک نمونہ تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو نیک اور صالح اولاد بھی عطا فرمائی، جن میں سب سے بڑے صاحبزادے مولانا سید حامد میاں تھے۔ وہ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے محبوب شاگرد اور ان کے خلیفہ بھی تھے۔ وہ پاکستان چلے گئے تھے اور لاہور میں ''جامعہ مدنیہ'' کی بنیاد ڈالی جو وہاں کے مدارس میں اہم مدرسہ کے طور پر متعارف ہے جسے ان کے پوتے اور مولانا حامد میاں کے صاحبزادے مولانا سید محمود میاں دیکھ رہے ہیں، اور وہ وہاں حدیث کے بڑے استاد بھی ہیں اور اس ادارے سے ایک دینی اصلاحی مجلّہ ''انوار مدینہ'' بھی نکالتے ہیں۔ ایک صاحبزادے خالد میاں تھے، جو جرمنی چلے گئے تھے اور مولانا سید ساجد میاں سعودی سفارت خانہ میں ملازم رہے اور انہوں نے اپنے ایک بیٹے سید علی میاں ندوی کو دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تعلیم دلائی۔ یہ اس تعلق کا امتداد ہے جو ان کو حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ اور ندوۃ العلماء سے تھا، انہوں نے اپنے شاگردوں کو حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ سے استفادہ کی طرف توجہ دلائی اور مولانا نور عالم خلیل امینی ایڈیٹر مجلّہ ''الداعی'' دیوبند کو اپنے خط کے ساتھ ندوۃ العلماء بھیجا اور یہاں انہوں نے عربی زبان و ادب میں خصوصیت سے استفادہ کیا اور پھر کچھ مدت پڑھایا بھی۔

ندوۃ العلماء اور جمعیۃ علماء ہند کا تعلق اس سے سمجھا جاسکتا ہے کہ جمعیۃ علماء ہند کی

ایگزیکیٹو کمیٹی کے دارالعلوم ندوۃ العلماء کی مرکزی عمارت کے پرشکوہ ''عباسیہ ہال'' میں جلسے بھی ہوئے اور دوسری میٹنگیں بھی ہوئیں۔ مولانا شاہد فاخری وغیرہ بھی شریک ہوئے، مجھے بھی شرکت کا موقع ملا۔ اگرچہ جلسہ عام شہر کے بڑے میدان میں ہوتا تھا، مگر ذیلی میٹنگیں ندوۃ العلماء میں ہوتی تھیں۔

۱۳۹۵ھ (۱۹۷۵ء) میں ندوۃ العلماء کے ۸۵ پچاس سالہ جشن تعلیمی کا جب انعقاد ہوا تو یہاں کے ذمہ داروں نے ملک اور ملک سے باہر اہم شخصیات کو شرکت کی دعوت دی اور ان شخصیات میں مولانا سید محمد میاں صاحب بھی تھے۔ وہ اپنی معذوری وعلالت کی وجہ سے اگرچہ شرکت کے لیے سفر نہیں کر سکے تھے، البتہ جو خط لکھا وہ بھی پایۂ تکمیل کو نہ پہنچا، لیکن وہ ادھورا خط ہی اس تعلق کو سمجھنے کے لیے کافی ہے جو ان کے اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے درمیان تھا۔ اس کی اہمیت کے پیش نظر اس کو ندوہ کے پچاسی سالہ جشن تعلیمی کی مفصل روداد ''روداد چمن'' مرتبہ مولانا سید محمد الحسنی مرحوم سے نقل کیا جاتا ہے۔ مولانا سید محمد الحسنی مرحوم لکھتے ہیں:۔

> ''جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے، یہ کہنا تحصیل حاصل ہوگا کہ یہاں کے مشاہیر اور اہل فضل وکمال نے اس کا نہایت گرمجوشی اور خلوص ومحبت سے استقبال کیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کے دل کی آواز اور ان کے احساسات کی سچی ترجمانی ہے اور ان کی ساری تمنائیں اسی ایک نقطہ پر سمٹ آئی ہیں۔ دعوت نامہ کے جواب میں جو خطوط موصول ہوئے ان میں سے صرف ایک خط ان سب کی نمائندگی اور ترجمانی کے طور پر یہاں درج کیا جا رہا ہے۔ یہ مولانا سید محمد میاں رحمۃ اللہ علیہ کا وہ تاریخی خط ہے جو انہوں نے بستر علالت سے سابق ناظم ندوۃ العلماء کو املا کرایا اور افسوس کہ اس کو پورا نہ کر سکے۔ اس خط کا عکس علماء سلف کی ایک امانت کے طور پر بے کم وکاست یہاں شائع کیا جا رہا ہے، اس کے بعد ہمیں اس موضوع پر زیادہ تفصیل کی ضرورت نہ ہوگی۔
>
> سید السادات، قدوۃ العلماء، مولانا العلی الاعلیٰ

لازالت شموس برکاته بازغة

الف تحیات مسنونہ

مزاج اقدس

یہ ناکارہ اس سعادت پر نازاں ہے کہ اجلاس ندوۃ العلماء کے دعوت نامہ سے سرفراز ہوا، مگر اس افتخار کے ساتھ اس کو اپنی حرماں نصیبی کا صدمہ بھی ہے۔ خود جناب والا کی زیارت اور شرف ملاقات اس ناکارہ اور نااہل کے لیے سعادت عظمیٰ اور بالخصوص یہ یادگار اجتماع عظیم جس میں پوری دنیائے اسلام کے ممتاز علماء، فضلاء اور مشائخ سے شرف لقاء حاصل ہو سکے گا، اس اجتماع میں شرکت بہت بڑی سعادت ہے۔ مگر افسوس یہ ناکارہ اس لیے معذور رہے گا کہ چلنے پھرنے سے معذور ہے۔ مکان سے مسجد کا راستہ جو دو تین منٹ میں طے ہوتا تھا، اب تیس منٹ میں مشکل سے طے ہوتا ہے۔ یہ سولہ رمضان تک کی صورت تھی، اس کے بعد خونی بواسیر کے دردوں نے اس احقر کو صاحب فراش بنا دیا ہے۔ دعا فرمایئے کہ اللہ تعالیٰ جلد اس قابل بنا دے کہ درس وغیرہ کی خدمات کو انجام دے سکے، اس صورت میں شرکت اجلاس ''۔ (روداد چمن ص ۴۱۔۴۲)

افسوس کہ وہ اتنا ہی اظہار کر سکے تھے اور معذرت کا جملہ مکمل نہیں ہو پایا تھا کہ ان کی مثالی زندگی کا دائرہ یہیں سمٹ گیا۔

جہاں تک ان کی تصانیف کا تعلق ہے، ان میں ان کی مشہور زمانہ تصنیف ''سیرت مبارکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن اور تاریخ کے آئینہ میں'' چھ سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ انسان کے وجود اول سے نبیوں کے سلسلہ اور پھر خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت و بعثت، ہجرت اور مدنی زندگی کے آخری دن تک پہنچایا گیا ہے، پھر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے احوال و مناقب پر دو جلدیں ہیں، جن میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے عہد زریں، فضائل و مناقب، عظیم الشان کارنامے، طرز حکمرانی، انداز جہانبانی اور ان کی مثالی حکومتوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ یہ کتاب بھی سیرت پاک ہی کا امتداد ہے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی درسگاہ نبوی میں تعلیم و تربیت ہوئی اور ایسی پاکیزہ جماعت تیار ہوئی

جس کی قرآن مجید نے تعریف کی اور یہ کہ نبوت کے کارناموں میں ان کی جو شرکت رہی، خاص طور پر دعوت اسلام کے پھیلنے میں، مصائب پر صبر واستقامت، غزوات و جہاد میں شرکت وشہادت اور وفات نبوی کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے منشا اور مشن کی عملی تکمیل کے لیے جدوجہد اور تنفیذ دین وشریعت، یہ سب بڑے اچھے اسلوب اور بڑے محققانہ انداز میں بیان کیا ہے۔ باقی ان کی دوسری کتابیں جن کی تعداد سو کے قریب پہنچتی ہے۔ مختلف موضوعات تاریخ اسلام، تاریخ مسلمانانِ ہند، تعلیم وتربیت، حدیث، تفسیر اور فقہ پر ہیں اور اکثر شائع ہو چکی ہیں اور بعض کے کئی ایڈیشن نکل چکے ہیں، اس کے باعث وہ بجا طور پر اس خطاب کے مستحق ہیں جو انہیں مورخ اسلام کی حیثیت سے دیا گیا۔

جہاں تک ان کے دوسرے مشاغل ومصروفیات اور علمی وتعلیمی خدمات کا تعلق ہے تو انہوں نے دارالعلوم دیوبند میں محدث جلیل علامہ انور شاہ کشمیریؒ اور شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ جیسے باکمال اساتذہ سے کسب فیض کرنے کے بعد ۱۹۲۵ء میں فراغت حاصل کی اور مدرسہ حنفیہ آرہ شاہ آباد بہار میں مدرس ہوئے۔ ۱۹۲۸ء میں جامعہ قاسمیہ شاہی مراد آباد آئے اور حدیث کے استاذ ہوئے۔ ۱۹۴۴ء تک یہاں تدریسی مشغولیت رہی۔ ۱۹۶۳ء تا ۱۹۷۵ء مدرسہ امینیہ دہلی میں شیخ الحدیث کے طور پر بخاری شریف کا درس دیا۔ یہ ان کی آخری مشغولیت رہی۔

جہاں تک سیاسی وسماجی خدمات کا تعلق ہے تو ملک کی سیاسی حالت اور اکابر علماء دیوبند کی عملی شرکت کے پیش نظر زمانۂ طالب علمی سے ہی سیاسی سرگرمی رہی۔ ۱۹۲۹ء میں پہلی بار پانچ مہینہ کی جیل ہوئی، جس میں ان کے ساتھ ان کے اساتذہ اور شیوخ اور بعض معاصرین بھی تھے۔ ۱۹۳۷ء میں ان کی اہم کتاب ''علماء ہند کا شاندار ماضی'' جو جہاد حریت کا سبق یاد دلاتی ہے، کی اشاعت پر برطانوی حکومت نے پابندی لگائی اور مقدمہ چلایا۔ ۱۹۴۷ء میں آزادی کے بعد مستقل طور پر دہلی میں قیام کیا اور جمعیۃ العلماء کے مرکزی دفتر کی ذمہ داری سنبھالی۔ تقسیم وطن کے ہنگاموں کے دوران اور بعد میں بازآبادکاری کے مرحلہ

میں کارہائے نمایاں انجام دیئے، صحت کی کمزوری کی وجہ سے ان کی یہ مشغولیت جاری نہ رہ سکی، البتہ تاحیات مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند کے رکن اور ''ادارۃ المباحث الفقہیہ'' کے صدر رہے۔ ان کی پیدائش ۱۳۲۱ھ مطابق ۱۹۰۳ء دیوبند ضلع سہارن پوری کی ہے اور ۱۹۷۵ء (۱۳۹۵ھ) میں وفات پائی۔ اس طرح ان کی عمر ۷۵ سال ہوئی اور بڑی کارگزار شخصیت کے طور پر انہوں نے شہرت حاصل کی اور سخت حالات میں ملت کی کشتی کی ناخدائی میں انہوں نے حصہ لیا جو ایک ناقابل فراموش کارنامہ ہے۔ رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃ۔

جہاں تک راقم کا ان مجلسوں میں شرکت کا تعلق ہے جو ان کے جمعیۃ العلماء کے مرکزی دفتر (دہلی) کے ذمہ دار ہونے کے بعد دہلی میں گلی قاسم جان میں ہوتی تھیں، تو ان کی تفصیل یہ ہے کہ ۱۹۵۳ء میں میرے قیام کے بعد حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی صدر جمعیۃ العلماء کی تشریف آوری پر عمائدین کا اجتماع جمعیۃ کی عمارت میں ہوتا تھا اور اس وقت کی ملی قیادت کے اقطاب وہاں جمع ہوتے تھے، جیسے مولانا عبدالحلیم صدیقیؒ، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانویؒ، مولانا احمد سعید دہلویؒ، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ اور مولانا سید محمد میاں صاحب تو اہم ترین مسائل پر جن کا تعلق ملک وملت اور عالم اسلام سے ہوتا، تبادلۂ خیال ہوتا۔ مجھے برادر مکرم مولانا سید ابوبکر حسنی مرحوم (سابق اسسٹنٹ پروفیسر جواہر لال نہرو یونیورسٹی) کے ساتھ جن کی دہلی میں قیام گاہ اور میری قیام گاہ مشترک تھی، جانا ہوتا، جو حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ سے بیعت وارادت کا تعلق رکھتے تھے اور دوسری شخصیات سے بھی ان کا تعارف تھا۔ یہ راقم بھی ایک طرف بیٹھ جاتا اور بہت کچھ سیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملتا اور جب ممالک اسلامیہ وعربیہ کی بڑی شخصیات، وزراء یا صاحب اقتدار شخصیت کی دہلی آمد ہوتی تو جمعیۃ العلماء استقبالیہ دیتی، مولانا محمد میاں صاحب کی شفقت کی وجہ سے مجھے شرکت کا موقع ملتا۔ چنانچہ جب سعودی عرب کے بادشاہ ملک عبدالعزیز آل سعود کے ۱۹۵۳ء میں انتقال کے بعد ان کے بڑے صاحبزادے سعود بن عبدالعزیز بادشاہ ہوئے تو دو سال بعد وہ ہندوستان آئے اور حکومت ہند نے ان کا بڑا اکرام کیا۔ جمعیۃ العلماء نے ان کو

استقبالیہ دیا تو اس میں بھی شرکت کا موقع ملا جس میں ان کے چچا اور شاہ عبدالعزیز کے بھائی امیر مساعد بن عبدالرحمٰن آل سعود بھی ساتھ تھے۔

اسی طرح مولانا کی شفقت سے بہرور ہونے کے مواقع ملتے رہے۔ جب خال معظم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی دہلی تشریف آوری ہوتی اور اس کا علم حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب مرحوم ناظم جمعیۃ العلماء کو ہوتا تو وہ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو دعوت دیتے اور اس حقیر کو ان کے ساتھ معیت کا شرف حاصل ہوتا۔

لکھنؤ میں ۱۹۴۸ء میں جمعیۃ العلماء کا اجلاس متعدد نوعیت سے بہت اہمیت کا حامل اجلاس تھا، جس کی کامیابی کے لیے سبھی مسلمان بلا اختلاف مکتب فکر کوشاں اور فکر مند تھے، اس کی جو ذیلی میٹنگیں ہوئیں وہ (جیسا کہ پچھلے صفحات میں تذکرہ آیا) دارالعلوم ندوۃ العلماء کی مرکزی عمارت کے پرشکوہ ہال عباسیہ ہال میں ہوئی تھیں، ہم لوگوں کو بھی اس میں شرکت کا موقع ملتا تھا۔ یہ مولانا محمد میاں علیہ الرحمہ کی جمعیۃ کی ذمہ داری کے ابتدائی دور کا وقت تھا۔ یہ جلسہ عام شہر کے بڑے میدان میں جہاں ہائی کورٹ کی عمارت ہے، ہوا تھا، اس میں اہم کانگریسی لیڈر پنت نے بھی شرکت کی اور مسلمانوں کے لیے اردو کے حوالہ سے اذیت رساں تقریر کی تھی۔ برادر مکرم مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی جو بہت متحرک تھے، انہوں نے حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی سے گذارش کی وہ اس کا ضرور جواب دیں، چنانچہ انہوں نے ایسی لاجواب تقریر کی کہ پنت کے لیے شرمندگی کے علاوہ کوئی راستہ نہ تھا۔

دین وملت کی فکر رکھنے والی شخصیات میں مولانا سید محمد میاں دیوبندیؒ کی شخصیت یہ امتیاز رکھتی تھی کہ وہ مختلف موضوعات پر اپنی گرانقدر تصنیفات اور تدریسی مشغولیت کی جامعیت بھی رکھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کے مراتب بلند کرے اور ان کی خدمات وحسنات سے لوگوں کو برابر فائدہ پہنچائے۔ (آمین)

حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ

ایک جامع کمالات شخصیت

مولانا قاری محمد حنیف صاحب جالندھری
صدر و شیخ الحدیث جامعہ خیر المدارس ملتان
و ناظم اعلیٰ وفاق المدارس العربیہ پاکستان

مؤرخ ملت حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی عمومی شہرت اگرچہ ایک مؤرخ اور مصنف کے طور پر ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان کی دینی و ملی خدمات کا دائرہ نہایت وسیع اور متنوع ہے۔ حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک کامیاب مدرس، مدبر منتظم، حالات کے نبض شناس سیاسی رہنما، بلند پایہ صحافی، درد دل رکھنے والے مبلغ، صاحبِ نظر مؤرخ اور کبیر الکتب مصنف تھے اور مندرجہ بالا صفات میں ہر صفت میں درجہ کمال کو پہنچے ہوئے تھے۔ لہٰذا ان صفاتِ کمال میں درجہ کمال تک پہنچنے والی نابغہ روزگار شخصیت کے متعلق بلا خوفِ تردید یہ دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ وہ ایک ''جامع کمالات شخصیت'' تھے۔

تدریسی خدمات:

اہل علم جانتے ہیں کہ جب تک پڑھا ہوا پڑھایا نہ جائے تب تک علمی رسوخ حاصل نہیں ہوتا۔ چنانچہ حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے رسمی تعلیم سے فراغت کے بعد اپنے استاد شیخ الفقہ والادب حضرت مولانا اعزاز علی رحمۃ اللہ علیہ کے مشورے اور حکم سے مدرسہ حنفیہ شاہ آباد تشریف لے گئے اور درس و تدریس کا سلسلہ شروع فرمایا، لیکن چونکہ اس مدرسہ کو سرکاری امداد ملا کرتی تھی اور یہ چیز دار العلوم دیوبند کے اصولوں کے خلاف تھی

اور سید محمد میاں صاحب رحمتہ للہ علیہ کے ضمیر کے اندر سرکار اور سرکاری امداد سے نفرت کا جذبہ شامل تھا، چنانچہ تین ساڑھے تین سال کا عرصہ وہاں گزارنے کے بعد دلبرداشتہ ہوکر ہو مدرسہ چھوڑ دیا اور پھر جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مرادآباد سے منسلک ہو گئے اور وہاں اعلیٰ درجہ کی کتابیں پڑھاتے رہے۔

سیاسی خدمات:

میدانِ سیاست میں قدم رکھا تو وہاں بھی کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ وہ زمانہ تحریک آزادی کے جوبن کا تھا، چنانچہ وہ تحریک میں ہراول دستے کی حیثیت سے شامل رہے اور محض اپنی زبان وقلم کی صلاحیتوں ہی کو بروئے کار لانے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس سلسلہ میں متعدد بار قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں۔ اسے ایک المیہ ہی کہا جا سکتا ہے کہ بہت سے لوگ تحریک آزادی کی راہ میں اپنا سب کچھ لٹا کر، متاعِ زیست گنوا کر اور ہر طرح کی قربانیاں دے کر بھی تاریخ آزادی میں وہ مقام نہیں پا سکے جس کا وہ کا استحقاق رکھتے تھے جبکہ دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ ایک بڑی تعداد ایسے لوگوں کی موجود ہے جو ایک دن کیلئے ملک وملت کی خاطر جیل نہیں گئے، آزادی کی جنگ میں ان کی جان کام آئی نہ مال، حتیٰ کہ کبھی ان کا کھانا پینا بھی مقررہ وقت سے آگے پیچھے نہیں ہوا۔ لیکن ہماری نصابی تاریخ انہیں تاریخِ آزادی کے ہیرو، ملک وقوم کے محسن اور اسلام ومسلمانوں کے نجات دہندہ قرار دیتی ہے

منزل انہیں ملی، جو شریکِ سفر نہ تھے

اس زمانہ میں جو سیاسی جماعتیں مسلمانوں خصوصاً راسخ العقیدہ اور دیندار مسلمانوں کی نمائندگی کے لئے میدانِ عمل میں جدوجہد کر رہی تھیں ان میں سے ایک فعال اور متحرک جماعت ''جمعیۃ علماء ہند'' بھی تھی۔ مولانا سید محمد میاں رحمۃ اللہ علیہ نے اسی جماعت کو اپنی سیاسی سرگرمیوں کا مرکز بنایا۔ ابتداءً ایک سامع کے طور پر ''جمعیۃ'' کے پروگراموں میں شریک ہونا شروع کیا، پھر ایک ''مبصر'' کی حیثیت سے ''جمعیۃ'' کی طرف سے بلائے جانے لگے اور پھر باقاعدہ علماء حق کی اس جماعت میں شمولیت اختیار کر لی اور

تحریر وتقریر، زبان وقلم اور فکر وعمل کی تمام تر صلاحیتوں کو ملک وقوم کے اجتماعی مفادات، مسلمانوں کے سیاسی غلبے اور غاصب حکومت کو ملک سے بے دخل کرنے کی کوششوں میں صرف کرتے رہے۔

اجتماع ضدین:

اربابِ نظر جانتے ہیں کہ سیاسی وتحریکی مصروفیات کے ساتھ علمی وتصنیفی مشغولیات کا جمع ہونا قریب قریب ناممکن سا ہوتا ہے۔اس لئے کہ علمی وتصنیفی کاموں کے لئے یکسوئی، بے فکری اور ہنگامہ ہائے شور وشغب سے کوخود کو دور رکھنا شرط اولین ہے جبکہ سیاسی وتحریکی زندگی ہنگامہ خیزی وحشر انگیزی سے ہی عبارت ہوتی ہے۔ان دونوں کو جمع کرنا ''جام و سنداں باختن'' اور پنبہ وآتش کے جمع کرنے کے مترادف ہے۔علاوہ ازیں یہ دونوں مصروفیات ایسی ہیں کہ ان میں سے ہر ایک، انسان کی پوری توجہ اور مکمل وقت کی طالب و متقاضی ہیں۔وادیِ سیاست کے سیاح کے لئے علمی مسند پر تمکن کا وقت نکالنا مشکل ہوتا ہے اور علمی خدمات میں مگن شخص کے لئے دشتِ سیاست کی سیاحی کی فرصت عنقا ہوتی ہے۔لیکن سید محمد میاں رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی محیر العقول شخصیت میں یہ ''اجتماعِ ضدین'' کر کے دکھایا کہ وہ سیاسی میدان میں بھی کسی سے پیچھے نہیں رہے اور علمی وتصنیفی خدمات کا تو کہنا ہی کیا!

علمی وتصنیفی خدمات:

ہمارے دیار میں علمی مقام ومرتبہ کی معراج یہ ہے کہ انسان شیخ الحدیث اور صدر مفتی کے عہدے تک پہنچ جائے اور تصنیفی وتالیفی قد کاٹھ کی انتہا یہ ہے کہ کسی مصنف ومؤلف کی مصنفات ومؤلفات نصاب میں شامل ہو جائیں یا مصادر ومراجع قرار پائیں۔ان معاییر پر حضرت مولانا سید محمد میاں رحمۃ اللہ علیہ کی علمی وتصنیفی قدر ومنزلت کو پرکھا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ وہ مدرسہ امینیہ کشمیری گیٹ دہلی میں صدر مفتی وشیخ الحدیث کے عہدہ ہائے جلیلہ ومنصف ہائے عظیمہ پر فائز رہے اور ان کی مصنفات ومؤلفات میں سے بعض نصاب

میں شامل ہیں اور بعض کو تاریخی مباحث میں ماخذ وحوالے کی کتب کی حیثیت حاصل ہے۔

ایں سعادت بزور بازو نیست　　　تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

تصنیفات:

جس طرح حضرت مولانا سید محمد میاں رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی متنوع کمالات کی مجموعہ تھی اسی طرح ان کی کتابیں بھی اپنے موضوعات کے اعتبار سے تنوع کا ایک جہان لئے ہوئے ہیں۔ حدیث، فقہ، تاریخ، سیاست، سوانح، اقتصادیات ومعاشیات، جمہوریت اور تعلیم سمیت مختلف موضوعات کو انہوں نے اپنی کتابوں کا موضوع بنایا اور جس موضوع پر بھی قلم اٹھایا اس کا حق ادا کر دیا۔

ان کے خامہ گہر بار سے لگ بھگ ۶۰ کتابیں تصنیف ہوئیں جن میں کچھ اہم کتب ورسائل درج ذیل ہیں۔

☆ علمائے ہند کا شاندار ماضی (چار حصے)
☆ علمائے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے (دو حصے)
☆ جمعیۃ علماء ہند کیا ہے؟ (دو حصے)
☆ مشکوٰۃ الآثار ومصباح الابرار (انتخاب حدیث)
☆ نور الاصباح (ترجمہ نور الاصباح)
☆ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (سیرت)
☆ صالح جمہوریت اور تعمیر جمہوریت
☆ صحابہ کرام کا عہدِ زریں (دو حصے)
☆ اسلام اور انسان کی حفاظت
☆ ہماری اور ہمارے وطن کی حیثیت اور ترکِ وطن کا حکم
☆ دین کامل، حیاتِ مسلم
☆ چاند تارے اور آسمان

☆ آنے والے انقلاب کی تصویر
☆ خطرناک نعرے
☆ جمعیۃ علمائے ہند کا صراط مستقیم
☆ تحریکِ شیخ الہند
☆ حیاتِ شیخ الاسلام
☆ اسیرانِ مالٹا
☆ مختصر تذکرہ خدمات جمعیۃ علماء ہند (چار حصے)
☆ شواہد تقدس
☆ ہندوستان شاہانِ مغلیہ کے عہد میں
☆ سیاسی واقتصادی مسائل اور اسلامی تعلیمات
☆ مسئلہ تعلیم اور طریقۂ تعلیم
☆ تاریخ اسلام (تین حصے)
☆ دینی تعلیم کے رسائل (بارہ حصے)
☆ روزہ زکوٰۃ
☆ ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم

اس فہرست سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ حضرت مولانا سید محمد میاں رحمۃ اللہ علیہ کے اسپِ قلم کی جولانیوں کا کیا عالم تھا؟ آپ کے ذوق تحریر وتصنیف کا یہ عالم تھا کہ چلتی ٹرین کے اندر کپڑا بچھا کر قلم وقرطاس سے رشتہ قائم کر لیتے تھے، تحریر کے اس ذوقِ فراواں کو دیکھتے ہوئے شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ، آپ کو ''حیوانِ کاتب'' کہا کرتے تھے۔

یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ اوپر ہم نے جو ۶۰ کے قریب مصنفات کا ذکر کیا ہے، یہ وہ کتابیں ہیں جو مطبوعہ ہیں جبکہ ان کی بعض تصانیف ایسی بھی ہیں جو شرمندۂ طباعت نہیں

ہوسکیں۔مثلاً فیض الباری شرح بخاری پر تفصیلی حواشی اور ''ترمذی شریف پر حاشیہ'' حضرت مؤرخ ملت رحمتہ اللہ علیہ کی قابلِ قدر خدمتِ حدیث ہے مگر ابھی تک یہ دونوں کتابیں شائع نہیں ہوسکیں۔

یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے مستقل تصانیف کے علاوہ حضرت رحمتہ اللہ علیہ کے رواں قلم سے نکلنے والے مضامین بھی اتنی بڑی تعداد میں ہیں کہ اگر انہیں جمع کیا جائے تو کئی مجلدات پر مشتمل ہوں گے۔ یہ مضامین برصغیر کے وقیع جرائد اور نامور رسالوں القاسم، الفرقان، برہان اور روز نامہ وہفت روزہ الجمعیۃ (دہلی) میں شائع ہوتے رہے ہیں۔

لکھنے کے فن سے وابستہ حضرات کے علم میں ہوگا کہ ہر مجلّے اور ہر رسالے کی اپنی پالیسی اور اپنا طرز ہوتا ہے اور اس رسالے میں لکھنے والوں کو رسالے کی پالیسی کے دائرے میں رہ کر ہی اپنا عندیہ اور نقطۂ نظر قارئین کے سامنے پیش کرنا ہوتا ہے جبکہ اعلیٰ درجے کے لکھاریوں کیلئے دوسروں کی وضع کردہ پالیسی کی تنگنائے میں محدود ومقید رہ کر اپنے خیالات و نظریات کا اظہار مشکل ہوتا ہے۔ایسوں کی تحریر کا لفظ لفظ پکار پکار کر کہہ رہا ہوتا ہے کہ:

کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کیلئے

چنانچہ دیکھا یہ گیا ہے کہ عموماً ایسے حضرات جلد یا بدیر اپنا مجلّہ جاری کر دیتے ہیں، تا کہ ان کے سمندِ قلم کو اپنی جولانیاں دکھانے کا خوب خوب موقع مل سکے۔یہی وجہ ہے کہ حضرت مولانا سید محمد میاں رحمتہ اللہ علیہ نے بھی مراد آباد سے ''قائد'' نامی ایک مجلّے کا اجرا کیا جس نے مختصر عرصے میں اہلِ علم کے ہاں اپنا ایک خاص مقام بنا لیا تھا۔اس مجلّے کے وقیع علمی مضامین، سنجیدہ وشائستہ اسلوب اور ملت اسلامیہ کو درپیش مسائل اور ان کے حل کے متعلق عمدہ ترین تحریرات سے متاثر ہو کر امام انقلاب مولانا عبیداللہ سندھی رحمتہ اللہ علیہ نے اس رسالے کو اپنا ممکنہ آرگن قرار دیا تھا۔اس رسالے کے معیار ووقار کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ حضرت مولانا سید محمد میاں رحمتہ اللہ علیہ کسی بھی مطبوعہ تحریر کو اس رسالے میں شائع کرنا اس رسالے کی توہین سمجھتے تھے۔ چنانچہ جتنا عرصہ یہ رسالہ نکلتا رہا اس میں اہل علم

کی تازہ اور نئی تحریرات قارئین کے شعور کی آبیاری کرتی رہیں۔

سماجی خدمات:

حضرت مولانا سید محمد میاں رحمتہ اللہ علیہ کی حیات طیبہ کا روشن پہلو اور درخشاں باب یہ بھی ہے کہ آپ ضرورت کے ہر موقع پر ہندوستانی مسلمانوں کے ایمان، جان اور مال کی حفاظت کے لیے سرگرم رہے۔ ان کی پوری زندگی اس امر کی گواہ ہے کہ اسلامیانِ ہند کو جب بھی مشکلات کے سیلاب نے گھیرا، حضرت مولانا سید محمد میاں رحمتہ اللہ علیہ کا وجود اس سیلابِ بلاخیز میں ان کے لیے سفینۂ نجات ثابت ہوا۔ ستمبر 1950ء میں بھاگل پور میں ہندو مسلم فسادات ہوئے اور وہاں کے مسلمانوں کے لیے جینا دشوار کر دیا گیا تو اس موقع پر مسلمانوں کی اشک شوئی، تسلی اور انہیں حوصلہ دلانے کے لیے ہندوستان کے سربرآوردہ علمائے کرام کا جو وفد بھاگل پورہ گیا تھا، حضرت محمد میاں رحمتہ اللہ علیہ اس وفد میں شامل تھے۔ مارچ 1953ء میں بھوپال میں ہندو مسلم فسادات ہوئے اس موقع پر پریشان حال مسلمانوں کی ڈھارس بندھانے اور اصلاحِ احوال کے لیے حضرت مولانا سید محمد میاں رحمتہ اللہ علیہ نے گرانقدر خدمات انجام دیں۔ گجرات میں شدھی تحریک کا تخم فساد اپنے زہریلے برگ و بار لانے لگا اور مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد اسلام سے منحرف ہوکر ہندومت اختیار کر بیٹھی اور دیگر مسلمانوں کے لیے بھی اپنے دین وایمان کو بچانا مشکل ہوگیا تو اس نازک صورتحال سے نمٹنے کے لیے حضرت مولانا سید محمد میاں رحمۃ اللہ علیہ بنفس نفیس و بذات خود وہاں تشریف لے گئے، شدھی تحریک کا پامردی، عزیمت اور استقلال کے ساتھ مقابلہ کیا اور اس فتنے کو فرو کر کے ہی دم لیا۔

بحیثیت مؤرخ:

حضرت مولانا سید محمد میاں رحمۃ اللہ علیہ اگرچہ مجموعہ کمالات تھے اور تمام کمالات میں اوج کمال تک رسائی رکھتے تھے، لیکن ان کے تاج کمالات کا سب سے بیش بہا ہیرا تصنیف وتالیف اور تاریخ نویسی میں ان کی مہارت تھی۔ ان کی شخصیت کے اصل جواہران کی

تحریری کاوشوں ہی میں کھلتے نظر آتے ہیں۔

ایک المیہ:

ہم اسلامیان برصغیر کا ایک بڑا المیہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں تاریخ کو اس قدر بے دردی کے ساتھ مسخ کیا گیا ہے کہ شاید ہی کسی دنیا کے خطے میں ایسا ہوا ہو! برطانوی استبداد کے خلاف اکابر علمائے ہند نے جو بے مثال جدوجہد کی ہے وہ ہماری تاریخ کا ایک تابناک باب ہے اور اس میں کوئی دوسری رائے نہیں ہوسکتی کہ انگریزی استعمار کے خلاف برصغیر کے علمائے کرام میدانِ عمل میں نہ اترتے تو استخلاص وطن کی تحریک کو کامیابی سے ہمکنار ہونے کے لیے کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا۔

امر واقعہ یہ ہے کہ آزادی وطن کے لیے بنیاد کا کام شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے فتوے نے دیا، ان بنیادوں پر حضرت مولانا سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کی تحریک، یاغستانی جہاد کی تحریک اور ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی نے دیواریں تعمیر کیں اور تحریک ریشمی رومال، تحریک خلافت اور تحریک ترکِ موالات نے قصرِ آزادی پر گویا چھت بھی ڈال دی۔ ان تحریکوں نے برصغیر پر انگریزوں کی گرفت بہت حد تک کمزور کردی تھی اور جنگ عظیم اول و دوم نے جب برطانوی سامراج کی کمر توڑ دی تو وہ اپنی نوآبادیات سے دست بردار ہونے پر مجبور ہوگیا، چنانچہ برصغیر کو بھی آزاد کرنا پڑا۔ اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ آزادیِ وطن کی تحریک کو کامیاب کرانے میں مذکورہ بالا تحریکات نے مرکزی کردار ادا کیا ہے اور یہ بات معلوم ہے کہ ان تحاریک کے محرک علمائے کرام ہی تھے، لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ تاریخ آزادی پر جو لٹریچر ہمارے یہاں دستیاب ہے اس میں علمائے کرام کی آزادیِ وطن کی خاطر کی جانے والی جدوجہد کا ذکر موجود نہیں ہے۔ حضرت مولانا سید محمد میاں رحمۃ اللہ علیہ اس حقیقت کا ادراک کیا اور پھر اپنی تحریری صلاحیت، ادبی لیاقت اور تصنیفی وتالیفی مہارت کو کام میں لاتے ہوئے قوم کو علمائے ہند کے شاندار ماضی، جاندار کردار اور قابل فخر کارناموں سے روشناس کرانے کا بیڑا اٹھایا اور اس مقصد میں سو فیصد سرخرو ٹھہرے۔ اس

ضمن میں ان کا کام ایک فرد نہیں بلکہ ایک ادارے کی کاوشوں کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔ ؎

لیس علی اللہ بمستنکرٍ　　　أن یجمع العالم فی واحدٍ

علمائے کرام کی جدو جہد آزادی اور ملی خدمات کو قوم اور آنے والی نسلوں کے سامنے پیش کرنے کے لیے انہوں نے جو اگرانقدر کتابیں تصنیف و تالیف کیں، ان میں ''علمائے ہند کا شاندار ماضی'' (چار جلد) ''علمائے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے'' (دوجلد) ''تحریک شیخ الہند عرف ریشمی رومال'' اور ''اسیران مالٹا'' شامل ہیں۔ یہ کتابیں آزادیِ وطن کے سلسلہ میں علمائے ہند کی مساعیِ جمیلہ کا ناقابل تردید دستاویزی ثبوت ہیں۔ان کے مطالعے سے یہ حقیقت کھلتی ہے کہ ہمارے اکابر محض زہد وتقویٰ ، سلوک وتصوف ، شب بیداری وتہجد گزاری اور سُبحہ خوانی وسجدہ ریزی ہی میں جلیل القدر وعظیم الشان نہیں تھے بلکہ رسم ''بخاک وخون غلطیدن'' جانبازی وسرفروشی ، ایثار وقربانی ، حریت فکر وآزادیِ عمل ، ہجرت و نصرت اور اور جہاد وسیاست میں بھی ان کا پایہ نہایت بلند تھا۔گویا وہ صرف 'رھبان باللیل' ہی نہیں تھے بلکہ 'فرسان بالنھار ' بھی تھے۔اپنی مرضی کی تاریخ مرتب کرنے والے نام نہاد بلکہ بدنہاد مؤرخین نے بہت کوشش کی کہ علمائے حق کے ان کارناموں پر پردہ ڈال دیا جائے اور آنے والی نسلیں آزادیِ وطن کے حقیقی ہیروؤں کے کردار ومقام سے ناآشنا رہیں لیکن یہ سید محمد میاں رحمۃ اللہ علیہ کے قلم کا اعجاز ہے کہ انہوں نے اپنی تصنیفات میں علمائے حق کی جدو جہد کا صور اس قدر بلند آہنگی کے ساتھ پھونکا کہ ملک کے کونے کونے میں اس کی گونج جا پہنچی اور ''علمائے ہند کا شاندار ماضی'' اور ''علمائے حق کے مجاہدانہ کارنامے'' نکھر کر قوم کے سامنے آ گئے۔ویسے تو مولانا سید محمد میاں رحمۃ اللہ علیہ کی ہر تصنیف اپنی مثال آپ ہے لیکن مندرجہ بالا کتب کا تو جواب ہی نہیں ہے۔سیاسیات ہند و پاک پر جو لٹریچر دستیاب ہے سید محمد میاں کی تصنیفات اس میں ایک خاص مقام رکھتی ہیں۔ویسے کسی بھی موضوع پر ان کی کتاب اٹھا کر پڑھ لی جائے تو قاری، مصنف کے بلندیِ مقصد، جامعیت فکر اور فصاحت و بلاغتِ کلام کا معترف ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا، لیکن خصوصیت کے ساتھ برصغیر کی سیاسیات پر لکھی گئی

مندرجہ بالا کتابوں میں سید محمد میاں رحمۃ اللہ علیہ کا فن اپنے عروج پر نظر آتا ہے۔ان کتابوں کے مطالعے سے قاری اس نتیجے تک پہنچتا ہے کہ مصنف مطالعے کی وسعت، خیالات کی بلندی، انداز بیان کی قدرت، تحریر کی روانی و برجستگی، آورد و تصنع سے پاک ادبیت اور تاریخ ہند پر عمقِ نظر، تاریخی واقعات کے اسباب کی کھوج اور سلسلۂ واقعات کی کڑیوں میں ربط باہمی کی تلاش کرنے کی محیر العقول صلاحیتوں سے مالا مال ہے۔

ایک اہم تاریخی اصول:

بانیِ فلسفہ تاریخ ابن خلدون رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے شہرہ آفاق مقدمے میں لکھا ہے کہ:

> ''اگر مورخ تاریخ نگاری میں صرف نقل پر اعتماد کرنے لگے اور اصولِ عادیہ،قواعد سیاسیہ، سماجی رویوں، معاشرتی مسائل اور اجتماعی رہن سہن کو مدنظر رکھتے ہوئے جزئی واقعات کو اصولِ کلیہ پر نہ پرکھے تو وہ لغزشوں اور غلطیوں سے محفوظ نہیں رہ سکتا اور مورخین عام طور پر اس وجہ سے غلطیوں کے مرتکب ہوئے ہیں کہ انھوں نے واقعات لکھنے میں محض نقل پر اکتفا کیا ہے اور عقل وقیاس کی کسوٹی پر انھیں پرکھا نہیں''۔

اس اقتباس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مورخ کے لئے محض وسعت مطالعہ اور اقوامِ سابقہ کے حالات پر مطلع ہونا ہی کافی نہیں ہے بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ واقعات کے اسباب وعلل کی کھوج اور ثمرات ونتائج کے اخذ کا ملکہ بھی رکھتا ہو۔سلسلۂ واقعات کی کڑیوں میں ربط باہمی تلاش کرسکتا ہو، سماج اور معاشرے کی نفسیات سمجھتا ہو اور تمدن واجتماع کے طبعی وعادی قواعد واصول پر ماہرانہ نظر رکھتا ہو۔ علاوہ ازیں ایک محقق مورخ کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ شواہد وقرائن کی بنیاد اور اپنی اجتہادی قوت کے ذریعے واقعات وحوادث کی صحت وسقم کا سراغ لگا سکتا ہو اور انہی کی اساس پر وہ نتائج اخذ کرسکتا ہو۔

اربابِ بصیرت پر یہ بات مخفی نہیں ہے کہ گذشتہ سطور میں ہم مورخ کے لئے جن اصول وضوابط کے ضروری ہونے کی طرف اشارہ کرآئے ہیں ان کا جاننا اور پھر تاریخ نگاری کے دوران انھیں برتنا اور کام میں لانا ایک مورخ کے لئے ضروری ہے، کیونکہ ان اصولوں کی

عدم رعایت کی صورت میں تاریخ نہیں لکھی جاسکتی ، بلکہ قصے کہانیاں ، اساطیر ، افسانے اور داستانیں جنم لیتی ہیں ، جبکہ ان اصول وضوابط کی رعایت رکھ کر جو تاریخ لکھی جاتی ہے وہی اصل تاریخ ہوتی ہے جس سے آنے والی نسلیں نہ صرف یہ کہ گذشتہ اقوام کے احوال واقعیہ سے مطلع ہوسکتی ہیں بلکہ اپنے احوال کو ان کے احوال پر قیاس کرکے اپنا حال سنوار اور مستقبل نکھار سکتی ہیں۔

اگر ہم قرآن کریم میں غور وفکر کریں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ اس مقدس وعظیم کتاب میں بھی جو بعض واقعات مذکور ہیں وہ بھی محض ایک واقعے کے بیان کے طور پر مذکور نہیں ہیں قرآن کریم نے ان واقعات کو اس اسلوب سے بیان کیا ہے کہ اپنے پڑھنے والوں کو ان واقعات کے وقوع پذیر ہونے کے اسباب اور اور ان کے ثمرات ونتائج میں غور وفکر کی دعوت بھی ساتھ ساتھ دیتا رہے۔ قرآن کریم نے مختلف مقامات پر انسانوں کو اس بات کی دعوت دی ہے کہ وہ گذشتہ اقوام کی زندگی کا مطالعہ کریں اور ان کے احوال سے عبرت حاصل کریں۔ اس سے ہمیں تاریخ نگاری کا یہ اہم اصول ہاتھ آتا ہے کہ تاریخ محض بیان واقعات کا نام نہیں بلکہ ان واقعات میں کارفرما اصول عادیہ واحوال طبعیہ کی نشاندہی بھی ایک مؤرخ کی ذمہ داری ہے۔ عام ، مؤرخین کی ایک بڑی لغزش یہ بھی ہے کہ وہ تاریخ نویسی کے دوران میں ذاتی اغراض، شخصی محرکات ، گروہی تعصّبات اور نظریاتی وعقیدتی وابستگیوں سے خود بچا نہیں پائے جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ انہوں نے نقل واقعات میں تحریف وتصرف سے کام لیا اور واقعات کو اپنی منشا کے مطابق پیش کیا یا اس انداز سے ان واقعات کو پیش کیا جس سے ان کے اغراض ومقاصد پورے ہوتے تھے۔

اب ہم ان اصولوں پر مؤرخ الملت حضرت مولانا سید محمد میاں رحمتہ اللہ علیہ کی تاریخ نگاری کو پرکھیں تو اس بات میں کوئی شک وشبہ نہیں رہ جاتا کہ انہوں نے تاریخ نگاری کے تمام اصولوں کو مدنظر رکھتے ہوئے تاریخی موضوعات پر خامہ فرسائی فرمائی ہے۔ انہوں نے اپنی تاریخ کتب میں اس بات کا التزام کیا ہے کہ واقعات کے نقل پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ان

کا تجزیہ بھی کیا ہے اوران واقعات سے پند ونصائح حاصل کر کے اوران سے نتائج اخذ کر کے اپنے حلقۂ قارئین کو یہ بھی بتلایا ہے کہ وہ ان واقعات سے ملنے والے سبق کو اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی میں کس طرح بروئے کار لا سکتے ہیں۔ حضرت مولانا سید محمد میاں رحمتہ اللہ علیہ کی تاریخی کتابیں اس بات پر بھی شاہد عدل ہیں کہ ان کے مصنف علام نے تمام تر تعصّبات سے بالاتر ہو کر تاریخ نویسی کی ہے اور واقعات کو جوں کا توں بیان کرنے میں نہ کسی تعصب کو آڑے آنے دیا ہے اور نہ کسی خوف کو بلکہ تمام احوال وحوادث کو بلا خوف لومۃ لائم کما ہی قلم بند کیا ہے۔

امر واقعہ یہ ہے کہ اگر حضرت مولانا سید محمد میاں رحمتہ اللہ علیہ کی تاریخی کاوشیں ہمارے سامنے نہ آتیں تو برصغیر کی تاریخ اپنی اصل شکل میں شاید ہمارے سامنے کبھی نہ آپاتی۔

ایک گزارش:

اس سیمینار کے توسط سے حضرت مولانا سید محمد میاں رحمتہ اللہ علیہ کے نسبی وعلمی ورثا سے یہ گزارش کرتا ہوں کہ مؤرخ ملت رحمتہ اللہ علیہ کی جن تحریرات پر ابھی تک کام نہیں ہو سکا مثلاً فیض الباری پر ان کے تفصیلی حواشی اور ترمذی پر حاشیہ نیز وہ کتب جو عرصہ دراز سے دوبارہ شائع نہیں ہو سکیں مثلاً ''ہندوستان شاہان مغلیہ کے عہد میں'' علاوہ ازیں وہ مضامین جو مختلف جرائد میں شائع ہو کر اب ناپید ہو چکے ہیں، ان تمام قلمی کاوشوں کو شایانِ شان طریقے سے شائع کرانے کا اہتمام کیا جائے، تاکہ نئی نسل ان کے کارناموں سے مستفیض ہو سکے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت مولانا سید محمد میاں رحمتہ اللہ علیہ کی تمام مساعی کو اپنی بارگاہ قبولیت عطا فرمائے اور ہمیں ان کے علمی آثر سے کسبِ فیض کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

☆☆☆☆☆

سید الملت حضرت مولانا سید محمد میاںؒ

(سابق ناظم عمومی جمعیۃ علماء ہند و شیخ الحدیث مدرسہ امینیہ دہلی)

از: مولانا محمد برہان الدین سنبھلی رئیس قسم التفسیر واستاذ حدیث دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

راقم الحروف نے یوں تو حضرت مولانا سید محمد میاںؒ کا نام بہت پہلے سے سن رکھا تھا اور متعدد بار سرسری ملاقات کا شرف بھی اپنے والد ماجد مولانا قاری حمید الدین سنبھلی رحمۃ اللہ علیہ (شاگرد رشید حضرت علامہ مولانا انور شاہ کشمیریؒ) کے توسط سے حاصل کر چکا تھا؛ لیکن دارالعلوم دیوبند سے اپنا تعلیمی سلسلہ رسمی طور پر مکمل کرنے کے تھوڑے ہی عرصہ بعد جب ۱۹۵۸ء کے وسط میں احقر دہلی بسلسلۂ ملازمت گیا (اور تقریباً ۱۳؍سال وہاں رہا) تو مولانا موصوف کو نہ صرف بہت قریب سے دیکھنے، بلکہ ان کی بزرگانہ شفقتوں اور مربیانہ انداز سے مستفید ہونے کا موقع بھی ملا۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ راقم کو (جو تھوڑی بہت) علمی و قلمی ترقیوں کے مواقع نصیب ہوئے، ان کی ابتدا مولانا مرحوم کی ہی توجہات کی رہینِ منت ہے۔

خوش اخلاقی، سادگی اور بے نفسی نیز تقوی و پرہیزگاری میں مولانا بزرگانِ سلف کا نمونہ اور اخلاص کا پیکر تھے۔ اس وقت ان کے تقوی وللّٰہیت کا دہلی میں ڈنکا بج رہا تھا۔ (اگرچہ ملی خدمات اور بیدار مغزی وجرأت کے لحاظ سے پورے ملک میں مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ کا طوطی بول رہا تھا) مولانا اپنی افتادِ طبع کے لحاظ سے ایک عالم، مدرس، مفتی اور مربی تھے، اگرچہ جمعیۃ علماء ہند (جو اس وقت مسلمانوں کی واحد نمائندہ تنظیم تھی اور اپنے ناظم عمومی مجاہد ملت کی عظیم شخصیت کی وجہ سے آزادی کے بعد مسلمانانِ ہند کی مشکلات و مصائب کا بلاشریک غیرے درماں ہونے کی وجہ سے پورے ملک کی مرجع بنی ہوئی تھی) کی متنوع خدمات میں مشغولیت اور اس سے قبل جنگ آزادی میں عملی شرکت کی وجہ سے (چونکہ

مولانا جمعیۃ کے ناظم تھے، پھر مجاہد ملت کے انتقال کے بعد ناظم اعلیٰ بنے) دوسرے کاموں میں زیادہ وقت دینے پر مجبور ہوگئے یا کر دیے گئے تھے، مگر ان کا علم سے رشتہ کبھی منقطع نہیں ہوا۔ اسی کا یہ اثر تھا کہ مولانا عرصۂ دراز بعد مدرسہ شاہی مرادآباد کی تدریس سے علاحدگی کے تقریباً تیس، چالیس سال بعد دہلی کے شہرۂ آفاق مدرسہ امینیہ جیسے اہم تدریسی مرکز کے شیخ الحدیث بنائے گئے تو مستفیدین کو ایسا لگا کہ مولانا ہمیشہ استاذ ہی رہے، کبھی اسی کوچہ سے جدا نہیں ہوئے۔ پھر دام واپسیں تک ''حدیث دوست'' کی ''تکرار'' میں ہی مشغول رہے اور

ماہرچہ خواندیم ، فراموش می کنیم
الّا حدیث یار کہ تکرار می کنیم

کی عملی تصویر بنے رہے، یا یوں کہہ لیجئے (علامہ شبلی مرحوم کے الفاظ میں) چندے آستانِ غیر پر مقیم رہنے کے بعد خاتمہ بالخیر ہونا تھا۔

مولانا اس نسل کی نمائندگی کرتے تھے جس میں وضع داری، بزرگ داشت تعلقات کا پاس ولحاظ اور خورد نوازی خمیر میں گندھی ہوئی تھی، جس کا خوش گوار تجربہ براہ راست خود راقم کو ہوا۔ راقم اپنی افتادِ طبع کے اعتبار سے نسبتاً کم آمیز اور تعلقات بڑھانے کی ٹیکنک یا فن سے ناآشنا ہے۔ اس لیے دہلی جیسی مرکزی جگہ مقیم ہوجانے اور یہ جاننے کے باوجود کہ اس وقت کے وہاں اکابر علما میں بیشتر وہ تھے، جو والد صاحبؒ کے شناسا، بلکہ گہرے دوستوں میں تھے، اپنا یہ تعارف کرواکر تعلق پیدا یا استوار کرنے کی بھی کوشش نہیں کی۔ لیکن حضرت الاستاذ مولانا معراج الحق صاحبؒ جو راقم پر غیر معمولی شفقت فرماتے اور اس سے حسن ظن رکھتے تھے، وہ والد صاحب سے متعارف تھے اور ان کے وسیع تعلقات سے واقف بھی تھے، نیز استاذ محترم حضرت مولانا محمد میاں کے برادر نسبتی تھے؛ اس لیے استاذ محترم کی دہلی تشریف آوری بکثرت ہوتی تھی۔ موصوف کو جب راقم کے دہلی میں قیام پذیر ہونے کا علم ہوا تو کسی طرح پتہ چلا کر قیام گاہ تشریف لائے، اس وقت اتفاق سے راقم کی ملاقات نہیں ہوسکی، موصوف نے ایک مختصر سے نوشتے میں اپنی تشریف آوری اور دہلی میں ملنے کے

پتہ سے مطلع کیا۔ راقم اس پتہ پر حاضر ہوا تو حضرت الاستاذ سے نیاز حاصل ہونے کے ساتھ یہ بھی انکشاف ہوا کہ یہ حضرت مولانا محمد میاں صاحب کا دولت کدہ ہے، جن کی عظمت کا نقش دل پر پہلے ہی سے قائم تھا۔ بعد کے واقعات سے پتہ چلا کہ احقر کی موجودگی میں تو نہیں؛ لیکن حضرت الاستاذ نے مولانا موصوف سے راقم کا تعارف کرایا اور خیال ہوتا ہے کہ اس حقیر سے جو حسن ظن تھا، اس کا بھی اظہار کیا، جس کا اندازہ بعد میں حضرت سید الملت کے اس برتاؤ سے ہوا، جو موصوف نے احقر کے ساتھ روا رکھا۔

سب سے پہلے تو اس کا اظہار بایں طور ہوا کہ جب کچھ عرصہ بعد مولانا سے ملاقات ہوئی تو بزرگانہ شفقت سے بھری یہ شکایت کی کہ 'تم نے مجھے یہ نہیں بتایا کہ تم فلاں ... کے صاحبزادے ہو؟' ظاہر ہے اس کا جواب بجز انفعال وشرمندگی کے کیا ہوسکتا تھا! اس کے بعد تو مولانا کی عنایتوں کا وہ سلسلہ شروع ہوا، جس نے بزرگانِ پیشیں کی یاد تازہ کردی۔

یہاں یہ عرض کرنا بے محل نہ ہوگا کہ راقم کی دہلی میں ابتدائی مشغولیت میں ایک مسجد میں درس قرآن مجید وحدیث شریف (روزانہ دو درس) تک محدود تھی؛ لیکن موصوف سے حضرت الاستاذ نے نہ جانے احقر کے بارے میں کیا ارشاد فرمایا، جس کی وجہ سے انھوں نے دہلی کے تمام بڑے عربی مدارس میں، جن کے موصوف فعال رکن تھے، مجھے مدرس بنوانے کی سعی شروع فرمادی اور احقر سے کہا کہ جب بھی تمھیں پتہ چلے کہ کہیں کوئی جگہ خالی ہوئی ہے، مجھے فوراً بتانا، اور غالباً یہ بھی فرمایا کہ میں خود بھی خیال رکھوں گا۔ چنانچہ کچھ مہینے ہی گزرے تھے کہ مدرسہ عالیہ عربیہ فتح پوری میں ایک جگہ خالی ہوگئی، احقر نے تعمیل حکم کرتے ہوئے مولانا کو مطلع کیا تو ایک درجہ مسرت آمیز حیرت (یا حیرت آمیز مسرت) سے دوچار ہوا، جب مولانا کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ مجھے معلوم ہوگیا تھا اور میں نے پہلے سلسلۂ جنبانی کردی ہے۔ چنانچہ راقم کا مدرسہ عالیہ فتح پوری کے اندر تدریسی شعبہ میں تقرر ہوگیا۔ (یہاں یہ ذکر کرنا بے محل نہ ہوگا کہ اسی مدرسے کے ایک مدرس صاحب جو مولانا کے ہمنام تھے، انھوں نے بھی میرے لیے سعی کی) **فجزاهما الله خير الجزاء.**

اسی سے پھر آگے علمی و قلمی ترقیوں کی راہ کھلی۔ اس وقت دہلی میں یہی مدرسہ سب سے زیادہ اہم سمجھا جاتا تھا، یہاں کی بہتر تدریس کی شہرت بھی تھی۔ اس تقرر کے تھوڑے ہی عرصہ بعد راقم کا سب سے پہلا مضمون ''قوم یہود اور پچاس نمازیں'' حضرت مولانا ہی کی توجہ فرمائی سے اور غالباً نظر ثانی و اصلاح کے بعد ایک وقیع علمی رسالہ میں شائع ہوا۔ پھر تو گویا راقم کا قلم چل پڑا۔ مذکورہ مضمون کا محرک بھی تدریس ہی بنی۔ غالباً پہلے ہی سال راقم سے متعلق جن کتابوں کی تدریس کی گئی، ان میں اصول فقہ کی مشہور کتاب ''نورالانوار'' بھی تھی۔ اس میں ایک جگہ گذشتہ ادیان سماویہ کے احکام منسوخہ کی مثالیں دیتے ہوئے پچاس نمازوں کا بھی تذکرہ ہے۔ یعنی یہ کہ بنی اسرائیل پر دن رات میں پچاس نمازیں فرض ہوئی تھیں؛ مگر حدیث کے ایک طالب علم کی حیثیت سے راقم کو یہ بات کھٹکی؛ کیوں کہ واقعہ معراج کی صحیح احادیث میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبی کریم ﷺ سے ملاقات کے تذکرے میں یہ بھی ملتا ہے کہ جب آنحضرت ﷺ کی امت پر (پچاس کے بجائے) صرف پانچ نمازیں ہی رہ گئیں، تب بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مزید تخفیف کی اللہ تعالیٰ سے درخواست کرنے کا حضور ﷺ کو مشورہ دیا تھا، نیز مشورہ دیتے ہوئے یہ فرمایا تھا:

یا محمد! لقد راودت بني إسرائيل قومي على أدنى من هذا فضعفوا وتركوه. [بخاری شریف، ج: ۲، ص: ۱۱۲۱، کتاب التوحید]

اس واقعہ کی صحت کے ساتھ موجودگی ''یہود پر پچاس نمازوں کی فرضیت'' تسلیم کرنے سے مانع بنی ہوئی تھی۔ چنانچہ راقم نے متعلقہ کتب کی ورق گردانی اور گہرا مطالعہ کرنے کے بعد حاصل سعی و مطالعہ محولہ بالا مضمون میں پیش کر کے شائع کرا دیا تھا، اس کے بعد بتوفیق اللہ بہت سی دینی، علمی خدمات کا موقع ملا۔ اسی زمانے میں ''ادارۃ المباحث الفقہیہ'' قائم ہوا۔ (جو نئے پیش آمدہ مسائل کی تحقیق اور ان کے شرعی حل پیش کرنے کے لیے ''جمعیۃ علماء ہند'' نے حضرت مولانا سید محمد میاں صاحبؒ کی سرپرستی میں قائم کیا تھا) مذکورہ ادارے سے بھی راقم کی علمی وابستگی ہوئی، اس وابستگی میں بھی احقر کے ساتھ موصوف

کا حسن ظن کارفرما تھا۔ اس ادارے کی طرف سے مولانا نے ایک طویل سوالنامہ ''رویت ہلال'' سے متعلق جاری کیا تھا، اور اسے ہندوستان بھر کے تمام قابل ذکر علمی اداروں اور علماء کے پاس بھیج کر جوابات طلب کیے تھے۔ راقم نے بھی اس کے جواب میں ایک تفصیلی مضمون لکھا، جو بعد میں کتابی شکل میں لکھنؤ سے شائع ہوا۔ مولانا مرحوم رویت ہلال کے بارے میں (رمضان وعید کے موقع پر) ہندوستان میں جو کبھی کبھی انتشار پیدا ہو جاتا ہے، اس سے بڑے فکرمند رہتے تھے، اسے دور کرنے کے لیے ہی یہ سوالنامہ جاری کیا اور متعدد بار اجتماعات کر کے فیصلے کیے اور خود بھی اس موضوع پر ایک وقیع علمی رسالہ لکھا اور سب سے پہلے غالباً ۱۹۵۱ء میں مرادآباد کے اندر ایک عظیم الشان اجتماع بلا کر جس میں حضرت الاستاذ شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ اور مفتی کفایت اللہؒ جیسے اکابر علماء بھی شریک تھے، ریڈیو سے نشر ہونے والی رویت ہلال سے متعلق اطلاع کا حکم شرعی ظاہر کیا۔

راقم حیران ہے کہ موصوف کی کس کس عنایت کا تذکرہ کیا جائے، سب کا احاطہ آسان نہیں ہے، بس ان ہی چند مثالوں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ موصوف کی شفقتوں کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ ان دنوں صاحبزادۂ گرامی ساجد میاں سلمہ مدرسہ فتح پوری کے طالب علم تھے (اس وقت تو صرف ساجد میاں کے نام سے جانے جاتے تھے) جو اپنے والد کی حسن تربیت اور اللہ کے فضل وکرم کی بنا پر زیور علم وعمل اور تقویٰ وسعادت مندی کی دولتوں سے آراستہ ہوئے، اب سعودی سفارت خانہ میں ایک اہم منصب پر فائز ہونے کی وجہ سے بہت سوں کے لیے فائدہ رسانی کا ذریعہ بنے ہوئے ہیں۔ **أعلى الله مراتبه ورعاه.**

مولانا کی توجہ تام اور پدرانہ تربیت کا اعلیٰ نمونہ موصوف کے بڑے صاحبزادے مولانا سید حامد میاںؒ میں دیکھا جا سکتا تھا، جنھوں نے علمی وعملی، فکری وتدریسی اور اصلاحی میدانوں میں ترقی کے اعلیٰ سے اعلیٰ منازل طے کیے۔ وہ ملک کے ہی نہیں؛ بلکہ برصغیر کے صف اول کے علماء ومصلحین میں شمار کیے گئے۔ تقسیم ہند کے چند سال بعد وہ پاکستان کے مشہور علمی وتہذیبی شہر ''لاہور'' منتقل ہو گئے، جہاں موصوف نے اپنے استاذ وشیخ (جن سے

انھیں اجازتِ بیعت بھی حاصل تھی) شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کے نام پر ''جامعہ مدنیہ'' قائم کیا، جو اُن کی انتھک محنتوں اور مخلصانہ جدوجہد کی وجہ سے پاکستان کے اعلیٰ دینی مدرسوں میں گنا جانے لگا؛ مگر افسوس کہ مولانا حامد میاں موصوف نسبتاً کم عمری ہی میں اپنے والد کے انتقال کے دس بارہ سال بعد خود بھی جوارِ رحمت کے مکین ہوگئے اور ایسا خلا چھوڑ گئے، جس کا جلد پورا ہونا دشوار ہے۔ مولانا مرحوم جید حافظ قرآن اور مجود بھی تھے، راقم الحروف نے اپنی بہت کم عمری میں (غالباً وہ تقسیم ہند سے قریب کا زمانہ تھا) مرادآباد کی شاہی مسجد میں متعدد بار تراویح ان کی پیچھے پڑھی۔ تراویح میں ان کی قراءت کی لذت آج تک یاد ہے، اس وقت مولانا کا عنفوان شباب تھا اور سبزہ آغاز۔

غرضیکہ حضرت مولانا محمد میاں صاحب ایک جامع شخصیت کے مالک تھے، اسی وجہ سے وہ متعدد اداروں، انجمنوں، مجلسوں اور تنظیموں کے رکن رکین تھے۔ مختلف مجالس میں بحثوں کے بعد تجویز مرتب کرنے کی ذمہ داری مولانا کی بیدار مغزی اور سلیقہ مندی کی بنا پر بالعموم انھیں کے سپرد کی جاتی تھی، جسے وہ بطریق احسن انجام دیتے تھے۔ کہا جاسکتا ہے کہ حضرت مولانا مفتی کفایت اللہؒ کے بعد فقیہانہ محتاط عبارت نگاری میں مولانا کا ہی درجہ تھا۔ سنا گیا کہ حضرت الاستاذ شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ نے جو مولانا کے شیخ بھی تھے، موصوف کے اس وصف امتیازی کی بنا پر مذاقاً انھیں ''حیوانِ کاتب'' کا لقب دیا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ مولانا قلم کے دھنی تھے۔ نہ جانے کتنے ہزار صفحات مولانا کے رشحات قلم سے مزین ہوکر شائع ہوچکے ہیں۔ متعدد مستقل کتابوں، جن میں ''علمائے ہند کا شان دار ماضی'' کی پانچ جلدیں سب سے نمایاں ہیں، ان کے علاوہ خدا جانے کتنے مضامین اور مقالے دینی، اصلاحی، سیاسی، علمی، تعلیمی، تنقیدی وغیرہ موضوعات پر مولانا نے لکھ کر ملک وملت کی خیرخواہی ورہنمائی کا فریضہ انجام دے کر ۱۶/شوال ۱۳۹۵ھ مطابق ۲۲/اکتوبر ۱۹۷۵ء کو ۷۴/سال کی عمر میں اپنے وطن مالوف ''دیوبند'' میں وفات پاکر رخصت ہوئے اور وہیں مدفون ہوئے۔ إنا للّٰہ وإنا إلیہ راجعون، ورحمہ اللّٰہ رحمۃ واسعۃ کاملۃ

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے ۔۔۔ سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

حضرت مولانا سید محمد میاں دیوبندی

عظیم مؤرخ اور مفکر

حضرت مولانا زاہد الراشدی صاحب گجرانوالہ پاکستان

جمعیۃ علما ہند کے قیام کو ایک صدی مکمل ہونے پر انڈیا میں صد سالہ تقریبات کا سلسلہ جاری ہے اور جمعیۃ کے بزرگ اکابر کی یاد میں مختلف سیمینارز منعقد ہو رہے ہیں۔ دہلی میں جمعیۃ علما ہند کے سرگرم راہنما، مؤرخ اور مفکر حضرت مولانا سید محمد میاں دیوبندی کے حوالہ سے منعقدہ سیمینار کی مناسبت سے حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ عقیدت اور چند ملاقاتوں کے تاثرات پر مشتمل کچھ گزارشات قلمبند ہوگئیں جو قارئین کی خدمت میں پیش کی جارہی ہیں۔

حضرت مولانا سید محمد میاں دیوبندی کا نام پہلی بار طالب علمی کے دور میں اس وقت سنا جب میں جامعہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ میں زیر تعلیم تھا اور چچا محترم حضرت مولانا صوفی عبدالحمید خان سواتی کے زیر مطالعہ کتابوں اور جرائد پر میری بھی نظر پڑتی رہتی تھی، بلکہ وہ خود کسی نہ کسی کتاب کے مطالعہ کا موقع فراہم کر دیتے تھے۔ ان دنوں جمعیۃ علما ہند کے بارے میں حضرت مولانا سید محمد میاں کا رسالہ ''جمعیۃ علما کیا ہے؟'' نظر سے گزرا۔ اس سے قبل چودھری افضل حق کی ''تاریخ احرار'' دیکھ چکا تھا، اس لئے تاریخ کا تھوڑا بہت ذوق رکھتا تھا۔ اس کے بعد ''علماء حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے'' اور ''علماء ہند کا شاندار ماضی'' کا مطالعہ کرنے کا موقع ملا اور ذہن وفکر کے دائرے متعین ہوتے چلے گئے۔ اس کے ساتھ ہی حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے افکار وتعلیمات کا ایک نقشہ مولانا سید محمد میاں کے قلم سے ''علماء ہند کا شاندار ماضی''

میں نظر سے گزرا تو حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے بارے میں وہ باتیں بھی کچھ نہ کچھ سمجھ میں آنے لگیں جو والد محترم حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر اور عم مکرم حضرت مولانا صوفی عبد الحمید خان سواتی سے عام طور پر سنا کرتا تھا۔ چچا محترم اپنے بیانات، اسباق اور مواعظ میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی، شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن، حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی اور حضرت مولانا عبید اللہ سندھی کا تذکرہ جس ذوق ومحبت سے کرتے تھے اس کے نقوش ذہن میں راسخ ہوتے چلے گئے اور ان بزرگوں تک فکری رسائی کا سب سے بڑا ذریعہ میرے پاس حضرت مولانا سید محمد میاں کی کتابیں اور مضامین ہوتے تھے۔

میں طالب علمی کے دور میں ہی جمعیۃ علماء اسلام پاکستان سے وابستہ ہو گیا تھا اور اس کی سرگرمیوں میں کسی نہ کسی سطح پر شریک رہنا میرے معمولات کا حصہ تھا۔ اسی دور میں جامعہ مدنیہ لاہور کے بانی اور حضرت مولانا سید محمد میاں کے فرزند حضرت مولانا سید حامد میاں کی خدمت میں حاضری کے مواقع میسر آنے لگے اور ان سے نیازمندی کا تعلق استوار ہو گیا۔ اس دوران معلوم ہوا کہ حضرت مولانا سید محمد میاں لاہور تشریف لائے ہوئے ہیں، بیحد خوشی ہوئی اور ایک روز ان کی ملاقات وزیارت کے لیے جامعہ مدنیہ لاہور حاضر ہو گیا۔ حضرت مولانا سید حامد میاں گھر میں نہیں تھے، ایک سادہ سے بزرگ نے دروازہ کھولا تو میں نے عرض کیا کہ گوجرانوالہ سے حضرت کی زیارت وملاقات کے لیے آیا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ 'حضرت تو کسی کام کے لیے گئے ہوئے ہیں، تھوڑی دیر میں آئیں گے، آپ اندر آئیں اور بیٹھ جائیں۔' میں سمجھا کہ خاندان کے کوئی بزرگ ہیں اور مہمانوں وغیرہ کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ میں کمرہ میں بیٹھ گیا، تھوڑی دیر بعد وہ بزرگ دسترخوان اور پانی کا لوٹا لیے تشریف لائے اور فرمایا کہ 'کھانے کا وقت ہے آپ دور سے آئے ہیں کھانا کھا لیں۔' میں بیٹھ گیا، انہوں نے ہاتھ دھلوانے کے لیے لوٹا پکڑا ہوا تھا، میں نے لوٹا ان کے ہاتھ سے لینا چاہا اور عرض کیا کہ 'آپ بزرگ ہیں، میں ہاتھ خود ہی دھو لوں گا۔' فرمایا کہ 'نہیں آپ ہمارے مہمان ہیں، اس لیے میں ہی ہاتھ دھلواؤں گا۔' میں نے ہاتھ دھوئے اور کھانا شروع

کر دیا، ابھی فارغ ہوا ہی تھا کہ حضرت مولانا سید حامد میاں تشریف لائے، ان سے ملا تو پوچھا ’کیسے آئے ہو؟‘ میں نے عرض کیا کہ ’حضرت سے ملنے آیا ہوں۔‘ پوچھا ’مل لیا؟‘ میں نے عرض کیا کہ ’وہ کہاں ہیں؟‘ کان کے قریب منہ لا کر آہستہ سے کہا کہ ’یہ آپ کے سامنے تو بیٹھے ہیں۔‘ اللہ اکبر! یہ کیا ہو گیا؟ میں تو شرم کے مارے پانی پانی ہو گیا، اب میرے منہ سے کوئی بات نہیں نکل رہی تھی اور حضرت مولانا سید حامد میاں مجھے دیکھ کر مسکرائے جا رہے تھے۔ حضرت مولانا سید محمد میاں نے انتہائی شفقت کے ساتھ مجھے تسلی دی اور فرمایا کہ بھائی آپ مہمان ہیں، اس لیے پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں ہے۔

یہ ان سے میری پہلی ملاقات تھی جس کے نقوش و مناظر ابھی تک ذہن میں تازہ ہیں، اور کبھی کبھی ان کا تصور ذہن میں لا کر اپنے ان بزرگوں سے عالم تخیل میں ملاقات کر لیا کرتا ہوں۔ میرے ساتھ ان دنوں گوجرانوالہ کے مولانا قاری محمد یوسف عثمانی جماعتی و تحریکی کاموں میں بہت متحرک ہوا کرتے تھے، اب وہ عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت گوجرانوالہ کے سیکرٹری جنرل کے طور پر کام کر رہے ہیں۔ ان کے ساتھ ایک بار پھر جامعہ مدنیہ حاضری ہوئی اور دونوں حضرات کی زیارت و ملاقات سے شادکام ہوئے۔ اس موقع پر پتہ چلا کہ حضرت مولانا سید محمد میاں اپنی پوتی کے نکاح میں شرکت کے لیے آئے ہیں، جس کا نکاح ضلع گوجرانوالہ کے ایک بڑے قصبہ قلعہ دیدار سنگھ کے کسی نواحی گاؤں میں ہوا ہے اور نکاح کے دوسرے دن حضرت کو ولیمہ میں شرکت کے لیے اس گاؤں جانا ہے۔ اس زمانہ میں گوجرانوالہ کا بائی پاس روڈ نہیں بنا تھا اور قلعہ دیدار سنگھ جانے کے لیے چوک گھنٹہ گھر کے پاس سے گزر کر جانا ہوتا تھا جس سے چند قدم کے فاصلے پر جامعہ نصرۃ العلوم واقع ہے۔ ہم بہت خوش ہوئے کہ اس بہانے حضرت مولانا سید محمد میاں تھوڑی دیر کے لیے ہی سہی جامعہ نصرۃ العلوم میں تشریف لاسکیں گے، مگر معلوم ہوا کہ عملاً ایسا نہیں ہو سکے گا، اس لیے کہ ویزے کے قوانین کے تحت ان کی نقل و حرکت متعین راستوں اور مقامات سے ہی ممکن ہوگی اور ادھر ادھر کسی جگہ وہ نہیں جاسکیں گے۔ یہ بات مجھے اور قاری محمد یوسف عثمانی کو کسی طرح

ہضم نہیں ہورہی تھی کہ حضرت مولانا سید محمد میاں جامعہ نصرۃ العلوم کے قریب صرف چند قدم کے فاصلے سے گزریں گے اور ہمارے ہاں تشریف نہیں لائیں گے۔ ہم شش و پنج اور پیچ و تاب کے اسی حال میں تھے کہ اللہ تعالیٰ نے **کذلک کدنا لیوسف** کی طرز پر ذہن میں ایک ترکیب ڈال دی اور ہم نے پلان بنا کر حضرت مولانا سید حامد میاں کو اعتماد میں لے لیا۔ پھر ہوا یوں کہ حضرت مولانا سید محمد میاں کو لاہور سے ولیمہ کے لیے قلعہ دیدار سنگھ لے جانے کے لیے گاڑی کا بندوبست ہم نے کیا جو جامعہ نصرۃ العلوم کے قریب سے گزرتے ہوئے اچانک خراب ہوگئی۔ ڈرائیور نے بہت کوشش کی مگر انجن کا نقص معلوم نہ ہوسکا۔ حضرت مولانا سید محمد میاں کو گاڑی سے باہر لا کر سڑک پر ایک کرسی پر بٹھا دیا گیا تاکہ جتنی دیر گاڑی چلنے کے قابل نہیں ہوتی وہ آرام سے بیٹھے رہیں۔ نگرانی کے لیے ساتھ جانے والے پولیس آفیسر سے ہم نے کہا کہ بزرگ مہمان ہیں، اس طرح سڑک پر بٹھانا مناسب نہیں ہے، قریب ہی مدرسہ ہے، اگر اجازت ہو تو گاڑی ٹھیک ہونے تک وہاں بٹھا لیا جائے۔ اس نے صورتحال دیکھتے ہوئے اجازت دے دی اور یوں ہم حضرت کو مدرسہ میں لے آئے جہاں حضرت والد محترم مولانا محمد سرفراز خان صفدر اور حضرت مولانا صوفی عبدالحمید سواتی کے علاوہ شہر کے بزرگ علماء حضرت مولانا مفتی عبدالواحد، حضرت مولانا عبدالقیوم ہزاروی، حضرت مولانا احمد سعید ہزاروی اور دیگر بہت سے حضرات پہلے سے موجود تھے۔ ان کے ساتھ تھوڑی دیر نشست رہی اور پھر گاڑی ٹھیک ہوجانے پر حضرت کو آگے روانہ کردیا گیا۔

حضرت مولانا سید محمد میاں نے ایک مؤرخ کے طور پر برصغیر میں دینی جدوجہد کی تاریخ کو جس ذوق و محنت کے ساتھ مرتب کیا ہے وہ اہل حق پر ان کا بہت بڑا احسان ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے افکار و تعلیمات کو منظم و مرتب انداز میں پیش کر کے انہوں نے علماء حق کی راہنمائی کا ہمیشہ کے لیے اہتمام کردیا ہے۔ وہ تحریک ولی اللہی کے محسنین میں سے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات جنت میں بلند سے بلند تر فرمائیں۔

آمین یا رب العالمین

مولانا سید محمد میاں صاحب

فکر وعمل کا ایک سرسری جائزہ

جناب محمد ادریس ایپل صاحب سابق مدیر ماہنامہ الجمعیۃ راولپنڈی

مضمون نگار جمعیۃ علماء اسلام پاکستان کے بزرگ رہنما ہیں، جمعیۃ علماء کا تنظیمی
آرگن ماہ نامہ الجمعیۃ راولپنڈی کے سابق ایڈیٹر ہیں۔ آج کل صاحب فراش ہیں،
۷۰ رسال سے زائد عمر ہے۔ انھوں نے ازراہ کرم یہ مضمون مولانا محمد عابد صاحب
(استاذ جامعہ مدنیہ لاہور) کے واسطہ سے بھیجا ہے، ہم دونوں حضرات کے ممنون ہیں۔

ایک عالمِ حق مکڑی کے جالے کی طرح اپنے گرد حصار نہیں بناتا کہ وہ سب سے کمزور حصار ہوتا ہے، تندیٔ بادِ مخالف کا ایک ہلکا سا جھونکا اس کا نام ونشان مٹا دیتا ہے۔ اور نہ وہ فکر وعمل میں گروہی، علاقائی اور فروعی امتیازات کا اسیر ہوتا ہے؛ بلکہ عالمِ حق کی نظر ہمیشہ آفاقی ہوتی ہے، وہ وہی سوچتا اور کرتا ہے، جس کے اثرات آفاقی اور ہمہ گیر ہوں؛ لہٰذا اس کی سوچ اجتماعیت پر مشتمل ہوتی ہے، وہ کل انسانیت کی فلاح سوچتا ہے اور اس کی نظر میں اسلام سے بڑھ کر انسانی اجتماعیت کی فلاح کا دوسرا کوئی پروگرام نہیں ہوتا؛ لہٰذا اس دائرے میں اس کا موضوع امت مسلمہ ہوتی ہے اور اس کی فکر کا محور اس امت کی بقا اور سربلندی ہوتی ہے۔ اور اس کا غم اس کے تنزل واضمحلال کا غم ہوتا ہے۔

بنیادی طور پر مولانا سید محمد میاں مفکر، ادیب اور صاحب قلم ہیں، اور ایسے صاحب قلم ہیں، جن کی سوچ آفاقی ہے، ان کے قلم کی نوک حالات کی نباض ہے، ان کی قلمی کاوشیں پتہ دیتی ہیں کہ فکر ونظر میں اضمحلال کہاں واقع ہے؟ اس کی وجوہات کیا ہیں؟ اور اسے کیسے مضبوط بنانا ہے؟ عمل میں کج روی کہاں ہے اور اسے کیسے راہِ راست پر لانا ہے؟

مولانا سید محمد میاںؒ اس دور کی شخصیت ہیں کہ جب مسلمان تین سو سالہ برطانوی استعمار کے ظالمانہ اور سفاکانہ اقتدار کے مقابل عظیم قربانیوں کے بعد، ابھی کچھ سنبھلے ہیں؛ لیکن آزادی وحریت کی جنگ ابھی جیتی نہیں گئی؛ بلکہ ایک فیصلہ کن موڑ پر آ گئی ہے، اس وقت یہ عالم ربانی (خدا ان پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے) اپنے آپ کو پیش کر کے، اپنے آپ کو اس کٹھن اور صبر آزما میدان میں اتار دیتے ہیں۔

ایک طرف انھیں حریت شعار اساتذہ واکابر سے جو علمی کمالات، تفسیری گہرائیاں، فہم حدیث کی بلندیاں، فقہ واجتہاد کی باریکیاں، فلسفہ وکلام کی نکتہ آفرینیاں اور تاریخی روایت اور صداقتیں ورثے میں ملی ہیں، انھوں نے نئی نسل تک پہنچانے کے لیے مسند تدریس کا انتخاب کیا اور اس میں مہارت وکمال حاصل کر کے ایک ایسی امتیازی حیثیت حاصل کر لی کہ بعد کے دور کی علمی اور سیاسی شخصیات ان سے شرف تلمذ پر فخر کرتی رہی ہیں۔

اس کے بعد ان کے ذوق تحقیق ومطالعہ نے انھیں تصنیف وتالیف پر آمادہ کیا، تصنیف وتالیف کا شغل رکھنے والے اس میدان میں آبلہ پائیوں سے اچھی طرح آگاہ ہیں، کتابوں کی ورق گردانی، حوالوں کی تخریج، متن کی ترتیب وتدوین اور قلم کی روانی میں ان کا سارا وقت صرف ہو جاتا ہے، انھیں کسی دوسری طرف نظر اٹھانے کا موقع ہی نہیں ملتا۔

مولانا سید محمد میاںؒ کی شخصیت کا اعجاز ہے کہ نہ تدریس، تصنیف وتالیف میں حائل ہوتی ہے اور نہ تصنیف وتالیف، تدریس میں۔ اوقات کی حسن ترتیب وتقسیم سے دونوں کام انجام پا رہے ہیں، ایک طرف ان کے زیر سایہ طلبہ تعلیم مکمل کر کے علمی اور عملی سفر کر رہے ہیں تو دوسری طرف ان کے قلم سے شاہکار کتابیں نکل کر لوگوں کو متاثر کر رہی ہیں۔

مولانا سید محمد میاں نے اپنے گرد وپیش کی فکری کاوشوں کو دیکھ کر یہ محسوس کیا کہ قومیں ہمیشہ اپنے قابل فخر ماضی اور کردار کی روشن قندیلوں سے جہاں مستقبل کے لیے راہ نمائی حاصل کرتی ہیں، وہاں ماضی کی جدوجہد کے تذکرے، ان کے جذبوں اور حوصلوں کو بھی بلندیاں عطا کرتے ہیں۔

یہ ان کا احساس تھا کہ دشمنان اسلام ہمارے ماضی کو داغ دار پیش کر کے، ہمارا رشتہ ماضی سے کاٹ کر، ہماری فکری کشتیوں کو بے سمت کر کے ہمیں بے یارومددگار، نامعلوم منزلوں کی طرف دھکیل رہے ہیں، تو انھوں نے ہمارا رشتہ ماضی سے مضبوط و مربوط کرنے کے لیے ہماری تاریخ کو اپنے زورِ قلم سے بڑے ہی قابل فخر انداز میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کی۔

صحابہ کا عہد زریں لکھ کر ہمیں بتایا کہ اس امت کا اثاثہ، اس امت کا ورثہ، اس کی اقدار، اس کی فکری حیثیت، اس کی علمی بلندیاں اور انسانیت کے لیے اس کی خدمات کیا ہیں؟ اور وہ کون سا قافلہ ہے، ہم جس سے بچھڑے ہوئے ہیں اور ہماری منزلیں کیا ہیں اور بحیثیت فردِ امت ہماری ذمہ داریاں کیا ہیں؟ وہ تاریخ کے اس فلسفے سے پوری طرح آگاہ ہیں کہ تہذیبیں اس وقت مرجاتی ہیں، نظریے وعقیدے موت کی وادیوں میں اتر جاتے ہیں، جذبے اور حوصلے پستیوں کی نذر ہوجاتے ہیں جب ان کا رشتہ ماضی سے کٹ جاتا ہے، تو باطل اس وقت حملہ آور ہوکر فکری غلبہ حاصل کرلیتا ہے؛ لہذا انھوں نے اس موضوع کا انتخاب کر کے اسلامی تہذیب کو تحفظ دیا، اور نئی نسل کو زندہ اور متحرک انداز میں سوچنے اور زندگی کا لائحۂ عمل مرتب کرنے کی ترغیب دی۔

''صحابہ کا عہد زریں'' کی تصنیف کے ساتھ ہی وہ ماضی قریب میں مغربی استعمار کی اسلام اور مسلمانوں کے خلاف مظالم اور سفاکیت کی داستانوں اور اس دورِ ابتلا میں علماء حق کی استقامت، جرأت اور قربانیوں کا نقشہ کھینچ کر ہماری تاریخ کو نہ صرف رقم کیا؛ بلکہ اسے مسخ ہونے کے خطرے سے بھی بچایا۔ اور تحریک آزادی کو بغاوت یا غدر کہنے والوں کو شاندار جواب دیا اور اس خطے میں مسلمانوں کو سر اٹھا کر کے چلنے کا حوصلہ دیا۔ ''علماء ہند کا شاندار ماضی'' اسی حق و باطل کی کشمکش کا تذکرہ ہے۔

مولانا سید محمد میاں نے اپنے ماضی کو شاندار قرار دے کر آنے والی نسلوں کو مرعوبیت سے نکال کر ان میں جذبوں اور حوصلوں کی روح پھونکی ہے کہ آج اس کو پڑھ کر ہر

فردِ اسلام کیلئے قربانی دینے اور استعمار سے آزادی کے جذبوں کو اپنے اندر جوان پاتا ہے۔

اس میدان میں وہ تھوڑا اور آگے بڑھتے ہیں تو وہ حضرت شیخ الہند اور مولانا عبید اللہ سندھی کی برپا کی ہوئی تحریک ریشمی رومال کی طرف متوجہ ہوتے ہیں کہ تاریخ کا یہ شاندار ورق مخالفین کی اڑائی ہوئی دھول کی نذر نہ ہو جائے۔تو انڈیا آفس لائبریری لندن میں رکھی برطانوی دور کی سی آئی ڈی رپورٹ کو نہایت عرق ریزی سے مرتب کر کے سامنے لاتے ہیں تو استعماری کارندوں کے تجزیاتی افسانوں اور واقعاتی کذب بیانیوں کا پول کھول دیتے ہیں اور ثابت کرتے ہیں کہ یہ کوئی رومانیت نہیں تھی ؛ بلکہ ایک حقیقت تھی ،جس نے انگریزوں کا ناک میں دم کیے رکھا اور یہ انڈر گراؤنڈ منظّم تحریک تھی اور پھر آزادیٔ وطن کی اس تحریک کا رشتہ انھوں نے سید احمد شہید اور شاہ ولی اللہ سے جوڑ کر علماء حق کی جہد مسلسل کا تأثر دیا ہے۔

مولانا سید محمد میاںؒ کی ان کاوشوں کا تجزیہ کرتے ہوئے ،اس کی اہمیت جانچنے کے لیے ہمارے تاریخی لٹریچر سے اگر ان کی تصانیف نکال دی جائیں تو ہمارے پاس کوئی مواد نہیں ، جو ہمیں ماضی کی جدو جہد سے آگاہی دے سکے،سوائے وہ مغربی استعمار اور اس کے کارندوں کے بے ربط ، نا قابل اعتماد ،متعصّبانہ تذکرے یا بیمار ذہنوں کے کچھ تجزیے۔مولانا محمد میاں کی ان تصانیف کے مطالعے کے بعد محسوس کیا جاسکتا ہے کہ شاہ ولی اللہ سے لے کر حضرت شیخ الہند و شیخ الاسلام اور مفتی محمود و مولانا فضل الرحمٰن تک ایک سنہری زنجیر ہے، جس کی ہر کڑی چمکتی ہوئی تحفظ اسلام اور آزادی و حریت کا درس دے رہی ہے اور مستقبل کی منزلوں کا پتہ دے رہی ہے۔

مولانا سید محمد میاں کا ماضی سے اپنا رشتہ اتنا مضبوط اور قوی ہے کہ ان کا سلسلۂ نسب سیدنا علیؓ سے ملتے ہوئے فخر موجودات تک پہنچتا ہے اور امام الاولیا، سید السادات حضرت علی رضی اللہ عنہ کی زندگی کی برتر صفات ،علم وحکمت ، جہاد و سیاست ،فقر واستغنا اور فصاحت وبلاغت ہیں۔مولانا سید میاں کا سید السادات کے خانوادے سے نسبی تعلق اپنی جگہ؛ لیکن چودہ سو سال بعد ان کی صفات کی جھلک مولانا سید محمد میاں کے سراپے میں ظاہر ہوئی ہیں۔

ایک مفکر، ایک داعی اپنی سوچ اور فکر کے محور سے ہمہ وقت دائرۂ عمل تشکیل دیتا رہتا ہے، اب ایک داعی کی حیثیت سے انھوں نے فخر موجودات اور سید الرسل حضرت محمد ﷺ کی سیرت نگاری کی کوششوں پر نظر ڈالی تو انھیں کافی کام نظر آیا، ''رحمۃ للعالمین'' اپنی آب و تاب کے ساتھ موجود تھی، مولانا شبلی نعمانی کی ''سیرت النبی''، مولانا مناظر احسن گیلانی کی ''النبی الخاتم'' تازہ ترین کاوشیں تھیں؛ لیکن مولانا محمد میاں نے اپنے آپ کو ہندوؤں کے متعصّبانہ معاشرے میں محسوس کیا تو داعیانہ انداز میں سیرت رسول ﷺ لکھنے کا فیصلہ کیا اور سیرت کے ایسے انسانی پہلو سامنے لائے کہ غیر مسلموں کی غلط فہمیاں دور ہوں اور اعلیٰ انسانی معیاروں پر فائز شخصیت کے بارے میں نرم گوشے کے ساتھ ساتھ محبت کے جذبات پیدا ہوں، مناظرانہ انداز نہیں؛ بلکہ داعیانہ انداز، جس سے غیر مسلم ہندو معاشرے میں سیرت کا پیغام پہنچ سکے؛ لہٰذا اس کے پیش نظر انھوں نے ''محمد رسول اللہ'' کے نام سے سیرت لکھی اور داد پائی۔ نسل نو کی ذہنی تربیت کے لیے کہیں وہ بچوں کا ادب تخلیق کرتے ہیں، دینی ضرورت کی کتابیں مرتب کرتے ہیں، جیسے کوئی ماہر تعلیم نئی نسل کی ترقی کے خواب دل میں سجا کر نصاب تعلیم مرتب کرتا ہے۔

اس طرح مولانا محمد میاں ایک داعی، مفکر، مدبر کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں کہ انھیں اصلاح امت کی دھن سوار ہو، جس کے لیے وہ اپنا قلم، اپنا ذہن و دماغ اور حیات مستعار کے اوقات نہایت تندہی سے استعمال کر رہے ہوں۔ تاریخ کے حوالے سے انھوں نے جو کام کیا ہے، اس کی نظیر نہیں ملتی، اس کے علاوہ بین الاقوامی حالات، نظریاتی رجحانات اور فکری پروازوں کو بھی زیر بحث لائے ہیں، آنے والے دور کی پیش بینی بھی انھوں نے کی ہے اور پیش بندی بھی سامنے لائے ہیں۔ انھوں نے علماء حق کی جدوجہد کا سلسلہ شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالعزیز سے جوڑ کر نظریاتی بنیادوں کو مضبوط کیا ہے۔ محمد میاں پہلے شخص ہیں، جنھوں نے شاہ ولی اللہ کے اصول مربوط انداز میں پیش کیے اور آنے والے دور کے لیے راہ نمائی فراہم کی۔ آنے والے انقلاب کی تصویر میں انھوں نے یورپ کی طرف سے آنے والے صنعتی انقلاب کے مضمرات پر بحث کی اور جہاں اسے ترقی قرار دیا، وہاں عام انسانوں

کے لیے بے روزگاری کی مصیبت کہا اور دین، مذہب، سیاست اور اقتصادیات پر اس کے برے اثرات کی نشاندہی کر کے اسے انسانیت کے لیے خطرناک قرار دیا، اور انسانیت کے لیے اس کا قابل عمل حل تلاش کرنے کی دعوت دی، آج ان کی پیش گوئیاں حقیقت کا روپ دھار چکی ہیں کہ اس صنعتی انقلاب نے ایک قلیل طبقے کو اعلیٰ معیار زندگی عطا کیا ہے؛ لیکن دنیا کی اکثر آبادی غربت اور بے روزگاری کی چکی میں پس کر خط افلاس سے بھی نیچے زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔ مولانا محمد میاں جب سیاسی حالات کا شاہ ولی اللہ کے فکر وفلسفہ کی روشنی میں تجزیہ کرتے ہیں تو وہ مولانا عبید اللہ سندھی کی فکری تحریک کے ترجمان لگتے ہیں۔

مولانا محمد میاں درس تدریس کے فردِ فرید اور تصنیف وتالیف کے مردِ میدان ہی نہیں؛ بلکہ انھوں نے سیاسی تحریکوں میں عملی طور پر بھرپور کردار ادا کیا، آزادئ وطن کے لیے قید وبند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں، جمعیۃ علماء ہند میں قائدانہ کردار ادا کیا، یہ الگ ایک موضوع اور عنوان ہے، جس کا یہاں احاطہ ممکن نہیں۔

مولانا محمد میاں کی فکر وعمل کی دنیا بڑی عجیب ودلکش ہے، جہاں فکر ونظر کی حسین وادیاں ہیں، جہاں علمی آبشاریں، ذوق کے خوب صورت چمن، شوق کی بلند وبالا گھاٹیاں، حکمت وتدبر کی نہریں، دانش وعمل کے ابلتے چشمے ہیں؛ لیکن اس سے بھی عجیب تر کہ ان کی عقبیٰ کے لیے حیران کن کاوشیں اور تعلق مع اللہ کے لیے بے تابیاں کہ سید حامد میاں کی روایت ہے، مصروفیات کا یہ سمندر عبور کر کے اور ہر میدان میں کمال حاصل کرنے کے بعد بھی ابھی تشنگی باقی تھی کہ حفظ قرآن کے شوق نے انگڑائی لی اور چونسٹھ سال کی عمر میں اس سعادت سے بہرہ ور ہوئے، اور اس بڑھاپے میں ان کے سراپے میں اللہ کی شان کا ظہور ہوا۔

یہ ہے کہ ان کی داستان کا خاکہ، آج ایک عالم دین کو ان کی داستان حیات یہ دعوت دے رہی ہے کہ ایسا ہوتا ہے عالم حق اور ایسا ہوتا ہے عالم ربانی:

ہر لحظہ مومن کی نئی آن نئی شان
کردار میں، گفتار میں اللہ کی برہان

سیّد الملّت حضرت مولانا سیّد محمد میاںؒ دیوبندی
وہ اپنی ذات میں ایک انجمن تھے

محمد سالم جامعی
ایڈیٹر ہفت روزہ ’الجمعیۃ‘ دہلی

سیّد الملّت حضرت مولانا سیّد محمد میاں صاحب قدس سرہٗ کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے، وہ اپنے مثالی کارناموں، عزم و ہمت، جہد مسلسل، تبحر علمی، تقویٰ وطہارت اور ایک ماہر تعلیم کی حیثیت سے اپنے ہمعصروں میں ایک ممتاز حیثیت کے حامل تھے۔

حضرت سیّد الملّتؒ ایک ایسے دور کی پیداوار تھے جو ہندستان خاص طور پر مسلمانوں کے لیے دینی، علمی اور سماجی طور پر بے حد کسمپرسی کا دور تھا۔ انگریزی سامراج اپنی تمام تر توانائیوں کے ساتھ ملک کے در و بست پر قابض تھا اور اس کا اصل نشانہ مسلمان تھے۔ اس نے پہلے ان کا سیاسی اقتدار چھینا اور اب اس کا ہدف مسلمانوں کا دین و ایمان اور ان کے عقائد تھے۔ انگریزی سامراج نے مسلمانوں کو ان کے عقائد اور دین و ایمان سے تہی دست کردینے کے لیے سات سمندر پار سے تمام سہولتیں مہیا کرکے عیسائی مشنریوں کو ہندستان بلایا جنھوں نے انگریزی سامراج کی سرپرستی میں پہلے مذہب اسلام کی حقانیت پر سوال اُٹھائے اور جب ہمارے جانباز علمائے اسلام نے ان کا منہ توڑ جواب دیا تو انھیں پسپائی اختیار کرنا پڑی جس کے بعد ایک چالباز قوم کی طرح انھوں نے مسلمانوں کے عقائد کو نشانہ بناکر مسلمانوں کو تشکیک کا شکار بنانے کی تحریک شروع کی، جس کا پھر ہمارے اکابر نے ڈٹ کر مقابلہ کیا اور تحدیث نعمت کے طور پر یہ کہنا کچھ مبالغہ نہ ہوگا کہ عیسائی مشنریوں کو یہ سمجھنے میں کچھ دیر نہیں لگی

کہ مسلمانوں کو ان کے مذہب اور ان کے عقائد حقہ سے بھٹکانے میں وہ کامیاب نہیں ہوسکتے، مگر اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں ہے کہ ۱۸۵۷ء کے اس تہذیبی، سماجی اور سیاسی انقلاب کا سب سے زیادہ اثر مسلمانوں پر ہی پڑا تھا، تاہم یہ بھی تائید ایزدی ہی تھی کہ انگریزی سامراج کے لائے ہوئے اس تہذیبی، سماجی اور سیاسی انقلاب کے بطن سے ہندوستانی مسلمانوں میں ایسے گراں صلاحیت لوگ بھی پیدا ہوتے رہے جنھوں نے علم و سیاست، تحریک و عمل اور جدوجہد کی دُنیا میں ایسے پائیدار نقوش ثبت کیے جن سے سات سمندر پار سے آئے ہوئے تہذیبی انتشار کا مقابلہ کرنا آسان ہوگیا۔ انھوں نے قوم کے بکھرے ہوئے شیرازہ کو مجتمع کرنے کی کوشش کی جس میں وہ بڑی حد تک کامیاب رہے۔ ان حضرات نے علم و عمل کے وہ چراغ روشن کیے جن کی روشنی سے آج بھی نہ صرف ہندستان بلکہ پورا عالم فیضان حاصل کررہا ہے۔ انھیں نابغۂ روزگار بزرگ ہستیوں میں ہمارے صاحبِ تذکرہ سیّد الملّتؒ حضرت مولانا سیّد محمد میاں صاحب دیوبندی قدس سرہٗ کی ذات والا صفات بھی تھی جو انتہائی خاموشی، حلم، وقار اور بھرپور نیازمندی کے ساتھ مسلسل نصف صدی سے زائد عرصہ تک خدمتِ علمِ دین اور قومی وملّی سرگرمیوں کا مرکز بنی رہی۔ حضرتؒ نے اپنی شبانہ روز جدوجہد کے ذریعہ جہاں ایک طرف دینِ حق کی تعلیم، عقائد صحیحہ کی ترویج اور تفہیم قرآن وحدیث کے ذریعہ مسلمانوں کے دین و مذہب اور ان کے عقائد پر ہونے والے حملوں کا مقابلہ کیا وہیں دوسری طرف سیاسی وسماجی میدان میں زمینی سطح پر انگریزی سامراج کے سامنے سدسکندری بن کر کھڑے رہے جس کے نتیجے میں عمر عزیز کا ایک قیمتی حصہ قید و بند اور مصائب و آلام کی نذر ہوا اور اپنی تمام تر علمی وسیاسی مصروفیات کے باوجود انتہائی جاں سپاری اور تندہی کے ساتھ ایک ایسی جماعتِ حقہ تیار کرنے میں کامیاب ہوگئے جو آج بھی انگریزی سامراج کی خود کاشتہ پودفرقِ باطلہ کا کامیاب تعاقب کررہی ہے۔ اس طرح حضرتؒ خیر القرون کی یادگار سلف صالحین کا نمونہ اور اسلامی مذاق ومزاج کی ایک جیتی جاگتی تصویر تھے۔ اللہ تعالیٰ نے علم وفضل کے ساتھ سادگی، تواضع، للّٰہیت، انابت، تقویٰ،

دیانت و امانت اور جذبۂ خدمت سے خوب نوازا تھا۔ حضرت سیّد الملّتؒ نے نہایت دشوار گزار دور میں علم وعمل، تقویٰ وطہارت اور تحمل وتدبر کی جو قندیلیں روشن کی تھیں ان سے عام لوگوں میں پھیلی ہوئی جہالت، بے دینی اور بدعات وخرافات کی تاریکی دور کرنے میں آج بھی جو روشنی مل رہی ہے وہ ان کے نامۂ اعمال کا ایک حسین ورق ہے۔

یہ ایک تاریخی سچائی ہے کہ اپنے بزرگوں اور اہل اللہ کا تذکارِ خیر مردہ دلوں کے لیے حیاتِ نو کا پیغام ہوتا ہے۔ اس سے قلوب کی مرجھائی ہوئی کھیتی سیراب ہوتی ہے اور ویران زندگی بہار آشنا ہو جاتی ہے۔ اسی لیے ہر دور میں اپنے اکابر ومشائخ کے براہِ راست فیض سے محروم ہو جانے کے بعد امت میں اس بات کا اہتمام رہا ہے کہ ان کا ذکر کر کے ان کے اعمالِ صالحہ، فیوضِ باطنہ اور ان کے جہد وعمل پر مشتمل کارناموں سے روشنی حاصل کی جائے۔ ارشادِ خداوندی بھی ہے:

”کہیے تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں اور اس کے ان بندوں پر سلام ہو جن کو اس نے منتخب فرمایا۔“ (سورۂ نمل آیت ۵۹)

خدائے بزرگ و برتر کے اس فرمان کے مطابق اس کے پسندیدہ بندے اس کے مستحق ہیں کہ ان کی خوبیاں بیان کی جائیں اور ان کے اعمالِ صالحہ سے روشنی حاصل کر کے اپنے مردہ دلوں میں حرارت پیدا کی جائے۔ الحمدللہ آج کا یہ سیمینار جو نمونۂ اکابر واسلاف سیّد الملّت حضرت مولانا سیّد محمد میاں صاحب نوراللہ مرقدہٗ کی حیات وخدمات کو منظرِ عام پر لانے کے لیے جمعیۃ علماء ہند کی صد سالہ تقریبات کے انعقاد کے پرمسرت موقع پر منعقد ہو رہا ہے اسی ارشادِ ربانی کی تعمیل کی ایک کڑی ہے۔

حضرتؒ مولانا سید محمد میاں اپنے مزاج کے لحاظ سے ایک مدرس اور مصنف تھے مگر آپ کی تربیت جس ماحول اور جن اساتذۂ کرام کی زیرِ نگرانی ہوئی تھی اس نے آپ میں سیاست کے جراثیم بھی سمو دیئے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ تعلیم وتدریس اور تصنیف کے ساتھ ملک کی سیاسی سرگرمیاں بھی جاری رہیں۔ اسی جذبہ کے تحت ۱۹۴۵ء میں جمعیۃ علماء ہند کی

سرگرمیوں میں حصہ لینے کیلئے مرادآباد سے دہلی تشریف لے آئے۔آپ خود تحریر فرماتے ہیں:

''مجاہد ملت (مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی ناظم عمومی جمعیۃ علماء ہند، متوفی ۱۹۶۲ء) زمانۂ اسارت میں احقر سے اتنے مانوس ہوگئے تھے کہ پھر احقر کو اپنی قید سے رہا کرنا گوارا نہ کیا۔۱۹۴۵ء میں حضرت شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کو ساتھ لے کر مرادآباد پہنچے اور مدرسہ شاہی کے مہتمم حضرت مولانا عبدالحق صاحب مدنی اور صدر مدرس حضرت مولانا سیّد فخرالدین احمد صاحب رحمہما اللہ سے اصرار کر کے مدرسہ شاہی سے چھ ماہ کی رخصت دلوائی اور دہلی لے آئے۔حضرت مجاہد ملت تیار نہیں تھے، مگر احقر کو سلسلۂ درس ترک کرنا گوارا نہیں تھا۔ چھ ماہ بعد واپس ہوگیا، لیکن چند روز بعد ۱۹۴۷ء کا مشہور ہنگامہ ہوگیا، ابتدائے ہنگامہ میں تو حالت یہ تھی کہ دہلی میں کسی طرف سے بھی کسی مسلمان کا آنا خودکشی کے مرادف تھا، لیکن جیسے ہی دہلی پہنچنے کا موقع ملا، احقر دہلی آگیا اور یہاں آکر محسوس کیا کہ اس وقت مجاہد ملت جو خدمت انجام دے رہے ہیں وہی بہترین خدمت بلکہ افضل ترین جہاد ہے۔لہٰذا احقر نے دہلی ہی میں اس وقت تک قیام کا ارادہ کرلیا جب تک مجاہد ملت کو ضرورت ہو۔اس طرح تقریباً چودہ سال گزر گئے۔مجاہد ملت رحمۃ اللہ علیہ نے بارہا فرمایا کہ وہ (جمعیۃ علماء کی) نظامت علیا سے سبکدوش ہونا چاہتے ہیں، یہ ذمہ داری احقر منظور کرلے، مگر احقر کا جواب یہی ہوتا تھا کہ احقر اپنی افتادِ طبع کے لحاظ سے مدرس ہے، آپ کی امداد کے لیے خدمت ترک کیے ہوئے ہے۔نظامت سے طبعاً دلچسپی نہیں ہے، آپ کو اگر امداد کی ضرورت نہیں تو احقر کا مقام مدرسہ شاہی ہے، نظامت علیا نہیں۔بہرحال نتیجہ یہ ہوا کہ آں قدح بشکست وآں ساقی نماند۔'' (تذکرہ حضرت مولانا سیّد محمد میاں دیوبندی، مؤلفہ مفتی مسعود عزیزی)

آخرکار ۱۹۴۷ء کے بعد آپ دہلی کے ہوکر رہ گئے اور جمعیۃ علماء ہند کے پلیٹ فارم سے عظیم قومی وملّی خدمات انجام دیں۔قیام مدرسہ شاہی کے دوران پہلے آپ کو جمعیۃ

علماء مراد آباد کا ناظم مقرر کیا گیا پھر آپ کی قومی، ملّی و سیاسی جد وجہد کو دیکھتے ہوئے صوبہ متحدہ آگرہ کی نظامت آپ کے سپرد کی گئی۔ اس کے بعد جب ۱۹۴۵ء میں حضرت مجاہد ملتؒ کو جمعیۃ علماء ہند کا مستقل ناظم عمومی بنایا گیا تو جمعیۃ علماء ہند کی نظامت پر آپ کو فائز کر دیا گیا۔ ۱۹۶۲ء میں مجاہد ملتؒ کی وفات کے بعد نظامت عمومی کی ذمہ داری آپ کے سر آ گئی جسے آپ نے میرٹھ کے اجلاس عام منعقدہ ۱۹۶۳ء میں فدائے ملت حضرت مولانا سیّد اسعد مدنی قدس سرہٗ کے سپرد کر دیا تھا۔ اس کے بعد بھی حضرتؒ تادم واپسیں بدستور جمعیۃ علماء ہند سے بحیثیت سرپرست دینی تعلیمی بورڈ و ادارہ مباحث فقہیہ و رکن مجلس عاملہ وابستہ رہے۔ تاہم چونکہ آپ فطری طور پر درس و تدریس کے آدمی تھے اس لیے جیسے ہی دہلی کی معروف دینی درسگاہ مدرسہ امینیہ کے مہتمم اور حضرت مفتی اعظم مفتی کفایت اللہؒ کے خلف اکبر مولانا حفیظ الرحمٰن واصفؒ نے آپ کو مدرسہ امینیہ میں درس حدیث کی پیشکش کی اسے آپ نے فوراً قبول فرمالیا اور تادم واپسیں مسلسل تیرہ برس تک آپ بحیثیت صدر مدرس، شیخ الحدیث اور صدر مفتی مدرسہ امینیہ سے وابستہ رہے۔

بلاشبہ حضرت سیّد الملّتؒ کی ذاتِ گرامی اہل علم کے لیے ایک شمع فروزاں تھی۔ ان کی ذات ایک طرح سے وادیٔ محبت تھی جس میں پہنچ کر آدمی دُنیا و مافیہا سے بےخبر ہوجاتا تھا۔ وہ اپنی ذات میں ایک انجمن تھے جس میں ہر فکر و خیال کے لوگ آتے اور بقدر ظرف فیض حاصل کرتے اور کسی کو اجنبیت کا احساس تک نہ ہوتا تھا۔ تواضع اور خاکساری کے الفاظ ہر شخص بولتا ہے مگر حضرتؒ کی ذات والا صفات تواضع و خاکساری کی ایک منہ بولتی تصویر تھی۔ سلوک و تصوف میں حب جاہ اور حب مال سے دل و دماغ کو پاک کرنے پر بہت زور دیا جاتا ہے اور یہ اصطلاح دنیائے تصوف میں کثرت سے استعمال کی جاتی ہے مگر اس کا صحیح مصداق نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے، تاہم بلا مبالغہ یہ کہنا بجا ہوگا کہ حضرتؒ نہ صرف اس کے مصداق تھے بلکہ ان الفاظ کے ظاہری و معنوی ہر دو اعتبار سے عملی نمونہ بھی تھے۔ وہ واقعی اس حدیث پاک کا مصداق تھے جسے ابوداؤد شریف میں حضرت ابوامامہؓ نے روایت کیا ہے کہ:

''نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میرے محبوب لوگوں میں سب سے زیادہ قابل رشک وہ مومن بندہ ہے جو مال وغیرہ کے اعتبار سے ہلکا پھلکا رہا ہو، نماز میں اس کا بڑا حصہ رہا ہو، حسن عبادات کا حامل رہا ہو، خلوت میں بھی اللہ کا فرماں بردار رہا ہو، وہ لوگوں میں اتنا نمایاں نہ رہا ہو کہ اس کی طرف انگلیوں سے اشارہ کیا جائے، اس کا رزق ضرورت بھر رہا ہو اور اس پر وہ صابر رہا ہو، پھر آپ نے اپنے دست مبارک سے زمین کریدتے ہوئے فرمایا کہ موت آ گئی اور اس پر آنسو بہانے والے تھوڑے ہی لوگ رہے اور مال وغیرہ کم ہی چھوڑا۔''

اتباعِ سنت کے دعویدار اور ان الفاظ کا ورد کرنے والے بھی بہت ملیں گے مگر حضرتؒ کو جس طرح اتباعِ سنت کا خوگر دیکھا گیا ایسا بہت کم دیکھنے کو ملتا ہے۔ انھیں یہ گوارا نہیں تھا کہ کوئی معمولی سے معمولی سنت کو بھی فراموش کر دیا جائے۔ آپ کا یہ جذبہ اتباعِ سنت صرف حقوق اللہ تک ہی محدود نہ تھا بلکہ حقوق العباد کی ادائیگی میں بھی اتباعِ سنت کا حد درجہ اہتمام فرماتے تھے۔ قرآن کریم میں جو لفظ 'ابرار' آیا ہے اور حضرت حسن بصریؒ نے اس کی جو تفسیر فرمائی ہے کہ ابرار وہ لوگ کہلاتے ہیں جو چیونٹی تک کو تکلیف دینا گوارا نہ کریں اور برائی سے کبھی راضی نہ ہوں، وہ اس کا صحیح مصداق تھے۔ ان کا حال تو یہ تھا کہ اگر کسی دوسرے سے بھی کوئی خطا سرزد ہو جاتی تو اس کی طرف سے خود ہی اظہارِ ندامت کرنے لگتے۔ بلاشبہ ان یہ کا حال مولانا حسامی کے اس شعر کے مصداق تھا جو انھوں نے اپنے مرشد حضرت مولانا محمد احمد پرتاپ گڑھی قدس سرہٗ کے بارے میں کہا تھا:

خطا مجھ سے ہوئی سرزد ندامت تیرے چہرے پر
مجھے یہ احترامِ آدمیت کم نظر آیا

سیّد الملّت حضرت مولانا محمد میاں صاحبؒ حالانکہ اپنے علم کے لحاظ سے ایک ممتاز مقام رکھتے تھے مگر بارگاہِ الٰہی میں انھیں جس بلند مقام سے نوازا گیا تھا وہ ان کی اسی بے نفسی، خاکساری اور بے تکلف زندگی کی وجہ سے ملا تھا۔ وہ ''اذا رووا ذکر اللہ'' کے صحیح مصداق

تھے، بلاشبہ ان کو دیکھ کر اللہ یاد آنے لگتا تھا۔ ان کو اللہ پاک نے جو قبولیت عام عطا کی تھی وہ اس حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندہ تصویر تھی۔ حضور پاک علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کا پاک ارشاد ہے کہ ''اللہ تعالیٰ جب کسی بندے سے محبت کرتا ہے تو حضرت جبرئیل کو بلا کر حکم فرماتا ہے کہ 'میں فلاں بندے سے محبت کرتا ہوں تم بھی اس سے محبت کرو۔ وہ اس سے محبت کرتے ہیں اور پھر آسمان میں اعلان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فلاں بندے سے محبت کرتا ہے تم بھی اس سے محبت کرو تو آسمان کے فرشتے اس سے محبت کرنے لگتے ہیں اور پھر یہ قبولیت اہل زمین کے دلوں میں ڈال دی جاتی ہے۔'' (مشکوٰۃ شریف)

بہرحال حضرتؒ کی ذاتِ گرامی صرف علوم دینیہ اور فن حدیث میں ہی سند کی حیثیت نہیں رکھتی تھی بلکہ ان کی ذاتِ گرامی سے ہندستان میں بزم علم وعرفان کی آبرو قائم تھی۔ کسی عربی شاعر نے اپنے قبیلہ کے سردار کی موت پر کہا تھا:

وما کان قیس هلکه هلک واحدٌ ولکنه بنیان قوم تهدما

یہ شعر ممکن ہے اس کے قبیلہ کے لیے صحیح رہا ہو، تاہم حضرتؒ کی ذاتِ گرامی بزم علم و فضل کے لیے واقعی اس کا مصداق ہے۔

حضرت سیّد الملّت قدس سرہٗ ایک ذی استعداد عالم تھے اور اپنی زندگی میں واقعی سلف کا نمونہ تھے۔ سادہ لباس، سادہ وضع قطع اور سادہ اندازِ گفتگو جو دل کو چھو لیتی تھی۔ پہلے کے مقابلہ میں آج مدارس اور مدارس سے فارغ ہونے والے طلبا کی تعداد کہیں زیادہ ہے مگر ایک طرف علمی صلاحیت کا فقدان ہے اور دوسری طرف نئے علماء علمی و عملی زندگی میں سنت نبوی اور سلف صالحین کی روش سے دور ہوتے جا رہے ہیں، تاہم خدا کا شکر ہے کہ ابھی ایسے علما مفقود نہیں ہیں جو اپنے اسلاف کی علمی صلاحیتوں اور ان کے طرزِ زندگی کو اپنے سینہ میں محفوظ رکھے ہوئے ہیں۔ ایسے علماء میں سے کسی کا جب ہمارے سر سے سایہ اُٹھ جاتا ہے تو ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ ہم کسی قیمتی سرمایہ سے محروم ہو گئے ہیں۔ ایسے ہی بزرگ علماء میں ہمارے حضرت سیّد الملّتؒ بھی تھے جو ہمارے لیے ایک شجر سایہ دار کی حیثیت رکھتے تھے۔

آوارگانِ عشق کا پوچھا جو میں نشاں
مشتِ غبار لے کے صبا نے اُڑا دیا

حضرت سیّد الملّتؒ کے تذکارِ خیر کی کہانی بڑی طویل ہے جسے سننے سنانے کے لیے مدت مدیدہ درکار ہے۔ بس آخر میں فاؔنی کا ایک شعر پیش کر کے رخصت ہونا چاہتا ہوں:

موت جس کی حیات ہو فاؔنی
اس شہید ستم کا ماتم کیا

وآخر دعوانا ان الحمد لله ربّ العالمين

☆☆☆☆☆

سید الملت
حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب دیوبندیؒ

مولانا فضیل احمد ناصری
خادم حدیث ونائب ناظم تعلیمات جامعہ امام محمد انور شاہ، دیوبند

دارالعلوم دیوبند کی علمی، ادبی، ثقافتی اور روحانی فضا نے جن نونہالوں کو پالا اور پال کر سایہ دار شجر بنایا ان میں سید الملت حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب دیوبندیؒ بھی ہیں۔ یہ دیوبند کے شہری، محلّہ سرائے پیرزادگان کے رہائشی اور قصبہ کی علمی وروحانی تسلسل کا امتداد تھے۔ ان کی پوری حیاتِ مستعار اربابِ علم وقلم کے لئے حیران کن رہی۔ وہ ایک طرف دانش وبینش کے فلک پیما، کتب بینی کے رسیا، لوح وقلم کے سلطان اور گراں بہا کتابوں کے مصنف اور کامیاب مدرس تھے تو دوسری طرف تحریکی مزاج، قائدملت، مجاہد آزادی اور سلیقہ مند منتظم بھی تھے۔ وجہِ شہرت ان کی تصنیفات بنیں۔ وہ انہیں کے سبب سے مؤرخ اسلام کہلائے مگر وہ جس طرح تاریخ دعوت وعزیمت کے شہ سوار تھے، اسی طرح فقیہ، محدث اور مفسر بھی تھے۔

ولادت اور نسب:

مولانا کی ولادت ۱۹۰۳ء میں ہوئی، والد کا نام منظور محمد تھا۔ ولادت کے وقت ان کے والد بسلسلۂ ملازمت بلند شہر میں مقیم تھے۔ وہیں مولانا مرحوم نے آنکھیں کھولیں۔ ساداتِ رضویہ سے خاندانی نسبت رکھتے۔ ساداتِ دیوبند کے خاندانوں میں یہی سب سے قدیم

ہے۔ گیارہویں صدی کے اوائل میں جناب سید ابراہیم صاحب دیوبند قیام فرما ہوئے۔ یہ جہانگیر کا زمانہ تھا۔ ان کی وفات ۱۰۳۴ھ میں ہے۔ مولانا محمد میاں صاحبؒ چالیس واسطے سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتے ہیں۔

تعلیم وتربیت:

تعلیم کی بسم اللہ مظفر نگر سے تعلق رکھنے والے میاں جی کے ذریعے ہوئی۔ ابتدائی فارسی جناب خلیل احمد صاحب سے پڑھی۔ مکتبی زندگی کا دور ختم ہوا تو ۱۹۱۲ء میں دارالعلوم دیوبند میں داخل کردیئے گئے۔ عمر مبارک اس وقت کل ۱۰ ربرس تھی۔ اولاً درجاتِ فارسی میں کئی سال لگائے۔ اس سے فارغ ہوئے تو درجاتِ عربی میں بڑے بڑے اساتذہ سے کسبِ فیض کیا، جن میں امام العصر علامہ انور شاہ کشمیریؒ، علامہ ابراہیم بلیاویؒ اور شیخ الادب مولانا اعزاز علی امروہویؒ جیسی نوابغِ زمانہ شخصیات شامل ہیں۔ اہلِ علم جانتے ہیں کہ ان جبالِ علم کا جہانِ فضل وکمال میں کتنا بڑا مقام ہے۔ علامہ کشمیریؒ تبحر علمی اور علوِ شان کی بنا پر ابن حجر ہندی سے متعارف ہیں تو علامہ بلیاویؒ امام المعقول والمنقول سے، جب کہ حضرت شیخ الادبؒ دنیائے عربیت وفقہ کی ناموس وآبرو کہلاتے ہیں۔ مولانا محمد میاں صاحب کو ان تمام بزرگوں کی شفقت وعنایت برابر حاصل رہی۔

ذہانت وفطانت کے واقعات:

مولانا کی پوری تعلیمی زندگی انہماک واشتغال میں گزری۔ وہ اسباق کے پابند اور درسگاہوں کے حاضر باش تو تھے ہی، جفاکش، مریضِ مطالعہ اور متیقظ بھی تھے۔ ذہانت و فطانت بلا کی تھی ہی، محنت ومستعدی نے ان کے حافظے کو مزید توانا کردیا تھا۔ عالم یہ تھا کہ مقاماتِ حریری جیسی مشکل اور صبر آزما کتاب نہ صرف یہ کہ ان کی دسترس میں رہی، بلکہ اس پر مالکانہ قابو بھی رکھتے۔ انہیں کے قلم سے یہ واقع سنئے:

''حضرت مولانا (اعزاز علیؒ) کے یہاں مقاماتِ حریری کا درس ہوتا تھا۔ احقر کو اور مولانا اشفاق حسین صاحب سنبھلی کو مقامات سے اتنا شغف تھا کہ حافظِ مقامات مشہور ہوگئے

تھے۔ سہ ماہی امتحان کی نوبت آئی۔ امتحان تقریری تھا اور اتفاق سے احقر اور مولانا اشفاق صاحب دونوں کا امتحان ساتھ ہوا اور کچھ ایسی صورت ہوئی کہ اس وقت درسگاہ میں ہم دو کے علاوہ اور کوئی طالب علم نہیں تھا۔ حضرت مولانا نے ساتویں مقامہ کی عبارت پڑھوائی اور نحوی سوال کرلیا۔ جس کے جواب میں ہم دونوں قابل ترین طالب علم بغلیں جھانکنے لگے۔ حضرت مولانا نے اپنے مخصوص انداز میں فرمایا ''مولانا! ہم تو سمجھے تھے کہ آپ مقامات خوب یاد کرتے ہیں، بڑی محنت کرتے ہیں۔'' حضرت مولانا کے ان ملامتی ارشادات کے جواب میں ہم دونوں دم بخود تھے۔ یقین تھا کہ ہم دونوں فیل کردیئے جائیں گے، لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ دونوں کو پورے نمبر عطا فرمائے۔'' (تصویر انور، ص: ۴۳۴)

ذہین، محنتی اور سنجیدہ طلبہ درست جواب دے کر بھی ریب وتردد اور ارتیاب وتذبذب میں پڑے رہتے ہیں کہ خدا معلوم نتیجہ کیا ہو، مولانا کی کشمکش بھی اسی نوعیت کی تھی۔ لگے ہاتھوں اسی قبیل کا یہ واقعہ بھی سن ہی لیجئے۔ خود میاں صاحب فرماتے ہیں:

''ششماہی امتحان تھا، اس زمانہ میں سہ ماہی یا ششماہی امتحان تقریری ہوا کرتے تھے۔ چند روز پہلے احقر کی شادی ہوئی تھی۔ امتحان دینے کے لئے حضرت شاہ صاحبؒ کی خدمت میں پیش ہوا۔ عبارت پڑھی۔ شاید عبارت میں کوئی غلطی بھی کی۔ پھر مضمون حدیث پر کوئی بحث نہ کرسکا، خاموش بیٹھ گیا۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے ایک سوال کیا۔ احقر یہی سمجھتا ہے کہ اس کا جواب الٹا سیدھا دیا۔ مگر تعجب ہوا کہ احقر کو نمبر پورے عطا فرمائے۔'' (ایضاً)

غرض مولانا کی طالب علمانہ زندگی قابل رشک گزری۔ وہ ممتاز نمبرات سے کامیاب ہوتے رہے۔ دورۂ حدیث میں ان کے نمبرات ملاحظہ فرمائیں:

بخاری شریف، ترمذی شریف، طحاوی شریف، نسائی شریف (۵۱)، مسلم شریف، موطا امام مالک، موطا امام محمد، ابن ماجہ، شمائل ترمذی (۵۰)، ابوداؤد (۴۸)، بیضاوی (۵۲) اور رشیدیہ (۴۴)۔

اسباق سے اُن کا ذوق وشوق، گہرائی وگیرائی اور کتب بینی کا چسکا صرف طلبہ ہی نہیں،

اساتذہ کے درمیان بھی معروف تھا۔ موقع بہ موقع اساتذہ کے سامنے عبارت خوانی بھی کی حتی کہ امام العصر علامہ کشمیریؒ کے درس میں بھی، جس میں ذکی طلبہ کی بھی ہوا اکھڑ جاتی تھی۔ بخاری شریف علامہ کشمیریؒ سے پڑھی اور ۱۹۲۵ء میں طالب علمی کا دور پورا ہوا۔ اس وقت دورہ میں صرف ۸۷ر طلبہ تھے۔

عملی زندگی کا آغاز

دارالعلوم سے فراغت پائی تو عملی زندگی میں اترنے کا فیصلہ کیا۔ نئے فارغین کے لئے سب سے بڑا مسئلہ فیصلے کا ہوتا ہے۔ وہ اپنے مستقبل کے بارے میں سراپا حیرت ہوجاتا ہے کہ اس کا اگلا قدم کیا ہو؟ خیر قدرت نے دستگیری کی اور جس فضا سے نکلے تھے بتغیر یسیر پھر اسی فضا میں پہنچ گئے۔ مدرسہ عالیہ کلکتہ کی شاخ مدرسہ حنفیہ آرہ میں تقرر ہوگیا۔ بہتر ہوگا کہ اس سفر کی روداد بھی انہی کی زبانی سنی جائے:

''کتب درسیہ سے فارغ ہوا تو ملازمت کے سلسلے میں بھی حضرت شاہ صاحبؒ کی خاص شفقت نے دستگیری فرمائی۔ آرہ ضلع شاہ آباد، صوبہ بہار میں ایک بہت پرانا مدرسہ ہے مدرسہ حنفیہ۔ اس نے گورنمنٹ سے ایڈ حاصل کرنی شروع کی اور مولوی و فاضل وغیرہ کے درجات کھولے تو آپ کو ایسے مدرس کی ضرورت ہوئی جو ادب، تاریخ اور ہیئت وغیرہ کی کتابیں پڑھا سکے۔ حضرت شاہ صاحبؒ کسی تقریب سے بہار تشریف لے گئے تو اراکین مدرسہ حنفیہ کے ایک وفد نے حضرت سے ملاقات کی اور مدرسہ حنفیہ کے لئے ادیب کی فرمائش کی۔ یہاں جس طرح استاذ محترم مولانا اعزاز علی صاحبؒ کی عنایت خصوصی نے سبقت فرما کر احقر کا نام پیش کیا، ایسے ہی حضرت شاہ صاحبؒ کی خاص شفقت تھی کہ باوجودے کہ حضرت شاہ صاحبؒ کے یہاں نہ حاضر باش تھا اور نہ اور کوئی خاص تعلق تھا، محض از راہِ شفقت احقر کے نام کو منظور فرمایا۔

یہ ۱۳۴۴ھ مطابق ۱۹۲۷ء کا واقعہ ہے۔ اس وقت احقر کی عمر تقریباً ۲۰ر سال تھی۔ داڑھی نہیں تھی، صرف سبزہ آغاز تھا۔ مدرسہ حنفیہ کے عمر رسیدہ مدرسین اور اراکین کے لئے

عجیب سی بات تھی کہ ایک لڑکے کو اس خدمت کے لئے بھیج دیا گیا۔ مگر ان بزرگوں کی دعاؤں نے امداد فرمائی اور چند اجتماع جو اسی ہفتے میں ہوئے ان میں اردو، عربی کی تقریروں نے اس خلجان کو رفع کر دیا۔ اور بجائے تحقیر کے احقر کی عزت کرنے لگے۔ پھر تقریباً تین سالہ قیام میں ایسی مقبولیت حاصل ہوئی کہ اگر وہاں کچھ اور عرصہ قیام رہتا تو شاید اس حلقہ کی معراج احقر کو حاصل ہو جاتی، یعنی مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ کا پرنسپل بنا دیا جاتا، مگر:

عشق نے غالب نکما کر دیا ☆ ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

انگریزی سرکاری وظیفہ خواری کے ساتھ علم دین کی خدمت گوارا نہ ہوئی، گلو خلاصی کی کوشش کرنے لگا۔'' (حوالہ، ص: ۴۳۵)

درس نظامی کی مشہور فقہی کتاب ''نور الایضاح'' کا اردو ترجمہ و تشریح بنام ''نور الاصباح'' اسی زمانے میں لکھی۔ یہ ۱۹۲۷ تھا۔

بہار سے مراد آباد:

مولانا اپنی متواتر محنتوں، لگاتار مجاہدوں اور سوزِ اندروں کی بنا پر تدریس میں جوئے شیر کا فرہاد نکلے۔ بہار میں ان کا قیام مزید رہ سکتا تھا، مگر دینی خودداری نے انہیں ساڑھے تین برس سے زیادہ ٹکنے نہ دیا۔ وہاں سے آئے تو حضرت شیخ الادبؒ کی سفارش اور حضرت علامہ کشمیریؒ کی کوشش پر مدرسہ شاہی مراد آباد میں تقرر ہو گیا۔ ان کی تدریس کا شہرہ یہاں بھی ہوا۔ حل کتاب کے لئے مطالعے کا حد درجہ اہتمام تھا، صرف ایک دو کتابوں پر ہی اکتفا نہ تھا بلکہ متعلقہ ساری ہی شرحیں کنگھال ڈالتے۔

ترمذی شریف کا درس بھی ان سے متعلق رہا۔ اس سلسلے کا یہ واقعہ ذکر کر دینا ہرگز بے محل نہ ہوگا۔ سنئے مولانا کے قلم سے:

''جس وقت جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مراد آباد میں ترمذی شریف احقر سے متعلق ہوئی تو اگرچہ زمانۂ درس کے نوٹ میرے پاس تھے اور حضرت شاہ صاحب کی تقریروں کا مجموعہ ''العرف الشذی'' بھی زیر مطالعہ رہتا تھا۔ مگر احقر کو نہ اپنی لکھی ہوئی تقریروں پر اطمینان

ہوتا اور نہ العرف الشذی کے مبہم حوالوں سے دل مطمئن ہوتا تھا بلکہ جو کتابیں بھی دستیاب ہوسکیں احقر نے ان کا مطالعہ کیا اور اصل عبارت مطالعہ کرنے کے بعد حرف بحرف اپنے پاس قلم بند کرلی۔ چوں کہ اصل عبارت نقل کرنے اور قابلِ یادداشت مسائل قلم بند کرنے کے لئے العرف الشذی کا حاشیہ کافی نہیں تھا تو سرِ ورق کے ساتھ ایک سادہ ورق لگا کر العرف الشذی کی جلد بندھوانی پڑی۔ یہ اوراق بھی عموماً یادداشتوں سے بھر گئے ہیں اور اس طرح معلومات کا ایک ذخیرہ فراہم ہوگیا ہے۔

اسی زمانہ کی بات ہے کہ ایک مرتبہ حضرت شاہ صاحبؒ کی خدمت میں حاضر تھا۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے فضلاء کی کوتاہ ہمتی کی مذمت کرتے ہوئے شکایت فرمائی کہ نئے مدرسین صرف العرف الشذی پر اعتماد کرلیتے ہیں اور ان کو یہ خیال نہیں آتا کہ اس کے حوالوں میں بہت کچھ غلطیاں ہیں۔ جب کاتب الحروف نے عرض کیا کہ یہ خادم صرف حوالوں پر اعتماد نہیں کرتا بلکہ حوالوں کی تصحیح کرتا ہے اور اصل عبارت بھی نوٹ کرلیتا ہے تو شاہ صاحبؒ بہت خوش ہوئے اور پھر دوسرے حضرات کے سامنے احقر کے اس فعل کی نظیر پیش فرمائی۔''
(تصویر انور، ص: ۲۸-۴۲۷)

کم وبیش ہر علم وفن کی یہاں کتابیں پڑھائیں۔ مولانا یہاں ۱۷ برس رہے اور علوم و معارف کے موتی لٹاتے۔ مشہور مورخ قاضی اطہر مبارک پوریؒ، عارف باللہ حضرت قاری صدیق احمد باندویؒ اور حضرت مولانا مفتی محمود پشاوری (پاکستان) اسی دور کے تلامذہ ہیں۔

سیاست سے وابستگی:

ادھر مدرسہ شاہی مرادآباد میں مسندِ تدریس سجائی اور ادھر میدانِ سیاست میں بھی قدم زنی شروع ہوگئی۔ اہتمام تدریس کا یہ عالم کہ بقول مولانا سید حامد میاں: دوپہر کا وقت والد صاحب گھر جانے کے بجائے مدرسہ میں ہی گزارتے۔ میں گھر سے کھانا لاتا اور کھانے کے دوران بھی مطالعہ جاری رہتا اور شام کے درس کے لئے تیاری ہوجاتی۔ دورانِ طعام کا مختصر مطالعہ پورے درس کے لئے کافی ہوتا۔ ظہر کے بعد مدرسہ میں افتاء کا کام کرتے۔''

اور سیاست کا یہ عالم کہ اپنا خونِ جگر خارج اوقات میں اسے بھی دیتے اور پورے جوش وخروش کے ساتھ۔ خود ہی فرماتے ہیں:

''جمعیۃ علمائے ہند کا اجلاس ۲۹ء میں قصبہ امروہہ، ضلع مراد آباد میں ہو رہا تھا۔ احقر اس زمانے میں مراد آباد کی مشہور درسگاہ جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مراد آباد میں درس وتدریس کی خدمات انجام دے رہا تھا۔ مراد آباد ضلع کا صدر مقام ہے اور قصبہ امروہہ مراد آباد سے تقریباً اٹھارہ میل کے فاصلہ پر ہے۔ اس لئے مراد آباد کے حضرات بھی اس اجلاس کے داعی اور ذمے داروں میں شامل تھے۔ مگر احقر اس وقت صرف ایک مدرس تھا، جس کو اس کے اکابر حضرت مولانا حبیب الرحمٰنؒ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند اور حضرت الاستاذ مولانا اعزاز علی صاحبؒ سابق شیخ الفقہ والادب دارالعلوم دیوبند نے چند ماہ پہلے حنفیہ آرہ شاہ آباد، صوبہ بہار سے منتقل کر کے بھیجا تھا، البتہ جذبۂ صادق نے اس احقر کو حضرت مولانا سید فخر الدین احمد صاحبؒ اور حضرت مولانا قاری عبداللہ صاحب مرحوم کی پارٹی کا ایک رکن یا ایک رضا کار بنا دیا تھا اور اس بنا پر اس اجلاس سے احقر کا تعلق صرف وزیٹر یا تماشائی کا نہیں تھا بلکہ یہ حیثیت ہو گئی تھی کہ ایک مبصر کی طرح قریب سے قریب ہو کر حالات کا جائزہ لے سکے۔'' (مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، ایک سیاسی مطالعہ: ص ۱۳۲)

سرفروشانہ جدوجہد کا تسلسل:

سیاست میں داخلہ ہوا تو تحریک آزادی سے وابستگی پیہم مستحکم ہوتی گئی، یہ جذبہ روز فراواں ہوتا رہا۔ دل کے غنی اور عزیمت کے پہاڑ تھے، بڑے بڑے سنگِ راہ بھی ان کے قدم نہ روک سکے۔ اس کی تفصیل بھی مولانا ہی کے قلم سے سنئے:

''احقر کی حیثیت صرف یہ تھی کہ مدرسہ شاہی مراد آباد کا مدرس اور جمعیۃ علمائے شہر مراد آباد کا ناظم تھا۔ اس موقع پر لفظ لیڈر استعمال کرنا درست ہو تو مختصر تعبیر یہ ہے کہ احقر مقامی لیڈر تھا اور مجاہد ملت آل انڈیا لیڈر تھے، مگر خوش قسمتی سے ایک مرتبہ جیل کاٹ چکا تھا، اس بنا پر ایک خاص امتیاز حاصل ہو گیا تھا۔ دوسرا امتیاز یہ تھا کہ احقر کو جمعیۃ علماء ہند کا نواں

ڈکٹیٹر نامزد کیا جاچکا تھا۔ اس کی تشریح یہ ہے کہ اس زمانے میں کانگریس خلافِ قانون جماعت قرار دی جاچکی تھی اور جمعیۃ علماء ہند کو اگرچہ انگریزی ڈپلومیسی نے خلافِ قانون جماعت قرار نہیں دیا تھا تا آں کہ خود انگریزی حکومت کے عمل سے اس کے دعوے کی تردید نہ ہوجائے کہ مسلمان تحریک آزادی میں شریک نہیں ہے، مگر عمل جمعیۃ علماء ہند کے ساتھ ایسا ہی تھا، جیسا کسی خلاف قانون جماعت کے ساتھ ہوسکتا ہے۔ اس کے دفتر پر پولیس کے چھاپے پڑتے رہتے تھے، نمایاں کارکنوں کو گرفتار کرلیا جاتا تھا، وغیرہ وغیرہ۔'' (مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، ایک سیاسی مطالعہ، ص:۱۴۲)

مولانا پانچ مرتبہ جیل بھی گئے مگر پابجولانی ان کے عزمِ سفر کے آگے حائل نہ ہوسکی، ان کا جرم عشق وقت کے ساتھ بڑھتا ہی گیا۔ مرادآباد، دہلی، میرٹھ، بریلی اور فیض آباد کی جیلوں میں گرفتار کر کے بھیجے گئے۔ ہفتہ روزہ ''الجمعیۃ'' ۸/مئی ۱۹۷۰ء کے شمارے میں مولانا کا ملفوظ اس طرح درج ہے کہ:

''گرفتار ہوا پانچ مرتبہ۔ ایک بار تا اختتام عدالت۔ ایک بار ایک ہفتہ کی سزا ہوئی اور تین بار بالترتیب ایک سال، چھ مہینہ اور اٹھارہ مہینہ جیل میں رہا۔''

جمعیۃ علماء ہند سے تعلق:

مولانا محمد میاں صاحب ابتداء سے ہی تحریکی مزاج رکھتے تھے۔ ان کی اس فطرت پر ان کے تعلیمی اور تصنیفی مشاغل رخنہ انداز نہ ہوسکے۔ اسی کا خوشگوار اثر تھا کہ عنفوان شباب سے ہی ملک کی سب سے باوقار ملی تنظیم جمعیۃ علماء ہند سے وابستہ ہوگئے اور یہ وابستگی ان کی حیات تک مسلسل جاری رہی۔ وہ متعدد مناصب پر بھی فائز رہے۔ ضلعی، ریاستی اور مرکزی سطح پر اس کی خدمت کی، اعلیٰ عہدوں پر متمکن رہے۔ یہ تفصیلات بھی انہیں کی زبانی سنئے:

''۱۹۲۹ء میں جمعیۃ علماء ہند کا اجلاس امروہہ میں ہوا، جس میں شرکتِ کانگریس کا ریزولیشن پاس کیا گیا۔ اس اجلاس سے کچھ پہلے جمعیۃ علماء شہر مرادآباد کی مجلس منتظمہ کا اجلاس ہوا، جس میں احقر کو جمعیۃ علماء شہر مرادآباد کا نائب ناظم منتخب کیا گیا۔ کچھ دنوں بعد نائب کے

بجائے ناظم بنا دیا گیا۔ اس وقت نظام جمعیۃ علماء سے وابستہ کیا گیا تھا تو احقر کو جمعیۃ علماء صوبہ آگرہ کا ناظم تبلیغ بنا دیا گیا۔ ناظم تبلیغ کے ساتھ احقر جمعیۃ علماء صوبہ آگرہ، پھر پورے صوبہ متحدہ کی جمعیۃ علماء کا ناظم ہوگیا۔'' (اردو روزنامہ الجمعیۃ، خصوصی اشاعت، ص: ۳۰-۱۲۹)

مولانا رفتہ رفتہ ترقیات کے زینے پر چڑھتے گئے۔ سہارنپور میں جمعیۃ کا بڑا اجلاس ہوا تو اس میں انہیں جمعیۃ علماء ہند کا ناظم بھی نامزد کردیا گیا۔ اس کی روداد مولانا نے خود یوں بیان کی ہے:

''۴رمئی تا ۷رمئی ۱۹۴۵ء کو بڑی شان کے ساتھ جمعیۃ علماء ہند کا اجلاس سہارنپور میں ہوا، حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ صدر اور مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی صاحبؒ ناظم اعلیٰ منتخب کئے گئے۔ احقر کا نام زبانوں پر آیا تو احقر نے اسٹیج پر کھڑے ہوکر معذرت کرنی چاہی، مگر سیدی شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ نے جو اسٹیج پر تشریف فرما تھے، خلاف معمول احقر کا دامن جھٹک کر کھینچا اور احقر کو پیچھے بٹھا دیا۔ اب بجز تسلیم و رضا چارہ ہی کیا تھا۔ ''قہر درویش بر جان درویش۔'' (مجاہد ملت نمبر، ص: ۵۶)

اگست ۱۹۶۲ء تک مجاہد ملت حیات رہے، ان کی وفات کے بعد مولانا کو ہی ناظم اعلیٰ منتخب کیا گیا اور ایک سال اس منصب پر فائز رہے۔ ۱۹۴۴ء سے ۱۹۶۳ء تک ناظم اور ۱۹۶۳ء تک ناظم اعلیٰ رہے۔ مولانا ہی وہ شخصیت ہیں جنہوں نے جمعیۃ علماء ہند کی تاریخ کو تفصیل سے لکھا اور اسے دستاویز کی شکل دی۔ جمعیۃ علماء پر ان کی تین بڑی کتابیں ہیں، جن میں مختصر تذکرہ، خدمات جمعیۃ علماء ہند چار حصوں پر مشتمل ہے۔ اسی طرح خطرناک نعرے اور جمعیۃ علماء ہند کا صراطِ مستقیم، اسی طرح جمعیۃ علماء ہند کیا ہے؟ یہ بھی دو حصوں میں منظر عام پر آئی۔

مسندِ تدریس کی طرف واپسی:

عمر مبارک ۶۰ رسال کی ہوئی تو جمعیۃ کی سرگرم شرکت سے علیحدہ ہوگئے، اس کی مجلس عاملہ کے رکن، ادارۃ المباحث الفقہیہ کے نگراں اور جمعیۃ ٹرسٹ کے چیرمین ضرور رہے، مگر جمعیۃ کا مستقل قیام ختم ہوگیا۔ طبیعت ایک بار پھر تدریس کی طرف مائل ہوئی، چنانچہ مدرسہ

امینیہ دہلی کے شیخ الحدیث اور صدر مفتی بنائے گئے اور اخیر تک ان مناصب پر جلوہ افروز رہے۔ مدرسہ امینیہ میں قیام کا دورانیہ ۱۲/ برسوں پر محیط ہے اور مولانا کی تدریس کی مجموعی مدت ۳۲/ سال۔

لوح وقلم کے بادشاہ:

حضرت مولانا محمد میاں کی ذاتِ گرامی خوبیوں کا مجموعہ تھی، ان کی ماہرانہ تدریس، ذوقِ مطالعہ، سرفروشانہ کارنامے اور جمعیۃ علماء ہند سے طویل وابستگی آپ پڑھ آئے ہیں۔ ان سے مولانا کی عظمت و رفعت اور شانِ علمیت وعزیمت آفتابِ نیم روز کی طرح عالم آشکار ہے۔مگر حیرت ناک حد تک مولانا کی جس خوبی نے ملتِ اسلامیہ کو متاثر کیا وہ لوح وقلم سے استوار رشتہ ہے۔انہوں نے اس فن سے ایسا کام لیا کہ آنے والی پوری علمی اور تاریخی کائنات ان کی محتاج ہے۔ وہ ہر موضوع پر بے تکلف اور برجستہ لکھ لیتے تھے۔مضمون اپنے مدعا پر مکمل حاوی اور جامع ہوتا۔علم وفن کا کوئی میدان ایسا نہیں جہاں انہوں نے اپنے قلم کی سلطانی کے پھریرے نہ اڑائے ہوں۔ حدیث پر لکھتے تو اس کے حدود واطراف اور روح و عروق تک پر سیر حاصل لکھ ڈالتے۔فقہ پر لکھتے تو ایک مکمل فقیہ کے نقوش قارئین کے ذہنوں میں مرتسم ہو جاتے۔ ہر فن ان کا اپنا تھا،قلم اٹھایا اور مواد سے بھرپور ایک خوبصورت مضمون تیار ہو گیا۔خوب نگاری اور بسیار نویسی مولانا کی وہ خصوصیت تھی کہ کہنے والے انہیں ''حیوانِ کاتب'' کا ظریفانہ لقب دے گئے۔(مطالعہ کا شوق،ص:۲۱۷)

جامعہ امام محمد انور شاہ دیوبند کے بانی فخر المحدثین حضرت مولانا سید محمد انظر شاہ کشمیریؒ کا تبصرہ سنئے:

''دارالعلوم کے شعبۂ تعلیمات میں کہاں مسند آرا حضرت شیخ الادب مولانا اعزاز علی مرحوم، علامہ بلیاویؒ اور نہ جانے کون کون؟ اور پھر یہ تہی دست و بے مایہ اب تعلیمی کارروائی میں شرکت کے لئے مجلس شوریٰ کی بعض نشستوں میں خاکسار کی بھی شرکت ہوئی۔ یہاں مولانا محمد میاں مرحوم کو ایک اور ہی دنیا میں پایا، ایک ننھے سے گاؤ تکیہ پر ٹیک لگائے ہوئے

قلم ہاتھ میں، شوریٰ کی کارروائی کی تحریر اور اس کو ضبط کرنے کا کام ان ہی سے متعلق۔ حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب اپنی مخصوص بے تکلف مجلسوں میں مرحوم کو حیوان کاتب فرماتے۔ واقعی وہ حیوانِ کاتب دکھائی دیتے۔ مجلس کی بحث وتمحیص میں شرکت برائے نام ہوتی، زیادہ وقت ان کا لکھنے لکھانے میں گزرتا۔ کارروائی کی رپورٹ ایسے چست انداز میں لکھتے کہ قیل وقال کی گنجائش نہ رہتی۔'' (لالہ وگل، ص:۱۹۸)

شوقِ مطالعہ

خوب لکھنا اور زیادہ لکھنے کے ساتھ معلومات اور مواد سے بھرپور لکھنا، یہ کثرتِ مطالعہ کے بغیر نہیں ہوسکتا۔ جس شخص کی کتابوں پر نظر ہو اور کرمِ کتابی بن کر زندگی گزارنے کو اپنا وظیفہ ٹھہرا چکا ہو، مطالعہ کا مشتاق اور تحریرات دیکھنے کا عادی ہوا ایسا ہی شخص جب قلم اٹھاتا ہے تو اپنے مضامین میں حقائق ومعارف اور اسرار وغوامص کے دفتر کھول دیتا ہے۔ مولانا محمد میاں صاحبؒ کی یہ کثرتِ نویسی اسی کثرتِ مطالہ کی مرہونِ منت تھی۔

فخر المحدثین حضرت مولانا سید محمد انظر شاہ کشمیریؒ فرماتے ہیں:

> ''مولانا محمد میاں مرحوم یوں بھی خاموش، زاویہ پسند، عزلت نشیں اور مرنجامرنج قسم کے آدمی تھے۔ نہ درباری داری نہ رونقِ مجلس، نہ کسی کو اُن کی ضرورت نہ وہ کسی کی ضرورت رکھتے۔ دیوبند آتے، مہمان خانہ میں قیام ہوتا، شوریٰ میں شرکت فرماتے اور یہیں کے کتب خانہ سے مستعار کتابیں لے کر مطالعہ کرتے۔ یہ تھیں ان کی مصروفیات۔'' (لالہ وگل، ص:۱۹۷)

مولانا کے قلمی کارنامے:

مولانا کا قلمی سفر نہایت تاریخ ساز رہا، اس نے مقبولیت کی نئی نئی تاریخ رقم کی۔ ان کے خامۂ عنبر شمامہ سے نوے کے قریب تصنیفات سامنے آئیں۔ ''ہمارے پیغمبر'' ان کی اولین تصنیف ہے۔ سفر کی مبتدا جب اس قدر سعید ہو تو خبروں کا سلسلہ بھی بالعموم سعید ہوتا ہے۔ پھر تو ان کا قلم جواہر حکمت لٹانے میں فقید المثال بن گیا۔ اہم ترین اور معرکۃ الآراء کتابیں ان

کے سدا بہار قلم سے آئیں۔ ان میں سے دو تو پیغمبر اسلام ﷺ کی سیرت پر ہیں۔ چند کتابیں صحابۂ کرامؓ کی عظمت کے اظہار کے لئے لکھیں، انہیں میں سے ایک شواہد تقدس ہے۔ اس میں انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی تقدیس کے دلائل پیش کئے ہیں۔ ''صحابہ کرامؓ کا عہدِ زریں اور مثالی حکومتیں'' یہ بیش قیمت کتاب خاصے کی چیز ہے۔ ماضی کی بعض تاریخی کتب نے صحابۂ کرامؓ کے بارے میں جو رطب و یابس معلومات دی ہیں، ان سے ایک عام قاری متاثر ہو جاتا ہے اور عظمت صحابہؓ ہرن ہونے لگتی ہے۔ یہ کتاب ایسی ہی تحریروں کا ازالہ ہے۔ یہ کتاب دو جلدوں میں ہے۔ یہی کیا، مولانا کی ایسی ۷؍ کتابیں ہے جو متعدد جلدوں پر مشتمل ہیں، ان میں علمائے ہند کا شاندار ماضی (۴ جلدیں)، علمائے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے (۲ جلدیں)، جمعیۃ علمائے ہند کیا ہے؟ (۲ جلدیں)، عہد زریں (۲ جلدیں)، مختصر تذکرہ خدمات جمعیۃ علماء ہند (۴ جلدیں)، تاریخ اسلام (۳ جلدیں) اور دینی تعلیم کا رسائل (۱۲ حصے) شامل ہیں۔ ان کتابوں نے علمی، ادبی اور تاریخی حلقوں میں بڑی دھوم مچائی۔

علمائے ہند کا شاندار ماضی:

یوں تو ساری تصنیفات ہی مولانا کی قابلیت اور نابغیت کا منہ بولتا ثبوت ہیں، مگر ''علمائے ہند کا شاندار ماضی'' وہ کتاب ہے جس نے مصنف کو مسلمانوں ہی کیا، انگریزوں میں بھی مشہور کر دیا۔ چار جلدوں پر مشتمل اس کتاب میں حضرت مجدد الف ثانی، شاہ ولی اللہ، سید احمد شہید اور علمائے صادق پور کے حالات اور ان کی حیاتِ مبارکہ کی اسلامی مساعی کو نہایت تفصیل سے بیان کیا۔ ساتھ ہی سکھوں کی حکومت کا زوال اور برطانوی استعمال کے خلاف علمائے کرام کی جدو جہد کی وہ داستانیں جمع ہو گئیں ہیں، جن سے اہل اسلام کے سینے فخر سے چوڑے ہو جاتے ہیں اور دل میں سرفروشی کے جذبات انگڑائیاں لینے لگتے ہیں۔ یہ کتاب آئی تو اس نے ایوانِ باطل پر ایک زلزلہ طاری کر دیا۔ انگریز تلملا اٹھے، برہمی ایسی شدت اختیار کر گئی کہ جمعیۃ کا پریس بند کر دیا گیا۔ کتاب ضبط کر لی گئی اور خود مصنف پر مقدمہ درج کر دیا گیا۔ برطانوی حکومت کا یہ اقدام سراسر ظلم و عدوان پر مبنی تھا۔ جمعیۃ علماء ہند بجا

طور پر حرکت میں آئی اور مجلس عاملہ نے ۱۳/۱۴/ جولائی ۱۹۴۰ء کے اجلاس میں شدید مذمت کرتے ہوئے کہا کہ:

''جمعیۃ اس کو صریح تشدد اور قانون کا بیجا استعمال سمجھتی ہے، کیوں کہ وہ کتاب محض ایک تاریخی کتاب ہے، جس میں گذشتہ واقعات کو تاریخ کی کتابوں یا اسانید کے ساتھ جمع کیا گیا ہے۔ اس ضبطی کا علوم وتصنیفاتِ جدیدہ کی تدوین و اشاعت پر نہایت ناگوار اور نا قابلِ برداشت اثر پڑے گا۔'' (جمعیۃ العلماء کیا ہے؟ ص: ۳۱۴)

مولانا کی اکثر کتابیں اسلامیات، سیاسیات اور تاریخ کے گرد گھومتی ہیں۔ ہر کتاب اپنے موضوع پر منفرد اور اپنے مقصد میں کامیاب۔ خاص بات یہ کہ وہ جو کچھ بھی لکھ رہے ہیں انتہائی مدلل اور مستند حوالوں سے۔ ہندی سیاست اور مسلمانوں کی تاریخ پر ان کی تصنیفات بلا مبالغہ دائرۃ المعارف کا درجہ رکھتی ہیں۔ معلومات ومواد تو ان کی جان ہے ہی، اسلوبِ سخن بھی دل نشین اور پیکرِ الفاظ بھی جاذبِ قلب ونظر۔ ان کی تحریریں پڑھنے والا کائناتِ کلام میں گم ہو جاتا ہے اور جب وہ باہر آتا ہے تو جیب وداماں لالیِ حکمت وجواہرِ معلومات سے لبریز۔ ان کی اکثر کتابیں آج بھی دستیاب ہیں اور ہر لائبریری کی زینت علم ومطالعہ کا رسیا اور تاریخ وسیاست کا شوقین ان سے مستغنی نہیں ہوسکتا۔ ان کی تحریروں کی یہ جاودانی ان کے کمالاتِ علمی پر برہانِ قاطع ہیں۔

فروغِ تعلیم اور مولانا:

مولانا کی مہمات میں جہاں ملی اور سیاسی معاملات شامل تھے، وہیں ملتِ اسلامیہ میں تعلیم دین کا فروغ بطور خاص پیش نظر تھا۔ ہندوستان آزاد ہوا تو ایک بڑا خطرہ اس بات کا تھا کہ پسماندہ علاقوں کے مسلمان کہیں ارتداد کا شکار نہ ہوجائیں۔ جمعیۃ علماء ہند اسی ضرورت کی تکمیل میں ملک کے مختلف حصوں میں پرائمری درجہ کے مکاتب قائم کرنے لگی۔ مقصد یہ تھا کہ بچے ابتدائی دینی تعلیم کے ساتھ اس قابل ہوجائیں کہ وہ یہاں سے نکل کر سرکاری، غیر سرکاری اسکولوں میں داخلہ لے سکیں۔ مکاتب قائم ہوئے تو نصاب کا مسئلہ کھڑا ہوا، اس

مسئلے کے حل کے لئے تو مولانا آگے آئے اور دینی تعلیم کا نصاب تیار کر دیا۔ یہ نصاب کافی مقبول ہوا اور بچوں کی ذہنیت اسلامی سانچے میں ڈھالنے میں بڑا کارآمد و بارآور۔ یہ نصاب آج بھی جاری ہے اور امت کے نونہال آج بھی اس سے برابر فیض یاب ہو رہے ہیں۔ ان کے علاوہ متعدد کتب بچوں کے لئے تیار کیں، جن میں ہمارے پیغمبرؐ اور اسلامی تقریبات جیسی تحریرات بھی شامل ہیں۔ انہیں پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ بچوں کی ذہنی ساخت سے مولانا کس قدر آگاہ تھے اور اس ساخت کے مطابق الفاظ و معانی کی ادائیگی پر انہیں کس قدرت حاصل تھی۔ مولانا نے صرف کتابیں ہی نہیں لکھیں، بچوں کے اسلامی مستقبل کے لئے دور دراز کے دوورے بھی کئے۔ ہماچل پردیش، راجستھان اور میوات کے علاقوں میں پہنچے اور مسلمانوں کو تلقین کی، مکاتب قائم کئے۔ مجدد الف ثانیؒ کے مزار کو شرنارتھیوں سے بچایا۔ ان کے علاوہ کئی ایسی کتابیں تیار کی گئیں جو آج بھی مدارس میں داخل نصاب ہیں۔

مولانا اپنے اخلاق کے آئینے میں:

یہ تو رہے مولانا کی علمی، سیاسی اور قلمی زندگی کے چند کارنامے۔ عام مشاہدہ ہے کہ جب انسان زیادہ قابل اور محامد کا حامل ہو تو اس کے اخلاق بالعموم اعجابِ نفس کے شکار ہو جاتے ہیں۔ مگر مولانا زندگی کے اس گوشے میں بھی نمونے کے انسان نظر آتے ہیں۔

فخر المحدثین حضرت مولانا سید محمد انظر شاہ کشمیریؒ فرماتے ہیں:

''یہ عروس البلاد بمبئی کا دیوہیکل مسافر خانہ ہے، کئی منزلہ میں۔ یہاں کی بالائی منزل میں اپنی والدہ مرحومہ کے ساتھ مقیم ہوں۔ ایک صبح بالائی منزل سے نیچے آیا تو دیکھا کہ ایک بوڑھا بیٹھا ہوا خود اپنے ہاتھ سے کپڑے دھونے میں مصروف ہے۔ یہ تو کوئی جانی پہچانی شخصیت ہے، جس کے خدوخال سے نگاہیں اگرچہ دور بین نہ سہی، مگر آشنا ہیں۔ یہ تھے سید الملت مرحوم مولانا محمد میاں۔ جمعیۃ علمائے ہند کے ناظم اعلیٰ جو جمعیۃ کی فراہمی مالیات کے لئے سفر کرتے ہوئے بمبئی وارد ہوئے تھے۔ کہنے کو یہ چھوٹی بات ہے، مگر ان کی اس ادا میں ان کی تواضع، فروتنی اور خاکساری کی داستانِ عبرت پنہاں ہے۔ خدا تعالیٰ نے مرحوم کو

متانت اور سنجیدگی کی دولتِ فراواں عنایت فرمائی تھی۔'' (لالہ وگل، ص: ۲۰۰)

دوسروں کے کام آنا مولانا کا وظیفہ تھا، کوئی کسی ضرورت کی درخواست لے کر آتا تو اسے محروم نہ بھیجتے۔

مولانا کی وفات ۱۹۷۵ء میں ہوئی۔ اس طرح آسمانِ علم وفضل کا آفتاب و ماہتاب ۷۲ رسال دنیا میں اپنی تابانیاں بکھیرتا رہا۔ ملت کا یہ پاسبان اب قبرستان مہدیان دہلی میں خوابِ راحت کے مزے لے رہا ہے۔

آخری بات:

اخیر میں ختام مسک کے طور پر حضرت مولانا سید انظر شاہ کشمیریؒ کے جملوں کے ساتھ اپنے اس مقالہ کو ختم کرتا ہوں۔ شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں:

''مرحوم کی تصانیف، مضمون کی زرخیزی، عنوانات کی جاذبیت، ذیلی سرخیوں کی شوکت، فتویٰ اور تقویٰ، علم وعمل، ورع و پرہیزگاری، سیاسی دلچسپیاں، قید و بند کے آلام اور شاندار کارناموں پر بہت کچھ لکھا جائے گا مگر مجھ بے بضاعت کو تو ان کی زندگی کے اس نادر باب نے گہرا تاثر دیا کہ وہ مدرسہ شاہی سے نکلے، جمعیۃ علماء کی نظامت تک پہنچے، پھر نیابتِ صدارت دہلی، وہاں کے اونچے حلقوں میں پذیرائی اور دوڑتی بھاگتی دنیا سے رابطہ، یہ ممبرانِ پارلیمنٹ، وہ وزیر با تدبیر، یہ امیر طنّاز، وہ رئیس کج کلاہ، مگر مولانا محمد میاں مرحوم کی کھدّر کی شیروانی، کھادی کا لمبا کرتا، شرعی پاجامہ، دھوڑی کا جوتا، سر پر دوپلّی ٹوپی، ہاتھ کا تولیہ، چہرہ کی داڑھی، مسجد کی نمازیں، آہِ سحرگاہی، شب بیداری، جلوتوں میں خلوت، حدیث کا درس، فتوے کے لئے قلم، جیب کی تسبیح نہ چھوٹنا تھی اور نہ چھوٹی۔ کہنے کو تو بات معمولی ہے لیکن اپنی ڈگر پر یہ استواری بڑی بات ہے۔ بقول شاعر:

وفاداری بشرطِ استواری اصلِ ایماں ہے

اور یہی ان کی زندگی کا وہ روشن باب تھا جس کی یادیں زمزمۂ افلاک میں ان شاء اللہ ہمیشہ باقی رہیں گی۔

☆☆☆☆☆

سید الملت کی علمی خدمات:

حضرت مولانا سید محمد میاں دہلوی اور علمِ حدیث

مولانا فیصل احمد بھٹکلی ندوی
استاذ حدیث وتفسیر دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

عمر کی ناپختگی کے زمانے میں جن علمائے ہند کے نام، کسی حد تک کام اور قدرے مقام سے واقفیت کے مواقع حاصل ہوئے، ان میں حضرت مولانا سید محمد میاں دیوبندی ثم دہلوی بھی ہیں۔ میری عمر سولہ سال کی تھی جب میں نے تحریک آزادی میں علماء کا کردار کے عنوان پر ایک مفصل مضمون لکھا تھا، اس وقت مولانا کی کتابوں میں تحریک شیخ الہند ہم دست ہوئی تھی، جس سے ہم نے خاصا فائدہ اٹھایا تھا۔ پھر کچھ ہی عرصے کے بعد ۱۹۹۰ء کے ابتدائی مہینوں میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخلہ ہوا تو مولانا کی کتاب ''علمائے حق اوران کے مجاہدانہ کارنامے'' (دو حصے) ہم نے خریدی۔ مولانا کی سب سے مشہور کتاب ''علمائے ہند کا شاندار ماضی''، ہمیں لکھنو میں برائے خرید اس وقت نہیں ملی ۔ یادش بخیر ان دنوں مولانا کے پوتے یعنی مولانا کے صاحب زادۂ گرامی قدر مولانا سید ساجد میاں کے فرزند برادر مکرم مولوی سید علی میاں ندوی دارالعلوم ندوۃ العلماء میں زیر تعلیم تھے، مولانا سے تعلق کی وجہ سے ان سے ہمارا کچھ ربط ہوگیا تھا، ہم نے ان کے جد بزرگ وار کی یہ وقیع کتاب انھی کے ذریعے دہلی سے منگوائی، انھوں نے اس کی زحمت گوارا کی، **فجزاہ اللہ خیراً**۔

جب سے ہم مولانا کو جانتے ہیں اس وقت سے کچھ عرصے قبل تک ہم مولانا کو ایک بڑا مورخ اور عظیم مجاہد آزادی ہی کی حیثیت سے جانتے تھے اور بس، پھر معلوم ہوا کہ وہ فقیہ و مفتی بھی تھے اور ساتھ ساتھ علمِ حدیث میں بھی نمایاں مقام رکھتے تھے۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ علامہ انور شاہ کشمیری (وفات: ۱۹۳۴ء) کو اللہ تعالیٰ نے جو اعلیٰ علمی ذوق عطا فرمایا تھا، وہ ان کے ذہین طلبہ میں ایک حد تک منتقل ہوا، دارالعلوم دیوبند کی تاریخ کا جائزہ لے کر اگر تجزیہ کیا جائے تو یہ حقیقت منکشف ہوگی کہ علامہ کشمیری کے تلامذہ میں جو بلند درجہ مصنفین و محققین اور علمی ذوق کے حاملین پیدا ہوئے، ان کا آدھا حصہ بھی دوسروں کے یہاں نظر نہیں آتا، انھی باتوفیق تلامذہ میں ایک نمایاں نام ہمارے ممدوح حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب دہلوی کا ہے۔

مولانا کی شہرت مجاہد آزادی اور ایک مورخ کی حیثیت سے زیادہ ہے، تاہم ادب میں بھی ان کی حیثیت مسلم تھی، ان کے اساتذہ شیخ الادب مولانا اعزاز علی امروہی (وفات: ۱۹۵۵ء) اور علامہ انور شاہ کشمیری کا اس سلسلے میں انھیں اعتماد حاصل تھا۔ وہ بڑے فقیہ اور مفتی بھی تھے، مفتی اعظم ہند مفتی کفایت اللہ دہلوی (وفات: ۱۹۵۳ء) جیسے فقیہ و مفتی کی جگہ پر وہ فتویٰ نویسی کا کام کرتے تھے اور فقہ وفتویٰ کے ایک اہم رکن سمجھے جاتے تھے، ساتھ ساتھ علمِ حدیث میں بھی وہ ایک مقام رکھتے تھے۔

سالہا سال تک حدیث کی امہات کتب کا درس دیا، جن میں صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابی داود اور سنن ترمذی شامل ہیں، فراغت کے بعد آپ نے ابتداءً مدرسہ حنفیہ آرہ شاہ آباد (بہار) میں تدریسی خدمات انجام دی، یہ مولانا کا بالکل آغاز شباب تھا، اس وقت آپ کی عمر صرف بیس سال تھی، اس دوران میں آپ نے دیگر کتابوں کے ساتھ سنن ابی داود کا بھی درس دیا۔ (دیکھیے روزنامہ الجمعیہ، شمارہ ۹/مئی ۱۹۵۵ء)

پھر مدرسہ شاہی مرادآباد میں ۱۹۲۸ء سے ۱۹۴۴ء تک ۱۶ سال آپ مدرس رہے، اس دوران میں دیگر کتابوں کے ساتھ صحیح مسلم اور سنن ترمذی کا درس دیا۔

(ماہ نامہ ندائے شاہی، تاریخ شاہی نمبر، ص: ۳۸۷، مضمون مولانا معزالدین احمد قاسمی)

مدرسہ شاہی میں آپ سے ترمذی پڑھنے والوں میں قاضی اطہر مبارک پوری (وفات: ۱۹۹۶ء) اور مولانا نظام الدین اسیر ادروی مدظلہ جیسے مشاہیر ہیں۔ (تاریخ شاہی

نمبر، ص: ۴۴۳، مضمون قاضی اطہر، وص: ۴۵۷، مضمون مولانا اسیر ادروی، نیز مولانا اسیر ادروی کی خودنوشت داستانِ ناتمام ص: ۷۳)

نیز مفتی محمود صاحب سابق وزیراعلیٰ صوبہ سرحد (حال صوبہ خیبر، پختون خواہ)، پاکستان (وفات: ۱۹۸۰ء) نے بھی مدرسہ شاہی میں آپ سے ترمذی پڑھی تھی۔ (مضمون مولانا سید حامد میاں صاحب بعنوان ''حضرت مولانا مفتی محمود صاحب نور اللہ مرقدہ ایک جامع صفات شخصیت'')

پھر ۱۹۶۲ء سے اپنی وفات ۱۹۷۵ء تک ۱۳ سال مدرسہ امینیہ دہلی میں شیخ الحدیث اور صدر مفتی رہے۔

نہایت حیرت کی بات ہے اور مولانا محمد میاں صاحب کے علم حدیث سے مسلسل اشتغال اور اس میں پختگی اور کمال کی دلیل ہے کہ تقریباً بیس سال تدریس سے دور رہنے کے باوجود ایک بڑے اور مشہور مدرسے میں حدیث کی سب سے اونچی کتاب صحیح بخاری کے تدریس کے لیے آپ کا انتخاب عمل میں آیا، اور آپ کو شیخ الحدیث کے منصب پر فائز کیا گیا۔ اس تیرہ سالہ عرصے میں آپ نے صحیح بخاری کے ساتھ سنن ترمذی کا بھی درس دیا۔

مدرسہ امینیہ میں آپ سے بخاری شریف پڑھنے والوں میں جامعہ نظامیہ حیدرآباد کے شیخ الحدیث مولانا خواجہ شریف صاحب بھی ہیں۔ (افسوس مضمون لکھنے کے بعد بروز جمعہ ۶/ ربیع الثانی ۱۴۴۰ھ مطابق ۱۴/ دسمبر ۲۰۱۸ء مولانا خواجہ شریف کی وفات ہوئی) نیز مدرسہ امینیہ میں بخاری شریف اور ترمذی شریف پڑھنے والوں میں مشہور ادیب ومصنف مولانا نور عالم خلیل امینی بھی ہیں، انھوں نے مولانا کے درس حدیث کا اس طرح نقشہ کھینچا ہے:

> وہ بڑے بافیض وباتوفیق مدرس تھے، ان کا درس صرف مغز کا حامل ہوتا، وہ بہت مختصر گفتگو کرتے، جس سے فائدہ اٹھانا اور متعلق موضوع سمجھنا اور سمیٹنا طلبہ کے لیے آسان ہوتا۔ کبھی لایعنی گفتگو کرتے، نہ درازکلامی کرتے، نہ بیجا مزاح کرتے، نہ کبھی زور سے ہنستے، نہ ہنسانے کے لیے کسی چٹکلے کا سہارا لیتے۔ ان کا طرز کلام مفکرانہ،

مدبرانہ اور مؤرخانہ ہوتا، درس حدیث میں اسی کے ساتھ محدثانہ وفقیہانہ ہوتا۔ ان کے اکثر جملوں میں غیر معمولی غور وفکر کی دعوت چھپی ہوتی، ان کے ان تدریسی صفات و خصوصیات کی وجہ سے ذہین اور ہوش مند طلبہ کے لیے، ان کے درس سے ایک ہمہ صفات عالم وداعی اِلی اللہ بننے کی راہ ہموار ہوتی۔ زبان ولب ولہجہ بہت پاکیزہ ہوتا، لفظ لفظ سے شرافت ٹپکتی، ہر تعبیر سے دین کا درد، ایک زاہد شب بیدار کا کرب، ایک مؤرخ اسلام کی بے قراری، ایک پرسوز عالم کا اضطراب اور عالم کے لیے ہدایت کا ذریعہ بننے والی امت کی زبوں حالی کا بے کراں دکھ چھلکتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔

(پس مرگ زندہ، ص: ۴۰)

علم حدیث میں مولانا کی خدمات امہات کتب حدیث کی تدریس میں محدود نہیں ہیں، بلکہ مولانا نے حدیث میں تصنیفی نقوش بھی چھوڑے ہیں۔ ان کی اس سلسلے میں دو کتابیں ہیں:

(۱) اربعین: یہ چالیس احادیث کا مجموعہ ہے۔ ٹائٹل پر لکھا ہے، زندگی کے مختلف شعبوں پر مشتمل اسلامی تعلیمات کا گل دستہ۔ بعض اہلِ خیر کی فرمایش پر۱۹۶۲ء میں مولانا نے یہ مجموعہ مرتب کیا۔ شروع میں چودہ صفحات پر مشتمل ایک وقیع مقدمہ ہے، جس میں انھوں نے مابعد الموت زندگی کی بہتری کے لیے فکر کی عقلی ضرورت، اللہ تعالیٰ کی اپنے بندوں کے ساتھ پیدایش سے لے کر اخیر تک شفقت ورحمت، دنیوی زندگی میں مادی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے اسباب ووسائل کی فراہمی اور اخروی زندگی میں کامیابی اور دائمی فلاح و بہبود کے لیے خدائی انتظام کا مؤثر انداز میں ذکر کیا ہے۔ پھر نبی ورسول اور وحی کی تعریف، قرآن مجید اور اس کی حقانیت کے دلائل، حدیثِ نبوی اور اس کی ضرورت، قرآن اور حدیث کے درمیان فرق، قرآن اور حدیث کی حفاظت کے لیے خدائی تدبیریں، روایت حدیث کے سلسلے میں محدثین کی احتیاط کا تذکرہ کیا ہے۔ چالیس احادیث جمع کرنے کا علماء نے جو اہتمام کیا ہے، اس کا مختصراً جائزہ لیتے ہوئے اخیر میں لکھتے ہیں: یہ چالیس

حدیثیں انسانی زندگی کے کسی ایک شعبہ مثلاً عبادت یا تجارت، یا مثلاً صنعت وحرفت، یا مثلاً نماز روزہ کے متعلق بھی ہوسکتی ہیں؛لیکن اگر یہ چالیس حدیثیں ایسی منتخب کی جائیں جو انسانی زندگی کے مختلف گوشوں سے تعلق رکھتی ہوں تو ظاہر ہے یہ مجموعہ اصلاح اور تبلیغ کے نقطۂ نظر سے زیادہ مفید اور زیادہ کارآمد ہوگا۔اس لیے چہل حدیث مرتب کرنے والے حضرات عموماً یہی کوشش کرتے ہیں کہ چہل حدیث کو یک رنگ نہ رکھا جائے، بلکہ اس کو رنگ برنگ پھولوں کا گل دستہ بنادیا جائے۔آپ کے سامنے جو چہل حدیث کا مجموعہ پیش کیا جارہا ہے، وہ اسی رنگ برنگ پھولوں کا گل دستہ ہے۔(اربعین ص:۱۴)

اس کتاب میں مولانا نے مندرجۂ ذیل عناوین قائم کر کے حدیثیں ذکر کی ہیں:

(۱) احتساب: سب سے پہلے اپنے آپ کو جانچو۔

(۲) دستورِ اساسی۔

(۳) ذمہ داری اور حدودِ ذمہ داری۔

(۴) ایمان، اسلام، تزکیۂ باطن اور تعمیر روحانیت (تصوف) ان چاروں عنوانات کے تحت ایک ایک حدیث ذکر کی ہے۔

(۵) معیار اور کسوٹی۔اس کے تحت دو حدیثیں ہیں۔

(۶) سنت اور بدعت۔اس کے تحت ایک حدیث ہے۔

(۷) عمل، اس کی تاثیر اور جزاء۔اس کے تحت تین حدیثیں ذکر کی ہیں۔

(۸) وضو اور نماز۔اس کے تحت دو حدیثیں ذکر کی ہیں۔

(۹) زکاۃ۔اس کے تحت دو حدیثیں ہیں۔

(۱۰) روزہ۔اس کے تحت ایک حدیث ہے۔

(۱۱) حج وعمرہ۔اس کے تحت ایک حدیث ذکر کی ہے۔

(۱۲) مہلک گناہ۔اس کے تحت تین حدیثیں ذکر کی ہیں۔

(۱۳) آپس کی پھوٹ۔اس کے تحت ایک حدیث ہے۔

(۱۴) امتِ محمدیہ میں مفلس کون ہے۔اس کے تحت ایک حدیث ہے۔
(۱۵) کسب معاش، اکلِ حلال، پاک اور ناپاک آمدنی، اور اس کا اثر۔اس کے تحت تین ذیلی عناوین ہیں: تجارت، دستکاری، اور کاشتکاری، اور ہر عنوان کے تحت ایک ایک حدیث ہے،اور پھر اکل حلال کے سلسلے میں ایک مشہور جامع حدیث ذکر ہے۔
(۱۶) انسانی بھائی چارہ،امداد باہمی،ایک دوسرے کا احترام۔اس کے تحت تین حدیثیں ہیں۔
(۱۷) خلق خدا سے ہمدردی-محبت وشفقت۔اس کے تحت تین حدیثیں ہیں۔
(۱۸) بغض،حسد،کینہ،دشمنی،غیبت،چغلی،بدگمانی،وغیرہ۔اس کے تحت چار حدیثیں ہیں۔
(۱۹) نصیحتیں اور ہدایتیں۔یہ آخری عنوان ہے۔اس کے تحت پانچ حدیثیں ذکر کی ہیں۔

مولانا نے تمام احادیث کا عربی متن نقل کر کے اردو میں ان کا ترجمہ کیا ہے۔دو جگہ فائدہ لکھ کر کچھ تشریح کی ہے اور متعدد جگہوں پر حاشیے میں کچھ وضاحتیں ہیں۔

اکثر حدیثوں کے بعد اخیر میں حوالے کے طور پر صحاح لکھا ہے، جو بظاہر صحاح ستہ میں موجود ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ایک جگہ متفق علیہ، دو جگہ مسلم شریف،ایک جگہ ابوداود وترمذی وغیرہ اور ایک جگہ صرف ترمذی اور ایک جگہ نسائی کا حوالہ ہے،دو حدیثیں ترغیب وترہیب سے نقل کی ہیں اور وہ دونوں طبرانی کی روایتیں ہیں، تین حدیثیں مشکاۃ سے لی ہیں: ایک بیہقی کی اور دوسری شرح السنۃ کی ہے، اور تیسری جگہ صرف مشکاۃ کا حوالہ دیا ہے،ایک جگہ بیہقی کا حوالہ ہے،ایک جگہ احمد وبیہقی کا ایک ساتھ ہے، دو حدیثیں جمع الفوائد سے لی ہیں۔

(۲) علم حدیث میں مولانا کی دوسری کتاب ”مشكاة الآثار ومصباح الأنوار مع أربعين من جوامع الكلم“ ہے۔۱۲۱ عنوانات کے تحت ۴۲۴ حدیثیں اور ۷۱ آیتیں ہیں،مگر نمبر شمار آیتوں اور حدیثوں کا ایک ساتھ ہے۔

یہ کتاب دراصل دار العلوم دیوبند میں مشکاۃ سے پہلے والے مرحلے میں نصاب کے لیے لکھی گئی تھی۔مولانا نے مقدمۂ کتاب میں ذکر کیا ہے کہ ۱۳۹۱ھ میں اراکین مجلس

شوریٰ دارالعلوم دیوبند نے قدیم نصاب میں کچھ ترمیم وتحسین کی تجویز پاس کی تو مشکاۃ سے پہلے حدیث کی کوئی کتاب پڑھانا طے کیا گیا، جب انتظامیہ کو اپنی چاہت کے مطابق کتاب نہیں ملی تو ایک نئی کتاب تیار کرنا طے کیا گیا اور اس عاجز کو اس کی ذمہ داری تفویض کی گئی۔ یہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ علم حدیث میں مولانا سید محمد میاں صاحب کا مقام مسلم تھا، اسی لیے دارالعلوم کے اساتذہ اور فارغین میں علم حدیث سے خصوصی تعلق رکھنے والے دسیوں حضرات کی موجودگی کے باوصف مولانا کو اس کام کا اہل سمجھا گیا۔

یہ حدیثیں صحاح ستہ سے منتخب کی گئی ہیں اور ان میں بھی اکثر مشکاۃ میں موجود ہیں، اس لیے مولانا نے اصل کتاب اور مشکاۃ دونوں کا حوالہ بقید صفحات دیا ہے، کہیں کہیں مختصراً توضیح کی ہے اور مشکل الفاظ کے معنی حاشیے میں دیے ہیں اور متعدد موقعوں پر اردو میں بھی اس کا مطلب لکھا ہے۔

کتاب کے اخیر میں ''الأربعون من جوامع الکلم'' کے عنوان سے چالیس احادیث کا انتخاب بھی ہے۔ یہ چالیس حدیثیں الگ ہیں، مولانا کی کتاب ''اربعین'' سے اس کا تعلق نہیں۔

ان دو کتابوں کے علاوہ مولانا نے میرٹھ سے نکلنے والے ماہ نامہ الحرم میں ''لطائف الحدیث'' کے عنوان سے ایک سلسلہ شروع کیا تھا۔ مختلف موضوعات پر حدیثیں پیش کر کے ان کی تشریح کی ہے، یہاں انھوں نے عربی متن کے بجائے اردو ترجمہ پیش کرنے پر اکتفا کیا ہے اور ان کی توضیح وتفہیم کی ہے۔ اس کے متعدد شماروں میں مختلف عنوانات کے تحت ان کے مضامین شائع ہوتے رہے۔

اخلاص، صدق، نیک نیتی کے عنوان سے پانچ قسطوں میں ایک مفصل مضمون ہے۔ (دسمبر ۱۹۵۵ء تا اپریل ۱۹۵۶ء) اسی طرح اخلاص وریاء کے عنوان سے ایک مضمون ہے۔ (ستمبر ۱۹۵۵ء)

علامہ ظہیر احسن شوق نیموی (وفات: ۱۳۲۲ھ/۱۹۰۴ء) کی مشہور کتاب ''آثار

السنن'' پر علامہ انور شاہ کشمیری نے حواشی لکھے تھے، یہ ایک منتشر کام تھا، مولانا سید محمد میاں صاحب نے ان کو مرتب کرنا شروع کیا تھا، جو تقریباً دو سو صفحات میں وہ کر چکے تھے۔ مجلس علمی کراچی کے پاس یہ چیز موجود تھی، اب معلوم نہیں اس کا کیا حال ہے۔

اہل علم سے یہ بات مخفی نہیں کہ آثار السنن کس پایے کی کتاب ہے اور علامہ شوق نیموی کا حدیث میں کتنا اونچا مقام تھا، پھر اس پر علامہ کشمیری کے حواشی کس درجے کے ہوں گے۔ مولانا محمد میاں کا اس کام کے لیے تیار ہونا اور اس کو اپنے ہاتھ میں لینا علم حدیث میں ان کے تبحر کی روشن دلیل ہے۔

نیز ماہ نامہ دار العلوم دیوبند میں امام الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے معمولات شب و روز کے عنوان سے تین قسطوں میں (مئی ۱۹۷۳ء تا جولائی ۱۹۷۳ء) مولانا محمد میاں کا ایک مفصل مضمون شائع ہوا ہے جس میں انھوں نے حدیث کی روشنی میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے شب و روز کا مفصل نقشہ کھینچا ہے۔

ایک مضمون ''تعلیمات قرآن مجید اور احادیث مقدسہ کا مرقع'' کے نام سے ہے۔ (ماہ نامہ دار العلوم دسمبر ۱۹۷۳ء) جس میں متعدد موضوعات پر قرآن کی آیتیں اور احادیث مبارکہ پیش کی ہیں۔

اسی طرح ملک کے مشہور جرائد: الجمعیۃ (دہلی) قائد (مرادآباد) مدینہ (بجنور) الحرم (میرٹھ) برہان (دہلی) اور دار العلوم (دیوبند) وغیرہ میں شائع شدہ آپ کے مضامین کا جائزہ لیا جائے تو حدیث میں آپ کی مہارت کے مزید پہلو سامنے آسکتے ہیں اور علم حدیث کی خدمت کے متعدد گوشے ظاہر ہو سکتے ہیں۔

رحمه الله وغفر له وأسبغ عليه شآبيب رضوانه

مآخذ

۱- ماہ نامہ ندائے شاہی، تاریخ شاہی نمبر، نومبر- دسمبر ۱۹۹۲ء مطابق جمادی الاولی جمادی الثانیہ ۱۴۱۳ھ،

مدرسہ شاہی مرادآباد
۲-داستان ناتمام (خودنوشت سوانح) مولانا اسیر ادروی، کتب خانہ حسینیہ دیوبند، ۲۰۰۹ء
۳-پس مرگ زندہ، مولانا نور عالم خلیل امینی، ادارہ علم وادب، دیوبند ۱۴۳۱ھ/۲۰۱۰ء
۴-اربعین، مولانا سید محمد میاں دہلوی۔دہلی
۵- مشکاۃ الآثار ومصباح الأنوار مع أربعین من جوامع الکلم، مولانا سید محمد میاں دہلوی۔دہلی
۶-ماہ نامہ الحرم، میرٹھ، شمار ستمبر ۱۹۵۵ء، ودسمبر ۱۹۵۵ء تا اپریل ۱۹۵۶ء
۷-ماہ نامہ دارالعلوم، دیوبند، شمارہ مئی وجون وجولائی ۱۹۷۳ء وشمارہ دسمبر ۱۹۷۳ء
۸-روزنامہ الجمعیہ، شمارہ ۹/مئی ۱۹۵۵ء
۹-حضرت مولانا مفتی محمود صاحب نور اللہ مرقدہ ایک جامع صفات شخصیت، مولانا سید حامد میاں صاحب

(اس مضمون کی بعض معلومات برادر محترم مولانا ضیاء الحق خیرآبادی (کنوینر سیمینار) نے فراہم کی ہیں، اس کے لیے ہم ان کے خاص طور پر مشکور ہیں)

باسمہٖ سبحانہ تعالیٰ

سید الملت مولانا سید محمد میاں صاحب دیوبندیؒ
بحیثیت مفتی وفقیہ

مولانا مفتی محمد سلمان صاحب منصور پوری

جمعیۃ علماء ہند کی تاریخ جن شخصیات کے تذکرے کے بغیر نامکمل ہے، اُن میں ایک نمایاں ترین شخصیت سید الملت حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب دیوبندی نور اللہ مرقدہٗ (المتوفی ۱۳۹۵ھ) کی ہے، جنہوں نے بلاشبہ اِس جماعت کو بامِ عروج تک پہنچانے میں اپنی بہترین صلاحیتیں اور زندگی کے قیمتی لمحات صرف فرمائے، اور بے مثال مخلصانہ قربانیاں پیش کیں، جن کا اِس دور میں ہم جیسے لوگوں کے لئے تصور کرنا بھی مشکل ہے۔

بریں بنا جمعیۃ کی صد سالہ تقریبات کے موقع پر حضرت موصوف کی شخصیت اور خدمات پر سیمینار کا انعقاد ایک مستحسن قدم ہے۔

حضرت کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر دیگر حضرات نے مقالات ومضامین تحریر فرمائے ہیں، احقر نے اپنے منتخبہ موضوع **"سید الملت حضرت مولانا سید محمد میاں صاحبؒ بحیثیت مفتی وفقیہ"** مختصر تحریر مرتب کی ہے، جو پیشِ خدمت ہے۔ (مرتب)

سید الملت حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۳۹۵ھ) ایک عظیم مؤرخ، بہترین مصنف اور ممتاز مفکر ہونے کے ساتھ ساتھ اعلیٰ درجہ کے مفتی اور فقیہ بھی تھے، جس کا اندازہ آپ کی فقہی تحریروں اور مبسوط فتاویٰ سے بآسانی کیا جاسکتا ہے۔

آپ نے ''دینی تعلیم کے رسالوں'' میں بہت آسان اَنداز میں ضروری دینی مسائل جمع فرمائے، جو اُمت کے نونہالوں کے لئے اِنتہائی نفع بخش ہیں۔اِسی طرح آپ نے فقہ حنفی کی مقبول کتاب ''نورالایضاح'' کا اُردو ترجمہ وتشریح ''نورالاصباح'' کے نام سے شائع فرمایا، جو طلبہ اور اَساتذہ کے لئے بہت کارآمد ہے۔

جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مرادآباد میں آپ کا دورِ قیام (۱۳۴۷ھ-تا-۱۳۶۶ھ) آپ کی زندگی کا تابناک دور ہے، اِسی زمانہ میں آپ نے اکثر تصنیفات مرتب فرمائی ہیں، اور تدریسی خدمت کے ساتھ صوبائی جمعیۃ کے ماتحت ملی خدمات بھی اَنجام دی ہیں۔

مدرسہ شاہی میں مفتی کے منصب پر

اِسی دوران ۱۳۵۸ھ سے ۱۳۶۶ھ تک دارالافتاء کی ذمہ داری بھی آپ کے سپرد رہی، جسے آپ نے نہایت محنت اور دلجمعی کے ساتھ اَنجام دیا، چناں چہ اِس دور کے ۴۵۸ رفتاویٰ خود آپ کے دست مبارک سے لکھے ہوئے نقولِ فتویٰ کے رجسٹروں میں درج ہیں اور عظیم علمی سرمایہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ (ندائے شاہی، تاریخ شاہی نمبر ۱۷۴)

اُن فتاویٰ میں سے چند فتاویٰ بطورِ نمونہ ذیل میں درج کئے جارہے ہیں، جن سے قارئین حضرت والا کی فقہی گیرائی کا بخوبی اندازہ لگاسکتے ہیں:

قرآنِ کریم افضل ہے یا ذاتِ نبوی ﷺ

سوال:- ایک سید صاحب نے مولوی صاحب سے پوچھا کہ قرآنِ مجید کی شان اَفضل ہے یا رسولِ پاک ﷺ کی شان اَفضل ہے؟ مولوی صاحب نے کہا کہ قرآنِ مجید کی شان یہ ہے کہ بغیر وضو کے ہاتھ لگانا منع ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق خود حدیث میں ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ گھر سے باہر آرہے تھے کہ راستہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ملے، تھوڑی دیر کے بعد حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ چلے گئے، غسل فرماکر پھر حاضر خدمت ہوئے اور مصافحہ کیا، سرکارِ دوجہاں صلی اللہ علیہ وسلم نے اِرشاد

فرمایا کہ: ''اگر جنبی تھے تو میرے ساتھ مصافحہ کر سکتے تھے''۔

دوسری حدیث شریف میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم بستری سے فارغ ہو کر غسل فرمایا کرتے تھے، تو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا کرتے تھے کہ مجھے سردی لگ رہی ہے گرم کرو، حالاں کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اُس وقت جنبی ہوتی تھیں۔

اِس مسئلہ کو سنتے ہی ایک حافظ صاحب نے مولوی صاحب کو کہا کہ: ''واجب القتل ہے''۔ اُس کے بعد ایک مولوی صاحب ملتان سے آئے، تو اُس نے یہ مسئلہ سنا اور کہا کہ مولوی صاحب نے شانِ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم میں گستاخی کی ہے۔ عرض یہ ہے کہ ایک سید دوسرے حافظ صاحب تیسرے مولوی صاحب چوتھے ملتان والے مولوی صاحب، اِن چار آدمیوں میں سے کون گنہگار ہوگا اور کس کس کو توبہ کرنی چاہئے؟

الجواب :- مسئلہ بہت پیچیدہ ہے، اِس جستجو میں کافی وقت صرف ہوگیا کہ کسی کتاب میں اِس مسئلہ کے متعلق کسی بزرگ کا کوئی قول مل جائے، مگر اَب تک ناکامی رہی، اِسی باعث جواب میں اِس قدر تاخیر ہوئی، چند روز کے بعد اِمداد الفتاویٰ ۱۴۰/۳ مطالعہ سے گذری، جس میں اسی مضمون کے استفتاء کے جواب میں توقف کو بہتر فرمایا گیا ہے۔ الدر المختار اور رد المحتار کی حسبِ ذیل عبارت سے استدلال ہے:

وعنه عليه الصلاة والسلام: القرآن أحب إلى الله من السماوات والأرض ومن فيهن (الدر المختار) قال الشارح: ومن فيهن ظاهره يعم النبي صلى الله عليه وسلم والمسئلة ذات خلاف، والأحوط الوقف.

(شامي / قبيل باب المياه ١٧٨/١ كراچى، ١٦٥/١ مصرى)

سید الثقلین، فخر موجودات، افضل الرسل، خاتم الانبیاء، تاجدار لولاک لما خلقت الافلاک، حامل علم الاولین والآخرین صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ عقیدہ مسلم ہے کہ ''بعد اَز خدا بزرگ توئی قصہ مختصر''۔

وقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إن الله قال: ما خلقت خلقًا أكرم علىٰ منك. (خصائص كبرىٰ ۱۹۳/۲)

دین میں قرآنِ کریم کی ایک شان یہ بھی ہے کہ وہ کلام اللہ ہے، یعنی حضرت حق جل مجدہ وتعالیٰ شانہ کی ایک صفت قدیمہ ہے۔ اس میں شک وشبہ کی کیا گنجائش ہوسکتی ہے کہ حضرت حق جل مجدہ اور اُس کی صفات جملہ ماسواء سے اعلیٰ برتر اور وراء الوریٰ ہیں۔

بہرحال وجوہاتِ اَفضلیت متعارض ہیں؛ لہٰذا اِس مسئلہ میں سکوت اور توقف ہی بہتر اور اسلم؛ بلکہ ضروری ہے۔ وہ اَحادیث جو مولانا صاحب نے پیش فرمائی ہیں، اگرچہ صحیح اور مستند ہیں، مگر ایسے جزوی اُمور سے فضل کلی ثابت نہیں ہوتا کہ فضل کلی پر استدلال کیا جائے۔

مولانا صاحب، حافظ صاحب، سید صاحب اور اِس مسئلہ میں تمام دلچسپی رکھنے والے حضرات سے درخواست ہے کہ اُمت اِسلامیہ میں پہلے ہی کون سے کم اختلافات ہیں کہ ایک اور مسئلہ بحث میں لاکر اُن میں اِضافہ کیا جائے۔ اگر یہ مسئلہ دین کی ضروریات میں سے ہوتا اور اگر یہ بحث مفاد ملت کے لئے ضروری ہوتی تو آج تک اِس طرح زاویہ خمول میں نہ رہتا۔

هٰكذا روي، نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن كثرة السوال، حتى قال: ذروني ما تركتم، فإذا حدثتكم فخذوا عني؛ فإنما هلك من كان قبلكم بكثرة سوالهم واختلافهم علىٰ أنبيائهم. (صحيح مسلم ۳۳۹/۲، سنن الترمذي ۹۶/۲، سنن ابن ماجة ۲) واللہ اعلم بالصواب

کتبہ: محمد میاں عفی عنہ

۷/رجب ۱۳۶۴ھ

عقیدۂ حیات النبی

سوال:- محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کس معنی میں وفات کے بعد بھی باحیات ہیں؟ کیا

آپ کو موت ہوئی یا نہیں؟ اگر موت نہیں ہوئی تو قرآنِ کریم غلط ہوا جاتا ہے، اور اگر موت ہوئی تو یہ حیات کیسی؟ نیز حیات نبی اسی جسد مبارک کے ساتھ ہے یا نہیں؟ کتب صحاح اور احادیث کے حوالہ جات سے واضح طور پر تحریر کریں؟

جواب:- قرآنِ کریم میں شہداء کے متعلق اِرشاد ہے: ﴿وَلاَ تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْیَآءٌ. [البقرة، جزء آیت: ١٥٤] (یعنی جو راہِ خدا میں مارے جائیں اُن کو مردہ مت کہو وہ زندہ ہیں)

انبیاء کا درجہ شہداء سے کہیں زیادہ ہے اور بالخصوص سرور کائنات، فخر موجودات، محبوب رب العالمین، رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم (روحی فداہ) کا درجہ برتر و بالا ہے، جس کا اندازہ لگانا بھی ناممکن ہے۔ لہٰذا آپ کی حیات بھی شہداء کی حیات سے بدرجہا اعلیٰ اور اشرف ہوگی۔

[**لا شک في حیاتہٖ صلی اللّٰہ علیہ وسلم بعد وفاتہ، وکذا سائر الأنبیاء علیہم الصلاۃ والسلام أحیاء في قبورھم حیاۃً أکمل من حیاۃ الشھداء التي أخبر اللّٰہ تعالیٰ في کتابه العزیز.** (وفاء الوفاء ٤٠٥/٢ بحوالة: تسکین الصدور ٢٣٢)

ترجمہ:- وفات کے بعد آنحضرت ﷺ کی حیات میں کوئی شک نہیں، اور اسی طرح باقی تمام انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام بھی اپنی قبروں میں زندہ ہیں، اور اُن کی یہ حیات شہداء کی اُس حیات سے بڑھ کر ہے، جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں کیا ہے۔

رہا یہ کہ وہ حیات کس قسم کی ہے؟ اِس کو خدا ہی خوب جانے؛ البتہ جس طرح شہداء کی ظاہری موت جس کو اپنی آنکھوں سے دیکھا جاتا ہے، اُن کی اس حیات کے منافی نہیں جس کا تذکرہ قرآنِ کریم میں ہے۔ اِسی طرح انبیاء کی ظاہری موت بھی اُن کی باکمال اور حقیقی حیات کے منافی نہیں ہوگی۔ جسد مبارک کے متعلق صحیح اَحادیث میں وارد ہے کہ زمین انبیاء علیہم السلام کے بدن کو نہیں کھا سکتی، خدا نے زمین پر ان حضرات کے جسد حرام کردئے ہیں۔

نسائی شریف میں حضرت اوس بن اوس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے:

قالوا: یا رسول اللّٰہ! کیف تعرض صلاتنا علیک، وقد أرمت إلي؟ یقولون: وقد بلیت، قال: إن اللّٰہ عزوجل قد حرّم علی الأرض أن تأکل أجساد الأنبیاء علیہم السلام. (سنن النسائي ۱/ ۲۰٤)] واللہ اعلم بالصواب

کتبہ: محمد میاں عفی عنہ

۱۳؍رجب ۱۳۵۸ھ

حضرت اَمیر معاویہؓ کے بارے میں ایک سوال

سوال:- جب حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کے متعلق حضرت پیغمبر اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ ''تم کو باغی قتل کردیں گے''، اور قتل کئے گئے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی پارٹی کی طرف سے، تو اَب حضرت معاویہؓ کون ہوئے؟ کیا باغیوں میں شمار نہ ہوئے؟

الجواب:- حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے متعلق اہل سنت والجماعت کا عقیدہ یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مخالفت ذاتی غرض پر مبنی نہ تھی؛ بلکہ نظریات واجتہاد کا اختلاف تھا، اور اِس اختلاف میں حضرت علی رضی اللہ عنہ حق پر تھے، اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ خاطی تھے۔ مجتہد خاطی کو اپنی خطا کا خود احساس نہیں ہوتا، وہ خود کو مصیب سمجھتا ہے، اِسی بنا پر اس کو گناہ نہیں ہوتا؛ بلکہ نفس اجتہاد کا اُس کو اجر ملتا ہے۔ (کما ہو مصرح فی الاصول)

بہرحال بہت کم مسائل ایسے ہیں کہ بعد کے علماء یہ فیصلہ کرسکتے ہیں کہ خاطی کون تھا؟ اور مصیب کون؟ ورنہ عموماً اجتہادی مسائل میں جن میں اختلاف چل رہا ہے، اور ہر ایک فریق اپنے مجتہد کو مصیب ہی سمجھتا ہے اور ثابت کرتا ہے۔ حدیث سے صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حق پر ہونے کا علم ہوتا ہے، اور یہ علماء کے لئے اس فیصلہ کی حجت ہے کہ وہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو مصیب قرار دیتے ہیں اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو خاطی۔ لیکن چوں کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے اجتہاد نے اُن کو دیانتاً اس جدوجہد پر مجبور کردیا تھا؛ لہٰذا وہ

گنہگار نہیں کہے جاتے۔

یہ ایک علیحدہ سوال ہے کہ اس حدیث کا علم حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو ہوا یا نہیں؟ اہل تاریخ کا بیان ہے کہ اس حدیث کا علم ہوا تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ''ہم نے قتل نہیں کیا؛ بلکہ اُن لوگوں نے کیا جو اُن کو میدان میں لائے''۔

قال فبلغني أن معاوية قال: إنما قتله من أخرجه يخدع بذٰلک أهل الشام. (البداية والنهاية ٢٦٨/٧)

ایک روایت میں یہ ہے کہ باغ کے معنی طالب سمجھے۔ یعنی **فئة طالبه بدم عثمان**۔ اور یہ مستبعد نہیں؛ کیوں کہ باغ اس معنی میں آتا ہے، **يا باغي الخير** حدیث میں ہے، یعنی: **طالب الخير.**

قرآنِ کریم میں ہے: **﴿فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلاَ عَادٍ﴾ أي غير طالب، وفي قصة الهجرة تقيهما رجلٌ فقال: من أنتم؟ فقال أبوبكر: باغ وهاد عرض ببغاء الإبل وهداية الطريق مريدًا طلب الدين والهداية من الضلالة.**

(مجمع البحار / باب الباء مع الغين ١٠٨/١)

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر دم عثمان کے مطالبہ کا جذبہ غالب تھا، اِسی کے بموجب اُن کے دماغ نے حدیث کے یہ معنی سمجھے۔ اجتہادیات میں اس کی نظریں بے شمار ہیں، ورنہ کم اَز کم اِس حدیث کے مفہوم میں احتمال باقی رہا، اور ظاہر ہے کہ محتمل المعنی حدیث کی بنا پر کوئی مجتہد اپنے تحقیقی نظریہ کو کب چھوڑ سکتا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

کتبہ: محمد میاں عفی عنہ

۱۳/ربیع الثانی ۱۳۶۴ھ

اِیصالِ ثواب پر لین دین کا حکم

سوال:- مدت سے بنگال میں یہ رسم چلی آرہی ہے کہ لوگ اپنے مردوں کے لئے سال میں ایک دو دفعہ علماء اور حفاظ کو دعوت دے کر ایک جگہ جمع کرتے ہیں، اور تہلیل پڑھواتے

ہیں۔ نیز قرآنِ کریم کا ختم کرواتے ہیں، اور اُن کو دو چار روپیہ دے دیتے ہیں۔ اگر اُن پر کوئی اعتراض کرے کہ یہ جائز نہیں، تو کہتے ہیں کہ بنیت للہ دینا اور لینا جائز ہے، اور بنیت اُجرت جائز نہیں۔ یہ رسم مذکور شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ دینا اور لینا کیسا ہے؟ بیان فرمائیں۔

الجواب:- ناجائز ہے۔ باقی یہ کہ یہ کہنا کہ لین دین اُجرت کے طور پر نہیں ہے؛ سراسر غلط ہے؛ کیوں کہ علامہ شامی کی عبارت ''**فالحاصل أن ما شاع في زماننا من قراءة الأجزاء الخ**''. (شامي ٥٦/٦ کراچی، ٥٣/٥ مجتبائی) سے ثابت ہوا کہ قرأت قرآن یا تہلیل وغیرہ پر اگر باقاعدہ اُجرت کا معاملہ نہ ہو، تب بھی مروجہ صورت اس لئے ناجائز ہے کہ پڑھنے والے کے ذہن میں دنیاوی نفع کا خیال ضرور رہتا ہے، اور اسی لئے وہ پڑھتا ہے۔ چناں چہ بلا اس قسم کے موقع کے کہیں بھی نہیں پڑھتا۔ اِسی طرح فرمائش کرنے والا بطور خود کچھ خدمت کرنا ضروری سمجھتا ہے، اور اسی باعث وہ اپنے خاص عزیز کے لئے اِیصالِ ثواب کا مطالبہ کرتا ہے۔ اگر وہ حافظ اُس کے یہاں پڑھ کر اسی کی فرمائش کے بموجب اُس کے عزیز کو اِیصالِ ثواب نہ کرے تو کسی ہدیہ کا مستحق نہیں پایا جاتا۔

بہر حال اِطاعت اور عبادت کے لئے دنیوی نفع کا ذہن میں رہنا بھی للّٰہیت سے خارج کر دیتا ہے اور جب للّٰہیت نہ ہو تو ثواب بھی نہ ہوگا، اور پھر اِیصالِ ثواب بھی بے معنی۔

واللہ اعلم بالصواب　　　　کتبہ: محمد میاں عفی عنہ

۲۹ر شوال ۱۳۶۱ھ

حدیث میں بارہ خلفاء سے کون مراد ہیں؟

سوال:- شاہ عبدالقادر صاحب محدث دہلوی مصنف موضح القرآن اپنی تفسیر سورۂ مائدہ میں یہ ذیل آیت: ﴿**وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ بَنِيْ اِسْرَائِيْلَ وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيْبًا**﴾ بعنوان فائدہ اِرشاد فرماتے ہیں:

''ایک عہد اِس اُمت سے کہ رسول جو بعد پیدا ہوں اُن کی مدد کرو، اُس کے بدلے ہم سے یہ ہے کہ خلفاء کی اِطاعت کرو، یہ مذکورہ بارہ سرداروں کا بیان فرمایا۔ اِسی

اِشارہ کوحضرت نے بتایا کہ میری اُمت میں بارہ خلیفہ ہوں گے قوم قریش سے،اور فرمایا ہے کہ جوخرابی ہوئی پہلی اُمت میں سو ہوگی تم سے، جیسے وہ خراب ہوئے پیغمبروں کی مخالفت سے، یہ اُمت خراب ہوئی خلیفہ پرخروج کرکے''۔

اَب قابل سوال امر اِس عبارتِ مذکورہ بالا میں یہ ہے کہ وہ بارہ خلفاء کون کون اَصحاب ہیں؟ حالاں کہ اصلی خلافت راشدہ حضرات خلفاء اربعہ تک رہی، اُس کے بعد اِمامت کا درجہ رہا؟

الجواب :- خلیفہ یا اِمام کی تعریف علماء نے یہ فرمائی ہے کہ وہ شخص جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نائب کی حیثیت سے مسلمانوں کے دینی اور دنیوی معاملات میں عمومی قیادت اور سیادت کا حامل ہو، اور اپنی سیاسی قوت اور اقتدار سے مسلمانوں کی، نیز مسلمانوں کے مذہب اور ملک کی حفاظت کرسکے۔

[هي خلافة الرسول في إقامة الدين. (شرح مواقف ٢٦٢/٣)]

یہ شخص اگر غیر راشد ہو تب بھی اس کو خلیفہ اور اِمام ہی کہا جائے گا، جیسا کہ فقہ کی کتابوں اور رسول اللہ ﷺ کے اِرشادات مقدسہ میں خلیفہ یا امام کی دونوں صفتیں وارد ہوئی ہیں، یعنی عادل اور ظالم۔ لہٰذا سائل کا یہ اشکال تو ختم ہوا کہ اصلی خلافت راشدہ حضرات خلفاء اربعہ تک رہی۔ بے شک ان چار حضرات کے بعد صرف دو چار حضرات ہی ایسے گذرے کہ اُن کو خلیفہ راشد کہا جاسکتا ہے، یا کہا گیا ہے، مگر حدیث میں راشد کی تخصیص نہیں؛ بلکہ **اثنا عشر خلیفة** ہے۔ (جمع الفوائد ۳۲۳/۱ مطبع خیریہ، ابوداؤد شریف/ کتاب المہدی ۲۳۲/۲)

یعنی صرف لفظ خلیفہ وارد ہوا ہے، جس میں راشد اور غیر راشد سبھی شامل ہیں؛ البتہ ایک علامت ضرور بیان کی گئی ہے، اور وہ یہ کہ ''**كلهم يجتمع عليهم الناس**'' یعنی تمام مسلمان اُن کی خلافت پر متفق ہوں گے۔ اِس علامت کا لحاظ کرتے ہوئے بارہ خلیفہ کے متعلق حافظ جلال الدین سیوطیؒ کی رائے یہ ہے کہ خلفاء اربعہ کے علاوہ آٹھ خلیفہ مندرجہ ذیل

حضرات ہیں:

(۱) حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ (۲) یزید (۳) عبدالملک ابن مروان (۴) ولید (۵) سلیمان (٦) عمر بن عبدالعزیز (۷) یزید (۸) ہشام ولید بن یزید۔ (قرۃ العینین ۲۹۷ مطبوعہ مجتبائی)

وجہ یہ بیان کی ہے کہ ان خلفاء کے زمانہ میں اسلامی حکومت کا مرکز دنیا میں ایک ہی رہا۔ ولید کے بعد جب بنواُمیہ کے بجائے بنوعباس کے سر پر خلافت متمکن ہوئی تو باوجودیکہ شان وشوکت میں وہ بہت بڑھے ہوئے تھے، مگر اسلامی حکومت کا مرکز ایک نہیں رہا؛ بلکہ اُندلس میں ایک دوسری خلافت قائم ہوگئی۔

قاضی عیاض اور حافظ ابن حجر رحمہما اللہ نے بھی حدیث کی یہی توجیہہ کی ہے اور حدیث کے آخری فقرہ "**كلهم يجتمع عليهم الناس**" سے استدلال کیا ہے۔ (تاریخ الخلفاء ۱۱/۱)

إيضاح ذٰلک أنهم اجتمعوا بعد الخلفاء الراشدين الأربعة علىٰ معاوية بعد صلح الحسن ثم علىٰ يزيد بعد شهادة الحسين ثم علىٰ عبد الملک بن مروان بعد قتل ابن الزبير، ثم علىٰ أولاده الأربعة الوليد ثم سليمان ثم يزيد ثم هشام وتخلل بين سليمان ويزيد عمر بن عبد العزيز ثم اجتمعوا على الوليد بن يزيد بن عبد الملک بعد قتل عمه هشام. (بذل المجهود ۱۸۹/۱۷، تاريخ الخلفاء اردو / ترجمه بيان الأمراء ۱۹-۲۰)

سیدنا شاہ ولی اللہ قدس سرہ العزیز بھی بارہ خلفاء سے مندرجہ بالا خلفاء ہی مراد لیتے ہیں، مگر توجیہ یہ کرتے ہیں کہ اُن کے زمانہ میں ظہور دین کے دونوں بازو یعنی خلافت اور علم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم متحد رہے۔ خلیفہ بھی اُمت اسلامیہ کا ایک ہی ہوتا تھا، جو مستقل طور پر جملہ اُمور میں خلیفہ کی شان کے بموجب عمل کرتا تھا، جرنیلوں اَفسران فوج یا شیوخ کے ہاتھ میں کٹھ پتلی نہیں ہوتا تھا، اور علم کے اعتبار سے اتحاد تھا، یعنی معتزلہ شیعہ مرجیہ جہمیہ وغیرہ

کے فرقے پیدا نہ ہوئے تھے۔(خلاصہ ازالۃ الخلفاء فارسی ۱۵۵)

حافظ جلال الدین سیوطی قدس سرہ العزیز نے حدیث کی توجیہ میں ایک دوسرا قول بھی نقل کیا ہے کہ وہ بارہ خلفاء مراد ہیں جو قیامت تک تمام مدت اسلام میں ہوں گے جو شریعت حقہ کے بموجب اسلامی شان سے حکومت کو چلائیں گے۔ اِس توجیہہ کے بموجب اپنے زمانہ یعنی نویں صدی کے ختم تک مندرجہ ذیل دس خلفاء کے نام تحریر فرمائے ہیں:

حضرات خلفاء راشدین:- حضرت حسن رضی اللہ عنہ۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ۔ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ اور خلفاء عباسین میں سے مہدی اور طاہر۔ باقی دو میں سے ایک مہدی ہیں، جن کی خبر احادیث میں آئی ہے، کوئی اور صاحب ہوں گے۔(بیان الامراء/ترجمہ تاریخ الخلفاء ۲۱-۲۲)

شریعت وطریقت وغیرہ میں فرق؟

سوال :- شریعت، طریقت، حقیقت، معرفت۔ اِن چاروں لفظوں میں کیا فرق ہے؟ باصلاح شریعت ولغت بیان فرماویں؟

الجواب:- **الشريعة**: ما شرع الله لعباده من السنة والأحكام.

الطريقة: السيرة، الحالة، المذهب.

الحقيقة: ما يجب على الإنسان أن يحميه.

المعرفة: مصدر إدراک الشيء علىٰ ما هو عليه۔

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ لغت میں **شریعت** اُن سنن اور اَحکام کو کہتے ہیں کہ جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لئے مشروع فرمایا۔ اور **طریقت** سیرت، حالت، مذہب کو کہتے ہیں۔ اور **حقیقت** وہ چیز ہے کہ جس کی حمایت اور حفاظت آدمی پر ضروری ہے۔ اور **معرفت** کسی شیٔ کے نفس الامر میں اِدراک کو کہتے ہیں۔

باقی شریعت میں یہ چاروں لفظ کسی خاص اِصطلاح کے تحت وارد نہیں ہوئے ہیں؛ البتہ صوفیانِ کرام نے ان کو ایک خاص اصطلاح کے تحت ذکر کیا ہے، اور یہ عند المحققین مسلم

ہے کہ بدونِ شریعت نہ طریقت کوئی حاصل کرسکتا ہے اور نہ حقیقت اور معرفت، جیسا کہ ظاہر ہے۔ آنحضرت ﷺ احکامِ شریعت پہچاننے اور اُس پر عمل کرانے کے لئے مبعوث ہوئے ہیں، پس جو شخص شریعت کے خلاف عمل پیرا ہوگا، وہ نبی اکرم ﷺ کے منشاء بعثت کے خلاف ہے، ہرگز ہرگز نہ درجہ معرفت کو پہنچ سکتا ہے نہ طریقت نہ حقیقت کے خلاف۔

خلافِ پیمبر کسے رہ گزید
کہ ہرگز بمنزل نخواہد رسید

واللہ اعلم بالصواب
کتبہ: محمد میاں عفی عنہ
۲؍شعبان ۱۳۶۰ھ

عیدگاہ اور مسجد میں فرق؟

سوال :- عیدگاہ اور مسجد میں شریعت کے اعتبار سے کیا فرق ہے؟ عیدگاہ میں سکھانے کے واسطے کپڑے ڈالنا، کبڈی کھیلنا، گائے اور بکریوں کو باندھنا اور دنیاوی اُمور کو انجام دینا جائز ہے یا نہیں؟ اور عیدگاہ موقوفہ وغیر موقوفہ کا کیا حکم ہے؟ جواب مع حوالہ درج کیجئے۔

الجواب :- غیر موقوفہ عیدگاہ تو کسی شخص کی مملوکہ زمین ہوگی یا جنگل کی اُفتادہ زمین یا سڑک وغیرہ، اُس کو تو مسجد یا عیدگاہ کہنا ہی مناسب نہیں؛ البتہ وہ جگہ جو نماز عید کے لئے وقف کردی گئی ہو، جس میں عید کی نماز پڑھی جاتی ہو، عیدگاہ کہلائے گی۔ بہرحال عیدگاہ صرف جواز اقتداء میں مسجد کا حکم رکھتی ہے کہ انفصال صفوف کی صورت میں صحراء وغیرہ میں اقتداء جائز نہ ہوگی، مگر عیدگاہ میں جائز ہوگی، جیسے کہ اس صورت میں مسجد میں جائز ہوتی ہے، باقی اُمور میں نہیں؛ البتہ اتنا اہتمام ضرور ہونا چاہئے کہ پاخانہ پیشاب نہ کیا جائے، اور گائے بکری وغیرہ نہ باندھی جائیں۔

قال في البحر الرائق: وفي النهاية وغيرها والمختار للفتویٰ في المسجد الذي اتخذ لصلاة الجنازة والعيد أنه مسجد في جواز الاقتداء،

وإن انفصل الصفوف رفقًا بالناس، وفيما عدا ذٰلک ليس له حکم المسجد، وظاهر ما في النهاية أنه يجوز الوطء والبول والتخلي في مصلی الجنائز والعيد، ولا يخفی ما فيه فإن الباني لم يعده لذٰلک، فينبغي أن لا تجوز هٰذه الثلاثة، وإن حکمنا لکونه غير مسجد، وإنما تظهر فائدته في بقية الأحکام التي ذکرناها من حل دخوله للجنب والحائض. قال المحشي ابن عابدين رحمه اللّٰه: أي کجواز الوضوء والمضمضة منه، ومسح الرجل من الطين بحشيشه والبصاق ونحو ذٰلک. (البحر الرائق / الفصل کره استقبال القبلة بالفرج ٣٦/٢) واللہ اعلم بالصواب

کتبہ: محمد میاں عفی عنہ
۲۹؍ذی الحجہ ۱۳۶۳ھ

وقف علی الاولاد میں تبدیلی وتصرف

سوال :- ایک عورت نے اپنی ایک صحرائی جائیداد جو تین قطعوں پر مشتمل تھی، اوران تین قطعوں میں سے ایک قطعہ کی کل کی مالک تھی اور دوقطعوں میں سے جزو کی مالک تھی، وقف علی الاولاد کیا، اور اپنی اولاد میں سے صرف لڑکیوں اورلڑکیوں کی اولاد کواوراُن کے بعد بھائی اوراُس کی اولاد کو مستحق منافع جائیداد وتولیت قرار دیا ہے، حالاں کہ واقفہ کے اَولادِ ذکور بھی موجود ہیں، اور صاحب اَولاد اور ضرورت مند بھی ہیں۔ اَب وقف کرنے کے بعد اُس کے بھائی نے اس جائیداد موقوفہ میں سے چند بیگھوں میں ایک باغ انبہ نصب کیا، اَب کئی سال سے اس میں بہار بھی آنے لگی ہے۔ کیاواقفہ کوموقوفہ زمین میں باغ لگانے کا حق تھا یانہیں؟

اِجازت دینے کا حق نہ ہونے کی شکل میں باغ لگانے والے کی ملکیت ہوگا یا وقف میں شامل ہوگا؟ اگر یہ ثابت کردیا جائے کہ اجازت ہی نہیں دی تھی تو باغ کس کی ملکیت ہوگا؟

کوئی حیلہ شرعی ایسا ہوسکتا ہے کہ باغ وقف میں شامل ہوجائے، اور باغ لگانے والے کی ملکیت سے نکل جائے؟

کیا باغ لگانے والا اِس پر مجبور کیا جاسکتا ہے کہ وہ درختوں کی قیمت لے لے، حالاں کہ زمین کا لگان مقرر کر کے باغ لگایا تھا؟

اگر واقفہ نے باغ لگانے کی اِجازت دے دی تھی تو باغ کس کا حق ہے؟

کیا غیر منقسمہ جائیداد کا وقف صحیح ہے یا اُس میں کوئی نقص ہے؟

اگر وقف نامہ میں جائیداد منقسم وغیر منقسم دونوں شامل ہوں، تو وقف صحیح ہے یا نہیں؟ باغ لگانے کی اِجازت دینے میں موقوفہ جائیداد کے قطعہ منقسمہ اور غیر منقسمہ میں کوئی فرق ہے یا نہیں؟

وقف علی الاولاد میں اگر واقفہ نے اَولاد ذکور کو کوئی حق نہ دیا ہو، تو وقف صحیح ہے یا کچھ نقصان ہے؟ اَب واقفہ کے کارکن اور واقفہ کی لڑکیوں وغیرہ کی رائے ہے کہ واقفہ کو موقوفہ زمین میں باغ نصب کرنے کی اِجازت دینے کا حق نہ تھا، اِس لئے یہ باغ لگانے والے کے پاس سے نکل سکتا ہے، تو لامحالہ نوبت مقدمہ بازی کی آوے گی، تو دیگر رشتہ داروں کو کس فریق کا ساتھ دینا چاہئے؟ باغ لگانے والے کا یا باغ چھیننے والوں کا؟ عند الشرع کون حق پر ہے؟

الجواب :- واقفہ موقوفہ زمین میں باغ خود بھی لگا سکتی ہے اور کسی دوسرے شخص کو اِجازت بھی دے سکتی ہے، مگر ان دونوں صورتوں میں وہ باغ بھی وقف مانا جائے گا۔ اِسی طرح کوئی دوسرا شخص باغ لگا دے تو وہ بھی وقف ہی ہوگا؛ البتہ اگر اِجازت سے لگایا ہے تو باغ کا صرفہ اُس کو دیا جائے گا، اور اگر اُس وقت نہ دیا جاسکے تو باغ کی آمدنی سے رفتہ رفتہ اَدا کیا جائے گا۔ اور اگر بلا اِجازت لگایا ہے تو چوں کہ اُس کی حیثیت غاصب جیسی ہے، تو اُس کو درختوں کے اُکھاڑنے کا حکم دیا جائے گا۔ اور درختوں کے اکھاڑنے میں گڈھوں وغیرہ سے اگر زمین وقف کو نقصان پہنچے تو درختوں کی قیمت دی جاسکتی، مگر اِس اندازے سے کہ جو اکھاڑنے کے بعد ان درختوں کی قیمت ہوتی ہو۔

قال في الفتاویٰ الهندية: متولي وقف بني في عرصة الوقف فهو

للوقف أن بناه من مال الوقف أو من مال نفسه، ونواه للوقف أو لم ينو شيئًا، وإن بنى لنفسه وأشهد عليه كان له والأجنبي إذا بنى ولم ينو فله ذٰلک، وكذا الغرس. (الفتاویٰ الهندية ٤١٦/٢، شامي ٤٥٥/٤ كراچی)

وقال في رد المحتار: اعلم أن عمارة الوقف بإذن متوليه ليرجع بما انفق يوجب الرجوع باتفاق أصحابنا – إلیٰ أن قال – إذا كان يرجع معظم العمارة إلى الوقف. (شامي ٤٤٠/٤ كراچی)

وقال في الفتاویٰ الهندية: إن كانت الزيادة مالاً متقومًا كالبناء والشجر يؤمر الغاصب برفع البناء وقلع الأشجار ورد الأرض وإن لم يضر ذٰلک بالوقف، وإن كان أضر بالوقف بأن خرب الأرض بقلع الأشجار وال...... برفع البناء لم يكن للغاصب أن يرفع البناء أو يقلع الشجر إلا أن القيم يضمن قی مة الغراس مقلوعًا، وقيمة البناء مرفوعًا إن كان للوقف غلة في يد المتولی، يكفي لذٰلک الضمان، وإن لم يكن للوقف غلة يواجر الوقف فيعطي الضمان من ذٰلک، ملخصًا. (الفتاویٰ الهندية ٤٤٧/٢ كوئٹه)

غیر منقسم کا وقف صحیح ہے۔

كما في الفتاویٰ الهندية في فصل وقف المشا ع أن المتأخرين أفتوا بقول أبي يوسف أنه (أي الوقف المشا ع) يجوز، وهو المختار. (الفتاویٰ الهندية ٤٦٥/٢ كوئٹه)

اَولادِ ذکور کو نہ دینے کی صورت میں جائز وارثوں کو محروم کر دینے کا گناہ تو یقیناً ہوگا، مگر وقف صحیح ہو جاتا ہے۔

قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه عليه وسلم: لا حبس عن فرائض اللّٰه تعالیٰ. (الهداية ٦٣٧/٢) واللہ اعلم بالصواب

کتبہ: محمد میاں عفی عنہ

۷؍ ذی قعدہ ۱۳۶۱ھ

دہلی کے زمانۂ قیام میں فقہ وافتاء میں مشغولیت

۱۳۶۶ھ میں آپ نے جمعیۃ علماء ہند کی نظامت کے تقاضوں کی بنا پر مرادآباد کے بجائے دہلی میں رہائش اختیار کرلی؛ لیکن علمی سلسلہ وہاں بھی برقرار رہا، خاص طور پر ’’مدرسہ اَمینیہ‘‘ سے منسلک ہونے کے بعد وہاں کے شعبہ اِفتاء کی ذمہ داری بھی آپ بحسن وخوبی بجالانے لگے۔ اِس دور کے دو اَہم استفتاء درج ذیل ہیں، جن کا تعلق جدید مسائل سے ہے، جو برائے اِفادہ ذیل میں درج کئے جارہے ہیں:

انگلینڈ میں ذبح خانہ کا طریقہ اور ذبیحہ کے متعلق سوال وجواب

سوال:- کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیانِ شرع متین مسائل ذیل میں کہ: یہاں انگلینڈ میں گائے بکری بھیڑ وغیرہ کو مذبح خانہ کے علاوہ دوسری جگہ ذبح کرنا قانوناً ممنوع ہے۔ یہاں مذبح خانہ کے مالک مذہب کی رو سے عیسائی ہوتے ہیں۔ مذبح خانہ کا دستور ہے کہ جانور ذبح کر کے کھال اُدھیڑ کر سرا وجھڑی آنتیں وغیرہ نکال کر اچھی طرح پانی سے دھوکر ذبح کیا ہوا جانور ’’فریزر‘‘ یعنی ٹھنڈے کمرہ میں لٹکا دیا جاتا ہے؛ تاکہ ٹھنڈ کی وجہ سے گوشت سخت ہوجائے، اور ٹکڑے کرنے میں سہولت ہو، اور گوشت میں صفائی اچھی آئے، فریزر میں رکھنے کی اس وجہ سے ضرورت پڑتی ہے کہ یہاں کے جانوروں میں چربی بہت زیادہ ہوتی ہے، اگر گوشت فریزر میں نہ رکھا جائے تو چربی کی وجہ سے ٹکڑے کرنے اور چھوٹی بوٹیاں بنانے میں بڑی دقت کا سامنا ہوتا ہے۔ بکری بھیڑ کو تقریباً چھ سات گھنٹے اور گائے بیل کے گوشت کو تقریباً دس بارہ گھنٹے فریزر میں رکھتے ہیں۔ فریزر مذبح خانہ ہی میں ہوتا ہے۔

(ا) اَب سوال یہ ہے کہ یہاں مسلمان قربانی کا جانور مذبح خانہ میں اپنے ہاتھ سے ذبح کر کے نیز مسلمان دوکاندار اپنے ہاتھ سے ذبح کرنے کے بعد کھال اُدھیڑنے اور آلائش وغیرہ نکال کر پانی سے اچھی طرح دھونے کے بعد اپنا مخصوص نشان لگا کر یا اپنا نام گوشت پر لکھ کر اُسی مذبح خانہ کے فریزر میں چھوڑ آتے ہیں۔ نیز مذبح خانہ والا بھی اپنی

طرف سے ایک لیبل لگا کر اُس پر ''کوشر'' لکھ دیتا ہے، یعنی اِسلامی طریقے پر ذبح کیا ہوا؛ تا کہ عیسائیوں کے ذبح کیئے ہوئے اور مسلمانوں کے ذبح کیئے ہوئے جانور خلط ملط نہ ہونے پائے۔ نیز مذبح خانہ والے ہمیں یقین دلاتے ہیں کہ چوں کہ یہ مذہبی معاملہ ہے، اس وجہ سے ہم اس میں پوری احتیاط برتتے ہیں۔ اَب یہ گوشت جو چھ سات گھنٹے یا دس بارہ گھنٹے مسلمانوں کی نظروں سے غائب رہا، تو اِس صورت میں یہ گوشت مسلمانوں کو کھانا اَز روئے شرع شریعت مطہرہ جائز ہوگا یا نہیں؟

(۲) مذبح خانہ میں محکمہ حفظانِ صحت کی طرف سے ایک انسپکٹر بھی متعین ہوتا ہے جو جانور ذبح ہونے کے بعد اُس کی کھال اُدھیڑتے اور اُس کی آلائش وغیرہ نکال دینے کے بعد اُس گوشت کی طبی طور پر جانچ پڑتال ہوتی ہے، اگر انسپکٹر کو گوشت میں طبی طور پر کوئی خرابی معلوم ہوتی ہے، تو پورے جانور کا گوشت فیل کر کے ردّی میں پھینک دیتا ہے، اور قربانی کرنے والے کو ایک بوٹی بھی نہیں ملتی۔ اَب اگر محکمہ ہیلتھ والے پورا جانور فیل کر کے اُس کا گوشت فیل کر کے ردی میں پھینک دیں تو مذبح خانہ والا کبھی دوسرا جانور دیتا ہے اور کبھی کچھ کم وبیش قیمت واپس کر دیتا ہے، اور کبھی کچھ بھی نہیں دیتا ہے۔ مذبح خانہ والا دوسرا جانور یا قیمت اس وجہ سے دیتا ہے کہ جانور اُسی سے خریدا ہوا ہوتا ہے، بدلے میں دوسرا جانور یا قیمت دینا نہ دینا اُس کی مرضی کی بات ہے، ہمیں جبراً مانگنے کا کوئی حق نہیں ہوتا؛ کیوں کہ خریدتے وقت کوئی شرط نہیں ہوتی، اور گوشت کو فیل کرنے والا بھی محکمہ ہیلتھ کا آدمی ہوتا ہے، نہ کہ مذبح خانہ والا کہ جس سے ہم نے جانور خریدا ہے۔

اَب سوال یہ ہے کہ فیل شدہ گوشت کے بدلے میں مذبح خانہ والا دوسرا جانور یا قیمت واپس دیدے، تو اُس کا لینا جائز ہے یا نہیں؟ کیوں کہ جانور خریدتے وقت نیز ذبح کرتے وقت اُس جانور میں کوئی شرعی نقص نہیں تھا، اس لئے قربانی تو صحیح ہوگئی، اَب جو جانور یا قیمت واپس دیتا ہے تو اُس کا گوشت کھانا یا اُس کی قیمت کو اپنے خرچ میں لینا اَز روئے شرع جائز ہے یا نہیں؟ اگر جائز ہے تو کیوں؟ اور اگر ناجائز ہے تو پھر اُس کا مصرف کیا ہوگا؟

(۳) قربانی کا جانور خریدتے وقت یہ شرط کرنا کہ اگر اس جانور کا گوشت محکمہ ہیلتھ والا فیل کردے تو تجھے دوسرا جانور یا قیمت واپس کرنی ہوگی، یہ شرط جائز ہوگی یا نہیں؟ بینوا بالکتاب وتوجروا بیوم الحساب۔

نوٹ:- جس جانور کا گوشت محکمہ ہیلتھ انسپکٹر فیل کرتا ہے، اس کے بدلے میں مذبح خانہ کا مالک قربانی کرنے والے کو دوسرا جانور یا قیمت دیتا ہے، یہ اِس لئے دیتا ہے کہ دوسری دفعہ بھی یہ ہم سے جانور خریدتے رہیں، نیز اس نے جس سے یہ جانور خریدے ہوتے ہیں، اُن کو اتنی رقم جبراً کم دیتا ہے، اِس طرح جبر کرکے اگلے جانور کے مالک کو جبراً قیمت کم کرکے وہ اتنی رقم قربانی کرنے والوں کو دے دئے، تو یہ لینا جائز ہے یا نہیں؟ بینوا وتوجروا۔

الجواب:- (۱) قطعاً جائز ہے، نگاہوں سے غائب ہونے کی صورت میں ناجائز اُس وقت ہوتا ہے جب یہ خدشہ ہو کہ اصل ذبیحہ نہیں رہا، یا اُس کی جگہ ناجائز ذبیحہ بدل گیا ہے، اور اِس خدشہ کی موجودگی میں ہندو یا مجوسی کا قول معتبر نہیں ہوگا؛ کیوں کہ دیانات (حلال و حرام) کے بارے میں کافر کا قول معتبر نہیں ہوتا۔

من اشتریٰ لحمًا فعلم أنه مجوسي وأراد الرد، فقال: ربحه مسلم كره أكله، تحت قول صاحب الدر أو قال: اشتريته من مجوسي فيحرم.
(شامي / كتاب الحظر والإباحة ۳۰۱/۱)

مگر صورتِ مسئولہ میں یہ خدشہ اِس لئے نہیں کہ خود آپ کی علامت موجود ہے، جس کی بنا پر آپ کو یقین ہے کہ ذبیحہ وہی ہے بدلا نہیں ہے۔ علاوہ اَزیں مذبح والا ہندو یا مجوسی نہیں، جس کا ذبیحہ حرام ہوتا ہے؛ بلکہ کتابی ہے جس کا ذبیحہ جائز ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں اگر کوئی وہم ہو تو وہ قابل اعتبار نہیں ہے۔ "**لأن اليقين لا يزول بالشك**".

چناں چہ ایک سوال کے جواب میں حضرت مولانا عبدالحئ رحمۃ اللہ علیہ فرنگی محلی نے تحریر فرمایا ہے: "ہرگاہ یہ امر یقیناً معلوم ہے کہ اس مقام پر بجز مسلمان کے کوئی ذبح نہیں کرتا، ایسی صورت میں کافر کی دوکان سے گوشت خریدنا اور اُس کا کھانا حلال ہے۔ الاشباہ

وغیرہ میں ہے: ''**الیقین لا یزول بالشک**''۔(فتاویٰ مولانا عبدالحیؒ ۱۴-۱۵)

حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ رحمۃ اللہ علیہ مفتی اعظم ہند کا فتویٰ جو اُن کے خلف رشید مولانا حفیظ الرحمٰن صاحب واصف مہتمم مدرسہ امینیہ کے ذریعہ حاصل ہوا ہے، وہ بھی اس کی تائید کرتا ہے۔فتویٰ یہ ہے:

''جب کہ گمان غالب اِس بات کا ہو کہ ذبیحہ مسلمان کا ہی ہے، اور غیر مسلم کو ذبح کرنا قانوناً ناجائز ہو، ذابح صرف مسلمان مقرر ہو تو ایسے گمان غالب کی صورت میں غیر مسلم بیچنے والے سے گوشت خرید لینا جائز ہے''۔

بہر حال اِن دونوں بزرگوں کے فتویٰ سے اِس بات کی تائید ہوتی ہے کہ جو صورت آپ کے یہاں ہے کہ مسلمان نے ذبح کیا ہے اور آپ کو اپنی علامت اور مذبح کے مقررہ قوانین غیرہ کی بنا پر یقین ہے کہ اس میں تبدیلی نہیں ہوئی ہے، تو اِس صورت میں اُس گوشت کا کھانا جائز ہے، دوسرے اِحتمالات کی بنا پر اُس کے کھانے کو ناجائز نہیں کہا جاسکتا۔

(۲) خرید لینے، قیمت اَدا کردینے اور اپنے قبضہ میں لے لینے کے بعد یہ جانور آپ کی ملک ہو چکا، بائع سے اِس کا تعلق نہیں رہا۔ اِس میں کوئی شرعی نقص بھی نہیں ہے، جس کی بنا پر رد بالعیب کی شکل نہیں نکل سکتی، اور اگر بالفرض کوئی نقص یا عیب اُس میں تھا تو جب آپ اُس کو ذبح کر چکے تو رد بالعیب کا حق بھی ختم کر چکے۔ اَب محکمہ ہیلتھ کا جو کچھ فعل ہے وہ آپ کی ملک پر آپ کے حق میں ہے، آپ کوئی مطالبہ اگر کر سکتے ہیں تو اُس فیل کرنے والے سے، بائع سے مطالبہ کرنا شرعاً بے محل ہے۔ اِس مطالبہ کی بنا پر اگر کچھ حاصل ہوتا ہے تو وہ بھی غلط ہے، اُس کو واپس کر دینا چاہئے۔

اگر آپ کی کسی قسم کی طلب کے بغیر وہ بائع از خود آپ کی دلداری کے لئے دیتا ہے تو اگرچہ احتیاط یہی ہے کہ اُس کو نہ لیا جائے؛ لیکن اگر بطور عطیہ لے لیا جائے، تو عطیہ کو آپ کسی بھی مصرف میں صرف کر سکتے ہیں۔

(۳) جائز نہیں ہوگا۔

نهىٰ رسول الله صلى الله عليه وسلم عن بيع و شرط.

نوٹ:- مذبح خانہ کا مالک ایسے جانور کی قیمت جس کے گوشت کو انسپکٹر نے فیل کر دیا ہے، بیچنے والے سے وصول کرتا ہے یا کچھ کم کرتا ہے، تو اُس کا یہ جبر شرعی اُصول کی بنا پر ناجائز ہے۔

اِس طرح حاصل کردہ رقم غصب کا درجہ رکھتی ہے، مسلمان خریدار کو جب مطالبہ ہی کا حق نہیں رہا تھا تو اس جبری رقم کا وصول کرنا یا اُس میں حصہ دار بننا بھی اُس کے لئے جائز نہیں۔ واللہ اعلم بالصواب

العبد الضعیف: محمد میاں غفرلہ

جمادی الاولیٰ ۱۳۹۳ھ (بشکریہ: ماہنامہ دارالعلوم اگست ۱۹۷۳ء)

انگلینڈ میں مشتبہ لاشوں کے متعلق طریقہ اور دستور العمل

سوال:- کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیانِ شرع مسائل ذیل میں کہ: یہاں انگلینڈ میں جب کسی کا انتقال ہوتا ہے تو اگر اُس پر پولیس والوں کو شبہ ہو جائے کہ یہ اپنی قدرتی موت سے نہیں مرا ہے؛ بلکہ اُس کو کسی نے مار ڈالا ہے، یا اُس نے خودکشی کی ہے، اِن صورتوں میں پولیس لاش کو اپنے قبضہ میں لے لیتی ہے، اور اُس لاش کو فریز میں یعنی برف جیسی ٹھنڈی جگہ میں رکھ دیتے ہیں، یہاں تک کہ اُس میت کے بارے میں پولیس والے اپنی تفتیش پوری نہ کر لیں، اور اس تفتیش میں کبھی ایک مہینہ اور کبھی دو تین مہینے بھی گذر جاتے ہیں، اور اس دو تین مہینے کے طویل عرصہ کے دوران یہ لاش بلا غسل اور بلا نماز جنازہ کے اس فریز میں برف کے مانند پڑی رہتی ہے، اگر فریز میں نہ رکھی جائے تو اتنے عرصہ میں لاش پھول جائے اور پھٹ جائے۔ اور فقہ کی کتابوں میں لکھا ہے کہ جب لاش پھول جائے یا پھٹ جائے تو اُس پر نماز جنازہ جائز نہیں ہے، اور باوجود فریز میں رکھنے کے لاش خراب اور بوسیدہ تو ہی جاتی ہے؛ لیکن فریز میں ٹھنڈک کی وجہ سے برف کی طرح جمی رہتی ہے، اور یہ تجربہ ہو گیا ہے کہ جب تین مہینے کے بعد فریز سے نکالی گئی تو اتنی بوسیدہ ہو گئی کہ پانچ منٹ بعد اُس لاش کو ہاتھ بھی نہیں لگا سکتے، اِس وجہ سے اُسے غسل دینا تو کسی صورت میں ممکن ہی نہیں، ہاں تیمّم کرا سکتے

ہیں؛ لیکن وہ بھی صحیح طور سے نہیں؛ کیوں کہ اگر ہاتھ ذرا دبا کر پھیرا جائے تو کھال مع گوشت کے چورا چورا ہو جائے۔ ایسے واقعات یہاں دو تین ہو چکے ہیں، تو مذکورہ صورت میں اتنی طویل مدت کے بعد اُس لاش پر نماز جنازہ پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟

(۲) ایسے میت کی لاش کے بارے میں پولیس والوں سے یہ کہہ کر کہ ہمارے مذہب میں میت کو غسل دینا اور نماز جنازہ پڑھنا ہم پر ضروری ہے، اگر غسل نہ دیا جائے اور نماز جنازہ نہ پڑھی جائے تو بستی کے سارے مسلمان گنہگار ہوتے ہیں، اور دو تین مہینے کے بعد نماز جنازہ پڑھنا مذہب کی رو سے جائز نہیں ہے؛ لہٰذا لاش ہمیں دے دو، ہم اسلامی طور پر غسل دے کر نماز جنازہ پڑھ کر لاش تمہارے سپرد کر دیں گے، اِس پر پولیس والے راضی ہو کر لاش اِس شرط پر ہمیں دے دیں، اور ہم لوگ اُس کو غسل دے کر اور نماز جنازہ پڑھ کر لاش پھر پولیس والوں کے سپرد کر دیں، اور پھر تفتیش پوری ہونے کے بعد جب لاش ہمیں دے دیں تو ہم اُسے دفن کر دیں تو ایسا کرنا اَز روئے شریعت جائز ہے یا نہیں؟

(۳) یہاں بیشتر لاشوں کا پوسٹ مارٹم کیا جاتا ہے، اِس پوسٹ مارٹم کے بعد اُس لاش میں سے خون نکلتا رہتا ہے، اور بعد غسل کے کفن بھی خون آلود ہو جاتا ہے، جس سے کفن ناپاک ہو جاوے، اور میت پر نماز صحیح ہونے کے لئے کفن کا پاک ہونا بھی شرط ہے، تو ایسے خون آلود کفن والے میت پر نماز جنازہ جائز ہے یا نہیں؟ اگر جائز نہ ہو تو کیا خون بند ہونے کا انتظار کیا جائے یا نہیں؟ کیوں کہ انتظار کرنے کی صورت میں میت کے دفن کرنے میں ایک دو روز کی تاخیر ہو جاتی ہے، تو کیا دفن کرنے میں ایک دو روز کی تاخیر کی جائے؟ بینوا وتو جروا۔

الجواب:- (۱) جس مردہ کو نماز پڑھے بغیر دفن کر دیا گیا ہے، اُس کے متعلق حکم یہ ہے کہ جب تک غالب گمان یہ ہے کہ لاش پھٹی نہیں ہے، اور اُس کے اَعضاء الگ الگ نہیں ہوئے ہیں، اُس وقت تک اُس کی قبر پر نماز پڑھی جا سکتی ہے، اور جب غالب گمان یہ ہو جائے کہ اُس کی لاش پھٹ کر اُس کے اعضاء بکھر گئے ہیں، تو اُس پر نماز جنازہ جائز نہیں رہتی، اِس کے لئے کسی مدت کی حد نہیں ہے۔ اگر آب و ہوا اور زمین کی نوعیت ایسی ہے کہ ایک ماہ بعد

بھی غالب گمان یہی ہے کہ لاش پھٹی نہیں ہے، تو ایک ماہ بعد بھی نماز پڑھی جاسکتی ہے، یہاں لاش سامنے ہے، اور پھٹی نہیں تو اُس پر نماز پڑھ سکتے ہیں، خواہ کتنے ہی دن گذر جائیں۔

وإن دفن بغير صلاةٍ صلي علىٰ قبره ما لم يدر على الظن تفسخه. (تنوير الأبصار، رد المحتار ٨٢٧/١)

من غير تقدير هو الأصح (الدر المختار) لأنه يختار باختلاف الأوقات حرًا وبردًا، والميت ...... وهزالاً، والأمكنة (بحر) وقيل يقدر بثلاث أيام وقيل عشرة وقيل شهرًا. (رد المحتار ٨٢٧/١)

وتفسخ أي تعزقت أعضاءه عضوًا عضوًا. (رد المحتار / فصل فی البير ١٩٥/١)

یہاں جب لاش سامنے ہے اور ظن غالب نہیں؛ بلکہ مشاہدہ ہے کہ وہ پھٹی نہیں ہے، تو اُس پر نماز جنازہ پڑھی جاسکتی ہے، خواہ کتنے ہی دن گذر گئے ہوں۔

(۲) جائز ہے۔ اھون البلیتین یہی ہے کہ جہاں تک امکان میں ہے اپنے فرض سے جلد سے جلد فراغت ہوجائے۔

قال في الدر المختار: يسرع في جهازه. (رد المحتار ٨٩٩/١)

(۳) غسل دینا اور پاک کفن پر کفنانا ضروری ہے، غسل دینے اور کفنانے کے بعد نجاست خارج ہو یا خون بہے، جس سے کفن ناپاک ہوجائے تو مجبوری ہے، اِسی حالت میں اُس پر نماز پڑھ لی جائے گی۔

إذا تنجس الكفن بنجاسة الميت لا يضر دفعًا للحرج، بخلاف الكفن المتنجس ابتداءً، وكذا لو تنجس بدنه بما خرج منه إن كان قبل أن يكفن غسل وبعده لا. (رد المحتار ٢١٢/١) واللہ اعلم بالصواب

کتبہ العبد الضعیف:

محمد میاں عفی عنہ

بشکریہ: ماہنامہ دارالعلوم ستمبر ۱۹۷۳ء

اِس کے علاوہ بھی بہت سے فتاویٰ اور فقہی مضامین ہفت روزہ ''الجمعیۃ'' اور ''رسالہ دارالعلوم دیوبند'' میں شائع شدہ ہیں۔

اِدارۃ المباحث الفقہیہ جمعیۃ علماء ہند

آپ نے نئے پیش آمدہ فقہی مسائل پر اجتماعی غور وفکر کے لئے ۱۹۷۰ء میں جمعیۃ علماء ہند کے ماتحت ''اِدارۃ المباحث الفقہیہ'' قائم فرمایا، اور آپ کے دور نظامت میں رویت ہلال، حق تصنیف، اور کوآپریٹیو سوسائٹیوں کے مسائل پر تحقیق و تنقیح کا کام ہوا، اور رویت ہلال کے موضوع پر ۱۹۷۲ء میں باقاعدہ اجتماع بھی ہوا، جس میں رویت ہلال کے شرعی اُصول وضوابط تیار کئے گئے، جو الگ سے شائع کئے گئے ہیں، اور آج کل ملک کی تقریباً سبھی رویت ہلال کمیٹیاں اُنہی اُصول کی روشنی میں چاند کا اعلان کرتی ہیں۔ الحمدللہ آج بھی یہ شعبہ سرگرم عمل ہے، جس کے اَب تک مختلف عنوانات پر ۱۴/ اِجتماعات منعقد ہوچکے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ حضرت سید الملتؒ کی پوری زندگی علمی مشاغل اور ملی خدمات میں گذری، جو ہم سب کے لئے بہترین نمونہ اور مشعل راہ ہے۔

اللہ تعالیٰ حضرت مرحوم کی خدمات کو بے حد قبول فرمائیں، درجات بلند فرمائیں، اور بعد میں آنے والے حضرات کو اُن کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائیں، آمین۔

❍❖❍

مسلمانانِ ہند:
مولانا سید محمد میاں صاحبؒ کا
فقہی موقف اور اس کی معنویت

از: مفتی عطاء اللہ قاسمی مدرسہ ضیاء العلوم پورہ معروف

مولانا سید محمد میاں صاحبؒ کے رسالہ ''ہم اور ہمارے وطن کی شرعی حیثیت اور ترک وطن کا شرعی حکم'' (مطبوعہ ماہنامہ دارالعلوم ۱۹۵۲ء) میرے اس مقالے کی بنیاد ہے، بعد میں یہ الجمعیۃ بکڈ پو سے کتابچہ کی شکل میں بھی شائع ہوا۔ عطاء اللہ قاسمی

حضرت مولانا سید محمد میاں صاحبؒ دیوبند کی اس خاک سے پیدا ہوئے، جس نے ایک سے بڑھ کر ایک نائب رسول، علماء فحول، محدث، مفسر، فقیہ اور مجاہد پیدا کیے۔ سید صاحب ہماری اس دنیا میں ۱۹۰۳ء میں اسی طرح آئے تھے، جس طرح دو لاکھ بچے اسی دن پیدا ہوئے تھے، جو خداداد ذہانت وفطانت، ذکاوت وانفرادیت اور بے پناہ جد وجہد اپنے ساتھ لائے تھے۔ چنانچہ ۱۹۲۵ء میں دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد درس وتدریس، فقہ وفتاویٰ، تصنیف وصحافت کے ساتھ ساتھ ملکی وملی سرگرمیوں کے میدان میں قدم رکھا تو ان کی شخصیت کا پرچم اڑتا چلا گیا، پھر تو ''جامع الجہات'' شخصیت کا لقب بجا طور سے ان کی ذات پر چست اور درست ہو گیا۔

مولانا سید محمد میاں صاحبؒ کا خمیر جن عناصر سے اٹھایا گیا تھا، ان میں ملی ودینی غیرت وحمیت، تاریخ اسلام پر گہری نظر، پختہ سیاسی شعور اور فقہی بصیرت نمایاں عنصر ہیں۔ جمعیۃ علماء ہند سے وابستگی ان کے سیاسی شعور کی پختگی کی دلیل اور اس کی نظامت دینی غیرت وحمیت کا ثبوت ہے۔ ''تاریخ اسلام''، ''علماء ہند کا شان دار ماضی'' اور ''علماء حق'' جیسی کتابیں ان کی تاریخی نظر وفکر کی شاہد عدل ہیں تو ادارۂ مباحث فقہیہ ان کی فقہی بصیرت و

مہارت کا گن گا تا رہے گا۔

فقہ اور تفقہ:

قرآن کریم ازلی اور ابدی علوم ومعارف کا موجد ومخزن ہے، حدیث شریف بہت جامع اور تہہ دار علم ہے، انسانی معاملات سب سے پیچیدہ اور بہت متنوع فن ہے، منطق و فلسفہ قائل اور معقول کرنے کا اچھا گُر ہے۔ اگر ان پھولوں کو کسی آبگینے میں نچوڑ دیا جائے تو امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ، ابن تیمیہؒ، شاہ ولی اللہؒ اور قاسم نانوتویؒ کا تفقہ صاف نظر آئے گا۔ دارالعلوم دیوبند اسی تفقہ اور فکر وفن کا امین اور ترجمان ہے۔ مولانا سید محمد میاں صاحبؒ دارالعلوم کے ساختہ وپرداختہ ہیں، انھیں اس تفقہ میں درک اور کمال حاصل تھا۔

تاریخی تجزیہ:

ہمارے اسلاف کرام کا وہ قافلہ جس نے سب سے پہلے سرزمین ہند پر قدم رکھا اور گنگا کے مقدس پانی سے وضو کر کے پہلا سجدہ کیا تو اس دھرتی نے ان کے پاؤں پکڑ لیے، تو انھوں نے یہاں اپنا سامان سفر کھول دیا اور اقامت گزیں ہو گئے، پھر تو کابل وقندھار سے لے کر برما اور اراکان تک، کشمیر کی حسین وادیوں سے لے کر کنیا کماری تک ان کی جواں مردی اور اولوالعزمی، صداقت وامانت اور سیادت وقیادت کا ڈنکا بجنے لگا، تا آنکہ مئی ۱۸۵۷ء میں بہادر شاہ ظفر کی گرفتاری کے ساتھ ہی ان کے جاہ وجلال کا سورج روپوش ہو گیا، ان کی عظمت وشوکت کا پھریرا زمین بوس ہو گیا، مسلمان انگریزوں کے غلام اور محکوم ہو گئے، خون کے دریا میں ڈوب گئے۔

ہماری بے بسی اور بے چارگی بڑھتی ہی جا رہی تھی کہ رحمت حق کو جوش آ گیا، ملاء اعلیٰ میں آزادی کا فیصلہ ہوا تو قدرت نے شاہ عبدالعزیز جیسا دور اندیش، حاجی امداد اللہ جیسا سپہ سالار، شیخ الہند جیسا مدبر، ابوالکلام جیسا ہوش مند اس سرزمین کو عطا کر دیا۔ انھوں نے آنکھیں کھولیں، حالات کا گہرا جائزہ لیا، پھر شریعت الٰہی کی روشنی مین راہِ عمل طے کی اور اس پر چل پڑے۔ پھر تو جیل کی سلاخیں، توپوں کے دہانے، گولیوں کی بوچھار اور بیڑیوں کی

جھنکار بھی ان کا راستہ نہ روک سکیں اور وہ لوگ اس شان سے آگے بڑھتے رہے کہ سارا زمانہ ان کے ساتھ نعرہ زن ہوگیا؛ حتیٰ کہ انگریزوں کو بھاگنا پڑا اور برصغیر ہی نہیں، پورے ایشیا و افریقہ میں آزادی کی لہر چل پڑی۔

ایک اہم سوال:

جدوجہدِ آزادی کے اس دور میں مسلمانانِ ہند کے تعلق سے کئی سوالات زیرِ بحث آئے، ان میں سب سے اہم مسئلہ یہ تھا کہ ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستانی مسلمان اور خود ہندوستان کی فقہی و شرعی حیثیت کیا بنتی ہے؟ اور کیا ہونی چاہیے؟ اس موضوع پر سب سے مفصل اور مدلل بحث جس ہستی کی طرف سے سامنے آئی، وہ حضرت مولانا سید محمد میاں صاحبؒ کی ذات گرامی ہے۔ آپ نے اسلامی ہند کی پوری تاریخ کا بے لاگ اور غیر جانب دارانہ تجزیہ کیا اور اس کی روشنی میں جچی، تلی فقہی رائے کا اظہار کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت جیسے اساطینِ علم وفن اور ماہرینِ فقہ وفتاویٰ کو حق پہنچتا ہے کہ اس نازک اور اہم موضوع پر خامہ فرسائی کریں۔ ہم اس موضوع پر حضرت کی تحریر کا ایک اختصار پیش کرنے کی کوشش کریں گے۔

مولانا سید محمد میاں صاحبؒ کا موقف:

حضرت کا موقف یہ ہے کہ

”ہندوستان پہلے دارالاسلام تھا؛ لیکن ۱۸۵۷ء کے بعد دارالامان ہوگیا اور آزادی کے بعد اس کی یہ حیثیت اور مستحکم ہوگئی۔“

اس سلسلے میں حضرت نے ہندوستان سے متعلق دو ایسے فتاویٰ کا تنقیدی جائزہ لیا ہے، جس میں ہندوستان کو دارالحرب کہا گیا ہے۔ تنقید کا لب ولہجہ خالص علمی اور منطقی ہے اور اسی ضمن میں بحث کو اس انداز سے آگے بڑھایا کہ ان کا موقف خود بخود واضح ہوگیا ہے۔ حضرت لکھتے ہیں:

”(۱) ۱۸۰۶ء میں دہلی پر قبضہ کرنے کے بعد اگرچہ انگریزوں نے بساطِ سیاست پر

شاہ عالم کو ایک تاج دار کی حیثیت سے نمایاں کیا اور مملکت اور حکومت میں ایک عجیب و غریب تقسیم کر کے اعلان کیا کہ ''ملک بادشاہ کا اور حکم انگریز بہادر کا''، اس بنا پر کچھ علما کو یہ خیال بھی ہوا کہ ہندوستان بدستور دارالاسلام ہے؛ مگر اس زمانے کے فقیہ اعظم عالم ربانی حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کی ایمانی فراست وحمیت اور آپ کی دقیقہ رس بصیرت اس سیاسی شعبدہ کی حقیقت سے واقف تھی، آپ نے فتویٰ صادر کیا کہ ہندوستان دارالحرب ہوگیا ہے۔

(۲) ۱۸۵۷ء کے بعد امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے استفسار کیا گیا تو آپ کا جواب بھی یہی تھا۔

ان دونوں فتاویٰ میں اگرچہ نصف صدی سے زائد کا فصل ہے؛ لیکن ہندوستان کی سیاسی حیثیت میں اگر کچھ فرق واقع ہوا تو صرف یہ کہ انگریزی اقتدار حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے دور میں ابتدائی مراحل طے کر رہا تھا اور ۱۸۵۷ء کے بعد وہ عروج واستحکام کے آخری نقطہ پر پہنچ گیا تھا۔ یعنی باہر کی غیر مسلم طاقت جس نے ہندوستان سے مسلم اقتدار کو ختم کیا تھا، جو لامحالہ حربی طاقت تھی، اس کا تسلط ہندوستان پر روز افزوں ہوتا رہا؛ لہٰذا ہندوستان بدستور دارالحرب رہا۔''

نقد ونظر:

ان فتاویٰ میں ہندوستان کو دارالحرب کہا گیا ہے؛ لیکن ہجرت کا حکم نہیں دیا گیا ہے؛ اسی لیے مولاناؒ نے اسے لفظی دارالحرب پر محمول کیا ہے، حقیقی معنی پر نہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

> ''چونکہ ان بزرگوں کی کوشش یہ رہی کہ اس جابر وقاہر اقتدار کو ہندوستان سے ختم کیا جائے تو لفظی معنی کے لحاظ سے ہندوستان دارالحرب بنا ہوا تھا، فرق صرف یہ ہوا کہ ۱۸۵۷ء تک یہ حرب اسلحہ سے رہی اور اس کے بعد اسلحے ضبط کر لیے گئے؛ لیکن مجاہدینِ حریت کے جذبات اور ان کے جنگی منصوبوں کو ضبط نہ کیا جاسکا اور وہ لوگ امکانی حدود میں مصروفِ پیکار رہے۔''

اس سے منطقی پیرایہ اختیار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''انگریزی اقتدار، اس کے جابرانہ تسلط اوراس کی اسلام کش کارگزاریوں کے لحاظ سے ہندوستان یقیناً دارالحرب تھا؛ لیکن ایک دوسرا سوال بھی قابل توجہ تھا: وہ یہ کہ خود ہماری حیثیت کیا ہے؟ اور باشندگانِ وطن کا لحاظ کرتے ہوئے ہمارا ملک کیا حیثیت اختیار کرتا ہے؟ آیا ہم حربی ہیں؟ اگر ہم حربی ہیں تو کیا مسلمان حربی ہوا کرتا ہے؟ اور پھر ہماری جنگ کس مسلم ملک سے ہے کہ ہم اپنے آپ کو حربی تصور کریں؟ اگر ہم حربی نہیں ہیں تو کیا ہم مستامن ہیں؛ مگر اصطلاح فقہ میں مستامن وہ ہوگا جو اس ملک کا باشندہ نہ ہو، ہم جب ہندوستان کے باشندے ہیں، ہندوستان ہمارا وطن ہے تو کیا کسی ملک کا اصل باشندہ خود اپنے وطن میں مستامن ہوسکتا ہے؟ کیا ہم مستضعفین ہیں؟ لیکن ہم مستضعفین کے زمرے میں اس وقت داخل ہوسکتے ہیں، جب معاذ اللہ نماز، روزہ، جمعہ اور عیدین وغیرہ شعائرِ اسلام سے محروم ہوجائیں۔''

ان فتاویٰ پر نقد کرتے ہوئے ایک اہم نکتہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جن باتوں کے ثابت ہونے پر بقول امام اعظم (۱) دارالاسلام، دارالحرب بن جاتا ہے، وہ تمام باتیں بھی اس دور میں مشکوک تھیں۔ کیوں کہ حکومت کا کوئی قانون یا حکم بھی عیسائیت کی بنیاد پر نہیں ہوتا تھا۔ لہٰذا ظہور احکام الکفر کی شرط مشتبہ اور مشکوک ہوگئی۔ (۲) پورا ہندوستان ایک ملک تھا اور اس کا اتصال افغانستان اور ایران سے تھا، جو اس تمام عرصے میں دارالاسلام رہے۔ (۳) بیشک وہ امن جو اقتدار کے باعث ہونا چاہیے تھا، وہ نہیں تھا؛ لیکن مسلمان ہونے کی بنا پر کوئی خطرہ بھی نہیں تھا، لہٰذا یہ شرط بھی ایک حد تک مشتبہ ہوگئی۔''

آگے حضرت مولانا علی سبیل الترقی ارشاد فرماتے ہیں:

''اس دور میں مسلمانوں نے اسلامی مدارس، یونیورسٹیاں اور کالج قائم کیے، تبلیغی انجمنیں نہ صرف عیسائیت کا مقابلہ کرتی رہیں؛ بلکہ عیسائی بننے والوں کو دوبارہ اسلام میں داخل کرتی رہیں، عالی شان مسجدیں تعمیر کی گئیں، حتیٰ کہ سرکاری دفاتر، چھاؤنیوں، سکریٹریٹ کے قریب، خود ان کے حلقوں میں مسجدیں تعمیر کی گئیں، انتہا یہ کہ ہمیں اس

کا بھی حق تھا کہ اندرونی معاملات کے لیے ہم پنچایتی نظام قائم کریں۔ چنانچہ امارت شرعیہ، بہار میں قائم بھی کی گئی اور کوشش کی گئی کہ ہم فقہائے کرام کی تصریح کے مطابق اس کو دارالاسلام بنالیں۔''

مولانا میاں صاحبؒ کے دلائل:

بہرحال ان سہولتوں اور رعایتوں کے پیشِ نظر یہ سوال یقیناً جواب طلب تھا کہ ہم اپنے وطن کو کیا کہیں؟ خداوند عالم حضرت الاستاذ علامہ سید محمد انور صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کو جزائے خیر عطا فرمائے، آپ کی دقیقہ رس ذکاوت نے اس طرف توجہ فرمائی اور ۱۹۲۷ء مطابق ۱۳۴۶ھ میں جمعیۃ علمائے ہند کے اجلاس ہشتم کی صدارت فرماتے ہوئے آپ نے واضح فرمایا کہ ہندوستان نہ دارالحرب ہے اور نہ دارالاسلام، بلکہ دارالامن ہے۔ ارشاد ہے:

''مسائل شرعیہ تین قسم کے ہیں: اول وہ جو اسلامی حکومت اور اس کی شوکت کے ساتھ متعلق ہیں۔ دوسرے وہ جو دارالامان کے ساتھ مخصوص ہیں۔ تیسرے وہ جو دارالحرب میں جاری ہوتے ہیں۔

ہندوستان کے موجودہ حالات کو دیکھنا ہے کہ وہ دارالاسلام ہے یا دارالامان یا دارالحرب؟ جہاں تک اصول شرعیہ کا تعلق ہے، زیادہ سے زیادہ اس کو دارالامان کا حکم دیا جاسکتا ہے، دارالاسلام کے احکام جاری ہونے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔''

[خطبۂ صدارت، ص:۴۲، پشاور]

اس کے بعد شاہ صاحبؒ ارشاد فرماتے ہیں:

''ہندوستان کے دارالحرب نہ ہونے کی حالت میں ہمارا فرض ہے کہ ہم دارالامان کے احکام کتبِ مذہب میں تلاش کریں اور ان احکام کی روشنی میں ہندوستانی مسلمانوں کی رہنمائی کا فرض ادا کریں۔''

حضرت شاہ صاحبؒ نے بطور مثال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ معاہدہ پیش کیا ہے، جو آپ نے ابتدائے زمانۂ ہجرت میں مسلمانوں اور یہودِ مدینہ کے درمیان کرایا تھا۔

اس معاہدہ میں فریقین کی مذہبی آزادی کو تسلیم کرتے ہوئے یہ طے کیا گیا تھا کہ دفاع کے وقت یہود اور مسلمان ایک جماعت ہوں گے، ہر فریق پر دوسرے کی ہمدردی لازم ہوگی، دونوں فریق کوشش کریں گے کہ ظلم اور ناانصافی ختم ہو۔''

فقہی ذکاوت:

حضرت مولانا سید محمد میاں صاحبؒ کی فقہی بصیرت و ذکاوت نے علامہ کشمیریؒ کی پیش کردہ اس مثال پر نقد کرتے ہوئے، اس سے بہترین دوسری مثال پیش کی ہے:

''لیکن چونکہ اس معاہدہ میں ایک دفعہ یہ بھی تھی کہ یہود اور مسلمانوں کی باہمی نزاعات کی آخری اپیل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہِ عدالت پناہ میں ہو سکے گی؛ اس لیے ہندوستان کے حالات پر اس معاہدے کو منطبق کرنے میں بعد حضرات کو تأمل ہوسکتا ہے، لیکن اس معاہدے کے علاوہ سیرت مقدسہ کے دوسرے دور بھی ہمارے لیے سبق آموز ہیں۔ مثلاً حیات مقدسہ کے ابتدائی دور میں مکہ معظّمہ کی مختلف جماعتوں میں ایک معاہدہ ہوا تھا، جو'' حلف الفضول'' کے نام سے مشہور ہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اس معاہدہ میں شریک تھے۔ یہ معاہدہ اگرچہ قبل از نبوت ہوا تھا، اس بنا پر اس سے استدلال نہیں کیا جاسکتا؛ مگر نبوت کے بعد جن الفاظ سے آپ اس معاہدہ کی تحسین وتعریف فرمایا کرتے تھے، وہ بموجب روایت ابن ہشام یہ تھے:

ما أحب أن لي حمر النعم ولو أدعى به في الإسلام لأجبت.

[سيرة ابن هشام، ج:١، ص:١٢٤، بيروت]

میں سرخ اونٹوں (قیمتی چیزوں) کے بدلے بھی اس معاہدے سے روگردانی پسند نہیں کرسکتا، اگر اسلام کے دور میں بھی مجھے اس کی دعوت دی جائے تو میں یقیناً اسے منظور کرلوں گا۔

دورِ نبوت میں کسی چیز کی تحسین خود ایک شرعی دلیل ہے اور یہاں تو خود زبانِ نبوت تصریح فرما رہی ہے کہ اگر دورِ اسلام میں اس کی دعوت دی جائے تو میں یقیناً منظور کرلوں گا۔

حضرت مولانا محمد میاں صاحبؒ آخری دلیل کے طور پر تحریر فرماتے ہیں:

''سب دلائل سے بالاتر قرآن حکیم نے ہمارے سامنے ایک روشن اصول پیش فرمادیا ہے، جس کو دارالامان کا دستور اساسی کہا جاسکتا ہے۔ سورۂ ممتحنہ کی مندرجہ ذیل آیت اس اصول کی تلقین کرتی ہے:

لَا یَنْھٰکُمُ اللّٰہُ عَنِ الَّذِیْنَ لَمْ یُقَاتِلُوْکُمْ فِیْ الدِّیْنِ وَلَمْ یُخْرِجُوْکُمْ مِنْ دِیَارِکُمْ اَنْ تَبَرُّوْھُمْ وَتُقْسِطُوْا اِلَیْھِمْ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ ○ اِنَّمَا یَنْھٰکُمُ اللّٰہُ عَنِ الَّذِیْنَ قَاتَلُوْکُمْ فِیْ الدِّیْنِ وَاَخْرَجُوْکُمْ مِنْ دِیَارِکُمْ وَظَاھَرُوْا عَلٰی اِخْرَاجِکُمْ اَنْ تَوَلَّوْھُمْ وَمَنْ یَتَوَلَّھُمْ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الظّٰلِمُوْنَ ○ [سورة الممتحنه:۹/۸]

سیدنا حضرت مولانا شاہ عبدالقادرؒ کے الفاظ میں ان آیات کا ترجمہ یہ ہے:

اللہ تم کو منع نہیں کرتا ان سے جو لڑتے نہیں تم سے دین پر، اور نکالا نہیں تم کو تمہارے گھروں سے، کہ کرو ان سے بھلائی اور انصاف کا سلوک، اللہ چاہتا ہے (محبت کرتا ہے) انصاف والوں کو۔ اللہ تو منع کرتا ہے تم کو ان سے جو لڑے تم سے دین پر اور نکالا تم کو تمہارے گھروں سے، اور میل باندھا تمہارے نکالنے پر، کہ ان سے کرو دوستی، اور جو کوئی ان سے دوستی کرے، سو وہ لوگ وہی گنہگار ہیں۔

یہ آیت صرف ان غیر مسلموں کے ساتھ دوستی کو ممنوع قرار دے رہی ہے جو (الف) دین کے بارے میں جنگ کریں۔ (ب) مسلمانوں کو وطن سے نکالیں۔ (ج) مسلمانوں کو وطن سے نکالنے میں امداد کریں۔ ان کے علاوہ جملہ غیر مسلموں کے بارے میں اجازت دے رہی ہے کہ برّ اور قسط کے اصول پر ان سے معاہدہ کریں، ان کے ساتھ نظام ملکی یا نظام زندگی میں اشتراک و تعاون کریں۔ واللہ اعلم بالصواب

۱۹۴۷ء کے بعد:

حضرت کشمیریؒ کے ارشاد کے مطابق انگریزی دور کو اگر دارالامن کہا جاسکتا ہے تو ۱۹۴۷ء کے انقلاب کے بعد ہندوستان کو بدرجۂ اولیٰ دارالامان کہا جاسکتا ہے؛ کیوں کہ

انگریزی دور میں ہماری مذہبی آزادی انگریز کی عطا کردہ تھی اور اس وقت یہ آزادی کسی کی عطا نہیں؛ بلکہ یہ ہمارا فطری یا وطنی حق ہے۔

ایک شبہ اور اس کا علمی جواب:

یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ دارالامان (سیکولر جمہوری حکومتوں) میں اکثریتی طبقہ کے کچھ لوگ مخصوص تہذیب اور نظریے کو غلبہ دینے اور اسے جاری کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اپنی بالادستی اور برتری ثابت کرنے کے لیے جارحیت سے گریز نہیں کرتے۔ ان حالات میں مسلمانوں کو خاصی ذہنی، جانی اور مالی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ صورتِ حال اس وقت بڑی بھیانک ہو جاتی ہے جب مسلمانوں کی جان و مال اور عزت و آبرو سے کھلے بندوں ہولی کھیلی جاتی ہے تو ایسی صورتِ حال میں ہندوستان کو مسلمانوں کے لیے دارالامان کس طرح کہا جائے؟

حضرت مولانا سید محمد میاں صاحبؒ نے اس کا جو فقہی اور علمی جواب دیا ہے، وہ سیاسی اہمیت کا بھی حامل ہے اور بڑے دوررس اثرات رکھتا ہے۔ موصوف لکھتے ہیں:

''جہاں تک ہندوستان میں ہندو تہذیب کو جاری کرنے کا تعلق ہے تو بے شک ایک تنظیم اور اس سے وابستہ لوگ یہ نعرہ لگاتے ہیں اور عملی اقدام بھی کر گزرتے ہیں؛ لیکن اگر کچھ افراد یا کوئی جماعت ملک کے دستورِ اساسی کے خلاف نعرہ لگائے یا اقدام کرے تو اعتبار دستورِ اساسی کا ہوگا، اس جماعت کے نعروں اور ان کے اقدامات کا اعتبار (دارالامن کی حیثیت معدوم کرنے کے لیے) نہیں ہوگا۔ کیوں کہ اربابِ اقتدار اور اصحاب حل وعقد کے قول و فعل کا اعتبار ہوتا ہے۔

في شرح السير الكبير أن المعتبر في حكم الدار هو السلطان في ظهور الحكم. [ج:٤، ص:١٨]

افراد یا کسی جماعت کے قول و فعل پر پورے ملک کے متعلق فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً کسی ملک سے اگر صلح کا معاہدہ ہوا ہے تو اگر اس ملک کے کچھ آدمی دارالاسلام

میں گھس کر ڈاکہ ڈالیں، قتل وغارت کر جائیں تو اس کو پورے ملک کی طرف سے نقضِ عہد نہیں تصور کیا جاتا ہے:

كما قال في الهداية: إذا دخل جماعة منهم، فقطعوا الطريق ولا منعة لهم، حيث لايكون هذا نقضًا للعهد. [هدايه ثانى باب الموادعه]

مولانا سید محمد میاں صاحبؒ کا پیغام مسلمانانِ ہند کے نام:

اب تک حضرت مولاناؒ کے افکار وخیالات کا جو خلاصہ حضرت کی تحریروں میں پیش کیا گیا ہے، اس سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ حضرت کو فقہ وفتاویٰ، تاریخ وسیرت اور اسلامی سیاست پر کتنا عبور حاصل تھا۔

مذکورہ عنوان کے تحت حضرت نے کچھ نہیں لکھا؛ لیکن انھوں نے اپنی تحریروں میں مسلمانانِ ہند کے لیے جن رہنما خطوط کی نشاندہی کی ہے، اسی سے ہم نے یہ عنوان اخذ کیا ہے۔ اس کے تحت حضرت کے کچھ ارشادات کا خلاصہ پیش کیا جائے گا، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ آج بھی ان کے افکار وخیالات کی معنویت اور افادیت برقرار ہے۔

موجودہ دور کی سیکولر جمہوریتیں اس اعتبار سے دارالامان ہیں کہ وہاں تمام اقلیتوں بشمول مسلمانوں کو مصالحانہ طور پر تسلیم شدہ مشترکہ دستور العمل اساسی کی بنیاد پر مذہبی آزادی حاصل ہوتی ہے۔ مذہبی آزادی کا حصول ہی وہ بنیادی نقطہ ہے جو اِن جمہوریاؤں کو فقہی اصطلاح کے اعتبار سے دارالامان کے دائرے میں لا دیتا ہے۔ اس طرح کی جمہوریتوں میں یہ خطرہ بنا رہتا ہے کہ اکثریت اپنی عددی برتری کے بل بوتے پر دستور اساسی میں تبدیلی کردے اور مذہبی آزادی مفلوج ہوجائے۔ ان حالات میں مسلم اقلیت سب سے زیادہ نقصان میں پڑ جائے گی؛ چنانچہ یہ کہنا بجا ہوگا کہ:

☆ جمہوری اداروں کا تحفظ واستحکام مسلمانوں کے مفاد میں ہوگا۔

☆ اسی لیے مسلمانوں کی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ ایک طرف خارجی محاذ پر

جمہوریت اور سیکولرزم کے تحفظ واستحکام کی ممکنہ جدوجہد کریں تو دوسری طرف داخلی طور پر تنظیمی، مالی اور تعلیمی طور پر اپنے آپ کو اتنا مضبوط بنائیں کہ بوقت ضرورت اپنا دفاع اور تحفظ کرسکیں اور اکثریت کی چیرہ دستیوں کا مقابلہ کرسکیں۔

☆ دارالامان میں مسلمان اقتدار اعلیٰ سے دور اور اجتماعی قوت وشوکت سے محروم ہوں گے؛ اس لیے جہادِ اصغر فرض تو نہیں ہوگا؛ لیکن اس طرف سے غفلت ولاپرواہی کسی صورت جائز نہیں ہوگی؛ کیوں کہ یہ ملی خودکشی کے مرادف ہے۔

☆ دارالامان درحقیقت دارالمعاہدہ ہے اور معاہدہ وقتی، عبوری اور عارضی ہوا کرتا ہے، نہ کہ مستقل۔ اس طرح دارالامان کے مسلمان ایک عبوری دور میں ہوں گے۔ اس دور میں شدائد ومصائب یقینی ہیں؛ کیوں کہ جمہوریت مختلف اقلیتوں کا مجموعہ ہوتی ہے، جن کے درمیان مذہبی، لسانی اور علاقائی بنیادیں ہوتی ہیں، جو کبھی تعصّبات کی نذر ہوجاتی ہیں تو فسادات پھوٹ پڑتے ہیں تو شہریوں کا امن وچین غارت ہوجاتا ہے۔ ان حالات میں مسلمانوں کے لیے اسلام کی بنیاد پر سیاست خطرناک، اور اشتعال اس سے زیادہ خطرناک اور نقصان دِہ ہوگا۔ اس لیے بڑی بیدارمغزی، صبر وتحمل اور ضبط وبرداشت سے کام لینا ہوگا، بصورتِ دیگر ملت اسلامیہ کا ناقابل تلافی نقصان ہوسکتا ہے۔

☆ دارالامان میں غیر مسلموں کے ساتھ آویزش نہیں، امن وامان کی فضا میسر ہوگی۔ اس میں ایک دوسرے سے ملنے جلنے اور ایک دوسرے کو سمجھنے کا موقع ملتا ہے۔ اس پُر امن وقفہ میں یکسوئی کے ساتھ منظّم اور باقاعدہ طور پر اسلام کی دعوت دینے اور تبلیغ کا بہترین فریضہ ادا کرنا لازمی ہوگا۔ غیروں کے سامنے اسلام کی خوبیاں بہترین انداز میں پیش ہونی چاہیے۔ دعوت وتبلیغ کا یہ کام فرقہ پرستی کے خلاف بہترین اور کارگر ہتھیار ثابت ہوگا۔ اس میں کوتاہی مسلمانوں کو بے وقعت اور بے حیثیت بنادے گی؛ بلکہ دوسرے باشندگانِ ملک مسلمانوں کو ایک بوجھ محسوس کرنے لگیں گے، پھر تو مسلمانوں کا خدا حافظ۔

☆☆☆☆☆

حُرمتِ صحابہ کا تحفظ

اور حضرت مولانا محمد میاں دیوبندیؒ کی کتاب ''شواہد تقدس''

مولانا ندیم الواجدی، دیوبند
nadimulwajidi@gmail.com

یہ عنوان سمینار کمیٹی کی طرف سے بھیجے گئے عنوانات کی فہرست میں شامل نہیں ہے، اگر چہ تصانیف کے ضمن میں اس کتاب کا جس کا حوالہ مضمون کے عنوان میں دیا گیا ذکر ہوسکتا ہے، لیکن موضوع کی اہمیت اور کتاب کی قدر و قیمت کی وجہ سے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح حضرت مولانا محمد میاں دیوبندیؒ کی دوسری تصانیف کو بہ طور خاص موضوع بنایا گیا ہے، اس کو بھی موضوعات کی فہرست میں شامل کیا جانا چاہئے تھا۔ اگر چہ اب یہ کتاب بازار میں دستیاب نہیں ہے، اور مصنف کی دوسری کتابوں کی طرح معروف بھی نہیں ہے، مگر جس کتاب کے رد میں یہ تصنیف کی گئی تھی وہ برابر چھپ رہی ہے۔ ضرورت ہے کہ اس طرح کی کتابیں بھی زندہ رہیں، تاکہ پڑھنے والوں کے سامنے تصویر کا صرف ایک ہی رخ نہ رہے۔

''شواہد تقدس'' پر لکھنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ حال ہی میں اس فتنے نے پھر سر اٹھایا ہے جس کی سرکوبی کے لئے یہ شاہ کار تصنیف وجود میں آئی تھی۔ افسوس اس کا ہے کہ اس مرتبہ یہ فتنہ ہمارے ہی حلقے سے اٹھا ہے، مدرسے کے پروردہ، مدرسے کے تعلیم یافتہ، مدرسے میں عقائد، تفسیر، حدیث اور فقہ کا درس دینے والے ایک استاذ نے پندار علم میں مبتلا ہوکر صحابۂ کرام جیسی جلیل القدر ہستیوں پر زبان طعن دراز کی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر حضرت مولانا محمد میاں دیوبندیؒ حیات ہوتے تو وہ اپنے قلم کے ذریعے ان کی ہفوات کا بھی جائزہ لیتے، جس طرح انھوں نے مولانا ابوالاعلی مودودی کی کتاب ''خلافت وملوکیت'' کا

اپنی کتاب ''شواہد تقدس'' کے ذریعے رد کیا ہے، اسی طرح ان کا بھی رد کرتے۔راقم کی رائے ہے کہ جن صاحب نے یہ قضیہ چھیڑا ہے اور صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی مقدس شان میں گستاخی کا ارتکاب کرکے اپنی زبان وقلم کو آلودہ کیا ہے، ان کے رد کے لئے شواہد تقدس سے بہتر کوئی کتاب نہیں ہے۔

علم ایک ناپیدا کنار سمندر ہے، کوئی شخص یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ اس نے یہ سمندر عبور کرلیا ہے یا وہ اس کو عبور کرسکتا ہے، البتہ تحقیق کا دروازہ ہر وقت کھُلا ہے، جو چاہے وہ علم کے سمندر میں شناوری کرسکتا ہے اور تحقیق وجستجو سے وہاں تک پہنچ سکتا ہے جہاں تک دوسرے نہیں پہنچ پائے ہیں۔لیکن تحقیق کے نام پر حدود سے تجاوز کرنے کی بھی کوئی گنجائش نہیں ہے، اس کے ساتھ ہی یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہر دور میں کچھ ایسے اہل علم رہے ہیں جن کے فکر میں شدت اور رائے میں شذوذ پایا جاتا ہے، جمہور علماء امت سے ہٹ کر اپنی ڈفلی بجانا اور اس پر اپنا راگ الاپنا ان کا شیوہ رہا ہے، مگر تاریخ بتلاتی ہے کہ ایسے شذوذات اور ایسے تفردات جو جمہور کی رائے سے انحراف کرکے اختیار کئے جاتے ہیں کبھی قبول نہیں کئے گئے خواہ ان کا قائل کتنا ہی ذی علم کیوں نہ ہو۔شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ اسلامی تاریخ کے ایک بلند پایہ عالم، محقق، فقیہ، محدث اور مصنف گزرے ہیں، انھوں نے اپنی کتابوں میں بعض ایسے خیالات پیش کئے ہیں جو نہ اس سے قبل جمہور فقہاء اور محدثین نے ظاہر کئے اور نہ بعد میں ان کا وجود ملتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ امام ابن تیمیہ کی جلالت علمی کے باوجود ان کے تفردات کو لائق اعتبار نہیں سمجھا گیا، بلکہ بعض علماء نے تو ان کے رد میں کتابیں تک لکھی ہیں۔ علامہ تاج الدین سبکیؒ، ابن حجر ہیثمیؒ، علامہ ذہبیؒ، ملا علی قاریؒ اور علامہ شامیؒ وغیرہ کا شمار ایسے ہی اصحاب علم میں ہوتا ہے جنھوں نے اپنی کتابوں میں علامہ ابن تیمیہؒ کے تفردات کا بسط و تحقیق کے ساتھ رد کیا ہے۔بعض حضرات علماء کرام نے تو ان کی تکفیر سے بھی دریغ نہیں کیا۔ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے لکھا ہے کہ ابن تیمیہ کی تحریرات سے اختلاف کی بنیاد ان کے وہ نظریات ہیں جو عقائد اسلام سے ٹکراتے ہیں۔(الدرر الکامنہ:۱/ ۴۰۹)

علامہ زاہد الکوثریؒ نے ''ابن تیمیہ'' کے نام سے ان کی کی مفصل سوانح لکھی ہے، اس میں ان کے تفردات بیان کرنے کا بھی اہتمام کیا گیا ہے۔ان تفردات سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اس غلط فہمی کا شکار ہو گئے تھے کہ صحابۂ کرام پر بھی نقد کیا جا سکتا ہے۔چنانچہ انھوں نے حضرت عمر ابن الخطابؓ کو بھی نہیں بخشا،جن کی تعریف میں زبان رسالت علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام رطب اللسان رہی اور جن کی رائے کے مطابق کئی بار قرآنی آیات کا نزول ہوا۔ انھوں نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے متعلق لکھا کہ ستر باران سے خطا سرزد ہوئی ہے۔علماء امت کی طرف سے ابن تیمیہ کے افکار وخیالات کے بھرپور رد کے باوجود ہر دور میں بعض لوگ ان کی روش پر چلے ہیں اور ان کے اتباع میں انھوں نے اسلام کے مسلّمہ عقائد کے خلاف اپنی زبان وقلم کو بے لگام چھوڑا ہے۔ ہمارے دور میں بھی بعض اہل علم اس غلط فہمی کا شکار ہو گئے ہیں کہ وہ بھی اس دور کے ابن تیمیہؒ ہیں، اور انھیں بھی یہ حق حاصل ہے کہ وہ اسلام کے مسلّمہ عقائد ونظریات کے خلاف کچھ نئے خیالات پیش کر کے واہ واہ لوٹیں، یا ناقدینِ صحابہ کی فہرست میں شامل ہو کر شہرت بٹور لیں۔

ہمارا خیال ہے کہ نامور لوگوں میں سب سے پہلے جنھوں نے صحابۂ کرامؓ کو اپنی بے جا تنقید کا نشانہ بنایا ان میں ایک اہم نام سر سید احمدؒ کا ہے۔فرماتے ہیں: ''کس کو جرأت ہے کہ اس کو لکھے کہ حضرت عثمانؓ نے سب چیزوں کو غارت کر دیا،حضرت ابوبکرؓ تو برائے نام بزرگ آدمی تھے۔(ملاحظہ کیجیے خطوط سر سید مرتب ڈاکٹر سید راس مسعود ص:۱۸۳) مولانا ابو الاعلی مودودی نے سر سید کے اس چیلنج کو قبول کیا اور اپنی کتاب ''خلافت وملوکیت'' میں وہ سب کچھ کہہ ڈالا جس کی کھلم کھلا جرأت سر سید بھی نہ کر سکے تھے،البتہ دونوں میں ایک فرق ہے، اور وہ یہ کہ سر سیدؒ ان مغربی مصنفین سے مرعوب نظر آتے ہیں جن کو مستشرقین کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ بہ ظاہر علم وتحقیق کے دلدادہ اور مشرقی علوم وفنون کے عشاق نظر آتے ہیں مگر درحقیقت انھوں نے اسلامی تاریخ بہ طور خاص عہد صحابہؓ کو پر نشانہ بنایا ہے۔سر سیدؒ اپنی کتابوں میں اور خطوط میں وہ ہی سب کچھ لکھتے ہوئے نظر آتے ہیں جو وہ مستشرقین کی

کتابوں میں پڑھتے ہیں۔مولانا مودودی بھی اگرچہ مغربی فکر وفلسفے سے متأثر ہیں، بلکہ بڑی حد تک مرعوب بھی ہیں،مگر وہ ظاہر یہ کرتے ہیں کہ وہ اپنی تحریروں کے ذریعے مغربی مصنفین کے ذریعے اٹھائے گئے سوالات کا جواب دے رہے ہیں اوران کے ذریعے پھیلائی گئی غلط فہمیوں کا ازالہ کررہے ہیں۔خلافت وملوکیت کی وجہ تصنیف بیان کرتے ہوئے انھوں نے کچھ اسی طرح کے خیالات کا اظہار کیا ہے۔فرماتے ہیں:''آج پاکستان میں تمام ہائی اسکولوں اور کالجوں اور یونی ورسٹیوں کے طالب علم اسلامی تاریخ اورعلم سیاست کے متعلق اسلامی نظریات پڑھ رہے ہیں،ابھی کچھ مدت پہلے پنجاب یونی ورسٹی کے ایم، اے سیاسیات کے امتحان میں یہ سوالات آئے تھے کہ قرآن نے ریاست کے متعلق کیا اصول بیان کئے ہیں،عہدرسالت میں ان اصولوں کوکس طرح عملی جامہ پہنایا گیا،خلافت کیا چیز تھی اور یہ ادارہ بادشاہی میں کیوں اور کیسے تبدیل ہوا؟ اب کیا معترض حضرات چاہتے ہیں کہ مسلمان طلبہ ان سوالات کے وہ جوابات دیں جومغربی مصنفین نے دئے ہیں،؟ یا ناکافی مطالعہ کے ساتھ خودالٹی سیدھی رائیں قائم کریں؟ یاان لوگوں سے دھوکا کھائیں جوتاریخ ہی کونہیں اسلام کے تصور خلافت تک کومسخ کررہے ہیں۔''(خلافت وملوکیت ص:۳۰۰)

اس عبارت سے تو کچھ ایسا لگتا ہے کہ''خلافت وملوکیت'' دراصل مغربی مفکرین کے فرسودہ اورمن گھڑت نظریات کے رد میں لکھی گئی ہے،لیکن کتاب کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ دراصل اس کے مشمولات اورمحتویات سے مغربی مفکرین کے نظریات کی تائید ہورہی ہی۔بات صرف اتنی ہے کہ مولانا مودودی چاہتے ہیں کہ ہمارے صحابۂ کرامؓ کوکوئی دوسرا برا کیوں کہے،ہم یہ کام زیادہ بہتر کرسکتے ہیں،ہماری تاریخ پر دوسرا کیوں انگلی اٹھائے، ہم زیادہ اچھے طریقے سے اپنی تاریخ میں کیڑے نکال سکتے ہیں،ہماری خلافت کوتنقید کا نشانہ دوسرا کیوں بنائے ہم اسے زیادہ عمدہ انداز میں ملوکیت کےعنوان سے تصور خلافت کونقصان پہنچاسکتے ہیں۔ہم نے جو یہ لکھا ہے کہ مولانا مودودی مغرب سے کچھ زیادہ ہی مرعوب ومتأثر نظر آتے ہیں، وہ بے وجہ نہیں ہے۔تحریک سیدینؒ کے متعلق انھوں نے پہلے تو یہ لکھا کہ وہ

سراسر ناکام رہی، پھر اس ناکامی کی وجوہات کتاب وسنت اور عہد اوّلین کی تاریخ میں تلاش کرنے کے بجائے انھوں نے یہ بھی لکھ دیا کہ سیدین کو چاہئے تھا کہ وہ پہلے کسی کو یورپ بھیج کر اس کی ترقی کا راز معلوم کرتے پھر یہاں اسلامی انقلاب برپا کرنے کی کوشش کرتے۔ فرماتے ہیں: ''سید صاحبؒ اور شاہ اسماعیل شہیدؒ جو عملاً اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لئے اٹھے تھے، انھوں نے سارے انتظامات کئے، مگر اتنا نہ کیا کہ اہل نظر علماء کا ایک وفد یورپ بھیجتے اور یہ تحقیق کرتے کہ یہ قوم جو طوفان کی طرح چھائی چلی جارہی ہے اور نئے آلات و نئے وسائل، نئے طریقوں اور نئے علوم وفنون سے کام لے رہی ہے، اس کی اتنی قوت اور اتنی ترقی کا کیا راز ہے۔'' (تجدید واحیائے دین ص: ۱۲۸)۔

''خلافت وملوکیت'' میں مولانا نے صحابۂ کرامؓ کے متعلق جو نظریات پیش کئے ہیں اگرچہ ان کے متعلق وہ یہ کہتے ہیں کہ مغربی مصنفین نے اسلامی نظام حکومت بہ طور خاص خلافت کے متعلق جو کچھ لکھا ہے، ان نظریات کے ذریعے دراصل وہ ان مغربی مصنفین کے مقابلے میں صحیح خلافت اور اسلامی نظام حکومت کا صحیح اور حقیقی تصور پیش کرنا چاہتے ہیں۔ یہ تو ان کا دعویٰ ہے، اس سلسلے میں انھوں نے پنجاب یونی ورسٹی کے پرچۂ سوالات کا حوالہ بھی دیا ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ صحابۂ کرامؓ کے متعلق ان کے نظریات کی بنیاد اس وقت پڑ گئی تھی جب وہ ۱۹۴۱ء میں جماعت اسلامی کی بنیاد رکھ رہے تھے۔ اس جماعت کے لئے مولانا مودودی نے جو دستور پیش کیا تھا اس کی یہ شق ملاحظہ کیجئے: ''رسول خدا کے سوا کسی انسان کو معیار حق نہ بنائے، کسی کو تنقید سے بالاتر نہ سمجھے، کسی کی ذہنی غلامی میں مبتلا نہ ہو، ہر ایک کو خدا کے بنائے ہوئے معیار کامل پر جانچے اور پرکھے، اور جو اس معیار کے لحاظ سے جس درجے میں ہو، اس کو اسی درجے میں رکھے۔'' (دستور جماعت اسلامی، مسلمان اور موجودہ سیاسی کش مکش: ۳/۱۷۰)

صاف ظاہر ہے کہ وہ انبیاء کرام کے علاوہ تمام انسانوں کو ان میں صحابۂ کرامؓ بھی ہیں، تنقید سے بالاتر نہیں سمجھتے۔ ''خلافت وملوکیت'' تو جماعت کی دستور سازی کے تقریباً پچیس سال بعد ۱۹۶۶ء میں معرض وجود میں آئی۔ مولانا مودودیؒ تو اس شق کو دستور کا حصہ

بنانے سے پہلے بھی صحابۂ کرامؓ کی مقدس جماعت پر نقد کے تیر برساتے رہے۔ایک مرتبہ انھوں نے حضرت عثمان ذوالنورینؓ کے متعلق کچھ اس طرح کے جملے ارشاد فرمائے تھے:
''حضرت عثمانؓ جن پر اس کارعظیم (خلافت راشدہ) کا بار رکھا گیا تھا ان خصوصیات کے حامل نہ تھے جو ان کے جلیل القدر پیش رووں کو عطا ہوئی تھیں،اس لئے جاہلیت کو اسلام کے نظام اجتماعی میں گھس آنے کا راستہ مل گیا۔'' (ترجمان القرآن دسمبر ۴۰ء جنوری ۱۴۱ص ۳۴،۳۵)۔

حضرت مولانا محمد میاں دیوبندیؒ کی کتاب ''شواہد وتقدس'' کا ذکر کرنے سے پہلے دل چاہتا ہے کہ مصنف کے متعلق اپنا تأثر عرض کردوں۔حضرت مولاناؒ کی شہرت زیادہ تر ان کتابوں کی وجہ سے ہے جو انھوں نے ملت اسلامیہ ہند کی تاریخ پر لکھی ہیں۔ان کتابوں کے حوالے سے وہ مؤرخ اسلام کی حیثیت سے ہمارے حلقوں میں معروف ومتعارف ہیں،لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک ہمہ جہت عالم دین تھے،صرف مؤرخ ہی نہیں تھے، بلکہ باکمال اور بے مثال مدرس بھی تھے۔انھوں نے مدرسہ شاہی مرادآباد اور مدرسہ امینیہ جیسے بڑے اداروں میں سالہا سال تک درس نظامی کی امہات الکتب کا درس دیا،وہ ایک عظیم محدث، صاحب نظر فقیہ،قادر الکلام مقرر،اعلا پائے کے منتظم،باشعور سیاسی قائد،مدبر اور مفکر بھی تھے،اس کے ساتھ ہی وہ اعلا درجے کے صاحب علم اور مصنف بھی تھے۔ان کے قلم سے متعدد کتابیں نکلی ہیں،ان میں سے کئی کتابیں قابل رشک شہرت کی حامل بھی ہیں۔حضرت مولاناؒ کی تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے قلم میں شگفتگی،سلاست،روانی اور حلاوت کے ساتھ ساتھ پختگی بھی ہے،گہرائی اور گیرائی بھی ہے۔وہ جس موضوع پر بھی لکھتے ہیں اس کا حق ادا کرتے ہیں،اس موضوع کا کوئی گوشہ تشنہ نہیں چھوڑتے، بلکہ اس کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہیں۔ان کی ہر کتاب ان کی علمی بصیرت اور فکر ونظر کے ساتھ ادبی بانکپن کا شاہ کار بھی ہے۔مولاناؒ کے یہاں علمی بحثوں میں بھی سمندر کے سکون اور ٹھہراؤ کے بجائے آبشار کا مسلسل شور ملتا ہے،لہجے میں دھیمے پن کے بجائے وہ الفاظ کی شوکت پر نظر رکھتے تھے اور ایسا اسلوب اختیار کرتے تھے جس میں خطیبوں کا ساز وبیان نمایاں ہو۔وہ علماء کے محدود

حلقے میں بہت اچھا لکھنے والے تھے۔ انھوں نے جتنا کچھ لکھا ہے اور جتنی مدت تک لکھا ہے اور جس جگر کاوی اور نظر سوزی کے ساتھ لکھا ہے اس کی نظیریں کم نہیں تو زیادہ بھی نہیں ہیں۔

علماء دیوبند کی جس خصوصیت کا ایک زمانہ اعتراف کرتا ہے وہ یہ ہے کہ انھوں نے ہر دور میں اپنی آنکھیں کھلی رکھی ہیں۔ جب بھی امت پر برا وقت آیا، جب بھی کسی نے اسلام کے خلاف ہرزہ سرائی کی، جب بھی کہیں سے دین متین کے خلاف کوئی آواز اٹھی، جب بھی کہیں کوئی فتنہ رونما ہوا، علماء دیوبند سینہ سپر ہو کر سامنے آئے۔ حضرت مولانا محمد میاں دیوبندیؒ میں بھی پچھلوں کے کردار کا جمال، ان کے علم کی سطوت اور زمانے کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر بات کرنے کی جرأت صاف نظر آئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۶۶ء میں جب مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے ''خلافت وملوکیت'' لکھ کر علم وتحقیق کے سمندر میں تلاطم برپا کیا تو اس کی تموج خیز موجوں کے شور نے حضرت مولانا کو بھی بے چین کر دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس طوفان کا رخ وہی لوگ موڑ سکتے تھے جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے اس کام کے لئے لگ بھگ ایک صدی سے منتخب کر رکھا تھا۔ اُس دور میں جو حضرات علماء کرام علمی محاذ پر سرگرم عمل تھے ان میں ایک نمایاں نام حضرت مولانا محمد میاںؒ کا تھا۔ ''خلافت وملوکیت'' کی اشاعت کے بعد عوام تو عوام علماء تک حضرت کی طرف دیکھ رہے تھے کہ وہ اس کا جواب دیں گے۔ لوگوں کی امید بجا تھی۔ دو تین سال تک حضرت نے کتاب کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی، لیکن جب اس کی شہرت بڑھی اور لوگ پے در پے سوال کرنے لگے تو حضرت نے تعمق نظر سے کتاب کا مطالعہ کیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ ''یہ ایک فریضہ ہے جو ہر ایک صاحب علم پر عائد ہو رہا ہے، اور اگر اپنی بے بضاعتی اور کم مائیگی کے باوجود اس فرض کی انجام دہی کی کوشش کی جائے تو وہ ایک سعادت ہوگی اور کیا عجب ہے کہ عنداللہ اس کو شرف قبولیت حاصل ہو جائے۔ خلیفۂ مظلوم ذی النورین سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کا تقدس جزو ایمان ہے۔ اس تقدس کو مجروح کرنے والے الزامات کی تردید تقاضائے ایمان ہے۔'' (پیش لفظ شواہد تقدس ص:۴)

الحمدللہ خلافت وملوکیت کے جواب کے طور پر ''شواہد تقدس'' ۱۹۷۰ء میں منظر عام

پرآئی۔اس موضوع پر یہ پہلی کتاب تھی جس نے وقت کی ایک بڑی ضرورت کی تکمیل کی ،اس سے ان دلوں کوقرار آیا جو خلافت وملوکیت کی اشاعت سے بے چین ہو گئے تھے۔مولانا مودودی صاحبؒ نے اپنی کتاب میں دعوی کیا ہے کہ ''جو تاریخی مواد اس بحث میں پیش کیا گیا ہے وہ تاریخ اسلام کی مستند کتابوں سے ماخوذ ہے، جتنے واقعات میں نے نقل کئے ہیں، ان کے پورے پورے حوالے درج کردئے ہیں اور کوئی ایک بات بھی بلا حوالہ نہیں ہے۔'' (ص:۲۹۹ ضمیمہ) اس دعوی کا رد کرتے ہوئے حضرت مولانا محمد میاںؒ نے لکھا ہے کہ ''ہم اس ارشاد گرامی کی تردید نہیں کرتے ،ہم تسلیم کرتے ہیں کہ جو آپ نے لکھا ہے اس کا حوالہ دیا ہے،مگر ہم یہ تسلیم نہیں کرتے کہ جو کچھ آپ نے لکھا ہے اور واقعات کی جو توجیہ آپ نے کی ہے وہ صحیح ہے۔وہی واقعہ ہے ''وَأَنْتُمْ سُكَارىٰ'' کو چھوڑ کر ''لَاتَقْرَبُوْا الصَّلَاةَ'' کا لکھنے والا یہی کہہ سکتا ہے کہ جو کچھ میں نے لکھا ہے وہ قرآن میں ہے، جو حوالہ دے رہا ہوں وہ صحیح ہے،مگر اس کو تحقیق کہا جائے گا یا نسخ وتحریف اور تلبیس بالباطل۔'' (شواہد تقدس ص:۳۴،۳۵)

تاریخی مواد کے حوالوں کے سلسلے میں حضرت مولانا محمد میاں نے جس تحریف وتلبیس کی طرف اشارہ کیا ہے حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب نے بھی اپنی کتاب ''حضرت معاویہ اور تاریخی حقائق'' میں اس پر بڑی تفصیلی بحث کی ہے۔طوالت کے خوف سے ہم صرف ایک تاریخی واقعے کے سلسلے میں مولانا مودودی کے حوالوں کی صورت حال پر مولانا تقی عثمانی کی گرفت کا ذکر کرتے ہیں۔بات حضرت علی کرم اللہ وجہہ پر سب وشتم کی ہے،مولانا مودودی کا دعویٰ ہے کہ حضرت معاویہؓ خود اور ان کے حکم سے ان کے تمام گورنر خطبوں میں برسر منبر حضرت علی رضی اللہ عنہ پر سب وشتم کی بوچھار کرتے تھے،حتی کہ مسجد نبوی میں منبر رسول پر عین روضہ نبوی کے سامنے حضور کے محبوب ترین عزیز کو گالیاں دی جاتی تھیں اور حضرت علیؓ کی اولاد اور ان کے قریب ترین رشتہ دار اپنے کانوں سے یہ گالیاں سنتے تھے۔'' (خلافت وملوکیت ص:۱۷۴)

مولانا تقی عثمانی اس دعویٰ کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''انھوں نے (مولانا مودودی نے) تین کتابوں کے چار حوالے پیش کئے ہیں۔طبری:۱۸۸/۴،ابن کثیر ۲۳۴/۳،

ج:۴،ص:۱۵۴، البدایہ:۹؍۸۰۔ہم نے ان میں ایک ایک حوالے کو صرف مذکورہ صفحات پر ہی نہیں بلکہ ان کے آس پاس بھی بہ نظر غائر دیکھا، ہمیں کسی بھی کتاب میں یہ نہیں ملا کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ خود علی پر برسر منبر سب وشتم کی بوچھار کرتے تھے۔ہم نے مذکورہ تمام کتابوں کے متوقع مقامات پر دیر تک جستجو کی کہ شاید کوئی گری پڑی روایت ایسی مل جائے لیکن یقین فرمائیے کہ ایسی کوئی بات ہمیں کسی کتاب میں نہیں ملی، پھر بعض ان تواریخ کی طرف بھی رجوع کیا جن کے بارے میں مولانا کو اعتراف ہے کہ ان کے مصنف شیعہ تھے، مثلاً مسعودی کی مروّج الذہب، لیکن اس میں بھی ایسی کوئی بات نہیں ملی، اس کے برعکس اس جستجو کے دوران ایسی متعدد روایات ہمیں ملیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت معاویہؓ حضرت علیؓ سے اختلاف کے باوجود ان کا کس قدر احترام کرتے تھے۔(حضرت معاویہؓ اور تاریخی حقائق ص:۳۲،۳۳)

حضرت مولانا محمد میاں دیوبندیؒ نے ''خلافت وملوکیت'' کی اس کمزوری کو بہت پہلے بےنقاب کردیا تھا کہ اس کے مؤلف حوالے دینے کے سلسلے میں پوری طرح ایمان دار نہیں ہیں۔حضرت ولید بن عقبہؓ مشہور صحابی ہیں، فتح مکہ کے موقع پر ایمان لائے، مگر وہ ان سعادت مند صحابیوں میں سے ہیں جنہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شروع ہی سے خدمت اسلام کے لئے قبول فرمالیا تھا۔ چند ماہ بھی نہیں ہوئے تھے کہ ۹ھ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں قبیلۂ بنی مصطلق کے صدقات وصول کرنے کے لئے عامل بنا کر بھیج دیا۔ حضرت ابوبکرؓ کے زمانۂ خلافت میں ان کو حضرت خالد بن ولیدؓ کی قیادت میں عراق کی طرف جہاد کے لئے روانہ کیا گیا، اگلے سال ۱۳ھ میں شام میں جہاد کا اعلان ہوا، اس جہاد میں بھی حضرت ولید بن عقبہؓ نے شرکت کی، معرکہ یرموک میں بھی حضرت ولید بن عقبہؓ حضرت خالد بن ولیدؓ کے ساتھ شریک تھے، معرکۂ یرموک کے بعد انتظامی اور دفاعی حلقے بنائے گئے، ہر ایک حلقہ ایک امیر کے حوالے کیا گیا، اُردُن کے امیر حضرت ولیدؓ بنائے گئے، ۱۷ھ میں قیصر روم نے حمص کی طرف اقدام کیا، اس کا دفاع کیا گیا، دفاع کے بعد اس علاقے میں کچھ اور فوجی ٹیمیں روانہ کی گئیں، عرب الجزیرۃ کی طرف جو مہم روانہ کی گئی اس کی

قیادت حضرت ولید بن عقبہؓ کے سپرد کی گئی، اس مہم کے بعد حضرت ولیدؓ اس علاقے میں مامور کردئے گئے، حضرت عمر فاروقؓ کی وفات کے بعد بھی ان کی خدمات کا سلسلہ اسی طرح جاری رہا، ایک مرتبہ فارس کے بڑے بڑے علاقوں آذر بائیجان اور آرمینیہ میں بغاوت پھیلی تو اس کا خاتمہ کرنے کے لئے حضرت ولید بن عقبہؓ کو متعین کیا گیا، جنھوں نے بڑی بہادری اور دانش مندی سے بغاوت کی آگ پر قابو پایا اور وہاں کا نظام حکومت درست کیا، شام کے علاقے میں رومی فوجوں نے حضرت معاویہؓ پر دفعۃً چڑھائی کردی، انھوں نے خلیفۂ سوم حضرت عثمانؓ سے امداد کی درخواست کی تو انھوں نے حضرت ولید بن عقبہؓ کو کوفے کی چھاؤنی سے دس ہزار فوج لے کر رومیوں کی سرکوبی کے لئے روانہ کیا، بہ قول حضرت مولانا محمد میاںؒ 'حضرت ولیدؓ کے یہ تمام مناقب تاریخ طبری وغیرہ کتابوں میں موجود ہیں جن پر مولانا مودودی کو بڑا اعتماد ہے اور جن کے مستند ہونے پر انھوں نے اپنی کتاب خلافت وملوکیت میں تقریباً چار صفحے لکھ کر یہ ثابت کیا ہے کہ ان میں درج تمام واقعات نہایت مستند اور قابل اعتماد ہیں۔' حضرت ولید پانچ سال تک کوفے کے گورنر رہے، اس دوران ان کے مخالفین نے ان پر الزامات عائد کرکے اور ان کے خلاف جھوٹی سچی شکایات لگا کر انہیں ان کے منصب سے معزول بھی کرانا چاہا مگر حضرت عثمانؓ نے ان کی یہ درخواست منظور نہیں کی۔ مولانا مودودی نے اس واقعے کو بنیاد بنا کر حضرت عثمانؓ پر اقربا پروری کا الزام لگایا اور یہاں تک کہہ ڈالا کہ حضرت عمرؓ کے آخری زمانے میں وہ الجزیرہ کے عرب علاقے پر جہاں بنی تغلب رہتے تھے عامل مقرر کئے گئے۔ ۲۵ھ میں اس چھوٹے سے منصب سے اٹھا کر حضرت عثمانؓ نے ان کو حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کی جگہ کوفہ جیسے بڑے اور اہم صوبہ کا گورنر بنادیا، وہاں سے راز فاش ہوا کہ یہ شراب نوشی کے عادی ہیں۔'' (خلافت وملوکیت ص:۱۱۲)

مولانا محمد میاںؒ نے تقریباً پندرہ صفحات میں مولانا مودودی کے اس الزام کی تردید کی ہے کہ انہیں حضرت عثمانؓ نے بلا استحقاق آگے بڑھایا، اور یہ کہ وہ شراب نوشی کیا کرتے تھے۔ مولانا محمد میاںؒ نے جو کچھ لکھا ہے وہ ان ہی کتابوں کے حوالے سے لکھا ہے جن سے

مولانا مودودی نے اپنی کتاب کا تاریخی مواد حاصل کیا ہے۔ مصنف نے ثابت کیا ہے کہ مولانا مودودیؒ مذکورہ بالا کتابوں سے تاریخی مواد حاصل کرنے میں دیانت داری سے کام نہیں لیتے بلکہ اپنی مطلب کی بات اخذ کرتے ہیں، اور جو چیز ان کے مقصد کے خلاف نظر آتی ہے اسے نظر انداز کر دیتے ہیں۔ حضرت عثمانؓ اور حضرت معاویہؓ جیسے برگزیدہ صحابۂ کرامؓ کے متعلق جو باتیں مولانا مودودی صاحب نے تحریر فرمائی ہیں ان سب کی یہی حقیقت ہے۔

شواہد تقدس میں صحابۂ کرامؓ کی عدالت، خلافت وملوکیت اور فتنۂ وضع حدیث پر جو مدلّل گفتگو کی گئی ہے وہ مصنف کی جلالت علمی پر دلالت کرتی ہے۔ مولانا مودی صاحب نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ ''بلاشبہ ہمارے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام صحابہ واجب الاحترام ہیں اور بڑا ظلم کرتا ہے وہ شخص جو ان کی کسی غلطی کی وجہ سے ان کی ساری خدمات پر پانی پھیر دیتا ہے اور ان کے مرتبے کو بھول کر گالیاں دینے پر اتر آتا ہے، مگر یہ بھی کچھ کم زیادتی نہیں ہے کہ اگر ان میں سے کسی نے غلط کام کیا ہو تو ہم محض صحابیت کی رعایت سے اس کو اجتہاد قرار دینے کی کوشش کریں۔'' (خلافت وملوکیت ص:۱۴۳)

ایک جگہ لکھتے ہیں:

''بعض حضرات اس معاملے میں نرالا قاعدہ کلیہ پیش کرتے ہیں کہ ہم صحابۂ کرامؓ کے بارے میں صرف وہی روایات قبول کریں گے جو ان کی شان کے مطابق ہوں اور ہر اس بات کو رد کر دیں گے جس سے ان پر حرف آتا ہو، خواہ وہ کسی حدیث میں ہی وارد ہوئی ہو۔ لیکن میں نہیں جانتا کہ محدثین، مفسرین وفقہاء میں سے کسی نے یہ قاعدہ کلیہ بیان کیا ہے اور کون سا محدث یا فقیہ ہے جس نے کبھی اس کی پیروی کی ہے۔'' (خلافت وملوکیت ص:۳۰۵)

مولانا مودودی کے اس دعوے پر کہ صحابۂ کرامؓ کو ان کی غلطیوں پر مطعون کیا جا سکتا ہے، مولانا محمد میاں دیوبندیؒ نے ان کی اچھی خاصی خبر لی ہے۔ سب سے پہلے تو مولانا نے یہ بتلایا کہ یہ ایسا قاعدہ نہیں ہے جو محدثین، مفسرین یا فقہاء کے بیان کا محتاج ہو، بلکہ یہ اجماعی عقیدہ چلا آرہا ہے۔ عقائد کی کتابیں دنیا بھر میں پڑھی پڑھائی جاتی ہیں، اور ان پر تمام دنیا

کے علمائے اہل سنت کا اتفاق چلا آرہا ہے۔ آپ کو سب سے پہلے اس قاعدے کی تحقیق کرنے کے لئے کتب عقائد کی طرف رجوع کرنا چاہئے تھا۔ اس کے بعد مولانا نے شرح عقائد نسفی، شرح مواقف، عقیدۃ الطحاوی، خطیب بغدادی کی کتاب الکفایہ وغیرہ سے طویل عبارتیں نقل کرکے یہ ثابت کیا ہے کہ تمام صحابۂ کرامؓ کی تعظیم اور ان پر اعتراض کرنے سے اجتناب واجب ہے۔ اس سلسلے میں مولانا محمد میاںؒ نے اپنی کتاب کے لگ بھگ بیس صفحات میں جو طویل بحث کی ہے، اس کا خلاصہ ان جملوں میں کیا جاسکتا ہے۔

عقائد کی کتابوں میں یہ تفصیلات موجود ہیں کہ ایک مسلمان کو صحابۂ کرام کے متعلق کیا نظریہ اور کیا عقیدہ رکھنا چاہئے، ان میں سب سے پہلا عقیدہ تو یہ ہے کہ انبیائے کرام کے بعد اگر کوئی جماعت عالی مقام اور بلند مرتبہ ہے تو وہ صحابۂ کرام کی جماعت ہے، اسی لیے یہ ضروری ہے کہ ہم تمام صحابہ کو ثقہ اور عادل سمجھیں، ہر مسلمان پر صحابۂ کرام کی تعظیم وتکریم واجب ہے، البتہ صحابۂ کرام کے مراتب میں باہم فرق ہوسکتا ہے۔ چنانچہ تمام صحابۂ کرام میں سب سے بڑا مرتبہ حضرت ابوبکر الصدیق کا، پھر حضرت عمر فاروق، پھر حضرت عثمان اور پھر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا ہے۔ خلفائے راشدین کے بعد عشرہ مبشرہ کا مقام ومرتبہ ہے، ان کے بعد اہل بدر کا مرتبہ ہے، تمام اہل بیت اور ازواج مطہرات بھی علومرتبہ میں خاص مقام رکھتی ہیں۔ تمام امت اس پر متفق ہے کہ ہزاروں جنید وشبلی اور بایزید بسطامیؒ مل کر بھی کسی ادنیٰ صحابیؓ کے کف پا پر لگے ہوئے غبار کا تقدس حاصل نہیں کرسکتے۔

اس میں شک نہیں کہ صحابۂ کرام انسان تھے، اور بہ تقاضائے بشریت ان کے درمیان اختلاف اور نزاعات بھی رونما ہوئے، مگر یہ تمام اختلافات لوجہ اللہ تھے۔ یہ تصور بھی نہیں کیا جاسکتا کہ کسی صحابی کے دل میں طلبِ دنیا، حبِ جاہ اور خواہشِ اقتدار تھی، جس کی بنا پر اختلافات پیدا ہوئے اور جمل اور صفین جیسی جنگیں برپا ہوئیں۔ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کا اختلاف اور ان کے مابین ہونے والی جنگ بھی جانبین کی نیک نیتی پر مبنی تھی، اگرچہ علماء کرام اس جنگ میں حضرت علیؓ کو حق پر مانتے ہیں اور حضرت معاویہؓ کو غلطی پر، مگر ان کی

یہ غلطی بھی اجتہادی تھی جس پر وہ ایک اجر کے مستحق ہیں، اور حضرت علی دوہرے اجر کے۔ صحابہ کرام کے باہمی اختلافات ونزاعات بلکہ جنگوں تک کے لیے علماء امت نے از روئے احتیاط ایک عجیب ومنفرد تعبیر اختیار کی ہے اور وہ ہے 'مشاجرات' جو مشاجرہ کی جمع ہے، جس کے معنی ہیں کسی درخت کی شاخوں کا ایک دوسرے میں گھسنا جو درخت کے لیے عیب نہیں ہے بلکہ اس کی زینت ہے۔ یہ اصطلاح جو قرآن کریم کے الفاظ "**فیما شجر بینھم**" سے مستفاد ہے اختیار کر کے علماء امت نے واضح کر دیا ہے کہ دور صحابہ میں اختلاف ونزاع کے جو بھی واقعات پیش آئے وہ صحابۂ کرام کے لیے باعث ننگ نہیں ہیں، بعد والوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان مشاجرات کو بدنیتی کے ساتھ نوکِ زبان یا نوکِ قلم پر نہ لائیں۔ واقعات کی حکایت تو کی جاسکتی ہے مگر ان کی بنیاد پر کسی فریق کو اچھا یا کسی کو برا نہیں کہا جاسکتا۔ علامہ قرطبیؒ نے آیت کریمہ **وان طائفتان من المؤمنین اقتتلوا** کی تفسیر کرتے ہوئے صحابۂ کرام کے تعلق سے جو دس اصولی مسائل لکھے ہیں ان میں سے دسویں اصل یہ بیان فرمائی ہے "یہ جائز نہیں کہ کسی بھی صحابی کی طرف قطعی اور یقینی طور پر غلطی منسوب کی جائے، ان حضرات نے اپنے اپنے طرز عمل میں اجتہاد سے کام لیا تھا اور سب کا مقصد اللہ کی رضا کا حصول تھا، یہ سب حضرات ہمارے مقتدا اور راہ نما ہیں، ہمیں یہ حکم دیا گیا ہے کہ ان کے باہمی اختلافات سے کف لسان کریں اور ہمیشہ ان کا ذکر بہترین طریقے پر کریں۔ صحابیت بڑی حرمت والا منصب ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو برا کہنے سے منع فرمایا ہے اور یہ خبر دی ہے کہ اللہ نے انھیں معاف کر رکھا ہے اور وہ ان سے راضی ہے۔

مشاجرات صحابہ کے سلسلے میں علماء امت کی رائے یہی ہے، جو لوگ اس رائے سے انحراف کر کے بعض صحابۂ کرام کے مقابلے میں بعض پر سب وشتم کرتے ہیں اور ان پر کینہ پروری، طلب جاہ ومنصب اور ظلم وزیادتی کے الزامات لگاتے ہیں وہ اپنی عاقبت خود خراب کر رہے ہیں، قیامت کے دن ان کو بالیقین ان الزامات کا جواب دینا ہوگا، وہ لوگ بھی جواب دہی سے نہیں بچ سکتے جو گروہی عصبیت کا شکار ہو کر سوچے سمجھے بغیر ان ناعاقبت اندیشوں کی

تائید پر تائید کئے جارہے ہیں۔ آخر یہ لوگ اپنے اس طرز عمل کا کیا جواب دیں گے؟

مولانا مودودی کے اس دعوے کو کہ انھوں نے یہ تمام روایات وواقعات تاریخی کتابوں سے لئے ہیں، رد کرتے ہوئے مولانا محمد میاں دیوبندیؒ نے شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کے ایک مکتوب کا حوالہ بھی دیا ہے، جس میں وہ ارشاد فرماتے ہیں کہ ''مؤرخین کی روایتیں تو عموماً بے سروپا ہوتی ہیں، نہ راویوں کا پتہ ہوتا ہے، اور نہ ان کی توثیق وتخریج کی خبر ہوتی ہے، نہ اتصال وانقطاع سے بحث ہوتی ہے اور اگر بعض متقدمین نے سند کا التزام کیا بھی ہے تو عموماً ان میں سے ہر غث وثمین اور ارسال وانقطاع سے کام لیا گیا ہے، خواہ ابن الأثیر ہوں، یا ابن قتیبہ، ابن ابی الحدید ہو یا ابن سعد۔ ان اخبار کو مستفاض اور متواتر قرار دینا بالکل غلط ہے، اور بے موقع ہے۔ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے متعلق ان کو قطعی اور متواتر قرار دینا بالکل غلط ہے، اور بے موقع ہے۔ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے متعلق ان قطعی اور متواتر نصوص ودلائل عقلیہ ونقلیہ کی موجودگی میں اگر روایات صحیح احادیث کی بھی موجود ہوتیں تو مردود یا مؤول قرار دی جاتیں، چہ جائیکہ روایات تاریخ۔ (مکتوبات شیخ الاسلام:۱/۲۶۶)

پوری کتاب اس طرح کی قیمتی بحثوں سے لبریز ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مولانا محمد میاںؒ نے ''خلافت وملوکیت'' کا بھرپور علمی اور تحقیقی جواب دیا ہے، اور یہ جواب اس لئے بھی اہمیت کا حامل ہے کہ ہمارے علم کے مطابق یہ اس کتاب کا پہلا بھرپور علمی جائزہ ہے، بعد میں اس کے بہت سے جوابات لکھے گئے ہیں، جن میں حضرت مولانا محمد تقی عثمانی کی کتاب ''حضرت معاویہؓ اور تاریخی حقائق'' بھی بڑی گراں قدر اور اہم ہے۔ ''شواہد تقدس'' کا بھی جواب لکھا گیا ہے۔ سب سے پہلے مولانا عامر عثمانیؒ نے اس کا جواب لکھا، انھوں نے ماہ نامہ تجلی کا ضخیم خلافت وملوکیت ممبر نکالا، اور شواہد تقدس کا رد کیا۔ ہمیں اعتراف ہے کہ مولانا عامر عثمانی نے رد لکھنے میں بڑی محنت کی ہے، مگر زبان وبیان کے عامیانہ پن نے اس کی علمی حیثیت کو متأثر کیا ہے۔ ضرورت تھی کہ کوئی صاحب قلم مولانا عامر عثمانی کی تحقیقات کا

جواب بھی لکھے۔ جماعت اسلامی کے بعض خود ساختہ دانش ور یہ سمجھتے ہیں کہ مولانا عامر عثمانی نے شواہد تقدس کا نہایت مسکت اور دنداں شکن جواب دیا ہے۔ بہ قول ان کے 'مولانا محمد میاں صاحبؒ اپنی زندگی میں اور ان کی وفات کے بعد ان کے اخلاف آج تک بھی اس کا جواب نہیں دے سکے'۔

مضمون کے آخر میں حضرت مولانا محمد میاں دیوبندیؒ کی ایک اور نادرۂ روزگار کتاب کا جو صحابۂ کرامؓ کی عدالت اور ان کے واجب الاحترام ہونے کے موضوع پر ہے، ذکر کرنا بھی بے حد ضروری ہے۔ اس کتاب کا نام ''صحابۂ کرامؓ کا عہد زریں'' ہے۔ لوح کے صفحے پر اس نام کے ساتھ یہ عبارت بھی لکھی ہے ''فضائل ومناقب، عظیم الشان کارنامے، طرز حکمرانی، انداز جہاں بانی اور ان کی مثالی حکومتیں''۔ یہ کتاب دو جلدوں میں ہے اور تقریباً نو سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کا اصل مآخذ عالم اسلام کے مشہور محدث، مسند الہند حضرت امام شاہ ولی اللہ دہلوی قدس سرہ العزیز کی شہرۂ آفاق کتاب ''اِزالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء'' ہے۔ یہ کتاب عربی اور فارسی زبان میں ہے۔ انگریزوں کے دور اقتدار میں حضرت مولانا محمد میاں دیوبندیؒ کی مشہور کتاب ''علمائے ہند کا شاندار ماضی'' پر بھی پابندی عائد کی گئی، اور ان کو مختلف سیاسی سرگرمیوں کی بنا پر قید بھی کیا گیا۔ آپ جدوجہد آزادی کے دوران پانچ مرتبہ قید وبند کی آزمائش سے گزرے، ایسے ہی کسی موقع پر حضرت مولانا نے ازالۃ الخفاء کو اُردو کا لباس پہنایا، اور انداز تحریر ایسا اختیار کیا جو عام فہم بھی ہو اور دل چسپ بھی۔ مولانا نے اس کا خیال رکھا کہ دوران ترجمہ کوئی مضمون چُھٹنے نہ پائے اور اس کا مفہوم بھی پوری طرح ادا ہو جائے۔ ابواب کی ترتیب میں کچھ تبدیلی کی گئی اور اسے ایسا قالب دیا گیا جو دور حاضر کی علمی نفسیات کے قریب اور فکری تقاضوں کی تکمیل کرنے والی ہو۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے اس نوعیت کے بعض مضامین قرۃ العینین میں تحریر فرمائے ہیں، جن کو ان کے پوتے حضرت اسماعیل شہیدؒ نے اپنی کتاب منصب امامت میں واضح بھی کیا ہے۔ مولانا محمد میاں دیوبندیؒ نے ان دونوں کتابوں سے یہ مضامین لے کر اپنے الفاظ میں شامل کئے

ہیں۔ کتاب میں جگہ جگہ توضیحی حواشی بھی ہیں اور شروع میں ایک نہایت علمی اور تحقیقی مقدمہ بھی ہے۔ کتاب میں جو مضامین ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ:

۱- صحابۂ کرامؓ واجب الاحترام کیوں ہیں۔

۲- یہ بات کہ انبیاء علیہم السلام کے بعد صحابۂ کرامؓ کائنات کی آنکھ کا تارا ہیں، محض ایک عقیدہ ہے یا حقیقت ہے۔

۳- جماعت صحابہؓ کا ظہور تاریخ کا ایک اتفاقی واقعہ تھا یا ایک ایسا منصوبہ تھا جس کو مشیت الٰہی اور ارادۂ خداوندی نے ازل سے طے کر رکھا تھا۔ انبیاء علیہم السلام اس جماعت کے لئے دعائیں کرتے تھے اور کتب سابقہ میں ان کی ظہور کی بشارتیں موجود ہیں۔

۴- قرآن کریم نے صحابۂ کرامؓ کے بڑے فضائل اور مناقب بیان کئے ہیں اور ان کے کارناموں کی تحسین کی ہے۔

۵- وہ غیر معمولی کارنامے کیا ہیں جو انسانیت کی پوری تاریخ میں امتیازی شان رکھتے ہیں جن کی بنا پر ان کا احترام نہ صرف اخلاقی فریضہ بلکہ شرافت و انسانیت کا ایک تقاضا بن چکا ہے۔

۶- خلافت، خلافت راشدہ، خلافت راشدہ کے مراتب، تاریخ اسلام میں خلافت راشدہ اور خلفائے راشدین کی اہمیت، قرآن وحدیث سے اس اہمیت کے دلائل وشواہد۔

یہ کتاب اس لئے لکھی گئی کہ کچھ لوگ ہر دور میں احترام صحابہ کے عقیدے کو چیلنج کرتے رہے ہیں، کبھی ان پر تنقید کی جاتی ہے اور کبھی تنقید سے بھی آگے بڑھ کر تکفیر تک کی جرأت کی جاتی ہے۔ حضرت مولانا محمد میاں دیوبندیؒ کی یہ دونوں کتابیں اس طرح کے فتنوں کے سدّ باب کے لئے بڑی اہم ہیں۔ طعن صحابہ کے دروازے کھلے رہیں گے، اس کے ساتھ ہی دفاع صحابہ کا فریضہ بھی انجام دیا جاتا رہے گا۔ ہمیں امید ہے کہ جب تک حضرت مولانا میاں دیوبندیؒ جیسے اکابر علماء کی کتابیں موجود رہیں گی اس طرح کے فتنے اپنی موت آپ مرتے رہیں گے۔ ☆☆☆

باسمہ تعالیٰ

جہاد کے موضوع پر مولانا محمد میاںؒ کی ایک تحریر
''جہادِ اسلامی اور دورِ حاضر'' کا تعارف

مولوی محمد طلحہ ادروی متعلم (دورہ حدیث) دارالعلوم دیوبند

مولانا سید محمد میاں کا یہ مضمون مولانا ازہر شاہ قیصر مدیر ماہنامہ دارالعلوم کی فرمائش پر لکھا گیا اور ماہنامہ دارالعلوم کی تین اشاعتوں (شعبان، رمضان، شوال ۱۳۷۰ھ) میں شائع ہوا۔ اس کے تعارف وتمہید میں مولانا سید محمد میاں صاحب لکھتے ہیں:

> اس میں شک نہیں کہ یہ وقت کا بہت اہم مسئلہ ہے، اور ضرورت ہے کہ اسلامی نقطہ نظر سے اس پر روشنی ڈالی جائے، بالخصوص اس صورت میں کہ مذہب کو سیاست کا آلۂ کار بنایا جاتا ہے اور وہ درندگی جو سیاست کے لئے کی جاتی ہے مذہب کے سر تھوپ دی جاتی ہے۔ ضرورت ہے اس موضوع پر سیر حاصل بحث ہو، لیکن علمی کم مائیگی، علمی مجالس اور علمی مشاغل سے بے تعلقی کے ساتھ جو مصروفیت اس ناکارہ کو سب طرف سے گھیرے ہوئے ہے، اس کی موجودگی میں اس موضوع پر سیر حاصل بحث تو اس کم مایہ سے ناممکن ہے، البتہ جستہ جستہ چند اشارات سپرد قلم کئے جاتے ہیں، خدا کرے وہ مقصود کو واضح کر سکیں اور عام مسلمانوں کے لئے مفید ہوں۔
>
> اس موضوع پر مختلف انداز سے بحث ہوسکتی ہے، لیکن احقر کے خیال میں مناسب معلوم ہوا کہ جہادِ اسلامی کی حقیقت بیان کرنے سے پہلے (۱) خود اسلام کا تعارف کرا دیا جائے، اور (۲) جبکہ وہ حقوق اور روحانیات کی تعلیم دیتا ہے تو اس کا

تعلق جنگ اور جہاد سے کیا ہے، وہ مسجد وخانقاہ کو چھوڑ کر میدان جنگ کی طرف کیوں بڑھتا ہے۔ (۳) اس کے بعد جہادِ اسلامی اور دورِ حاضر کی لڑائیوں پر کچھ روشنی ڈالی جائے۔

باطل طاقتوں کا شعار رہا ہے کہ جھوٹ اس قدر بولو کہ سچ سمجھا جانے لگے، پروپیگنڈہ کا غبار اس قدر اڑاؤ کہ آسمانِ حقیقت غبار آلود ہو جائے، تحقیق کے نام پر جہالت کو اتنا عام کرو کہ اصلیت پر پردہ پڑ جائے۔ اہل مغرب نے اس اصل کو ہر اس جگہ برتا اور استعمال کیا جہاں اسے حقائق کی دنیا میں پسپائی کا سامنا کرنا پڑا، صفحات دہر پر جا بجا اس پروپیگنڈے کے کریہہ نقوش ابھرے پڑے ہیں۔ جنھیں دیکھ کر امانت ودیانت سر پیٹ لے، علم وتحقیق منھ تکتے رہ جائیں اور حقیقت پسندی شرمسار ہو کر رہ جائے۔ ادھر ماضی قریب میں جسے تمدن اور ارتقاء کا دور کہا جاتا ہے یورپ اور اس کی ہمنوا اقوام نے سیاسی اغراض ومقاصد کے حصول اور دنیا پر اپنا سکہ رائج کرنے کے لئے اپنے سب سے بڑے حریف اسلام کے خلاف بہتان و اتہام کی جو ایک لمبی عمارت کھڑی کی ہے ان میں سے ایک بنیادی اعتراض اسلام کے نظام جہاد وقتال پر ہے، کہ اسلام ایک خونخوار مذہب ہے وہ اپنے پیروؤں کو خونریزی اور تشدد کی تلقین کرتا ہے، اس نے خونخواری کو تقدس کا لبادہ پہنایا ہے، ظلم وعدوان کو ایک قانونی اور مذہبی شکل میں پیش کیا ہے، تنگ نظری اس کی اصل اور انتہا پسندی اس کی سرشت میں داخل ہے۔

اگر یورپ کی غلامی نے ہمارے ذہنوں پر اثر نہ ڈالا ہوتا، اسے مفلوج اور ماؤف نہ کیا ہوتا تو اعتراض کا یہ کانٹے دار شجر برگ وبار آنے سے پہلے ہی مرجھا جاتا، اپنی نشو ونما سے پہلے ہی سوکھ چکا ہوتا، مگر افسوس! گردش زمانہ پر اس کا الزام رکھیے یا قضا وقدر کو اس کا ذمہ دار ٹھہرایئے کہ اس کی جڑیں مضبوط ہوتی رہیں اور اعتراضات کا یہ پودا غیروں کے شور وغوغا اور بعض اپنوں کی سادہ لوحی وعاقبت نااندیشی سے سیراب ہو کر آج ایک تناور درخت کی شکل میں کھڑا ہے جو درحقیقت ہماری دوررسی، باریک بینی اور قوت فکریہ کو ایک زبردست چیلنج ہے۔

کہا جاتا ہے کہ پروپیگنڈے میں بڑی طاقت ہے؛ لیکن وہی سب سے بڑی طاقت ہو

ایسا نہیں ہوسکتا ہے۔ حقائق دب تو سکتے ہیں لیکن ختم نہیں ہو سکتے، انھیں دھندلا تو کیا جا سکتا ہے، لیکن مٹایا نہیں جا سکتا ہے۔ یہ بات عالم آشکارا ہے کہ اسلامی تعلیمات میں وہ کشش، وہ جاذبیت ہے کہ اگر اسے اپنے اصلی خدوخال میں پیش کر دیا جائے تو بدگمان دنیا اس کے تئیں اپنے خیال بدلنے پر مجبور ہو جائے۔

اسی طرح اسلام کی جہادی تعلیمات، اس کے عوامل ومحرکات، اس کے اصول وضوابط، مجاہد کے جذبات واحساسات، اس کے فرائض اور اس کی حیثیت، جہاد کے نتائج کو صحیح سیاق و سباق، عمدہ انداز بیان، دل نشیں تعبیرات میں اگر کسی منصف مزاج شخص کے سامنے پیش کیا جائے تو وہ پکار اٹھے گا کہ:

عیاں ہوئیں وہ حقیقتیں جو نہاں تھیں پردۂ راز میں

ایک ذہین وفطین، متیقظ اور باخبر انسان جو اپنے گرد وپیش پر تحقیقی وتنقیدی نگاہ رکھتا ہے، وہ امروز کی شورش سے فردا کی سنگینی کا اندازہ لگا لیتا ہے، حالات کے مد و جزر، طرز فکر کی تبدیلی، بدلتے منظر نامے سے وہ کسی بھی بڑے حادثے کا پتہ لگا لیتا ہے، پھر اگر وہ اپنے پہلو میں دردمند دل، امت کے تئیں اصلاحی فکر اور ہاتھ میں انقلاب آفریں قلم رکھتا ہو تو وہ اپنے افکار کو دنیا کے سامنے پیش کر دیتا ہے، پھر ملت کے لئے عظیم سرمایۂ گرانمایہ اصولِ حیات اور تاریخی ورثہ ہاتھ آ جاتا ہے۔

مولانا محمد میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی انھیں شخصیات میں سے ہیں جن کا طائرِ فکر بہت اونچی پرواز بھرتا ہے، ذوق تحقیق ہر چیز کی حقیقت تک رسائی چاہتا ہے اور اشہب قلم اس حقیقت کو لے کر صفحات پر چل پڑتا ہے۔ تقریباً سات دہائی پہلے سیاست کی رزم گاہ میں جو اُتھل پُتھل اور معرکہ آرائیاں جاری تھیں، ہر ایک سیاسی مکتبۂ فکر، دوسرے پر اپنا پنجہ گاڑنے کی جوسرتوڑ کوشش کر رہا تھا وہ ہر اس شخص پر عیاں ہے جو ذرا بھی سیاسی اور تاریخی شعور رکھتا ہو۔ جنگوں کا بازار گرم تھا، کرۂ ارض بے گناہ عوام کے خون سے لالۂ زار بنا تھا اور طاقت کے عفریت اپنے سے کمزوروں کو نگل رہے تھے۔ ان جنگوں میں مذہبِ اسلام اور اس کی تعلیم

جہاد کو جس طرح بدنام اور پامال کیا جا رہا تھا، وہ مولانا محمد میاں صاحبؒ جیسے منصف مزاج محقق کو اس موضوع پر کچھ لکھنے کا احساس دِلا رہا تھا۔ چنانچہ حضرت لکھتے ہیں:

''اس میں شک نہیں کہ جہاد اسلامی اور دورِ حاضر کی جنگ وقت کا بہت اہم مسئلہ ہے اور ضرورت ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے اس پر روشنی ڈالی جائے بالخصوص اس صورت میں کہ مذہب کو سیاست کا آلۂ کار بنایا جاتا ہے اور وہ درندگی جو سیاست کے لئے کی جاتی ہے مذہب کے سر تھوپ دی جاتی ہے''۔

جب یہ احساس شدت اختیار کر گیا تو دل سے چھلک کر ماہ نامہ دارالعلوم کے صفحات پر جلوہ گر ہوا، اور مئی، جون، جولائی ۱۹۵۱ء شعبان، رمضان، شوال ۱۳۷۰ھ میں ۳/قسطوں میں شائع ہوا۔ پورا مضمون تقریباً ۲۱/صفحات پر مشتمل ہے جو اپنی معنویت، گہرائی اور پیغام سے ضخیم دفتروں کی ہم سری کرتا نظر آ رہا ہے۔

اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ اس موضوع پر لکھنے والے عجیب صورت حال سے دوچار ہوتے ہیں۔عموماً دو طرح کے افراد اس جولان گاہ میں نظر آتے ہیں: ایک طبقہ تو وہ ہوتا ہے کہ مغربی پروپیگنڈہ ان کے لاشعور پر قبضہ کر چکا ہوتا ہے اور وہ اس سے بری طرح متأثر ہو کر نِرا مدافعانہ اور عاجزانہ رویہ اختیار کرتے ہیں اور ان کے دربار میں کھڑے ہو کر صفائی دیتے ہوئے نظر آتے ہیں، نتیجتاً وہ بہت سی ان باتوں کو اپنے اس اسلوب پر قربان کر دیتے ہیں جن کے اظہار سے ان کے اس تخیل کی عمارت زمیں بوس ہو جاتی ہے جو انھوں نے جہاد کے بارے میں بنا رکھی ہوتی ہے۔

دوسرا طبقہ وہ ہے جو حالات کے جبر کا مارا ہوا ہے، ردّ عمل کی نفسیات کا شکار اور انتہا پسندانہ سوچ کا حامل ہے، وہ جب زمانہ کی ناانصافیوں کو دیکھتا ہے، مغرب کی چیرہ دستیوں اور سفاکیوں سے دوچار ہوتا ہے پھر انصاف کے ہر دروازہ کو بند پاتا ہے تو جوشِ انتقام انھیں ایک ایسی راہ پر ڈال دیتا ہے جہاں جذبات کی حکمرانی ہوتی ہے اور عقل و تحقیق غلام باندی بن کر رہ جاتے ہیں، پھر وہ جو کچھ لکھتا ہے اس کے احساسات اور جذبات ہوتے ہیں جنھیں وہ اسلامی قالب میں ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے۔

یقیناً یہ دونوں راستے فطرت سے ہٹے ہوئے اور غیر معقول ہیں، اس سے صورتِ حال واضح کیا ہوتی اور گرد آلود ہو کر رہ گئی۔ مولانا محمد میاں صاحبؒ ان دونوں راہوں کو صحیح نہیں سمجھتے تھے، ان کے محققانہ مزاج، نکتہ رس نگاہ اور بات بات سے نتائج اخذ کرنے والے مؤرخانہ ذہن نے انھیں مذکورہ دونوں طریقوں سے روک دیا، انھوں نے اپنا قلم جادۂ مستقیم پر ڈال دیا، ان کے قلم میں جرأت گفتار بھی ہے اور دعوت کردار بھی، تحریر میں جابجا یہ دونوں قوتیں کارفرما نظر آتی ہیں۔ کوئی بھی مصلحت انھیں اظہارِ حق سے نہیں روک سکی اور نہ ہی مخالفین کے اعتراضات انھیں راست روی سے ہٹا سکے، کبھی ان کے قلم کی نوائیں مجاہد کو للکارتی ہیں تو کبھی اسے اپنی حیثیت و ذمہ داری کا احساس دلاتی ہیں، جوش و جذبہ اور سنجیدہ فکر کے حسین امتزاج سے یہ مضمون ایک خوب صورت شکل اختیار کر گیا، اس کے علاوہ مولانا کے اندر ایک بہترین ادیب اور الفاظ کا پارکھ بھی چھپا ہوا ہے، جس نے جملوں کی ساخت اور انتخاب میں اپنا جوہر دکھا کر تحریر کے حسن کو دوبالا کر دیا۔ الفاظ کی مرصع کاری، طرزِ ادا، اندازِ بیان، سلاست و روانی، سادگی اور برجستگی ایسی کہ باذوق قاری کے ذہن و دماغ پر کیف و سُرور نشہ بن کر چھا جائے، پھر موقع بہ موقع بات بات پر قرآنی آیات اور احادیث نبویہ کے جواہر پارے پیش کر کے مضمون کے استناد میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔

اب آیئے مضمون پر ایک نگاہ ڈالتے چلیں۔ ۲۱/صفحوں پر پھیلا یہ مضمون اسلام کے تعارف اور جنگ سے اس کا تعلق، اسلامی جہاد اور دور حاضر کی لڑائیاں جیسے اہم مباحث پر مشتمل ہے۔ حضرت خود تحریر فرماتے ہیں:

> ’’اس موضوع پر مختلف انداز سے بحث ہو سکتی ہے؛ لیکن احقر کے خیال میں مناسب معلوم ہوا کہ جہادِ اسلامی کی حقیقت بیان کرنے سے پہلے خود اسلام کا تعارف کرایا جائے اور جب کہ وہ حقوق اور روحانیت کی تعلیم دیتا ہے تو اس کا تعلق جنگ اور جہاد سے کیا ہے؟ وہ مسجد و خانقاہ کو چھوڑ کر میدانِ جنگ کی طرف کیوں بڑھتا ہے۔ اس کے بعد اسلامی جہاد اور دورِ حاضر کی لڑائیوں پر کچھ روشنی ڈالی جائے‘‘۔

چنانچہ پہلے انھوں نے اسلام کا ایک خاکہ پیش کیا جو اس وقت دین کے بارے میں قائم کی گئی فضا میں بہت ہی اہمیت رکھتا ہے۔ بعض حضرات نے دین کو محدود کرنے کی ٹھان رکھی تھی اور بعض نے اسلام کو صرف ایک سیاسی پروگرام ثابت کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور صرف کر دیا تھا، حالانکہ دین کا صحیح تصور یہ ہے کہ وہ ایسا ضابطہ حیات ہے جو انسان کو اس کے خالق سے وابستہ کر دیتا ہے، وہ ضابطۂ حیات چمن زار ایمان کی آب یاری اس طرح کرتا ہے کہ خلوص کی کلیاں چٹکنے لگتی ہیں، اعمالِ صالحہ کے کنول کھلنے لگتے ہیں اور انسان للّٰہیت و فنائیت کا پیکر بن جاتا ہے، دنیاوی اقتدار اور بزم سیاست کی جلوہ گری اس کے مقاصد میں داخل نہیں ہو پاتی، لیکن اسلام تقشّف و رہبانیت کی بھی تعلیم نہیں دیتا، وہ اپنے ماننے والوں کو دنیا میں بھی بلندیاں عطا کرتا ہے۔ مولاناؒ اس حقیقت کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''بہر حال دین کی حقیقی روح یہی ہے کہ وہ خالق کائنات سے رابطہ و تعلق پیدا کرتے ہوئے اعمال و افعال میں للّٰہیت اور خلوص پیدا کر دے۔ انفرادی یا اجتماعی طور پر دنیاوی زندگی کا بام عروج پر ہونا، دنیاوی اقتدار اور دنیاوی جاہ و جلال دین کے مقاصد میں داخل نہیں ہیں؛ لیکن اسلام کا اعلان یہ ہے کہ وہ ایسا مکمل دین ہے کہ اگر اس کے جملہ احکام وضوابط پر صحیح طور سے عمل کیا جائے تو لامحالہ دنیاوی سربلندیاں بھی قدم چومیں گی اور دنیاوی اقتدار بھی انھیں حاصل ہوگا، جو اس ضابطۂ حیات کو اپنی زندگی کا پروگرام بنالیں گے''۔

یعنی اسلام ایسا ضابطۂ حیات اور سیاسی الفاظ میں ایک ایسا انقلاب آفریں پروگرام پیش کرتا ہے جو دنیا میں بھی پارٹی کو برسر اقتدار کر سکے، اور اخروی زندگی میں بھی اس کو رنج و محن، شدائد و آلام سے نجات دلا سکے۔ اس دعوے کو سن کر ذہن میں یہ سوال ابھرے گا کہ وہ پروگرام کیا ہے؟ جس پر اتنے بلند و بانگ دعوے؟ اتنی امید افزا باتیں؟ کمیونزم اور سوشلزم نے بھی یہی دعوے کیے تھے، انھیں نعروں سے آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا؛ لیکن صداقت اسے چھو کر بھی نہیں گذری، اور وہ ایک خوش نما دام ثابت ہوا جس میں صید کے ساتھ ساتھ بالآخر صیّاد بھی آ گیا اور وہی کمیونزم جس کے بڑے بڑے دعوے تھے آج آثار قدیمہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ تو بالآخر

اسلامی پروگرام اور ان میں خط امتیاز کیا ہے؟ حضرتؒ اس کی وضاحت فرماتے ہیں:

''مذہبی الفاظ میں پروگرام بہت مختصر ہے مگر سیاسی لحاظ سے بہت وسیع، ہمہ گیر، بہت زیادہ انقلاب انگیز اور دنیا کے ہر سیاسی پروگرام سے جدا، نقطۂ اختلاف یہ ہے کہ دنیا کے سیاسی پروگرام عموماً اقتصادیات سے شروع ہوتے ہیں، سوشلزم، کمیونزم وغیرہ کا سنگِ بنیاد اقتصادی مسائل ہیں؛ لیکن یہ پروگرام عقائد کے تزکیہ وتطہیر سے شروع ہوتا ہے، کمیونزم محنت اور معاوضہ محنت جب کہ سوشلزم ملکیت کے مسئلہ کو بنیاد قرار دیتا ہے؛ لیکن اسلامی پروگرام مسئلہ عبادت کو بنیاد قرار دیتا ہے۔ دنیا کے تمام سیاسی پروگرام مادیت سے آگے نہیں بڑھتے اور جوان کو مادیات سے آگے بڑھاتا ہے وہ ان پروگراموں کو الجھاتا ہے، ان کے تنگ دائرہ کو مجبور کرتا ہے کہ اپنی حیثیت سے زیادہ وسعت اختیار کرلے۔''

آگے اسی کی مزید وضاحت فرماتے ہیں:

''اسلام خالق کائنات پر یقین واذعان کو بنیاد قرار دیتے ہوئے اعلان کرتا ہے کہ حقیقی ملکیت اسی کی ہے کیوں کہ وہ خالق ہے اور پالنے والا ہے، اسلام یہ ترتیب قائم کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ''رب الناس'' ہے، لہٰذا ''ملک الناس'' ہے، لہٰذا ''الٰہ الناس'' ہے۔''

اس کے علاوہ اسلام نے جن چیزوں کو بنیاد بنایا ہے ان میں سے اہم ترین امر قیام امن اور انسانی جانوں کی حفاظت ہے، دنیا کے قوانین تو اسے طاقت کے زور اور سزا کے خوف سے منواتے ہیں؛ لیکن اسلام نے اپنے پیروؤں کے دلوں میں اس کی قدر و قیمت کو بٹھایا ہے اور قتل نفس کی قباحت وشناعت کو جگہ جگہ مؤثر انداز میں بیان کیا ہے۔ مولانا علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

''اشارے کے طور پر کہا جاسکتا ہے کہ جس قانون کے بنیادی نظریات یہ ہوں کہ اللہ رب العالمین ہے، اس کی رحمت ہر شے کو محیط ہے یہ قانونِ ہدیٰ، شفاء، رحمت اور نور ہے جس ذات مقدس کے ذریعے اس قانون کو نوع انسان تک

پہنچایا گیا وہ رؤف و رحیم ہے،اس کے ذریعے ایسا قانون انفرادی اور اجتماعی زندگی کے لئے ایک ایسا مکمل دستور عنایت فرمایا جواخروی فلاح و بہبود کے ساتھ دنیا کے اطمینان اور عالم اسلامی کے امن وامان کا ضامن بن سکے،ایک عام خوش حالی روئے زمین پر ہو،اور آسمان سے زمین تک رأفت ورحمت،امن واطمینان، سرسبزی وشادابی کی فضا محیط ہوجائے‘‘۔

ان نظریات اور اصول کو بنیاد قرار دے کر جس نظام کو پیش کیا جائے گا وہ یقینی طور پر اپنے ماننے والوں کو بے چین کیے رہے گا کہ وہ مخلوق خدا کا خادم،امن وسلامتی کا پیغامبر اور رحمت ومحبت کا پیکر بن کر ایک مثال قائم کرے اور عمل وکردار میں دوسری قوموں پر برہانِ الٰہی ہو۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

اسلام کی نظر میں امن وامان،صلح وآشتی ہی اصل ہے،اسلامی تعلیمات کی تبلیغ کا اصل طریقہ ومنہج وہی ہے جو مذکورہ آیتوں میں بیان کیا گیا ہے؛لیکن بعض طبیعتیں شوریدہ سر ہوتی ہیں،وہ مخلوقِ خداوندی پر ہر مشق ستم روا رکھتی ہیں،نصیحت وفہمائش ان پر اثر نہیں کرتی،ان کی طبیعت کی کجی انھیں ترغیبات اور اخلاقی نصیحتیں قبول کرنے سے روکتی ہیں،تو پھر انسانی امن وامان کے لئے ان کی سرکوبی اور ان سے جنگ اخلاقی فرض ہوجاتا ہے۔یقیناً ایسے کانٹوں سے چمن زار حیات کو ضرور پاک ہونا چاہئے جو چمن کے خرابے کا سبب بنتے ہیں۔کتنے ہی پھول ان کی وجہ سے ٹوٹ کر بکھر جاتے ہیں،کتنی کلیاں مسل دی جاتی ہیں،عفت وعصمت کی کیسی کیسی قبائیں تار تار ہوجاتی ہیں،چند کانٹے دار درختوں کی وجہ سے چمن کو اجڑتے دیکھنا یقیناً چمن کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔ایسے میں حاکم اور حکومت کا فرض ہوگا کہ انھیں بیخ وبُن سے اکھاڑ پھینکے۔‘‘

مولانا لکھتے ہیں:

’’......بایں ہمہ وہ برموقع عدم تشدد کا قائل نہیں وہ پوری طرح سمجھتا ہے کہ جن

کی فطرت مسخ شدہ ہوتی ہے، ان کے لئے اخلاق کی تلوار کارگر نہیں ہوتی، ان کے لئے فولادی تلوار ہی کی ضرورت ہے۔ ایسے ہی کج خلقوں کے لئے خداوند عالم نے فولاد کو پیدا کیا ہے ﴿ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَأْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ﴾ ایسے کج طبع اگرچہ بہت تھوڑے ہوتے ہیں مگر اکثر ایسا ہوتا ہے کہ وہ پوری سوسائٹی پر اس طرح چھا جاتے ہیں کہ ان کا وجود ساری مخلوق کو دبائے رکھتا ہے اور ان کی چیرہ دستیوں سے خداوند عالم کے لاکھوں کروڑوں بندے تباہ و برباد ہوتے رہتے ہیں۔ جب انسانیت کو اس طرح پامال کیا جارہا ہو تو بلاشبہ اس پارٹی کا جو نوع انسان کے فائدے اور مخلوق خدا کی خدمت کے لئے پیدا کی گئی ہے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر جس کا نصب العین ہو، فرض ہو جاتا ہے کہ وہ آگے بڑھے اور اس چیرہ دست جبار و قہار گروہ کے پنجہ سے خدا کی مخلوق کو نجات دلائے۔''

یہ ہے وہ سرحد جہاں سے میدانِ جنگ کا آغاز ہوتا ہے، جنگ ایک خوں آشام وادی ہے جہاں داخل ہونے سے پہلے اپنے حدود اربعہ پر نظر رکھنا از حد ضروری ہے۔ یہ صحیح ہے کہ عظیم ترین مجاہد وہ ہے کہ جس کے بارے میں علامہ اقبالؒ نے فرمایا:

مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

لیکن یہ واضح رہے کہ اس کے لئے ''بدر'' کی سی فضا بھی ہونی چاہئے، ورنہ واقعات کی عمومی دنیا میں قرآن ہمیں اپنے احتساب کی ہدایت دیتا ہے ﴿ فَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّأَةٌ صَابِرَةٌ يَّغْلِبُوْا مِأَتَيْنِ ﴾ اس لئے شرائط و اصول کی پاسداری، اسلحہ جات اور عسکری تیاری اور جنگی پوزیشن کا خیال پیش نظر ہونا چاہئے؛ لیکن اپنی بزدلی پر بے مائیگی کا پردہ ڈالنا اور کم ہمتی کو شرائط کے پیچھے چھپانا بھی ایک مسلم حکومت کو زیب نہیں دیتا۔ اسباب کی فراہمی بھی حکومت کے فرائض میں داخل ہے۔

حضرت مولاناؒ فرماتے ہیں:

''بیشک اسلامی اسٹیٹ کا ہی یہ قومی اور ملکی فرض ہے کہ وہ مقابلہ کی پوری قوت محفوظ رکھے، وہ ضرورت کے وقت کسی دوسرے ملک کے کارخانوں سے

سامانِ جنگ خریدنے پر مجبور نہ ہو بلکہ ہر قسم کا سامانِ جنگ خود اس کے یہاں تیار ہو اور وہ خود ہر قسم کی عسکری اور جنگی قوت کا مرکز ہو، اس کی مرکزیت بھی ایسی مسلم ہو کہ دوسری قوموں کو اس کے مقابلے کی ہمت نہ ہو۔ ﴿وَاَعِدُّوْا لَھُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّۃٍ﴾''

جہاد کا مقصد اور نصب العین امن و امان کا قیام، ظلم و عدوان اور شر و ضرر کو دفع کرنا ہے، جسے دوسرے لفظوں میں اعلاء کلمۃ اللہ کہہ سکتے ہیں، کیوں کہ قانونِ الٰہی میں ہی وہ قوت و تاثیر ہے جو ان معائب کا قلع قمع کر سکے۔ کلمہ کی بلندی کے معنی کی وضاحت خود مولانا رحمۃ اللہ سے سنئے:

''کلمۃ اللہ کے بلند ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ خدا کے وجود کو تسلیم کر لیا جائے اور اس کے بلند و برتر ہونے کا نعرہ لگا دیا جائے؛ بلکہ کلمۃ اللہ کے بلندی کے معنی یہ ہیں کہ وہ اصول بلند و بالا ہوں اور ان اصول کا قومی و ملکی اور بین الاقوامی حیثیت سے اقتدار ہو جن کو امن عالم اور نوعِ انسان کی اخروی نجات کے لئے اللہ تعالی نے انبیاء علیہم السلام اور اخیر میں نبی علیہ السلام کے ذریعہ دنیا کو تلقین کیا ہے۔''

پھر جہاد کے نتیجے میں حاصل ہونے والے فوائد کا تذکرہ کیا ہے، عدل و انصاف وغیرہ کا تذکرہ کرنے کے بعد ایک اہم فائدہ مساوات کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

''عدل و انصاف کو جب آپ سچائی اور وسعت نظر کے ساتھ عمل میں لائیں گے تو سب سے پہلے مساوات کا پاکیزہ اصول کار فرما ہوگا محض دستوری اور قانونی طور پر نہیں؛ بلکہ عملی طور پر اور صرف نمائش کے لئے نہیں بلکہ اس اعتقاد اور یقین کے ساتھ ﴿اِنَّا خَلَقْنَاکُمْ مِنْ ذَکَرٍ وَّاُنْثٰی﴾''

آگے مزید وضاحت فرماتے ہیں:

''مساوات کا تقاضہ یہ ہے کہ جس طرح آپ کو ایک عقیدہ رکھنے کا حق ہے دوسرے کو بھی حق ہو، جس طرح آپ کوئی بات کہہ سکیں دوسرا بھی کہہ سکے، آپ کا

اقتدار اس کی زبان بند نہ کرے، اسی کو آج کل کی اصطلاح میں رائے، ضمیر، مذہب، تحریر اور تقریر کی آزادی سے تعبیر کیا جاتا ہے''

آج کل اسلام پر یہ اعتراض بڑی شد و مد کے ساتھ کیا جاتا ہے کہ اسلام نے مذہبی آزادی سلب کر لی ہے، اظہارِ رائے اور آزادیِ ضمیر کی مخالفت کی ہے اور انسان کو ان فطری حقوق سے محروم کر دیا ہے۔ قرآن پاک کی ایک آیت کے حوالے سے حضرتؒ اس کا جواب تحریر فرماتے ہیں:

''آج کتاب اللہ ہمارے سامنے ہے جس نے دو تین صدی پہلے نہیں بلکہ ساڑھے تیرہ سو برس پہلے دنیا کو آزادیِ ضمیر کی تعلیم دیتے ہوئے جنگ و جہاد کا مقصد ہی یہ قرار دیا تھا کہ ضمیر، رائے اور مذہب کی آزادی باقی رہے اور عبادت گاہوں کی حفاظت ہو۔ ارشاد باری ہے: ﴿ وَلَوْلاَ دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضُهُمْ بِبَعْضٍ لَهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَصَلَوَاتٌ وَّمَسَاجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا ﴾''

اسی آیت سے متعلق ایک لطیف نکتہ تحریر فرماتے ہیں:

''رواداری اور وسعت نظر کی بھی انتہا ہوگئی کہ باوجودیکہ اس حقیقت کو ظاہر کیا جا رہا ہے کہ اللہ کی مسجدوں میں اللہ کا ذکر بکثرت ہوتا ہے؛ لیکن اس خصوصیت اور اہمیت کے باوجود مساجد کا ذکر سب سے اخیر میں کیا جا رہا ہے''۔

جہاد کے مقاصد کی تفصیل کے بعد اس بات کی قدرے تفصیل فرمائی ہے کہ جو جماعت ان اعلیٰ مقاصد کو لے کر کھڑی ہو اس کے احساسات کیا ہوں، اس کی تمام ترک تازیوں، معرکہ آرائیوں کے پیچھے کون سے جذبات کارفرما ہوں؟

''مجاہد کا لفظ سن کر ذہن اس طرف منتقل ہوتا ہے کہ اس کا جذبہ یہ ہوگا کہ وہ میدانِ جنگ کا خوں خوار نبرد آزما ہو جس کے رعب وادب اور حیرت انگیز طرز و انداز سے دشمن تھرانے لگے، میدان جنگ کانپ اٹھے، جس کی شمشیر بے نیام کا ایک وار کشتوں کو پشتے لگا دے۔''

''بیشک یہ درست ہے کہ جب جنگ کے سوا کوئی چارۂ کار نہ رہے اور شرعی نقطۂ نظر جہاد بالسیف ہی کا فیصلہ کردے تو اس وقت ایک مجاہد کا فرض ہے کہ فن سپہ گری کی اعلیٰ صلاحیتوں کا ثبوت پیش کرے، وہ میدانِ جنگ میں بہادر شیر ببر کی طرح نمودار ہو، وہ کروفر (ڈفنس اور ایفنس) ہجوم و جموح، تقدم وتاخر، قدر اندازی وغیرہ وغیرہ غرض میدان جنگ کی ہر ایک ضرورت میں اعلیٰ قابلیت اور بہترین مہارت کا ثبوت دے۔ قرآن حکیم میں مہارت پر آمادہ کرنے کے لئے ہدایت ہوئی ﴿ وَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ فَاضْرِبُوْا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ ﴾''

مذکورہ اقتباس سے مجاہد کی جو تصویر ابھر کر سامنے آتی ہے وہ بظاہر یہ ہے کہ وہ خون کا پیاسا ہو، دشمنوں کو زیر کرنا اور اس کے خون سے کھیلنا ہی اس کا مشغلہ ہو، جب کہ مجاہد کے بارے میں اسلامی تعلیم یہ ہے کہ:

مجاہدو اس کو یاد رکھنا یہ ایک نکتہ ہے عارفانہ
جہاد حق کارگر نہ ہوگا اگر نہ ہو گریۂ شبانہ

حضرت اس حقیقت کو واضح فرماتے ہیں:

''لیکن ان تمام ہدایات کے باوجود کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بار بار واضح فرمادیا ہے کہ ظاہری شان وشوکت، یہ عسکری اور فوجی طاقت اور جنگ وجدال کی اعلی مہارت جہاد کی روح نہیں بلکہ جہاد کی روح مجاہد کا جذبۂ فنا اور شوق لقاء اللہ ہے۔ اس کا نصب العین یہ نہیں ہوگا کہ وہ کس طرح دشمن کے عروج و اقبال کو ختم کرے اور کس طرح اس کے جثۂ منحوس کو پارہ پارہ کرکے اپنا دل ٹھنڈا کرے؛ بلکہ اس کی نظر صرف اس پر ہوگی کہ اس وقت ارشاد خداوندی اور مرضی مولیٰ کیا ہے؟''

''لہٰذا مجاہد کے متعلق یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ جہاد کے وقت دست قدرت کا آلۂ کار ہے، اس کی حیثیت وہی ہے جو حملہ آور کے ہاتھ میں بندوق کی۔ فیلسوف اسلام حضرت شاہ ولی اللہ قدس اللہ سرہ العزیز نے اپنی مشہور تصنیف ازالۃ الخفاء میں اسی حیثیت کو نہایت خوبی سے واضح فرمایا ہے۔''

''جہاد کی حقیقت یہ ہے کہ انسان اپنے ذاتی رجحانات اور نفسانی جذبات کو فنا

کردے اور دست قدرت کا آلہ کار بن کر ان کو مقہور اور مغلوب کرنے کی کوشش کرے
جس کو قادر ذوالجلال کی حکمت بالغہ مقہور ومغلوب کرنا چاہتی ہے۔''

آخر میں ایک اہم بحث پر ہم اس مضمون کو ختم کرتے ہیں کہ رزم کی یہ کاروائیاں کب تک جاری رہیں گی؟ معرکۂ کارزار کب تک گرم رہے گا؟ تلواروں کے جھنکار سے ماحول کب تک پُرشور رہے گا؟ یا دوسرے لفظوں میں یوں سوال قائم کیجئے کہ کفار کے ساتھ جنگ کی علت کیا ہے؟ جس کے ہوتے ہوئے جہاد ہوتا رہے گا اور اس کے ختم ہونے سے جہاد کا سلسلہ موقوف کردیا جائے گا۔ یہ باب جہاد کی ایک معرکۃ الآراء بحث ہے، جس پر فقہا نے صفحے کے صفحے لکھے، دلائل وشواہد کے انبار لگ گئے، فکر ونظر کی صلاحیتیں بروئے کار لائی گئیں اور ۳/مکتبہ فکر سامنے آئے۔

دراصل اس سوال کے جواب میں فقہا جن نصوص سے بحث کرتے ہیں ان میں سے مرکزی آیت ﴿ وَقَاتِلُوْاهُمْ حَتّٰی لاَ تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ﴾ ہے۔نقطۂ اختلاف یہ ہے کہ فتنہ سے مراد کیا ہے؟ بعض نے اس سے کفر مُراد لیا، پھر اس کی روشنی میں کہا کہ جب تک کفر ہے تب تک قتال جاری رہے گا،لیکن جمہور نے اسے قابل اعتنانہ سمجھا، کیوں کہ اگر کفر علت قتال ہے تو پھر صلح کی آیات، جزیہ کے احکام، قیدیوں کے حقوق کے کیا معنی؟

دوسری رائے یہ ہے کہ علت، دفاع ہے۔ یہ وہ نظریہ ہے کہ جس کو ثابت کرنے کے لئے ہمارے دیار کے ایک سیرت نگار نے اپنی تمام تر علمی قوتیں اور فکری صلاحیتیں استعمال کیں؛ لیکن جمہور نے اسے ان کا تفرد قرار دیا؛ کیوں کہ اقدام علی القتال سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور ہماری تاریخ کا ایک ایسا باب ہے کہ جس کے انکار پر اگر ہمیں کوئی چیز ابھار سکتی ہے تو وہ وہی ذہنیت ہوگی جو مغرب سے متأثر ہوکر اس کے دربار میں صفائی پیش کرنے لگے۔

تیسری رائے یہ ہے کہ شوکتِ کفر علتِ قتال ہے اور مستدل ﴿ وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰی لاَ تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ﴾ اور دین سے مراد اطاعت وانقیاد ہے کہ تابعداری و

فرماں برداری اللہ کی ہونے لگے، قانون اس کا نافذ ہو، اصول اسی کے بلند ہوں۔یہی محققین کی رائے ہے اور اسے ہی مولاناؒ نے اختیار کیا ہے۔آپ لکھتے ہیں:

''اس جنگ کا طول وعرض کچھ زیادہ نہیں صرف اتنا کہ اس سفاکت مآب، جبار وقہار جماعت کی چیرہ دستی کا سلسلہ ختم ہو جائے، ان کے جبر وقہر میں دبی ہوئی مخلوق کو موقع مل جائے کہ وہ آزادی کے ساتھ سوچ سمجھ سکے، دین ومذہب کو اللہ کی چیز سمجھ کر اپنے مستقبل کے متعلق غور کر سکے جیسے ہی عام انسانوں کے لئے یہ سہولت پیدا ہو، یہ جنگ صلح سے بدل جاتی ہے اور بزم کی شادمانی رزم کی جگہ لے لیتی ہے ﴿ وَاِنۡ جَنَحُوۡا لِلسَّلۡمِ فَاجۡنَحۡ لَهَا ﴾''

بلاشبہ زمانہ کی تبدیلیوں، بین الاقوامی اصولوں کے نئے انداز اختیار کرنے، قوانین جنگ کے تمدن کی نئی ادائیں سیکھنے کے سبب ان نظریات میں جزوی تبدیلیاں اور تغیرات کا وقوع کچھ مستبعد نہیں؛ لیکن یہ بات بھی ہمیں ملحوظ رکھنی ہوگی کہ:

ہزار جدت طرازیوں کے لباس بدلا کرے زمانہ
مگر یقیناً رہے گا عامرؔ مزاج باطل وہی پرانا

بہرکیف یہ چند اقتباسات جو پیش کئے گئے ہیں، وہ پوری تحریر کی عکاسی اور منظر کشی کرتے ہیں۔تحریر میں آپ کو فکر ونظر کی دنیا بھی آباد ملے گی، زمانہ کی ناانصافیوں کے شکوے بھی جابجا نظر آئیں گے، باطل دعوؤں کی نقاب کشائی بھی ہوگی اور اپنوں کو دعوتِ کردار و عمل بھی، ساتھ ساتھ آپ ادب کی چاشنی سے بھی محظوظ ہوتے جائیں گے۔

الغرض: پوری تحریر اسی طرح کے فکری جواہر پارے اور ادبی شہ پارے سے بھری نظر آتی ہے اور پڑھنے والا جیسے جیسے آگے بڑھتا ہے تحریر کی خوبیاں اور صاحبِ تحریر کی مہارت اور خداقت اس پر آشکارا ہوتی جاتی ہے۔

یزیدک وجهه حسنًا
إذا مازدته نظـــراً

☆☆☆☆☆

ذکر تخصصات سید الملت:

حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب
ایک مفکر تعلیم، ایک ماہر تعلیم

مفتی جمیل احمد صاحب نذیری
مہتمم جامعہ عین الاسلام، نوادہ، مبارکپور، اعظم گڈھ

تعلیم کیا ہے؟

تعلیم کے معنی ہیں سکھانا، حصول علم میں مدد کرنا، یہ اس کے لغوی معنی ہوئے۔ لیکن اصطلاحی مفہوم میں بچے کی دماغی، جسمانی اور اخلاقی تربیت کا نام تعلیم ہے۔ گویا تعلیم صرف سکھانے کا نام نہیں، تربیت بھی اس میں داخل ہے۔ نرا کسی چیز کا سکھا دینا اور واقف کرا دینا کافی نہیں، جب تک عملی زندگی میں اس کے اثرات نہ ہوں۔

بہت سے لوگ سمجھتے ہیں کہ بچہ کے دماغ میں معلومات ٹھونس کر بھرنے کا نام تعلیم ہے، جبکہ یہ حقیقت نہیں۔ بقول ایک مفکر:

> ''بچہ کا ذہن کوئی برتن نہیں ہے جس کو میکانکی طریقہ سے بھر دیا جائے۔ وہ تو ایک زندہ چیز ہے اور پرورش وتغذیہ چاہتا ہے۔ اور غذا جب ہی جزوِ بدن ہوتی ہے جب اشتہا کے ساتھ کھائی جائے۔'' (اصول تعلیم، ص: ۱۰ ارڈاکٹر ایس ایم ضیاء الدین علوی)

اس سے معلوم ہوا کہ تعلیم طلبہ کی معلومات میں اضافہ کا نام نہیں، بلکہ یہ ایک عمل ہے غذا پہنچانے کا، آبیاری کا، نشوونما کی طرف بھرپور توجہ کا، جس میں بچہ کی خواہشات، دلچسپیوں اور صلاحیتوں کا بھی ممکنہ حدود تک لحاظ ہو۔

رسمی اور غیر رسمی تعلیم

کسی بھی بچے کی تعلیم دو طرح ہوتی ہے: رسمی اور غیر رسمی۔ رسمی تعلیم مدرسوں، اسکولوں اور تعلیم گاہوں میں ہوتی ہے، غیر رسمی گھر اور سماج کے ذریعہ ہوتی ہے۔ رسمی تعلیم سے مراد وہ تعلیم ہے جسے لوگ تعلیم سمجھتے ہیں، غیر رسمی سے مراد وہ تعلیم ہے جسے لوگ تعلیم نہیں سمجھتے۔ مگر وہ بھی تعلیم ہوتی ہے اور دھیمے دھیمے اس کے اثرات ظاہر ہوتے ہیں۔

مدرسوں اور اسکولوں کی تعلیم کو ہر کوئی تعلیم سمجھتا ہے، لیکن گھر اور سماج کے ذریعہ بچے کو جو تعلیم ملتی ہے اسے کوئی تعلیم نہیں کہتا، جب کہ یہ تعلیم بھی بچے کی بنیادی تعلیم میں داخل، بلکہ اولین درجہ میں داخل ہے۔

والدین اپنی تہذیب وتمدن، اپنی رسوم وعادات اور مذہبی معاملات میں بچوں کو شامل کرتے ہیں، بچے کے اچھے کاموں پر گھر اور پاس پڑوس میں اس کی تعریف اور حوصلہ افزائی ہوتی ہے، برے کاموں پر ملامت اور محاسبہ ہوتا ہے۔ یہ ساری چیزیں بچے میں پسندیدہ معیار پیدا کرنے میں معاون ہوتی ہیں۔ گھر اور معاشرہ کی ان دانستہ کوششوں سے بچہ بلند مقاصد کی طرف راغب ہوجاتا ہے، لیکن یہ غیر رسمی تعلیم بچے کی ساری تمدنی ومعاشرتی ضروریات پوری نہیں کرپاتی، اس لئے مدرسہ اور اسکول کے ذریعہ رسمی تعلیم کا نظام بنایا جاتا ہے اور خوب سے خوب تر کی تلاش جاری رہتی ہے۔

اگر غور کیا جائے تو ظاہر ہوگا کہ رسمی اور غیر رسمی دونوں طرح کی تعلیم باہم مربوط ہے۔ اور بچے کی علمی واستعدادی نشو ونما میں ایک دوسرے کی مدد ومعاون، دونوں کا باہمی ربط جتنا مضبوط ہوگا، بچے کی اٹھان اور ترقی اتنی ہی زیادہ ہوگی۔

یہ بات بھی بالکل واضح ہے کہ جس تعلیم کو ابھی غیر رسمی تعلیم کہا گیا ہے، اس کا جس رسمی تعلیم سے سب سے پہلے سابقہ پڑتا ہے وہ ہے مدرسوں اور اسکولوں کی ابتدائی تعلیم۔ یہ ابتدائی تعلیم اعلیٰ تعلیم کے لئے مہمیز ہوتی ہے اور بچے کی آگے کی ترقی کا راستہ کھولتی ہے۔

ابتدائی تعلیم کے ذریعہ بچے کی ذات اور شخصیت پر ایسا گہرا اثر پڑتا ہے جوانمٹ ہوتا ہے

اور پوری زندگی اس کے اثرات باقی رہتے ہیں۔ (کچھ حضرات نے اسے بے ضابطہ و باضابطہ تعلیم سے تعبیر کیا ہے۔ دیکھئے: تعلیم اور اس کا سماجی پس منظر، ص: ۲۱۹ تا ۲۲۱، ڈاکٹر سلامت اللہ، مطبوعہ ترقی اردو بیورو نئی دہلی)

ماہر تعلیم کی ذمہ داری:

ان تفصیلات کی روشنی میں ایک مفکر تعلیم اور ماہر تعلیم کی ذمہ داریاں صاف طور پر سامنے آجاتی ہیں۔

ماہر تعلیم وہ ہوگا جو تعلیم کے لغوی و اصطلاحی مفہوم سے واقف ہو، جو رسمی اور غیر رسمی تعلیم کے فرق کو جانتا ہو، جو رسمی و غیر رسمی تعلیم کو باہم مربوط کرنے کے ہنر سے آگاہ ہو، جو ابتدائی تعلیم کے خدوخال کو اعلیٰ تعلیم کی استعداد پیدا کرنے اور ذوق وشوق اجاگر کرنے کے لئے درست اور صحیح سمت دے سکے۔

سید الملت ماہر تعلیم کی حیثیت سے:

اس میں کوئی شک نہیں کہ سید الملت حضرت مولانا محمد میاں صاحب رحم اللہ علیہ ایک زبردست ماہر تعلیم اور مفکر تعلیم تھے۔ تعلیم کے موضوع پر ان کی تصانیف اس کا بین ثبوت ہیں۔ ایک ماہر تعلیم کی جو خصوصیات ہونی چاہئیں وہ ان پر پورے طور پر منطبق ہیں۔

لیکن انھوں نے اپنی فکر کے دائرے کو مکاتب دینیہ میں ابتدائی دینی تعلیم تک محدود رکھا ہے اور تعلیم و تربیت کے معاملے میں مکاتب دینیہ ہی ان کی سرگرمیوں کا مرکز ومحور ہیں۔ ان کی تصنیف کردہ تدریسی کتب دینی تعلیم کے رسالے، مسئلہ تعلیم اور طریقہ تعلیم، دینی تعلیمی تحریک اور دستور العمل، طریقہ تقریر اول اور چارٹ وغیرہ اس کے غماز ہیں۔

مکاتبِ دینیہ اور معلمین کی خدمات کی اہمیت:

مکاتبِ دینیہ اور اس کے معلمین وہ کام کررہے ہیں کہ اگر وہ اسے چھوڑ دیں تو کوئی دوسرا اسے نہیں کرے گا۔ کسی کو نہیں پڑی ہے کہ قرآن پڑھنا سکھائے، نماز، روزہ، حج، زکوۃ اور دوسری دینی باتیں سکھاتا پھرے۔ اللہ اور رسول کا حکم بتائے، دین پر چلنا سکھائے۔

لیکن دوسرے جو کام کر رہے ہیں یعنی اسکول و کالج والے، اگر وہ اپنا کام چھوڑ دیں تو اس کے کرنے والے بہت ہیں، بلکہ کر رہے ہیں، حکومت کی پوری مشینری اس پر لگی ہوئی ہے، سبھی حساب وجغرافیہ پڑھا رہے ہیں، سبھی ہندی، انگریزی اور مختلف زبانیں سکھا رہے ہیں، بلکہ ایک ہوڑ ہے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی، کیونکہ یہ کمائی کا ذریعہ ہیں، ہر کوئی اسی میں بازی مار لینا چاہتا ہے۔

اِس فرق کو ملحوظ رکھئے، پھر دیکھئے ایک ماہرِ تعلیم اسکول کے ایک بنیادی تعلیم کے استاذ کو کیا نصیحت کرتا ہے۔ اور سید الملت مکاتب کے بنیادی تعلیم کے استاذ کو کس طرح خطاب کر رہے ہیں۔

عصری تعلیم کے ایک ماہر تعلیم اساتذہ کو خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''آپ نے بنیادی تعلیم کا کام اپنے ہاتھ میں لیا ہے، تو آپ اس کی ذمہ داریوں کو بھی سمجھ لیجئے۔ بنیادی تعلیم کی حیثیت قومی تعلیم کی ہے، یعنی یہ تعلیم پوری قوم کے لئے ہے۔ ہندوستان کے ہر ایک بچے کا حق ہے کہ وہ اس تعلیم سے فائدہ اٹھائے، اس کا انتظام کرنا حکومت کا فرض ہے۔۔۔۔۔۔ یہ تو سچ ہے کہ بنیادی تعلیم کا کام حکومت کا کام ہے۔ لیکن حکومت کا ارادہ کیسا ہی نیک اور نیت کتنی ہی پاک کیوں نہ ہو، اس وقت تک ٹھیک تعلیم نہیں ہو سکتی جب تک کہ آپ استاذ کی حیثیت سے اپنے فرض کو نہ پہچانیں اور اپنے کام کو اچھی طرح نہ سمجھیں۔ ریاست یا حکومت زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتی ہے کہ تعلیم کے لئے ضروری سامان مہیا کر دے اور پڑھانے کی دوسری سہولتیں پیدا کر دے۔ لیکن اس سے اس وقت تک کوئی مفید نتیجہ نہیں نکل سکتا جب تک کہ استاذ کو خود اپنے کام سے لگاؤ نہ ہو۔۔۔۔۔۔ استاذ کا خلوص اور ایمان داری اور محبت ایسی چیزیں ہیں جو مدرسے (یہاں مدرسہ سے مراد اسکول ہے، اسی طرح آگے بھی مدرسہ سے مراد اسکول ہیں، اس لئے کہ یہاں بات قومی تعلیم یعنی اسکولی تعلیم کی ہے) میں ساز وسامان کی کمی ہونے پر بھی اچھی اور موثر تعلیم کی ضمانت کرتی ہیں۔ اور اس

کے خلاف اگر استاذ میں یہ خوبیاں نہ ہوں تو اچھے سے اچھا تعلیمی سامان، شاندار سے شاندار مدرسے کی عمارت اور عمدہ سے عمدہ نصاب تعلیم بے اثر ثابت ہوتا ہے۔ اس طرح آپ دیکھئے تو آپ ایک بہت بڑا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھانے کیلئے تیار ہوئے ہیں۔'' (بنیادی استاذ کیلئے، ص: ۹ تا ۱۱/ڈاکٹر سلامت اللہ)

سید الملت حضرت مولانا محمد میاں صاحب بنیادی تعلیم کے مکاتبِ دینیہ کے معلم صاحبان کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''آپ مسلمان لڑکوں اور لڑکیوں کی تعلیم کی جو خدمت انجام دے رہے ہیں، ممکن ہے کہ اس کو آپ معمولی کام سمجھتے ہوں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ جن مسلمانوں نے آپ کے متعلق یہ خدمت کی ہے، وہ اس کو کوئی خاص اہمیت نہ دیتے ہوں، لیکن آپ یقین کیجئے کہ مفادِ ملت اور جماعتی نقطہ نظر سے یہ خدمت بہت زیادہ اہم، بہت زیادہ قابلِ قدر اور بہت زیادہ مستحق توجہ ہے۔

جو خدمت آپ انجام دے رہے ہیں وہ ایسی عظیم الشان خدمت ہے، جو تعمیر ملت کے لئے بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے۔

آپ بچہ کے سادہ دماغ میں اسلام کا پودا لگا رہے ہیں، وہ جس قدر بھی بڑھے گا اور ترقی کرے گا، آپ کا بویا ہوا بیج ہوگا۔

بچہ کے دماغ کو اسلام کے سانچہ میں ڈھالنے کے لئے اس کے ماں باپ اور مربی حضرات نے اس کو آپ کے حوالہ کر دیا ہے، اب تمام ذمہ داری آپ پر ہے۔ اگر آپ اپنا فرض خوش اسلوبی سے انجام دیں گے تو یہ بچہ آپ کے خزانہ اعمال کا ایک قیمتی موتی ہوگا۔ یہ بچہ اپنی آخری عمر تک اس تعلیم پر جو کچھ عمل کرے گا، اس کا ثواب جیسا اس کو ملے گا، آپ کو بھی ملتا رہے گا۔''

چند سطروں کے بعد پھر لکھتے ہیں:

''ہمیں نہیں معلوم کہ آپ کی بستی یا آپ کے گاؤں میں آپ کو کیا خطاب دیا جاتا ہے۔ البتہ ہمیں یہ ضرور معلوم ہے کہ اگر آپ اپنا فرض محنت اور سلیقہ سے انجام دیتے

رہے ہیں۔یعنی اگر آپ یہ کوشش کررہے ہیں کہ بچہ جیسے پڑھنا لکھنا سیکھے اور حرفوں کے نقوش اور ان کی مختلف شکلیں جس طرح اس کے دماغ میں پیوست ہوں، ایسے ہی اللہ رسول کی باتیں اس کے دل ودماغ میں جم جائیں، اس کے عادات اسلامی تعلیم و تہذیب کے مطابق ہوں اور اس کے جذبات ور جحانات پر اسلامی عقائد وروایات کی چھاپ ہو، تو ہم آپ کو بشارت دیتے ہیں کہ سید الثقلین خاتم الانبیا والمرسلین رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو معلم الخیر کا خطاب عطا فرمایا ہے اور ہم آپ کو مبارکباد دیتے ہیں کہ ترجمانِ رسالت نے آپ کو یہ خوشخبری دی ہے کہ اللہ تعالی کی رحمتیں آپ کے لئے پھیلی ہوئی ہیں، اللہ کے فرشتے اور زمین وآسمان کی ہر شے یہاں تک کہ بلوں کی چیونٹیاں اور سمندروں کی مچھلیاں آپ کے لئے دعا خیر کررہی ہیں۔

جبکہ اچھی تعلیم نہ صرف اس بچہ کے لئے، بلکہ تمام انسانوں اور انسانوں کے علاوہ فضا، آسمان اور بحر وبر کی مخلوق کے لئے خیر وبرکت کا ذریعہ ہے، تو حضراتِ معلمین کی تعلیمی جدوجہد نہ صرف ایک ملت کے لئے، نہ صرف نوعِ انسانی کے لئے، بلکہ تمام مخلوق کے لئے ایک اساسی اور بنیادی خدمت ہے۔'' (مسئلہ تعلیم اور طریقۂ تعلیم، ص: ۱۳ تا ۱۵/ مولانا سید محمد میاںؒ)

اس تحریر میں اساتذہ اور معلمین کے لئے جو سوز وگداز اور درد جھلکتا ہے وہ سابقہ تحریر میں مفقود ہے۔اور دونوں تحریروں کے موازنے سے دونوں طرح کے معلمین اور اساتذہ کے کام کی نوعیت اور امتیاز بھی واضح ہوجاتا ہے۔

ہمارا فرض اور ادائے فرض کی صورتیں:

دینی مکاتب کی ضرورت واہمیت کو بتاتے ہوئے سید الملت کہتے ہیں کہ سرکار نے یہ بات صاف کردی ہے کہ نہ سرکار دینی اور مذہبی ہے، نہ اس کی تعلیم دینی اور مذہبی۔سرکار دنیا کے کاموں کے لئے ہے۔ملک کا انتظام ٹھیک ہو اور وہ ترقی کرتا رہے، یہ سرکار کا مقصد ہے۔لہٰذا اس کی تعلیم کا بھی یہی مقصد ہے۔روحانیت، خداشناسی اور خداپرستی کی باتیں، خواہ وہ کتنی ہی ضروری ہوں، مگر سرکار اس کی ذمہ دار نہیں ہے۔یہ کام دین اور مذہب کے ماننے

والوں کا ہے کہ وہ اپنے طریقہ پہ دین و مذہب کی تعلیم دیں، بچوں کو خدا پرست اور دین دار بنائیں۔

اس ضمن میں سیدالملت نے جو جملہ استعمال کیا ہے وہ بہت زیادہ غور وتوجہ کا متقاضی ہے۔ لکھتے ہیں:

''بے شک سرکار یہ کسی سے نہیں کہہ سکتی کہ وہ اپنا مذہب چھوڑے، لیکن اگر مذہبی تعلیم نہ ہوگی تو ظاہر ہے کہ مذہب خود ہی چھوٹ جائے گا۔'' (مسئلہ تعلیم اور طریقۂ تعلیم، ص:۱۹)

لیکن مذہب کا چھوٹ جانا آسان سودا نہیں۔ آخرت کا نقصان تو ہے ہی، دنیا کا بھی نقصان ہے، صرف قانون، انسان سے بری باتیں نہیں چھڑا سکتا، خوفِ خدا ہی ایسی چیز ہے جو انسان کے دل کو پاک اور اس کے اخلاق کو بلند کر دیتا ہے۔ وہ صرف اپنے مذہب کا نہیں، ملک کا بھی خیر خواہ ہو جاتا ہے۔

برادرانِ وطن کی مذہبی تعلیم کے بارے میں کیا سوچ ہے، وہ جانیں، مگر مسلمان اس فرض سے کبھی غافل نہیں ہو سکتا کہ وہ خلقِ خدا کو خدا شناسی، خدا پرستی، روحانیت اور اعلیٰ اخلاق کا بھولا ہوا سبق یاد دلائیں اور پڑھائیں، اور خود بھی روحانیت اور اعلیٰ اخلاق کا مظہر بنیں۔

ایسی صورت میں جب کہ ایک طرف سرکار ہے جو اپنی مقرر کردہ لازمی تعلیم پر اربوں روپئے سالانہ صرف کر رہی ہے اور آئندہ اور صرف کرے گی، دوسری طرف مسلمان ہیں جنھیں اتنی رقم کے تصور سے ہی کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔ وہ سرکاری نظام تعلیم کے پہلو بہ پہلو مذہبی تعلیم کا نظام کیسے قائم کریں۔ اور جو فرض اللہ کی طرف سے ان پر عائد ہے، وہ کیسے انجام دیں؟ لکھتے ہیں:

''بیشک یہ صورتِ حال بہت مایوس کن اور بہت زیادہ حوصلہ شکن ہے۔ لیکن آپ اطمینان رکھیں، اسلام نے آپ کو ایک کیمیا بتا دیا ہے، آپ اسی کیمیا کو کام میں لائیں۔ آپ کو نہ اربوں کی ضرورت ہوگی، نہ لاکھوں اور کروڑوں کی۔'' (کتاب مذکور ص:۲۱)

اب بغیر اربوں خرچ کئے ہوئے، اِس ادائے فرض کی کیا کیا صورتیں ہوسکتی ہیں؟ تفصیل کے ساتھ کل سات صورتیں بیان کی ہیں اور انھیں احساس فرض سے تعبیر کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''یہ کیمیا کیا ہے؟ یہ کیمیا ہے: احساسِ فرض، یعنی اپنے فرض کو پہچاننا، فرض کو فرض سمجھنا اور اس پر عمل کرنا۔'' (حوالہ مذکور)

احساسِ فرض میں سب سے پہلے نمبر کی بات یہ ہے کہ اسلام نے بچوں کی مذہبی تعلیم اور دینی تربیت خود ماں باپ پر فرض کی ہے۔ مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ اپنے بچوں کو نماز کی تعلیم دیں، صوم وصلو کا پابند بنائیں، ان کے عقیدے اور ان کے اخلاق ٹھیک کریں۔ سید الملت نے اپنی بات کو سورہ طہٰ آیت: ۱۳۲، سورہ تحریم آیت: ۶، اور متعدد احادیث نبویہ سے مبرہن کیا ہے۔

''لہٰذا ادائے فرض کی سب سے پہلی صورت یہ ہے کہ اپنے بچوں کو خود پڑھائیں، دوسری صورت یہ ہے کہ گھر گھر مکتب ہو، تیسری صورت یہ ہے کہ مکاتبِ دینیہ قائم کئے جائیں اور ان کے قیام واستحکام میں امداد وتعاون کیا جائے، چوتھی صورت یہ ہے کہ شبینہ یا صباحی مکاتب کا قیام عمل میں لایا جائے، پانچویں صورت یہ ہے کہ ہر مسجد مذہبی تعلیم وتربیت گاہ ہو، چھٹی صورت یہ ہے کہ مذکورہ امور کی بہتر انجام دہی کے لئے دینیات وغیرہ کی نصابی کتابیں تیار کی جائیں، ساتویں صورت یہ ہے کہ طریقہ تعلیم کو بہتر سے بہتر بنایا جائے۔'' (کتاب مذکور ص: ۲۳ تا ۳۳)

تعلیم وتربیت کے بنیادی اصول یہ ہیں کہ بچوں کو اپنے سے مانوس بنایئے۔ درجہ کو صاف ستھرا رکھئے اور سجایئے۔ اور بچوں کی صلاحیتوں کو سمجھئے اور ان سے کام لیجئے۔ حرفوں کی آواز بتایئے اور کم سے کم حرف بتا کر پڑھنا سکھا دیجئے، سب سے پہلے اللہ پڑھنا سکھایئے۔ تصویر کے بجائے یہ تصور پیدا کیجئے کہ جو لفظ زبان سے ادا ہو رہا ہے وہ کاغذ پر بھی آسکتا ہے۔ مثلاً قلم کا لفظ بولا بھی جاسکتا ہے اور کاغذ پر اس کی تصویر بھی بنائی جاسکتی ہے۔ دلچسپ تمہید

سے طلب اور شوق پیدا کیجئے۔ حرفوں کو ملا کر دکھانے کا تماشہ بھی بنائیے۔ بار بار مشق کرا کے پختہ کرائیے۔ مشق کے دلچسپ طریقے اختیار کیجئے۔ بچے خالی بیٹھنا نہیں جانتے، آپ ان کو تعلیم میں لگائے رکھئے۔ مصروفیت کے باوجود دماغی تفریح کے اصول کو بھی اپنائیے۔ بچوں کے شوق اور دلچسپی سے فائدہ اٹھائیے۔ حروف روشن اور جلی لکھئے۔ حروف اور حرکتیں ترتیب وار بتائیے۔ چند بچوں کا ایک سبق رکھئے۔ جہاں ضرورت ہو، سلیقہ مند بچوں کو مانیٹر بنائیے۔

حضرت مولانا محمد میاں صاحب علیہ الرحمہ نے اِن ساری باتوں کو اتنی تفصیل کے ساتھ اور اتنے اچھے انداز میں بتایا ہے کہ بچوں کی بنیادی تعلیم اور طریقہ تعلیم کا مسئلہ مکمل طور پر حل ہو جاتا ہے۔

پھر انہی پر اکتفا نہیں، پنج سالہ نصابِ دینیات بھی تحریر کیا، اس کے مقاصد بھی واضح کئے اور طریقہ تعلیم بھی بتایا۔ نظم مدرسہ اور تنظیم مکاتب پر بھی روشنی ڈالی، تعلیمی کارڈ بنانے کا طریقہ اور ان کی مشق بھی بتائی، دینی تعلیمی تحریک اور اس کے دستور العمل کو بھی مبادی، فرائض، تقسیم عمل اور طریق کار کی تفصیلات کے ساتھ بیان کیا۔ طریقہ تقریر کی بھی رہنمائی کی۔ چارٹ وغیرہ کے ذریعہ بھی تعلیمی مقاصد کو بروئے کار لانے کی رہنمائی کی۔

خلاصہ یہ کہ حضرت سید الملت نے دین کی ابتدائی تعلیم کے کام اور نظام کو جس قدر عمدہ انداز میں پیش کیا ہے وہ ان کے ماہر تعلیم ہونے کا بین ثبوت ہے۔ راقم سطور کو اس طرح کی کلی و جزوی تفصیلات عصری اسکولوں و کالجوں کے ماہرین تعلیم کی تصانیف میں نہیں ملیں۔ وہ لوگ صرف الفاظ کے گورکھ دھندوں میں پھنسے ہیں جبکہ سید الملت نے حقائق کے موتی رولے ہیں۔

☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مولانا سید محمد میاں دیوبندی علیہ الرحمہ (پ: ۱۹۰۳ء و: ۱۹۷۵ء)

بحیثیت ماہر تعلیم اوران کی نصابی خدمات

مولانا ضیاء الحق خیرآبادی (کنوینرسیمینار مولانا سید محمد میاں)

مولانا سید محمد میاں دیوبندی کی سیرت وسوانح اور ان کے ہم عصر علماء کرام اور دانشوارانِ ملت کی ان کے بارے میں آراء سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ کامیاب مدرس وفقیہ اور محدث، مستند مؤرخ، بے مثال منتظم اور پالیسی ساز، بالغ نظر سیاستداں، دوراندیش دانشور اور ماہر تعلیم تھے۔ ان کی ہمہ جہت دینی، ملی اور تنظیمی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ ان پر سید الملت کا لقب پوری طرح فٹ ہوتا ہے، جو ان کی بے مثال ملی خدمات کے پیش نظر بالکل حق بہ حقدار رسید کہے جانے کے لائق ہے۔ مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ کی نگاہ دوربیں نے آپ کی تنظیمی خوبیوں اور کمالات کو محسوس کیا اور مدرسہ شاہی کے ارباب انتظام سے آپ کو جمعیۃ علماء ہند کے لئے مانگ لیا اور دہلی لاکر اپنے معتمد علیہ اور معاون کی حیثیت کی سے بیٹھا دیا، پھر مولانا محمد میاں نے اپنی گوناگوں خدمات سے یہ ثابت کردیا کہ مجاہد ملتؒ نے جس گوہر نایاب کا انتخاب اپنے مشن بلکہ جمعیۃ علماء ہند کی تعلیمی پالیسیوں کی تنفیذ کے لئے کیا تھا اس کے لئے آپ کی ذات قابل ترین وموزوں ترین شخصیت تھی۔

مولانا محمد میاں کا اصل میدان تعلیم وتعلم اور درس وتدریس تھا، مولانا لکھتے ہیں:

> احقر کا پیشہ مدرسی رہا، اگرچہ بیس سال ایسے گذرے کہ قید وبند یا جمعیۃ علماء کی خدمت کی وجہ سے احقر اس پیشہ پر قائم نہیں رہ سکا، پھر خدانے توفیق عطا فرمائی کہ قال

اللہ وقال الرسول کے حلقہ میں احقر حاضر ہوگیا۔''(خودنوشتِ بےنوا)

آپ کی دینی وملی خدمات کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ اسے چند صفحات میں بیان کرنا بہت دشوار ہے، آپ کی علمی وقلمی خدمات کا اپنا ایک الگ رنگ ہے، آپ نے تاریخ، فقہ، حدیث، سیاست، بچوں کے ادب اور ان کے علاوہ مختلف موضوعات پر لکھا، اور خوب لکھا۔ کثرت تحریر کی وجہ سے حضرت شیخ الاسلامؒ از راہ تفنن آپ کو'' حیوان کاتب'' کہتے تھے، جو درحقیقت ان کی بے پناہ علمی وتصنیفی خدمات کا اعتراف ہے۔ مولانا سید محمد میاں کو قوم کے نونہالوں کی تعلیم وتربیت سے گہرا لگاؤ اور خصوصی تعلق تھا، وہ ایک نابغۂ روزگار ماہر تعلیم تھے، اس مقالہ میں ہم مولانا کی تعلیمی مہارت اور نصاب تعلیم کے سلسلے میں ان کی کاوش وخدمات کا جائزہ لیں گے۔ مولانا مسعود عزیزی ندوی لکھتے ہیں:

''تدریس وافتاء اور تصنیف وتالیف اور ملک وملت کی عظیم سیاسی مصروفیتوں اور گوناگوں ذمہ داریوں کے باوجود آپ کو نونہالان اسلام (بچوں اور بچیوں) کی تعلیم وتربیت اور مدارس ومکاتب کے نظام تعلیم کی اصلاح وتسہیل سے خاص شغف تھا، اسی لئے آپ نے بچوں کے لئے دینی تعلیمی نصاب مقرر فرما کر اس کے لئے از خود دینی تعلیم کے رسالے اور چارٹ وغیرہ بڑی محنت اور جانفشانی سے تیار فرمائے، جو سہل ہونے کے ساتھ مفید ترین معلومات سے لبریز بھی ہیں، آپ کے یہ رسائل تقریباً پورے ہندوستان میں مقبولیت کے ساتھ رائج ہیں اور کثرت سے مدارس میں داخل نصاب ہیں۔ (تذکرہ مولانا سید محمد میاں، ص:۷۸)

دینی تعلیم کا یہ رسالہ بارہ حصوں میں لکھا گیا اور عمدہ کتابت وطباعت کے ساتھ شائع ہوا، مولانا کے اخلاص کا یہ عالم تھا کہ اس پر بحیثیت مصنف اپنا نام بھی نہیں لکھا، ان کے انتقال کے بعد الجمعیۃ بکڈپو نے اس پر آپ کا نام بحیثیت مصنف درج کر دیا ہے۔ مدرسہ شاہی کی تدریس کے زمانے میں آپ نے بچوں کے لئے تاریخ اسلام تین حصوں میں لکھی، اسے بھی قبول عام حاصل ہوا، اپنی بالکل ابتدائی تدریس کے زمانے میں بچوں کے لئے سیرت پر کتاب ''ہمارے پیغمبر'' لکھی، جو سوال وجواب کے انداز پر ہے، تعلیمی خدمات کے

ذکر میں ان کا مختصر تعارف کرایا جائے گا۔ یہ سب رسالے اور تعلیمی چارٹ بچوں کی تعلیم کے لئے ایک عمدہ سیٹ ہے، جس میں آداب واخلاق، عقائد وعبادات، ضروری مسائل، سیرت نبوی اور تاریخ اسلام سے متعلق معلومات کو نہایت دلچسپ انداز میں بیان کیا گیا ہے، اگر اسے مولانا کے بتائے ہوئے طریقہ پر پڑھا دیا جائے تو دینی معلومات اور زبان وادب کے اعتبار سے بچوں کے اندر اتنی لیاقت اور اس قدر شعور پیدا ہوجائے گا کہ مستقبل میں دین ومذہب اور زبان کے سلسلہ میں ان کے سامنے کوئی اندھیرا نہیں رہے گا۔

آزادی کے بعد جب مسلمانان ہند ہر علاقہ اور خطہ میں اقلیت میں آگئے اور اسی کے ساتھ غیر مسلم اکثریت کی نظر میں خارِ مغیلاں کی طرح چبھنے لگے، نیز ان کے دینی تشخص اور ملی پہچان کی بقاء کا مسئلہ بھی تھا، حکومت جو قائم ہوئی وہ سیکولر اصولوں پر قائم ہوئی، حکومت کا نصاب جسے پڑھ کر سرکاری اداروں میں شمولیت اور سرکاری ملازمت کا حصول تھا اس میں مذہبی تعلیم کا کوئی خانہ نہیں تھا، اس لئے ہر مذہب وملت کو اپنے طور پر ہی مذہبی دینی تعلیم حاصل کرنا اور اپنی نسل نو کو اپنے طور پر مذہبی تعلیم دلانا تھا۔ جمعیۃ علماء ہند کے اکابر نے اس مسئلہ کی اہمیت کو شدت کے ساتھ محسوس کیا، اور اس کے لئے تعلیمی کنونشن منعقد کیا اور اس پر غور کرنے کے لئے ماہرین تعلیم کو اکٹھا کیا اور دینی تعلیمی بورڈ بنایا۔ مکاتب ومدارس کے لئے جامع نصاب تعلیم وضع کرنے اور عصری علوم کی جانب خصوصی توجہ دینے کا فیصلہ کیا۔ اس لئے کہ دنیا کی کسی بھی قوم کی بقاء وتحفظ اور تہذیب وتمدن کو قائم رکھنے کا ایک ہی نسخہ ہے کہ وہ اعلیٰ تعلیم کے میدان میں تیز رفتاری سے ترقی کرے اور اپنے اسلاف کے علمی وتمدنی ورثہ کو پوری دیانت داری کے ساتھ اپنی نسل نو میں منتقل کرنے کا مستحکم نظم کرنے کے ساتھ ساتھ عصری تقاضوں اور ضرورتوں سے آراستہ کرنے میں غفلت کا شکار نہ ہو۔

جن قوموں نے اپنی قوت وتوانائی اپنی نئی نسل.....جن سے قوم کا مستقبل وابستہ ہوتا ہے.....کی تعلیم وتربیت پر صرف کی، اسی قوم کے بچوں نے مستقبل میں نہ صرف اپنی شناخت قائم رکھی، بلکہ پوری قوم کے تحفظ وبقا اور عقیدہ ونظریہ کی حفاظت کی ذمہ داری بھی لی۔

ایسے وقت میں اللہ تعالیٰ نے مولانا سید محمد میاں کی شکل میں جمعیۃ علماء کو ایک ایسا ماہر تعلیم اور صاحب قلم عطا کیا، جس نے تن من دھن سے جمعیۃ علماء کے عظیم تر تعلیمی منصوبوں کو پورا کیا۔ جمعیۃ کی صف اول کے رہنما آپ کی خداداد صلاحیت، سیاسی بصیرت اور تنظیمی لیاقت کی وجہ سے آپ پر مکمل اعتماد فرماتے تھے، لہٰذا دینی تعلیمی بورڈ کی ساری ذمہ داریاں آپ کے سپرد کی گئیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اس دور میں جبکہ نرسری اسکول کے بچوں کی کتابوں کی زبان مقرر کرنے پر ماہرین نفسیات اور ماہرین تعلیم کا پینل غور وفکر کرتا ہے، بہت گہرائی سے جائزہ لے کر اور کلاس کے ادنیٰ ذہن کے بچوں کو سامنے رکھ کر، نصاب کی کتابیں اور ان کی زبان طے کی جاتی ہیں، ادھر ہمارے مولانا محمد میاں صاحب نے تنہا اور وہ بھی اپنے ذوقِ تربیت کی بنیاد پر، جمعیۃ علما ہند کے پلیٹ فارم سے یہ عظیم کارنامہ انجام دیا ہے۔

فجزاه الله عنی و عن سائر المسلمین۔

مولانا سید محمد میاں صاحب نے مرکزی تعلیمی بورڈ کے لئے جو نصابی کتابیں تیار کیں ان میں اردو عربی قاعدہ، قاعدہ حروف شناسی، تصویری چارٹ، تعلیمی کارڈ، حرفوں کے کارڈ، حرفوں کے چارٹ اور دینی تعلیم کا رسالہ جو بارہ حصوں پر مشتمل ہے اور غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔

مولانا نے ''**مسئلہ تعلیم اور طریقۂ تعلیم**'' کے عنوان سے اساتذہ مدارس کے لئے جو گائڈ لائن تیار کی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ تعلیم کے جملہ امور کے ماہر اور اکسپرٹ ہیں، اس میں مولانا نے ''ادائے فرض'' کی جو سات صورت بتائی ہے اس کو پڑھ کر کوئی بھی استاذ یہ کہنے پر مجبور ہوگا کہ ایک کامیاب معلم بننے کے لئے اس سے بہتر نسخہ نہیں ہوسکتا، ان کو ہم اختصار سے بیان کرتے ہیں:

(۱) اپنے بچوں کو خود پڑھائیں

اس کے تحت مولانا نے لکھا کہ قرآن وحدیث کی رو سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم

اپنے بچوں کو خود تعلیم دیں، اعلیٰ اخلاق سے مزین ہوں، اسلامی احکام کے پابند ہوں، اور اپنی اولادوں کو بھی اس کا پابند بنائیں، ہمیں دیکھ کر ہماری اولاد بھی اچھائی اور بھلائی کے سانچے میں ڈھلے گی۔ سب سے بہتر اور قیمتی عطیہ جو ہم اپنی اولاد کو دے سکتے ہیں وہ تعلیم خیر اور دینی تہذیب ہے جو ہمیشہ ہمیش رہنے والی دولت ہے۔ (ص: ۲۳/۲۴، حذف واختصار)

(۲) گھر گھر مکتب

اس میں مولانا نے بتایا کہ اگر ہم اپنی تفریح یا آرام میں سے تھوڑا وقت بھی اپنے بچوں اور پاس پڑوس کے بچوں کی تعلیم کے لئے نکال لیں تو ہر گھر تعلیم دین کا ایک مرکز بن جائے گا، یہاں پر مولانا نے ایک بہت اہم بات کی طرف توجہ دلائی ہے:

''**معلم سے بہتر معلمات**'' ماہرینِ تعلیم کا متفقہ فیصلہ یہ ہے کہ ''پرائمری تعلیم'' بالخصوص پری پرائمری تعلیم اور ''نرسری ایجوکیشن'' کے لیے، یعنی ایسے بچوں کی تعلیم کے لیے جو ابھی چھ سات سال کے نہ ہوئے ہوں، مردوں سے زیادہ عورتیں مفید ہیں؛ کیوں کہ فطرتاً مردوں سے زیادہ عورتوں میں بچوں سے انسیت ہوتی ہے۔ بچوں کے معاملہ میں قوتِ برداشت بھی عورتوں میں مردوں سے زیادہ ہوتی ہے۔ اور بچے بھی مردوں کے مقابلہ میں عورتوں سے جلد مانوس اور بے تکلف بن جاتے ہیں۔

پس اگر ہماری خواتین کچھ بھی توجہ فرمائیں اور طریقۂ تعلیم سے واقفیت حاصل کر کے خود اپنے مکان میں بچوں کی تعلیم وتربیت کا سلسلہ جاری کردیں، تو ملتِ اسلامیہ پر احسانِ عظیم ہوگا اور دورِ حاضر کی سب سے بڑی مشکل آسانی سے حل ہوجائے گی۔ (مسئلہ تعلیم اور طریقہ تعلیم، ص: ۲۵)

اسی صفحہ پر مولانا نے جو حاشیہ رقم فرمایا ہے، وہ ان کی شخصیت کی تشکیل میں ماں اور نانی کے کردار کو نمایاں کرتا ہے:

اتنی خودستائی کی اجازت دیجیے کہ احقر کو جو کچھ بھی ادب وتہذیب اور حسن اخلاق کی

دولت میسر ہے، زیادہ تر والدہ مرحومہ اور نانی مرحومہ کی تعلیم وتربیت کا ثمرہ ہے اور اب بھی احقر نے بچیوں کے لیے چھوٹا سا مکتب غربت کدہ میں قائم کر رکھا ہے۔ چھ سات سال کی عمر کے بچے اسکول سے فارغ اوقات میں یہاں آ کر قرآن شریف اور اردو بھی پڑھتے ہیں اور حساب کی کاپی لے آتے ہیں تو اپنی نو عمر استانیوں کی مدد سے سوالات بھی حل کر لیتے ہیں۔

نونہالانِ قوم کی تعلیم وتربیت کا جو طریقہ مولانا نے آج سے ستر سال پہلے اپنے علم وتجربے کی روشنی میں تحریر فرمایا ہے، اس کی افادیت آج بین الاقوامی طور پر نرسری اسکولوں میں تسلیم شدہ حقیقت ہے، اور دنیا کے ترقی یافتہ ملکوں میں سب سے زیادہ زور سات آٹھ سال کے بچوں کی تربیت پر دیا جاتا ہے، یہاں تک اہتمام کیا جاتا ہے کہ انتہائی تجربہ کار، تربیت یافتہ اساتذہ کا کالج ویونیورسٹی کے اساتذہ کے مقابلہ میں تقرری کے لئے سخت ترین انٹرویو لیا جاتا ہے۔ بچوں کی نفسیات اور طبیعت ومزاج سے واقفیت رکھنے والے اساتذہ ہی کو منتخب کیا جاتا ہے، جن کے لئے لازم ہے کہ وہ متحمل مزاج ہوں اور بچوں کی فطری شرارت پر مشتعل نہ ہوں۔

جمعیۃ علماء ہند نے آزادی کے بعد ملک کے بدلتے ہوئے حالات کے پس منظر میں مرکزی دینی تعلیمی بورڈ قائم کر کے یہی تحریک چلائی کہ قوم کے معصوم بچوں کو جگہ جگہ مکاتب قائم کر کے اپنے طور پر بنیادی دینی تعلیم دی جائے اور انھیں اعلیٰ اسلامی اخلاق وآداب سے متصف کیا جائے، اس تحریک کی وجہ سے گاؤں گاؤں، دیہات دیہات بکثرت مکاتب تو کھلے لیکن مسلمانوں نے ان مکاتب کو وہ اہمیت وتوجہ نہیں دی جتنی کہ آر ایس ایس نے سرسوتی نرسری اسکول کو دی، اور اپنے تیار کردہ ہندتوا نصاب کو سرگرمی سے لاگو کیا، ان سرسوتی اسکولوں پر دوسرے پلانوں کے مقابلہ میں زیادہ توجہ دی، جس کا ثمرہ آج اس کو مل رہا ہے کہ اس عرصہ میں پوری دو نسل تیار کر لی ہے جس کی رگ رگ میں آر ایس ایس کا نظریہ خون بن کر دوڑ رہا ہے۔

(۳) فرض نمبر تین: مکاتب کا قیام

اس کے تحت مولانا نے یہ تجویز پیش کی:

اگر آپ اپنے عمل اور اپنی محنت سے تعلیم و تربیت کا سلسلہ کسی بھی سبب سے نہیں قائم کر سکتے، تو پھر آپ کا یہ فرض ہے کہ اس فرض کی ادائیگی کے لیے اپنی جیب پر بوجھ ڈالیں۔ اور اپنے گاؤں، قصبہ یا محلّہ میں جہاں مسلمان بچے آسانی سے پہنچ سکیں، ابتدائی تعلیم کا باضابطہ مکتب (پرائمری اسکول) قائم کریں۔ اس اسکول میں باضابطہ درجہ بندی ہو اور اس کا کورس وہی ہو، جو سرکاری پرائمری اسکول کا ہوتا ہے۔ آپ اس میں صرف اتنی ترمیم کر لیں کہ نظام الاوقات (پروگرام) اپنی ضرورت کے مطابق بنائیں۔ یعنی سرکاری پرائمری اسکول میں تمام گھنٹے سرکاری کورس کے لیے دیے جاتے ہیں۔ آپ صرف چار گھنٹے سرکاری کورس کے لیے رکھیں اور دو گھنٹے مذہبی تعلیم کے لیے مخصوص کر لیں۔ اور ایسا طریقۂ تعلیم اور دینیات کا ایسا نصاب تجویز کریں کہ دو گھنٹے میں قرآن شریف اور دینیات کی تمام ضروری تعلیم اطمینان سے ہو سکے۔

پروگرام (نظام الاوقات) بنانے کی ایک آسان شکل یہ بھی ہے کہ آپ گھنٹہ چالیس منٹ کا رکھیں۔ اس طرح چھ گھنٹوں کے نو گھنٹے ہو جائیں گے۔ آپ چھ گھنٹوں میں سرکاری کورس کے مطابق تعلیم دیں اور باقی تین گھنٹوں میں قرآن شریف، دینیات اور اردو کی تعلیم دیں۔ اردو کی تعلیم کی آسان ترین صورت یہ ہے کہ آپ دینیات کے وہ رسالے منتخب کریں، جو ادب اور زبان کے لحاظ سے بھی اس معیار کے ہوں کہ ان سے تعلیم اردو کا کام لیا جا سکے۔ اس صورت میں اردو زبان کے لیے اور کتابیں نہیں پڑھانی پڑیں گی۔ دینیات کے رسالوں ہی سے دونوں کام ہو جائیں گے۔ صرف اردو لکھائی کے لیے تختی لکھوانی ہوگی۔ اور پھر انھیں دینیات کے رسالوں سے املا لکھوانا ہوگا، اس طرح ان کو جہاں اردو لکھنے کی مشق ہوگی، دینیات کے سبق بھی ان کے ذہن نشین ہو جائیں گے۔

(۴) فرض نمبر ۴: شبینہ یا صباحی مکاتب کا قیام

بہت سی جگہیں ایسی ہوتی ہیں جہاں پرائمری اسکول یا مکتب قائم کرنا دشوار ہوتا

ہے،اس کے لئے مولانا کی تجویز یہ ہے:

اگر کہیں مسلمانوں کی اتنی تعداد نہیں ہے، یا بدقسمتی سے ان میں یہ احساس نہیں ہے کہ مالی امداد کر کے باضابطہ مدرسہ (پرائمری اسکول) قائم کر سکیں،تو پھر فریضۂ تعلیم کی ادائیگی کی شکل یہ ہے کہ محلّہ میں صباحی یا شبینہ مکتب قائم کریں اور کسی معلم یا معلّمہ کی خدمات اس کے لیے حاصل کریں۔جن مدرسوں میں گیارہ سال سے زیادہ عمر کے بچے بھی تعلیم پاتے ہیں،ان میں ایسا انتظام کیا جا سکتا ہے کہ صبح کے ابتدائی دو گھنٹے یا شام کے دو گھنٹے پرائمری سرکاری اسکول میں تعلیم پانے والے بچوں اور بچیوں کے لیے مخصوص کر دیں اور باقی اوقات میں گیارہ سال سے زیادہ عمر کے بچوں کو تعلیم دی جائے۔

(۵) فرض نمبر ۵: ہر مسجد میں تعلیم گاہ و تربیت گاہ

اسلام کے قرن اول میں جو نظام رائج تھا کہ مسجدیں صرف نماز ہی کے لئے نہیں تھیں بلکہ مذہبی تعلیم گاہ اور دینی تربیت گاہ بھی تھیں،مولانا لکھتے ہیں کہ اس نظام کو دوبارہ جاری کر کے بنیادی مذہبی تعلیم کے مسئلہ پر قابو پایا جا سکتا ہے:

آخری شکل اور اسلام کے نظام اجتماعی کے لحاظ سے سب سے پہلی شکل یہ ہے کہ مسجد کے امام صاحب کو بچوں کی مذہبی تعلیم و دینی تربیت کی طرف متوجہ کیا جائے اور جس طرح جنوبی ہند کے بیشتر قصبات و دیہات اور شہروں میں رواج ہے کہ صبح یا شام کو (اسکول کے وقت سے پہلے یا بعد کو) گاؤں یا محلے کے بچے دو گھنٹے کے لیے مسجد میں آتے ہیں اور امام صاحب سے دینیات و قرآن شریف پڑھتے ہیں،شمالی ہند میں بھی اس کو رواج دیا جائے۔

اسلامی تعلیم کے لحاظ سے مسجد محلّہ کا اجتماعی مذہبی مرکز ہے۔ اور امام صاحب محلّہ کے پیشوا اور مربّی اور سرپرست ہیں۔ یہ حیثیت اگر پیش نظر ہے،تو آسانی سے ہماری ہر ایک مسجد مذہبی تعلیم گاہ اور دینی تربیت گاہ بن سکتی ہے اور وہ نظام پھر سے زندہ ہو سکتا ہے جو اسلام کے قرنِ اوّل میں رائج تھا۔

............محلّہ یا گاؤں والے امام صاحب کی اقتصادی ضروریات پوری کریں اور امام

صاحب محلّہ والوں کو اپنی تعلیمی اور اخلاقی کمک پہنچائیں۔ یہ وہ تعاون ہے، جس کو اللہ تعالیٰ نے ہم پر فرض کیا ہے۔

(۶) فرض نمبر ۶: نصاب کی کتابیں

اس کے تحت مولانا جو کچھ لکھ رہے ہیں وہ ایک ماہر تعلیم ہی کی سوچ اور فکر ہو سکتی ہے:

> یہ تمام صورتیں جو اوپر پانچ نمبروں میں بیان کی گئی ہیں، ان کی کامیابی اس پر موقوف ہے کہ:
>
> (۱) دینیات کی کتابیں ایسی آسان، جامع اور مختصر ہوں کہ دین کی تمام ضروری باتیں ان کے ذریعہ معلوم ہو جائیں اور ان کے پڑھنے پڑھانے کے لیے ایک گھنٹہ کافی ہو سکے۔
>
> (۲) بچوں کی نفسیات کا لحاظ کرتے ہوئے تعلیم و تربیت کا ایسا دل چسپ طریقہ اختیار کیا جائے، جو بچوں میں دینی تعلیم کا شوق پیدا کر دے اور اس مکتب سے ان کو ایسا لگاؤ اور تعلق ہو جائے کہ سرکاری اسکولوں سے چھٹی کے وقت ان کو یہاں آنا ناگوار نہ ہو۔
>
> کتابوں کا مسئلہ بفضلہ تعالیٰ جمعیۃ علماء ہند اور دینی تعلیمی بورڈ طے کر چکے ہیں۔
> (مسئلہ تعلیم اور طریقۂ تعلیم: ۲۹)

اس کے بعد مولانا نے نصاب کا تعارف، اس کی اہمیت و جامعیت، اسے کتنے وقت میں اور کس طرح پڑھایا جائے، اس پر تفصیل سے گفتگو کی، جو معلمین اور ذمہ داران مکاتب کے لئے بہت اہم ہے، اس گفتگو کے بعد مولانا پُر عزم حوصلہ اور یقین کے ساتھ یہ لکھ رہے ہیں:

> اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم پر اعتماد کرتے ہوئے یہ دعویٰ پورے وثوق کے ساتھ کیا جا سکتا ہے کہ اگر ان رسالوں کے مضامین بچوں کے ذہن نشین کر دیے جائیں، تو ان کے دل و دماغ (ان شاء اللہ) ان تمام جراثیم سے محفوظ رہیں گے، جو کلچر، تہذیب قدیم یا نیشنلزم وغیرہ کے نام پر فضا میں پھیلائے جا رہے ہیں۔ (واللّٰہ علی

مانقول وکیل وھو ولی التوفیق و علیه التکلان)

.......جہاں تک اصول کا تعلق ہے، طریقۂ تعلیم اور ترتیبِ مکاتب کے چند کارآمد اور مفید اصول آنے والے ابواب میں پیش کیے جارہے ہیں، لیکن ظاہر ہے کہ ان سے مفید نتیجہ اسی وقت برآمد ہوسکتا ہے، جب ان پر عمل ہو۔

تعلیم کو دلچسپ بنائیے:

ہمارے یہاں عام طور سے مکاتب میں تعلیم کا جو نظام ہے، اس کی وجہ سے بچے اسے تعلیم گاہ کم اور قید خانہ زیادہ سمجھتے ہیں، اور مارے باندھے کسی طرح مدرسہ پہنچتے ہیں یا پہنچائے جاتے ہیں، ضروری ہے کہ ایسا سسٹم اور نظام رائج کیا جائے اور ایسی دلچسپی کا سامان کیا جائے کہ بچے مدرسہ کو تعلیم گاہ ہی سمجھیں، اسے جیل اور قید خانہ تصور نہ کریں، مولانا اس سلسلے میں کتنی عمدہ بات لکھتے ہیں:

مذہبی اور دینی تعلیم کو غیر منفعت بخش تو اسی وقت سے سمجھا جارہا ہے، جب سے مادہ پرستی کا آغاز ہوا اور یورپ کی سنہری روپ والی تہذیب نے ایشیا کی نورانی روحانیت کا مذاق اڑانا شروع کیا۔ سیکولر دورِ حکومت میں اس مذاق کی اصلاح، ظاہر ہے بہت ہی مشکل ہوگئی ہے۔ اس دشواری کے ساتھ ساتھ بہت ہی خطرناک صورتِ حال یہ ہے کہ ترقی پذیر ہندستان میں تعلیم کو زیادہ سے زیادہ دل چسپ بھی بنایا جائے گا اور ترغیب وتحریص کی صورتیں بھی زیادہ سے زیادہ اختیار کی جائیں گی۔ مثلاً جدید طریقۂ تعلیم میں یہ اصول تو قطعی طور پر تسلیم کرلیا گیا ہے کہ تعلیم کا ایسا طریقہ اختیار کیا جائے، جس میں خوف اور دہشت کے بجائے بچوں کے لیے کھیل اور تفریح کا سامان ہو، مزید براں دیہاتی حلقوں میں بچوں کو دودھ بھی دیا جاتا ہے۔ کھلونے اور مٹھائیاں بھی تقسیم کی جاتی ہیں اور بہت ممکن ہے کہ مستقبل قریب میں ان کو اسکول کی مقرر کردہ پوشاک (وردی) بھی دی جایا کرے۔

ترغیب وتحریص کی ان تمام صورتوں کے ساتھ، اگر ہمارے طریقۂ تعلیم میں وہی پرانی یبوست باقی رہی، وہی روکھا؛ بلکہ کھردرا طریقہ رائج رہا، تو اس کے معنیٰ

یہ ہوں گے کہ دینی تعلیم اور دینی مذاق کو ایک طرف زمانہ کے رجحانات ختم کریں گے، تو دوسری طرف ہم خود اپنے طرزِ عمل سے ان کا گلا دبا کر فنا کر دینے میں کوتاہی نہ کریں گے۔ (معاذ اللہ)

پس ہمدردی دین و ملت کا بہت ہی ضروری مطالبہ ہے کہ ہم اپنے طریقۂ تعلیم میں تبدیلی پیدا کریں۔ بے شک دودھ اور مٹھائیاں تقسیم کرنا یا وردی بنا کر بچوں کو پہنانا ہمارے لیے مشکل ہوگا مگر میٹھا طریقہ اور شیریں طرزِ عمل تو ہم جب بھی چاہیں اختیار کر سکتے ہیں۔ اور اسی سے دودھ اور مٹھائی کا کام لے سکتے ہیں۔

اساتذۂ مکاتب و مدارس کی ذمہ داریاں:

مولانا ادائے فرض کی شق نمبرے ''طریقۂ تعلیم'' کے اصول ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں (روئے سخن اساتذہ کی طرف ہے):

اس سلسلے میں سب سے بڑی اور بنیادی بات تو استاد کی لگن ہے، یعنی اگر معلم صاحب اس جذبہ میں سرشار ہوں کہ جو بچہ ان کے یہاں آئے، وہ محروم نہ جائے تو لامحالہ وہ کوشش کریں گے کہ بچہ کو سمجھ کر ایسا طریقہ اختیار کریں، جس سے کامیابی ممکن ہو اور بچہ فیضیاب ہو سکے۔ وہ طریقہ کہیں نرم ہوگا کہیں گرم۔

اس کے اس سلسلہ میں چند اصول ذکر کرتے ہیں:

بچوں کو مانوس کیجیے:

سب سے پہلا اصول، جو کسی وقت بھی نظر انداز نہ ہونا چاہیے، یہ ہے کہ جیسے ہی بچہ آپ کے یہاں داخل ہو، سبق شروع کرانے سے پہلے آپ اس کو اپنے سے مانوس کر لیں، چھ سال کا بچہ جو اپنی سوچی سمجھی بات بھی پوری طرح زبان سے ادا نہیں کر سکتا، جیسے ہی کسی اجنبی کے سامنے پہنچتا ہے، مرعوب ہو جاتا ہے۔ بسا اوقات اجنبی صورت سے اس کا ننھا سا دل لرزنے لگتا ہے۔........ایک گھبرایا ہوا بچہ نہ کچھ سمجھ سکتا ہے، نہ یاد رکھ سکتا ہے۔ ایسی صورت میں یاد کرنے کی فرمائش سے اس کو اور زیادہ وحشت ہوتی ہے۔

پس معلم خیر اور مشفق استاذ کا سب سے پہلا کام یہ ہے کہ بچہ کو اپنے سے مانوس کرلے۔اس کے دماغ کو مطمئن کرے۔اور اس کی طبیعت کو اپنی طرف مائل کرے۔
اور عام طور پر بچہ کے دل میں جو مدرسہ یا مکتب کا ڈر بیٹھا دیا جاتا ہے،اس کو دل سے نکالے۔
جب بچہ آپ سے اور مکتب کے ماحول سے کسی قدر مانوس ہوجائے،تب اس کو پڑھانا شروع کیجیے۔
بچہ کو مانوس کرنے میں اگر ایک ہفتہ بھی صرف ہوجائے،تو مضائقہ نہیں۔اس ہفتہ میں آپ اس کو بسم اللہ وغیرہ یاد کرادیجیے۔ (ص:۲۴)

(۱) درجہ کو صاف ستھرا رکھیے اور اس کو سجائیے
(۲) بچوں کی صلاحیتوں کو سمجھیے اور ان سے کام لیجیے
(۳) حرفوں کی آواز بتائیے اور کم سے کم حرف بتاکر پڑھنا سکھادیجیے
(۴) سب سے پہلے اللہ پڑھنا سکھائیے
(۵) دلچسپ تمہید سے طلب اور شوق پیدا کیجئے

مولانا محمد میاں صاحب نے ان اصولوں کے تحت جو کچھ تحریر فرمایا ہے سب کو نقل کرنے سے کافی طوالت پیدا ہوجائے گی۔تعلیم وتدریس سے جو حضرات وابستہ اور منسلک ہیں انھیں محسوس ہوگا کہ مولانا اس میدان کے کتنے زبردست شہ سوار تھے،انھوں نے بچوں کی نفسیات کا کس قدر لحاظ کیا ہے،آج کل کے یورپین ماہرین تعلیمات اور دانشوروں کا طریقۂ کار یہی ہے کہ وہ بچوں کی نفسیات سمجھنے اور صلاحیت ورجحان جاننے پر اپنی پوری توجہ مرکوز کرتے ہیں،اور اس کے لئے تمام تر وسائل وذرائع کا استعمال کرتے ہیں،ان کے شوق ورجحان کے لحاظ سے ان کے مضامین کا انتخاب کرتے ہیں،کسی کو سائنس سے دلچسپی ہے،کسی کا میڈیکل لائن کی طرف رجحان ہے،کسی کو انجینیر نگ سے رغبت ہے،کسی کو لکھنے پڑھنے کا شوق ہے،تو انھیں خطوط پر ان کی تربیت کی جاتی ہے،اور انھیں فنون میں اس کی صلاحیتوں کو پروان چڑھایا جاتا ہے۔یہی ان کی تیز رفتار ترقی کا بنیادی سبب ہے،یہ ایک مسلمہ حقیقت

ہے کہ جب کسی چیز کے ساتھ ذوق وشوق اور ذاتی دلچسپی شامل ہو جائے تو کام کی رفتار کئی گنا بڑھ جاتی ہے۔

اگر آج بھی اہل مکاتب و مدارس حالات زمانہ کے تھوڑے فرق سے یعنی بدلتے حالات وضروریات کا لحاظ کرتے ہوئے ان اصولوں کو نافذ کریں تو تعلیمی انقلاب لا سکتے ہیں۔

دینی عربی تعلیم اور عصری تعلیم :

مولانا سید میاں نے تعلیم و تربیت کا جو ضابطہ اور نصاب تیار کیا ہے اس کی جامعیت اس سے ثابت ہوتی ہے کہ انھوں نے اگرچہ دینی تعلیم اور اسلامی تربیت کو اولیت دی ہے، کیونکہ یہی مسلمانوں کا دینی فریضہ ہے اور اس وقت کے حالات کا تقاضہ بھی یہی تھا، لیکن دنیاوی تقاضے اور مسائل بھی زندگی کا لازمہ ہیں، اس کے لئے جدید عصری تعلیم کا ہونا بھی ضروری ہے، خاص کر ایک ایسے ملک میں جس میں مسلم اقلیت کو تعلیم کے میدان میں پیش قدمی کے بغیر نہ اہمیت حاصل ہوگی اور نہ ہی سرکاری امور میں حصہ داری! لہٰذا ہندوستانی مسلمانوں کے سماجی اور سیاسی مسائل کے حل کے لئے عصری علوم کا حاصل کرنا ضروری ہے اور اپنے ایمان وعقیدہ اور ملی تشخص وامتیاز کو پختگی کے ساتھ باقی رکھنا بھی فرض ہے۔ اسی لئے عربی مکاتب و مدارس اور عصری درسگاہوں میں ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے مولانا نے اپنے رسالہ دینی تعلیمی تحریک اور دستور العمل میں ضلعی اراکین کو مشورہ دے رہے ہیں:

بورڈ کے اراکین اور مبلغ (آرگنائزر) صاحبان سب سے پہلے یہ معلوم کریں گے کہ:

(۱) پورے ضلع میں کتنے عربی مدرسے ہیں؟ جہاں درس نظامی یا کسی اور نصاب کی تعلیم ہوتی ہے۔

(۲) کتنے اسکول، کالج یا پرائمری درجات کے مدرسے یا مکتب ہیں، جن کا انتظام مسلمان کرتے ہیں۔

(۳) ڈسٹرکٹ بورڈ کے دفتر سے ان پرائمری اسکولوں کی فہرست حاصل کر لی جائے، جو اس ضلع میں قائم ہیں۔

پھر عربی مدرسوں کے ذمہ دار حضرات کو آمادہ کیا جائے کہ وہ پرائمری اسکولوں کے معیار پر اپنے مدرسہ میں ابتدائی درجات قائم کریں، جن میں سرکاری اسکولوں کے کورس کے ساتھ

دینیات کی تعلیم بھی درجہ وار دی جائے۔ بچوں کی دینی تربیت کا بھی انتظام کیا جائے۔ اس موقع پر یہ حقیقت نظرانداز نہ ہونی چاہیے کہ عربی مدارس اگر عربی کی اعلیٰ تعلیم دے کر فرضِ کفایہ انجام دے رہے ہیں، تو بچوں کی بنیادی مذہبی تعلیم ــــــ جس کے ذریعہ بچے دین و ایمان اور فرض عبادتوں سے آشنا ہوں ــــ فرض عین ہے۔ زمانہ کے تقاضوں نے ان فرض عین کی ادائیگی کا یہی طریقہ طے کر دیا ہے کہ دینی تعلیم کے ساتھ دنیاوی تعلیم بھی دی جائے۔ لہٰذا درجات کی یہ ترتیب بھی ضروری ہوگئی ہے۔ نیت بخیر ہے تو اس میں بھی ادائے فرض کا ثواب ملے گا۔

(۱۰) معلم و مبلغ صاحبان اور حضرات اراکین بورڈ کا فرض ہے کہ وہ تحریک کے چلانے میں انتہائی ہوش مندی، مزاج شناسی اور بیدار مغزی سے کام لیں۔ دیہات کے عام آدمی تعلیم کی قدر و قیمت نہیں پہچانتے، ان کو مانوس اور آمادہ کرنے میں بہت زیادہ سلیقہ اور تدبر کی ضرورت ہوگی۔

مولانا نے دس نکات کے ذریعہ اس موضوع پر تفصیلی گفتگو فرمائی ہے، ہم نے طوالت کی وجہ سے درمیانی حصہ حذف کر دیا جسے اصل رسالہ میں دیکھا جاسکتا ہے۔

یہ ساری باتیں آج سے ستر سال پہلے کی ہیں، ایسا محسوس ہوتا ہے مولانا کی نگاہوں کے سامنے آنے والے ہندوستان کا مکمل نقشہ اور صورتحال موجود ہے۔ آج تو گجرات کے بعض مدارس میں نصاب تعلیم اس اعتبار سے مرتب کیا گیا ہے کہ عربی پنجم تک تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ ہائی اسکول کا امتحان بھی دیتے ہیں، اور اب یو پی میں بھی بعض مدارس میں اس کا تجربہ کیا جارہا ہے۔

مولانا سید محمد میاں صاحب کی ایک طویل ترین تحریر عربی نصاب کے بارے میں ہے جس کا عنوان ہے ''عربی نصاب سے متعلق ضروری یادداشت'' یہ تحریر آج سے ۵۸ر سال پہلے لکھی گئی، اس کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا کی زمانہ شناس نگاہیں مستقبل کے پردے میں کتنی دور تک دیکھ لیتی تھیں، جو باتیں انھوں نے عربی نصاب کے تعلق سے اس وقت کہی ہیں وہ آج ہو بہو صادق آرہی ہیں۔ نصاب کا مفہوم، نصاب کے اجزاء، اور

''نصاب پر غور وفکر کیوں ضروری ہے'' کے ذیلی عنوان کے تحت بحث کرتے ہوئے مولانا لکھتے ہیں:

دوسرے نمبر پر سوال یہ ہے کہ فضلاء اپنے اندر کتنی ہی للہیت اور اخلاص کی پونجی رکھتے ہوں مگر مادی لحاظ سے ان کو لامحالہ معاشی اور اقتصادی ضرورتیں پیش آئیں گی، ان ضرورتوں کے پورا کرنے کی کیا سبیل ہے۔''...........

اس تمام صورتحال پر تفصیلی نظر ڈالنے کے بعد ہمیں غور کرنا چاہئے کہ:

(۱) جو نصاب تقریباً سو سال پیشتر رائج کیا گیا تھا، کیا اس پورے نصاب کے یا اس کے اجزائے مذکورہ بالا میں سے ہر ایک جزو کے کچھ مقاصد پیش نظر تھے؟

(۲) اگر کچھ مقاصد پیش نظر تھے جو اس وقت پورے ہوا کرتے تھے تو کیا وہ مقاصد اس نصاب اور اس کے اجزاء سے اب بھی پورے ہوتے ہیں؟

(۳) اس دینی نصاب کے دینی مقاصد کے ساتھ کیا اقتصادی اور معاشی مصالح بھی ملحوظ تھے؟ یا بعنوان دیگر اس نصاب میں ایسی صلاحیت تھی کہ دینی مقاصد کے ساتھ ساتھ معاشی ضرورتیں بھی قدرتی طور پر پوری ہوسکتی تھیں؟

(۴) کیا وہ معاشی ضرورتیں اب بھی پوری ہوسکتی ہیں؟

ان تمام امور پر مولانا نے تسلی بخش بحث کی ہے جس سے ان کے وفور علم، وسعت نظر اور تعلیمی مہارت کا پتہ چلتا ہے، یہ پورا مقالہ آج بھی ہمیں غور فکر کی دعوت دیتا ہے۔ اس مقالہ کو تو طوالت کی بنا پر ہم نہیں شائع کررہے ہیں، لیکن اس مجلّہ میں ہم مولانا کا ایک خط ''مکتوب بہ سلسلہ نصاب مدارس'' شائع کررہے ہیں، جو پاکستان کے ایک کے عالم کے استفسار کے جواب میں لکھا گیا ہے، اس سے بھی مولانا کی تعلیمی مہارت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

مولانا محمد میاں کے تیار کردہ نصاب، مسئلہ تعلیم وطریقہ اور نصاب تعلیم سے متعلق لکھے گئے مضامین، نقشہ جات، چارٹ اور اصول وضوابط برائے مکاتب کا سرسری نظر سے مطالعہ کرنے والا شخص بھی یہی محسوس کرے گا کہ مولانا ایک ممتاز وکامیاب ماہر تعلیم تھے، اور

اسے شاید یہ خیال ہوگا کہ مولانا کا صرف یہی ایک میدان تھا جس میں انھوں نے ایسے تابناک نقوش چھوڑے ہیں، حالانکہ صورتحال یہ ہے کہ جمعیۃ علماء کے ناظم ہونے کی حیثیت سے مولانا نے تاریخ ساز خدمات انجام دی ہیں، سیاسی میدان ہو یا تعلیم وتصنیف کی وادی ہو، ہر جگہ مولانا نے اپنے زندۂ جاوید نقوش چھوڑے ہیں۔

تعلیمی ونصابی خدمات:

جمعیۃ علماء ہند کی دینی تعلیمی تحریک میں مولانا محمد میاں صاحب کی خدمات دوطرح کی ہیں، ایک تو مولانا نے مسئلہ تعلیم اور طریقہ تعلیم پر ایک ماہر تعلیم کی حیثیت سے اپنے خیالات کا اظہار کیا اور اس سلسلے میں ایسے اصول ونکات وضع کئے جن پر عمل کرنے کی صورت میں کامیابی سو فیصد یقینی ہے، جس کا کچھ حصہ ان کی تعلیمی بصیرت ومہارت کے طور پر گزشتہ صفحات میں پیش کیا گیا۔ دوسری خدمت یہ کہ اس تحریک اور نظام تعلیم کے لئے مولانا نے بچوں کی عمر اور ان کی نفسیات کے لحاظ سے خود نصاب تیار کیا، اور اس نصاب کو پڑھانے کے لئے معلمین کو باقاعدہ اپنی نگرانی میں تین مہینے کی ٹریننگ دے کر تیار کیا، ان صفحات میں ہم مولانا کے قلم سے لکھی سے ہوئی کتابوں کا تعارف اور اس تحریک کے لئے مولانا کی فکرمندی، قربانی اور جانفشانی کا ذکر بھی کریں گے۔

پہلے دینی تعلیمی پروگرام کی داستان خود مولانا کی زبانی سنئے، جو انھوں نے ہفت روزہ الجمعیۃ کے ایڈیٹر مولانا وحیدالدین خاں سے دوران انٹرویو بیان کی:

> جمعیۃ علماء کے دینی تعلیمی کام کی تفصیل بتاتے ہوئے مولانا نے فرمایا: ۱۳/اکتوبر ۱۹۴۷ء کو مولانا آزاد نے دہلی میں ایک کانفرنس مسلم قائدین کی طلب کی تھی، کانسٹی ٹیوشن کلب میں دوتین روز تک اس کا اجتماع ہوتا رہا اور ہر فکر کے مسلم رہنما اس میں شریک ہوئے، مولانا آزاد نے اس میں کہا کہ پاکستان ایک حقیقت بن چکا ہے، اس کا انکار نہیں کیا جاسکتا، ہمیں اپنی جگہ پر ہندوستان میں رہنے کے لیے ایک راہ عمل طے کرنی ہے، اور راہ عمل یہی ہوسکتی ہے کہ ہماری سیاسی جدوجہد مشترک ہو، سیاست کے

بارے میں ہمارا پلیٹ فارم الگ نہ ہو، باقی رہا مذہب اور کلچر، اس کی حفاظت کے لیے ہمیں الگ انتظام کرنا ہے۔

اس کے بعد دسمبر ۱۹۴۷ء میں مشہور لکھنؤ کانفرنس ہوئی، جس میں طے کیا گیا کہ مسلمان کسی فرقہ وار سیاسی جماعت میں شریک نہیں ہوں گے، لکھنؤ کانفرنس کے بعد مولانا آزاد نے جمعیۃ علماء کے ورکروں کو دہلی میں جمع کیا اور اخبار الجمعیۃ کے دفتر میں ان سے خطاب فرمایا، ان کے سامنے یہ بات کہی کہ جمعیۃ علماء کے لیے کام کرنے کا اب وقت آیا ہے۔ مولانا نے بڑے اصرار اور وضاحت کے ساتھ کہا کہ مسلمانوں کو یہ اعلان کرنا چاہیے کہ ہماری تہذیب اور کلچر الگ ہے اور جمعیۃ علماء کا فرض ہے کہ اس کو محفوظ رکھنے کی کوشش کرے۔ مولانا نے یہ بھی فرمایا کہ شہروں کے بچے اپنے ماحول سے متأثر ہو کر مذہبی بن جاتے ہیں اور مذہبی معلومات حاصل کر لیتے ہیں مگر دیہات میں یہ ممکن نہیں ہے، لہٰذا جمعیۃ علماء کا یہ اہم فرض ہے کہ دیہات کے بچوں میں دینی تعلیم پھیلانے کی کوشش کرے۔

مولانا کی یہ تحریک اکابر جمعیۃ علماء کی رائے اور ان کے خیالات کے عین مطابق تھی چنانچہ اس سلسلہ میں کوشش کا آغاز ہو گیا اور فروری ۱۹۴۸ء میں جمعیۃ علماء ہند کے دفتر میں ماہرین تعلیم کا ایک اجتماع کیا گیا جس میں جامعہ ملیہ کے مایہ ناز ماہر تعلیم شفیق الرحمٰن مرحوم نے بھی شرکت فرمائی نیز لکھنؤ وغیرہ کے علماء بھی اس میں شریک ہوئے، اس وقت یہ طے کیا گیا کہ دیہات کے نصاب کے واسطے ایک سیلبس مرتب کر کے اس کے بموجب کتابیں لکھوائی جائیں اور اس تحریک کو عام کرنے کے واسطے جگہ جگہ کانفرنسیں کی جائیں، چنانچہ احمد آباد، الہ آباد، اور دیگر مقامات پر اجتماعات کئے گئے، اور پھر ۱۹۵۴ء میں ممبئ میں دینی تعلیمی کنونشن ہوا جس میں طے کیا گیا کہ حکومت کے ذرائع سے قطع نظر کر کے دینی تعلیم کا انتظام مسلمان خود کریں، اور یہ بھی طے کیا گیا کہ ہر فرقہ اپنے فرقے والوں کے لیے ایک نصاب مرتب کرے، نصاب کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم دینے والوں کی ٹریننگ کا انتظام بھی کیا گیا، دہلی میں گھٹا مسجد میں تربیتی مرکز قائم ہوا اور تین سال تک یہ سلسلہ جاری رہا۔

مولانا وحید الدین خاں لکھتے ہیں:

مولانا محمد میاں صاحب اس پروگرام کے انچارج تھے، اس سے پہلے گھٹا مسجد بالکل ویران تھی، مولانا محمد میاں نے پہلی بار اس کو آباد کیا اور اسی غرض سے وہاں ایک سال اعتکاف کیا۔ دینیات کا نصاب مرتب کرنے کے لیے مولانا نے مختلف اہل علم سے خط وکتابت کی اور ربط قائم کیا، مگر جب کسی نے عملی توجہ نہ دی تو خود قلم اٹھایا، اس سلسلے میں جماعت وار رسالے مرتب کئے، طریقہ تعلیم پر بھی ایک کتاب لکھی، ایک ایسا سلسلہ بھی جاری کیا کہ بچہ دس دن میں پارہ پڑھ سکے، پھر ہر جماعت کے لیے الگ الگ چارٹ بھی تیار کئے، چنانچہ اٹھارہ چارٹ اس سلسلہ میں شائع ہو چکے ہیں۔ مولانا نے قاعدہ کے علاوہ دینی تعلیم رسالہ تیار کیا جس کے بارہ حصے ہیں، یہ رسالے بے حد مقبول ہیں۔

مکاتب کے قیام کے سلسلہ میں جمعیۃ علماء کی خصوصی توجہ ان علاقوں میں رہی جو ۱۹۴۷ء میں تباہ ہوگئے تھے، اور وہاں اکا دکا مسلمان باقی رہ گئے تھے، مثلاً مشرقی پنجاب اور بھرت پور، راجستھان، نیز اجمیر شریف کا دیہاتی علاقہ، ان علاقوں میں مکاتب کے قیام کو اولین اہمیت دی گئی، پھر ضلع سورت اور کھیڑا وغیرہ میں شدھی کی تحریک کا خطرہ ہوا تو وہاں بھی مکاتب قائم کئے گئے، دورے کئے گئے، اور تقریباً دو سو مکاتب قائم کئے گئے۔

جمعیۃ علماء ہند کی دینی تعلیمی تحریک کے بارے میں مولانا اخلاق حسین قاسمیؒ لکھتے ہیں:

دینی تعلیم کی تحریک جس کی محرک جمعیۃ علماء ہند تھی، اس تحریک کو عملی طور پر چلانے کا کام حضرت مولانا محمد میاں علیہ الرحمہ کے ہاتھ میں تھا۔

مولانا محمد میاں صاحب دراصل اس تاریخی جماعت کی زبان وقلم تھے، تعلیمی سرگرمیوں کے امیر تھے، مولانا مرحوم کو مولانا احمد سعیدؒ جمعیۃ علماء کا ذوالنون مصری کہا کرتے تھے۔

مرکزی دفتر گلی قاسم جان دلی میں مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ کی بائیں طرف دو بزرگ ہستیاں بیٹھی نظر آتی تھیں، پہلے مولانا محمد میاں صاحب اور ان کے بعد مفتی عتیق الرحمٰن صاحب۔ یہ دونوں بالترتیب جماعت کی روح اور اس کی فکر تھیں، اور انھیں مولانا حفظ

الرحمٰن صاحب کی عملی سرگرمیوں اور ملی جہاد کا دماغ سمجھئے۔

مولانا محمد میاں صاحب نے دینی تعلیم کی تحریک کے لئے معلم تیار کرنے کی غرض سے دلی کی تاریخی مسجد (زینت المساجد دریا گنج) میں ایک تربیتی مرکز قائم کیا۔اس تربیت کے امیر مولانا محمد میاں صاحب تھے،تربیت کے سلسلے میں ہر ہفتہ ایک عالم دین اور تعلیمی دانش ور کا لکچر اور تقریر کروائی جاتی تھی۔

ان علماء میں ایک تقریر کے لئے مولانا محمد یوسف صاحب علیہ الرحمہ کو بھی دعوت دی گئی اور مولانا نے قبول کرلیا۔

مولانا محمد میاں صاحب علیہ الرحمہ نے مجلس تربیت کے مقاصد کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا:

> ''جمعیۃ علماء ہند دینی تعلیمی تحریک کے ذریعہ ایسے دینی کارکن،ایسے معلم ومدرس تیار کرنا چاہتی ہے جو زمانۂ حال (مادی ترقی) کے مطابق عقائد وعبادات کے ساتھ اخلاق ومعاشرت کے اسلامی احکام اور اخلاق ومعاشرت سے متعلق اسوۂ رسول ﷺ اور اسوۂ صحابہؓ کی اہمیت کو بھی تسلیم کرے،اور مسلمانوں کی خدمت،عبادت واخلاق دونوں میدان میں انجام دے،دنیاداری،معیشت،تجارت اور جدید تعلیم وترقی کے کاموں کو گناہ تصور نہ کرے۔مسلمانوں کی تاریخ کا عہد عروج اسی راہ پر چلنے سے ہوا،اور دین کے وسیع اور کامل تصور سے علیٰحدہ ہو کر ہم زوال کے گرداب میں پھنس گئے۔

جب جمعیۃ علماء نے اپنے لکھنؤ اجلاس میں یہ طے کرلیا کہ دینی تعلیم کی ذمہ داری کو حکومت سے قطع نظر وہ خود پورا کرے گی اور اس کے لئے مولانا محمد میاں ذمہ دار بنائے گئے تو انھوں نے تحریک کی کامیابی اور اس کے نفاذ کے لئے اپنی تمام تر توانائیاں صرف کردیں،۶؍ اگست ۱۹۴۹ء کے الجمعیۃ میں انھوں نے اس سلسلہ میں ایک تفصیلی مضمون لکھا کہ:

> ''جس طرح ملک کی ترقی کے لئے تعلیم کا مسئلہ بنیادی حیثیت رکھتا ہے،ملت کی اصلاح اور ترقی بھی تعلیم پر موقوف ہے،مذہبی تعلیم اگر نہ ہوتو اول تو مذہب کا وجود ہی نہ رہے گا اور اگر کچھ وجود باقی بھی رہے گا تو وہ ایک جسم ہوگا جو روح سے خالی ہوگا،یہ

بے روح کا جسم نہ خود اپنے لئے مفید ہے نہ ملک اور اہل ملک کے لئے ۔ بلکہ بسا اوقات اس لاشۂ بے روح سے اغراض پرست جماعتیں ایسے فائدے حاصل کرتی ہیں جو مذہب بلکہ انسانیت کے لئے باعث شرم ہیں۔

........اس بنا پر اسلام نے جس طرح انسان کی فلاح و بہبود کے لئے مذہب کو لازم گردانا ہے ایسے ہی مذہبی تعلیم کو بھی لازمی قرار دیا ہے۔ جمعیۃ علماء ہند نے اپنے اس لائحۂ عمل میں اجلاس عام لکھنؤ میں اس نے منظور کیا ہے، مسلمانوں کو اسی فرض کی طرف توجہ دلائی ہے جمعیۃ علماء کی انتہائی آرزو ہے کہ مسلمان اپنے اس فرض کو پوری طرح محسوس کریں اور اپنے بچوں کو نہ صرف یہ کہ مذہب و اخلاق کی تعلیم سے واقف کرائیں بلکہ وہ ان کو ان تعلیمات کا عامل اور مذہبی احکام کی تعمیل کا خوگر اور عادی بھی بنائیں۔

اس کے بعد مولانا ابتدائی تعلیم کے نصاب کا خاکہ پیش کر کے حضرات اہل علم سے درخواست کی کہ وہ اس کو ملاحظہ کر کے اپنی آراء سے نوازیں تا کہ اس کی روشنی میں نصابی کتابیں تیار کی جا سکیں۔ اس اعلان کے چھ ماہ بعد ر فروری ۱۹۵۰ء کو مولانا نے دوبارہ اس مضمون کو الجمعیۃ میں شائع کرایا اور شکوہ بھی کیا کہ آج سے چھ ماہ قبل ہم نے ملک کے اُن حضراتِ اہل علم سے جو اس موضوع سے دلچسپی رکھتے ہیں مشورہ طلب کیا تھا، لیکن ان حضرات کے مشاغل نے ان کو اس کا موقع نہ دیا کہ وہ کچھ رائے دے سکیں، اس لئے اسے دوبارہ شائع کیا جا رہا ہے، لیکن جب کہیں سے کوئی خاص مدد نہیں ملی تو مولانا نے خود ہی قلم اٹھایا اور ایک کہنہ مشق صاحب قلم و ماہر تعلیم کی طرح خود ہی ''دینی تعلیم کا رسالہ'' کے نام سے بارہ حصے تیار کر دیئے، مولانا کے حسن اخلاص کی برکت تھی کہ ان رسائل کو وہ قبول عام حاصل ہوا کہ آج تک زمانہ کے اس قدر ترقی کر جانے کے باوجود اس کی قبولیت کی لو مدھم نہیں ہوئی ہے۔ میرا حال یہ ہے کہ دینی تعلیم میں جو کچھ پڑھ لیا خواہ اس کا تعلق نماز کے مسائل سے ہو، دعاؤں سے ہو، یا سیرت رسول سے ہو، یا اخلاق و معاشرت سے ہو، اب بھی ذہن و دماغ میں تازہ ہے۔ خصوصاً سیرت سے متعلق جو کچھ دوسرے اور پانچویں حصہ میں ہے اسے بار بار پڑھنا یاد ہے۔ ان بارہ رسائل کا الگ الگ چند سطروں میں تعارف پیش خدمت ہے تا کہ

سرسری طور پر ہی سہی ان کے مندرجات سے کسی قدر واقفیت ہو جائے۔

دینی تعلیم کا رسالہ نمبر۱ صفحات:۴۰

یہ ان بچوں کے لئے ہے جو حروف شناسی کے مرحلہ سے گزر چکے ہوں، اسی لئے اس میں اردو کے چھوٹے چھوٹے جملوں کو عربی رسم الخط میں لکھا گیا ہے، تاکہ بچے جو قاعدہ پڑھ کر آئے ہیں، ان کے لئے یہ رسم الخط مانوس رہے۔

اس میں ہر سبق میں نظم اور نثر دونوں نمونے موجود ہیں، سبق کے بعد بچوں کے ذہن اور ان کی دلچسپی کے لحاظ سے سوالات ہیں، اور مشکل الفاظ کو سبق کے بعد لکھ دیا گیا ہے تاکہ ان کے معانی بچوں کو یاد کرادئے جائیں۔

دینی تعلیم کا رسالہ نمبر۲ صفحات:۹۶

یہ سال دوم کی پہلی ششماہی کے لئے ہے۔ اس میں پہلا باب عقائد کے بیان میں ہے۔ جس میں درج ذیل عناوین ہیں، ''اللہ'' اس میں اللہ کی وحدانیت اور اس کی ربوبیت کو بیان کیا گیا ہے۔ پھر اسی موضوع پر ایک نظم ہے۔ پھر ''نبی ورسول'' ''مسلمان ہونے کا مطلب'' ''کلمہ طیبہ وکلمہ شہادت'' وغیرہ پر مضمون ہے اور اسے سوال وجواب کے طرز پر بھی سمجھایا گیا، غرض ہر وہ کوشش کی گئی ہے جس سے مضمون ذہن میں نقش ہو جائے۔

دوسرا باب سیرۃ نبوی پر ہے، جو ختم کتاب تک چلا گیا ہے، اس حصہ میں مکی زندگی میں اہل ایمان کی آزمائش تک کا بیان ہے، اس میں ایک نیا طرز اختیار کیا گیا ہے، سوالات کے ساتھ ہر سبق کے بعد اس کا نتیجہ اور حاصل سبق بھی چند سطروں میں بیان کیا گیا ہے۔ جیسے: ''رسول اللہ ﷺ کا ذریعہ معیشت'' کے بعد اس سبق کا یہ نتیجہ بیان کیا گیا:

> تجارت مسلمان کا اصل پیشہ ہے۔ دیانت وامانت اس کا اصلی سرمایہ ہے۔ تم سچے اور امانت دار بنو، ہر ایک کے ساتھ اخلاق سے پیش آؤ دنیا تم پر عاشق ہوگی۔

اللہ کے راستہ میں آنے والے مصائب وتکالیف اور دین کیلئے پیش آنے والی آزمائشوں کے بعد بطور نتیجہ اور حاصل سبق مولانا بچوں کو کتنی قیمتی بات ذہن نشین کرا رہے ہیں:

اللہ کے پیارے نبی محمد رسول اللہ ﷺ کی زندگی سے سبق حاصل کرو۔ دین کے لئے مصیبتیں اٹھانی سیکھو۔ ایمان کے لئے اذیتیں سہنی سیکھو۔ سچائی کے لئے قربان ہونا سیکھو۔ سچوں کے لئے مرنا سیکھو۔ اللہ کے لئے شہید ہونا سیکھو۔

دینی تعلیم کا رسالہ نمبر۳ صفحات:۸۸

یہ سال دوم کی دوسری ششماہی کے لئے ہے۔ اس کو رسالہ نمبر۲ کا حصہ دوم قرار دیا ہے، اُس میں دو باب تھے، اِس حصہ کی ابتداء تیسرے باب سے ہوتی ہے جو جس کا عنوان ''فقہ'' ہے۔ جس کا پہلا مضمون ''ضروری مسائل'' ہے، جس کا آغاز ''پاکی'' کے ذیلی عنوان سے ہوتا ہے۔ جس میں پاکی سے متعلق اسلامی تعلیم کو پیش کیا گیا ہے، ظاہر و باطن کی پاکی کو وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، پاک و ناپاک چیزوں کے ذکر کے بعد وضو کے مسائل، نماز کا طریقہ، اس میں پڑھی جانے والی سورتیں، اور تمام دعائیں مع ترجمہ درج کی گئی ہیں۔

چوتھا باب ''اخلاق'' ہے۔ اس میں چھوٹی چھوٹی سبق آموز اخلاقی کہانیاں بیان کی گئی ہیں، سبق کے اختتام پر اس سے حاصل ہونے والے سبق کو نہایت جامعیت اور اختصار کے ساتھ دلنشیں انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

پانچواں باب: ''معاشرت'' ہے، جس کا پہلا مضمون ہے ''بچوں کو کس طرح رہنا چاہئے'' یہ پورا باب نہایت اہم ہے اور بچوں کی تربیت کے لئے کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔

دینی تعلیم کا رسالہ نمبر۴ سال سوم کی پہلی سہ ماہی کے لئے

یہ رسالہ ۲۷؍صفحات پر مشتمل ہے، باب اول عقائد پر مشتمل ہے، جس میں توحید، فرشتے، قیامت، خدا کی کتابیں اور جنت دوزخ وغیرہ کے متعلق معلومات ہیں، سابقہ طرز کے مطابق اس میں بھی سبق کے اخیر میں سوال و جواب کا مفید سلسلہ ہے، اساتذہ کے لئے ہدایات بھی ہیں، ایک جگہ مولانا لکھتے ہیں:

> ''(۱) سمیع وبصیر کے معنی بتاتے ہوئے استاذ صاحب بچوں کو یہ بھی سمجھائیں کہ بے شک اللہ تعالی ہر چیز سنتا ہے، ہر چیز دیکھتا ہے، مگر ہماری طرح آنکھ،

کان یا زبان کا محتاج نہیں۔ ہم تو ہر چیز میں کسی آلہ اور ذریعہ کے محتاج ہیں، ہاتھ کے بغیر پکڑ نہیں سکتے، زبان نہ ہو تو بول نہیں سکتے، کھائے پئے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے، لیکن اللہ تعالیٰ کسی کا محتاج نہیں، اس کو کسی بات میں کسی کی حاجت نہیں، لہٰذا نہ وہ ہاتھ، پیر، آنکھ، ناک کسی کا محتاج ہے اور نہ ہماری طرح اس کے ہاتھ پاؤں یا آنکھ، ناک ہیں۔

(۲) استاذ صاحب بچوں کو یہ بھی سمجھا دیں کہ بولنا، سننا، دیکھنا، زبان، کان اور آنکھ ہی پر موقوف نہیں ہے، یہ تمام عضو گوشت پوست کے بنے ہوئے ہیں، جس خدا نے زبان کے ٹکڑے میں بولنے کی، آنکھ کی سفید چربی میں دیکھنے کی، اور کان کے پردوں میں سننے کی طاقت بخشی ہے، وہ چاہے تو زبان کا کام ہاتھ سے لے سکتا ہے۔ اس کے حکم سے آنکھ، ناک کا کام کر سکتی ہے اور وہ چاہے تو یہ تمام کام بغیر کسی آلہ اور ذریعہ کے بھی لے سکتا ہے۔

دوسرا باب عبادات پر مشتمل ہے۔ اس میں وضو، اذان، تکبیر اور نماز کے مسائل اور طریقے تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں۔

دینی تعلیم کا رسالہ نمبر۵ سالِ سوم کی دوسری سہ ماہی کا دینی نصاب

یہ رسالہ ۸۰ رصفحات پر مشتمل ہے، یہ مکمل سیرت نبوی پر مشتمل ہے، اس میں حضرت حمزہؓ کے اسلام سے لے کر ہجرت مدینہ تک کے واقعات نہایت دلکش و دلنشیں انداز میں بیان کئے گئے ہیں، سیرت سے فطری دلچسپی کی وجہ سے بلا مبالغہ میں نے اس حصہ کو سیکڑوں بار پڑھا ہے۔ آج بھی یہ حصہ سامنے آجاتا ہے تو ایک نظر اس کے مضامین پر ڈال ہی لیتا ہوں۔ اس میں مولانا نے بہت سے حواشی لکھے ہیں، جس میں بعض خاصے طویل ہیں۔

دینی تعلیم کا رسالہ نمبر۶ سالِ سوم کی دوسری سہ ماہی کا دینی نصاب

یہ رسالہ ۹۶ رصفحات پر مشتمل ہے، یہ اخلاق ومعاشرت سے متعلق مضامین پر مشتمل ہے، اس میں ''حقوق''، ''خدمت خلق''، شکر واحسان مندی اور ایفاعہد جیسے عناوین پر نہایت قیمتی اور بنیادی باتیں پیش کی گئی ہیں۔ غیبت، چغلی اور جھوٹ کی قباحت کو بیان کیا گیا ہے، اور دیگر اسلامی آداب کو ملت کے نونہالوں کے سامنے پیش کیا گیا ہے۔

دینی تعلیم کا رسالہ نمبر ۷ مشتمل بر عقائد و عبادات

یہ رسالہ ۱۱۲ ر صفحات پر مشتمل ہے، جس کی ابتداء مولوی اسماعیل میرٹھی کی ایک حمد سے ہوتی ہے، اس کے بعد مولانا حالی مرحوم کی ایک نعت پاک ہے۔ ان دونوں کے مشکل الفاظ کے معانی حاشیے میں لکھ دئے گئے۔ اس کے بعد ایمان مجمل و مفصل کا ذکر ہے، اس کے تحت اسلام، کفر، توحید، شرک اور اقسام شرک کو سوال و جواب کے انداز میں نہایت دلنشیں انداز میں بتایا گیا ہے، اساتذہ کرام کو ہدایت بھی دی گئی ہے کہ کس انداز میں اسے پڑھائیں۔

اس کے بعد ''فرشتے'' ''رسالت، نبوت اور وحی'' اور ''نبیوں کے متعلق ضروری عقیدے'' کے عنوان سے بنیادی دینی معلومات کو پیش کیا گیا ہے۔ ہر مضمون کے اخیر میں اس طرح سوالات دئے گئے ہیں، کہ جوابات میں پورے سبق کا خلاصہ آجائے۔

اس کے بعد ایک اہم مضمون ''ختم نبوت اور خاتم الانبیاء'' ہے۔ اس کے بعد ''ارکان اسلام'' کے عنوان سے ایک سبق ہے۔ اسی پر پہلا باب مکمل ہوجاتا ہے۔

پھر دوسرا باب شروع ہوتا ہے جو عبادات سے متعلق ہے، اس میں پہلے فرض، واجب، سنت مؤکدہ، سنت، مستحب، مباح، مکروہ تنزیہی، مکروہ تحریمی، حرام وغیرہ کی تشریح مثالوں کے ساتھ کی گئی ہے۔ اس کے بعد وضو کے فرائض، طہارت کے مسائل، اور نماز سے متعلق ہر ہر چیز پوری تفصیل کے ساتھ بیان کی گئی۔ اسی پر کتاب ختم ہوگئی ہے۔

دینی تعلیم کا رسالہ نمبر ۸ رسول اللہ ﷺ کی مدنی زندگی

یہ رسالہ ۱۰۴ ر صفحات پر مشتمل ہے، دینی تعلیم کے رسالہ ۲ میں ولادت نبوی سے مسلمانوں کے ابتلاء و آزمائش تک کے واقعات ہیں۔ اس کے بعد پانچویں حصہ میں حضرت حمزہؓ کے اسلام سے لے کر ہجرت مدینہ تک کے واقعات تھے، اس حصہ میں پوری مدنی کی تفصیلات ہیں، جو ہجرت سے لے کر وفات تک کے واقعات پر مشتمل ہے۔ اس میں سبق کے اخیر میں سوال و جواب اور جگہ جگہ قیمتی حواشی ہیں۔

دینی تعلیم کا رسالہ نمبر ۹ اخلاق اور اسلامی تہذیب

یہ رسالہ۱۰۴رصفحات پر مشتمل ہے،جس کا آغاز **الحب فی اللہ و البعض فی اللہ** سے ہوتا ہے، جس میں محبت کی تعریف، محبت کے تقاضے، کس سے محبت کرنی چاہئے ؟ ماں باپ سے محبت، صلہ رحمی، حسن سلوک کی اہمیت، اس کی صورتیں، اس کی برکتیں، بدسلوکی کا وبال وغیرہ کے عنوانات پر نہایت عمدہ اور دلنشیں انداز میں اسلامی تعلیمات کو پیش کیا گیا ہے۔اس کے بعد آداب معاشرت کے عنوان سے کھانے پینے، لباس و پوشاک کے آداب واحکام، مکانات وگلی کوچے کیسے ہونے چاہئیں، اس کی وضاحت، سونے جاگنے کے آداب، اخیر میں املاوخطوط نویسی کے طریقے بتائے گئے ہیں۔سابقہ حصوں کی طرح اس میں سبق کے بعد سوال وجواب کا سلسلہ ہے۔

دینی تعلیم کا رسالہ نمبر۱۰ عقائد وعبادات

یہ سب سے طویل رسالہ ہے، جو درجہ پنجم کی پہلی ششماہی کے لئے ہے، اس کے صفحات ۱۹۲ ہیں ، ابتداء اللہ کی وحدانیت اور شرک کی قباحت کو عقلی دلائل سے واضح کیا گیا ہے۔یہ مباحث چالیس صفحات تک ہیں ، اس کے بعد قیامت، برزخ اور حشر ونشر کا بیان ہے،ایک باب عظمت رسول پر ہے۔عقائد کے بعد عبادات کا بیان ہے۔جس کی ابتداء موزوں اور پٹی پر مسح کے شرائط واحکام سے ہوتی ہے،اس کے بعد نماز و جماعت کا بیان ہے،اس کے بعد اخیر تک اسی سلسلہ کے اسباق ہیں۔اس میں جمعہ اور عیدین پر بھی تفصیلی بحث کی گئی ہے۔

دینی تعلیم کا رسالہ نمبر۱۱ روزہ حج زکوۃ وغیرہ کا بیان

یہ رسالہ ۹۶ رصفحات پر مشتمل ہے، گزشتہ حصہ میں نماز کی بحث مکمل ہوگئی تھی، اس میں روزہ، رمضان، اعتکاف، زکوٰۃ، حج، قربانی اور عقیقہ وغیرہ کے احکام تفصیل سے بیان کئے گئے۔ان رسالوں میں ایک کمی یہ ہے کہ اکثر میں فہرست مضامین نہیں ہے، اب تک کے رسالوں میں ۸، ۱۰راور ۱۱میں فہرست ہے، ان کے علاوہ کسی میں فہرست نہیں ہے۔

دینی تعلیم کا رسالہ نمبر۱۲ استاد اور شاگردوں کی سات مجلسیں

یہ رسالہ ۱۲۸ رصفحات پر مشتمل ہے،اس میں استاد وشاگردوں کے سات مجلسیں

قائم کر کے اس مضمون کو سوال و جواب کے ذریعہ سمجھایا گیا ہے کہ "انسان کی حقیقت اور کائنات عالم میں اس کی حیثیت کیا ہے؟ انسان کی خصوصیتیں اور انسانیت کے تقاضے اور انسان کے فرائض و کمالات کو بیان کیا گیا ہے۔ یہ صفحہ ۴۸ تک ہے۔ اس کے بعد "بچوں کی بین الاقوامی کانفرنس" کے عنوان سے انسانی مساوات، بھائی چارہ، پیداوار، ملکیت اور سود جیسے مسائل پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ پوری یونیورسٹی کے طلبا کو تین بلاک میں تقسیم کر کے ان سے ان کے موقف کے مطابق تقریر کرائی گئی ہے، اور اس میں اسلامی نقطہ نظر کو نہایت جامعیت اور خوبی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

اسی حصہ پر دینی تعلیم کے رسالوں کا سلسلہ اختتام کو پہنچ گیا۔

مولانا کی تعلیمی خدمات کے ضمن میں یہ ایک اہم ترین کارنامہ ہے، گزشتہ ساٹھ پینسٹھ سالوں میں نہ جانے کتنے نونہالوں نے ان رسائل سے استفادہ کیا ہوگا۔ اور یہ ان کے اندر دینی جماؤ اور پختگی کا سبب بنے ہوں گے۔ اب تعلیمی سلسلے کے مزید چند رسائل کا تعارف کرا کے مضمون کو ختم کرتا ہوں۔

☆ ہمارے پیغمبر ﷺ مع عقائد و احکام اسلام

یہ مولانا محمد میاںؒ کی اولین تصانیف میں سے ہے۔ یہ چھوٹی سائز کے ۱۱۲ صفحات پر مشتمل ہے، اس کے دو حصے ہیں، پہلے حصے میں سیرت مبارکہ کو بالکل نوعمر بچوں کے ذہن کے مطابق چھوٹے چھوٹے عناوین کے تحت نہایت آسان انداز میں بیان کیا گیا ہے، اور جگہ جگہ بچوں کو مخاطب کر کے سبق کا حاصل اور خلاصہ چند سطروں میں بیان کیا گیا ہے، جیسے رسول اللہ ﷺ کی یتیمی کے ذکر کے بعد فرماتے ہیں:

> دیکھو! مصیبت کو نحوست مت سمجھو، یتیموں سے محبت کرو، بے وارثوں کی پرورش کرو، تمہیں کیا خبر کہ وہ کس بلندی پر پہنچیں گے۔ قدرت نے ان میں کیسے کیسے جوہر رکھے ہیں۔

کفار مکہ کے تمام تر ظلم و ستم اور ہر طرح کی آزمائشوں اور مصائب کے بعد بھی اسلام کا ننھا منا درخت پھلتا پھولتا رہا اور لوگ اس کے سایہ میں آتے رہے، اس وقت لکھتے ہیں:

دیکھو! اسلام کو کس کس طرح روکا گیا مگر وہ بے کسی میں کیسا بڑھا؟

دیکھو! اسلام کی ترقی کی خاطر جو کچھ رکھتے ہو قربان کردو، تم پھیلنے کی کوشش کرو، اسلام کا جھنڈا بلند کرو اور ساری دنیا پر چھا جاؤ۔

تم یہ بھی دیکھو، اسلام تلوار سے پھیلا یا اخلاق سے؟ یاد رکھو، اسلام کی طاقت سچائی ہے، اصل اقتدار اخلاق کا اقتدار ہے، تم اچھے اخلاق اختیار کرو، اچھی عادتیں اپناؤ، دنیا تمہاری عزت کرے گی۔ مسلمانوں کی بڑائی اسی میں ہے وہ اچھی باتوں اور اعلیٰ اخلاق میں سب سے بڑھے ہوئے ہوں۔

دیکھئے! اسلام کی یہ بنیادی تعلیمات کس طرح سہل اور دلنشیں انداز میں نونہالان امت کے دل و دماغ میں غیر محسوس طریقے سے داخل کی جارہی ہیں تا کہ وہ اسلام کے اصلی نمونے بنیں، اور اسلام کا اوریجنل نمونہ دنیا کے سامنے پیش کریں۔

صفحہ ۸۷ پر کتاب کا پہلا حصہ جو سیرت نبوی سے متعلق ختم ہو گیا، اس کے بعد چار صفحات میں ولادت سے لے کر وفات تک کے تمام واقعات کو نہایت حسن و خوبی کے ساتھ تاریخ وار بیان کیا گیا ہے تا کہ ایک نظر میں پوری سیرت بچوں کے سامنے آجائے۔

دوسرا حصہ اسلامی عقائد و احکام صفحہ ۳۸ سے ۲۱۱ تک ہے، اس کی ابتداء کلمہ طیبہ سے ہوتی ہے، سوال و جواب کے انداز میں اس کی عمدہ تشریح کی گئی، اس کے بعد ''خدا کی کتابیں'' ''فرشتے'' ''تقدیر'' ''صحابہ کرام سے متعلق ضروری عقیدے ''صحابہ کرام کی خصوصیات'' اور فرائض و احکام سے متعلق باتیں بیان کی گئی ہیں۔

یہ اہم کتاب چونکہ اب عام طور پر دستیاب نہیں ہے اس لئے قدرے تفصیل سے اس کا تعارف کرادیا، میں نے بھی اسے پی ڈی ایف فائل میں پڑھا۔

نورالاصباح ترجمہ نورالایضاح

یہ کتاب مولانا سید میاں صاحب کے تصنیفی سلسلہ کی پہلی کڑی ہے، اسی سے ان کی تصنیفی زندگی کا آغاز ہوتا ہے، میرے سامنے اس کا پہلا ایڈیشن ہے جو حسب فرمائش شیخ الادب والفقہ مولانا اعزاز علی صاحب ۱۳۴۸ھ (۱۹۲۹ء) میں مطبع قاسمی میں طبع ہو کر کتب

خانہ قاسمی دیو بند سے شائع ہوا۔ (یہ ایڈیشن دارالعلوم دیو بند کے کتب خانہ میں ''گوشۂ اکابر'' میں ''مولانا سید محمد میاں صاحب والے خانہ میں محفوظ ہے) اس کے علاوہ میرے سامنے کتابستان گلی قاسم جان کا چھپا ہوا موجودہ ایڈیشن بھی ہے۔

پہلے ایڈیشن (مطبوعہ ۱۹۲۹ء) میں ''التماس'' کے عنوان سے ساڑھے تین صفحات پر مشتمل مولانا کا پیش لفظ ہے، جس کی ابتداء ان الفاظ سے ہوتی ہے:

> ''آج **پہلا روز** ہے کہ یہ ناچیز طلبہ کرام کی خدمت میں تحریری حاضری کا شرف حاصل کر رہا ہے۔......آگے چل کر لکھتے ہیں: اپنے اس بیان کو ختم کر دینے سے پہلے میں اپنی اس قلبی مسرت کو ظاہر کر دینا ضروری سمجھتا ہوں جو مجھ کو اس تخیل سے ہمیشہ لاحق رہتی ہے کہ اس ناچیز کی **پہلی خدمت تالیف** کے سلسلہ میں اس کتاب سے متعلق ہوئی جس کی خدمت میں میرے بزرگ استاذ اور مقدس مخدوم جناب حضرت مولانا مولوی اعزاز علی صاحب کو بے حد شغف رہا ہے۔۔۔۔۔۔

اس پیش لفظ میں مولانا نے ترجمہ کرنے کی وجہ بھی لکھی ہے، اور حسب منشا ترجمہ نہ کرنے پر اعتذار بھی پیش کیا ہے، اور ترجمہ میں جو رموز استعمال کئے ہیں ان کی وضاحت بھی ہے۔ اس پیش لفظ کو بھی کتاب کے ساتھ ضرور شائع کرنا چاہئے تاکہ اس سے اس ترجمہ کی پوری غرض وغایت قارئین کے سامنے آجائے۔ اس پر مولانا اعزاز علی صاحب کی تقریظ بھی ہے۔ جو بعد کے ایڈیشن میں نہیں ہے۔ اس پیش لفظ کے اختتام پر لکھا ہے:

> العبد الضعیف: محمد دیو بندی غفرلہٗ (حال ادیب مدرسہ حنفیہ آرہ، حال وارد پورینہ)
>
> ۳۰ر جمادی الاولیٰ ۱۳۴۶ھ مطابق ۲۴ر دسمبر ۱۹۲۷ء

پیش لفظ کی تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ جب کتاب مکمل ہوئی تو اس وقت مولانا مدرسہ حنفیہ آرہ میں تھے، اور جب دو سال بعد کتاب شائع ہوئی تو ختم کتاب پر یہ تحریر ہے:

> العبد الضعیف: محمد دیو بندی غفرلہٗ (مدرس مدرسہ قاسم الغربا، شاہی مسجد مرادآباد)

گویا اس وقت مولانا مدرسہ شاہی میں آچکے تھے۔ پہلا ایڈیشن ۱۶۴ر صفحات پر مشتمل ہے، اور کتابستان والا آخری ایڈیشن ۲۴۰ر صفحات پر۔

یہ مولانا کی مقبول ترین کتابوں میں سے ہے، اور حل کتاب کے لئے حد درجہ مفید ہے۔ ایک وقت تو وہ تھا کہ جب نور الایضاح کے حل کے لئے یہی واحد کتاب تھی، اب تو شروحات کا جو سیلاب آیا ہوا ہے نہ جانے کتنی شرحیں منظر عام پر آچکی ہیں۔

مشکوٰۃ الآثار و مصباح الابرار نصاب کے لئے منتخب احادیث کا مجموعہ

دار العلوم دیوبند کے نصاب میں حدیث کی پہلی کتاب ''مشکوٰۃ شریف'' تھی، جو فراغت سے ایک سال قبل پڑھائی جاتی تھی، ۱۳۹۱ھ میں شوریٰ نے فیصلہ کیا کہ احادیث کا سلسلہ درجۂ وسطیٰ سے شروع ہونا چاہئے، اس کے لئے مولانا سید محمد میاں کو مکلّف بنایا گیا کہ وہ ایک ایسا مجموعہ مرتب کریں جو اخلاق، نیکی وگناہ (اثم وبر) اور سنن پر مشتمل ہو، مولانا نے اسی حکم کی تعمیل میں یہ مجموعہ مرتب کیا جو پانچ سو سے زائد احادیث رسول پر مشتمل ہے، اور اس وقت سے اب تک دار العلوم اور اس سے ملحقہ مدارس میں داخل نصاب ہے۔

اس کے علاوہ مولانا کی ایک اہم اور مقبول تر کتاب ''**تاریخ اسلام**'' ہے، جو تین حصوں پر مشتمل ہے، اور مدارس کے نصاب میں داخل ہے۔ یہ کتاب مدرسہ شاہی کے زمانہ تدریس میں لکھی گئی۔ اس کی اہمیت کے لئے یہی بات کافی ہے کہ جمعیۃ علماء ہند صدر اول وثانی مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب وشیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی اور مولانا اعزاز علی صاحب علیہم الرحمہ کی تقریظات ہیں۔ اس کتاب میں اس کا تفصیلی تعارف موجود ہے، اس لئے اتنے پر اکتفا کرتا ہوں۔ (دیکھئے صفحہ)

یہ تو مولانا کے تعلیمی افکار ونظریات اور ان کی تعلیمی خدمات کا تذکرہ ہے، اس کے علاوہ مولانا نے دینی تعلیم کے شیوع کے لئے مکاتب ومدارس کے قیام کے سلسلہ میں جو کوششیں اور کاوشیں کی ہیں وہ ایک الگ داستان ہے، جو اس مجلّہ میں شامل مقالہ ''مکاتب دینیہ کے استحکام میں مولانا سید محمد میاں کا کردار'' میں تفصیل سے بیان کی گئی ہے۔

اللہ تعالیٰ مولانا سید محمد میاںؒ کی ان تعلیمی خدمات پر ان کو اپنے شایان شان اجر عطا فرمائیں، اور ہمیں ان کے تعلیمی مشن کی تکمیل کا ذریعہ بنائیں۔ آمین یارب العالمین

مولانا محمد میاںؒ اور جدید تاریخ نگاری

پرفیسر امجد علی شاکر سابق پرنسپل گورنمنٹ کالج لاہور

دنیا میں عموماً یہ سمجھا جاتا ہے کہ نئی تاریخ کو ۱۹۷۰ء اور ۱۹۸۰ء کی دہائیوں میں ایجاد یا دریافت کیا گیا۔ نئی تاریخ کا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے تاریخ کے مرکز کو بھی تبدیل کر دیا اور مآخذ کو بھی بدل دیا۔ نئی تاریخ کے تصور کے پس منظر میں اس تحریک کو دیکھا جاتا ہے جس میں تاریخ نویسوں سے یہ بھی مطالبہ کیا جاتا تھا کہ انھیں تاریخ کو صرف اور محض سیاسی اور فوجی واقعات تک خود کو محدود نہیں کرنا چاہیے، بلکہ قانون، رسم و رواج، ادب و آداب، تجارت، معاشرے کی سوچ اور روحِ عصر کو تحریر میں لانا چاہیے۔ گویا نئی تاریخ سیاسی تاریخ کے متبادل تاریخ کا نظریہ ہے۔ اس تصور اور نظریے کو ہم ماضی میں دیکھ سکتے ہیں، لیکن نئی تاریخ کو ایک مسلمہ ماڈل کی حیثیت ۱۹۷۰ء اور ۱۹۸۰ء کی دہائیوں میں حاصل ہوئی۔

روایتی تاریخ صرف حکمران طبقات کی تاریخ تھی جب کہ نئی تاریخ نے نچلے طبقات اور نظر انداز شدہ لوگوں کی تاریخ کو مرکز میں لا بٹھایا۔ روایتی تاریخ میں حکمران طبقہ تاریخ کا مدار ٹھہرا تھا اور دوسرے طبقات کی تاریخ حاشیے پر لکھی گئی تاریخ تھی۔ نئی تاریخ نے مفتوح لوگوں کی تاریخ کو مرکز اور مدار میں لا بٹھایا اور حکمران طبقوں کو حاشیے پر دھکیل دیا یا کم از کم ان سے مرکزی حیثیت چھین لی۔

تاریخ میں جب حکمران طبقات اور فاتح فوجوں کو مرکزی حیثیت حاصل نہ رہی تو تاریخ کے مآخذ بھی بدل گئے۔ اب ان لوگوں کی تلاش شروع ہوئی جو مفتوح تھے یا خاموش تھے۔ جو لوگ نظروں سے اوجھل تھے جیسے عورتیں، کسان، مزدور، اور دوسرے طبقات یا وہ

لوگ جو اچھل اچھل کر سامنے آنے کی کوشش میں مبتلا نہیں تھے جیسے علماء، دانشور، ادیب اور محقق۔ ان کی باتیں اور ان کی حکایتیں تلاش کرنا بہت مشکل اور کٹھن کام تھا۔ اب تاریخ کے نئے مآخذ سامنے آئے۔ وہ دستاویزات تاریخ کا حصہ ہوگئیں جو کبھی تاریخ کے نقطۂ نظر سے کسی طرح بھی اعتنا کے قابل نہیں تھیں۔ مدارس کی روداد یں، علماء کے خطوط، سی آئی ڈی کا ریکارڈ، لوگوں کی آپ بیتیاں سب تاریخ کے مآخذ بن گئے۔ ان سے زیادہ اور مشکل مآخذ زبانی روایتیں تھیں۔ اب ان روایتوں کی چھان پھٹک کا مرحلہ بھی درپیش تھا اور راویوں کی تلاش بھی ضروری تھی۔ ایک آسانی بھی میسر آگئی تھی کہ اخباروں نے اس تاریخ کا کچھ نہ کچھ ریکارڈ محفوظ کر رکھا تھا، لیکن مسئلہ یہ تھا کہ حکمرانوں کی تاریخ صفحۂ اوّل پر لکھی جاتی تھی اور عوام کی، علماء کی، دانشوروں کی، کارکنوں کی، درویشوں صوفیوں کی خبریں یا تو غائب تھیں یا اندرونی صفحات میں ایک کالمی سرخی کے ماتحت نظر آتی تھیں۔

نئی تاریخ نے تاریخ کا دائرہ وسیع سے وسیع تر کر دیا۔ اس نے عمرانیات، معاشیات اور سیاسیات کے بہت سے سوالات اور معاملات کو تاریخ کا حصہ بنا دیا مثلاً؛

۱۔ یہ سوال کہ کون لوگ ہیں جو تاریخ میں تبدیلی لاتے ہیں، افراد، جماعتیں یا گروہ؟

۲۔ یہ سوال کہ تاریخ کی فعال قوتیں کون سی ہیں، حکمران طبقات کے مفادات، عوام کے مسائل، معاشرے کے مختلف کلچر یا عوام کو متاثر کرنے والے علماء، صوفیا اور دانشور؟

۳۔ کیا معاشرے کے ڈھانچے کو کسی بھی تبدیلی کے عمل سے بچایا جانا ممکن ہے؟ حکمران طبقات کی خواہشات کا پس منظر کیا ہوتا ہے؟

۴۔ اقتصادی مسائل، دینی عقائد، دعوت و تبلیغ اور تعلیمی سرگرمیوں کا تاریخ کے عمل میں کیا حصہ ہو سکتا ہے اور ہوتا رہا ہے؟

۵۔ کسی بھی معاشرے میں تاریخ نویسی کا نقطۂ آغاز کس واقعے، کس شخصیت یا کس عہد کو قرار دیا جا سکتا ہے اور کیوں؟

مؤخرالذکرسوال تو قدیم دور سے ہی تاریخ کا موضوع رہا ہے، مگرنئی تاریخ نے ان بہت سے سوالات کو سامنے لاکرتاریخ کی معنویت میں نئی جہات تلاش کیں۔

مغرب کا عجیب المیہ ہے کہ وہ ہر شے کا آغاز مغرب میں تلاش کرتے ہیں اور مشرق کے دانشوروں کونظر انداز کرتے ہیں۔سری نواس رامانُوجن جیسے ماہر ریاضی کو پروفیسر ہارڈی نے کیمرج کے کنگز کالج میں بلوا تو لیا،مگراس کی موت کے بعد وعدے کے باوجود اس کے لواحقین اور پسماندگان کو پنشن سے محروم رکھا۔ یہ مغرب کے خود پسند اور خودنگر رویے کی ایک مثال ہے۔مغرب ہر معاملے میں اپنی طرف ہی دیکھتا ہے اور مشرق کونظر انداز کرتا ہے۔ یہ دیکھ کرروڈیارڈ کپلنگ کی نظم کے یہ مصرعے یاد آتے ہیں:

West is West and the East is East,

and the twain shall not meet...

دراصل نئی تاریخ کے بانی مولانا عبیداللہ سندھی ہیں۔اس تصور کے بعض ابتدائی اجزاابوالفضل اور دوسرے ہندوستانی مؤرخین کے ہاں تلاش کیے جاسکتے ہیں۔مولانا سندھی عجیب وغریب شخصیت تھے۔وہ بے حدآزادسوچ کے حامل ہونے کے باوجود پکے حنفی، راسخ الفکرولی اللہ اور دوٹوک لفظوں میں دیوبندی تھے۔انھیں اپنے حوالوں پرفخر تھااور وہ کبھی اپنی ان شناختوں کو چھپاتے نہیں تھے۔مولانا نے ہمیشہ اپنے ائمہ فکر کا کھلے لفظوں میں ذکر کیا تھا، لیکن وہ فرماتے تھے کہ وہ تاریخ میں کسی کو اپنا امام نہیں مانتے۔اس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ تاریخ میں خود امام کے مقام پر فائز تھے۔انھوں نے فلسفۂ تاریخ کو نئے تصورات دیے اور نئے نظریات متعارف کرائے۔

مولانا عبیداللہ سندھیؒ کی ''**التمهيد لتعريف ائمه التجديد**'' تاریخ میں بعض نئے تصورات متعارف کرارہی ہے، چند تصورات درج ذیل ہیں:

۱۔مولانا سندھی زندگی کو ایک کُل کی شکل میں دیکھتے تھے۔ وہ حکومت اور حکمت کے شعبوں کو الگ الگ نہیں سمجھتے تھے۔

۲۔مولانا حکومتی نظام اور تعلیمی نظام کا ربط واضح کرتے نظر آتے ہیں۔
۳۔مولانا زندگی کو تسلسل میں اور تمام حوالوں سے دیکھ رہے تھے۔
۴۔مولانا تاریخ میں صوفیا اور علما کے کارناموں کو فائق خیال کرتے تھے۔
۵۔مولانا فقہ، تصوف اور دوسرے علوم کا تاریخ سے ایک ارتباط تلاش کرتے تھے۔

مولانا عبید اللہ سندھی وقت کو متحرک Dynamic خیال کرتے تھے اور کسی قسم کے جمود کو قبول نہیں کر سکتے تھے۔مولانا کسی طرزِ حکومت کی معنویت اس دور کے تاریخی تناظر میں دیکھتے تھے۔

مولانا عبید اللہ سندھی کے بعد ہم جن علما کو تاریخ پر کام کرتے دیکھتے ہیں ان میں مولانا محمد میاں بہت اہم ہیں۔مولانا محمد میاں کی تاریخ نویسی میں مندرجہ ذیل کارنامے ایسے ہیں جنھیں کبھی اور کسی صورت میں بھلانا ممکن نہیں۔

۱۔مولانا محمد میاں نے جدید ہندوستان کی مسلم تاریخ کا نقطۂ آغاز حضرت مجدد الف ثانیؒ کو قرار دیا ہے۔

۲۔مولانا محمد میاں نے تاریخ میں دریافت کیا کہ ہندوستان میں مغل عہد میں ایک تکثیری معاشرہ وجود میں آ چکا ہے۔حضرت مجدد الف ثانی اس تکثیری معاشرے میں مسلمانوں کی اسلامیت پر زور دیتے ہیں اور اسے ایک جذب و شوق کے ساتھ تکثیری معاشرے میں اپنا وجود منوانے کا حوصلہ دیتے ہیں۔

۳۔مولانا محمد میاں حضرت شاہ ولی اللہ کے تجدیدی کارناموں، جماعتِ مجاہدین کے متحدہ قومیت کے اصولوں کے ساتھ اسلام کی دعوت اور اسلامیت پر پُرزور روشنی ڈالتے ہیں۔

۴۔مولانا محمد میاں نے تحریکِ آزادی کی تاریخ لکھی اور اس میں زمیں زاد عوام اور علما کی مساعی کو نمایاں کیا۔

۵۔مولانا محمد میاں نے جمعیۃ علماء ہند کی تاریخ کو محفوظ کیا۔

۶۔مولانا محمد میاں نے حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن قدس سرہ العزیز سے متعلق

سی آئی ڈی ریکارڈ کو مرتب اور محفوظ فرمایا۔

۷۔مولانا محمد میاں نے حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ کی مساعیِ جمیلہ کو محفوظ کیا۔

مولانا محمد میاں نے حاشیے پر لکھی جانے والی تاریخ کو مرکزِ تاریخ میں لا بٹھایا، یہی نو تاریخیت (جدید تاریخ نگاری) کا بنیادی اصول ہے۔اس حوالے سے ہم مولانا محمد میاں کو نئی تاریخ کے انداز کا ایک بڑا مؤرخ قرار دے سکتے ہیں۔

اب ہم اس اجمال کی تفصیل پیش کرتے ہیں:

ہندوستان میں تاریخ نویسی کے ذیل میں ہم ہندوستان کے مسلمان مؤرخین میں ابوالفضل کو ایک نئے اندازِ تاریخ کا بانی کہہ سکتے ہیں۔اس سے پہلے تاریخ عموماً حضرت آدمؑ سے شروع کی جاتی تھی اور تاریخ اسلام کے تسلسل کو آگے بڑھاتے ہوئے اپنے عہد تک کی تاریخ لکھی جاتی۔ابوالفضل نے اکبر کی تاریخ لکھی اور تاریخ کا آغاز اکبر کے آباواجداد سے کیا۔دراصل ابوالفضل برصغیر کی تاریخ کو مغل عہد سے شروع کرتا نظر آتا ہے۔ابوالفضل سے قبل مؤرخین نے تاریخ کو جس انداز میں لکھا،اس پر نعمان احمد صدیقی نے یوں تبصرہ فرمایا ہے:

> ''انھوں نے (ابوالفضل سے قبل کے مؤرخین نے) تاریخِ ہندوستان کو اس تصادم کی حیثیت دی جو ہندوؤں اور اسلام کے حامیوں کے درمیان ہوا۔تاریخِ ہندوستان کی اسی تشریح کی بنا پر سابقہ مؤرخین نے لوگوں کو گمراہ کیا تھا اور ہندوستانی سماج کو بہت بڑا نقصان پہنچا تھا۔''
>
> (نعمان احمد صدیقی، شیخ ابوالفضل، ہندوستانی دورِ وسطیٰ کے مؤرخین، مرتبہ محبّ الحسن، ص: ۲۳۰، ۲۳۱)

ابوالفضل نے ماضی کے مؤرخین کے برعکس ایک انداز اپنایا، اس نے ماضی کے مؤرخین کے اس رویے کی نفی اور تغلیط کی۔اس کے برعکس اس نے جو رویہ دیا وہ نعمان احمد صدیقی کے بقول:

''ابو الفضل کے نزدیک یہ تصادم مغل سلطنت اور ہندوستانی حکمرانوں کے درمیان ہوا جن میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل تھے۔ دراصل اس تصادم میں ایک طرف قیام، استحکام اور اچھی سرکار کی قوتیں ایک ایسے مثالی فرمانروا کے تحت بروئے کار اور انتشار کی قوتیں تھیں جن کی قیادت زمیندار کر رہے تھے۔''

(حوالہ مذکور بالا ص: ۲۳۶، ۲۳۷)

ابوالفضل نے ایک بات ایسی کہی جس سے بہرطور اتفاق کرنا ہی پڑتا ہے، وہ یہ ہے:

''ابو الفضل کے نزدیک مغل سلطنت صحیح معنوں میں ہندوستانی سلطنت تھی کیونکہ اب اس کا تعلق محض کسی ایک نسلی گروہ یا کئی نسلی گروہوں کے مجموعے سے نہ تھا...... ان بدلے ہوئے حالات کے پیش نظر ہندوستانی فرمانرواؤں کے لیے اب جائز نہ تھا کہ وہ اس شاہی ریاستی اتحاد میں شامل نہ ہو جو ملک میں اتحاد، استحکام اور معاشی خوشحالی لائے گا۔'' (حوالہ مذکورہ بالا ص: ۲۳۷)

مغل حکومت صحیح معنوں میں ہندوستانی حکومت تھی ۔ اس میں برصغیر کے نسلی گروہوں کے لیے گنجائش موجود تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب ۱۸۵۷ء میں پہلی سیاسی تحریک سامنے آئی تو تمام ہندوستان کے لوگ ایک شخص پر متفق ہو سکے۔ وہ آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر تھا۔ اس سے پہلے حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریکِ جہاد نے نہ مغل حکمران سے کسی طرح تعرض کیا، نہ مرہٹوں کی حکومت کے خلاف کوئی قدم اٹھایا، بلکہ مرہٹوں کی دعوت قبول کی اور ان کی حکومت کو تسلیم کیا۔ انھوں نے اس حکومت کے خلاف اٹھائی جو مذہب میں مداخلت کر رہی تھی اور اپنی رعایا کو جائز مذہبی آزادی دینے کی روادار نہیں تھی۔

ابو الفضل کی تاریخ کو مولانا عبید اللہ سندھی بہت اہمیت دیتے تھے۔ مولانا محمد میاں نے بھی اس اصول کو اپنایا اور ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ کو مغل عہد سے شروع کیا۔ انھوں نے تاریخِ اسلام سے اپنے رشتے اور روابط کو قائم رکھنے کے لے سیرۃ مبارکہ لکھی اور تاریخِ اسلام بھی، مگر ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ کو مغل عہد سے شروع کیا۔ انھوں نے نقطۂ آغاز تو عہدِ مغلیہ کو قرار دیا، مگر جس شخصیت کو بنیادی اہمیت دی وہ اکبر کی بجائے حضرت

مجدد الف ثانیؒ ہیں۔ گویا انھیں اپنی ہندوستانیت عزیز تھی اور اسلامیت عزیز تر تھی۔

مولانا محمد میاں نے تاریخِ ہند کے سلسلے میں جو شاندار کتب یادگار چھوڑیں ان کے اسماء یہ ہیں:

۱۔ علمائے ہند کا شاندار ماضی (۴ جلدیں)

۲۔ علمائے حق کے مجاہدانہ کارنامے

۳۔ ہندوستان شاہان مغلیہ کے عہد میں

۴۔ اسیرانِ مالٹا

۵۔ پانی پت اور بزرگانِ پانی پت

۶۔ حیات شیخ الاسلام

۷۔ مختصر تذکرۂ خدمات جمعیۃ علمائے ہند (چار حصے)

ان کتب کے اسماء ہی سے ظاہر ہے کہ مولانا محمد میاں نے بادشاہوں یا افواج کی تاریخ نہیں لکھی، عام لوگوں کی تاریخ لکھی ہے۔ ان لوگوں کی تاریخ لکھی ہے جو عموماً تاریخ کے حاشیے کے قریب پائے جاتے ہیں یا حاشیے میں ان کا ذکر ضمناً کیا جاتا ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ علمائے کرام اور صوفیائے عظام نے تاریخ پر وہ گہرے نقوش چھوڑے ہیں جو کسی طرح مٹائے نہیں جا سکتے۔

پانی پت اور بزرگانِ پانی پت ایک لحاظ سے بہت اہم کتاب ہے کہ مسلم تہذیب و ثقافت کا یہ مرکز ۱۹۴۷ء میں تقسیم کے وقت مسلمانوں اور مسلم ثقافت سے خالی ہو گیا۔ یہ وہ شہر تھا جہاں گھر گھر حفظ ہوتا تھا۔ جہاں کے حفاظ اکنافِ ہند میں قرآن سناتے تھے، مگر ۱۹۴۷ء کے بعد صرف ایک حافظ تھا جو قرآن سننے کے لیے بھی اکیلا تھا اور سنانے کے لیے بھی۔ یہ حافظ نئے ہندوستان میں پانی پت میں اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ کا سرِ آغاز ہوا۔ یہ تھے مولانا حافظ لقاء اللہ عثمانی۔ ان کا کارنامہ پانی پت کے فاتحین سے کسی طرح کم نہ تھا۔ مولانا محمد میاں نے اپنی اس کتاب میں پانی پت کی عملی روحانی اور دینی تاریخ قلمبند کی

ہے۔اس کتاب کا موضوع بھی اہم ہے اور متن بھی۔موضوع اس لحاظ سے کہ اگر کوئی شہر دہلی کا تہذیبی، ثقافتی اور روحانی طور پر جزواً ہمسر ہوسکتا ہے تو پانی پت ہے۔ یہ کتاب ایک دعوت بھی ہے۔وہ شہر جو تمام ہندوستان کو قرآن مجید کا درس دیتا تھا، وہ شہر جہاں حضرت محی الاسلام عثمانی نے بیٹھ کر سبعہ عشرہ پر متعدد جلدوں میں ایک عظیم کتاب مرتب کی۔وہ شہر مسلمانوں اور ان کی ثقافت سے خالی ہوگیا۔ یہ کتاب اس بات کی دعوت ہے کہ مسلمان اس شہر کو پھر سے بسائیں۔ جمعیۃ علمائے ہند کی کاوشوں سے یہ شہر پھر بسا۔اس کی غیر آباد مساجد پھر سے آباد ہونے لگیں تو اس کار خیر میں اس کتاب کا حصہ بھی ہے۔

مولانا محمد میاں کی کتاب ''علماء ہند کا شاندار ماضی'' ایک شاندار شناخت کی حامل کتاب ہے۔اس کتاب کا نام اب تو لوک/فوک ادب کی طرح عام ہوگیا۔ یہ بات اس کتاب کی قبولیت کی دلیل ہے، یہ کتاب صرف مختصر نام ''شاندار ماضی'' کے نام سے پہچانی جاتی ہے۔اس کے چار حصے ہیں۔

☆ پہلا حصہ حضرت مجدد الف ثانیؒ اور ان کے خلفاء کے اصلاحی اور روحانی کارناموں پر مشتمل ہے۔

☆ دوسرا حصہ حضرت شاہ ولی اللہؒ اور ان کے اخلاف کے کارناموں پر مشتمل ہے اور شہدائے بالاکوٹ تک منتہٰی ہوتا ہے۔

☆ تیسرا حصہ علمائے صادق پور کی عزیمت کی داستان سناتا ہے۔

☆ چوتھا حصہ ۱۸۵۷ء کی داستانِ خونچکاں سنا رہا ہے۔

مولانا محمد میاں نے اپنی ان کتابوں میں تمام ممکنہ مآخذ سے استفادہ کیا ہے اور نقد و تجزیہ بھی فرمایا ہے۔مثلاً خواجہ حسن نظامی نے ۱۸۵۷ء کے حادثۂ خونیں پر بہت کچھ لکھا ہے مگر وہ ان کی روایات پر آنکھیں بند کر کے ایمان نہیں لائے، بلکہ ان روایتوں پر نقد و جرح بھی کی ہے اور حقیقتِ حال واضح کی ہے۔مثلاً ایک جگہ وہ لکھتے ہیں:

''سطورِ بالا میں خواجہ صاحب کا یہ ارشاد خاص طور پر غور طلب ہے کہ ''جامع

مسجد میں اس وقت ہزار ہا مسلمان نماز کے لیے جمع تھے۔ خواجہ صاحب نے اس کی تصریح نہیں فرمائی کہ یہ مسلمان شہر کے باشندے تھے یا باہر سے آئے ہوئے تھے۔ جہاں تک شہری مسلمانوں کا تعلق ہے، بے شک جمعہ کے روز وہ ہزاروں کی تعداد میں جامع مسجد میں حاضر ہوتے ہیں مگر یہ جمعہ کا دن نہیں تھا۔ یہ ۱۴ستمبر ۱۸۵۷ء کا واقعہ ہے۔ ۱۴ستمبر کو جمعہ نہیں بلکہ دوشنبہ تھا۔''

یہ ہے تجزیاتی انداز جو سائنٹفک تاریخ نگاری کے لیے ضروری ہے۔ مولانا محمد میاں نے اس تاریخ کے لیے راقم الدولہ ظہیر دہلوی کی ''داستانِ غدر'' سے بھی استفادہ کیا ہے اور خواجہ حسن نظامی سے بھی۔ ان کے مآخذ میں ہر طرح کی کتابیں شامل ہیں۔ ان کے ہاں عوام، علماء اور امراء سبھی کے احوال ملتے ہیں۔ سبھی کی زندگی اور اعمال و آثار کی کیفیت نظر آتی ہے۔

مولانا محمد میاں نے شاندار ماضی میں عہدِ مغلیہ کے عروج سے بہادر شاہ ظفر کی گرفتاری اور جلاوطنی تک کے عہد کو اپنا موضوع بنایا ہے مگر اس تاریخ کو متن نہیں بنایا جو ہماری روایتی تاریخ کا متن رہا ہے، بلکہ اس تاریخ کو متن بنایا ہے جو مروج تاریخ میں حاشیے پر رہی ہے۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ، حضرت شاہ ولی اللہؒ، جماعتِ مجاہدین، علمائے صادق پور اور ۱۸۵۷ء میں علماء کی جرأت وعزیمت کی داستانیں اس کتاب کا موضوع ہیں۔ حاشیے پر آنے والے لوگ متن کا حصہ بن جائیں تو تاریخ کا تجزیہ وتحلیل مختلف انداز میں کرنا پڑتا ہے اور کیا جاتا ہے۔

۱۸۵۷ء کی مروج تاریخ سرسید کے نقطۂ نظر سے دیکھی اور پڑھی جاتی تھی یا مارکسی نقطۂ نظر سے دیکھی جاتی تھی۔ جدید ہندوستان میں تاریخ پر کام ہوا تو ۱۸۵۷ء کے جہادِ آزادی میں عورتوں، دلتوں اور کسانوں کی تاریخ دریافت کی گئی۔ اس کام کا آغاز مولانا محمد میاں جیسے مؤرخین نے شروع کیا۔ انھوں نے علماء کی خدمات کو پہلی بار دریافت کیا جو ایک عرصہ سے تاریخ کا پوشیدہ باب تھا۔ اب تاریخ کے خفتہ موضوعات بیدار ہو رہے ہیں اور

تاریخ کے مجاہدین کی دریافت ہورہی ہے۔خوش قسمتی ہے کہ مولانا محمد میاں جیسے مؤرخین نے اس باب کو کھولا ہے اور مجاہدینِ آزادی کو دریافت کیا ہے۔اس تاریخ میں علمائے صادق پور کو بھی دریافت کیا گیا ہے۔

جماعتِ مجاہدین کے بارے میں حضرت مدنی علیہ الرحمہ نے جب لکھا تھا تو ایک صاحب جو اسلامی انتہا پسندی کے نمائندہ تھے، نے حضرت مدنی کے حوالوں کی تغلیط کرنے کی بجائے ان پر یہ الزام عاید کیا کہ وہ جماعتِ مجاہدین کو انڈین نیشنل کانگریس ثابت کرنا چاہتے ہیں۔مولانا محمد میاں نے ''شاندار ماضی'' کی دوسری جلد میں مرہٹہ مہاراجا کے ہاں حضرت سید صاحب کی دعوت اور ملاقات کے احوال بہت تفصیل سے بیان کیے ہیں۔وہ ملاقات کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

> ''دولت راؤ خود حاضر نہ ہوسکا، معذوری کو دستاویز بنا کر سید صاحب کو محل میں بلا لیا۔ جو سید صاحب کے ساتھ تھے ان کو ایک بڑے کمرے میں بٹھا دیا گیا۔پھر ہندوراؤ سید صاحب کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر آپ کو مہاراجا کے کمرے میں لے گیا۔بڑی دیر تک باتیں ہوئیں......مہارانی پردے کے پیچھے بیٹھی ہوئی تھی۔اس نے عرض کیا کہ آپ ایک سال گوالیار میں قیام فرمائیں، آپ کے تمام ساتھیوں کی مہمان داری ہمارے ذمہ ہو گی۔سید صاحب نے معذرت کی۔پھر مہارانی نے کہا، کہ اچھا اتنی مدت ٹھہر جایئے کہ آپ کے لشکر کے لیے پورا سامان مہیا کیا جاسکے۔'' (شاندار ماضی،ص:۵۰۷)

حضرت سید احمد شہید ایک ایسے قائد تھے جنھوں نے حکمرانی کے لیے نہ تو مذہب کو جواز کے طور پر پیش کیا، نہ کسی حکومت کے لیے لازم ٹھہرایا کہ وہ کسی مذہب یا ملت سے وابستہ ہو۔سیاست کو انھوں نے تمام ہندوستانیوں کے لیے عام قرار دیا۔وہ مذہب کو انسانی زندگی کا لازمہ سمجھتے تھے، مگر کسی گروہ کو اس بات کی اجازت نہیں دیتے تھے کہ وہ دوسروں کے مذہب میں مداخلت کرے۔وہ ہندوستان میں تمام مذاہب کو جینے کا حق دیتے تھے اور پُرامن بقائے باہمی کے قائل تھے۔حضرت سید صاحب کا مرہٹہ حکومت کے ساتھ رویہ ہندوستانی قومیت کا

سنگِ بنیاد بنتا ہے۔ یہ ہے تاریخ کا وہ بیانیہ جو مولانا محمد میاں کے شاندار ماضی سے سامنے آتا ہے۔

مولانا محمد میاں کی کتاب علماء ہند کا شاندار ماضی کی شاندار مقبولیت کے باعث علماء ہند کے مجاہدانہ کارنامے ذرا کم مشہور رہے، مگر یہ کتاب بھی مولانا کی پہلی کتاب (شاندار ماضی) کی طرح اہمیت کی حامل ہے۔ اس کتاب کی اہمیت کے کئی حوالے ہیں جو عام قاری سے مستقبل کے مؤرخ تک کے لیے بہت اہم ہیں۔ پہلی بات تو یہی ہے کہ اس کے مآخذ کا دائرہ ویسے ہی وسیع ہے جیسے شاندار ماضی کے مآخذ ہیں۔ اس کتاب میں انھوں نے مختلف اخبارات، رسائل، خطوط، یادیں اور یادداشتیں، پارٹیوں کی رپورٹس، مختلف کانفرنسوں کے خطباتِ صدارت، دینی مدارس کی رپورٹس، تواریخ اور زبانی روایات کو بنیاد بنایا ہے۔ دوسرے اس کا دائرہ عمل بہت وسیع ہے۔ اس میں صرف سیاسی تاریخ ہی نہیں، علمی، ثقافتی، تہذیبی، ادبی، تعلیمی تواریخ بھی پیش کی گئی ہیں۔ تیسرے یہ صرف حکمرانوں اور حکمران طبقات کی تاریخ نہیں ہے، عام آدمیوں، یتیموں، یسیروں اور دکھی لوگوں کی تواریخ بھی ہے۔ چوتھے اس میں سیاسی پارٹیوں کا تعامل اور کارکردگی ہی زیرِ بحث نہیں ہے، سیاسی پارٹیوں کے صدور ہی نظر نہیں آتے، پارٹیاں بھی نظر آتی ہیں۔ عموماً سیاسی تاریخ لکھنے والے پارٹی رہنماؤں کا نقطۂ نظر اور تعامل پیش کر کے فارغ ہو جاتے ہیں، مگر پارٹی کے اندر بحث مباحثے باہمی جھگڑے اور پارٹیوں کے فیصلوں پر اثر انداز ہونے والے گروہوں اور ان کی سرگرمیوں کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔

کانگریس ایک سیاسی پارٹی تو تھی مگر بعض اوقات یہ لگتا ہے جیسے یہ ایک متحدہ محاذ تھا۔ عتیق صدیقی نے یادوں کے سائے میں اس صورتِ حال کو بہت خوبی سے واضح کیا ہے۔ مولانا محمد میاں نے بھی اس بات کو نظر انداز نہیں کیا، مگر ان کا بنیادی موضوع علماء حق ہیں۔ انھوں نے جمعیۃ علماء ہند اور اس کے پیش رو علماء کو مرکزِ نگاہ بنایا ہے۔ گویا جو کبھی حاشیے کی چیز تھی، اسے متن بنا دیا اور جو دوسری تاریخی کتب میں متن تھا اسے حاشیہ بنا دیا۔ نئی تاریخ

کا یہی وہ کمال ہے جس سے واقعات اور اشیاء مختلف نظر آنے لگتے ہیں اور تمام کا تمام تجزیہ بدل جاتا ہے۔ مولانا محمد میاں نے یہی کارنامہ سرانجام دیا ہے اور یہی ان کا عطیہ ہے۔

اس کتاب کی پہلی جلد کا آغاز ۱۸۵۷ء کی ناکامی کے بعد انگریزی پالیسی اور شکست خوردہ ہندوستان کے مختلف طبقات کا طرزِ عمل سامنے آتا ہے۔ اشرافیہ کے نمائندے سرسید احمد خان کی کالونیلزم کی فکر سامنے آتی ہے اور علماء دیوبند کی نیشلزم کی فکر بھی سامنے آتی ہے۔ حضرت سید احمد رحمۃ اللہ علیہ سکھوں کی غیر سیکولر پالیسی اور دوسرے مذاہب میں مداخلت پر اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ سرسید اور اعلیٰ اشرافیہ نے علی گڑھ قائم کیا اور مسلمانوں کے دینی طبقہ نے دیوبند قائم کیا جس کے معاون و معین ادنیٰ اشرفیہ کے لوگ تھے یا دستکار اور محنت کش تھے جو معاشرے کے حاشیے پر نظر آتے تھے۔

مولانا محمد میاں نے تاریخِ ہند کے گم گشتہ گوشوں کو دریافت کیا ہے اور پوشیدہ حوالوں کو بے نقاب کیا ہے۔ مثلاً علماء لدھیانہ کا کانگریس کی حمایت میں فتویٰ نصرت الابرار کی دریافت ان کا تحقیقی کارنامہ ہے۔ ایسے ہی محدثِ جلیل استاذ الاساتذہ حضرت مولانا انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ تعالیٰ اور مولانا محمد انصاری کے سیاسی کارناموں کو خوبی اور خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ حضرت الاستاذ المحدث مولانا انور شاہ کشمیری نور اللہ مرقدہ عموماً تعلیم و تعلم اور درس و تدریس کے حوالے سے یاد کیے جاتے ہیں، مگر ان کی سیاسی خدمات کم اہم نہیں ہیں۔ ایسے ہی مولانا محمد انصاری کے سیاسی حوالے سے عملی اور علمی سرگرمیاں ناقابلِ فراموش ہیں۔ یہ دریافتیں مولانا محمد میاں کا کارنامہ بھی ہیں اور کارِ خیر بھی۔

مولانا محمد میاں نے مختلف مآخذ کی مدد سے یہ ثابت کیا ہے کہ آزادی کی تحریکیں ابتدا میں مذہبی حوالوں سے سامنے آئیں۔ مسلمانوں میں علماء دین نے تحریک آزادی کا آغاز کیا اور ہندوؤں نے مختلف مذہبی حوالوں سے آزادی کی تحریک شروع کی۔ رولٹ کمیٹی کی رپورٹ میں بہت سے واقعات رپورٹ کیے گئے ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ بعض مقامات پر کالی دیوی کے چرن چھو کر آزادی کی جدوجہد شروع کرنے کے لیے حلف لیا گیا۔

ہندوستان کی تحریک آزادی آگے چل کر انڈین نیشنل کانگریس کا روپ دھار گئی۔ اگرچہ بہت سے گروہ موجود رہے جو مذہبی حوالے سے کام کر رہے تھے۔ علماء کرام کا یہ کمال ہے کہ انھوں نے سیاست میں ہمیشہ سیکولر رویہ اختیار کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے دینی فرائض ادا کرتے رہے۔ امت کو دعوت الی اللہ کا فریضہ بھی ادا کیا اور مسلمانوں کے عالمی مسائل میں مسلمان امت کے ساتھ اظہار یکجہتی بھی کیا۔ اس سلسلے میں انھوں نے مختلف تحریکات بھی چلائیں، ان کی تفصیل بھی مولانا محمد میاں کی کتاب میں موجود ہے۔

مولانا محمد میاں کے ہاں تاریخ کا سیاق وسباق بہت وسیع ہے۔ وہ اس کتاب کا دوسرا حصہ دوسری جنگ عظیم سے شروع کرتے ہیں اور عالمی تناظر میں بات کرتے ہیں۔ ان کے عنوانات دیکھیے:

دوسری جنگِ عظیم
روس کے خلاف متحدہ محاذ اور اسپین کی خانہ جنگی
حملہ جاپان بر چین
اٹلانٹک چارٹر
دوسری جنگِ عظیم اور ہندوستان
افلاس کی تصویر ہندوستان

دیکھا جائے تو یقیناً تاریخ کے مطالعے کا یہی درست تناظر ہے۔ ۱۹۲۹ء سے ۱۹۳۹ء تک کی عالمی کساد بازاری کے بعد جنگِ عظیم دوم غلام ہندوستان کے لوگوں کے لیے خوشحالی بھی لائی تھی اور کھیت کھلیان جیالے کسانوں سے محروم بھی ہوئے تھے۔ اس سے آگے کی تاریخ کے دو کردار عموماً زیرِ بحث آتے ہیں:

کانگریس اور مسلم لیگ

حالانکہ ان کے علاوہ بھی بہت سے گروہ تھے۔ غیر کانگریسی ہندو اور غیر مسلم لیگی مسلمان، مورخین ۷۰ سال سے ان گروہوں کو نظر انداز کرتے آئے ہیں۔ یہ خوشی کی بات

ہے اب Msulims against Muslim League اور Muslims against Partition کے عنوانات سے کتب بھی سامنے آتی ہیں۔ اس پر بہت خوشی ظاہر کی جارہی ہے۔ ویسے تو تقسیم کے حامی ہندوؤں پر بھی کام ہونا چاہیے اور شاید ہندوستان میں ہو بھی رہا ہو۔ بہر حال تقسیم کے خلاف مسلمانوں کا اپنا ایک تاریخی کردار ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ یہ تاریخ حاشیے میں ڈال دی گئی ہے، مولانا محمد میاں نے اس تاریخ کو متن بنا دیا ہے۔ انھوں نے ۱۹۴۶ء کے الیکشن میں حضرت مدنی کے ساتھ ہونے والے سلوک کی تفصیل بھی فراہم کی ہے۔ سیاست میں بد تہذیبی کا عنصر کیسے شروع ہوا اور کب شروع ہوا، اس کی تفصیل اس کتاب میں تفصیل سے موجود ہے۔ یہ الیکشن کیسے ہوئے، جیتنے والے کیسے جیتے، اس کی بہت سی تفصیل اس کتاب سے فراہم ہوتی ہے۔ یہ تفصیل جاننے کے بعد یہ بات سمجھنا کچھ مشکل نہیں رہتا کہ بنگال ۱۹۴۷ء سے صرف ۲۴ سال بعد بنگلہ دیش کیسے بنا۔ یہی نئی تاریخ کی افادیت ہے۔

مولانا محمد میاں بہر حال نئی تاریخ کے بنیاد گزاروں میں گنے جا سکتے ہیں۔ ان کی زیرِ بحث کتب کے علاوہ تاریخ پر کتب بھی اس سلسلے کی ہی مختلف کڑیاں ہیں۔ مولانا محمد میاں کا یہ کام بہرحال کارنامہ بھی اور ہے کارِ خیر بھی۔ **اللّٰھم ارحمہ واغفر لہ**

☆☆☆

حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب دیوبندیؒ
ایک دیدہ ور مؤرخ

مفتی شرف الدین عظیم قاسمی اعظمی
امام خطیب مسجد انوار گوونڈی ممبئی

مرکز علم وفن، شہر دیوبند کے درخشاں مطلع سے بے شمار علم وفضل کے آفتاب وماہتاب اور نجوم وکواکب جلوہ نما ہوئے ہیں، جنھوں نے اپنی روشن شعاؤں اور فرحت بخش کرنوں سے نہ صرف ہندوستان، بلکہ پوری دنیا کے ان خطوں، علاقوں کو روشن اور منور کیا، جو جہالت وضلالت کی دبیز تاریکیوں میں گم، سپیدۂ سحر کے انتظار میں تھک کر آس وامید کے سرمایے سے محروم ہو چکے تھے۔ ملت اسلامیہ کے عظیم فرزند، اسلامی علوم کی عظمتوں کی علامت، فکر دیوبند کے بے باک نقیب، نظریۂ ولی اللہی کے حوصلہ مند ترجمان، گلشن قاسمی کے گل سرسبد، حضرت مدنی کے مشن کے امین ومحافظ، ملت اسلامیہ ہند کے اولوالعزم نگہبان اور وادیِ سیاست کے میر کارواں حضرت مولانا محمد میاں صاحب دیوبندیؒ ان ہی درخشاں ستاروں میں سے ہیں، جن کے علم وعمل کی تابانیوں نے ملک کے گوشے گوشے میں پھیلی ہوئی ظلمتوں کے پردے چاک کیے، وقت کے چہرے پر اپنی عظمتوں کی داستان رقم کی، پوری زندگی درد والم کے صحراؤں میں بادیہ پیمائی کر کے ملت اسلامیہ ہند کو نخلستانوں کی خبر دی، اشکوں سے تاریک راتوں میں چراغاں کیا، نیرنگیِ زمانہ کے نتیجے میں زندانوں کی مایوس کن فضاؤں میں بے بسی کے عالم میں بھی جادۂ حق پر رواں دواں قافلۂ علم وعمل کو عشق ووفا اور عزیمت واستقامت کا راز بتایا، انسانیت کی حقیقی منزلوں سے آشنائی اور معرفت کی دولت عطا کی۔

مولانا سید محمد میاں صاحبؒ کی شخصیت کسی ایک فن یا چند کمالات کی حامل نہیں ہے؛ بلکہ ان کی ذات ایسی کثیر الجہات اور جامع الکمالات ہے، گویا وہ ایک انجمن ہے، جس میں تمام علوم وفنون اور اوصاف وکمالات کے رنگوں کو قدرت نے جمع کر دیا ہے۔ آپ کی زندگی کا کینوس اتنا وسیع اور لمبا ہے اور اس پر اس قدر متنوع کارناموں اور کمالات کے نقوش ہیں کہ ایک مصور یا خاکہ نگار کے لیے چند صفحات میں انھیں سمیٹنا مشکل ہی نہیں؛ بلکہ محال ہے۔

مولانا محمد میاں دیو بندیؒ ایک باکمال وفیض رساں معلم ومدرس بھی تھے اور دلوں کی دنیا میں انقلاب پیدا کرنے والے مربی بھی، امنگوں اور ولولوں کی فضا قائم کرنے والے خطیب بھی تھے اور حالات پر گہری نظر رکھنے والے سیاسی مدبر بھی، وہ بلند پایہ محدث بھی تھے اور وسیع النظر فقیہ بھی، ممتاز رنگ وآہنگ سے متصف مضمون نگار بھی تھے اور خوب صورت دل آویز اسلوب کے حامل ادیب وانشا پرداز بھی، حرف حرف شعور وآگہی کی شعاؤں سے معمور مصنف بھی تھے اور فلک پیما فکر سے آراستہ محقق ومفکر بھی، عہد اور زمانے کے نبض شناس اور بصیرت مند داعیِ اسلام بھی تھے اور ماضی کے دشت میں گم شدہ اسلام کی عظمت رفتہ پر مشتمل واقعات کی تہہ تک پہنچ کر اس سے تابناک مستقبل کی نتیجہ خیز معرفت حاصل کرنے والے دیدہ ور مؤرخ بھی۔

حاصل یہ کہ آپ کی ذات گوناگوں اوصاف وکمالات کا حیرت انگیز مجموعہ تھی، تاہم ان تمام خوبیوں کے باوجود اور لامحدود کارناموں کے باوصف، یہ کس قدر حیرت کی بات ہے کہ مولانا مرحوم کی علمی وادبی، سیاسی وانتظامی، تخلیقی وتحقیقی فتوحات، علماء مصنفین، دانشوران قوم وملت اور دیگر اصحاب فکر ونظر کی جولانگاہوں کی وسعت کے باوجود قابل اعتنا نہ ہوسکیں اور ان کی توجہات سے افسوس ناک حد تک محروم رہیں۔ مولانا مرحوم کے اوصاف وکمالات، کمیت وکیفیت ہر دو لحاظ سے اہم اور قابل قدر ہیں؛ لیکن تاریخ کے حوالے سے آپ کی زندگی مذکورہ تمام کمالات میں نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔

زیر نظر تحریر میں مولانا مرحوم کی علمی فتوحات کے اسی پہلو کو اجاگر کرنے کی کوشش کی

گئی ہے۔ یہاں اس امر کا اعتراف بھی ضروری ہے کہ فن تاریخ جیسی خشک، نازک اور پُر خار وادی میں آپ کی سیاحت اور اس موضوع پر آپ کی وقیع وگراں قدر خدمات کا احاطہ اور اس پر ناقدانہ تجزیے اور مؤرخانہ تبصرے کے لیے شعور وادراک میں پختگی، علمی وسعت و گہرائی اور بصیرت مندانہ فکر ونظر کی ضرورت ہے، اور راقم الحروف کا دامن اس سرمایے سے بالکل خالی ہے۔ لہٰذا حضرت مولانا کی شخصیت کے اس پہلو پر یہ تحریر، وادیِ علم میں ایک نو وارد طالب علم عقیدت کیش کی طرف سے طالب علمانہ خراج عقیدت ومحبت تصور کیا جائے کہ یہی انصاف کا تقاضا ہے۔

شخصیت کے تعمیری اسباب وعوامل:

قدرت جب کسی کو آفتاب کے پیکر میں ڈھالنا چاہتی ہے تو ابتدا ہی میں داخلی عوامل کے ساتھ ایسے خارجی اسباب مہیا کر دیتی ہے، جس کی روشنی میں اس کا ہر قدم ارتقا کے راستے کی طرف خود بخود اٹھتا چلا جاتا ہے، عظمتوں کی شاہراہیں کھلتی چلی جاتی ہیں، بظاہر وہ اسباب وعوامل حوصلہ شکن گمنام سرنگوں کی طرف جانے والی پگڈنڈیاں ہوتی ہیں، جہاں انسانی وجود حسرتوں، ارمانوں کے جنازے کے ساتھ ہمیشہ کے دفن ہوجاتا ہے؛ مگر مایوسیوں کی اسی تاریک فضا سے عزم وہمت کی کرن بھی پیدا ہوتی ہے، داخلی شعور کی بے پناہ قوت اسی یاس آشنا ماحول کے اندھیروں سے روشنی حاصل کرتی ہے، صبر آزما مراحل میں صبر و استقلال کا نقش قائم کر کے منزلوں تک رسائی حاصل کرنے والی دھن اور جذبات اور عزم و ارادے کی نشو ونما اور پختگی اسی ماحول میں انجام پاتی ہے، بالآخر آزمائشوں کی راہوں کو سر کر کے زندگی عروج وارتقا کی عظیم منزلوں کی طرف محوِ سفر ہوجاتی ہے۔

مولانا سید محمد میاں صاحبؒ نے جس عہد میں آنکھیں کھولی تھیں، وہ فکری، تہذیبی، دینی وعلمی، خوش حالی وآزادی کے لحاظ سے بڑا پُر آشوب اور تاریک دور تھا۔ انگریزی سامراجیت کی چیرہ دستیاں پورے ملک کو گھیرے ہوئے تھیں، اس کے خونین پنجوں میں ملک کا ایک اک خطہ سسک رہا تھا، سرزمین ہند ''باشندگانِ ہند'' کے خون سے لالہ زار ہوچکی تھی،

غلامی کی وحشت ناک فضا میں غربت وافلاس اور تنگی وبدحالی کی اذیت ناک لہروں میں ملک کی اکثر زندگیاں لپیٹ میں آچکی تھیں۔

مولانا محمد میاں صاحبؒ کا خاندان اگرچہ دین دار، پاک باز اور دیانت دار تھا، اسلامی احکام وتعلیمات پر سختی سے کاربند تھا، دینی شعور اور اسلامی تہذیب سے روشن اور عبادات واذکار کے زمزموں سے معمور تھا، تاہم ماحول، عہد کے زیر اثر مستقبل میں خوش حالی وفارغ البالی کی موہوم شعاؤں کی تلاش وجستجو اور دل کے کسی گوشے میں وقت کے عام مزاجوں کے مطابق بے نام سی آرزؤں کا تقاضا تھا کہ آپ کو اعلیٰ دنیاوی تعلیم کی راہ پر لگایا جائے اور پھر اسی پر عمل کرنے کا منصوبہ بھی بنالیا گیا؛ مگر معاشی حالات کی وہی تنگی جو اوروں کے لیے یاس ونامرادی اور گمنامی کا باعث تھی، آپ کی عظمت ورفعت اور ترقی کا زینہ بن گئی۔ نتیجتاً تقدیر نے آپ کو فکر وعمل سے ناآشنا مادیت کی بے کیف فضاؤں سے نکال کر شہر علم وفن دیوبند کی سرزمین پر پہنچادیا۔ تعلیمی سفر کی یہ سرگزشت خود حضرت مولانا کے قلم سے محفوظ ہے:

> ''والد صاحب محکمہ نہر میں ملازم تھے، قیام دیہات میں رہتا تھا، احقر بھی مع والدہ محترمہ ان ہی کے ساتھ رہتا تھا۔ پانچ چھ برس کی عمر ہوئی تو احقر کی تعلیم کی فکر ہوئی، موضع بچولہ ضلع بلند شہر جو والد صاحب کا ہیڈ کوارٹر تھا، چھوٹا سا گاؤں تھا، جہاں کوئی تعلیمی ادارہ نہیں تھا، تو محترمہ نانی صاحبہ نے شفقت فرمائی اور والدین کی درخواست پر انھوں نے بسم اللہ کرادی۔ نانی صاحبہ بہت صالحہ وصابروشاکر خاتون تھیں، میری والدہ اور میرے ماموں سید بشیر احمد (مولانا حافظ سید محمد اعلیٰ صاحب کے والد) یہ دو بچے ہی ہوئے تھے کہ نانا صاحب کا انتقال ہوگیا، بیوگی کے دور میں بھی ان دونوں بچوں کی پرورش کی، صوم وصلاۃ کے علاوہ اوراد کی بھی پابند تھیں، والد صاحب مرحوم اس تاریک قریہ میں تھوڑے عرصے رہے، پھر موضع ٹنڈ ھیرہ ضلع مظفر نگر تبادلہ ہوگیا، جہاں دینی تعلیم کا مکتب تھا۔ احقر مکتب میں داخل کردیا گیا، پھر والد صاحب کا قصبہ میسونہ تبادلہ ہوا، وہاں ایک صاحب تھے، خلیل احمد صاحب ان کا اسم گرامی تھا، پیشہ چرم دوزی تھا، مگر فارسی کی قابلیت بہت عمدہ تھی۔ یہ احقر قرآن شریف ختم ہونے پر موصوف کے

حوالے کیا گیا کہ فارسی پڑھائیں، مگر یہ عارضی انتظامات تھے اور چونکہ چھ ماہ بعد والد صاحب کا تبادلہ ہوتا رہتا تھا تو یہ انتظامات بھی ناکافی رہتے تھے، تو اب والد صاحب مرحوم نے متعلقین کو دیوبند ہی بھیج دیا کہ احقر کی تعلیم کا انتظام ہو سکے۔ خاندان کے نئے رواج کے مطابق احقر کو انگریزی پڑھانے کے لیے سرکاری اسکول میں داخل کرانا چاہیے تھا؛ مگر انگریزی تعلیم کے مصارف ناقابل برداشت سمجھے گئے اور احقر دارالعلوم دیوبند کے درجہ فارسی میں داخل کر دیا گیا، جہاں تعلیم مفت تھی۔ یہ غالباً ۱۹۱۶ء کا واقعہ ہے۔'' [پس مرگ زندہ: مولانا نور عالم خلیل امینی صاحب ص: ۹۴]

دیوبند کی علمی و تحقیقی فضا اور روحانی ماحول میں جہاں پر استاذ اپنی ذات میں آپ انجمن اور ہر معلم علم و فضل کا مستقل سرچشمہ تھا، ذہن و دل میں روشنی اور نور کی شمع جلانے، فکر و نظر کو لامحدود وسعتوں سے ہمکنار کرنے، مختلف علوم و فنون کے چشمۂ صافی سے قلب کو سیراب کرنے کے سنہرے مواقع حاصل ہوئے۔ اساتذہ و شیوخ کی پُر کیف علمی و اصلاحی مجلسوں میں علم ریز ماحول میسر آیا، ذوق مطالعہ کی تکمیل کے لیے کتابوں کی ایک دنیا نظر آئی، قرآن و حدیث کے علاوہ اخلاقیات، عمرانیات، سیاسیات اور دوسرے فنون کے زمزموں کی گونج سنائی دی، جو شخصیت سازی میں بنیادی کردار ادا کرتی ہیں۔

مولانا محمد میاں صاحبؒ نے ان نعمتوں سے فائدہ اٹھایا اور وقت کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے اس طرح اس سرمایے کی قدر کی، جیسے ایک پیاسا شخص گلاس میں موجود چند گھونٹ پانی کو آب حیات سمجھ کر اپنے وجود میں اتار لیتا ہے اور ایک قطرہ ضائع کیے بغیر اس کی نمی کو بھی چوس لینا چاہتا ہے۔ چنانچہ آپ نے اس وقت کے جبال علم اور اساطین فن علامہ شبیر احمد عثمانی، مولانا اعزاز علی امروہوی، مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی اور محدث جلیل علامہ انور شاہ کشمیری سے بڑے اہتمام اور شوق فراواں سے کسب فیض کیا، خاص طور سے آپ کی علمی، ادبی اور تحقیقی صلاحیتوں کو نکھارنے، سنوارنے اور صیقل کرنے میں علامہ انور شاہ کی شخصیت کا زیادہ دخل رہا ہے۔ علامہ کی بافیض اور کیمیا اثر صحبتوں نے آپ کی فکر و نظر کو جلا بخشی، تحقیقی مزاج و مذاق میں پختگی پیدا کی، آپ کی ذات پر علامہ کشمیریؒ کی توجہات و عنایات، ان کے ترسیل و

انتقال کے مخصوص طرز ومنہاج اور مولانا میاں صاحب مرحوم کی ذات میں موجود فطری لحاظ سے علم کی تڑپ اور شوق، خداداد ذکاوت وفراست، زبردست تخلیقی شعور، فہم وادراک کی قوت اور اخذ واکتساب کی بے پناہ صلاحیت کا نتیجہ یہ ہوا کہ تدریس وتعلیم، تحقیق وتصنیف، تاریخ و سیر، فقہ وحدیث اور اخلاقیات وعمرانیات کے قلمرو میں آں محترم ایک بے مثل تاجور کی حیثیت سے ظاہر ہوئے، جس کے جلو میں علم وتحقیق، زبان وادب اور فکر وفن کی کہکشاؤں کے قافلے ہر آن محوسفر تھے۔

یہ ایک مسلّمہ امر ہے کہ زندگی کے کسی ایک شعبے میں مہارت اور فن کے کسی خاص پہلو پر قدرت کا ظہور معاشرہ میں غیر معمولی واقعہ کی صورت تو ہے؛ مگر حیرت انگیز امر میں اس کا شمار نہیں، اس کے برعکس فکر وفن کی تمام جہتوں پر فتوحات کا پرچم نصب کرنے والی ذات جہاں لوگوں کے لیے استعجاب کا باعث ہوتی ہے، وہیں معاصرین اور آئندہ آنے والی نسلوں کے لیے روشنی کا مینار ہوتی ہے، جس کے ہر سو بکھرے ہوئے اجالوں میں مسافران علم وہنر آسانی کے ساتھ اپنی منزل مقصود کی طرف رواں دواں ہو جاتے ہیں۔ یقیناً ایسے افراد کبھی صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں اور دنیا والوں کے لیے کامرانیوں کا نقش چھوڑ جاتے ہیں۔ مولانا مرحوم کی ذات والا صفات اسی مذکورہ مقام رفیع پر نظر آتی ہے۔ ایک علمی محقق ومصنف اور فن کار کے لیے ماحول کا سکون، وقت کی وسعت، روز وشب کی تنہائی ویکسوئی کس قدر اہمیت رکھتی ہے اور اس کے تخلیقی عمل کے لیے کس قدر ناگزیر ہے، اہل علم بخوبی واقف ہیں؛ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ مولانا کی زندگی درس وتدریس کے زمزموں، سیاسی ہنگاموں، معاشرتی وسماجی دوڑ دھوپ، ملت کی مسیحائی کے لیے اسفار کے منصوبوں اور غلامانہ ماحول کی یاس انگیز خونیں وستم ریز فضاؤں کے درمیان بھی تحقیق وجستجو اور تلاش وتفحص میں سرگرم رہی ہے، ملک وملت کی تاریخ دریافت کرتی ہے، تحقیق کی وادیوں میں آبلہ پائی کر کے علم ریز قلم کے ذریعہ اسلامی علوم اور تاریخ وسیر کے تقریباً تمام تنوعاتی موضوعات کو سمیٹتی ہے اور ایک خاص اسلوب اور طرز نگارش سے علوم وفنون کا صفحۂ قرطاس پر ایک جہاں آباد کرتی ہے۔ چنانچہ

آپ کے قلم کی تیز گامیوں نے اسلامی علوم کی تقریباً تمام امکانی جہتوں کی بازیافت کی اور معنی خیز تشریحات کا ایک دفتر تیار کیا ہے۔عہد رسالت اور خلافت راشدہ کے عہد زریں کی خصوصیات وامتیازات کو جمالیاتی اسلوب میں آشکارا کیا،اسلامی ہند کی عظمت رفتہ کا سراغ لگا کر ہزاروں صفحات پر پھیلی ہوئی شاہ کار تصنیف ''علمائے ہند کا شاندار ماضی'' کی شکل میں علمائے اسلام کی بے مثال جدوجہد کی تصویر کشی کی،علم وتحقیق کے بحر ناپیدا کنار میں مسلسل غواصی کر کے تخلیقی صلاحیتوں کی بدولت رسالہ ''قائد'' میں اور دوسرے جرائد ورسائل میں مختلف عنوانات پر مقالات ومضامین کے ذریعہ تشنگان علوم کے لیے علوم کی شناوری کا راستہ ہموار کیا،ملت اسلامیہ کی عظیم شخصیت،عصر حاضر کے شہرۂ آفاق اہل قلم اور آپ کے مایۂ ناز شاگرد حضرت مولانا نور عالم خلیل امینی صاحب استاذ دارالعلوم دیوبند نے آپ کے کمالات کا نقشہ بڑے عمدہ انداز میں کھینچا ہے:

''وہ بہت بڑے اہل قلم اور مؤلف تھے،ان کی چھوٹی بڑی تصنیفات کی تعداد ستر تک پہنچتی ہے،بعض کتابیں متعدد جلدوں میں ہیں،مختلف علمی،دینی وقیع رسالوں میں جو لاتعداد علمی،تحقیقی،فکر انگیز مقالات لکھے ہیں،وہ ان کے علاوہ ہیں،جنھیں جمع کر دیا جائے تو متعدد الاجزا دسیوں کتابیں تیار ہو جائیں گی،ان کے قلم میں عالم کا وقار،فقیہ و مفتی کی جزرسی،مؤرخ کی دیدہ وری وپختہ کاری،ادیب کی فن کاری،چاشنی اور فصاحت وبلاغت وجاذبیت کے ساتھ دہلوی اردو کا بانکپن اور ممتاز رنگ وآہنگ ہر قاری کو محسوس ہوتا ہے،دردمند عالم کا سوز ان کی ہر تحریر کا امتیاز ہے۔'' [پس مرگ زندہ،ص:۴۱]

فلسفۂ تاریخ میں آپ کا فنی شعور:

تاریخ ایک آئینہ ہے،جس میں گذشتہ اقوام وملل کے انفرادی احوال وکوائف سے لے کر اجتماعی حالات،افکار وخیالات،عقائد ونظریات،تہذیب وتمدن،طرز معاشرت، صنعت وحرفت،جنگوں کے حالات اور دیگر زندگی کی داخلی وخارجی دلچسپیوں کا عکس نظر آتا

ہے۔ بیدار مغز اور باشعور قوموں نے اسی تاریخ کے عکس کی روشنی میں اپنی زندگی کے زاویے بدلے، سمت سفر متعین کیا، سابقہ امتوں میں زوال وپس ماندگی کا پتہ لگایا اور راہ ارتقا کے عوامل کی دریافت کی اور پھر اس بنیاد پر وہ زندگی کے ہر میدان میں ترقی کی راہوں پر گامزن ہوئیں۔

فلسفۂ تاریخ کے امام علامہ ابن خلدون کے مطابق تاریخ دنیا کے تمام علوم وفنون کا سرچشمہ اور گزرے ہوئے زمانے کا ایسا آئینہ ہے، جس میں اسلاف کے احوال وآثار، انبیاء کرام کی سیرتیں، ان کے افعال وکردار، بادشاہوں کا طرز جہاں بانی وجہاں گیری، ان کے افکار وخیالات، رعایا کے ساتھ ان کے معاملات، ملکی قوانین ونظامہائے سلطنت، عوام الناس کی انفرادی واجتماعی طرز زندگی اور اس کے مذہبی، تہذیبی وتمدنی نقوش کو دیکھا جاسکتا ہے۔ [مقدمہ ابن خلدون جلد اول کا خلاصہ، ص:]

یہی وجہ ہے کہ ہر زمانے میں متمدن قوموں کے یہاں تاریخ کے علوم کی بڑی اہمیت اور قدر ومنزلت رہی ہے، اسے قوموں کا حافظہ قرار دیا گیا ہے کہ اس کے بغیر قومیں احساس کمتری کا شکار ہوجاتی ہیں، وہ کسی فکر، کسی نظریہ اور کسی تمدن پر قائم نہیں رہ پاتی ہیں۔ جس طرح ایک شخص کی یادداشت اس کے افکار وخیالات اور اس کے کردار پر اثر انداز ہوتی ہے، ٹھیک اسی طرح ایک قوم کی اجتماعی زندگی اور طرز معاشرت پر سب سے گہرا اثر اس کی تاریخ کا ہوتا ہے۔ تاریخ ہی کے ذریعہ قوموں کے مدوجزر، عروج وزوال اور ترقی وانحطاط کی راہیں ہموار ہوتی ہیں، اسی سے گذشتہ قوموں کی لغزشوں، کوتاہیوں اور غلطیوں کی شناخت ہوتی ہے۔ اس کا مطالعہ جہاں حوصلوں میں بلندی، ارادوں میں مضبوطی اور عزائم میں پختگی عطا کرتا ہے اور دور اندیشی وبصیرت مندی اور شعور وتخیل کو وسعتوں سے آشنا کراتا ہے، وہیں اقوام وملل کو اس بات سے آگاہ بھی کرتا ہے کہ نظام حیات کے کسی شعبے میں بھی، کسی بھی لمحہ زندگی کے مقاصد سے غفلت اور فرائض منصبی سے کوتاہی انھیں عروج کی منزلوں سے اتار کر زوال وتنزل کی تاریکیوں میں پہنچا سکتی ہے۔

علم تاریخ کی اہمیت وافادیت اور اس کی عظمت کے لیے اتنی بات کافی ہے کہ وہ کلام مقدس جو رشد وہدایت کا علمبردار اور راہِ حق وصداقت کا حقیقی معیار ہے، اس کا ورق ورق امم ماضیہ کے تذکروں، شہنشاہوں کی چیرہ دستیوں اور خوش حالی وفارغ البالی کی نعمتوں سے آراستہ قوموں کی گمراہیوں اور بے اعتدالیوں سے بھرا ہوا ہے، جس میں ان کے عقائد و اعمال اور طرز معاشرت کی بڑی واضح تصویر نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی دوسری قوموں کی بہ نسبت مسلمانوں نے اس فن کی طرف زیادہ توجہ دی، اس کے سرمایہ کو محفوظ کیا، اس کے اصول وضوابط مرتب کیے، یہاں تک کہ ابن خلدون جیسی عبقری شخصیت نے اسے مستقل علم اور فن کی حیثیت عطا کردی۔ یہ فن جس قدر عظیم اور اہم ہے، اسی لحاظ سے مشکل بھی ہے۔ یہ علم وتحقیق کے اس دشت بے کراں کی طرح ہے، جس میں کوچہ گردی وآبلہ پائی جہاں ذہن ودل کے بند دریچوں کو وَا کرتی ہے، انھیں ایک نئے جہان سے آشنا کراتی ہے، وہیں اس کی سیاحت قلب ونظر کو حقائق ومعارف کے شفاف جلوؤں سے محروم کرکے خود ساختہ نظریات، مزعومہ افکار، بے بنیاد اخبارات، شعوری یا غیر شعوری طور پر صداقتوں کے برعکس خانہ ساز واقعات وحکایات کی صورت میں نظر آنے والی کذب وافترا اور تلبیس و خیانت کی تاریکیوں میں غرق کردیتی ہے۔ اس پُرخطر وادی میں سیاحت اور اس کے سودمند اثرات سے فیضیاب ہونے کے لیے ضروری ہے کہ اس راہ کا مسافر علم کی وسعت، فکر کی بلندی، مشاہدات کی نتیجہ خیز قوت، تجربات کے تعمق اور رطب ویابس، خطا وصواب، حق و باطل کے درمیان امتیاز پیدا کرنے کی زبردست صلاحیت سے آراستہ ہو۔

مولانا سید محمد میاں صاحب کی تحریروں کے مطالعے کے بعد قاری پر یہ بات بالکل آشکارا ہوجاتی ہے کہ ان کی ذات مذکورہ تمام خوبیوں سے مزین اور آراستہ تھی، فیاض ازل نے انھیں اخذ واکتساب، فہم وفراست، عرفانی حقیقتوں کی کائنات دریافت کرنے والی بصیرت، گذشتہ زمانوں میں پیش آنے والے واقعات وحادثات کے اسباب کی تہہ تک پہنچنے والے ادراک وشعور کی دولت سے نوازا تھا، پھر مطالعہ کی وسعت نے وقت کے ساتھ ساتھ

مذکورہ صلاحیتوں کو آسمان کی پرواز عطا کردی۔

جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مذکورہ خوبیوں اور فنی مہارت کی رہنمائی میں تاریخ نگاری کی وادی میں آپ اترے تو عالم اسلام کے ساتھ ساتھ برصغیر کی ملت اسلامیہ ہند کے عروج و زوال، اس کی شان وشوکت، اس کی علمی، معاشی، تمدنی فتوحات، اس کی جہانگیری و جہاں بانی، مسلم حکمرانوں کے عہد میں علمائے اسلام کی سرگرمیوں، انگریزی سامراجیت کے تاریک دور میں احیائے اسلام کی تحریکوں، ملک کی آزادی کے لیے ان علماء ومشائخ خصوصاً اسلاف دیوبند کی لازوال وحیرت انگیز مجاہدانہ کارناموں کی انتہائی جرأت مندانہ وحقیقت پسندانہ تصویرکشی کی، علاوہ ازیں مستشرقین کی نام نہاد غیر منصفانہ تحقیقات سے مرعوب فکر و اذہان کے نتیجے میں ظہور پذیر ہونے والی امت مسلمہ کی کردارکشی پر مبنی حکایات اور مسلم حکمرانوں پر واقع ہونے والے بے بنیاد تعصب وتنگ نظری کے الزامات کی بے سروپا داستان کذب وافترا کی اپنے زرخیز وعلم ریز قلم کے ذریعہ مخصوص رنگ وآہنگ، پُراعتماد اسلوب اور مؤرخانہ طرز نگارش میں حقیقت آشکارا کی۔ آپ نے کتابوں کی دنیا کے مطالعہ پر اکتفانہیں کیا؛ بلکہ موضوع کے لحاظ سے ماحول، حالات، عہد اور زمانے کا گہرا جائزہ لیا، ظاہری سطح اور مظاہر کا سینہ چیر کر حقائق ومعارف کی جستجوئے مسلسل کی، تلاش وتفحص کے بے کراں سمندر میں مستقل غواصی کی، بے شمار علوم ومعارف کے خزانوں کا سراغ لگایا، وقت کی تہوں میں پوشیدہ بے شمار ہستیوں کو روشنی عطا کی، ان کے کارناموں کو دریافت کرکے نئی زندگی عطا کی، فرزندان قوم کے وہ تاریخی سرمایے جو تاریکیوں کا مقدر بن چکے تھے، آپ نے اپنی گراں قدر تحقیقات سے انھیں اجاگر کیا، وقت کے حالات، تیور اور تقاضے کے مطابق ان کے کارناموں کی ضرورت واہمیت واضح کی، تاہم پرورش لوح وقلم، اسلامی تمدن ومسلم سلاطین کی تہذیب کے تحفظ وتفحص کے عمل کے دوران، جذبات کے زیراثر حق وصداقت کے اظہار سے کہیں آپ نے سمجھوتا نہیں کیا؛ بلکہ تاریخ نویسی کے اصول کے مطابق راہ تحقیق کے تمام مراحل میں اعتدال وتوازن، اسلوب میں متانت وسنجیدگی اور استشہاد واستناد میں

منصفانہ عمل کا اعتماد قائم رکھا ہے۔ ہزاروں صفحات پر پھیلی ہوئی آپ کی تمام تحریروں میں یہ صفت پوری شان سے نظر آتی ہے۔ چنانچہ آپ کی تصانیف میں مقبولیت کی بلندیوں پر فائز ہونے والی کتابیں: ''علماء ہند کا شاندار ماضی، علمائے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے، ہندوستان شاہان مغلیہ کے عہد میں، تحریک ریشمی رومال، تاریخ الاسلام'' اور ملک کے مؤقر رسالوں اور آپ کے جاری کردہ ماہنامہ ''قائد'' کے ادارتی صفحات میں شائع ہونے والے سیکڑوں مقالات، آپ کے خلاق ذہن اور فلک پیما فکر ونظر کا بہت واضح ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ علمی وتحقیقی جلوؤں کی کرنیں یوں تو آپ کی تمام تصانیف میں محسوس ہوتی ہیں؛ لیکن مذکورہ کتابوں میں آپ کی مؤرخانہ بصیرت، تنقیدی مہارت، محققانہ ندرت، حق وباطل کی شناخت رکھنے والی گہری فراست اور دجل وفریب کے پردوں میں چھپی ہوئی روایات و حقائق کو پرکھنے والی عدیم النظیر درایت کی لہریں پورے شباب پر نظر آتی ہیں اور قاری کے سامنے نئے نئے جہانوں اور حقیقتوں کی دنیا کا انکشاف کرتی ہیں، خاص طور سے ''علمائے ہند کا شاندار ماضی'' اپنے موضوع، مواد، تحقیق وتدقیق، فنی معلومات، روایت ودرایت، نقد و تبصرے، فکر وفن کی جامعیت اور اسلوب نگارش کی دلآویزی کے لحاظ سے مقبولیت اور استناد کے اس مقام پر ہے کہ علمی وتحقیقی دنیا میں اسے اپنے موضوع کے حوالے سے دستاویز کا درجہ حاصل ہے اور ہندوستان میں سلطنت مغلیہ کے حالات وواقعات سے متعلق تاریخ کے طالب علموں کے لیے مآخذ ومراجع کی حیثیت رکھتی ہے۔

مولانا سید محمد میاں مرحوم کی تاریخ نگاری ان کی تصانیف کی روشنی میں:

مولانا سید محمد میاں صاحب نے جس عہد میں آنکھیں کھولی تھیں، وہ ہندوستان کی سیاست کے لحاظ سے بڑا پُرآشوب دور تھا، پورا ہندوستان انگریزی سامراجیت کی قربان گاہ پر سسک رہا تھا۔ ۱۸۵۷ء کی قیامت میں مسلم حکمرانوں اور ان کی شان وشوکت کا آفتاب گل ہو چکا تھا، ہر طرف یاس وہراس کا عالم تھا، انگریزی سفاکیت اور اس کے جبر واستبداد سے پوری فضا زخم زخم اور پورا ماحول سوگوار تھا، اس دور رستاخیز میں تعلیمی مراحل کو مکمل کر کے جب

عملی زندگی میں آپ نے قدم رکھا تو برطانوی حاکمیت، اس کے مظالم اور ہندوستانیوں خصوصاً مسلمانوں کے ساتھ اس کے غیر انسانی رویوں اور قوم مسلم کی بے بسی و بے کسی اور بساط کے مطابق حصول آزادی کے لیے اس کی جدوجہد اور نقل وحرکت کا جو احساس کم سنی کے عالم میں لوح قلب پر نقش تھا، اس میں شدت آ گئی، وہ شرارہ گویا اب شعلوں کی شکل اختیار کر چکا تھا، یہ کیفیت اور اس میں بے تاب بجلیوں کی صفت جہاں جہاد حریت کے احساس کا نتیجہ تھی، وہیں ماحول میں تبدیلی ہندوستانیوں میں آزادی کی بیداری اور اکابر دیوبند کی مسلسل جدوجہد کا بھی خاصا دخل تھا۔ چنانچہ ۱۹۲۹ء میں جامعہ قاسمیہ شاہی مرادآباد میں بحیثیت استاذ آپ تشریف لائے تو یہاں کی فضا جہادِ آزادی کے فلک شگاف نعروں سے مرتعش تھی، کانگریس کے پلیٹ فارم کے علاوہ خود جمعیۃ علما اپنی تنظیمی سطح پر جنگی تدابیر کی صورت میں سرگرم عمل تھی، اس پلیٹ فارم سے مفتی اعظم مفتی کفایت اللہ دہلوی، شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی، حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندی، امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد، مفسر قرآن مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کی قیادت میں جگہ جگہ آزادی کے شعلے بھڑک رہے تھے، ایسی صورت حال میں بہت مشکل تھا کہ ملت اسلامیہ کی عظمتوں کے تجسس میں رہنے والا قلب وجگر خاموشی کے عالم میں شب وروز گزار لیتا۔ چنانچہ قیام مدرسہ شاہی کے دوسرے سال ۱۹۳۰ء میں آپ نے جمعیۃ علماء کے پلیٹ فارم سے شیخ الاسلام مجاہد آزادی مولانا حسین احمد مدنی کی ایما پر قافلۂ آزادی میں شمولیت اختیار کر لی۔

یہی وہ زمانہ ہے جس میں ایک طرف تعلیم وتدریس ہے، دوسری طرف سیاسی ماحول کی زلفوں کو سنوارنے کی دھن ہے، تیسری طرف ملت اسلامیہ کی روشن تاریخ کی تلاش وتفحص کا جانکاہ عمل بھی جاری ہے، ہرچند کہ تلاش وجستجو کا یہ عمل دلوں کو اکتا دینے والا اور بے شمار سنگریزوں کے باعث پاؤں کو لہولہان کر دینے والا بے آب وگیاہ صحرا تھا؛ مگر آپ نے آہنی عزم استقلال کی بدولت ہندوستان کی مغلیہ دور کی پوری تاریخ کے ساتھ ساتھ، ایسٹ انڈیا کمپنی کی سازشی کارستانیوں، ملک کے اقتدار پر اس کے غاصبانہ اقدام، باشندگان ہند

خصوصاً مجاہدین حریت کے ساتھ اس کی بربریت، نیز ۱۸۵۷ء کے قیامت خیز، روح فرسا دور میں اس کے مظالم اور چیرہ دستیوں کی لرزہ خیز داستانوں کو اپنے بے پناہ جذبۂ حریت اور گم شدہ اسلامی عظمتوں سے عشق کے زیرِ اثر کھنگال ڈالا۔ مغلوں کے دورِ اقتدار سے لے کر انگریزی سامراجیت کی لہولہان فضا تک علمائے اسلام کی کیا قربانیاں رہی ہیں؟ دینی، اصلاحی، علمی، تحقیقی، فکری و دعوتی اور سیاسی سطح پر ان کے کارنامے کس نوعیت کے تھے؟ ان کے دائرۂ عمل کی وسعت کہاں تک تھی؟ اس راہ میں ان کی سرفروشانہ سرگرمیوں کے نتیجے میں اصحاب اقتدار اور انگریزی استعماریت کو مسلط کرنے والے غاصبانِ وقت نے کیسی کیسی ستم رانیاں ایجاد کیں، ان کے ایمان شکن ظلم و ستم کے طوفانوں کا علمائے اسلام اور مجاہدین آزادی نے کس طرح مقابلہ کیا، صبر و استقامت کی کیسی روشن داستان رقم کیں؟ تاریخی اوراق کے سینوں میں محفوظ ان لرزہ خیز واقعات کا آپ نے گہری نظر سے مطالعہ کیا اور مکتوبات مجدد الف ثانی، آئین اکبری، تزک جہانگیری، خزینۃ الاصفیاء، سفینۃ الاولیاء، مآثر الکرام جیسی مسلم حکمرانوں کے روشن عہد کی عکاسی کرنے والی دستاویزات کے علاوہ، عہد غلامی کے خزاں آشنا لمحوں میں لکھے گئے نثری مراثی و علمائے اسلام کے شاندار مجاہدانہ کارناموں پر مشتمل تاریخ ہند، عمادت السعادت سیر المتأخرین، نزہۃ الخواطر، وقائع احمدی، نور احمدی، وثیقۃ التواریخ، تاریخ اودھ، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی سیاسی تحریک، سیرت سید احمد شہید اور اسی جیسی پچاسوں معتبر و مستند کتابوں کے ذریعہ عہد اکبری سے لے کر آخری تاجدار مغل بہادر شاہ ظفر تک تمام سلاطین کے نظامہائے حکمرانی، رعایا کے ساتھ ان کے رویے، ان کی اخلاقی و ایمانی حالات، شاہی تہذیب و تمدن، عوام الناس کے تہذیبی، معاشی اور اخلاقی و ایمانی احوال و کوائف کا ایک جامع اور تفصیلی نقشہ مرتب کیا اور پھر ان ہی مصادر کی روشنی میں مغل حکومت کے سقوط یعنی ۱۸۵۷ء تک اسلامی عمارتوں پر شب خون مارنے والے نام نہاد علماء سوء اور بندگان حرص و ہوس، ان کے شرمناک افعال و کردار اور علمائے ربانیین و مشائخ عظام، امام الاتقیا والصلحا مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد سرہندی اور ان کے تلامذہ و خلفاء

کرام کی دینی، دعوتی واصلاحی کارناموں اور حادثۂ غدر کے بعد شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی منصوبہ بند تحریکوں، نیز ان کے جانشین شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، سید احمد شہید، شاہ اسماعیل شہید کی جہد وعزیمت سے لبریز ہر محاذ پر سرفروشانہ قربانیوں اور مجاہدانہ کارناموں پر مشتمل آپ نے ''علمائے ہند کا شاندار ماضی'' کے نام سے معرکہ آرا کتاب تصنیف فرمائی، جو کم وبیش ایک ہزار صفحات میں چار جلدوں پر پھیلی ہوئی ہے۔

شاندار ماضی کی اشاعت پر حکومت کا ایکشن:

اس عظیم الشان کتاب کا منظر عام پر آنا تھا کہ ہر طرف پذیرائی ومقبولیت کی دھوم مچ گئی، کیا علماء اور کیا عوام! ہر ایک کی زبان پر اس کے چرچے عام ہوئے، حکومت کے ایوانوں تک اس کی شہرت کا آوازہ پہنچا، خطرہ محسوس کیا گیا کہ کہیں اس کے مندرجات و مضامین مجاہدین آزادی کے افسردہ قلوب پر ولولۂ تازہ کی شبنم نہ چھڑک دے، سینوں میں دبی ہوئی چنگاریوں میں شعلوں کی روح نہ پھونک دے۔ اس خطرے کے سدباب کے لیے حکومت حرکت میں آئی، کتاب خلاف قانون قرار دے کر ضبط کر لی گئی، پریس پر پابندی عائد کر دی گئی، مصنف پر فرد جرم عائد کر کے گرفتار کر لیا گیا اور آپ کے اوپر مقدمہ دائر کیا گیا۔

مفتی مسعود عزیزی لکھتے ہیں:

''علمائے ہند کا شاندار ماضی'' چار جلد یہ آپ کی شاہکار تصنیف ہے، اس کتاب نے سامراجی طاقت کے کالے کرتوت اور ظلم وتشدد کی داستانوں کو واشگاف کر کے اس حکومت کو جھنجھوڑ ڈالا، جس کی فرمانروائی میں سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔ یہ کتاب مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی (متوفی: ۱۰۳۴) سے لے کر ۱۸۵۷ء تک کے مجاہدین حریت کے مجاہدانہ کارناموں پر مشتمل ہے۔ اولاً مدرسہ شاہی کے قیام کے دوران ۱۹۳۹ء میں تحریر فرمائی، جس کو جابر حکومت نے ضبط کر لیا اور مصنف کو گرفتار کر کے مقدمہ چلا دیا۔ دوبارہ آزادی کے بعد غالباً ۱۹۵۷ء میں از سر نو اضافوں کے ساتھ ترتیب دیا۔'' [تذکرہ سید میاں ص: ۸۴]

حکومت کے اس اقدام سے اہل دل میں انگریزی قوم کے خلاف جذبات میں مزید شدت پیدا ہوئی، نفرتوں میں اضافہ ہوا، ہر سو اس غیر منصفانہ و جابرانہ رویے کی مذمت کی گئی، اس سلسلے میں وقت کی فعال تنظیم حریت جمعیۃ علماء نے ۱۹۴۰ء میں مجلس عاملہ کا اجلاس بلایا اور اس تاریخ ساز کتاب کی ضبطی اور آپ کی گرفتاری کے عمل پر شدید مذمتی قرارداد پیش کی اور اس ظالمانہ اقدام کو فکر و نظر کی آزادی پر حملہ قرار دیا گیا۔

شاندار ماضی کے وجود کا محرک:

ملک کو غلامی کی زنجیروں سے آزاد کرانے کی سیاسی جدوجہد میں علمائے دیوبند کے کردار کو ایک مخصوص طبقہ بجائے اس کے کہ وہ سیاسی محاذ پر معاونت کرتا یا تائیدی تخلیقات کے ذریعہ ان کے کارناموں کی تحسین کرتا، اپنی جارحانہ تنقیدوں سے آزادی کے اس بے لوث اقدام کو مصلحت کے خلاف اور اسلامی تعلیمات سے منحرف قرار دیتا تھا، مزید اس افسوس ناک نظریے کی علی الاعلان بیانات اور تحریروں میں پورے شدومد سے تردید کر کے برطانوی حکومت سے اپنی وفاداری کا ثبوت فراہم کرتا تھا۔ برٹش حکومت کی حمایت میں اس کی فکر یہ تھی کہ علمائے اسلام کو سیاسی محاذوں سے کنارہ کش ہو کر صرف مذہبی امور میں محصور رہنا چاہیے اور اپنی تمام صلاحیتوں کو عبادات و عائلی نظام پر مرکوز کرنا چاہیے۔ اس نظریے کی ترویج و اشاعت نے آپ کے اندر یہ جذبہ پیدا کیا کہ اسلامی افکار و مزاج کے خلاف اس فکر و عمل کا تاریخی لحاظ سے تجزیہ کیا جائے اور بتایا جائے کہ ہر دور میں ملک کے سیاسی حالات کی زلف پریشاں کو علمائے اسلام نے تن من دھن کی قربانیوں سے سنوارا ہے اور ان ہی کی مساعیِ جمیلہ سے ہر دور میں اسلام کی بادِ بہاری آئی ہے۔ تاریخ ہند کی سیاحت اور اس کے محرکات و عوامل کے متعلق مولانا مرحوم کی جو تصریح ملتی ہے، اس سے درج بالا دعوے کی تائید ہوتی ہے۔ مولانا لکھتے ہیں:

> ''شاندار ماضی کی تصنیف کے مقصد دو تھے: اول یہ کہ سیاسی تحریک میں علماء کی شرکت کو علماء کی شان کے خلاف ایک طرح کی بدعت قرار دیا جا رہا تھا، اس کتاب میں

ظاہر کیا گیا ہے کہ علماء نے ہر دور میں اس دور کی سیاست کے مطابق عملی حصہ لیا ہے اور سزائیں بھگتی ہیں؛ لہٰذا اس دور میں اس دور کے تقاضے کے مطابق تحریک میں حصہ لینا علماء کی شان کے خلاف نہیں؛ بلکہ ان کی تاریخی روایات کو زندہ کرنا ہے۔ دوسرا مقصد تحریک آزادی کو تقویت دینا تھا، اسی لیے ان مظالم کی تاریخ بیان کی گئی تھی، جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے آغاز سے اس وقت تک انگریزوں نے کیے تھے۔'' [پس مرگ زندہ، ص:۱۰۲]

تاریخ نویسی میں مولانا مرحوم کی فنی بصیرت:

مولانا سید محمد میاں صاحب کے زرنگار قلم سے وجود میں آنے والی مذکورہ کتاب ان کی تمام تصنیفات میں تاریخی اصول وقواعد اور تحقیق وجستجو کے لحاظ سے اور اپنے موضوع کی وسعت وجامعیت کے اعتبار سے بڑی اہم اور شاہکار سمجھی جاتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ پوری کتاب میں مولانائے محترم کی مؤرخانہ بصیرت، فنی شعور، علم کی گہرائی اور فکر کی وسعت پوری آب وتاب سے نظر آتی ہے۔ مجموعی طور سے یہ کتاب حضرت مجدد الف ثانی کی دعوتی، اصلاحی اور تبلیغی سرگرمیوں پر قاری کی توجہ مرکوز کرتی ہے؛ مگر ضمناً پوری سلطنت مغلیہ کی علمی، اخلاقی، تہذیبی، تمدنی تاریخ سمٹ آئی ہے۔ مغل فرماں روا ظہیرالدین بابر کے ہاتھوں قائم ہونے والی مغل سلطنت کا تخت جب اس کے پوتے جلال الدین محمد اکبر کے ہاتھوں میں آیا تو ہر چند حدود مملکت کا دائرہ پورے ہندوستان پر پھیل گیا تھا، اکبر کی سیاسی تدبیروں کے نتیجے میں سلطنت ہر لحاظ سے مستحکم ہو چکی تھی، ہر طرف سکون و اطمینان کی فضا قائم تھی، مگر اسی کے ساتھ یہ تلخ حقیقت بھی ہے کہ کچھ ہی عرصہ بعد درباری علماء سوء کے نفسانی کردار کی وجہ سے حکومت کا پورا ڈھانچہ صحیح اسلامی نہج سے بالکل ہٹ گیا، حکومتی سطح پر شعائر اسلام کو مسخ کر دیا گیا، بادشاہ کے ملحدانہ ومشرکانہ قلب وذہن...... جو غرض پرست دنیادار علماء کی ذہن سازی کا نتیجہ تھا...... کے باعث قصر شاہی کے در و بام بدعات و خرافات اور شرک وبت پرستی کی تاریکیوں میں ڈوب گئے، اسلامی روایات کے فانوس ایک

ایک کر کے بجھ گئے یا بجھا دیئے گئے، پھر ایک وقت ایسا آیا کہ کلی طور پر بادشاہ نے اوتار اور پیغمبری کے منصب کو اختیار کر لیا۔ قدرتی طور پر بادشاہ کے نظریات سے عوام بھی متأثر ہوئی، جس کی وجہ سے اسلام اور اس کی تعلیمات حیات، فرسودہ رسوم و رواج میں محصور ہو کر رہ گئی۔

اس المناک صورت حال کی مولانا مرحوم نے اس انداز سے منظر کشی کی ہے کہ اس دور کی تصویر مکمل حشر سامانیوں کے ساتھ نگاہوں میں آ جاتی ہے۔ ذیل کے اقتباس سے اس کی جھلک کے ساتھ مولانا مرحوم کی تاریخ نگاری کا شعور اور فنی بصیرت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ منتخب التواریخ اور دوسرے مستند مآخذ کے حوالے سے ''فتنۂ اکبری کے دین الٰہی کے عناصر'' کے عنوان کے تحت مولانا رقم طراز ہیں:

''اکبر آفتاب کی عبادت دن میں چار وقت یعنی صبح و شام، دو پہر اور آدھی رات میں لازمی طور پر کرتا تھا اور ایک ہزار آفتاب کے ہندی ناموں کو اپنا وظیفہ بنا لیا تھا۔ ٹھیک دو پہر کو آفتاب کی طرف متوجہ ہو کر حضور قلب کے ساتھ ان ناموں کو پڑھا کرتا تھا اور اپنے دونوں کانوں کو پکڑ کر بادشاہ ایک چرخ کھاتا اور کانوں کی لَو پر ٹکے لگاتا اور اس قسم کی دوسری حرکات بھی بہت سی بادشاہ سے صادر ہوتی تھیں، وہ قشقہ بھی لگاتا تھا اور آدھی رات کو ایک دفعہ پھر طلوع آفتاب پر دوسری بار، روزانہ نوبت اور نقارہ بھی مقرر تھا۔ یہ قاعدہ مقرر تھا کہ جب آفتاب کا ذکر کیا جائے تو (العیاذ باللہ) جلّت قدرتہ کہا جائے۔ اسی طرح آگ، پانی، درخت اور تمام مظاہر فطرت حتیٰ کہ گائے اور گائے کے گوبر تک کو پوجتا تھا اور قشقہ اور جینو سے اپنے بدن کو آراستہ کرتا تھا اور آفتاب کو مسخر کرنے کی دعا جس کی تعلیم ہندوؤں نے دی تھی، وِرد کے طور پر آدھی رات کو طلوع آفتاب کے وقت پڑھا کرتا تھا اور صرف عبادت ہی نہیں کی جاتی تھی، بلکہ ربوبیت میں بھی اس کو شریک ٹھہرایا جاتا تھا کہ یہ آفتاب نیّر اعظم ہے اور سارے عالم کو وہ داد و دہش کرتا ہے، بادشاہوں کا مربی اور سرپرست سورج ہی ہے اور سلاطین اس کو رواج دینے والے ہیں۔ کواکب پرستی میں اس قدر غلو بڑھ گیا تھا کہ بادشاہ اپنے لباس کا رنگ سات ستاروں کے رنگ کے موافق رکھتے تھے۔ چونکہ ہر دن کسی ستارے کے

ساتھ منسوب ہے؛ اس لیے ہر دن کے لباس کا رنگ جداگانہ ستارے کے رنگ کے مطابق ہوتا تھا۔

خنزیر کے متعلق بھی ہندوؤں نے باور کرایا تھا: خوک ازاں مظہر است کہ حق تعالیٰ دراں حلول کردہ (العیاذ باللہ) مبدأ اور معاد پر مذاہب کی بنیاد ہے، اس میں مبدأ کے متعلق تو یہ عقیدہ قرار دیا گیا، رہا معاد یعنی بعد مردن، اس کے متعلق جدید دین میں تناسخ کے عقیدے میں بڑی پختگی پیدا ہوگئی تھی۔ اعظم خان گورنر بنگال جب دربار میں حاضر ہوا تو بادشاہ نے کہا: ہم نے تناسخ کی صداقت پر قطعی دلائل حاصل کر لیے ہیں، شیخ ابوالفضل تمہارے ذہن نشین کرا دے گا۔ اس مسئلے کے متعلق خوش اعتقادی یہاں تک پہنچی ہوئی تھی کہ برہمنوں کے مشورے سے بادشاہ سر کے بیچ کے بال منڈوایا کرتے تھے اور چاروں کناروں کے بال چھوڑ دیئے جاتے تھے۔ عقیدہ یہ تھا کہ چونکہ بادشاہ کی روح کامل ہو چکی ہے اور کامل مکمل لوگوں کی روح کھوپڑی سے نکلتی ہے، اس وقت ایک کڑاکے کی آواز پیدا ہوتی ہے اور یہ آواز میت کی سعادت ونجات کی دلیل ہوتی ہے اور یہ کہ مردوں کو گناہوں سے نجات مل گئی ہے (جلنے کے وقت آخر میں جو مردوں کی کھوپڑی پھٹتی ہے، اس وقت ایک آواز قدرتی طور پر پیدا ہوتی ہے، شاید برہمنوں نے اسی کو نجات کی دلیل سمجھ لیا ہوگا) اور مذہب تناسخ کے بموجب اس بات کی علامت ہے کہ یہ روح کسی ذی شوکت صاحب اقتدار اور مطلق العنان بادشاہ کے بدن میں جنم لے گی۔ گویا اس طریقے سے بادشاہ کو یقین تھا کہ مرنے کے بعد پھر کسی دوسرے تخت پر اسی شان وشوکت کے ساتھ جلوہ گر ہوں گے، اگرچہ بعض برہمنوں نے تو یہ بھی باور کرا دیا تھا کہ اکبری عہد (الف ثانی) سے چونکہ بجائے قمر کے زحل کا عمل دخل شروع ہو گیا ہے؛ اس لیے عمر کی کمی جو دورۂ قمر کا نتیجہ تھی، اب نہ ہوگی۔ دورۂ زحل کے متعلق خیال تھا کہ ''مجدد اطوار واوراد ومورث طول اعمار است'' الغرض پہلے تو موت ہی کے وجود کو ایک دور دراز زمانے تک ملتوی کر دیا گیا اور اس کے بعد بھی یقین دلایا گیا کہ آئندہ بھی بادشاہ کی روح کسی ایسے بادشاہ کے بدن میں حلول کرے گی، جیسا کہ وہ خود تھا۔ ان باتوں نے تناسخ پر اس کے قدم کو راسخ کر دیا تھا۔ [علمائے ہند کا

شاندار ماضی، ج:۱،ص:۱۴]

مولانا مرحوم نے صرف اکبر کی ذاتی زندگی اور اس کے اعمال وافعال اور افکار و نظریات ہی سے پردہ نہیں اٹھایا ہے؛ بلکہ اس کی سرپرستی میں حکومتی پیمانے پر اسلامی شعار، اسلامی تمدن وثقافت اور اسلامی احکامات پر جو شب خون مارا گیا اور جس قدر ان میں تبدیلیاں کی گئیں، ان تمام حقائق کا باریک بینی سے جائزہ لیا اور انتہائی جرأت مندانہ و حقیقت پسندانہ اسلوب میں اسے طشت از بام کیا۔ چنانچہ آپ نے دین الٰہی کے نام پر نئے دین اور اس کے جاری شدہ ملحدانہ رسومات واحکامات، سود اور جوئے کی حلت، شراب کی ترغیب وحلت، داڑھی رکھنے اور غسل جنابت کی منسوخی، سارداا یکٹ، پردے کی مخالفت، زنا کی تنظیم وترویج، شیعیت کے زیر اثر متعہ کی ترغیب، ختنہ کی رسم پر پابندی، مردوں کے لیے ریشمی لباس اور سونے کے زیورات کے استعمال کے جواز ورواج، شیوراتری ورکشابندھن کے اہتمام، ہندی علوم سے عقیدت، عربی زبان سے نفرت اور اس میں موجود علوم اسلامی کے حصول پر پابندی، غرض اسلام کی اجنبیت وبے چارگی اور مجموعی طور پر پورے قلمرو میں اس کی تصویر کو مسخ کرنے کے منصوبہ بند عمل پر بڑی محققانہ اور فاضلانہ بحث کی ہے اور مستند مصادر وماخذ کے حوالوں سے مذکورہ حالات کی اس طرح تفصیل وتشریح کی ہے کہ اس عہد کا پورا ماحول، اس کی مذہبی وتمدنی اور سیاسی فضا قاری کے سامنے بالکل بے غبار ہو جاتی ہے۔

نیز مولانا میاں صاحب نے عہد اکبری کی اس اسلام بیزار فضا کے ذکر پر اکتفا نہیں کیا ہے؛ بلکہ ماحول میں اضطراب، ارتداد کی صورت حال، اذہان وقلوب میں اسلام بیزاری اور اکبر کا الحاد کیوں کر وجود میں آیا؟ اس کے اسلامی، روحانی اور وحدانیت سے معمور ذہن میں کیوں کر دوسرے مذاہب راسخ ہوئے؟ اس کی وجوہات اور اسباب کی بھی بازیافت کی ہے کہ تاریخ نویسی میں اسباب وعلل کی تلاش وجستجو بنیادی اہمیت رکھتی ہے اور اس عمل سے گزرنا ایک مؤرخ کا اولین فریضہ ہے، اس کے بغیر واقعات کی تہہ تک پہنچنا اور اس کی اصلیت اور حقائق کو معلوم کرنا دشوار اور محال ہے۔

کوئی شک نہیں کہ مولانا مرحوم اس بنیادی اصول سے اچھی طرح واقف ہی نہیں تھے؛ بلکہ تاریخ نگاری کے تمام مراحل میں اس پر کاربند بھی رہے۔ یہی وجہ ہے کہ شاندار ماضی میں عہد اکبری کے فتنہ خیز ماحول میں ملحدانہ افکار وخیالات اور اس کی ترویج واشاعت کی وجوہات وعلتیں بڑی صراحت کے ساتھ ملتی ہیں۔ مولانا مرحوم نے مذکورہ تمام نتائج کا ذمہ دار پورے اعتماد ویقین کے ساتھ اس عہد کے نفس پرست، دنیادار علماء سوء کی ضمیر فروشی وایمان فروشی کے شرم ناک کردار وعمل کو قرار دیا ہے، جو موسم کے لحاظ سے اور وقت کے تیور کے مطابق دربار اکبری میں ظاہر ہوا کرتے تھے، جو چند سکوں کے عوض یا اپنی اَنا کی تسکین کے لیے دینی احکامات وتعلیمات کو بے تکلف بدل ڈالا کرتے تھے، ان کے ایام ایک دوسرے کی تکفیر وتفسیق میں گزرتے اور راتیں عیش کوشیوں میں گزرتیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ان ہی سوداگرانِ ضمیر وظرف، اَنا پرست وخود غرض بندگان حرص وہوس کی مزعومہ مقدس جماعت کی فتنہ پردازیوں اور ریشہ دوانیوں کی وجہ سے اولاً حکومت کے ایوانوں میں پھر وہاں سے صادر ہونے والے قوانین کے نتیجے میں پورے ملک میں الحاد وبے دینی اور بدعات وخرافات کی لہر دوڑ گئی۔ سیاہ کردار وعمل میں ڈوبی ہوئی علماء سو کی یہ جماعت جس کی مولانا محترم نے اہتمام کے ساتھ معتبر حوالوں سے زر پرستی، ہوس پرستی اور دنیا پرستی کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے، اس کا ایک نمونہ ملاحظہ فرمائیں جو ایک ایسے عالم کے کردار سے متعلق ہے، دربار اکبری میں جس کے علم وفضل اور عظمت ومرتبہ کا آوازہ گونجا کرتا تھا اور سلطنت اکبری میں مخدوم الملک کے منصب پر فائز تھا۔ اکبر کے دربار میں کس قماش کے علماء جمع تھے، اس کا اندازہ اسی سے ہوسکتا ہے کہ ان میں ملا عبداللہ سلطان پوری تھے، جن کا عہدہ مخدوم الملک تھا محض اس لیے کہ حج نہ کرنا پڑے، فریضۂ حج کے اسقاط کا فتویٰ دے دیا تھا۔ زکوۃ کے متعلق بھی مشہور ہے کہ ششماہی تقسیم کرنے والے حیلہ سے کام لیا کرتے تھے، آخر میں جب ہزار ہا ذلت وخواری کے بعد انتقال ہوا اور بادشاہی حکم سے ان کے مکان کا جو لاہور میں تھا، جائزہ لیا گیا تو اتنے خزانے اور دفینے ظاہر ہوئے کہ ان خزانے کے تالوں کو وہم کی کنجیوں سے بھی کھولنا ناممکن تھا، من جملہ ان کے سونے سے بھرے ہوئے چند

صندوق مخدوم الملک کے گورخانے سے برآمد ہوئے، جنھیں مُردوں کے بہانے سے اس نے دفن کیا تھا۔[شاندار ماضی،ص:۳۶]

حضرت مجدد الف ثانی کے کارنامے اور نتائج کا ادراک:

بدعات وخرافات اور اسلام بیزار معاشرے میں صحیح اسلامی تعلیمات کی شمع جلانے والے اور شب وروز کی مسلسل جدوجہد کے ذریعہ ملک میں اسلامی روح بیدار کرنے والے عظیم مصلح وداعی اعظم حضرت مجدد الف ثانی کی حیات کے تمام گوشوں کا مولانا مرحوم نے جہاں مکمل احاطہ کیا ہے، وہیں مذکورہ تناظر میں مجدد الف ثانی کی خدمات اور اس کی اہمیت اور اس کے خوش گوار نتائج کا بھی تفصیلی تذکرہ کیا ہے۔

عہد اکبری سے لے کر عہد جہانگیری وعالم گیری میں مجدد الف ثانی علیہ الرحمہ اور آپ کے خلفاء وجانشینوں نے کس طرح دینی واصلاحی خدمات انجام دیں، ان قربانیوں کے کیا اور کیسے اثرات ملک پر، حکومت پر مرتب ہوئے، بادشاہ اور اراکین سلطنت کی پیشانیوں پر ان کی دعوت وتبلیغ سے کس قدر شکنیں نمودار ہوئیں اور ان مساعیِ جمیلہ کا کس انداز سے شاہی ردِعمل ظاہر ہوا؟ ناسازگار ماحول میں اور صبر آزما مرحلوں میں مصلحین امت کا کیا طرزِعمل رہا، ان کی ذات سے صبر واستقامت کی اس سرزمین پر کیسی داستان رقم ہوئی، شاہی عتاب اور اراکین حکومت کی سازشوں اور تعصّبات وعناد کی آندھیوں میں ان مسافران حرم نے کیوں کر اپنا سفر جاری رکھا؟ ان تمام تفصیلات کا مولانا نے انتہائی دقت نظر سے مطالعہ کیا اور فلک رسا بصیرتوں کی روشنی میں ان کا تجزیہ وتبصرہ کیا اور نہایت خوبی سے سلسلہ وار انداز میں اس طرح حوالۂ قرطاس کی ہے کہ حضرت مجدد الف ثانی اور ان کے خلفاء کرام کی پوری حیات، ان کے شاندار اور حیرت انگیز کارنامے، تمام طرز ہائے عمل منور گوشوں کے ساتھ سامنے آجاتے ہیں۔ عام طور سے ملتوں کے مذہبی وسیاسی انحراف کے نتیجے میں مصلح و ریفارمر کی اصلاحی کوششیں اور سرگرمیاں، عوامی طاقت وقوت کے سہارے اقتدار کی مخالفت وبغاوت، سرِعام احتجاجی جلوسوں، بے ہنگم نعروں، اشتعال انگیز تقریروں اور اسٹیج کے

مناظراتی مباحثوں کی صورت میں ظاہر ہوتی ہیں اور نتائج کے اعتبار سے اور اثرات و نتائج کے لحاظ سے سمندری جھاگ ثابت ہوتی ہیں؛ یہی وجہ ہے کہ ان تمام طریقہائے اصلاح کے برعکس حضرت مجدد الف ثانی نے انتہائی رازدارانہ انداز میں انفرادی طور پر اعیان سلطنت اور اصحاب اثر ورسوخ پر اپنی اصلاحی جدوجہد مرکوز کی اور اسلامی تعلیمات سے معمور اثر انگیز خطوط کے ذریعہ خاموش انقلاب کی بنیاد ڈالی، رفتہ رفتہ اکبر کے وہ عمائدین حکومت جن کے ہاتھوں میں حکومت کا پورا نظام تھا، جہانگیر کی تخت نشینی کے بعد کچھ ہی عرصہ میں آپ سے متأثر ہو جاتے ہیں اور آپ کے حلقۂ ارادت کے اسیر ہو جاتے ہیں اور وہی مغل حکومت جو کفر وشرک کی آماجگاہ اور بدعات والحاد کی نگراں وسرپرست تھی، جلال الدین اکبر کی موت کے بعد اسلام کی محافظ بن گئی۔ حضرت مجدد الف ثانی نے عبدالرحیم خان خاناں جو عہد جہانگیری میں ذہانت وفراست، سیاسی اثر ورسوخ اور جہاں بانی کی بصیرتوں کی وجہ سے آدھی سلطنت کا مالک سمجھا جاتا تھا، خان جہاں، خان اعظم مفتیِ صدر جہاں، خواجہ جہاں، مرزا داراب قلیج خان جیسے اصحاب عہدہ ومناصب کے پاس آپ نے بہت سے خطوط بھیجے اور مختلف خاموش طریقوں سے ان کے دلوں میں اسلام کی روح پیدا کی، ان کے فرائض منصبی سے انھیں آگاہ کیا، دنیا کی بے ثباتی اور آخرت کا استحضار عطا کیا؛ یہاں تک کہ عظمت وشوکت کی علامت سمجھے جانے والے، غرض پرستی اور مفاد پرستی کے شہ کار، بدعنوانیوں میں ملوث حضرات اسلامی تعلیمات وشریعت اور اس کے احکامات کے محافظ اور پاسبان بن گئے اور حکومت میں انصاف وعدالت کے علاوہ ذاتی زندگی میں بھی عدالت وانصاف کے خوگر بن گئے۔

پھر اسی خاموش انقلاب نے ہندوستان کو انتہائی باعظمت وشوکت اور جاہ وجلال کی چوٹیوں پر جلوہ افروز اورنگ زیب عالم گیر کی صورت میں وہ عظیم الشان حکمراں عطا کیا، جس کے قلمرو میں اسلامی تمدن کی ترویج کے ساتھ اقتصادی ومعاشی ترقی عروج پر پہنچ گئی۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ نے سلطنت کے انقلاب کے لیے طاقت وقوت اور بغاوت کے بجائے خاموش انقلاب اور ارا کین حکومت اور بادشاہ کی اصلاح پر اپنی توجہ کیوں مرکوز کی؟ مولانا

مرحوم کی بالغ نظر اور قوت ادراک ان اسباب تک بڑی آسانی سے رسائی حاصل کرلیتی ہے اور اس عہد کے حالات کے تناظر میں حضرت مجدد علیہ الرحمہ کے طریقۂ کار کی صحت واہمیت اور ہمہ گیر افادیت نیز اس کے خوش گوار نتائج کو دریافت کرلیتی ہے۔ چنانچہ مولانا نے مجدد الف ثانی کے طریقۂ اصلاح کی افادیت کے ساتھ تاریخی شہادتوں اور ماحول ومزاج کی روشنی میں اس کے برعکس تمام طریقوں میں صحیح نتائج کے فقدان پر بھی خاصی روشنی ڈالی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''یہ ممکن تھا کہ آپ ابتدا سے ہی انقلاب سلطنت کی صورتیں سوچتے اور کامیابی کی جدوجہد کرتے؛ مگر آپ کو اپنے لیے سلطنت مطلوب نہ تھی، دوسرے کو سلطان بنانے میں وہی دشواری درپیش ہوتی؛ اس لیے انقلاب سلطنت کے بجائے نظریات سلطنت کی تبدیلی کو آپ نے زیادہ مفید تصور کیا اور درحقیقت گورنمنٹ کا حکومت سے حقیقی تصادم یہی تھا؛ لیکن اس کے لیے بادشاہ کی اصلاح سے پیشتر کارکنان حکومت کی اصلاح ضروری تھی۔ بدقسمتی یہ تھی کہ بادشاہ اور اراکین دولت ذاتی اغراض کے سوا کوئی نصب العین نہیں رکھتے تھے اور چونکہ ذاتی اقتدار کے تحفظ کے لیے عوام کی دلجوئی ضروری سمجھتے تھے، اس لیے عامۃ الناس کے جذبات وخیالات کے احترام میں اپنے مذہب تک کو قربان کرنے کے عادی ہوگئے تھے، اکبر کی پچاس سالہ زندگی اس کی شاہد ہے۔

حضرت مجدد صاحب قدس اللہ سرہٗ کا سیاسی عقیدہ جب یہ تھا کہ **السلطان کالروح** سلطان جان ہے تو لازمی تھا کہ اصلاح روح کے ساتھ بدن اور اعضاء بدن کی نگہداشت کا لحاظ بھی فرماتے؛ تاکہ قلب کی بڑھتی ہوئی قوت کو اعضا برداشت کرسکیں، دنیا کی تاریخ میں سیکڑوں مثالیں ہیں کہ بادشاہ کی اصلاح پسندی سے جو اراکین دولت میں برہمی پیدا ہوئی اور تھوڑے دنوں میں وہ بادشاہت ہی ختم کردی گئی، کم از کم حضرت عمر بن عبدالعزیز کی تاریخ سب کے سامنے ہے، آپ بہ نفس نفیس خلیفہ راشد تھے، چونکہ تابعین کا دور تھا، آپ کی اصلاح کارگر ہوئی، ملک غضوض فوراً ہی خلافت راشدہ بن گیا، مگر پھر کیا ہوا؟ صرف ڈھائی سال بعد ہی اغراض پرستوں کی

فریب کاریوں نے سم قاتل سے مخلصانہ خدمت انجام دی۔شام ہوئی تھی تو خلافت راشدہ کا چاند روشن تھا،صبح ہوئی تو آفتاب خلافت ایسا غروب ہوا کہ آج تک دوبارہ طلوع ہونے کی نوبت نہیں آئی۔''[شاندار ماضی،ص:۱۰۳]

حضرت مجدد کے اسی ظاہری تزک واحتشام سے ناآشنا خاموش اصلاحی تحریک اور اصلاحی کوششوں کی وجہ سے اصحاب اقتدار اور ملک کے سلاطین کے دلوں میں ایمان کی ایسی بادبہاری چلی کہ ایوان سلطنت کے ساتھ ساتھ عام زندگیوں میں دین داری کا ہر طرف مزاج پیدا ہوگیا اور بلاشبہ یہ شیخ احمد سرہندیؒ کا وہ عظیم الشان تجدیدی کارنامہ ہے کہ انھوں نے انتہائی بصیرت مندانہ حکمت عملی اور جرأت رندانہ سے مع وزراء وسلاطین پورے ملک میں اسلام کی روحانی فضا قائم کردی اور ڈوبتی ہوئی اسلامی کشتی کو ساحل سے ہمکنار کردیا۔حضرت شیخ احمد سرہندی کا میدان عمل اور برائیوں،فتنوں اور غیر اسلامی افکار ونظریات اور اس کے زیر اثر پائے جانے والے کفریہ وشرکیہ اعمال وافعال کو ختم کرنے کی جدوجہد اگر دوسری شکل یا دوسری راہ سے ہوتی تو یقیناً ملک میں ایوان اقتدار سے لے کر عام افراد کے ذہنوں میں یہ فکری ونظریاتی انقلاب برپا نہ ہوتا اور تحریک ابتدائی مرحلے میں ہی دم توڑ جاتی؛مگر حکمت و دانائی وبالغ نظری اور مومنانہ فراست کی بدولت حالات کے تقاضے کے مطابق آپ نے وہ مؤثر راستہ اختیار کیا،جس نے اراکین مملکت کے علاوہ وقت کے حکمرانوں کو بھی آپ کے حلقۂ ارادت میں شامل کردیا اور یہ امر مسلّم ہے کہ ملک کا اشرافیہ طبقہ جس فکر پر عامل ہوتا ہے، عوام ورعایا بھی اسی نظریات وخیالات کی غیر شعوری طور پر یا خارجی بنیاد پر پابند ہوجاتی ہے۔لہٰذا قدرتی طور پر ملک کی فضا میں آپ کے ذریعہ اسلامی تعلیمات کی روشنی پھیل گئی، بلاشبہ یہ آپ کا تجدیدی کارنامہ ہے،جس پر مولانا میاں صاحب نے بڑی شرح وبسط کے ساتھ بحث کی ہے اور احادیث وآثار،تاریخی شواہد،منطقی دلائل اور ہر زمانے کے انبیاء ورسل کے اس عہد کے مزاج کے مطابق دعوتی، اصلاحی حکمت عملی اور طریقۂ کار کی نوعیت کے حوالے سے حضرت شیخ الف ثانی کی مجددیت کو آفتاب نیم روز کی طرح ثابت کیا ہے اور اس

پر صحیح العقیدہ اہل علم ودانش کے علاوہ معاندین کا اتفاق بھی نقل کیا ہے۔ چنانچہ آپ اس حوالے سے لکھتے ہیں:

''حضرت امام ربانی کی مجددیت کا تمام امت کو دنیا کے ہر گوشے میں علم ہوا، اور جو لوگ اس معاملے میں اہل حل وعقد ہو سکتے تھے، ان سب نے آپ کی مجددیت کو تسلیم کیا؛ بلکہ جو لوگ بدعات کی محبت یا اپنی سرد بازاری کے خیال سے آپ سے عناد رکھتے تھے، وہ بھی مجبور ہوئے۔'' [شاندار ماضی، اول۔ص:۱۴۴]

مولانا نے حضرت امام ربانی کی دینی واصلاحی کوششوں کے پس منظر میں ان کی حیات پر اس طرح روشنی ڈالی ہے اور نتائج کے حوالے سے مغل فرماں رواؤں خصوصاً جہانگیر، شاہ جہاں اور اورنگ زیب عالم گیر کے سیاسی ومعاشرتی ماحول کا ایسا نقشہ کھینچا ہے کہ مذکورہ علمی وروحانی شخصیتوں کے علاوہ سیاسی ہستیوں کی پوری سوانح حیات قاری کے سامنے آجاتی ہے۔ خاص طور سے شاہ عالم گیر کی تعلیم وتربیت، اس کا نظام حکمرانی، اسلامی قوانین کی طرف اس کے رجحانات، رعایا کے ساتھ اس کے عدل وانصاف، اس کے اخلاق وعادات، حضرت شیخ احمد سرہندی کے خلیفہ وجانشین سے اس کی محبت وعقیدت، جہانگیری وجہاں بانی میں اس کی بے نظیر فراست، اس کی قوت ارادی وجواں مردی، دشمنوں کے ساتھ اس کی کرم گستری، باغیوں کے ساتھ عفو ودرگذر، غیر مسلموں کے ساتھ اس کے اخلاقی رویوں جیسی زریں صفات دن کے اجالوں کی طرح روشن اور عیاں ہوگئی ہے۔

شاندار ماضی کا دوسرا حصہ اٹھارویں صدی میں مسلمانوں کے سیاسی، معاشی اور اجتماعیت کے زوال کی داستان، حکمران وقت کی خانہ جنگیوں، ایسٹ انڈیا کی بڑھتی ہوئی خیانتوں، انگیریزی استعمار کے بڑھتے ہوئے قدموں اور ان کی سازشی پالیسیوں، مغل فرماں رواؤں کی نااہلیوں، عیش کوشیوں اور ناعاقبت اندیشیوں کی المناک روداد اور اٹھارہویں صدی کے ہی آغاز میں اس عالم رنگ وبو میں آنکھیں کھولنے والی عبقری شخصیت امام ربانی حضرت شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریکوں اور آپ کے نامور شاگردوں کی علمی، اصلاحی،

روحانی اور سیاسی محاذ پر سرگرمیوں کے حوصلہ افزا مجاہدانہ کارناموں پر مشتمل ہے۔ خاص طور سے حضرت شاہ ولی اللہ کے عظیم فرزند شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی اور ان کے تربیت یافتہ اور ان کے مشن کی تکمیل کے لیے شہادت کا جام پی کر عشق ووفا کی داستان رقم کرنے والی ہستی حضرت سید احمد شہید کی جرأت مندانہ ومجاہدانہ کارناموں کی پوری تفصیل مولانا مرحوم نے سپرد قرطاس کی ہے، جس میں سید احمد شہید کی سرفروشانہ سرگرمیوں کا سرچشمہ یعنی حضرت شاہ ولی اللہ کے انقلابی افکار ونظریات، ان کے سیاسی نصب العین، حکومت کے اصول وضوابط، معاشی ناہمواریوں کو مساوات میں بدلنے والے عادلانہ معاشی ومعاشرتی افکار کے علاوہ ان کے علمی وتحقیقی کارنامے، ان کے تعلیمی وتربیتی نظام، ان کے داخلی وخارجی حیات کے تمام گوشوں کے ساتھ حضرت سید احمد شہید اور ان کے رفقا کے ذریعہ سکھوں اور انگریزی جارحیت کے خلاف سر دھڑ کی بازی لگا کر معرکہ کارزار میں بپا ہونے والی مجاہدانہ وسرفروشانہ کردار کی تصویریں بھی تمام جمالیاتی اوصاف ووحشت ناک عناصر کے ساتھ ابھر آتی ہیں۔

مولانا مرحوم نے سید احمد شہید اور ان کی قیادت میں قافلۂ حریت کی سرگرمیوں کے پس منظر میں حالات کی ناہمواری، ماحول کی سنگینی، ایسٹ انڈیا کمپنی کے جاسوسی کارکنوں کے ذریعہ پورے ملک میں پھیلی ہوئی سازشی ہواؤں کے باوجود اس جماعت کا نیٹ ورک، نظام کے استحکام، دہلی، راجستھان، بہار وبنگال کے صوبوں میں مواصلاتی نظام کی حیرت انگیز ضبط و ترتیب کا اس خوبی سے تذکرہ کیا ہے اور اس قدر مرتب انداز میں اس کی منظرکشی کی ہے کہ اس عہد کی پوری صورت حال تمام موضوعاتی امکانات کے ساتھ آپ کی تحریر میں سمٹ آئی ہے۔

کتاب مذکور کے اس باب میں سیکڑوں مستند مآخذ ومصادر، اپنوں کے ساتھ غیروں کی شہادتوں کی روشنی میں آپ نے تمام واقعات کو صحت کے معیار پر پرکھ کر بالتفصیل اس غرض سے پیش کیا ہے کہ مذکورہ تحریک کو منصوبہ بند اور ایک خاص مقصد کے تحت اصحاب اقتدار اور ان سے وفاداری کا دم بھرنے والے انگریزی تمدن سے مرعوب اور اس میں اپنی ترقی کا راز ڈھونڈنے والے روشن خیال طبقے کے سامنے آجائے جس نے اسلام کے تحفظ اور

مسلمانوں کی علمی تہذیبی سرمایے کے بقا کے لیے ایک خدا کے بھروسے پر محض رضائے الٰہی کی خاطر ایک خالص تحریک آزادی کو نہ صرف نظر انداز کیا ہے بلکہ اسے ذاتی اغراض اور شورش پسندی سے منسوب کر کے تاریخ سازی کا مجرمانہ کام انجام دیا ہے، اور تعصب کی روشنی میں علماء مجاہدین کی زریں خدمات کی کردار کشی کا یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ چنانچہ عصری اداروں کے چند نام نہاد تاریخ سے نا آشنا دانشوروں کی ایک جماعت انگریز بہادر کی تقلید میں مسخ تاریخ کا کام انجام دے رہی ہے، بطور نمونہ تحریر ملاحظہ کرتے چلیں جس میں ان کے تاریخی شعور اور حالات کی بے بصیرتی صاف نظر آ رہی ہے:

''سید احمد شہیدؒ کی تحریک جہاد جس کا 1831 میں حسرتناک انجام ہوا کوئی قومی تحریک نہیں تھی ...... یہ تحریک صرف سکھوں کے مظالم کے سدباب کے لیے وجود میں آئی تھی۔ تحریک کے بانیوں کو اپنے بڑے دشمن یعنی انگریزوں سے کوئی عناد نہ تھا بلکہ انہیں کی عملداری میں تحریک کو فروغ ہوا علاوہ ازیں عام مسلمانوں نے نہ اس میں حصہ لیا اور نہ ان کو معلوم تھا کہ اس کا مقصد کیا ہے۔'' (ماہنامہ نقوش سرسید نمبر ۲۳ تحریر قمرالدین خان)

مضمون نگار کے بارے میں یہ حتمی رائے تو قائم نہیں کی جاسکتی کہ سید احمد شہید کی کفن بردوش جماعت سے انہیں عناد تھا مگر کلام کے تیور سے جو بغیر کسی ثبوت کے کردار کشی کا عمل پیش کر رہے ہیں اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے پیش رؤں کی اس حوالے سے لکھی گئی تحریروں کو تاریخ و تحقیق کے لیے کافی سمجھا ہے۔ مذکورہ تحریک اس کے پس منظر اور اس کے اغراض و مقاصد و نصب العین کے متعلق تلاش و تفحص کی خارزار راہوں سے گزرنے کی ضرورت نہیں سمجھی ہے، جس کی وجہ سے تحریک کی اکثر اہم جہتیں اور گوشے ان پر کھل نہ سکے جو تاریخ نویسی کے ساتھ بہت بڑا جرم اور انصاف و دیانت کے یکسر خلاف ہے۔

مولانا مرحوم کے عہد میں غیروں کے رویوں کا کیا ذکر اپنوں نے بھی اس عظیم اور تاریخ ساز تحریک، اس کے مقاصد اور اس کے بے نظیر کارناموں کو کوئی اہمیت نہ دی جس کا انہوں نے عالم رنج میں شکوہ بھی کیا ہے:

’’بے شک تاریخ کے صفحات نے ان کو نمایاں جگہ نہیں دی، کیوں تاریخ کی یہ کمزوری بہت پرانی ہے کہ وہ صرف فاتحین کے نام ہی روشن کرتی ہے، بالخصوص ایسے دور میں کہ قلم دشمنوں کے ہاتھ میں ہو یا اہل قلم دشمنوں سے مرعوب ہوں، لیکن کیا آزاد ہندوستان کے حقیقت شناس مورخ بھی اسی دشمن نوازی کی تقلید کریں گے۔‘‘

(شاندار ماضی حصہ دوم، ص: ۶۴۰)

یہ امر واقعہ اور تلخ حقیقت ہے کہ دشمن نوازی کی تقلید جس طرح انگریزی استعماریت کے زمانے میں تھی آج بھی اسی رفتار سے جاری ہے، جیسا کہ درج بالا اقتباس سے ظاہر ہے۔ اس حوالے سے اگر دیکھا جائے تو یہ بات بالکل بے غبار ہو جاتی ہے کہ آپ کے قلم سے نکلی ہوئی تحریک بالاکوٹ کی تاریخی تحریریں اپنی اہمیت وحیثیت کے لحاظ سے دو چند ہو جاتی ہیں، اس کی افادیت کا دائرہ مزید وسیع ہو جاتا ہے، تاہم مولانا مرحوم اس غیر منصفانہ و جانب دارانہ عمل سے مایوس نہیں ہوتے ہیں، بلکہ کردار کشی اور عصبیت پر مبنی اس طرح کے تحریری واقعات آپ کے عزم وارادے میں مزید پختگی پیدا کر دیتے ہیں، نتیجتاً تحقیقات کے سمندر میں شناوری وغواصی کا عمل مزید تیز ہو جاتی ہے۔ چنانچہ تاریخ کے دشت امکاں میں صحرا نوردی وآبلہ پائی کے ذریعہ ناقابل تردید شواہد ودلائل کے ساتھ نیز پورے اعتماد ویقین کے ساتھ مولانا حقائق کو طشت از بام کرتے چلے جاتے ہیں اس طرح اور اس اسلوب میں کہ خود بخود انگریزی مصنفین اور ان کے فکری متبعین کی دانستہ تلبیسات اور خانہ ساز تاریخی طلسم کے پردے چاک ہو جاتے ہیں۔

تحریک بالاکوٹ کا دوسرا دور اور مولانا کی وسعت نظر:

شاندار ماضی کی تیسری جلد میں مولانا مرحوم نے سید صاحب ہی کی تحریک آزادی کے دوسرے دور کا تذکرہ کیا ہے جس میں سید صاحب کے جانشین مولانا ولایت علی صاحب نے صادق پور پٹنہ سے اس میں نئی زندگی کی روح پھونکی اور اسی لائحۂ عمل جو جہاد، ہجرت اور جان ومال کی قربانیوں پر مشتمل تھا پورے اہتمام وانہماک اور مکمل جوش وجذبے کے ساتھ

اپنی سرگرمیوں کو جاری کیا، اور پورے ملک کی نقل وحرکت اور مجاہدین کی نقل وحرکت کے لیے اس کی کنٹرولنگ کے لیے پٹنہ کو مرکز قرار دیا۔ کفن بردوش مجاہدین کی اب یہیں سے تربیت ہوتی، جنگی اصول سکھائے جاتے، وطن پر قربان ہونے کے جذبوں سے انہیں معمور کیا جاتا، صبر واستقامت اور استقلال کی روح دلوں میں پیدا کی جاتی، پھر عملی طور پر دشمنان ملک و اسلام سے نبرد آزما ہونے کے لیے علاقۂ سرحد بھیج دیا جاتا۔ انگریزی استعماریت کے خلاف قربانیوں کا نقش قائم کرنے والی اس مختصر سی سرفروش جماعت کی حیرت ناک معرکہ آرائیوں، اس کی جانبازیوں کی داستان، انگریزی حکومت کی زمین دوز کارروائیوں کے نتیجے میں سرحد کے قبائلی علاقوں میں کاروان حریت سے بدگمانیوں اور ان کی ناعاقبت اندیش غیر دانش مندانہ مخالفتوں ومخاصمتوں کی وجہ سے شکست سے دوچار ہونے کے بعد ۱۸۵۷ء کا قیامت خیز طوفان اور برطانوی سامراجیت کے غلبہ اور اس کے انسانیت سوز مظالم، روح فرسا چیرہ دستیوں اور المناک سزاؤں کا ایک طویل سلسلہ ہے، جو کتاب کی مکمل چوتھی جلد تک پھیلا ہوا ہے۔ چوتھی جلد میں خاص طور سے مغلیہ سلطنت کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کی زندگی، اس کی حکومت کا نظام، ان کے اختیارات پر انگریزی کمپنی کی طرف سے پابندی، طرز معاشرت، ماحول اور عہد کے تمدنی حالات، رعایا کے ساتھ اس کی ہمدردی ومحبت کے جذبات، عوام کی اپنے تاجدار سے عقیدت ومحبت، بادشاہ کی سرپرستی میں میرٹھ کی افواج کی بغاوت، اس کی ناکامی اور اسباب ناکامی، اسلاف دیوبند سید الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی، امام محمد قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی کے انگریزوں کے خلاف سر سے کفن باندھ کر شاملی کے میدان میں استخلاص وطن کے لیے قائدانہ کردار، حریت کے لیے ان کی سرفروشانہ سرگرمیاں، جس کی سنہری زنجیروں کی کڑیاں اسی تحریک سے وابستہ تھیں، بالاکوٹ کی پہاڑیوں میں جس نے آزادی کا صور پھونکا تھا، نیز اکابرین دیوبند اور دیگر پروانۂ آزادی پر برطانوی اقتدار کی طرف سے انتقامی کارروائیوں کے اندوہناک سلسلے، ملک گیر پیمانے پر گرفتاریوں، قید وبند کی صعوبتوں اور زندانوں میں غیر انسانی وحشت ناک مظالم کی

دردناک داستانوں کا مستند حوالوں کی روشنی میں تفصیلی تذکرہ ہے۔

مجموعی لحاظ سے پوری کتاب مولانا مرحوم کی تاریخ نگاری کی بے پناہ لیاقت، اس فن میں شعور وادراک کی زبردست قوت، فنی مہارت، سیاسی بصیرت، تنقید و تنقیح کی بے مثل صلاحیت، مختلف واقعات کے ظہور میں اثرات واسباب کا سراغ لگانے والی نظر کی وسعت اور واقعات کے سلسلۂ ارتقاء کی دریافت، اور اسی ترتیب وتہذیب سے جمع کرنے کے فنی اصول سے آگہی کا زبردست اور ناقابل انکار ثبوت فراہم کرتی ہے۔ نیز صف اول کے مؤرخ شبلی مرحوم کے دریافت کردہ تاریخ کے اس فلسفے اور اصول پر کہ ''تاریخ عالم کا ہر واقعہ بہت سے مختلف واقعات کے سلسلے میں بندھا ہے، ان ہی ریشہ دوانیوں کا پتہ لگانا اور ان سے فلسفیانہ نکتہ سنجی کے ساتھ تاریخی نتائج مستنبط کرنا، یہی چیز ہے جو تاریخ کی جان ہے اور روح ہے اور یورپ کو اس فن کے متعلق جس اختراع وایجاد پر زیادہ تر ناز ہے، وہ اسی طلسم کی پردہ کشائی ہے۔'' [المامون، ص:۶] ہر ہر لحاظ سے پوری اترتی ہے؛ بلکہ کہنا چاہیے کہ مولانا کی مکمل تحریر اس اصول کا آئینہ ہے۔

علمائے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے:

مسلمانان ہند کی شاہانہ عظمت وشوکت کی سنہری داستان شاندار ماضی کی تکمیل کے بعد جب کہ اس کتاب کی عظمت واہمیت کا غلغلہ اور اس کی گونج ملک کی فضاؤں میں تھمی بھی نہیں تھی کہ مولانا مرحوم کے تیز گام قلم نے سفر کی رفتار مزید تیز کردی اور ملک کی آزادی کے صرف ایک سال کے بعد ۱۹۴۸ء میں ''علمائے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے'' کے زیر عنوان دو جلدوں میں ایک نئی کتاب مرتب کردی۔ یہ کتاب اگرچہ موضوع اور مواد کی جدت اور تنوع کی وجہ سے مستقل ایک الگ تاریخ کا درجہ رکھتی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ مجموعی لحاظ سے شاندار ماضی کے سلسلے کی سنہری کڑی ہے، جس میں علمائے اسلام کی خدمات کو اجاگر کرنے کی بھرپور کوشش کی گئی ہے، اس کتاب میں آپ نے ۱۸۵۷ء کے بعد ۱۹۴۷ء تک فقط علماء کی سرفروشانہ، قائدانہ ومجاہدانہ سرگرمیوں کا تذکرہ کیا ہے، جس کا سلسلہ اٹھارہویں

صدی کے آغاز میں شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کی تحریک اور ان کے فیض یافتہ جانشین سید احمد شہید کی جانباز جماعت احرار سے ملتا ہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد ملک کی سرزمین جس طرح ہندوستانیوں کے خون سے لالہ زار ہوئی، ظلم و بربریت کا کھلے عام جس طرح رقص ہوا، مغربی تہذیب وتمدن کی ترویج اور اقتدار کے استحکام کے لیے انگریزی اقتدار نے جس انداز حیوانیت میں قتل وغارت گری کا طوفان مچایا، اسلامی علوم وعقائد پر مادی وسائل اور طاقت کے ذریعہ جس طریقے سے شب خون مارنے کا سلسلہ شروع ہوا، تاج برطانیہ کے لٹیروں، غاصبوں نے ملک کے معزز و معظم تاجدار بہادر شاہ ظفر کو جلاوطن کر کے اور دہلی کی سرزمین کو معصوموں کے خون سے رنگین کر کے جس طرح وحشت وبربریت اور حیوانیت کا ثبوت دیا، کوئی پوشیدہ داستان اور نادر حادثہ نہیں ہے؛ مگر یہ تعجب خیز امر ضرور ہے کہ خوف وہراس کی اس تیرہ وتاریک فضا میں جہاں امن کی روشنی کی کہیں سے کوئی کرن نظر نہیں آرہی تھی، ملت اسلامیہ کا درد رکھنے والی علماء امت کی ایک جماعت بے سروسامانی کے عالم میں کھڑی ہوتی ہے اور سر سے کفن باندھ کر پوری قوت سے ملت کی مسیحائی اور انگریزی اقتدار کو زیروزبر کرنے میں سرگرم ہوجاتی ہے۔

مولانا مرحوم نے پوری مؤرخانہ بصیرت اور محققانہ مہارت کے ساتھ مذکورہ جماعت کی علمی، اصلاحی اور سیاسی کارناموں کی تفصیل بیان کی ہے؛ چنانچہ مجاہد حریت مولانا محمد قاسم نانوتوی اور ان کے رفقا کے ذریعہ دارالحکومت دہلی سے ڈیڑھ سو کلومیٹر دور افتادہ مقام پر دارالعلوم دیوبند کا قیام، اس کی جہادی، سیاسی، علمی سرگرمیاں، تربیتی اداروں کا قیام، درجہ بدرجہ اس کے علمی واصلاحی ارتقا کے مراحل حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندی، شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی، علامہ انور شاہ کشمیری، مفتی کفایت اللہ دہلوی کی حریت کی راہ میں لازوال قربانیاں، قید وبند کی مشقتیں، تحریک ریشمی رومال، اس کا پس منظر اس تحریک کو تکمیل کی منزل پر پہنچانے کے لیے مولانا عبید اللہ سندھی، مولانا حسین احمد مدنی وحضرت شیخ الہند کے اسفار اور جزیرہ مالٹا کی اسیری اس کتاب کے نمایاں عناوین ہیں۔

مولانا سید محمد میاں صاحب نے مختلف قدیم مصادر، اخبارات و رسائل اور خود اپنے گہرے مشاہدے کی روشنی میں طبقہ علما کے ان تمام کرداروں کو لفظ وحرف کی روشنی دے کر نمایاں کیا ہے اور علمی بصیرت اور فکری وسعت کے ذریعہ اس طبقے پر سخت مگر پورے انصاف و دیانت کے تقاضے کے تحت بے باکانہ انداز میں نقد کیا ہے کہ جنھوں نے محض تعصب و عناد میں ان مجاہدین پر کیچڑ اچھالا ہے، ان کی کردارکشی کی سعیِ لاحاصل کی ہے اور ملت کی زبوں حالی کو ان جلیل القدر علماء کی جدوجہد سے اس لیے منسوب کیا ہے کہ وہ انگریزی معاشرت، مغربی افکار وخیالات کو کسی صورت قبول نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ سرسید احمد خان کی مسلم ترقی کے نام پر انھیں کی تحریروں سے علماء دشمنی کی نہ صرف قلعی کھولی ہے؛ بلکہ لارڈ میکالے کے افکار کو عملی صورت میں کامیابی کی منزلوں سے ہمکنار کرنے میں سرسید مرحوم کا کس قدر رول ہے، اسے بھی واشگاف انداز میں واضح کیا ہے۔ علمائے اسلام کے متعلق سرسید احمد خان کا نظریہ کس قدر اخلاقی پستی کا حامل ہے، اس کی ایک جھلک ملاحظہ فرمائیں، جس کو مولانا نے اپنے دعوے کے ثبوت میں بطور استشہاد پیش کیا ہے:

''مسلمانوں کو ذلت سے نکالنے کے لیے سرسید نے دو طریقے اختیار کئے: اول اصلاح معاشرت اور دوسرے اصلاح مذاہب۔ اصلاح معاشرت کے لیے سرسید نے ۱۸۵۷ء کے بعد ہی سے انگریزی تمدن اختیار کرلیا تھا اور انگریزوں کے ساتھ کھانا پینا شروع کردیا تھا، جو ہندو اور مسلمانوں کو ناگوار تھا، مگر انگلستان سے لوٹ کر سرسید نے یہ اضافہ کیا کہ اس کام کی باقاعدہ تبلیغ شروع کردی، یہی طریقہ ترکوں نے بھی اپنے ملک میں جاری کیا تھا، اس لیے سرسید کو اپنے خیالات میں بہت تقویت ہوتی تھی، چنانچہ آپ نے تہذیب الاخلاق میں لکھا: ترکوں کا تمام لباس بجز ٹوپیوں کے بالکل یورپین ہے، سب نے زمین پر بیٹھنا بالکل چھوڑ دیا ہے، میز وکرسی پر بیٹھتے ہیں، میز پر چھری کانٹوں سے کھانا کھاتے ہیں، ان کے مکان کی آراستگی اور طریقہ بالکل یورپین جیسا ہے، جب ترک اپنی ہمسایہ قوموں فرنج اور انگریزوں میں مل کر بیٹھتے ہیں تو ہمجولی معلوم ہوتے ہیں اور امید ہے کہ روز بروز مہذب ہوتے جائیں گے۔ پس ہندوستان

کے مسلمانوں سے بھی ہم یہی چاہتے ہیں کہ اپنے تعصّبات وخیالات خام کو چھوڑ دیں اور تربیت وشائستگی میں قدم بڑھائیں۔'' [علمائے حق کے مجاہدانہ کارنامے اول]

چونکہ انگریزوں کی تقلیدان کے اسلامی تہذیب کے خلاف طرز معاشرت کو اپنانے کے سلسلے میں علماء سخت مخالف تھے، اس لیے وہ سرسید کی نگاہوں میں مجرم اور احمق ٹھہرے۔ مولانا مرحوم نے اس طرز عمل اور غیر اخلاقی روش کا انسانیت واخلاق کی روشنی میں جائزہ لیا ہے اور ان کے افکار کی قباحتوں اور تاریک نتائج کا بڑے جرأت مندانہ انداز میں ذکر کیا ہے۔

اس کتاب کے مندرجات کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ مولانا مرحوم محض کتابوں کی دنیا میں رہنے والے اصحاب قلم میں سے نہیں، بلکہ وہ اپنے عہد کے پُرآشوب حالات، مذہبی رسوم وعقائد، سیاسی نشیب وفراز، وطن ہند کی اقتصادی، تمدنی، علمی، اخلاقی اور سیاسی زوال وانحطاط اور اس کے اسباب پر بڑی گہری نظر رکھتے تھے، ان کے مشاہدات وتجربات اس قدر روشن اور عمیق تھے کہ ان کی روشنی میں وہ ماضی کے حالات و واقعات سے مستقبل کے عالم موہوم میں بھی وہ نتائج تلاش کر لیتے تھے۔ کتاب کی جامعیت اور ذخیرۂ معلومات کی بنیاد پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ کتاب مولانا مرحوم کی نظر کی وسعت، تاریخی شعور کی پختگی، قدیم مصادر کے ساتھ ساتھ جدید تحقیقات پر مشتمل اخبار وجرائد کی معلومات کی دسترس کے علاوہ آپ کی سیاسی دوراندیشی وبصیرت کی بہترین ترجمان اور ملکی حالات کے علاوہ عالمی منظرنامہ پر آپ کی نگاہ دوررس کی مکمل آئینہ دار ہے۔

کتاب علمائے حق کی دوسری جلد بیسویں صدی کے آغاز سے ہندوستان کی آزادی ۱۹۴۷ء تک ملک میں پیش آنے والے حالات وواقعات، معاشرتی وسیاسی تبدیلیوں، کاروانِ آزادی میں علماء دیوبند کی قیادت وبےلوث جدوجہد میں عام مسلمانوں کے سنہرے کردار، کانگریس کے قیام اور اس کے ارتقاء واستحکام میں عمائدین امت مسلمہ خصوصاً مولانا ابوالکلام آزاد اور شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی کے قائدانہ کردار، جمعیۃ علماء کا قیام، اس کا پس منظر، وجوہات واسباب، اس کے پلیٹ فارم سے علماء دیوبند کی

سرفروشانہ سرگرمیوں، قائداعظم محمد علی جناح کا ملک کی آزادی کے متعلق سیاسی موقف، ان کے نظریۂ پاکستان، مسلم لیگ کی سیاسی بصیرت کا افلاس اور اس کے نتیجے میں ہندوستان کی تقسیم کا سانحہ، لاتعداد مسلمانوں کا دہلی، پنجاب کے صوبوں سے انخلاء، ان مقامات پر بڑے پیمانے پر نسل کشی کے لرزہ خیز واقعات کی تمام جہتوں کا احاطہ کرتی ہے۔

علاوہ ازیں آزادی کی راہ میں مذکورہ تمام واقعات وسانحات کے پس منظر میں موجود عالم اسلام، عالم مغرب یورپ وامریکہ اوران کے درمیان واقع ہونے والی جنگ عظیم اول اور جنگ عظیم ثانی، اس کے اسباب ومحرکات، اس میں شامل ہونے والے ممالک، ان کے مرکزی کردار، خلافت عثمانیہ کے سقوط اوراس کی علتیں، سعودی حکومت کا قیام، اس کا پس منظر وپیش منظر، خلافت عثمانیہ کے عہد میں سعودی حکمرانوں کی پوزیشن، جنگ عظیم کے نتیجہ میں پورے عالم پر اس کی تباہی کے اثرات، اس دوران برطانیہ عظمیٰ کے نزدیک ہندوستان کی اہمیت وحیثیت، ہٹلر اور مسولینی کی جارحیت پر مشتمل بہت سی اہم معلومات فراہم کرتی ہے، جس کا تعلق ہند کی آزادی کے سلسلہ اسباب سے مربوط ہے۔

۱۹۳۹ء میں واقع ہونے والی عالمی جنگ، اس کے اسباب ووجوہات، پوری دنیا میں اس کی وجہ سے معاشی وسیاسی بحران، کروڑوں انسانوں کی ہلاکت، اس تناظر میں حریت کے حوالے سے ہندوستان کی پوزیشن پر آپ کے بصیرت افروز اور عالمانہ ومدبرانہ تبصروں اور تفصیلی دانشورانہ تجزیوں کی روشنی میں ملکی حالات کے علاوہ بین الاقوامی سیاست اور اس کے تمدنی ماحول پر کس قدر آپ کی گہری نظر تھی، اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ عالمی جنگ کی تفصیلات میں مذکور انسانوں، جانوں کے اتلاف کی تخمینی تعداد جو اس وقت شائع ہونے والے ایک امریکی جریدے سے ماخوذ ہے، جہاں اقتدار کی ہوس کا مکروہ نتیجہ سامنے آتا ہے، وہیں مولانا مرحوم کی علمی وتحقیقی دسترس اور حالات حاضرہ کے مزاج ومذاق پر بھی خاصی گرفت معلوم ہوتی ہے۔

۵ رستمبر ۱۹۴۵ء کو واشنگٹن کے ایک بیان میں ظاہر کیا گیا تھا کہ جنگ میں ساڑھے

پانچ کروڑ انسان کام آئے، جن کا مختصر اندازہ حسب ذیل ہے:

روس: دو کروڑ دس لاکھ
جرمنی: کم از کم ساٹھ لاکھ
پولینڈ: فوجی نو لاکھ، شہری ستاون لاکھ
چین: تیس لاکھ
فرانس: دس لاکھ
جاپان: ستائیس لاکھ
امریکہ: دس لاکھ ستر ہزار
سلطنت برطانیہ: چودہ لاکھ تیس ہزار
اٹلی: گیارہ لاکھ
یوگوسلاویہ: سولہ لاکھ، اسی ہزار
اسٹریا: سات لاکھ
ہنگری: چھ لاکھ
رومانیہ: سات لاکھ
یونان: سات لاکھ
ہالینڈ: دو لاکھ پچھتر ہزار
فن لینڈ: ایک لاکھ تراسی ہزار
زیکوسلاویکیہ: ساٹھ ہزار
فلپائن: تیس ہزار

غلام جو ہلاک یا گم ہیں، تین لاکھ پچاس ہزار...... بیان میں کہا گیا تھا کہ یہ کم سے کم اندازہ ہے، جو ہلاک، زخمی اور گم شدگان کے بارے میں لگایا گیا، جنگ کے قیدی اس میں شامل نہیں۔ [تیج ۸رستمبر ۱۹۴۵، بحوالہ علمائے حق دوم ص: ۳۹]

ہندوستان کی یہ بدقسمتی تھی کہ عالمی جنگ کے موقع پر ہندوستان غلامی کی طوفانی گرداب سے نکل کر آزادی کے ساحلوں تک آ چکا تھا، تاج برطانیہ فتح وشکست کے حوصلہ شکن دوراہے پر کھڑا تھا، ہٹلر، مسولینی اور جاپان کے مقابلے کے لیے اسے ہندوستانی امداد کی سخت ضرورت تھی کہ جاپان کی طوفانی افواج کی لہریں برما کو زیروزبر کرکے اب ہندوستان کے دروازوں پر دستک دے رہی تھیں، کانگریس جمعیۃ علماء اور دیگر تنظیموں نے اس کی حمایت و اعانت کو پروانۂ آزادی اور کلی طور پر برطانیہ کے ہند سے انخلاء پر موقوف کردیا، جس کا برطانیہ نے استقبال کیا اور اہل ہند کے ہاتھوں ملک کی باگ ڈور سونپ کر یہاں سے کوچ کے ارادوں کو عمائدین ملت کی میٹنگوں میں ظاہر بھی کردیا۔ ایسے پُرمسرت موقع پر مسلم قومیت کے تحفظ کے نام پر نمودار ہونے والی مسلم لیگ کے غیر دانش مندانہ اقدام، شعور و بصیرت سے خالی تحریک، دوقومی نظریہ پر مبنی تجاویز ومطالبات اور کاروانِ آزادی کانگریس و جمعیۃ علماء کے نظریات اور ان کی جدوجہد کے خلاف جارحانہ مخالفت نے آزادیٔ ملک کی منزل کو مزید دور کردیا۔ مولانا مرحوم نے مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے مسٹر محمد علی جناح کی مخالفت، ان کے اخلاقی رویے، ان کے دوقومی نظریے کی صداقت اور اس کے نتائج اور ان کی سیاسی بصیرتوں کا کھل کر جائزہ لیا ہے اور بڑی شعوری تنقید کی ہے اور ملک میں شائع ہونے والے تمام اخباروں، رسالوں اور دیگر ذرائع سے حاصل ہونے والی خبروں اور اپنے مشاہدات کی روشنی میں یہ ثابت کیا ہے کہ مسٹر جناح کا پیش کردہ دوقومی نظریہ ملک کی جغرافیائی صورت حال کے علاوہ پورے ملک کی مخلوط رہائش کے تناظر میں کس طرح درست نہیں۔ کانگریس اور جمعیۃ علماء کا متفقہ منشور اور تجویز یہ تھی کہ ملک کے تمام صوبے بااختیار اور مرکز کو مختصر اختیار جو ڈاک رسائل وغیرہ پر مبنی ہوں دے دیئے جائیں، پورے صوبے ایک وفاق میں مربوط ہوں، مسلم اقلیت کے تحفظ کے لیے ممبران پارلیمنٹ کی تعداد میں ایسا تناسب ہو کہ مستقبل میں کسی اقلیت خصوصاً مسلمانوں کا استحصال نہ ہوسکے؛ مگر مسٹر محمد علی جناح نے اس تجویز کا سختی سے انکار کردیا اور الگ نظریے کی بنیاد پر علاحدہ ریاست کا مطالبہ

کردیا، اس سلسلے میں ان سے رہنمایانِ کانگریس و جمعیۃ علماء نے متعدد ملاقاتیں کیں، کانفرسیں ہوئیں، مگر وہ اپنی تجویز و مطالبے پر تمام اندیشوں اور ممکنہ خطرات سے آنکھیں بند کرکے قائم رہے۔ الگ ریاست کے وجود میں آجانے کے بعد ملک کے دوسرے صوبوں میں رہائش پذیر اقلیتی مسلمانوں کے بارے میں محمد علی جناح کے پاس کیا لائحہ عمل تھا، ان کے متعلق ان کی کیا رائے تھی؟ مولانا نے اس پر بھی بڑی معرکہ آرا سیاسی بصیرت سے معمور بحث کی ہے اور جناح کے تمام تر سیاسی کرداروں کا جائزہ لے کر اس کے ہولناک نتائج سے آگاہ کیا ہے۔ مناسب ہے کہ اس کی ایک جھلک پیش کی جائے؛ تاکہ مولانا کی دیدہ وری کا اندازہ ہو سکے۔ ذیل کا اقتباس مسٹر جناح کی وہ فکر ہے، جو ہندوستان کے اقلیتی مسلمانوں کے بارے میں ظاہر ہوئی تھی:

''جن صوبوں میں مسلمان اقلیت میں ہیں، ان کے لیے تین صورتیں ہیں: ایک غریب الوطن غیر ملکی کی طرح زندگی بسر کریں، جن کا کوئی حق یا کوئی حصہ حکومت میں نہ ہوگا اور وہ اپنے آبائی وطن میں رہتے ہوئے اسی طرح غریب الوطن اجنبی اور حق حکومت سے محروم رہیں گے، جیسے کوئی افریقہ، نیپال یا آزاد قبائل کا باشندہ، یا ہندونیشن اختیار کریں (العیاذ باللہ) جس کے معنی مسٹر جناح کی تفسیر کے بموجب ہندو مذہب ہیں۔ کیوں کہ نظریہ ٹونیشن کی بنیاد ہی اس پر ہے کہ نیشن کو مذہب کے ہم معنی قرار دیا جائے۔ تیسری صورت یہ ہے کہ پاکستان تشریف لے آئیں، وہاں میں ان کا استقبال کروں گا۔ [علماء حق حصہ دوم، ص:۳۴۳]

مختلف مذاہب پر مبنی اس ملک کے تمام گوشوں میں پھیلی ہوئی اقوام کے تناظر میں مذکورہ دو قومی نظریہ ملکی سالمیت کے علاوہ قوم مسلم کے لیے کس قدر خطرناک تھا، خصوصاً مسلمانوں کے لیے اس میں تباہیوں کے کیسے لرزہ خیز طوفان پوشیدہ تھے، ملت اسلامیہ ہند کی وحدت ہمیشہ کے لیے کیوں کر پارہ پارہ ہوئی، ان تمام ممکنہ خطرات و اندیشوں کو آپ کے گہربار قلم نے جہاں طشت از بام کیا ہے، وہیں ملک کی تقسیم کے بعد جاری تباہی کے وہ

اندیشے جنھوں نے حقیقت کا روپ دھارا، قوم مسلم پر دہلی پنجاب امرتسر میں قتل عام اور عصمت ریزیوں کی جو قیامت گزری، ملک میں مسلم اقلیت کی وجہ سے مساوات کا جو توازن بگڑا، سیاسی، معاشی اور اقتصادی لحاظ سے پسماندگی کا جو سایہ مسلط ہوا، یہ اور اس کے متعلق تمام موضوعات پر سیر حاصل بحث کی ہے اور اپنی فکری وسعت، زرخیز ذہن اور سیاسی شعور کی روشنی میں ثابت کیا ہے کہ مسلمانان ہند کی علمی، اقتصادی، مذہبی اور سیاسی زوال میں مسلم لیگ اور مسٹر جناح کی فکر و عمل کا ہر لحاظ سے بنیادی دخل ہے اور یہ کہ مسلمانوں کی مرکزیت، وحدت، ان کی زندگی کے انفرادی و اجتماعی شعبوں کی سالمیت کا راز اس کے علاوہ کسی اور صورت میں ممکن ہی نہیں تھا، جسے ملک کے سارے صوبوں کے متحدہ وفاق کی صورت میں کانگریس اور جمعیۃ علماء نے پیش کیا تھا، جس میں تمام اقلیتوں کے بشمول مسلمانان ہند، معاشی، سماجی و اقتصادی اور سیاسی، مذہبی اور تمدنی سرمایے کے تحفظ اور ان کی ترقی کی ضمانت دینے والے قوانین وضع کیے گئے۔

تحریک شیخ الہند:

ہندوستان کی زلف پریشاں کو سنوارنے کے لیے جان کی بازی لگا کر ملک کے ذرے ذرے سے بے مثال محبت و الفت کا ثبوت دینے والوں کی روشن داستان میں ایک نمایاں باب تحریک ریشمی رومال ہے۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ ملت اسلامیہ ہند کے بطل جلیل، مجاہد حریت، مفکر ملت حضرت مولانا محمود الحسن دیوبندیؒ نے ۱۹۱۵ء میں اپنے ہونہار و دانش مند شاگرد حضرت مولانا عبید اللہ سندھی کو آزادی کا ایک جامع منصوبہ مرتب کر کے کابل بھیجا؛ تاکہ شاہ افغانستان اور خلیفۂ ترکی کی امداد کی وجہ سے انگریزوں کا ملک سے انخلا عمل میں آ سکے۔ اس نصب العین کی تکمیل کے لیے آپ نے خود اپنے جاں نثار رفقاء آزادی خصوصاً شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی، مولانا عزیر گل کے ہمراہ حجاز روانہ ہوئے؛ مگر حجاز کے گورنر شریف مکہ کی ضمیر فروشی سے یہ منصوبہ ناکام ہو گیا اور حضرت شیخ الہند مع رفقاء حریت گرفتار ہو کر جزیرۂ مالٹا میں قید کر دیئے گئے۔ اس انقلابی جدوجہد اور راہ عزیمت و استقامت

اورزمانۂ اسیری میں آپ کے اوپر کی جانے والی ظلم وستم کی ان وارداتوں کو جو عام طور سے عوام الناس کیا اہل علم کی بھی نگاہوں سے پوشیدہ تھیں، تحریک کے سلسلے میں حجاز مکہ مدینہ اور دوسرے شہروں کی کوچہ نوردی، وہاں کے سیاسی لوگوں سے ملاقات، مستقل سفر اور سفر کی مشقتیں، جواب تک پردۂ خفا میں تھیں، مولانا میاں صاحب نے پوری جانفشانی اور عرق ریزی سے جمع کر کے کتابی صورت میں اہل علم کی خدمت میں پیش کردیا۔

آزادی کی شاہ راہ میں قدم قدم پر علمائے اسلام کے نقوش کو اجاگر کرنے والی مولانا مرحوم کی اس مرتب اور جامع تحریر نے اہل علم سے لے کر سیاسی گلیاروں میں رہنے والے مدبرین ودانش ورانِ ملت کو بتایا کہ اسلاف دیوبند نے دشت آزادی میں کس قدر آبلہ پائی کی ہے اور وطن کی عظمت وعصمت کے لیے کیسی کیسی صعوبتیں برداشت کی ہیں۔ جہاد وجاں نثاری اورعزیمت واستقلال کی اس سنہری دستاویز کی اہمیت ومقبولیت کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے کہ:

''۱۹۷۵ء میں جب آپ نے انڈیا آفس لائبریری کی سی آئی ڈی کی رپورٹوں سے یہ کتاب مرتب فرمائی تو اس کا افتتاح صدر جمہوریہ ہند نے اپنے قصر صدارت میں غالباً ۵؍ جولائی ۱۹۷۵ء میں کیا، جس میں تقریباً تمام وزراء مع وزیر اعظم وارکان اسمبلی ومعززین کو بڑی تعداد میں مدعو کیا گیا؛ تاکہ لوگوں کے سامنے یہ حقیقت واضح ہوجائے کہ اس میں آزادی کی شمع جلانے سے لے کر اسے شعلۂ جوالہ کی شکل دینے تک تمام مراحل میں طبقۂ علماء کا مجاہدانہ کردار صف اول میں رہا اور گمنام مجاہدین کے علاوہ قیادت وسیادت کی وادیوں میں بھی ان کے قدموں کے نشانات ثبت ہیں، نہ کہ نواب، جاگیردار اور اصحاب اقتدار جنھیں وقت کی گردش نے بغیر کسی جدوجہد کے قیادت کا تاج تاریخی صفحات میں عطا کردیا ہے۔''

[تذکرہ سید محمد میاں صاحب دیوبندی، مرتب: مفتی مسعود احمد عزیزی]

تحریک شیخ الہند کے مطالعے کے بعد جہاں ملک میں حضرت شیخ الہند کی وطن سے محبت اور اس کے نتیجے میں اس کی حفاظت وسالمیت کے لیے بے لوث جدوجہد، عدیم المثال سرگرمی، لازوال قربانی، انگریزی استعمار کے خلاف سردھڑ کی بازی لگانے کا جذبہ اور عملی

کردار سامنے آتا ہے، وہیں یہ کتاب مولانا کے علم کی وسعت، تحقیق کی ندرت، موضوعات پر گرفت، واقعات وحکایات کی تہہ تک رسائی حاصل کرنے کی مہارت، ملک کے علاوہ عالمی منظر نامے کے حوالے سے فکر ونظر کی وسعت کی طرف بھی راہنمائی کرتی ہے۔ کتاب کا مرکزی کردار چونکہ ایک نامور شخصیت ہے اور وہ بھی ایسی عظیم المرتبت کہ اس کی جلالت شان کے حصار سے نکلنا دشوار اور مشکل، اس کے باوجود عقیدت ومحبت کے جذبات میں آ کر تاریخ کے اصول اور تحقیق کے معیار سے آپ نے کہیں سمجھوتا نہیں کیا ہے اور بلاشبہ ایک مؤرخ کی یہ شان ہے کہ سوانحی احوال وکوائف میں بھی وہ تمام واقعات کو تاریخی روح اور تحقیقی روایات کی روشنی میں سوچتا اور محسوس کرتا ہے۔

ہندوستان شاہان مغلیہ کے عہد میں:

ہندوستان کی یہ خوش قسمتی تھی کہ اسے اورنگ زیب عالم گیر جیسا نیک دل انصاف پسند حکمراں میسر ہوا جو شیخ احمد سرہندی کی اصلاحی سرگرمیوں کا جاں نواز ثمرہ تھا، جس کی حکومت کے عہد میں ملک کی اقتصادی، تمدنی، دینی ومذہبی اور اخوت ومحبت کی فضا اپنے عروج پر پہنچ گئی تھی، لیکن اس رعایا پرور عادل بادشاہ کے رخصت ہوتے ہی ملک کا سیاسی و معاشی ڈھانچہ زیروزبر ہو کر رہ گیا، ہر طرف خانہ جنگی کی صورت حال پیدا ہوگئی۔ سلطان عالم گیر کی مذہبی رواداری وانصاف پسندی کی روشن روایات کے باوجود برطانوی استعماریت کی ہندو مسلم منافرت کی فضا قائم کرنے کے لیے صداقت وحقائق کو مسخ کر کے خانہ ساز واقعات وحکایات کی ایجاد واختراع کے زیراثر ملک کے عام اصحاب قلم نے اپنی تحریروں کے ذریعہ یہ باور کرایا کہ سلطنت مغلیہ کے زوال میں عالم گیر کے ہندوؤں کے متعلق متعصّبانہ کردار کا مکمل عمل دخل ہے اور اسی کے تعصب اور دہرے معیار اور ہندوؤں پر مظالم کے نتیجہ میں مرہٹوں نے مغل حکومت پر حملے کر کے تہ وبالا کیا ہے۔ ایک انصاف پسند مورخ جس کی نظروں کی رسائی تاریخ کے تمام واقعات وحادثات پر پوری قوت کے ساتھ ہو اور ملک کی تمام سیاسی جہات اس کے سامنے روشن ہوں، اس کے لیے یہ امر سوہان روح ہے، بالآخر حقیقت کی

نقاب کشائی کا فرض اسے مجبور کرتا ہے کہ کذب وافترا پر مبنی خانہ ساز تحریروں کی حقیقت کو عالم آشکارا کردے۔ احساس فرض کے پیش نظر مولانا مرحوم نے اس موضوع پر بھی قلم اٹھایا اور مطالعہ کی وسعت اور ادراک کی قوت اور ماخذ ومصادر پر حیرت انگیز دسترس کے ذریعہ مغلیہ حکومت کے زوال پر تفصیلی بحث کی اور آثار وقرائن سے ثابت کیا کہ عالم گیر کے عہد حکومت کے بعد مغل سلطنت کے زوال کے اسباب شاہزادوں میں نظام حکومت کی صلاحیت کا فقدان اور مدبرانہ لیاقت سے محرومی، جہانگیری وجہانبانی کے اصول سے تہی دستی اور آپسی خانہ جنگی اور شیعوں کی سازشی پالیسی تھی، نہ کہ ہندو عوام وحکمرانوں کی حملہ آوری۔ اس دعوے کے ثبوت میں مولانا مغل فرمانرواؤں کے تئیں علاقائی غیر مسلم حکمرانوں کا جو مزاج اور نظریہ پیش کیا ہے وہ مولانا مرحوم کے موقف کی صداقت اور آپ کی گہری بصیرت کا منھ بولتا ثبوت ہے کہ:

”ہماری غور وفکر کی طاقت اگر عدل وانصاف سے محروم نہیں ہوئی ہے تو کیا وہ فیصلہ کرسکتی ہے کہ جب ہندوؤں کی تمام طاقتیں ہندوستان میں مسلمانوں کے فاتحانہ داخلے کو نہ روک سکیں تو سیکڑوں سال کے حاکمانہ اقتدار کے بعد جب مسلمانوں کی عظمت ان کے دل ودماغ کے گوشہ گوشہ میں یہاں تک سرایت کرچکی تھی کہ مغل بادشاہ کے درشن کو وہ مذہبی عبادت سمجھنے لگے تھے، کیا وہ ہندوؤں کی طاقتیں سلطنت دہلی کو ختم کرسکتی تھیں۔“ (ہندوستان شاہانہ مغلیہ کے عہد میں: ۱۴۲)

مولانا مرحوم نے اس کتاب میں بڑی باریک بینی سے ان اسباب وعوامل کی دریافت کی ہے، جنہوں نے مغل سلطنت کی بنیادوں میں تزلزل پیدا کیا ہے اور ان واقعات کا سراغ لگایا جو ملک میں اختلاف وانتشار اور خانہ جنگیوں کا سبب ثابت ہوئے اور ان حقائق کا پتہ لگایا جنہیں ایک خاص منصوبے کے تحت تعصب کی زمینوں میں دفن کرکے اورنگ زیب عالم گیر کی شفاف شخصیت کی کردارکشی کا مشغلہ جاری کیا گیا تھا۔ چنانچہ مولانا مرحوم نے اس حوالے سے پوری بصیرت مندی اور تاریخی حقائق کے ذریعہ ملک میں پھیلی ہوئی

شیواجی کے متعلق بے بنیاد افسانوں کا تحقیقی و تفصیلی جائزہ لیا ہے، اور شیواجی پر عالم گیر کے مسلسل احسانات کا ذکر کیا ہے، علاوہ ازیں کتاب کے پہلے حصہ میں مغل حکمرانوں کے عہد میں ہندوستان کی اقتصادی، سیاسی، تمدنی اور معاشرتی خوشحالی اور ارتقاء پر بھی مؤرخانہ بحث کی ہے، پس شاہانہ مغلیہ کی رواداری، حسن سلوک، حکومت کے نظام کے استحکام، ملک میں ان کی حسن تدبیر کے باعث ہر طرف امن وامان، خوشحالی، فارغ البالی، تجارت ومعیشت، صنعت وحرفت، درآمدات، برآمدات اور ملک میں انگریزی قافلوں کی آمد اور ان کی تجارتی و سیاسی پالیسی عہد جہانگیری وعالمگیری میں ان کی پوزیشن اور مغلوں کا ان کے ساتھ فیاضانہ سلوک پر سیر حاصل بحث کے حوالے سے کہا جاسکتا ہے کہ یہ کتاب مولانا مرحوم کی تحقیقی لیاقت، تاریخ نگاری کی مہارت، اور سیاسی بصیرت، تنقیح وتحلیل، اور تنقید وتجزیہ اور فنی قدر و قیمت کی بڑے واشگاف انداز میں شناخت کراتی ہے اور مولانا مرحوم کی عظمتوں اور بلندیوں کا پتہ بتاتی ہے۔

حاصل یہ ہے کہ مولانا سید محمد میاں صاحب ان باکمال عبقری ہستیوں میں ہیں اور کشور قلم کے ان تاجداروں میں سے ہیں جو اپنی خداداد صلاحیتوں، عرفانی حقیقتوں کی معرفت، فلسفۂ حیات اور اس کے لوازمات کے کلی ادراکات اور وقت کے سمندر میں چھپی ہوئی حق وصداقت کی شناخت اور اس کے اظہار کی تخلیقی قوتوں کے سرمائے کے ساتھ صحرائے فکر فن میں عازم سفر ہوتے ہیں، تو جابجا علم وتحقیق کے گلہائے رنگارنگ سے بے کیف صحراؤں کو معمور و آباد کرتے جاتے ہیں۔ تاریخی نگارشات میں آپ کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ واقعات وارادت کی جمع وترتیب میں سرسری روایات وحکایات پر اعتماد نہیں کرتے بلکہ مستند ماخذ ومصادر تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں اور پوری تنقیح وتحلیل کے بعد اپنے موضوع کا حصہ بناتے ہیں، مزید پورے کمال اہتمام سے ان حوالوں کا ذکر بھی کرتے ہیں تاکہ واقعات وحقائق کی صداقت میں کسی اشتباہ کی گنجائش نہ رہے۔ تاریخ کے اس اصول وضوابط پر عمل کرنے میں یقیناً علامہ شبلی کو اولیت حاصل ہے تاہم اس حقیقت سے انکار

ممکن نہیں ہے کہ مولانا سید محمد میاں صاحب نے اپنی تمام نگارشات میں اس اصول کو اختیار کر کے اسے استحکام عطا کیا ہے، علاوہ ازیں مولانا مرحوم کی علمی فتوحات، ہندوستان کی تاریخوں میں جا بہ جا یورپی مصنفین کے حوالے ملتے ہیں، اس وجہ سے پورے وثوق سے یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ علمی وسیاسی اعتبار سے فاتح اقوام کی تخلیقات پر اعتماد واعتبار کا رجحان مفتوح قوموں میں ایک فطری عمل ہے، نیز ہزار عصبیت وحریفانہ پوزیشن کے باوجود یورپین مصنفین کا اپنی قوم کے مفاد عامہ کے خلاف تحقیقاتی کارنامے درحقیقت حقائق کا اعتراف بھی ہے جس کی وجہ سے ان کے نظریات سطحی اذہان کے لیے قابل اعتماد حقیقت اختیار کر جاتے ہیں مگر اصحاب علم ودانش اور مسافران علم وتحقیق انہیں افکار کو قبول کرتے ہیں جو تاریخی اصولوں کے معیار پر پورے اترتے ہوں۔ مولانا سید محمد میاں صاحب انہیں اصحاب بصیرت وفراست میں تھے جو بھاری بھرکم تاریخی دستاویز سے مرعوب ہونے کے بجائے نقد و تحقیق کی کسوٹی پر واقعات وروایات کی صحت کو پرکھتے اور جانچتے ہیں کہ تاریخ کے صفحات پر نظر آنے والے واقعات صداقت کے معیار پر کہاں تک پورے اترتے ہیں، بالآخر ان کی نگاہ بصیرت تاریخ سازی کے جانبدارانہ عمل اور اسباب عمل کی تہہ تک پہنچ جاتی ہے، اور پورے وثوق سے استرداد وانتقاد کے عمل سے گزار کر اسے خلاف واقعہ قرار دے دیتی ہے۔ مولانا مرحوم کی تمام نگارشات میں تحقیق وتنقید کی یہ صفت نمایاں طور پر محسوس ہوتی ہے، مولانا مرحوم کی تاریخ کے موضوعات پر شہرتوں کی بلندیوں کو سر کرنے والی تحریریں عام طور سے بر صغیر کی تاریخ سے متعلق ہے اور اب تک ان کی فتوحات کے ثبوت میں نگارشات کی جو ہلکی سی جھلک پیش کی گئی ہے ہر چند کہ وہ ہندوستان کے احوال سے متعلق ہیں جس سے یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ آپ کے تحقیق ومطالعہ کی وسعت اسی دائرے میں محدود ہے، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ آپ کے علمی سفر میں ماضی قریب کے احوال کے علاوہ قرن اول کے موضوعات بھی شامل ہیں۔ مراد آباد سے رسالہ ''قائد'' کا آپ نے اجرا کر کے اور اس میں سیکڑوں مقالات و مضامین اور مستقل تاریخ اسلام لکھ کر آپ نے اس امر کا ثبوت پیش کیا ہے کہ عہد رسالت اور

خلفائے راشدین کے تمدنی، اخلاقی اور جہاں بانی کے حالات آپ کے دائرے مطالعہ سے باہر نہیں تھے۔تاریخ اسلام نامی کتاب اگرچہ مختصر ہے مگر معلومات کے لحاظ سے اس قدر جامع ہے کہ تھوڑے سے وقت میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بہت سی معلومات فراہم کر جاتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ یہ کتاب مقبولیت کے آسمان پر پہنچی اور آج بھی مدارس ومکاتب کے نصاب میں شامل ہے۔

خلاصہ کلام:

یہ کہ مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ شگفتہ اسلوب نگارش،فکری پختگی،تخلیقی زرخیزی، مطالعہ کی بے پناہ وسعت، حیرت انگیز ژرف نگاہی، تجربات ومشاہدات کا تعمق، تاریخی احوال وآثار پر دسترس، مستحکم طریقہ استدلال اور مخصوص طرز ادا کی دلکشی کے ذریعہ اقوام عالم کی علمی، تمدنی، مذہبی احوال کو اجاگر کرنے کی فنی صلاحیت نے علمی تحقیقی اور تاریخ نگاری کی دنیا میں انہیں وہ ممتاز مقام اور عظمت عطا کی ہے جس کی طرف نگاہ اٹھاتے وقت اچھے اچھے شہرت یافتہ افراد کی ٹوپیاں گر جاتی ہیں۔لاریب مولانا سید محمد میاں دیوبندی علیہ الرحمہ ایک متبحر عالم، دیدہ ور مورخ اردو زبان کے قد آور تاجدار قلم، سچائی کی تلاش وجستجو اور غیر جانبدارانہ انداز میں تلبیسی پردوں کے چاک کرنے کی غیر معمولی صلاحیت ولیاقت سے متصف مبصر ونقاد اور موضوع کے تنوعاتی جہان کو سمیٹ لینے کی مہارت سے معمور عظیم مقالہ و مضمون نگار، زبردست محقق ومورخ، شاندار انشاء پرداز اور بلند پایہ مصنف تھے۔انہوں نے اپنی فلسفیانہ،محققانہ تحریروں،متوازن تاریخ نگاری،موزوں تبصرہ نگاری اور بے باک اظہار صداقت کے نتیجہ میں وجود میں آنے والی گراں مایہ تخلیقات کے ذخیروں کی وجہ سے فن تاریخ کے علاوہ اردو زبان وادب کے دامن کو بھی وسعتوں سے ہمکنار کیا ہے،جس پر علمی دنیا جس قدر بھی فخر وناز کرے کم ہے۔

☆☆☆☆☆

مولانا سید محمد میاں دیوبندیؒ
اور
تحریک آزادی
(۱۹۰۳ء-۱۹۷۵ء)

مفتی امانت علی قاسمی استاذ حدیث دار العلوم حیدر آباد

خلوص شوق طلب سے پہلے کہیں بھی پائے طلب نہ ٹھہرا
ہزار دیر و حرم نے روکا ہمیں تیرے سنگ در سے پہلے

مؤرخ ملت حضرت مولانا سید محمد میاں صاحبؒ کی شخصیت ہمہ گیر و ہمہ جہت تھی، آپ مؤرخ بھی تھے مجاہد بھی، درس و تدریس کے شہ نشیں تھے، خطابت کے شہ سہوار تھے، تصنیف و تالیف آپ کی طبیعت بن چکی تھی، اسی وجہ سے حضرت شیخ الاسلام حسین احمد مدنیؒ (م ۱۹۵۷ء) نے آپ کو حیوان ناطق سے ''حیوان کاتب'' بنا دیا تھا۔ آپ آسمان صحافت کے روشن ستارے تھے، میدان کارزار کے غازی، جدو جہد آزادی کے جانباز اور قافلہ حریت کے سپہ سالار تھے۔ یہ سب باتیں مبالغہ آرائی نہیں بلکہ حقائق وشواہد پر مبنی ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آپ کا اصل میدان تعلیم و تعلم تھا، آپ کا اصل رفیق قرطاس وقلم تھا، آپ نے لکھا اور خوب لکھا۔ لکھنے والوں نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ آپ سبق کے دوران بھی سبق روک کر لکھ لیا کرتے تھے، سفر میں بے تکلف لکھتے تھے اور جب جی چاہتا لکھتے، بے تکان لکھتے، ہموم و غموم اور مصائب و شدائد کی حالت میں لکھتے۔ آپ نے ہندوستان کا شاندار ماضی لکھا، اصلاحی اور نصابی کتابیں لکھیں، مضامین و مقالات لکھے، اخبارات میں

آپ کے مضامیں کوشوق سے پڑھا گیا،آپ کے مقالوں سے رسالوں کا معیار بڑھا۔غرض یہ کہ آپ نے مختلف موضوعات پرلکھا۔اس لیے یہ کہنا صحیح ہے کہ آپ کا اصل میدان قرطاس وقلم تھا،آپ کا دلچسپ مشغلہ تعلیم وتدریس تھا،آپ کی زندگی کا اصل سرمایہ ماضی کے اوراق سے واقعات کو کھنگال کرتاریخ کی زینت بنانا تھا،واقعات وحوادث کوریکارڈ کرنا تھا،لیکن ان سب کے بیچ مؤرخ ملت کی زندگی کا ایک اہم باب داستان حریت کولکھنے کی جرأت وہمت کا ہے،ان کی زندگی کا ایک پہلو جہادآزادی میں عملی سرگرمیوں کا ہے،اس کے لیے قید وبند کی صعوبتوں کوجھیلنے،خاک وخون کی دنیامیں اتر کرملک وملت اورقوم کے لیے اپنی جان ہتھیلی پررکھ کرجدوجہد کرنے کا ہے۔یہ ایک حقیقت ہےاورتاریخ سے اس کے شواہد ملتے ہیں کہ مولانا محمد میاں صاحب جنگ آزادی کےمجاہداورقافلۂ حریت کے سالار تھے۔

ماضی کی تاریخ کا اگر مطالعہ کیا جائے تو حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی ؒ (۱۸۳۳ء-۱۸۸۰ء) شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی(۱۸۵۱ء-۱۹۲۰ء)ؒ شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ،(۱۸۷۹ء-۱۹۵۷ء) مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن (۱۹۰۱ء-۱۹۶۲ء)اور اِن جیسے بہت سے اصحابِ عزیمت پر ہماری نگاہ پڑتی ہے جوایک طرف مدرسہ میں درس وتدریس کےفرائض انجام دیتے ہیں،خانقاہ میں اصلاح نفس اورتزکیہ نفس کا کام کرتے ہیں،مسجدمسجد،محلّہ محلّہ پھرکرتبلیغ دین اوردعوت دین کے ذریعہ لوگوں میں ایمان واسلام کی شمع روشن کرتے ہیں،تنہائی میں بیٹھ کرتصنیف وتالیف کے ذریعہ اشاعت دین و دفاع دین کی ذمہ داری ادا کرتے ہیں،ان تمام ہمہ جہت کارناموں کے ساتھ ساتھ وطن و قوم کی حفاظت کے لیے، ملک کی سالمیت وبقااوراس کی آزادی کے لیے جان کی بازی لگاتے ہیں۔انہی اصحاب عزیمت کی جماعت کے ایک فرد مؤرخ ملت مولانا محمد میاں صاحبؒ ہیں۔

تحریک آزادی کا دوسرادور

یہ ایک حقیقت ہے کہ آزادی کی جنگ ۱۸۵۷ء سے نہیں اس سے پہلے ہی جاری

تھی؛ بلکہ کہنا چاہیے کہ جب سے ملک پر غاصب انگریز کا ناجائز قبضہ ہوا اسی وقت سے تحریک آزادی شروع ہوگئی تھی؛ لیکن اس وقت زیادہ تر تحریکیں خفیہ طور پر انجام دی جاتی تھیں یا ملک کے کسی خاص حصے اور کسی خاص طبقے کی طرف سے چلائی جارہی تھی، لیکن پہلی جنگ عظیم ۱۹۱۴ء سے تحریک آزادی نے نیا رخ لیا اور علانیہ طور پر آزادی کی جدوجہد شروع ہوئی؛ اس لیے یہ زمانہ تحریک آزادی میں اہمیت کا حامل ہے۔ کہنا چاہئے کہ یہ آزادی کی تحریک کا دوسرا دور ہے۔ مولانا سید محمد میاں صاحب تحریر فرماتے ہیں:

> آزادی ہند کی تحریک اگرچہ بہت پہلے سے شروع ہوچکی تھی اور اگر یہ دعوی کیا جائے کہ جیسے ہی یورپ کے بنیوں نے دوکانداری کو حکمرانی کی شکل دی، آزادی کی تحریک شروع ہوگئی تھی تو واقعات اس دعوے کی ناقابل تردید ثبوت پیش کردیں گے۔ مگر اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ پہلی جنگ عظیم (۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸ء) کے بعد تحریک آزادی نے ایک ایسی صورت اختیار کی جو پہلے کسی کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھی۔ جب دیش کے باپو گاندھی جی نے ستیہ گرہ کا راستہ اختیار کیا اور عدم تشدد اہنسا یا مقاومۃ بالبصر کی طاقت کو جنگ آزادی کا حربہ قرار دیا، جب وہ تجویزیں جو خفیہ انجمنوں میں منظور کی جاتی تھیں، برملا اسٹیجوں پر پیش کی جانے لگیں اور مقابلے کے وقت میدان جنگ کو فوجوں سے پاٹ دینے کے بجائے رضا کاروں سے جیل خانوں کو بھرا جانے لگا۔ یہ پروگرام جنگ آزادی کے پہلے طریقوں سے اتنا مختلف تھا کہ عام طور پر اس کو تحریک آزادی کا آغاز قرار دیا گیا۔
>
> (مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی-ایک سیاسی مطالعہ، ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہاں پوری، فرید بک ڈپو، دہلی، ۲۰۱۱ء ص: ۱۳۰)

مولانا محمد میاں صاحب کی تحریک سے وابستگی

جمعیۃ علماء ہند جو ابتداء سے ہی تحریک آزادی کے لیے جدجہد کررہی تھی ۱۹۱۹ء میں اس کی باضابطہ تاسیس یا کہئے کہ نشأۃ ثانیہ عمل میں آئی۔ کانگریس اس سے پہلے ۱۸۸۵ء میں ہی قائم ہوچکی تھی، لیکن کانگریس جدجہد آزادی سے کافی دور تھی۔ دھیرے دھیرے کانگریس

نے بھی آزادی کی تحریک شروع کی۔ مارچ ۱۹۲۹ء میں گاندھی جی نے نمک سازی کی تحریک شروع کی اور ڈانڈی کے مشہور مارچ سے اس تحریک میں روح پھونک دی اور ۱۹۳۰ء میں لاہور میں راوی کے کنارے پنڈت جواہر لال نہرو کی صدارت میں مکمل آزادی کا ریزولیشن پاس کیا۔ اس وقت سوال یہ تھا کہ مسلمانوں کو کیا کرنا چاہئے۔ اس سلسلے میں مسلمانوں کی ایک جماعت تحریک آزادی میں شرکت سے پہلے ہندو مسلم معاہدہ کو ضروری سمجھتی تھی جبکہ دوسری جماعت جس کی سربراہ جمعیۃ علماء ہند تھی ان کا نقطہ نظر یہ تھا کہ جہادِ آزادی مسلمانوں پر مذہبی فریضہ ہے جس کے لیے کسی معاہدہ کی ضرورت نہیں ہے۔ اس سلسلے میں جمعیۃ علماء نے امروہہ میں ۱۹۲۹ء میں ایک اجلاس منعقد کیا جس میں کانگریس کے ساتھ شراکت کی تجویز پیش کی گئی۔ مولانا محمد میاں صاحب اس وقت مدرسہ شاہی مرادآباد میں مدرس تھے، یہی اجلاس مولانا کی تحریک سے وابستگی کا نقطۂ آغاز ہے، اسی اجلاس سے آپ میں آزادی کی دبی ہوئی چنگاری شعلہ جوالہ بنی، جس نے پوری زندگی وطن کی خاطر قربانی دی، جد جہد کی۔ ملک آزاد ہوا تو بھی جذبۂ خدمت خلق اور قوم وملت کی ہمدردی وغمخواری نے آپ کو مسلمانوں کی بازآبادکاری اور ان کے تحفظ اور ان میں عزم وحوصلہ پیدا کرنے کے لیے آپ کو مضطرب و بے چین رکھا۔ مولانا محمد میاں صاحبؒ، مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہارویؒ کی زندگی پر لکھے اپنے ایک مضمون میں تحریک آزادی کا حصہ بننے اور جمعیۃ اور کانگریس میں شمولیت کی تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جمعیۃ علماء ہند کا اجلاس ۱۹۲۹ء میں قصبہ امروہہ ضلع مرادآباد میں ہو رہا تھا، احقر اس زمانہ میں مرادآباد کی مشہور درسگاہ جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مرادآباد میں درس و تدریس کی خدمات انجام دے رہا تھا۔ مرادآباد ضلع کا صدر مقام ہے اور قصبہ امروہہ مرادآباد سے تقریباً اٹھارہ میل کے فاصلہ پر ہے، اس لیے مرادآباد کے حضرات بھی اس اجلاس میں داعی اور ذمہ داروں میں شامل تھے، مگر احقر اس وقت صرف ایک مدرس تھا جس کو اس کے اکابر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اور حضرت مولانا اعزاز علی

صاحب نے چند ماہ پہلے مدرسہ حنفیہ آرہ شاہ آباد (بہار) سے منتقل کر کے بھیجا تھا۔
البتہ جذبۂ صادق نے اس احقر کو حضرت مولانا سید فخر الدین اور حضرت مولانا قاری عبداللہ صاحب کی پارٹی کا ایک رکن یا رضا کار بنا دیا تھا اور اس بنا پر اس اجلاس سے احقر کا تعلق صرف وزیٹر یا تماشائی کا نہیں بلکہ یہ حیثیت ہوگئی تھی کہ مبصر کی طرح قریب سے قریب ہو کر حالات کا جائزہ لے سکے۔''

جیسا کہ پہلے بھی ذکر کیا گیا کہ اس وقت کانگریس میں شرکت کو نقصان دہ تصور کیا جارہا تھا اور طرح طرح کے خطرات اور شکوک وشبہات پیدا کئے جارہے تھے، اس لیے اس اجلاس کی بڑی اہمیت اور معنویت تھی۔ اس اجلاس میں حضرت شیخ الاسلامؒ نے فقہی اور شرعی نقطۂ نظر سے بصیرت افروز خطاب کیا اور حضرت علامہ سید سلیمان ندوی (۱۸۸۴ء-۱۹۵۳ء) نے سیاسی نقطۂ نظر سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

''انقلاب کی تحریک جب شروع ہو جاتی ہے تو تاریخ کی شہادت یہی ہے کہ وہ بے نتیجہ ختم نہیں ہوتی، بے شک اس کو مختلف حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ نیست و نابود ہونے لگتی ہے، لیکن اس کی خاک میں چھپی ہوئی چنگاریاں پھر دہکتی ہیں اور شعلہ بن کر مختلف طاقتوں کو نذر آتش کر دیتی ہیں۔ اب کیا مسلمان پسند کریں گے کہ مخالف انقلاب طاقتوں کا ضمیمہ بن کر وہ بھی نذر آتش ہو جائیں یا ساحل پہ کھڑے طوفان کا تماشہ دیکھتے رہیں اور جب طوفان ختم ہو تو وہ اپنی سیاسی حیثیت بھی ختم کر چکے ہوں اور ان کا شمار بھی انہیں پسماندہ قوموں میں ہو جن کے لیے ہندوستان میں نفرت وحقارت کی پالیسی ہمیشہ کے لیے طے ہو چکی ہے۔'' (مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی - ایک سیاسی مطالعہ، ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہاں پوری، فرید بک ڈپو، دہلی، ۲۰۱۱ء ص: ۱۳۶)

جمعیۃ علماء کا نقطہ نظر صاف تھا، اجلاس میں حضرت مجاہد ملت نے کانگریس میں شرکت کی تجویز پیش کی۔ رات میں عمومی اجلاس ہوا جس میں شہنشاہ خطابت حضرت مولانا عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری نے اس تجویز کی تائید میں تقریباً تین گھنٹے کی شعلہ نوا تقریر کی

جس نے بہت سے خرمن دل میں لرزہ پیدا کردیا، سامعین میں تحریک آزادی کا جذبہ شعلہ جوالہ بن کر پھوٹنے لگا، لوگ انقلاب اور تحریک میں شرکت کے لیے بے چین و بے تاب ہوگئے۔ اس اجلاس نے جن لوگوں کے دلوں میں آزادی کی دبی چنگاری کو ہوا دی اور دل کی دنیا بدل دی، اس میں ایک نام مولانا محمد میاں صاحب کا ہے۔ وہ خود فرماتے ہیں:

> ''اس موقع پر یہ عرض کردینا بھی تاریخی انکشاف ہے کہ جلسہ عام میں جس نے اس تحریک کی تائید کی وہ ہندوستان کے مشہور خطیب حضرت مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری تھے جن کی شعلہ بار تقریر نے جن کا سلسلہ تقریباً تین گھنٹے تک جاری رہا تھا، بہت سے دلوں کی دنیا بدل دی، جن میں خود راقم بھی ہے کہ پہلے صرف ایک گوشہ نشیں مدرس تھا اور اب جنگ آزادی کا سپاہی بن گیا جن کو قید بند اور دار و رسن کے خواب آنے لگے۔'' (مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی - ایک سیاسی مطالعہ، ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہاں پوری، فرید بک ڈپو، دہلی، ۲۰۱۱ء ص: ۱۳۷)

جمعیۃ علماء اور کانگریس سے وابستگی

ملک کی آزادی میں جمعیۃ علماء ہند اور کانگریس زیادہ سرگرم عمل تھی۔ مولانا میاں جمعیۃ سے اگرچہ زمانہ طالب علمی سے ہی وابستہ تھے، الجمعیۃ کے جمعیۃ علماء نمبر میں ہے کہ مولانا سید محمد میاں صاحب کا تبحر علمی، اصابت رائے، خدا داد قوتِ حافظہ، بلند پرداز دوراندیشی نے ان کو جمعیۃ علماء ہند کی طرف مائل کردیا تھا۔ (ہفت روزہ الجمعیۃ، جمعیۃ علماء نمبر ص: ۷۷) لیکن یہ وابستگی رسمی تھی۔ آپ حضرات علماء کرام کے ساتھ ۱۹۲۶ء میں جمعیۃ کے ساتویں اجلاس کلکتہ میں شریک ہوچکے تھے لیکن آپ کی جمعیۃ سے کامل وابستگی امروہہ کے اِس اجلاس سے ہوئی، جس میں کانگریس میں شرکت کی تجویز پیش کی گئی تھی۔ اس اجلاس کے بعد آپ حضرت شیخ الاسلام کے مشورہ سے کانگریس میں شریک ہوگئے، اب یہ شرکت صرف رسمی نہیں تھی بلکہ دل و جان سے شرکت تھی، فکر و عمل کے ساتھ شرکت تھی، کردار و گفتار کے ساتھ شرکت تھی۔ آپ نے جمعیۃ علماء ہند کے پلیٹ فارم سے ملک کی آزادی کی بھرپور جدو جہد کی، اپنے قلم اور عمل دونوں سے میدان جہاد میں کود پڑے، اس کے لیے صعوبتیں

برداشت کیں، قید و بند کا سامنا کیا، دار و رسن کے لیے تیار رہے۔

میدان کارزار کا مرد غازی

مولانا محمد میاں صاحب تحریک آزادی کے پرعزم سپاہی تھے، حالات سے نبرد آزماں ہونے، تکلیفوں کو برداشت کرنے، مشقتوں کو جھیلنے کی ان کے اندر جرأت و ہمت پیدا ہوگئی تھی۔ آپ علماء ہند کا شاندار ماضی کے سچے وارث و امین تھے، علماء حق کے مجاہدانہ کارناموں کے نہ صرف ناقل تھے، بلکہ اس داستان حریت کے ایک کردار اور قافلۂ حریت کے سالار تھے۔ مولانا کے شاگرد اور عربی و اردو ہر دو زبان کے بہترین ادیب حضرت مولانا نور عالم صاحب خلیل امینی انہیں میدان سیاست کا تکان نا آشنا شہسوار قرار دیتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

> اسی کے ساتھ وہ میدان سیاست کے پرجوش اور تکان نا آشنا شہ سوار تھے۔ آزادی وطن کی سرگرمیوں میں انہوں نے سرفروشانہ حصہ لیا اور علمی و تدریسی مشاغل کے گمبھیر بوجھ کے باوجود زبان و قلم اور حرکت و عمل کے ساری توانائیوں سے تحریکِ آزادی کے انتہائی فعال، مخلص اور سچے سپاہی کا بے مثال کردار ادا کیا۔ اس سلسلے میں وہ ساحل کے تماشائی نہ تھے، بل کہ طرح طرح کی سختیوں، آزمایشوں، چکی کی مشقتوں اور جیل کی سلاخوں، حوالات کے عذابوں، گرفتاریوں کی دردناکیوں اور خوف و دہشت کی تلاطم خیزیوں سے دیوانہ وار مقابلہ کیا۔'' (پس مرگ زندہ، مولانا نور عالم خلیل امینی، ادارہ علم و ادب، دیوبند، ۲۰۱۰ء ص:۴۴)

داستان قید و بند

آپ جنگ آزادی کے بے لوث مجاہد اور قافلہ حریت کے جانثار سپاہی تھے۔ اُس وقت آزادی کی تحریک کا حصہ بننے، آزادی پر لب کشائی کرنے، اس سلسلے میں نوکِ قلم کو حرکت دینے، لوگوں میں تحریک کا شعلہ بھڑکانے کی پاداش میں جو تکلیفیں اور اذیتیں دی جاتی تھیں، قید و بند کی جو صعوبتیں جھیلنی ہوتی تھی وہ سب مولانا میاں صاحب کے حصہ میں بھی

آئیں۔آپ نے اپنی تحریروں سے لوگوں میں جذبۂ حریت کو بھڑکایا تھا،تقریروں کے ذریعہ لوگوں کے دلوں کو گرمایا تھا،تحریک کا حصہ بن کر لوگوں کی فکر کا رخ تبدیل کیا تھا،تحریک کو قوت دی تھی،اس میں جان اور روح پھونکی تھی،اس کے لیے اپنے اکابر کے نقش قدم پر سنت یوسفی کو بخوشی قبول کیا تھا۔آزادی کے اس متوالے کو''بجرم عشق حریت''پانچ بار قید و بند کی آزمائش میں ڈالا گیا۔مرادآباد، دہلی،میرٹھ، بریلی اور فیض آباد کی جیلوں میں سلاخوں کے پیچھے رکھا گیا؛لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کسی مرتبہ بھی آپ کے پائے ثبات میں جنبش نہیں ہوئی ، ہمت و عزیمت کی راہ کو ترک نہیں کیا اور ملک کے آزاد ہونے تک آپ کی مسلسل جد جہد جاری رہی۔آپ نے نہ صرف زندان کو بخوشی قبول کیا بلکہ اس سے آگے کے لیے بھی تیار تھے۔آپ بزبان حال اپنے ساتھیوں سے کہہ رہے تھے ؎

یہ کوئے جاناں ہے ہم صفیرو !عزیز ہو سر تو لوٹ جاؤ
ابھی تو آیا ہے صرف زنداں ابھی توقع ہے دار آئے

مولانا محمد میاں صاحب قید و بند کی تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

کانگریس کا باقاعدہ ممبر بننے کے چند ہفتے بعد ہی احقر گرفتار ہوا،اس وقت حضرت مولانا سید فخر الدین احمدؒ (سابق صدر جمعیۃ العلماء ہند) نے بھی احقر کا ساتھ دیا۔اس کے بعد احقر ۱۹۳۲ء میں پہلے دہلی پھر مرادآباد میں گرفتار ہو کر سزایاب ہوا، پھر ۱۹۴۰ء میں یہ شرف حاصل ہوا،۱۹۴۲ء کی تحریک میں آخری بار گرفتار ہوا۔''(الجمعیۃ اکابر جمعیۃ نمبر،مضمون مولانا معز الدین صاحب،ص:۱۰۰)

دہلی کے زندان میں

۱۹۳۲ء میں جمعیۃ علماء اور کانگریس نے سول نافرمانی کی تحریک چلائی تھی،لوگوں کے جھتے بھیجے جاتے تھے جو برسر عام قانون کی خلاف ورزی کرتے اور قید کر لیے جاتے ، حکومت کی پوری کوشش ہوتی تھی کہ اس تحریک کو کچل دیا جائے،اس کے سربراہان کو گرفتار کر لیا جائے۔جمعیۃ علماء نے اس تحریک کی ذمہ داری حضرت مولانا ابوالمحاسن سجاد صاحب کو سپرد

کی تھی۔مولانا ابوالمحاسن سجاد صاحبؒ کی ہدایت پر مولانا محمد میاں صاحبؒ ہر جمعہ مرادآباد سے دہلی آتے اور جمعہ کی نماز کے بعد جامع مسجد میں تقریر کرتے،حکومت ہر چند گرفتار کرنے کی کوشش کرتی اور مولانا بچ کر نکل جاتے۔لیکن ایک مرتبہ معمولی سے غلطی پر مولانا گرفتار کرلے گئے۔اس کی تفصیل خود حضرت کی زبانی سنئے فرماتے ہیں:

جمعہ کا دن تھا احقر حسب ہدایت مرادآباد سے دہلی پہنچا،اس روز پولیس پوری طرح چوکنی تھی اور احقر کی گرفتاری کا سامان اس نے مکمل کرلیا تھا۔حضرت مولانا سجاد صاحب کو اس کا علم تھا،مولانا موصوف نے نماز جمعہ کے لیے احقر کو خفیہ راستوں سے روانہ فرمایا تو احقر کے رہبر قاضی اکرام الحق صاحب کو تاکید کردی کہ نماز کے بعد جنوبی دروازہ سے احقر کو نہ نکالیں۔اس طرف پولیس چوکی ہے اور آج چوکی کے علاوہ بھی پولیس کا انتظام ہے بلکہ شمالی دروازہ کے سامنے تانگہ تیار رکھیں اور اسی راستہ سے نکال کرلائیں،اس طرف پولیس نہیں ہوگی۔

قاضی اکرام الحق صاحب سہواو رنسیان کے پرانے مریض ہیں، یہاں بھی وہ اس ہدایت سے غافل ہوگئے کہ خاص طور پر ممنوعہ راستہ پر ہی تانگہ کا انتظام کیا۔یعنی جنوبی پھاٹک سے ہی احقر کو لے کر آئے جہاں پولیس کی چوکی تھی،پھر راستہ بھی چاوڑی بازار کے علاوہ چاندنی چوک کی طرف کا اختیار کیا۔چنانچہ جیسے ہی کوتوالی کے سامنے سے تانگہ پہنچا،سی آئی ڈی کے سب انسپکٹر نے جو جامع مسجد سے ہی تانگہ کے پیچھے لگ گیا تھا اور اطمنان سے اپنی سائیکل ہمارے پیچھے پیچھے چلا آرہا تھا،اس سب انسپکٹر نے تانگہ کو رکوالیا اور احقر کو پورے اعزاز کے ساتھ تانگہ سے اتار کر حوالات میں پہنچا دیا۔اس حوالات میں مولانا منت اللہ صاحب رحمانی موجودہ امیر شریعت بہار صبح سے ہی قیام پذیر تھے اور چند ساتھی اور بھی تھے جو اسی روز یا اگلے روز آئے۔

غالبا اگست کا مہینہ تھا،شدید گرمی،حوالات سب طرف سے بند،کوئی روشن دان نہ کھڑکی،صرف ایک جانب مین دروازہ کے دو طرف جنگلے تھے مگر سامنے چوڑا ابرآمدہ تھا جس کی وجہ سے یہ جنگلے بھی ہوا سے ناآشنا رہتے تھے۔پیشاب پاخانہ کے لیے صبح کو ۸ بجے ایک گھنٹہ کے لیے کھولا جاتا باقی ۲۳ گھنٹے اسی کمرہ میں بند رہتے تھے،یہیں وضو

بھی کیا جاتا تھا۔ پانی نکلنے کی کوئی نالی نہیں تھی نتیجہ یہ ہوا کہ وضو کا پانی کمرہ ہی میں ہوتا تھا۔ حسن اتفاق یہ تھا کہ کمرہ میں ڈھال کافی تھا، اسی ڈھال میں پانی رہتا تھا رفتہ رفتہ صورت یہ ہوگئی کہ کمرہ کے نصف حصہ میں پانی بھر گیا اور نصف حصے میں ہمارے چھ سات ساتھیوں کے بستر تھے اور لطف کی بات یہ تھی کہ اسی تھانہ کوتوالی کے سب انسپکٹروں میں ایک بزرگ سید اصغر حسین صاحب بھی تھے جو احقر کے چچا زاد برادر محترم تھے۔ ان کو صدمہ تھا کہ میرا بھائی کانگریسیوں کے چکر میں آ کر گمراہ ہوگیا۔''

(ہفت روزہ الجمعیۃ، مجاہد ملت نمبر ص: ۴۷)

دہلی کے بعد مرادآباد میں گرفتاری

جو شخص ہر وقت جان ہتھیلی پر لے کر چلتا ہو اس کے لیے زندان اور سلاخوں کے کوئی معنی نہیں ہوتے۔ مجاہدین آزادی ہر وقت موت سے کھیلتے تھے، اس لیے انہیں گرفتاری کا کوئی ڈر نہیں ہوتا تھا۔ مولانا موصوف دہلی سے ایک ہفتہ بعد رہا ہو کر دیوبند آئے پھر مرادآباد پہنچ گئے جہاں کانگریس کے ڈکٹیٹر کی حیثیت سے ان کی گرفتاری کا پروگرام طے تھا لیکن راہِ آزادی کے اس راہی کو گرفتاری کا کہاں ڈر تھا؟ سی آئی ڈی کے لوگ مولانا کی تلاش میں لگے تھے کہ اچانک مولانا مرادآباد چوک میں اس حال میں نمودار ہوئے کہ ایک ہاتھ میں جمعیۃ کا جھنڈا تھا تو دوسرے ہاتھ میں کانگریس کا۔ مولانا کو دیکھ کر لوگوں کا ہجوم جلوس کی شکل اختیار کر گیا اور مولانا اس کی قیادت کرنے لگے۔ لیکن چند ہی منٹ بعد مولانا گرفتار کر لیے گئے۔ گرفتاری کی روداد اور مشقت کی تفصیلات ان ہی کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں:

''ایک عزیز دوست پنجابی سوداگر حافظ محمد شفیع صاحب نے آگے بڑھ کر سنہری ہار گلے میں ڈالا جس کو احقر نے منظور کیا، کیوں کہ پہننے اور پہنانے کے لیے اس سے بہتر وقت کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ چند منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ حاضرین کے اجتماع نے جلوس کی شکل اختیار کر لی اور یہ جلوس جس کی قیادت محمد میاں کر رہا تھا جس کے دونوں ہاتھ اس طرح گھرے ہوئے تھے کہ ایک ہاتھ میں ایک جھنڈا تھا تو دوسرے ہاتھ میں دوسرا اور گلے میں قرآن شریف امروہہ گیٹ کی طرف بڑھنے لگا۔ ابھی تقریباً ایک

فرلانگ چلا تھا کہ پولیس کے دستے نے آ کر محاصرہ کرلیا، احقر کو گرفتاری کا حکم سنا کر اپنی تحویل میں لے لیا اور مجمع کو منتشر کرنے لیے لاٹھی چارج شروع کر دیا۔

چند روز مقدمہ چلا، چھ ماہ کی سزا با مشقت کلاس ''سی'' اور مشقت میں احقر اور موجودہ کین ڈولپمنٹ منسٹر یوپی داؤد یال کھنہ کو چکی دی گئی، لیکن حکیم انظار احمد صاحب نے فوراً دوڑ دھوپ شروع کر دی، یوپی کے گورنر صاحب رخصت لے کر یورپ گئے تھے اور ان کی جگہ نواب احمد سعید خان صاحب آف چھتاری فرائض گورنر انجام دے رہے تھے۔ بہر حال نواب صاحب کو جیسے ہی توجہ دلائی گئی احقر اور داؤد یال کھنہ اور چند ساتھیوں کا درجہ ''سی'' کے بجائے ''بی'' کر دیا، تیسرے ہی دن اس کے آرڈر آ گئے اور ہمیں جس طرح سی کلاس سے نجات ملی چکّی کی مشقت سے بھی نجات ملی۔'' (ہفت روزہ الجمعیۃ مجاہد ملت نمبر ص:۴۸)

مدرسہ شاہی سے روپوشی

حضرت مولانا محمد میاں صاحب کے دل و دماغ میں انگریز سے اس قدر نفرت بیٹھ گئی تھی کہ جب کبھی انگریز کا نام آ جاتا تو آپ کا قلم شعلہ بار ہو جاتا اور آگ اگلنے لگتا تھا۔ وہ کسی قیمت انگریز حکومت کا خاتمہ چاہتے تھے اور اس کو مسلمانوں کے لیے فرض قرار دیتے تھے۔ اس سلسلے میں انہوں نے بہت سی چھوٹی بڑی تحریریں لکھیں جس میں مسلمانوں کو یہ فرض یاد دلایا۔ ایک موقع پر آپ مدرسہ شاہی میں تھے اور آپ کی گرفتاری کا وقت آ گیا۔ مولانا کو معلوم نہیں تھا کہ واپسی کب ہوگی، اس لیے ضروری سمجھا کہ اپنے شاگردوں میں جذبۂ آزادی کی روح پھونک دی جائے اور ایک آخری بار ان کو یہ فرض یاد دلا دیا جائے۔ مولانا اسیر ادروی صاحب اس کی تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''۹/ اگست کی صبح شور محشر بن کر مدرسہ شاہی میں آئی طلبہ اپنی اپنی قیام گاہوں سے جوں ہی گیٹ سے داخل ہو کر ترمذی شریف کے درس کے لیے حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب کی درسگاہ میں پہنچے جو شمالی جانب تھی تو حضرت استاذ پہلے سے موجود تھے، چہرے پر قدرے تفکرات کا سایہ تھا، آنکھیں بتا رہی تھیں رات کو سکون سے نہیں

سو سکی ہیں، حرکات و سکنات سے کچھ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ آپ بڑی عجلت میں ہیں اور بہت اہم اور ضروری امور پیش نظر ہے اور وقت بہت کم ہے اسی لیے وہ جلد از جلد بتا دینا چاہتے تھے جسے بتانے کے لیے وہ کانٹوں پر چل کر آئے تھے کیوں کہ شہر میں پولیس کو چوکنا کر دیا گیا تھا کسی بھی لحہ گرفتاری ہو سکتی تھی آپ نے فرمایا 'میں آپ لوگوں سے ایک غیر معینہ مدت کے لیے رخصت ہو رہا ہوں اگر زندگی رہی تو پھر ملاقات ہوگی آپ حضرات کے کاندھوں پر قوم و ملک اور ملت کی بڑی ذمہ داریاں ہیں ان سے عہدہ برآ ہونے کی جد جہد میں کوئی کوتاہی نہیں کریں گے انگریزی اقتدار کو ہندوستان سے ختم کرنا ہمارے فرائض میں سب سے بڑا فریضہ ہے اچھا خدا حافظ' پھر حضرت استاذ نگاہوں سے اوجھل ہو گئے تو برسوں کے بعد آپ کی خیرت کی خبر مل سکی۔'' (تذکرہ مولانا محمد میاں صاحب، مولانا مسعود عزیزی ندوی، ص:۱۲۹)

علماء ہند کا شاندار ماضی اور گرفتاری

علماء ہند کا شاندار ماضی کی اشاعت پر بھی آپ پر مقدمہ چلا اور گرفتاری عمل میں آئی۔ اس کی خاص وجہ یہی تھی کہ اس کتاب میں جب کہیں انگریزوں کا تذکرہ ہوتا تو مولانا کے جذبۂ حریت کا لاوا پھوٹ پڑتا اور آپ غصے میں اس طرح بے قابو ہو جاتے کہ آپ کا قلم زہر اگلنے لگتا، جسے انگریزی سی آئی ڈی کے لوگ برداشت نہ کر سکے۔ اس کی کچھ تفصیل مولانا اسیر ادروی صاحب نے اپنے مضمون میں بیان کی ہے:

ان کا ایک مضمون اسلام کو کس کی چھری نے ذبح کیا؟ اتنا مقبول ہوا کہ ہم جیسے طلبہ نے اس کو زبانی یاد کر لیا، لیکن یہی شاہکار ان کو جیل خانے تک لے گیا۔ چونکہ آپ جمعیۃ علماء ہند کے ایک اہم رکن تھے، اس لیے انگریزی حکومت سے خدائی بیر رکھتے تھے۔ انگریزی حکومت کا تذکرہ ہوتے ہی ان چہرہ سرخ ہو جاتا تھا، ایسے موقعوں پر ان کی تحریروں میں ایک جوش سا ابلتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ اس سے پہلے آپ کی متعدد کتابیں علماء ہند کا شاندار ماضی طبع ہو کر منظر عام پر آ چکی تھی جو کئی حصوں میں شائع ہوئی۔ تین حصوں تک سی آئی ڈی کے دفتر میں پڑھ کر ڈیسک میں ڈال دی جاتی تھی

لیکن جب چوتھی جلد شائع ہوئی جو ۱۸۵۷ء سے شروع ہوتی ہے تو حضرت استاذ کا قلم شعلہ بار ہوگیا اور آگ اگلنے لگا، نوک قلم سے الفاظ نہیں چنگاریاں نکلتی تھیں، یہ چنگاریاں اڑ کر انگریزی حکومت کے خلعت فاخرہ تک پہنچ گئی اور اس کو داغ داغ کر دیا۔ جب شاندار ماضی کا یہ چوتھا حصہ سی آئی ڈی آفس میں پڑھا گیا تو تاب ضبط نہ رہی اور فوراً جاہ جلال کا پارہ اوپر چڑھ گیا نادرشاہ نے اپنی جابر و قاہر فوج کو الرٹ رہنے کا حکم دیا۔ اس نے آگے بڑھ کر حضرت استاذ کو زندان حوادث کے حوالے کر دیا۔''

(تاریخ شاہی ص: ۴۶۵)

کوئٹ انڈیا تحریک اور گرفتاری

۱۹۴۲ء میں کوئٹ انڈیا تحریک (ہندستان چھوڑو) ہوئی اور اس تحریک نے بھی زور پکڑا۔ اس تحریک میں کوشش یہ کی گئی تھی کہ خفیہ طور پر کام کیا جائے اور جہاں تک ہو سکے اپنے آپ کو گرفتاری سے بچایا جائے۔ مولانا نے اس تحریک میں بھی سرگرم حصہ لیا اور خوب جدو جہد کی اور اپنے آپ کو گرفتاری سے بچانے کی بھی ممکن کوشش کی لیکن یہ کوشش ناکام ہوگئی اور مولانا اس مرتبہ بھی گرفتار کیے گیے اور دو سال تک قید کی مشقت جھیلنے کے بعد رہائی ہوئی۔ یہ آپ کی آخری گرفتاری تھی۔ مولانا موصوف اپنی خودنوشت میں تحریر فرماتے ہیں:

''۸/ اگست ۱۹۴۲ء کو وہ تحریک شروع ہوئی، جس کا نام کوئٹ انڈیا والی تحریک مشہور ہوا۔ اس وقت پالیسی یہ تھی کہ کام خفیہ طور سے کیا جائے اور جہاں تک ممکن ہو اپنے آپ کو بچایا جائے۔ چناں چہ جیسے ہی احقر کو معلوم ہوا کہ مرادآباد میں گرفتاریاں ہو رہی ہیں، احقر مرادآباد سے باہر نکل آیا، اول ایک گاؤں میں رہا پھر دہلی پہنچ کر مجلس عاملہ کے اجلاس میں مدعو خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی، پھر مجلس عاملہ کی تجویز جس میں تحریک آزادی میں شرکت کے لیے مسلمانوں ابھارا گیا تھا، چھپوا کر اس کی تقسیم کرنے کے لیے یوپی کا دورہ کیا۔ بہار جانے کا ارادہ تھا مگر بارش اور تحریک کے کارکنوں نے ریلوے لائن کو اس درجہ خراب کر دیا تھا کہ مغل سرائے سے آگے گاڑیاں نہیں جا رہی تھیں، مجبوراً واپس ہوا۔ دہلی میں قیام مشکل تھا خصوصاً اِس بنا پر کی پولیس کو احقر کے

متعلق خیال ہو گیا تھا کہ بم بنانے والی پارٹی سے میرا تعلق ہے، لہٰذا دوسرے مقامات سے گم نام ہینڈ بل اور پمفلٹ شائع کرنے شروع کئے۔ کچھ کاربن سے لکھ کر خاص خاص مرکزوں میں بھیجا کرتا تھا، اسی طرح کا ایک پمفلٹ پشاور پہنچ گیا، وہاں کالج کے نوجوانوں نے میرے نام کے حوالے اس کو چھپوا کر تقسیم کیا۔ وہ مضمون یوپی کی پولیس کو مل گیا، یا صوبہ سرحد کی پولیس نے بھیجا، بہر حال اس طرح کی سرگرمیوں کی بنا پر اکتوبر ۱۹۴۲ء میں گرفتار کر لیا گیا۔'' (پس مرگ زندہ ص:۱۰۳)

اخلاص کا تاج محل

مولانا محمد میاں صاحب نے تحریک آزادی کے لیے اپنا تن دھن من سب کچھ نثار کر دیا تھا ان کی فکر آزادی تھی، ان کی زبان تحریک آزادی کے لیے چلتی تھی، ان کا قلم آزادی کے لیے شعلہ اگلتا تھا، ان کی ساری توانائی آزادی پر قربان تھی۔ لیکن یہ سب کچھ صلہ کے لیے نہیں بلکہ رضائے الٰہی کے لیے تھا، قوم وملت کے مستقبل کی تابناکی کے لیے تھا، ہندوستان میں اسلام کی حفاظت، اسلامی تہذیب کی بقا کے لیے تھا، ہندوستان کی غلامی سے دوسرے اسلامی ممالک پر جو اس کے اثرات پڑ رہے تھے، اس کی آزادی کے لیے تھا۔ بالآخر ایک مشترکہ جدوجہد کے نتیجے میں ملک آزاد ہوا جس میں آپ کی بھرپور جدوجہد شامل تھی، لیکن اس کے لیے آپ نے کوئی انعام نہیں لیا۔ دوستوں نے پارلیمنٹ کے الیکشن لڑنے کی سفارش کی تو قبول نہیں کیا، آزادی کا پنشن ملا تو ٹھکرا دیا، اس لیے کہ آپ نے یہ سب کچھ صرف خدا کے یہاں صلہ کے لیے کیا تھا۔ مولانا موصوف نے اپنی وفات سے قبل اگست ۱۹۷۵ء میں ایک مضمون الجمعیۃ کے نام املا کرایا تھا، اس میں آپ نے صراحت کی تھی کہ مسلمانوں نے جہاد حریت میں جو قربانیاں پیش کی ہیں وہ کسی دنیاوی معاوضہ کی طلب میں نہیں بلکہ انہوں نے مذہبی فریضہ سمجھ کر انجام دی تھی۔ وہ لکھتے ہیں:

''کل یا پرسوں الجمعیۃ کے اداریہ میں تھا کہ بہت سے مسلمانوں نے جہد حریت میں قربانیاں دیں، انہوں نے مذہبی فرض سمجھ کر قربانیاں پیش کیں، انہوں نے ان پر کسی

معاوضہ کا مطالبہ تو کیا معاوضہ لینا بھی پسند نہیں کیا، اور اگر کسی کو معاوضہ مل گیا تو اس ایسی بھی مثالیں ہیں کہ اس نے لینے سے انکار کر دیا کہ ہم نے قربانی اس لیے نہیں دی تھی۔ احقر کی گزارش ہے کہ آئندہ کسی ایسے موقع پر اگر آپ چاہیں تو اس کے لیے محمد میاں کی مثال بھی پیش کر سکتے ہیں۔ اپنے بزرگوں کے طفیل میں محمد میاں نے تحریک آزادی میں حصہ لیا اور پوری سرگرمی سے لیا مگر اس میں مقصد قوم وملت اور ملک کی خدمت کا تھا اور رضائے الٰہی مقصود ومطلوب تھی۔'' (تذکرہ مولانا محمد میاں صاحب ص:۶۸)

تحریک آزادی اور قلمی جولانی

مولانا محمد میاں صاحب تحریک آزادی کے پرعزم مجاہد تھے، آپ نے تحریک کے لیے پوری توانائی صرف کر دی تھی، اس کے لیے جس طرح عملی جد وجہد، دوڑ دھوپ کی، تقریروں کے ذریعہ لوگوں کے دلوں کو گرمایا، غلامی کی ذلت اور آزادی کی عظمت ونعمت کا احساس دلایا، اسی طرح آپ نے تحریروں کے ذریعہ بھی لوگوں تک اس فرض کو پہنچایا۔ مولانا کا نظریہ تھا کہ آزادی کی جد وجہد سب سے اہم فریضہ ہے، اس کے لیے آپ نے کتابیں لکھیں، رسالے لکھے، مضامین لکھے، کتابچے اور پمفلیٹ شائع کئے، لوگوں کو بتایا کہ حضور کا ارشاد ہے جس شخص نے جہاد نہیں کیا اور نہ جہاد کا جذبہ اس کے دل میں پیدا ہوا اور اسی حالت میں مر گیا تو ایک قسم کے نفاق کی حالت میں مرا۔ (مسلم شریف) مولانا ابوسلمان شاہجہاں پوری نے حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی کی سیاسی ڈائری آٹھ ضخیم جلدوں میں شائع کی، جس میں جس میں تین جلدیں مقالات سیاسیہ سے متعلق ہیں۔ اس میں دوسری جلد حضرت مولانا محمد میاں کے مقالات پر مشتمل ہے جس میں آپ کے سیاسی مقالات کو شائع کیا ہے۔ اس میں آپ کی آزادی سے متعلق مختلف تحریروں کو شائع کیا گیا ہے۔ بطور نمونہ کہ ایک تحریر ملاحظہ فرمائیں:

''طرح طرح کے بیانوں سے مسلمانوں کو بزدل بنا کر جد وجہد آزادی سے علاحدہ رکھنے کی کوشش عرصہ سے کی جارہی ہے، لیکن حالات مذکورہ بالا کے پیش نظر کسی

مسلمان کے لیے بھی گنجائش نہیں رہتی کہ وہ جد و جہد میں دوسری قوموں کے دوش بدوش زیادہ سے زیادہ قربانیاں پیش کرنے میں تامل کرے۔ بلکہ اس کا فرض ہے ہوجاتا ہے کہ برطانوی شاہنشاہیت کے ہندوستانی نظام کو بیکار کرنے میں پوری جدوجہد صرف کردے۔یعنی عدم تشدد کے اختیار کردہ اصول کی پابندی کرتے ہوئے ایسی رکاوٹیں پیدا کرے کہ موجودہ حکومت کا کوئی کام نہ چل سکے۔مثلا اسکول، کالج سرکاری دفاتر، سرکاری کارخانے، فیکٹریاں کچہریاں بند کردی جائیں۔ملازمین ہڑتال کردیں،اورایسا نہ کریں تو پرامن پیکٹنگ کیا جائے اور جوملازمین آڑے آئیں ان کا بائیکاٹ کردیا جائے۔فیکٹریوں اور کارخانوں میں کام کرنے والے کارخانے بند کردیں ورنہ کم از کم کوئی سرکاری آرڈر پورا نہ کیا جائے، لگان اور ہرایک ٹیکس بند کردیا جائے،حکومت کا کوئی مطالبہ ادا نہ کیا جائے۔نوٹ ہرگز نہ لیے جائیں اور جو نوٹ موجود ہوں ان کو واپس کرکے روپیہ فراہم کرلیا جائے،بینکوں سے اپنا روپیہ واپس لے لیا جائے اپنی مکمل آزادی کا اعلان کرنے میں گاؤں گاؤں محلّہ محلّہ پنچایتیں بنادی جائیں،نوجوانوں کی حفاظتی جماعتیں تیار کی جائیں۔یہی پنچایتیں آپس کے جھگڑوں اور جملہ معاملات کا فیصلہ کریں۔یہی جماعتیں حفاظت اور جملہ ضروریات کی ذمہ دار ہوں،مسلمان اپنے میں سے کسی بہتر شخص کو اپنا امیر بنالیں۔''(علماءِ حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے،مولانا سید محمد میاں صاحب،فیصل پبلی کیشنز، دیوبند ص:۱۳۱)

سیاسی تحریر کی معنویت

مولانا موصوف نے اس موضوع پر بہت کچھ لکھا ہے جو بڑی اہمیت کی حامل ہیں آپ نے انگریزوں کے ظلم و بربریت کی داستان کو مستند حوالوں سے قلم بند کیا ہے۔ انگریزوں کے ناپاک عزائم سے لوگوں باخبر کیا،لوگوں میں سیاسی شعور اور جذبۂ حریت کی روح پھونکی ہے۔اس وقت یہ تحریریں تاریخی دستاویز کی حیثیت حاصل کرچکی ہیں، ان کی معنویت اور عظمت کا اندازہ اس کے مطالعہ کے بعد ہی لگایا جاسکتا ہے۔مولانا ابوسلمان شاہجہاں پوری صاحب اس تعلق سے لکھتے ہیں:

''حقیقت یہ ہے کہ ان کی سیاسی تالیفات وتحریرات اپنی کمیت اور کیفیت ہر دو لحاظ سے تاریخ سیاسیات ہند و پاکستان کے لٹریچر میں اپنی مثال نہیں رکھتیں۔'' (حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ کی سیاسی ڈائری، سلسلہ مقالات سیاسیہ، ابوسلمان شاہجہاں پوری، فرید بک ڈپو، دہلی ۲۰۱۸ء ۲/۱۱)

آپ نے اپنی کتابوں اور تحریروں میں انگریز حکومت کے مظالم کو بڑی جرأت سے بیان کیا ہے، جب کہ اس وقت کا حال یہ تھا کہ نوک شمشیر کے سامنے کسی کو کچھ لکھنے کی ہمت نہ تھی۔ حضرت سیدالملت نے مسلمان اور برٹش دور حکومت کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا جس میں آپ انگریز حکومت کے مظالم کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''بہر حال سرحد سے بنگال تک پورے شمالی ہند میں درختوں پر لٹکا کر پھانسی دینے، توپ دم کرنے، کمروں میں بند کر کے بھوکے پیاسے مار ڈالنے، گرم سلاخوں سے داغ داغ کر مارنے، چونے کی بھٹی میں ڈال دینے، ہاتھی کے پیروں سے باندھ کر سسکا سسکا کر مارنے، سور کی کھال میں سی کر چونے کی بھٹی میں ڈال دینے کے واقعات اتنے بکثرت ہیں کہ ان کے قلمبند کرنے کے لیے ضخیم کتاب کی ضرورت ہے۔''
(مقالات سیاسیہ ۲/ ۱۴۷)

اگر یہ دیکھنا چاہو ، قیامت کس کو کہتے ہیں
اٹھو محفل سے ، باہر آؤ اپنی رہ گزر دیکھو

خلاصہ

پورے مقالے سے یہ بات صاف واضح ہو جاتی ہے کہ مولانا محمد میاں صاحب تحریک آزادی کے بے لوث مجاہد تھے اور داستان حریت کے قصہ گو یا ثنا خواں نہیں بلکہ اس داستان کے ایک کردار تھے۔ آپ نے جمعیۃ علماء اور کانگریس دونوں کے دو بازو کی طرح کام کیا اور پوری توانائی سے ملک کی آزادی میں کردار ادا کیا، اس کے لیے ہر طرح کی تکلیفوں، مشقتوں کا سامنا کیا، فکر و عمل کے ذریعہ اور قرطاس و قلم کے ذریعہ آپ نے نہ صرف ملک کی آزادی تک بلکہ اس کے بعد زندگی کے آخری سانس تک اپنی جد و جہد جاری رکھی۔

سید الملت کی ملی و جمعیتی خدمات:

حضرت مولانا سید محمد میاں دیوبندی ثم دہلویؒ
جمعیۃ علماء ہند کے ایک مخلص اور جانباز سپاہی

مولانا امداد الحق بختیار قاسمی
استاذ حدیث ورئیس تحریر مجلّہ ''الصحوۃ الاسلامیہ''
وصدر شعبہ عربی ادب جامعہ اسلامیہ دار العلوم حیدرآباد

جمعیۃ علماء ہند اور ملک وملت اور قوم کے تئیں جب اس عظیم تنظیم کی زریں خدمات، تاریخی کارنامے، آزادی وطن کے لیے اس کے ٹھوس اقدامات، مؤثر تدبیریں، جمہوریت کی تشکیل میں اس کا قائدانہ کردار، اس کی بقا اور حفاظت میں اس تنظیم کی ناقابل فراموش قربانیاں، آزادی کے بعد مسلمانوں اور دیگر اقلیتوں کی اس ملک میں حفاظت، ان کو ثابت قدم رکھنا، ان کی ڈھارس بندھانا، ان کا سہارا بننا، ان کے پیش آمدہ مسائل کو حل کرنا، ان کی جان ومال اور عزت آبرو کی حفاظت کے ساتھ ساتھ ان کے دین وایمان اور مذہب وعقیدہ کی پاسبانی کرنا، یہ اور ان جیسی بے شمار سنہری خدمات کے تذکرہ کا لامتناہی سلسلہ جب شروع ہوتا ہے تو ان کے پس منظر میں کچھ قدسی صفات ہستیاں نمایاں طور پر نظر آتی ہیں، جنہوں نے اپنے پہاڑی حوصلوں، مضبوط قوت ارادی، مخلصانہ عزائم، سرفروشانہ جذبات اور دینی حمیت و غیرت سے ان کارناموں کو وجود بخشا اور تاریخی صفحات ان سے آراستہ ہوئے۔ ان پاکباز ہستیوں میں حضرت مولانا مفتی کفایت اللہؒ (۱۲۹۲ھ=۱۸۷۵ء/۱۳۷۲ھ=۱۹۵۲ء) سحبان الہند مولانا احمد سعید دہلویؒ (۱۳۰۶ھ=۱۸۸۸ء/ ۱۳۷۹ھ=۱۹۵۹ء) ابو المحاسن مولانا سجادؒ

(۱۳۰۱ھ/ ۱۳۵۹ھ=۱۹۴۰ء) شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ (۱۲۹۵ھ =۱۸۷۹ء / ۱۳۷۷ھ= ۱۹۵۷ء) مولانا ابوالکلام آزادؒ (۱۳۰۵ھ=۱۸۸۸ء/ ۱۳۷۷ھ۱۹۵۷ء) ،مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمان سیوہارویؒ (۱۳۱۸ھ=۱۹۰۱ء/۱۳۸۲ھ=۱۹۶۲ء) اور دیگر کئی ایک محسن شخصیات ہیں۔

مورخ ملت مولانا سید محمد میاںؒ (۱۳۲۱ھ=۱۹۰۳ء/ ۱۳۹۵ھ=۱۹۷۵ء) بھی اس جماعت کے اہم رکن اور اس طائفہ کے ممتاز فرد رہے ہیں، جنھوں نے قوت بازو بن کر اس جماعت کے خوابوں کو شرمندہ تعبیر کیا، ایک جانباز اور مخلص سپاہی کی طرح ہر موقع پر اپنے آپ کو پیش کیا، ہر خطرہ میں کودنے کو تیار رہے، ملک کے گوشے گوشے میں پہنچ کر جمعیۃ کے پیغام کو عام کیا، زمینی سطح پر اس جماعت کو مضبوط کرنے میں تن من دھن کی بازی لگادی، ایک طرف زبان جمعیت بن کر اس کی ترجمانی کا حق ادا کیا، تو دوسری طرف قلم جمعیت کی حیثیت سے اس کی تاریخ مرتب کرکے آئندہ نسلوں پر احسان گراں بار کیا۔ صوبائی اور ملکی دونوں سطح پر اس کی نظامت کے فرائض بخوبی انجام دیے، جمعیت کے اصولوں پر کاربند رہتے ہوئے بڑی بڑی دشواریوں اور صعوبتوں کا سامنا کیا، جیلوں میں مشقت بھری زندگی گزاری، سزائیں کاٹیں، ایک دور وہ تھا جب آپ نے تمام مشاغل ترک کرکے جمعیت کی خدمت کو اپنا نصب العین بنالیا تھا، اور اسی کو اس وقت کی سب بڑی عبادت سمجھتے تھے۔

عملی میدان میں قدم اور ملک کا سیاسی نقشہ

آپ نے ۱۳۴۳ھ میں دارالعلوم دیوبند سے تمام علوم متداولہ میں تکمیل کرکے سند فراغ حاصل کی، بعد ازاں ۱۹۲۶ء میں عملی میدان میں قدم رکھا اور علامہ انور شاہ کشمیریؒ (۱۲۹۲ھ=۱۸۷۵ء/ ۱۳۵۱ھ=۱۹۳۲ء) اور شیخ الادب مولانا اعزاز علی امروہیؒ (۱۳۰۰ھ= ۱۸۸۲ء/ ۱۳۷۴ھ=۱۹۵۴ء) کے مشورہ سے سب سے پہلے مدرسہ حنفیہ آرہ ضلع شاہ آباد صوبہ بہار سے اپنی تدریس کا آغاز فرمایا، وہاں تقریباً ساڑھے تین سال تک تدریسی خدمات انجام دیں اور پھر مولانا حبیب الرحمان عثمانیؒ (۱۳۴۸ھ) مہتمم دارالعلوم دیوبند اور شیخ

الادب مولانا اعزاز علی امروہیؒ کے حکم سے مارچ ۱۹۲۸ء (۱) سے مدرسہ شاہی میں تدریسی خدمات انجام دینے لگے، یہاں کا ماحول اور آب وہوا آپ کے مزاج و مذاق کے بالکل موافق تھی۔

یہ ٹھیک وہ زمانہ تھا، جب کہ جمعیت علماء کے بائیکاٹ اور کانگریس کے مقاطعہ کی وجہ سے سائمن کمیشن (۲) ہندوستان پہنچ کر نا کام واپس ہو چکا تھا، اس کمیشن کا مقصد اہل ہند کو لالچ دینا اور ان سے ایسے وعدے کرنا کہ وہ آزادی سے دستبردار ہو جائیں اور اس طرح آزادیِ ہند کی تحریک کمزور پڑ جائے اور انگریزوں کو ایک بار پھر لمبے عرصے تک اس ملک پر حکومت کرنے کا موقع ہاتھ آ جائے، ایک طرف خلافت تحریک (۳) کا غلغلہ پورے ملک میں گونج رہا تھا، یہ تحریک اگرچہ اپنے آخری ایام میں تھی، لیکن اس نے ملک کی سیاست میں روح پھونک دی تھی، ''اتحاد اہالیان ہند'' کا بے نظیر کارنامہ انجام دیا تھا اور جدوجہد آزادی کے ایک نئے، کامیاب اور پرامن طریقہ سے اہل ہند کو متعارف کروایا، تو دوسری طرف جمعیۃ علماء ہند نے اپنے ساتویں اجلاس منعقدہ ۱۱ تا ۱۴/ مارچ ۱۹۲۶ء کلکتہ میں مکمل آزادی کی تجویز منظور کر دی تھی (۴) ہندوستانی سیاست میں ایک نیا رنگ آ چکا تھا، تحریک آزادی اپنے آخری پڑاؤ پر تھی، آزادی ہندوستان کی چوکھٹ تک پہنچ چکی تھی، ڈیڑھ سے دو دہائی کے دوران یہ ملک آزادی سے بہرہ ور ہونے والا تھا۔

مالٹا سے واپسی کے بعد شیخ الہندؒ (۱۲۶۸ھ=۱۸۵۱ء/ ۱۳۳۹ھ=۱۹۲۰ء) نے تحریک آزادی کے طریقہ کار میں تبدیلی فرمائی، ایک طویل مسلح جدجہد کے نتائج ان کے سامنے تھے؛ لہٰذا انہوں نے یہ نظریہ پیش کیا کہ اب عدم تشدد کی راہ اختیار کی جائے اور اب قتل وغارت گری کے بجائے، عدم تشدد، ترک موالات، مقاطعہ وبائیکاٹ، پرامن احتجاج و مظاہرے، جیل بھرو تحریک کو آزادی کے لیے ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جائے، گاندھی جی (موہن داس کرم چند ۱۸۶۹ء/ ۱۹۴۸ء) بھی اسی نظریہ کے حامی اور پرجوش داعی بنے؛ چنانچہ پورے ملک میں اس کو سراہا گیا اور اختیار کیا گیا، اور پھر اس کو عملی شکل دینے کے لیے

بہت سی تحریکات وجود میں آئیں، جیسے ستیہ گرہ (صبر کے ذریعہ مقابلہ) تحریک (۵) تحریک نمک سازی اور تحریک سول نافرمانی، ترک موالات وغیرہ۔

یہ بھی یاد رہے کہ چند شرارت پسند بلکہ انگریزوں کی کاسہ لیسی کرنے والے عناصر اسلام دشمنی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ارتدادی تحریک چلا رہے تھے، جن سے عمومی طور پر ملک اور بالخصوص اسلامیان ہند کی فضا مسموم ہو رہی تھی، سوامی شردھانند کی شدھی سنگٹھن تحریک ایسے ہی ناپاک عزائم کے ساتھ نمودار ہوئی تھی۔ (۶)

جمعیۃ علماء ہند سے وابستگی

مولانا سید محمد میاںؒ نے جس وقت عملی میدان میں قدم رکھا، اس وقت سب بڑی عبادت جو ہندوستان کی سرزمین پر ادا کی جارہی تھی، وہ حصول آزادی کے لیے جہاد عظیم اور ملت اسلامیہ کے دین وایمان کی حفاظت کی عبادت تھی۔ مولانا کے سامنے اس میدان کے گزرے ہوئے مجاہدین حضرت شاہ ولی اللہؒ (۱۱۱۴ھ=۱۷۰۳ء/ ۱۱۷۶ھ=۱۷۶۲ء) سے لے کر حضرت شیخ الہندؒ (۱۲۶۸ھ=۱۸۵۱ء/ ۱۳۳۹ھ=۱۹۲۰ء) تک بھی تھے اور موجودہ مجاہدین میں شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ اور علامہ انور شاہ کشمیریؒ کی جدوجہد بھی تھی، جبکہ ان میں سے ایک ان کے روحانی پیشوا اور مربی تھے تو دوسرے گرامی قدر استاذ مکرم؛ لہٰذا ان سے متاثر ہونا ناگزیر تھا، نیز ملک کے چوٹی کے علماء جمعیت علماء ہند کے پلیٹ فارم سے اس عبادت میں سرگرم حصہ لے رہے تھے اور دارالعلوم دیوبند کا ادنی سے ادنی علمی فرزند بھی شاہ ولی اللہ، مولانا محمد قاسم نانوتویؒ (۱۲۴۸ھ=۱۸۳۳ء/ ۱۲۹۷ھ=۱۸۸۰ء) مولانا رشید احمد گنگوہیؒ (۱۲۴۴ھ=۱۸۲۹ء/۱۳۲۳ھ=۱۹۰۵ء) اور شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی کی مجاہدانہ خدمات سے ناآشنا نہیں ہوتا اور کوئی ایسا نہیں ہے جو ان اکابر واسلاف اور جمعیۃ علماء ہند کی خدمات کو قدر؛ بلکہ رشک کی نگاہ سے نہ دیکھتا ہو اور اپنے اسلاف کی اقتداء اور ان کی قربانیوں کا حصہ بننا نہ چاہتا ہو۔

مولانا سید محمد میاںؒ دارالعلوم دیوبند کے عظیم فضلاء میں سے تھے؛ لہٰذا دارالعلوم

دیوبند، جمعیۃ علماء ہند اور ان کے معماروں اور پاسبانوں کی تحریکات، زریں خدمات، مثالی قربانیوں کا مولانا کے قلب میں موجزن ہونا بالکل ظاہر و باہر تھا۔ مولانا کی صلاحیتیں اس تحریک کا تاریخی حصہ بننے کے لیے کسی موقع کی تلاش میں تھیں اور اس موقع کی آمد کی آہٹ جیسے ہی سنائی دی، مولانا اپنی تمام تر توانائیوں کے ساتھ اس میدان میں کود پڑے۔

چنانچہ مارچ ۱۹۲۹ء میں جب مولانا سید محمد میاںؒ شاہی مرادآباد میں مدرس کی حیثیت سے تشریف لائے، تبھی سے آپ کی سرگرم جمعیتی زندگی کا بھی آغاز ہوتا ہے، جو ۳۵ سال کے طویل عرصے پر محیط ہے؛ بلکہ جمعیت سے آپ کا رشتہ پوری زندگی استوار رہا اور آپ نے اس عظیم پلیٹ فارم سے اپنے پیشرو اور موجودہ اکابر کے نقش قدم پر چلتے ہوئے، جہاں ملک کی آزادی میں سرفروشانہ خدمات پیش کیں، وہیں ملت اسلامیہ کے دین وایمان اور عقیدہ واعمال صالحہ کی پاسبانی کے لیے قابل تقلید اور لائق صد ستائش کارہائے نمایاں انجام دیے اور خود جمعیت علماء ہند کی وہ بے مثال خدمت انجام دی ہے، جو اس کی تاریخ میں سنہرے باب کی حیثیت سے درخشندہ ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ مولاناؒ نے اپنی شبانہ روز کی عملی جدوجہد کے ساتھ زبان وقلم کو بھی جمعیت کے لیے وقف کر دیا تھا۔

جمعیۃ علماء ہند کے ساتھ آپ کی وابستگی کے تعلق سے ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری نے خوب لکھا ہے:

> ''جمعیۃ علماء ہند، اس کی سیاست، اس کے رہنماؤں، اس کے مقاصد اور اس کے اصول سے لے کر فروع تک سے مورخ ملت کا تعلق جسم وجان کا سا تھا۔ جمعیۃ علماء ہند کے ایک دور کی کہانی مولانا محمد میاںؒ کی کہانی تھی۔ مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمان سیوہارویؒ کی حیات (اگست ۱۹۶۲ء) تک جمعیۃ کے روح رواں رہے، ان کے انتقال کے بعد ایک سال تک وہ جمعیۃ کے ناظم اعلی کے منصب پر فائز رہے تھے، اس کے بعد بھی منصب کی ذمہ داری کے بغیر جمعیۃ سے ان کا تعلق اسی طرح ذوق وخدمت کا تعلق رہا''۔(۷)

جمعیۃ علماء ہند مرادآباد و متحدہ صوبہ آگرہ و اودھ کی نظامت

جمعیت علماء ہند کے ساتھ قلبی اور جذباتی رشتہ کے بعد آپ کے باضابطہ عملی رشتہ کی ابتداء مرادآباد جمعیت کی نظامت سے ہوتی ہے۔ آپ ۱۹۲۹ء کے آس پاس سب سے پہلے جمعیت علماء ہند مرادآباد کے نائب ناظم بنائے گئے اور پھر کچھ ہی عرصہ کے بعد ناظم بھی منتخب کیے گئے، آپ کی تنظیمی صلاحیت اور مخلصانہ خدمات کی وجہ سے جمعیت علماء صوبہ آگرہ کے ناظم تبلیغ کی حیثیت سے آپ کا انتخاب کیا گیا، بعدازاں آگرہ اور صوبہ متحدہ آگرہ و اودھ کے ناظم بنائے گئے۔ مولانا نور عالم خلیل امینی تحریر فرماتے ہیں:

''مئی ۱۹۳۰ء میں جمعیت علماء کا تاریخی اجلاس شہر امروہہ میں منعقد ہوا، اس کی بڑی اہمیت یہ تھی کہ اس میں کانگریس کے ساتھ شراکت عمل کی قرارداد پاس کی گئی، اس اجلاس سے کچھ پہلے جمعیۃ علماء شہر مرادآباد کی مجلس منتظمہ کے اجلاس میں آپ کو شہر مرادآباد کی جمعیۃ علماء کا نائب ناظم منتخب کیا گیا، کچھ دنوں کے بعد باقاعدہ ناظم بنا دیا گیا، پھر جمعیۃ علماء صوبہ آگرہ کا ناظم تبلیغ بنا یا گیا؛ کیوں کہ اس وقت جمعیۃ علماء تبلیغ کی سرگرمیاں بھی انجام دیتی تھی، پھر آگرہ اور صوبہ متحدہ آگرہ و اودھ کے ناظم جمعیۃ بنا دے گئے۔'' (۸)

مولانا سید محمد میاںؒ اپنی خودنوشت سوانح میں اس حوالے سے ارقام کرتے ہیں:

''احقر کو مدرسہ شاہی مرادآباد میں کام کرتے ہوئے، ابھی ایک سال ہی ہوا تھا کہ سیاسی فضا میں یہ گرمی پیدا ہوگئی، اس سال جمعیۃ علما مرادآباد کا بھی انتخاب ہوا تو احقر نائب ناظم بنایا گیا''۔ (۹)

رزونامہ الجمعیۃ کی خصوصی اشاعت میں مولانا سید محمد میاںؒ کی مندرجہ ذیل تحریر ملتی ہے:

''اس اجلاس (جمعیت علماء ہند کا اجلاس امروہہ) سے کچھ پہلے جمعیۃ علماء شہر مرادآباد کی مجلس منتظمہ کا اجلاس ہوا، جس میں احقر کو جمعیۃ علماء شہر مرادآباد کا نائب ناظم منتخب کیا

گیا، کچھ دنوں بعد نائب کے بجائے ناظم بنا دیا گیا،اس وقت نظام جمعیۃ علماء میں صوبہ آگرہ الگ تھا اوراودھ علیحدہ اوراس زمانہ میں تبلیغ کا سلسلہ بھی جمعیۃ علماء سے وابستہ کیا گیا تھا تو احقر کو جمعیۃ علماء صوبہ آگرہ کا ناظم تبلیغ بنا دیا گیا، ناظم تبلیغ کے بعد احقر جمعیۃ علماء صوبہ آگرہ، پھر پورے صوبہ متحدہ کی جمعیۃ علماء کا ناظم ہوگیا''۔(۱۰)

جمعیۃ علماء ہند اور کانگریس کی ڈکٹیٹر شپ اور گرفتاری

تحریک سول نافرمانی جو ۱۹۳۱ء میں شروع ہوئی، اور تمام ہندوستانیوں نے اس میں پورے جوش وجذبہ کے ساتھ حصہ لیا، اوراس میں انگریز حکومت کے ہر قانون کی پرامن طریقہ سے مخالفت کی گئی، جس سے انگریز بری طرح جھنجھلا گئے اور بڑی تعداد میں ہندوستانیوں کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا، جس کا اندازہ آزادی کے راہنماؤں کو پہلے سے ہی تھا اور وہ پہلے سے اس کے لیے تیار بھی تھے اوراس کے لیے پوری تیاری بھی کر رکھی تھی۔ چنانچہ جمعیت علماء ہند اور انڈین نیشنل کانگریس دونوں نے صدر، سکریٹری اور دیگر تمام تنظیمی عہدوں کو ختم کر کے ''ڈکٹیٹر شپ'' کا نظام قائم کیا تھا، ڈکٹیٹر ہی تمام امور دیکھتا تھا، اپنے بڑے لیڈوروں کو بالترتیب نمبروار ڈکٹیٹر نامزد کیا اور خفیہ طور پران کی فہرست تیار کر لی گئی تھی اور منصوبہ یہ تھا کہ تمام ڈکٹیٹرز یکے بعد دیگر ایک بڑے مجمع کے ساتھ سول نافرمانی کرتے ہوئے گرفتاری پیش کریں گے اور ہر ڈکٹیٹر اپنی گرفتاری کے وقت اپنے جانشین ڈکٹیٹر کے نام کا اعلان کرے گا(۱۱)۔

حضرت مولانا سید محمد میاںؒ کو بھی ڈکٹیٹر بنایا گیا؛ بلکہ آپ کو یہ امتیاز حاصل رہا کہ آپ بیک وقت جمعیت علماء ہند اور انڈین نیشنل کانگریس دونوں کے ڈکٹیٹر تھے، مولاناؒ جمعیت علماء ہند کے نویں(۹) ڈکٹیٹر تھے۔ چنانچہ آپ خود تحریر کرتے ہیں:

''دوسرا امتیاز یہ تھا کہ احقر کو جمعیۃ علماء ہند کا نواں ڈکٹیٹر نامزد کیا جا چکا تھا.....اور یہ شرف غالباً احقر کے لیے ہی مخصوص تھا کہ ساتھ ساتھ اتر پردیش کانگریس کمیٹی، اس کا بھی ڈکٹیٹر احقر ہی تھا''۔(۱۲)

ڈکٹیٹر بننے کے بعد یہ بات تقریباً طے تھی کہ گرفتاری عمل میں آئے گی اور قید و بند کی صعوبتوں کا سامنا ہوگا۔ یہ چیز تمام ڈکٹیٹروں کو معلوم تھی اور وہ ذہنی طور پر اس کے لیے تیار بھی تھے۔ تحریک سول نافرمانی کے دوران ایک اندازے کے مطابق جیل جانے والے افراد کی تعداد نوے (۹۰) ہزار تھی، جن میں چالیس ہزار پانچ سو (۴۰۵۰۰) مسلمان تھے (۱۳) مولانا سید محمد میاںؒ کو بھی اس کی پاداش میں گرفتار کیا گیا اور جیل کی تاریک و تنگ کوٹھری میں انھیں تکلیف دہ ایام کا سامنا کرنا پڑا۔

چنانچہ مولاناؒ کو ڈکٹیٹر شپ کی وجہ سے دو مرتبہ گرفتار کیا گیا، ایک مرتبہ دہلی سے، جہاں وہ ہر جمعہ کو بہت احتیاط سے مرادآباد سے جا کر جامع مسجد میں تقریر کرتے تھے اور پولیس کو مات دے کر واپس مرادآباد تشریف لے آتے تھے؛ لیکن ایک دفعہ رہبر کی غلطی کی وجہ سے چاندنی چوک کوتوالی کے سامنے سے آپ گرفتار کر کے پورے اعزاز کے ساتھ حوالات میں پہنچا دیے گئے۔ ایک ہفتہ تک جیل میں رہے نیز چھ مہینے کے لیے دہلی میں آپ کا داخلہ ممنوع قرار دیا گیا۔ اس کی تفصیل مولانا نے خود لکھی ہے، جو طویل؛ لیکن دل چسپ ہے:

> ''اس نظام (ادارہ حربیہ اور ڈکٹیٹر شپ) کی کلید حضرت ابوالمحاسن سجاد صاحبؒ کے دست مبارک میں تھی، موصوف کی ہدایت اس احقر کے لیے یہ تھی کہ ہر ہفتہ جمعہ کی صبح کو مرادآباد سے چل کر دہلی پہنچا کرے اور نماز جمعہ کے بعد جامع مسجد میں تقریر کر کے واپس ہو جایا کرے۔ چند جمعے اس طرح گزرے، مرادآباد سے تقریباً ۵ بجے صبح کو گاڑی چلتی تھی، احقر اس ٹرین سے تقریباً ساڑھے دس بجے دہلی پہنچتا تھا، اسٹیشن پر ہی کوئی صاحب موجود رہتے جو احقر کو احتیاط سے طے کردہ مقام پر پہنچا دیتے تھے، پھر اسی احتیاط سے رقیبوں کی نظروں سے بچاتے ہوئے جامع مسجد پہنچاتے اور تقریر کے فوراً بعد اسی احتیاط سے کسی صاحب کی رہنمائی میں صوبہ دہلی کی حدود سے باہر پہنچا دیتے تھے، پولیس جب تلاش کرتی تو اس کو اپنی ناکامی پر کافی جھنجھلاہٹ ہوا کرتی تھی۔
>
> جمعہ کا دن تھا، احقر حسب ہدیت مرادآباد سے دہلی پہنچا، اس روز پولیس پوری طرح

چوکنی تھی اور احقر کی گرفتاری کا سامان اس نے مکمل کررکھا تھا۔حضرت مولانا سجاد صاحب کواس کا علم تھا،مولانا موصوف نے نماز جمعہ کے لیے احقر کو خفیہ راستوں سے روانہ فرمایا تو احقر کے رہبر قاضی اکرام الحق صاحب کو تاکید کردی کہ نماز کے بعد جنوبی دروازہ سے احقر کو نہ نکالیں ،اس طرف پولیس چوکی ہے اور آج چوکی کے علاوہ بھی پولیس کا انتظام ہے؛ بلکہ شمالی دروازہ کے سامنے تانگہ تیار رکھیں اور اس راستہ سے نکال کرلائیں ،اس طرف پولیس نہیں ہوگی ۔قاضی اکرام الحق صاحب سہواورنسیان کے پرانے مریض ہیں یہاں بھی وہ اس ہدایت سے ایسے غافل ہوگئے کہ خاص طور پر ممنوعہ راستہ ہی پر تانگہ کا انتظام کیا، پھر راستہ بھی چاوڑی بازار کےعلاوہ چاندنی چوک کی طرف کا اختیار کیا۔چنانچہ جیسے ہی کوتوالی کے سامنے تانگہ پہنچاسی آئی ڈی کے سب انسپکٹر نے جو جامع مسجد سے ہی تانگہ کے پیچھے لگ گیا تھااوراطمینان سے اپنی سائیکل پر ہمارے پیچھے پیچھے چلا آرہا تھا، اس نے تانگہ رکوالیا اور احقر کو پورے اعزاز کے ساتھ تانگہ سے اتار کرحوالات میں پہنچادیا''۔(۱۴)

یہاں جیل میں کن پریشانیوں سے مولاناؒ کوگزرنا پڑا،کیسی کیسی تکلیفیں برداشت کرنی پڑیں ، یہاں کی زندگی کتنی تنگ اور دشوار گزار تھی،خودمولانا کی زبانی وہ روداد اور داستان پیش خدمت کی جاتی ہے:

''غالبًا اگست کا مہینہ تھا۔شدید گرمی،حوالات سب طرف سے بند،نہ روشن دان،نہ کھڑکی،صرف ایک جانب مین دروازہ کے دوطرف جنگلے تھے؛مگر سامنے چوڑا برآمدہ تھا،جس کی وجہ سے یہ جنگلے بھی ہوا سے ناآشنا رہتے تھے۔پیشاب پاخانہ کے لیے صبح کو آٹھ بجے ایک گھنٹہ کے لئے کھولا جاتا تھا،باقی ۲۳ گھنٹے اسی کمرہ میں بندرہتے تھے، یہیں وضوبھی کیا جاتا تھا۔پانی نکلنے کی کوئی نالی نہیں تھی ؛نتیجہ یہ ہوا کہ وضو کا پانی کمرہ ہی میں بھرتا رہا۔حسنِ اتفاق یہ تھا کہ کمرہ میں ڈھال کافی تھا، پانی اسی ڈھال میں رہتا تھا۔رفتہ رفتہ صورت یہ ہوگئی کہ کمرہ کے نصف حصہ میں پانی بھر گیا اور نصف حصہ میں ہمارے چھ یا سات ساتھیوں کے بستر تھے،ایک ہفتہ بعد ہمیں حوالات سے نجات ملی

اور ٦ ماہ کے لیے دہلی میں داخلہ ممنوع قرار دے دیا گیا۔ اگست کے مہینہ میں اس حبسِ بے جا کا اثر یہ ہوا کہ تمام ساتھیوں کو عوارض لاحق ہو گئے، احقر کو پیچش ہو گئی''۔ (۱۵)

دہلی سے رہائی کے بعد مولاناؒ دیوبند اپنی والدہ اور متعلقین سے ملنے تشریف لے گئے اور پھر وہاں سے جلد ہی مرادآباد کے لیے روانہ ہو گئے، ادھر مرادآباد میں آپ کی گرفتاری کی مکمل تیاری ہو چکی تھی؛ کیونکہ آپ صوبہ یوپی کانگریس کمیٹی کے بھی ڈکٹیٹر تھے، سی آئی ڈی آپ کی تلاش میں تھی۔ مولانا فرماتے ہیں:

''ممکن ہے کہ اس (سی آئی ڈی) کو حیرت ہوئی ہو، جب احقر دفعۃً مرادآباد کے چوک بازار میں اس حالت میں نمودار ہو گیا کہ ایک ہاتھ میں کانگریس کا جھنڈا تھا، دوسرے میں جمعیۃ علماء ہند کا!''۔ (١٦)

مولانا کے چوک بازار میں اس طرح نمودار ہونے کے بعد ان کے ساتھ ایک بڑا مجمع ہو گیا، جس نے جلوس کی شکل اختیار کر لی اور یہ جلوس امروہہ گیٹ کی طرف بڑھنے لگا، اس کی قیادت مولانا اس شان سے کر رہے تھے کہ آپ کے ایک ہاتھ میں کانگریس کا، دوسرے میں جمعیۃ علماء ہند کا جھنڈا تھا اور گلے میں قرآن کریم لٹک رہا تھا۔ تھوڑا فاصلہ طے کرنے کے بعد پولیس کے ایک دستہ نے مولانا کا محاصرہ کر لیا اور گرفتاری کا حکم سنا کر اپنی تحویل میں لے لیا اور لاٹھی چارج کر کے مجمع کو منتشر کر دیا۔ چھ ماہ کی سزا بامشقت کلاس ''سی'' سنائی گئی، کچھ دوڑ دھوپ کے بعد یہ سزا کلاس ''سی'' سے ''بی'' میں تبدیل کر دی گئی اور چکی کی مشقت سے بھی آپ کو چھٹکارا ملا۔ (۱۷)

جمعیۃ علماء ہند کے لیے ایک عظیم سپوت کی دریافت:

مولانا سید محمد میاںؒ کی جمعیتی اور سیاسی زندگی کی عمر ابھی چند ہی برس کی ہوئی تھی کہ اس میدان کے بڑے اور ماہر شہسواروں نے آپ کی جد و جہد، طریقہ کار اور شاندار کارکردگی کے آئینہ میں آپ کے اندر مخفی صلاحیتوں کا ادراک کر لیا اور آپ کی ان صلاحیتوں سے قوم و ملت اور ملک عزیز کو زیادہ سے زیادہ نفع پہنچانے کے لیے جمعیۃ علماء کے عظیم پلیٹ فارم کے

لیے آپ کا انتخاب کرلیا گیا۔اس روشن آغاز کی کچھ تفصیل یہ ہے کہ مرادآباد اور بریلی کی جیلوں میں مولانا سید محمد میاںؒ کو مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمان سیوہارویؒ کے ساتھ رہنے کا موقع ملا، اس عرصہ میں مجاہد ملتؒ نے اس گوہر آبدار کو پہچان لیا اور شاید یہ عزم مصمم کرلیا کہ اسے کسی طرح حاصل کرنا ہے، یہ جمعیۃ علماء ہند کا مستقبل ثابت ہوسکتا ہے۔اس زمانہ تک مولانا سید محمد میاںؒ مدرسہ شاہی مرادآباد کے مدرس تھے، مجاہد ملتؒ مدرسہ شاہی تشریف لائے؛ تاکہ مولانا میاںؒ کو جمعیۃ کے لیے یہاں سے لے جائیں اور مجاہد ملتؒ نے اپنے اس منصوبہ کو عملی شکل دینے اور اپنے اس خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کی پوری اور مضبوط تیاری کرلی تھی۔ چنانچہ وہ اکیلے تشریف نہیں لائے تھے؛ بلکہ مولانا میاںؒ کے پیرومرشد، شیخ ومربی شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی کو بھی ساتھ لائے تھے؛ جن کی بات کسی قیمت پر مولانا میاںؒ رد نہیں کرسکتے تھے۔ چنانچہ مدرسہ کے مہتمم صاحب سے رخصت دلوا کر مولانا میاںؒ کو دہلی لے گئے۔مولانا دہلی کیا گئے پھر دہلی ہی کے ہوکر رہ گئے۔مولانا میاںؒ نے خود اس واقعہ کو تحریری دستاویز میں محفوظ کیا ہے۔آپ لکھتے ہیں:

> ''مجاہد ملت زمانہ اسارت میں احقر سے اتنے مانوس ہوگئے تھے کہ پھر احقر کو اپنی قید سے رہا کرنا گوارا نہ کیا۔۱۹۴۵ء میں حضرت شیخ الاسلامؒ کو ساتھ لے کر مرادآباد پہنچے اور مدرسہ شاہی کے مہتمم حضرت مولانا عبدالحق صاحب مدنیؒ اور صدر مدرس حضرت مولانا سید فخر الدین احمد صاحبؒ سے اصرار کرکے مدرسہ شاہی سے چھ ماہ کی رخصت دالوائی اور دہلی لے آئے۔حضرت مجاہد ملت تیار نہیں تھے؛ مگر احقر کو سلسلۂ درس ترک کرنا گوارا نہیں تھا، چھ ماہ بعد واپس ہوگیا؛ لیکن چند روز بعد ۱۹۴۷ء کا مشہور ہنگامہ ہوگیا، ابتداء ہنگامہ میں تو حالت یہ تھی کہ دہلی میں کسی طرف سے بھی کسی مسلمان کا آنا خودکشی کے مرادف تھا؛ لیکن جیسے ہی دہلی پہنچنے کا موقع ملا، احقر دہلی گیا اور یہاں آکر محسوس کیا کہ اس وقت مجاہد ملت جو خدمت انجام دے رہے ہیں وہی بہترین خدمت؛ بلکہ افضل ترین جہاد ہے؛ لہٰذا احقر نے دہلی ہی میں اس وقت تک قیام کا ارادہ کرلیا، جب تک مجاہد ملت کو ضرورت ہو''۔(۱۸)

جمعیۃ علماء ہند کی نظامت

مولانا سید محمد میاںؒ قومی وملی خدمت کے میدان میں ایک اچھے کارکن تھے، انھوں نے نائب ناظم اور ناظم کی حیثیت سے اپنی صلاحیت کو ثابت کردیا تھا اور اب اونچے مناصب کے لیے لیے فتح مندی کا دروازہ کھل چکا تھا (۱۹) مگر ان کی دلی خواہش اور ان کی خوشی اس بات میں تھی کہ وہ ادنی خادم کی حیثیت سے جمعیۃ علماء ہند کی خدمت کرے، انہیں عہدوں اور منصبوں سے بیزاری ہوتی تھی، وہ ان سے دور بھاگتے تھے، جب کبھی ایسا موقع آتا وہ اپنا دامن بچانے کی بھرپور کوشش کرتے، لیکن جب ۱۹۴۵ء میں سہارن پور میں جمعیۃ علماء ہند کا عظیم الشان اجلاس ہوا اور اس میں جمعیۃ علماء ہند کا انتخاب از سرنو عمل میں آیا، جس میں شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ کو صدر، مجاہد ملتؒ کو ناظم اعلی منتخب کیا گیا اور نظامت کے لیے مولانا سید محمد میاںؒ کا نام لیا گیا تو مولانا نے اٹھ کر معذرت کرنے کی کوشش کی تو ان کے شیخ و مرشد شیخ الاسلام نے ان کا دامن پکڑ کر انہیں نیچے بٹھادیا۔ شیخ الاسلام کے حکم کے آگے ان کے لیے سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں رہ جاتا تھا کہ وہ اپنے آپ کو خود سپرد کردیں۔ چنانچہ اس اجلاس میں آپ جمعیۃ علماء ہند کے ناظم منتخب کیے گئے۔ (۲۰)

مولانا سید محمد میاںؒ تحریر فرماتے ہیں:

> ''۴ تا ۷/مئی ۱۹۴۵ء کو بڑی شان کے ساتھ جمعیۃ علماء ہند کا اجلاس سہارن پور میں ہوا، حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ صدر اور مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمان صاحبؒ ناظم اعلی منتخب کیے گئے، احقر کا نام زبانوں پر آیا تو احقر نے اسٹیج پر کھڑے ہوکر معذرت کرنی چاہی؛ مگر سیدی شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ نے جو اسٹیج پر تشریف فرما تھے، خلاف معمول احقر کا دامن جھٹک کر کھینچا اور احقر کو نیچے بٹھادیا۔ اب بجز تسلیم ورضا چارہ ہی کیا تھا؟ ''قہر درویش بر جان درویش''۔ (۲۱)

مولانا سید محمد میاںؒ کو معلوم تھا کہ نظامت کا عہدہ قبول کرنا، اپنے آپ کو بڑی آزمائشوں کے حوالے کرنا ہے؛ کیوں کہ ایک آل انڈیا جماعت جو نہایت ذمہ دار، حساس

اور سرگرم ہو، جس کی سینکڑوں شاخیں ملک میں پھیلی ہوئی ہو، جس کے ہزاروں کارکن قوم و ملت کی خدمت میں مصروف ہوں، اس سے ایک ناظم کی ذمہ داریوں اور اس کی مشکلات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ مولانا سید محمد میاںؒ نے اپنے ذوق خدمت، اپنی صلاحیتوں اور فکر عمل کی قابلیتوں کو کسوٹی کے حوالے کر دیا تھا، جس کے کھرے کھوٹے پر ایک عالم کی نگاہیں لگی ہوئی تھیں؛ لیکن اللہ تعالی نے مولاناؒ کو کاموں کی انجام دہی کا ایسا سلیقہ اور ہمت عطا فرمائی تھی کہ ہر کام بروقت اور حسن وخوبی کے ساتھ انجام پا رہا تھا۔ (۲۲)

جمعیۃ علماء ہند کی نظامت علیا

مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمان سیوہارویؒ کی دیرینہ خواہش تھی کہ اپنی زندگی میں ہی مولانا سید محمد میاںؒ کو جمعیت علماء ہند کی نظامتِ علیا کی ذمہ داری سپرد کر دیں۔ بارہا آپ نے اس خواہش کا اظہار بھی کیا؛ لیکن مولانا میاںؒ اس کے لیے تیار نہ ہوتے اور اپنی طبیعت اور مزاج اور دیگر بہانوں کے ذریعہ ٹالنے کی کامیاب کوشش کرتے؛ یہاں تک کہ مجاہد ملتؒ ان کے سامنے ہتھیار ڈال دیتے۔ چنانچہ مولانا میاںؒ اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

''مجاہد ملتؒ نے بارہا فرمایا کہ وہ نظامت علیا سے سبک دوش ہونا چاہتے ہیں، یہ ذمہ داری احقر منظور کر لے؛ مگر احقر کا جواب یہی ہوتا تھا کہ احقر اپنی افتادِ طبع کے لحاظ سے مدرس ہے، آپ کی امداد کے لیے خدمت درس ترک کیے ہوئے ہے، نظامت سے طبعاً دل چسپی نہیں ہے، آپ کو اگر امداد کی ضرورت نہیں تو احقر کا مقام ''مدرسہ شاہی'' ہے، نظامت علیا نہیں۔ بہر حال نتیجہ یہ ہوا ''آں قدح بشکست وآں ساقی نماند۔ (۲۳)

مجاہد ملتؒ نے اپنے مرض الوفات میں مولانا سید محمد میاںؒ کے لیے اپنی قائم مقامی کا اعلان کرا دیا تھا۔ چنانچہ مجاہد ملتؒ کی وفات (۱۳۸۲ھ مطابق ۱۹۶۲ء) کے بعد آپ کو جمعیۃ علماء کا ''ناظم اعلی''، منتخب کیا گیا اور پورے ایک سال تک آپ اس عہدہ پر فائز رہے۔ مولانا لکھتے ہیں:

''حضرت مجاہد ملتؒ نے زمانہ مرض میں از خود احقر کی قائم مقامی کا اعلان کرا دیا تھا،

مرحوم کی وفات کے بعد ایک سال تک اس اعلان کا احترام کرتے ہوئے یہ خدمت انجام دی''۔(۲۴)

جمعیۃ علماء کی دیگر ذمہ داریاں

نظامت علیا سے سبک دوش ہونے کے بعد آپ مدرسہ امینیہ میں شیخ الحدیث اور مفتی کی حیثیت سے خدمات انجام دینے لگے اور آپ کا محبوب مشغلہ درس وتدریس کا سلسلہ ایک بار پھر شروع ہو گیا؛ لیکن جمعیۃ علماء ہند سے آپ کا رشتہ منقطع نہیں ہوا؛ بلکہ پوری زندگی آپ نے جمعیۃ علماء ہند کی خدمت انجام دی، آپ اس کی مجلس عاملہ کے رکن رکین، ادارہ مباحث فقہیہ کے مدیر (ناظم) اور جمعیۃ ٹرسٹ کے سکریٹری رہے۔(۲۵)

روزنامہ الجمعیۃ کا احیاءِ نو اور اس کی ادارت

مجاہد ملتؒ نے الجمعیۃ اخبار کے احیاءِ نو کا عزم فرمایا اور اس کی ادارت کی ذمہ داری مولانا سید محمد میاںؒ کو دی۔ چنانچہ ۲۳/ دسمبر ۱۹۴۷ء سے یہ روزنامہ دوبارہ جاری ہو سکا، پہلے یہ اخبار سہ روزہ تھا؛ لیکن مجاہد ملتؒ نے اس نشاۃ ثانیہ میں اسے ''روزنامہ'' کر دیا۔ مولانا محمد میاںؒ اس حوالے سے ارقام کرتے ہیں:

> ''۲۰/ دسمبر (۱۹۴۷ء) کو سہانپور میں مجاہد ملّت کا تار پہنچا اور احقر خطرناک راستے طے کرتا ہوا خدا کے فضل سے دہلی پہنچ گیا۔ یہاں مجاہد ملّت روزنامہ الجمعیۃ کے جاری کرنے کا عزم فرما چکے تھے اور احقر کو اسی لئے طلب فرمایا تھا کہ بلا توقف روزنامہ جاری کر دیا جائے۔ چنانچہ ۲۳/ دسمبر ۴۷ء سے یہ روزنامہ پھر جاری ہو گیا جو ۹ سال پہلے برطانوی حکومت کے ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کی نوازشوں کا شکار ہو چکا تھا؛ فرق یہ ہوا کہ پہلے سہ روزہ تھا اور اس مرتبہ مجاہد ملت کے حوصلہ عالی نے اس کو روزنامہ قرار دیا''۔(۲۶)

ادارہ مباحث فقہیہ

صنعتی انقلاب اور روز افزوں سائنسی ایجادات کی وجہ سے نت نئے مسائل پیدا

ہور ہے تھے، اور شریعت اسلامیہ کی روشنی میں ان مسائل کا حل اور حکم شرعی پیش کرنا، علماء کی ذمہ داری ہوتی ہے اور انفرادی کوشش کے مقابل میں اجتماعی غور وفکر کے ذریعہ مسائل کی صحیح صورت حال اور ان کے شرعی حکم تک پہنچنا بہتر، قریب از صواب اور محتاط طریقہ کار ہے۔ چنانچہ جمعیۃ علماء ہند نے اس شرعی اور ملی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے ۱۹۷۰ء میں مولانا سید محمد میاںؒ کی تحریک پر اور آپ کی زیر نگرانی ''ادرہ مباحث فقہیہ'' قائم کیا، تاکہ بدلتے ہوئے حالات میں پیدا شدہ مسائل پر تحقیق اور غور وخوض کرکے، ملت کی ان کے سلسلے میں رہنمائی کی جائے، جس کے تحت متعدد نئے مسائل اور جدید موضوعات پر فقہی مقالے لکھے گئے، جنہیں ملک کے نامور علماء اور فقہاء نے تحسین کی نگاہ سے دیکھا۔ الحمدللہ یہ ادارہ ہنوز اپنے نہج پر قائم ہے اور ملت کی رہنمائی کا فریضہ منظّم انداز میں انجام دے رہا ہے۔ (۲۷)

مورخ جمعیۃ علماء ہند کی قلمی خدمات

حضرت مولانا جہاں ایک طرف کامیاب مدرس، نکتہ سنج مفسر، بالغ نظر فقیہ، کہنہ مشق خطیب، عاشق رسول محدث، عالم باعمل، مجاہد آزادی اور امت کا درد رکھنے والے اور اس کے لیے تڑپنے والے تھے، وہیں حقیقت کی تہہ تک پہنچنے والے مورخ بھی تھے، آپ کی بیشتر کتابوں میں تاریخی عنصر نمایاں اور غالب نظر آتا ہے، آپ تاریخ ساز ہونے کے ساتھ ساتھ تاریخ نگار بھی تھے، اس فن میں آپ نے متعدد بیش قیمت کتابیں تالیف فرمائی ہیں، جنھیں برصغیر کی تاریخ میں اہم مقام حاصل ہے۔ ان کی سیاسی تالیفات وتحریرات اپنی کمیت اور کیفیت ہر دو لحاظ سے تاریخ سیاسیاتِ ہند و پاکستان کے لٹریچر میں اپنی مثال نہیں رکھتیں (۲۸) اور اسی وجہ سے آپ کو ''مورخ ملت'' کے لقب سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔

مولانا نے اپنے اسی طبعی ذوق اور فطری صلاحیت کو بروکار لاتے ہوئے جمعیۃ علماء ہند کے لیے اس قدر لکھ دیا ہے کہ، جمعیۃ علماء ہند کی معلومات اور تاریخ کا ماخذ مولانا ہی کی تحریریں اور کتابیں ہیں اور جمعیۃ کی تاریخ ودستاویزات کے تعلق سے آپ کی تحریریں ہی

اصل سرمایہ ہیں۔آپ نے اس موضوع پر بہت کچھ لکھا اور تاریخ نویسوں کے لئے بنیادی مواد فراہم کردیا۔چنانچہ مولانا معزالدین صاحب تحریر فرماتے ہیں:

''آپ کے قلم نے جمعیۃ علماء ہند کے دستاویز کو محفوظ کردیا اور علماء حق کے کارناموں کو زندہ جاوید کردیا، جمعیۃ علماء کے پاس آج جو بھی تاریخ ہے، وہ مولانا مرحوم کی رہین منّت ہے؛ یقیناً آپ جمعیۃ علماء کے قلم تھے''۔(۲۹)

مولانا مسعود عزیزی ندوی لکھتے ہیں:

''مولانا سید محمد میاں صاحب بالعموم ہر اجلاس میں پیش کی جانے والی تجایز مرتب کرتے یا اگر کوئی اور مرتب بھی کرتا تو بھی اس کی نوک پلک سنوارنے کے لیے وہ تحریر مولانا کو ہی دی جاتی۔تجاویز کی عبارت حسب حال اور بہت جچی تلی ہوتی''۔(۳۰)

دوسری جگہ مولانا مسعود عزیزی ندوی لکھتے ہیں:

''جمعیۃ علماء کی سیاسی تاریخ اور اس کے ریکارڈ پر ان کی گہری نظر تھی، علماء ہند کی سیاسی خدمات سے عوام الناس کو روشناس کرانے اور ایک طرح سے ہندوستان کی جدو جہد آزادی میں مسلمانوں کے کردار کو واضح کرنے میں، انہوں نے عظیم تصنفی خدمات انجام دیں۔اکابر دیوبند کی عملی، سیاسی اور دینی وتبلیغی خدمات پر آپ کی تحریریں بہت مستند سمجھی جاتی ہیں، یورپ اور امریکہ کے مصنفین بھی ان کے حوالے دیتے ہیں''۔(۳۱)

چناں چہ مولاناؒ نے جمعیۃ علماء کی تاریخ پر متعدد کتابیں لکھی ہیں، جن میں سے بعض کا تعارف پیش کیا جاتا ہے:

(۱) علماء حق اور ان کی مجاہدانہ کارنامے

یہ کتاب دو جلدوں پر مشتمل ہے: پہلی جلد ۲۲/ستمبر ۱۹۳۹ء کو مکمل ہوئی تھی، اس میں جنگ عظیم دوم کے آغاز سے پہلے کے حالات، تحریکات اور رجال کار کی خدمات کا احاطہ کیا گیا ہے اور جلد دوم جنگ عظیم ثانی کے آعاز اور اس کی تباہ کاریوں کے تذکرے سے لے کر گاندھی جی کے قتل (۱۹۴۸ء) اور حالات مابعد پر تبصرے کے ساتھ اپنے اختتام کو پہنچتی ہے۔

(۳۲) نیز اس کے دوسرے حصے میں ملک کی آزادی اور تقسیم کے بعد کے حالات اور اس دور میں جمعیۃ علماء ہند کی خدمات کا ذکر ہے۔(۳۳) مولانا معزالدین صاحب سے لکھتے ہیں:

''یہ کتاب علماء ہند کا شاندار ماضی کا تکملہ ہے، جس میں ۱۸۵۷ء کے بعد سے ۱۹۴۷ء تک مجاہدین حریت کے کارناموں کو بیان کیا گیا ہے؛ بالخصوص شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ اور شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی کے مجاہدانہ کردار کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے''۔(۳۴)

(۲) جمعیۃ علماء کیا ہے؟

یہ کتاب دو حصوں میں چند ضمیموں کے ساتھ ہے ۔ یہ سلسلہ حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ کے ایما پر مورخ ملت نے تالیف کیا تھا۔اس کی پہلی جلد ۱۹۴۵ء میں مرکزی لجِس لیٹو اسمبلی کے انتخاب کے موقع پر شائع ہوئی تھی ۔ یہ جلد جمعیت علماء کی اسلامی اور سیاسی خدمات کے تعارف میں ہے ۔اس کا دوسرا حصہ جنوری ۱۹۴۶ء میں صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات سے قبل شایع کیا گیا تھا، اس کے چند ضمیمے بھی تھے، جن میں ان سے قبل وبعد کے اجلاسوں کی اہم تجاویز مرتب کردی گئی ہیں ۔(۳۵) مولانا معزالدین صاحب اس کتاب کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:

''اس کتاب میں جمعیۃ علماء ہند کی خدمات اور اس کی تجاویز کو مرتب کیا گیا ہے، تاریخ جمعیۃ میں یہ کتاب سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے''۔(۳۶)

(۳) خدمات جمعیۃ علماء ہند

یہ کتاب چار حصوں میں ہے اور ان میں جمعیۃ علماء ہند کی خدمات کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔حصہ اول ۳۰ صفحات پر مشتمل ہے: اس میں جمعیۃ علماء ہند کی بنیادی خدمات کا تذکرہ ہے۔ یہ نومبر ۱۹۵۲ء میں شایع ہوئی تھی۔حصہ دوم اکتوبر ۱۹۶۲ء میں شایع ہوا: اس کے ۸۰ صفحات ہیں اور اس میں جمعیۃ علماء ہند کی امداد و خدمات کا تذکرہ ہے۔حصہ سوم ۱۸ صفحے کا ایک رسالہ ہے، جس میں جمعیۃ علماء ہند کی تعمیری خدمات کا بیان ہے اور یہ بھی اکتوبر ۱۹۶۲ء

میں شایع ہوا، نیز یہ تینوں حصے شعبہ نشر واشاعت جمعیۃ علماء ہند، نئی دہلی سے شایع ہوئے۔ چوتھا حصہ میں مجاہد ملت کی تاریخی تقریریں جمع کی گئی ہیں۔ یہ ۱۹۲صفحات کی کتاب ہے، الجمعیۃ بک ڈپو، نئی دہلی سے شایع ہوئی ہے۔(۳۷)

ان کے علاوہ بھی جمعیۃ علماء ہند کی تاریخ، اس کی خدمات، اس کے کارنامے، اس کی سیاست اور اس کے منشور وغیرہ پر مولاناؒ نے متعدد کتابیں اور رسالے تحریر فرمائے ہیں۔ جن میں سے چند کے نام پیش خدمت ہیں:

(۴) آنے والے انقلاب کی تصویر (۵) جمعیۃ علماء ہند ایک تاریخی مطالعہ (۶) ہندوستانی سیاست اور علماء ہند ۱۸۵۷ء کے بعد (۷) تقسیم ملک اور جمعیۃ علماء ہند کا موقف (۸) ہندوستانی سیاست اور اس کا تقابلی مطالعہ (۹) ہندوستان کی تین بڑی جماعتیں اور ان کی تجاویز (۱۰) جمعیۃ علماء ہند اور لیگ کا نصب العین (۱۱) جمعیۃ علماء ہند اور عمایدین لیگ کے کارنامے (۱۲) شرکت کانگریس کا جواز، تھانوی، عثمانی نقطہ نظر پر تنقید وتبصرہ کی ایک نظر (۱۳) مسلم لیگ کے دعاوی اور ان کی حقیقت تحریک پاکستان کے پس منظر میں (۱۴) جمعیۃ علماء ہند کا واضح فیصلہ پورا ہندوستان ہمارا پاکستان ہے(۳۸)۔(۱۵) خطرناک نعرے اور جمعیۃ علماء ہند کا صراط مستقیم۔(۳۹)

جمعیت علماء کا بے لوث اور نڈر خادم

مولانا سید محمد میاںؒ جمعیۃ علماء کے مشن کو عملی شکل دینے کے لیے ہر راہ سے گزرے ہیں، ہر وادی کو انھوں نے عبور کیا ہے، خطرات کے راستے طے کیے ہیں، خطرناک اور ہنگامہ خیز حالات میں بھی وہ میدان عمل میں نکلے؛ بلکہ ایسے خوفناک ماحول میں بھی جب کہ اپنی منزل سے نکلنے والے کو یہ معلوم نہیں رہتا تھا کہ وہ زندہ اور سلامت واپس آئے گا یا نہیں، انھوں نے سر سے کفن باندھ کر اور جان ہتھیلی پر رکھ کر بھی جمعیۃ کی دعوت پر لبیک کہا ہے۔ وہ بلاشبہ جمعیۃ علماء ہند کے جانباز، نڈر اور بے خوف سپاہی تھے۔ کئی موقعوں پر انھیں جمعیۃ کے مشن کو بروئے کار لانے کے لیے ایسے اسفار کرنے پڑے، جن میں جان کا بھی خطرہ تھا،

متعدد بار گرفتار کیے گئے (۴۰) مہینوں جیل کاٹنی پڑی، جس کا کچھ تذکرہ ''جمعیۃ علماء ہند اور کانگریس کی ڈکٹیٹر شپ اور گرفتاری'' عنوان کے ذیل میں آچکا ہے۔اس کے علاوہ بھی متعدد بار جیل جانا پڑا۔

مولانا قاضی سجاد حسین (متوفی ۱۴۱۰ھ=۱۹۹۰ء)، سابق صدر مدرس مدرسہ عالیہ عربیہ، دہلی، مولانا کی کتاب ''اسیران مالٹا'' پر اپنے ''تعارفی کلمات'' میں لکھتے ہیں:

''جمعیت علماء کی نظامت کے جلیل القدر عہدہ پر عرصہ دراز تک فائز رہے؛ لیکن عہدہ کی جلالت کبھی مولانا کے لئے ادنیٰ سے ادنیٰ خدمت سے مانع نہ ہوئی۔مولانا کا مقصد کام اور خدمت ہوتی تھی، خواہ وہ کسی بھی نوعیت کی کیوں نہ ہو۔۱۹۴۷ء کے ہنگاموں میں جبکہ ہندوستان جہنم کدہ بنا ہوا تھا اور مظلوموں کی چیخ و پکار سے اہل ہند کے دل دہل رہے تھے، مولانا نے انتہائی استقامت کے ساتھ مظلوموں کی خدمت کی، جہاں کہیں بھی مسلمانوں پر ظلم وستم ہوا، مولانا بے دھڑک وہاں ریلیف اور امداد کے لئے پہنچے۔پنجاب کے خونچکاں واقعات کے بعد جبکہ مسلمانوں کے کچھ افراد پنجاب اور ہماچل کی دور دراز آبادیوں میں اکّا دُکّا رہ گئے تھے، مولانا نے پنجاب کے دیہات کے دورے کئے، ہماچل پہاڑ کے پھیلے ہوئے دیہات میں دشوار گزار راستے طے کر کے پہنچے اور وہاں ان کے زخموں پر مرہم رکھا اور ان کے دین وایمان کے تحفظ کے لئے مکاتب اور مدارس قائم کئے''۔(۴۱)

خطروں بھرے اسفار

جب انڈین نیشنل کانگریس نے ۸/ اگست ۱۹۴۲ء کو ''کوئٹ انڈیا'' (ہندستان چھوڑو) کی تجویز پاس کی، تو مجاہد ملّت مولانا حفظ الرحمان سیوہارویؒ (ناظم عمومی جمعیۃ علماء ہند) نے اس تحریک کی تائید کے لئے ۷، ۸/ اگست ۱۹۴۲ء کو دہلی میں مجلس عاملہ کا ہنگامی اجلاس بلایا۔مولانا سید محمد میاںؒ اس اجلاس میں کیسی کیسی صعوبتیں اٹھا کر شریک ہوئے اور پھر حسب ہدایت ملک کے گوشہ گوشہ میں مجلس عاملہ کی تجویز کو پہنچایا، مولانا مرحوم کا یہ ایک عظیم الشان کارنامہ ہے اور ان کے جذبہ آزادی اور جمعیۃ علماء خدمت کی ایک تابناک مثال

ہے۔مولانا نے خود اس کی بھی تفصیل لکھی ہے، جو حسب ذیل ہے:

''اس زمانہ میں احقر کا تعلق مدرسہ شاہی مرادآباد سے تھا؛ مگر جب رفقاء محترم کو بجرم عشق حریت ۸/ اگست کو مرادآباد سے گرفتار کیا گیا تو احقر نے فوراً ہی روپوش ہو جانا ضروری سمجھا؛ چنانچہ پولیس گرفتاریوں میں مصروف تھی اور احقر تاریک اور غیر معروف گلیوں، کوچوں میں ہوتا ہوا، مرادآباد سے نکل رہا تھا، میرے نسبتی بھائی حافظ سادات حسن صاحب از راہ ہمدردی احقر کے ساتھ ہو لئے، ہم دونوں (۸) میل پا پیادہ طے کر کے قصبہ حکیم پور پہنچے، جب چند گھنٹہ بعد دہلی جانے والا پسنجر حکیم پور پہنچا تو احقر اس سے روانہ ہوا؛ لیکن ٹرین میں زیادہ دیر تک بیٹھنا بھی مناسب نہیں تھا؛ لہٰذ سمبھاؤلی اسٹیشن پر اتر گیا اور موضع ویٹ میں جو اسٹیشن سمبھاؤلی سے تقریباً تین میل کے فاصلہ پر ہے، اپنے ماموں زاد بھائی مولانا سید محمد اعلی صاحب صدر مدرسہ اعزاز یہ قصبہ ویٹ کے یہاں دو تین روز قیام کیا، پھر کچھ پا پیادہ اور کچھ بس سے سفر کرتے ہوئے دہلی پہنچنا چاہتا تھا کہ جمنا کے پل پر راستہ روک دیا گیا کہ شہر میں کانگریسیوں نے فساد برپا کر رکھا ہے، فساد کا تماشہ میں خود بھی جمنا پار سے دیکھ رہا تھا؛ کیونکہ پیلی کوٹھی کو جس میں ریلوے کا ریکارڈ تھا، آگ لگادی گئی تھی اور اس کے شعلے آسمان سے باتیں کر رہے تھے۔ یہ شعلے جمنا پار؛ بلکہ شاہدرہ سے نظر آرہے تھے، اس وقت جمنا برج سے واپس ہو کر غازی آباد پہنچا، پھر غازی آباد سے دہلی پہنچنے کی داستان طویل ہے۔

مولانا کسی طرح دہلی پہنچ گئے اور مجلس عاملہ کے اجلاس میں بحیثیت مدعو خصوصی شریک ہوئے، اس اجلاس میں جمعیۃ نے ایک تجویز پاس کی اور یہ فیصلہ لیا کہ اس تجویز کو کثیر تعداد میں چھپوایا جائے اور ملک کے گوشے گوشے میں اسے پہنچایا جائے۔ یہ مشکل ترین خدمت دو حضرات کے سپرد کی گئی: (۱) مولانا عبدالماجد دہلوی (۲) مولانا سید محمد میاںؒ۔ اس تجویز کو دہلی سے مشرقی ہندوستان کے آخری کنارے تک پہنچانے کی ذمہ داری مولانا سید محمد میاںؒ کو تفویض کی گئی۔ مولاناؒ تجویز کا بنڈل لے کر سفر کے لیے کمر بستہ ہو گئے۔ مولانا کے قلم تاریخ رقم نے سفر کی داستان محفوظ کر دی ہے:

''جگہ جگہ ہڑتالیں ہورہی تھیں، پولیس اور فوج کی گولیاں موت کی بارش برسارہی تھیں، ریل کی پٹریاں اکھاڑی جارہی تھیں، ٹیلیفون اور ٹیلی گراف کے تار کاٹ کر نظام حکومت؛ خصوصاً ریلوے کے نظام کو معطل کیا جارہا تھا اور بارش کی مسلسل جھڑیوں نے جس طرح پولیس اور سی آئی ڈی کے کام کو دشوار کردیا تھا، مسافروں کے لئے بھی صعوبتیں پیدا کردی تھیں۔ بہر حال ان حالات کو انگیز کرتے ہوئے دہلی سے روانہ ہوکر مغل سرائے تک تو رسائی ہوگئی؛ لیکن مغل سرائے کے بعد سفر کی تمام صورتیں ناممکن ہوگئیں؛ کیونکہ ریلوے کی پٹریاں تو تحریک کی نذر ہوگئی تھیں اور عام راستوں اور سڑکوں کو سیلاب نے ناقابل عبور بنادیا تھا؛ مجبوراً احقر جونپور واپس ہوا اور محترم حاجی ولی محمد صاحب مرحوم کے ایک مکان میں گوشہ نشیں ہوکر اس لٹریچر کو مختلف صورتوں سے ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں پہنچانے کا انتظام کیا''۔ (۴۲)

مجاہد ملتؒ نے جب اخبار ''الجمعیۃ'' کی نشاۃ ثانیہ کا عزم فرمایا اور اس کی ادارت کے لیے مولانا سید محمد میاںؒ کو دہلی طلب کیا تو آپ کن دشوار گزار راہوں کو طے کرتے ہوئے، دہلی پہنچے، مولانا کے قلم نے اس کا حال بھی سپرد قرطاس کیا ہے:

''وسط دسمبر (۱۹۴۷ء) میں احقر چند ضرورتوں سے دہلی سے باہر گیا ہوا تھا، غالباً ۲۰/ دسمبر کو سہانپور میں مجاہد ملّت کا تار پہنچا اور احقر خطرناک راستے طے کرتا ہوا خدا کے فضل سے دہلی پہنچ گیا''۔ (۴۳)

آزادی کے بعد پھوٹنے والے قیامت خیز فسادات میں جمعیۃ اور کارکنان جمعیۃ کی قربانیاں

تقسیم ہند کے بعد جب پورے ملک میں فسادات کی آگ پھیل گئی، مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ کردیا گیا، لاکھوں کی تعداد میں مسلمان قتل کیے گئے، ان کے گھر اجاڑے گئے، ان کی آبادیاں ویران کی گئیں، فسادات کے شعلے ملک کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک بلند ہورہے تھے، پورا ملک جہنم کدہ بنا ہوا تھا، دہلی، میوات، ہریانہ اور دیگر کئی

صوبوں سے مسلمانوں کے اخراج کی منصوبہ بندی مکمل کر لی گئی تھی، حکومت اور انتظامیہ چشم پوشی سے کام لے رہی تھی، بالفاظ دیگر فسادیوں اور بلوائیوں کے ساتھ کھڑی تھی، ملک کا وزیر داخلہ ان فسادات اور بڑی تعداد میں مسلمانوں کے جانی و مالی نقصان کو معمولی سمجھ رہا تھا؛ بلکہ وقتاً فوقتاً اس کی تردید کر رہا تھا، جس کی کہانی مولانا آزاد نے تفصیل سے لکھی ہے۔

ان سنگین حالات اور ہندو دہشت گردی وفرقہ پرستی کا مقابلہ کرنے کے لیے جمعیۃ علماء ہند اور اس کا جانباز کارکنان نے جان کی بازی لگا دی، مجاہد ملتؒ اور ان کے دست و بازو مولانا سید محمد میاںؒ، مولانا انیس الحسنؒ وغیرہ اپنی جان کی پرواہ کیے بغیر ان فساد زدہ علاقوں میں پہنچ جاتے، فسادیوں پر کنٹرول کرنے کے لیے انتظامیہ کو متنبہ کرتے، زخمیوں کی مرہم پٹی کرتے، مظلوم اور بے سہارا لوگوں کی ہر طرح امداد کرتے، ان کے درد میں شریک ہوتے، ملک میں جہاں کہیں فساد ہوتا، فوراً وہاں پہنچتے اور ہر طرح سے وہاں کے لوگوں کے ساتھ ہمدردی اور تعاون کا مظاہرہ کرتے۔ جمعیۃ کے تمام کارکنان اس عرصہ میں نہایت مصروف رہے، دیگر تمام کاموں کو روک دینا پڑا۔ مولانا سید محمد میاںؒ اس زمانہ کی اپنی مصروفیت کے تعلق سے لکھتے ہیں:

> ''افسوس اس زمانے میں جمعیۃ علماء سے تعلق رکھنے والا ہر ایک چھوٹا بڑا، اس درجہ مصروف اور منہمک تھا کہ کسی کو بھی ڈائری لکھنے کی توفیق نہیں ہوئی، احقر نے چند بار یہ سلسلہ قائم کرنا چاہا؛ مگر ایک طرف واقعات کی کثرت اور دوسری جانب جماعتی فرائض کی انجام دہی کی کوشش؛ نتیجہ یہ ہوا کہ ڈائری لکھنے میں کامیاب نہ ہو سکا، تاہم بہت سے واقعات علماء حق جلد دوم اور مختصر تذکرہ خدمات جمعیت علماء ہند میں درج کر کے شائع کرا چکا ہوں۔ (۴۴)

ایک دوسرے موقع پر مولانا تحریر فرماتے ہیں کہ وہ جمعیۃ علماء کی طرف سے فسادات میں ستم رسیدہ اور زخم خوردہ مظلوموں کی مدد کے تشریف لے جاتے تھے:

> ''۱۹۴۷ء کے وقتی ہنگاموں کے بعد جو فسادات گذشتہ پندرہ سال میں ہوئے، ان کا

شمار مشکل ہے، ہر فساد کے موقع پر جمعیۃ علماء ہند کی طرف سے وفود بھیجے جاتے تھے اور ستم رسیدہ مسلمانوں کی امداد کی جاتی تھی؛ مگر ان وفود میں خود مجاہد ملت شریک نہیں ہوا کرتے تھے؛ بلکہ اہم موقع پر احقر کو بھیج دیا کرتے تھے''۔(۴۵)

ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری لکھتے ہیں:

''اور ۱۹۴۷ء کے آخر تک جو وقت آیا تھا، اس میں ہر صبح وشام کو ان کی ذمہ داریوں اور مصروفیتوں میں اضافہ ہوتا رہا تھا اور آخر میں تو یہ اہتمام اتنا بڑھ گیا تھا کہ جب وہ جمعیۃ کے دفتر سے نکلتے تو جان کو پہلے اپنی ہتھیلی پر رکھ لیتے تھے''۔(۴۶)

۱۹۴۷ء کے بعد ہنگامہ خیز اور قیامت افشاں حالات میں مولانا میاں کی خدمت کے حوالے سے مولانا مسعود عزیز ندوی لکھتے ہیں:

''اس پر آشوب دور میں جب کہ مسلمان خود کو بے یار و مددگار پا رہے تھے، اس موقع پر مولانا حفظ الرحمان سیوہارویؒ کے ساتھ معاون کے طور پر مولانا سید محمد میاں نے جو خدمات انجام دیں، وہ ہندوستان کی تاریخ میں سنہری حروف میں لکھی جائیں گی۔ اکابر علماء نے اس فتنہ سے مسلمانوں کو بچانے میں جان کی بازی لگادی اور سر ہتھیلی پر رکھ کر خدمات انجام دیتے رہے''۔(۴۷)

جمعیۃ علماء فتنۂ ارتداد کے مقابلہ میں اور مولانا سید محمد میاںؒ کی قربانیاں

آزادی کے بعد ملک کی صورت حال کچھ اس طرح ہوئی کہ مسلمان دہشت اور خوف کے سایہ میں تھے، احساس کمتری نے ان کے اندر مضبوطی کے ساتھ اپنے پاؤں جما لیے تھے، جس کی وجہ سے بہت سے ایسے علاقوں میں جہاں مسلمانوں کی تعداد بہت کم رہ گئی تھی، جیسے ہریانہ، پنجاب اور میوات وغیرہ وہاں بڑی تعداد میں مسلمان ڈر کی وجہ سے مرتد ہو گئے تھے، بہت سوں نے ہندوؤں کی طرح چوٹیاں بھی رکھ لی تھیں۔ جمعیۃ علماء ہند اور اس کے ارکان بالخصوص مجاہد ملت اور مولانا سید محمد میاںؒ وغیرہ نے ان مسلمانوں سے خوف و دہشت دور کرنے، احساس کم تری سے ان کو باہر کرنے اور دوبارہ حلقہ بگوش اسلام کرنے اور بقیہ مسلمانوں کے دین وایمان کی حفاظت کرنے اور آئندہ نسل کو ارتداد والحاد سے محفوظ رکھنے

کے لیے بڑی بڑی قربانیاں دی ہیں۔مولانا سید محمد میاںؒ نے ان علاقوں کے اسفار کیے، جب کہ وہ علاقے مسلمانوں کے لیے بالکل غیر محفوظ تھے۔مولانا نور عالم خلیل امینی رقم طراز ہیں:

’’ ملک کی آزادی کے بعد جہاں مسلمان تھوڑی تعداد میں رہ گئے تھے، وہاں ارتداد کا شدید خطرہ پیدا ہوگیا تھا، ان مسلمانوں کو مسلمان باقی رکھنا بڑا نازک مسئلہ بن گیا تھا۔ آپ نے اس سلسلے میں بڑا بنیادی کردار ادا کیا۔ راجستھان، میوات، ہماچل پردیش اور مشرقی پنجاب کے دور دراز علاقوں میں شب وروز دورے کیے، دینی مکاتب قائم کیے، ان مسلمانوں کو دینی معلومات بہم پہنچائیں، انھیں حکمت عملی سے اسلام کی قیمت و اہمیت بتائی۔اس سلسلے میں بعض ایسی جگہوں کا سفر کیا جہاں جانا بڑی ہمت اور عزیمت کا کام تھا۔ان کے کمزور جسم میں آہنی ارادے کا ایک بہت طاقت ور انسان نہ ہوتا تو وہ ہرگز یہ مہم انجام نہیں دے سکتے تھے، انھوں نے اس سلسلے میں متعدّد رفقاے کار کو کام پر لگایا اور ان کی وفکری تربیت کی، اس طرح ان گنت مسلمانوں کو ارتداد سے بچایا۔ یہ ان کے دینی وملی کارناموں میں بڑا تاریخی کارنامہ ہے‘‘۔(۴۸)

جمعیۃ علماء کا دینی تعلیمی پروگرام اور مولانا سید محمد میاںؒ کی کاوشیں

جمہوری ہندوستان تیزی کے ساتھ نئے افکار ور جحانات کی طرف بڑھ رہا تھا اور یہ خیال ایک قطعی فیصلہ کی شکل اختیار کر چکا تھا کہ ملک کی اتنی بڑی آبادی کو جہالت وپس ماندگی سے نکالنے کے لیے دنیوی تعلیم کی عام اور جبری اشاعت ضروری ہے۔ یہ نظریہ قابل تحسین تھا؛ لیکن اس میں یہ خطرہ بالکل یقینی تھا کہ جب مسلمان بچے دنیوی لازمی تعلیم کا حصہ ہوں گے تو وہ دین کی تعلیم سے اور نتیجتاً دین سے دور ہو جائیں گے؛ کیوں کہ جمہوری ملک کی سرکاری تعلیم میں کسی مذہب کی تعلیم نہیں دی جاسکتی تھی، نیز ایسی مسموم ذہنیت کے افراد کی بھی کمی نہیں تھی، جو سرکاری نصاب تعلیم کو جمہوری اور دستور ہند کی منشا کے خلاف اکثریت کے مخصوص مذہبی رجحانات میں رنگنے لگے تھے اور ایک خاموش کوشش شروع ہوچکی تھی کہ نصاب تعلیم کے ذریعہ آنے والی نسل کا ابتدا ہی سے اس طرح ذہن ڈھالا جائے کہ وہ اسلامی

عقائد ونظریات سے دور ہو جائیں۔ ایسے ناسازگار حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے جمعیۃ علماء ہند نے اپنے سالانہ اجلاس منعقدہ لکھنؤ (۱۹۴۹ء) میں دینی تعلیم کی مہم کو اپنا سب سے اہم پروگرام قرار دیا (۴۹) اور ملک گیر پیمانہ پر دینی تعلیمی تحریک مہم کو برپا کرنے کا عزم کیا، تاکہ مسلمانوں کے دل میں دینی تعلیم کی اہمیت کو جاگزیں کی جائے اور ان کی نسلوں کے دین و ایمان کی حفاظت کی جا سکے اور ملک کے طول وعرض میں بیسیوں کامیاب اجتماعات کیے۔

اس کے لیے یہ بھی ضروری تھا کہ ایک مختصر اور سہل دینی نصاب مرتب کیا جائے جو کم سے کم وقت میں مسلمان بچوں کو دین کے مبادیات، عقائد، احکام اور اخلاق سے آراستہ کرے اور یہ ذمہ مولانا سید محمد میاںؒ نے بحسن وخوبی انجام دی۔ نصاب تیار کیا اور دینی تعلیم کے رسالے لکھے اور تعلیم کو آسان سے آسان تر بنانے کے طریقے متعارف کروائے۔ مولانا انیس الحسن اپنے مقالہ میں تحریر کرتے ہیں:

> ''جمعیۃ نے اپنے سالانہ اجلاس منعقدہ لکھنؤ (۴۹ء) میں دینی تعلیم کی مہم کو اپنا سب سے اہم پروگرام قرار دیا اور اس کے خدام اس مہم کی ساخت و پرداخت میں لگ گئے۔ مجوزہ نصاب کی تدوین وترتیب کی سعادت اکثر وبیشتر حضرت مولانا محمد میاں صاحب کے حصہ میں آئی اور ملک گیر پیمانہ پر اس مہم کو برپا کرنے کا شرف مجاہد ملتؒ کو حاصل ہوا''۔ (۵۰)

مولانا نور عالم خلیل امینی لکھتے ہیں:

> ''اسی طرح آزادی کے بعد کے مرحلے میں مسلمانوں کی نئی نسلوں میں دین کی حفاظت اور عقیدہ اسلام پر انھیں برقرار رکھنا بھی دینی وملی فریضے میں بنیادی حیثیت کا کام تھا، جمعیۃ علماے ہند نے اپنے سولھویں اجلاس منعقدہ لکھنؤ ۱۶ تا ۱۸/ اپریل ۱۹۴۹ء میں دینی تعلیم پر ارتکاز کو اپنا بنیادی پروگرم قرار دیا اور اس مہم کو انجام دینے کی ذمے داری آپ ہی کے ذمے کی گئی۔ آپ نے نہ صرف اسے مطلوبہ معیار پر انجام دیا بلکہ اس کے لئے نصابی رسالے بھی مرتب فرمائے، جو ''دینی تعلیم کے رسالے'' کے نام سے بہت مشہور ومقبول ہوے اور آپ کی میزان حسنات میں گراں قدر اضافے کا

باعث بنے''۔(۵۱)

جمعیۃ علماء ہند کا منصوبہ''شرعی پنچایتوں کا نظام''اور مولانا محمد میاںؒ کی خدمات

محکمہ قضا ایسا ضروری محکمہ ہے کہ اس کے بغیر مسلمانوں کی سماجی زندگی کو اسلامی زندگی کہنا سراسر غلط ہے اور ایک بے معنی لفظ ہے؛ اسی لیے قاضی کے تقرر کو واجب قرار دیا جاتا ہے، جس کے لیے جدوجہد کرنا مسلمانوں پر واجب اور لازم ہے، جدوجہد نہ کریں تو سب گنہگار رہیں؛ مگر اس واجب کی ادائیگی کے لیے حکومت کے تعاون کی ضرورت ہے؛ لیکن بدرجہ مجبوری (یعنی حکومت کے تعاون نہ کرنے کی صورت میں) ان مسائل کا حل ایسی کمیٹیوں اور پنچائتوں کے ذریعہ ہوسکتا ہے، جن کو''شرعی پنچایت'' کہا جاسکے۔(۵۲)

چنانچہ شرعی پنچایت کی اسی اہمیت کے پیش نظر جمعیۃ علماء ہند اپنے اجلاسوں کی تجاویز میں بار بار مسلمانوں کو''شرعی پنچایت'' کے قیام کی طرف توجہ دلاتی رہی ہے اور جب جمعیۃ علماء ہند نے اپنے اجلاس اجین منعقدہ ۹ تا ۱۱/ دسمبر ۱۹۶۰ء میں شرعی پنچایتوں کے نظام کو جاری کرنے کا فیصلہ کیا (۵۳) تو مولانا میاںؒ نے ہی اس کا ضابطہ عمل، اختیارات و فرائض اور احکام تیار کیے۔(۵۴)

مولانا سید محمد میاںؒ نے شرعی پنچایت کے لیے یہ ضابطہ عمل حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ (۱۲۸۰ھ=۱۸۶۳ء/۱۳۶۲ھ=۱۹۴۳ء) کی کتاب'' الحیلۃ الناجزۃ للحلیۃ العاجزۃ'' کی روشنی میں مرتب کیا تھا، پھر اس کا مسودہ حضرت مولانا نظام الدینؒ (متوفی ۱۴۲۰ھ = ۲۰۰۰ء) سابق مفتی دارالعلوم دیوبند اور حضرت مولانا شاہ عون احمدؒ پھلواری شریف کی خدمت پیش کیا اور ان حضرات کے نظر ثانی کے بعد ہی اسے شائع کیا گیا۔ چنانچہ مولانا سید محمد میاںؒ تحریر فرماتے ہیں:

> ''اللہ تعالی بے حد و بے حساب رحمتیں نازل فرمائے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی، شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی اور ان کی رفقاء و معاون حضرات پر اور ان کی مدارج بلند کرے کہ ان حضرات نی خود اپنی تحقیق و تفتیش کی علاوہ

حرمین شریفین کے ارباب فتوی علماء سے مراسلت کر کے ایسا ذخیرہ مرتب فرمادیا ہے، جو مسلم پرسنل لا سے متعلق ان اہم مسائل میں شمع ہدایت اور مشعل راہ ہے، جو ''الحیلۃ الناجزۃ للحلیۃ العاجزۃ'' کے نام سے بار بار طبع ہو کر حضرات علماء کرام کی قبولیت حاصل کر چکا ہے۔ یہ مقبول ومستند ذخیرہ ہی اس ضابطہ عمل کی بنیاد ہے؛ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ ضابطہ عمل اسی ذخیرہ کی تشریح ہے، جو نمبروار دفعات کی صورت میں مرتب کر دی گئی ہے''۔(۵۵)

جمعیۃ علماء ہند کی ایک یادگار خدمت

جمعیۃ علماء کے حوالے سے مولانا سید محمد میاںؒ کی خدمات کے تذکرہ کو احقر ان کی ایک یادگار اور ایسی خدمت پر ختم کرتا ہے، جس سے جمعیۃ علماء ہنوز استفادہ کر رہی ہے اور اب وہ جمعیۃ کا نشان اور اس کی پہچان بن گئی ہے اور وہ ہے جمعیۃ علماء ہند کا موجودہ پرشکوہ اور اہمیت کا حامل دفتر اور اس کی جگہ، جو مسجد عبد النبی کے احاطہ میں ہے۔ آزادی کے بعد دیگر بہت سی مساجد اور اوقافی جائدادوں کی طرح یہ مسجد بھی غیروں کے قبضہ میں تھی۔ مولانا سید محمد میاںؒ نے دیگر مساجد کی طرح اس مسجد کو بھی واگزار کرایا(۵۶) اور یہ مسجد ۲۱/فروری ۱۹۶۳ء کو جمعیۃ علماء کے حوالے کر دی گئی۔ آپ کی خواہش بھی تھی کہ جمعیۃ علماء کا صدر دفتر گلی قاسم جان سے منتقل ہو کر یہاں قائم ہو جائے اور یہ خواب حضرت فدائے ملت مولانا اسعد مدنیؒ (۱۳۴۶ھ = ۱۹۲۸ء/ ۱۴۲۷ھ = ۲۰۰۶ء) نے ۱۹۶۵ء میں شرمندہ تعبیر کیا۔(۵۷)

حواشی وحوالہ جات

(۱) مولانا سید محمد میاںؒ کس سنہ میں مدرسہ شاہی کے مدرس ہوئے، اس سلسلہ میں تحریروں میں کافی اختلاف پایا جاتا ہے(۱) مولانا مسعود عزیز ندوی نے اپنی کتاب ''تذکرہ مولانا سید محمد میاں صاحب دیوبندی'' میں مولاناؒ کی تحریر پیش کی ہے، جس میں لکھا ہے کہ آپ مارچ ۱۹۲۹ء میں مدرس ہوئے۔(ص:۴۱) (۲) جبکہ مفتی محمد سلمان صاحب منصور پوری لکھتے ہیں: ۱۹۲۸ء میں جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مرادآباد تشریف لائے (تحریک آزادی ہند میں مسلم علماء اور عوام کا کردار، ص:۲۲۱) اور مولانا نور عالم خلیل امینی کی ''پس مرگ زندہ'' میں شامل مولانا سید محمد

میاںؒ کی خودنوشت سوانح (ص:۹۵) اور مولانا معزالدین صاحب نے تاریخ شاہی نمبر (ص:۳۸۶، ۳۸۷) میں مولانا سید محمد میاںؒ کی تحریر کے حوالے سے یہی لکھا ہے، نیز مولانا معزالدین صاحب نے رجسٹر کارروائی اجلاس مجلس شوریٰ مدرسہ شاہی کے حوالے سے بھی لکھا ہے کہ مولانا ۱۳۴۷ھ (مطابق ۱۹۲۸ء) میں تدریسی خدمات پر مامور ہوئے۔(۳) مولانا اشفاق حسین قاسمی نے ندائے شاہی کے تاریخ شاہی نمبر میں لکھا ہے: آپ ۱۳۴۷ھ مطابق ۱۹۲۷ء میں مدرسہ شاہی میں مدرس کی حیثیت سے تشریف لائے۔(تاریخ شاہی نمبر، ص:۲۳۹)

غور کرنے اور تاریخوں اور واقعات کو آپس میں ملانے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ دوسری رائے ہی صحیح ہے۔ یعنی مولانا سید محمد میاںؒ ۱۹۲۸ء میں ہی جامعہ قاسمیہ شاہی مرادآباد کے مدرس ہوگئے ہیں؛ کیوں کہ (۱) مدرسہ شاہی مرادآباد کی تاریخی روداد میں بھی درج ہے کہ شوال ۴۷ھ (۱۳۴۷ھ مطابق ۱۹۲۸ء) سے حضرت مولانا محمد میاں صاحبؒ ناظم جمعیۃ علماء ہند نے بحیثیت ادیب و مدرس مدرسہ شاہی میں کام کا آغاز کیا۔ (تاریخ شاہی نمبر، عنوان مدرسہ شاہی کے ایک سو سترہ سال، از مفتی محمد سلمان منصور پوری، ص:۱۵۵) (۲) مولانا سید محمد میاںؒ نے لکھا ہے کہ یہ وہی زمانہ ہے جس میں سائمن کمیشن ناکام واپس ہوا ہے، اور تاریخی اعتبار سے یہ بات متعین ہے کہ یہ کمیشن ۳۱/ مارچ ۱۹۲۸ء کو واپس ہوا ہے۔(۳) اس باب میں مولانا مسعود عزیزی نے اپنی کتاب کا ماخذ، تاریخ شاہی میں موجود مولانا معزالدین صاحب کے مضمون کو ہی بنایا ہے، اکثر عبارتیں بھی بعینہٖ ہیں؛ لہٰذا غالب گمان یہ ہے کہ مولانا مسعود عزیزی کی کتاب اور مولانا اشفاق صاحب کے مضمون میں کاتب سے سہو ہوا ہو۔

لیکن تقریباً تمام ہی سوانح نگاروں نے یہ بات نقل کی ہے کہ مارچ ۱۹۲۶ء میں کلکتہ میں جمعیت کا اجلاس ہوا اور پھر اس کے بعد ہی مولانا مدرسہ حنفیہ آرہ ضلع شاہ آباد کے مدرس ہوئے اور مولانا نے وہاں تقریباً تین، ساڑھے تین سال تدریسی خدمات انجام دیں، جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ۱۹۲۹ء یا اس کے بعد ہی مولانا مدرسہ شاہی کے مدرس بنے ہیں، واللہ اعلم بحقیقۃ الحال!

(۲) شاہجہان پوری، ڈاکٹر ابوسلمان، مقالات سیاسیہ، فرید بک ڈپو (پرائیویٹ) لمٹیڈ نئی دہلی، ج:۲، ص:۲۹۔

(۳) سائمن کمیشن (Simon Commission) برطانوی حکومت نے ۱۹۲۷ء میں سات ممبران پر مشتمل ایک کمیشن تشکیل دیا، جس کا چیئرمین سر جوہن سائمن (Sir John Simon) تھا، کمیشن کا مقصد ۱۹۱۹ء میں بنے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ (Government of India Act of 1919) کی کارگزاری کی رپورٹ دینا، اور اس میں کچھ ترمیم اور اصلاحات کرنا اور ہندوستانیوں کو جزوی خودمختاری دینا تھا، لیکن پس پردہ

اس کا مقصد آزادی کی تحریک اور اس کے مطالبہ کو سرد کرنا تھا۔ کمیشن فروری ۱۹۲۸ء کو ہندوستان آیا، مگر ہر طرف اس کی مخالفت ہوئی، جس کی وجہ سے ایک مہینہ بعد ہی مارچ ۱۹۲۸ء کو نامراد واپس چلا گیا۔

(۴) جنگ عظیم اول جو برطانیہ اور جرمنی اور ان کے حلیف ممالک کے درمیان ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۸ء تک جاری رہی اور جس کا اختتام، خلافت عثمانیہ کے تاراج پر منتج ہوا۔ لہٰذا خلافت کی حمایت اور انگریزوں کی مخالفت میں ۱۹۱۸ء میں خلافت تحریک وجود پذیر ہوئی، جس کے بہت ہی شاندار نتائج ہندوستانی سیاست پر مرتب ہوئے، اس سے ہندو مسلم اتحاد کو تقویت ملی، کیونکہ برادران وطن، کانگریس اور مہاتما گاندھی نے بھی اس تحریک کی تائید کی اور اس کے جلسوں میں شریک ہوئے۔ اس تحریک سے ملکی سیاست میں بڑی تبدیلی پیدا ہوئی۔ اس نے برطانوی پروڈکٹس اور حکومت برطانیہ کے عہدوں اور ان کی امدادوں کا بائیکاٹ کیا، ترک موالات کا فتوی پورے ملک میں پھیلا گیا، جس سے تحریک آزادی میں ایک نیا جوش اور پرامید امنگ پیدا ہوئی۔

(۵) مختصر داستان حریت، مفتی عبدالحمید دانش قاسمی، ص: ۲۱۵۔

(۶) مولانا ابوالکلام آزاد اور مہاتما گاندھی نے ستیہ گرہ کا نظریہ پیش کیا اور مارچ ۱۹۱۹ء کو ممبئی میں ستیہ گرہ سبھا قائم ہوئی اور اس کا مقصد یہ تھا کہ حکومت برطانیہ کے قوانین کی مخالفت کرنا، عدم تشدد کے ساتھ سول نافرمانی کرنا۔ (مختصر داستان حریت، ص: ۲۰۸)

(۷) سوامی شردھانند، جو تحریک سول نافرمانی کا حصہ تھے، وہ دوران جیل حکومت برطانیہ کے آلہ کار بن گئے اور انھوں نے ۱۹۲۲ء میں شدھی سنگٹھن تحریک چلائی، جس کے ذریعہ انھوں نے بہت سے مسلمانوں کو مرتد بنادیا۔ یہ تحریک ملکانوں کے علاقہ سے شروع ہوئی اور ہزاروں ملکانوں کو مرتد بنادیا گیا؛ لیکن جمعیۃ علماء ہند نے اس تحریک (بلکہ تخریب) کا کامیاب تعاقب کیا اور تمام مرتدین کو دوبارہ حلقہ بگوش اسلام کیا۔ (تاریخ جمعیۃ علماء ہند، اسیر ادروی، ج: ۱، ص: ۶۳)

(۸) امینی، مولانا نور عالم خلیل، پس مرگ زندہ، ادارۂ علم وادب، افریقی منزل قدیم، نزد چھتہ مسجد دیوبند، یوپی، انڈیا، ایڈیشن ۱، ۱۴۳۱ھ مطابق ۲۰۱۰ء، ص: ۴۶۔

(۹) پس مرگ زندہ، ص: ۹۷۔

(۱۰) روز نامہ الجمعیۃ دہلی، خصوصی اشاعت، بموقع اجلاس بست وسوم جمعیۃ علماء ہند، ۵/مئی ۱۹۷۲ء، مضمون بعنوان: خود نوشت نوا، ص: ۱۲۹، ۱۳۰۔ بحوالہ تاریخ شاہی نمبر، ۱۹۹۲ء مطابق ۱۴۱۳ھ، مضمون مولانا معز الدین

صاحب، عنوان: مدرسہ شاہی کے عظیم محسن سید الملت مولانا سید محمد میاں دیوبندیؒ کی زندگی کے چند اوراق، ص: ٣٩٠

(١١) تفصیل کے لیے دیکھیں: مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمان سیوہاروی ایک سیاسی مطالعہ، ص: ١٤٢، مختصر داستان حریت، از مفتی عبد الحمید دانش، ص: ٢١٧، ٢١٨۔

(١٢) شاہجہان پوری، ڈاکٹر ابو سلمان، مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمان سیوہارویؒ ایک سیاسی مطالعہ، فرید بک ڈپو (پرائیویٹ) لمٹیڈ نئی دہلی، ٢٠١١، ص: ١٤٢، ١٤٣۔

(١٣) مختصر داستان حریت، ص: ٢١٨۔

(١٤) مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمان سیوہارویؒ ایک سیاسی مطالعہ، ص: ١٤٣، ١٤٤۔

(١٥) مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمان سیوہارویؒ ایک سیاسی مطالعہ، ص: ١٤٤، ١٤٥۔

(١٦) مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمان سیوہارویؒ ایک سیاسی مطالعہ، ص: ١٤٥۔

(١٧) مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمان سیوہارویؒ ایک سیاسی مطالعہ، ص: ١٤٥، ١٤٦۔

(١٨) تاریخ شاہی نمبر، ص: ٣٨٨۔

(١٩) شاہجہان پوری، ڈاکٹر ابو سلمان، مقالات سیاسیہ، فرید بک ڈپو (پرائیویٹ) لمٹیڈ نئی دہلی، ج: ٢، ص: ١٠۔

(٢٠) ادروی، اسیر، تاریخ جمعیۃ علماء ہند، شعبہ نشر و اشاعت جمعیۃ علماء ہند، ١٤٠٣ھ، ص: ١٤٨۔

(٢١) تاریخ شاہی نمبر، ص: ٣٨٨۔

(٢٢) مستفاد از: مقالات سیاسیہ ج: ٢، ص: ٢٥، ٢٦۔

(٢٣) تاریخ شاہی نمبر، ص: ٣٩١۔

(٢٤) ندوی، مفتی محمد مسعود عزیزی، تذکرہ حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب دیوبندیؒ، دار البحوث والنشر مرکز احیاء الفکر الاسلامی، مظفر آباد، سہارن پور، یوپی، ٢٠١٣ء/١٤٣٤ھ، ص: ٥٨۔

(٢٥) ہفت روزہ الجمعیۃ نئی دہلی، اکابر جمعیۃ علماء نمبر، نومبر ٢٠٠٨ء مطابق ذی قعدہ ١٤٢٩ھ، مرتب محمد سالم جامعی، ص: ١٠٠۔

(٢٦) تاریخ شاہی نمبر، ص: ٣٩٨۔

(٢٧) دیکھیں: پس مرگ زندہ، ص: ٤٨۔ إدارة المباحث الفقهية لجمعية علماء الهند، تعريب:

عبدالرزاق القاسمی، الناشر:إدارۃ المباحث الفقهية التابعة لجمعية علماء الهند، ١٤٣٨ھج/٢٠١٧ء،ص:٨۔

(٢٨)مزید کے لیے دیکھیں: مقالات سیاسیہ، ج:٢،ص:٦،١٠،١١۔

(٢٩)ہفت روزہ الجمعیۃ نئی دہلی، اکابر جمعیۃ علماء نمبر،ص:١٠٣۔

(٣٠) تذکرہ حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب دیوبندیؒ،ص:٦٥۔

(٣١) تذکرہ حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب دیوبندیؒ،ص:٦٧،٦٨۔

(٣٢)مقالات سیاسیہ، ج:٢،ص:١٣۔

(٣٣)پس مرگ زندہ،ص:٨٧

(٣٤) تاریخ شاہی نمبر،ص:٣٩٩۔

(٣٥)مقالات سیاسیہ، ج:٢،ص:١٣،١٤۔

(٣٦) تاریخ شاہی نمبر،ص:٣٩٩۔

(٣٧)مقالات سیاسیہ، ج:٢،ص:١٣،١٤۔

(٣٨) مقالات سیاسیہ ج:٢۔

(٣٩) تاریخ شاہی نمبر،ص:٤٠٠۔

(٤٠) آپ پانچ مرتبہ قید وبند کی آزمائشوں سے گزرے۔مولانا کا بیان ہے:’’کانگریس کا باقاعدہ ممبر بننے کے چند ہفتے بعد ہی احقر گرفتار ہوا،اس وقت حضرت مولانا سیّد فخر الدین احمدؒ سابق صدر جمعیۃ علماء ہند نے بھی احقر کا ساتھ دیا،اس کے بعد احقر ١٩٣٢ء میں پہلے دہلی پھر مراد آباد میں گرفتار ہوکر سزایاب ہوا، پھر ١٩٤٠ء میں یہ شرف حاصل ہوا،١٩٤٢ء کی تحریک میں آخری بار گرفتار ہوا‘‘۔(تاریخ شاہی نمبر،ص:٣٩٢)

(٤١)مولانا سید محمد میاں، اسیران مالٹا، الجمعیۃ بک ڈپو، گلی قاسم جان، دہلی ١١٠٠٠٦، اشاعت:١،١٩٧٦ء۔

(٤٢) تاریخ شاہی نمبر،ص:٣٩٥،٣٩٦۔

(٤٣) مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمان سیوہارویؒ ایک سیاسی مطالعہ،ص:٢١٦۔

(٤٤) مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمان سیوہارویؒ ایک سیاسی مطالعہ،ص:١٨٤۔

(٤٥) مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمان سیوہارویؒ ایک سیاسی مطالعہ،ص:١٩٨،١٩٩۔

(۴۶) مقالات سیاسیہ ج:۲،ص:۲۶۔
(۴۷) تذکرہ حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب دیوبندیؒ،ص:۹۶،۹۷۔
(۴۸) پس مرگ زندہ،ص:۴۷۔
(۴۹) ڈاکٹر رضی احمد کمال، جمعیۃ علماء ہند، دستاویزات مرکزی اجلاس ہائے عام (۱۹۴۸ء تا ۲۰۰۳ء) شعبہ نشر و اشاعت جمعیۃ علماء ہند، اشاعت:۲۰۰۴ء،ص:۸۴،۸۵۔
(۵۰) مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمان سیوہارویؒ ایک سیاسی مطالعہ،ص:۲۵۸۔
(۵۱) پس مرگ زندہ،ص:۴۸۔
(۵۲) مولانا سید محمد میاں، اسلامی معاشرہ کی بنیادی ضرورت شرعی پنچایت، جمعیۃ علماء ہند، دہلی،ص:۳۔
(۵۳) جمعیۃ علماء ہند، دستاویزات مرکزی اجلاس ہائے عام (۱۹۴۸ء تا ۲۰۰۳ء) ص:۲۹۸۔
(۵۴) تاریخ شاہی نمبر،ص:۳۹۷۔
(۵۵) اسلامی معاشرہ کی بنیادی ضرورت شرعی پنچایت،ص:۴۔
(۵۶) تذکرہ حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب دیوبندیؒ،ص:۹۶،۹۷۔
(۵۷) منصور پوری، محمد سلمان، ندائے شاہی کی خاص اشاعت، فدائے ملت نمبر، اشاعت دوم:۱۴۲۹ھ مطابق ۲۰۰۸ء، ناشر: جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مراد آباد،ص:۳۸۔

☆☆☆☆☆

مولانا سید محمد میاں اور جمعیت کے تعارف اور موقف کی ترجمانی میں ان کی مساعی کا جائزہ

کلیم صفات اصلاحی
رفیق دار المصنّفین، اعظم گڑھ

مولانا محمد میاں کا مختصر تعارف:

مولانا محمد میاں ہندوستان کی مایۂ ناز اور ممتاز درسگاہ دارالعلوم دیوبند کے نمایاں ترین فضلا میں تھے۔ ان کی شخصیت علم وفضل، سعی وعلم، زہد وورع سے عبارت تھی، اخلاق و شرافت کے اعلیٰ مقام پر فائز اور نمونۂ اسلاف تھے، مطالعہ وتحقیق، تصنیف وتالیف کا عمدہ ذوق تھا۔ تفسیر وحدیث، فقہ ومنطق، ادب وتاریخ، سیرت وسوانح، تعلیم وتعلم اور سیاست و مذہب سے ان کو خاص شغف تھا۔ ان کا طرزِ تحریر نہایت شگفتہ، دلنشیں اور سادہ تھا، رفعتِ خیال، افادیت، معنویت، جامعیت، وسعتِ مطالعہ، خوبیِ تجزیہ ان کی تصنیفات ومضامین کے اصلی جوہر ہیں، جس کے سبب وہ اپنے ہم عصر علما اور دانشوروں میں الگ مقام رکھتے ہیں۔ جرأت وہمت، بے خوفی، صبر واستقامت، بے لوثی، پاکیزہ نفسی، ایثار پسندی نے ان کی عالمانہ شان میں چار چاند لگا دیا تھا۔ مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی نے ان کے انتقال پر جو مختصر تحریر سپردِ قلم کی ہے اس سے مولانا محمد میاں کا مختصر مگر انتہائی جامع تعارف سامنے آ گیا ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''مولانا محمد میاں سے قارئین معارف بخوبی واقف ہیں، ان کی علمی وعملی خدمات محتاج تعارف نہیں، وہ ''در کفے جام شریعت در کفے سندان عشق'' کے قائل تھے۔

انہوں نے علمی شغف اور قومی خدمت کو اپنی زندگی میں سمو رکھا تھا۔ مطالعہ وتحقیق اور تصنیف وتالیف کے لیے سکونِ قلب اور فراغِ خاطر ضروری سمجھا جاتا ہے لیکن محمد میاں نے سیاست کے پرشور ہنگاموں اور قید وبند کی پریشانیوں میں یہ منزل طے کی ہے، انہوں نے نہ کبھی دار ورسن کا خوف کیا نہ آبلہ پائی کا گلہ، وہ مطالعہ میں مصروف ہوتے یا درس وتدریس میں منہمک یا خاندانی مشاغل میں مشغول، جیسے ہی جنگ آزادی کا بگل بجتا میدان میں نکل آتے اور اس کی ہر پریشانی خندہ پیشانی سے برداشت کرتے۔ وہ زندگی بھر اس روش پر چلتے رہے۔ سیاست کے ساتھ تقویٰ کا عمل بہت مشکل ہے مگر انہوں نے سیاسی زندگی کو پاکیزگی سے کبھی جدا نہیں ہونے دیا۔ ان کی خدمت بے لوث اور سیرت بے داغ تھی۔ جماعتی زندگی میں کشمکش عام ہوتی ہے، ہر شخص سیادت کا طالب ہوتا ہے لیکن ان کا دامن اس عیب سے پاک تھا، انہوں نے اپنے مفاد پر جماعت کے مفاد کو مقدم رکھا۔ اس راہ ایثار میں ہر پریشانی کو خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کرتے رہے۔ افسوس ہے کہ علم وعمل اور ایثار وخدمت کا یہ مجسمہ دنیا سے رخصت ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ انہیں اپنی رحمت سے سرفراز فرمائے اور دوسروں کو ان کی پاکیزگی اور پرخلوص زندگی کو نمونۂ عمل بنانے کی توفیق عطا فرمائے''۔

(معارف شذرات، نومبر ۱۹۷۵ء، ص ۳۲۴)

اس قدر عظیم الشان ہستی کی خدمات کا تعارف بھی بڑے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس کے شایان شان موجود نہیں ہے، ناقدری وبے توقیری کی اس سے بڑی مثال اور کیا ہوسکتی ہے کہ جس شخص نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ ملت وملک کی سربلندی کے لیے صرف کیا اور جس کی زندگی ایثار وقربانی اور جد وجہد کی نمونہ تھی، ملت نے اس کو فراموش کرنے میں دیر نہیں کی۔ اسیران مالٹا، مآثر شیخ الاسلام اور نقوش حیات میں جستہ جستہ ان کے متعلق مجمل معلومات ضرور موجود ہیں، تاہم ایسی پیکر عمل اور ہشت پہلو شخصیت کے علمی، ادبی، دینی، صحافتی اور سیاسی وعلمی کارناموں کے تفصیلی تعارف کے لیے کیا یہ ضمناً تذکرے

کافی ہیں، ان کی علمی شخصیت کا بھر پور مطالعہ تحقیقی دنیا پر قرض ہے، اس خصوصی سیمینار سے ممکن ہے اس داغ کی کچھ صفائی ہو جائے۔علمی دنیا کے لیے مقام مسرت ہے کہ ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہاں پوری نے اپنے وقیع علمی کام ''حضرت شیخ الاسلام کی سیاسی ڈائری، اخبار وافکار کی روشنی میں'' میں مولانا سید محمد میاں کے مختصر حالات بہم پہنچائے ہیں اور ان کے کارناموں بالخصوص ان کی سیاسی جدو جہد اور بصیرت سے واقفیت کا موقع فراہم کیا۔آج کے حالات میں ان کی شخصیت کا یہ پہلو نئی نسل کے سامنے آنا چاہیے تاکہ اس سے سبق حاصل کر کے وہ مفید سیاست کی منزلیں طے کریں۔ ہمارے پیش نظر اس کی جلد ہفتم اور اسی سے اس مقالہ میں خصوصی استفادہ کیا گیا ہے۔(۱)

مولانا سید محمد میاں کی تصنیفات ومقالات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں اعلیٰ پایہ کے مصنف ومقالہ نگار ہونے کے تمام گر موجود ہیں۔مختلف علوم وفنون پر انہوں نے تصنیفات یادگار چھوڑی ہیں، اس سے ان کے علمی ذوق کے تنوع کا اندازہ ہوتا ہے اور یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے ابتدا میں تصنیف وتالیف کا منصوبہ بنایا تھا اور اس کے تحت باقاعدہ کام بھی شروع کر دیا تھا، تاہم ان کی سیاسی اور ملی مصروفیتوں نے ان کے پیروں میں بیڑیاں ڈال دیں اور اپنے خاکہ کے مطابق وہ بہت زیادہ کام نہ کر سکے، تاہم جو کچھ کیا وہ لائق قدر ہے۔ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہاں پوری کے بیان کے مطابق ''ان کی ضخیم تالیفات ومختصر رسالہ جات تقریباً پچاس اور سیکڑوں چھوٹے بڑے مقالات اور دیگر تحریرات یادگار ہیں۔''(۲)

اس کے علاوہ چھوٹے بڑے گیارہ مستقل کتابچے جو پہلے اور پانچ طویل ومختصر مقالے ''ماہنامہ دارالعلوم'' دیوبند اور سہ روزہ ''زمزم'' لاہور میں شائع ہو چکے تھے۔ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہاں پوری نے اس کو حاصل کر کے نہ صرف الگ الگ مجموعہ تیار کیا بلکہ باقاعدہ اس کی تبویب، پیراگرافنگ، فہرست اور ذیلی سرخی قائم کی، اپنے علمی وتالیفی حسن ذوق کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کو الگ الگ ناموں سے بھی موسوم کر دیا ہے۔اس جدید ترتیب و

تدوین سے اس کی نوعیت الگ مستقل کتاب کی ہوگئی ہے۔ ہر مجموعہ کے شروع میں حسب ضرورت مجموعہ کی اہمیت وافادیت پر متعدد صفحات پر مشتمل پیش لفظ بھی تحریر کردیا ہے۔ مجموعہ کو مزید کارآمد اور مفید بنانے کے مقصد سے اس موضوع سے متعلق دیگر علما کے فکر انگیز مقالات بھی منسلک کردیے ہیں۔ اس پورے مجموعہ کو حضرت شیخ الاسلام کی سیاسی ڈائری کے ''مقالات سیاسیہ'' کے حصہ دوم کی شکل میں اہل علم کی خدمت میں پیش کردیا ہے، یہی حصہ ہمارے پیش نظر ہے۔ ان کے نام اس طرح ہیں:

۱۔ جمعیت علمائے ہند ایک تاریخی مطالعہ ۲۔ وطن- اس کی اہمیت اور وقت کے تقاضے ۳۔ ہندوستانی سیاست اور علمائے ہند، ۱۸۵۷ء کے بعد ۴۔ ہندوستانی سیاست اور اس کا تقابلی مطالعہ ۵۔ شرکت کانگریس کا جواز، تھانوی، عثمانی نقطہ نظر پر تنقید وتبصرہ کی ایک نظر ۶۔ مسلم لیگ کے دعاوی اور ان کی حقیقت- تحریک پاکستان کے پس منظر میں۔

ان تصنیفی وتالیفی خدمات کے علاوہ مولانا ۱۹۵۵ء میں مدرسہ شاہی کے مہتمم مولانا عبدالحق مدنی کے انتقال کے بعد اس کے منصب اہتمام پر بھی فائز ہوئے۔ مرادآباد کے دوران قیام میں ادارۂ حفظ الرحمٰن کی بنیاد ڈالی، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کے انتقال کے بعد جمعیت علمائے ہند کی نظامت کا فریضہ ایک عرصہ تک انجام دیا۔ جمعیت ٹرسٹ سوسائٹی کے صدر بھی رہے، تحریک آزادی کے نامور سپاہی ہونے کے سبب انہیں سنت یوسفی بھی ادا کرنی پڑی۔ ۱۹۲۸ء سے ۱۹۴۴ء تک چار مرتبہ مرادآباد میں اور ایک مرتبہ دہلی میں دار ورسن کی آزمائش سے گزرے۔ یہ بھی عام طور پر مشہور ہے کہ انہیں متعدد بار راجیہ سبھا کے الیکشن میں حصہ لینے بلکہ بلا مقابلہ منتخب کیے جانے کی پیشکش ہوئی مگر مولانا نے قبول نہیں کیا، البتہ ان کی سیاسی خدمات کے اعتراف میں انہیں جب سند ''تامیر پتر'' سے نوازا گیا تو قبول کرلیا۔ ۲۴/اکتوبر ۱۹۷۵ء کو ۶ بجے شام میں اپنے مالک حقیقی سے جاملے، دہلی میں مسجد عبدالنبی کے قریب دہلی دروازے کے باہر قدیم قبرستان میں ان کی تدفین عمل میں آئی۔ (۳)

جیسا کہ سطور بالا میں گزر چکا ہے کہ مولانائے محترم جمعیت علمائے ہند کے منصب

نظامت پر عرصہ تک فائز رہے، لہٰذا جمعیت کی قومی، ملی، سیاسی خدمات اور ہندوستان کی آزادی کے لیے اس کی کوششوں کا تعارف ان کے فرائض منصبی میں شامل تھا، اسی طرح جمعیت کے کاموں اور اس کے موقف پر اپنوں اور غیروں کی جانب سے اٹھنے والے اعتراضات کا مسکت اور مدلل جواب دینا بھی ان کے دائرۂ کار کے تحت تھا۔ مولانا نے اس ضمن میں اپنی ذمہ داریوں کو کس حد تک محسوس کیا اور کہاں تک اس سے عہدہ برآ ہوئے، اس کا جائزہ و مطالعہ آج کے مخصوص حالات کا تقاضا بھی ہے اور ضرورت بھی۔ اس سے ایک طرف تو مولانا کے عہد میں جمعیت کے کاموں کی نوعیت اور اس عہد کی سرگرمیوں کا اندازہ ہوگا، دوسری طرف اس وقت جب ملی، قومی، سیاسی اور دینی مسائل سر اٹھاتے تو جمعیت کس انداز سے ان کا مقابلہ کرتی تھی اور اپنا موقف اور رخ اس وقت کی حکومت کے سامنے کس طرح رکھتی تھی، معلوم ہوگا۔ اسی احساس کے تحت زیر نظر مقالہ میں مولانا سید محمد میاں کی جمعیت کے تئیں پیش کردہ خدمات و مساعی کا جائزہ مقصود ہے۔

جمعیت علمائے ہند کا تعارف:

جمعیت علمائے ہند کا پہلا اجلاس ۱۹۱۹ء میں امرتسر میں مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے زیر صدارت منعقد ہوا۔ ہندوستان کے علما نے ''جمعیت علمائے ہند'' کے نام سے ایک تنظیم قائم کی، جس کا مقصد تعلیم وتعلم، سیاسیات، مذہب واخلاق، تمدن ومعاشرت، اقتصادیات وغیرہ سے متعلق پیش آمدہ مسائل کا حل باہمی بحث وتمحیص اور تحقیق وتدقیق کی روشنی میں پیش کرنا تھا، تاکہ عام مسلمان اس راستہ پر عمل کر سکیں۔ مولانا سید محمد میاں نے اس سلسلہ میں بڑے محققانہ مقالات قدیم وجدید معلومات کی روشنی میں تحریر کیے ہیں اور اس ضمن میں جمعیت علمائے ہند کی شرعی اہمیت، جمعیت علما کی مذہبی عظمت، جمعیت علما کی اہمیت، جمعیت علما کا نصب العین، جمعیت کے اغراض ومقاصد اور خدمات کو موضوع بنایا ہے۔

جمعیت علما کی شرعی اہمیت کی نشاندہی مولانا انور شاہ کشمیری کے خطبہ صدارت کے بعض اقتباسات کے ذریعہ کی ہے، جس میں علامہ انور شاہ کشمیری نے خلفائے راشدین

حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ یہ حضرات وہ مسائل جس میں قرآن وسنت کی وضاحت نہ ہوتی تو زعما وعلمائے امت کو بلا کر مشورہ کرتے اور متفقہ رائے پر فیصلہ فرماتے۔(۴)

جمعیت علما کی مذہبی عظمت کے سلسلہ میں مولانا محمد حبیب الرحمٰن عثمانی کے خطبہ صدارت کے اقتباسات پیش کیے ہیں جس میں مولانا نے صاف طور پر لکھا ہے کہ اس کی مذہبی عظمت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ ابتدا سے آج تک ہندوستان کے اپنے اپنے میدانوں میں ممتاز علما اس کے ارکان اور اس کے اجلاسوں میں شریک اور اس کی تجاویز اور پالیسیوں کو مرتب کرنے والے رہے ہیں، اس کے اجلاسوں کی صدارت ایسے علما نے کی ہے جو ہندوستان ہی نہیں بلکہ عالم اسلام میں ممتاز مقام کے حامل ہیں، اس میں کل ۱۰ رعلما مولانا محمود حسن، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا عبدالباری فرنگی محلی، مولانا سید حسین احمد مدنی، مولانا سید سلیمان ندوی اور علامہ انور شاہ کشمیری وغیرہم کا نام لیا ہے۔

اس کے بعد جمعیت علما کی اہمیت کے عنوان سے ۲ صفحہ پر مشتمل ان ہی کا اقتباس نقل کیا ہے جس سے نہ صرف یہ کہ جمعیت کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے بلکہ اس کا دائرۂ کار بھی معلوم ہوتا ہے، فرائض اور ذمہ داریوں کی نشان دہی بھی ہوتی ہے۔ ذیل میں ان اقتباسات کے جستہ جستہ جملے نقل کیے جاتے ہیں۔

جمعیت علما کی اہمیت کے متعلق مولانا عثمانی کا یہ جملہ بہت اہم ہے کہ ''جمعیت علما کی اہمیت کو بس میں ایک ہی جملہ میں بیان کرسکتا ہوں اور وہ یہ کہ جمعیت عام مسلمانوں کی مذہبی رہنمائی کے لیے قائم ہوئی ہے''۔(۵)

آگے اس کی وضاحت میں یہ فرماتے ہیں کہ ''ایک مسلمان کی زندگی کا کوئی شعبہ مذہب سے مستغنی نہیں ہوسکتا، مسلمانوں کو ہندوستان میں رہ کر غیر مسلم اقوام سے معاملات پڑتے ہیں، ان کو ضرورت پڑتی ہے کہ اپنی ہم وطن اقوام کے ساتھ کیوں کر رہیں، شرعاً کس قسم کے معاملے کے مجاز ہیں اور گورنمنٹ کے ساتھ ہمارا کیا معاملہ ہونا چاہیے، پھر مسلمانان

عالم کے ساتھ ہمارے تعلقات کی نوعیت کیا ہے، ان کی ہمدردی یا تعاون وتناصر کے احکام کا تعلق ہم سے کس حد تک ہے''(٦) ظاہر ہے ان تمام امور ومعاملات میں غور وفکر کرکے رہنمائی کا فریضہ علما ہی انجام دے سکتے ہیں۔

اغراض ومقاصد جمعیت کی نشاندہی:

اغراض ومقاصد جمعیت علمائے ہند کی دفعہ۳ کے حوالے سے نشاندہی کی ہے۔ لکھتے ہیں:

''اسلامی نقطہ نظر سے ملت کی رہنمائی کرنا''۔

ا۔ اسلام، مرکز اسلام اور شعائر اسلام کی حفاظت اور اسلامی قوت کو نقصان پہنچانے والے اثرات کی مدافعت ۲۔مسلمانوں کے مذہبی اور وطنی حقوق اور ضروریات کی تحصیل وحفاظت ۳۔علما کو ایک مرکز پر جمع کرنا ۴۔ملت اسلامیہ کی شرعی تنظیم اور محاکم شرعیہ کا قیام ۵۔شرعی نصب العین کے موافق قوم اور ملک کی کامل آزادی ٦۔مسلمانوں کی مذہبی، تعلیمی، اخلاقی، معاشرتی، اقتصادی اصلاح اور اندرون ملک حسب استطاعت اسلامی تبلیغ واشاعت ۷۔ممالک اسلامیہ اور دیگر ممالک کے مسلمانوں سے اسلامی اخوت واتحاد کے روابط کا قیام واستحکام ۸۔شرعی حدود کے مطابق غیر مسلم برادران وطن کے ساتھ ہمدردی واتفاق کے تعلقات کا قیام۔(۷)

مذکورہ بالا مقاصد واغراض کو پیش نظر رکھ کر اس بات کی فی زمانہ جائزہ کی ضرورت ہے کہ جمعیت علمائے ہند کی موجودہ قیادت ان مقاصد کی تکمیل میں کس حد تک سرگرم ہے، مرکز اسلام اور شعائر اسلام پر ہونے والے حملوں کی مدافعت کا اس نے کیا منصوبہ بنایا ہے، علما کو ایک مرکز پر لانے کے لیے وہ کون سے قدم اٹھا رہی ہے، مسلمانان ہند کی اخلاقی بالخصوص ان کی اقتصادی حالت کو مستحکم کرنے کے لیے اس نے کیا کیا گیم پلان تیار کیا ہے۔ اگر ان چند مقاصد کی تکمیل یا ان کو روبہ عمل لانے کی تدبیریں اس نے اختیار کر رکھی ہیں تو یقیناً وہ قابل تحسین اور اپنے اسلاف کے قائم کردہ مفید اور بامقصد اصولوں پر عمل کرنے والی

جماعت ہے اور اس کی توقیر وعظمت کا اعتراف ملت کے ہر ہوشیار فرد کو کرنا چاہیے۔

جمعیت کی خدمات سے لوگوں کو آگاہ کرنا:

جمعیت کا قیام جن اغراض ومقاصد کے تحت عمل میں آیا تھا، ضروری تھا کہ ملت کو بتایا جاتا کہ وہ اپنے عزائم پر پوری ہوشیاری، دیانت داری اور مستعدی کے ساتھ سرگرم ہے، اس کی جانب سے کسی قسم کی کوتاہی یا غفلت نہیں ہورہی ہے، اس آگاہی و واقفیت اور ملت کو اس کی جاری خدمات سے بروقت روشناس کرنے کا ایک فائدہ تو یقینی طور پر یہ ہوتا تھا کہ اس کا تعاون کرنے والے حضرات مطمئن ہوجاتے تھے اور مزید معاونت کا ان کے اندر جذبہ پیدا ہوتا تھا، دوسرے اس عمل سے جمعیت کی بہتر کارکردگی کا نقش ان کے دل میں ثبت ہوتا تھا اور نتیجتاً جمعیت مزید مستحکم ہوتی تھی۔ چنانچہ مولانا سید محمد میاں نے اس مقصد کے تحت ''جمعیت علماء کیا ہے'' کے نام سے ایک کتاب کے دو حصے مرتب کر کے شائع کیے تھے۔ ان کے چند عناوین درج کیے جاتے ہیں تاکہ اس کی خدمات کی نوعیت اور دائرہ کار کا اندازہ ہوسکے:

> ''مختلف الخیال علماء کو ایک مرکز پر لانے کی کوشش، مشہور عالم پانچ سو علمائے کرام کے متعدد مسائل پر متفقہ فیصلہ کی ترتیب واشاعت، تحریک خلافت کی تائید و حمایت، مظلومین وشہدائے موپلا کی مالی امداد، انسداد فتنۂ ارتداد کی مؤثر تدابیر، سارداا یکٹ کی مخالفت، سائمن کمیشن کے خلاف اظہار رائے، نہرو رپورٹ پر تنقید، کانگریس کے ساتھ اشتراک عمل، صوبہ جات سرحد، سندھ کے استقلال کا مطالبہ، حج بل ومعلمین حج بل کی مخالفت، صوبہ سرحد کی اسمبلی میں شریعت بل کے نفاذ کی سعی، خلع بل، قانون انفساخ نکاح کی غیر شرعی ترمیمات کے خلاف جدو جہد، حدود شرعیہ کے اندر ہندو مسلم اتحاد کی تائید، واردھا تعلیم اسکیم میں اصلاح و ترمیم کی سعی، ہندو مسلم فسادات کے انسداد کی تدابیر، قربانی اور ذبیحہ گاؤ پر پابندی ہٹائے جانے کی سعی، ۱۹۴۲ء کی تحریک حریت میں مجاہدانہ خدمات، اسلامی کلچر کی

حفاظت کے ضروری وسائل وذرائع پر غور، سول میرج ایکٹ، آرمی بل، مرکزی اسمبلی کے شریعت بل میں ترمیم کی مخالفت''۔(۸)

اس فہرست عناوین سے جمعیت کے دائرۂ کار کا ایک نقشہ ذہن میں آجاتا ہے، اس سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ مولانا سید محمد میاں کے دور میں جمعیت کے کندھے پر ملک وملت کے جس قسم کے مسائل کے حل کی ذمہ داری تھی آج بھی چند ایک کو چھوڑ کر ملک میں تقریباً اسی قسم کے مسائل کا سامنا ہے بلکہ اس وقت تو ملت کی عام بے حسی، غفلت، عدم بیداری، جہالت، انتشار اور بے جمیتی کے سبب ہمارا وجود خطرہ میں ہے۔ مختلف مکاتب فکر کے علما آج بھی اسی طرح منتشر اور باہم جوتم پیزار، فتنۂ ارتداد کی ترقی یافتہ شکل گھر واپسی، لو جہاد اور دہشت گردی اور طلاق ثلاثہ، تعدد ازدواج اور حلالہ جیسے ہمارے شرعی مسائل میں حکومت کی مداخلت، مدارس کی تعلیم کو ملک مخالف قرار دینے، گئوکشی کے نام پر عام مسلمانوں کو بھیڑ کے ذریعہ قتل اور مسلمانوں کو برادران وطن کی نگاہ میں اچھوتی قوم ثابت کرکے ان سے الگ کرنے کی ناپاک مہم چھیڑی گئی ہے۔ بہرحال ملت کے سامنے درپیش چیلنجز کا پامردی سے مقابلہ کرنے کے لیے جس قسم کی چارہ جوئی اس سے پہلے کی گئی تھی، اس کی تفصیل مولانا سید محمد میاں کے قلم سے موجود ہے۔ جمعیت کی موجودہ قیادت کو اس کا مطالعہ کرنا اور اپنے مخلص پیشرؤوں کے اسوۂ حسنہ کو اپنانا ضروری ہے، تاکہ کارکردگی کو وہ متاثر کن بنا سکیں۔ اس میں شبہہ نہیں کہ جمعیت بعض ملی ذمہ داریوں کو ترجیحی بنیاد پر نبھا رہی ہے، دہشت گردی، ہندو مسلم فسادات، ماب لنچنگ، بابری مسجد، حکومت کے ذریعہ بعض شریعت مخالف بل کے خلاف اس کے اقدامات اور احتجاجات یقیناً قابل تحسین ہیں، بعض دوسری جماعتیں بھی حسب استطاعت اس سلسلہ میں سرگرم ہیں لیکن ملت کو جمعیت کے ہاتھ کو مضبوط کرنا چاہیے، اس کی قیادت یقیناً لائق اعتماد ہے، تاہم جمعیت کے اندر باہم اختلافات کی صدائے بازگشت جو کبھی کبھی اٹھتی رہتی ہے وہ اس کے پایۂ استحکام واستقامت کو متزلزل کرتی رہتی ہے اور اس کی صحت کے لیے مفید نہیں ہے، جمعیت کو اس پر قابو پانا

ہوگا۔

تحریک آزادی کے لیے جمعیت کی کوششوں کا تعارف:

وطن عزیز پر برطانوی قبضہ وتسلط کے خلاف آواز اٹھانا، اس کے خلاف سراپا احتجاج ہوجانا جمعیت کے بنیادی مقاصد میں شامل تھا۔ اس نے روز اول سے جنگ آزادی کی پرزور حمایت کی بلکہ عملاً اس میں شامل ہونا اپنا فریضہ قرار دیا۔ مولانا سید محمد میاں بذات خود اس میدان کے سرگرم سپاہی اور مجاہد آزادی تھے۔ انہوں نے نہ صرف یہ کہ اس میں عملاً حصہ لیا بلکہ اس کو دینی فریضہ سمجھ کر ''تحریک آزادی وطن'' کا قرآن وحدیث کی روشنی میں صحیح تصور پیش کیا، تاکہ یہ تحریک سیاسی کے ساتھ ساتھ مذہبی رنگ اختیار کر جائے اور جب کوئی تحریک مذہب سے جوڑ دی جاتی ہے تو اس کے مؤیدین اور اس سے وابستہ افراد کا نشہ دو آتشہ ہوجاتا ہے۔ چنانچہ مولانا سید محمد میاں نے ۱۷/دسمبر ۱۹۴۲ء کو ایک مختصر مضمون ضبط تحریر کیا، اس میں پہلے صاف طور پر لکھا کہ آزادی وطن ہر مسلمان پر فرض ہے، مغلوب ومقہور رہ کر غلامانہ زندگی پر قناعت کرنا اسلامی نقطہ نظر سے حرام ہے اور اس سلسلہ میں قرآن مجید کی متعدد آیتیں اور ترمذی اور مسلم شریف کی متعدد حدیثوں کے ٹکڑے استدلالاً پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''مسلمان اس لیے ہے کہ اپنی خدمات اور قربانیوں سے تمام انسانوں کو فائدہ پہنچائے، عدل وانصاف کے بہترین احکام وقوانین دنیا میں نافذ کرے، فسق وفجور اور ظلم وتعدی کی جڑیں اکھاڑ دے''۔(۹)

اس کے بعد برطانیہ کے ظالمانہ طرز حکومت کے متعلق لکھا ہے کہ اس نے بلاتفریق ہندو مسلمان ہندوستانیوں کے ذرائع معاش پر قبضہ کرکے ان کو بھوک اور افلاس کی آخری حد تک پہنچا دیا ہے، ہندوستانیوں کے علوم وفنون ختم کرکے اپنی زبان اور اپنے ملحدانہ خیالات کالجوں اور اسکولوں میں رائج کیے ہیں، جس کے نتیجہ میں ہندوستانیوں میں مذہب سے بیزاری پیدا ہورہی ہے، گوروں کو برتر اور ہندوستانیوں کو ذلیل وکمتر ماننے کی پالیسی اپنائی ہے، ہندوستانیوں کی نہ عزت محفوظ ہے نہ آبرو، اپنے وحشیانہ اور ظالمانہ اغراض ومقاصد کو

محفوظ رکھنے کے لیے ہندوستانیوں کو ان کی مرضی کے خلاف دوسری حکومتوں سے جنگ کرنے پر یہ حکومت مجبور کررہی ہے، اس کی ان پالیسیوں کے خلاف آواز اٹھانے والوں کو پھانسی یا قید وبند کی صعوبتیں جھیلنی پڑتی ہیں اور شیخ الاسلام اور مہاتما گاندھی جیسے ہمارے عظیم رہنماؤں کو بھی یہ حکومت غرور وتمکنت کے نشہ میں جیلوں میں ٹھونس دیتی ہے۔ لہٰذا ہر ایک مسلمان کا مذہبی اور اسلامی فرض ہے کہ اس ظالم حکومت کو ہٹا کر جلد از جلد عدل وانصاف کی حکومت قائم کرے، یہ بھی فرض ہے کہ برطانوی شہنشاہیت کے ہندوستانی نظام کو بیکار کرنے کی جدو جہد میں تعاون کریں، عدم تشدد کے اختیار کردہ اصولوں کی پابندی کرتے ہوئے ایسی رکاوٹیں پیدا کریں کہ حکومت کا کوئی کام نہ چل سکے، سرکاری تعلیمی ادارے، دفاتر، کارخانے، عدالتیں بند کردیں، ہڑتال کریں، جو ملازمین آڑے آئیں ان کا بائیکاٹ کریں، لگان اور ٹیکس نہ ادا کریں، بینکوں سے اپنا روپیہ واپس لے لیں، مکمل آزادی کے لیے گاؤں گاؤں، محلّہ محلّہ پنچایتیں بنادی جائیں وغیرہ وغیرہ۔(۱۰) آگے لکھتے ہیں کہ اس تمام تحریک میں عدم تشدد اور مقاومت بالصبر کے قرآنی اصول سے منحرف نہ ہوں۔(۱۱)

مولانا سید محمد میاں کی ان تحریروں سے امت مسلمہ کے ذہن میں آزادی کی اہمیت کا صحیح تصور قائم کرنے میں مدد ملی۔ گویا ان تحریروں سے ذہن سازی ہوئی اور تحریک آزادی کے لیے جمعیت کی کوششوں میں اس ذہن سازی کی ضرورت واہمیت سے کون انکار کرسکتا ہے، اس کے علاوہ انڈین نیشنل کانگریس کے ساتھ اشتراک عمل کو بھی جمعیت کی مجاہدانہ سرگرمیوں کا ایک بامقصد حصہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا، حالانکہ مسلمانوں کے ایک بڑے طبقہ نے اس کی مخالفت بھی کی تھی۔

جمعیت کی باضابطہ تشکیل ۱۹۱۹ء میں ہوئی لیکن اس کے اکابر اور بانیوں نے اس سے بہت پہلے ہی ہندوستان کی آزادی کے لیے جدوجہد شروع کردی تھی۔ چنانچہ مولانا سید محمد میاں کے مطابق ۱۹۱۲ء میں ترکوں کی حمایت، ۱۹۱۴ء میں ریشمی خطوط تحریک، ۱۹۱۶ء میں کابل میں ہندوستان کی آزاد گورنمنٹ کے قیام کی حمایت اور اس کے نتیجہ میں اس کے

بانیوں کی گرفتاری وغیرہ اس سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔مولانا محمد میاں کے بقول ۱۹۱۹ء میں جمعیت نے اپنے پہلے اجلاس میں تمام جماعتوں سے پہلے ہندوستان کی مکمل آزادی کو اپنا نصب العین قرار دیا،اس کے علاوہ ۱۹۲۰ء میں انگریزی حکومت اور فوج سے بائیکاٹ کا فتویٰ دینا، ۱۹۲۷ء میں سب سے پہلے سائمن کمیشن کے خلاف رائے اور اس کے بائیکاٹ کا فیصلہ کرنا، گاندھی جی کی نمک تحریک، سردار پٹیل کی قیادت میں چلائی گئی تحریک عدم ادائیگی لگان کی پرزور حمایت اور نیلام ہونے والی جائدادوں کے خریدنے کی ممانعت کا فتویٰ صادر کرنا، ۱۹۲۹ء سے ۱۹۳۳ء تک کانگریس کے دوش بدوش تحریک آزادی کے لیے لڑنا یعنی اس میں حصہ لینے کی پاداش میں گرفتاری، نظر بندی، ضبطی جائداد، جرمانے، ملازمت سے برطرفی اور لاٹھی چارج وغیرہ جیسی صعوبتوں کا برداشت کرنا، ۱۹۳۶ء میں کمیونل ایوارڈ کی مخالفت، کانگریس کے ساتھ انتخاب میں حصہ لینا، ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۴ء تک تحریک آزادی ہند میں کانگریس کے دوش بدوش لڑکر جمعیت کے ارکان کا ضبطی جائداد، جرمانے، نظر بندی اور قید کی مشکلوں کو جھیلنا، ۱۹۴۵ء میں تقسیم ہند، مطالبہ پاکستان کے خلاف متحدہ ہندوستان کی حمایت اور ۱۹۴۷ء سے آج تک فرقہ پرستوں کا مقابلہ کرتے ہوئے جمہوریت کی جڑیں مضبوط و مستحکم کرنے کے لیے جد وجہد کرنا ایسے کام ہیں جو تحریک آزادی کے لیے جمعیت کی کوششوں کو ثابت کرتے ہیں۔(۱۲)

اس کے علاوہ جمعیت کی خدمات کا وہ حصہ بھی قابل توجہ ہے جس کا تعلق کونسلوں، اسمبلیوں اور پارلیمنٹ میں پیش کیے جانے والے بلوں کے متعلق ہے۔مولانا سید محمد میاں نے اس سلسلہ کی خدمات کا تعارف بھی اپنی تحریروں میں کرایا ہے۔مولانا کی تحریر کردہ تفصیلات کا خلاصہ درج ذیل سطور میں پیش کیا جاتا ہے۔مولانا نے اس سلسلہ کو نمبر وار پیش کیا ہے، تاہم یہاں نمبر کے بجائے اس کا اختصار اپنے لفظوں میں پیش کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

۱۹۲۹ء میں مرکزی اسمبلی دہلی نے ساردا ایکٹ جس کی رو سے اسلام کے قانون

میں بے جامداخلت کرنے کی کوشش کی تھی، جمعیت نے اس کی مخالفت کر کے اس کو بے اثر کیا، ۱۹۳۰ء میں صوبہ سرحد اور ۱۹۳۵ء میں پنجاب شریعت بل پاس کرایا تاکہ یوپی کی طرح ان صوبوں میں ترکے رواج کے بجائے اسلامی قانون وراثت کے تحت تقسیم ہوں، ۱۹۳۱ء میں اس بل کی مخالفت کی جس سے حجاج پر بے جا پابندیوں اور حجاز وعرب کے اندرونی معاملات میں مرکزی حکومت کی مداخلت کا راستہ کھلتا تھا، قانون افساخ کا مسودہ مرتب کرا کر مرکزی اسمبلی میں پیش کرایا جو قانون بن کر عرصہ سے نافذ ہے، اس کے نتیجہ میں اس زمانے میں خودکشی، اغوا اور ارتداد جیسے جرائم میں مبتلا عورتوں کو نجات ملی، اسلامی اوقاف کی حفاظت کے لیے برطانوی دور حکومت میں ۱۹۳۲ء میں مسودہ قانون مرتب کر کے یوپی اور بہار کی کونسل میں قانون پاس کرایا، تقسیم ہند کے بعد یونین کے تمام ہی اوقاف خطرہ میں پڑ گئے ، اسمبلیوں کے ذریعہ مسلم اوقاف کے لیے کسی قانون بننے کا امکان معدوم تھا لیکن جمعیت کے سر براہوں کی محنت سے یہ گنجائش پیدا ہوئی کہ مرکزی حکومت اس صوبائی مسئلہ کے متعلق قانون بنائے۔ چنانچہ یہ جمعیت کی ہی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ ۱۹۵۴ء میں پارلیمنٹ نے یہ وقف ایکٹ منظور کر لیا، اس کے علاوہ امارت شرعیہ کا قیام، اسلامی کلچر کی حفاظت کے لیے ضروری وسائل، بہار میں اوقاف اسلامی کو ٹیکس سے مستثنٰی کرانا، شہدائے موپلا کی مالی امداد اور ان پر لگائے گئے الزامات کی تردید، اردو کے سلسلہ میں جدوجہد، عالم اسلام فلسطین، عراق، شام، ایران اور تیونس وغیرہ کی تحریکات آزادی کی حمایت وغیرہ (۱۳) وہ اقدامات اور کوششیں ہیں جو جمعیت نے برطانوی اقتدار کے دور میں کی ہیں اور یہ سب کی سب ایک طرح سے تحریک آزادی کو تقویت اور برطانوی تسلط کو ہندوستان سے بے دخل کرنے کے مقصد سے کیا گیا تھا۔

آزادی کے بعد کے ہنگامی حالات میں جمعیت نے کیا کیا؟:

جمعیت کے کاموں اور اس کی خدمات ومساعی کے تعارف کا شاید ہی کوئی گوشہ ہو جو مولانا سید محمد میاں کے نوکِ خامہ کی گرفت سے رہ گیا ہو۔ چنانچہ ۱۹۴۷ء میں آزادی کے حصول کے بعد ملک کے اندر جو شورش و ہنگامہ پیدا ہوا، قتل وغارت گری اور خون ناحق کا جو

سیلاب امنڈا ،ضرورت تھی کہ ایسی ستم آرا وظلم آگیں فضا میں مظلومین ومقہورین کے ہاتھوں کو تھاما جاتا ،ان کے زخموں پر مرہم پٹی کی جاتی ،ان کو پناہ دی جاتی ،ان کی حفاظت و صیانت کا انتظام کیا جاتا ، جمعیت نے اپنا فرض نبھایا اور آگے بڑھ کر مظلوموں کا ساتھ دیا۔

مولانا سید محمد میاں نے تاریخ کے اس المناک سانحہ کے دوران ہونے والی جمعیت کی سرگرمیوں کو اپنے مقالہ میں لکھ کر محفوظ کر دیا ، گوکہ ان واقعات کا تعلق آزادی کے بعد کے واقعات سے ہے،تاہم چونکہ ان کے پیچھے کارفرما عوامل واسباب کا جنم بطن حریت سے ہی ہوا تھا،اس لیے مولانا کی تحریر کردہ اس سلسلہ کی تصنیفات کا اختصار پیش کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔مولانا لکھتے ہیں:

''آزادی کے بعد مشرقی پنجاب ،دہلی اور یوپی کے مغربی اضلاع میں قتل و خونریزی کا سیلاب امنڈ پڑا تو جمعیت کے جاں باز اراکین کی حوصلہ مندانہ خدمات نے عام مسلمانوں کے اندر حوصلہ پیدا کیا اور انہیں کی جاں گسل کاوشوں کے سبب ان علاقوں میں مسلمانوں کی ایک نمایاں تعداد اور دینی تعلیمی ادارے باقی رہے،اس سیلاب کو روکنے ہی کے نتیجہ میں ہند یونین کے باقی مسلمان اس آفت سے محفوظ رہے،فساد زدہ علاقوں میں گھرے ہوئے مسلمانوں کو اپنی جان پر کھیل کر نکالنا ، دہلی ،گڑ گاؤں اور پلول میں مسلم پناہ گزینوں کے لیے کیمپ قائم کرنا،مسلمانوں کے خصوصی تعاون سے ان کے لیے کھانے پینے ،لباس اور جاڑوں میں لحاف وغیرہ کا انتظام کرنا،نیم سرکاری اداروں سے مل کر ہزاروں اغوا شدہ خواتین کو برآمد کر کے ان کے اعزا کے پاس پہنچانا، دہلی کے ہزاروں مکانوں کو شرڑ نارتھیوں سے محفوظ رکھنا ، بلوہ،قتل اور قاتلانہ حملوں کے جھوٹے الزام میں گرفتار ہزاروں مسلمانوں کی گلوخلاصی کے لیے قانونی امدادی کمیٹی قائم کرنا اور کسٹوڈین کی آفت سے نجات دلانا،شورش زدہ علاقوں میں تقریباً آٹھ لاکھ مسلمانوں کی بازآبادکاری کے لیے کوششیں، حکام ووزرا سے بار بار احتجاج اور موقع بہ موقع ان کی مالی امداد کرنا،مسلمان جب ان علاقوں میں آباد ہوئے تو ان سے مسجدیں،امام باڑے، تکیے اور وہ مزارات جہاں عرس ہوتا تھا،غیر مسلم حکومت ان

کومسلمانوں سے خالی کرارہی تھی ، ایسے نازک حالات میں اختلاف عقیدہ ومسلک کے باوجود جمعیت کا حکومت سے اجازت دلوانا اور مسلمانوں کے شہری حقوق بحال کرانا، اس کے علاوہ مارچ ۱۹۴۸ء میں گودھرا میں دو ہزار پانچ اور چار منزلہ عمارتوں کو نذر آتش کیا گیا، جس میں مسلمانوں کی کروڑوں املاک تباہ ہوئیں ، ریاست جونا گڑھ کے خاتمہ کے بعد سوراشٹر (کاٹھیا واڑ) کے لاکھوں مسلمانوں کا ناطقہ بند کیا گیا ، ۱۹۴۸ء میں حیدرآباد کے خلاف پولیس ایکشن لیا گیا، دسمبر ۱۹۴۹ء میں مغربی بنگال، آسام میں لاکھوں مسلمان فسادات سے برباد کیے گئے اور جس کے شعلے یوپی یہاں تک کہ دہلی تک مارچ ۱۹۵۰ء میں پہنچ گئے ، یہاں تک کہ سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ہندوستان کے ان تمام صوبہ جات میں جہاں مسلمان اقتصادی لحاظ سے بہت مستحکم تھے، فرقہ وارانہ فسادات کرائے گئے اور مسلمانوں کی رہی سہی پونجی برباد کی گئی ، بھوپال ، مبارک پور، لاہر پور، فیروز آباد وغیرہ میں باقاعدہ کھل کر مقامی حکام اور پولیس نے فرقہ پرستوں کی پشت پناہی کی اور ساتھ دیا تو جمعیت نے ان خطرناک حالات میں مسلمانوں کی غم خواری کی ،حکومت کو احساس فرض پر آمادہ کیا، ذمہ دار وزرا کے سامنے غیر ذمہ دار افراد کی غلطیوں کو پوری قوت اور بے باکی سے رکھا اور بتایا کہ مسلمان اس ملک میں کسی کے دست نگر بن کر نہیں بلکہ پورے وقار کے ساتھ رہیں گے اور مقامی طور پر برادران وطن سے اپنے تعلقات خوش گوار کر کے جذبہ رواداری کی نئی طرح ڈالیں گے، اس سے عام مسلمانوں کے حوصلے بلند، جذبات بیدار اور ہمت کو تقویت ملی اور روشن مستقبل کی چمک ان کی نظروں میں پھرنے لگی۔ پھر ۱۹۶۱ء کے بعد پوری منصوبہ بندی اور سازش کر کے مسلمانوں کو ملازمتوں، سرکاری اداروں، پارلیمنٹ، اسمبلی، لوکل باڈیز سے الگ بلکہ برطرف کرنے کی کوشش شروع ہوئیں اور مسلمانوں کی حق تلفی بیانگ دہل کی جانے لگی تو مولانا سید محمد میاں کے بقول جمعیت نے ''ہند یونین کے تمام مسلمانوں کا مشترکہ اجتماع'' کنونشن کیا، جس کے نتائج بڑی حد تک مفید رہے اور ارباب اقتدار کو محسوس ہوا کہ مسلمان عضو معطل اور قالب بے روح نہیں ہیں اور یہ کہ ان کو آسانی سے نظرانداز نہیں کیا جاسکتا''۔ (۱۴)

جمعیت کا مخصوص جھنڈا:

جمعیت کی تاریخ کا مطالعہ کرنے والے افراد اس سے بخوبی واقف ہوں گے کہ جمعیت نے اپنا ایک خاص جھنڈا متعین کیا تھا، آج بھی جمعیت کے مرکز میں اس کا منفرد جھنڈا لہراتا اور اس کے پروگراموں میں نظر آتا ہے۔ اس مخصوص جھنڈے کی ضرورت کیوں پیش آئی، جھنڈے کی کیفیت ونوعیت کیا ہو؟ شریعت نبویؐ میں جھنڈے کی کیا اہمیت ہے؟ جمعیت کی یہ تجویز کب روبہ عمل آئی اور جمعیت کے جھنڈے کی رنگت ونوعیت میں سنت نبویؐ کی کس قدر اتباع کی جاسکتی ہے؟ مولانا سید محمد میاں نے جمعیت کی اس مخصوص خدمت کو موضوع بنا کر اس پر محققانہ و عالمانہ گفتگو کی جو یقیناً مطالعہ کے لائق ہے۔ اس میں جھنڈے سے متعلق پیدا ہونے والے شکوک کا ازالہ بھی کیا ہے اور اس کی ضرورت کی نشاندہی بھی۔ مولانا فرماتے ہیں:

''جب سے دنیا میں قومی اور جماعتی نظام کا وجود ہوا، ایک ایسی چیز کو بھی ضروری سمجھا گیا جو اس قوم اور جماعت کی علامت ہو۔ جھنڈے کی ہزاروں صورتیں ہیں مگر اس کے اختیار وانتخاب میں قوم اور جماعت کے جذبات، عقائد یا تاریخی روایات کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔ مولانا محمود الحسن کی سرپرستی میں جب جمعیت نے منظّم شکل اختیار کی، عام مسلمانوں کی تنظیم کے لیے خلافت کمیٹی کا قیام اس سے قبل عمل میں آچکا تھا اور یہ زمانہ اس کے شباب کا عہد تھا، چونکہ دونوں جماعتوں کا لائحہ عمل ایک اور تقریباً کارکن بھی ایک تھے، اس لیے کسی جھنڈے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی لیکن گردش حوادث سے رفتہ رفتہ خلافت کمیٹی مضمحل پھر ختم ہوگئی اور جمعیت اکیلے میدان میں باقی رہی، جس کا مقصد حریت وطن اور ملت کے تحفظ کی خدمت انجام دینا تھا۔ یہاں جمعیت اور خلافت میں بنیادی فرق کی جانب اشارہ کردینا ضروری ہے۔ خلافت تحریک کے پیچھے پین اسلامزم اور جمعیت کے پیچھے قومی یکجہتی کا جذبہ تھا، خلافت تحریک ختم تو ہوگئی لیکن جمعیت کے قیام کے پیچھے قومی یکجہتی کا جو جذبہ تھا اس سے ملت اسلامیہ کو کس قدر فائدہ پہنچا، اس کا تجزیاتی مطالعہ بالخصوص آج کے حالات میں انتہائی

ضروری ہے۔ مسلم لیگ بلاشبہ ایک عرصہ سے موجود تھی لیکن بار بار آزمانے کے باوجود اس نے قیادت کا صحیح فریضہ انجام نہیں دیا اور وہ اپنی راحت پسندی اور عافیت کیشی کے دائرہ سے نہ نکل سکی، مسلم لیگ کی اس کمی کی جانب اشارہ مولانا محمد میاں نے مولانا شبلی کے درج ذیل حقیقت آمیز تبصرہ کے حوالہ سے کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''اس عرصہ میں اس کو بار بار آزمایا گیا، اس کی طرف تعاون کا ہاتھ بڑھایا گیا، اس کے پلیٹ فارم پر پہنچ کر مانوس کرنے کی کوشش کی گئی مگر افسوس واقعات نے یہی ثابت کیا کہ وہ فقرے غیر معمولی حقیقت افروز اور الہامی رنگ کے تھے جو ہندوستان کے بوڑھے مدبر علامہ شبلی نعمانی کے قلم سے سرزد ہوئے تھے:
>
> ''لیگ کی بنیاد کی پہلی اینٹ ٹیڑھی رکھی گئی، اس پر جو عمارت بنائی جائے گی ٹیڑھی ہوگی، لیگ کی پالیٹکس صرف یہ ہے کہ جو ملکی حقوق اور عہدے ہندوؤں نے حاصل کیے ہیں ان میں مسلمانوں کا حصہ معین کردیا جائے، یہ حقیقی پالیٹکس نہیں، حقیقی پالیٹکس گورنمنٹ کے رعایا سے مطالبہ کا نام ہے، اس جذبہ میں مذہب کی برابر قوت ہوتی ہے، اس قوت کے نہ ہونے کی وجہ سے مسلم لیگ کا ممبر کسی قسم کا نقصان اٹھانے کے لیے تیار نہیں ہوسکتا اور اپنے میں کوئی عزم اور دلیری نہیں پاتا''۔(۱۵)

بہر حال ۱۹۳۹ء میں جمعیت کی ممبر سازی کے عمل کے وقت جھنڈے کی ضرورت محسوس کی گئی اور ہر معاملہ کی طرح اسوۂ نبیؐ اور قرن اول کے مرکز کو پیش نظر رکھ کر اس معاملہ میں بھی یعنی جھنڈے کے رنگ و نوعیت پر غور و فکر اور تحقیق کی گئی تو معلوم ہوا کہ سرور کائناتؐ کا جھنڈا مربع تھا، دھاری دار تھا، سفید و سیاہ دھاریاں تھیں، سیاہی سفیدی پر غالب تھی۔ جمعیت کی مجلس عاملہ نے انہیں اوصاف کو جھنڈے کی خصوصیت قرار دیا، البتہ تمام ہندوستان کی تنظیموں کے جھنڈوں میں یکسانیت پیدا کرنے کے لیے پٹیوں کی تعداد اور ان کے باہمی تناسب کو بھی بیان کردیا تاکہ تمام کارکن ایک وضع پر کاربند ہوسکیں۔(۱۶)

جمعیت پر ناواجب اعتراض کا جواب:

جیسا کہ سطور بالا میں گزر چکا ہے کہ جمعیت کی پالیسی، اس کے کاموں اور ملک و

ملت کے تئیں اس کے اختیار کردہ موقف پر اگر کسی نے اعتراض کیا تو مولانا سید محمد میاں نے ایک بیدار مغز کارکن کی حیثیت سے اس کا انتہائی مدلل، سنجیدہ اور مسکت جواب دینے کی کوشش کی، اسلوب میں کرختگی وسختی کے بجائے نرمی کو راہ دی تاکہ معترض کو تشفی ہو جائے اور اس کو مزید غلط فہمی کی اشاعت کا موقع نہ ملے۔

جمعیت نے بلا تفریق مسلک ومکتب فکر ہندوستان کے تمام علما کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کی شروع دن سے پالیسی بنائی ہے اور وہ اپنی اس پالیسی پر سختی سے عمل پیرا بھی ہے۔ اس کی خواہش ہے کہ اس کا دائرہ وسیع اور تمام مکاتب فکر کے علما پر حاوی ہو لیکن خود دوسرے مکتب فکر کے علما کی بے توجہی اور غفلت اور دیوبندی فکر کے علما کی اس تنظیم سے بڑھی ہوئی الفت ومحبت اس کو خاص رنگ میں رنگتی جا رہی ہے، اس میں قصور معترضین کا ہے نہ کہ اس کے منتظمین کا۔ چنانچہ ۱۹۴۵ء میں مولانا محمد عبدالرحمٰن مشہور اہل حدیث عالم نے ''تیج'' دہلی میں مولانا سید حسین احمد مدنی کے نام خط شائع کرایا جس میں یہ الزام تھا کہ جمعیت کے جلسوں اور کانفرنسوں میں اہل حدیث علما کو مدعو نہیں کیا جاتا، اس طرح علمائے اہل سنت والجماعت میں ایک تفریق اور خلیج حائل ہوتی جا رہی ہے اور رفتہ رفتہ جمعیت دیوبند بنتی جا رہی ہے۔ مولانا سید محمد میاں کے ساڑھے چار صفحے پر طویل جواب اور دفاع کا اختصار ملاحظہ فرمائیں:

> ''بے شک ان کانفرنسوں میں علمائے اہل حدیث کی عدم شرکت کا افسوس تو احقر کو بھی ہے مگر مولانا موصوف فرمائیں کہ خدام جمعیت علما کی یہ خواہش اسی وقت پوری ہو سکتی ہے جب ہر ایک خیال کے علمائے کرام بھی مساوی طور پر توجہ فرمائیں۔ پرانا طریقہ یہی تھا کہ کانفرنس کے موقع پر علما کو مدعو کر لیا جاتا تھا مگر جدید دستور العمل (منظور کردہ اجلاس جمعیت علمائے ہند منعقدہ مئی ۱۹۳۹ء، بمقام مرادآباد) نے جس طرح جمعیت علما کی ممبری کو ہر مسلمان کے لیے عام کر دیا ہے، اس کے انتخاب کو بھی عام ممبروں کے حوالہ کر دیا ہے، مقامی جمعیتیں آنے والے ابتدائی ممبر بناتی ہیں اور یہ عام ممبران مقررہ تاریخوں پر مقامی

جمعیت کا انتخاب کرتے ہیں، مقامی جمعیتیں جمعیت علمائے ضلع کے لیے ارکان
منتخب کرتی ہیں، پھر ضلعی جمعیت اور وہ نہ ہو تو مقامی جمعیت جس کا الحاق صوبہ سے
ہو کر مرکز کی مقرر کردہ تعداد کے مطابق ارکان منتخب کرتی ہے، ان انتخابات میں
مسلک اور عقیدہ کی کوئی قید نہیں ہے، اس مفہوم کی اپیلیں عام ممبر سازی کے
زمانے میں جمعیت کے عہدیداروں کی جانب سے اخبارات میں بار بار شائع کی
جاتی رہتی ہیں اور عام تقریروں میں بھی پوری قوت سے اس جانب توجہ دلائی جاتی
ہے۔ جمعیت اپنے دستور العمل پر پوری احتیاط کے ساتھ عمل پیرا ہے، اس کے
باوجود اگر کسی خیال کے علما کنارہ کش رہیں تو ذمہ داران جمعیت علما کو مخاطب
کرنے کے بجائے ان کے ساتھ افسوس میں شریک ہونا چاہیے''۔(۱۷)

جمعیت نے متحدہ قومیت کی حمایت اور تقسیم ہند کی مخالفت کی:

دو قومی نظریہ اصلاً انگریزوں نے اپنی سیاسی بقا اور مفاد کی خاطر پیش کیا تھا، جس کا
آلہ کار مسلمانوں کی معتد بہ تعداد ہوگئی۔ ہندوؤں کی بعض جماعتوں نے بھی دبے لفظوں اور
خفیہ طور پر اس لیے اس نظریہ کی حمایت کرنے کی کوشش کی تھی کہ ان کو اپنی قوم کی بقا اور قوت
کی ضمانت بھی اس میں نظر آ رہی تھی، لیکن صحیح بات یہ ہے کہ دونوں قوموں کی اکثریت اس
کے حق میں نہیں تھی، تاہم حالات ایسے بن گئے کہ ہندوستان برصغیر ہندو پاک کے دو ٹکڑوں
میں تقسیم ہو گیا اور اس ہندوستان کا خواب چکنا چور ہو گیا جو آزادی و تقسیم ہند سے قبل
ہندوستانیوں نے دیکھا تھا۔ جمعیت علمائے ہند نے اس پورے منظر نامہ میں مستقبل شناس
قیادت کا ثبوت فراہم کیا، اس نے دو قومی نظریہ اور تقسیم ہند کے بجائے متحدہ قومیت کی
حمایت اور مسلم لیگی نظریہ کی مخالفت کی اور سیاست میں اس عہد کی کانگریس کا ساتھ دیا جو
جمہوریت، قومی یکجہتی اور ہندو مسلم تہذیب کے فروغ کی قائل و حامی تھی۔ مولانا سید محمد میاں
نے اپنی متعدد تحریروں میں اس کے موقف کی پرزور اشاعت کا فریضہ انجام دیا ہے،
انہوں نے صاف طور پر لکھا کہ ''تقسیم ہند سے مسلمانوں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا، ان کا سراسر
نقصان ہوگا، اس لیے مسلمان یہ مطالبہ کر کے اپنے لیے بھلا نہیں کر رہے ہیں بلکہ

دوسروں کے آلہ کار بن رہے ہیں۔ بہر حال حضرات علما (ہند) اور قوم پرور مسلمانوں نے نہ دو قومی نظریے کی حمایت کی اور نہ اس کی بنا پر تقسیم کے مطالبہ کو جائز قرار دیا، انتہا یہ کہ آخر میں کانگریس اس مطالبہ کے سامنے سپر انداز ہوگئی لیکن جمعیت علمائے ہند نے تقسیم کے اس فلسفہ کو اس وقت بھی تسلیم کرنے سے انکار کر دیا (۱۸) اتنا ہی نہیں بلکہ جمعیت نے انتہائی جامع فارمولا پیش کیا جس کی جانب نہ صرف توجہ دی گئی بلکہ کانگریس کے اجلاسوں میں اس پر گرما گرم بحثیں بھی ہوئیں، اس فارمولے کے مطابق ہندوستان کی تمام قومیں اپنے عقائد و عبادات، مذہبی رسوم اور تہذیب و زبان میں آزاد ہوں گی اور حکومت ان میں مداخلت نہ کرے گی، دستور اساسی میں مسلم پرسنل لا کی حفاظت کے لیے خصوصی دفعہ مقرر کی گئی جس میں تصریح ہوگی کہ مقننہ اور حکومت کی جانب سے اس معاملہ میں کسی بھی طرح کی مداخلت نہ ہوگی، تمام بالغوں کو چاہے وہ کسی بھی ملت یا آبادی کے لحاظ سے کتنی ہی کم تعداد میں ہوں، حق رائے دہی دیا جائے گا، طریقہ انتخاب مخلوط ہوگا، طرز حکومت وفاقی ہوگا، ملازمتوں پر تقرر غیر جانب دار پبلک سروس کمیشن کی طرف سے کیا جائے گا، وغیرہ وغیرہ۔ (۱۹)

یہ اور اس قسم کے بہت سے دینی، مذہبی، ملی، سیاسی اور قومی مسائل و امور ہیں جن میں مولانا سید محمد میاں نے جمعیت کے خصوصی موقفوں کی وضاحت و تشریح اور اس کی خدمات و مساعی کو نہایت دلنشیں پیرایہ بیان میں بیان پیش کیا ہے۔ جمعیت کے وہ انتہائی سرگرم کارکن اور اس کے فکری شارح و ترجمان تھے، جمعیت کی ترجمانی جس بلیغ و مؤثر انداز میں انہوں نے کی، اس کی مثال مشکل ہی سے ملے گی۔ وہ اس کی پالیسیوں، ضابطوں اور سب سے بڑھ کر اس کی اس روح سے آشنا تھے جس کا خمیر ملک و ملت کی غیر جانب دارانہ ترقی کی فکر، اخوت و بھائی چارگی، قومی یکجہتی، ہندو مسلم اتحاد کی خوبی اور فرقہ واریت، جبر و تشدد، ظلم و جور، حق تلفی سے نفرت و عداوت کے جذبہ سے تیار ہوا تھا، وطن سے محبت، اس کے لیے ایثار و قربانی، اس کی ترقی و خوش حالی کے لیے ہر قسم کے تعاون، اس کی آن بان شان کے لیے مر مٹنے کو وہ جز و ایمان سمجھتے تھے۔ وسعت مطالعہ اور ملکی و قومی معاملات میں مسلسل غور و

فکر کرنے کے سبب ان کی سیاسی بصیرت بہت پختہ اور قابل قدر ہوگئی تھی، ساتھ ہی ملت اسلامیہ کے مذہبی، تہذیبی، معاشرتی اور شہری حقوق کی حفاظت وصیانت کا سودا بھی ان کے سر میں ہمیشہ سمایا رہتا تھا اور اس سلسلہ میں کسی بھی قسم کے سمجھوتہ پر راضی نہ تھے اور اس جانب سے پوری چوکسی برتتے تھے۔ ان کا علمی وسیاسی قد بڑا تھا لیکن انہوں نے ذاتی مفاد پر ہمیشہ قومی وملی مفاد کو ترجیح دی، ایک عظیم قائد کی سب سے بڑی پہچان یہی ہے۔ ان کی شخصیت کے یہ تمام پرتو اور پہلو جمعیت کے کاموں کے تعارف اور اس کے موقف کی ترجمانی پر مشتمل ان کی مذکورہ بالا تحریروں میں موجود ہیں۔ مولانا نے جمعیت کو جن خطوط پر آگے بڑھایا تھا اور اس کو ناگفتہ بہ حالات میں بھی ہندوستان کی ایک مؤثر جماعت بنانے کے لیے جو لائحہ اختیار کیا تھا، جمعیت کو مقبولیت کے جس بلند مقام پر فائز کرنے کے لیے کوشش کی تھی، ضرورت ہے کہ انتہائی گہرائی و دلچسپی سے ان کا مطالعہ کیا جائے تا کہ جمعیت اپنے موجودہ وقار میں اضافہ کرے اور اس کی آواز ملت اسلامیہ کی آواز سمجھی جائے۔

☆☆☆

(۱) حضرت شیخ الاسلام کی سیاسی ڈائری اخبار وافکار کی روشنی میں (جلد ہفتم، سلسلۂ مقالات)، مقالات سیاسیہ، حصہ دوم، تالیف وتدوین ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہاں پوری، ص۱۰، فرید بک ڈپو (پرائیویٹ لمٹیڈ، دریا گنج دہلی ۲۰۱۸ء۔ (۲) ایضاً، ص۱۱۔ (۳) درج بالا معلومات حضرت شیخ الاسلام کی سیاسی ڈائری حوالہ مذکور، ص۹ تا ۳۶ سے ملخصاً ماخوذ ہیں۔ (۴) تفصیل کے لیے شیخ الاسلام کی سیاسی ڈائری، جلد ہفتم، ص۴۱-۴۲ ملاحظہ فرمائیں۔ (۵) حوالہ مذکور، ص۴۵۔ (۶) ایضاً۔ (۷) ایضاً، ص۴۸۔ (۸) شیخ الاسلام کی سیاسی ڈائری، حوالہ مذکورہ، ص۴۹ تا ۵۱۔ (۹) شیخ الاسلام کی سیاسی ڈائری، حوالہ مذکورہ، ص۵۶۔ (۱۰) یہ تفصیلات شیخ الاسلام کی سیاسی ڈائری ص۵۶ تا ۶۰ سے ملخصاً ماخوذ ہیں۔ (۱۱) ایضاً۔ (۱۲) یہ تفصیلات شیخ الاسلام کی سیاسی ڈائری ص۶۴ تا ۷۶ سے ملخصاً ماخوذ ہیں۔ (۱۳) ایضاً، ص۷۷ تا ۷۹۔ (۱۴) دیکھیے شیخ الاسلام کی سیاسی ڈائری، ص۸۰ تا ۸۴۔ (۱۵) ایضاً، ص۹۰۔ (۱۶) ایضاً، ص۹۲-۹۳۔ (۱۷) ایضاً، حوالہ مذکور، ص۱۰۷-۱۰۹۔ (۱۸) ایضاً، ص۲۸۲۔ (۱۹) ایضاً، ص۲۸۳ تا ۲۸۵۔

فتنہ ارتداد کے انسداد میں
حضرت مولانا سید محمد میاں صاحبؒ کا کردار
جمعیۃ علماء ہند کے پلیٹ فارم سے

مولانا عمران اللہ غازی آبادی قاسمی، استاذ دارالعلوم دیوبند
imranqasmi78@gmail.com

وارثین علوم نبوت ،علماء اسلام کا یہ امتیاز رہا ہے کہ مذہب اسلام کی اشاعت، حفاظت، اور مدافعت کو وہ اہم ترین دینی فریضہ گردانتے ہیں، اس کی ادائیگی کے لیے زندگی کے قیمتی لمحات کو قربان کرنے، جان نچھاور کرنے اور مال لٹانے کو باعث سعادت بلکہ قابل فخر جانتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ جب اور جہاں بھی ضرورت پیش آئی حاملین علوم نبوت نے آگے بڑھ کر قربانیاں پیش کیں۔ تاریخ وسیر کے صفحات میں تابندہ نقوش کی صورت اختیار کئے گذشتہ زمانے کے بے شمار واقعات وحقائق کا مطالعہ یہ یقین دلاتا ہے کہ علماء کرام کی خدمت وقربانی کا یہ انداز اور بے لوث جذبہ اپنے اندر ایسا مستحکم تسلسل رکھتا ہے جس میں کبھی انقطاع واقع نہیں ہوا، ہندوستان ہی میں دیکھئے انگریزوں سے قبل کا زمانہ ہو یا انگلش دور استبداد، علماء کرام دین وملت اور وطن وقوم کی خدمت کے لیے ہر زمانہ میں سینہ سپر نظر آئیں گے۔ جب ۱۹۱۹ء میں جمعیۃ علماء کا قیام عمل میں آیا، تو اس کی تاسیس کے اغراض ومقاصد میں بھی یہی جذبہ کارفرما تھا اور اسی فکر کو وسعت دینے اور جدوجہد کے جذبہ کو منظم کر کے استحکام بخشنا پیش نظر تھا، چنانچہ اکابر جمعیۃ علماء وقت تاسیس سے آج تک اسی جذبہ کے ساتھ سرگرم عمل رہے، اور انہیں اغراض ومقاصد کے لیے ان کی زندگیاں وقف رہیں۔

جمعیۃ علماء کی ہمہ جہتی خدمات اور فتنہ ارتداد:

جمعیۃ علماء ہند نے ہر موقع اور ہر موڑ پر قوم وملت کی رہنمائی کے فرائض انجام دیئے ہیں، تاریخ جمعیۃ کا سرسری مطالعہ بتلاتا ہے کہ جمعیۃ کی خدمات ہمہ جہت اور متنوع ہیں، ان کا دائرہ بہت وسیع ہے، مذہبی وقومی خدمات کا کوئی گوشہ حتی الامکان جمعیۃ کے دائرۂ عمل سے خارج نہیں رہا ہے، ۲۳،۱۹۲۲ء میں آزادی سے قبل انگریز کے اشارے پر سوامی شردھانند نے دین سے ناواقف اور جاہل مسلمانوں میں شدھی سنگھٹن تحریک چلائی جس کا مقصد مسلمانوں کو دین اسلام سے برگشتہ کر کے آرین بنانا تھا، آرین مبلغین سادہ لوح مسلمانوں میں جاتے دین اسلام پر اعتراضات کر کے اس کو کمزور اور غلط ٹھہراتے پھر اپنے نظریہ کی ترجیح ثابت کر کے مالی لالچ وغیرہ کے ذریعہ اپنے مذہب کی تبلیغ کرتے تھے، یہ تحریک سوامی نے پہلے ملکانوں (ایک مخصوص برادری) میں شروع کی تھی اور ہزاروں ملکانوں کو مرتد بنادیا تھا، جب یہ تحریک چلی اور سادہ لوح مسلمان اس کا شکار ہوئے تو ارباب جمعیۃ نے اس کا ڈٹ کر مقابلہ کیا، اس وقت کے ناظم حضرت مولانا احمد سعید صاحب رحمہ اللہ اور صدر جمعیۃ حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب رحمہ اللہ نے مرتدین کے علاقہ میں مسلسل تبلیغی وفود بھیجے، یہ حضرات خود بھی تشریف لیجاتے، حالات کا جائزہ لیتے (تاریخ جمعیۃ اسیر ادروی ص ۶۳) اس طرح کے حالات سے نمٹنے کے لیے ارباب جمعیۃ نے ۹/۱۰ فروری ۱۹۲۲ء میں اپنی تنظیم کا ایک اجلاس منعقد کیا جس میں شعبہ تبلیغ کے قیام کو منظوری دی گئی اور متعدد تجاویز پاس کیں، نیز فتنہ ارتداد کی اہمیت اور اس کی مدافعت کی ضرورت کے متعلق اکابر قوم کی جانب سے تمام مسلمان ہندوستان کے نام ایک متفقہ اپیل شائع کرنے کی تجویز بھی منظور کی گئی۔ (جمعیۃ علماء کیا ہے ص ۶۲) اس وقت اکابر کی ان کوششوں سے تقریباً گیارہ ہزار سے زائد افراد توبہ کر کے دوبارہ اسلام میں داخل ہوئے، اور دو ہزار سے زائد غیر مسلم مذہب اسلام قبول کر کے مسلمانوں میں شامل ہوئے۔

ارباب جمعیۃ نے اس فتنے کے سدباب کے لیے ارتداد سے متاثرہ حلقوں میں متعدد افراد کو بطور مبلغ متعین کیا جن کا کام ان علاقوں میں گشت کرنا حالات پر نظر رکھتے ہوئے عوام

کو دینی مسائل واحکام سمجھانا اور شکوک وشبہات دور کرنا تھا، ان مبلغین سے کام لینے کے علاوہ جابجا شعبہ تبلیغ کی شاخیں قائم کی گئیں نیز اس علاقہ کے دیہاتوں میں ڈیڑھ سو سے زائد مکاتب قائم کیے گئے اس طرح رفتہ رفتہ اس فتنہ کا زور ٹوٹ گیا، جمعیۃ علماء کا یہ شعبہ بعد میں بھی مختلف النوع خدمات انجام دیتا رہا۔ (جمعیۃ علماء کیا ہے ج ا ص ۴۲)

حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب علیہ الرحمہ کا باضابطہ دلی میں قیام

حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب طویل عرصے سے مرادآباد کے معروف ادارے مدرسہ شاہی میں تدریس پر مامور تھے، مدرسی کے ساتھ تحریک آزادی اور جمعیۃ علماء کی خدمات میں سرگرم رہتے تھے، تحریک آزادی میں متعدد بار گرفتار بھی ہو چکے تھے اس وقت جمعیۃ کے ناظم حضرت مولانا حفظ الرحمان صاحب سیوہاری اکابر کے مشورے سے ان کو جمعیۃ کے اہم امور کی انجام دہی کے لیے دلی لے آئے، حضرت مولانا محمد میاں صاحب اس کا پس منظر اس طرح بیان کرتے ہیں:

''مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمان سیوہاری (ناظم عمومی جمعیۃ علماء ہند متوفی ۱۹۶۲ء) زمانہ اسارت میں احقر سے اتنے مانوس ہو گئے تھے کہ پھر احقر کو اپنی قید سے رہا کرنا گوارہ نہ کیا، ۱۹۵۲ء میں حضرت شیخ الاسلام کو ساتھ لے کر مرادآباد پہنچے اور مدرسہ شاہی کے مہتمم حضرت مولانا عبدالحق مدنی علیہ الرحمہ اور صدر مدرس حضرت مولانا فخر الدین صاحب علیہ الرحمہ سے اصرار کر کے مدرسہ شاہی سے اولاً چھ ماہ کی رخصت دلوائی اور دلی لے آئے، احقر کو سلسلہ درس ترک کرنا گوارہ نہیں تھا، چھ ماہ بعد میں واپس ہو گیا، لیکن اس کے چند روز بعد ۱۹۴۷ء کا ہنگامہ ہو گیا، ابتداء میں ہنگامہ کی یہ حالت تھی کہ دہلی میں کسی طرف سے بھی کسی مسلمان کا آنا خودکشی کے مترادف تھا لیکن جیسے ہی موقع ملا احقر دلی پہنچا اور یہاں آ کر محسوس کیا کہ اس وقت مجاہد ملت جو خدمت انجام دے رہے ہیں وہی بہترین خدمت اور افضل ترین جہاد ہے احقر نے دلی رہنے کا ارادہ کر لیا (روزنامہ الجمعیۃ اجلاس بست وسوم ص ۱۲۰، از مضمون خود نوشت بے نوا) اگر چہ آپ جمعیۃ علماء کے پہلے سے کارکن تھے مگر ۱۹۴۷ء میں باضابطہ دلی

میں قیام کر کے مستقل طور پر جمعیۃ کے خادم بن گئے۔اور اپنی مساعی کے ذریعہ جمعیۃ علماء ہند کی عملی خدمات کے ساتھ ساتھ اس کی تاریخ، طریقہ کار، اغراض ومقاصد کی ترتیب وتدوین کا عظیم الشان کارنامہ انجام دیا، نیز آپ کی زیر نگرانی جمعیۃ علماء نے دینی تعلیمی جو تحریک چلائی تھی وہ بھی آپ کے ہی متعین کردہ خطوط پر چل کر کامیابی سے ہم کنار ہوئی۔

۱۹۴۷ء کے خونچکاں ہنگامے

ہندوستان کی تاریخ میں ۱۹۴۷ء کے ہنگامے کسی سے ڈھکے چھپے نہیں ہیں، آزادی کے لیے چلنے والی تحریکیں اور آزادی کے بعد رونما ہونے والے فسادات، نقل مکانی میں ہونے والی تباہی انسانی کلیجے کو چیر دیتی تھی، ان لرزہ خیز ہنگاموں سے انسانیت چیخ پڑتی تھی، اس وقت سب سے دشوار گذار مرحلہ اور پریشانی کا سبب مشرقی ومغربی پنجاب اور پاکستان سے متصل علاقوں کی آبادی کے تبادلہ کا تھا، یہ فیصلہ چند ہندستانی چوٹی کے لیڈروں اور برطانوی ایجنٹوں نے ایسے خفیہ انداز سے لیا کہ ان کروڑوں انسانوں کو اس کی بھنک بھی نہیں لگنے دی جو اس فیصلہ سے متاثر ہونے والے تھے، چنانچہ دونوں طرف سے تبادلہ آبادی اور نقل مکانی کے عمل اور سازشی ٹولوں کے منصوبے کی وجہ سے مسلم مخالف فسادات بھڑک اٹھے اور نفرتوں تعصب کا ایسا قیامت خیز طوفان برپا ہوا گویا زمانہ بھر مسلمانوں کے خون کا پیاسا ہو گیا، مسلمانوں کے ساتھ قتل وغارت گری اور لوٹ مار ہونے لگی، صوبہ دہلی، یوپی کے مغربی اضلاع، اور پاکستانی سرحد سے ملنے والے علاقے خصوصا راجستھان کے بعض اضلاع اور پنجاب وہماچل کے بعض علاقے اس قتل وغارت گری کے سیلاب میں پوری طرح غرق ہو گئے۔

حضرات علماء کرام کی جدوجہد اور قربانیاں:

ہر طرف خونی کھیل جاری تھا اور مسلمان پاکستان منتقل ہونے میں مصروف تھے کہ عمائدین وقت واراکین جمعیۃ علماء ہند نے ہوشمندی کا مظاہرہ کیا وہ عزم واستقلال کی دیوار بن کر سامنے آئے اور ہمت وحوصلہ سے کام لیتے ہوئے انھوں نے مسلمانوں کو سمجھایا، تقسیم کے نتائج سے آگاہ کیا، ان کو ہندستان میں ہی رہ کر زندگی گزارنے کا حوصلہ دیا، پھر کیا تھا بندھے ہوئے

بستر، سازوسامان کھل گئے اور مسلمانوں کی کچھ تعداد ہندوستان میں باقی رہ گئی۔مغربی پنجاب، ہماچل پردیس، راجستھان کے وہ علاقے جن کی سرحد پاکستان سے ملتی ہے وہاں پرآبادی کا تبادلہ بکثرت ہوا تھا مسلم آبادی کی اکثریت پاکستان منتقل ہوچکی تھی ان مذکورہ علاقوں میں اوراطراف کے دیہات وقصبات میں صرف وہ مسلمان باقی رہ گئے جو اپنی غربت وافلاس اور معاشی مشکلات کی وجہ سے پاکستان جانہیں سکتے تھے۔

فتنہ ارتداد:

پاکستان کے علاقوں سے منتقل ہوکرآنے والے شرنارتھیوں کی کثرت، ان کی خوں ریزی اور فتنہ انگیزی، نفرت بھرے نعروں کی وجہ سے مسلم طبقہ خود اپنا مستقبل ہندوستان میں محفوظ نہیں سمجھتا تھا اس لیے اپنی زندگی بچانے اور اپنے مال اور بچوں کی جان بچانے کے لیے بعض سادہ لوح دینی تعلیم سے ناواقف معاشی اعتبار سے کمزور لوگوں نے تبدیل مذہب کی راہ اختیار کی، یہ تقریبا تین لاکھ کی تعداد تھی اگرچہ ان میں بعض کے دل اسلام کی سچائی کے معترف، اسلام سے محبت کرنے والے اور چھپ چھپ کرنماز ادا کرنے والے تھے۔

(جمعیۃ کا مختصر تعارف وفہرست خدمات جمعیۃ علماء ہند ص ۶)

اس طرح کے مشکل حالات اور تعلیم سے دوری کی وجہ سے ان علاقوں میں فتنہ ارتداد کو راہ مل گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے اس فتنہ نے ہماچل پردیش، مغربی پنجاب اور راجستھان کے بہت سے علاقوں کو اپنی چپیٹ میں لے لیا۔الور، بھرت پور اور گڑگاؤں ضلع کے تقریبا چار لاکھ میو اور غیر میو مسلمان ارتداد کے شکار ہوگئے، اسی طرح تحصیل ''بیاور'' علاقہ اجمیر کے متعدد دیہات کے تقریبا ایک لاکھ (مراتی اور چیتا) مسلمانوں کو مجبور کیا گیا کہ وہ اپنی سابق برادری میں مخلوط ہوجائیں اور وہی مذہب اختیار کرلیں ورنہ پاکستان چلے جائیں چنانچہ اس علاقے کے لوگ بھی مجبورا اس فتنہ کی زد میں آگئے، بالکل اسی طرح ایک ناخواندہ برادری جس کو ''مولاء اسلام گراسیہ'' کہا جاتا ہے اور ضلع کھیڑا، سورت، احمدآباد وغیرہ کے علاقے میں ان کی تعداد تین لاکھ سے متجاوز تھی۔ان میں بھی ان مشکل حالات کی وجہ سے اور دین

بیزاری کے سبب ارتداد پھیل گیا، ان لوگوں نے اپنے نام تبدیل کر لئے ان کے لباس و وضع اور گفتگو وغیرہ میں تبدیلی آ گئی، وہ لوگ مکمل طور پر دین اسلام سے برگشتہ ہو کر مرتد ہو گئے۔ (جمعیۃ کا مختصر تعارف وفہرست خدمات جمعیۃ علماء ہند ص ۷)

مذکورہ حالات کی منظر کشی اور تصدیق اس واقعہ سے بھی ہوتی ہے جس کو خود حضرت مولانا محمد میاں صاحب نے بیان کیا ہے: لکھتے ہیں: ''وہ منظر کبھی فراموش نہیں ہوگا جب دوپہر کے وقت سکھ نما پنجابیوں کی ایک جماعت دفعۃً دفتر پہنچ گئی یہ پندرہ سولہ آدمی تھے، اردو سے ناواقف، ان سے گفتگو شروع ہوئی تو کچھ دیر تک تو یہی رہا کہ ''زبان یار من ترکی و من ترکی نمی دانم''، مگر پوری توجہ سے کام لیا گیا تو ان کا مطلب سمجھ میں آ گیا کہ: ''وہ مسلمان ہیں ضلع پٹیالہ کے دیہات کے باشندے، محض جان بچانے کے لیے یہ وضع اختیار کی ہے، اب مطالبہ یہ ہے کہ اس طرح اپنے ضمیر کے خلاف دو سال زندگی گزار چکے ہیں آئندہ یہ صورت باقی رکھنا نہیں چاہتے ان کے لیے انتظام کیا جائے کہ وہ مسلمان بن کر آزادی سے زندگی گزار سکیں اور یہ ممکن نہ ہو تو ان کو پاکستان پہنچا دیا جائے (الجمعیۃ کا مجاہد ملت نمبر ص ۷۹)

ارباب جمعیۃ ان حالات سے واقف و باخبر تھے اور ان علاقوں کا رخ کر کے مسلمانوں میں ہمت و حوصلہ پیدا کرنے اور دیگر ضروریات کا لحاظ کرنے کے ساتھ ان کے دین وایمان کے بقاء کی بھی جدوجہد جاری رکھے ہوئے تھے، یہ ایک عجیب صورت حال سامنے آئی تھی اس لیے اس کے ازالہ کی فوری طور پر کوششیں کی گئیں، اس سلسلے میں مولانا حفظ الرحمان سیوہاری ناظم جمعیۃ علماء ہند کی مساعی سنہرے حروف سے لکھنے کے لائق ہیں، آپ نے اس وقت کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لعل نہرو سے ملکر حکومت ہند کی جانب سے مذہبی آزادی اور مشرقی پنجاب کے مسلمانوں کے لیے ایک خاص سرکلر جاری کرایا جو دیہات کے پٹواریوں اور چوکیداروں تک پہنچا دیا گیا، اس سرکلر میں خاص طور پر ہدایت تھی کہ جو لوگ ۱۹۴۷ء سے قبل مسلمان تھے وہ اب بھی مسلمان ہیں اور آزادی سے اپنے اسلام کا اظہار کر سکتے ہیں، مذہبی عبادت کر سکتے ہیں ان پر کوئی قانونی پابندی نہیں ہے اور نہ کوئی شخص یا جماعت ان کی مذہبی

آزادی میں رکاوٹ پیدا کرسکتی ہے،اس سرکلر کے آجانے سے بہت راحت ملی اور ڈرے سہمے مسلمانوں کو اپنے اسلام کے ظاہر کرنے کا موقع ملا۔(تعارف خدمات جمعیۃ علماء ہند ص۶)

ارتداد سے متاثر علاقوں میں ضرورت کے اعتبار سے وفود روانہ کئے جاتے اور وفد میں حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب خاص طور سے شریک رہتے تھے، کیوں کہ حضرت مولانا حفظ الرحمان صاحب ناظم عمومی جمعیۃ علماء ہند اس طرح کے زیادہ اہم موقعوں پر مولانا محمد میاں صاحب کو بھیجا کرتے تھے، نیز حضرت مولانا محمد میاں صاحب کا مزاج بھی فکری جد و جہد اور محنتی عمل سے موافقت رکھتا تھا، یہی وجہ ہے کہ ارتداد کے انسداد اور ان حالات سے نمٹنے میں مولانا کی سرگرمی اور کردار بہت نمایاں ہے۔(مختصر تذکرہ خدمات جمعیۃ علماء جلد چہارم ص۲۲)

اراکین جمعیۃ کو جہاں بھی خبر ملتی وہیں پہنچ جاتے اور مسلمانوں کی مدد کرتے ان کو حوصلہ دیتے ان کی دیگر ضروریات کا انتظام کرتے ان کے دین وایمان کی حفاظت کے بھرپور انتظام کرتے، تبادلہ آبادی کے نتیجہ میں ویران ہونے والی مساجد جن پر غیر مسلموں کا قبضہ ہو چکا تھا ان کو آزاد کراتے، نماز کا سلسلہ جاری کراتے، ان مساجد میں امام مقرر کرتے تاکہ وہ فرائض امامت کے ساتھ ساتھ اسلامی احکام کی تعلیم وتبلیغ کا کام جاری رکھیں۔

بچوں میں دینی شعور اور اسلامی عقائد کی شناخت کے لیے مذہبی تعلیم کے مکاتب ومدارس بھی قائم کرتے چنانچہ مشرقی پنجاب اور ہماچل پردیش کے علاقے میں اس دوران پچاس سے زائد مکاتب ومدارس قائم کیے گئے، اسی طرح الور، بھرت پور، گڑگاؤں ضلع کے چار لاکھ میو اور ایک لاکھ غیر میو مسلمان جو تباہ وبرباد ہو چکے تھے وہ حضرت مولانا محمد میاں اور جمعیۃ کے مخلص کارکنوں کی مدد اور ہمت افزائی سے دوبارہ اسلام پر قائم ہوئے تو ان علاقوں میں بھی دینی تعلیم کے لیے سو سے زائد مدارس اور مکاتب کا قیام عمل میں آیا، تحصیل بیاور ضلع اجمیر کے اطراف ودیہات میں بھی حالات حد سے زیادہ تباہ کن تھے مگر ارکان نے حوصلہ وہمت سے کام لے کر مخالفین کا پروپیگنڈہ ختم کیا اور پسماندہ مسلمانوں کی کانفرنس کراکر چیف کمشنر صاحب سے مذہبی آزادی کا اعلان کرادیا، اور جان ومال کی حفاظت کا اطمینان دلایا گیا، جمعیۃ

علماء کے مبلغین نے اس علاقے میں بھی دورے کئے ان کو تعلیم کی طرف متوجہ کیا اور اس دوران اس علاقہ میں پندرہ مدرسے قائم کیے گئے، اسی طرح کھیڑا، ضلع سورت، احمد آباد میں بھی تین لاکھ سے زائد مسلمان تھے جن کو مرتد بنانے کی کوشش کی گئی، مرکزی جمعیۃ اور صوبائی جمعیۃ کی فوری توجہ اور دوڑ دھوپ سے مخالفین اسلام کی کوششیں ناکام رہیں، اس علاقے میں جمعیۃ علماء صوبہ گجرات کے ماتحت ایک خاص شعبہ انجمن اصلاح المسلمین کے نام سے قائم کیا اس کی نگرانی میں ۷۰ سے زائد مدرسے قائم کیے گئے اور مساجد تعمیر کرائی گئیں۔

ارتداد کے سد باب میں حضرت مولانا کی دلچسپی

فتنہ ارتداد سے متاثرہ علاقہ میں حضرت مولانا محمد میاں صاحب علیہ الرحمہ کی آمد ورفت اور اس کے انسداد کے لیے آپ کی کڑھن ودلچسپی ہمیشہ آپ کو بے چین بنائے رکھتی تھی، خاموشی کے ساتھ ایک گوشہ میں بیٹھ کر قلم چلانے والی یہ شخصیت جب میدان میں نکلی تو بے شمار لوگوں کے ایمان اس کے ذریعہ سے محفوظ ہوئے، اس سلسلہ میں آپ کا کردار اس قدر نمایاں ہے جس کا ہر کوئی معترف ہے، آپ کی وفات پر اخبارات میں مضامین لکھے گئے جن میں اس کارنامہ کو سراہا گیا اور جلی حروف میں سرخیاں لگائی گئیں کہ ارتداد کو روکنا مولانا کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ الجمعیۃ روزنامہ کے ایڈیٹر جناب ناز انصاری صاحب نے اپنے اداریے میں حضرت مولانا محمد میاں صاحب کی قربانیوں اور جمعیۃ کے پلیٹ فارم سے ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے بڑے بلند الفاظ میں اس بات کی وضاحت کی ہے کہ مولانا نے غیر محفوظ علاقوں مشرقی پنجاب، ہماچل، راجستھان اور سوراشٹر میں ایسے وقت پہنچ کر کام کیا جبکہ دوسرے لوگ پناہ گاہوں میں چھپے ہوئے تھے اور سانس لیتے ہوئے بھی ڈرتے تھے (روزنامہ الجمعیۃ ۲۵/اکتوبر ۱۹۷۵ء)

حضرت مولانا کو فتنہ ارتداد کے سد باب سے کس قدر دلچسپی تھی اس کا اندازہ ان الفاظ سے لگایا جا سکتا ہے جو انھوں نے کارگزاری رپورٹ لکھنے، اسفار کی روداد بیان کرنے، جمعیۃ کی دیگر خدمات کو ترتیب دینے اور متاثرہ علاقوں کی حقیقت حال پر روشنی ڈالتے ہوئے تحریر

کیے ہیں۔ایک جگہ لکھتے ہیں:

''یہ غیر معمولی اقلیت جس کی آبادی منتشر ہے علم سے نا آشنا جاہل پیروں کے پھندے میں پھنسی ہوئی اور ایسی مفلوک الحال کہ جب تک گھر کے چھوٹے بڑے مزدوری نہ کریں پیٹ پالنا مشکل ہے ان کی جانیں تو ۴۷ء کے ہنگاموں میں محفوظ رہ گئیں مگر ان کے ایمان کا تحفظ بہت ہی دشوار اور نازک مسئلہ ہے''۔

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:''مشرقی پنجاب اور ہماچل پردیش کے علاقوں میں اگرچہ مسلمانوں کی تعداد زیادہ نہیں ہے کل تعداد تقریباً ساڑھے تین لاکھ ہے، لیکن جو شخص اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے وہ اگر ایک بھی ہے تو اس کی اور اس کے دین وایمان کی حفاظت ہمدردان ملت کا سب سے پہلا فرض ہے۔(ہماچل و پنجاب کے پہاڑی بھائی اور ہمارا نظام تعلیم ص ۸)

ارتداد کا سبب: دین سے بیزاری اور جہالت

ارتداد کے سدباب کے لیے کوششیں کرتے ہوئے اس کے اسباب وعوامل پر نظر کی جائے تو معلوم ہوگا کہ تعلیم سے دوری اور جہالت اس کا اہم سبب ہے اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک جگہ حضرت مولانا محمد میاں صاحب نے تحریر فرمایا کہ: غالباً یہی سبب ہے کہ ۱۹۴۷ء سے پہلے بھی اس علاقہ میں مسلمان تعلیم سے نا آشنا تھے ان کے یہاں مولوی یا پیر کی جگہ قاضی کا خطاب استعمال ہوتا تھا یہ قاضی صرف نکاح خوانی کے نہیں بلکہ جملہ مذہبی ضرورتوں کے بھی ذمہ دار ہوتے ہیں ان کے پاس نسلاً بعد نسل جنت کا ٹھیکہ چلا آرہا ہے وہ اپنے مریدوں کے نام بھی جنت کا پٹہ لکھ دیا کرتے ہیں جس کے معاوضہ میں کچھ نذرانہ مقرر تھا جو سال بہ سال یا موسم پر ادا کیا جاتا تھا ان ٹھیکیداروں کو علم کی روشنی سے وحشت ہوتی تھی۔۔۔۔بہرحال ۱۹۴۷ء سے پہلے جہالت کے باوجود ان میں اسلام کے اثرات باقی تھے لیکن ۱۹۴۷ کے بعد حالات نے تبدیلی اختیار کی اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ مسئلہ تعلیم کی پیچیدگی کا اثر ان کے دین وایمان تک پہنچتا ہے یعنی ہمدردان ملت کے سامنے صرف یہ مسئلہ نہیں تھا کہ اگر ان کی تعلیم نہ ہوگی تو یہ جاہل اور پسماندہ رہ جائیں گے بلکہ مسئلہ یہ ہے اگر وہ

دینی تعلیم سے دور رہیں گے تو آنے والی نسلیں دولت ایمان سے تہی دامن اور یکسر محروم ہوجائیں گی (ہماچل و پنجاب کے پہاڑی بھائی اور ہمارا نظام تعلیم ص ۷)

حضرت مولانا محمد میاں صاحب نے اس طرح کے بے نوا مسلمانوں کے حالات اور ان کی دینی ضرورتوں کا اضطراب انگیز احساس کرتے ہوئے متاثرہ علاقوں کو دینی و تعلیمی جدوجہد کی جولان گاہ بنایا، جگہ جگہ مکاتب قائم کیے اور مسلمانوں میں ابتدائی تعلیم کے ساتھ دینی تعلیم کی تحریک شروع کی، اس کو ایک مشن کی صورت دی، جگہ جگہ کانفرنسیں منعقد ہوئیں، کنونشن بلائے گئے، پورے ملک میں جمعیۃ کے پلیٹ فارم سے دینی تعلیم کی تحریک نہایت شدومد سے جاری کی گئی تاکہ مسلمانوں میں اس تعلق سے بیداری پیدا ہو چنانچہ اس کے بہت اچھے اثرات رونما ہوئے۔ جگہ جگہ دینی تعلیم کے مدارس و مکاتب کا قیام عمل میں آیا جن کی تفصیلات اخبارات اور اس وقت کی کارگزاری کی رپورٹ میں ملاحظہ کی جاسکتی ہیں۔

نیز اسکول و کالج کے نصاب میں مذکور مضامین سے جب دین و ایمان پر ضرب لگنے کے خطرات محسوس ہوئے تو اس طرف بھی توجہ برتی گئی اور حضرت مولانا نے ایک ایسا نصاب ترتیب دیا جو بچوں میں عقائد کی پختگی احکام اسلام کا تعارف اور ضروری مسائل سے ان کو آشنا کردیتا ہے، اور دین کی بنیادی ضروری معلومات حاصل ہوجاتی ہیں۔

الغرض حضرت مولانا محمد میاں علیہ الرحمہ نے اپنی زندگی کے دورانیہ میں بے شمار خدمات انجام دیں وہ متبحر عالم، محدث، مورخ اور مدرس ہونے کے ساتھ ایک بہترین داعی اور مبلغ بھی تھے اپنے سینے میں ایک دھڑکتا دل رکھتے تھے، ان کی کڑھن اور بے چینی ان کی تحریرات سے محسوس کی جاسکتی ہیں، ۱۹۴۷ء کے ہنگاموں کے بعد رونما ہونے والے فتنہ ارتداد میں ان کا نمایاں کردار ہے۔ اور اگر آج ان علاقوں میں اسلامی شعائر کا وجود، ایمان کی روشنی، زبانوں پر کلمہ، بچوں میں دینی تعلیم کا ماحول، گلی کوچوں میں قرآن کریم کی تعلیم کا نظم و انتظام وغیرہ نظر آتا ہے تو یقیناً اس میں حضرت مولانا محمد میاں صاحب کی مساعی اور جدوجہد کا وافر حصہ ہے۔

☆☆☆

مکاتب دینیہ کے استحکام میں مولانا سید محمد میاں کا کردار

مولانا محمد تبریز عالم حلیمی قاسمی (استاذ دارالعلوم حیدرآباد)

بقائے دین کے تعلق سے ہندوستان میں دو طرح کی کوششیں تاریخ کا حصہ ہیں: ایک آزادی سے پہلے اور دوسری آزادی کے متصلاً بعد۔ آزادی سے پہلے ہندوستان میں ایک وقت اور دور ایسا آیا کہ ایوانِ مغرب کی گھٹا ٹوپ ہواؤں نے اسلام کے جگمگاتے قمقوں اور چراغوں کو گل کرنے کا پختہ ارادہ کرلیا تھا۔ بے دینی اور جہالت کے ان اندھیروں میں چند اہل اللہ امید کی ایک کرن لے کر نمودار ہوئے۔ اس مقدس جماعت نے یہ تاریخی فیصلہ کیا کہ اس وقت بقائے دین کی صورت اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ دینی تعلیم کے ذریعہ مسلمانانِ ہند کی حفاظت کی جائے اور تعلیم وتربیت کے راستے ان کے دل ودماغ کی تعمیر کرکے ان کی بقا کا سامان کیا جائے۔ اس کی واحد صورت یہی ہے کہ ایسی درس گاہیں قائم کی جائیں، جہاں علوم نبویہ کی تعلیم کا نظم ہو۔ چنانچہ ۱۵؍محرم الحرام ۱۲۸۳ھ مطابق ۳۰؍مئی ۱۸۶۶ء کو اس عظیم مشن کے لیے دارالعلوم دیوبند کی داغ بیل ڈالی گئی۔ دارالعلوم قائم ہوتے ہی اس کے مفید اثرات مرتب ہونے شروع ہوگئے۔ مسلمانوں کے دینی، ملی اور فکری دائرے کو اس کے قیام کی روشنی سے نئی زندگی ملی اور اس طرح دارالعلوم دیوبند وہ ہند میں سرمایہ ملت کا نگہبان کا مصداق بنا۔

جب ملک آزاد ہوا تو اس وقت بھی کچھ ایسے حالات رونما ہوئے کہ ضرورت اس بات کی محسوس کی گئی کہ بقائے دین کی کوشش کو وسیع تر کیا جائے اور مدارسِ اسلامیہ کے ساتھ مکاتبِ دینیہ کا قیام عمل میں لایا جائے۔ کیوں کہ کسی بھی معاشرہ اور سوسائٹی میں مکاتب کا

نظام اسلام کی بقا کا ضامن ہے، اعلی تعلیم کا انتظام ہر جگہ ہوتا ہے، اور یہ نسبتاً آسان ہے؛ لیکن مذہبی تعلیم اور عقائد واحکام کی الف با کی جانب توجہ کم ہوتی ہے۔ کیوں کہ یہ نسبتاً دشوار طلب اور مشکل بھرا کام ہے۔ چنانچہ جمعیت علمائے ہند جو ملت کی خدمت میں مشغول سب سے قدیم اور نمائندہ جماعت ہے، جس کی روشن تاریخ اور سرفروشانہ جدوجہد سے کوئی مؤرخ صرفِ نظر نہیں کرسکتا، ملک کی آزادی کے وقت تباہی وبربادی کے بھڑکتے شعلوں میں گھس کر مسلمانوں کی بروقت امداد کی تو دوسری طرف حامیانِ ملت اور علم برادرانِ وراثتِ انبیا کی نظریں دینی تعلیمات اور تہذیبِ اسلامی کے بقا وتحفظ پر تھیں۔ اس نے اس ضرورت کو دیگر جماعتوں کے مقابلہ میں کچھ زیادہ محسوس کیا۔ اکابرِ جمعیت کو اس کا شدید احساس تھا کہ نظامِ حکومت (سیکولرزم) کو اکثریت کے اثرات سے پاک وصاف رکھنا بہت مشکل؛ بلکہ ناممکن ہے، اس بنا پر جب تک کوئی تہذیب خود اپنی حفاظت کا سامان نہ کرے، اس کا باقی رہنا ناممکن ہو جائے گا۔ چنانچہ جمعیت علمائے ہند نے اپنی بنیادی مذہبی تعلیم کو سب سے اہم کام اور اپنی کارگزاریوں کے لیے بنیادی پروگرام قرار دیا۔ اظہارِ اسلام کے ساتھ بقائے اسلام کی یہ کوششیں ایسی کام یاب ہوئیں کہ تباہ شدہ علاقوں میں پھر دینی اور مذہبی تعلیم کے چراغ جگہ جگہ روشن ہو گئے اور دینی تعلیم کی اشاعت ایک تحریک کی شکل اختیار کرگئی۔

یہ واقعہ ہے کہ کسی بھی تحریک کی تاثیر اور بقا کے لیے محنتی اور مخلص افراد کا ہونا ازبس ضروری ہوتا ہے۔ جمعیت علمائے ہند کی اس تحریک کو بامراد اور منزلِ مقصود تک پہنچانے کے لیے بہت سے ایسے افراد اور شخصیات ملیں جو میر کارواں کے مصداق تھے، ان میں ایک بڑا اور نمایاں نام سید الملت، مورخِ اسلام، مولانا سید محمد میاں صاحب دیوبندی ثم دہلوی (۱۹۰۳ء۔۱۹۷۵ء) کا ہے۔ آپ نے جمعیت علمائے ہند کے پلیٹ فارم سے ملک وملت اور قوم ووطن کے لیے ناقابل فراموش خدمات انجام دیں اور خود جمعیت علمائے ہند کی وہ خدمت انجام دی، جو جمعیت علماء کی تاریخ میں سنہرے حروف سے لکھے جانے کے لائق ہے۔ مکاتبِ دینیہ کے قیام واستحکام کے حوالہ سے آپ کا کردار قابلِ رشک بھی ہے اور لائقِ

صدشکر بھی۔ کیوں کہ آپ اسی دارالعلوم دیوبند کے فرزند تھے، جس نے کتاب وسنت کی نشر و اشاعت اور بقائے دین کے لیے قیامِ مدارس ومکاتب کوایک تحریک کی شکل دی تھی۔ ذیل میں اس تعلق سے تفصیلی جائزہ پیش کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔

سیکولرزم اور دینی تعلیم کے بارے میں اکابر کی آراء:

جب ملک آزاد ہو چکا تو دستور ساز اسمبلی نے سیکولرزم کو نظامِ حکومت کی بنیاد قرار دیا تھا، جس کا مطلب یہ تھا اور ہے:

''ہر فرقہ کے مذہب، تہذیب، معاشرت، روایات وافکار اور دینی احساسات کے بقا وتحفظ کی ذمہ داری خود اس فرقہ پر ہوگی، حکومت پر نہیں۔''

اس حقیقت کے پیشِ نظر اس وقت اہم سوال یہ تھا کہ مسلم اقلیت جو اپنے مذہبی امتیازات میں سب سے الگ اور سب سے نمایاں ہے، وہ مسلم اقلیت ہر طرح کے تصادم کے وقت اپنے مذہب وتہذیب کو کس طرح محفوظ رکھ سکے گی؟ بلکہ جس وقت سیکولرزم کو نظامِ حکومت کی بنیاد قرار دینے کے لیے ادھیڑ بن ہورہی تھی، اسی وقت یہ بنیادی سوال بھی اکابرِ جمعیت علمائے ہند کے سامنے تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جیسے ہی سیکولرزم دستور اور آئین کی بنیاد قرار دیا گیا، اس سوال کا جواب بھی ان اکابر کی زبانوں پر آ گیا اور انھوں نے اسلامی تشخصات اور دینی تعلیمات کے حوالہ سے اپنے خدشات ظاہر فرما دیے تھے۔ چناں چہ مجاہدِ آزادی شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی صاحب سابق صدر جمعیت علمائے ہند (۱۸۷۹ء۔۱۹۵۷ء) نے فرمایا تھا:

> ''دینی تعلیم اور اس کی اشاعت یوں تو مسلمانوں کے لیے ہر زمانہ میں تمام ضروریات سے اعلیٰ ترسمجھی گئی ہے، مگر انڈین یونین (بھارت) میں وہ انتہائی درجہ کو پہنچ گئی ہے، سیکولر اسٹیٹ میں مسلمانوں کا مستقبل محفوظ رہ سکتا ہے تو صرف دینی مدارس ہی کے زیادہ سے زیادہ اجرا اور ان کی ترقیات سے محفوظ رہ سکتا ہے؛ اس لیے ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اس میدان میں اپنی جدوجہد کو تیز کردے۔''

(دینی تعلیمی تحریک اور دستور العمل، ص:، مرتب: مولانا محمد میاں صاحب، شائع کردہ: دینی تعلیمی بورڈ، جمعیت علمائے ہند، دہلی)

امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد (۱۸۸۸ء۔۱۹۵۸ء) کی فرمائش پر مرکزی اور صوبائی جمعیتوں کا ایک خاص اجتماع فروری میں کیا گیا۔ آپ نے اس اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

''مسلمان ایک مخصوص تہذیب وتمدن کے مالک ہیں، جو دوسری تہذیبوں سے ممتاز ہے۔ مسلمانوں کا حق ہے کہ وہ اپنی تہذیب وتمدن کو محفوظ رکھیں اور ترقی دیں۔ ان کی تہذیب کا بقا دینی تعلیم پر موقوف ہے۔ شہری زندگی میں مسلمان بچے اپنے ماحول سے بھی بہت کچھ سیکھ لیتے ہیں؛ لیکن دیہات وقصبات میں عموماً اس ماحول سے محروم رہتے ہیں، ان میں کام کرنے کی زیادہ ضرورت ہوگی۔ یہ فرض جمعیت علما کا ہے، جمعیت علما کے لیے کام کرنے کا وقت اب آیا ہے، اس کی ذمہ داریاں بہت وسیع ہوگئی ہیں۔ ہمیں اپنے مذہب وتہذیب کو اپنی ذمہ داری پر محفوظ رکھنا ہے۔''

دینی تعلیمی تحریک اور دستور العمل، ص:، مرتب: مولانا محمد میاں صاحب

دینی تعلیم اور جمعیت علمائے ہند کا احساس:

جمعیت علمائے ہند کی بنیادی مذہبی تعلیم کے لیے کی گئی مشترکہ جدوجہد کو سمجھنے کے لیے یہاں دو اقتباس نقل کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے:

''اسلام، اسلامی شعائر، اسلامی تہذیب وتمدن کی حفاظت مسلمانوں کے مذہبی، تہذیبی، تعلیمی اور تمدنی حقوق کا حاصل کرنا جمعیت علمائے ہند کا فرض ہے، وہ اس فرض کی ادائیگی میں کسی قسم کی کوتاہی گوارا نہیں کرے گی۔'' (اجلاس ۲۰،۲۱/ مارچ ۱۹۴۸ء)

اس اجلاس کے صرف ایک مہینہ بعد ممبئی کے اجلاسِ عام میں دینی تعلیم کے تعلق سے کئی اہم تجویزیں منظور کی گئیں۔ تجویز نمبر ۹ یہ تھی:

''جمعیت علمائے ہند کا یہ اجلاسِ عام ابتدائی تعلیم کے ساتھ مذہبی تعلیم کی اہمیت و ضرورت کو شدت سے محسوس کرتے ہوئے تمام ماتحت جمعیتوں پر لازم قرار دیتا ہے کہ وہ اپنے حلقہ اثر میں ابتدائی مدارس اور شبینہ مکاتب قائم کر کے زیادہ سے زیادہ مسلمانوں کو مذہبی عقائد سے واقف کرنے کی کوشش کریں، اور اس بلند وبالا مقصد کو کام

یاب کرنے کے لیے جدو جہد صرف کردیں۔'' (اجلاس ممبئی ۲۷/۲۸/ اپریل ۱۹۴۸ء)

دینی تعلیم کے استحکام کے لیے مولانا محمد میاں کا انتخاب:

جمعیت علمائے ہند اور اکابر جمعیت کی مذکور کوشش، بے لوث تگ ودو اور سعیِ پیہم کی وجہ سے جب دینی تعلیم کے متعلق احساس عام ہوگیا، شہر اور قصباتی حلقوں میں بیداری پیدا ہوگئی تو جگہ جگہ سے دینی تعلیم کے نصاب اور طریقہ تعلیم کے مطالبات ہونے لگے۔ مزید براں جمعیت علمائے ہند کے سامنے ایک تصفیہ طلب مسئلہ یہ تھا کہ دینی تعلیم کا انتظام اسے اور دیگر مکاتبِ خیال کو خود کرنا چاہیے یا اس کی ذمہ داری حکومت پر ڈالی جائے؟ چناں چہ اس تعلق سے ممبئی میں ایک مشہور اور تاریخی دینی تعلیمی کنونشن منعقد ہوا اور فیصلہ ہوا کہ دینی تعلیم کا انتظام ہر ایک فرقہ خود کرے اور اس اہم ذمہ داری کو حکومت کے بہانہ جو اور حیلہ تراش کاندھوں پر نہ ڈالے۔ اس صورتِ حال میں نافعیت اور انتظام وانصرام کے مؤثر ہونے کے لیے ضروری تھا کہ اس اہم کام کے لیے ایک خاص طرح کا نصاب تیار ہو۔ مبادی، فرائض، قواعد، تقسیم عمل اور طریقِ کار کے ساتھ دستور العمل ترتیب دیا جائے۔ اس کے لئے ایسی روشن ضمیر شخصیات کی ضرورت تھی، جو مذہبی تعلیمات میں ماہر اور نفسیات کے نشیب وفراز سے خوب واقف ہوں۔ چناں چہ اس کام کے لیے باقاعدہ مرکزی دینی بورڈ کا قیام عمل میں آیا، مولانا محمد میاں صاحب کو اس بورڈ میں مرکزیت حاصل تھی؛ کیوں کہ اس کام کو بہ حسن وخوبی انجام تک پہنچانے کے لیے اکابر کی نظر میں مولانا ممدوح سے اچھا، ماہر اور قابل فرد کوئی دوسرا نہیں تھا۔ تفصیل آگے بھی آرہی ہے، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ کا انتخاب حسنِ انتخاب تھا۔ ایک اقتباس پڑھیے:

> ''آزادی ہند کے بعد فوراً نسلوں میں دین کی حفاظت کا کام بنیادی تھا، جمعیت علمائے ہند نے اپنے سولھویں اجلاس منعقدہ لکھنؤ ۱۶/ تا ۱۸/ اپریل ۱۹۴۹ء میں دینی تعلیم کی مہم کو اپنا سب سے اہم پروگرام قرار دیا، اس تحریک کو چلانے کا کام مولانا مرحوم (مولانا محمد میاں صاحب) کے ہاتھ میں تھا اور آپ نے کامیابی کے ساتھ چلایا اور مجوزہ نصاب کی ترتیب و تدوین کی سعادت بھی آپ کے حصہ میں آئی اور آپ نے دینی تعلیم کے رسالے تحریر فرمائے۔'' (ہفت روزہ الجمعیۃ، ص:۱۰۲، اکابر جمعیت علما نمبر)

سید الملت کا مقام:

مکاتب دینیہ کے استحکام میں آپ کا جو بیش قیمت تعاون اور بے لوث خدمات ہیں، وہ کوئی اتفاق نہیں تھا؛ بلکہ آپ اس میدان کے ماہر شہ سوار تھے۔ اس جگہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اختصار کے ساتھ آپ کا علمی مقام واضح کیا جائے؛ تا کہ اس کام کے لیے آپ کے انتخاب کی وجوہ سمجھی جا سکیں۔ مولانا سید محمد میاں صاحب ہمہ جہت عالمِ دین تھے، وہ بڑے بافیض و باتوفیق مدرس اور بلند پایہ محدث تھے، فقہ وفتاوی میں اپنا ایک الگ مقام رکھتے تھے، وہ بہت بڑے اہل قلم اور مؤلف تھے، ممتاز مؤرخ وسوانح نگار کے طور پر معروف تھے۔ چناں چہ آپ نے مختلف جہات سے اور سمتوں میں کام کیا۔ ان کی زندگی کا ہر ورق جہد وعمل اور سعیِ مسلسل کی گواہی دیتا ہے۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے، جو ایک ایک لمحہ کو کام یاب اور کار آمد بنانے کے فن سے واقف اور ہر طرح کی صلاحیتوں کے مالک ہوتے ہیں۔ آپ کا تاریخی نام مظفر میاں تھا اور نام کے اثرات ان کی حیاتِ مبارکہ پر بہ خوبی دیکھے اور محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ مولانا مرحوم نے اپنے پیچھے وہ تاریخی کارنامے چھوڑے ہیں، جو آنے والی نسلوں کے لیے چراغِ راہ ہیں۔ ایک ایسا چراغ جو رات کی ہول ناک تاریکیوں میں اجالے کا نقیب بنتا ہے اور عزم وحوصلہ کے ساتھ آگے بڑھنے کی دعوت دیتا ہے۔ علم، مطالعہ اور معلومات کی کثرت کی گہری چھاپ آپ کی پوری زندگی میں دکھائی دیتی ہے۔ چناں چہ درس وتدریس کے علاوہ تصنیف وتالیف اور سیاسی وسماجی خدمات کا دائرہ بھی بے انتہا وسیع ہے۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی (۱۹۱۴ء۔۱۹۹۹ء) کے بہ قول:

> حضرت مولانا سید محمد میاں علم وعمل کے صحیح معنی میں جامع تھے، زہد واستغنا اور دنیا سے بے نیازی میں وہ ممتاز تھے، اپنے علم وقلم سے ملت کی بے لوث خدمت کی، وہ بڑے قد کے عالم تھے؛ لیکن خلوت نشینی اور شہرت ونمود سے دوری کی وجہ سے کم لوگ ان کے مقام ومرتبہ سے واقف ہیں۔ (پسِ مرگِ زندہ، ص: ، مولانا نور عالم خلیل امینی، ادارہ علم وادب دیوبند)

ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری نے ایک جگہ ان کی تصنیفی خدمات کے تعلق سے لکھا ہے:

> ''ان کی علمی قابلیت کے واقعی اندازہ شناس تو بہت کم لوگ تھے؛ لیکن ان کے شوق علمی کی دھوم پورے شہر میں مچی تھی۔ حضرت شیخ الاسلام نے انھیں از راہِ تفنن حیوان کاتب کہا تھا اور

پورے حلقے میں ان کے اِس لقب کی شہرت ہوگئی تھی۔‘‘

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

’’وہ ایک مستند عالمِ دین تھے، مفسر، محدث اور مفتی تھے اور خطیب و مقرر بھی تھے؛ لیکن ان کا اصلی میدان تصنیف و تالیف تھا۔ ان کی شخصیت کے اصل جوہر، قلم وقرطاس کی صحبتوں میں کھلتے ہیں، وہ اپنی تمام حیثیتوں میں مصنف سب سے بڑے تھے۔ اور ہر دائرہ فن کی تحریرات میں انھوں نے مقاصد کی بلندی، خیالات کی اہمیت، مطالب کی افادیت، مباحث کی جامعیت، فکر کی معنویت، مطالعہ کی وسعت، تحریر کی سلاست اور بیان کی شگفتگی کا نقش بٹھا دیا ہے۔‘‘ (مقالات سیاسیہ، حصہ دوم، ص: ۱۰/۱۱، م: ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری، ناشر: فرید بک ڈپو)

سید الملت کا جمعیتی مقام:

چوں کہ دینی تعلیمی تحریک کی باگ ڈور جمعیت علمائے ہند کی مرکزی قیادت کے ہاتھ میں تھی؛ اس لیے یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ جمعیت علمائے ہند کی مرکزی قیادت میں سید الملت رحمہ اللہ کا کیا مقام و مرتبہ تھا؟ اس تعلق سے صرف ایک اقتباس درج کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری لکھتے ہیں:

’’جمعیت کے دائرے میں ان کی حیثیت لسانِ جمعیت یا اس کے ترجمان کی تھی۔ جمعیت کے موقف کی وضاحت اور خدمات کے تعارف میں ان کی مساعی کو سب پر ترجیح حاصل ہے۔ اس کے بزرگوں کے افکار کی ترجمانی اور ان کے دفاع میں وہ سب سے زیادہ پر جوش اور ان کا قلم سب سے زیادہ سرگرم رہا تھا، ان کا دماغ حقیقت آشنا، زبان حقیقت ترجمان اور قلم حقیقت رقم تھا، اس خصوصیت میں جمعیت کے دائرۂ فکر و عمل میں ان کا کوئی شریک و سہیم نہ تھا۔‘‘

(مجاہدِ ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی: ایک سیاسی مطالعہ، ص: ، مرتب: ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری)

تحفظ ملت کے بارے میں سید الملت کا نظریہ:

بقائے دین اور تحفظِ ملت سید الملت کا خاص مشن اور آپ کے دل کی آواز تھی؛ لیکن آپ اس کام کے لیے قیادت اور سرپرستی کو ضروری سمجھتے تھے، ملت کی ترقی اور استحکام

کے سلسلہ میں سید الملت کا نظریہ بالکل صاف تھا کہ ملی خدمات اور تحفظ ملت کے لیے کسی ایسی جماعت میں شریک ہونا ضروری ہے، جو علمائے ملت کے زیر قیادت تحفظ وترقی ملت کے لیے کام کرتی ہو۔ جماعت سے وابستگی اس کام میں بے حد مفید اور معاون ہے اور جماعت المسلمین کی قیادت سے علاحدہ فرد کی کوشش مفید اور مؤثر نہیں ہوتی۔ سید الملت کی نگاہ میں تحفظِ ملت کے لیے سب سے بہتر جماعت اور لائقِ اعتماد قیادت جمعیت علمائے ہند ہی تھی۔ چناں چہ اسی جذبہ کی بنیاد پر جمعیت علمائے ہند کے ساتھ اگر چہ آپ کا رشتہ زمانہ حصول تعلیم ہی میں قائم ہوگیا تھا اور فراغت کے بعد مارچ میں جمعیت علمائے ہند کے ساتویں اجلاس کلکتہ میں اکابر علما کے ہم راہ آپ نے بھی شرکت فرمائی تھی، مگر اس سلسلے کی سرگرمی مدرسہ شاہی میں تشریف آوری کے بعد شروع ہوئی تو پھر زندگی بھر ختم نہ ہوئی۔ یہی جذبہ اور شوق تھا کہ آپ نے جمعیت علمائے ہند کے پلیٹ فارم سے ملت کی ہمہ جہت خدمات انجام دیں، مکاتبِ دینیہ کے استحکام کے تعلق سے آپ کی خدمات اور آپ کی تگ ودو کو اسی پس منظر میں دیکھنا اور سمجھنا چاہیے۔

دینی تعلیم اور سید الملت کا احساس:

مولانا محمد میاں صاحب کے تمام تصنیفی کاموں میں ان کی مؤرخانہ خصوصیات نمایاں ہیں؛ کیوں کہ وہ ایک بہت بڑے مؤرخ بھی تھے۔ بہ قول ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری: آپ سید الملت کے ساتھ مؤرخ ملت تھے؛ اس لیے آپ اہم کاموں میں تاریخی زاویہ کو نظر انداز نہیں فرماتے تھے، ماضی کے ساتھ مستقبل کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اقدامات فرمایا کرتے تھے۔ جمعیت علمائے ہند کے زیرِ قیادت مکاتبِ دینیہ کی تحریک کی باگ ڈور جب آپ کے ہاتھ میں آئی تو آپ نے تاریخی پس منظر کو سامنے رکھتے ہوئے مکاتبِ دینیہ کے استحکام کی بھرپور کوشش کی۔ اس تعلق سے آپ کے اقدامات سطحی اور ظاہر پر مبنی نہیں تھے؛ بلکہ حقائق، تاریخ اور مثبت نتائج کے حوالے سے گہرائی اور گیرائی کا مصداق تھے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ذیل میں اس کی تفصیلات پیش کی جائیں۔

۱۔ مولانا سید الملت کو یہ شدید احساس تھا کہ جب اقتدار بدلتا ہے تو نئے اقتدار کے ساتھ بہت سے نئے مسائل بھی پیدا ہو جاتے ہیں، جن کا سمجھنا اور ان کا حل پیدا کرنا اس جماعت اور ان رہنمایانِ ملت کا فرض ہوتا ہے، جن کو ہمدردی ملت کے سوز و گداز کے ساتھ فہم و بصیرت کی امانت بھی سپرد ہوئی ہو؛ انگریزوں کی حکومت کے خاتمہ کے بعد جب نیا اقتدار آیا تو واقعتاً بہت سارے نئے مسائل پیدا ہوئے۔ دینی تعلیم کی اشاعت اور اس کا استحکام اس وقت ایک ملی چیلنج سے کم نہیں تھا۔ مولانا سید الملت کی دوررس نگاہوں اور ملی فکر مندی نے اسے تاڑ لیا تھا اور جیسے ہی اس میدان میں شہ سواری کا موقع ہاتھ آیا، آپ نے ملی جذبہ کے ساتھ خوب شہ سواری کی۔

۲۔ آپ مؤرخ ملت تھے، اسپین کی تاریخ اور فلسفہ تاریخ سے آپ نے ملت کے مفاد کے حوالہ سے بہت کچھ مثبت نتائج اخذ کیے ہوں گے۔ اسپین میں تقریباً سات سو سال اسلامی حکومت رہی اور وہاں اسلام کو ہر طرح غلبہ حاصل تھا۔ جب عیسائیوں نے اس ملک میں مسلمانوں کا قتل عام کیا، جس کے نتیجے میں ہزار ہا ہزار مسلمان اسپین سے ترکِ وطن کر کے فرانس کے علاقے میں سکونت پذیر ہوئے، فرانس میں ان سے ایک تاریخی غلطی یہ ہوئی کہ ان لاکھوں پناہ گزیں مسلمانوں نے اپنے دین و ایمان کی بقا کی فکر نہیں کی، نسلوں میں دینی اور مذہبی مزاج بیدار کرنے کی سعی نہیں کی؛ نتیجہ یہ نکلا کہ بعد کی نسلیں عملی اور شعائر کے اعتبار سے بالکل خستہ حال ہوگئیں۔ اسلام کا ظاہر باقی رہا، لیکن اسلام کی روح غائب ہوگئی۔ انگریزوں کی حکومت کے بعد ملک ہندوستان میں مسلم قوم اسی طرح کی صورت حال سے دو چار نہ ہوجائے؛ اس لیے اکابرِ جمعیت کے ساتھ سید الملت کا یہ احساس بہ جا تھا کہ نسلوں میں بقائے دین کا واحد اور مؤثر راستہ مکاتبِ دینیہ کا قیام اور اس کا استحکام ہے۔ سید الملت نے اِسی تاریخی پس منظر میں مکاتبِ دینیہ کے استحکام کے لیے تن، من، دھن کی بازی لگا دی تھی، جیسا کہ آگے آ رہا ہے۔

۳۔ ملک کی آزادی کے وقت سائنس نے کافی ترقی کر لی تھی اور اس نے دنیاوی

تعلیم کے دائرہ کو اتنا وسیع کر دیا تھا کہ سائنس کی اعلی تعلیم کے لیے اگر پہلے ۵ر سال کی مدت کافی تھی تو اب اس کی عمر دو چند، سہ چند ہوگئی ہے۔ مولانا سید الملت یہ چاہتے تھے کہ بچوں کے اوقات کو زیادہ سے زیادہ تعلیم میں مشغول رکھ کر ان میں یہ صلاحیت پیدا کی جائے کہ وہ تعلیم کی عمر ہی میں سائنس وغیرہ کی اعلی تعلیم حاصل کر لیں۔ اس پس منظر میں مولانا سید الملت نے مسلمانانِ ہند کے سامنے یہ تجویز رکھی:

(الف) اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے بچے اعلی تعلیم کی ڈگریاں حاصل کر کے ترقی کی دوڑ میں دوسروں کے ہم دوش رہیں تو ضروری ہو جاتا ہے کہ ہم تعلیم کے پھیلاؤ کو سمیٹیں اور ایسی صورت اختیار کریں کہ تھوڑے وقت میں زیادہ تعلیم ہو سکے۔

(ب) سرکاری تعلیم گاہوں میں صرف ایسی تعلیم ہی دی جائے گی، جس کی ملکی تعمیر و ترقی میں ضرورت ہے۔ بے شک اس تعلیم کے نتیجہ میں بچے وطنِ عزیز کے جاں نثار فرزند اور ملکی تعمیر و ترقی کے بہترین معمار بن سکیں گے؛ لیکن کیا ان کے سامنے کوئی تصور آخرت اور حیات مابعد الموت کا بھی ہوگا؟ کیا مسلمانانِ ہند اِس بات کو جائز سمجھیں گے کہ ان کے نو نہال ایسی زندگی اختیار کریں، جو فکرِ آخرت سے تہی دامن ہو؟ ہرگز نہیں! اِس لیے یہ ضروری ہے کہ جیسے جیسے ہند یونین میں سیکولرزم ترقی کرے، دینی تعلیم کی تحریک بھی اپنے تمام لوازمات اور تقاضوں کے ساتھ ترقی کرتی رہے۔

(مستفاد: دینی تعلیمی تحریک اور دستور العمل، ص:، مرتب: مولانا محمد میاں صاحب)

سید الملت کی دینی سوچ کے نتائج:

دینی مکاتب کے فوائد کا دار و مدار اس کے استحکام پر موقوف ہے، چنانچہ تدریس، تصنیف و تالیف اور ملک و ملت کی عظیم سیاسی مصروفیتوں اور گوناگوں ذمہ داریوں کے باوجود آپ کو نونہالانِ اسلام [بچوں اور بچیوں] کی تعلیم و تربیت اور مدارس و مکاتب کے نظامِ تعلیم کی اصلاح و تسہیل سے خاص شغف تھا؛ اسی لیے آپ نے بچوں کے لیے دینی تعلیمی نصاب مقرر فرما کر اس کے لیے از خود تقریباً ایک درجن دینی تعلیم کے رسالے اور چارٹ وغیرہ بڑی

جاں فشانی سے تیار فرمائے، جو سہل ہونے کے ساتھ مفید ترین معلومات سے لبریز بھی ہیں۔
(تذکرہ حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب: ص ۸۷/ تالیف: مفتی محمد مسعود عزیزی ندوی)

دینی مدارس ومکاتب کا قیام اور سید الملت کی رائے:

دینی مدارس ومکاتب کے تعلق سے سید الملت کا نظریہ یہ تھا کہ مدارس ومکاتب ایسی جگہوں میں ضرور قائم کیے جائیں، جہاں مسلمانوں کے اخلاق ومعاشرت کی اصلاح کی زیادہ ضرورت ہو اور ایسے دور دراز کے علاقوں میں مکاتبِ دینیہ کے استحکام کی خوب کوشش کی جائے۔ آپ کی یہ شدید خواہش تھی کہ بڑے مدارس کے طلبہ کی محنت اور مستعدی کا دائرہ صرف درسیات میں منحصر نہیں رہنا چاہیے؛ بلکہ ان کے ماسوا تاریخ، جغرافیہ، اصلاح واخلاق اور مذہبی بنیادی تعلیمات کی ترویج واشاعت کی فکر بھی ہونی چاہیے۔ ایک جگہ خود رقم طراز ہیں:

> ''اگر تبلیغ واصلاح کے مقصود کو سامنے رکھ کر دیہات وقصبات میں مدارس قائم کیے جائیں اور حسبِ ضرورت ان میں مسلمان بچوں کو تعلیم دی جائے اور پھر اس مدرسہ کو ایک مرکز قرار دے کر مضافات میں تبلیغ کی جائے، حق وصداقت پر قائم رہ مسلمانوں کے اخلاق ومعاشرت کی اصلاح کی جائے تو بلاشبہ یہ مدارس مسلمانوں کے لیے رحمت، برکت اور سراسر برکت ہیں۔ نیز مندرجہ ذیل ارشاد ربانی کی تعمیل کی بہتر اور آسان شکل ہے: فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ. (سورہ توبہ، آیت: ۱۲۲)
>
> (تذکرہ مولانا مولانا سید محمد میاں، ص: ۱۷۲)

دارالعلوم کے بہ جائے مکاتب کے قیام پر زور:

سید الملت اس بات کے پر جوش داعی تھے کہ سلسلہ تعلیم میں عام مسلمانوں کی ضرورت کا لحاظ رکھنا از بس ضروری ہے۔ یہ کوشش قوم وملت کے لیے انتہائی نقصان دِہ ہے کہ مکاتب ومدارس میں عربی پڑھنے والے طلبہ فراہم ہوں اور بخاری شریف وترمذی شریف جیسی بڑی کتابوں کا درس ان کو دیا جائے۔ یعنی کوشش کی جائے کہ ہر ایک چھوٹے گاؤں میں

قائم کیا جائے تو دارالعلوم جو مرکزِ اسلام کا خطاب جلد حاصل کر سکے، بسا اوقات انھی جذبات کے ماتحت ایک ایک شہر میں کئی کئی مدارس قائم کیے جاتے ہیں اور ہر ایک کو دارالعلوم بنانے کی کوشش کی جاتی ہے، اور ضرورت کے مطابق مسلمان بچوں کی ابتدائی تعلیم کے بہ جائے انتہائی تعلیم ہماری توجہات کا مرکز بن جاتی ہے۔ مولانا سید الملت اس عمل کے نقصان پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس جذباتی جدو جہد میں مسلمان بچوں کی ابتدائی تعلیم سے توجہ ہٹ جاتی ہے، جو درحقیقت فرض تھی اور جس کے لیے زائد سے زائد مدارس کے قیام کی شدید ضرورت اس وقت بھی موجود تھی اور آئندہ بھی رہے گی۔ جب تک مسلمانوں کے ہر ایک گاؤں اور ہر ایک محلّہ میں مذہبی تعلیمات کا ایک مدرسہ نہ قائم ہو جائے اور جب تک ہر ایک مسلمان لڑکا اور لڑکی مذہبی ضروری تعلیم سے کما حقہ واقف نہ ہو جائے۔''

(تذکرہ مولانا مولانا سید محمد میاں، ص:۱۷۳)

دینی مکاتب سے بے توجہی اور سید الملت کا دردِ دل:

مولانا سید الملت کو ان فضلائے مدارس سے شکوہ تھا، جو ملازمت کو اپنا نصب العین بنا لیتے ہیں، یا لیلیٰ تدریس کی منزل ہی کو مقصودِ زندگی بنا لیتے ہیں۔ سید الملت کا یہ نظریہ تھا کہ ایسی فکر کے حامل فضلاء فراغت کے بعد ایک عرصہ تک کسی عربی مدرسہ میں ملازمت کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں، اس کی وجہ سے کسی اور دینی خدمت کی جانب توجہ مبذول نہیں ہو پاتی، جس کی وجہ سے رفتہ رفتہ علم کی تازگی ختم ہو جاتی ہے اور دینی خدمات کا جذبہ سرد پڑ جاتا ہے۔ آپ کی یہ خواہش تھی اور آپ نے فضلاء اور ائمہ مساجد سے اپیل بھی کی کہ وہ ضروریاتِ ملت میں مقتدی کے بہ جائے امام بنیں۔ چناں چہ ابنائے دارالعلوم دیو بند سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''بہت سی مثالیں موجود ہیں کہ آزاد مدارس عربیہ کے فضلا نے فکرِ معاش سے مجبور ہو کر میونسپلٹی یا ڈسٹرکٹ بورڈ کی پرائمری مکاتب کی ملازمت ہی کو ذریعہ معیشت قرار

دیا۔ کاش یہ حضرات ابتدا ہی سے نصِ قرآنی کے بہ موجب اِنذار و اصلاح کو اپنا نصب العین قرار دیتے اور تحصیلِ علم کے بعد اپنے وطنِ عزیز میں پہنچ کر سب سے پہلے وہاں کی اصلاحی ضرورتوں پر نظر ڈالتے اور انھیں اصلاحات کے پیشِ نظر مدرسہ یا مکتب یا تبلیغی ادارہ قائم کر کے ذریعہ معاش بھی فراہم کر لیتے اور فرضِ منصبی کو بھی ادا کرتے۔

اگر اپنی بستی میں پہلے سے کسی ادارہ کے قیام کے باعث ضرورت نہ ہوئی تو قرب و جوار کے جس مقام پر ضرورت ہوتی وہاں پہنچ کر کسی دار العلوم کے قیام یا اپنے صنمِ علم کی پرستش کے لیے نہیں؛ بلکہ وہاں کے مسلمانوں کی ملی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے وہاں کی ضرورت کے موافق ادارہ قائم کرتے اور ارشادِ الٰہی وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْا اِلَيْهِمْ کی تکمیل کی ابدی سعادت حاصل کر لیتے۔

اور ایسی مثالیں بھی موجود ہیں کہ اس قرآنی فلسفہ کو سمجھ کر کام کیا گیا تو دنیاوی اعتبار سے بھی کامیابی حاصل کی، اور توقع ہے کہ آخرت میں بھی یہ حضرات کامیاب ہوں گے۔“

(ماہنامہ دار العلوم، شمارہ: جمادی الاولی ۱۳۶۱ھ بحوالہ تذکرہ مولانا سید محمد میاں، ص: ۱۷۶)

سید الملت اور دینی تعلیم کے استحکام کے زریں اصول:

دینی تعلیم اور مکاتبِ دینیہ کے قیام و استحکام اور انھیں مؤثر و مفید بنانے کی فکر اور دھن سید الملت کے دل و دماغ میں ایسی رچی بسی تھی کہ اس کے لیے انھوں نے باضابطہ اصول و ضوابط، مبادی و فرائض اور قواعد و تقسیمِ عمل کی پوری وضاحت کی۔ مولانا موصوف نے اس وقت کے اکابر کی سرپرستی میں اس تعلق سے باضابطہ ایک رسالہ تحریر فرمایا؛ تا کہ آئندہ جب اِس کام کو وسعت دی جائے تو لوگوں کو دشواری نہ ہو۔ ذیل میں مختصر اور ضروری اصول لکھے جاتے ہیں:

۱۔ بچوں کے والدین کو ترغیب دی جائے کہ بچوں کی دینی تعلیم و تربیت کے فرض کو وہ خود انجام دیں اور ایسا ماحول پیدا کریں کہ ہر مسلمان کا گھر دینی تعلیم و تربیت کا مرکز بن جائے۔

۲۔ یہ بات پوری طرح ذہن نشین کر لینی چاہیے اور اس کو ہمیشہ یاد رکھنی چاہیے کہ

آئندہ نسل میں اسلام کو محفوظ رکھنے کی سب سے زیادہ کام یاب صورت یہ ہے کہ ہم خود عملاً مسلمان بن جائیں۔خربوزہ خربوزہ سے رنگ پکڑتا ہے۔ ہمارے اعمال اولاد کے لیے عملی سبق ہونے چاہئیں، ہم اپنے عمل اور قول وفعل کو اسلامی سانچے میں ڈھالیں، ہماری اولاد کا ذہن ودماغ، شعور وکردار بھی اسی سانچے میں ڈھل جائے گا۔

۳۔ائمہ مساجد کو آمادہ کیا جائے کہ وہ اپنی پیشوا کی حیثیت سے اپنا فرض پہچانیں اور جو بچے یا بڑے دینی تعلیم سے محروم ہیں، ان کو صبح یا شام کے اوقات میں دینی تعلیم سے آشنا کریں اور مرکزی جمعیت علمائے ہند کی تعلیمی کمیٹی نے دینیات کا نصاب اور طریقہ تعلیم مرتب کر کے جو سہولتیں پیدا کی ہیں، ان سے فائدہ اٹھائیں۔ائمہ مساجد کو آپ نے یوں جھنجھوڑا:

> ''ائمہ مساجد کو آمادہ کیا جائے کہ وہ شبینہ یا صباحی مکتبوں میں تعلیم وتربیت کی مقدس خدمت انجام دیں، اس مقدس خدمت کو پیغمبرانہ خدمت کہا جا سکتا ہے؛ کیوں کہ آں حضرت ﷺ کو جو خدمات سپرد کی گئی تھیں، ان میں بہت بڑی خدمت تعلیم وتربیت تھی۔ چناں چہ اللہ تعالی نے اپنے کلام پاک میں متعدد جگہ آپ کی شان یہ بتائی ہے: يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ خود آپ نے اپنے متعلق فرمایا:إنّی بُعِثتُ مُعَلِّماً۔''(دینی تعلیمی تحریک،ص:۱۲)

۴۔مسلمانوں کو توجہ دلائی جائے کہ جہاں تک ممکن ہو وہ اپنی مساجد کے لیے ایسے امام کا انتخاب کریں، جو دینی تعلیم وتربیت کا سلیقہ اور اس سے دل چسپی رکھتے ہوں۔

۵۔کوشش کی جائے کہ ہر ایک مسلم آبادی میں اسلامی مدرسہ قائم ہو، جس میں دینی تعلیم کے ساتھ پرائمری اسکول کے لازمی مضامین کی تعلیم بھی سرکاری اسکولوں کے درجات کے معیار پر دی جائے۔

۶۔ ہفتہ میں کم از کم ایک دن گاؤں، دیہات میں پہنچ کر وہاں کے مسلمانوں کی تعلیمی حالت کا جائزہ لیا جائے۔

۷۔ مکاتبِ دینیہ کی شیرازہ بندی کے لیے بہتر یہ ہوگا کہ ضلع میں جو کام یاب اسلامی مدرسے پہلے سے کام کر رہے ہیں، ان کے ساتھ ان کو منسلک کیا جائے۔ کام یاب مدارس کے ذمہ دار حضرات کا بھی فرض ہے کہ وہ چھوٹے مدرسوں کی کشتی کو سنبھالیں اور ان کی امداد واعانت کریں۔

۸۔ مسلمانوں کو عادی بنایا جائے کہ جس طرح مسجدوں، یتیم خانوں، عربی مدرسوں کی امداد کرتے ہیں، دینی مکتبوں اور اسکولوں کی امداد بھی زندگی کی ایک ضرورت سمجھیں اور چٹکی، ماہانہ چندہ یا فصل پر غلہ جیسی کوئی ایسی صورت جس کو ہمیشہ ہمیشہ نبھا سکیں، ضرور اختیار کریں۔

۹۔ ہر ضلع میں اس ضلع کے ہمدردانِ ملت کا نمائندہ اجتماع کر کے ایک تعلیمی بورڈ قائم کیا جائے، اس کے عہدہ دار مقرر کیے جائیں، دفتر کا انتظام کیا جائے اور آمد وصرف کا میزانیہ (سال بھر کا بجٹ) منظور کیا جائے۔

۱۰۔ ہر ایسا مسلمان بورڈ کا ممبر بن سکتا ہے جو: (الف) ملت سے ہمدردی رکھتا ہو۔ (ب) دامے، درمے، قدمے، سخنے؛ جس طرح بھی ممکن ہو، دینی تعلیم کی تحریک میں حصہ لینے اور اس کو آگے بڑھانے کا تہیہ اور عزم کرے۔ (ج) اپنے حلقہ میں باثر ہو۔ (د) صاحب الرائے اور سنجیدہ مزاج ہو۔ (ہ) مسلمانوں کے اندرونی اختلافی مسائل میں روادار ہو۔

۱۱۔ آپس کے تبادلۂ خیالات، جلسوں، اشتہارات، رسالوں اور پمفلٹوں وغیرہ کے ذریعہ ناسمجھ بچوں کے سرپرستوں اور سمجھ دار بچوں کو دینی تعلیم پر آمادہ کیا جائے۔

۱۲۔ جن محلوں یا دیہات میں مسلمانوں کی آبادی کافی ہے، وہاں پورے وقت کا مکتب قائم کیا جائے، جن میں سرکاری پرائمری اسکولوں کے کورس کے ساتھ دینی تعلیم کا انتظام کیا جائے۔ جہاں پورے وقت کا مدرسہ نہ قائم ہو سکے، وہاں صبح وشام کے وقت دینی تعلیم کا انتظام کیا جائے۔

۱۳۔ بورڈ کی طرف سے نشر واشاعت کا سلسلہ بھی قائم کیا جائے۔ مثلاً: دینی تعلیم کی اہمیت وضرورت کے متعلق گاہے گاہے اپیلیں شائع کی جائیں، دینی تعلیم کے سلسلے میں اکابر علما کی تقریریں یا مثلاً خطبات صدارت کے ضروری اقتباسات اپنے ضلع کی زبان اور رسم الخط میں شائع کیے جائیں۔ (ص:۱۴)

مکاتبِ دینیہ اور مالیہ کا نظام:

چوں کہ مالیہ کے بغیر مکاتب کا استحکام بہت مشکل ہے؛ اس لیے آپ نے اِس کے لیے مندرجہ ذیل آسان اور قابلِ عمل تجویز بنائی ہیں:

۱۔ کاشت کاروں سے طے کرلیا جائے کہ سواں حصہ (سو سیر میں ایک سیر) دینی تعلیم کے اس نظام کے لیے دیں گے، جو ان کے گاؤں میں قائم کیا گیا ہے۔

۲۔ شہروں، قصبوں یا دیہاتوں میں ملازمت پیشہ مسلمانوں سے طے کرلیا جائے کہ وہ اپنی آمدنی کا مثلاً سواں حصہ دیں گے، یعنی سو روپیہ میں ایک روپیہ۔

۳۔ چٹکی فنڈ، یعنی خواتین سے طے کرلیا جائے کہ وہ صبح وشام جب بھی روٹی پکائیں، ایک چٹکی چٹکی فنڈ کی ہنڈیا میں ڈال دیں اور مہینہ میں اس کا آٹا ادارے کے کارکنوں کو دے دیا جائے۔

۴۔ ردی فنڈ: مثلاً ردی اخبار، کاغذ، لوہا، ٹین وغیرہ مسلمان پابندی سے ان کو محفوظ رکھیں اور ادارہ کی طرف سے ان کی فراہمی اور فروخت کا انتظام کردیا جائے۔

۵۔ تاجر اور دکان دار، وکلا اور ڈاکٹر جس طرح سیل ٹیکس ادا کرتے ہیں، اسی طرح آمدنی کا کوئی حصہ، جس کو بہ سہولت پابندی کے ساتھ ادا کرسکیں، اس مدِ خیر کے لیے مخصوص کردیں۔

۶۔ کارخانوں کے مزدور، جب بھی ان کو مزدوری ملے، روپیہ میں ایک نئے پیسے (اس دور کے حساب سے) کے حساب سے اس کارِ خیر کے لیے مخصوص کردیں۔

۷۔ متولیانِ وقف سے اپیل کی جائے کہ وہ وقف کی آمدنی میں سے زیادہ سے

زیادہ حصہ اس کارِ خیر کے لیے مخصوص کردیں۔

مکاتبِ دینیہ اور مناسب ماحول:

مولانا نے یہ بھی ضروری سمجھا کہ دینیات کے درجے میں اس کے مناسب ایسی چیزیں بھی موجود ہوں جن سے دماغ متاثر ہوں اور ان کے مشاہدہ سے سبق سمجھنے میں مدد ملے۔ لکھتے ہیں:

> ''دینیات کے درجے میں خانہ کعبہ، مکہ معظّمہ، مدینہ منورہ، مسجد قبا، مسجد منی، آں حضرت ﷺ کی مسجد [مسجدِ نبوی] جبل عرفات اور تاریخی مقامات؛ مثلاً: میدانِ بدر، جبلِ احد، حدیبیہ وغیرہ کے نقشے، آں حضرت ﷺ کے مکتوبِ گرامی کا عکس، عقائد اور اخلاق کے سلسلے میں چارٹ اور خاص آیتوں کے کتبے ہوں۔ یہ آرائش بچوں میں درجہ سے بھی دل چسپی پیدا کرے گی اور موقع بہ موقع سبقوں کو سمجھانے اور یاد کرانے میں بھی مددگار ہوگی۔'' (دینی تعلیمی تحریک، ص:۲۳)

مکاتبِ دینیہ کے لیے ضروری اشیا:

مکاتب کے استحکام کے لیے کچھ خاص ضابطہ کی چیزیں بھی ضروری ہیں، ان کے بغیر مکاتب کا نظم ونسق برقرار رکھنا مشکل ہے۔ مولانا نے اس کے لیے مندرجہ ذیل چیزیں ضروری قرار دیں:

۱۔ تعلیمِ مدرسہ کا نصاب معین ہو، مضامین معین ہوں، مدتِ تعلیم مقرر کی جائے، تعلیم کے درجات قائم کیے جائیں، نصاب کا نقشہ سامنے رکھا جائے، ہر مہینہ کی مقدارِ خواندگی مقرر ہو۔

۲۔ نظام الاوقات کا نقشہ بنایا جائے۔

۳۔ روزانہ پہلے گھنٹہ میں لڑکوں کی حاضری لے کر لڑکوں سے گنتی کرایا جائے۔

۴۔ ہر مکتب میں دو رجسٹر ہونے ضروری ہیں؛ رجسٹر داخلہ، رجسٹر حاضری۔

۵۔ تختہ سیاہ کا استعمال کیا جائے۔ (مستفاد از: دینی تعلیمی تحریک)

مکاتب دینیہ کی آرائش:

اس بارے میں لکھتے ہیں:

''اگر مکتب یا مدرسہ کے ساتھ صحن بھی ہو تو وہ بھی سجا ہوا ہونا چاہیے، دیوار یا کمرہ کے دروازوں پر سبق آموز جملے لکھے جا سکتے ہیں، رنگ وروغن کی ضرورت نہیں ہے، البتہ سپیدی ضرور ہونی چاہیے، ان کے علاوہ صحن میں چمن اور پھلواری سجاوٹ کی سب سے بڑی چیز ہے، اس کا انتظام ضرور رہنا چاہیے۔'' (ص:۲۴)

مکاتبِ دینیہ اور صفائی ستھرائی:

مکاتب میں صفائی ستھرائی کا خیال رکھنا کس قدر ضروری ہے، اس تعلق سے رقم طراز ہیں:

''سجاوٹ سے مقدم صفائی ہے، مکتب یا مدرسے کچے مکان میں ہوں یا پھونس کے چھپر میں، صفائی اور ستھرائی لامحالہ ضروری ہے۔ آں حضرت ﷺ کے عہدِ مبارک میں مسجد ایسی کچی تھی کہ آج کل کچی مسجدیں بھی بہ ظاہر اس کے مقابلے میں مضبوط ہوں گی۔ یہی حال ان حجروں کا تھا جو ازواج مطہرات کے لیے نام زد تھے، جن میں خود سرورِ کائنات ﷺ بسیرا فرمایا کرتے تھے؛ مگر پھر بھی احادیث مقدسہ میں تطییب وتطہیر، پاک صاف رکھنے اور خوشبو سے مہکانے کے احکام وارد ہوئے ہیں، اور جہاں تک بدبو کا تعلق ہے تو پاخانہ، پیشاب تو درکنار؛ لہسن اور پیاز جیسی چیزوں کی بدبو بھی قابلِ برداشت نہیں تھی۔ اِس سنتِ مبارکہ کی اتباع بھی ہمارا فرض ہے۔'' (ص:۲۴)

مکاتبِ دینیہ اور قرینہ:

مکاتبِ دینیہ کے استحکام کے لیے سید الملت قرینہ اور سلیقہ کو بھی ضروری سمجھتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

''قرینہ سے چیزوں کا رہنا، صفائی اور سجاوٹ اور ہر قسم کی آرائش کی جان ہے۔ چیزیں اگر قرینہ سے رکھی ہوئی ہوں تو ان کا بھدا پن بھی چھپ جاتا ہے اور قرینہ سے نہ ہوں تو اعلیٰ قسم کا آرائشی سامان بھی کوڑا معلوم ہونے لگتا ہے۔ بچوں سے کام لینے کا

ڈھنگ اور جرم وسزا بھی نظمِ مدرسہ کے لیے ضروری عنوان ہیں۔'' (ص:۲۴)

سید الملت کی نصابی کتابوں کا پس منظر اور تعارف:

۱۹۴۸ء میں جب جمعیت علمائے ہند نے مکاتبِ دینیہ کے لیے دینی تعلیم کا نصاب بنانا طے کیا تو مولانا محمد میاں صاحب کی بھی خدمات لی گئیں۔ مولانا مؤرخ بھی تھے، بلکہ آپ کا مؤرخانہ وصف آپ کی ہر تصنیف میں نمایاں ہو جاتا ہے، اسی بنیاد پر آپ مؤرخِ ملت کی حیثیت سے بھی معروف ہوئے۔ مؤرخ ماضی کی داستان سے سبق حاصل کرتے ہوئے، مستقبل کے خطرات وفوائد کو پیشِ نظر رکھتا ہے۔ مولانا کے پیشِ نظر یہ بات تھی کہ بچوں کے لیے ایسی کتابیں تیار کی جائیں، جس سے یہ حقیقت مدلل طور پر مسلمان بچوں کے ذہن نشین ہو جائے کہ اسلام ایک مکمل دین ہے اور اس کی تہذیب ہر دور کے لحاظ سے ایک بلند وبالا زندہ تہذیب ہے اور وہ ایسے اخلاق کی تعلیم دیتا ہے جو روحانیت، انسانیت، شرافت، انسانی بھائی چارہ، دماغی اور ذہنی سکون، آپس کی خوش گواری، حسنِ اعتماد اور عالمی امن وامان کے لحاظ سے سب سے اعلی اور بلند اخلاق ہیں، جن کے متعلق سرورِ کائنات ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا: إنّی بُعِثتُ لِأُتَمِّمَ مَکارِمَ الْأَخْلاقِ۔ (میں اس لیے مبعوث ہوا ہوں کہ اعلی اخلاق کی تکمیل کروں۔)

چناں چہ آپ نے اسی کے بہ موجب کتابیں تصنیف کیں، جو دینی تعلیم کے سلسلے میں نہ صرف مضامین، بلکہ ترتیب، طرزِ ادا اور زبان وغیرہ کے لحاظ سے بھی سب سے بہتر اور جامع تصانیف مانی گئیں۔ مولانا کی کتابیں جہاں بھی پہنچی ہیں، مقبول ہوئی ہیں۔ جس طرح وہ قدیم ماہرین کی پسندیدگی حاصل کر چکی ہیں، جدید طریقہ تعلیم کے ماہرین بھی اس کے مداح اور اس کو ترقی یافتہ طرزِ تعلیم قرار دیتے ہیں۔ مولانا کے تیار کردہ چارٹوں اور تعلیمی کارڈوں کے ذریعے تعلیم صرف سہل اور آسان ہی نہیں ہوئی، بلکہ بچوں کی نفسیات کے بہ موجب آسان اور دل چسپ انداز اختیار کیا ہے؛ تاکہ بچے اکتائیں نہیں، بلکہ مانوس رہیں اور کھیل وتفریح کی طرح تعلیم میں ہنسی خوشی مشغول رہ سکیں۔ مولانا کی اکثر کتابوں میں

طریقہ تعلیم بھی لکھا گیا ہے، جس سے ان کتابوں کا حسن اور ان کی افادیت دوچند ہو گئی ہے۔ طلبہ اور اساتذہ دونوں کے لیے کافی سہولت پیدا ہو جاتی ہے۔ (مستفاد: دینی تعلیم و تربیت کے متعلق جمیعت علما ہند کا احساس فرض، ص:۷)

سید الملت بہ طور ماہر نفسیات و معلم:

مکاتبِ دینیہ کے استحکام کا ایک حصہ یہ بھی تھا کہ دینیات کے سلسلے میں مولانا نے مسئلہ تعلیم اور طریقہ تعلیم نام کی کتاب بھی لکھی، جس میں بہت وضاحت اور آسان طریقہ پر حضراتِ اساتذہ کو سمجھایا گیا ہے کہ دینیات کے مضامین کی زبانی تعلیم بچوں کو کس طرح دی جائے اور کس طرح ان کی ذہنی اور عملی تربیت کی جائے؟ یہ کتاب آپ کی مشہور ترین کتابوں میں ہے، جو آپ کو ایک ماہر نفسیات اور کامیاب معلم کے طور پر دنیا کے سامنے پیش کرتی ہے۔ مولانا نور عالم خلیل امینی صاحب لکھتے ہیں:

> ''بہ طور معلم اور ماہر تعلیم مولانا سید محمد میاں کا بڑا کارنامہ وہ تعلیمی نصاب ہے جو آپ نے مرتب فرمایا، جس میں نہ صرف طلبا کے لیے ٹیکسٹ بکس ہیں؛ بلکہ استاذوں کی تربیت کے لیے بھی مواد موجود ہے۔'' (پسِ مرگ زندہ، ص:۸۹)

تعلیمی چارٹ:

سید الملت نے بچوں کی نفسیات کو سامنے رکھ کر سولہ عدد چارٹ تیار کیے تھے؛ تا کہ انھیں مدارس اور مکاتبِ دینیہ میں آویزاں کیا جائے، جن کے ذریعے وہ معلومات، ہدایات اور دینی و اخلاقی باتیں بچوں کے قلب و ذہن میں اترتی رہیں، نیز بچوں کو محسوس طور پر سمجھانے کے لیے اس سے مدد حاصل کی جائے۔ تعلیمی چارٹ کی تیاری آپ کا بڑا کارنامہ ہے؛ کیوں کہ بچوں کی نفسیات اور ان کی عمر کا لحاظ کر کے بہت آسان انداز میں کچھ لکھنا سب کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ یہ چارٹ گھروں میں بھی مناسب جگہوں پر آویزاں کیے جا سکتے ہیں، یقیناً اس کے فوائد محسوس کیے جائیں گے۔ ہر ایک چارٹ کا تعارف درج ذیل ہے:

چارٹ نمبر (۱): اس چارٹ میں گیارہ تصویریں دی گئی ہیں؛ تا کہ ایک تصویر کی

طرف اشارہ کر کے بچوں سے پوچھا جائے کہ یہ کیا ہے؟ اس سے بچوں کو حروف پہچاننے کا ڈھنگ آئے گا۔ اور یہ بات بھی ذہن نشین ہو جائے گی کہ جو چیزیں ہم دیکھتے ہیں اور جو کچھ ہم زبان سے بولتے ہیں وہ کاغذ پر لکھا بھی جا سکتا ہے۔

چارٹ نمبر (۲): یہ چارٹ حروف شناسی کے مقصد کے پیشِ نظر تیار کیا گیا ہے، اور لفظ اللہ کے مفردات کیا ہیں اور مفردات آپس میں کیسے جڑتے ہیں کہ لفظ اللہ بن جاتا ہے؟ نقشہ میں اسے سمجھایا اور دکھایا گیا ہے۔

چارٹ نمبر (۳): یہ چارٹ نمبر (۲) کے برعکس ہے، اس میں لفظ اللہ کی ترکیب کا مفرداتی تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔

چارٹ نمبر (۴)(۵)(۶): یہ تینوں چارٹ دستیاب نہ ہو سکے۔

چارٹ نمبر (۷): یہ چارٹ اردو عربی قاعدہ کے پسِ منظر میں تیار کیا گیا ہے۔ تصویروں کے ذریعہ حروف کی شناخت کرائی گئی ہے، اس چارٹ سے بچے آسانی کے ساتھ حروف، حرکات اور نقطے کی شناخت کر سکتے ہیں۔ مفردات سے مرکبات کی جانب توجہ بھی مبذول کرانا اس چارٹ کا خاص مقصد ہے۔

چارٹ نمبر (۸): یہ چارٹ درجہ اول و دوم کے طلبہ کیلئے تیار کیا گیا ہے، اور اس سے دو اہم اسلامی تہذیب پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ سلام اور جوابِ سلام کے الفاظ کے ساتھ چھینک سے متعلق دعائیں لکھی گئی ہیں؛ تاکہ طلبہ اس اہم تہذیب کو اپنی زندگی کا اٹوٹ حصہ بنا لیں۔

چارٹ نمبر (۹): یہ چارٹ بھی درجہ اول و دوم کے لیے ہے، جس میں میری اور پھسڈی کی اصطلاح کے ذریعہ بچوں میں آگے بڑھنے اور درجہ میں حاضری کا جذبہ پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

چارٹ نمبر (۱۰): درجہ دوم کے لیے یہ چارٹ تیار کیا گیا ہے، جس میں سلیقہ کے عنوان سے بہت سہل زبان میں اسلام کی اہم تعلیمات لکھی گئی ہیں۔ یہ چارٹ دینی تعلیم کا رسالہ نمبر (۳) سے ماخوذ ہے۔ بچوں کو مکتب میں روزانہ جن امور سے سابقہ پڑتا ہے، ان

امور کے اسلامی آداب بتائے گئے ہیں۔

چارٹ نمبر (۱۱): برائے درجہ دوم وسوم۔ اس چارٹ میں صفائی کے بارے میں اہم ہدایات وآداب کی نشان دہی کی گئی ہے۔ یہ چارٹ دینی تعلیم کا رسالہ نمبر (۳) سے ماخوذ ہے۔

چارٹ نمبر (۱۲): درجہ سوم وچہارم کے لیے تیار کیا گیا ہے، اس چارٹ میں صفائی، پاکیزگی اور جمالِ مسلم کے عنوان سے ایک تفصیلی مضمون ہے، وضو اور مسواک کی ترغیب دلائی گئی ہے۔ علاوہ ازیں ناک، آنکھ، داڑھی، مونچھ، ہاتھ، پاؤں، بدن اور کپڑے کی پاکی اور طہارت کا شرعی حکم دل نشیں انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ ضمنی طور سے سنت پر عمل کے فوائد اور ترکِ سنت کے نقصانات کی وضاحت کی گئی ہے۔

چارٹ نمبر (۱۳): درجہ دوم وسوم کے طلبہ کے لیے یہ چارٹ تیار کیا گیا ہے، اس میں آدابِ ملاقات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ آپ کہیں جائیں اِس عنوان کے تحت سترہ آداب درج کیے گئے ہیں۔ کوئی آپ کے یہاں آئے اس عنوان کے ذیل میں دس آداب لکھے گئے ہیں۔ دونوں آداب قرآن وحدیث سے ماخوذ ہیں۔ چارٹ کا یہ مضمون دینی تعلیم کا رسالہ (۳) اور (۴) سے ماخوذ ہے۔

چارٹ نمبر (۱۴): درجہ سوم وچہارم کے واسطے تیار کیے گئے اِس چارٹ میں آدابِ مجلس کے تحت اکیس آداب درج کیے گئے ہیں۔ اخیر میں آدابِ گفتگو کے عنوان سے گفتگو کے آداب اور طریقہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ دینی تعلیم کا رسالہ ۳/ ۶/ اور/ ۹ اس چارٹ کا ماخذ ہے۔

چارٹ نمبر (۱۵): یہ درجہ سوم وچہارم کے لیے ہے۔ دربار نبوی، یعنی بزمِ رحمۃ للعالمین ﷺ کی خصوصیات اور آداب کے تحت اٹھارہ حصوں کے ضمن میں خصوصیات وآداب کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ پوری تفصیل شمائلِ ترمذی سے مستفاد ہے۔ چارٹ کے بیچ میں شمائل ترمذی کا منظوم ترجمہ لکھا گیا ہے۔ یہ منظوم ترجمہ مولانا عبدالکافی مرادآبادی (م: ۱۸۵۸ء)

کی شاہ کار تخلیق ہے۔

چارٹ نمبر (۱۶): درجہ سوم وچہارم کے لیے تیار کیے گئے اس چارٹ میں کھانے پینے کے آداب درج کیے گئے ہیں۔ اولاً اکلِ حلال کی اہمیت بتائی گئی ہے، ثانیاً کھانے کے آداب کے تحت بیس آداب لکھے گئے ہیں، بعدہ پانی پینے کے آداب کے ضمن میں چھ آداب درج کیے گئے ہیں۔ یہ مضمون دینی تعلیم کا رسالہ نمبر ۶ اور ۹ سے ماخوذ ہے۔

تعلیمی کارڈ:

سید الملت نے تعلیمی کارڈ بچوں کی نفسیات کو مدِ نظر رکھ کر تیار کیا تھا، یہ بچوں کے لیے ایک طرح کا کھیل ہے۔ کارڈ کے اوپر ایک ایک حرف یا ایک ایک جملہ لکھ دیا جائے، سبق کے وقت یہ کارڈ بچوں کو تقسیم کر دیا جائے، پھر ہر ایک بچہ سے پوچھا جائے کہ اس کے پاس جو کارڈ ہے اس پر کیا حرف ہے؟ جب بچہ کارڈ کا حرف بتائے گا تو پھر بچہ سے یہ کہا جائے گا کہ تختہ سیاہ یا تعلیمی چارٹ میں جہاں یہ حرف ہے اس پر اپنا کارڈ رکھ دے۔ اس طرح ایک دفعہ میں بچہ دو مرتبہ حرف کی شناخت کر لے گا اور بار بار کے اس طرح کی مشق سے بچہ کی شناخت پختہ ہو جائے گی۔

اسلامی تعلیمات کا مرقع:

ایک چارٹ کی شکل میں ابتدائی تعلیمات درج کی گئی ہیں۔

اردو عربی کا قاعدہ:

اس قاعدہ میں حرفوں کی صورتیں اور ان کی آوازیں بتائی گئی ہیں۔ حرف کے ساتھ اس کا تلفظ بھی لکھ دیا گیا ہے؛ تاکہ بچوں کو صحیح مشق کرائی جا سکے۔ اس قاعدہ میں کل انتالیس اسباق ہیں، تدریج کے ساتھ آسان زبان میں تجوید کی تمرین بھی ہے۔ بچوں کی دل چسپی کے لیے الفاظ کے ساتھ تصویروں کے ذریعہ مثالیں بھی دی گئی ہیں۔ عربی حروف وقواعد کے ساتھ ہندی حروف اور ان کی مثالیں بھی درج کی گئی ہیں۔ یہ قاعدہ الف، ب سے شروع ہو

کر تسمیہ، تعوذ، ثنا اور درود شریف پر ختم ہوتا ہے۔ اس قاعدہ میں بھی بچوں کی نفسیات کا خوب خیال رکھا گیا ہے۔

قاعدہ حروف شناسی مع طریقہ تعلیم:

سولہ صفحات اور گیارہ اسباق پر مشتمل یہ مختصر قاعدہ حروف کی شناخت کے لیے لکھا گیا ہے۔ حروف کی پہچان کے لیے اور بچوں کے ذہن و دماغ میں انھیں جاگزیں کرنے کے لیے آسان اور دل چسپ انداز میں کہانی کا سہارا لیا گیا ہے، کہیں تصویر کے ذریعہ بھی یہ کام لیا گیا ہے۔ مفردات سے مرکبات کا وجود کیسے ہوتا ہے؟ طریقۂ ادا اور طرزِ تلفظ میں کیسے فرق آتا ہے؟ دل نشیں انداز میں اسے سمجھانے کی کام یاب کوشش کی گئی ہے۔ نیز طریقہ تعلیم کی وضاحت نے معلمین کے لیے کافی سہولت پیدا کر دی ہے۔

تاریخ الاسلام:

غالباً یہ سب سے پہلی تصنیف ہے۔ ابتدائی درجات (دوم، سوم، چہارم) کے بچوں کے لیے سوال و جواب کے انداز میں لکھی گئی یہ کتاب تین حصوں پر مشتمل ہے: پہلا حصہ سرورِ کائنات حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی مکی زندگی، دوسرا مدنی زندگی اور تیسرا حصہ رسول اکرم ﷺ کے اخلاق و عادات کے ذکر میں ہے۔ یہ کتاب مدارس کے نصاب میں شامل ہے۔ زبان انتہائی سادہ اور انداز دل چسپ ہے۔

ہمارے پیغمبر ﷺ:

بچوں کے لیے لکھی گئی اس مختصر کتاب میں سیرتِ مبارکہ کو آسان انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ بھی داخلِ نصاب ہے۔ کتاب کے دوسرے حصے میں اسلامی عقائد کی وضاحت کی گئی ہے۔ اس کا انگریزی ترجمہ بھی شائع ہو گیا ہے۔

مشکوٰۃ الآثار:

یہ کتاب اخلاقیات میں احادیثِ مبارکہ کا ایک مختصر مجموعہ ہے، جو درسِ نظامی میں

مشکوۃ سے پہلے پڑھایا جاتا ہے۔ دارالعلوم دیوبند کے نصاب میں داخل ہے۔

طریقۂ تقریر:

دوحصوں میں درجہ دوم، سوم، چہارم اور پنجم میں سات سے دس سال سے کم عمر کے بچوں کے لیے یہ کتاب لکھی گئی ہے؛ تاکہ تقریر اور گویائی کی مشق کرائی جائے۔ اس کے لیے مولانا نے ہدایات بھی لکھی ہیں؛ تاکہ طریقہ موثر ہو۔

دینی تعلیم کا رسالہ:

یہ رسالے ۱۲؍ حصوں میں ہیں۔ جمعیت علمائے ہند کے مکاتب میں رائج ہیں۔ اب تو ان رسالوں سے اہلِ قلم نے کئی نئے رسالے اور نصاب بنا لیے ہیں۔ مولانا نسیم اختر شاہ قیصر صاحب اس کتاب کے بارے میں رقم طراز ہیں:

''میرا ذاتی تاثر یہ ہے کہ یہ کتاب گو بچوں کے لیے لکھی گئی ہے، مگر پانچ سال کے بچے سے لے کر پچاس سال کے آدمی تک کے لیے یہ کتاب مفید، کارآمد اور معلومات افزا ہے۔ اس کی زبان سادہ، دل کش اور اسلوب خوب صورت ہے۔ کہیں الجھا نہیں، سیدھا سادہ اندازِ بیان، بات کہنے کا عمدہ سلیقہ اور قاری کے ذہن کے اعتبار سے گفتگو کا ملکہ ان کو حاصل ہے۔ اردو کی وہ چند کتابیں جنھیں دائمی شہرت اور قبولیت حاصل ہوئی، ان میں حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کی بہشتی زیور حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب کا تعلیم الاسلام اور حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب کا دینی تعلیم کا رسالہ شامل ہیں۔ ان تینوں کتابوں کے ناشرین بھی شاید یہ نہ بتا سکیں کہ کتنے ایڈیشن اِن کتابوں کے بازار میں آ چکے ہیں۔ اگر حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب دیوبندی صرف دینی تعلیم کا رسالہ لکھ کر قلم اٹھا کر رکھتے اور کچھ نہ لکھتے، تب بھی ان کی عظمت و رفعت اور عند اللہ مقبولیت کا اظہار ہوتا رہتا۔''

(میرے عہد کے لوگ، ص: ۴۷، نسیم اختر شاہ قیصر، ازہرا کیڈمی، محلّہ خانقاہ، دیوبند)

☆☆☆☆☆

سید الملت کی صحافتی خدمات:

ماہنامہ ''قائد'' مرادآباد

ایک تعارف

مولانا محمد عرفات اعجاز اعظمی

دورِ غلامی میں ہندستان کی مذہبی صحافت کے افق پر متعدد رسائل و جرائد طلوع ہوئے اور اپنی تابانی بکھیر کر غروب ہوگئے۔ ان میں سے بہت سے رسائل ایسے تھے جن کے ناموں کی شفق تک باقی نہیں رہی، قلوب و اذہان سے یکسر فراموش ہو چکے ہیں۔ ان کے لیے جگہ محض اوراقِ پارینہ میں رہ گئی ہے۔ اور بعض رسائل ایسے بھی تھے جن کی ضیاباری کم مدت کے لیے ضرور ہوئی مگر ان کی شفقِ سرخ بہت سے ذہنوں کے افق پر ابھی تک باقی ہے۔ انھیں معدودے چند ماہناموں میں ایک ذی وقار نام...... مولانا سید محمد میاں صاحب کی زیرادارت نکلنے والے رسالے...... 'قائد' مرادآباد کا بھی ہے۔

قائد مرادآباد کے ضوفشانی کی کل مدت محض بیس مہینے ہے۔ یعنی محرم ۱۳۵۷ھ مطابق مارچ ۱۹۳۸ء تا شعبان ۱۳۵۸ھ مطابق ستمبر ۱۹۳۹ء ہے۔ مگر قلیل مدت کے باوصف قائد نے اپنے معیار و وقار اور اندازِ پیش کش کی ندرت کی وجہ سے اپنے زمانہ کے سرخیل علما و دانشوروں کے دامنِ دل کو اپنی جانب کھینچا اور متعدد معاصر رسائل و جرائد نے اس کے لیے ستائشی کلمات لکھے۔

قائد کی انفرادیت و امتیاز کے لیے محض اس کے سرپرست اور ارکانِ ادارت کا نام ہی کافی ہے۔ اس کے سرپرست شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی نوراللہ مرقدہ تھے۔ مولانا مدنی کا نام کسی شمارے میں سرپرست کی حیثیت سے مطبوع تو نہیں ہوا، مگر قائد کے

پہلے شمارے میں بعنوان 'التماس' اس کی صراحت ہے کہ 'حضرت شیخ الہند ثانی دام ظلہم [مولانا سید حسین احمد مدنی] رسالہ ہذا کے سرپرست قرار دیے گئے ہیں۔' [محرم، صفر ۱۳۵۷ھ/ص: ۵] رسالہ کے قائد التحریر مولانا سید محمد میاں صاحب تھے اور مدیر مسئول کی حیثیت سے رسالہ کی لوح پر مولانا سید اختر الاسلام قاسمی صاحب کا نام شائع ہوتا تھا۔ رسالہ میں ارکان ادارت کا باقاعدہ کوئی کالم تو نہیں تھا، مگر غیر منقسم ہندوستان کی جن مایہ ناز شخصیتوں نے اپنی خصوصی نگاہِ التفات کا قائد کو مسلسل سزاوار قرار دیے رکھا، ان کے اسما بالترتیب یہ ہیں:

۱- حضرت العلامہ الحاج مولانا اعزاز علی صاحب۔
۲- حضرت علامہ مولانا سید فخر الدین احمد صاحب۔
۳- حضرت علامہ مولانا عبد الحق مدنی صاحب۔
۴- حضرت مولانا ابوالقاسم محمد حفظ الرحمان سیوہاروی صاحب۔

قائد کی انفرادیت محض ان ناموں کی وجہ سے نہیں تھی بلکہ اس کا امتیاز واعتبار اور مقام اس کے مقاصدِ جلیل اور ندرتِ خیال کی بنا پر تھا۔ قائد کی زنبیل میں متعدد انفرادی واجتہادی کارنامے ہیں۔ قائد کا دینی وسیاسی نہجِ فکر وعمل وہی تھا جو حضرت نانوتوی اور حضرت شیخ الہند کا تھا۔ اس کی وضاحت قائد کے پہلے شمارے میں ان الفاظ میں کی گئی ہے:

''ہم نہایت ذمہ داری کے ساتھ یہ اعلان بھی کیے دیتے ہیں کہ ہمارے تمام مباحث اور ہمارا نقطہ نظر وہی ہوگا جو حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب یا سیدنا شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب قدس سرہ العزیز کا خاص مشن تھا۔'' [محرم، صفر ۱۳۵۷ھ/ ص: ۵]

اور قائد کے جو اہم مقاصد شمار کرائے گئے ہیں، وہ یہ ہیں:

الف- سید الکونین رحمۃ للعالمین ﷺ اور صحابہ کرام بالخصوص اصحابِ صفہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے مبارک اور مستند حالات پیش کر کے مسلمانوں کی مذہبی، سیاسی اور اقتصادی یعنی

مالی اور تجارتی اصلاح۔

ب- تاریخِ عالم اور اقوامِ دنیا کے عروج وزوال کے فلسفے اور وجوہات پر بحث کر کے مسلمانوں کے جذباتِ ترقی وعروج کو بیدار کرنا۔

ج- عربی خواں طلبہ میں عربی کا مذاق پیدا کرنا۔

د- ہندوستان اور حجاز کے مابین صحافتی رابطہ قائم کرنا۔

ان مقاصد کے حصول کے لیے جو مستقل عناوین ومباحث رسالہ کے لیے تجویز کیے گئے تھے، وہ یہ ہیں:

۱- سیرت رسول اللہ ﷺ

۲- ترجمہ ابن کثیر۔

۳- سیرت صحابہ رضوان اللہ تعالی علیہم اجمعین

۴- سیرت اصحاب صفہ رضی اللہ عنہم

۵- تاریخ عالم

۶- مسلم اقتصادیات

۷- سیاساتِ حاضرہ

۸- سیاسی روزنامچہ

۹- رنات العرب۔ یعنی اشعار ومضامین

پھر دوسرے شمارے میں ان عناوین ومباحث میں مزید توسیع کی گئی اور رسالہ کو مزید متنوع وجامع اور بوقلموں بنانے کے لیے تین عناوین یعنی 'فقہیات، عقایدِ اسلام کے متعلق فلسفی مکالمہ اور علمی وادبی افسانہ' کا اضافہ کیا گیا۔

رسالہ کے محض عناوین ہی سے اس کی رنگارنگی اور بوقلمونی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ان میں بعض عناوین تو بالکل غیر ممسوس اور اچھوتے ہیں۔ مثلاً مسلم اقتصادیات، رنات العرب، عقاید اسلام کے متعلق فلسفیانہ مکالمہ اور علمی وادبی افسانہ۔ بہت سے مذہبی رسائل

نے ان موضوعات پر مضامین ومقالات شائع کیے ہوں گے، مگر شاید ہی کسی نے ان کو مستقل عنوان کی حیثیت سے برتا ہو۔

ایسا بھی نہیں ہے کہ یہ بھاری بھرکم عناوین محض تجویز ہی کی حد تک محدود ہوکر رہ گئے ہوں۔ قائد کے بیشتر شمارے ان مجوزہ مباحث میں سے اکثر کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔ان مستقل عناوین میں زیادہ تر ایسے ہیں جن پر لکھنے والے افراد متعین تھے۔مثلاً سیرتِ رسول ﷺ، تاریخ عالم، مسلم اقتصادیات اور عقایدِ اسلام [دلچسپ مکالمے کے انداز میں] پر لکھے گئے زیادہ تر مضامین مولانا سید محمد میاں صاحب کے ہیں۔ان کے علاوہ سیرتِ صحابہ اور سیاساتِ حاضرہ پر بھی چند مہینے مولانا سید محمد میاں صاحب ہی نے لکھا ہے۔ترجمہ ابن کثیر اور متعلقاتِ قرآن کے تمام مباحث کو حضرت مولانا سید فخر الدین احمد صاحب کے قلم نے اعتبار بخشا ہے۔رنات العرب کے دوصفحات عام طور سے حضرت مولانا عبدالحق صاحب مدنی کے قلم سے ہوتے تھے، اور کبھی کبھار مولانا اعزاز علی صاحب بھی ان صفحات کو زینت بخشتے تھے۔رسالہ میں رنات العرب کے صفحات عربی خواں وعربی داں حضرات کو رسالہ کی طرف متوجہ کرنے کے لیے رکھا گیا تھا، اور اس لیے بھی کہ مدارس کے عربی طلبہ میں زبانِ عربی کا ستھرا مذاق اِن صفحات کے ذریعے پیدا کیا جاسکے اور ہندستان وحجاز کے مابین صحافتی رابطہ قائم کیا جاسکے۔فقہیات میں کسی جدید مضمون کی بجائے علامہ ابوالفضل مجدالدین کا قدیم عربی متن 'المختار للفتوی' کا ترجمہ مع ضروری شرح کے شائع کرنے کا سلسلہ رکھا گیا۔ سیاساتِ مسلم یا سیاسیاتِ حاضرہ پر مختلف علمائے کرام ودانشور حضرات اظہار خیال کرتے تھے۔سیاسی روز نامچہ ادارہ کی جانب سے شائع کیا جاتا تھا۔علمی واصلاحی افسانے کے عنوان کے تحت سید مظفر صاحب کا طویل افسانہ 'یتیم بچہ' مسلسل شائع ہوتا رہا۔ یہ افسانہ درمیان میں چند شماروں کے سوا تسلسل کے ساتھ جلد ۱-شمارہ ۲ سے شروع ہوکر جلد ۲ شمارہ ۶ تک ۹/قسطوں میں شائع ہوا۔ان کے علاوہ ایک سلسلہ مضامین قاضی اطہر صاحب مبارک پوری نے بھی بعنوان 'ائمہ اربعہ کے مختصر حالات' شروع کر رکھا تھا۔مولانا حافظ محمد یوسف

انصاری گنگوہی صاحب کا مولانا روم کے ملفوظات 'فیہ مافیہ' کا ترجمہ بھی سات قسطوں میں مطبوع ہوا۔

رسالہ میں چوں کہ مستقل مجوزہ عناوین بارہ تھے، اور سارے عناوین ایسے تھے جنھیں چند صفحات میں سمیٹنا ممکن نہیں تھا۔ اس لیے سال بھر تک تو قائد نے وضع داری نبھائی اور ایفاے عہد کی پاس داری کرتا رہا، مگر آئندہ سال صفحات کی تنگ دامنی اور موضوع کی وسعت کے پیش نظر یہ اعلان کرنا پڑا کہ: ''گزشتہ سال یہ کوشش رہی کہ ہر عنوان کے ماتحت مضمون شائع کیا جائے، لیکن اس میں دشواری یہ ہوئی کہ مضامین ایک اشاعت میں پورے شائع نہیں ہو سکتے تھے، بقیہ باقی رہ جاتا تھا۔ جو ناظرین کرام کے لیے بسا اوقات تکلیف دہ ہوتا تھا، جس کی شکایتیں بارہا موصول ہوئیں، مگر درمیان سال میں طرز بدل دینا بہتر نہیں سمجھا گیا۔......اب سال نو میں اس طرز کو بدل دیا جائے گا۔ مضامین تو وہی شائع ہوں گے جو مستقل عنوانات کے تحت آسکیں، نیز مستند اور بلند پایہ ہوں، مگر یہ ضروری نہ ہوگا کہ ہر نمبر میں تمام عنوانات کے ماتحت مضامین شائع ہوں۔'' [محرم: ۱۳۵۸ھ]

ذی قعدہ ۱۳۵۷ھ میں قائد کا ایک خاص نمبر بعنوان 'صحیفہ سیاست اور مصطفیٰ کمال نمبر' شائع ہوا۔ یہ خاص نمبر ۸۰/صفحات پر محیط ہے۔ اس نمبر کا ماحصل تین مقالے تھے: ایک قائد التحریر مولانا سید محمد میاں صاحب کا مضمون ''غازی ملت مصطفیٰ کمال کی خدمات شریعتِ غرا کی روشنی میں'۔ اس مقالہ میں مصطفیٰ کمال کی خدمات پر شرعی نقطہ نظر سے حد درجہ بصیرت افروز تبصرہ کیا گیا ہے۔ اس مقالہ کی وقعت و معنی خیزی کا صحیح اندازہ اس کے مطالعہ کے بعد ہی کیا جا سکتا ہے۔ دوسرا مقالہ قائد کے مدیر مسئول کا ہے جس کا عنوان ہے 'مسیحاے ترکی مصطفیٰ کمال پاسا کی مختصر سوانح حیات'۔ اس مقالے میں تاریخی ترتیب کے اعتبار سے مصطفیٰ کمال کے حالات زندگی کو قلم بند کیا گیا ہے۔ اور تیسرا مضمون جو دراصل صحیفہ سیاست کے تحت ہے، شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی کا ہے۔ اس مضمون کا عنوان ہے 'مسٹر جناح صاحب کا پراسرار معمہ اور اس کا حل۔ مسلم لیگ کی تاریخِ سیاہ اور علماے ہند کی علاحدگی'۔ اس مضمون

میں مولانا مدنی نے مسلم لیگ کے ساتھ اپنے اشتراکِ عمل اور پھر اس سے قطع تعلق کی وجوہات تفصیل سے بیان فرمائی ہے۔ یہ مضمون حقیقت میں سیاستِ ہند کی تاریخ اور مسلم لیگ کی پالیسیوں پر ایک بھرپور تبصرہ ہے۔

قائد کا جو پہلا شمارہ شائع ہوا تھا وہ محرم،صفر کا مشترک شمارہ تھا۔ایک سال مکمل ہونے کے بعد پھر محرم،صفر کا شمارہ مشترک شائع ہوا،مگر یہ شمارہ سال نامہ یا سالگرہ کے نام سے موسوم ہوا۔ یہ بھی گویا ایک طرح سے خاص نمبر ہی تھا۔اس کی ضخامت دیگر شماروں کے مقابلہ میں بہت زیادہ تھی۔یعنی یہ کل ۱۷۶/صفحات پر مشتمل تھا۔اس شمارے کا خصوصی موضوع 'رحمۃ للعالمین ﷺ کی سیرتِ مقدسہ کا سیاسی اور انقلابی پہلو' ہے۔اس کے خاص مضامین ہیں:

۱- 'اساس انقلاب یا مراقبہ نماز' از حضرت علامہ غازی مولانا محمد بن عبداللہ المعروف منصور انصاری صاحب کابل

۲- 'عقیدہ توحید اور رحمۃ للعالمین کا اثر سیاسیاتِ عالم پر' از قائد التحریر مولانا سید محمد میاں صاحب۔

۳- 'آسمانی حکومت کی تصویر، ترجمہ حکومتِ الٰہی' از حضرت علامہ غازی ابوالمحامد محمد بن عبداللہ انصاری مقیم کابل [جلاوطن از ہندستان]

۴- 'رحمۃ للعالمین کا انقلابی شاہکار' از مولانا بدرالحق صاحب خان کوٹی ندوی۔

۵- اشاعت وارتقاے اسلام۔از مولانا منفعت علی صاحب حسینی منگلور۔

۶- 'آزاد ہندستان میں اسلامی تحفظات' از مولانا مقصود علی خان صاحب یوپی سنبھلی۔

'قائد' کی اسکیم:

رمضان المبارک ۱۳۵۷ھ کے شمارے میں ''بہبودیِ ملت کے متعلق بہی خواہانِ امت سے اہم مشورہ'' کے عنوان سے ایک اہم منصوبہ قائد نے زعماے امت کی عدالت میں

پیش کیا۔ یہ منصوبہ کیا تھا، بس کہہ لیجیے کہ امت کی دنیاوی بہبود کی شاہ کلید ہے۔ یہ منصوبہ گرچہ آج سے ستر اسّی سال پہلے بنایا گیا تھا مگر موجودہ دور میں اس کی افادیت ونافعیت اُس زمانے سے دوچند ہوگئی ہے۔ اُس وقت غالباً اس پر عمل نہیں ہوسکا، لیکن اگر آج کوئی باحوصلہ مسلم تنظیم اس خاکے میں جدید دور کے لحاظ سے مزید رنگ وروغن کر کے وسیع پیمانے پر نافذ کردے تو یہ ہندستان کے مظلوم ومقہور مسلمانوں کے حق میں ایک بڑی نعمت اور ان کی پس ماندگی کا کارگر علاج ثابت ہو۔ اصل اسکیم تو رسالہ کے چھ صفحات پر محیط ہے، جس میں مختصراً اس کے اصول وضوابط، انجام وعواقب اور طریقہ کار کی وضاحت کی گئی ہے۔ یہاں مختصر لفظوں میں اس اسکیم کا خلاصہ پیش کرنے کوشش کی جاتی ہے:

ملت اسلامیہ کی بنیادی ضرورتوں میں ایک اہم اور بڑی ضرورت اقتصادی استحکام ہے۔ 'قائد' نے ملت کے اقتصادی استحکام کے لیے دو چیزوں کی جانب زعماے امت کی توجہ مرکوز کرنے کی کوشش کی:

۱- سیاسی تربیت گاہ:

اس کا مقصد آزاد مدارسِ عربیہ کے تعلیم یافتگان کی سیاسی واقتصادی تربیت کے لیے خوداعتمادی اور خودداری کے اصول پر ایک ایسا ادارہ فراہم کرنا، جس میں:

الف- اقوامِ عالم کی تاریخ، ان کی ترقی وتنزلی کے فلسفے اور دنیا کی موجودہ سیاست، نیز اقتصادیات اور معاشیات کے مطالعہ ومذاکرہ کا اہتمام کرایا جائے۔

ب- جغرافیہ، مساحت، حساب، تجارت وغیرہ، نیز ان زبانوں کی تعلیم دی جائے جو سیاسی یا تبلیغی اعتبار سے ضروری ہوں۔ جن کے حصول کے بعد سرکاری وغیر سرکاری، سیاسی واقتصادی میدان میں رسوخ حاصل کرسکیں۔

ج- فنون حربیہ کی تعلیم دی جائے۔ [جس حد تک قانون اجازت دیتا ہو]

۲- دارالصنائع کمپنی لمیٹیڈ:

مسلمانوں کی گھریلو صنعت کو محفوظ اور ترقی یافتہ بنانے اور ان میں مزید شوق

ودلچسپی اور وسعت پیدا کرنے کی غرض سے یہ کمپنی قائم کی جائے، جس کے ساتھ ایک سیاسی تربیت گاہ بھی ہو۔

الف۔ اس کمپنی کا سرمایہ سردست دس لاکھ روپے ہوگا۔ پھر جیسی ضرورت محسوس کی اُسی اعتبار سے سرمایہ میں اضافہ کیا جاتا رہے گا۔

ب۔ کمپنی کے سردست ایک لاکھ حصے ہوں گے۔ ہر حصہ کی قیمت دس روپے ہوگی۔

ج۔ کم از کم دو ہزار حصص کی فروخت یعنی بیس ہزار روپے کی فراہمی پر کمپنی کا کام شروع کردیا جائے گا۔

د۔ کمپنی کے ماتحت سردست مندرجہ ذیل شعبے ہوں گے:

۱-پارچہ بافی ۔۲- چرم سازی ۔۳-اسلحہ سازی ۔۴- نجاری ۔۵- پریس ۔۶- زراعت ۔۷-ظروف سازی۔

مسلمانانِ ہند کی بہی خواہی کیلئے یہ ایک منظّم اور مربوط اسکیم تھی۔ زعمائے ملت نے اس اسکیم کا خیر مقدم کیا اور اس کی حوصلہ افزائی کی۔ اس اسکیم سے متعلق بعض اساطینِ علم وسیاست کی رائے جو قائد کے صفحات میں محفوظ رہ گئی ہیں، ان کو یہاں نقل کردینا مناسب ہوگا۔

۱-امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد

’آپ نے جو تجویز بھیجی ہے، اس کے مقصد سے مجھے پورا اتفاق ہے۔ البتہ جو بات قابل غور ہے، وہ طرق اور وسائل کا مسئلہ ہے۔ کیا اچھا ہوا گر آپ اس معاملہ کے مشورہ کو بھی اس موقع پر ملتوی رکھیں جو عن قریب دہلی میں متوقع ہے۔ یعنی جمعیۃ علما کی مجلس عاملہ کے انعقاد کے موقع پر۔ ان شاء اللہ میں بھی موجود ہوں گا، دیگر حضرات بھی ہوں گے اور زیادہ بہتر طریقہ پر غور وخوض کیا جاسکے گا۔‘ ۲ شوال ۱۳۵۷ھ کلکتہ [ذی قعدہ ۱۳۵۷ھ: ج۱، ش۱۰۔ ص۲]

۲-مولانا منت اللہ رحمانی صاحب فاضل دیوبند، ایم، ایل، اے، مونگیر بہار

’جو اسکیم جناب والا نے ارسال فرمائی ہے، وہ اپنے مقاصد کے لحاظ سے بہت

زیادہ اہم ہے۔اورضرورت ہے کہ پہلی فرصت میں اس پر توجہ کی جائے۔‘۲۹/نومبر[ذی قعدہ۱۳۵۷ھ:ج اش۱۰۔ص۲]

۳-جناب محامداللہ میاں صاحب انصاری علی گڑھ کالج

’مجاہداعظم اوران کے رفقاے کار کی اس تجویز کو خاکسار بنظر استحسان دیکھتا ہے اوران ضرورتوں کو جواس میں ظاہر کی گئی ہیں،لفظ بلفظ تسلیم کرتا ہے۔............‘

۴-حضرت علامہ ابوالمحاسن مولانا محمد سجاد صاحب نائب امیر شریعت صوبہ بہار

’سیاسی تربیت گاہ اور دارالصنائع کی تجویز مجموعی اوراصولی حیثیت سے بہت ہی مبارک ہے۔اس قسم کی عملی تجویز مسلمانوں کے بہت سے قومی امراض کا صحیح علاج ہوسکتی ہیں۔خدا کرے مسلمان اس ضرورت کومحسوس کریں اوراس دعوت پر لبیک کہیں۔مذکورہ بالا اسکیم کی تفصیلات کے متعلق میں اپنی تفصیلی رائے پیش کروں گا۔‘۱۹/شوال ۱۳۵۷ھ[ذی الحجہ۱۳۵۷ھ:ج۱،ش۱۱۔ص۲۸]

۵-حضرت علامہ مولانا سید سلیمان ندوی صاحب

آپ نے دارالصنائع کی جوتجویز پیش فرمائی ہے،کلی حیثیت سے مجھے اس سے اتفاق ہے۔علاوہ دوسری مصلحتوں کے جوآپ صاحبان کے سامنے ہیں،یہ بات بھی قابلِ ذہول نہیں کہ علما کے حلقہ کی بقا کے لیے پیٹ کے مسئلہ سے گریز نہیں کرنا چاہیے۔ضرورت ہے کہ مدرسی اور خطابت کے علاوہ ان کے لیے کچھ اور ذرائعِ معاش بھی پیدا کیے جائیں۔مجھے آئندہ کا ہندوستان بہت ڈراؤنا معلوم ہوتا ہے اگر مسلمانوں نے اپنی دینی اور اقتصادی نظام کوسنبھالنے کی کوشش نہیں کی۔‘دارالمصنفین ۸/فروری[محرم۱۳۵۸ھ:ج۲ش ا۔ص۱۳۳]

۶-فدائے قوم حضرت مولانا شکراللہ صاحب مہتمم مدرسہ احیاء العلوم مبارکپوراعظم گڑھ

دارالصنائع اور سیاسی تربیت گاہ ہرقرن میں بالخصوص موجودہ دورِانقلاب میں مسلمانانِ عالم کے لیے بے حدضروری اورلازم ہے۔اس پرعمل پیرانہ ہونے سے مسلمانوں

کو جو نقصانات پہنچے ہیں اور پہنچ رہے ہیں، ان کا تصور بھی مشکل ہے۔ اس کے بغیر کسی قوم کا عزت و جرات کی زندگی بسر کرنا مشکل ہے کہ اس کے اندر زندگی کا راز مضمر ہے۔ مسلمانوں کے اندر جو تعطل اور جمود پیدا ہو گیا ہے، اس کے دفعیہ کے لیے یہ کیمیا ہیں۔ تہِ دل سے اس کی زبردست تائید کرتا ہوں اور دعا گو ہوں کہ اللہ تعالی ہم مسلمانوں کو توفیق عطا فرمائیں کہ جلد از جلد اس پر عمل پیرا ہو کر اس کو معراجِ ترقی پر پہنچا دیں، تاکہ عزت و شجاعت کی زندگی بسر کر سکیں۔' وما ذالك على الله بعزيز [محرم ۱۳۵۸ھ: ج ۲، ش ۱، ص ۱۳۳]

'قائد' اساطین علم کی نظر میں:

قائد کی تاریخ گرچہ زیادہ طویل نہیں ہے مگر زمانے کے لحاظ سے ایک رسالے کی کامیابی کے لیے جو بھی چیزیں ضروری تھیں، تقریباً سبھی کو قائد نے اپنے سینہ اوراق پر جگہ دی۔ معیار کی رفعت، انتخابِ مضامین کی ندرت اور علمی و فکری مقالات کی اشاعت اس کا امتیاز رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت کم مدت میں اس نے ملک کے چیدہ چنیدہ اساطینِ علم کو اپنی جانب متوجہ کر لیا۔ بہت سے اساطینِ علم نے خط لکھ کر اس کے لیے نیک خواہشات کا اظہار کیا اور اس کے معیار و امتیاز کو سراہا اور اظہارِ اعتماد کے ذریعے ارکانِ قائد کی حوصلہ افزائی کی۔ قائد کے بارے میں میدانِ علم و قلم کے چند معتبر اور مستند علما کے خیالات کو اس تحریر کا حسن اختتام بنانا مناسب ہوگا، تاکہ قائد کی علمی رفعت کی صحیح جھلک سامنے آ سکے۔

۱- شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی صاحب

'میں نے رسالہ قائد کے بعض بعض مضامین دیکھے۔ میں پہلے ہی سے اس کے کارکنوں سے واقف ہوں۔ سب کے سب ماشاءاللہ ماہرینِ علم و فضل اور صحیح الخیال اشخاص اور اہل کمال افراد ہیں۔ ان میں بہت سے حضرات نے خدمات ملیہ اور وطنیہ میں عالی ہمتی کے ساتھ بہت سی قربانیاں بھی دی ہیں۔ مجھ کو قوی امید ہے کہ قوم مسلم اور تمام ہندستانیوں کے لیے ان حضرات اور رسالہ کی رہنمائی نہایت صحیح اور بہت زیادہ مفید اور کارآمد ہوگی۔' [ربیع الثانی ۱۳۵۷ھ، ص ۲]

۲-علامہ غازی حضرت مولانا عبیداللہ سندھی

'میں ہندستان آنے سے مایوس ہو چکا تھا،مگر جب میں نے دیکھا کہ امام ولی اللہ کا فلسفہ اتنا اونچا ہے کہ دنیا اس کو پسند کرسکتی ہے تو خیال ہوا کہ ہندستان میں اس کی اشاعت ضروری ہے۔اسی نظریہ کی بنیاد پر مجھے ہندستان کی واپسی کا شوق پیدا ہوا،مگر جب مکہ معظّمہ میں رسالہ'قائد' کے چند نمبر پڑھے تو مجھے بڑی مسرت ہوئی۔کیوں کہ میں نے دیکھا کہ ہندستان واپس ہونے کا جو مقصد تھا،وہ اس جماعت نے شروع کر دیا ہے جو ادارہ قائد کے روح رواں ہیں۔'' [ستمبر ۱۹۳۹ء]

''قائد کے متعدد نمبر دیکھ چکا ہوں،اس کے اراکین ادارہ سے ذاتی واقفیت رکھتا ہوں۔یہ ایک ترقی کرنے والی جماعت کا آرگن ہے۔میں اپنے مشورے اس جماعت کو دیتا رہوں گا،اور ممکن ہے کہ یہ میرے خیالات کا آرگن بن جائے۔میں اپنے دوستوں کو اس کی طرف توجہ دلاتا ہوں۔'عبیداللہ سندھی الدیوبندی ۳۰/مئی ۱۹۳۹ء [جمادی الاول ۱۳۵۸ھ: ج۲،ش۵۔سرورق]

۳-حضرت علامہ مولانا سید سلیمان ندوی صاحب

'یہ [قائد] رسالہ مہینوں سے مرادآباد سے نکل رہا۔اس کا مقصد سیر طیبہ اور سیر صحابہ کی روشنی میں مسلمانوں کی مذہبی،سیاسی اور اقتصادی اصلاح،قدیم وجدید قوموں کے عروج وزوال کی تاریخ سے مسلمانوں کے جذباتِ ترقی کو بیدار کرنا،عربی خواں طلبہ میں عربی کا ذوق پیدا کرنا اور ہندوستان اور حجاز کے درمیان صحافتی رابطہ کا قیام ہے۔اگرچہ یہ مقاصد نہایت اہم ہیں،لیکن خوش قسمتی سے رسالہ قائد کو صاحبِ علم ونظر اور حالاتِ زمانہ سے واقف علما کی سرپرستی اور ان کی قلمی امداد حاصل ہے۔اس لیے ان مقاصد میں کامیابی کی توقع کی جاسکتی ہے۔اس رسالہ میں مسلمانوں کی دینی ضروریات اور دنیوی مصالح کو نہایت ہم آہنگی کے ساتھ سمویا گیا ہے۔مفید مذہبی اور تاریخی مضامین کے ساتھ سیاسی حالات خصوصاً مسلمانوں کی سیاست پر سنجیدہ تبصرہ اور لائقِ غور مشورے ہوتے ہیں۔سیرت نبوی،سیر صحابہ

،ترجمہ ابن کثیر، فقہی مسائل اور بہت سے مذہبی موضوعوں میں مفید اور مسلسل مضامین نکل رہے ہیں۔اسلام اور آئین حکومت، اقتصادیاتِ مسلم اور فلسفہ ایمان کا سلسلہ زیادہ مفید ہے۔رنات العرب کے عنوان کے تحت مولانا عبدالحق مدنی صاحب کا عربی مضمون 'السیاسة فی الاسلام' مسلسل نکل رہا ہے۔یہ سب کے سب مضامین مفید اور اچھے ہیں۔'
منقول از معارف [رجب ۱۳۵۷ھ: ج۱ش۱ص۶]

۴-عالی جناب مولوی سید طفیل احمد صاحب علیگ

ہندستان میں یہ پہلا موقع ہے کہ مستند علمائے کرام کی سرپرستی اور قلمی امداد سے رسالہ 'قائد' مرادآباد سے نکلا ہے۔اس کے دو نمبر میرے سامنے ہیں جو تمام ضروری مذہبی عنوانات پر مشتمل ہیں، اسی کے ساتھ سیاسیات کی چاشنی بھی ہے جس میں رہنمائی کرنے کے سب سے زیادہ علمائے کرام اہل ہیں۔مجھے کامل امید ہے کہ یہ مفید رسالہ حقیقی معنوں میں ملک اور قوم کا قائد ثابت ہوگا۔[جمادی الاولی ۱۳۵۷ھ، سرورق]

۵-حضرت علامہ الحاج ابوالمحاسن مولانا سجاد صاحب نائب امیر شریعت بہار

'رسالہ قائد میں نے دیکھا۔ماشاءاللہ مستند علما کا رسالہ ہے جو فقہی بصیرت، علومِ عقلیہ ونقلیہ کی مہارت کے ساتھ سیاسیات میں بھی سراسر عمل ہیں۔اس رسالہ کے مقاصد بلند پایہ ہیں، جن کی تکمیل صرف ایسی جماعت ہی سے ہوسکتی ہے جیسی خوش قسمتی سے رسالہ قائد کو حاصل ہے۔'

۶-حضرت مولانا منت اللہ رحمانی صاحب ایم، ایل، اے صوبہ بہار

'رسالہ قائد کے مطالعہ کا حسن اتفاق سے مجھے موقع ملا۔الحمدللہ میں اس کو ان ضرورتوں کے بالکل مطابق پایا جو اس وقت مسلمانوں کو درپیش ہیں۔رسالہ کے مقاصد نہایت بلند ہیں، خصوصاً سیاسیات میں آسمانی حکومت یا حکومتِ الٰہیہ کا نظریہ جو رسالہ قائد پیش کر رہا ہے، وہ مستحق صد مبارک باد ہے۔'

☆☆☆☆☆

مولانا سید محمد میاں صاحب کی علمی و قلمی خدمات

ماہنامہ ’قائد‘ کے آئینے میں

مولانا محمد عرفات اعجاز اعظمی
(الجامعۃ الاسلامیہ، جامعہ نگر، گورکھناتھ گورکھپور)

مولانا سید محمد میاں صاحب ایک دیدہ ور مورخ اور ادیبِ بارع تھے۔ان کے طرزِ تحریر میں ایک الگ طرح کی سحر آمیزی اور ادبی لطافت وحلاوت ہے۔ان کے انداز نگارش کو شستہ،شگفتہ اور رعنا کہنا تو بس روایتی بات کا اِعادہ ہوگا جو ہر ادیب کی تحریر کی خوبی ہوتی ہے۔حقیقت یہ ہے کہ ان کا اندازِ تحریر اور اسلوبِ بیان شستگی، شگفتگی اور رعنائی سے کہیں آگے کی چیز ہے۔قلم وقرطاس کے ساتھ کثرتِ مزاولت کی وجہ سے ان کی تحریر میں ایک ایسی جاذبیت،حلاوت اور سحر طرازی پیدا ہوگئی تھی جس کو بیان کرنا مشکل ہے،اس کا صرف وِجدان سے ادراک ہی کیا جا سکتا ہے۔ان کے بہت سے ادبی وتاریخی شہ پارے کتابی شکل میں شائع ہو کر محفوظ ہو چکے ہیں اور بہت سے ایسے ہیں جو ’قائد‘ اور اس جیسے بہت سے دیگر رسائل کے صفحات میں مدفون پڑے ہیں۔ان کی علمی وقلمی خدمات کثیر الجہت اور متنوع ہے۔قائد ان کا اپنا جاری کردہ رسالہ تھا،اس کے صفحات میں بکثرت ان کے مضامین بکھرے پڑے ہیں۔قائد میں مطبوع ان کے بیشتر مقالات متعدد قسطوں میں ہیں۔اس مضمون میں اُنھیں چیدہ چیدہ مضامین کا سرسری سا تعارف پیش کرنے کی کوشش جائے گی۔

المزایا بقدر البلایا/ تاریخ عالم:

اس مضمون کا ذیلی عنوان ہے ’’رحمۃ للعالمین ﷺ تمام انبیا سے افضل کیوں

ہیں؟'' ذیلی عنوان ہی سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ اس میں رحمۃ للعالمین ﷺ اور دیگر انبیا کے مابین فضیلت کا تقابلی مطالعہ پیش کیا جائے گا۔ یہ خاصا طویل مضمون ہے جو تقریباً قائد کے تمام شماروں کو حاوی ہے۔ اس کی پہلی قسط جو کہ اصل مقالہ کی تمہید ہے، قائد کے پہلے شمارے میں یعنی محرم، صفر ۱۳۵۷ھ میں شائع ہوئی اور آخری قسط قائد کے آخری شمارے سے ایک شمارہ قبل شائع ہوئی۔ یعنی جمادی الثانی ۱۳۵۸ھ میں۔ یہ مضمون مولانا سید محمد میاں صاحب کے قلم کی سیلانی اور ان کی وسعت مطالعہ کا بہترین نمونہ ہے۔

تقابلی مطالعہ کی ابتدا 'رسول اللہ ﷺ کی افضلیت حضرت آدم علیہ السلام کے مقابلہ میں' سے شروع ہوتی ہے اور پھر مولانا سید محمد میاں صاحب کے قلم کی سیلانی کا آفتاب نصف النہار پر آجاتا ہے اور آدم علیہ السلام کے ذکر خیر کے ساتھ ہی مولانا کا رہوارِ قلم بجائے تقابلی مطالعہ کے 'تاریخ آدم' یا 'تاریخ عالم' کی طرف مڑ جاتا ہے اور پھر اس میں قسم قسم کے فلسفیانہ اور متکلمانہ بحثیں چھڑتی ہیں اور قدیم وجدید علوم کے موتے لٹائے جاتے ہیں۔ تخلیق آدم سے لے کر وفات آدم تک کے اہم واقعات کی الجھی ہوئی گتھی کو قرآن وحدیث اور عقل کی میزان سے سلجھایا جاتا ہے۔ انسان کی خلافت فی الارض بھی زیر بحث آتی ہے اور شیطان کا مکروہ کردار بھی پیش ہوتا ہے۔ اولادِ آدم میں ہابیل اور قابیل کا قضیہ بھی معرضِ بحث لایا جاتا ہے اور ہبوطِ آدم کی توجیہ وتاویل اور عفوِ گناہ کے بعد بھی آدم کے دنیا ہی میں رہ جانے، جیتے جی دوبارہ جنت میں نہ جانے کی عقلی توجیہ پر گفتگو کی جاتی ہے۔

یہ مضمون کیا ہے، علم وعقل اور فلسفہ وکلام کا حسین امتزاج ہے۔ دقیق علمی بحث کے باوصف ادبی لطافت نہ کہیں کھوئی اور نہ کہیں کم ہوئی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مضمون کے شریان میں ادبیت وبرجستگی زندگی کے لہو کی طرح دوڑ رہی ہے کہ جسم میں لہو کی گردش ہمہ دم ہوتی ہے مگر غیر محسوس طریقے سے، مگر اسی گردش سے زندگی عبارت ہوتی ہے۔ مضمون کی تمہید کے چند جملے دیکھیے:

''اس خاک دان نور وظلمت، حرارت وبرودت، رطوبت ویبوست، رنج وراحت،

مرض وصحت کی کشاکش کی طرح خیر وشر کا تصادم بھی ہمیشہ سے رہا ہے بلکہ انھیں مختلف قوتوں کی کشمکش کا نام دنیا ہوا۔تماش گاہِ ہستی جس طرح فرعون کے نخوت وغرور،نمرود کے قہر و استبداد اور شداد کے ظلم وستم کی جولانگاہ بنی،اسی طرح موسیٰ کی حکیمیت،ابراہیم کی خلت اور عیسیٰ کے زہد وتبتل کے آفتاب و ماہتاب بھی اس ظلمت کدہ پر ضیاپاش ہوئے،لیکن برگزیدگی اور مقبولیت کے چاند تاروں میں جس نے آفتاب کا مرتبہ حاصل کیا وہ عرب کا یتیم،آمنہ کا لعل،عبداللہ کا جگر گوشہ،امی لقب مصطفیٰ ومجتبیٰ تھا۔''[محرم،صفر ۱۳۵۷/ص ۱۸]

اقتصادیات مسلم/ دولت مسلم کا عروج وزوال:

قوم مسلم کے اقتصادی عروج وزوال سے اس مضمون میں بحث کی گئی ہے۔یہ مضمون محرم،صفر ۱۳۵۷ھ سے ذی الحجہ ۱۳۵۷ھ تک بالاقساط شائع ہوا ہے۔اس مضمون میں بنیادی بحث تو مسلم اقتصادیات ہی سے ہے لیکن بہت سی ذیلی مگر متعلق بحثیں بھی اس کے جلو میں آگئی ہیں۔مثلاً توکل کی تعریف،اس کے درجات اور قسمیں۔توکل کن مقامات پر قابل ستائش ہے اور کن جگہوں پر مذموم ہے۔زہد کسے کہتے ہیں اور زہد کے حدود وقیود کیا ہیں اور احادیث رسول کی روشنی میں زہد کس عمل کو کہا جائے گا؟اور مال کے تعلق سے معتدد غلط فہمیوں کا ازالہ،خاص طور سے اس غلط فہمی کا ازالہ......جو کہ عام طور سے ذہنوں میں بار پاگئی ہے......کہ''خدا کی مرضی یہی ہے کہ مسلمان مفلس رہیں۔'' حالاں کہ واقعہ یہ ہے کہ افلاس فی نفسہ کوئی مطلوب شے نہیں ہے،اگر مطلوب ہوتی تو دولت اور آلاتِ دولت کو'فضل اللہ' نہ کہا جاتا۔

دولت مسلم کے عروج کی وجہ صاحبِ مضمون کے نقطہ نگاہ سے اگر ایک لفظ میں بیان کرنا ہو تو وہ ہے'جزم کامل'۔یعنی اہل اسلام نے محض ۱۸/ سال کی مدت میں جو عروج حاصل کیا تھا،اس کی وجہ صرف اور صرف جزم اور کامل یقین ہے۔اس بات کا جزم اور کامل یقین کہ وہ خلیفۃ اللہ ہیں،دنیا میں حکومت الٰہی کو قائم کرنے اور قانونِ خداوندی کو رائج کرنے آئے ہیں۔لہٰذا جب تک مقصد حاصل نہیں ہو گیا اس وقت تک مسلمانوں نے راحت وآرام

کی سانس نہیں لی۔ اس وقت مسلمان 'ان الارض یرثھا عبادی الصالحون' کی آیت کو ایک مستحکم وثیقہ خداوندی سمجھتے تھے۔ ہمارے زمانے کی طرح اس آیت کو خوش الحان قاریوں سے سن کر مخارج کی ادائیگی اور آواز کے زیر و بم میں نہیں پھنسے تھے۔ اُنھیں یقین تھا کہ اس آیت کے مصداق اصحابِ رسول ہی ہیں۔

آپ اسے یقین کہیے، جزم کہیے، احساسِ منصب کہیے، عزم کہیے یا استقلال کا نام دیجیے۔ یہ ان کا جزم ہی تھا جس نے انھیں عروج سے ہم کنار کیا اور اسی جزم کی رسی جب مسلمانوں کے ہاتھ سے پھسلی تو انھیں قعرِ زوال میں پہنچا دیا۔

مولانا سید محمد میاں صاحب نے جزم کی جو تفسیر وتشریح کی ہے، وہ دل کو لگتی ہے۔ کامل یقین اور جزم صرف اہل اسلام کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ یہ ایک قانونِ قدرت ہے۔ جو بھی قوم کسی چیز کا کامل یقین لے کر اٹھی ہے، وہ کامیاب ہوئی ہے۔ دنیا میں جتنے بھی فاتح گزرے ہیں اور جو بھی قوم معراجِ ترقی تک پہنچی ہے، اگر ان کی وجہِ ترقی تلاش کی جائے تو یہی جزم و یقین کامل ملے گا۔ حتیٰ کہ ظالم بادشاہوں نے بھی اسی شاہِ کلید کے توسط سے دولتِ عروج تک رسائی حاصل کی ہے۔

یقین ہے کہ آج بھی قومِ مسلم خلیفۃ اللہ اور وراثت ارض کے جزم کی طرف لوٹ آئے تو غلبہ وعروج کے فاصلے مٹ جائیں گے۔ کیوں کہ قانونِ قدرت اب بھی وہی ہے بس صرف ہم میں صلاحیت کا فقدان ہے۔

آئینِ حکومت اور اسلام:

یہ مضمون قائد کے صفحات پر آٹھ قسطوں میں مطبوع ہوا۔ چار قسطیں بالترتیب محرم، صفر ۱۳۵۷ھ سے جمادی الاول ۱۳۵۷ھ تک شائع ہوئیں اور پانچ تا آٹھ ربیع الاول، ربیع الثانی، جمادی الاول اور رجب ۱۳۵۸ھ میں شائع ہوئیں۔

اس مضمون کی ابتدا کی ایک طویل تمہید سے ہوتی ہے جس میں قدیم طریقہائے حکومت، وجوہاتِ انقلاب، مدارِ حکومت، حکومت اور عوام کے تعلقات اور جدید دنیا میں

رائج نظام حکومت پر ایک سرسری سا تبصرہ ہے۔دوسری قسط میں قدیم وجدید دنیا میں نظام حکومت کی مختلف صورتوں کا بغیر کسی محاکمہ کے ذکر ہے۔تیسری قسط میں نظام حکومت کے اغراض ومقاصد زیر بحث لائے گئے ہیں۔یہ قسط مولانا سید محمد طفیل صاحب علیگ کی مشہور تصنیف 'مسلمانوں کا روشن مستقبل' کے اقتباسات سے معمور ہے۔اس قسط میں بالتفصیل حکومت کی ذمہ داری اوراس کی کارکردگی کا تذکرہ کیا گیا ہے۔چوتھی قسط میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کی کتاب 'حجۃ اللہ البالغۃ' سے سیاسیات کی بحث کے چیدہ چیدہ حصہ کا ترجمہ کیا گیا ہے۔پانچویں قسط میں نظام حکومت کے سلسلے میں اسلام کا بنیادی نقطہ نظر پیش کیا گیا ہے۔ اس قسط کی ابتدا اِن الفاظ سے ہوتی ہے:

''حکومتِ اسلام کا بنیادی نقطہ نظر 'رحمت' ہے۔چنانچہ اس کے قانون ساز کا خطاب جس سے تبرک وتیمن کرتے ہوئے قانونِ اسلام یعنی قرآن حکیم کا آغاز ہوا، رحمان، رحیم، ارحم الراحمین، رب العالمین ہے۔اس قانون کو ہدی اور رحمت کہا گیا ہے۔اس قانونِ مکمل کے مبلغ وناشر کو 'رؤوف ورحیم' کا خطاب دیا گیا ہے۔اور رؤوف ورحیم کی بعثت کی غرض بیان فرمائی گئی کہ: وما ارسلناك الا رحمة للعالمين۔''

مگر یہ بات بھی مسلم ہے کہ قانون چاہے کتنا ہی عمدہ ہو، اگر صرف صفحات یا ذہنوں میں ہو، عملی دنیا میں اس کا تجربہ نہ ہوا تو وہ محض ایک علمی یا ذہنی تفریح ہے، اس کی خوبیوں کے سلسلے میں سارے دعاوی صرف سراب اور فریب ہیں۔سید محمد میاں صاحب نے قانونِ اسلام کا جو نچوڑ 'رحمت' کے لفظ کے ذریعے بیان کیا ہے، اس کے عملی ثبوت کے لیے حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کا پہلا خطبہ پیش کیا ہے۔حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے طویل خطبے کا جو خلاصہ پیش کیا ہے، وہ یہ ہے:

۱- خلیفہ متولی یا ولی کی حیثیت رکھتا ہے، مالک نہیں ہوتا۔
۲- خلیفہ کا فرض ہے کہ وہ خود کو عوام سے بہتر اور برتر نہ سمجھے۔
۳- خلیفہ کا فرض اور خلافت کا مقصد صرف یہ ہے کہ قوانین الٰہی کو دنیا میں نافذ کرے۔

۴- ہر چھوٹے بڑے کے حقوق کا تحفظ اور ان کی ادائیگی خلیفہ کا فرض ہے۔
۵- قانون بنانا خلیفہ کا کام نہیں، یہ بدعت ہے۔خلیفہ کا کام قانون نافذ کرنا ہے۔
۶- خلیفہ کی اطاعت جب ہی ضروری ہے جب کہ وہ حق پر ہو۔
۷- جمہور ایک ایسی طاقت ہے جو خلیفہ کی کجی دور کر سکتی ہے۔

نظامِ حکومتِ اسلامی کے یہ وہ زریں اصول ہیں جنھیں بروے کار لاکر حضرات شیخین رضی اللہ عنہما نے دنیا کو مثالی امن وامان اور مسلمانوں کو ناقابل فراموش سیاسی و اقتصادی استحکام بخشا تھا۔موخر الذکر چاروں قسطیں انتہائی بصیرت افروز اور پر از معلومات ہیں۔سیاسیات سے دل چسپی رکھنے والوں کو اس کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔

فلسفہ ایمان:

یہ بھی قائد کا ایک مستقل عنوان تھا،جس میں مولانا سید محمد میاں صاحب نے عقل و فلسفہ کی کسوٹی پر اسلام کے مختلف عقاید کو پرکھ کر ان کی حقانیت کا مضبوط ثبوت فراہم کیا ہے۔ اس موضوع کا پہلا عنوان ہے 'خداوند عالم،فرشتے اور جنات نظر کیوں نہیں آتے؟' یہ عنوان چوں کہ فلسفہ کے خشک مباحث پر مبنی ہے،اس لیے اسے دل چسپ بنانے کے لیے مکالمہ کی صورت میں لکھا گیا ہے۔سب سے پہلے تو مادی محسوس غیر مرئی چیزوں کی مثال کے ذریعے ذہن کو ہموار کیا گیا اور پھر لطافت و کثافت کا فرق بیان کر کے خدا اور فرشتوں کے غیر مرئی ہونے کی دلیل دی گئی ہے۔یہ مضمون عصبیت سے خالی ذہن کے لیے یقیناً راہنما ہے۔

'فلسفہ ایمان' کا دوسرا عنوان ہے 'کیا مذہب فطری جذبہ ہے؟' اس میں مذہب کی تعریف، مذہب کی ضرورت اور مذہب کے سلسلے میں فلاسفہ کے اقوال نقل کیے گئے ہیں۔اور انسان کے باطنی احساسات اور خارجی مشاہدات کی روشنی میں مذہب کے جذبے کا فطری ہونا ثابت کیا ہے۔

یہ ایک طویل مکالمہ ہے جو چار قسطوں میں شائع ہوا ہے۔یعنی ربیع الاول ۱۳۵۷ھ سے رجب ۱۳۵۷ھ تک۔اس مکالمہ میں مولانا سید محمد میاں صاحب کا قلم پورے

عروج پر نظر آتا ہے۔فلسفیانہ مباحث کو ادب کی چاشنی میں اس طرح لپیٹ کر پیش کیا ہے کہ پڑھنے والا نہ صرف یہ کہ اکتاہٹ محسوس نہ کرے بلکہ عمدہ الفاظ وتعبیرات اور دل کش ترکیبات کے جلو میں پوری دل چسپی ودل جمعی کے ساتھ آگے بڑھتا رہے۔اس مکالمہ میں ان کے قلم کا جادو چلا ہے مگر یہ جادو دماغ کو مسخر کر کے ایک رخ پر نہیں بہاتا، بلکہ پڑھنے والے کو دوسرے رخ پر سوچنے کا موقع بھی دیتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ مکالمہ ختم ہونے کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ کچھ علم حاصل ہوا ہے، کچھ معلومات میں اضافہ ہوا ہے، کچھ عقل وشعور کے ساز پر ضرب پڑی ہے، کہیں سے مذہب کے جذبۂ فطری کو کسی نے چھیڑا ہے۔جو ایقان نقل کی بنیاد پر تھا، اس میں عقل وشعور کا آمیزہ بھی شامل ہوگیا ہے۔محض نری لفاظی یا علمی وادبی عیاشی ہاتھ نہیں لگی ہے۔

'فلسفہ ایمان' کا تیسرا عنوان ہے'وجود خالق کی روشن دلیل'۔اس کی پہلی قسط میں صانع سے مصنوع اور خالق سے مخلوق کے وجود پر دلیل فراہم کی گئی ہے۔اور دوسری اور تیسری قسط میں خالص فلسفیانہ نقطہ نظر اور جدید سائنسی ایجادات برق وبخارات کی کارکردگی کے توسل سے وجودِ باریِ تعالی کے وجوب کو مدلل کیا گیا ہے۔اور پھر انسان کے نین ونقش اور اس میں غیر محدود تشتت واختلاف کے ذریعے ایک باشعور وجود کی دلیل فراہم کی گئی ہے۔

یہ مکالمہ عقل اور قدیم وجدید کلام کا ایک حسین گل دستہ ہے جو اپنے پڑھنے والوں کے سامنے تدبر وتفکر کے کئی دروازے وا کرتا ہے اور خلفشار وانتشار میں مبتلا ذہن کو ایک نقطہ وحدت مہیا کرتا ہے۔

غازی ملت مصطفیٰ کمال کی خدمات شریعت غرا کی روشنی میں:

ترکی کے انقلابی رہنما مصطفیٰ کمال[:۱۸۸۱ء-۱۹۳۸ء] کی یاد میں قائد [ذی قعدہ ۱۳۵۷ھ] کا ایک شمارہ خاص کیا گیا، جس میں اس کی حیات وخدمات کے تعلق سے دو طویل مضمون شائع ہوئے۔مولانا سید محمد میاں صاحب نے اپنے مضمون میں مصطفیٰ کمال

کی خدمات کا شریعت کی روشنی میں طویل جائزہ پیش کیا ہے۔

مصطفیٰ کمال کی شخصیت عجیب وغریب تضادات کا مجموعہ ہے۔ ہندستان کے مذہبی طبقہ کی اکثریت اُسے اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتی۔اس نے اپنے دورِحکومت میں ترکی میں جو اصلاحات کی ہیں، وہی دراصل اختلاف رکھنے والوں کی نگاہ میں کھٹکتی ہیں۔اُسے صرف لا دین ہی نہیں بلکہ ترکی میں لادینیت کا بانی سمجھا جاتا ہے۔مگر مولانا سید محمد میاں صاحب کی سیاسی بصیرت اُسے ایک الگ ہی زاویہ نگاہ سے دیکھتی ہے۔مصطفیٰ کمال کو کیا واقعی مذہب سے کوئی لگاؤ نہیں تھا اور مسلمانوں کے اجتماع کو وہ پسند نہیں کرتا تھا؟اس سوال کے جواب میں مولانا سید میاں صاحب لکھتے ہیں کہ:

''اس کی زندگی کا وہ سب سے بڑا کارنامہ ہے جس کو آج میثاقِ سعدآباد کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔اس میثاق کے ذریعے اس نے افغانستان،ایران،عراق اور ترکوں کو اس طرح جکڑ بند کردیا کہ خلافتِ عظمیٰ کا صحیح نقشہ پھر دنیا کے سامنے آگیا۔بے شک اس میثاق کو خلافت کے نام سے تعبیر نہیں کیا گیا،فیڈریشن اس کا نام رکھا گیا،مگر کیا اسلام کا مطالبہ معنوی حیثیت سے پورا نہیں ہوا۔''[ص۱۲]

مصطفیٰ کمال نے ترکی میں جو اصلاحات کی تھیں وہ دراصل اسلام کے خلاف نہیں بلکہ ترک دشمنوں کے خلاف ایک سیاسی حربہ تھا۔بقول مولانا سید میاں صاحب:

''مصطفیٰ کمال نے دشمنوں کے مقابلہ کے لیے وہی حربہ ہاتھ میں لیا جس سے اس کو برباد کیا جارہا تھا۔یعنی ترکی ممالک صرف ترکوں کے ہیں۔بالفاظِ دیگر اس نے قومی اور نسلی عصبیت کو اشتعال دیا اور ترکوں کے ذہن نشین یہ کرایا کہ وہ خود ایک مستقل قوم ہیں جس کو استقلال اور قوت کے ساتھ دنیا میں زندہ رہنا ہے۔ترک کو مستقل قوم گرداننے کے لیے اس کو لامحالہ ضرورت تھی کہ وہ اس کا رسم الخط وہ قرار دے جس سے ترکی خود کو مستقل قوم سمجھے۔''

''علاوہ ازیں چوں کہ ترکی ممالک یورپ میں واقع ہے اور یورپین حکومتوں کا منشا یقیناً یہ ہے کہ یورپ سے اس قوم کو کسی طرح خالی کیا جائے۔یورپین اقوام کی مرضی کے بر

خلاف مصطفیٰ کمال کا منشا یہ تھا کہ وہ یورپ کے اندر رہ کر تمام یورپین حکومتوں کے سینے پر سوار رہے۔ تو لامحالہ یہ بھی ضروری تھا کہ وہ اپنی قوم کے ہر فرد میں یورپین ہونے کا احساس پیدا کردے۔ صرف یورپین ہونے کا احساس پیدا کرنے کے لیے اور یورپ کی تمام طاغوتی حکومتوں کی چھاتی پر مونگ دلنے کے لیے اس نے اپنی قوم کے واسطے یورپین وضع قطع، طرز لباس، یورپین معاشرت معین کی اور یورپین رسم الخط کو اپنی قوم میں رائج کیا۔" [ص:۱۱]

مصطفیٰ کمال کی اسلام پسندی کا ثبوت اس سے بھی ملتا ہے کہ بیماری سے چند دن پہلے افاقہ کے درمیان جس میں اُسے مکمل پرہیز کرنا چاہیے تھا، اس نے معاہدہ سعد آباد میں یمن، شام، نجد و حجاز کو شریک کرنے کے لیے معاہدہ مرتب کیا اور شام کے بعد معاہدہ کی کاپی جب صاف ہو کر پیش ہوئی تو سب سے پہلے اس نے اپنی شرطیں پیش کیں اور زبان سے یہ الفاظ ادا کیے:

"خدا کا شکر ہے کہ اتحادِ اسلام کا پروگرام مکمل ہو گیا جو خداوند عالم نے میرے سپرد کیا تھا۔" [ص:۱۴]

مصطفیٰ کمال کے اعمال و افکار سے ہزار اختلاف کے باوجود اس کی وحدتِ عرب کی کوشش کی ستائش نہ کرنا ناانصافی ہوگی۔ مولانا سید میاں صاحب نے امت کے اِسی وسیع تر مفاد کے تناظر میں اس کی خدمات کو دیکھنے کی کوشش کی اور اس کی اصلاحات وانقلابی مہمات کو دشمنوں کے خلاف ایک سیاسی حربہ قرار دے کر اسے ستائش کا سزاوار سمجھا ہے، ورنہ وہ بھی خلیفہ راشد اور متدین ومتشرع مصطفیٰ کمال کو نہیں سمجھتے تھے۔

عقیدہ توحید اور رحمۃ للعالمین کا اثر سیاسیاتِ عالم پر:

سید محمد میاں صاحب کا یہ ایک تفصیلی مضمون ہے جو قائد کے تقریباً ۴۵/صفحات کو محیط ہے۔ یہ مضمون محرم، صفر ۱۳۵۸ھ کے سال نامہ میں مطبوع ہوا۔ اس مضمون میں کل سات ابواب ہیں جن کے عناوین بالترتیب درج کیے جاتے ہیں تاکہ اس کی اہمیت وضرورت کی ہلکی سی جھلک نگاہوں کے سامنے آجائے:

پہلا باب: خاتم الانبیا اور تمام انبیا کی بعثت کا مقصد
دوسرا باب: حقوقِ انسانیت
تیسرا باب: ظہورِ اسلام سے بیشتر عالم انسانی کی تباہ حالی
چوتھا باب: موجودہ دنیا کی تباہ حالی اور اس کے اسباب
پانچواں باب: عقیدہ توحید کی تشریح
چھٹا باب: عقیدہ رحمۃ للعالمین کی تشریح
ساتواں باب: عقیدہ توحید اور رحمۃ للعالمینﷺ کا اثر سیاسیاتِ عالم پر
۱- اصول حکومت۔ ۲- وضعِ قانون۔ ۳- قانون کا نظریہ

اس مقالہ کا دوسرا باب حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کی تصنیف 'حجۃ اللہ البالغہ' سے ماخوذ ہے۔ تیسرے باب میں قبلِ اسلام کی دنیا کی نقشہ کشی کی گئی جس میں خاص طور ہمارے ملک ہندستان اور عرب جاہلیت کا تذکرہ ہے۔ اُس وقت کے طریق ہائے حکومت اور انسانوں کی سماجی و اخلاقی حالت کو بالتفصیل زیر بحث لایا گیا۔ چوتھے باب میں جدید دنیا جو ترقی وتمدن کے اعلی مدارج تک رسائی کی دعوے دار ہے، اس کی تباہ حالی اور تباہ حالی کے ذمہ دار اسباب کے تلاش کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ یہ باب دراصل جدید دنیا کے چہرے سے اس کے مصنوعی خول کو اتار کر اس کے سامنے آئینہ رکھنے کے مترادف ہے جس میں اس کے کریہہ چہرے کے خدوخال...... جو جدیدیت کی بصارت کُش روشنی کی وجہ سے نگاہوں سے اوجھل ہیں یا پھر چمک دار نظر آتے ہیں...... واضح ہوکر سامنے آجاتے ہیں۔ اس مضمون کا سب سے اہم اور جاندار باب ساتواں یعنی آخری باب ہے۔ اس میں رسول اللہﷺ کی بعثت اور مدینہ کی دارالحکومت کی وجہ سے سیاسیاتِ عالم پر کیا خوش گوار اثرات پڑے ہیں، انھیں واضح کیا گیا ہے۔ قبل اسلام کے طرزِ حکومت میں کیا خامیاں تھیں، اور اسلام نے اس میں کیا اور کس انداز سے اصلاحات کی ہیں، اس کو بیان کیا گیا ہے۔ مزید یہ کہ اسلام کا اصولِ حکومت، اسلام میں وضعِ قانون کا اختیار اور نظریہ قانون کیا ہے، ان امور پر بصیرت و

بصارت افروز روشنی ڈالی گئی ہے۔

ہمارا ہندستان، ہمارا پاکستان:

یہ مضمون جمادی الثانی ۱۳۵۸ھ میں شائع ہوا ہے۔ یہ تقسیم ہند کے پس منظر میں لکھا ہوا مسلم لیگ کی نادان دوستی کو واضح کرنے والا ایک بہترین مضمون ہے۔ یہ مضمون اگر چہ اَسّی سال پہلے لکھا گیا ہے مگر حیرت انگیز طور سے اس زمانے کی بعض باتیں اور نعرے آج بھی اُسی پس منظر میں ملک کی فضا کو پرشور کیے ہوئے ہیں۔ مثلاً علما کا عوام سے اثر زائل کرنے کے لیے اس وقت یہ آواز بلند کی گئی کہ ''مولوی سیاست سے نابلد، رفتارِ زمانہ سے ناواقف، مسلمانوں کو موت کے گھاٹ اتار رہے ہیں۔ بچو! بچو! مولویوں سے بچو!'' آج بھی یہ آواز تسلسل کے ساتھ مختلف گلوں سے نکلتی سنائی دیتی رہتی ہے۔ جب ہندوؤں نے ہندومہا سبھا بنائی تو اپنے ہم مذہبوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے جو صدا بلند کی، اس کی بازگشت اُس وقت سے لے کر آج تک سنائی دیتی ہے بلکہ اِدھر ۲۰۱۴ء سے تو انتہائی شدت و بلند آہنگی سے کانوں میں پڑ رہی ہے۔ ''یعنی ہندو دھرم خطرے میں ہے۔'' مسلمانوں نے مسلم لیگ بنائی تو یہی خطرہ اسلام کو بھی لاحق کر دیا۔ کانگرس کے سرکردہ لیڈروں کے غیر مسلم ہونے کی وجہ سے جب اس نعرے کی طرف لوگوں کا خاطر خواہ رجحان مہا سبھائیوں نہیں دیکھا تو ڈاکٹر مونجی اور ساور کرنے دوسرا شوشہ چھوڑا کہ ''کانگرس مسلمانوں کی غلام ہو چکی ہے۔''

اِن مماثلتوں سے ہمارے ملک کے باشندوں کے سیاسی اعتبار سے ذہنی ارتقا کا اندازہ ہوتا ہے۔ یعنی اَسّی سے قبل سیاست کی اخلاقیات کے جس دلدل میں تھے، آج بھی اسی میں پھنسے ہوئے ہیں بلکہ اب تو مزید گلے گلے ڈوبے نظر آتے ہیں۔

مولانا سید محمد میاں صاحب کے قلم میں ندرت و گونا گونی بہت تھی۔ طبع زاد مضامین کے علاوہ ان کے قلم سے متعدد تراجم بھی نکلے اور قائد کے صفحات کی زینت بنے۔ حضرت شیخ الہند کے جانباز رفیق غازیِ ملت حضرت مولانا علامہ محمد بن عبداللہ الانصاری المعروف بمنصوری انصاری، مقیم کابل کے فارسی کے معرکہ آرا مقالہ 'تفسیر مختصر و تبویب سورہ فاتحہ' کا

بعنوان 'سورہ فاتحہ کی سیاسی تفسیر' کا چھ قسطوں میں ترجمہ کیا۔ حجۃ اللہ البالغہ سے منتخب سیاسیات کے مباحث کو اردو کا جامہ پہنا کر قارئین کو مستفیض کیا۔ فقہیات کے عنوان سے 'المختار للفتوی' کی عبارت مع مختصر توضیح وتشریح شائع ہوتی تھی، اس کے مستقل مترجم آپ ہی تھے۔

یہ مولانا سید محمد میاں صاحب کے علمی وادبی شہ پاروں کی...... جو قائد کے صفحات پر بکھرے پڑے ہیں...... ہلکی سی جھلک ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قائد میں مطبوع ان کی تحریروں کا ایک اشاریہ درج کر دیا جائے، جو استفادہ کرنے والوں کے لیے دلیل راہ ہو۔

☆☆☆☆☆

اشاریہ مضامین قائد از مولانا سید محمد میاں صاحب:

محرم، صفر ۱۳۵۷ھ - مارچ اپریل ۱۹۳۸ء/ جلد ۱ - نمبر ۱

۱- الموز ایا بقدر البلایا/ رحمۃ للعالمین ﷺ تمام انبیا سے افضل کیوں؟

۲- آئین حکومت اور اسلام/ نظریہ خلافت الٰہیہ/ علمائے ربانی کو دعوت نظر

۳- تاریخ اسلام

۴- مسلم اقتصادیات/ دولت مسلم کا عروج وزوال

....

ربیع الاول ۱۳۵۷ھ/ جلد ۱ - نمبر ۲

۵- فلسفہ ایمان/ خداوند عالم، فرشتے اور جنات نظر کیوں نہیں آتے؟

۶- حیات آدم علیہ السلام/ ابوالبشر اور خیر البشر علیہما الصلوٰت والسلام کے امتحانات کا مقابلہ

۷- تاریخ اسلام/ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ

۸- اسلام اور آئین حکومت/ نظام حکومت کی مختلف صورتیں

۹- اقتصادیات مسلم/ دولت مسلم کا عروج وزوال
۱۰ فقہیات/ ترجمہ ومختصر تشریح المختار للفتوی

....

ربیع الثانی ۱۳۵۷ھ/ جلد ۱- نمبر ۳

۱۱- تاریخ عالم/ پدر انبیا اور خاتم الانبیا علیہما السلام کے امتحانات کا مقابلہ
۱۲- تاریخ اسلام/ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ
۱۳- فلسفہ ایمان [مکالمہ]/ کیا مذہب فطری جذبہ ہے؟ [مجلس اول]
۱۴- اسلام اور آئین حکومت [باب دوم]/ نظام حکومت کے اغراض ومقاصد
۱۵- مسلم اقتصادیات/ اصول دولت اور احکام اسلام [زمین، محنت، تجارت اور جہاد]
فقہیات/ ترجمہ ومختصر تشریح المختار للفتوی

....

جمادی الاولیٰ ۱۳۵۷ھ/ جلد ۱- نمبر ۴

۱۶- تاریخ عالم/ خیر البشر اور ابوالبشر علیہما السلام کے امتحانات کا مقابلہ
۱۷- تاریخ اسلام/ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ
۱۸- فلسفہ ایمان [مکالمہ]/ کیا مذہب فطری جذبہ ہے؟
۱۹- اسلام اور آئین حکومت [باب دوم]/ نظام حکومت کے اغراض ومقاصد
۲۰- مسلم اقتصادیات/ اصول دولت اور احکام اسلام/ دولت کی پہلی اصل 'زمین'
فقہیات/ ترجمہ ومختصر تشریح المختار للفتوی

....

جمادی الثانی ۱۳۵۷/ جلد ۱- نمبر ۵

۲۱- عرض اولین/ صرف تین پیسے اور تھوڑا سا وقت
۲۲- تاریخ عالم/ حضرت آدم علیہ السلام

....

رجب المرجب ۱۳۵۷ھ/جلد ۱-نمبر ۶

....

شعبان المعظم/۱۳۵۷ھ جلد ۱-نمبر ۷

۴۰- ناسخ ومنسوخ کے متعلق فتویٰ

....

رمضان المبارک ۱۳۵۷ھ/ جلد ا -نمبر ۸

۴۱- تاریخ عالم/ سیدنا آدم علیہ السلام دنیا میں
۴۲- فلسفہ ایمان/ رمضان شریف، شب قدر، اعتکاف
۴۳- فلسفہ ایمان [مکالمہ]/ وجود خالق عز وجل کی فلسفی دلیل
۴۴- تاریخ ہندستان کا ایک باب/ زوال دولیت مغلیہ کے اسباب
۴۵- تاریخ اسلام/ سیدنا ابوبکر اور ابوفکیہ رضی اللہ عنہما
۴۶- تمہید اور تعارف تفسیر مختصر وتبویب سورہ فاتحہ از حضرت علامہ مولانا محمد بن عبداللہ الانصاری معروف بمنصوری انصاری، مقیم کابل
۴۷- مسلم اقتصادیات/ زمین کس کی ہے؟/عروج وزوال مسلم کے تاریخی اسباب
۴۸- ناسخ ومنسوخ کے متعلق فتویٰ

....

شوال المکرّم ۱۳۵۷/ جلد ا -نمبر ۹

۴۹- ترجمہ تفسیر مختصر وتبویب سورہ فاتحہ بعنوان سورہ فاتحہ کی سیاسی تفسیر
۵۰- تاریخ عالم/ حضرت آدم علیہ السلام دنیا میں/فتلقی آدم من ربہ کلمات فتاب علیہ
۵۱- فلسفہ ایمان [مکالمہ]/ وجود خالق عز وجل کے متعلق فلسفی دلائل
۵۲- آئین حکومت اور اسلام/ نظام حکومت کے اغراض ومقاصد
۵۳- اقتصادیات مسلم/ زمین کس کی ہے؟/عروج وزوال مسلم کے تاریخی اسباب
۵۴- ناسخ ومنسوخ کے متعلق فتویٰ

....

ذی قعدہ ۱۳۵۷ھ/ جلد ا -نمبر ۱۰ [مصطفیٰ کمال وصحیفہ سیاست نمبر]

....

ذی الحجہ ۱۳۵۷ھ/ جلد۱-نمبر۱۱

....

محرم الحرام،صفر المظفر ۱۳۵۸ھ/ جلد۲-نمبر۱،۲[سال گرہ نمبر]

....

ربیع الاول ۱۳۵۸ھ/ جلد۲-نمبر۳

....

ربیع الثانی ۱۳۵۸ھ/ جلد۲-نمبر۴

۶۸-　ترجمہ تفسیر مختصر وتبویب سورہ فاتحہ بعنوان سورہ فاتحہ کی سیاسی تفسیر/جستجوے مرکز مدنیت انسانی

۶۹-　تاریخ عالم/سیدنا آدم علیہ السلام کے دنیاوی حالات

۷۰-　اسلام اورآئین حکومت/رحمۃ للعالمین اورسیاسی انقلاب [حصہ دوم]

....

جمادی الاول ۱۳۵۸ھ/جلد۲-نمبر۵

۷۱-　تاریخ عالم/حیات آدم علیہ السلام/شیطانی اور ربانی جذبات کی سب سے پہلی جنگ

۷۲-　اسلام اورآئین حکومت/نظارہ رحمت/خلیفہ اول صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا سب سے آخری خطبہ اورخلیفہ دوم فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا سب سے پہلا خطبہ

۷۳-　فقہیات/ترجمہ ومختصر تشریح المختار للفتوی/باب الانجاس وتطهيرها

۷۴-　اجلاس جمعیۃ العلما/جمعیۃ علماے صوبہ آگرہ اورمسلمانان صوبہ/کیا آپ مدد نہ فرمائیں گے؟

....

ستمبر ۱۹۳۹ء-رجب،شعبان ۱۳۵۸/جلد۲-نمبر۷

۷۵-　شذرات/قیامت صغری یاجنگ یورپ

۷۶-　معراج رسول اللہ ﷺ اورہماری معراج

۷۷-　مغفرت کی رات/سلام علی من اتبع الہدی

۷۸-　اسلام اور آئین حکومت/رسول اللہ ﷺ اور ازواج مطہرات کا طرز زندگی -آمدنی،خرچ

....

مولانا سید محمد میاں
اور روزنامہ الجمعیۃ

ضیاء الحق خیرآبادی (کنوینر سیمینار مولانا سید محمد میاں)

اردو صحافت کی کل مدت دوصدی ہے، اس کا ماضی نہایت شاندار اور تابناک ہے۔

تحریک آزادی کی جدوجہد میں اس کا نمایاں کردار رہا ہے، جو ایک تفصیل طلب موضوع ہے۔ آج سے تقریباً دوسو سال پہلے اردو کا پہلا اخبار ''جامِ جاں نما'' کلکتہ سے ۱۸۲۲ء میں منشی سداسکھ لعل اور ہری دت نے جاری کیا، اردو کا دوسرا اخبار ''دہلی اردو اخبار'' ہے جسے اردو کے ممتاز اور نامور ادیب مولوی محمد حسین آزاد کے والد مولانا محمد باقر نے شروع کیا، یہ اردو کے پہلے اخبار ''جام جہاں نما'' کے ۱۵/سال بعد ۱۸۳۷ء میں جاری ہوا۔ پہلے اس کا نام ''دہلی اخبار'' تھا، ۱۸۴۰ء میں ''دہلی اردو اخبار'' ہوا۔ اس کے بانی مولانا محمد باقر انگریزوں کے ہاتھوں شہید ہوئے۔ اس کا شمار اردو کے بااثر اور بے باک اخباروں میں ہوتا تھا۔ اس کے بعد سرسید احمد خاں کے بھائی سید محمد خاں نے ''سید الاخبار'' نکالا، جو ۱۸۴۸ء تک جاری رہا۔ اس کے ایڈیٹر مولوی عبدالغفور تھے۔ (تلخیص از ''احوال صحافت'')

اس کے بعد انقلاب ۱۸۵۷ء تک تقریباً سات اخبار اور نکلے، ۱۸۵۷ء کے بعد تو نہ جانے اردو کے کتنے ہفت روزہ اخبار اور روزنامے نکلے۔ مشہور صحافی سہیل انجم نے اپنی کتاب ''احوال صحافت'' میں لکھا ہے کہ: ایک اندازے کے مطابق اردو صحافت کے آغاز سے لے کر ۱۹۴۷ء تک ۱۵۴۷/اردو اخبارات جاری ہوئے۔

انھیں اخبارات میں ایک نمایاں اخبار جمعیۃ علماء ہند کا ترجمان ''الجمعیۃ'' بھی

ہے۔ جمعیۃ علماء ہند اپنے قیام کے اول روز سے تحریک آزادی میں مؤثر طور پر حصہ لیتی رہی ہے۔ اپنے مشن، پیغام اور افکار و خیالات کی ترویج و اشاعت کے لئے اس نے اوائل ۱۹۲۵ء میں ایک سہ روزہ اخبار ''الجمعیۃ'' نکالا، جس کے پہلے ایڈیٹر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی تھے۔ اپنی شہرہ آفاق کتاب ''الجہاد فی الاسلام'' مولانا نے اسی زمانے میں لکھی تھی۔ ۱۹۲۸ء میں جب مولانا مودودی حیدرآباد چلے گئے تو ہلال احمد زبیری صاحب اس کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ اس زمانہ میں مولانا احمد سعید دہلویؒ ناظم جمعیۃ علماء اخبار کے نگراں اور ذمہ دار تھے، انھوں نے نامور صحافی مولانا عثمان فارقلیط کو الجمعیۃ میں مترجم اور نائب مدیر مقرر کیا۔ زبیری صاحب کے بعد مولانا فارقلیط الجمعیۃ کے ایڈیٹر ہوئے۔ جمعیۃ علماء ہند ایک قوم پرور جماعت تھی، اس کی پالیسیاں انگریزی حکومت کی پالیسیوں سے متصادم تھیں، اس لئے اس کا ترجمان الجمعیۃ حکومت کی نظر میں خار بن کر کھٹکتا رہا۔ حکومت کی نظر برابر اس پر رہتی تھی، ۱۹۳۸ء میں اس سے ضمانت طلب کی گئی جو ادا نہ ہوسکی اور اس کا حشر بھی وہی ہوا، جو اس کے پیشرو اردو اخبارات الہلال والبلاغ وغیرہ کا ہوا، یعنی ۱۹۳۸ء میں یہ اخبار بند ہوگیا۔

(دیکھئے: مولانا عثمان فارقلیط کے اداریے از سہیل انجم، و تاریخ صحافت اردو جلد پنجم از امداد صابری)

اس کے بعد ۱۹۳۸ء سے ۱۹۴۷ء تک ملکی احوال اس قدر پُر آشوب تھے کہ اس دوران ''الجمعیۃ'' کا دوبارہ اجراء ممکن نہ ہوسکا، لیکن ملک کی آزادی کے بعد فوراً مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ اس کی طرف متوجہ ہوئے اور مولانا سید محمد میاںؒ کو تار دے کر دہلی بلایا اور اخبار کی ذمہ داری اور نگرانی ان کے سپرد کردی۔ مولانا محمد میاں لکھتے ہیں:

> ''۲۰/ دسمبر (۱۹۴۷ء) کو سہارنپور میں مجاہد ملّت کا تار پہنچا اور احقر خطرناک راستے طے کرتا ہوا خدا کے فضل سے دہلی پہنچ گیا۔ یہاں مجاہد ملّت روزنامہ الجمعیۃ کے جاری کرنے کا عزم فرما چکے تھے اور احقر کو اسی لئے طلب فرمایا تھا کہ بلا توقف روزنامہ جاری کردیا جائے۔ چنانچہ ۲۳/ دسمبر ۴۷ء سے یہ روزنامہ پھر جاری ہوگیا جو ۹ سال پہلے برطانوی حکومت کے ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کی نوازشوں کا شکار ہو چکا تھا؛ فرق

یہ ہوا کہ پہلے سہ روزہ تھا اور اس مرتبہ مجاہد ملت کے حوصلہ عالی نے اس کو روزنامہ قرار دیا''۔(تاریخ شاہی نمبر،ص:۳۹۸)

مولانا عثمان فارقلیط ایڈیٹر مقرر ہوئے،اداریہ وہی لکھتے تھے،لیکن مولانا محمد میاں صاحب نگراں اور ذمہ دار ہونے کی حیثیت کا پورا حق ادا کرتے تھے اور اخبار میں شائع ہونے والا ہر مضمون اور مقالہ ان کی نگاہ سے گذرنے کے بعد ہی پریس میں جاتا تھا۔الجمعیۃ کے خصوصی نمبرات جیسے مفتی اعظم نمبر (مفتی کفایت اللہ نمبر) شیخ الاسلام نمبر،مولانا آزاد نمبر اور مجاہد ملت نمبر خصوصاً آخر الذکر سب کے سب مولانا ہی کی کاوشوں کے مرہون منت تھے۔ چونکہ مولانا اس نسل سے تعلق رکھتے تھے جسے صرف کام سے مطلب تھا،نام سے کوئی غرض نہ تھی اس لئے بیشتر لوگوں کو پتہ بھی نہ تھا کہ مولانا کا بھی اخبار سے کوئی خاص تعلق ہے۔ان کے اخلاص کا عالم تو یہ تھا کہ دینی تعلیم کے تمام رسالے خود لکھے اور بغیر نام کے شائع کرادیئے۔

ملک کی آزادی کے بعد حد سے زیادہ بڑھی ہوئی مصروفیات کے باوجود بوقت ضرورت مضامین،تنقید،تبصرے،سوالات کے جوابات،فتوے،وفیات اور وقتی ضرورت کی بنا پر مختلف قسم کی تحریریں مولانا کے قلم سے آتی رہتی تھیں،یہ سلسلہ پچیسوں سال پر محیط ہے۔ ارادہ تھا کہ مولانا کے مضامین کے تعارف کے ساتھ اس کا اشاریہ بھی تیار کردیں لیکن اشاریہ کے لئے جو وقت اور محنت درکار تھی،وہ میسر نہ ہوسکی،اس لئے صرف مضامین کے تعارف پر اکتفا کیا جارہا ہے۔ان شاء اللہ آئندہ اس کی کوشش کی جائے گی۔

۲۴؍محرم ۱۳۷۰ھ (۶؍نومبر ۱۹۵۰ء) کے سنڈے ایڈیشن میں مولانا نے روزنامہ الجمعیۃ کے لئے ایک اپیل لکھی:

''**روزنامہ الجمعیۃ** آپ کے خیالات وجذبات اور آپ کی سیاسی و مذہبی ضرورتوں کا ترجمان ہے،اس کا بے لاگ تبصرہ اور اس کی بے لوث صحافت کا آپ روز مرہ مشاہدہ کرتے رہتے ہیں۔

حب وطن کے جذبات کے ساتھ صحیح جمہوریت یعنی آزادیِ ضمیر اور آزادی کی

روح بھی آپ کے اندر پیدا کرتا ہے، یہ ملک و وطن کا بہترین خادم ہے، آپ اس کے خریداروں میں اضافہ کر کے اس کے دائرۂ اثر کو وسیع اور اس کی آواز کو زیادہ مؤثر بنائیے، یہ آپ کی زیادہ سے زیادہ خدمت کرے گا۔ آپ اپنی جیب سے صرف دو آنہ یومیہ خرچ کر کے اپنے قومی اور ملی ترجمان کو مضبوط کر سکتے ہیں۔''

اسی شمارہ میں مولانا نے اپنے اس سفر حج کے مشاہدات لکھے ہیں، جو سال بھر پہلے کیا تھا، اس کا عنوان ہے:

دیارِ حبیب کی باتیں

کائناتِ ارضی کا سب سے مقدس مقام، بیت اللہ کے ماحول میں زائرین بیت اللہ

''سفر حجاز کے مشاہدات میں سب سے اعلیٰ اور ارفع مقام خدا کا وہ سب سے پہلا گھر ہے اور رب العرش العظیم کی وہ تجلی گاہ اعظم ہے، جو نہ صرف نوعِ انسان کے لئے پناہ گاہ ہے، بلکہ ہر جاندار کے لئے یہ حرمِ اطہر ''جائے امن'' ہے۔

یہ رب العالمین کا حرم ہے، جہاں اس کی ربوبیت، اس کی پروردگاری، اس کی رزاقیت، اس کی رحمت و رافت، حقیقت و معنویت کے تمام پردے چاک کر کے آنکھوں کے سامنے آتی ہے، جو قریش کے ملحدوں اور زندیقوں سے بھی اعتراف کرالیتی ہے: اَطْعَمَهُمْ مِنْ جُوْعٍ وَّاٰمَنَهُمْ مِنْ خَوْفٍ.''

یہ اس مشاہدات سفر کا ابتدائیہ ہے۔ آپ مولانا کے قلم کا زور اور انشاء پردازی کو ملاحظہ فرمائیں، پورے مضمون کا رنگ یہی ہے۔ یہ مضمون کی پہلی قسط تھی، دوسری قسط یکم صفر مطابق ۱۳ رنومبر کو، تیسری قسط ۹ رصفر مطابق ۲۰ رنومبر کو شائع ہوئی۔ اس پر مکہ مکرمہ کا ذکر مکمل ہو گیا۔ اس کے بعد ۲۳ رصفر مطابق ۴ ردسمبر کی اشاعت میں مدینہ منورہ کا ذکر خیر ہے جس کا عنوان ہے: **دیارِ حبیب کی باتیں**

جلوہ گاہِ جمال و کمال مدینۃ الرسول ﷺ کا قلمی نظارہ

اس کے بعد والی قسط کا عنوان ہے: ''اہل حجاز کی معیشت اور ذرائع معیشت''۔ یہ ۲۵ ردسمبر ۱۹۵۰ء (۱۴ رربیع الاول ۱۳۷۰ھ) کو شائع ہوئی ہے۔ مولانا نے سفر حج سے پہلے

۲۴/ جولائی اور ۳۱/ جولائی ۱۹۵۰ء کے سنڈے ایڈیشن میں ''سفر حج کے سلسلہ میں چند ضروری باتیں'' کے عنوان سے عازمین بیت اللہ کو بڑی قیمتی نصیحتیں کی ہیں، جن پر عمل کرنے کی صورت میں ان شاءاللہ حج مبرور کی سعادت حاصل ہوگی۔

کاش کوئی صاحب ہمت اٹھتا اور ان قیمتی نصائح اور مشاہدات سفر کو جمع کر کے شائع کر دیتا۔

''سوراشٹر'' ریاست گجرات میں بحیرہ عرب کے ساحل سے ملا ہوا علاقہ ہے، جو ضلع راجکوٹ سمیت ۱۱/ اضلاع پر مشتمل ہے۔ اگست ۱۹۵۰ء میں مولانا سید محمد میاںؒ نے جمعیۃ علماء کے وفد کے ساتھ اس علاقہ میں ۱۶/ دن گزارے اور ۳/ نومبر ۱۹۵۰ء سے ''سوراشٹر اور باشندگان سوراشٹر سے تعارف'' کے عنوان سے چودہ قسطوں میں وہاں کی روداد سفر لکھی، جو نہایت دلچسپ اور معلومات آفریں ہے۔ آخری قسط ۱۸/ نومبر ۱۹۵۰ء کے اخبار میں شائع ہوئی۔ یہ اس لائق ہے کہ اسے مکمل شائع کیا جائے، اس سے جمعیۃ علماء ہند کی کوششوں اور مساعی کا کسی قدر اندازہ ہوگا۔ اسی طرح ۱۴/ مئی ۱۹۵۰ء کو مولانا کا ایک مضمون ''ٹونک راج میں ہمارا کام'' شائع ہوا ہے، جس میں ریاست ٹونک میں جمعیۃ علماء ہند کی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے۔

مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند کی رکنیت: روزنامہ الجمعیۃ ۲۸/ اکتوبر ۱۹۵۰ء کی ایک خبر سے معلوم ہوتا ہے کہ ۲۵/ اکتوبر ۱۹۵۰ء (۱۲/ محرم ۱۳۷۰ھ) کی مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند نے آپ کو رکن شوریٰ منتخب کیا۔

جیسا کہ میں نے لکھا کہ جیسی ضرورت پیش آتی تھی اس کے لحاظ سے مولانا کا قلم چل پڑتا تھا۔ ۹/ دسمبر ۱۹۵۰ء کے شمارہ میں انتقادات کے عنوان سے مولانا حکیم محمد ایوب سہارنپوری کے رسالہ ''تصحيح الاغلاط الكتابية'' کا تعارف کرایا ہے۔ ۸۰/ صفحات پر مشتمل اس رسالہ میں امام ابوجعفر طحاویؒ کی معانی الآثار کی طباعتی غلطیوں کی تصحیح کی گئی ہے۔ مولانا معانی الآثار کے طرز و انداز کے بارے میں لکھتے ہیں:

”مصنف نے اس کتاب کی تصنیف میں تمام فقہاء ومحدثین سے جداگانہ ایک نرالا اور وہی مفید طرز اختیار کیا ہے۔یعنی صرف احادیث کوکسی خاص ترتیب سے جمع کردینا پیش نظر نہیں ہے، بلکہ کسی مسئلہ سے متعلق جس قدر روایات، احادیث اور آثار وارد ہوئے ہیں،ان سب کو ایسے فقیہانہ انداز سے جمع کرتے ہیں کہ جو بھی تعارض ہوتا ہے وہ ختم ہوتا چلا جاتا ہے اور تمام احادیث کا صحیح محمل اور صحیح منشا سامنے آجاتا ہے۔

مصنف اپنے زمانے کے بہترین قانون داں اور وکیل رہے ہیں، لہٰذا قانونی انداز میں ہرایک بحث کوشروع کرتے ہیں،اور تمام وکیلانہ موشگافیوں کا جواب دیتے ہوئے آخر میں ایسا فیصلہ صادر کرتے ہیں کہ ہرایک انصاف پسند طبیعت اس کو تسلیم کرنے پر مجبور ہوجاتی ہے۔

مصنف مسلک کے لحاظ سے حنفی ہیں،مگر آپ کی کتاب ہرایک مسلک کے فقہاءاور محدثین کا مرجع ہے۔اگرچہ مقاصد مختلف ہوتے ہیں مگر اس کے مطالعہ کوجیسا کہ حنفی علماءضروری سمجھتے ہیں ایسے ہی شافعی اور مالکی وحنبلی اور اہل حدیث حضرات بھی اس کا تتبع ضروری سمجھتے ہیں۔“

مولانا حکیم محمد ایوب صاحب نے سولہ سال کی محنت شاقہ کے بعد طحاوی کی طباعت میں ہونے والی اغلاط کودرست کرکے علمی دنیا کے سامنے پیش کیا۔مولانا لکھتے ہیں:

”ان سطور میں جس کتاب کا تعارف کرایا جارہا ہے یہ سولہ سالہ جدوجہد کی کتابی تصویر ہے اور اس کی مستحق ہے کہ اہل علم نقد جاں پیش کرکے اس کوحاصل کریں اور اپنے پاس محفوظ رکھیں۔“

حکیم مظہرالدین صاحب اجملی کے رسالہ ”مسیح الملک“ اکتوبر ۱۹۵۵ء کے ”اجمل ڈے“ نمبر پر مولانا محمد میاں کا تفصیلی تبصرہ ۲۵/دسمبر ۱۹۵۵ء کے روزنامہ الجمعیۃ میں شائع ہوا۔

میوات سے مولانا کو ایک خاص لگاؤ اور تعلق تھا، آپ نے جنوری ۱۹۵۱ء میں میوات کا دورہ کیا تھا،جس کی رپورٹ آپ کے قلم سے ۲۷/جنوری ۱۹۵۱ء کے اخبار میں

شائع ہوئی۔ چند سطریں ملاحظہ فرمائیں:

''ہم نے ان لوگوں (اہل میوات) سے ملاقات کی، جن کی ملاقات کو زیارت سے تعبیر کیا جائے تو زیادہ بہتر ہے۔ یہ بھارت کے شکستہ حال مسلمان ہیں، کپڑے پھٹے ہوئے، صفائی سے ناآشنا، حجامت سے بے نیاز، بال گردآلود، ہاتھوں میں گٹھے پڑے ہوئے، مصائب کی ترشیوں سے چہرے مرجھائے ہوئے، لیکن ان کے رگ وریشے میں حب وطن کا جذبہ موجزن ہے............زمانے نے ان کو دھکیلا، مسلح طاقتوں نے ان کو اپنے گھروں سے اجاڑا، ان کی جھونپڑیوں کو برباد کیا، یہ اپنے ہزاروں جگر پاروں اور بھائی بندوں کی قربانی دے کر اپنی بستیوں سے نکلنے پر مجبور ہوئے لیکن ملک چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوئے۔''

اس مجموعہ میں ایک مقالہ ''مولانا سید محمد میاں اور میوات'' ڈاکٹر مشتاق تجاروی کے قلم سے ہے، اس میں اہل میوات سے مولانا کے لگاؤ اور تعلق کو ملاحظہ فرمائیں۔

۱۸/اپریل ۱۹۵۱ء کے اخبار میں مولانا کا ایک تفصیلی مضمون ''جمعیۃ علماء کے دینی مکاتب'' شائع ہوا ہے۔ جس میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ مکاتب کا قیام صرف مسلمانوں کے لئے نہیں بلکہ پورے ملک کے لئے ایک مفید قدم ہے۔ اس موضوع پر کئی مضامین ہیں۔

۲۷/جولائی ۱۹۵۱ء میں ''مودودی صاحب کا طریق فکر! ایک غلط فہمی کا ازالہ'' کے عنوان سے ایک اہم مضمون شائع ہوا، جس میں جماعت اسلامی کے اس دعویٰ کا رد کیا گیا ہے کہ ''دورِ حاضر کے پیچیدہ مسائل کو اسلامی نقطۂ نظر سے سلجھانے کی جو خدمت جماعت اسلامی نے انجام دی ہے، وہ کوئی اور جماعت نہیں پیش کر سکتی۔''

مولانا لکھتے ہیں کہ: ہمیں اس دعویٰ پر تعجب اور حیرت ہے اور اس مختصر مضمون میں ہم اس مسئلہ پر ہلکی سی روشنی ڈالنا چاہتے ہیں۔'' مولانا کی باتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ اس سے پہلے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، ان کے پوتے شاہ اسماعیل شہید امارت اور منصب امامت پر سیر حاصل بحث کر چکے ہیں۔ موجودہ صدی کے علماء میں سب سے پہلے مولانا ابوالمحاسن سجاد

اور مولانا محمد میاں منصور انصاری (مہاجر افغانستان) کے اسماء گرامی خصوصیت سے پیش کئے جاسکتے ہیں جنھوں نے ان مسائل پر اس درجہ منضبط اور مستحکم بحث کی ہے کہ آج تک وہ ضبط و استحکام مودودی صاحب یا ان کی جماعت کی کسی تصنیف کو حاصل نہیں ہوسکا، اور یہ تصانیف مودودی صاحب کی تحریک سے دس سال پیشتر لکھی جاچکی ہیں اور تعجب کی بات یہ ہے کہ اسی نام سے آچکی ہیں جس پر یہ لوگ آج فخر کررہے ہیں۔

۲۴؍ستمبر ۱۹۵۱ء کے سنڈے ایڈیشن میں ایک مضمون ہے ''کیا ہندوستان کے ساڑھے چار کروڑ مسلمان ایمان فروش ہیں؟ ایک سوال اور اس کے جواب پر طائرانہ نظر'' ایک سائل نے مولانا مودودیؒ سے یہ سوال کیا تھا کہ اب ہندوستان و پاکستان دارالکفر و دارالاسلام کی صورت میں دو ملک وجود میں آچکے ہیں، بہت سے مسلمان ایسے ہیں جو ہندوستان (دارالکفر) میں ہیں اور ان کی اولاد، والدین اور دیگر رشتہ دار پاکستان (دارالاسلام) میں ہیں، تو کیا یہ ایک دوسرے کی وراثت کے حق دار ہوسکتے ہیں؟ اور ان کے درمیان شادی بیاہ جائز ہے؟ (اگر آج ہمیں ان سوالات کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے تو بجا ہے، لیکن اُس دور میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پاکستان کا تقدس اس درجہ ذہن و دماغ میں بٹھا دیا گیا تھا کہ بالکل مکہ اور مدینہ کے ساتھ ہندو پاک کا تقابل کیا جاتا تھا، آج تو اس مقدس ریاست کی جو حالت ہے کسی بھی مسلمان کے ذہن میں اس طرح کے سوالات آ ہی نہیں سکتے۔ از مرتب)

مولانا مودودیؒ نے جواب میں اپنا یہی رجحان ظاہر کیا ہے کہ ہندوستان اور پاکستان میں رہنے والے رشتہ دار ایک دوسرے کی وراثت کے حق دار نہیں ہوسکتے ہیں، اور نکاح محض ہجرت سے نہیں ٹوٹتا اس کے لئے نکاح کے فسخ کے لئے درخواست دینی چاہئے، اور آئندہ ہندوستانی و پاکستانی مسلمانوں کے درمیان شادی بیاہ نہ کرنا چاہئے۔

اس پر مولانا نے نہایت سخت انداز میں تنقید کی ہے، جو عنوان ہی سے ظاہر ہے۔

۲۳؍جولائی ۱۹۵۰ء کے اخبار میں پاکستان جانے والے افراد کی عورتوں کے متعلق ایک ضروری ہدایت مولانا کے قلم سے موجود ہے۔ ایک صاحب نے لکھا کہ: ''میوقوم

میں اُن لڑکیوں کے نکاح کی کثرت ہوتی جارہی ہے جن کے شوہر پاکستان میں زندہ ہیں۔“
اس پر مولانا نے لکھا:

”اگر یہ اطلاع صحیح ہے تو بہت زیادہ تکلیف دہ اور افسوسناک ہے، جن کے شوہر پاکستان میں زندہ موجود ہیں، ان کا نکاح حرام ہے۔ ان عورتوں کا نکاح صرف اسی صورت میں درست ہوسکتا ہے کہ ان کے شوہر طلاق دیدیں۔ اگر شوہر لاپتہ ہے اور اس کے ملنے کی توقع نہیں رہی یا اس کی ضرورت سے لاپرواہ ہے اور پریشان کرنے کے لئے اس کو طلاق بھی نہیں دیتا تو کسی وکیل سے مشورہ کرکے فسخِ نکاح کا دعویٰ دائر کردیا جائے، جب فسخ نکاح کا فیصلہ ہوجائے تو اس کو برادری کی پنچایت میں پیش کرکے اس فیصلہ کی شرعی طور تصدیق کرالی جائے۔

فسخِ نکاح کی اس کارروائی کے بعد عورت کو عدت گذارنی ہوگی، عدت گذر جانے کے بعد کسی سے نکاح جائز ہوگا، جب تک یہ کارروائی نہ ہوجائے دوسرا نکاح درست نہیں اور اس کا وبال ہمیشہ نئے میاں بیوی کی گردن پر رہے گا۔“

۴/اور ۶/اگست ۱۹۵۱ء کے الجمعیۃ میں علماء دیوبند، سہارنپور اور دہلی کی ایک متفقہ تحریر شائع ہوئی تھی جس میں مولانا مودودیؒ کے لٹریچر کو مسلمانوں کے لئے مضر بتایا گیا اور اس سے لاتعلقی کا اظہار کیا گیا، اس پر قیم جماعت اسلامی مولانا محمد یوسف صاحب نے اپنے ملاحظات پیش کئے، جس کا مولانا محمد میاںؒ نے الجمعیۃ کے کئی صفحات میں تفصیلی رد کیا۔

مولانا کا مضمون ”مودودی صاحب کا طریق فکر! ایک غلط فہمی کا ازالہ“ جو ۲۷/ جولائی ۱۹۵۱ء کے الجمعیۃ میں شائع ہوا تھا، جس کا ذکر پچھلے صفحات میں ہے، اس کا جواب مولانا ابواللیث اصلاحیؒ نے ”زندگی“ کے ستمبر کے شمارے میں دیا، اس پر مولانا نے ایک طویل مضمون بعنوان ”مولانا ابواللیث صاحب کے جواب پر ایک نظر“ لکھا جو الجمعیۃ میں نو قسطوں میں شائع ہوا، جو باتیں پہلے والے مضمون میں تشنہ رہ گئی تھیں اس میں اس کی پوری وضاحت ہوگئی ہے۔ پہلی قسط ۵/نومبر ۱۹۵۱ء میں شائع ہوئی، اور نویں قسط ۳۱/دسمبر ۱۹۵۱ء میں۔ مضمون کے ابتداء میں مولانا لکھتے ہیں:

''طول نگاری ایک مرض ہے، احقر بھی اس مرض میں مبتلا ہے، اور ہمارے کرم فرما مولانا ابواللیث صاحب امیر جماعت اسلامی ہند کا درجہ احقر سے بھی بڑھا ہوا ہے۔ آپ بلاضرورت بھی خامہ فرسائی شروع کر دیتے ہیں اور شوقِ تحریر میں غیر متعلق چیز کو بھی اپنے اوپر لے لیتے ہیں۔ چنانچہ اس کی تازہ مثال آپ کا وہ طویل مضمون ہے جو ''زندگی'' ستمبر کے اشارات میں شائع ہوا ہے۔ اس مضمون کا شان نزول احقر کا ایک مقالہ ہے جو الجمعیۃ مورخہ ۲۷/جولائی ۱۹۵۱ء میں شائع ہوا تھا، جس کا عنوان یہ تھا : ''مودودی صاحب کا طریق فکر! ایک غلط فہمی کا ازالہ''

۱۵/دسمبر ۱۹۵۱ء کو مولانا سید محمد میاںؒ کی طرف سے ایک اعلان جمعیۃ علماء کے انگریزی اخبار ''دی میسیج'' کے بارے میں شائع ہوا:

'' حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب ناظم عمومی جمعیۃ علماء ہند نے ایک انگریزی اخبار کے لئے جو اپیل کی تھی، خدا کا شکر ہے کہ بمبئی کے اہل خیر حضرات نے اس پر خاص توجہ فرمائی اور اب خدا کے فضل وکرم سے یہ وقت آ گیا کہ جلد ہی اس کی اشاعت ہمارے سامنے آ جائے۔

یہ اخبار ''دی میسیج'' ویکلی ۲۲/دسمبر ۱۵ء (سنیچر) سے شائع ہو رہا ہے۔ یہ اخبار سیکولرزم اور جمہوریت کا حامی، جمہور کا ترجمان اور اقلیتوں کے حقوق کا بہترین محافظ و پاسبان ہوگا اور پوری آزادی کے ساتھ اپنی رائے ظاہر کرتے ہوئے یہ کوشش کرے گا کہ وطن عزیز کا روشن مستقبل تمام باشندگانِ ہند کے میل ملاپ اور محبت کی مضبوط بنیاد پر قائم ہو........ایک ایسے اخبار کے لئے ہمیں ملک وملت کے ہر بہی خواہ سے یہ امید ہے کہ وہ اس کی خریداری کو ملک وملت کی ایک ضروری خدمت سمجھیں اور اس اعلان کے بعد فوراً ہی اپنا زرِ خریداری ارسال فرما دیں گے۔''

۱۹۵۲ء میں آزاد ہندوستان کا پہلا پارلیمانی الیکشن ہوا۔ یکم جنوری ۱۹۵۲ء کو اس موضوع پر مولانا کا ایک مضمون ''ہمارے ووٹ کا مستحق کون ہے؟ ملک کی مختلف پارٹیاں اور ان کے کارناموں پر ایک نظر'' کے عنوان سے شائع ہوا، جس میں مولانا نے ووٹ کی اہمیت

اوراس کی قدر و قیمت پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے، اوراس کی شرعی حیثیت کو بھی واضح ہے، اوراس وقت کی پارٹیوں کا تجزیہ کرکے بتایا ہے کہ کس کو ووٹ دینا ملک وملت کے حق میں مفید ہوگا۔اس مضمون کی اہمیت جیسے اس وقت تھی آج بھی ہے۔

اہم شخصیات کے انتقال پر مولانا تاثراتی مضامین بھی لکھا کرتے تھے، کبھی مختصر کبھی تفصیل کے ساتھ۔اپنے خصوصی مربی اوراستاذ مولانا اعزاز علی صاحب اور مدرسہ شاہی کے مہتمم مولانا عبدالحق مدنی پر تفصیلی مضمون لکھا تھا جسے ہم مکمل اس مجلّہ میں شائع کرر ہے، اس کے علاوہ ذیل میں دو مختصر تعزیتی تحریر پیش کرر ہے ہیں۔ایک مشہور اہل حدیث عالم مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی پر ہے، اور دوسری مشہور صاحب قلم عالم مولانا مناظر احسن گیلانی کی وفات پر لکھی گئی۔

آسمان علم وفضل کا ایک ستارہ غروب
مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی کی رحلت
موتُ العالِم موتُ العالَم

یہ خبر نہایت افسوس کے ساتھ پڑھی جائے گی کہ ہندوستان کے مشہور اہل حدیث عالم حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب میر سیالکوٹی ۲۸ر جمادی الاولیٰ ۱۳۷۵ھ مطابق ۱۲ر جنوری ۱۹۵۶ء بروز پنجشنبہ اس دارِفانی سے رحلت فرما گئے۔انا للہ وانا الیہ راجعون

مرکزی جمعیۃ اہل حدیث مغربی پاکستان کے تار میں جو الجمعیۃ اور جناب حاجی محمد صالح صاحب (آف کوٹھی علی جان دہلی) کے نام موصول ہوا ہے، یہ روح فرسا خبر دی گئی ہے کہ جمعرات کے روز دوپہر کو مولانا موصوف کا انتقال ہوگیا، جمعہ کے بعد تدفین عمل میں آئی۔

مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی ایک پاک باز، صاحب زہد وتقویٰ عالم تھے، جنھوں نے تمام عمر علم دین کی خدمت میں صرف کی۔آپ کا حلقۂ درس ہمیشہ بارونق رہا، بہت سے اہل علم شاگرد اور چند قابل قدر تصانیف آپ کی علمی یادگار ہیں۔

آپ ہمیشہ حریت پسند رہے، جنگ آزادی میں عملاً پیش گام رہے، آپ کا شمار اُن بزرگوں میں ہے جو جمعیۃ علماء ہند کی سب سے پہلی مجلس منتظمہ کے قابل فخر ارکان میں تھے۔

جمعیۃ علماء ہند اور ادارہ الجمعیۃ آپ کی وفات کو دنیائے علم کا عظیم الشان نقصان قرار دیتا ہے، اور تمام پس ماندگان سے دلی ہمدردی ظاہر کرتے ہوئے دست بدعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جوارِ رحمت میں مقام اعلیٰ عطا فرمائے۔ رحمہ اللہ ونور مرقدہ

(مولانا) محمد میاں (ناظم جمعیۃ علماء ہند)

روزنامہ الجمعیۃ ۱۶/جنوری ۱۹۵۶ء، ص:۳

مولانا مناظر احسن گیلانی کی وفات پر لکھا:

موتُ العالِم موتُ العالَم

حضرت مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی کا سانحہ ارتحال

حلقۂ اہل علم کے لئے یہ خبر بہت زیادہ الم انگیز اور اندوہناک ہے کہ حضرت مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی ۲۵/شوال ۱۳۷۵ھ مطابق ۵/جون ۱۹۵۶ء سہ شنبہ کی صبح کو اس جہانِ فانی سے رحلت فرما گئے۔ حضرت مولانا ہندوستان کے منتخب اور چیدہ علماء میں سے تھے جن کو قدرت نے تحریر وتقریر، وسعت نظر، اعلیٰ اخلاق وکردار کی دولتوں سے نوازا تھا، اور آپ نے اپنی تمام صلاحیتیں اور تمام عمر علمی افادات، درس و تدریس، تصنیف وتالیف اور اشاعت علوم میں صرف کر دیں۔

عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد میں آپ کی علمی خدمات تاریخی اہمیت کی مالک ہیں اور آپ کی بے شمار تصانیف ومقالات زندہ جاوید کارنامہ ہیں، جن سے دنیا ہمیشہ مستفیض ہوتی رہے گی۔ دنیائے علم آپ کی وفات پر سوگوار ہے اور **موتُ العالِم موتُ العالَم** کا صحیح نقشہ سامنے ہے۔ اس ناقابل لافی نقصان پر نہ صرف آپ کے متعلقین اور خاندانی پس ماندگان کو تعزیت وتسلی دی جارہی ہے بلکہ حق تو یہ ہے کہ ہر ایک علم دوست تعزیت کا مستحق ہے۔

دعا ہے اللہ تعالیٰ جوارِ رحمت میں آپ کو اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور پس ماندگان کو صبر جمیل اور آپ کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق بخشے۔ جمعیۃ علماء ہند اور ادارہ الجمعیۃ آپ کی وفات پر دلی رنج والم کا اظہار کرتا ہے اور تمام پس ماندگان ووابستگان سے دلی ہمدردی کا اظہار کرتا ہے۔'' (مولانا) محمد میاں (ناظم جمعیۃ علماء ہند)

۶/ اکتوبر ۱۹۵۲ء میں الجمعیۃ کا تیونس مراکش نمبر نکلا تھا، اس میں مولانا محمد میاں نے ''ہندوستانی مسلمان اور دنیائے اسلام'' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا، جس میں انھوں نے دنیائے اسلام کے لئے ہندی مسلمانوں کی اخوت وہمدردی اور ان پر آنے والے حوادث ومصائب پر ان کے اضطراب وبے چینی کو تاریخ کی روشنی میں بیان کیا ہے، اور اس سلسلہ میں ترکی حکومت کی امداد، ڈاکٹر انصاری کے طبی مشن، خلافت کمیٹی اور جمعیۃ علماء ہند کی مساعی کا ذکر کیا ہے۔ یہ خصوصی نمبر بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ اس نمبر کے بعد مولانا نے کئی شماروں میں ''تاریخ افریقہ کا یک ورق'' کے عنوان سے مضامین لکھے جس میں ''عرب اور افریقہ کے تعلقات اور افریقہ کی مذہبی حالت''، ''لشکر کشی کی وجہ اور دور اول کے مسلمان فاتح'' اور ''افریقہ میں اشاعت اسلام'' کے ذیلی عنوان کے تحت ۱۳/ اکتوبر/ ۲۰/ اکتوبر/ ۲۷/ اور ۷/ نومبر ۱۹۵۲ء کو مضامین شائع ہوئے۔

مولانا ''اسلامی تعلیمات'' کے کالم کے تحت مضامین لکھا کرتے تھے جس میں انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر بحث ہوتی تھی۔ ۲۵/ جون ۱۹۵۲ء کے اخبار میں ''آداب مجلس'' کے عنوان سے ان اصول وضوابط کو بیان کیا ہے جو مجالس کے بارے میں شریعت میں وارد ہوئے ہیں۔ اس میں نمبروار ایک سے سولہ نمبر تک آداب بیان کئے گئے ہیں، بہت مفید مضمون ہے۔

الجمعیۃ میں ایک کالم تھا ''بچوں کی دنیا'' مولانا محمد میاں صاحب جنھیں بچوں کی نفسیات سے غیر معمولی واقفیت تھی اور انھوں نے بچوں کے نصاب پر کافی کام کیا تھا، اس کالم میں بچوں کے لئے چھوٹے چھوٹے سبق آموز دینی واخلاقی مضامین لکھتے تھے۔ ۱۵/

ستمبر ۱۹۵۱ء کے مضمون کا عنوان تھا: ''مخالفوں کو کس طرح اپنے رنگ میں رنگا کرتے ہیں''
اس میں انھوں نے لقمان حکیم کے واقعات بیان کئے اور اخیر میں بطور خلاصہ اور نتیجہ لکھا:

''حضرت لقمان کی نیت پھل لائی اور لڑکیوں کے دل میں خدا کا خوف پیدا ہوا۔
تم بھی جو کچھ کرو خیر خواہی کے جذبہ کے ساتھ کرو، اپنی بڑائی، نام و نمود یا دوسرے کو ذلیل اور حقیر کرنے کا جذبہ ہرگز نہ ہو۔ اگر نیت خراب ہوتی ہے تو بنا بنایا کام بگڑ جاتا ہے۔''

اس کالم میں ۲۹ر ستمبر ۱۹۵۲ء کو ''بڑوں کی بڑی باتیں'' کے عنوان سے عرب کے مشہور سخی حاتم طائی کی بیٹی اور بیٹے عدی بن حاتم کے اسلام لانے کا واقعہ اور اس ضمن میں اسلام کی اخلاقی تعلیمات کا ذکر کیا ہے۔ ۲۰ر اکتوبر کا عنوان ہے: ''دشمنوں کو دوست بناؤ''
اس میں حضرت ابوذر غفاریؓ، عمر بن عبدالعزیزؒ، امام اعظم ابوحنیفہؒ کے واقعات بیان کئے گئے جو اعلیٰ اخلاق پر دلالت کرتے ہیں۔ مولانا لکھتے ہیں:

''دیکھو! برائی کا بدلہ برائی سے بھی دیا جا سکتا ہے، مگر اس سے برائی ختم نہیں ہوتی، دشمن دوست نہیں بنتا۔ اور برائی کے جواب میں اگر اخلاق سے کام لیا جائے تو برائی ختم ہوتی ہے دشمن دوست بنتا ہے۔
دیکھو! مسلمان اس لئے ہے کہ برائی کو ختم کرے، اخلاق کو زندہ کرے اور اخلاق کی قوت سے دشمن کو دوست بنائے۔

۲۲ر دسمبر کا مضمون جس کا عنوان ''مسلمان کی شان'' ہے۔ یہ تو اس لائق ہے کہ اس کو مکمل نقل کر دیا جائے:

''مسلمان اللہ پر ایمان لاتا ہے، اللہ کے حکموں کی تعمیل کرتا ہے، تمام انسانوں کو ایک ماں باپ کی اولاد سمجھتا ہے، سارے بندوں کو بھائی بھائی جانتا ہے۔
رسول اللہ ﷺ نماز کے بعد دعا میں فرمایا کرتے تھے: اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا وَرَبَّ كُلِّ شَيْءٍ وَأَنَا شَهِيدٌ أَنَّ الْعِبَادَ كُلُّهُمْ إِخْوَةٌ۔ (اے پروردگار اور ہر چیز کے پالنہار! میں گواہ ہوں کہ سارے بندے بھائی بھائی ہیں۔) [ابوداؤد شریف]
مسلمان ہر ایک کی بھلائی چاہتا ہے، ہر انسان کو نفع پہنچاتا ہے، اچھی باتیں بتاتا

ہے، بری باتوں سے روکتا ہے، ہمیشہ سچ بولتا ہے، گلے پر خنجر ہو تب بھی مومن سچ بولتا ہے۔ پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹ سکتا ہے مگر مسلمان کی زبان سچائی سے نہیں ہٹ سکتی۔ ہر ایک سے انصاف کرتا ہے، مظلوم کی امداد کرتا ہے، ہر ایک پر رحم کرتا ہے، کرم کرتا ہے، کسی کو نہیں ستاتا، کسی کی توہین نہیں کرتا، کسی کو ناپاک نہیں سمجھتا، کسی سے چھوت چھات نہیں کرتا، بری بات زبان سے نہیں نکالتا، برائی کا بدلہ برائی سے نہیں دیتا بلکہ برائی کا جواب بھلائی اور اچھے اخلاق سے دیتا ہے، اپنے خدا کو ہر وقت یاد کرتا ہے، اُس کے قہر سے ڈرتا رہتا ہے اور اس کے رحم کا ہر وقت امیدوار رہتا ہے، نماز پڑھتا ہے، روزے رکھتا ہے، صدقہ خیرات کرتا ہے، اچھی باتوں کا نمونہ دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے۔

اللہ میاں نے فرمایا: مسلمان اس لئے پیدا کیا گیا کہ سارے انسانوں کو نفع پہونچائے۔

مسلمان اس لئے پیدا کیا گیا کہ بلند اخلاق اور اچھی سے اچھی عادتوں کا نمونہ دنیا کے سامنے پیش کرے۔

مسلمان اس لئے پیدا کیا گیا کہ اس کا وجود کائنات کے لئے رحمت ہو۔

مسلمان بے بسوں کا مددگار ہوتا ہے۔ مسلمان غم زدوں کا غم خوار ہوتا ہے۔ مسلمان یتیموں کا والی، مسکینوں کا وارث، بے پناہوں کی پناہ، بے نواؤں کا سرپرست ہوتا ہے۔

مسلمانوں کا رسول، رحمۃ للعالمین، مسلمانوں کا خدا، ارحم الراحمین، رب العالمین۔

لہٰذا: مسلمان بھی ہر ایک کے لئے رحمت، ہر ایک کا مددگار اور ہر ایک کے لئے دستگیر ہوگا۔''

مولانا کا ذہن ہر چہار سمت میں چلتا تھا، جب ۱۹۵۷ء کی آمد آمد تھی تو مولانا نے ایک پروگرام بنایا کہ ان مسلم فدایان حریت کے ناموں اور کارناموں کو محفوظ کیا جائے جنھوں نے تحریک آزادی میں کسی طرح کا بھی کردار ادا کیا ہے، اور ان شہیدوں کے متعلق ضروری معلومات حاصل کی جائیں جنھوں نے آزادیِ وطن کے لئے جانیں قربان کردی ہیں۔ ۶ر

ذی قعدہ ۱۳۷۵ھ مطابق ۱۶/جون ۱۹۵۶ء (شنبہ) کے اخبار میں مولانا نے ایک اپیل شائع کرائی تھی، معلوم نہیں اس پر کہاں تک عمل ہوا، یہ ایک انتہائی مفید کام تھا۔

”عنقریب ۱۹۵۷ء شروع ہونے والا ہے اور اس سال ۱۸۵۷ء کے شہدائے حریت کی صد سالہ یادگار منائی جائے گی۔ یہ ایک نمایاں اور مسلمہ حقیقت ہے کہ ۱۸۵۷ء کے خونِ شہادت میں مسلمانوں کا حصہ بہت زیادہ تھا، بلکہ اصل باغی مسلمانوں کو قرار دے کر ان پر مظالم کے پہاڑ توڑے گئے تھے، لیکن افسوس کہ ان کی تاریخ قلم بند نہیں ہوسکی۔ چونکہ اس کے بعد مدت تک ایسے حالات رہے کہ لوگ ان کا نام بھی لیتے ہوئے ڈرتے تھے، اسی کا نتیجہ ہے کہ آج شہدائے وطن کی صد سالہ یادگار منائی جارہی ہے جن کے نام یاد نہیں ہیں۔

جمعیۃ علماء ہند کی کوشش ہے کہ ان فدایان حریت کے نام معلوم کئے جائیں، ان کے حالات قلم بند کئے جائیں اور ۱۹۵۷ء شروع ہونے سے قبل ہی فراہم شدہ ذخیرہ شائع کردیا جائے۔ چنانچہ جمعیۃ علماء یوپی کی مجلس عاملہ نے اپنے حالیہ اجلاس میں ایک سب کمیٹی اس مقصد کے لئے بنائی ہے اور جمعیۃ کی تمام شاخوں سے اس اہم خدمت میں تعاون کی اپیل کی ہے۔

یہ کام بہت بڑا، بہت ضروری اور انتہائی اہم اور ساتھ ساتھ دشوار بھی ہے، لیکن آپ کے تعاون سے آسان ہوسکتا ہے۔ خونِ مظلومی کا مطالبہ ہے کہ ان بزرگوں کی یاد تازہ رکھی جائے، ان کے روشن کارناموں کو وطن کی تاریخ میں روشن رکھا جائے اور صد سالہ کے پروگرام میں ان کے نام شامل کرائے جائیں۔ کتابوں میں بے شک ان کے نام اور حالات نہیں ہیں، لیکن ان کی اولاد واخلاف اور شہر یا قصبہ کے بڑے بوڑھوں کے سینوں میں ضرور محفوظ ہیں۔

اپنے احباب وعوام کو توجہ دلا کر جتنی معلومات حاصل ہوسکے قلم بند کیجئے۔ خاص طور سے حسب ذیل امور:

نام۔ ولدیت۔ جائے سکونت۔ کیا کرتے تھے۔ جہادِ حریت ۱۸۵۷ء میں کیا خدمات انجام دیں۔ ان کی املاک وجائداد کا کیا حشر ہوا۔ اب ان کی اولاد کہاں

ہے۔ ان کے نام، پتے۔ نیز یہ کہ آپ کو کس ذریعہ سے ان امور کا علم ہوا۔ اگر کسی کتاب سے معلومات فراہم ہوئیں تو اس کا نام، حوالہ اور صفحہ۔ جو حضرات شہید نہیں ہوئے بلکہ روپوش ہوگئے، جلاوطن کئے گئے، ان کی جائداد ضبط ہوئی یا اور کوئی سزا دی گئی، ان کے حالات بھی اسی طرح قلم بند کئے جائیں۔

اس راہ میں آپ کے ضلع کا گزیٹر بہت مددگار ہوسکتا ہے، اس کے متعلقہ صفحات کا اقتباس (مع حوالہ) ٹائپ کرائیے۔

اس طرح آپ جس قدر معلومات ومواد فراہم کرسکیں اس کی ایک نقل مجھے اور ایک نقل براہ راست سب کمیٹی مذکور کے کنوینر مسٹر نفیس احمد وکیل، نواب گونگے باغ، امین آباد لکھنؤ کے نام ارسال فرماویں۔''

الجمعیۃ اپنے ابتدائی سالوں میں یوم آزادی (۱۵/اگست) کی مناسبت سے چند صفحات کے اضافے کے ساتھ آزادی نمبر شائع کرتا رہا ہے، تقریباً ہر نمبر میں مولانا کی کوئی نہ کوئی تحریر ضرور ہوتی تھی۔ ۱۵/اگست ۱۹۵۵ء کے آزادی نمبر میں تحریک سید احمد شہید...... جسے سرکاری کاغذات میں ''وہابی تحریک'' کہا گیا......' کی مالی قربانیوں پر ایک چشم کشا تحریر ہے جس کا عنوان ہے: ''جنگ آزادی میں مسلمانوں کی مالی قربانیاں'' وہابی موومنٹ کے ایک پہلو پر طائرانہ نظر۔ تین کروڑ کی جائدادیں ضبط۔

اس میں تاریخی حوالے سے یہ ثابت کیا گیا ہے، تحریک سید احمد شہید کے مجاہدین نے اس راہ میں جو مالی قربانیاں پیش کی ہیں ان کا میزانیہ تین کروڑ تک پہنچ جاتا ہے۔

اس مضمون کی ابتداء میں بھی مولانا نے اس بات کا اظہار کیا کہ ''ہم نے پہلے بھی اپیل کی تھی اور یہ اپیل دوبارہ پیش کی جارہی ہے کہ جو باتیں زبانوں پر ہیں یا سینوں میں محفوظ ہیں ان کو قلم بند کرنے کی زحمت گوارا فرمائی جائے، ایسے بیانات اور مضامین کے لئے الجمعیۃ کے کالم وقف ہیں، الجمعیۃ پوری فراخ حوصلگی کے ساتھ ان کو شائع کر کے اس تاریخ کو پائیدار بنانے کی کوشش کرے گا۔''

آزادی کی پہلی سالگرہ کے موقع پر ۱۹/۲۰/اگست ۱۹۴۸ء کی اشاعت میں دو

قسطوں میں مولانا کی مضمون ''مقصود آزادی'' شائع ہوا ہے۔اس وقت ملک کی پوری فضا میں جو خطرناک قسم کی فرقہ واریت کا زہر پھیلا ہوا تھا، اور جو سلوک مسلمانوں کے ساتھ ہوا، اس پر مولانا نے لکھا کہ کیا یہی آزادی کا مقصود تھا اور اسی کے لئے اتنی قربانیاں دی گئی تھیں۔ مولانا نے حکومت وقت کی کوتاہیوں اور سرکاری مشینری کی ذمہ داریوں کو یاد دلایا۔۱۶/ اگست ۱۹۴۹ء کے اخبار میں اسی موضوع پر ایک مضمون ہے، جس کا عنوان ہے''ہمارے حال کا ماضی کیا ہے؟ کیا یہی آزادی تھی جس کے لیے قربانیاں پیش کی تھیں؟''اس کی ابتداء اس شعر سے ہوتی ہے:

قسمت نے کیا اس لئے چنوائے تھے تنکے
بن جائے نشیمن تو کوئی آگ لگا دے

مولانا کے مختصر اور تفصیلی فتاوے بھی شائع ہوتے رہتے تھے۔۲/اگست ۱۹۵۲ء کے اخبار میں ایک صاحب نے سوال کیا کہ رامپور اور مرادآباد میں کچھ ایسے بینک قائم ہوئے ہیں جو جمع کردہ رقم چھ ماہ میں سات گنا کر کے دیتے ہیں۔ان صاحب کا اصرار تھا کہ اس کا یہ مراسلہ الجمعیۃ میں ضرور شائع کیا جائے۔

مولانا اس کے جواب میں لکھتے ہیں:

تعجب! توقع نہیں تھی کہ ایسے اور اس طرح کے لین دین کے متعلق شرعی حکم دریافت کیا جائے گا، اور اصرار ہوگا کہ اس کو اخبار میں شائع کیا جائے، کیونکہ جس چیز کی حرمت آفتاب کی طرح ظاہر ہے اگر ہم اس کے متعلق علماء اور مفتیان کرام کے بغیر فیصلہ نہیں کر سکتے تو یہ ہمارے دینی انحطاط اور مذہبی پستی کی انتہا ہے، اس پر ہمیں ماتم کرنا چاہئے۔کیا اگر''مئے ارغوانی'' کا نام''جامِ محبت''یا''شربتِ حیات'' رکھ دیا جائے تو اس کا شرعی حکم معلوم کرنے کے لئے بھی علماء کرام کے درازوں پر دستک دینی ہوگی۔یہ استفتاء نہیں دین کے ساتھ ایک قسم کا استہزاء کہنا چاہئے...........

جواب: محترم بندہ! یہ تو فرمایئے کہ سو کے بجائے سات سو کس بنا پر لے رہے

ہیں، کیا کوئی تجارت ہے؟ اگر بالفرض تجارت ہے تو نفع کی تعداد معین کرنا لامحالہ اتنے عرصہ کے بعد اتنی رقم دینی ہوگی، تجارت کو ناجائز کر دیتی ہے، خواہ آپ اس کا نام ''امداد باہمی'' رکھیں یا کوئی اور نام تجویز کریں۔ اگر تجارت نہیں ہے (جیسا کہ بالکل واضح ہے کہ تجارت نہیں ہے) اور آپ قرض دے رہے ہیں تو قرض پر جو نفع حاصل کیا جائے وہ حرام ہے، کیونکہ وہ سود ہے۔ اگر آپ امانت رکھوار ہے ہیں تو امانت پر نفع کیسا؟ یہ بھی شرعاً حرام ہے۔ یہ ایسی کھلی ہوئی باتیں ہیں جن کو معمولی عقل وفہم والا انسان بھی آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔''

اس کے بعد مولانا خاصی تفصیل سے بینک کے اس طرز عمل کی حقیقت کو واضح کیا کہ کس طرح یہ دھوکہ دے کر لوگوں سے رقم اینٹھتے ہیں۔

ایک مرتبہ بیکانیر کے کچھ مسلمانوں نے ''ہریجن ڈے'' کے موقع پر بھنگی آبادی میں صفائی کر دی تو لیگیوں نے ان کے کفر کا فتویٰ دیا، سوشل بائیکاٹ کیا اور ان کو مسجدوں میں جانے سے روک دیا۔ وہاں سے لوگوں نے اس پر استفسار کیا تو مولانا محمد میاں نے یہ جواب دیا:

'' نحمده ونصلی علیٰ رسوله الکریم ! مسلم لیگیوں کا یہ فتویٰ قطعاً غلط ہے، ان مسلمانوں کے بائیکاٹ کے جواز کی کوئی وجہ نہیں، ان کے لئے مسجدوں کا داخلہ ممنوع نہیں کیا جا سکتا۔

بھنگیوں کو یا کسی انسانی جماعت کو ناپاک قرار دینا، اس سے چھوت چھات کا معاملہ کرنا اسلامی تعلیمات کے سراسر خلاف ہے۔ قرآن حکیم تمام انسانوں کو ایک ماں باپ بلکہ ایک تن حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد قرار دیتے ہوئے ان کے درمیان اس قسم کی تفریق کی پوری قوت سے تردید کرتا ہے۔ حضرت حق جل مجدہ کا ارشاد ہے: یَـا اَیُّهَا النَّـاسُ اِنَّـا خَلَـقْنَـاکُمْ مِنْ ذَکَرٍ وَاُنْثٰی وَجَعَلْنَاکُمْ شُعُوْبًا وَقَبَآئِلَ لِتَعَـارَفُوْا (الحجرات:۱۳) ترجمہ: اے انسانو! ہم نے تم کو مرد اور عورت سے پیدا کیا، تمہارے خاندان وقبیلہ اس لئے بنادیئے کہ آپس میں ایک دوسرے کو پہچان سکو۔

ارشاد ربانی ہے: خَلَـقَـکُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ (سورۃ نساء:۱) تم سب کو ایک تن سے پیدا کیا۔

اس کے بعد احادیث اور فقہاء کے قول کو ذکر کرنے کے بعد لکھا کہ:

ان نصوص قرآنیہ، احادیث اور تصریحات فقہاء کی روشنی میں کسی قوم کو ناپاک سمجھنا اوران سے چھوت چھات کرنا، اسلام اور اس کے مقدس اصول کے لئے باعث ننگ وعار ہے۔افسوس! ہندوستانی مسلمانوں نے اپنے پڑوسیوں کے اتباع میں اسلامی اصول کو نظر انداز کرکے ان لوگوں سے چھوت چھات اختیار کی جن سے ہمارے پڑوسی چھوت چھات کرتے تھے۔نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان میں خود ان سے چھوت چھات کی جانے لگی۔

اگر ہم اس چھوت چھات کی مصیبت میں مبتلا نہ ہوتے تو اسلام کی بہت کچھ خدمت کرسکتے تھے۔آج ہمارا فرض ہے کہ اس رسم بد کو ختم کریں اور جو جماعتیں اس ننگِ انسانیت رسم کو ختم کرنے کی کوشش کررہی ہیں، ہم ان کا ساتھ دیں۔''

جیسا کہ میں نے لکھا کہ مولانا کا ذہن ہر چہار جانب چلتا تھا،الجمعیۃ کے جمہوریت نمبر ۲۶/جنوری ۱۹۵۵ء میں مولانا کا ایک مضمون ہے'' کاروبار اور روزگار کی باتیں''جس میں مولانا لکھتے ہیں:

''جمہوریہ ہند کے مسلمان اگر ترقی کرنا چاہتے ہیں تو ان کو اپنی تمام طاقت دو چیزوں پر صرف کرنی ہوگی۔(۱) مذہبی اور اخلاقی تعلیم وتربیت (۲) صنعت وحرفت۔ نمبر اول کے متعلق جمعیۃ علماء ہند کی کوششیں محتاج بیان نہیں ہیں،اسی کا جدوجہد کا نتیجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے تعلیم وتربیت کے متعلق عام بیداری پیدا ہوگئی ہے اور ہر ایک مجلس تعلیم وتربیت کے تذکرہ سے گرم ہے۔ضرورت ہے کہ ترقی کا دوسرا زینہ بھی نظر انداز نہ ہو اور آگے بڑھنے والا قدم دونوں سیڑھیوں پر یکساں پڑتا رہے۔

اسی وجہ سے ادارہ الجمعیۃ نے اعلان کیا ہے مہینہ کا ایک سنڈے ایڈیشن روزگار اور کاروباری معلومات کے لئے وقف ہوگا،اس میں مفید معلومات کے ساتھ کاروباری طبقہ کی ضروریات بھی پیش کی جایا کریں گی،اور جس طرح وہ کاروباری اور مزدور پیشہ کا ترجمان بننا اپنی کامیابی تصور کرے گا ،وہ حکومت کی کاروباری تجاویز اور ترقی کی اسکیمیں اپنے ہزاروں لاکھوں ناظرین تک پہنچانے میں کوتاہی نہیں کرے گا۔آج اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے یہ سلسلہ شروع کیا جارہا ہے۔.... (مولانا) محمد میاں

مولانا کا ایک مضمون ۲۲؍ مارچ ۱۹۵۰ء کی اشاعت میں ''ہم کہاں ہیں'' کے عنوان سے شائع ہوا ہے، جس میں مولانا نے بتایا کہ قوموں کی ترقی اور عروج کے لئے کیا چیزیں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں اور ہمارا رویہ اس سلسلہ میں کیا ہے اور ''ہم کہاں ہیں''۔ لکھتے ہے کہ: جس قوم کو نصب العین کی شناخت، عزم وحوصلہ اور ایثار وقربانی جیسے قیمتی اوصاف نصیب ہوجائیں، کامیابی ان کے قدم چومتی ہے اور عروج وترقی ان کے استقبال کے لئے دوڑتی ہے۔ تاریخ عالم کی بے شمار اقلیتیں جنھوں نے اکثریتوں پر غلبہ حاصل کیا اور گردش لیل ونہار کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے کر اَبلقِ روزگار کی تمام شوخیوں کو ختم کردیا، وہ انھیں اوصاف کی حامل تھیں اور ان کے دامن انھیں موتیوں سے بھرے ہوئے تھے۔''

ناظم عمومی (جنرل سکریٹری) جمعیۃ علماء ہند:

۱۰؍ستمبر ۱۹۶۲ء کے الجمعیۃ سے معلوم ہوتا ہے کہ ۸؍ستمبر ۹۶۲ء کو مجلس عاملہ کا اجلاس حضرت مولانا سید فخر الدین صاحب کی صدارت میں ہوا، جس میں مولانا عبدالحلیم صدیقی، قاری محمد طیب صاحب، مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی اور ڈاکٹر سید محمود جیسے لوگ شریک تھے۔ اس اجلاس میں مولانا سید محمد میاں کو مجاہد ملت کی جگہ جمعیۃ کا جنرل سکریٹری مقرر کیا گیا۔

الجمعیۃ کی ابتدائی فائلوں میں جمعیۃ کی تنظیم اور اس کے استحکام، جمعیۃ کے اجلاس کی تجاویز، ان اجلاس کی اہمیت، جمعیۃ کی خدمات کا تذکرہ، ان سے متعلق اور تعلیم ونصاب تعلیم سے متعلق مولانا کی سینکڑوں تحریریں اور مضامین ومقالات ہیں، جن کی تفصیل اس مجموعہ مقالات میں جستہ جستہ آپ پڑھیں گے۔ اس مقالہ میں عموماً وہ چیزیں پیش کی گئی ہیں جن سے کسی نے تعرض نہیں کیا ہے۔ مراسلات کے ذریعہ جمعیۃ علماء پر ہونے والے اعتراضات کے جوابات بھی گاہے بگاہے دیا کرتے تھے۔ کبھی کبھی مولانا کے خطوط بھی کسی مناسبت سے چھپ جاتے تھے۔ ہم ایک خط پیش کرتے ہیں جو ۳۰؍دسمبر ۱۹۶۲ء کے الجمعیۃ میں شائع ہوا۔ یہ لکھنؤ کے الحاج سید محمد امین صاحب کے نام لکھا گیا ہے۔ ۱۹۵۱ء کے کسی اجتماع میں مسلم مسافر خانے کی تجویز پاس کی گئی تھی، جس کو ۱۱؍سال بعد مولانا کی نظامت عمومی کے دور میں

جمعیۃ علماء لکھنؤ نے عملی جامہ پہنانے کا قصد کیا تو مولانا نے اسی سلسلہ میں یہ خط لکھا۔

محترم ومکرم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

روزنامہ الجمعیۃ میں آج یہ خبر پڑھ کر مسرت ہوئی کہ جمعیۃ علماء لکھنؤ نے طے کیا ہے کہ مسلم مسافر خانہ کی تجویز جو عرصہ سے گمنام زندگی گزار رہی تھی اس کو زندہ کرنے اور سرگرم جدوجہد سے پایۂ تکمیل تک پہونچائے۔

اس مقصد کے لئے جناب کی زیر صدارت ایک کمیٹی بنائی گئی ہے، یہ اقدام اگرچہ ابتدائی ہے مگر بہت مبارک اقدام ہے، اس لئے میں دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ مجھے مسرت اس بنا پر بھی ہے کہ یہ اقدام اس منزل کی طرف ہے جو جمعیۃ علماء کا اہم نصب العین ہے۔

وہ فرائض جو ۱۹۴۷ء سے پہلے تحریک آزادی کے سلسلہ میں اور ۱۹۴۷ء کے بعد ہنگامی حالات کی بناء پر جمعیۃ علماء انجام دیتی رہی وہ سب ہنگامی تھے۔

ملت کی تعمیر وترقی جمعیۃ علماء ہند کا بنیادی نصب العین ہے اور جو خدمات اس نصب العین سے متعلق ہوں وہ بنیادی فرائض ہیں جن کی ذمہ داری جمعیۃ علماء ہند پر عائد ہوتی ہے۔

مدرسوں، تعلیم گاہوں، دینی تعلیم کے حلقوں، دارالمطالعہ اور لائبریریوں کا قائم کرنا، جاری رکھنا اور ان کو ترقی دینا جس طرح جمعیۃ علماء کے پروگرام میں داخل ہے، ایسے ہی مسافر خانوں اور طلبہ کے لئے اقامت گاہ اور ہوسٹلوں کی تعمیر بھی ملت کی اہم ترین ضرورت ہے اور جناب نے اور جناب کے احباب نے لکھنؤ میں مسافر خانے کی تجویز زندہ کر کے پورے ملک میں پھیلی ہوئی جمعیۃ علماء کی سینکڑوں شاخوں کو ایک روشنی بخشی ہے کہ ان کی عملی سرگرمیاں ایسی ضرورتوں اور ایسے مقاصد کی تکمیل میں مصروف ہونی چاہئیں۔

ضرورت ہے کہ اس ارادہ کو جلد سے جلد عملی جامہ پہنایا جائے اور بلا تاخیر کام شروع کر دیا جائے۔ لکھنؤ کی زمین زرخیز ہے، آپ حضرات اگر بلاتوقف جدوجہد کریں تو چند ماہ میں یہ تجویز ایک عظیم الشان عمارت کی شکل میں جامۂ عمل سے آراستہ

ہوسکتی ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو ملک وملت کی بہترین خدمات کی توفیق بخشے۔آمین

والسلام

نیازمند محتاج دعا

محمد میاں

اس کے علاوہ وقتاً فوقتاً مولانا کی تقریریں، یا اس کے اقتباسات بھی چھپتے رہتے تھے۔ایک مرتبہ مولانا نے جمعیۃ کے کسی پروگرام کی صدارت کی تھی اور ایک تفصیلی خطبہ بھی دیا تھا، جس کے اقتباسات پانچ چھ قسطوں میں شائع ہوئے تھے۔اس وقت تلاش کے باوجود ان اخبارات کے فوٹو نہیں مل رہے ہیں، ورنہ نمونہ کے طور پر کچھ حصہ نقل کرتا۔

الجمعیۃ نے ابتدائی سالوں میں کئی عید نمبر بھی نکالے۔ ہمارا ملک ۲۷/رمضان کو آزاد ہوا تھا، ۱۵/اگست ۱۹۴۷ء کو عربی تاریخ ۲۷/رمضان ۱۳۶۶ھ تھی۔ مولانا کا ایک مضمون ۸/اگست ۱۹۴۸ء کے عید نمبر میں شائع ہوا ہے، جس کا عنوان ہے ''پہلی عید اور اب کی عید''، مضمون سے پہلے عربی زبان کے مشہور شاعر متنبّی کا یہ شعر لکھا ہے ؎

عید بایة حالٍ عدت یا عید — بما مضیٰ أم لامرٍ فیک تجدید

ہمارے سامنے عید ہے، اے عید تو کس حالت میں دوبارہ آئی ہے۔

اسی پہلی حالت کے ساتھ یا کوئی نئی حالت لے کر

اس مضمون میں آزادی کے معاً بعد والی اور اس عید کا تجزیہ کیا گیا ہے اور اس موجِ خوں کا ذکر کیا گیا ہے جو دلی کے مسلمانوں پر ان دو عیدوں کے درمیان گزر گئی۔

۲۳/مئی ۱۹۵۵ء کے عید نمبر میں ''ہماری عید'' [خدا پرستی، ہمدردیِ خلقِ خدا اور انسانی شرف وعظمت کا مظاہرہ] کے عنوان سے ایک مضمون شائع ہوا ہے۔اس میں مولانا نے امن وسلامتی، اسلامی اخوت وہمدردی، رِفق ونرمی، توحید وخدا پرستی، زینت وصفائی اور انسانی شرف وعظمت پر شاندار گفتگو کی ہے۔

۲۴؍ جون ۱۹۴۹ء (۲۷؍ شعبان ۱۳۶۸ھ) کے اخبار میں ''ماہ مبارک کا استقبال ہم کس طرح کریں'' کے عنوان سے ایک مختصر، جامع اور عمدہ ترغیبی مضمون لکھا ہے۔

اسی طرح ۱۲؍ اگست ۱۹۵۶ء میں مولانا کا ایک بہت ہی اہم مضمون ''دینی ذوق اور اسلامی ماحول کیونکر پیدا ہو'' شائع ہوا، جس میں اس بات پر زور دیا گیا کہ مساجد کو صرف پنج وقتہ نماز تک محدود نہ رکھا جائے بلکہ اس کی مرکزیت کو عملی جامہ پہنایا جائے۔

''مسجد صرف پنج وقتہ جماعتوں کا مرکز ہی نہیں بلکہ سیرت رسول (ﷺ) سیرت خلفاء راشدین اور سنن نبویہ کی رہنمائی یہ ہے کہ وہ مذہبی تعلیم، اسلامی تہذیب اور اخلاقی و روحانی تربیت کا بھی مرکز ہے۔ آپ بھی اس مرکزیت میں یہ جامعیت پیدا کیجئے۔

اس کے بعد ترتیب وار تین باتیں لکھی ہیں کہ: کسی نماز کے بعد نصف گھنٹہ مقرر کر کے قرآن پاک کا ترجمہ، یا حدیث کی کوئی کتاب، یا اخلاق وتصوف کے متعلق کوئی رسالہ ہلکی پھلکی تشریح کے ساتھ سنایا جائے۔ اور محلّہ کے بچوں کے لئے حسب سہولت صباحی یا شبینہ مکتب قائم کیا جائے۔ اور دیانت وامانت، اخلاص وصداقت کا ذوق پیدا کرنے کے لئے اس مسجد کے احاطہ میں کوئی دینی دارالمطالعہ، دینی کلب قائم کیجئے، جہاں بچوں کی دماغی تربیت وتفریح کے ساتھ دینی ذوق اور علم کا شوق بھی پیدا ہو۔''

ذی الحجہ ۱۳۸۹ھ (۱۹۷۰ء) میں مولانا نے حج کیا، حج سے واپسی پر اس کے متعلق ۱۲؍ اپریل ۱۹۷۰ء کے الجمعیۃ ایک خبر شائع ہوئی:

''حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب صدر جمعیۃ ٹرسٹ مع اپنی اہلیہ صاحبہ کے آج حج بیت اللہ سے واپس تشریف لے آئے۔ نئی دلی ریلوے اسٹیشن پر آپ کا ستقبال کرنے کے لئے جو حضرات موجود تھے اُن میں حضرت مولانا سید اسعد مدنی (ناظم عمومی جمعیۃ علماء ہند) مفتی عتیق الرحمٰن صاحب، مولانا سید احمد ہاشمی ناظم جمعیۃ اور دوسرے ممتاز حضرات موجود تھے۔ مشہور کاتب خلیق ٹونکی نے اس موقع پر اشعار کے ذریعہ جو تاریخ نکالی تھی، وہ پیش خدمت ہے:

ہدیۂ ادنیٰ بموقع مراجعت از حجِ بیت اللہ مع اہلیہ صاحبہ (۱۹۷۰ء)
بعالی جناب والا جاہ ونجیب الطبع وزعیم ملت حاجی ومولوی سید محمد میاں (۱۳۸۹ھ)

جو درّاکِ عالی بڑے نکتہ داں ہیں		جو شیریں زباں ہیں سلاست بیاں ہیں
جو ظرّاف وزاہد نقیب جہاں ہیں		و ہ مو لا نا سید محمد میا ں ہیں

۱۴۹۹ + ۴۷۱ = ۱۹۷۰ء

ناچیز محمد خلیق ٹونکی (۱۳۸۹ھ)

۱۹۶۷ء میں جمعیۃ علماء ہند نے روزنامہ الجمعیۃ کے علاوہ اس کا ایک ہفت روزہ ایڈیشن نکالنے کا فیصلہ کیا، اس کے لئے مشہور صاحب قلم مولانا وحید الدین خاں کی خدمات حاصل کی گئیں۔ ہفت روزہ الجمعیۃ تقریباً سات سال تک پوری کامیابی کے ساتھ نکلا، اس کا معیار نہایت اعلیٰ اور انداز بالکل منفرد تھا۔ یہ جمعہ کو شائع ہوتا تھا اس لئے جمعہ ایڈیشن کہلاتا تھا۔ اس کے ایڈیٹر مولانا وحید الدین خاں کے مستعفی ہونے کے بعد یہ بند ہو گیا۔

اس میں مولانا سید محمد میاں کے بہت سے مضامین ومقالات، فتاوے اور تجاویز و تبصرے شائع ہوئے۔ ضرورت ہے کہ اس کا بھی بغور مطالعہ کر کے اس کا اشاریہ تیار کر دیا جائے۔ میں نے دوران مطالعہ جو چیزیں نوٹ کر لی تھیں ان میں سے چند ایک کی فہرست ذیل میں دی جارہی ہے:

☆ عرفانِ عارف (تبصرہ بر کلام قاری محمد طیب صاحب) ۱۳/اکتوبر ۱۹۶۹ء، ص:۱۳
☆ رحمت عالم (تبصرہ بر کتاب مولانا احتشام الحسن صاحب) ۲۰/اکتوبر ۱۹۶۷ء، ص:۱۲
☆ کاش عرب سمجھیں ۲۲/ستمبر ۱۹۶۷ء، ص:۴
☆ اسلام میں وعدہ کی اہمیت یکم دسمبر ۱۹۶۷ء، ص:۱۷
☆ ایک عجیب وغریب قانون ۱۹/فروری ۱۹۶۸ء، ص:۲
☆ دار العلوم دیوبند ایک یادگار ۱۹/اپریل ۱۹۶۸ء، ص:۱۳
☆ مسلمانوں کا جارحانہ اقدام ۱۴/جون ۱۹۶۸ء، ص:۹

☆ اپنے رب سے رشتہ جوڑیئے ۲۴/اگست ۱۹۶۸ء، ص:۸

☆ وأعدوا لهم مااستعطم ۱۰/اکتوبر ۱۹۶۹ء، ص:۳

☆ دیارخواجہ کے زائرین توجہ فرمائیں (خواجہ نمبر) ۲۵/اگست ۱۹۷۰ء، ص:۴

☆ ادارۃ المباحث الفقہیہ (ایک انٹرویو) ۲۲/مئی ۱۹۷۰ء، ص:۱۸/۱۹

☆ جمعیۃ ورکرس تربیتی کیمپ، مفصل رپورٹ ۲۵/ستمبر ۱۹۷۰ء، ص:۶

☆ // // // // ۶/نومبر ۱۹۷۰ء، ص:۱۷

☆ جمعیۃ علماء اپنی تجاویز کے آئینہ میں ۱۵/جنوری ۱۹۷۲ء، ص:۱۹

☆ تین طلاق کا مسئلہ (ایک تفصیلی فتویٰ) ۴/فروری ۱۹۷۴ء، ص:۵

☆ ہندوستان میں مسلمانوں کے ملکی فرائض شریعت کی روشنی میں
(ایک تفصیلی فتویٰ) یکم/مارچ ۱۹۷۴ء، ص:۱۶/۱۷

جمعیۃ علماء ہند کے جواں ہمت قائد اور جنرل سکریٹری مولانا محمود مدنی دامت برکاتہم کا عزم یہ ہے کہ روز نامہ الجمعیۃ اور ہفت روزہ الجمعیۃ کو ڈیجیٹلائز کر کے محفوظ کر دیا جائے۔روز نامہ الجمعیۃ کا کام تو بہت لمبا ہے،اس لئے اس میں تو ابھی وقت لگے گا،لیکن ہفت روزہ الجمعیۃ کا کام اپنے آخری مرحلہ میں ہے،اس کے بعد اس کا مطالعہ اور اس سے استفادہ بہت آسان ہوجائے گا۔اور اس وقت اشاریہ بھی بسہولت تیار ہوجائے گا۔’’مولانا سید محمد میاں اور روز نامہ الجمعیۃ‘‘ اس سیمینار کا ایک اہم اور قدرے مشقت طلب عنوان تھا، شاید اسی لئے اس پر کوئی مقالہ نہ آسکا۔اس کی اہمیت کے پیش نظر میں نے سیمینار کے بعد اس پر قلم اٹھایا اور جس قدر ممکن ہوسکا روز نامہ اور ہفت روزہ الجمعیۃ سے تلاش کر کے نمونہ کے طور پر کچھ چیزیں دیدیں تاکہ آئندہ کام کرنے والوں کے لئے ایک نمونہ رہے،اور ان شاء اللہ بعد کے لوگ اسے خوب سے خوب تر اور اعلیٰ و برتر بنانے کی کوشش کریں گے۔

☆☆☆☆☆

سید الملت حضرت مولانا سید محمد میاں صاحبؒ کی علمی وقلمی خدمات رسالہ 'القاسم' اور ماہ نامہ 'دارالعلوم' دیوبند کے آئینے میں

محمد شاہد جمشید پوری (جھارکھنڈ) متعلم شعبۂ تحفظ سنت دارالعلوم دیوبند

اس مقالہ میں ہم مولانا سید محمد میاں کی ان تحریروں کا تعارف پیش کریں گے جو دارالعلوم سے نکلنے والے رسالے ''القاسم'' و''ماہنامہ دارالعلوم کے صفحات کی زینت بنیں۔

اصل مضمون سے پہلے ان دونوں رسالوں کا مختصر تعارف پیش خدمت ہے:

دارالعلوم دیوبند نے خدمت دین واشاعت اسلام کے لئے دیگر ذرائع کے ساتھ تحریر و صحافت کو بھی ایک ذریعہ بنایا۔ اس کا آغاز ۱۳۲۸ھ بمطابق ۱۹۱۰ء میں ''رسالہ القاسم'' سے ہوا، جس کے مدیر مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ عثمانی سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند، اور نائب مدیر مولانا سید اصغر حسینؒ استاذ دارالعلوم دیوبند، جب کہ سرپرست شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب دیوبندیؒ اور حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ قرار پائے۔ پھر بعد میں مولانا مفتی احمد حسن امروہویؒ، مولانا خلیل احمد انبہٹویؒ اور مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ نے بھی رسالے کی سرپرستی فرمائی۔ رسالے کے اجرا کے تین سال کے بعد مولانا سراج احمد رشیدیؒ استاذ دارالعلوم دیوبند کو رسالہ کا نائب مدیر مقرر کیا گیا۔

دو سال ۳۵،۱۳۳۴ھ/ ۱۷،۱۹۱۶ء/ ادیب زماں حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ نے بھی ''القاسم'' اور ''الرشید'' کے معاون مدیر رہے، اور اس پرچے کا حجم ۳۲، صفحات پر مشتمل ہوتا تھا۔

گیارہ سال کے بعد بعض دشواریوں کی وجہ سے رسالہ کی اشاعت موقوف ہوگئی، جمادی الثانی ۱۳۳۹ھ کو مارچ ۱۹۲۰ء کو آخری شمارہ شائع ہوا، پھر چار سال کا عرصہ گذرنے کے بعد محرم الحرام ۱۳۴۴ھ / ۱۹۲۵ء کو اس رسالہ کی نشأۃ ثانیہ ہوئی۔ اس وقت بھی مدیر مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانیؒ ہی رہے البتہ نائب مدیر کی ذمہ داری حافظ احمد صاحب کے صاحبزادے مولانا قاری محمد طاہر صاحب نے سنبھالی،

اور معاون مدیر عتیق احمد صدیقی تھے۔ دورِ ثانی میں رسالہ تین سال نکل کر ۱۳۴۷ھ/ ۱۹۲۸ء میں بند ہو گیا۔

''القاسم'' کے بند ہونے کے بعد دارالعلوم کے مخلصین ومحبین اور متوسلین کے اصرار پر اہل انتظام نے بالآخر جمادی الاول ۱۳۶۰ھ/ (جون) ۱۹۴۱ء میں ''ماہنامہ دارالعلوم'' کے نام سے ایک نئے رسالہ کا سلسلہ شروع کیا، جو معمولی تخلف کے ساتھ حکیم الاسلام حضرت مولانا وقاری محمد طیب صاحبؒ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند کی نگرانی میں قضیۂ نامرضیہ کے پیش آنے تک نکلتا رہا۔

یہ رسالہ علمی وتحقیقی مقالات ومضامین کے ساتھ مہتمم صاحب کے اصلاحی اسفار، زائرین کی آمد ورفت کی تفصیلات، مجلس شوری وعاملہ کی کارروائیاں اور دارالعلوم کے پیش آمدہ حالات ومسائل اور حوادث سے بہی خواہاں دارالعلوم دیوبند کو آگاہ کرتا رہا۔ قضیۂ نامرضیہ کے بعد یہ رسالہ مولانا مرغوب الرحمٰن صاحبؒ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند کی نگرانی میں نکلتا رہا۔ رمضان المبارک ۱۴۰۳ھ/ جون ۱۹۸۳ء سے جمادی الاولی ۱۴۰۵ھ/ فروری ۱۹۸۵ء تک مجلس ادارت میں مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ، مولانا ریاست علی بجنوریؒ، مولانا حبیب الرحمٰن صاحب قاسمی اعظمی کے نام مندرج ہیں، اور اب یہ رسالہ مولانا مفتی ابوالقاسم نعمانی صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کی نگرانی میں نکل رہا ہے۔

اس کے پہلے مدیر مولانا عبدالوحید صدیقی غازی پوریؒ تھے جن کی بعد میں ''نئی دنیا'' کے بانی ومدیر کی حیثیت سے بڑی شہرت ہوئی۔ ان کا دورِ ادارت چار سال دو مہینے ہے۔ یعنی جمادی الاول ۱۳۶۰ھ سے جمادی الثانی ۱۳۶۴ھ/ جون ۱۹۴۵ء تک رہا۔ جولائی تا دسمبر اس کی اشاعت عارضی طور پر موقوف رہی۔

اس کے بعد محرم ۱۳۶۵ھ/ ۱۹۴۶ء جنوری سے رسالہ کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہوا۔ قاضی خلیق احمد صدیقی سردھنوی نے ادارت کی ذمہ داری سنبھالی، جن کی ادارت میں محرم ۱۳۶۸ھ/ نومبر ۱۹۴۸ء تک نکلتا رہا۔ صفر ۱۳۶۸ھ/ دسمبر ۱۹۴۸ء میں مشہور مصنف، صاحب مصباح اللغات ابوالفضل حضرت مولانا عبدالحفیظ صاحب بلیاویؒ رسالہ کے مدیر مقرر ہوئے۔ ان کی مدت ادارت بہت مختصر رہی، یعنی کل سات مہینے۔ ۱۳۶۸ھ صفر تا شعبان/ دسمبر ۱۹۴۸ء تا جون ۱۹۴۹ء۔

اسی جون والے شمارے میں مجلس شوری دارالعلوم دیوبند نے مالی مشکلات اور دیگر اسباب کی بناء پر ماہ نامہ دارالعلوم کو سہ ماہی کرنے کا اعلان کیا اور یہ رسالہ سہ ماہی بھی آئندہ صرف کوائف دارالعلوم پر مشتمل ہوا کرے گا۔ ماہِ شوال، ذیقعدہ وذی الحجہ ۱۳۶۸ھ کا شمارہ کوائف دارالعلوم دیوبند کے نام سے

مولانا سیدازہرشاہ صاحب قیصرؒ بن علامہ سید انور شاہ کشمیریؒ کی ادارت میں شائع ہوا۔ یہ بہترین انشاپردازاور صاحب قلم ادیب تھے، ان کی تحریر بڑی دلچسپ ہوتی تھی۔ ماہ نامہ دارالعلوم کے مدیر کی حیثیت سے ان کی بڑی شہرت ہوئی۔ مولانا کی ادارت میں رسالہ سہ ماہی سے بہت جلد دوبارہ ماہ نامہ ہوگیااوراس کا معیار بھی بلند ہوگیا۔

مولاناسیدازہرشاہ قیصرؒ کی ادارت کا زمانہ بہت طویل ہے، کل مدت ادارت ۳۲ سال چھ مہینے ہے۔ یعنی جولائی ۱۹۴۹ء سے ۱۹۸۲ء تک مسلسل وہ رسالہ کے مدیر رہے۔ درمیان میں سترہ سال اداریہ لکھنے کا فریضہ مولانا مفتی ظفیر الدین صاحبؒ نے انجام دیا، لیکن رسالہ پر بحیثیت مدیر مولانا ازہرشاہ قیصر ہی کا نام رہا۔ انتظامیہ میں تبدیلی کے بعد مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب منصب اہتمام پر فائز ہوئے، تو ادارت کی ذمہ داری مولانا ریاست علی صاحب بجنوریؒ کے حوالے ہوئی۔ حضرت مرحوم کی ادبی حیثیت اورحسن تحریر تو مسلم ہے۔ آپ کی کل مدت ادارت تین سال پانچ مہینے ہے یعنی جمادی الثانی ۱۴۲۰ھ مطابق اپریل ۱۹۸۲ء سے ذیقعدہ ۱۴۰۵ھ/ اگست ۱۹۸۵ء تک ہے۔ مولانا ریاست علی صاحب کے بعد ادارت کی ذمہ داری مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی قاسمی مدظلہ کے سپرد کی گئی۔ مولانا زمانہ ادارت بھی مولانا سیدازہرشاہ قیصر صاحبؒ کی طرح خاصا طویل ہے۔ مولانا نے رجب المرجب ۱۴۰۴ھ/ اپریل ۱۹۸۴ء سے ادارت کی ذمہ داری سنبھالی تھی، لیکن باضابطہ ذی قعدہ ۱۴۰۵ھ مطابق اگست ۱۹۸۵ء میں مدیر مقرر ہوئے اور دوسال قبل نومبر ۲۰۱۶ء میں اپنے امراض وعوارض کی وجہ سے اس ذمہ داری سے معذرت کرلی۔ آپ کی مدت ادارت کل ملاکر ۳۲ سال آٹھ مہینے ہوتی ہے۔ یعنی رجب المرجب ۱۴۰۴ھ/ اپریل ۱۹۸۴ء سے/ نومبر ۲۰۱۶ء تک مدیر رہے۔ اس کے بعد دسمبر ۲۰۱۶ء سے ادارت کی ذمہ داری مولانا محمد سلمان صاحب بجنوری استاذ دارالعلوم دیوبند کے سپرد ہے۔ اب اصل مضمون ملاحظہ فرمائیں۔

☆☆☆☆☆

سید الملت حضرت مولانا سید محمد میاں صاحبؒ کا شمار دارالعلوم دیوبند کے ممتاز فضلا اور علامہ کشمیریؒ کے ہونہار ومخصوص تلامذہ میں ہوتا ہے۔ جنگ آزادی کے عظیم قائد و رہنما اور بے باک لیڈر وسپاہی اور صحافی تھے۔ آپ کی تحریر میں ایک الگ قسم کی حلاوت، لطافت اور جاذبیت ہوتی ہے، جو پڑھنے والوں کے دلوں کو مسخر کرلیتی ہے۔ آپ کی قلم میں

جو کشش ہے اسے بیان کرنا مشکل ہے۔حضرت مولانا کا اندازِ تحریر عام فہم اور اور اسلوب بہت دلچسپ اور نرالا ہوتا تھا۔اس بات کا پورا لحاظ رکھتے ہیں کہ کوئی پہلو چھوٹنے نہ پائے اور مفہوم بھی پورا ادا ہوجائے۔ ہندوستان کے آخری عہد اسلامی کی تاریخ پر ان کی گہری نگاہ تھی اور مطالعہ بھی بہت وسیع تھا۔خاندان ولی اللّٰہی اور بزرگان دیو بند کی علمی وسیاسی اور دینی وتبلیغی خدمات پر ان کی تحریریں عزت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں۔ ہندوسان کی تاریخ میں انہوں نے جو علمی وتحقیقی اور تصنیفی خدمات انجام دی ہیں اسے ہمیشہ یادرکھا جائے گا۔علمائے ہند کی سیاسی خدمات سے عوام کو روشناس کرانے کے لیے بے انتہا محنت کی اور راستہ کی دشوار گھاٹیوں کو عبور کر کے اس سلسلہ میں انہوں نے جو تصنیفی کارنامے انجام دیے ہیں اس کی نظیر نہیں ملتی۔

جمعیۃ علمائے ہند کے پلیٹ فارم سے آپ نے بے لوث خدمات انجام دی ہیں، جمعیۃ کی سیاسی تاریخ اور اس کے ریکاڑ کے تنہا آپ مصنف ہیں۔حضرت مولاناؒ نے ہر ایک چیز کو تحریری شکل میں محفوظ کر دیا۔حضرت مولانا اسیر ادروی صاحب مدظلہ تاریخ شاہی کے صفحہ ۴۶۶ پر رقم طراز ہیں کہ:

''جمعیۃ علمائے ہند آپ کے زرنگار قلم کے احسانات سے کبھی بھی سبکدوش نہیں ہوسکتی، اور حقیقی معنوں میں جمعیۃ کی سیاسی خدمات سے دنیا کو متعارف کرانے والے مولانا موصوفؒ ہی تھے۔ سیاسی علما پر حضرت مولاناؒ کے جو احسانات ہیں اسے بھلایا نہیں جاسکتا۔ جس وقت مجلس شوری دارالعلوم دیو بند کے رکن بنے ،اس وقت سے لے کر آخر دم تک مجلس شوری وعاملہ کی رپوٹیں وتجاویز آپ ہی قلم بند فرماتے تھے۔''

آپ کے بہت سے علمی وادبی وتاریخی مقالات ومضامین کتابی شکل میں شائع ہوچکے ہیں اور بہت سے ایسے ہیں کہ جو ہندوستان کے مشہور ومعروف اور پائے کے اخبار وجرائد کے صفحات میں بکھرے پڑے ہیں، انھیں مایہ ناز رسائل میں رسالہ'دارالعلوم' دیو بند بھی ہے۔

رسالہ 'دارالعلوم' دیوبند سے آپ کا ربط اور تعلق بہت گہرا تھا، چنانچہ آپ ماہ نامہ دارالعلوم دیوبند میں اس کے آغاز سے آخر دم تک برابر مضامین لکھتے رہے۔ ماہ نامہ دارالعلوم دیوبند کا سینہ اوراق آپؒ کے بہت سے علمی و قلمی ادب پاروں کا محافظ و امین ہے۔اس مضمون میں ماہ نامہ دارالعلوم میں شائع شدہ چیدہ چنیدہ مضامین کا ایک سرسری تعارف پیش کرنے کوشش کی جائے گی۔

لیلۃ البراءت یا شب برات

یہ مضمون کا عنوان ہے: اس مضمون کے تحت حضرت مولانا نے کئی ذیلی سرخیاں قائم کی ہیں، جسے ترتیب وار ذکر کیا جاتا ہے:

(۱) اوقات و ایام عبادت
(۲) اختلاف و وجوہات
(۳) حلوا
(۴) مساجد میں اجتماع
(۵) قبرستانوں میں گشت
(۶) فضائل

عنوان ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مضمون میں شب برات کی فضیلت واہمیت، اور اوقاتِ عبادات کے ساتھ اس رات میں ہونے والے بدعات وخرافات تجزیہ کیا گیا ہے۔ یہ مضمون ماہِ رجب المرجب ۱۳۶۱ھ میں شائع ہوا۔ یہ مضمون کیا ہے دراصل حضرت مولانا سید محمد میاں صاحبؒ کے قلم کی روانی اور ان کے ذخیرۂ معلومات کا ایک انوکھا نمونہ ہے۔

مولانا جب کسی موضوع پر روشنی ڈالتے ہیں تو موضوع کا مکمل احاطہ کرنے کے ساتھ اگر کوئی نئی چیز سامنے آجاتی ہے تو اس پر بھی مولانا کا قلم بے تکلف چل پڑتا ہے۔ چناں چہ اس مضمون میں بھی ایسا ہی ہوا ہے۔ مضمون میں عبادات کو موسمِ بہار سے تعبیر

کرکے ایام عبادات کو سب کے لیے یکساں قرار دیا ہے۔یعنی ہندو اور مسلمان کے لیے مختلف اوقات عبادات الگ الگ نہیں ہیں۔پھر اوقاتِ عبادات کے درمیان جغرافیائی بحث کو چھیڑ کر اپنی بات کو مدلل کرتے ہوئے مختصر اور نہایت جامع انداز میں روشنی ڈالی ہے۔اس کے بعد مہینوں کے متعلق مذاہب کا اختلاف کیوں کر ہوا اور اختلاف کی وجوہات کو بڑے اچھے انداز میں بیان کیا ہے۔ اسلام کی آفاقیت اور عالم گیریت کے تعلق سے دوسرے مذاہب سے موازنہ کیا ہے۔مجوسی اور یورپین اقوام کے مابین ایک تقابلی مطالعہ بھی پیش کیا ہے۔شاہ جہاں کے عہد حکومت میں اس وقت کی نو ایجاد برائیاں وخرابیاں اور شاہانہ رسم ورواج کو تاریخ کی روشنی میں آنکا ہے۔شب براءت میں مساجد میں لوگوں کی اجتماعیت، شریعت میں اس کی کیا حقیقت ہے؟ اور قبر پرستی اور شمع فروزی جیسی جاہلانہ رسم کی ممانعت اور فضائل شب براءت کو احادیث کی روشنی میں واضح کیا ہے۔

اسی مضمون میں ایک جگہ شب براءت میں نوافل کی جماعت اور مروجہ رسموں کی طرف مولانا نے اشارہ کیا ہے۔ دین میں جو بگاڑ اور فساد رونما ہوئے ہیں، مثلاً نفل نماز جماعت کے ساتھ پڑھنا کیسا ہے، مستحب ہے، مسنون ہے، مکروہ ہے؟ شریعت اس سلسلہ میں کیا کہتی ہے؟ اس کی صحیح صورت حال سے لوگوں کو آگاہ اور شریعت کی صحیح تشریح کرکے اس کے سد باب کے لیے حضرت مولانا کا ذہن ودماغ جن حکیمانہ جملوں کی طرف جاتا ہے وہ قابل دید وداد ہے۔ذیل میں حضرت مولانا کی عبارت پر نظر ڈالتے چلیں:

''نوافل کی جماعت مکروہ ہے، صرف تین آدمیوں کی جماعت جائز قرار دی گئی ہے، مگر وہ بھی اس شرط پر کہ کسی کو دعوت نہ دی جائے بلکہ اتفاقی طور پر اجتماع ہو گیا ہو۔علاوہ ازیں یہ ضروری نہیں کہ تمام رات جاگتے رہیں بلکہ شب کے آخری حصہ میں چند رکعات پڑھ لینا بھی کافی ہوسکتا ہے۔لیکن ہمارے دوستوں نے شریعت اسلامیہ کی ان تمام پابندیوں کو بالائے طاق رکھ کر رات بھر بیدار رہنے کے لیے سب سے پہلے چائے کا انتظام کیا، مسجد میں ایک دیگچہ پانی کا بھٹی پر رکھ دیا، اس میں چائے پکائی گی، جس کا دور شب بھر

چلتا رہا، گوشۂ تنہائی کو چھوڑ کر مسجد کو رونق بخشی اور اس طرح مذہب کی اصلاح و تکمیل کی جس کی تکمیل کا خداوندی اعلان ۹/ذی الحجہ ۱۰ھ کو عرفات کی مقدس پہاڑی پر سرور کائنات ﷺ کے ذریعہ سے مقدس صحابہ کے ایک لاکھ نفوس کو سنایا جا چکا تھا۔'' (ماہ نامہ دارالعلوم دیوبند رجب المرجب ۱۳۶۱ھ ص:۹)

بلا مبالغہ یہ مضمون دقیق علمی مباحث اور ادبی و تاریخی عبارتوں سے مزین ہے۔ مولانا نے پورے مضمون کا خلاصہ بھی چند سطروں میں ص:۱۳ پر اس طرح بیان کیا ہے:

(الف) حسب توفیق وقدرت رات کو تنہا جاگ کر نماز پڑھنا، تلاوت اور ذکر و تسبیح میں مشغول رہنا۔

(ب) مغفرت، عافیت، فراخی رزق وغیرہ مقاصد دارین کی دعا مانگنا۔

(ج) اگر موقع ہو تو قبرستان میں جا کر آخرت کی یاد تازہ کرنا اپنے مآل اور انجام پر غور کرنا اور مردوں کے لیے دعائے خیر اور استغفار کرنا۔

(د) صبح یعنی پندرہ شعبان کو روزہ رکھنا۔

فرعون ہذہ الامۃ (ابوجہل) کا قتل/مسلم نونہالوں کی جانبازی اور ایک انصاری خاتون کا بے نظیر ایثار

دراصل یہ مضمون حضرت مولانا کی کتاب عہد زریں کا ایک حصہ ہے جو ماہ نامہ دارالعلوم دیوبند میں ۱۹۶۵ء میں مطبوع ہوا۔ سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اس وقت کے عام حالات اور غزوات وسرایا سے حضرت مولانا کو عجیب وغریب مناسبت تھی۔ اس مضمون کے علاوہ بھی کئی اس طرح کی تحریریں ہیں جن میں سیرت کی تابانی بکھیری ہے۔

یہ مضمون ابوجہل کے قتل کے پسِ منظر پر لکھا گیا ہے اور موت کے وقت ابوجہل کی انانیت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ مضمون کا شروع کا حصہ تو سوال وجواب کی شکل میں ہے، اس کے بعد جنگ کے پس منظر پر کلام کرتے ہوئے ایک جانباز انصاری خاتون کے بے نظیر ایثار وقربانی کا ذکر ہے۔ اس مضمون کو مرتب کرنے میں حضرت مولانا نے جو محنت کی ہے،

آپ کو تاریخ کی جن کتابوں کو کھنگالنا پڑا اس کی کہانی خود حضرت مولانا کی زبانی سنیے۔ اصل مضمون سے پہلے ایک مکتوب جو حضرت مولانا سید ازہر شاہ قیصرؒ کے نام ہے، اسے بھی ایک نظر دیکھتے چلیے:

محترم مولانا! دام لطفکم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مختصر مضمون پیش ہے:

آپ کو بہت انتظار کرنا پڑا، معاف فرمایئے۔ اس سے پہلے جس مضمون کا ارادہ تھا، وہ طویل بھی ہے اور دوسرے مضامین سے اس کا ربط بھی ہے، مستقل مضمون کی حیثیت سے دینے میں کچھ ردوبدل کرنا پڑتا۔ یہ مضمون اگرچہ مختصر ہے، مگر آپ کی فرمائش کے مطابق ہے کہ دارالعلوم کے تین یا ساڑھے تین صفحات میں آجائے گا۔ اس کو مرتب کرنے میں احقر کو بہت کاوش کرنی پڑی ہے۔ سیرت کی اردو اور عربی کتابیں سب سامنے رکھ کر پڑھا جائے تو اندازہ ہوگا کہ اس میں چند باتیں وہ ہیں جو سیرت کی عام کتابوں میں نہیں ہیں۔ چند روایتوں میں تعارض ہے، علامہ شبلیؒ بھی 'سیرت النبی' میں وہ تعارض رفع نہیں کر سکے۔ انہوں نے ایک روایت پر اعتماد کر لیا، احقر نے تعارض رفع کیا ہے اور مختلف روایتوں کو جمع کیا ہے۔ یہ بات بالکل نئی ہے کہ ''ابوجہل یوں ہی نہیں مر گیا، بلکہ دو مجاہدوں کو شہید کرنے کے بعد زخمی ہوا تھا' نیز حضرت عفراء رضی اللہ عنہا کی قربانی اور ایثار کا تذکرہ سیرت کی کتابوں میں اس تفصیل سے نہیں ہے۔ بہرحال تاخیر کی معافی چاہتے ہوئے یہ مضمون پیش کر رہا ہوں۔ گر قبول افتد زہے عز وشرف۔'' والسلام! نیاز مند محمد میاں (۱۹/۶/۶۵ء) (ماہ نامہ دارالعلوم دیوبند ستمبر ۱۹۶۵ء ص:۳)

جنگ بدر اسلامی غزوات کی ایک اہم کڑی ہے، اسی جنگ میں ابوجہل صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ہاتھوں قتل کیا گیا تھا۔ اس جنگ میں اللہ تبارک وتعالی نے مسلمانوں کو کامیابی وکامرانی سے ہم کنار کیا۔ اس عظیم الشان کامیابی اور حضرت عفراءؓ کے جذبہ حریت اور قربانی کے سلسلہ میں حضرت مولانا نے جو جملے سپرد قلم فرمائے ہیں وہ یہاں درج کیے جا رہے ہیں:

''سلسلہ غزوات میں یہ اسلام کی پہلی اور عظیم الشان فتح تھی کہ فرعون ہذہ الامۃ کا قتل ہوا، مگر اس شاندار فتح میں حضرت عفراء رضی اللہ عنہا مستحق مبارک باد ہیں کہ انہوں نے اس کامیابی کے لیے اپنے دولخت جگر قربان کردیے۔ (معوذ اور عوف رضی اللہ عنہما) اسلام کی پوری تاریخ اس کی مثال نہیں پیش کر سکے گی کہ ایک خاتون کے سات لڑکے ہوں اور سب میدان جہاد میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جھنڈے کے نیچے جان قربان کرنے کی سبیل پیدا کررہے ہوں۔ یہ آبِ زر سے لکھی جانے والی ممتاز خصوصیت اور فضیلت حضرت عفراء رضی اللہ عنہا کو حاصل ہے۔'' (ماہ نامہ دارالعلوم دیو بند ستمبر ۱۹۶۵ء ص: ۶/۵)

حضرتؒ نے اسی مضمون کے آخری حصہ میں حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ کے وقت کے فرعون اور ابوجہل کے درمیان موازنہ کیا ہے کہ مرتے وقت فرعون کا کیا حال تھا اور ابوجہل کا کیا رویہ تھا؟ اس وقت کی منظر کشی مولانا نے اس طرح کی ہے کہ جیسے آنکھوں دیکھا حال ہے۔ چناں چہ ذیل کی عبارت ملاحظہ فرمائیں:

''حضرت موسیٰ علیہ السلام کے فرعون کا دل پھر بھی کمزور تھا کہ جب وہ ڈوبنے لگا تو پکار اٹھا'' **آمنت انہ لاالہ الا الذی آمنت بہ بنوا اسرائیل وانا من المسلمین** (سورۂ یونس ع: ۹) میں ایمان لایا کہ اس کے علاوہ کوئی معبود نہیں جس پر بنواسرائیل کا ایمان ہے اور میں مسلمان ہوں۔

مگر فرعون ہذہ الامۃ (ابوجہل) کی شقاوت اور قساوت ملاحظہ فرمایئے کہ بدن زخمی ہے، گردن کٹنے والی ہے، فرشتۂ موت سر پر ہے، لیکن اونچ نیچ کا فرق اور اپنی بڑائی کا غرور جو فطرت کا انمٹ داغ بن چکا تھا، اب بھی ابھر رہا ہے اور غلطی اور توبہ واستغفار یا ندامت کے بجائے اس کے دماغ پر اس بات کا بوجھ ہے کہ کسانوں نے اس کو مار ڈالا، کاش اس کا قاتل کوئی اور ہوتا۔ فرعون کے ان درجات سے ان مصائب اور تکالیف کا بھی اندازہ ہوتا ہے جو حضرات انبیا علیہم السلام کو برداشت کرنی پڑیں۔ فرعون ہذہ الامۃ جب فرعونیت میں بڑا ہوا ہے تو لامحالہ اس کی ایذا بھی زیادہ ہوگی۔'' (ماہ نامہ دارالعلوم دیو بند ستمبر ۱۹۶۵ء ص: ۶)

کفاح السیدۃ فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا

دنیا میں بے شمار لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور فاطمہ رضی اللہ عنہا کے نام لیوا ہیں، ان میں سے بعض تو ذاتِ علیؓ میں غلو کر کے شیخین کو برا بھلا کہنا اپنا فرض سمجھتے ہیں اور بعض ایسے ہیں جو اعتدال پسندی اور میانہ روی سے کام لیتے ہوئے امتِ مسلمہ کو انصاف پسندی اور حق کی راہ پر لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر ایک طرف حضرت علیؓ کا مقام و مرتبہ اصحابِ رسول اللہ ﷺ اور اسلام میں بہت اونچا ہے تو دوسری طرف صحابیات میں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی حیثیت سیدۃ النساء کی ہے۔ ان دونوں کی زندگی مثالی زندگی ہے جو تاریخِ انسانی کا ایک زریں اور روشن باب ہے۔ تنگ دستی اور مفلسی کے باوجود سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر عمل پیرا ہو کر جس حلم و بردباری، صبر و قناعت اور زہد و تقویٰ کا لاثانی ثبوت دیا اور دینِ اسلام کی نشر و اشاعت میں مثالی جدوجہد کی ہے وہ تاریخ و سیر کے کتابوں میں مندرج ہیں۔

حضرت مولاناؒ کا یہ مضمون ماہ نامہ دارالعلوم دیوبند کے صفحات پر ستمبر ۱۹۶۹ء میں نمودار ہوا۔ مولانا کی تحریر کی خصوصیات میں سے جو نمایاں اور امتیازی وصف ہے وہ یہ ہے کہ باتیں کم ہوں مگر کام کی ہوں۔ چنانچہ اس مضمون کو بھی اسی نہج پر ڈھالا گیا ہے۔ مضمون تو ہے مختصر لیکن مسلمانان عالم کی زندگی کے لیے نادر نمونہ و بہترین سبق ہے۔

اس مضمون میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے رشتہ ازدواج میں منسلک ہونے کے وقت کے حالات کو سامنا رکھا گیا ہے۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی عمر پندرہ برس تھی، نکاح کے پیغامات آنے شروع ہو گئے تھے۔ حضرت علیؓ کو بھی مشورہ دیا گیا کہ وہ اس سلسلہ میں ارادہ فرمائیں، لیکن حضرت علیؓ نے اپنی غربت و افلاس اور تہی دستی کی وجہ سے ہمت نہیں کی۔ مگر بعد میں مشیرین کے اصرار پر پیغام دینے کی ہمت کر لی۔ حضرت علیؓ کا خود بیان ہے کہ مجھ پر مشورہ دینے والوں نے اتنا اصرار کیا کہ بالآخر مجھے حکم کی تعمیل کرنی پڑی۔ خیر رشتہ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو جہیز میں جو چیزیں دی تھیں وہ سیرت کی کتابوں میں محفوظ

ہیں: مثلاً چمڑے کا ایک لحاف، دو چکیاں، ایک مشکیزہ، دو مٹی کے گھڑے۔

سید الملت حضرت مولانا سید محمد میاں صاحبؒ نے آغازِ مضمون میں بڑے پتے کی بات کہی ہے، جس کا مفہوم یہ ہے کہ ’آج کل نکاح کے لیے دولت وثروت اور مال وزر کا ہونا ضروری ہے، ورنہ آج کے دور میں اس کے بغیر نکاح کا کوئی تصور نہیں۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ اس ترقی پذیر دنیا میں لوگوں کا خیال بھی یہی ہے، اسی وجہ سے اس کے ظاہری وباطنی نقصانات دن بہ دن بڑھتے جارہے ہیں۔‘

مولانا چونکہ شریعتِ اسلامیہ کے پابند تھے، اس لیے کوئی چیز شریعت مطہرہ کے خلاف دیکھتے تو اس پر ضرور ان کا قلم اٹھتا اور بلا تامل حق بات کہنے کے عادی تھے۔ ذیل میں حضرت مولاناؒ کی ایک عبارت نقل کی جاتی ہے جس میں مولانا کے قلم کا اصلاحی رنگ خوب اچھی طرح جھلکتا ہے:

ارشاد خداوندی ہے: ’’**وأنكحوا الأيامى منكم**‘‘ تا’’**واسع عليهم**‘‘(سورۃ:۲۴النور آیت:۳۲) نکاح کروان کا جوتم میں بے نکاح ہوں، اور اپنے غلاموں اور باندیوں کا (بھی) جو اس کے قابل ہوں اگر وہ مفلس ہوں گے تو خدا تعالیٰ ان کو اپنے فضل سے غنی کردے گا اور اللہ تعالیٰ وسعت دیتا ہے، خوب جاننے والا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو خاص طور سے ہدایت فرمائی: ’’علی! تین کام ہیں، ان میں تاخیر ہرگز نہ کرنا (۱) نماز جب اس کا وقت ہوجائے (۲) جنازہ جب آجائے (۳) نکاح جب اس کا کفومل جائے۔ ہمارا طریقہ یہ ہے کہ ہم پہلے ’’غنا‘‘ چاہتے ہیں پھر نکاح، مگر فرمان خداوندی نے نکاح کو مقدم رکھا اور غنا کا خود وعدہ فرمایا۔ اس کی عجیب وغریب مثال حضرت علیؓ اور سیدہ فاطمۃ الزہراءؓ کا نکاح ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے والد خواجہ ابوطالب کی وفات کے وقت اگر چہ جوان تھے، تقریباً ۲۰ سال کی عمر تھی، مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بچپن سے ہی اپنی تربیت میں لے لیا تھا، اور خواجہ ابو طالب کو ان کی طرف سے بے فکر کردیا تھا۔ ابوطالب دولت مند نہیں تھے کہ ان کے وارث

ان کے ترکہ سے دولت مند ہو جاتے، اس کے علاوہ ہجرت کرنے والے بزرگ وہ تھے کہ دولت مند بھی فقیر ہوگئے تھے، لہٰذا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس بھی جو تھا وہ توکل کا سرمایہ تھا اور بس!'' (ماہ نامہ دارالعلوم دیوبند ستمبر ۱۹۶۹ء ص:۱۰)

ہمارے اسلاف کی ایک زندۂ جاوید یادگار – دارالعلوم دیوبند

یہ مضمون ماہ نامہ دارالعلوم میں ۱۹۶۸ء کو اکتوبر میں شائع ہوا۔اس مضمون میں فرنگیوں کے بدترین مظالم کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ ہندوستان میں جب انگریزوں کی باقاعدہ حکومت قائم ہوئی، اس وقت سے لے کر قیام دارالعلوم دیوبند تک باشندگان ملک بالخصوص مسلمانوں پر جو ادوار گذرے ہیں، ان سب کے حقائق کو پیش کیا گیا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ، حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ، حضرت سید احمد شہیدؒ، شاہ اسماعیل شہیدؒ، حضرت مولانا قاسم صاحب نانوتویؒ، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کی جنگ آزادی میں جدوجہدِ مسلسل اور قربانیوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مضمون کے آخری حصہ میں اپنے زمانہ طالب علمی کی کیفیت، دارالعلوم دیوبند کی خدمات اور صورت حال کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اس مضمون کو جس انوکھے اور نرالے انداز میں سینہ اوراق پر ثبت کیا ہے اسے بیان نہیں کیا جاسکتا، مکمل مضمون کے مطالعہ ہی سے مولانا کے اسلوب بیان کی چاشنی حاصل کی جاسکتی ہے۔

حضرت مولاناؒ نے اپنے مضمون میں تین ذیلی عنوان قائم کیے ہیں:

(۱) مظالم فرنگی کی ایک مثال

(۲) تین مقصد

(۳) انگریز سے نفرت

آپ تو تاریخ کے امام مانے جاتے تھے، 'مظالم فرنگی کی ایک مثال' کے تحت آپؒ نے انگریزوں کی سنگ دلی اور سفاکیت کو انتہائی دلخراش انداز میں بیان کیا ہے۔ پھر وقت کے علماء نے ان لوگوں سے نمٹنے کی جو ذمہ داری اپنے کاندھوں پر لی، اس کا مختصر تذکرہ کیا

ہے۔ پرتیگزی قوم اور انگریز دونوں ایک دوسرے کے حریف تھے، اس کو بھی مولانا نے واضح کیا ہے۔ اس تعلق سے مولانا کی ایک عبارت ملاحظہ ہو:

''پورے ہندوستان پر انگریزوں کی حکومت قائم ہوگئی، یورپ کی یہ قومیں (پرتیگزی اور انگریز) اگرچہ مختلف تھیں اور آپس میں ایک دوسرے کی رقیب اور حریف بھی تھیں، مگر ہندوستانیوں کے حق میں وہ یکسانیت کے ساتھ نہایت سنگدل اور سفاک ثابت ہوئیں۔ ان کے لرزہ خیز مظالم کی داستان بہت طویل ہے اور موضوع سے خارج بھی، ہندوستانی اگر حکمرانی کی صلاحیت ختم نہ کر چکے ہوتے تو ہندوستان میں ان وحشی قزاقوں کے لیے حکومت کا کوئی امکان نہ تھا۔ حضرات علماء جن میں شاہ ولی اللہؒ المتوفی ۱۱۷۶ھ/۱۷۶۲ء کا اسم گرامی برسرلوح ہے، مسلسل کوشش کرتے رہے کہ حکومت کے ذمہ دار اپنی اصلاح کرلیں اور ہندوستان کو یہ روز بد نہ دیکھنا پڑے کہ وہ کسی غیر قوم کے غلام بنیں، لیکن حکمران اسی راستہ پر تیزی سے قدم بڑھاتے رہے جس کی آخری گھاٹی مکمل تباہی اور بربادی ہوتی ہے کما قال اللہ تعالی: **واذا اردنا ان نهلک قرية امرنا مترفيها ففسقوا فيها فحق عليها القول فدمرنا ها تدميرا**''. (پارہ:۱۵/سورہ بنی اسرائیل، آیت ۱۶)

''علماء کی جماعت نے مسلمانوں کی حکومت یعنی سلطنت مغلیہ کی گرتی ہوئی دیوار کو سنبھالنے کی کوشش کی اور جب یہ یقین ہوگیا کہ اس دیوار کی ایک ایک اینٹ گل چکی ہے اور شوریت نے اس کے ایک ایک ریزہ کو شوریدہ مزاج بنادیا ہے، تو انہوں نے آنے والے سیلاب کو روکنے کی کوشش کی۔'' (ماہ نامہ دارالعلوم دیو بند اکتوبر ۱۹۶۸ء ص:۴۲)

دورِ آزادی میں علماء دیو بند کی دو جماعت تھی: ایک تو وہ جو دوسروں کے ساتھ مل کر تحریک آزادی میں کام کرنے کو پسند نہیں کرتی تھی اور ایک جماعت وہ تھی جو دوسروں کے ساتھ مل کر کام کرنے کو ضروری سمجھتی تھی۔ چوں کہ مجبوری یہ تھی اگر مسلمان دوسروں کا تعاون حاصل نہیں کرتے تو آزادی ایک مشکل امر تھا۔ کیوں کہ مسلمان کافی تعداد میں پھانسی کے پھندوں پر لٹک چکے تھے، جیل کی سلاخوں میں ڈالے جاچکے تھے اور بے شمار قتل کیے گئے تھے۔

ایسے نازک ترین وقت میں دوسروں سے تعاون ضروری تھا،لیکن یہ اختلاف اختلاف تک ہی محدود رہا، ذاتیات تک معاملہ نہیں پہنچا،لیکن دونوں جماعت کو اس کا احساس تھا کہ ملک کو غلامی کے چنگل سے نکالنا ہے۔حضرت مولاناؒ نے اپنے دلچسپ انداز میں اسے یوں بیان کیا ہے:

''اس میں شک نہیں کہ علماء دیو بند کی ایک جماعت ایسی بھی رہی ہے جس نے آزادی ہند کی تحریکات میں شرکت کو اچھا نہیں سمجھا، یہ حضرات انڈین نیشنل کانگریس کے بھی مخالف رہے،لیکن انگریز اور انگریزیت سے نفرت ان کو بھی ایسی ہی تھی جیسے ان علماء کو تھی جو حریت کے علمبردار تھے۔حضرت مولانا نے ایک اہم بات کہی ہے وہ یہ ہے کہ'' بعض بزرگوں کا یہ قول ہم تک پہنچا ہے کہ انگریز اور انگریزیت بعنوان دیگر مغرب اور مغربیت سے نفرت جز وایمان ہے۔'' (ماہ نامہ دارالعلوم دیو بند اکتوبر ۱۹۶۸ء ص:۴۳)

صالح جمہوریت اور جمہور/تعلیمات قرآن پاک کی روشنی میں

یہ مضمون ماہ نامہ دارالعلوم دیو بند میں جولائی ۱۹۶۸ء میں شائع ہوا ہے۔ اس مضمون میں بنیادی بحث تو 'جمہوریت تعلیمات قرآن کی روشنی میں' ہے۔اس مضمون میں کئی ذیلی عنوانات بھی ہیں۔مثلاً سنگ بنیاد اور حقیقی روح،تصریحات وارشادات،حقیقی روح اور جمہوریت کی جان،مساوات اور بھائی چارہ کا تقاضہ اور مطالبہ۔

مضمون کے جلی عنوان سے ہی اس کی افادیت اور عمدگی کا پتہ چلتا ہے۔قرآن کریم کی روشنی میں جمہوریت سے بحث کی گئی ہے، اس کے علاوہ احادیث کا بھی سہارا لیا گیا ہے۔

آپس میں بھائی چارہ قائم کرنا،ایک دوسرے کے ساتھ ہمدردی کا معاملہ کرنا، بیماروں کی عیادت،غربا وفقرا اور مساکین کی امداد اور مقروض کے قرض کی ادائیگی کے اسباب مہیا کرنا،ان سب پر روشنی ڈال کر تحفظ جمہوریت کے لیے ان سب چیزوں کو جزء لاینفک قرار دیا،اوران باطل نظریات کی تردید بھی کی ہے، جولوگوں میں رائج ہے کہ فلاں برادری کا رشتہ چاند سے جڑا ہوا ہے اور فلاں قوم آفتاب کی نسل سے ہے اور کسی نسل کا مورث پروردگار

کے چہرے سے پیدا ہوا ہے وغیرہ وغیرہ۔

حضرت مولانا محمد بن موسیٰؒ

حضرت قدس سرہ کا یہ مضمون جون ۱۹۶۳ء میں ماہ نامہ دارالعلوم دیوبند میں شائع ہوا۔اس مضمون میں علامہ کشمیریؒ کے ممتاز تلمیذ حضرت مولانا محمد بن موسی سملکی گجراتی کا ذکر خیر ہے،جس میں ان کی زندگی مختلف گوشوں یعنی علمی، تحقیقی، تعلیمی وتدریسی خدمات کونہایت مختصر مگر جامع اسلوب میں بیان کیا ہے۔یہاں مولانا کا تذکراتی اسلوب بھی دیکھتے چلیے :

''مولانا محمد بن موسی میاں کون تھے؟ ہندوستان اور پاکستان کے علمی حلقوں اور تعلیمی اداروں سے دریافت کیجئے۔جوہانسبرگ کے مسلم اسکول، مسلم ہوسٹل اور ڈابھیل اوراب کراچی کی ''مجلس علمی'' سے تحقیق کیجیے۔یہ ایک درویش صفت دولت مند تھے۔عالم باعمل، پابند شریعت، متبع سنت، جن کی جوانی کا دور جوانوں کے لیے سبق تھا۔دارالعلوم دیو بند میں داخل تھے تو ایک معمولی طالب علم کی طرح نہایت سادہ زندگی،غریبوں کے دوست، مفلسوں کے ہمدرد، اپنی ذات پر کم سے کم خرچ، لیکن امور خیر میں اس قدر فراخ حوصلہ کہ استاذ محترم حضرت علامہ مولانا انور شاہ صاحب کشمیری قدس اللہ سرہ العزیز کے لیے مکان کی ضرورت محسوس کی تو جو رقم جیب خرچ کے لیے ان کے پاس تھی اس میں سے وہ حویلی تیار کردی جس کا خرچ اب سے تقریباً تیس سال پہلے تقریباً دس ہزار روپے تھا۔'' (ماہ نامہ دارالعلوم دیوبند جون ۱۹۶۳ء ص:۳۴)

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت/فرائض وبرکات

حضرت مولانا کا یہ مضمون ماہ نامہ دارالعلوم دیوبند میں دوقسطوں میں مطبوع ہوا ہے۔پہلی قسط ماہِ نومبر ۱۹۶۷ء میں شائع ہوئی، اور دوسری قسط 'دعوت الی اللہ/ داعی کے اوصاف وفضائل اور خصوصیات' کے عنوان سے ستمبر ۱۹۷۰ء کو شائع ہوئی۔دونوں مضمون کے ضمن میں کئی ذیلی عنوان ہیں:

(۱) پہلی خصوصیت اور نبی اور فلسفی کا فرق

(۲) دوسری حیثیت

(۳) ایک سبق

(۴) تیسری حیثیت

(۵) چوتھی حیثیت

(۶) چھٹی خصوصیت

(۷) ہدایت

ان عنوانات کے تحت کئی اہم امور پر کلام کیا گیا ہے۔ نبی اور فلسفی کے درمیان فرق کو مفصل انداز میں بیان کیا ہے۔ سقراط، ارسطو، افلاطون کا بھی مختصر تذکرہ کیا ہے، درمیان میں سائنس کا بھی ذکر ہے۔ زبان سے نکلنے والے الفاظ پر منطقی انداز میں بحث کی ہے، محسوس اور غیر محسوس چیزوں کے سلسلہ میں سابقہ فلاسفہ اور موجودہ فلاسفہ کا ذہن کیا ہے؟ ان کی جو تحقیقات ہیں، اس پر مدلل بحث کی ہے اور فلاسفہ کی تردید کی ہے۔ مادہ اور روح، خدا سے تعلق رکھنے والے مسائل اور خالق کائنات کی ذات وصفات، اس سے انسان کا حیات بعد الممات کا تعلق جیسے پیچیدہ مسائل کو سلجھانے کی کوشش کی ہے۔ فلاسفہ کے اقوال بھی نقل کیے ہیں۔ اس کے بعد آپ ﷺ کی خصوصیت، بشارت پر مختلف طریقے سے کلام کیا ہے۔

دوسری قسط کا آغاز قرآن کریم کی آیت: یا ایھا النبی انا ارسلناك شاھدا الخ. سے ہے۔ آیت قرآنی کی تفسیر کے بعد توریت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق جو بشارت دی گئی ہے، اس پر بھی تبصرہ کیا ہے۔ شاہد عدل کا اطلاق کس پر ہوتا ہے؟ شاہد اور گواہی کا مدار مشاہدہ پر ہے یا نہیں؟ اس کی تحقیق پیش کی ہے۔ مزید قدیم ہندوستانی فلاسفہ کی بھی تحقیق کی ہے، اور پھر اپنی تحقیق بھی پیش کی ہے۔

آخر میں جہاد کا بھی مختصر تذکرہ کیا ہے۔ دعوت الی اللہ پر نہایت جامع اور مدلل بحث کی ہے۔ قرآن کریم کی تفسیر سے آپ ﷺ کی خصوصیات، اوصاف وکمالات اور دعوت کیلئے جن باتوں کا ہونا ضروری ہے اور وہ صفات جو آپ ﷺ کے اندر تھیں، ان کو بیان کیا ہے۔

کیا عالمانہ تحقیق ہے۔ایک مضمون کے تحت مختلف پہلو پر کلام کر کے اسے ثابت کرتے چلے جارہے ہیں۔آپ صحیح معنوں میں علوم وفنون کے جامع تھے۔ہر میدان کے آدمی تھے۔منطق وفلسفہ جیسے خشک موضوع پر لکھتے اور بولتے ہوئے اچھے اچھے ماہر اساتذہ اور معلمین کو دشواری پیش آتی ہے لیکن حضرت کی تحقیق سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا میدان ہی فلسفہ وکلام ہو۔یہ ایک عجیب بات ہے کہ قدیم ہندوستانی فلاسفہ اور تاریخ عالم کے قدیم وجدید فلاسفہ کی تاریخ پر قابو پانا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے،لیکن حضرت مولانا کی شخصیت اس موضوع میں بھی سرفہرست ہے۔مضمون کا ایک پیرا گیراف پیش خدمت ہے:

''نبی اس عالم کے فنا ہونے، قیامت اور محشر کے برپا ہونے پر قسم کھا سکتا ہے، کیوں کہ اس کو یقین ہوتا ہے کہ اس عالم کا آخری انجام قیامت ہے۔فلسفی کے قیاس اور فکر میں اس عالم کا جو بھی انجام ہو، وہ اس پر قسم نہیں کھا سکتا، کیوں کہ اس کے پاس یقین کی مضبوطی اور ایمان کی روشنی نہیں ہے۔اس کے پاس ظن ہے، گمان ہے، تخمینہ اور اندازہ ہے۔ اور میری خود تحقیق یہ ہے (ممکن ہے غلط ہو) چونکہ فلسفی نور یقین سے محروم ہوتا ہے تو وہ اپنے نظریہ کی دعوت بھی نہیں دیتا، اس کا حوصلہ پست رہتا ہے نہ اس میں ذاتی ایثار ہوتا ہے نہ شوق فدائیت نہ جذبۂ قربانی۔'' (ماہ نامہ دارالعلوم دیوبند ستمبر ۱۹۷۰ء ص:۲۱)

حقیقت انسان اور فرائض انسانیت

حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب کا یہ مضمون طویل ہے اور ماہ نامہ دارالعلوم دیوبند میں دوقسطوں میں شائع ہوا ہے۔پہلی قسط ذی قعدہ وذی الحجہ ۱۳۶۳ھ میں شائع ہوئی جو کہ بیس صفحات پر مشتمل ہے، اور دوسری قسط محرم الحرام، صفر المظفر، ربیع الاول ۱۳۶۴ھ/ جنوری، فروری، مارچ ۱۹۴۵ء کو شائع ہوئی جو کہ انتیس صفحات پر مشتمل ہے۔پورے مضمون میں حقوقِ انسانی سے بحث کی گئی ہے۔مولانا کی عادت یہ تھی کہ وہ مضمون کو زیادہ سنوارنے اور بنانے کے بجائے سادہ اور عام فہم الفاظ استعمال کرتے ہیں۔مزید افادہ عام کے لیے جلی عنوان کے تحت ذیلی عنوانات قائم کرتے ہیں۔اس مضمون میں بھی اسی صورت کو اپنایا ہے۔

حضرت مولانا نے ۳۲/ ذیلی عنوانات قائم کیے ہیں، ان میں سے چند یہ ہیں:

(۱)انسان کیا ہے(۲)ہمارا وطن عزیز (۳)شریف خود دار باعزت انسان (۴)تحصیل علم (۵)علماء کون ہیں (۶)فرائض/ پہلا فرض: تحصیل علم (۷)دوسرا فرض: اشاعت علم (۸) تیسرا فرض: اتحاد و تنظیم کی جدوجہد اختلاف وافتراق کی تمام صورتوں کو روکنا(۹)چوتھا فرض: کسب معاش(۱۰)مال جمع کرنا اور اس کی حفاظت (۱۱)انفاق (۱۲)قرض حسنہ(۱۳)نصیحت اور خیر خواہی(۱۴)غیر مسلم (۱۵)عدل اور سچی گواہی (۱۶)زنا، چوری، شراب نوشی(۱۷)لواطہ(۱۸)ہم سایہ کی رعایت (۱۹)متعلقین کی ذمہ داری(۲۰)والدین اور رشتہ داروں کے ساتھ معاملہ(۲۱)عام رشتہ ار(۲۲)نکاح اور خانہ داری(۲۳)مستورات کے ساتھ حسن معاشرت وغیرہ وغیرہ۔

نوع انسان کے زندگی گذارنے کے تمام طریقوں کو اس مضمون میں بیان کردیا ہے۔تحریر شفافیت، ندرت اور شگفتگی سے معمور ہے۔کسی بھی مسئلہ کی تبیین میں کوئی الجھاؤ نہیں خواہ کتنا ہی مشکل کیوں نہ ہو۔

مضمون کے ضمن میں بھی متعدد نئی بحثوں نے جنم لیا ہے اور حضرت مولانا نے ان سب کو واضح انداز میں سمجھایا ہے اور ضرورت پڑنے پر اس کی تشریح بھی فرمادی۔مثلاً مخلوق، جاندار، ارادہ، قدرت، حیات، علم، اختیار، وغیرہ۔عقائد اسلام اور علم کلام کا بھی تذکرہ درمیان میں زیر بحث آیا، تاریخ ہند پر بھی روشنی ڈالی، مزید یہ کہ حضرت شیث اور حضرت نوح علیہما السلام کا ذکر بھی آیا۔حضرت آدم علیہ السلام کا تذکرہ آیا تو تاریخ آدم کو مختصر اور جامع انداز میں سمیٹ دیا۔اس کے علاوہ بھی بہت ساری چیزیں ہیں جسے اس مختصر مقالہ میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔

ابنائے دارالعلوم دیوبند سے خطاب: ”حاسبوا قبل ان تحاسبوا“

یہ مضمون اس پسِ منظر میں لکھا گیا ہے جب ملک آزاد نہیں ہوا تھا بلکہ آزادی کی جنگ لڑی جارہی تھی۔مولاناؒ کا یہ مضمون جمادی الاول ۱۳۶۱ھ میں مطبوع ہوا۔مضمون ہر

اعتبار سے قابل دید وستائش ہے۔ یہ مضمون اس شمارہ کے تمام مضامین پر حاوی ہے۔

اس مضمون میں مولانا نے طلبۂ دارالعلوم دیوبند کو مخاطب کیا ہے اور دارالعلوم دیوبند کی عظمت، شان وشوکت اور اس کی خصوصیات کو ان کے دلوں میں جاگزیں کرنے کی کوشش کی ہے۔ پھر دارالعلوم دیوبند کی قربانیوں کو اور اس کی لازوال خدمات کو مفصل انداز میں بیان کیا ہے، اور طلبۂ دارالعلوم دیوبند کو یہ ترغیب دی ہے کہ اپنے آپ کو اس طرح تیار کریں کہ ضرورت پڑنے پر ہر خدمت کے لیے لبیک کہہ سکیں۔

اس مضمون میں ایک جگہ حضرت مولانا نے فرمایا کہ 'فضلائے دارالعلوم دیوبند کے ہوتے ہوئے مسلمانوں میں فسق وفجور کی وبا کیوں پھیلی ہوئی ہے؟ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟' اس کے بعد فرزندان دارالعلوم دیوبند کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ

''ہم اپنے آپ کو وارثین انبیا کہتے ہیں، لیکن کیا صحیح معنوں میں ہم اس کے حق دار ہیں؟ ہماری حیثیت کیا ہے؟ دل میں اس کا خیال کیوں پیدا نہیں ہوتا؟ اگر ہوتا بھی ہے تو بزدلی کا شکار ہو جاتے ہیں اور کمزور کیوں ہو جاتے ہیں؟''

''اسماعیل شہیدؒ، سید احمد شہیدؒ، امداد اللہ مہاجرؒ، قاسمؒ و رشیدؒ اور محمود حسنؒ کے یہ فرزند دنیا میں موجود ہوں اور مسلمانان ہندان کو اپنا واحد نمائندہ تسلیم نہ کریں، یاللعجب! یہ جمود کیسا ہے؟ اگر یہ دہر ناپائیدار، بے وفا اور ناقدر شناس ہے تو اس کو پلٹ کیوں نہیں دیا جاتا؟ پیر فلک کی آخر شکایت کب تک؟ ایک نیا آسمان کیوں نہیں بنا لیتے!''

''کیا دوڑتے دوڑتے تھک گئے ہیں؟ بعد مسافت نے آبلہ پا کر دیا ہے، یا ابھی چلنا ہی نہیں شروع کیا؟ کس قدر تعجب کی بات ہے! جن سے چلنے کے لیے نہیں کہا گیا، جن کی بلندی وبرتری اور عروج وترقی کو 'متاع قلیل' کہا گیا ہے جس کا نتیجہ جہنم ہے، وہ سراسر جدوجہد بنے ہوئے مصروف عمل ہیں، بلکہ پیکر کردار۔'' (ماہ نامہ دارالعلوم دیوبند جمادی الاول ۱۳۶۱ھ ص:۱۱)

حضرت معاویہؓ اور یزید کی خلافت

یزید بن معاویہ کی خلافت، اس کی خلافت کے لیے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ

کی تحریک وخواہش، یزید کا فسق وفجور، خطوطِ اسلامی کے خلاف اس کی زندگی، حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے لیے اس کی ذمہ داری، یہ تاریخ اسلامی کے وہ جلی عنوانات ہیں جو ہمیشہ متنازع اور غبار آلود رہے ہیں۔ امت کا ایک بڑا طبقہ تو یزید سے نفرت کرتا ہے اور ایک چھوٹی جماعت اس کی صفائی اور حمایت بھی کرتی ہے۔ جس طرح امام غزالیؒ نے یزید کے معاملہ میں موافقانہ بحث فرمائی ہے، اسی طرح مشہور مؤرخ ومفکر علامہ ابن خلدون بھی یزید کے حامیوں میں ہیں۔

حضرت مولانا کا یہ مضمون چھ صفحات پر مشتمل ہے جو کہ ایک استفتاء کا مدلل جواب ہے۔ اپریل ۱۹۶۷ء میں یہ مضمون ماہ نامہ دارالعلوم دیوبند میں شائع ہوا۔

مولانا نے یزید کے فسق وکفر کے سوال پر لکھا ہے کہ:

''یزید کے متعلق اگر مان بھی لیا جائے کہ اس نے حضرت حسینؓ کے شہید کر دینے کا حکم دیا تھا، پھر وہ اس پر خوش ہوا، یا یہ کہ وہ شرابی تھا یا زانی تھا، ان تمام روایتوں کو صحیح مان لینے کے باوجود بھی ان کو فاسق یا فاجر تو کہا جا سکتا ہے، لیکن کافر نہیں کہا جا سکتا۔ کیوں کہ شرح عقائد نسفی میں عبارت موجود ہے: **لان الكبيرة لاتخرج العبد المؤمن من الايمان ولا دخله فی الكفر** .(شرح العقائد النسفيه مع تعليقه القلائد الذهبيه، چھوٹا سائز مکتبہ اتحاد دیوبند ستمبر ۲۰۱۵ء)

علامہ سعد الدین تفتازانیؒ فرماتے ہیں کہ یزید پر لعنت بھیجنی جائز ہے اور انہوں نے اپنے اس قول پر عمل بھی کیا ہے۔ چنانچہ شرح عقائد نسفی صفحہ ۱۱۷، پر عبارت موجود ہے، **لعنة الله عليه وعلى انصاره واعوانه.**

لیکن درست بات وہ ہے جو امام غزالیؒ نے تحریر فرمائی ہے، احیاء علوم الدین ج ۳/ ص: ۸۹ر پر جو عبارت درج ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ 'یزید نے حضرت حسینؓ سے جنگ کی یا جنگ کا حکم کیا تو اس پر لعنت بھیجنی جائز ہے۔ ہم جواب دیں گے کہ یہ پوری طرح (قطعاً) ثابت نہیں ہے، پس جب تک قتال یا حکم قتال ثابت نہ ہو جائے تو بلا ثبوت یہ کہنا بھی درست

نہیں ہے کہ اس نے قتال کیا یا قتال کا حکم دیا۔ اور جب بلا ثبوت قتال یا قتال کا الزام لگانا بھی درست نہیں ہے تو لعنت بھیجنا کب درست ہوسکتا ہے۔ بلا تحقیق کسی مسلمان پر گناہ کبیرہ کا الزام لگانا جائز نہیں۔ امام غزالیؒ کے ان ارشاد سے ثابت ہوا کہ (۱) یزید مسلمان ہے کافر نہیں (۲) یہ الزام پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچا کہ اس نے حضرت امام حسینؓ کے قتل کا حکم دیا تھا (۳) اور جب تک ثبوت مہیا نہ ہو تو کسی مسلمان کی طرف گناہ کبیرہ کا الزام لگانا یعنی مثلاً زانی یا شرابی کہنا بھی صحیح نہیں ہے (۴) جب زانی یا شرابی بھی نہیں کہا جاسکتا تو لعنت بھیجنی یقیناً ممنوع ہے۔'' (ماہ نامہ دارالعلوم دیو بند اپریل ۱۹۶۷ء ص: ۲۱)

''بہت سارے لوگوں نے یزید پر (جن میں حضرت امام احمد بن حنبل، حضرت خلال، ابو بکر عبدالعزیز، قاضی ابو یعلی، قاضی ابوالحسین، علامہ ابوالفرج ابن جوزی وغیرہ شامل ہیں) لعن کو جائز قرار دیا ہے، اور بہت سارے لوگوں نے اس کو جائز قرار نہیں دیا، بلکہ اس سے منع کیا ہے۔'' ان حضرات کے پیش نظر یہ احتیاط بھی ہے کہ یزید پر لعنت کا سلسلہ کہیں حضرت معاویہؓ یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی اور صحابی (رضی اللہ عنہم اجمعین) تک نہ پہنچ جائے۔'' (ماہ نامہ دارالعلوم دیو بند اپریل ۱۹۶۷ء ص: ۲۲)

یہ تھی سید الملت حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب کی علمی وقلمی خدمات اور ادبی شہ پاروں کی ماہ نامہ دارالعلوم کے حوالے سے ایک ہلکی سی جھلک۔ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ماہ نامہ میں مطبوع ان کی تحریروں کا ایک اشاریہ بھی درج کر دیا جائے، تاکہ جو استفادہ کرنے والوں کے لیے آسانی ہو۔

اشاریہ مضامین ماہ نامہ دارالعلوم دیو بند حضرت مولانا سید محمد میاں صاحبؒ

۱۔ ابنائے دارالعلوم دیو بند سے خطاب
جمادی الاول ۱۳۶۱ھ جلد نمبر: ۱/ شمارہ نمبر: ۵/ ص: ۱ تا ۲۱

۲۔ لیلۃ البراءت یا شب براءت
رجب المرجب ۱۳۶۱ھ جلد نمبر: ۲/ شمارہ نمبر: ۷/ ص: ۵ تا ۱۳

۳۔ اخلاق و ملکات انسانی کا حقیقی سرچشمہ
شعبان المعظم ۱۳۶۱ھ جلد نمبر :۲/ شمار نمبر :۸/ص :۱۷تا۲۶
۴۔ امامت خلافت اور سلطنت
ربیع الاول ۱۳۶۲ھ جلد نمبر :۳/ شمار نمبر :۲،۳/ص :۱۷تا۳۷ استفتاء کا جواب ہے
۵۔ مسلمانوں کی نجات وترقی کا راستہ
رجب المرجب ، شعبان المعظم ۱۳۶۲ھ جلد نمبر :۳/ شمار نمبر :۷،۸/ص :۱۳تا۳۳
۶۔ حقیقت انسان اور فرائض انسانیت قسط اول
ذیقعدہ وذی الحجہ ۱۳۶۲ھ جلد نمبر :۳/ شمار نمبر :۱۱،۱۲/ص :۵تا۲۵
۷۔ حقیت انسان اور فرائض انسانیت قسط دوم
محرم الحرام ، صفر المظفر ، ربیع الاول ۱۳۶۴ھ مطابق جنوری ، فروری ، مارچ ۱۹۴۵ء جلد نمبر :۴/ شمار نمبر :۱،۲،۳/ص :۲۷تا۵۶
۸۔ قربانی کے بارے میں حکام کا رویہ توہین آمیز تھا واقعہ دیوبند سے متعلق مولانا محمد میاں صاحب ناظم جمعیۃ علماء ہند کی رپورٹ محرم الحرام ۱۳۶۸ھ مطابق نومبر ۱۹۴۸ء جلد نمبر :۸/ شمار نمبر :۱/ص :۱۰،۱۱
۹۔ جہاد اسلامی اور دور حاضر کی جنگ پہلی قسط
شعبان ۱۳۷۰ھ مطابق ۱۹۵۱ء مئی جلد نمبر :۱/ شمار نمبر :۲/ص :۳۰ تا ۳۸
۱۰۔ دوسری قسط رمضان ۱۳۷۰ھ مطابق ۱۹۵۱ء جون جلد نمبر :۱/ شمار نمبر :۳/ص :۳۷تا۴۳
۱۱۔ تیسری قسط شوال ۱۳۷۰ھ مطابق ۱۹۵۱ء جولائی جلد نمبر :۱/ شمار نمبر :۴/ص :۱۱تا۲۸
۱۲۔ ایک شبہ اور اس کا جواب
جمادی الاول ۱۳۷۲ھ مطابق ۱۹۵۳ء فروری جلد نمبر :۴/ شمار نمبر :۵/ص :۳۸ تا ۴۱
۱۳۔ ہماری اور ہمارے وطن کی حیثیت پہلی قسط
ربیع الثانی ۱۳۷۱ھ مطابق ۱۹۵۲ء جنوری جلد نمبر :۲/ شمار نمبر :۴/ص :۱۷ تا ۲۳
۱۴۔ // // // // دوسری قسط
جمادی الاول ۱۳۷۱ مطابق ۱۹۵۲ء فروری جلد نمبر :۲/ شمار نمبر :۵/ص :۲۰ تا ۲۷
۱۵۔ // // // // تیسری قسط

رجب المرجب ۱۳۷۱ھ مطابق ۱۹۵۲ء اپریل جلد نمبر: ۳/ شمار نمبر: ۱/ص: ۳۳ تا ۳۸

۱۶۔ 〃 〃 〃 〃 چوتھی قسط

شعبان المعظم ۱۳۷۱ھ مطابق ۱۹۵۲ء مئی جلد نمبر: ۳/ شمار نمبر: ۲/ص: ۱۹ تا ۲۳

۱۷۔ ترک وطن کا شرعی حکم امت اسلامیہ کا تبلیغی موقف اور ہجرت کی حقیقت پانچویں قسط

رمضان ۱۳۷۱ھ مطابق ۱۹۵۲ء جون جلد نمبر: ۳/ شمار نمبر: ۳/ص: ۲۵ تا ۳۰

۱۸۔ ہجرت کی حقیقت اور اس کا حکم چھٹی قسط

شوال المکرّم ۱۳۷۱ھ مطابق ۱۹۵۲ء جولائی جلد نمبر: ۳/ شمار نمبر: ۴/ص: ۱۹ تا ۲۴

۱۹۔ 〃 〃 〃 〃 ساتویں اور آخری قسط

ذیقعدہ ۱۳۷۱ھ مطابق ۱۹۵۲ء اگست جلد نمبر: ۳/ شمار نمبر: ۵/ص: ۱۶ تا ۲۳

۲۰۔ مولانا محمد بن موسیٰ سملکی ۱۹۶۳ء جون جلد نمبر: ۲۵/ شمار نمبر: ۳/ص: ۳۴ تا ۳۶

۲۱۔ آنحضرت ﷺ بحیثیت داعی الی اللہ
۱۹۶۵ء مارچ جلد نمبر: ۲۸/ شمار نمبر: ۶/ص: ۷ تا ۱۴

۲۲۔ فرعون ہذہ الامۃ کا قتل/مسلم نونہالوں کی جانبازی اور ایک انصاری خاتون کا بے نظیر ایثار
۱۹۶۵ء ستمبر جلد نمبر: ۲۹/ شمار نمبر: ۶/ص: ۳ تا ۷

۲۳۔ خواتین قریش اور خواتین اسلام
۱۹۶۵ء دسمبر جلد نمبر: ۳۰/ شمار نمبر: ۳/ص: ۲۷ تا ۳۳

۲۴۔ ایک امریکی موقف کی غلط بیانی اور اس کا حقیقت افروز جواب
۱۹۶۶ء مئی جلد نمبر: ۳۱/ شمار نمبر: ۲/ص: ۴ تا ۱۱

۲۵۔ تعارف اسلام اور چند مسائل کے متعلق ایک قابل قدر مقالہ
۱۹۶۶ء ستمبر جلد نمبر: ۳۲/ شمار نمبر: ۱/ص: ۱۱ تا ۱۸

۲۶۔ حضرت امیر معاویہ اور یزید کی خلافت
۱۹۶۷ء اپریل جلد نمبر: ۳۶/ شمار نمبر: ۶/ص: ۲۰ تا ۲۶

۲۷۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقت فرائض اور برکات
۱۹۶۷ء نومبر جلد نمبر: ۳۴/ شمار نمبر: ۲/ص: ۱۹ تا ۲۲

۵۱۔ 〃 〃 〃 〃 دوسری قسط

۱۹۷۳ء جون جلد نمبر:۴۵/شمار نمبر:۳/ص:۵ تا ۱۲

۵۲۔ غیر اسلامی حکومت کی تائید وحمایت

۱۹۷۳ء اگست جلد نمبر:۴۵/شمار نمبر:۵/ص:۲۱ تا ۲۷/ استفاء کا جواب ہے۔

۵۳۔ انگلینڈ میں ذبح خانہ کا طریقہ اور ذبیحہ سے متعلق سوال وجواب

۱۹۷۳ء اگست جلد نمبر:۴۵/شمار نمبر:۵/ص:۳۷ تا ۴۰/استفتاء کا جواب ہے

۵۴۔ انگلینڈ میں مشتبہ لاشوں کے متعلق طریقہ اور دستور العمل

شعبان ۱۳۹۳ھ مطابق ۱۹۷۳ء ستمبر جلد نمبر:۴۵/شمار نمبر:۶/ص:۲۵،۲۶/استفتاء کا جواب ہے

۵۵۔ تعلیمات قرآن مجید اور احادیث مقدسہ کا مرقع

ذیقعدہ ۱۳۹۳ھ مطابق ۱۹۷۳ء دسمبر جلد نمبر:۴۶/شمار نمبر:۳/ص:۹ تا ۱۷ بقیہ ص:۸

۵۶۔ ایشیا اور یورپ کے دو دور قرون وسطی کے دوروپ

ذیقعدہ ۱۳۹۳ھ مطابق ۱۹۷۳ء دسمبر جلد نمبر:۴۶/شمار نمبر:۳/ص:۲۵ تا ۲۹

۵۷۔ اپنا انجام نبی اور وحی کی ضرورت

صفر المظفر ۱۳۹۴ھ مطابق ۱۹۷۴ء مارچ جلد نمبر:۴۶/شمار نمبر:۳/ص:۱۰ تا ۱۶ بقیہ ص:۹

۵۸۔ چند اقتصادی اصول ونظریات آیات کتاب اللہ کی روشنی میں پہلی قسط

جمادی الثانی ۱۳۹۴ھ مطابق جولائی ۱۹۷۴ء جلد نمبر:۴۷/شمار نمبر:۴/ص:۵ تا ۹

۵۹۔ 〃 〃 〃 〃 دوسری قسط

رجب المرجب ۱۳۹۴ھ مطابق ۱۹۷۴ء اگست جلد نمبر:۴۷/شمار نمبر:۵/ص:۵ تا ۹

۶۰۔ 〃 〃 〃 〃 تیسری قسط

رمضان ۱۳۹۴ھ مطابق اکتوبر ۱۹۷۴ء جلد نمبر:۴۸/شمار نمبر:۱/ص:۵ تا ۸

۶۱۔ 〃 〃 〃 〃 چوتھی قسط

شوال المکرّم ۱۳۹۴ھ مطابق ۱۹۷۴ء نومبر جلد نمبر:۴۸/شمار نمبر:۲/ص:۱۰ تا ۱۴

۶۲۔ اسلام اور عہد وپیمان کا بے نظیر احترام

ذیقعدہ ۱۳۹۴ھ مطابق ۱۹۷۴ء دسمبر جلد نمبر:۴۸/شمار نمبر:۳/ص:۲۴ تا ۲۹ بقیہ ص:۱۷

۶۳۔ فلسطین بنی اسرائیل کے چار معرکے
ربیع الاول ۱۳۹۵ھ مطابق ۱۹۷۵ء مارچ جلد نمبر: ۴۸/ شمارنمبر: ۶/ص: ۵ تا ۱۰

۶۴۔ دارالامن میں عقود فاسدہ
جمادی الثانی ۱۳۹۵ھ مطابق ۱۹۷۵ء جون جلد نمبر: ۴۹/ شمارنمبر: ۳/ص: ۳۴ تا ۳۷ استفتاء کا جواب ہے

۶۵۔ جمعیۃ علماء ہنداور مذہبی تعلیم وتربیت
اپریل ۱۹۵۹ء جلد نمبر: ۱۷/ شمارنمبر: ۱/ص: ۲۵ تا ۳۰

رسالہ ''القاسم'':

ماہ نامہ دارالعلوم دیوبند کے بعد اب رسالہ ''القاسم'' دیوبند کے تعلق سے حضرت مولانا محمد میاں صاحب کی علمی وقلمی خدمات پر مختصر روشنی ڈالنا مناسب معلوم ہوتا۔

حضرت مولانا رسالہ ''القاسم'' کے دوسرے دور کے مضمون نگاروں میں سے ہیں۔ رسالہ ''القاسم'' میں حضرت کے مضامین زیادہ شائع نہیں ہوئے، صرف دو ہی مضمون رسالہ ''القاسم'' کے صفحات کی زینت بنے۔ دونوں ہی مضمون ۱۳۴۶ھ میں شائع ہوئے۔ پہلے مضمون کا عنوان ہے:

'رحمت عالم ﷺ کے الطاف صنف نازک پر/ اسلام میں خواتین کے حقوق'

اس مضمون میں اسلام میں خواتین کے حقوق سے بحث کی گئی ہے۔ یہ مضمون ربیع الاول ۱۳۴۶ھ سے رجب المرجب ۱۳۴۶ھ تک مستقل چار قسطوں میں شائع ہوا۔ اس مضمون میں بنیادی بحث تو اسلام میں خواتین کے حقوق سے ہے لیکن بہت سی ذیلی بحثیں اس کے جلو میں آگئی ہیں۔ حقوقِ خواتین کو قرآن وحدیث سے مدلل کیا گیا ہے۔

بعثتِ نبوی سے قبل 'خواتین کے حقوق' نام کی کوئی چیز نہیں تھی، لیکن بعثت کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خواتین کو جو بلند مقام عطا کیا ہے پوری تاریخ انسانیت میں اس کی مثال موجود نہیں ہے۔ اسے ترکہ، وراثت اور دوسرے حقوق میں باضابطہ فریق قرار دیا اور عورتوں کی عزت وعظمت کو ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا۔

صاحبِ مضمون نے بالغہ اور نابالغہ لڑکی کے مسئلۂ نکاح کو بھی مفصل انداز میں بیان کیا ہے، اور اختلافِ ائمہ کی طرف بھی اشارہ ہے۔ اس مضمون کا ایک ایک جز قابل استفادہ ہے۔ عرب کے مشہور سردار قیس کا ایک واقعہ مولانا کے قلم زرنگار سے ملاحظہ ہو:

''ایک روز میری [قیس کی] غیرت نے جامہ صبر کو چاک کر دیا۔ میں تقریب میں لے جانے کے بہانہ سے اس لڑکی کو اپنے ساتھ باہر لے گیا۔ جنگل میں لے گیا، ایک گڑھا کھودا، اس لڑکی کو اس میں ڈال دیا، اوپر سے اپنے جگر کے ٹکڑے پر مٹی ڈالنے لگا۔ وہ بچی یعنی میری لخت جگر بیٹی ایک اندوہناک دردناک آواز سے چلا رہی ہے کہ 'ابا جان! تمہاری جان کی قسم بتاؤ تو یہ کیا کر رہے ہو؟' جوں جوں میں مٹی سے اس کو پاٹ رہا وہ لڑکی نہایت عاجزی سے ان الفاظ کو دہرا رہی تھی، مگر جب بچی نے جان لیا کہ میرا ارادہ غیر ہے تو ایک مایوسی اور حسرت بھرے رخصت کرنے والے انداز میں کہا کہ 'ابا جان! کیا مجھے یہیں چھوڑ کر چلے جائیں گے۔''

''اس کی آواز سے پہاڑ پھٹ جاتا، پتھر ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا، لوہا پانی ہو جاتا مگر میرا دل تھا فولاد کہ اس پر کچھ بھی اثر نہ ہوا، دبایا اور چلا آیا۔ مگر کچھ عرصہ کے بعد معلوم ہوا کہ لخت جگر کی عاجزی بھری آواز نے جگر پر زخم کر دیا تھا، اس وقت تک مندمل نہیں ہوا، اور کبھی کبھی اس کا خیال اس پر نمک پاشی کر دیتا ہے۔ رحمت عالم کا قلب مبارک اس اندوہ گین واقعہ کے سننے سے بھر آیا، چشم مبارک نے اشکباری سے اندوہ نہانی کا اظہار کیا۔ یعنی مبارک آنکھوں سے آنسوں بہنے لگے اور زبان مبارک پر یہ الفاظ جاری ہوئے: **واللہ ان ذلک لقسوۃ من لایَرحم لایُرحم.** خدا کی قسم سخت دلی اسی کا نام ہے جو شخص دوسرے پر رحم نہ کرے اس پر بھی رحم نہ کیا جائے۔

(رسالہ القاسم دیوبند جمادی الاول ۱۳۴۶ھ ص: ٦)

رسالہ 'القاسم' سے بھی مولانا کے مضامین کا اشاریہ درج کیا جاتا ہے، جو اگرچہ مختصر ہے مگر شاید کسی قدر دان کے لیے مفید ہو:

اشاریہ مضامین حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب

نوٹ: کتب خانہ دارالعلوم دیوبند میں رسالہ ''القاسم'' کے دور اول کے درج ذیل شمارے مجھے دستیاب نہیں ہوئے:

ربیع الاول ۱۳۳۵ھ

جمادی الثانی ۱۳۳۵ھ

القاسم دور ثانی کے محرم الحرام ۱۳۴۷ھ میں ایک دارالعلوم نمبر نکلا جس کی ضخامت تقریباً ساٹھ صفحات ہیں، یہ شمارہ رسائل کے ذیل میں موجود نہیں ہے صرف ایک نسخہ فخر الہند حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی کے تالیفات کے خانے میں کتب خانہ دارالعلوم دیوبند میں موجود ہے اور اس کی مائکرو فلم حضرت مولانا مفتی محمد اللہ صاحب شعبۂ انٹرنیٹ دارالعلوم دیوبند ومؤلف 'دارالعلوم دیوبند کی جامع ومختصر تاریخ' کے پاس موجود ہے۔ اس کے سوا اور کتنے شمارے نکلے معلوم نہیں ہوسکا۔

☆☆☆☆☆

سید الملت کی نثری جہات:

مولانا سید محمد میاںؒ کی نثر نگاری

(ڈاکٹر) مولانا ابرار احمد صاحب اجراوی/ مدھوبنی، بہار

مولانا محمد میاں دیوبندیؒ کی شخصیت کسی تعارف یا تشریح کی محتاج نہیں ہے۔ درس وتدریس اور فتوی نگاری کے ساتھ، ان کو زبان وقلم پر جو عبور حاصل تھا، وہ ان کے ہم عصروں میں خال خال ملتا ہے۔ وہ تحریک وتنظیم کے بھی آدمی تھے اور تحریر وتقریر کے بھی دھنی تھے۔ انھیں خلاق ازل کی طرف سے تصنیف وتالیف کا ادبی ذوق ودیعت ہوا تھا۔ وہ کمہار کے چاک کی طرح اپنی تحریروں کو شکل وصورت عطا کرتے تھے، سخت ترین سیاسی، سماجی، فقہی اور مذہبی موضوع بھی ان کے قلم کے آگے موم ہو جاتا تھا اور عمیق و دقیق مسئلہ بھی اتنی آسان زبان میں ان کے نوک قلم سے ادا ہو جاتا تھا کہ دوسرے اس مفہوم کی ادائیگی کے لیے نہ جانے کتنے الفاظ کا منہ تکتے اور جملوں کی ساخت اور ترکیب کے ادھیڑ بن میں دیر تک کھوئے رہتے۔ انھوں نے کتابیں بھی لکھیں اور اردو کے مختلف رسائل کی ترتیب وادارت بھی کی، جمعیۃ علمائے ہند، ہندستانی مدارس اور دوسری تحریکات کا تعارف نامہ بھی لکھا، تعلیمی نصاب و نظام تعلیم کا نقشہ بھی ترتیب دیا، تجاویز اور منصوبوں کے خاکے بھی اپنے ذہنی ٹکسال میں ڈھالے، سیرت بھی لکھی اور سوانح بھی، اقران واحباب اور مشائخ وبزرگان دین کو خطوط بھی لکھے اور تقریر وخطابت کا جادو بھی دکھایا، تصنیف کا ذوق اتنا پختہ اور بالیدہ تھا کہ ہجوم کار کے باوجود زائد از ۲۵ رمطبوعہ کتابیں ان کی تحریری یادگار کے طور پر ہماری لائبریریوں میں محفوظ ہیں، مگر زبان وقلم کا اتنا بڑا خادم اور تحریر وتالیف کا اتنا ممتاز شیدائی بھی ہماری بے توجہی اور

بے اعتنائی کی قربان گاہ پر شہید ہو گیا۔ ڈھنڈورچی آگے بڑھ گیا اور گوشہ نشیں فن کار و قلم کار کہیں کھو گیا۔ بالشتیے سر آنکھوں پر چڑھ بیٹھے اور قدآور منہ دیکھتا رہ گیا۔ المیہ تو یہ ہے کہ مولانا محمد میاں جیسے بسیار نویس قلم کار کو آج تک کوئی اچھا محقق، سوانح نگار اور ناقد نہ ملا، جو ان کی شخصیت اور ان کی متنوع خدمات کا تنقیدی جائزہ لیتا اور انھیں علم و فن کی وسیع کائنات میں متعارف کراتا۔ ان پر باضابطہ نہ کوئی مفصل کتاب لکھی گئی نہ کسی رسالے نے اپنا مخصوص شمارہ نکالا، جن رسالوں نے ان کا خونِ جگر پی کر جوانی کی عمر طے کی، وہ بھی ان کے ساتھ انصاف نہ کر سکے۔

مولانا محمد میاں صاحب کو گرچہ درس و تدریس کا چسکہ تھا، مگر وہ اصل میں زبان و ادب کے آدمی تھے، ان کے تربیت کنندگان اور ان کے اساتذہ انھیں اسی میدان میں سرگرم رکھنا چاہتے تھے۔ چناں چہ جب جمعیۃ علماء ہند کے دوسرے اجلاس منعقدہ کلکتہ سے وہ واپس لوٹ رہے تھے، انھیں اسی فن کی تعلیم کے لیے شاہ آباد آرہ میں ان کے اساتذۂ دیوبند نے رکھ چھوڑا تھا۔ وہ خود لکھتے ہیں:

> ''مارچ ۱۹۲۶ء میں کلکتہ میں جمعیۃ علمائے ہند کا دوسرا اجلاس زیر صدارت علامہ سید سلیمان ندوی ہوا تھا، حضرت علامہ مولانا محمد انور شاہ صاحب صدر المدرسین دار العلوم دیوبند اور دار العلوم دیوبند کے جملہ اکابر اس میں شامل ہوئے۔ واپسی پر ''آرہ شاہ آباد'' کے اسٹیشن پر مدرسہ حنفیہ آرہ شاہ آباد کے ارکان نے صدر المدرسین دار العلوم دیوبند حضرت علامہ کشمیری سے ایسے مدرس کی فرمائش کی، جو عربی تقریر و تحریر کی مشق اور خصوصاً فن ادب کی اونچی کتابیں پڑھا سکے۔ حضرت موصوف دیوبند واپس ہوئے تو حضرت شیخ الادب مولانا محمد اعزاز علی صاحب کے مشورے سے اس خدمت کے لیے احقر کو منتخب کیا گیا۔'' (اشتات سوانح محمد میاں، ماہنامہ دار العلوم، مئی ۱۹۷۶ء)

مولانا محمد میاں کے تحریری موضوعات کیا تھے، ان کا تحریری محور و مرکز کیا تھا، اس تعلق سے انھوں نے صراحت کے ساتھ تو کہیں نہیں لکھا ہے، مگر ان کے ایک شاگرد اور شاعر و ادیب مولانا اسیر ادروی کا بیان بہت معتبر معلوم پڑتا ہے:

''اسلامی ہند کے دورآخر کی تاریخ ان کا خاص موضوع تھا، ان کی بیشتر کتابیں اسی دور کی تاریخ سے وابستہ ہیں، آزادی کے بعد اسلامیات کوآپ نے اپنا موضوع سخن بنایا اور کئی اہم ترین اور شاہکار کتابیں معرض وجود میں آئیں۔'' (تذکرہ مولانا سید محمد میاں، مسعود عزیزی ندوی، ص: ۸۷، بحوالہ تاریخ شاہی نمبر، ص: ۴۶۶)

مولانا محمد میاں نفسیات و کیفیات کے ماہر قلم کار وفن کار تھے۔ وہ ہر موضوع کو ایک ہی اسلوب کی لاٹھی سے ہانکنے کے عادی نہ تھے۔ طبائع اور مزاج کے اختلاف اور موضوعات کی تنوع کاری کی وجہ سے ان کا اسلوب نثر و انداز تحریر بھی ادلتا بدلتا رہتا تھا۔ موضوع اور سامعین کی ذہنی سطح کا خیال رکھ کر ہی وہ کچھ بھی لکھا کرتے تھے۔ ان کی مختلف قسم کی تحریروں پر تقابلی نظر ڈالنے سے یہ عقدہ کھل جائے گا۔ وہ انسانی اذہان کے مطابق ادبی، رنگین یا سادہ و سہل اسلوب نگارش کا انتخاب کرتے تھے۔ ماہ نامہ قائد کی فائلوں میں دبی ان کی مختلف قسم کی تحریروں کا مطالعہ کرنے پر خود بخود یہ راز منکشف ہوجائے گا کہ موضوع کی حدود و قیود نے ہی انھیں اس قسم کا سادہ و رواں اسلوب تحریر کا دامن پکڑنے پر آمادہ کیا ہے۔ طرز تحریر کا انتخاب کرتے وقت زبان دانی کا اظہار ان کا منشا و مدعا نہ تھا۔ انھوں نے کسی فیشن کے اظہار میں کہیں مشکل ادبی اسلوب کا دامن نہیں تھاما ہے کہ لوگ انھیں بھی نام نہاد ادیبوں اور نثر نگاروں کی صف میں جگہ دیں۔ یہ وقت و حالات اور موضوع و مشمول کا تقاضا تھا۔

مولانا محمد میاں میر امن کی طرح دلی کا روڑا تو نہیں تھے، مگر وہ دلی کی بولی، اہل دلی کے محاورے اور وہاں کے روزمرہ سے ناواقف نہیں تھے۔ انھوں نے دہلوی انداز نثر اختیار کیا، وہی نثر جس کا سرا فورٹ ولیم کالج، علی گڑھ تحریک اور دلی کالج سے جا ملتا ہے۔ انھوں نے فسانۂ عجائب والے مرصع اور مقفی اسلوب سے احتراز و اجتناب کیا اور وہ زبان اختیار و انتخاب کی، جس پر میر امن کی باغ و بہار اور مکتوبات غالب کی چھاپ ہے۔ انھوں نے اپنی تحریروں سے دہلوی انداز نثر کی توسیع وتشہیر کی۔ جو اسلوب نثر دبستان دہلی کا امتیاز ہے، اس کا تاریخی تعارف کراتے ہوئے ڈاکٹر احمد عبدالرحیم جاگیردار لکھتے ہیں:

''اردو نثر کا جو قدیم انداز بیان ہے اس کی مثال ہم ''فسانۂ عجائب'' اور ''انشائے بہار بے خزاں'' میں دیکھتے ہیں، اُس زمانے میں مقفی، مسجع اور مرصع انداز بیان کا رواج تھا۔ دہلی کے نثر نگاروں نے اس قدیم اور پر تکلف انداز بیان کو ترک کیا اور پہلی مرتبہ اردو نثر کے رخ کو سلاست، سادگی اور روانی کی طرف موڑا، جس کی وجہ سے اس میں ہر قسم کے خیالات سادگی، صفائی، برجستگی اور وضاحت کے ساتھ بیان کرنے کی صلاحیت پیدا ہوگئی۔'' (اردو نثر کا دہلوی دبستان، ص:۱۴ شالیمار پبلی کیشنز حیدر آباد، ۱۹۷۵ء)

مولانا محمد میاں ایک کشادہ ذہن عالم تھے۔ وہ صرف اسلامیات و مذہبیات ہی نہیں، اردو کے تاریخی پس منظر، اس کی جائے پیدائش اور اس کے آغاز وارتقا کی پوری تفصیل سے بہرہ ور تھے۔ وہ عصری ادبی منظر نامے پر بھی گہری نظر رکھتے تھے، ان کا ذہن ضرور مدارس کا پروردہ تھا، مگر وہ رائج طرز تحریر سے نابلد نہ تھے۔ وہی چھوٹے چھوٹے جملے جس میں سرسید، شبلی اور حالی بات کرنے کے قائل تھے اور جن کے طرز تحریر کو نثری دبستان کی حیثیت حاصل تھی۔ ضرورت پڑی تو اپنی تحریروں میں شعر وادب کی شیرینی بھی ڈال دی۔ مگر سہولت وسادگی ہمیشہ ان کا طرۂ امتیاز رہا۔ وہ دلی کی بولی ٹھولی اور وہاں رائج بول چال کی زبان لکھتے تھے۔ انھیں دہلوی محاروں، ضرب الامثال اور فقروں پر عبور حاصل تھا۔

آج ہی نہیں پہلے زمانے میں بھی مصنف ومؤلف اپنی بات کو پر اثر اور مدلل کرنے کے لیے اشعار کے دامن میں پناہ لیتے تھے، مولانا میاں بھی فارسی اور اردو اشعار سے اپنی بات کو باوزن اور مدلل کرتے تھے۔ حالاں کہ ان کی تحریروں میں مستعمل اشعار کی تعداد بہت کم ہے۔ **الضرورة تتقدر بقدر الضرورة** کے تحت انھوں نے چیدہ اشعار کی گود میں ہی پناہ لی ہے، جس سے موضوع کی تفہیم وتفسیر اور معنی کی تشریح وتعبیر میں مدد ملتی ہے۔ اور یہ اشعار بھی مختلف قسم وقماش کے ہیں۔ کہیں سنجیدہ تو کہیں مزاحیہ۔ اشعار کی مدد سے کہیں ہنسایا ہے تو کہیں رلایا بھی ہے۔ کہیں چٹکی لی ہے تو کہیں ان کے احساس کو گدگدایا ہے۔ اپنی کتاب 'علماء حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے' میں اپنے ہم عصر مشہور مزاحیہ اور فلسفی شاعر احمق

پھپھوندوی (۱۸۹۵-۱۹۵۷ء) کا ایک مزاحیہ شعر انھوں نے مستعار لیا ہے، جب مولانا نے علما کے مجاہدانہ کارناموں اور جد و جہد حریت میں ان کے نمایاں کردار کو آشکار کیا ہے اور علما کے خلاف پروپگنڈوں کا مدلل جواب دیا ہے:

''کیا اعتراض کرنے والے اپنی جماعت میں سے کوئی ایک شخص بھی پیش کر سکتے ہیں جس نے توس مکھن اور آرام کرسی کے سوا شاہراہ انقلاب کی گرد چھانی ہو۔ احمق پھپھوندوی کا ایک شعر ان راحت طلب مصلحین قوم کے حالات کا مرقع ہے۔

سوچا تھا قوم کے متعلق بہت سا کام
لیکن خیال بنگلہ و موٹر میں رہ گیا

علماء ملت صحیح طور پر اور بجا طور پر کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے ایک مرتبہ نہیں بار ہا حریت اور انقلاب کی قربان گاہ پر خود کو پیش کیا۔ انگریزی اقتدار کی ابتداء سے آج تک ان کے خیالات، انقلاب کا نقشہ قائم کرنے میں اور ان کی عملی طاقتیں انقلاب کو بروئے کار لانے میں مصروف رہیں۔'' (علماءِ حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے، ج:۱، ص:۱۳۵، فیصل پبلی کیشنز دیو بند، ۲۰۰۳ء)

جب حضرت شیخ الہند مالٹا کی اسارت کے بعد ہندستان قدم رنجہ ہوتے ہیں، تو ان کی آمد سے جنگ آزادی کی شعلہ بداماں تحریک کو نئی قوت و توانائی اور نئی دِشا اور دشا ملتی ہے، مگر ان کا آخری وقت زندگی کے دروازے پر دستک دے چکا تھا، وہ بہت نڈھال اور نحیف و ضعیف ہو چکے تھے، اس وقت کا نقشہ اس شعر کی مدد سے اس طرح کھینچا ہے:

''بلا شبہ حضرت شیخ الہند کی تشریف آوری پر مسلمانوں کا شیرازہ اس طرح فراہم ہوا تھا کہ توقع ہوتی تھی کہ اب ان کے اقبال کا تارہ گردش سے نکل چکا۔ لیکن افسوس

سیہ بختی میں کب کوئی کسی کا ساتھ دیتا ہے
کہ تاریکی میں سایہ بھی جدا ہوتا ہے انسان سے

حضرت شیخ الہند ہندوستان تشریف لائے تو مرض الوفات کا آغاز تھا۔ آپ کو

وجع المفاصل کا قدیم سے عارضہ تھا۔ کثرت بول کی شکایت بھی پرانی تھی۔ اس پر مالٹا کا سرد موسم اور مزید برآں حضرت والا کی شب بیداری، ریاضت اور قلت غذا۔ بایں ہمہ پیرانہ سالی اور پھر ترکوں کی شکست اور جد وجہد کی ناکامی کا صدمہ۔'' (علماء حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے، ج:۱،ص:۱۴۳)

میر جعفر و میر صادق ہر دور میں ہماری صفوں کو کھوکھلا کرتے رہے ہیں اور ہمارے متحدہ شیرازے کو منتشر کرنے پر آمادہ رہے ہیں۔ مولانا کا زمانہ بھی ان دوست نما دشمنوں سے مبرا و منزہ نہ تھا۔ مجاہدین کے ساتھ منافقین و معاندین کا ایک گروہ سرگرم تھا۔ اسی قسم کے خائن و بددیانت اور غدار وطن رہ نماؤں کی سازش کی عکاسی کرتے ہوئے مولانا نے ایک جگہ شاعر مشرق علامہ اقبال (۱۸۷۷-۱۹۳۸ء) کا یہ ناصحانہ شعر لکھا ہے:

''خداوند عالم ایسے خود غرض خائن اور غدار خود ساختہ لیڈروں کے پنجہ سے قوم کو نجات بخشے۔ مگر جب تک قوم خود ان کو قیادت کے اسٹیج سے نہ دھکیل دے اس کو نجات نہیں حاصل ہو سکتی۔

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

(علماء حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے، ج:۲،ص:۸۱)

مسلم لیگ کے قیام و نظام کا مقصد کیا تھا، یہ نہ اس وقت کسی ذی شعور سے مخفی تھا اور نہ اب کسی سے مخفی رہا ہے، لیگ مسلمانوں کو کانگریسی تحریک سے الگ رکھنے کی مہم چلا رہی تھی۔ لیگ کا موقف تھا کہ کانگریس کی تحریک کا مقصد ہندو راج کا قیام اور مسلمانوں کو ہندو راج کے چنگل میں پھنسانا ہے۔ جس سے مسلم انڈیا مکمل طور پر تباہ ہو جائے گا اور یہ عمل اسلام و ایمان کی تباہی و بربادی پر منتج ہوگا۔ اس لیے وہ موجودہ تحریک کی مخالفت کریں اور ہڑتال وغیرہ کے موقع پر جان و مال کے تحفظ کے عنوان سے مسلمان بھی بلوہ کریں۔ لیکن مسلمانوں نے مسٹر جناح اور لیگ کی ایک نہ سنی۔ اس حالت کی عکاسی کرتے ہوئے مولانا اردو اور فارسی کا ایک ایک مصرع حسب حال یوں نقل کرتے ہیں:

''مگر افسوس مسلمانوں نے مسٹر جناح کے مشورہ کو قبول نہیں کیا بلکہ کانگریس کی امداد کی، ورنہ خاموشی اختیار کی۔ بہر حال لیگ نے مسلمانوں کو علیحدہ رکھنے بلکہ طول و عرض ہندوستان میں بلوے کرانے کی ترغیب میں کوتاہی نہیں کی۔ مسلمانان ہند نے جس قدر تحریک کا ساتھ دیا یا خاموشی اختیار کی وہ جمعیۃ علماء ہند کی جد و جہد کا نتیجہ اور اراکین جمعیۃ علماء ہند کی قربانیوں کی برکت تھی۔ ؎

کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

آنچہ استاد ازل گفت ہماں می گویم

۲۰/اگست ۱۹۴۲ء والی مسلم لیگ کی تجویز اس کی اپنی تصنیف و ایجاد تھی یا اس پردۂ زنگاری میں کوئی سفید فام ہاتف یہ الہام کر رہا تھا۔ ذیل کے بیانات ملاحظہ فرما کر اس امر کا فیصلہ کیجئے۔'' (علماء حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے، ج:۲،ص:۱۳۷)

مسلم لیگ کی نظر میں ہر وہ شخص معتوب و مطعون تھا جو ان کے تشکیل کردہ نظریۂ پاکستان کا مخالف تھا۔ اس میں علما، فضلا، اولیا، صوفیا، دین دار و دنیا دار یا سیاسی رہ نما کسی کی تمیز و تفریق نہ تھی۔ یہ عتاب و عقاب اتنا سخت تھا کہ مولانا مدنی اور مولانا آزاد جیسا مخلص و جاں سپار مسلم رہ نما بھی ان کی دشنام طرازیوں، شعلہ باریوں اور افترا پردازیوں سے محفوظ نہ رہ سکا۔ ایک بار مولانا آزاد شملہ سے کلکتہ واپس جا رہے تھے کہ علی گڑھ ریلوے اسٹیشن پر مسلم یونی ورسٹی کے طلبہ کا ایک شرارت پسند لیگی گروہ اکٹھا ہو گیا اور مولانا کے ساتھ زبردست ہلڑ بازی کی۔ گاڑی چلنے لگی تو زنجیر کھینچ کر بدتمیزی کی ساری حد پار کر دی۔ اس واقعہ پر مولانا نے حاشیہ چڑھاتے ہوئے طنزیہ انداز میں ایک فارسی مصرع کا سہارا لے کر لکھا ہے:

''لیگ کے ترجمان اخبار ڈان نے اس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے ۲۷/ستمبر کے مقالہ افتتاحیہ میں لکھا۔ جہاں تک اس سلوک کا تعلق ہے جو لیگی لیڈروں کی جانب سے مولانا کے ساتھ ہونا بیان کیا جاتا ہے ہم صرف یہی کہہ سکتے ہیں کہ گلدستہ کے مقابلہ میں تو ان لوگوں کے حصہ میں اینٹ پتھر ہی آئیں گے جو شو بوائے کا کام کرتے ہیں۔ جب لیگ کے سرکاری ترجمان کا یہ فتویٰ ہو تو پھر شرارت پسند طبقہ کی حرکات کا

کیا ٹھکانہ۔ ؎ چوں کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی۔‘‘

(علماء حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے، ج:۲،ص:۲۱۵)

سید پور اور بھاگل پور میں حضرت مدنی پر اتنا زوردار قاتلانہ اور وحشیانہ حملہ ہوا کہ سن کر روح کانپنے لگتی ہے۔ لیگی بدمعاشوں نے یہاں بھی ان کا ناطقہ بند کرنا چاہا۔ انھیں پچھاڑنے تک کی کوشش کی۔ انھیں سب وشتم کیا، انھیں اسٹیشن پر محصور ومقید کر کے رکھا اور لوٹ جانے پر مجبور کر دیا۔ یہ رپورٹ اخبارات میں بھی اجمال کے ساتھ آئی تھی، اس کی عکاسی کرنے کے لیے مولانا میاں نے اردو میں طنز ومزاح کے سب سے بڑے شاعر اکبر الہ آبادی (۱۹۲۱-۱۸۴۶ء) کا یہ مشہور زمانہ شعر لکھا ہے:

’’یہ ہے وہ رقت خیز اور روح فرسا داستان کہ جس سے سوائے لیگی پریس کے ہر شخص مغموم ومتاثر ہے اور ارباب لیگ کی طرف سے واقعہ کی تکذیب کی جارہی ہے افسوس صد افسوس۔

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

(علماء حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے، ج:۲،ص:۲۳۰)

خدا کا قہر دیکھیے کہ ان سب وشتم کرنے والوں پر بروقت عتاب بھی نازل ہوا۔ کوئی تالاب میں غرق ہوا، تو کوئی دوسری طرح بدترین قسم کی موت کا شکار ہوا۔ جن لوگوں نے جمعیۃ کی راہ میں روڑے اٹکائے، وہ بفضل خدا پھلی پھولی اور جس مسلم لیگ کی حمایت میں یہ جرم بدتمیزی کیا، اس کی مخالفت شروع ہوگئی۔ شیخ الاسلام مولانا مدنی کی اس کھلی کرامت کا ذکر کرتے ہوئے مولانا نے غالب وذوق کے ہم عصر مومن خاں مومن (۱۸۵۲-۱۸۰۰ء) کا یہ شعر اس طرح درج کیا ہے کہ:

’’جو لوگ اب تک غنڈے بنے ہوئے تھے وہ اب تائب ہو کر ایک دوسرے کو متہم کر رہے ہیں اور جس جھنڈے کے تحت میں یہ سب کچھ خرافات کی گئی تھی اسی جھنڈے کی اب علانیہ مخالفت شروع کر دی گئی ہے۔ اللہ رے قدرت کیا برعکس معاملہ ہے۔

مانگا کریں اب تو دعا ہجر یار کی
آخر تو دشمنی ہے دعا کو اثر کے ساتھ

(علماء حق اوران کے مجاہدانہ کارنامے، ج:۲،ص:۲۳۱)

آپ ﷺ کی آمد سے پہلے عربوں کا جو حال زار تھا، اس پر سینکڑوں صفحات لکھے جائیں تب بھی ان حالات کی صحیح کمیت و کیفیت کے ساتھ عکاسی نہیں ہوسکتی۔ ہمارے نثر نگاروں نے بھی ان ناگفتہ بہ احوال کونشان زد کیا ہے اور اردو کے کئی شعرانے بھی عربوں کی اس بدترین حالت کو ردیف وقافیہ کا پیکر عطا کیا ہے۔مگر مولانا الطاف حسین حالی نے اپنے مشہور زمانہ مسدس میں عربوں کے ان حالات کا جو نقشہ کھینچا ہے، وہ سبق آموز بھی ہے اور ان حالات پر مکمل انداز میں منطبق بھی ہوتا ہے۔اردو شعر وادب میں مسدس کی نظیر پیش کرنا مشکل ہے، سرسید اسی لیے اس پر فخر کرتے تھے اور اس کو اپنی نجات اخروی کا ذریعہ متصور کرتے تھے۔چناں چہ جب مولانا میاں کو اپنی سیرت والی کتاب میں ماقبل اسلام عربوں کی حالت کا نقشہ کھینچنے کا مرحلہ پیش ہوتا ہے تو اسی مسدس حالی کی طرف رجوع کرتے ہیں اور کئی بند پرمبنی مسلسل یہ اشعار یوں لکھتے ہیں:

''حتی کہ ہندوستان کے ایک مشہور قومی شاعر (علامہ حالی) نے عربوں کے اس دور کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا:

عرب جس کا چرچا ہے یہ کچھ وہ کیا تھا　　جہاں سے الگ اک جزیرہ نما تھا
زمانہ سے پیوند جس کا جدا تھا　　نہ کشورستاں تھا نہ کشورکشا تھا
تمدن کا اس پر پڑا تھا نہ سایہ
ترقی کا تھا واں قدم تک نہ آیا

نہ واں مصر کی روشنی جلوہ گر تھی　　نہ یونان کے علم وفن کی خبر تھی
وہی اپنی فطرت پہ طبع بشر تھی　　خدا کی زمیں بن جُتی سر بسر تھی
پہاڑ اور صحرا میں ڈیرا تھا سب کا
تلے آسماں کے بسیرا تھا سب کا

چلن ان کے جتنے تھے سب وحشیانہ ہر ایک لوٹ اور مار میں تھا یگانہ
فسادوں میں کٹتا تھا ان کا زمانہ نہ تھا کوئی قانون کا تازیانہ
وہ تھے قتل وغارت میں چالاک ایسے
درندے ہوں جنگل میں بے باک جیسے
(محمد رسول اللہ ﷺ، ص:۶۵)

مولانا محمد میاں اپنی نثر میں حد سے زیادہ سنجیدہ ومتین نہیں تھے۔ وہ مزاحیہ شعر ہی نہیں، لطیفوں اور ادبی چٹکلوں کا بھی تحریروں میں استعمال کرتے تھے۔ آزادی کے بعد مولانا ہماچل پردیش، پنجاب اور آسام وغیرہ ریاستوں کا دورہ کرتے ہیں، جب وہاں آب ودانہ اور غذائی اجناس کی قلت اور خشک سالی کا ہوش ربا منظر دیکھتے ہیں، تو اس کی عکاسی کرنے کے لیے اونٹ کی پشت وکمر کا ذکر کرتے ہوئے یہ لطیفہ لکھتے ہیں:

''مثل مشہور ہے کہ اونٹ نے دعا کی تھی کہ اُس کی کمر پر ایک پیندا رکھ دیا جائے کہ انسان سوار نہ ہو، حضرت انسان نے جب یہ پیندا دیکھا تو خوش ہوا کہ ایک کمر پر دو نشستیں ہوگئیں۔ اس جانور پر ایک نہیں دو سوار ہوا کریں گے، ایک گردن کا سہارا لے گے دوسرا پیندے کا۔''

''آسام کے سیلاب اور پنجاب وہماچل پردیش کے ان علاقوں کو دیکھ کر یہی خیال ہوتا ہے کہ انسان کی شوخ چشمی، زبردستی یا اس کی حد درجہ اقتصادی مجبوریاں ہیں کہ وہ ان علاقوں کو اپنا مسکن یا نشیمن بناتا ہے۔'' (ہماچل پردیش اور پنجاب کے پہاڑی بھائی اور ہمارا نظام تعلیم...، ص:۵، الجمعیۃ پریس دہلی،)

مولانا میاں ناول وافسانہ تو نہیں لکھتے تھے[۳] کیوں کہ یہ ان کا علاقہ نہیں تھا، وہ کسی اور دنیا کے باسی تھے، وہ زبان وقلم کے سند باد تھے، جس کا جزیرہ الگ تھا، مگر کہانی گوئی اور وقوعہ نویسی کا فن انھیں آتا تھا۔ قصہ گوئی یا فکشن نگاری تو حقائق پر جھوٹ کی ملمع سازی کا تقاضا کرتی ہے اور اسی لیے علمائے دین نے اس صنف ادب سے احتراز کیا ہے۔ مولانا نے بھی آج کل کی مروجہ فکشن نویسی سے تو احتراز کیا، مگر اس کے تقاضوں سے وہ بے بہرہ نہیں تھے۔

وہ اس دریا کے شناور تو نہیں ہیں، مگر ان کی تحریروں میں فکشن کے نقوش تلاش کیے جا سکتے ہیں۔ دیکھیے جب مولانا حسین احمد مدنی پر لیگیوں نے افترا پردازی کی، ان کا تعاقب کیا اور انھیں زدوکوب کے دریائے شور سے گزارا، اس کے ایک ایک جزیئے کا کتنی گہرائی کے ساتھ ذکر کرتے ہیں۔ جزئیہ نگاری، منظر نگاری اور وقوعہ نویسی کمال کی ہے، جب مولانا مدنی سید پور اسٹیشن پر اترتے ہیں، اس وقت کا دل دوز منظر دیکھیے، یہ دردناک واقعہ مولانا ریاض الدین صاحب نے خود کولوٹولہ کی مسجد میں مولانا میاں صاحب کو سنایا تھا۔:

''افسوس کہ ممدوح کو میرے [مولانا ریاض الدین صاحب کے] غریب خانہ تک پہنچنے کی نوبت بھی نہ آئی تھی کہ دفعتہ تقریباً سات سو لوگوں کا لیگی انبوہ نعرے لگاتا ہوا اسٹیشن پر آدھمکا اور حضرت شیخ کو عریاں و دشنام دہی شروع کر دی، ہاتھوں میں لاٹھیاں، ڈنڈے اور چھتریاں تھیں۔ بے تمیزی سے نام لیکر قتل کر دو، مار ڈالو، ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالو، یہ غدار ہے ایسا ہے ویسا ہے جو کچھ منہ میں آرہا تھا بکواس کی۔ ہم بنا پر استقبال صرف دس پندرہ آدمی تھے اور ان لوگوں میں برابر ایک شخص کے ناقوس پر ناقوس بجانے پر زیادتی ہورہی تھی، چنانچہ دیکھتے ہی دیکھتے تقریباً تین ہزار غنڈے سید پور ورکشاپ اور مضافات سے جمع ہوگئے اور پھر کربلا کا منظر حسین احمد بن حسین کے سامنے آگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ماردھاڑ شروع کر دی اور ہم چند لوگ جو شیخ مدظلہ کو حلقہ میں لئے ہوئے تھے کچھ مجروح اور کچھ مضروب ہورہے تھے اور خدا جانے ہم لوگوں میں آیا فرشتے آگئے تھے یا کیا بات تھی کہ بے انتہا قوت ہمارے اندر پیدا ہورہی تھی اور ہم کانھم بنیان مرصوص بنے ہوئے تھے۔ اسی اثنا میں ایک فرعون بے سامان نے اپنی فرعونیت کا شدید ترین مظاہرہ کیا۔ مدنی صاحب کو زمین پر پچھاڑنے کی کوشش کی۔ بیدردی سے گریبان اور آخر میں سخت مدافعت کے باوجود کلاہ سر مبارک سے اتار لی بیہودہ کلمات بکتے ہوئے پاؤں کے نیچے روندا اور پھر اس کو جلا دیا۔ ہم میں سے بعض اشخاص نے ایک مسلمان سب انسپکٹر کو جو قریب ہی تھا امداد کے لئے متوجہ کیا مگر افسوس کہ اس نے لیگی ذہنیت کی وجہ سے ابتداء لطائف الحیل سے کام

لے کر کچھ دیر بعد صاف وصریح انکار کر دیا کہ میں اس بڑے مجمع کو قابو میں لانے سے معذور ہوں۔'' (علماء حق اوران کے مجاہدانہ کارنامے، ج:۲،ص:۱۲۹)

مولانا محمد میاں ڈرامے کی لائن کے بھی آدمی نہ تھے، انھوں نے خالص ڈرامے تو نہیں لکھے، مگر ذرا یہ ڈرامائی مکالماتی انداز بیان اور سوال و جواب کا منظر بھی بچشم انصاف دیکھیے ۔اپنی مشہور کتاب سیرت محمد رسول اللہ ﷺ میں 'دین ایک ہے' کے ذیلی عنوان کے تحت ایک دو جملے میں جو کچھ لکھا ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کسی ڈرامے کے دو کردار باہم سوال و جواب میں منہمک ہوں اور سامعین وحاضرین کا انبوہ سامنے بیٹھا ان مکالموں کو بغور سن رہا ہو:

''دنیا خود بخود ہوگئی۔ یا اس کو کسی نے پیدا کیا؟
پیدا کرنے والا ایک ہے یا کئی ہیں؟
پیدا کرنے والے کو مددگاروں کی ضرورت ہے یا نہیں؟
وہ ہم جیسا ہے یا ہم جیسا نہیں ہے؟
اس کے بیوی بچے اور اولاد ہے یا نہیں ہے؟
ان میں سے ایک ہی بات حق ہوسکتی ہے۔
وہی ایک بات اول سے آخر تک تمام نبیوں اور تمام رسولوں نے پیش کی، اسی کا نام دین ہے'' (سیرت محمد رسول اللہ ﷺ، ص:۲۲-۲۱)

مولانا محمد میاں بنیادی طور ایک سہل پسند قلم کار تھے۔ وہ آسان زبان لکھتے تھے۔ جیسے دو نفوس تکلف وتصنع سے دور جملہ سازی سے بے پروا باتیں کرنے میں مشغول ہوں۔ مگر کہیں کہیں انھوں نے اپنا زور قلم بھی دکھایا ہے۔ تشبیہات اور دوسری صنعتیں استعمال کی ہیں۔ حالاں کہ یہ عمل غیر اختیاری اور غیر عمدی ہوگا۔ ایک جگہ عالمی جنگ اور احوال زمانہ کے تعلق سے جنگوں کی تباہی کا نقشہ پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ہٹلر کی فوجیں طوفان بن کر اٹھیں۔ مگر اقتصادی مشکلات کے بھنور میں پھنس کر تباہ ہوگئیں۔ جاپان کے برق خرمن سوز کو امریکہ کے ایٹم بم نے آبگینہ بنا دیا، جو ایک ہی گولہ سے چور چور ہوگیا۔'' (علماء حق اوران کے مجاہدانہ کارنامے، ج:۱،ص:۱۹۹)

مولانا اپنی تحریروں میں تشبیہات کا بھی استعمال کرتے ہیں اور لف ونشر مرتب کی شاعرانہ صنعت کو اپنی نثر میں کھپاتے ہیں۔ رعایت لفظی کا بھی اہتمام کرتے ہیں۔ جمعیۃ علماء ہند کا بہت پہلے سے وطن کی آزادی کے متعلق ایک فارمولا تھا کہ آزادی کامل کے ساتھ مسلمانوں کا مذہب بھی آزاد ہوگا اور ان کا کلچر، ان کی تہذیب وثقافت بھی تمام جکڑ بندیوں سے آزاد ہوگی، اور کوئی ایسا آئین نہ ہوگا جس میں ایسی آزادی پر مبنی شرائط نہ ہوں۔ تمام صوبے بھی خود مختار ہوں گے اور مرکز کو وہی اختیارات حاصل ہوں گے جن کو طے کر دیا گیا ہو۔ مسٹر جناح کو اور ان کی لیگ کو بھی اس فارمولے سے اختلاف نہ تھا، مگر فارمولے کی یہ بیل منڈھے نہیں چڑھ سکی اور کیبنٹ مشن کے راستے سے ملک دولخت ہوا۔ اس کی نقشہ گری کرتے ہوئے مولانا محمد میاں آسمان وزمین کی مناسبتوں سے اس طرح کام لیتے ہیں:

> ''کاش اس وقت جمعیۃ علماء ہند کی دعوت اتحاد منظور کر لی جاتی تو آج ہندوستان کا آسمان حکومت بدل چکا ہوتا اور زمین ہندوستان ہندوستانیوں کے زیر نگیں ہوتی۔'' (علماء حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے، ج:۲،ص:۱۰۸)

مولانا چھوٹے چھوٹے جملے لکھنے کے عادی تھے۔ لمبے اور طویل جملے جس میں اسم موصول اور صلہ کا استعمال ہو، اس سے حتی الامکان بچتے تھے کہ اس طول بیانی سے قاری کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو جاتا ہے اور وہ کتاب کی سطروں کی قراءت سے اپنی نگاہیں پھیر لیتا ہے۔ مختصر چند لفظی جملوں پر مبنی یہ اقتباس دیکھیے جس میں جمعیۃ علماء ہند کی ورکنگ کمیٹی کے ممبران جمعیۃ کے اعلان پر اپنی جان کی پروا نہ کرتے ہوئے دہلی پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں، جہاں مولانا احمد سعید صاحب کی زیر صدارت جمعیۃ علماء ہند کی مجلس عاملہ کا اجلاس ۱۷-۱۸/اگست ۱۹۴۲ء کو ہونا طے تھا:

> ''ٹیلیفون اور ٹیلی گراف کے تار کاٹے جا رہے تھے، ہڑتالیں ہو رہی تھیں۔ پٹریاں اکھاڑی جا رہی تھیں، جگہ جگہ فوج اور پولس کی گولیاں موت کی بارش برسا رہی تھیں اور قدرتی طور پر مسلسل بارش نے سفر کو اور بھی دشوار کر دیا تھا۔ ان تمام خطرات اور دشواریوں سے بڑھ کر خود اپنی گرفتاری کا خطرہ ہر دم لگا ہوا تھا لیکن جملہ صعوبتوں

اور خطرات کو برداشت کرتے ہوئے مجلس عاملہ کے اراکین نے سفر طے کئے۔ اور اجلاس میں شرکت کی۔'' (علماء حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے، ج:۲،ص:۱۲۶)

ایک اور نمونہ دیکھیے، ایک لفظ ہی پورا پورا جملہ بن گیا ہے، 'زندگی کیا ہے؟' کے عنوان سے سیرت والی کتاب میں لکھتے ہیں:

''لوگ کہتے ہیں۔ بہت خفیف سا قطرہ یا کیڑا تھا۔ ماں کے پیٹ میں اس نے بڑھنا شروع کیا۔ وہ بچہ بن گیا۔ پیدا ہوا۔ بڑھا۔ جوان ہوا۔ بوڑھا ہوا۔ یہ زندگی ہے۔ مگر یہ تو اس قالب کی سرگذشت ہے۔ زید جس کو انسان کہتے ہیں وہ تو کچھ اور ہے۔'' (محمد رسول اللہ ﷺ، قرآن اور تاریخ کے آئینے میں، ص:۳)

مولانا محمد میاں صرف مؤلف و مصنف ہی نہیں تھے، بلکہ تجربہ کار محقق بھی تھے اور تحقیق کے دریا کے شناور تھے۔ انھوں نے اپنی کتابوں میں ایک منجھے ہوئے محقق کی طرح معتبر تاریخی کتابوں سے جو طویل اقتباسات دیے ہیں، اس سے ان کا تحقیقی جوہر کھلتا ہے۔ وہ اغلاط و تسامحات سے پاک متن لکھنے کے پابند مصنف تھے کہ وہی متن بعد والوں کے لیے حوالہ اور مرجع بن جاتا ہے۔ وہ کسی بھی بات یا خبر پر محض اعتقاد یا تقلید میں ایمان نہیں لاتے تھے، بلکہ اس کو تحقیق کو کڑی کسوٹی پر پرکھتے تھے۔ ایک بار جب مسٹر جناح نے ایک اخبار کے نمائندے کے سوالوں کا جواب دیتے ہوئے یہ کہا کہ ہندوستان ایک ملک نہیں۔ ہندوستان ایسا ملک ہے جس میں کئی قومیتیں آباد ہیں، ہمارا مطالبہ ہے کہ ہماری قوم کے لئے ایک مکمل آزاد ریاست پاکستان کے نام سے قائم کردی جائے۔ اور یہ کہ اگر ہندستان میں ڈھائی کروڑ مسلمان رہ جائیں گے، اس کا کوئی علاج نہیں۔ ایک متحدہ وفاق کی صورت میں مسلم صوبہ جات بھی جہاں مسلمان ستر فیصدا کثریت میں ہیں، ہندوؤں کے قبضۂ قدرت میں آجائیں گے، پاکستان میں ان کی حالت ضرور اچھی ہوگی۔ اس ستر فیصد والی بات کو مسترد کرتے ہوئے مولانا محمد میاں صاحب حاشیہ میں یہ محققانہ نوٹ لکھتے ہیں:

''ستر فیصدی کا تخیل غلط ہے۔ سینسس آف انڈیا ۱۹۴۱ء [۱۹۴۱ء] ص/۹۸ و ۹۹/حصہ اول ج ا/مرتبہ ایم۔ ڈبلیو۔ ایم۔ یائیس۔ سی۔ آئی۔ اے۔ سی۔ ایس۔

سینسس کمشنر آف انڈیا اور کتاب ۱۹۴۱ء کی مردم شماری پر جامع تبصرہ مصنفہ چودھری رحم علی صاحب ہاشمی کی تفصیلات کے بموجب ۱۰۷۰۰۴۷۸۳ر پاکستانی صوبجات (پنجاب بنگال سندھ۔ سرحد۔ بلوچستان۔ آسام) کی کل آبادی دس کروڑ ستر لاکھ چار ہزار سات سو تراسی ہوتی ہے۔ ان صوبجات میں مسلمانوں کی کل تعداد پانچ کروڑ اکیانوے لاکھ ایک ہزار دو سو سات ہے ۵۹۱۰۱۲۰۷ر اور بلا غیر مسلم آبادی کل تعداد چار کروڑ اناسی لاکھ تین ہزار پانچ سو چھہتر ہے ۴۷۹۰۳۵۷۶ لہٰذا مسلمان فیصدی ۵۵ اعشاریہ ۵ (تقریبا) ہوتے ہیں اور غیر مسلم ۴۴ اعشاریہ ۵ فیصدی۔ انہیں اعداد وشمار کے لحاظ سے وزارتی مشن نے دستور ساز اسمبلی میں مسلمانوں کو نشستیں دی ہیں، لہٰذا پاکستان میں مسلمانوں کو ستر فیصدی اور غیر مسلموں کو تیس فیصدی بیان کرنا ناعاقبت اندیشانہ خطرناک پروپیگنڈہ ہے۔'' (علماء حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے، ج:۲، ص: ۲۵۳)

تقسیم ہند کے بعد دہلی میں جو ہولناک فسادات ہوئے اس میں مسلمانوں کا ناقابل تلافی جانی اور مالی نقصان ہوا، ہر شخص کو اپنی جان پیاری تھی، نفسی نفسی کا قیامت جیسا منظر ہر طرف تھا، اس کا کتنا مؤثر اور حسب حال نقشہ مولانا نے کھینچا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے آنکھوں کی اسکرین پر یہ منظر نمودار ہو رہا ہو۔ جملے مختصر ہیں اور بات میں زور واثر ہے، جس میں مبالغہ کی صنعت بھی سما گئی ہے:

''تباہ شدہ انسان اپنے مکانات سے فرار ہوئے۔ ماں کو بچوں کی خبر نہ تھی باپ کے حواس باختہ تھے۔ بھائی بہن سے غافل تھا۔ ایسی صورت میں حجاب ونقاب کا تو سوال ہی کیا۔ گھروں سے نکلے۔ سڑک پر گولیوں اور چھروں نے استقبال کیا، کچھ زمین پر ڈھیر ہوگئے۔ کچھ گرتے پڑتے جامع مسجد پہنچے۔ جامع مسجد کا صحن پر ہوگیا تو پرانے قلعہ کا راستہ لیا۔ جامع مسجد سے پرانا قلعہ یا ہمایوں کا مقبرہ تقریبا تین میل ہے۔ راستہ قطعا غیر محفوظ تھا۔ مگر راستہ میں کوئی حملہ بھی نہیں ہوا۔ گویا منشاء یہ تھا کہ مکانات چھوڑیں اور پاکستان جانے کے لئے تیار ہو جائیں۔

''پرانے قلعہ میں ایک لاکھ سے زیادہ کا مجمع ہوگیا۔ وہیں پیشاب وہیں پاخانہ۔ گندگی، تعفن سے سانس لینا مشکل۔ پانی کے لئے صرف ایک نل، غذا بھی مشکل سے ملتی تھی۔ باہر نکلنے میں جان کا خطرہ۔ یہ پناہ گاہ خود مصیبت گاہ بن گئی۔ جو چند روز پہلے دولتمند تھے، یہاں بھوک اور پیاس سے جاں بلب تھے۔ جو سخت جان تھے وہ زندہ رہ گئے، جو ناتواں تھے چل بسے۔'' (علماء حق اوران کے مجاہدانہ کارنامے، ج:۲،ص:۴۲۷)

مولانا محمد میاں مدارس میں پڑھائی جانے والی عربی فارسی ؎ کے پروردہ تھے، اس لیے وہ ان زبانوں کی کوکھ سے جنم لینے والی مشترکہ اور مخلوط زبان اردو سے نہ صرف تحریر اور ذریعہ اظہار کی حد تک واقف تھے، بلکہ وہ اس کی مشترکہ تاریخی اقدار و روایات کا بھی گہرا شعور رکھتے تھے۔ ہندو مسلم ہمیشہ سے ہندستان میں مل جل کر رہتے آئے ہیں، مغلیہ دور اس حقیقت کا گواہ ہے۔ اردو اسی مشترکہ تعلق کا نتیجہ ہے۔ اس اشتراک کے نتیجے میں پیدا ہوانے والی اس زبان کا تاریخی اور حالیہ نقشہ کھینچتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اسی اشتراک واختلاط کا نتیجہ تھا کہ ہندومسلمانوں کی آبادیاں مشترک ہیں۔ بازار مشترک ہیں عام کاروبار زندگی مشترک ہے حتی کہ اس اشتراک نے ایک مشترک زبان کے ایجاد پر مجبور کیا اور اس تقرب سے اردو یا ''ہندوستانی'' زبان عالم وجود میں آئی۔'' (علماء حق اوران کے مجاہدانہ کارنامے ج:۲ص:۴٦٦)

اس مشترکہ تعلق کی وضاحت کرتے ہوئے تاریخ کے دریچہ میں بھی جھانکتے ہیں۔ اور یہ لکھتے ہیں کہ:

''اس مشترک زبان کے ایجاد میں جو خوشگوار تعلقات کے ترجمان کی حیثیت رکھتی ہے ہندوستان کے جلیل القدر شیخ یعنی حضرت سلطان المشائخ نظام الدین دہلوی (قدس اللہ سرہ العزیز) نے خاص حصہ لیا۔ چنانچہ آپ نے اپنے خاص احباب کی ایک جماعت بنائی اور اس کو ہدایت کی کہ ایسی زبان تیار کریں کہ ہندوستان کے رہنے والے ہندو اور باہر کے آئے ہوئے مسلمان اس کے ذریعہ لین دین اور دوسری

ضرورتوں کی بات چیت کر سکیں۔ اس کمیٹی کے ارکان نو تھے۔ ہندو، ہردیو، سنیل دیو، چیتل دیو، سنبھل دیو، اور پانچ مسلمان، امیر خسرو، خواجہ سید محمد، خواجہ حسن سنجری، خواجہ سید موسی اور خواجہ سید رفیع الدین ہارون۔

''امیر خسرو کی مشہور کتاب ''خالق باری'' اسی حسن تعلق کی یادگار ہے جو آج تک بچوں کو پڑھائی جاتی ہے برطانیہ کا دور حکومت سب سے پہلا دور تھا جس میں ''لڑاؤ اور حکومت کرو'' کی نا مبارک پالیسی اختیار کی گئی۔'' (علماء حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے، ج:۲، ص:۴۶۶)

تقسیم ملک سے بہت پہلے اردو ہندی تنازعہ کی بنیادی ڈال دی گئی تھی، اسی لیے گاندھی جی نے ہندستانی پرچار سبھا قائم کی تھی اور ایک نئی زبان ہندستانی کا پرچار کرنا شروع کر دیا تھا، جس میں اردو اور ہندی دونوں کی ترقی کے امکانات تھے۔ اردو ہندی کے تنازعہ نے کس قدر ہماری مشترکہ گنگا جمنی تہذیب کے جسم پر چرکہ لگایا، اس کو بیان کرتے ہوئے مولانا محمد میاں لکھتے ہیں:

''اردو ہندی کا قصہ چھیڑ کر ملی جلی خوشگوار تہذیب کے جگر پر نشتر لگایا گیا اور اس قسم کے مہلک اور تباہ کن مسائل کی زہر افشانی کو مسلسل جاری رکھنے اور اتحاد و اتفاق کی کوششوں کو پیہم شکست دینے کے لئے جدا گانہ انتخاب کا نرالا طریقہ جاری کر دیا گیا۔'' (علماء حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے، ج:۲، ص:۴۶۶)

مولانا محمد میاں ابتدا تا انتہا مکاتب و مدارس کے تعلیم یافتہ تھے، انھوں نے کالج یا عصری اداروں کا منہ بھی نہ دیکھا تھا، وہ ایک سیدھے سادے مولوی تھے، وہ خود ڈاکٹر یا پی ایچ ڈی ہولڈر نہیں تھے، مگر انھوں نے بہت سے پی ایچ ڈی کرنے والوں کی رہ نمائی کی، انھیں مواد فراہم کرایا۔ ماہر قانون داں ڈاکٹر سید طاہر محمود اپنا قصہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جب ہم اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے کے لیے مواد جمع کر رہے تھے اور اوقاف کے موضوعہ قوانین کی تاریخ کا ذاتی علم رکھنے والوں کی تلاش میں تھے، انھیں دنوں پرانی دہلی میں مقیم محمد میاں [مولانا سید محمد میاں] تک رسائی ہوئی اور کئی نشستوں

میں اپنے سوالات اور ان کے جوابات کو ہم نے ریکارڈ کیا اور وہ مستند مواد ہمارے تحقیقی کام کا اہم حصہ بنا۔'' (قصۂ درد سناتے ہیں، ص: ۱۴۰، ایم آر پبلی کیشنز، نئی دہلی)

مولانا میاں صاحب کے مطالعہ کا کئی رخ تھا۔ وہ جہاں دیگر کتابوں کا اسلامی نقطۂ نظر سے مطالعہ کرتے تھے اور اس کے لالہ وگل سے اپنی تحریروں کو سجاتے تھے، وہیں قرآن و حدیث جیسی مقدس کتابوں کو درس وعبرت اندوزی کے علاوہ زبان وادب کے نقطۂ نظر سے بھی پڑھتے تھے۔ یہ نقطۂ نظر دوسرے علما کے یہاں مفقود ہے۔ قرآن کی ادبی چاشنی بھی مولانا کے پیش نظر رہی ہے۔ محمد رسول اللہ نامی کتاب میں لکھتے ہیں:

''قرآن پاک جس طرح زمانۂ نزول میں معجزہ تھا، آج بھی معجزہ ہے۔ عربی ادب میں اس کو آج بھی وہ مقام حاصل ہے کہ بڑے بڑے ادیب اس کے فقروں اور جملوں سے اپنے کلام کو آراستہ کرتے ہیں، کسی بھی ادبی مضمون میں اس کی کوئی آیت آجاتی ہے تو پورے کلام میں جان ڈال دیتی ہے۔'' (محمد رسول اللہ ﷺ: قرآن اور تاریخ کے آئینے میں، ص: ۴۹)

مولانا محمد میاں صاحب ایک عمدہ مکتوب نگار بھی تھے۔ وہ خط کی زبان انتہائی سادہ اور رواں رکھتے تھے۔ وہی بے تکلف باتیں سادہ پیرایے میں، جس پر غالب کا یہ قول صادق آتا ہے کہ 'مراسلے کو مکالمہ بنا دیا ہے۔ مولانا نے آداب والقاب سے بھی اکثر اجتناب کیا ہے کہ یہ دل کی باتوں کے بیان میں حارج ہوتے ہیں۔ اپنے ایک شاگرد مولانا نور عالم خلیل امینی کو جب کہ وہ ندوہ میں نو تقرر استاد کی حیثیت سے تدریسی فرائض انجام دینے لگتے ہیں، خط لکھتے ہوئے جو کچھ لکھا ہے، اس سے ایسا محسوس نہیں ہوتا کہ مکتوب نگار کہیں اور ہے اور مکتوب الیہ کہیں اور بیٹھا ہے۔ دیکھیے:

''نامۂ عزیز باعث صد مسرت ہوا۔ اللہ تعالی مبارک فرمائے۔ عارض کو مستقل اور زہید کو کثیر بھی بنا دے گا۔ محنت شرط ہے اور ایسی لگن گویا آپ کو یہیں رہنا اور یہیں کام کرنا ہے۔ مطالعہ پوری توجہ سے کیجیے، طلبہ کو مانوس رکھیے، ہر ایک کا احترام کیجیے، کسی کی برائی نہ کیجیے، مطالعہ وسیع کیجیے، ہر مضمون خود حل کیجیے۔ البتہ ضرورت کے وقت

ارشادِ ربانی فاسئلوا اھل الذکر کی تعمیل کیجیے۔'' (پس مرگ زندہ، ص:۷۴)

مولانا محمد میاں صاحب ڈھیر ساری کتابوں کے مصنف تھے، رسائل و جرائد میں شائع ہونے والے مضامین و مقالات اس پر مستزاد ہیں، اگر ان کی تمام تحریروں کا ادبی پیمانے پر جائزہ لیا جائے، انھیں عام نثر کے طور پر نہیں، ادب کے طور پر پڑھا جائے اور ان کی تنقیدی دائرے میں تعیین قدر کی جائے تو اس سے مولانا کی شخصیت کا وہ ہیولا تیار ہو سکتا ہے، جس سے وہ اردو کے بہترین نثر نگاروں میں جگہ پا سکتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں نثر کے تمام لوازم و خصائص کی بو باس ملتی ہے۔ مگر افسوس یہ ہے کہ ان کی شخصیت پر تاثراتی مضامین تو لکھے گئے، مگر ان کی تحریروں کا اس زاویہ سے جائزہ نہیں لیا گیا۔ جب کہ وہ دلی کی ٹکسالی زبان لکھتے تھے، جو اس وقت کے شرفا کی زبان تھی۔ علاقائی بولی ٹھولی پر انھیں عبور حاصل تھا۔ اردو کے کلاسیکی شعر و ادب اور اردو زبان کی تاریخ و روایات پر ان کی نظر بہت گہری تھی۔ ان کا انداز تحریر منفرد تھا۔ ان کی نثر کا بیانیہ کسی معاصر یا پیش رو اہل قلم سے مستعار و مستفاد نہیں تھا۔ وہ خود اسی دوآبہ کے خطہ سے جنم لینے والے نثر نگار تھے، جہاں اردو زبان نے اپنی آنکھیں کھولی ہیں۔ انھوں نے ان جڑوں سے استفادہ کیا ہے، جو اردو کی بنیاد میں پیوست ہیں۔ مولانا نے اسلامی اور تعمیری ادب کی تعمیر و تشکیل میں اہم رول ادا کیا اور ترقی پسند و مابعد جدید نظریات سے الگ رہ کر ادب میں ان اقدار کی پرورش کی جن سے اسلامی تعمیری ادب کا پودا اگتا اور برگ و بار لاتا ہے۔ ان کی تحریروں میں اسلامی تعمیری ادب کی تمام خصوصیات جلوہ گر ہیں۔ اسلامی ادب کیا ہے، سید عروج احمد قادری لکھتے ہیں:

> ''اسلامی ادب ایک ایسا سدابہار گلشن ہے جو توحید کی زمین پر اگتا، وحی الٰہی کی پاکیزہ بارش سے سیراب ہوتا ہے اور آخرت کی لازوال خوشبو سے مہکتا ہے، اور غیر اسلامی ادب ایسا صحرائے خاردار ہے جو الحاد و شرک کی زمین پر پنپتا ہے، مادیت کے گدلے پانی سے پھیلتا ہے اور نفسانیت، عریانیت، فحاشی اور ہوا و ہوس کے بدبو سے وبال جان بنتا ہے۔''

مولانا محمد میاں صاحب کا بھی تصور ادب ونثر نگاری یہی کچھ تھا، جس کی پرورش و پرداخت میں اسلامی تصورات اور اخلاقی اقدار کا اہم رول تھا۔ اس کی کاشت اس زمین پر ہوئی تھی جو وحی الٰہی کی بارش سے شاداب اور تر وتازہ تھی اور جس میں جنات نعیم کی خوشبو رچی بسی تھی۔ ان کا عہد اردو کا عہد بہاراں تھا، کئی تحریری دھارے بہہ رہے تھے، مگر انھوں نے اپنا الگ طرز تحریر ایجاد کیا، جس کا سرا ترقی پسندوں یا جدیدیت کے پرستاروں سے نہیں، بلکہ اس صوفیائی سلسلے سے ملتا تھا، جس کا خون اردو کی رگوں میں بہتا ہے۔ وہی سنجیدہ علمی اسلوب اختیار کیا جس میں علم وتحقیق کی بات ہوتی تھی۔ ان کی تحریر، ان کے خطوط، ان کے خطبات اور شذرات پر بھی ادب کا سایہ پڑا ہے، مگر ان کے اور دوسرے ادبا کی تحریروں میں بس یہ فرق یہ ہے کہ انھوں نے ادب کی مصنوعی وردی نہیں پہنی ہے، بلکہ مولویانہ درویشانہ روش اختیار کی ہے جس میں اخلاق سوزی نہیں، اخلاق وکردار سازی کا عنصر ملتا ہے۔ انھوں نے بھی ادبی نثر لکھی مگر اس پر ادب کا عنوان چسپاں نہیں کیا، اس پر ادب کی ملمع کاری نہیں کی، بلکہ اس سے دین و مذہب کی تبلیغ کی اشاعت کا کام لیا، بھٹکے ہوئے آہو کو سوئے حرم لائے اور ان کے زنگ آلود قلب وعقیدہ کی صفائی کی۔ انھوں نے ایک درویش کی طرح اردو زبان کی خدمت کی، بساطی کی طرح ادب کی دکان نہیں لگائی اور زبان وادب اور انشاء وتحریر کو معاش کا ذریعہ نہیں بنایا۔ مگر مولانا محمد میاں اور ان جیسے دوسرے بوریہ نشیں علما کو زبان وادب کے دھارے سے دور رکھنے کی دانستہ کوشش کی گئی ہے۔ انھیں ادب میں وہ مقام نہیں دیا گیا جس کے وہ مستحق تھے۔ ملاعبت کرنے والے کی قدر ہوئی اور ریاضت کرنے والے کو حاشیہ میں بھی جگہ نہیں ملی۔ جنگ آزادی میں ان علما کی خدمات کا تو یہ ادبا بھی ذکر کرتے ہیں، مگر ان کی ادبی خدمات کو وہ نظر انداز کر دیتے ہیں۔ دیوبندی علما کی جدوجہد آزادی میں شرکت کا ذکر قرۃ العین حیدر نے بھی اپنے ناول 'کار جہاں دراز ہے' میں یوں کیا:

''بے شمار دیوبندی مولانا دین پرست انقلابی، جوشیلا قوم پرست، سر پہ کفن

باندھ جیل میں گھس گیا، پھانسی چڑھا، کابل تاشقند، ماسکو برلن، امریکہ فرار ہوا۔ یہاں اور وہاں بھوکوں مرا۔‘‘

دیوبندی علما کی اردو تقریروں کے اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے شاعر و محقق ڈاکٹر کمال احمد صدیقی لکھتے ہیں:

’’دارالعلوم دیوبند کے علماء کا اثر مذہب اور فرقہ کے دائرے سے سوا تھا۔ ان کے خیالات اتنے مؤثر اور فکر انگیز ہوتے تھے کہ ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی سب بڑے انہماک اور دلچسپی سے گھنٹوں ان کی تقریریں سنا کرتے تھے۔ مولانا حسین احمد مدنی، عطاء اللہ شاہ بخاری اور مولانا حبیب الرحمٰن وغیرہ کی تقریروں کی تاثیر کا آج اندازہ لگانا بھی مشکل ہے۔ کیا یہ بات کہی جاسکتی ہے زمیندار کے مدیر مولانا ظفر علی خاں نے ایک دور میں تحریکِ آزادی میں کسی سے کم کردار ادا کیا تھا؟‘‘

مدارس اور اردو اور فضلائے مدارس کی اردو خدمات کا سبھی اعتراف کرتے ہیں، مگر جب ان کو تنقید کی میزان پر تولنے کا وقت آتا ہے، تو سبھی کو سانپ سونگھ جاتا ہے۔ وہ مذہب اور غیر مذہب کی بحثوں میں الجھ جاتے ہیں۔ جب کہ اردو کے عناصر خمسہ مدارس کی پیداوار تھے۔ مدارس نے ہی اردو کے شجر کو سینچ کر تناور اور پھل دار بنایا ہے۔ مگر مدارس کی اردو خدمات کی تنقید و تعیین کے وقت ہمارے ناقدین و مؤرخین ڈنڈی ماری کا جرم کرتے ہیں۔ وہ اہل مدارس کی تحریروں کو تو چٹخارے لے کر پڑھتے ہیں، مگر انھیں ادیب و ناقد شاعر اور نثر نگار مشتہر کرنے میں تعصّبات و تحفظات کے حصار میں قید ہو جاتے ہیں۔ مولانا محمد میاں جیسا سادہ و منفرد نثر نگار جس کی نثر میں ادب کی چاشنی بھی تھی اور زبان کی لذت بھی، وہ بھی ہماری تعصب و تنگ نظری کی نذر ہو گیا اور ایک ایسے پایے کے نثر نگار و افسانہ نویس سے اردو کی تاریخ محروم ہو گئی، جس کی موجودگی سے لسانی نقشہ میں اردو زبان کا قد دراز ہو جاتا اور اردو کی تنگ دامنی و تہی دستی کا شکوہ بھی دور ہو جاتا۔

اے اہل ادب آؤ، یہ جاگیر سنبھالو

☆☆☆☆☆

حواشـــــــــی:

۱۔مسعود عزیزی ندوی کی تحقیق کو صحیح تسلیم کرلیا جائے تو مولانا میاں کی تصنیفات وتالیفات کی تعداد ۷۰ سے بھی زائد ہے۔ دیکھیے (تذکرہ مولانا سید محمد میاں، مسعود عزیزی ندوی، ص:۷۹) مزید اسی کتاب میں مولانا میاں کے فرزند حامد میاں کے حوالے سے ہے کہ ''تصانیف کی تعداد ستر یا اس سے زائد ہے، بہت سی کتابیں ناپید ہوچکی ہیں، کچھ وہ ہیں جو احقر کے نام سے شائع نہیں ہوئیں، کسی اور نام سے یا اداروں کی طرف سے شائع ہوئی ہیں''۔(ایضاً،ص:۸۴) مگر اس تعداد کو باضابطہ کتاب قرار دینے میں ذرا تامل ہے۔اس میں چند صفحاتی رسائل کو بھی شمار کرلیا گیا ہے، جس کو باضابطہ یک موضوعی کتاب کا درجہ دینا ذرا غیر محتاط رویہ ہوگا۔اس سلسلے میں مولانا محمد میاں نے ایک جگہ خود مولانا وحید الدین خان کو انٹرویو دیتے ہوئے یہ اعتراف کیا ہے:''میری مطبوعہ تصنیفات کی تعداد تقریباً ساٹھ ہے، کئی کتابیں تیار پڑی ہیں مگر ابھی وہ چھپ نہیں سکیں۔''(الجمعیۃ، ۸رمئی ۱۹۷۰ء)

۲مولانا سے شعر کے اندراج میں یہاں سہو ہوگیا ہے۔ پہلے حافظہ پر اعتماد کر کے اشعار کے رائج مصرعے لکھ دیے جایا کرتے تھے۔اصل شعر اس طرح ہے۔

مانگا کریں گے اب سے دعا ہجر یار کی
آخر تو دشمنی ہے اثر کو دعا کے ساتھ

۳گرچہ مولانا محمد میاں صاحب کا ایک طویل افسانہ 'کرشمۂ قدرت' بھی ملتا ہے، جو ماہ نامہ قاسم العلوم دیوبند میں دو قسطوں میں شائع ہوا تھا۔اس افسانہ کی بنت اور تعمیر میں کافی دقت نظری سے کام لیا گیا ہے۔ کردار بھی کم ہیں اور وحدت تاثر جو افسانہ کی بنیادی شرط ہے، اس کی جلوہ گری بھی نظر آتی ہے۔ابتدا تا انتہا ایک سسپنس رہتا ہے، جو افسانہ کو افسانہ بناتا ہے۔وہ بہتر افسانہ نگار بھی ہوسکتے تھے، مگر مروجہ افسانہ نویسی سے مولانا کے احتراز کی وجہ بہت صاف تھی۔اردو افسانہ کو اس وقت بھی مہمل گوئی اور باطل خیالات کا مجموعہ سمجھا تا تھا۔علامہ سید سلیمان ندوی نے جو کچھ لکھا تھا وہ بالکل صحیح تھا۔حالاں کہ اس وقت اردو افسانہ پریم چند وغیرہ کی کوششوں سے اردو ادب میں اپنی اہمیت منوا چکا تھا۔اردو افسانہ کے حوالہ سے سید سلیمان ندوی نے لکھا تھا:''ہمارے ملک میں افسانہ نویسی جس طرز کی جاری ہے، اسکے لئے نہ علم کی ضرورت ہے نہ مہارت انشاء کی، ہر وہ صاحب قلم جو دو انسانوں کی باتوں کو قید تحریر میں لانا جانتا ہو، وہ ہمارے ملک کا بڑا افسانہ نویس ہے، اس طرز تحریر میں نہ منطقی دلائل کی حاجت پڑتی ہے نہ فلسفیانہ نظریوں کی، نہ تاریخی

معلومات کی نہ ادبی نکتہ دانی کی، نہ مذہبی علوم کی، بلکہ صرف اتنا سلیقہ کافی ہے کہ وہ مبتذل خیالات، سوقیانہ تصورات اور عریاں جذبات کو نامانوس ترکیبوں اور مضحکہ انگیز فقروں میں ادا کر کے نوخیزوں کو بہلا اور نوجوانوں کو لہکا سکے.....کیا علم و دانش کے بعد اخلاق و آداب بھی اس طبقہ سے رخصت ہو چکا ہے۔''
(شذرات معارف، علامہ سید سلیمان ندوی، فروری، ۱۹۳۳ء)

۸؎ پہلے علم صرف عربی و فارسی میں منحصر ہوتا تھا۔ انھی زبانوں خصوصا فارسی میں دفتری کام بھی انجام پاتے تھے اور انھی زبانوں کے ماہرین کو علم وفن کا ماہر سمجھا اور مانا جاتا تھا، ہاں سرکاری ملازمتوں اور بڑے بڑے مناصب پر فائزوہ لوگ اکثر ہوتے تھے، جو انگریزی جانتے تھے۔ گویا علم وفن کا تعلق عربی فارسی سے تھا، انگریزی صرف ملازمت کے حصول کا زینہ تھی بس۔ مولانا حالی نے صحیح لکھا ہے: ''اگر چہ اس وقت قدیم دہلی کالج خوب رونق پر تھا مگر جس سوسائٹی میں مَیں نے نشوونما پائی تھی، وہاں علم صرف عربی اور فارسی زبان میں منحصر سمجھا تا تھا۔ انگریزی تعلیم کا خاص کر پانی پت میں اول تو کہیں ذکر ہی سننے میں نہیں آتا تھا اور اگر اس کی نسبت لوگوں کا کچھ خیال تھا تو صرف اس قدر کہ وہ سرکاری نوکری کا ایک ذریعہ ہے نہ یہ کہ اس سے کوئی علم حاصل ہوتا ہے بلکہ برخلاف اس کے انگریزی مدرسوں کو ہمارے علماء مجہلے (یعنی جہالت کی جگہ) کہتے تھے۔ دلی پہنچ کر جس مدرسے میں مجھ کو شب وروز رہنا پڑا وہاں سب مدرس اور طلبہ کالج کے تعلیم یافتہ لوگوں کو محض جاہل سمجھتے تھے۔ غرض کبھی بھول کر بھی انگریزی تعلیم کا خیال دل میں نہ گزرتا تھا۔ ڈیڑھ برس تک دلی میں رہنا ہوا، اس عرصے میں کبھی کالج کو جا کر آنکھ سے دیکھا تک نہیں اور نہ ان لوگوں سے (اس زمانے میں) کبھی ملنے کا اتفاق ہوا جو اس وقت کالج میں تعلیم پاتے تھے جیسے مولوی ذکاء اللہ، مولوی نذیر احمد، مولوی محمد حسین آزاد وغیرہ وغیرہ۔'' (غالب تنقید، جاوید رحمانی، ص: ۳۷-۳۶)

۹؎ مولانا محمد میاں کی تربیت میں ان عناصر کا کچھ ایسا دخل تھا کہ عصری اداروں یا حکومتی محکموں سے ملحق اداروں میں درس وتدریس سے ان کی طبیعت ابا کرتی تھی۔ وہ اس کو دارالعلوم اور اکابر دارالعلوم کے طور و طریق اور اصل واصول سے متصادم تصور کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ آرہ شاہ آباد، بہار کے مدرسہ حنفیہ سے صرف اس لیے الگ ہو گئے کہ اس کو سرکاری ایڈ ملتی تھی اور یہاں بہار یونی ورسٹی کے درجات فاضل وغیرہ کی تیاری بھی کرائی جاتی تھی۔ اگر وہ وہاں رہتے تو اپنی قابلیت واہلیت اور وسیع تعلقات کے سبب، بہار کی قدیم سرکاری درس گاہ مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ کے پرنسپل تک ہو جاتے۔ اپنی خودنوشت میں لکھتے ہیں: ''احقر نے تقریباً ساڑھے تین سال آرہ میں قیام کیا، اول اول کچھ مشکلات پیش آئیں، پھر نہ صرف

مدرسے کے حضرات بلکہ شہر کے بھی بہت سے حضرات احقر سے مانوس ہو گئے، صوبۂ بہار کے دوسرے اضلاع کے علما اور بزرگوں سے بھی کچھ تعارف ہو گیا؛ مگر احقر اس مدرسے سے خاطر برداشتہ رہا؛ کیوں کہ اس مدرسے کو سرکاری ایڈ ملتی تھی اور بہار یونی ورسٹی کے درجات فاضل وغیرہ کی تیاری بھی یہاں کرائی جاتی تھی، یہ دونوں باتیں دار العلوم دیوبند کے اصول کے خلاف تھیں، احقر کے اکابر جو دار العلوم کے بااثر و بارسوخ حضرات تھے، انھوں نے اگر چہ وقتی طور پر احقر کا انتخاب فرما دیا تھا اور اس میں شک نہیں کہ اگر احقر وہاں کچھ عرصے اور قیام کرتا تو ''شمس الہدیٰ'' پٹنہ میں پروفیسر ہو سکتا تھا اور یہ بھی ممکن تھا کہ پروفیسر ہونے کے بعد پرنسپل بھی ہو جاتا؛ کیوں کہ احقر کے تعلقات وسیع ہو گئے تھے اور وہاں پرنسپل شپ کے لیے کسی ڈگری کی ضرورت نہیں تھی، اس زمانے میں مولانا محمد سہول صاحبؒ پرنسپل تھے جو صرف دار العلوم دیوبند کے فاضل تھے اور دیوبند میں وغیرہ میں بااثر استاد رہ چکے تھے، ان کے پاس کوئی ڈگری تو کیا ہوتی، وہ بہ ظاہر انگریزی کے حروف سے بھی واقف نہ تھے، لیکن احقر کسی ایسے مدرسے کی خدمت کا خواہاں تھا، جو دار العلوم دیوبند کی طرح سرکاری امداد اور سرکاری اثرات سے پاک ہو۔''

(اشتات سوانح محمد میاں، ماہ نامہ دار العلوم، مئی ۱۹۷۶ء)

☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مولانا سید محمد میاںؒ کا تربیتی اسلوبِ نگارش
ان کی کتابوں کی روشنی میں

مولانا ضیاء الدین صاحب قاسمی ندوی خیرآبادی
استاذ دارالعلوم تحفیظ القرآن سکٹھی، مبارکپور اعظم گڈھ

سید الملت مولانا سید محمد میاں علیہ الرحمہ (۱۹۰۳ء۔۱۹۷۵ء) ان علماء ربانیین اور مؤرخین میں سے ایک ہیں جن کے ذکر خیر کے بغیر نہ جمعیۃ علماء ہند کی تاریخ مکمل ہوسکتی ہے اور نہ ہی تحریک آزادی میں اساسی کردار ادا کرنے والے مسلم رہنماؤں کی روداد مکمل کہی جاسکتی ہے۔ہم مولانا محمد میاں صاحب کی حیات وخدمات کا گہرائی سے جائزہ لیتے ہیں اور دوسرے بہت سارے مؤرخین، مصنفین اور علماء حق کی گراں قدر خدمات سے ان کا موازنہ کرتے ہیں تو بے ساختہ کہنا پڑتا ہے ع

بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری

مولانا ایک حساس اور دردمند دل رکھنے والے انسان تھے، ملت اسلامیہ ہند کے مستقبل کے تئیں مولانا بہت فکرمند رہتے تھے، ان کے پیش نظر ایک خاص بات یہ تھی کہ وہ کون سے طریقے اختیار کئے جائیں جن سے ہماری نسل نو دین کے سانچے میں ڈھل جائے اور سنت وشریعت سے اس کا تعلق ہمیشہ استوار رہے۔ایک جگہ لکھتے ہیں:

> آج کے بچے کل کے جوان ہوں گے اور مستقبل کی باگ ڈور ان کے ہاتھ میں ہوگی، انھیں کی قابلیت کے سانچے میں ملت کا مستقبل ڈھالا جائے گا، ہمارا فرض ہے کہ ہم اس سانچے کو زیادہ سے زیادہ موزوں اور وقت کے تقاضوں کے مطابق ترقی

پذیر بنائیں۔'' [طریقۂ تقریر اول ص:۲،۳]

مولانا کی تحریروں میں یہ فکرمندی اور تربیتی پہلو بہت ہی واضح اور نمایاں ہوکر سامنے آتا ہے اور اپنے قارئین کو دعوت فکر اور دعوت عمل دیتا ہے۔ اس مقالے میں ہم مولانا کی کتابوں میں موجود اسی تربیتی پہلو پر گفتگو کریں گے۔

میدان تصنیف و تالیف کے بے تاج بادشاہ:

لکھنا اور مسلسل تصنیف و تالیف میں مشغول رہنا گویا مولانا محمد میاں کی طبیعت ثانیہ تھی، لہٰذا جہاں جہاں بھی خدمات انجام دیں اور جس ماحول میں بھی رہے، لکھنے کا مشغلہ جاری رہا اور ان کی سیاسی، سماجی، تدریسی اور انتظامی سرگرمیاں ان کے قلم کی جولانی پر قدغن نہ لگاسکیں۔

مولانا محمد میاں صاحب کو اللہ رب العزت نے علوم مختلفہ کا بحر ناپیدا کنار بنایا تھا، وہ اگر حدیث و تفسیر پر کام کرنا چاہتے تو آج ان کے سیال قلم سے فن حدیث یا بخاری و ترمذی کی محقق شرح، یا قرآن مجید کی اعلی معیار کی تفسیر، فتویٰ نویسی کے رموز و اسرار اور فقہ حنفی پر شاہکار تصنیف طالبان علوم نبویہ اور معلمین و مدرسین کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوتی۔

تعمیر ملت ان کا مشن تھا:

تعمیر ملت ان کا مشن تھا، لہٰذا مولانا نے اس موضوع سے پیش نظر امت اسلامیہ کی اسلامی نہج پر تربیت اور مسلمانوں کی نئی نسل کے عقائد و افکار کی درستگی کو وقت کا تقاضہ اور آزاد ہندوستان میں مسلم اقلیت کے اسلامی تشخص کی بقا کو بنیادی مسئلہ بنالیا۔ مولانا کی تصانیف کا جائزہ لینے کے بعد میں بلاتردد کہہ سکتا ہوں کہ وہ ہند میں سرمایۂ ملت کے نگہبان اور ملت کے معمار تھے، ان پر اسلامی تربیت کا رنگ غالب تھا اور وہ نونہالانِ ملت کی کردار سازی، سیرت النبی، تاریخِ اسلام اور قرآن و سنت کے اصولوں کے تحت کام کرنے کے خواہاں ہی نہیں، عملاً کوشاں بھی تھے، اس ضمن میں حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی قدس سرہ کے قول کو دلیل راہ تصور کرتے تھے۔ مولانا محمد میاں صاحب اپنی کتاب ''دینی، تعلیمی تحریک اور دستور

العمل'' کے آغاز میں ص:۲، پر حضرت مدنیؒ کا قول نقل کرتے ہیں:

''دینی تعلیم اور اس کی اشاعت یوں تو مسلمانوں کے لیے ہر زمانے میں تمام ضروریات سے اعلیٰ تر سمجھی گئی ہے؛ مگر انڈین یونین بھارت میں وہ انتہائی درجہ کو پہنچ گئی ہے، سیکولر اسٹیٹ میں مسلمانوں کا مستقبل محفوظ رہ سکتا ہے تو صرف دینی مدارس کے زیادہ سے زیادہ اجرا اور ان کی ترقیات سے محفوظ رہ سکتا ہے''۔

یہی بات امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد نے فروری ۱۹۴۸ء کے مرکزی وصوبائی جمعیتوں کے ایک خاص اجتماع میں فرمائی تھی:

''مسلمان ایک مخصوص تہذیب وتمدن کے مالک ہیں، جو دوسری تہذیبوں سے ممتاز ہے، مسلمانوں کا حق ہے کہ وہ اپنی تہذیب وتمدن کو محفوظ رکھیں اور ترقی دیں''۔[ص:۴]

مولانا محمد میاں صاحب نے یہی فریضہ ادا کرنے میں اپنی عمر مستعار صرف کردی، اسلامی تہذیب کی حفاظت اور اسلامی تربیت کی اشاعت میں اپنا سارا علمی وفکری زور صرف کردیا۔ مولانا نے مسلم بچوں کی تعلیم وتربیت کو ہدف بنایا؛ کیوں کہ یہی بچے ہندوستانی مسلمانوں کا مستقبل تھے اور انھیں کے کندھوں پر کروڑوں مسلمانوں کے عقائد وافکار اور ایمان کی حفاظت، سیکولر ہندوستان میں اسلامی تعلیمات اور تہذیب کی صیانت کی عظیم تر ذمہ داری عائد ہونے والی تھی۔ جس طرح انگریزوں کی غلامی سے ہندوستان کو آزاد کرانا ایک دینی فریضہ مان کر علماءِ حق نے قید وبند اور دار ورسن کو قبول کیا تھا، اسی طرح بلکہ اس سے اہم فریضہ اپنی خستہ حالت، زار ونزار اقلیت کا داغ رکھنے والی، ہندو اکثریت کی آنکھوں میں خار بن جانے والی ملت اسلامیہ اور اس کی آئندہ نسل کی اسلامی تربیت کا سامان فراہم کرنا بھی تھا اور مولانا موصوف نے اس فریضے کی ادائیگی کو اپنا مشن بنالیا۔

مولانا محمد میاں صاحب نے دینی تعلیم رسائل ۱۲/حصے اور تاریخ اسلام ۳/حصے، جو کہ ادب الاطفال کا شاہکار ہیں، کے علاوہ چھوٹے بڑے متعدد کتابچے تصنیف فرمائے اور دارالعلوم دیوبند کے ترجمان ''ماہنامہ دارالعلوم'' کے اور ''الجمعیۃ'' جیسے بہت سے رسائل و مجلّات اور جرائد میں اس موضوع پر ہزاروں صفحات پر مشتمل مضامین بھی قلمبند فرمائے۔

ان کتابچوں کی زبان چھوٹی عمر کے نونہالان مسلم کی استعداد اور صلاحیت کے اعتبار سے حد درجہ آسان اور رواں رکھی گئی ہے؛ تاکہ الفاظ کی ثقالت کا بوجھ معصوم ذہنوں پر نہ پڑے اور وہ اصل موضوع اور اس کی غرض و غایت کو سہولت سے سمجھ سکیں؛ کیوں کہ مقصد ان کی تربیت ہے۔ نیز اپنے علمی معیار کے لحاظ سے تمام کتابچے اس پایہ کے ہیں کہ بڑی عمر کے افراد بھی استفادہ کر سکتے ہیں۔ ان مختصر مختصر دینی کتابوں اور مضامین کو ہم ادب الاطفال کا نام دے سکتے ہیں۔

نونہالان قوم کی تربیت پر خاص توجہ تھی:

ادب الاطفال یعنی بچوں کی ذہنی نشو ونما اور تربیت کو سامنے رکھ کر، ان کی نفسیات اور صلاحیت کو سمجھتے ہوئے آسان زبان میں کتابیں لکھنا، جو اُن کی دلچسپی کا سامان بھی ہوں اور پڑھنے میں لطف بھی محسوس ہو، اور بلاشبہ ہمارے مولانا محمد میاں صاحب بچوں اور نوجوانوں کی نفسیات اور صلاحیتوں کو بخوبی سمجھتے تھے۔ بچوں کی نفسیات اور ادب الاطفال یا نونہالانِ قوم کی تربیت میں گہرا رشتہ ہے، بچوں کی نفسیات ہی ادب الاطفال کو جنم دیتی ہے اور مولانا موصوف نے اس رشتہ کو اپنی کتابوں میں خوب نبھایا ہے۔

مولانا محمد میاں صاحب کا تربیتی اسلوب:

راقم الحروف مولانا کی متعدد موضوعات پر تحریر کردہ کتابوں اور مضامین میں سے کچھ کے اقتباسات سے یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ تعمیر ملت اس مردِ مجاہد اور دانشور مؤرخ، دور اندیش مفکر کا مشن تھا۔ ان کی تمام کتابوں میں تربیتی اسلوب و انداز غالب ہے، اور لب و لہجہ بھی تحریر کے فلسفیانہ انداز سے پاک ہے۔ ذیل میں ان کی سیرت النبی پر لکھی ایک کتاب کے مختلف جگہوں سے لیے گئے اقتباسات پیش خدمت ہیں:

کتاب کا نام: ''ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پاکیزہ زندگی کے پاکیزہ سبق اور اسلامی عقائد'' ناشر: کتابستان قاسم جان اسٹریٹ دہلی جدید ایڈیشن ۱۹۸۱ء

اندازِ تحریر:

''پیدائش: پیر کے دن صبح کے سہانے وقت ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور ہوا، ربیع الاول کی ۹ رتاریخ تھی اور اسی سال وہ واقعہ ہو چکا تھا کہ ملک حبش کے ایک ظالم گورنر نے مکہ معظّمہ پر چڑھائی کی تھی، اللہ تعالی نے اس کو اس کی فوج کو جو ہاتھیوں پر سوار تھی، ہلاک کر دیا تھا؛ اور اسی وجہ سے اس سال کا نام ''عام الفیل'' پڑ گیا تھا، (ہاتھیوں والا سال)

وطن: مکہ شہر آپ کا وطن تھا، جہاں خانہ کعبہ ہے جو ہم سے پچھّم کی طرف ہے، جہاں حاجی حج کرنے جاتے ہیں، یہیں آپ پیدا ہوئے۔

لڑکپن: تقریباً چار سال بعد پھر یہ موتی آغوشِ آمنہ میں، آنکھوں کو ٹھنڈک اور دل کو سرور پہنچانے لگا۔ کچھ دن نہ گزرے تھے کہ حضرت آمنہ اپنے رشتے داروں میں مدینہ گئیں، قدرت نے کہا: یہ موتی ہمارا ہے، ہم ہی اس کی حفاظت کریں گے؛ چنانچہ ایسا ہوا کہ واپس ہوتے وقت حضرت آمنہ کی وفات راستے میں ہی ہوگئی۔

سنِ شعور: چچا تو گیارہ، بارہ تھے؛ مگر ان سب میں ابو طالب کو زیادہ تعلق تھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ساتھ رہنے لگے، آٹھ نو برس کی عمر ہی کیا ہوتی ہے؛ مگر سنجیدگی گویا گھٹی میں پڑی تھی، نہ دنگا، نہ شرارت، نہ رونا، نہ چھینکنا، نہ ضد، نہ ہٹ۔ بچے دنگا کرتے، شرارت کرتے، شور مچاتے؛ مگر آپ ہمیشہ خاموش رہتے۔ کھاتے وقت بچے ضد کرتے؛ مگر آپ چپ چاپ ادب سے چچا کے ساتھ کھانا کھا لیتے۔ ہر وقت صاف ستھرے رہتے، بدن پاک، کپڑے صاف۔

بچے دنیا کے ہوتے ہیں؛ مگر اس بچے کی شان ہی نرالی تھی، آٹھ نو سال کے جی کو یہ فکر بھی ہوگئی کہ اپنا بوجھ چچا پر نہ ڈالیں؛ چنانچہ مزدوری پر بکریاں چرانی شروع کر دی، بارہ سال کی عمر ہوئی تو چچا کے سر ہوگئے کہ آپ کے ساتھ تجارت کے لیے ہم بھی شام جائیں گے۔ خدا نے شام کے سفر میں اپنی قدرت کے انوکھے کرشمے دکھائے، شام سے واپس ہوئے تو پھر اپنے کام میں لگ گئے۔''

مولانا نے لڑکپن اور سن شعور کی داستان سنانے کے بعد یہ سبق سکھایا ہے:

دیکھو! مصیبت کو نحوست مت سمجھو، یتیموں سے محبت کرو، بے وارثوں کی پرورش کرو، تمہیں کیا خبر کہ وہ کس بلندی پر پہنچیں گے، قدرت نے ان میں کیسے کیسے جوہر رکھے ہیں۔ دیکھو بچو! تم بھی شرارت مت کرو، بزرگوں کا ادب کرو، ہمیشہ تہذیب سے رہو، تھیٹر، سینما، ناچ گانا وغیرہ وغیرہ لغو اور بیہودہ کام ہیں، خدا کو بھلا دیتے ہیں، دل کو کالا کر دیتے ہیں، ان سے دین دنیا دونوں کی بربادی ہے، تم ان پر لعنت بھیجو، دل سے نفرت کرو، بے ہودہ اور لغو کاموں میں پڑنا مسلمان کا کام نہیں''۔

''ہمارے پیغمبر'' کا دوسرا حصہ اسلامی عقائد اور احکام سے متعلق ہے، سیرت اور عقائد اسلام کے باہمی ربط کو مولانا نے اپنے فطری انداز میں چند جملوں میں جوڑ دیا ہے، پڑھنے والوں کا ذہن کتاب کے آخری صفحہ تک سیرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منسلک رہے گا اور ان کو یہ یقین حاصل ہوگا کہ ہمارے عقائد وافکار کی درستگی کا محور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات ہیں اور آپ یہی احکام ومسائل پہنچانے کے لیے اور ان پر بندوں کو چلانے کے لیے بھیجے گئے ہیں۔

مولانا تحریر فرماتے ہیں:

ہمارے پیغمبر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات زندگی پڑھ چکے، اب وہ باتیں سمجھو اور یاد رکھو جن کی تعلیم آپ نے دی اور جن کو سکھانے اور بتانے کے لیے آپ کو رسول بنا کر بھیجا گیا۔ یہ عجیب بات ہے کہ ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری تعلیم کا خلاصہ ان دو لفظوں میں آ جاتا ہے: (۱) لا الٰہ الا اللہ (۲) محمد رسول اللہ

کلمہ طیبہ:

ان دونوں لفظوں کو ملا کر پڑھو: لا الہ الا اللہ، محمد رسول اللہ، اس کو کلمہ طیبہ کہتے ہیں اور اس کو کلمۂ اسلام بھی کہتے ہیں؛ کیوں کہ اسلام کا مدار ان ہی دونوں لفظوں کے ماننے پر ہے۔ [پیغمبر اسلام ص: ۸۳]

مولانا محمد میاں صاحب کا یہ اندازِ تحریر، ان کی عبقریت کا ثبوت ہے کہ وہ محدث،

فقیہ اور درجات علیا کے طلبہ کو درس دینے والے جب نونہالان قوم کی تعلیم وتربیت پر آتے ہیں تو ان ہی کی عمر کی سطح پر اتر کر، انھیں کی روزمرہ کی زبان میں، عقیدۂ اسلام کو اتنی کامیابی سے دل میں اتار دیتے ہیں، جس کے بعد کوئی اسلوب ہی نہیں ہے۔ معصوم عمروں کی ذہن سازی کے لیے یہ سہل نگاری اور اطفال کی نفسیات پر عبور مولانا محمد میاں کا امتیاز ہے، جو اُن کی ان تمام کتابوں میں جلوہ گر ہے، جو چھوٹی عمر کے بچوں کے لیے لکھی ہیں۔

مولانا نے عقائد اسلام اور احکام کا طریقہ اپنی کتاب ''تاریخ اسلام'' ہی کی طرح سوال وجواب کی شکل میں رکھا ہے۔ ''سوال وجواب'' دنیا کے مروجہ نصابہائے تعلیم میں ہر زبان میں بین الاقوامی پیمانے پر ترقی یافتہ ممالک میں رائج ہے، جس کو اب ہمارے ہندوستان کے دانشورانِ علم وفن نے اسکولوں میں استعمال کرنا شروع کیا ہے؛ مگر ہمارے سید الملت مولانا محمد میاں صاحب نے جب یہ اسلوب اختیار کیا تو ہندوستان کے مکاتب و مدارس اور سرکاری اسکولوں میں یہ طریقۂ تعلیم خال خال ملتا تھا، حالانکہ سوال وجواب کے ذریعہ تعلیم کا آئیڈیا عملی طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش فرمایا، جن کو رب العالمین نے معلمِ انسانیت بنا کر مبعوث فرمایا اور مکارم اخلاق کی تکمیل واتمام آپ کا مقصد حیات تھا: **إِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا.** [رواہ الدارمی] میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ **إنما بعثت لأتمم مكارم الأخلاق** بعض روایات میں ''**محاسن الأخلاق**'' آیا ہے اور کہیں **بعثت لأتمم حسن الأخلاق** [رواہ مالک واحمد] جب کہ مسلم شریف کی روایت کردہ مشہور حدیثِ جبرئیل جو کہ اسلامی عقائد کی تعلیم وتربیت کی اساس ہے، سوال وجواب پر مشتمل ہے۔ حضرت جبرئیل علیہ الصلاۃ والسلام آنخضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں انسانی شکل وصورت میں تشریف لاتے ہیں اور صحابہ کرام سے بھری مجلس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اسلام، ایمان اور احسان سے متعلق سوالات کرتے ہیں، جن کا جواب آپ دیتے ہیں تو صحابہ کرام اس رویے پر حیرت زدہ ہیں کہ آخر یہ کون آدمی ہے؟ جو سوال تو اس انداز سے کر رہا ہے گویا طالب علم ہے، پھر تصدیق کرتا ہے گویا عالم ہے؛ مگر پاسِ ادب سے خاموش تھے۔

آخر میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث کے راوی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو مخاطب کر کے فرمایا:

یا عمر! أتدري من السائل؟ قلت: اللہ ورسولہ أعلم، قال: فإنہ جبرئیل، أتاکم یعلمکم دینکم. [رواہ مسلم]

مولانا محمد میاں صاحب نے اپنے اسی انداز و اسلوب میں کتاب مذکور میں اللہ کے متعلق عقیدہ، نبی یا رسول، خدا کی کتاب، فرشتے، تقدیر اور صحابہ کرام کے متعلق ضروری عقیدے جیسے بنیادی امور کو سہل نگاری کے ساتھ بیان فرما دیا ہے۔ یعنی ایمانیات وعقائد کے طویل مباحث کو چند صفحات میں، بچوں کے سامنے رکھ دیا ہے، گویا ایمان مفصل **آمنت باللہ وملائکتہ ورسلہ وکتبہ والیوم الآخر والقدر خیرہ و شرہ من اللہ تعالیٰ** کی آسان تفسیر کم پڑھے لکھے مسلمانوں کے سامنے ہے۔

امام الانبیاء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شب وروز:

ماہنامہ دارالعلوم کے مئی ۱۹۷۳ء میں مولانا محمد میاں صاحب کا مضمون ''امام الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے معمولاتِ شب وروز'' شائع ہوا تھا، جس میں مضمون نگار نے خاص طور پر ''اسلامی تہذیب کے بنیادی اصول''، ''آداب اور دعائیں''، ''عمل اور تعلیم'' اور ''پاک زندگی کیسی ہوتی ہے؟'' کے ذیلی عناوین لگا کر مستند حوالوں، تفسیر وحدیث کی کتابوں سے استدلال کر کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کے شب وروز کو تربیتی اسلوب میں پیش کیا۔ زبان نہایت شستہ، شگفتہ اور رواں ہے؛ لیکن تعلیم وتربیت کا لہجہ غالب ہے، جو محمد میاں صاحب کی خصوصیت ہے۔ مولانا کو سیرت رسول سے والہانہ لگاؤ تھا؛ لہٰذا جب سیرت النبی پر لکھتے ہیں تو اندازِ نگارش میں محبت رسول پھوٹی پڑتی ہے۔

''شب وروز کے حالات ومعمولات اور ان کے آداب ودعائیں'' کے عنوان سے مضمون نگار تمہیدی کلمات میں لکھتے ہیں:

جو حالات ومعمولات ذیل میں بیان کیے جا رہے ہیں، ان کے متعلق بہت سی

دعائیں روایات میں وارد ہیں، حضرات محدثین نے ان کو ضخیم جلدوں میں جمع کیا ہے، ہم یہاں مختصر آداب اور صرف ایک ایک دعا پیش کر رہے ہیں، نمونہ اور مثال مقصود ہے، استیعاب کا نہ مقام ہے اور نہ مقصود۔ اللہ تعالیٰ ان نمونوں پر ہی عمل کی توفیق بخشے، یہ بھی غنیمت ہے۔

لقد کان لکم فی رسول اللہ أسوۃ حسنۃ اور ذکر اللہ سے متعلق متعدد آیات تحریر فرمانے کے بعد، مولانا کا تربیتی انداز نظر آنے لگتا ہے۔ تحریر فرماتے ہیں:

ان آیات کا تقاضہ صرف ان دعاؤں کے پڑھ لینے سے پورا نہیں ہوتا، جو مختلف حالات کے متعلق احادیث میں وارد ہوئی ہیں، جن کی تفصیل آگے آ رہی ہے؛ کیوں کہ آیات کا تقاضہ یہ ہے کہ اللہ کی یاد زیادہ سے زیادہ ہو اور ہر حالت میں ہو۔ سید الانبیاء رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی شان یہاں بھی نرالی ہے، وہ تمام اوراد و وظائف جو حضرات علمائے کرام اور مختلف سلسلوں کے مشائخ طریقت کی تعلیمات میں رائج ہیں، ان سب کا مصدر و مأخذ وہ سینہ مبارک ہے، جو گنجینۂ اسرار و معارف تھا۔ ''آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری'' [از نفس مضمون]

دو قسطوں پر مشتمل مضمون میں آپ ﷺ کے دن کے اعمال سے متعلق اور رات کے معمولات سے متعلق وہ تمام باتیں آ گئی ہیں، جن کو حرزِ جان بنانے والا کوئی بھی بندۂ مومن اپنے کو اسوۂ حسنہ کی روشنی میں سنوار سکتا ہے؛ کیوں کہ سیرت رسول کا مقصد ہی ہے فدا کارانِ رسالت کی اسلامی، محمدی خطوط پر تربیت کرنا اور انسان کامل بنانا۔ مولانا محمد میاں صاحب نے تعلیم و تربیت کے پیش نظر مختصر مختصر دعائیں اور حالات و معاملات پیش کر دیے ہیں۔

حیات مسلم از مہد تا لحد:

حضرت مولانا محمد میاں صاحب کا ایک اہم رسالہ ہے، جو اپنے نام ہی سے بتا رہا ہے کہ انسان کو پیدائش سے لے کر وفات تک کی زندگی کیسے گزارنی چاہیے؟ اس کی فہرست میں ۴۸؍ سے زیادہ عناوین شامل ہیں، جن میں ''سیدھا راستہ''، ''اہل سنت و جماعت''، ''بدعت''، ''فریضۂ تربیت اولاد کے متعلق''، ''اسلامی تقریبات''، ''سرپرستوں کے

فرائض''، ''نماز کی تعلیم اور تربیت''، ''نکاح اور ازدواجی زندگی''، ''زندگی کیا ہے؟''، ''زندگی ایک منصوبہ''، ''مقاصد نکاح''، ''کسب معاش''، ''تجارت اور تاجر''، ''صنعت وحرفت''، ''اکل حلال''، ''ماں باپ''، ''بھائی بہن اور عام رشتے دار''، ''پڑوس''، ''عام مسلمان'' اور ''عام انسان'' وغیرہ جیسے اہم موضوعات پر رہنمائی کی گئی ہے۔ مولانا کے تربیتی اسلوب کی جادوگری یہاں بھی جلوہ گر ہے۔

فریضۂ تربیت کے تحت رقم طراز ہیں:

''اسلام نے جس طرح موجودہ زندگی میں اپنی اور اپنے اہل وعیال کی ضرورتوں کا انتظام کرنا مسلمانوں کے لیے لازم اور فرض کیا ہے، اسی طرح یہ بھی فرض کیا ہے کہ مسلمان اپنی اور اپنے اہل وعیال کی اخروی زندگی کو درست کرنے کی بھی کوشش کریں اور اپنی پوری محنت، توجہ اور پوری جدوجہد اسی میں صرف کریں: يا أيها الذين آمنوا قوا أنفسكم وأهليكم نارًا وقودها الناس والحجارة اے ایمان والو! بچاؤ اپنی جانوں اور اپنے گھر والوں کو اس آگ سے جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں۔'' [ماخوذ از ص:۱۷]

اور سرپرستوں کو ان کے فرائضِ تربیت کی یاددہانی کراتے ہیں۔ حضرت مولانا نے حیات مسلم، عبادات، معاملات، معاشرت، عقائد، اذکار، نوافل وغیرہ ہر اہم پہلو کا احاطہ کیا ہے، جس کو مشعل راہ بنا کر ایک عام آدمی بھی اپنی زندگی کو آسانی سے شریعت مطہرہ کاملہ کے تحت گزار سکتا ہے۔

دین کامل الاسلام کی مختصر تصویر:

''دین کامل الاسلام کی مختصر تصویر قرآن وحدیث کے آئینے میں'' مولانا سید محمد میاں صاحب کی اہم کتابوں میں سے ایک ہے، جس کا احساس خود مصنف کتاب اپنی اس جامع تصنیف کے تعارف میں قارئین کو دلا رہے ہیں:

''زیر نظر کتاب تکمیل ہے اس خواہش کی، جس کا اظہار اب سے چند سال پہلے جنوبی افریقہ کے ایک مخیّر جناب یوسف ابراہیم مفتی صاحب نے کیا تھا کہ مختلف اخلاقی و

معاشرتی مسائل پر، اسلام کی رہنمائی کے لیے قرآنی آیات اور احادیث کا ایک مختصر مگر جامع مجموعہ مرتب کر دیا جائے، جو علم و سائنس کی مادی ترقیات مگر روحانی اور اخلاقی روشنی سے محروم، اس دور میں ایک مشعلِ راہ بن سکے اور ساتھ ہی اس کی افادیت کا دائرہ وسیع کرنے کے لیے اس کا انگریزی میں بھی ترجمہ کیا جائے۔ آں موصوف نے اس خواہش کا اظہار کر کے اس کام کی بنیاد ہی نہیں ڈالی؛ بلکہ مالی تعاون بھی کیا، جس سے کتابت و ترجمہ کے ابتدائی مراحل طے ہو سکے، طباعت کے لیے ان ہی کے ہم وطن جناب مولانا محمد اسماعیل نانا صاحب ''ناظم ٹرانسوال جنوبی افریقہ'' نے پوری ذمہ داری لی اور بحمد للہ اب یہ کتاب اردو اور انگریزی میں شائع کی جارہی ہے۔

کتاب کی افادیت اور جامعیت کا اندازہ فہرست مضامین پر ایک نظر ڈالنے سے ہوسکتا ہے، کوشش یہ کی گئی ہے کہ مختلف عناوین کے تحت پہلے ایک دو آیتوں کا ترجمہ پھر اس کے بعد اسی مفہوم کی احادیث پیش کی جائیں۔ آیات و احادیث کا ترجمہ لفظی نہیں؛ بلکہ ان کا مفہوم واضح کرنے کے لیے آسان اور عام فہم زبان استعمال کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کوشش کو شرف قبولیت عطا فرمائے اور معاونین حضرات کو دینی اور دنیاوی ترقیات سے نوازے اور ان کی خواہشات کی تکمیل فرمائے''۔ [از: محمد میاں]

اس تعارف کے بعد ہم یہی کہیں گے کہ ''**صاحب البيت أدرى بما فيه**'' لہٰذا مزید لکھنے کی حاجت نہیں محسوس ہوتی، اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ اسلامی نظام حیات اور دستور بندگی کی شاہکار ہے یہ کتاب! جہاں تک اسلوب تحریر کا معاملہ ہے تو چند اقتباسات ''مشتے نمونہ از خروارے'' کے طور پر درج ذیل ہیں:

توحید:

توحید باری تعالیٰ کے اثبات میں، عقلی و منطقی اندازِ استدلال میں تحریر کرتے ہیں:

اگر اس بہترین کارگاہ روز و شب اور بہترین کارخانۂ موت و حیات کا خالق اور صانع سب سے بڑا باکمال ہے تو وہ ایک ہی ہوگا اور بے نظیر و بے مثال ہوگا؛ کیوں کہ جس کے نظیر و ہمسر ہوں وہ سب سے باکمال نہیں ہوسکتا، سب سے اہم سب سے بالا وہی ہے

جو اپنی مثال نہ رکھتا ہو، جو انوکھا ہو، جو اکیلا ہو، جس کا کوئی ہم جنس نہ ہو، جس کا کوئی والد نہ ہو اور نہ وہ مولود ہو، اس کے کوئی بیوی بھی نہ ہوگی، کیوں کہ وہ کسی کی ذات کا ہے اور نہ کوئی اس کی ذات کا، بے محل اور بے جوڑ بیوی سے شوہر کی عزت بڑھتی؛ بلکہ اس کے لیے ذلت اور بدنامی کا باعث ہوتی ہے، اقتدار اور شرکت ان دونوں میں تضاد ہے، اقتدار کے لیے شرکت توہین ہے، اقتدار کا مطلب ہوتا ہے أنا و لا غیری یا ''ہم چوں من دیگرے نیست'' اور شرکت ہر قدم پر اس کی تردید کرتی ہے۔[از: نفس کتاب]

جیسا کہ بتا چکے ہیں کہ عام فہم زبان استعمال کی گئی ہے؛ اسی لیے آپ نے دیکھا کہ انتہائی مختلف فیہ مسئلہ توحید کے باب میں، اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے اثبات میں نہ کوئی اصطلاحی جملہ استعمال کیا گیا ہے اور نہ ہی ایسی زبان استعمال کی ہے، جو عام ذہن سے بلند سطح کی ہو؛ بلکہ اقتدار و شرکت کے تضاد کو اتنی سہل زبان میں سمجھا دیا ہے کہ ایک موٹی عقل کا آدمی بھی آسانی سے فرق کو سمجھ جائے۔ یہ ہے تعلیمی و تربیتی اسلوب!

اپنا انجام:

اس عنوان کے تحت باتیں مختلف پیراگراف (الف) (ب) (ج) میں تقسیم کر کے سمجھانے پر توجہ دی ہے اور ہر جز کا ایک دوسرے سے ربط بھی قائم ہے۔

(ب) اس کے ضمن میں کتنی اہم بات کہہ رہے ہیں:

''کون جانتا تھا کہ ہماری زبان سے جو لفظ نکلتے ہیں، ان کا وجود ہے اور یہ باقی رہتے ہیں۔ کسی کے ہاتھ چوم لیے، کسی کی آمد پر استقبال کے لیے کھڑے ہو گئے، کسی کو طمانچہ مار دیا، یہ سب ہاتھ پاؤں یا بدن کی حرکتیں ہیں، ختم ہو گیا ان کا کیا وجود؟ لیکن ریڈیو، ٹیلی ویژن نے ہمیں صرف بتایا نہیں بلکہ دکھا دیا کہ جو لفظ بھی زبان سے نکلتا ہے، وہ باقی رہتا ہے، ہر ایک کے عمل کا وجود ہے اور اس وجود کو بقا ہے۔

(ج) کیا اس وجود کی کوئی تاثیر بھی ہے؟ آپ نے کسی کی تعریف کی، کسی کو گالی دی، کسی کے ہاتھ چومے، کسی کے لیے کھڑے ہو گئے، کسی کو طمانچہ مارا، کیا ان کاموں کی

تاثیر نہیں؟ وہ تاثیر ختم ہو جاتی ہے؟ یا جس طرح عمل کا وجود باقی رہتا ہے، وہ تاثیر بھی باقی رہتی ہے؟

(د) کسی بھی مشکل ترین مسئلہ کو تعلیم و تربیت میں اس کے کئی اجزا کر کے ہر ہر جز کو مثال سے سمجھانا پھر سب کے باہمی ربط سے نتیجہ نکالنا ہی تربیتی اسلوب اور تعلیمی انداز ہے۔

مذکورہ بالا کتاب (دین کامل الاسلام) اسلامی بنیادی احکام و مسائل کا موسوعہ ہے اور یہی اسلوب و انداز ہے، جس کو سب سے مؤثر اسلوب کہا جاتا ہے۔ تعلیم و تربیت کے ماہرین کے نزدیک یہ پسندیدہ انداز ہے۔ روانی، سلاست، لطافت بھی باقی رہے اور دل پر مثبت اثرات بھی مرتب ہوتے جارہے ہیں۔ کتاب کتنی مدلل اور جامع ہے؟ اس کا اندازہ تو آپ پڑھنے کے بعد ہی کر پائیں گے، فہرست عناوین میں سے کچھ اہم عناوین اور اس کے تحت ذیلی عناوین بھی قائم کیا ہے، جیسے: (۱) اللہ پر ایمان، اس کا ذیلی عنوان ہے: وجود باری، توحید، صفات خداوندی۔ (۲) اپنا انجام، اس کے تحت ذیلی عنوانات ہیں: موجودہ گردوپیش، عمل اور تاثیر عمل، اخلاق کا وجود اور تاثیر۔ (۳) بن دیکھی مخلوق، اس کے تحت ذیلی عنوانات: فرشتے، دیوی، دیوتا، جنات اور شیطان۔ علی ہذا القیاس ہر اساسی عنوان کے تابع متعدد عنوانات ہیں، جن کی فہرست طویل ہے۔

اربعین: اسلامی تعلیمات کا گلدستہ:

حضرت مولانا محمد میاں نے رسول کائنات امام الانبیاء علیہ الصلاۃ والسلام کے فرمان پر عمل پیرا ہوتے ہوئے کہ آپ نے فرمایا: ''جو شخص چالیس حدیثیں میری امت کے لیے محفوظ کر دے، اللہ تعالیٰ اسے ایک عقلمند عالم کی حیثیت سے اٹھائے گا اور قیامت کے دن میں اس کا شفیع اور گواہ رہوں گا''۔

چالیس حدیثوں کا ایک حسین گلدستہ تیار کر کے ''اربعین''، یعنی اسلامی تعلیمات کا گلدستہ نام دیا ہے اور کتاب کے آغاز میں ایک بسیط مقدمہ بھی لکھا ہے، جس میں اولاد کی اسلامی تربیت پر والدین کی ذمہ داریوں پر جامع گفتگو کی ہے۔ مقدمہ کا آغاز ان الفاظ سے

کرتے ہیں:

اگر انسان مرنے کے بعد کوئی حقیقت رکھتا ہے، اگر اس کی زندگی اسی حد پر ختم نہیں ہوجاتی، جس کا نام موت ہے تو عقل و دانش کا تقاضا ہے کہ ہماری موجودہ زندگی ایسی ہونی چاہیے، جو مابعد الموت کی بہتری کے لیے بہتر بنیاد بن سکے، اچھے تخم کا پھل بھی اچھا ہوتا ہے، بشرطیکہ اس کی تربیت بھی اچھی ہو۔ اس دنیا میں اگر ہر ایک ترقی اور ہر ایک بہتری کے لیے کچھ ضابطے ہیں، تو مابعد الموت کی بہتری کے لیے بھی کچھ ضابطے اور قاعدے ہونے چاہیے۔

مولانا نے ''اربعین'' کے مقدمہ میں قرآن، حدیث اور نبی یا رسول کا ربط بھی ذکر کیا ہے اور قرآن اور حدیث کے درمیان فرق کو بھی سمجھایا ہے اور حدیث نبوی کو محفوظ رکھنے کا اہتمام کرنے والے صحابہ کرام اور تابعین کا تذکرہ بھی کیا ہے۔

آگے مولانا تحریر کرتے ہیں:

''تابعین کا یہ دور ختم نہیں ہوا تھا کہ احادیث کے باضابطہ محفوظ اور مرتب کرنے کا سلسلہ شروع ہو گیا، اس سلسلے نے کچھ عرصے کے بعد عام تحریک کی شکل اختیار کرلی۔'' [ص:۲۱]

اربعین کی نوعیت کے بارے میں رقم طراز ہیں:

یہ چالیس حدیثیں انسانی زندگی کے کسی ایک شعبہ مثلاً عبادت، تجارت یا مثلاً صنعت و حرفت یا مثلاً نماز، روزہ کے متعلق بھی ہوسکتی ہیں؛ لیکن یہ چالیس حدیثیں ایسی منتخب کی جائیں، جو انسانی زندگی کے مختلف گوشوں سے تعلق رکھتی ہوں، تو ظاہر ہے یہ مجموعہ اصلاح اور تبلیغ کے نقطۂ نظر سے زیادہ مفید اور زیادہ کار آمد ہوگا؛ اسی لیے چہل حدیث مرتب کرنے والے حضرات عموماً یہی کوشش کرتے ہیں کہ چہل حدیث کو یک رنگ نہ رکھا جائے؛ بلکہ اس کو رنگ برنگ پھولوں کا گلدستہ بنادیا جائے۔ آپ کے سامنے جو چہل حدیث کا مجموعہ پیش کیا جارہا ہے، وہ اسی رنگ برنگ پھولوں کا گلدستہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ان سب سے سبق لینے اور ان پر عمل کرنے کی توفیق بخشے، آمین۔

حدیث کے چند عنوانات: احتساب، سب سے پہلے اپنے آپ کو جانچو، دستور اساسی، ذمہ داری اور حدود ذمہ داری، ایمان اور اسلام، معیار اور کسوٹی، سنت اور بدعت، عمل: اس کی تاثیر اور جزا، وضو اور نماز، زکوۃ، روزہ، حج اور عمرہ، کسب حلال، دستکاری، کاشتکاری، انسانی بھائی چارہ، امداد باہمی، ایک دوسرے کا احترام، بغض وحسد اور کینہ جیسے عنوانات سے مطابقت رکھنے والی احادیث اس مجموعے میں شامل ہیں۔ مقصد اسلامی فکر کے ساتھ ذہن سازی اور تربیت کرنا ہے؛ تاکہ دنیاوی اور اخروی زندگی دونوں کامیاب بنائی جاسکے۔

اسی طرح مولانا محمد میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مسنون دعاؤں کا مجموعہ اور اسلامی تقریبات، خطبۂ مسنونہ، طریقۂ تقریر، روزہ، زکاۃ وغیرہ اہم کتابیں تعلیم و تربیت، اصلاح معاشرہ اور تعمیر ملت کے لیے لکھی ہیں۔ طریقۂ تقریر حصہ اول میں جو باتیں اساتذۂ مدارس سے خطاب کے تحت لکھیں، وہ پڑھنے کی چیز ہے۔ فرماتے ہیں:

''آج کے بچے کل کے جوان ہوں گے اور مستقبل کی باگ ڈور ان کے ہاتھ میں ہوگی، انھیں کی قابلیت کے سانچے میں ملت کا مستقبل ڈھالا جائے گا۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم اس سانچے کو زیادہ سے زیادہ موزوں اور وقت کے تقاضوں کے مطابق ترقی پذیر بنائیں۔''
[طریقۂ تقریر اول ص: ۲،۳]

اختتامیہ:

مولانا محمد میاں صاحب کے تربیتی اسلوب نگارش کو عیاں کرنے کے لیے ان متعدد کتابوں کے اقتباسات مثال کے طور پر پیش کرنے کا مقصد یہی ہے کہ ہم اس عبقری شخصیت کے حامل، امت کے فردِ فرید کے فکر ونظر کو سمجھ سکیں کہ تعمیر ملت کا کیسا درد اور جذبہ ان کے اندر تھا! جو ان کو مسلسل لکھنے پر آمادہ رکھتا تھا، اور ان تحریروں سے نہ جانے امت کے کتنے نونہالوں نے اپنی سینوں میں دین وایمان کی شمعیں روشن کی ہوں گی۔

فجزاه الله عنا وعن جميع المسلمين خير الجزاء ورحمه رحمة واسعة

حضرت مولانا سید محمد میاں دیوبندیؒ
بہ حیثیت سوانح نگار

مفتی اشتیاق احمد قاسمی مدرس دارالعلوم دیوبند

غیر افسانوی ادب میں ''سوانح'' پسندیدہ صنف ہے، کسی بھی فرد کی پیدائش سے موت تک کے خارجی اور داخلی حالات جامعیت کے ساتھ اس صنف میں بیان کیے جاتے ہیں، اس میں افکار وافعال وقت اور زمانے کی صراحت کے ساتھ محفوظ ہوتے ہیں، سوانح کے ذریعہ انسان کی چلتی پھرتی متحرک تصویر مصروفِ عمل نظر آتی ہے۔ سوانح کے ذریعے صاحبِ سوانح کی سیرت، شخصیت اور سرگزشت کے تمام پہلو سامنے آجاتے ہیں، سوانح میں صاحبِ سوانح کی زندگی کے ساتھ اس کے گرد وپیش کی تاریخ، تہذیب اور معاشرت بھی سوانح کا حصہ بن جاتی ہیں۔ لکھنے پڑھنے کے رواج سے پہلے سینہ بہ سینہ زبانی حالات بیان ہوتے تھے، اس میں افسانویت کا رنگ چڑھ جاتا تھا۔ اٹھارہویں صدی میں سوانح نگاری میں پختگی آئی، اسلام کے آنے کے بعد سب سے پہلے اس فن کی تدوین پر حضرت عمرؓ نے توجہ دی، امام زُہری کی ''مغازی'' سامنے آئی۔ اردو زبان میں انیسویں صدی کی آٹھویں دہائی میں سوانح عمری لکھنے کی روایت شروع ہوئی۔ دارالعلوم دیوبند کے اوّلین صدرالمدرسین مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ نے ۱۸۸۰ء/ ۱۲۹۷ھ میں مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کا خاکہ لکھا، یہ خاکہ ''خاکہ نگاری'' کی اوّلین مثال بن گیا، اس کے بعد اردو میں دوسری سوانحی نگارشات، تذکرہ، خاکہ اور سوانح عمریوں کی شکل میں سامنے آئیں۔ سوانح نگاری میں دوسرے اہلِ

قلم کی طرح علمائے دیوبند کی نگارشات بھی کتب خانوں کی زینت ہیں؛ مگر افسوس کہ تاریخِ ادب میں ان کا ذکر اس طرح نہیں کیا گیا، جس کے وہ مستحق ہیں۔

حضرت مولانا سید محمد میاں دیوبندیؒ علمائے دیوبند میں عظیم ترین قلم کار کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں، تاریخ نویسی اور سوانح نگاری میں ان کا مقام ومرتبہ بہت اونچا ہے۔ موصوف علم وعمل اور فضل وکمال کی زمین دیوبند سے تعلق رکھتے ہیں، ۱۲/ رجب المرجب ۱۳۲۱ھ مطابق ۴/ اکتوبر ۱۹۰۳ء کو ضلع: بلند شہر میں پیدا ہوئے جہاں آپ کے والد ماجد سید منظور محمد محکمۂ نہر میں ملازم تھے۔

ابتدائی تعلیم مظفر نگر میں حاصل کی، فارسی سے فضیلت تک تیرہ سال (۱۳۳۱ھ/ ۱۹۱۲ء-۱۳۴۳ھ/ ۱۹۲۵ء) دارالعلوم دیوبند میں پڑھا۔ شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علی امروہویؒ، علامہ ابراہیم بلیاویؒ اور علامہ انور شاہ کشمیریؒ سے حدیث شریف پڑھنے کا شرف حاصل کیا۔ حضرت شیخ الادب کے مشورہ سے فراغت کے بعد ۱۹۲۶ء/ ۱۳۴۵ھ میں بہار کے مدرسہ حنیفہ آرا، شاہ آباد میں تدریسی خدمات پر مامور ہوئے۔ چوں کہ مدرسہ کو سرکاری تعاون ملتا تھا؛ اس لیے چھوڑ دیا، اس کے بعد مدرسہ شاہی مراد آباد میں مدرس ہوئے، علیا کی کتابیں پڑھائیں۔

۱۹۲۹ء/ ۱۳۴۸ھ میں جب جمعیۃ علماء ہند نے تحریکِ آزادی اور سِول نافرمانی شروع کی تو مولانا نے جمعیۃ کا ساتھ دیا، متعدد بار جیل جانے کی نوبت آئی، پھر ۱۹۴۵ء/ ۱۳۶۵ھ میں جمعیۃ علماء ہند کے ناظم کی حیثیت سے دہلی میں قیام فرمایا۔ جمعیۃ میں آپ کی خدمات آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہیں۔ بھاگل پور اور بھوپال کے فساد کے موقع سے بھی آپ کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔

۱۹۶۳ء/ ۱۳۸۳ھ میں جمعیۃ علماء ہند کی نظامت سے دست بردار ہوکر دوبارہ درس وتدریس کا سلسلہ شروع فرمایا؛ چناں چہ مدرسہ امینیہ کشمیری گیٹ دلی میں حدیث شریف پڑھانے لگے اور دمِ واپسیں تک صدارت افتاء اور مشیخیتِ حدیث کا سہرہ آپ کے سر رہا۔

موصوف کی بعض کتابیں نصاب میں شامل ہیں، مثلاً: ''دینی تعلیم کے رسائل'' کے بارہ حصے، تاریخ اسلام، ہمارے پیغمبر اور روزہ وزکوٰۃ اور مشکوٰۃ الآثار ومصباح الابرابر۔ آخر الذکر کتاب دارالعلوم دیوبند کے نصاب سوم عربی میں داخل ہے۔ الحمدللہ ناچیز کو اس کی تدریس کا شرف حاصل ہے۔

''سیرت محمد رسول اللہؐ''، ''حیات شیخ الاسلام'' اور ''اسیران مالٹا'' وغیرہ کتابوں کو تاریخی مراجع کی حیثیت حاصل ہے، تاریخ اور اس کے تجزیہ وتقابل پر ان کا قلم بھی خوب چلتا تھا۔ ''تحریک شیخ الہندؒ''، ''عہدِ زریں'' (دوجلدیں) ''جمہوریت اپنے آئینے میں''، ''صالح جمہوریت اور تعمیرِ جمہوریت''، آنے والے انقلاب کی تصویر'' اور ''سیاسی واقتصادی مسائل اور اسلامی تعلیمات واشارات'' ان سب کے مطالعہ سے کوئی مؤرخ متأثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔

فقہ میں ''نورالایضاح کی شرح نورالاصباح'' بہت عمدہ ہے، مقالہ نگار نے دارالعلوم دیوبند میں معین مدرسی کے زمانے میں اس سے استفادہ کیا ہے۔

تعلیم وتدریس کے اصول وضوابط پر اساتذہ کے لیے ایک بڑی قیمتی کتاب تصنیف فرمائی، اس کا نام ہے: ''مسئلہ تعلیم اور طریقۂ تعلیم''۔

خطرناک نعرے اور جمعیت علماء ہند کا صراط مستقیم، اسلام اور انسان کی حفاظت و عزت، ہندوستان شاہانِ مغلیہ کے عہد میں'' ''مختصر تذکرۂ خدماتِ جمعیۃ علماء ہند'' دین کامل، حیاتِ مسلم، چاند تارے اور آسمان، ہماری اور ہمارے وطن کی حیثیت اور ترکِ وطن کا شرعی حکم، پانی پت اور بزرگانِ پانی پت، یہ سب مولانا دیوبندی کی اہم ترین تصانیف ہیں۔ آپ کی سیاسی اور تصنیفی خدمات ہمیشہ یاد رہیں گی۔

۱۶/شوال المکرّم ۱۳۹۵ھ مطابق ۲۲/اکتوبر ۱۹۷۵ء بہ روز چہارشنبہ چوہتر سال کی عمر میں آپ کی وفات ہوئی، دہلی میں تدفین عمل میں آئی [1]۔

حضرت مولانا کی سوانحی تصانیف میں چند تصانیف نمایاں حیثیت کی حامل ہیں:

۱-سیرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات والا صفات پر بہت لکھا گیا، لکھا جا رہا ہے اور لکھا جاتا رہے گا۔ قرآن پاک کے بعد سیرت ہی ایسا دریا ہے، جس کا کوئی کنارہ نہیں، اس کی تہ کا کوئی اندازہ نہیں، ''لَاتَنْقَضِیْ عجائبُہٗ '' کے شواہد صرف انھیں دونوں موضوع میں ملتے ہیں۔ حضرت موانا سید محمد میاں دیوبندیؒ نے سوانح نبوی پر قلم اٹھایا تو بہترین تصنیف سامنے آئی، اس میں مطالعۂ سیرت کا نچوڑ پیش فرمایا۔ اس کا امتیاز یہ ہے کہ اس میں سیرت نبوی کے تبلیغی اور اخلاقی پہلو کو موضوعِ بحث بنایا گیا ہے، اسی سے متعلق مواد پیش فرمائے ہیں۔ اندازِ بیان کی ندرت اور حوالہ جات کی قطعیت نے کتاب کے حسن واعتماد میں خوب اضافہ کیا ہے۔

یہی وہ تصنیف ہ جس کو خود مصنفؒ اپنی ساری تصانیف پر مقدم خیال کرتے تھے اور اس کو ''اپنی زندگی کا شاہ کار'' کہا کرتے تھے۔

۲-علمائے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے

یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے: پہلے حصے میں ۱۸۵۷ء کے بعد سے قیامِ دارالعلوم دیوبند اور اس کے بعد کے حالات درج ہیں۔ سب سے پہلے ہندوستان کی حالت، ہندوستانی باشندوں کے بنیادی مزاج ومذاق پر گفتگو ہے، خصوصاً مسلمانوں کے دینی احوال اور ان کے مجاہدانہ طبیعت کو حوالہ جات سے ثابت کیا ہے، پھر دین کی حفاظت وصیانت، دارالعلوم دیوبند کا پس منظر، خاندان ولی اللہی کی جانشینی پر گفتگو کی ہے، پھر دارالعلوم دیوبند کے اوّلین بزرگان کی حیات اور مختصر خدمات کو بیان کیا ہے، مثلاً بانی دارالعلوم دیوبند حضرت حاجی سید عابد حسینؒ، مولوی مہتاب علی، شیخ نہال احمد، شیخ ذوالفقار علی، مولانا محمد قاسم نانوتوی اور ان کے لائق وفائق شاگرد حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ وغیرہ، حضرات کی زندگی اور ان کی خدمات کو قدرے اختصار سے بیان فرمایا ہے۔

بلا تکلف یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ کتاب سوانح کم اور تاریخ زیادہ کی حکایت کرتی ہے،

بات جو بھی پیش کی گئی ہے اس کے مآخذ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

اس کا دوسرا حصہ جنگ عظیم دوم سے آزادی ہند تک کے احوال پر مشتمل ہے۔یعنی ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۷ء تک کی تاریخ اس میں رقم کی گئی ہے۔اس درمیان جن علمائے کرام نے وطن عزیز کی حفاظت میں حصہ لیا، ان کے حالات بھی درج ہیں، خاص طور پر شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ اور جمعیۃ علماء ہند کی خدمات کا تفصیل سے ذکر ہے۔اس میں بہت سی باتیں موصوف کی مشاہداتی ہیں اور بہت سے مندرجات کو حوالوں سے نقل فرمایا ہے۔

۳-اسیرانِ مالٹا

پانچ شخصیات جو مالٹا کی جیل میں رہیں، ان کی سوانحی اور قید و بند کی زندگی کے احوال اس میں درج ہیں۔یعنی حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ، حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ، مولانا عزیر گل، مولانا وحید احمد مدنیؒ اور حضرت حکیم نصرت حسین۔ان پانچوں حضرات میں اوّلین دو شخصیات پر تو خوب لکھا گیا؛ مگر بقیہ تین شخصیات پر دوسری کتابوں میں مواد بہت کم ہے۔

مولانا سید محمد میاں صاحبؒ کی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے سب کے احوال کو قلم بند فرما کر ان کے ذکر کو دوام کا جامہ پہنا دیا۔راقم حروف کا خیال ہے کہ اس کا زیادہ تر مواد حضرت مولانا سید اصغر حسین میاں صاحب رحمہ اللہ کی کتاب ''حیاتِ شیخ الہند'' اور ''نقشِ حیات'' (خود نوشت حضرت مدنی) سے لیا گیا ہے، ان کے علاوہ چند دیگر کتابوں کے حوالے بھی نظر آتے ہیں، مثلاً: مکتوباتِ شیخ الاسلام، سفر نامۂ اسیرِ مالٹا، پیغامِ آزاد و مدنی، سوانحِ قاسمی، کابل میں سات سال، روح روشن مستقبل وغیرہ۔

۴-علمائے ہند کا شاندار ماضی

یہ ان کی مایہ ناز تصنیف ہے، اس میں علمائے ہند کے کارناموں کو بیان کیا ہے۔ اس سے انگریزی حکومت کو بہت غصہ آیا، کتاب ضبط کر لی گئی اور مصنفؒ کو جیل میں ڈال دیا

گیا، پھر چند دنوں کے بعد رہا ہوئے تو مزید حوصلہ بڑھا اور اگلی کتاب ''علمائے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے'' کے نام سے دو جلدوں میں تصنیف فرمائی۔ غرض یہ کہ مذکورہ بالا کتاب چار جلدوں میں مکمل ہوئی۔ حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانیؒ سے بات شروع کی اور ہندوستان کی آزادی پر لاکر ختم کی ہے۔ اس درمیان کے تقریباً سارے اہم ترین کارنامے اس میں شامل ہوگئے ہیں۔ ہندوستان کے تین مجددین کے کارناموں کو تفصیل سے لکھا گیا ہے: پہلے مجدد الف ثانی، پھر حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور حضرت شاہ محمد اسماعیل شہیدؒ اور ان کے معاصرین کے علمی اور سیاسی کارناموں کو ان میں سمیٹا گیا ہے۔

پہلی جلد

اس میں حضرت مجدد الف ثانیؒ اور ان کے معاصرین، خلفاء، خلفائے خلفاء، سلطنت مغلیہ کے چار تاج داروں (اکبر، جہاں گیر، شاہ جہاں اور اورنگ زیب) کے حالات وواقعات کو قلم بند کیا گیا ہے۔ اس درمیان کی سیاسی، معاشی ماحول میں علمائے امت کی مجاہدانہ اصلاحی سرگرمیوں اور ان کے نتائج پر تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔

تصنیف کا مقصد بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ایک ناکارہ وسرگرداں دیدہ ریزی اور دل سوزی سے ہزار ہا اوراق کو پلٹ کر ایک مجموعہ مرتب کیا ہے...... التجا ہے کہ
>
> ہم نے اپنے مقدس اکابر کو زُہد، تقشّف، چلہ کشی، شب بیداری، سُبحہ خوانی، سجدہ ریزی کے چشمہ سے دیکھا تو بہت جلیل القدر اور عظیم الشان نظر آئے، آیئے اب مکہ کی مظلومیت، طائف کی مقہوریت، ہجرت وطن، ترکِ اقارب، غار ثور کی روپوشی، بدر کی نصرت، اُحد کی شہادت، فتح مکہ کی مسرت، حُنین وثقیف کی سطوت، تبوک کی شوکت وغیرہ وغیرہ سُنن جہاد وسیاست کے چلمن سے نظر ڈالیں، کیسے نظر آتے ہیں؟ ہمارا حال ماضی کا ثمرہ اور مستقبل کا سنگِ بنیاد ہے۔ آیئے تاریخ ماضی سے اپنے مستقبل کے لیے کچھ سبق حاصل کریں!''۔ (۲)

حضرت مجدد الف ثانی کے اوصاف حمیدہ، حلیہ، اتباعِ سنت اور اشاعتِ اسلام کے جذبات کو بڑے اچھے انداز میں بیان فرمایا ہے، علمائے سوء اور صوفیائے خام کا بھی ذکر ہے جنھوں نے حضرت مجددؒ کو دربار میں سجدہ کرنے کا حکم صادر کروایا اور حکمِ عدولی کی سزا کے طور پر جیل کی راہ دکھائی؛ مگر حضرت نے جیل میں بھی اشاعتِ اسلام کا کام جاری رکھا، سارے بدمعاش نیک صفت ہوگئے، رہائی ملی تو بادشاہ نے فوج میں اپنے ساتھ رہنے کا حکم دیا۔ بادشاہ بھی متأثر ہوا اور حضرت سے معافی مانگی اور مکمل طور پر رہائی دے دی، پھر حضرت نے دربار سے قریب لوگوں سے رابطہ کیا، بالآخر اکبری فتنہ ختم ہوگیا۔ ان کی ساری تفصیلات ''الفرقان''، مجدد نمبر کے تنقیدی تجزیہ کے ضمن میں لکھی گئی ہیں۔

اسی جلد میں ''تحریکِ مہدویت'' کا بھی ذکر ہے۔ سید محمد جون پوری نے مہدی ہونے کا دعویٰ کیا، اس کی ابتدائی حالت اچھی تھی، اندازِ خطابت پُرکشش تھا، اس سے عبداللہ نیازی اور شیخ علائی بھی متأثر ہوئے۔

حضرت مجدد الف ثانی کا زمانہ ۱۰۰۰ھ/ ۱۵۹۱ء سے شروع ہوا، اس کے بعد تیس سال تک جن اہلِ علم نے ان کے ساتھ رہ کر خدمات انجام دیں، ان کی تعداد دوسو سے زائد ہے، ان سب کے احوال ذکر نہیں کیے گیے ہیں، جن کا تعلق ہندوستان کی سیاست سے رہا، یا کم از کم درس وتدریس کے ذریعہ سے اشاعتِ علم اور اصلاحِ خلق کی کوشش کی ہے۔

ان میں مشہور فقیہ ملاجیونؒ بھی ہیں، جنھوں نے عالم گیر اور ان کے صاحب زادے شاہ عالم کو پڑھایا۔ ان کی کتاب ''نورالانوار'' دارالعلوم دیوبند اور دیگر مدارس کے نصاب میں داخل نصاب ہے۔ مقالہ نگار کو بھی بارہا اس کے پڑھانے کا شرف حاصل ہوا ہے۔ آیاتِ احکام کی تفسیر ''تفسیراتِ احمدیہ'' کے نام سے انھوں نے لکھی، یہ بھی بڑی مقبول ہوئی۔

اس میں ''فتاویٰ عالم گیری'' کا بھی ذکر ہے کہ اورنگ زیب عالم گیرؒ نے ملک بھر کے بڑے بڑے فقہائے کرام کو جمع فرمایا تھا، ان سب کا نگراں ''ملا نظام الدین'' کو بنایا،

دو لاکھ روپے اس کی تدوین میں صرف ہوئے، خود بھی ایک دوصفحہ روزانہ دیکھتے تھے، موصوف متقی و پرہیزگار تھے، اپنے ہاتھ سے قرآن کریم کی کتابت فرماتے تھے، ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا قرآنِ پاک کا چوبیسواں پارہ دارالعلوم دیوبند کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ مقالہ نگار نے بارہا اس کا مشاہدہ کیا ہے۔

''علماء ہند کا شان دار ماضی'' کی پہلی جلد کے تیار کرنے میں موصوف نے بیالیس مآخذ سے استفادہ کیا ہے، ان سب کی تفصیلات فہرستِ مضامین سے پہلے موجود ہے، طوالت کے خوف سے اُن کو نقل نہیں کیا جاتا ہے۔

دوسری جلد

دوسری جلد میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے سیاسی اور اقتصادی نظریات، ان کی تعلیم وتربیت کے مرکز، حضرت شاہ عبدالعزیز کی سیاسی خدمات، ان کے فتویٰ اور اس کے قوی ترین اثرات کا ذکر ہے۔ اسی طرح حضرت شاہ محمد اسماعیل شہید اور ان کے رفقائے کار کے مجاہدانہ کارنامے بیان کیے گئے ہیں۔ اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے نصفِ اوّل کا سیاسی ماحول، شاہانِ اودھ، حافظ رحمت خان شہید، روہیلے اور مرہٹے، مرہٹوں کی قلیل ترین حکومت کا بھی ذکر ہے۔ اسی طرح لفظ ''وہابی'' کی تشریح بھی کی گئی ہے:

> ''یہ لفظ ہندوستانی زبان کی ڈکشنری میں انیسویں صدی ہی میں داخل کیا گیا اور اس مذہبی لفظ سے وہ عظیم الشان سیاسی مقاصد حاصل کیے گیے جو لاکھوں انسانوں کی قربانی اور کروڑوں اربوں روپے کے خرچ کرنے سے بھی نہیں حاصل ہو سکتے تھے''۔ (۳)

نجد کے ایک شخص محمد بن عبدالوہاب نے محمد بن سعود کے ساتھ حرمین شریفین پر حکومت کرنے کا منصوبہ بنایا تھا، اس وقت کی حکومت جو شریف حسین مکہ کے ہاتھ میں تھی، اس کو باغی اور حرمین کا مخالف کہہ کر بدنام کیا، حجاجِ کرام کے درمیان حکومتِ اسلامیہ کا باغی قرار دے کر شہرت دی، وہابی کہہ کر بدنام کیا، اس طرح پوری دنیا میں ان کو لوگ وہابی کہنے لگے۔ رفتہ رفتہ عوام میں یہ لفظ بددین کا مترادف ہو گیا اور گالی کی طرح استعمال کیا جانے لگا۔

ہندستان کے رضا خانی مکتبِ فکر سے تعلق رکھنے والے لوگ ''اہل حدیث'' کو وہابی کہنے لگے اور کبھی ''دیوبندی'' مکتبِ فکر کے حامل کو بھی کہنے لگے؛ حالاں کہ ان سے دیوبندیوں کا کوئی تعلق نہ تھا۔اس طرح کی بہت سی علمی اور تاریخی معلومات اس جلد میں موجود ہیں۔

تیسری جلد

تیسری جلد میں شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے کارناموں کا دوسرا دور ذکر کیا گیا۔علمائے صادق پور اور ان کے پُراسرار مجاہدانہ کارنامے بیان ہوئے ہیں، ایک عظیم ترین انقلابی تحریک جس کو ۱۸۵۷ء/۱۲۷۴ھ کا خونی طوفان بھی مٹا نہ سکا، جس کے لیے انگریزوں کو بار بار فوج کشی کرنی پڑی، گرفتاریاں ہوئیں، سزائیں دی گئیں۔حضرت مولانا عنایت علی غازی کا کارنامہ بھلایا نہیں جاسکتا، حضرت مولانا محمد جعفر تھانیسری کو سرکاری گواہ بنانے کے لیے بارہ گھنٹے پیٹا گیا، پہلے پھانسی کا حکم ہوا، پھر کالا پانی میں قید کی سزا ہوئی، ان کے بھائی مولانا احمد اللہ کو پھانسی کی سزا سنائی گئی، تمام جائدادیں قُرق کر کے نیلام کردی گئیں، گھر سے عورتوں اور بچوں کو نکال کر مکانات مسمار کردیے گئے۔خاندانی قبرستان کھدوا کر مردوں کو پھینکوادیا گیا۔انھوں نے رسول اللہ ﷺ کو خواب میں دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ''وَبَشِّرِ الصَّابِرِیْن'' الخ پڑھ کر تسلی دی کہ شکر کرو کہ تم ایسے امتحان کے لائق ٹھہرے۔ یہاں پر یہ جلد پوری ہوئی ہے۔

حضرت مولانا محمد جعفر ٹھانیسریؒ نے ''تواریخِ کالا پانی'' کے نام سے اپنی آپ بیتی لکھی ہے، جو پہلے نایاب تھی، کچھ دنوں پہلے دیوبند کے مکتبہ حجاز سے راقم حروف نے حاصل کر کے اس کا دوبارہ مطالعہ کیا، بڑی معلوماتی ''خودنوشت'' ہے۔

چوتھی جلد

چوتھی جلد بڑی اہمیت کی حامل ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس جلد میں ۱۸۵۷ء/ ۱۲۷۴ھ کی مکمل داستان موجود ہے، اس کے سارے اجزا کا باریکی سے جائزہ لیا گیا ہے، اسباب ووجوہات پر نئے انداز سے بحث کی گئی ہے، مجاہدین کے کارناموں کو اچھوتے انداز

میں بیان کیا گیا ہے۔ اس میں بہت سے ایسے بزرگوں کا تذکرہ ہے جن کا ذکر دوسری کتابوں میں اتنی جامعیت کے ساتھ نہیں ملتا ہے۔

جذبات سے لبریز انتساب

تحریک آزادی کے ایک عظیم مجاہد جناب ''نوشہ خان'' تھے؛ انھوں نے آزادی وطن کی خاطر اپنے بچوں کو بھوکا رکھا، گرفتار ہوئے، جیل کی سزا کاٹی، ۱۹۳۸ء/ ۱۳۵۷ھ میں ''یوپی کونسل'' کے لیے الیکشن میں کام کرتے رہے، دن بھر بھوکے رہے، جنوری کا مہینہ تھا سخت سردی تھی، کپڑے بھی کافی نہ تھے، نزلہ، زکام ہوا، بخار نمونیہ بن گیا، اگلے دن مرادآباد واپس آ کر وفات پا گئے۔ مولانا دیوبندی لکھتے ہیں:

> ''یہ کتاب ایسے ہی جاں بازو ایثار شیوہ مجاہدینِ حریت کی خدمت میں نذر ہے، جن کی قربانیوں نے ایثار و اخلاص کی عظیم الشان مثال قائم کی؛ مگر وہ خود سنگِ بنیاد کی طرح ایسے اوجھل ہوئے کہ نہ کامیاب ہونے والوں کی نظریں ان پر پڑیں اور نہ تاریخ ان کے آثار ونشانات کو محفوظ رکھ سکی''۔ (۴)

نامور علماء وفضلاء

۱۸۵۷ء/ ۱۲۷۴ھ کی داستان بیان کرنے کے بعد مؤلف نے چند بڑے اہلِ علم و فضل کا ذکر فرمایا ہے، جنھوں نے آزادی کی تحریک میں حصہ لیا، اذیتیں برداشت کیں، قوم و ملت اور دین کی بقا کے لیے محنتیں کیں۔ ان میں سرفہرست حضرت مولانا مفتی صدرالدین خان آزردہ، ان کے والد کا نام مولانا لطف اللہ تھا، کشمیر کے رہنے والے تھے، مدرسہ غازی الدین کشمیری گیٹ دہلی میں ''استاذ'' اور ''صدرالصدور'' تھے۔ اس مدرسہ کو انگریزوں نے کالج میں بدل دیا تھا، اس کا نام ''قدیم دہلی کالج'' رکھ دیا۔ آزادی کے بعد اس کا نام ''ذاکرحسین کالج'' ہوگیا، اب اسی نام سے جانا جاتا ہے۔ اس میں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ پڑھتے تھے، وہاں حضرت آزردہ سے شرفِ تلمذ حاصل تھا۔ تمام علوم؛ صرف، نحو، منطق، فلسفہ، ریاضی، معانی، بیان، بدیع، ادب، انشا، فقہ، حدیث اور تفسیر سب میں درک

حاصل تھا۔ ذوقِ شعر وسخن میں جوانانِ عاشق مزاج سے زیادہ مذاق رکھتے تھے، عربی، فارسی اور اردو میں عمدہ اشعار کہتے تھے، اشعار کے پڑھنے میں دل شگاف آواز، سخن حزیں اور صوت درد انگیز رکھتے تھے، جس نے آپ کی زبان سے سخن موزوں سنا ہے، وہی اس کی کیفیت جانتا ہے کہ انشاء وشعر تھا یا ایجادِ سحر۔ (۵)

شعراء اصلاح لینے آتے تھے، سیاست میں بڑی بصیرت حاصل تھی، انقلابی سرگرمیوں میں خاموش دل چسپی لیتے تھے۔

ان کی زندگی کے ایک پہلو سے راقم حروف کو تشویش تھی کہ اس زمانے میں انگریزوں سے وفاداری کا ان پر الزام تھا؛ مگر حضرت مولانا سید محمد میاں دیوبندیؒ کی تحریر میں اس اشکال کا جواب نظر آیا:

''(ایسٹ انڈیا) کمپنی کی حکومت کی طرف سے آپ کو تنخواہ ملتی تھی؛ مگر یہ صرف ایک ضابطہ کا تعلق تھا، آپ کے دل کا لگاؤ اور آپ کی حقیقی وفاداری سلطنت مغلیہ کے آخری نشان ''بہادر شاہ ظفر'' کے ساتھ مخصوص تھی، اسی پر آپ کو فخر اور ناز تھا''۔ (۶)

یہی وجہ ہے کہ حضرت مفتی صاحب نے انگریزوں کے خلاف فتویٰ پر سب سے پہلے دستخط کیے، آج بھی وہ موجود ہے۔ بہت دنوں تک قید میں رہنا پڑا، تنخواہ بند، نوکری موقوف اور جائداد ضبط ہوگئی۔ جب جامع مسجد دہلی پر انگریزوں کا قبضہ ہوگیا تو دوسال تک مسجد فوجی استعمال میں رہی، وہ بھی حضرت آزردہ کی محنت سے کھلی، اس کوشش میں مرزا الٰہی بخش بھی تھے۔ غالباً یہ وہی بزرگ ہیں جن کا بنگلہ مرکز حضرت نظام الدین دہلی میں تھا، اسی نسبت سے اس مسجد کو بنگلہ والی مسجد کہتے ہیں۔ (۷)

اخیر عمر میں حضرت آزردہ کو فالج کا اٹیک ہوگیا تھا، اکاسی سال کی عمر میں انتقال ہوا، انتقال کی تاریخ ۲۴؍ربیع الاوّل ۱۲۸۵ھ/ ۱۵؍جولائی ۱۸۶۸ء بتائی جاتی ہے۔

۲- دوسری عظیم شخصیت نواب مصطفیٰ خان شیفتہ کی ہے۔ سرسید مرحوم نے ''آثار الصنادید'' میں ان کا ذکر فرمایا ہے۔ شیفتہ شاعر منش نواب زادہ ہی نہیں تھے؛ بلکہ شعر و

سخن میں نبض شناس، سخن داں، نکتہ سنج، نکتہ داں، اخلاق وخصائص میں مہبطِ انوارِ سعادت، متقی وپرہیز گار اور زاہد شب زندہ دار تھے، نقشبندی سلسلہ میں بیعت تھے، متعدد کتابوں کے مصنف تھے۔ انگریزوں کی مخالفت میں قید وبند کی صعوبتیں اٹھائیں، ۱۸۶۹ء/ ۱۲۹۵ھ میں انتقال ہوا، درگاہ نظام الدین میں تدفین عمل میں آئی۔

۳- صہبائی شہید: موصوف بہت سے فنون میں کمال رکھتے تھے، خصوصاً علمِ عَروض اور شاعری میں بڑا کمال حاصل تھا۔ انگریزوں نے ''کٹرہ مہر پرور'' کے سارے مردوں کو ایک ساتھ دریا (یمونا) کے کنارے کھڑا کر کے گولیوں سے شہید کر ڈالا تھا، حضرت آزردہؔ کو جب شہادت کی اطلاع ملی تو بے اختیار یہ شعر پڑھا۔

کیوں کر آزردہؔ نکل جائے، نہ سودائی ہو ☆ قتل اس طرح سے بے جرم جو صہبائی ہو

''تذکرۃ الرشید'' کے ایک مضمون کی تردید

اس کے بعد مؤلف نے میرٹھ، مظفر نگر، سہارن پور، بلند شہر، علی گڑھ اور روہیل گڑھ کے احوال تفصیل سے لکھے ہیں؛ اس میں آگے چل کر ''تذکرۃ الرشید'' کے ایک مضمون کی تردید کی ہے، جس میں حضرت مولانا عاشق الٰہی میرٹھیؒ نے انگریزی حکومت کے غلبہ کی وجہ سے جہاد شاملی کو ایک اتفاقی مڈبھیڑ لکھا ہے۔ اس کی تفصیل ''تذکرۃ الرشید'' کے تجزیہ کے تحت عرض کی جا چکی ہے، وہاں ''علمائے ہند کا شان دار ماضی'' سے اقتباس بھی نقل کیا ہے کہ ایسا اسلوب محض حالات کے تقاضے کی وجہ سے اختیار فرمایا تھا۔

اس کے بعد حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ، مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، مولانا مظہر نانوتویؒ، مولانا منیر، مولانا رحمت اللہ کیرانوی، ڈاکٹر وزیر خان، مولانا عبد الجلیل شہیدؔ، مولانا فیض احمد بدایونی، منشی ذوالفقار الدین، مفتی عنایت احمد کاکوری اور مولانا فضل حق خیر آبادی کا ذکر قدرے تفصیل سے ''خاکہ'' کی شکل میں کیا ہے۔ ان حضرات کے کارناموں کو بھی بیان کیا ہے کہ اگر یہ حضرات اتنی جاں فروشانہ خدمات انجام نہ دیتے تو آج ہندوستان میں اسلام باقی نہ رہتا۔

ان میں سے بہت سوں کو قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں، جیسے حضرت مفتی عنایت احمد کاکوری (۱۲۲۸ھ/۱۸۱۳ء-۱۲۷۹ھ/۱۸۶۳ء) ہیں، موصوف کو ''تقویم البلدان'' کے ترجمہ کی وجہ سے جزیرہ انڈمان سے رہائی نصیب ہوئی۔ مفتی صاحبؒ نے چالیس فنون میں سے ایک ایک غیر منقوط مسئلہ منتخب فرمایا تھا، ان میں سے ہر ایک پر چالیس چالیس صفحات لکھنے کا ارادہ تھا، مثلاً تفسیر میں قرآن کی ایک آیت وعَلَّمَ آدَمَ الاسْمَاءَ كُلَّها کو منتخب فرمایا تھا اور حدیث سے كُلُّ مُسْكِرٍ حرامٌ کو اور ہر ایک پر غیر منقوط چالیس چالیس صفحات لکھنے کا ارادہ کیا؛ مگر احرام کی حالت میں جہاز جدہ کے قریب پہاڑ سے ٹکرا گیا، شہید ہوگئے اور مسودہ ضائع ہوگیا۔ (۸) ان کی کتاب ''علم الصیغہ'' دارالعلوم دیوبند اور دیگر مدارسِ اسلامیہ کے نصاب میں داخل ہے، جو بلا کسی کتاب سے مدد لیے محض اپنے حافظہ اور یادداشت کی بدولت لکھی تھی۔ راقم حروف کو بارہ سال تک اس کے پڑھانے کا شرف حاصل ہوا۔ اسی طرح حضرت مولانا فضلِ حق خیر آبادیؒ (۱۲۱۲ھ/ ۱۷۹۷ء-۱۲۷۸ھ/ ۱۸۶۱ء) ہیں کہ ان کا انتقال جزیرہ انڈمان میں ہی ہوگیا، ان کی کتاب ''مرقات'' فن منطق میں بڑی معروف ہے، دارالعلوم دیوبند و دیگر مدارس اسلامیہ کے نصاب میں داخل ہے۔ راقم حروف کو آٹھ سال تک اسے پڑھانے کا شرف حاصل ہوا۔

مولانا خیر آبادیؒ جہاں بڑے فاضل اور یگانۂ روزگار مدرس ومعلّم تھے، وہیں شعر و سخن کے فن کار اساتذہ میں شامل تھے، ساتھ ہی شطرنج بھی خوب کھیلتے تھے۔ ان کے معاصر شعراء میں غالبؔ، مومنؔ، ذوقؔ، عیشؔ، آزردہؔ، نصیرؔ، احسانؔ، تسکینؔ اور صہبائیؔ ہیں، یہ سب مولانا کے قدر شناس اور مولانا ان سب کے قدرداں تھے۔ یہ جلد حضرت حافظ ضامن شہیدؒ کی شہادت کے تذکرے پر ختم ہے۔

حاشیہ میں ایک تسامح

حضرت مفتی عنایت احمد کاکوریؒ کی ایک کتاب ''علم الفرایض'' ہے، اس کا نام تاریخی ہے، ۱۲۶۲ھ میں لکھی گئی ہے، ابجدی حروف کے عدد کے لحاظ سے اس کے عدد اتنے

ہی نکلتے ہیں؛ مگر بعض لوگوں کو یہاں شبہ ہوتا ہے کہ ''فرائض'' کی ضاد سے پہلے ''ہمزہ'' کا عدد ایک جوڑا جائے، یا ''ی'' کا عدد دس جوڑا جائے؟ جو لوگ ہمزہ سمجھتے ہیں ان کو نو عدد کی کمی نظر آتی ہے اور مادّۂ تاریخ غلط معلوم ہوتا ہے؛ لیکن صحیح بات یہ ہے کہ ایسے الفاظ میں ''ی'' کا نمبر دس جوڑا جاتا ہے، جیسا کہ اس فن کی کتاب ''محاسن التواریخ'' میں موجود ہے۔(۹)

اتفاق سے حضرت مولانا سید محمد میاں دیو بندیؒ کو بھی یہی شبہ ہو گیا، انھوں نے حاشیہ میں لکھا ہے کہ یہ سن صحیح نہیں ہے۔(۱۰) حالاں کہ یہ غلط فہمی ''ی'' کو ''ہمزہ'' سمجھ لینے کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔

یو پی حکومت کی طرف سے ''علمائے ہند کا شان دار ماضی'' کی ضبطی کا حکم

یو پی کی انگریزی حکومت نے حضرت مولانا محمد سید محمد میاں صاحب کی اس مایہ ناز کتاب کی ضبطی کے احکامات جاری کیے، جس پر جمعیۃ علماء ہند کی مجلس عاملہ نے ۱۳؍۱۴؍ جولائی ۱۹۴۰ء/ ۷؍۸؍ جمادی الثانیہ ۱۳۵۹ھ کے اجلاس میں اس بات کی شدید مذمت کرتے ہوئے مطالبہ کیا کہ جمعیت اس کو صریح تشدد اور قانون کا بے جا استعمال سمجھتی ہے؛ کیوں کہ وہ محض ایک تاریخی کتاب ہے، جس میں گزشتہ واقعات کو تاریخ کی کتابوں یا اسانید کے ساتھ جمع کیا گیا ہے، اس ضبطی کا علوم وتصانیفِ جدیدہ کی تدوین واشاعت پر نہایت ناگوار اور ناقابلِ برداشت اثر پڑے گا۔(۱۱)

''علمائے ہند کا شان دار ماضی'' کی دوسری جلد کی تمہید میں مصنفؒ لکھتے ہیں:

> ''علماء ہند کا شان دار ماضی'' پہلی مرتبہ ۱۹۳۹ء/ ۱۳۵۸ھ میں شائع ہوا، برطانوی دور تھا، جنگ کا زمانہ، فوراً ہی ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کے شکنجہ میں کس دیا گیا، کتاب ضبط اور مصنفؒ گرفتار، اس زمانہ کی امنگیں اور تھیں، جیسے ہی مقدمہ اور اس کی ہلکی سی سزا سے نجات ملی، کتاب پر نظر ثانی شروع کر دی''۔(۱۲)

اس کے بعد مزید حوصلہ بڑھا اور تقریباً ہزار صفحات کی ایک نئی کتاب مرتب فرمائی جو ''علمائے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے'' کے نام سے طبع ہوئی۔

خلاصہ یہ کہ حضرت مولانا سید محمد میاں دیوبندیؒ کا قلم سوانحی نگارشات میں بھی تحقیق ریز ہے، مواد اور اسلوب ہر لحاظ سے اصول پر اترتا ہے، ان کی تحریر کا قاری اپنے اندر اطمینان کی کیفیت پاتا ہے، کہیں غلو پسندی، مبالغہ سنجی اور عبارت آئی نظر نہیں آتی، اعتدال اور میانہ روی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹتا۔

☆☆☆☆☆

حوالہ جات

(۱) مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی - ایک سیاسی مطالعہ۔
(۲) علماء ہند کا شان دار ماضی: ۱/۱۔ کتابستان دہلی
(۳) علماء ہند کا شان دار ماضی: ۲/ ۲۲۶۔
(۴) علمائے ہند کا شان دار ماضی: ۴/ ۶۔
(۵) علمائے ہند کا شان دار ماضی: ۴/ ۳۳۰، بحوالہ حدائق الحنفیہ۔
(۶) علمائے ہند کا شان دار ماضی: ۴/ ۲۲۶۔
(۷) دینی دعوت: ص/ ۴۴، ادارہ اشاعت دینیات دہلی ۲۰۰۲ء۔
(۸) علمائے ہند کا شان دار ماضی: ۴/ ۴۳۸۔
(۹) محاسن التواریخ: ص/ ۸، مصنفہ مولانا محمد عثمان پورہ معروف مئو ۱۹۸۷ء۔
(۱۰) علمائے ہند کا شان دار ماضی: ۴/ ۴۲۸۔
(۱۱) جمعیۃ علماء ہند کیا ہے؟ ص/ ۳۱۴، الجمعیۃ بک ڈپو دہلی۔
(۱۲) علماء ہند کا شان دار ماضی: ۱/۱۔

تعارف وتجزیہ تصنیفات وتالیفات سید الملت:

مؤرخ ملت مولانا سید محمد میاں علیہ الرحمہ
کی تصنیفات ورسائل کا تعارف

مولانا محمد عابد صاحب

مدرس جامعہ مدنیہ، کریم پارک راوی روڈ، لاہور

اس مقالہ میں مولانا سید محمد میاں صاحب کی کتابوں کے ساتھ مختصر رسائل اور کچھ مقالات کا ذکر بھی کتابوں کے ذیل میں کرایا گیا ہے، وہاں پر اس کے صفحات اور جہاں سے وہ رسائل ومقالات شائع ہوئے ہیں، اس کی وضاحت ضروری تھی۔اس سے اس کی افادیت اور بڑھ جاتی، ہم فاضل مقالہ نگار کی اس سعی وکاوش اور تلاش وجستجو پر ان کے شکر گزار ہیں۔مرتب

میرے اس مقالہ کا موضوع ہے، سید الملت حضرت مولانا سیّد محمد میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تصانیف ورسائل کا تعارف اور ان پر تبصرہ۔حضرت سید الملت کی شخصیت جامع الجہات تھی۔ بیک وقت (۱) درس وتدریس (۲) وعظ ونصیحت (۳) تحدیث وافتاء (۴) دینی وعلمی کارنامے (۵) قومی وملی خدمات (۶) سیاسی ہنگامہ آرائیاں اور دیگر گونا گوں ذمہ داریاں آپ کے کندھوں پر تھیں، اِن سب کے باوجود آپ نے تصنیف وتالیف کا سلسلہ جاری رکھا۔اللہ تعالیٰ نے آپ کو تحریر کی بے پناہ صلاحیت دی تھی، آپ نے اس صلاحیت سے بھرپور فائدہ اُٹھایا، آپ اپنی تصانیف میں ایک ماہر مصنف وصاحبِ قلم اور تحریر وانشاء پردازی میں ایک صاحبِ طرز ادیب، تحقیق ودرایت میں ایک نکتہ رس فقیہ اور صاحبِ

بصیرت مؤرخ نظر آتے ہیں۔

فی الحال ہم مؤرخِ ملت کی تصنیفی و تالیفی خدمات پر چند سطور پیش کر رہے ہیں، ویسے تو حضرتؒ کی زندگی کے ہر ہر پہلو کو نمایاں طور پر اُجاگر کرنے کی ضرورت ہے تاکہ نسلِ نو اپنے بزرگانِ دین کی مبارک زندگی سے سبق حاصل کر کے اپنے لیے راہِ عمل متعین کر سکے۔

مولانا قاری شریف احمد صاحبؒ (م:۱۴۳۲ھ/۲۰۱۱ء) فرماتے تھے:

''حضرت مؤرخِ ملتؒ ریل میں سفر کے دوران اپنی سیٹ پر کسی دوسرے ضرورت مند کو بٹھا کر خود بوگی کے دروازے کے ساتھ فرش پر بیٹھ کر لکھنا شروع کر دیتے تھے، ریل کا سفر ہو یا بس کا، سواری کے چلتے ہوئے آپ بلا تکلف لکھتے تھے۔''

حضرت قاری صاحبؒ کے اِس قول کو حضرت مؤرخ ملتؒ کی اِس تحریر کے تناظر میں ملاحظہ فرمائیں:

''یہ مضمون زیر ترتیب تھا کہ ۱۲/اگست ۱۹۵۳ء کو ناگپور کا سفر پیش آ گیا، یہ دلچسپ مشغلہ سفر میں بھی جاری ہے، اس وقت دن کے آٹھ بجے ہیں، گرانڈ ٹرنک ایکسپریس بھوپال سے گزر چکا ہے، برسات کا موسم ہے بادلوں کا شامیانہ تنا ہوا ہے، پھوار کا ہلکا سا نقاب حسینۂ فطرت کے چہرے پر آویزاں ہے، سب طرف سبز لہرا رہا ہے اور پتیاں بارش میں بار بار منہ دھو کر نکھر رہی ہیں اور حسن فطرت کا جوبن سنوار رہی ہیں، شبابِ نوخیز کی مستی پوری فضا پر چھائی ہوئی ہے، ٹرین نے بھی رفتارِ رندانہ اختیار کر لی ہے، کبھی جھومتی، سیٹیاں بجاتی تاریک سرنگوں میں تیزی سے دوڑ رہی ہے اور کبھی جمال فطرت کے سامنے گردن جھکائے ہوئے دھیمی رفتار سے پہاڑوں پر چڑھ رہی ہے۔ ریلوے لائن کے دونوں جانب سبزہ پوش پہاڑوں کی قطاریں ہیں گویا زاہدانِ شب بیدار سبز کملیاں اوڑھے کرشمہائے قدرت کے سامنے سر بسجود ہیں۔ موسلا دھار بارش سے دھلی ہوئی ڈامر کی پہاڑی سڑک بنارسی ساڑھی کی رو پہلی کنی ہے جو دوشیزہ فطرت کے گداز بدن لپٹی ہوئی ہرے بھرے درختوں کی مشکیں زلفوں میں چمک رہی ہے۔

پہاڑوں کے دامنوں میں لہلہاتے ہوئے پودوں کے حسین تختے اور ان پر رنگ برنگ پھول گویا رخسار شباب پر مست سبزہ اپنی شوخیاں دکھا رہی ہے۔ پہاڑوں کے پہلوؤں میں صاف شفاف پانی کی نہریں موتیوں کا ہار بن کر جمیلۂ فطرت کے سینہ پر بل کھا رہی ہیں۔ کسی قدر فاصلے پر درختوں سے لدی ہوئی پہاڑ کی اونچی چوٹی جس پر بارش کی دھواں دار دبوندیں پڑ رہی ہیں، گویا مدہوش جوگی ہے جو گھونگریالے بال کھولے ہوئے فوارے کے نیچے انگڑائی لے رہا ہے۔ زلفوں کی لٹوں سے ڈھلکنے والا پانی آبشاروں کے راستے پیروں کی ایڑیوں تک پہنچتا ہے اور زمین کی کڑی کمر پر سیلاب کے طوفان لا دہا ہے۔ سامنے اونچے اونچے درختوں کا جنگل ہے، کسی درخت کے موٹے تنے اور ٹہنے سادھوؤں کی لٹوں کی طرح پھیلے ہوئے۔

کوئی مینار کی طرح سروقد، کسی کی اوپر نکلی ہوئی مندر اور گرجا کا نمونہ پیش کر رہی ہے اور کسی کی گول چھتری گنبد مسجد کی تصویر کھینچ کر اللہ کی یاد دلا رہی ہے۔ کسی کے پتے لانبے ہیں، کسی کے گول، کسی کے چھوٹے، کسی کے بڑے، کسی کے صاف اور چمکیلے، کسی کے کھردرے اور خاردار، کسی کے پتوں کے کنارے کمان ابرو کی طرح ہموار اور کسی کنارے مژگانِ چشم کی طرح نوکیلے اور خم دار۔'' (اسلام کیا اور اسلامی فکر کیا ہے؟ ص: ۷)

آپ کی تحریرات سیرت وسوانح، فقہ وفتاویٰ، اسلامی تہذیب وتمدن، عربی ادب، جیسے عنوانات کے ساتھ ساتھ علمائے ہند کی سیاسی خدمات اور جدوجہدِ آزادی میں مسلمانوں کے کردار کو بھی واضح کرتی ہیں۔

حضرت مؤرخ ملتؒ کے بارے میں مولانا معز الدین احمد قاسمی تحریر فرماتے ہیں:

''آپ کے قلم نے جمعیۃ علماء ہند کے دستاویز کو محفوظ کر دیا، اور علماء حق کے کارناموں کو زندۂ جاوید کر دیا، جمعیۃ علماء ہند کے پاس آج جو بھی تاریخ ہے، وہ مولانا مرحوم کی رہینِ منت ہے۔ یقیناً آپ جمعیۃ علماء کے قلم تھے اگر مجاہد ملت زبان تھے۔''

(ندائے شاہی، مرادآباد کا تاریخ شاہی نمبر ص: ۳۹۸، اشاعت ۱۹۹۲ء)

حضرت مولانا سیّد محمد میاں صاحبؒ کی تصنیفات و تالیفات کی فہرست بلحاظِ موضوع اس طرح ہے:

(الف) تفسیر قرآن:

(۱) مجالسِ سبعہ:

جون ۱۹۴۲ء میں شیخ الاسلام حضرت مولانا سیّد حسین احمد مدنی رحمہ اللہ کو حکومت نے گرفتار کر کے مراد آباد جیل میں بھیج دیا۔ اگست ۱۹۴۲ء میں مجاہدِ ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ اور اکتوبر میں مؤرخ ملت حضرت مولانا سیّد محمد میاں صاحبؒ نیز دیگر چند رفقاء بھی اسی جیل میں قید کیے گئے۔ چند ماہ بعد ۱۳۶۲ھ کا نیا سال شروع ہوا تو مجاہدِ ملت کو خیال آیا کہ حضرت مدنیؒ کی اس بابرکت رفاقت سے فہمِ قرآن کے سلسلہ میں فیض یاب ہونا چاہیے، حضرت مدنیؒ نے اس درخواست کو قبول فرمایا اور ۷/محرم الحرام ۱۳۶۲ھ/۱۴/جنوری ۱۹۴۳ء بروز جمعرات سے بعد نمازِ ظہر درسِ قرآن کا سلسلہ شروع فرمایا جو حضرت مدنیؒ کی نینی جیل الٰہ آباد منتقلی تک نو دن مسلسل جاری رہا۔ حضرت مؤرخ ملتؒ نے اِن ارشادات کے نوٹس بنا لیے۔ حضرت شیخ الاسلامؒ نے چار دن سورۂ فاتحہ اور پانچ دن سورۂ بقرہ کی ابتدائی پچیس آیات کا ترجمہ وتشریح ارشاد فرمائی جو علمی لطائف، رموزِ قرآن اور اَسرار وحکم کا بہترین مجموعہ تھا۔ حضرت مدنیؒ کے وفات کے بعد مؤرخِ ملتؒ کو خیال آیا کہ ان جواہر ریزوں کو ترتیب دیا جائے، پھر فدائے ملت حضرت مولانا سیّد اسعد مدنیؒ کی فرمائش اور اصرار پر آپ نے انہیں ترتیب دیا اور ساتھ ساتھ تشریحاتِ مفیدہ بھی تحریر فرمائیں۔ بقولِ مؤرخ ملت:

> ''حضرت شیخ الاسلامؒ کے یہ اشارات مخزنِ اسرار وحکم تھے جو قدرتی طور پر قابل قدر تھے لیکن خداوند عالم کے فضل وکرم سے ان اشارات کی یہ برکت محسوس ہوئی کہ ان کی تشریحات کو بھی علمی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔'' (مجالسِ سبعہ)

حضرت مدنیؒ کے ارشادات اور حضرت مؤرخ ملتؒ کی تشریحات ماہنامہ ''تذکرہ'' دیوبند میں سترہ قسطوں میں شائع ہوئیں۔ اپریل ۱۹۶۹ء میں ان اَقساط کو کتابی شکل میں

''الجمعیۃ بک ڈپو'' گلی قاسم جان، دہلی نے شائع کیا، اسی کا عکس حضرت مؤرخ ملتؒ کے صاحبزادے حضرت مولانا سیّد حامد میاں صاحبؒ (بانی جامعہ مدنیہ لاہور) نے اپنے ذاتی مکتبہ محمودیہ کریم پارک لاہور سے شائع کیا۔

(ب) اَحادیث:

(۲) مشکوۃ الآثار ومصباح الابرار:

۱۳۹۰ھ میں اَرباب دارالعلوم دیوبند نے فیصلہ کیا کہ نصابِ تعلیم میں درجۂ وسطی میں حدیث شریف کی ایک ایسی کتاب داخل کی جائے جو عمدہ اخلاق، نیکی وگناہ سے متعلق اورسنتِ رسول ﷺ سے متعلقہ احادیث مبارکہ پر مشتمل ہو، تاکہ طالب علم اِن اُمورِ مفیدہ کی بصیرت حاصل کرلے اوران اَخلاق ومحاسن سے مزین ہوجائے۔ اس کام کے لیے اربابِ شوریٰ کی نظرِ انتخاب حضرت مؤرخ ملتؒ پر پڑی۔ حضرت مؤرخِ ملتؒ نے بڑی عرق ریزی اور کنج کاوی سے ذی القعدہ ۱۳۹۰ھ/ فروری ۱۹۷۱ء کو یہ کتاب مکمل کی جو تقریباً پانچ سو اَحادیثِ شریفہ پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب اُسی وقت سے دارالعلوم دیوبند کے نصاب تعلیم میں داخل ہے۔ حضرت مؤرخِ ملتؒ اس کتاب کی ترتیب کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:

''ان اَحادیث کا انتخاب اگرچہ میں نے ''مشکوٰۃ المصابیح'' سے کیا ہے لیکن اس پر اکتفاء نہیں کیا کہ صرف مشکوٰۃ کا حوالہ دوں اوراسی طرح اس کے اصل ماخذ کو بیان کردینے ہی پر بس نہیں کیا بلکہ جو صحاح کی اَحادیث تھیں میں نے حاشیہ میں اس کا وہ باب بھی درج کردیا ہے جس میں وہ حدیث آئی ہے اوراکثر صفحات کے نمبرات بھی لکھ دیے ہیں، تو میں نے اسی پر بس نہیں کی مثلاً رواہ البخاری کہہ دی بلکہ میں نے وہ باب مع صفحہ نمبر ذکر کیا ہے جس میں یہ حدیث موجود ہے۔'' (مرآۃ الانوار شرح اردو مشکوۃ الآثار ص:۲۳، از مولانا نسیم احمد غازی مظاہری)

حضرت مؤرخ ملتؒ کے صاحبزادے حضرت مولانا سیّد حامد میاں صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں:

''اخلاقیات پر والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ نے حدیث شریف کی ایک کتاب بھی لکھی

ہے اس کا نام ''مشکوٰۃ الآثار'' ہے۔ انہوں نے اس کا نسخہ بھیجا کہ محمود میاں اور وحید میاں کو یہ پڑھائیں اور تحریر فرمایا:

''موطا امام محمدؒ سے آغاز بہت بہتر ہے (میں نے مدرسہ میں شرح وقایہ کے ساتھ موطا امام محمدؒ پڑھوانا شروع کی تھی۔ اس کی اطلاع دی تھی کہ دونوں فلاں فلاں کتابیں پڑھ رہے ہیں۔ حامد میاں) مگر مشکوٰۃ الآثار بھی ضرور پڑھوایئے۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ اس کو حفظ کرایا جائے۔ فقہی مسائل کے متعلق احادیث پر تو بہت زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ اخلاقیات کے متعلق صرف مشکوٰۃ کا نصف آخر ہے مگر وہ عموماً نہیں پڑھایا جاتا ہے اور پڑھایا جاتا ہے تو اس کو اَہمیت نہیں دی جاسکتی، مشکوٰۃ الآثار میں اسی کوتاہی کی تلافی کی کوشش کی گئی ہے کہ طالب علم ابتداء ہی سے اخلاقیات سے بھی واقف ہوجائے اور شفیق اُستاد ہو تو ان پر عمل کی تربیت بھی کرتا رہے۔ الحمدللہ ہندوستان میں اس کی مقبولیت بڑھ رہی ہے پہلا ایڈیشن ختم ہو گیا ہے، اب عربی حروف کے ٹائپ سے طباعت کا انتظام ہو رہا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ مکمل فرمائے۔'' (سیرتِ مبارکہ ص: ۶۱۴)

الحمدللہ یہ کتاب عربی حروف ٹائپ میں ''دائرۃ المعارف العثمانیہ'' حیدر آباد دکن سے شائع ہوگئی تھی۔ حضرت مولانا نسیم احمد غازی مظاہری صاحبؒ نے اس کتاب کا اُردو ترجمہ اور مفصل اُردو شرح تین جلدوں میں ''مرآۃ الانوار'' کے نام سے تحریر فرمائی ہے۔

(۳) چہل حدیث:

حضرت مؤرخ ملتؒ نے ''اَرْبَعُوْنَ مِنْ جَوَامِعِ الْکَلِمْ'' کے نام سے حضور ﷺ کے چالیس ارشاداتِ مبارکہ ۶ر جمادی الاخریٰ ۱۳۹۱ھ کو جمع کیے، بعد میں اِن کا اُردو ترجمہ بھی کیا۔ یہ کتاب دیوبند اور دہلی سے اُردو اور انگریزی ترجمہ کے ساتھ شائع ہوئی تھی۔

(ج) سیرت وسوانح:

(۴) حیاتِ آدم علیہ السلام

سب سے پہلے انسان اور سب سے پہلے نبی حضرت سیّدنا آدم علیہ السلام کی حیاتِ

مبارکہ پر اس کتاب میں حضرت مؤرخِ ملتؒ نے قیامِ جنت، اغوائے شیطان، دھوکا کھا جانے کی وجہ سے جنت سے اخراج، توبہ، کمالِ نیازمندی، عہدِ الست، دنیا میں نزول و قیام، سلسلہ پیدائس، سب سے پہلی اَولاد، وفات کے وقت تعدادِ اَولاد، ذریعۂ کسب، لباس، اَولادِ آدم کا نکاح، بیت اللہ کی تعمیر، حج، سب سے پہلی خون ریزی، اور شیطانی و ربانی جذبات کی سب سے پہلی جنگ وغیرہ وغیرہ نیز عجیب وغریب اور مستند مضامین پر مشتمل بیش بہا معلومات جمع کی ہیں۔

(۵) سیرتِ مبارکہ:

حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی سیرتِ مقدسہ کے حوالہ سے چھ سو صفحات پر مشتمل ایک ضخیم کتاب ہے۔ یہ کتاب تین حصوں پر تقسیم ہے:

پہلا حصہ ایک مبسوط مقدمہ ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ انسان نے حضرت آدم علیہ السلام کے دورِ آغاز سے کس طرح منزل بمنزل ترقی کی؟ کس طرح درجہ بدرجہ اس کی تعلیم ہوتی رہی اور کس طرح خاتم الانبیاء ﷺ کے دورِ مسعود میں دین کی تکمیل ہوئی۔

دوسرا حصہ ''عرب: قبل اسلام اپنے آئینے میں'' کے عنوان سے کتاب کا دیباچہ ہے۔ اس حصہ میں قریش کی سرگزشت، مکہ معظّمہ کی تاریخ، مکہ مکرمہ کی آبادی وغیرہ بیان کرتے ہوئے تمدنِ مکہ کو آئینہ میں لایا گیا ہے اور یہ واضح کیا گیا ہے کہ قریشِ مکہ اپنے تمدن میں دنیا کی کسی قوم سے پیچھے نہیں تھے۔

تیسرے حصے میں سیرتِ طیبہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس حصہ کا اصل ماخذ کتاب اللہ ہے۔ عام طریقہ یہ ہے کہ سیرت اور تاریخ کی کتابوں سے آنحضرت ﷺ کی سیرت مقدسہ مرتب کی جاتی ہے اور موقع بموقع آیات کتاب اللہ کو پیش کر دیا جاتا ہے، لیکن اس میں کتاب اللہ کو اصل گردانا گیا ہے اور اسی کو سامنے رکھا گیا ہے، البتہ ان کی وضاحت کے لیے احادیثِ مبارکہ اور سیرت کی کتابوں سے مدد لی گئی ہے۔ اس تبدیلی کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ:

(i) آنحضرت ﷺ کی وہ شخصیت نمایاں ہوتی ہے جو قرآنِ حکیم نے پیش فرمائی ہے۔

(ii) یہ واضح ہو گیا ہے کہ قریش کی مخالفت کا سبب صرف عقیدۂ توحید تھا یا وہ اقتصادی اور معاشی اسباب بھی تھے جن کی ضرب سر برآوردگانِ قریش کے مفادات پر پڑ رہی تھی۔

(iii) دعوت اسلام کی پوری حقیقت سامنے آگئی ہے کہ وہ صرف ایک فلسفہ نہیں بلکہ ہمہ گیر انقلاب ہے۔

(iv) ساتھ ساتھ آنحضرت ﷺ کی صداقت کے وہ دلائل بھی روشن ہو گئے ہیں جو قرآن حکیم نے پیش فرمائے ہیں۔

(v) نبوت سے پہلے چالیس سالہ حیاتِ مبارکہ کا دور مسعود بھی زیادہ اجاگر ہو گیا ہے۔

آنحضرت کی داعیانہ سیرت کو کو پیش کرتے ہوئے دعوت و تبلیغ کے وہ اصول وآداب واضح کیے گئے ہیں جن کی تلقین کتاب اللہ نے کی ہے اور آنحضرت ﷺ نے حیاتِ مبارکہ میں ان کے عملی نمونے پیش فرمائے ہیں۔

(vi) مختلف مذاہب والوں کے لیے دعوت و تبلیغ کے مختلف طریقے آیات کتاب اللہ کی روشنی میں پیش کیے گئے ہیں اور وہ اوصاف بیان کیے گئے ہیں جو داعی الی اللہ کے ہونے چاہئیں۔

(vii) سرمایہ اور قومیت وغیرہ سے متعلق دورِ حاضر کے مسائل و مباحث وانکار ونظریات کے بارے میں سیرتِ مبارکہ کی روشنی میں رہنمائی کی گئی ہے۔

(viii) سفرِ ہجرت کی مستند اور صحیح تفصیلات نہایت دلچسپ ودلکش انداز میں بیان کرتے ہوئے یثرب (مدینہ منورہ) کی تاریخ اور اس کا جغرافیہ بھی بیان کیا گیا ہے۔

(ix) حضراتِ انصار ومہاجرین رضی اللہ عنہم کے وہ مناقب بھی بیان کیے گئے ہیں جنہوں نے ان کو ''کائنات کی آنکھ کا تارا'' اور ''چشم انسانیت کا نورِ بصیرت'' بنا دیا۔

(x) آنحضرت ﷺ کے خطبہ پر کتاب کو ختم کیا گیا ہے جو حجۃ الوداع کے موقعہ پر آپ نے ارشاد فرمایا تھا اور اس خطبہ کے زیادہ سے زیادہ اجزاء جمع کیے گئے ہیں۔

اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے ماہنامہ ''برہان'' دہلی نومبر ۱۹۷۳ء کی اشاعت

میں لکھتا ہے:

’’یہ کتاب جو سلسلہ کی جلد اول ہے اگر چہ موضوع اس کا سیرتِ مبارکہ ہی ہے لیکن اس کی ترتیب خالص تبلیغی اور دعوتی ہے۔ چنانچہ پہلے انسان: زندگی اور موت کی حقیقت پر ایک بے تکلف مکالمہ کی شکل میں گفتگو کرنے کے بعد مذہب اور پیغمبروں کی ضرورت ثابت کی گئی ہے اور اس کے بعد مشہور پیغمبروں اور کتب سماویہ کے حالات قرآن اور انجیلِ مقدس کے بیانات کی روشنی میں لکھے گئے ہیں، پھر عرب اہل اسلام پر ایک خاصا طویل باب ہے اور اس کے بعد سیرت شروع ہو جاتی ہے۔ اس سلسلہ میں مولانا نے آنحضرت ﷺ کے ذاتی خاندانی اور خانگی حالات وسوانح اور آپ کی تعلیمات اور اخلاق وفضائل ان سب کو ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح خلط ملط کر دیا گیا ہے کہ بحیثیت ایک اعلیٰ ترین انسان کے آپ کی شخصیت کا پیکر اُبھر کر ایک غیر مسلم کو بھی متاثر کر سکے۔ اس لحاظ سے یہ بڑی عمدہ اور مقصد میں کامیاب کتاب ہے۔ زبان سلیس اور اندازِ بیان شگفتہ و دل نشین ہے۔

(ماہنامہ برہان دہلی نومبر ۱۹۷۳ء ص: ۳۵۵)

(۶) رحمۃ للعالمین ﷺ اور سیاسی انقلابات عرف مسلم سوشلسٹ:

(i) عقیدۂ توحید اور عقیدہ رحمۃ للعالمین ﷺ کا سیاسیاتِ عالم پر کیا اثر رونما ہوا؟

(ii) ایک مسلم سوشلسٹ کے اصولی عقائد کون کون سے ہیں؟

(iii) کالے گورے کی کوئی تفریق نہیں، بحر و بر کی کوئی تقسیم نہیں۔

ان مضامین سے متعلق مندرجہ ذیل سات ابواب پر مشتمل یہ کتاب اپنے موضوع پر ایک انوکھی اور البیلی تصنیف ہے:

(i) خاتم الانبیاء اور تمام انبیاء کرام علیہم السلام کی بعثت کا مقصد

(ii) حقوقِ انسانیت

(iii) ظہورِ اسلام سے پیشتر عالم انسانی کی تباہ حالی

(iv) موجودہ دنیا کی تباہ حالی اور اس کے اسباب

(v) عقیدۂ توحید کی تشریح
(vi) عقیدۂ رحمۃ للعالمین کی تشریح
(vii) عقیدۂ توحید اور رحمۃ للعالمین کا اثر سیاسیات عالم پر

(۷) ہمارے پیغمبر ﷺ:

اس مختصر کتاب میں سیرتِ مقدسہ کو اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ حیاتِ مبارکہ کے ہر ہر واقعہ سے آسانی سے سبق لے سکیں اور اپنے کردار و عمل کے لیے نمونہ بنا سکیں۔ اندازِ تحریر سادہ اور عام فہم ہے، گو کہ بچوں کے لیے لکھی گئی ہے لیکن ہر عمر کے افراد بھی اس سے مستفید ہو سکتے ہیں۔ اس کتاب کے دوسرے حصے میں اسلامی عقائد کی وضاحت اور مختصر مگر جامع انداز سے اسلام کے اصولی احکام بھی بیان کیے گئے ہیں۔ انگریزی دان بچوں اور بڑوں کے لیے سلیس اور آسان انگریزی میں ترجمہ کروا کر بھی خود حضرت مؤرخِ ملتؒ نے شائع کروایا تھا۔

(۸) تذکرہ سیّدنا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ:

حضرت مؤرخ ملتؒ ۱۹۲۸ء تا ۱۹۴۵ء مدرسہ شاہی مراد آباد میں تدریس سے وابستہ تھے، اسی دوران شاہی کمیٹی قائم کر کے اس کی طرف سے محرم الحرام ۱۳۵۷ھ/ مارچ ۱۹۳۸ء میں ''قائد'' نامی رسالہ جاری فرمایا جس کے قائد التحریر خود آپ تھے۔ اس رسالہ میں آپ کے تازہ تازہ مضامین شائع ہوتے تھے۔ خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے متعلق کئی مضامین تھے۔ مولانا تنویر احمد شریفی صاحب مدظلہم (کراچی) نے ان رسائل سے وہ مضامین نکال کر لاہور میں حضرت مولانا سیّد حامد میاں صاحب رحمہ اللہ کی خدمت میں بھیج دیے۔ ان مضامین میں مولانا رحمہ اللہ نے کافی تبدیلی فرمائی، مزید عنوانات قائم فرمائے۔ اس طرح یہ کتاب کی شکل بن گئی۔ اس کتاب میں جنابِ ابوبکر صدیقؓ کی سیرت، حضور علیہ السلام کی رفاقت، وصال رسول کے موقع پر افراتفری کے وقت مسلمانوں کو ایک مرکز پر جمع کرنا، مرتدین اور جھوٹے نبیوں سے جہاد کرنا، صدیقی دورِ حکومت کے کارنامے

وغیرہ ذکر کیے گئے ہیں۔

(۹) ملتِ اسلامیہ کے مجاہدِ جلیل (حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ):

حضرت مؤرخ ملتؒ نے شیخ الاسلام حضرت مولانا سیّد حسین احمد مدنی رحمہ اللہ کے مختصر حالات اس کتاب میں قلمبند فرمائے ہیں۔اس مختصر کتاب کو پڑھ کر حضرت شیخ الاسلامؒ کی زندگی کے شب و روز، آزادی وطن کے لیے آپ کی محنتیں، حضرت شیخ الہندؒ کی رفاقت جیسے واقعات ہمارے لیے نمونہ بنتے ہیں۔

(۱۰) حیاتِ شیخ الاسلامؒ:

حضرت مؤرخ ملتؒ نے اس کتاب میں شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ کے مفصل حالاتِ زندگی تحریر فرمائے ہیں۔علماءِ حق اور مجاہدِ جلیل کے ہوتے ہوئے اس کتاب کو مرتب کرنے کی ضرورت کیوں محسوس کی گئی؟ حضرت مؤرخ ملتؒ اس بابت تحریر فرماتے ہیں:

''علماءِ حق حصہ اول و دوم میں حضرت شیخ الاسلام مولانا سیّد حسین احمد صاحب مدنی دامت برکاتہم کے کارنامے شائع ہو چکے ہیں، مگر چونکہ ایک مخصوص سلسلہ کے مجاہدانہ کارنامے اس کتاب کا موضوع ہیں، لہٰذا حضرت مدظلہ العالی کے باقی حالات اس کتاب میں نہیں آسکے، نیز اس کتاب کی ضخامت اور ضخامت کے بموجب اس کی قیمت اتنی ہوگئی ہے کہ ہر شخص کے لیے اس کا مطالعہ آسان نہیں رہا، اس لیے ایک مختصر رسالہ کی ضرورت محسوس ہوئی۔رسالہ مجاہدِ جلیل کے مطالعہ سے اگرچہ حضرت کی زندگی پر ایک نظر پڑ جاتی ہے، مگر حیاتِ شیخ الاسلام کے تمام پہلوؤں کو یہ رسالہ روشن نہیں کرسکتا۔'' (حیاتِ شیخ الاسلام ص: ۷)

حضرت مدنی رحمہ اللہ کی حیاتِ مبارکہ کے اکثر مخفی گوشوں کو نمایاں کرنے کے لیے یہ کتاب حضرت مدنیؒ کی حیات ہی میں ترتیب دی گئی تھی اس لیے زندگی کے آخری حالات اس میں بھی نہیں آسکے ہیں۔اس کتاب میں حضرت مدنیؒ کی زندگی کے مندرجہ ذیل پہلو روشن ہوتے ہیں:

ابتدائی حالات، دار العلوم دیوبند میں داخلہ، قیام مدینہ منورہ، کسبِ معاش، اسارتِ مالٹا، وطن واپسی، حضرت شیخ الہندؒ کے حکم پر کلکتہ روانگی، مقدمہ کراچی، آزادیِ وطن کے لیے جدو جہد، دار العلوم دیوبند کی صدارت، جمعیۃ علماءِ ہند کی صدارت، پاکستان کے متعلق رائے گرامی، مسلمان اور آئینِ حکومت ہند، آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کا سیاسی مقام حاصل کرنے کے لیے کوششیں، مرکزی اسمبلیوں کے انتخابات اور حضرت شیخ الاسلامؒ کی جرأت واستقامت وغیرہ وغیرہ۔

(د) فقہ وفتاویٰ:

(۱۱) فتاویٰ شاہی (غیر مطبوع) ترتیب: مفتی محمد سلمان منصور پوری مدظلہم

گزشتہ سطور میں تذکرہ ہوا ہے کہ حضرت مؤرخ ملتؒ سولہ سال مدرسہ شاہی میں مراد آباد میں تدریس سے وابستہ رہے، یہاں درس وتدریس کے ساتھ ساتھ شعبہ افتاء میں بھی خدمات انجام دیتے تھے۔ مولانا شبیر احمد صاحب قاسمی تحریر فرماتے ہیں:

''۱۳۵۸ھ میں درسِ نظامی کی اعلیٰ کتابوں، مسلم شریف، ترمذی شریف، مشکوۃ شریف، ہدایہ آخرین، مختصر المعانی، مقاماتِ حریری وغیرہ کے ساتھ ساتھ اِفتاء کی ذمہ داری بھی آپ کے سپرد کردی گئی۔ آپ نے نہایت محنت اور دلجمعی کے ساتھ اس فریضہ کو انجام دیا۔ ۱۳۵۸ھ سے ۱۳۶۶ھ تک ۴۵۸ فتاویٰ بقلم خود رجسٹر نقول فتاویٰ میں درج فرمائے۔ یہ فتاویٰ ایک عظیم علمی سرمایہ کی حیثیت رکھتے ہیں جن کی ترتیب واشاعت کی تیاری جاری ہے۔ ان شاء اللہ جلد ہی زیورِ طبع سے آراستہ ہوکر منظرِ عام پر آئیں گے۔''

(ماہنامہ ندائے شاہی کا تاریخ شاہی نمبر ص: ۱۷۴)

مزید تحریر فرماتے ہیں:

''۱۴۱۰ھ ہی سے ترتیبِ فتاویٰ کا کام بھی باقاعدہ شروع کیا گیا ہے۔ یہ خدمت جناب مولانا کلیم اللہ سیتاپوری کے تعاون سے حضرت مولانا مفتی محمد سلمان صاحب انجام دے رہے ہیں۔ اب (۱۹۹۲ء) تک حضرت مولانا مفتی محمد میاں صاحبؒ کے فتاویٰ کی

ترتیب وتحشیہ کا کام ہوا ہے۔ ان شاء اللہ جلد ہی یہ گرانقدر مجموعہ شائع کرنے کا پروگرام ہے۔''(ایضًا ص:۱۷۳)

تاحال یہ مجموعہ فتاویٰ غیر مطبوع ہے، جو ہمارے پیش نظر ہے، یہ مندرجہ ذیل اَبواب پر منقسم ہے:

باب اوّل: کتاب العقائد

باب دوم: رسوم وبدعات کی تردید

باب سوم: قرآن وحدیث سے متعلق نیز سلوک وتصوف کے مسائل

باب چہارم: مساجد، مدارس اور عام اَوقاف سے متعلق مسائل

باب پنجم: کتاب الطہارۃ

باب ششم: مساجد سے متعلق مسائل

حضرت مؤرخِ ملتؒ کے پڑپوتے مولانا محمد حسان صاحب حفظ الرحمٰن بن مولانا سیّد رشید میاں صاحب مدظلہم دو تین سال پیشتر ہندوستان تشریف لے جارہے تھے تو راقم نے ان سے عرض کیا کہ:

''کیا ہی اچھا ہو کہ اگر جناب یہ مجموعہ فتاویٰ وہاں سے فوٹو اسٹیٹ لیتے آئیں۔''

اللہ جزائے خیر مرحمت فرمائے کہ وہ باقاعدہ سفر کرکے مراد آباد گئے اور بہت اہتمام سے اس کا فوٹو کروا کرلائے، ہم نے بھی یہاں اسی سے فوٹو لیا ہے۔ مولانا قاری تنویر احمد شریفی صاحب مدظلہم (کراچی) نے مدرسہ شاہی کے علاوہ دیگر مقامات پر دیے گئے فتاویٰ بھی جمع کیے ہیں۔

(۱۲) نور الاصباح ترجمہ وتشریح نور الایضاح:

حضرت علامہ فقیہ ابوالاخلاص حسن الوفائی الشرنبلالیؒ (م:۱۰۶۹ھ) کثیر التصانیف بزرگ ہیں، آپ کی تصنیفات میں فقہ کی ایک کتاب ''نور الایضاح'' بہت مشہور کتاب ہے۔ یہ کتاب ہندوپاک میں درس نظامی کے ابتدائی درجات میں پڑھائی جاتی ہے۔ اس کی

شرح مصنفؒ نے ''مراقی الفلاح'' کے نام سے خود لکھی تھی۔ حضرت مؤرخ ملتؒ نے نورالایضاح کا اُردو ترجمہ کیا اور شرح لکھی جس میں مراقی الفلاح سے بہت سی تشریحات لی ہیں۔ آپ نے اُردو ترجمہ کا نام ''نورالاصباح'' اور تشریحات کا نام ''ایضاح الاصباح'' تجویز فرمایا تھا۔ (اس کتاب کے تفصیلی تعارف کیلئے دیکھئے ص: ۲۶۹/۲۷۰۔ مرتب)

(۱۳) روزہ اور زکوۃ (بچوں کے لیے):

اسلام کے بنیادی اَرکان میں سے ایک اَہم رُکن روزہ اور ایک رُکن زکٰوۃ ہے۔ عام طور پر عوام الناس رمضان ہی میں زکٰوۃ کا عمل سرانجام دیتے ہیں۔ حضرت مؤرخِ ملتؒ نے اسی لیے اس کتاب میں دونوں اَرکان کے فضائل ومسائل ذکر فرمائے ہیں۔ روزہ کی بحث میں فدیہ صوم کے ساتھ ساتھ نمازوں کے فدیہ کے بارے میں بتایا ہے۔ اعتکاف، رؤیتِ ہلال اور نذر ومنت کے مسائل بھی ذکر فرمائے ہیں، اِسی طرح زکٰوۃ کے مسائل کے ساتھ ساتھ صدقۂ فطر کے مسائل بھی ذکر کر دیے ہیں۔ یہ رسالہ دینی تعلیم کے رسالہ کا گیارہواں حصہ ہے جس میں حضرت مؤرخ ملتؒ نے معمولی سی تبدیلی کر کے الگ شائع کیا تھا۔

(۱۴) رُویت ہلالِ رمضان وعید کے مسائل ودلائل:

رؤیت ہلال ہمارے زمانہ کے بڑے مسائل میں سے ایک اَہم مسئلہ ہے، اَوقات نماز کے ساتھ ساتھ روزے، عیدیں اور یومِ عرفہ یعنی حج کی تعیین نیز اس مسئلہ کے ساتھ مسلمانوں کی بڑی بڑی عبادات وابستہ ہیں۔ حضرت مؤرخِ ملتؒ نے اپنی اس کتاب میں اس مسئلہ کو فقہائے متقدمین اور متاخرین کے دلائل سے مزین کر کے تحقیقی انداز میں پیش فرمایا ہے۔

(۱۵) مسنون دعائیں:

حضرت مؤرخِ ملتؒ نے اس کتابچہ میں مختلف حالات اور صبح وشام کے اَوقات میں پڑھی جانے والی تقریباً چالیس دُعائیں جمع فرمائی ہیں۔

(۱۶) مجموعہ خطبات ماثورہ ومقبولہ:

حضرت مؤرخِ ملتؒ نے اس کتاب میں جمعہ کے دن کے فضائل ومسائل، آداب واَحکام، نیز صلوٰۃ التسبیح اور نمازِ استخارہ ذکر کرنے کے بعد حضور ﷺ کے گیارہ خطبات ماثورہ، عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے خطبات، خطبۂ نکاح، دعائے عقیقہ، خطبہ استسقاء جمع فرما کر ان سب کا ترجمہ بھی کیا ہے، بعد ازاں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ، حضرت مولانا شاہ محمد اسمٰعیل شہیدؒ اور شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے خطبات ''خطبات مقبولہ'' کے نام سے جمع کر کے ان کا بھی ترجمہ کیا ہے۔

(۱۷) المختار للفتوٰی:

علامہ ابو الفضل مجد الدینؒ کی کتاب کا اُردو ترجمہ۔ یہ ترجمہ قسط وار ماہنامہ ''قائد'' مرادآباد میں شائع ہوتا رہا ہے۔

(ھ) تاریخ وسیاست:

(۱۸) تاریخ اسلام:

حضرت مؤرخِ ملتؒ کے اُستاذِ گرامی شیخ الادب والفقہ حضرت مولانا محمد اعزاز علی صاحبؒ کی تحریک اور ایما پر آپ نے مسلمان بچوں اور بچیوں کی اسلامی، تاریخی اور اَخلاقی و مذہبی تعلیم کے لیے سوال وجواب کی صورت میں تین حصوں میں تاریخ کا ایک نصاب مرتب کیا۔ پہلا حصہ سرورِ کائنات حضرت محمد مصطفی ﷺ کی مکی زندگی، دوسرا مدنی زندگی اور تیسرا حصہ رسول اکرم ﷺ کے اَخلاق وعادات کے ذکر میں ہے۔ یہ کتاب ابتدائی درجات کے طلباء وطالبات کے لیے نہایت مفید ہے۔ غالبًا یہ سب سے پہلی تصنیف ہے جو بچوں کے لیے سوال وجواب کے انداز میں لکھی گئی ہے۔ پاکستان میں وفاق المدارس العربیہ کے نصاب میں عرصہ سے شامل ہے اور ہر سال ہزاروں کی تعداد میں شائع ہوتی ہے۔

(۱۹) صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم کا عہدِ زرّیں اور مثالی حکومتیں:

اِس کتاب کا اصل ماخذ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی کتاب ''اِزالۃ الخفا عن خلافۃ الخلفاء'' ہے، جس کا اُردو ترجمہ حضرت مؤرخ ملتؒ نے زمانۂ اسارت میں شروع کیا تھا، لیکن بعد میں مضامین کے پھیلاؤ اور کثرت کی وجہ سے یہ ایک مستقل کتاب بن گئی۔ دو جلدوں اور تقریباً نو سو صفحات پر مشتمل اِس کتاب میں یہ وضاحت کی گئی ہے:

حضراتِ صحابہ رضوان اللہ علیہم واجب الاحترام کیوں ہیں؟

صحابۂ کرامؓ کائنات کی آنکھ کا تارا ہیں، یہ محض ایک عقیدت ہے یا حقیقت؟

کلامِ اِلٰہی نے اِس جماعت کے کیا فضائل بتائے ہیں؟

خلافتِ راشدہ اور اُس کے مراتب کیا ہیں؟

تاریخِ اسلام میں خلافتِ راشدہ اور خلفاء اشدین کی اہمیت اور قرآن وحدیث سے اُس اہمّیت کے دلائل وشواہد

کتاب کا بنیادی مقصد حضرات صحابہؓ کی مُقدّس جماعت پر تنقید وتنقیص کے دروازے کو بند کرنا ہے، جو تحقیق کے نام پر کھول دیا گیا ہے۔ حضرت مؤرخ ملتؒ کا طرزِ تحریر نہ صرف حقائق کو بیان کر کے حضراتِ صحابہ کی مبارک شخصیات سے غبار کو صاف کرتا ہے بلکہ قاری کے دل کو اُن کی محبت وعقیدت سے سرشار بھی کر دیتا ہے۔

(۲۰) علماءِ ہند کا شاندار ماضی:

حضرت مؤرخ ملتؒ کی یہ کتاب چار جلدوں پر مشتمل ہے:

پہلی جلد: حضرت مؤرخ ملتؒ نے اِس جلد میں امام ربانی حضرت مجدد الفِ ثانیؒ، آپ کے خلفاء اور خلفاء الخلفا کے سوانح، چار مغل بادشاہ، اکبر، جہانگیر، شاہجہان اور عالم گیر کا سیاسی وحکومتی نظام نیز اِن تمام حضرات کے معاصرین کے حالات اور سیاسی کارنامے اور تقریباً اڑھائی سو سالہ دور کے سیاسی ومعاشی رجحانات، مقتضیات، علماء اُمت کی مجاہدانہ واصلاحی سرگرمیاں اور اُن کے نتائج وغیرہ تفصیل سے پیش کیے ہیں۔

دوسری جلد: یہ جلد حکیم الامت حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے انقلاب انگیز سیاسی اور اقتصادی نظریات، اُن کی تعلیم و تربیت کے مراکز، سراج الہند حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کی تربیت اور سیاسی حالات کے پیش نظر ہندوستان کے دارالحرب ہونے کا فتوی، حضرت سیّد احمد شہیدؒ اور حضرت شاہ اسمٰعیل شہیدؒ نیز اُن کے رفقا کے مجاہدانہ کارنامے اور قربانیاں وغیرہ، جنگ و نتیجہ جنگ، اٹھارویں صدی عیسوی کا سیاسی ماحول، متحارب طاقتیں، شاہانِ اَوَدھ، حافظ رحمت خان شہید، روہیلے اور مرہٹے، مرہٹوں کی ریاستیں اور اُن کے کام، آلِ سعود کی تاریخ، سکھ حکومت کا عروج و زوال کے بیان پر مشتمل ہے۔

تیسری جلد: یہ جلد ایک ایسی تحریک جو بنگال کے مشرق سے لے کر شمالی ہند کی مغربی سرحد تک پھیلی ہوئی تھی جو ۱۸۵۷ء کے ہیبت ناک خونی ہنگاموں کے بعد بھی سالہا سال زندہ رہی جس کے مقابلہ کے لیے برطانوی فوجوں کو بار بار خون کی ہولی کھیلنی پڑی، اس تحریک کے رہنماؤں کے حالات، اَخلاق و کردار، بے مثال قربانیاں، مقدمات و فیصلے، سکھوں کی سرگزشت اور اُس زمانہ کے قابل قدر سیاسی انکشافات پر مشتمل ہے۔

چوتھی جلد: یہ جلد تین ابواب پر مشتمل ہے:

(i) ۱۸۵۷ء کی تحریکِ آزادی، اُس کے اَسباب و وجوہ اور اس کے متعلق ہونے والے اعتراضات کے جوابات
(ii) ۱۸۵۷ء کی تحریک کے مراکز اور مجاہدین حریت کی جدوجہد اور انتقامی کارروائیاں
(iii) ۱۸۵۷ء کی تحریک کے زعماء اور رہنما اور اُن کی خدمات

(۲۱) علمائے حق اور اُن کے مجاہدانہ کارنامے:

حضرت مؤرخ ملتؒ کی یہ کتاب برطانوی استعمار کے خلاف علماء کرام کی جدوجہد کی تاریخ پر مشتمل ہے۔ اس کی دو جلدیں ہیں:

پہلی جلد: اس جلد میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے لے کر جنگ عظیم دوم کے آغاز سے پہلے ۱۹۳۱ء تک کے حالات، تحریکات اور رجالِ کار کی خدمات کا احاطہ کیا گیا

ہے۔ متحدہ ہندوستان میں سیاسی عوامل ،انقلابی جماعتوں اور علماء دیوبند کی جدوجہد، دارالعلوم دیوبند کے قیام اور اَغراض ومقاصد،علی گڑھ یونیورسٹی اور اُس کی غرض وغایت اور پالیسی،انڈین نیشنل کانگریس اور جمعیۃ علماء ہند کی قربانیوں اور مسلم لیگ کی تاریخ پر محققانہ انداز میں بحث کی گئی ہے۔

دوسری جلد: اِس جلد میں جنگ عظیم دوم کے آغاز اور اس کی تباہ کاریوں کے تذکرے، جنگ عظیم کے دوران بین الاقوامی حالات، ہندوستان کی سیاست،کانگریس اور جمعیۃ علماء ہند کی خدمات،مسلم لیگی پالیسی،ان تینوں جماعتوں کی تجاویز، شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کی بار بار اسارت،فسادات دہلی اور اس سلسلہ میں جمعیۃ علماء ہند کے اکابر اور کارکنوں کی جدوجہد، ۱۹۴۸ء میں گاندھی جی کا حادثۂ قتل وغیرہ اَبحاث تفصیل سے تحریر کی گئی ہیں۔

(۲۲) تحریک شیخ الہندؒ:

حضرت مؤرخ ملتؒ کی اس کتاب کے بارہ میں ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہانپوری صاحب مدظلہم نے تفصیل سے لکھا ہے،مناسب معلوم ہوتا ہے کہ وہی تفصیل من وعن یہاں دے دی جائے۔ ملاحظہ فرمائیں:

''۱۹۱۵ء میں حضرت شیخ الہندؒ نے ایک منصوبے کے تحت مولانا عبیداللہ سندھیؒ کو کابل بھیجا تھا اور خود حجاز تشریف لے گئے تھے۔ یہ دونوں سفر ایک ہی مقصد کے تحت تھے۔ پیش نظر یہ تھا کہ برطانیہ عالمی جنگ میں پھنسا ہوا ہے اور ہندوستان میں اس کی کوئی خاص فوجی قوت موجود نہیں ہے۔ اس موقع پر ترکی اور افغانستان کی مدد سے اگر ہندوستان پر حملہ کیا جائے اور اندرونِ ملک بغاوت کر دی جائے تو ہندوستان سے برطانوی اقتدار کا خاتمہ کیا جا سکتا ہے۔

مولانا سندھیؒ کے کابل پہنچنے سے دس روز قبل ہندوستان کے انقلابی راجہ مہندر پرتاب اور برکت اللہ بھوپالی، جرمنی اور ترکی کے نمائندوں پر مشتمل ایک مشن

لے کر کابل پہنچ چکے تھے ۔ وہ بھی اسی مقصد سے کابل پہنچے تھے کہ وقت کے سیاسی حالات اور عالمی تناظر میں ہندوستان کی آزادی کے لیے کوئی راہ نکالی جائے۔

انہوں نے ۱۹۱۶ء کے آغاز میں ہندوستان کی عارضی حکومت بھی قائم کر لی۔ مولانا سندھیؒ عارضی حکومت کے قیام کے مشورے میں شریک نہیں تھے لیکن ہندوستان کے ترکی جرمن مشن کے ارکان اور حکومت کے بانیان نے ان کی اہمیت اور کابل کے اونچے حلقے میں ان کے رسوخ کو دیکھ کر عارضی حکومت میں شامل ہونے کی انہیں پیش کش کی اور انہوں نے پیش کش قبول کر لی۔ وہ حکومت میں وزیر داخلہ بنا لیے گئے۔ اسی زمانے میں مولانا سندھیؒ نے مسلم سالویشن آرمی یا جنود ربانیہ کا منصوبہ بنایا تھا۔ مولانا سندھیؒ نے ہندوستان کی عارضی حکومت کے قیام اور مسلم سالویشن آرمی کے منصوبے اور دیگر حالات سے اپنے استاذ اور سیاسی مربی مولانا محمود حسنؒ کو مطلع کرنا چاہا اور ریشمی کپڑے کے دو ٹکڑوں پر خوش خط لکھ کر عبدالحق نامی ایک شخص کے ہاتھ سندھ کے ایک نومسلم سیاسی رہنما شیخ عبدالرحیم (حیدرآباد، سندھ) کو بھیجے اور ہدایت کی کہ وہ ان خطوط (ریشمی کپڑے پر لکھے ہوئے) کو کسی ذریعہ سے مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کو (جو بعد میں شیخ الہندؒ کے لقب سے ملقب و مشہور ہوئے) حجاز پہنچا دیں لیکن یہ خطوط شیخ صاحب تک پہنچنے سے پہلے ہی حکومت کے ہاتھ لگ گئے، ہندوستان میں ان خطوط سے حاصل شدہ معلومات کی روشنی میں سلسلۂ دار و گیر شروع ہو گیا۔

اسی طرح حضرت شیخ الہندؒ حجاز پہنچے تو انہوں نے وہاں اپنی کوششیں شروع کر دیں۔ گورنر حجاز غالب پاشا سے ملاقات کی، ان کا اعتماد حاصل کیا اور ان سے اپنی تحریک کے بارے میں ایک تحریر حاصل کی، جو غالب نامہ کے نام سے مشہور ہوئی۔

ترکی زعماء کے نام ان کے اعتماد اور ملاقات کے لیے خطوط حاصل کیے اور اس تعارف کے ذریعہ مدینہ منورہ میں انور پاشا اور جمال پاشا سے ملاقاتیں کیں، آزادی ہند کے منصوبے پر ان سے مشورے کیے اور ان سے کئی وثیقے حاصل کیے۔ لیکن یہ تمام باتیں راز نہ رہ سکیں۔ حجاز میں حسین شریفِ مکہ کی ترکی خلافت سے بغاوت نے حالات کو اور پیچیدہ بنا دیا۔ حضرت شیخ الہندؒ اور اُن کے رفقا کو گرفتار کر کے

مالٹا میں قید کر دیا گیا۔ ہندوستان میں بھی تحریک کے کارکنوں اور دیگر افراد کے لیے پریشان کن حالات پیدا ہو گئے۔ اور بساطِ سیاست کا پانسہ یک سر پلٹ گیا۔

حکومتِ ہند کو کابل اور حجاز میں تحریکِ آزادیٔ ہند کی کوششوں کے بارے میں اطلاعات ملی تھیں، پھر خطوط و تحریرات اور وثائق بھی ہاتھ لگ گئے۔ ان کی بنیاد پر ایک مقدمہ تیار کیا گیا اس میں استغاثے کے بڑے ملزم مولانا عبیداللہ سندھیؒ تھے اور ان کے انسٹھ شریک ملزمان تھے، ان کے ثبوت میں مولانا سندھیؒ کے خطوط، غالب نامہ اور دیگر تحریرات شامل تھیں۔ استغاثے کے ساتھ تقریباً دو سو بیس افراد کے بارے میں محض ضروری معلومات اور تعارف میں ایک ڈائریکٹری بھی تھی جو انٹیلی جنس نے اپنی ضرورت اور سہولت کی خاطر تیار کر کے شامل کر دی تھی۔ اگرچہ ریشمی رومال سازش کیس باقاعدہ چلانے کی نوبت نہیں آئی تھی لیکن کیس تیار کر لیا گیا تھا۔

یہ تمام کاغذات انڈیا آفس لائبریری میں محفوظ تھے، جو کسی ذریعے سے مورخِ ملت مولانا سیّد محمد میاںؒ کو حاصل ہو گئے۔ انہوں نے ان تمام مواد کو مرتب کر کے چھپوا دیا تھا۔ اس کے ساتھ چند بیرونی تحریریں شامل ہیں۔ جن کی تفصیل یہ ہے:

(i) پیش لفظ: از قلم حضرت مولانا سیّد اسعد مدنیؒ (وفات ۶ / فروری ۲۴ / اکتوبر ۱۹۷۵ء) صفحہ ۱۵ تا ۲۴۔

(ii) تعارف: از قلم حضرت مولانا سیّد محمد میاںؒ (وفات ۲۴ / اکتوبر ۱۹۷۵ء) صفحہ ۲۵ تا ۲۴۔

مورخِ ملتؒ نے اس تحریک کے پس منظر، اس کے نشو و نما اور فروغ کی تفصیلات، حضرت شیخ الہند کے منصوبے کی تفصیلات، استغاثہ کے ساتھ شامل مواد انٹیلی جنس کی حقیقت تک رسائی، استغاثہ کے ساتھ شامل مواد کی حیثیت اور استغاثے کی تالیف میں اہم غلطیوں کی نشاندہی بھی ہے۔

(iii) کتاب کے شروع میں مولانا عبیداللہ سندھیؒ (وفات ۲۱ / اگست ۱۹۴۴ء) کا ایک اہم مضمون ''شاہ ولی اللہؒ اور ان کی تحریک'' بطور پیش لفظ شامل کیا ہے۔ یہ مضمون ولی اللّٰہی تحریک کو دارالعلوم دیوبند کی تحریک سے اس مقام پر جوڑ

دیتا ہے جہاں سے مولانا سیّد اسعد مدنیؒ نے اپنے پیش لفظ کا آغاز کیا تھا۔اس طرح ریشمی رومال تحریک کو تاریخ کا دوسوسالہ پس منظر مل جاتا ہے۔

اس سے ثابت ہوجاتا ہے کہ تحریک شیخ الہندؒ کا ظہور دوسوسالہ تاریخ کے واقعات اور تحریک ولی الٰہی کا لازمی تسلسل ہے۔تاریخ کے اس سفر میں نشیب وفراز، مشکلات اور آزمائشیں ضرور پیش آئیں لیکن کوئی پیچ وخم نہیں، جس میں مقصد کبھی دھندلا گیا ہو یا منزل کبھی نظروں سے اوجھل ہوگئی ہو۔

(حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی قدس اللہ سرہ العزیز کی سیاسی ڈائری ج:۷،ص:۱۴تا۱۷)

(۲۳) اَسیرانِ مالٹا:

حضرت شیخ الہندؒ مع رفقاء کرام ۱۳۳۵ھ/ دسمبر ۱۹۱۶ء کو مکہ مکرمہ میں قید کیے گئے ،وہاں سے مالٹا بھیجے گئے اور ۲۰ر رمضان المبارک ۱۳۳۸ھ/ ۸ر جون ۱۹۲۰ء کو بمبئی کے ساحل پر ساڑھے تین سال بعد آزاد کیے گئے ، چند ماہ بعد حضرت شیخ الہندؒ کا وصال ہوگیا ،آپ کے انتقال کے بعد شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ نے ''سفر نامہ اسیر مالٹا'' کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں تمام اسیران حضرات کے مختصر حالات درج فرمائے ،لیکن یہ اُس دور کی تصنیف ہے جبکہ متحدہ ہندوستان برٹش سامراج کے آہنی پنجوں میں تھا ،رولٹ ایکٹ کے نفاذ کی وجہ سے مصلحتاً حضرت مدنیؒ نے تمام تفصیلات درج نہیں کیں۔۱۹۴۷ء میں ملک کی آزادی کے بعد حضرت مدنیؒ نے ۱۹۵۳ء میں اپنی خودنوشت ''نقش حیات'' میں تمام تفصیلات درج فرمادیں۔

حضرت مؤرخ ملتؒ نے ان تمام حالات وواقعات کو از سر نو ترتیب دے کر ۱۹۷۵ء میں ''اسیرانِ مالٹا'' کے نام سے ایک کتاب مرتب فرمائی جس میں مندرجہ ذیل اَفراد کے حالات جمع کیے ہیں:

(i) شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب رحمہ اللہ (م:۱۳۳۹ھ/ ۱۹۲۰ء)

(ii) شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمہ اللہ (م:۱۳۷۷ھ/ ۱۹۵۷ء)

(iii) مولانا حکیم سید نصرت حسین رحمہ اللہ (م: ۱۳۳۷ھ/ ۱۹۱۹ء، مدفون: مالٹا)
(iv) حضرت مولانا عزیر گل صاحب رحمہ اللہ (م: ۱۴۱۰ھ/ ۱۹۸۹ء)
(v) مولانا سید وحید احمد مدنی صاحب رحمہ اللہ (م: ۱۳۵۷ھ/ ۱۹۳۸ء)

یہ کتاب حضرت مورخ ملتؒ نے اپنی زندگی کے آخری دور میں تالیف فرمائی تھی، ابھی اس کی اشاعت کی نوبت بھی نہ آئی تھی کہ آپ کا وقت موعود آ پہنچا، کتاب کی اشاعت آپ کی وفات کے تقریباً آٹھ ماہ بعد ۱۹۷۶ء میں ہوئی۔

(۲۴) جمعیۃ العلماء کیا ہے؟:

جمعیۃ علماء ہند کے یوم تاسیس (۲۲/نومبر ۱۹۱۹ء) سے لے کر آزادی برصغیر (اگست ۱۹۴۷ء) تک جمعیۃ علماء ہند کی خدمات کا تذکرہ جمعیۃ علماء کیا ہے؟ حصہ اول میں اور جمعیۃ علماء کے اجلاسات میں منظور ہونے والی تجاویز، قراردادیں اور فیصلے حصہ دوم میں حضرت مؤرخ ملتؒ نے جمع فرمائے ہیں، اِن تجاویز سے جمعیۃ علماء ہند کی تاریخ پر روشنی پڑتی ہے، تاریخ جمعیۃ میں یہ کتاب سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔

(۲۵) مختصر تذکرہ خدمات جمعیۃ علماءِ ہند (چار حصے):

جمعیۃ علماء ہند کی ۱۹۴۶ء تک کی خدمات کا تذکرہ حضرت مؤرخ ملتؒ نے ''جمعیۃ علماء کیا ہے؟'' میں ذکر فرمایا ہے، اِن چار حصوں میں ۱۹۴۷ء کے بعد کی خدمات کا احاطہ کیا گیا ہے، جن خدمات کی بدولت اکابر جمعیۃ علماء ہندوستان میں اسلامی تہذیب کو بہت بڑی آزمائش سے نکالنے میں کامیاب ہوگئے۔

ان حصوں میں جمعیۃ علماء ہند کی کون کون سی خدمات جمع کی گئی ہیں اور کیوں؟ حضرت مؤرخ ملتؒ کی زبانی ملاحظہ فرمائیں:

''جمعیۃ علماء سے تعلق رکھنے والے اور بہی خواہانِ جمعیۃ علماء ہند کا تقاضا بھی ہے کہ اُن خدمات کو بھی ہمدردانِ ملت کے سامنے پیش کیا جائے جو جمعیۃ علماء ہند نے ۱۹۴۷ء کے ہنگامی دور اور اُس کے بعد گزشتہ آٹھ سال میں انجام دی ہیں جو آزاد ہند میں مستقبل کے لیے

بنیاد کی حیثیت رکھتی ہیں اور جن کے متعلق بجا طور پر کہا جاسکتا ہے کہ ترقی ملت کی وہ تمام تعمیریں جو اِس وقت یا آنے والے دور میں قائم کی جائیں اُن کی بنیاد یہی خدمات ہوں گی جو جمہوریہ ہند کے دستورِ اَساسی کی تکمیل اور نفاذ کے آغاز میں جمعیۃ علماءِ ہند کے خدام اور اَراکین انجام دے چکے ہیں۔

یہ خدمات تین قسم ہیں:

(i) بنیادی: یعنی ایسی خدمات جن کے ذریعہ مسلمانوں کو ہندیونین میں ایک موقف اور مقام حاصل ہوا اور جنھوں نے مسلمانوں کے دماغوں اور ذہنوں میں انقلاب پیدا کیا۔

(ii) امدادی: یعنی ریلیف کے وہ کام جو ہنگاموں اور مصائب کے وقت انجام دیے گئے۔

(iii) تعمیری: یعنی حفاظتِ دین، ترقیِ ملت اور مسلمانوں کے روشن مستقبل کے مقصد سے جو خدمات انجام دی گئیں یاد دی جارہی ہیں۔'' (مختصر تذکرہ خدمات جمعیۃ علماءِ ہند حصہ: اول، ص: ۳)

(۲۶) ہندوستان شاہانِ مغلیہ کے عہد میں:

حضرت مؤرخ ملتؒ نے اس کتاب میں سلاطین مغلیہ کے نظام حکومت، عدل واِنصاف، اُس دور کے تعلیمی حالات، ہندو مسلم تعلقات، ہندوستان کی خوش حالی، صنعتی وتجارتی ترقی، یورپین اَقوام کی آمد، ایسٹ انڈیا کمپنی کا تسلط، حکومتِ مغلیہ کا زوال اور اس کے حقیقی اَسباب سے مفصل بحث کی ہے۔ بہ قول حضرت مؤرخ ملتؒ:

''یہ علماءِ ہند کا شان دار ماضی کا تتمہ ہے، دوسرے اَلفاظ میں وہ شان دار ماضی کی داستان تھی اور یہ داستانِ بربادی ہے۔'' (پس مرگ زندہ ص: ۸۷)

(۲۷) پانی پت اور بزرگانِ پانی پت:

حضرت مؤرخ ملتؒ پانی پت کے حوالہ سے تحریر فرماتے ہیں:

''دنیا کی چشم حیرت نگار نے ۱۹۴۷ء جیسا کوئی انقلاب نہیں دیکھا ہوگا کہ نہ دو بادشاہتوں میں تصادم ہوا، نہ حاکم اور محکوم کے آپس میں خونریزی ہوئی، حکمران محفوظ، فوجیں محفوظ، مگر پنجاب وبنگال کے عوام تباہ وبرباد، اس انقلاب نے پانی پت کا بھی روپ بدل

دیا، تقریباً پچاس ہزار کی مسلم اکثریت شہر بدر، مسجدیں ویران، مدرسے برباد، مقابر و مزارات تباہ، جس شہر میں ہزاروں حافظ قرآن اور نہ صرف مرد بلکہ عورتیں بھی حافظ قرآن، اُس شہر میں صرف ایک کلمہ گو باقی رہ گیا جس کی قوت ایمانی نے اس کے قدمِ استقلال کو پہاڑ سے زیادہ مضبوط بنادیا، یہ مولانا لقاء اللہ صاحب عثمانی کا نفس نفیس تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ تقریباً دو سال بعد اسی ایک جڑ سے شاخیں پھوٹنی شروع ہوئیں۔'' (پانی پت اور بزرگانِ پانی پت ص:۶۹)

حضرت مؤرخ ملتؒ نے یہ کتاب کیوں لکھی؟ فرماتے ہیں:

''اِن حالات کی بنا پر حضرت مولانا لقاء اللہ صاحب عثمانی کا اصرار ہوا کہ پانی پت اور بزرگانِ پانی پت کے حالات یکجا شائع کردیے جائیں تاکہ چشم عبرت کے لیے ذخیرہ رہیں۔'' (پانی پت اور بزرگانِ پانی پت ص:۷۰)

حضرت مؤرخ ملتؒ نے اس کتاب میں کئی پانی پتی بزرگوں کا تذکرہ فرمایا ہے جن میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں:

(i) حضرت بوعلی قلندرؒ
(ii) حضرت خواجہ شمس الدین ترک پانی پتیؒ
(iii) حضرت شاہ اعلیٰ چشتی پانی پتیؒ
(iv) حضرت خواجہ عبدالرحمٰن گازرونیؒ

(۲۸) جہادِ اسلامی اور دورِ حاضر کی جنگ

حضرت مؤرخ ملتؒ کی یہ تحریر ۱۹۵۰ء کے لگ بھگ کی ہے جو آپ نے حضرت مولانا محمد ازہر شاہ قیصر صاحبؒ کی فرمائش پر لکھی تھی۔ حضرت مؤرخ ملتؒ نے اس مقالہ میں اولاً اسلام کا تعارف کروایا ہے کہ اسلام کا ضابطۂ حیات اور اسلام کا مذہبی نقطۂ نظر کیا ہے؟ پھر یہ بتایا ہے کہ اسلام جبکہ حقوق اور روحانیت کی تعلیم دیتا ہے تو اس کا تعلق جنگ اور جہاد سے کیا ہے؟ وہ مسجد و خانقاہ کو چھوڑ کر میدانِ جنگ کی طرف کیوں بڑھتا ہے؟ اسلام کا نظام سیاسی کیا ہے؟ جماعت مجاہدین کے خصائص کیا ہیں؟ ایک مجاہد کے جذبات اور اس کی شان

کیا ہے؟ آخر میں اسلامی جہاد اور دورِ حاضر کی لڑائیوں پر بھی نظر ڈالی ہے۔ حضرت مؤرخ ملتؒ کی یہ تحریر تقریباً ستر سال گزرنے کے بعد آج بھی تازہ دم ہے۔

(۲۹) دورِ جدید کی ہندوستانی سیاست میں مسلم علماء کا کردار:

دورِ جدید سے کیا مراد ہے؟ حضرت مؤرخ ملتؒ خود تحریر فرماتے ہیں:

''دورِ جدید سے مراد ہم وہ دور لیتے ہیں جب سے انڈین نیشنل کانگریس نے نظریات کی اسٹیج سے آگے بڑھ کر میدانِ عمل کا رُخ کیا۔''

(دورِ جدید کی ہندوستانی سیاست میں مسلم علماء کا کردار، ص:۳)

انڈین نیشنل کانگریس کی ابتدا تقریباً ۱۸۸۵ء میں ہوئی تھی، تو گویا ۱۸۸۵ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک کے سیاسی معاملات میں مسلم علماء کا کیا کردار رہا؟ حضرت مؤرخ ملتؒ نے اس کتاب میں وہ کردار واضح فرمایا ہے۔

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے اثرات اور فکرِ مستقبل، انڈین نیشنل کانگریس کی ابتدا، سیاسی میدان میں علماء کا موقف، جداگانہ انتخابات، تحریک شیخ الہندؒ کی ایک جھلک، پہلی جنگ عظیم کے خاتمہ پر سیاسی حالات میں تبدیلی اور حضرات علماء کا موقف، ترک موالات کا فتوٰی، شدھی اور تبلیغ کی تحریکیں، جمعیۃ علماء ہند کی طرف سے آزادیِ کامل کی تجویز، متحدہ قومیت اور دوقومی نظریہ، جمعیۃ علماء ہند کا فارمولا، ہنگامۂ تقسیم اور تبادلہ آبادی، علماء اور قوم پرور مسلمانوں کا موقف، ۱۹۴۷ء کے بعد جمہوریت کے لیے جدوجہد، سیکولر جمہوریہ کا نقشہ جیسے عنوانات پر مشتمل ایک سنجیدہ تحریر ہے۔

(۳۰) امامتِ اُمت کا دستورِ اَساسی

(دستورِ اَساسی اِمامتِ اُمت (فارسی) از مولانا محمد میاں انصاریؒ) کا ترجمہ:

حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے نواسے اور مولانا عبداللہ انصاری صاحبؒ (ناظم تعلیمات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) کے صاحبزادے حضرت مولانا محمد میاں المعروف منصور انصاری صاحبؒ ایک علمی و تاریخی شخصیت کے حامل فرد تھے، تحریک شیخ

الہندؒ کے نامور ساتھی تھے۔آپ نے فارسی میں چند کتب تصنیف فرمائی ہیں جن میں سے ایک کتاب ''دستورِ اَساسیِ اِمامتِ اُمت'' کا اُردو ترجمہ حضرت مؤرخ ملتؒ نے کیا۔ یہ ترجمہ ''قائد'' مرادآباد میں قسط وار شائع ہوتا رہا ہے۔آپ ہی کا ایک مضمون ''سورۂ فاتحہ کی مجمل سیاسی تفسیر'' بھی مرادآباد کے رسالہ ''قائد'' میں قسط وار شائع ہوتا رہا ہے۔اللہ کرے کہ ان دونوں مضامین کی تمام اَقساط جمع کر کے کتابی شکل میں شائع ہوں تو علم دوست حضرات کے لیے کسی نعمت سے کم نہ ہوں گی۔آپ کی ایک کتاب کا نام ''حکومت الٰہی'' اور ایک ''احساس انقلاب یا مراقبہ نماز'' بھی ہے۔

(۳۱) اَقسامِ حکومت وحریت

(اَنواع الدول وحریت الملل، (فارسی) از مولانا محمد میاں انصاریؒ کا ترجمہ):

حضرت مولانا محمد میاں صاحب المعروف منصور انصاری صاحبؒ ہی کی ایک فارسی تصنیف ''اَنواع الدول وحریت الملل'' ہے، جو آپ نے ۱۳۵۶ھ/ ۱۹۳۸ء میں تصنیف کی۔آپ نے اس کتاب میں حکومت، تقسیم حکومت، تقسیم حکومت مرکزیہ، جمہوریت، اقسام جمہوریت، آمریت، حکومت لامرکزیہ، حکومت الٰہیہ، مظالم واستبداد ہائے مروجہ، حکومت مخترعہ کی ناکامی، کامیابی، حکومت فطری جیسے عنوانات پر سیر حاصل بحث کی ہے۔حضرت مؤرخ ملتؒ نے اس کتاب کا اُردو ترجمہ ۱۳۶۴ھ/ ۱۹۴۵ء میں مرادآباد کے زمانہ قیام میں ''اَقسام حکومت وحریت'' کے نام سے کیا۔ یہ کتاب اُسی وقت (فارسی اور اُردو اکٹھی) کتب خانہ فخریہ مرادآباد سے شائع ہوئی تھی۔الحمدللہ راقم کے پاس ایک نسخہ موجود ہے۔

(و) عربی اَدب:

(۳۲) تعلیقات علی مقاماتِ حریری:

حضرت مولانا سید حامد میاں صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں:

''مقامات پر والد صاحبؒ کی تعلیقات ہیں جو بیشتر فقہ اللغۃ للثعالبی سے لی گئی ہیں لیکن یہ سب ان کو اتنی یاد تھیں کہ مطالعہ کے لیے صرف ایک نظر ڈالا کرتے تھے اور اَثناءِ

درس تمام تفاصیل دوہرا دیا کرتے تھے جو ازبر تھیں، اسی طرح اور بھی درسی کتب پر تعلیقات ہیں جو انہوں نے پڑھائی ہیں۔'' (سیرتِ مبارکہ،ص:۶۰۲)

(ز) اسلامی تہذیب:

(۳۳) عرب قبل از اسلام:

یہ مضمون حضرت مؤرخِ ملت ؒ کی مایہ ناز کتاب ''سیرتِ مبارکہ'' کا مقدمہ ہے جس میں حضور ﷺ کی تشریف آوری سے پہلے عرب معاشرے کی تفصیل پیش کی گئی ہے۔ عربوں میں موجود اَوصاف ذکر کیے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ کم از کم اُس دور میں کوئی دوسری قوم ان کی نظیر نہیں پیش کرسکتی تھی۔ اس دعوے کی تصدیق کے لیے تاریخ کا وسیع دفتر جو حقائق پیش کرسکتا ہے، اس میں سے بطور نمونہ واقعات بھی پیش کیے ہیں۔

(۳۴) حیاتِ مسلم:

پیدائش سے لے کر وفات تک ایک مسلمان کو پیش آنے والے مسائل مثلاً: عقیقہ، اسلامی تعلیم، مکتب ومدرسہ میں پڑھنا، کسب معاش، اکل حلال، زکوٰۃ، نکاح، مہر، جہیز، ولیمہ، ازدواجی زندگی، طلاق، ماں باپ، بہن بھائی، پڑوسی، رشتہ دار کے حقوق، بیماری، عیادت، وصیت، تجہیز وتکفین وغیرہ مسائل واَحکام پر مشتمل مضامین کا مجموعہ۔

(۳۵) اسلامی تقریبات:

عیدالفطر، عیدالاضحٰی، صدقۂ فطر، قربانی کے مسائل، نماز کا طریقہ اور دعائیں، عقیقہ کے اَحکام اور دعائیں وغیرہ جیسی اسلامی عبادات واَحکام اِس کتاب میں ذکر کیے گئے ہیں۔

(۳۶) اسلام اور انسانی جان کی حفاظت وعزت:

۱۹۶۷ء میں اسرائیل نے عرب پر حملہ کیا اور ابتدائی کامیابی بھی اسے حاصل ہوئی جس سے جہاں اور سوال کھڑے ہوئے، کچھ لوگوں کے دلوں میں یہود سے متعلق قرآن شریف کی آیتوں کے بارے میں بھی سوال پیدا ہوا۔ علامہ ظفر احمد عثمانی ؒ نے اس کا جواب دیا

جو بہت سے اخباروں میں شائع ہوا ہفت روزہ الجمعیۃ اور دہلی کے اخبار ''پرتاب'' میں بھی شائع ہوا۔ پرتاب کا منشا صرف اعتراض تھا، اس لیے اُس نے علامہ عثمانیؒ کے جواب پر اور اسلامی تعلیمات پر بھی کئی اعتراض کیے۔ حضرت مؤرخ ملتؒ نے ان کا نہایت مدلل جواب دیا جو روز نامہ الجمعیۃ کی کئی قسطوں میں شائع ہوا، ان اَقساط کو جمع کر کے کتابی شکل میں شائع کیا گیا، جس میں اولاً علامہ عثمانیؒ کا مضمون پھر ''پرتاب'' کا جواب اور بعد ازاں جان کی حفاظت، عین حالتِ جنگ میں غیر مسلم کو پناہ دینا، معاہدات کی پابندی وغیرہ کے متعلق اسلامی تعلیمات قرآن وحدیث اور فقہ کی مستند کتابوں کے حوالوں سے مزین ہیں۔

(۳۷) دورِ حاضر کے سیاسی واقتصادی مسائل اور اسلامی تعلیمات واِرشادات:

انسان کا معاشی مسئلہ اُتنا ہی قدیم ہے جتنا خود انسان کا اپنا وجود، جب تک انسان معاشی طور پر مستحکم رہا اس کے تمام اُمور میں اعتدال رہا لیکن جب سے انسانوں میں دو طبقے بن گئے اس کے تمام شعبوں میں اختلال پیدا ہو گیا۔ دو طبقے یہ ہیں:

ایک خود غرض، عیش پسند، متکبر ومغرور اور قارونی خصلتوں سے متصف اَفراد کا طبقہ

دوسرا غریب، نادار، محنت کش اور مزدور افراد کا طبقہ

دونوں کے مقاصد الگ، دونوں کے مفادات الگ، دونوں کے نظریات الگ، امیر وغریب کی اس طبقاتی جنگ سے دنیا بحران کا شکار ہو گئی اور تا حال اسی حالت پر باقی ہے، نہ جانے کب تک یہ طبقاتی جنگ جاری رہی گی۔ اسلام ہی واحد مذہب ہے جو امیر وغریب اور سرمایہ دار ومزدور کی اس جنگ کو ختم کرنے کے لیے ایسے اصول دیتا ہے جن کی موجودگی میں کوئی اختلاف نہیں رہتا۔

ماضی قریب میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے انسانی دنیا کے اس سلگتے ہوئے موضوع پر قلم اُٹھایا اور معاشیات کے اصول قلمبند فرما کر اُمت پر احسان عظیم فرمایا۔ مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ نے بھی اس موضوع پر لکھا، آپ کے بعد حضرت مؤرخ ملتؒ نے اس موضوع پر قلم اُٹھایا اور واضح فرمایا کہ غریبوں کو ان کے حقوق کس نے دیے؟

معاشرہ میں سچی مساوات کس نے قائم کی؟ تقسیم دولت کا مساویانہ نظام کس نے دیا؟
حضرت مؤرخ ملتؒ اس کتاب میں ''موضوع اور مقصد'' کے تحت تحریر فرماتے ہیں:

''دنیا دو طبقوں میں بٹ گئی ہے: صاحب سرمایہ اور محنت کش مزدور۔ ان دونوں کے نظریے مختلف ہیں اور اس بنا پر ان کے مفادات بھی مختلف سمجھے جاتے ہیں۔ یہ اختلاف تصادم کی حد تک پہنچ گیا ہے، پوری دنیا جو اس تصادم کی آماجگاہ ہے، بحران میں مبتلا ہے، اسلام ثالث بالخیر ہے، دونوں کو صحیح مشورہ دیتا ہے۔ یہ منتشر مضامین جو آپ کے سامنے ہیں انہی مشوروں کے ترجمان ہیں۔'' (دورِ حاضر کے سیاسی و اقتصادی مسائل، ص:۹)

(۳۸) دینِ کامل، الاسلام کی مختصر تصویر، (اُردو اور انگریزی):

حضرت مؤرخ ملتؒ نے اس کتاب میں مختلف اخلاقی اور معاشرتی مسائل پر اسلامی رہنمائی کے لیے قرآنی آیات اور احادیث مبارکہ کا ایک ایسا مختصر مگر جامع مجموعہ ترتیب دیا ہے جو علم و سائنس کی مادی ترقیات مگر روحانی اور اخلاقی روشنی سے محروم اس دور میں مشعل راہ ہے۔ وجود و توحیدِ باری تعالیٰ، ہمدردی خلقِ خدا اور للّٰہیت، ملکیتِ دولت، تقسیمِ دولت، معاہدۂ فطرت، اَخلاق، ایثار و قربانی اور جہاد فی سبیل اللہ، معاملات اور اقتصادیات، محرمات و ممنوعات، شرک وریا اور دوسرے کبیرہ گناہ جیسے مختلف عناوین کے تحت پہلے ایک دو آیات مبارکہ اور اُن کا ترجمہ پھر اِسی مفہوم کی احادیث پیش کی ہیں۔ آیات و اَحادیث کا ترجمہ لفظی نہیں ہے بلکہ ان کا مفہوم واضح کرنے کے لیے آسان اور عام فہم ترجمہ کیا گیا ہے۔ اس کتاب کی افادیت کا دائرہ وسیع کرنے کے لیے اس کا انگریزی ترجمہ بھی شائع کیا گیا ہے۔

(۳۹) چاند، تارے، زمین و آسمان:

حضرت مؤرخ ملتؒ نے اس کتاب میں آسمانوں اور چاند تاروں کے متعلق فلسفہ قدیم و جدید کے مختلف نظریات اور اسلامی تصورات کا فرق ظاہر فرمایا ہے۔ اس کتاب کو لکھنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟ حضرت مؤرخِ ملتؒ تحریر فرماتے ہیں:

''کچھ مذہبی طبقے وہ بھی ہیں جن کے لیے انسان کا چاند پر پہنچ جانا ایک معمہ بنا ہوا ہے۔طرح طرح کے سوالات اس سلسلے میں کیے جاتے ہیں۔مولانا ظہورالحسن صاحب (جامع مسجد نجیب آباد) نے سورۂ فرقان وسورۂ ملک ونوح کی آیات کی طرف احقر کوتوجہ دلائی اور مولانا محمد ابراہیم صاحب کھیڑہ افغان نے بڑی اہمیت کے ساتھ چند سوالات لکھ کر بھیج دیے اور تحریر فرمایا:

''ہر روز اس معمہ کے حل کا میں ہی نہیں بلکہ پوری اُمتِ مسلمہ شدت سے انتظار کررہی ہے۔''

یہ سوالات ممکن ہے کہ جاذب توجہ نہ ہوسکیں اور شاید ان کے جواب کوسعی لاحاصل سمجھا جائے،مگر ان سوالات سے ان شکوک وشبہات کا اندازہ ہوتا ہے جو خاص طور پر ان کو پیش آرہے ہیں جو فلسفہ قدیم کی باتوں کو اسلامی تصورات سمجھتے ہیں۔اس لیے ضروری معلوم ہوا کہ پہلے فلسفہ قدیم کے نظریات اور اور اسلامی تصورات کا فرق ظاہر کیا جائے اس کے بعد ان سوالات کے جواب دیے جائیں۔

خدا کرے احقر کی جدوجہد عنداللہ قبول ہو اور خیالات کی اصلاح ہوسکے۔

واللہ الموفق وھو المعین۔

محمد میاں ۱۰؍شعبان ۱۳۸۹ھ'' (چاند تارے اور آسمان ص:۲)

(۴۰) طریقۂ تقریر (دوحصے)

حضرت مؤرخ ملتؒ نے بچوں کی اصلاح اور اسلامی تعلیم وتربیت کے لیے دینی تعلیم کا ایک نصاب ترتیب دیا تھا جو کئی مدارس میں رائج ہوا۔حضرتؒ نے مدارس کے انہی طلبہ کے لیے ایک تقریری مقابلہ کرنے کے لیے''طریقۂ تقریر'' کے نام سے دوجلدوں میں ایک کتاب ترتیب دی جس میں بچوں کے جلسے ،نظمیں،تقریریں،مکالمے ،مقالات ،بچوں کی پریس کانفرنس اور بچوں کا سیمینار ترتیب دیے ہیں۔اس کا فائدہ کیا ہوگا ؟خود حضرت مؤرخ ملتؒ کی زبانی ملاحظہ فرمائیں:

''بچہ کو ذرا دھمکا کر یا مار پیٹ کر آپ سبق یاد کرا سکتے ہیں، لکھنا سکھا سکتے ہیں مگر قوت گویائی اس طرح نہیں پیدا کر سکتے، کیونکہ قوت گویائی اور خطابت کے لیے ضروری ہے کہ طبیعت آسودہ ہو، اس پر کوئی بار نہ ہو اور دماغ کھلا ہوا ہو، جو بچہ اُستاد کی گرم نگاہ یا اُس کی قمچی سے لرز رہا ہے وہ رَٹے ہوئے اَلفاظ تو آدھے تہائی ادا کر سکتا ہے مگر تقریر قطعاً نہیں کر سکتا، اس لیے قوت گویائی پیدا کرنے کے لیے ضروری ہوگا کہ کوئی ایسا سلسلہ قائم کیا جائے جس میں بچے اپنے شوق سے حصہ لیں اور شروع سے آخر تک اُن کی دلچسپی باقی رہے۔''

مزید تحریر فرماتے ہیں:

''جلسہ کی جگہ کو سجا کر یا کسی اور مناسب انداز سے ایسی صورت مہیا کی جائے کہ یہاں کی حاضری بچوں کے دماغ پر بار نہ ہو۔'' (طریقۂ تقریر جلد:۱، ص:۴)

(۴۱) اعترافِ حق اور تقاضائے عقل و اِنصاف

(۴۲) رحمت و ربوبیت کے آثار و مشاہدات

(۴۳) اَمنِ عالم کا مقدس فارمولہ

(۴۴) قرآنِ حکیم اور تعمیر انسانیت

(۴۵) دین اور دنیا کا سنگم:

نمبر (۴۱) تا (۴۵) حضرت مؤرخ ملتؒ کے پانچ رسائل ہیں جن میں آپ نے ابوالکلام آزادؒ اور مولانا محمد عثمان فارقلیطؒ کے افادات بھی جمع کیے ہیں۔ یہ رسائل ''اسلام کیا اور اسلامی فکر کیا ہے؟'' کے نام سے یکجا بھی شائع ہوئے ہیں۔

(۴۶) مسئلۂ تعلیم اور طریقۂ تعلیم:

حضرت مؤرخ ملتؒ نے جہاں سیرت، تاریخ، سیاست، معاشیات وغیرہ پر قلم اُٹھایا اور حق ادا کرتے ہوئے خوب لکھا، وہیں آپ نے تعلیم کے موضوع پر بھی قلم اُٹھایا اور اس موضوع پر کئی کتب و رسائل تیار فرمائے۔ اس سلسلہ میں ایک کتاب ''مسئلۂ تعلیم اور طریقۂ تعلیم''، تحریر فرمائی جو تعلیمی مسائل، تعلیم کی ضروریات، طریقۂ تعلیم پر مجمل اور ہمہ پہلو رہنمائی

کا ایک جامع خاکہ پیش کرتی ہے۔آپ نے اس کتاب میں صرف تعلیم کی اہمیت ہی پر زور نہیں دیا بلکہ مسلمان بچوں اور اساتذہ کے لیے تعلیم وتربیت کا پورا نصاب ترتیب دیا ہے اور ایسے اصول مرتب فرمائے ہیں جن پر عمل کر کے ایک اُستاذ نظام تعلیم کو بہتر بناتے ہوئے مستقبل کے لیے بہترین معمار تیار کرسکتا ہے۔یہ کتاب طلبہ اور اساتذہ کرام کے لیے یکساں مفید ہے۔

(۴۷) دینی تعلیم کا رسالہ (۱۲حصے، بچوں کے لیے):

حضرت مولانا سید حامد میاں صاحب تحریر فرماتے ہیں:

''ایک جگہ والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ نے تحریر فرمایا ہے:

''۱۵راگست ۱۹۴۷ء کے بعد .... مشرقی پنجاب اور ہماچل میں مسلمان ہندوانہ وضع یا سکھوں کی وضع اختیار کر کے زندگی گزار رہے تھے، جہاں تباہ شدہ مسلمانوں کی تعداد ایک فی ہزار رہ گئی تھی ۔جمعیۃ علماءِ ہند کے حضرات نے وہاں دورے کیے، حوصلے دلائے، شبینہ مکاتب (نائٹ کلاسز) شروع کیے، مسلمان جو چھپے ہوئے تھے برآمد ہونے لگے۔''

اس کے لیے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ نے آٹھویں جماعت تک دینیات کا بارہ رسائل پر مشتمل ایک نصاب تحریر فرمایا، مدد کے لیے تعلیمی چارٹ بھی بنوائے۔میں نے دیکھا ہے کہ وہ یہ رسائل باوضو تحریر فرمایا کرتے تھے ۔رسائل دینیہ کا یہ نصاب انتہائی مقبول ہوا۔''(سیرتِ مبارکہ ص:۶۱۱)

(ح) تطہیرِ اَفکار:

(۴۸) شواہدِ تقدس اور تردیدِ الزامات:

سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب مرحوم نے علمی تحقیق وجستجو کے نام پر جن صحابۂ کرام کو ہدف تنقید بنایا اُن میں خلیفۂ ثالث حضرت عثمان بن عفان ذوالنورین رضی اللہ عنہ کا نامِ نامی سرفہرست ہے۔آپ نے اپنی کتاب ''خلافت وملوکیت'' میں حضرت ذوالنورین رضی اللہ عنہ کی ذات گرامی پر رکیک حملے کیے ہیں۔اس حوالہ سے حافظ محمد افضل صاحب (رحیم یار

خان، پاکستان) نے ایک مکتوب میں حضرت مؤرخ ملتؒ سے چار سوال کیے:

(i) مودودی صاحب نے کتاب ''خلافت وملوکیت'' جو تصنیف کی ہے، اُس کے متعلق آپ کی رائے کیا ہے؟

(ii) جماعتِ اسلامی قرآن وحدیث کی روشنی میں کیسی جماعت ہے؟

(iii) کیا اسلام کی روشنی میں مودودی صاحب پر اعتماد کیا جاسکتا ہے؟

(iv) بعض دیوبندی علماء جو مودودی صاحب کے ساتھ تعاون کررہے ہیں، قرآن وحدیث کی روشنی میں وہ کیسے ہیں؟

حضرت مؤرخ ملتؒ نے ان سوالوں کے تفصیلی جوابات دیے جو کتاب کی صورت اختیار کرگئے۔ اس کتاب میں آپ نے ناقدین کے حوالوں اور دعووں کی حقیقت بیان کی اور حضرت ذوالنورینؓ کی مقدس شخصیت کے شواہد پیش کیے۔

(۴۹) دررِ منثورہ (بسلسلہ ردمودودیت):

یہ کتاب حضرت مؤرخ ملتؒ کے پانچ مقالات پر مشتمل ہے:

(i) حضرت مؤرخ ملتؒ کا ایک مقالہ جو ''الجمعیۃ'' مؤرخہ ۲۷ر جولائی ۱۹۵۱ء میں شائع ہوا جس کا عنوان ''مودودی صاحب کا طریق فکر'' تھا۔ اس مضمون کے مخاطب مودودی صاحب اور مولانا امین احسن اصلاحی صاحب تھے۔ اس کا جواب اس وقت کے امیر جماعت اسلامی ہند مولانا ابواللیث صاحب نے دیا۔ یہ مقالہ اس جواب پر ایک نظر ہے۔

(ii) دوسرا مقالہ بعنوان ''جماعت اسلامی کے متعلق ہماری رائے''

(iii) تیسرا مقالہ بعنوان ''حکومت الٰہیہ کیا ہے؟''

(iv) چوتھا مقالہ بعنوان ''حکومت اسلامی کو بحال کرنے کی جدوجہد''

(v) پانچواں مقالہ بعنوان ''ہند یونین کی موجودہ حیثیت''

(۵۰) دوضروری مسئلے (بسلسلہ ردمودودیت):

تقسیم وطن کے بعد مودودی صاحب مرحوم نے دو فتوے دیے:

(i) جو خواتین ہندوستان میں رہ گئی ہیں اور اُن کے شوہر پاکستان آ گئے ہیں یا وہ خواتین جو پاکستان آ گئی ہیں اور اُن کے شوہر ہندوستان میں رہ گئے ہیں، تو ایسے زوجین کا نکاح فسخ کیا جائے اور آئندہ شادی بیاہ کا تعلق پاکستانی اور ہندوستانی مسلمانوں کے درمیان نہ ہونا چاہیے۔

(ii) ہندوستان پاکستان کی قومیت رکھنے والوں میں اسلامی وراثت کے اصولوں پر عمل نہیں کیا جا سکتا۔

مودودی صاحب کے ان دونوں فتووں کی سنگینی کا ادراک کرتے ہوئے حضرت مؤرخ ملتؒ نے اس کتاب میں ان کا بھرپور رَد فرمایا۔

(۵۱) تسہیل تقریر دلپذیر، اَز حضرت نانوتویؒ

(۵۲) تسہیل انتصار الاسلام، از حضرت نانوتویؒ:

قاسم العلوم والخیرات حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی تمام کتب کے موضوعات کے اعتبار سے دقیق ہیں اِس لیے ہمارے اَکابر نے ان کتب سے عام استفادہ کے لیے ان کی آسان انداز میں شرح پیش کرنے کی کی سعی کی۔ سب سے پہلے حضرت شیخ الہندؒ نے تہیہ فرمایا کہ حکمت قاسمیہ کو ترتیب و تہذیب اور تفصیل و تبویب کر کے اس کی افادیت کو عام کیا جائے لیکن حوادث زمانہ کے سبب یہ کام ایک کتاب سے آگے نہ بڑھ سکا۔ اس کے بعد حضرت مؤرخ ملتؒ نے اس کام کا بیڑا اُٹھایا۔ اس حوالہ سے حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب قاسمیؒ تحریر فرماتے ہیں:

''حضرت مولانا محمد میاں صاحب دیوبندی ناظم جمعیت علماء ہند کو اس کا خیال پیدا ہوا تو ممدوح نے بھی اضافۂ عنوانات اور تشریحی فٹ نوٹوں کا سلسلہ شروع فرمایا اور تقریر دلپذیر اور انتصار الاسلام کی خاصی حد تک خدمت کی، لیکن یہ سلسلہ بھی ان دو کتابوں سے

شروع ہوکر ان ہی دو پر ختم ہو گیا اور آگے نہ بڑھ سکا۔''

(انوار المصابیح فی توضیح مصابیح التراویح ص:۱۷)

(ط) رسائل ومقالاتِ سیاسیہ:

(۱) صالح جمہوریت اور تعمیر جمہوریت:

قرآن حکیم نے انسانی مساوات اور بھائی چارہ کی تعلیم دی ہے جو جمہوریت کی بنیاد ہوتی ہے۔قرآن کی نظر میں جمہور کے اُوصاف کیا ہونے چاہئیں؟ان کی تربیت کن اُصولوں پر ہونی چاہیے؟ تاکہ صحیح جمہوریت رونما ہوسکے۔قرآن حکیم سے اسی اخذ واستنباط کا مجموعہ یہ کتاب ہے۔حضرت مؤرخ ملتؒ نے اصلاح سماج کو تعمیرِ جمہوریت کی بنیاد قرار دیا ہے۔اسی ضمن میں تحریر فرماتے ہیں:

''جمہور کا تجزیہ کیجیے،آپ اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ بہت سی سوسائٹیاں بہت سی جماعتوں اور مختلف طبقات کے مجموعہ کا نام جمہور ہے اور یہی جمہور جب اجتماعی تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے نظام بناتا ہے تو اس کو جمہوریہ کہا جاتا ہے۔اور یہ تصور یا نظریہ کہ نظام اس طرح کا ہو کہ جمہور کے احساسات وجذبات کی عکاسی کررہا ہو،جمہوریت ہے۔

طبقات،سوسائٹیوں اور جماعتوں کے ستون ہیں،اگر ہم ان ستونوں کا نام معاشرہ اور سماج رکھ دیں تو ہم یہ بھی کہہ سکیں گے کہ صحیح اور صالح جمہوریت کی بنیادی شرط اصلاحِ سماج ہے۔''(صالح جمہوریت اور تعمیر جمہوریت ص:۷)

(۲) آنے والے انقلاب کی تصویر:

تحریکِ پاکستان کے شور وہنگامے میں کسی موقع پر لکھا گیا حضرت مؤرخ ملتؒ کا ایک تاریخی رسالہ ہے۔اس رسالہ میں مندرجہ ذیل اُمور ذکر کیے گئے ہیں:

(i) برٹش حکومت کے استحصال کی تاریخ اور استحصال کے ظالمانہ طریقوں اور وقت کی سیاسیات پر تبصرہ۔

(ii) مشینی دور کے آنے سے جو معاشی اور معاشرتی بگاڑ پیدا ہوا اور بے روزگاری پھیلی

ہے اُس کا تذکرہ۔

(iii) متحدہ ہندوستان کی بعض سیاسی جماعتوں کے طرزِ فکر اور اس کے فرقہ پرستانہ انداز سیاست پر تنبیہ! جس نے صدیوں کی مشترک سماجی، معاشرتی اور تہذیبی اقدار کو تباہ کر کے سوسائٹی کو نفرت اور اشتعال کے جذبات سے بھر دیا ہے۔

(iv) جمعیت علماء ہند کے طریق سیاست، طرزِ عمل اور اسلامی خدمات کی وضاحت۔

(۳) ترکِ وطن کا شرعی حکم

(۴) جمہوریت اپنے آئینہ میں اور اسلامی نظام کا مختصر خاکہ

مطبوعہ: انوارِ مدینہ قدیم اشاعت: رجب المرجب ۱۳۹۲ھ/ اگست ۱۹۷۲ء

(۵) سرزمین ہندوستان کے فضائل:

علامہ غلام علی آزاد بلگرامیؒ کی ایک عربی تصنیف ''سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان'' ہے۔ اس کتاب کی فصل اول میں تفسیر وحدیث کی کتابوں سے ہندوستان کے فضائل اخذ کر کے ایک جگہ جمع کیے گئے ہیں۔ حضرت مؤرخ ملتؒ نے علامہ بلگرامیؒ کی کتاب کو بنیاد بنا کر اِس کتابچہ میں یہ بتایا ہے کہ ہمارا وطن ہندوستان بھی بہت سی عظمتوں کا سرچشمہ ہے۔ آپ نے یہاں بیس روایات ذکر فرمائی ہیں۔

(۶) دربار مدینہ اور حب وطن:

ہر شخص کو اپنے وطن سے فطری محبت اور اُنسیت ہوتی ہے۔ اس مختصر رسالہ میں حضرت مؤرخ ملتؒ نے یہی بات واضح فرمائی ہے کہ اسی لیے حضور علیہ السلام کو بھی اپنے وطن قدیم مکہ مکرمہ اور وطن جدید مدینہ منورہ سے قلبی محبت تھی اور آپ اس کی اقتصادی ترقی اور آب وہوا کی اصلاح کے جذبات سے مزین دعائیں مانگا بھی کرتے تھے۔

(۷) جمعیۃ علماء ہند کی شرعی اہمیت

(۸) تحریکِ آزادی اور جمعیۃ علماء کا پروگرام

(۹) جمعیۃ علماء ہند، مقاصد وخدمات کے آئینہ میں

(۱۰) جمعیۃ علماء ہند کا جھنڈا
(۱۱) جمعیۃ علماء ہند پر ایک ناواجب اعتراض اوراس کا جواب
(۱۲) ہماراوطن اوراس کی عظمت
(۱۳) مسلمان اور ہندوستان کی وطنی حیثیت
(۱۴) پاکستان گورنمنٹ کی اسلامی حیثیت
(۱۵) ہندوستان کی حیثیت
(۱۶) تقسیم ملک اور جمعیۃ علماء ہند کا موقف
(۱۷) ہندوستان کی تین بڑی جماعتیں اوران کی تجاویز (ایک تقابلی مطالعہ)
(۱۸) جمعیۃ علماء ہند اور لیگ کا نصب العین (حقائق اور واقعات کی روشنی میں)
(۱۹) جمعیۃ علماء ہند اور عمائدین لیگ کے کارنامے
(۲۰) جمعیۃ علماء ہند کا فیصلہ
(۲۱) مولانا ظفر احمد صاحب کے فتوے پر تبصرہ
(۲۲) شرکت کانگریس اور شریعت غرا
(۲۳) کشف الغوایہ عن الوقایۃ
(۲۴) قرآن حکیم کو بازیچۂ اغراض مت بناؤ!
(۲۵) خطرناک نعرے اور جمعیۃ علماءِ ہند کا صراطِ مستقیم
(۲۶) مسٹر جناح کی تشریحِ پاکستان پر مختصر تبصرہ
(۲۷) نواب زادہ لیاقت علی خان اور تفسیرِ پاکستان
(۲۸) جمعیۃ علماء ہند کا فیصلہ
(۲۹) کانگریس اور حق خود ارادیت
(۳۰) جمعیۃ علماء ہند کا واضح فیصلہ، پورا ہندوستان ہمارا پاکستان ہے
نمبر (۷) تا (۳۰) چوبیس کتابچے اور مقالات ہیں جنہیں ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہانپوری

صاحب مدظلہم نے شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ کی سیاسی ڈائری کی ساتویں جلد میں جمع کر دیا ہے۔ان سے متعلق ڈاکٹر صاحب تحریر فرماتے ہیں:

''(حضرت مؤرخ ملتؒ کے کتابچے اور مقالات) مضامین ومباحث کی مناسبت سے چھ مجموعوں میں مرتب کیے گئے ہیں اور ہر مجموعے کا ایک عنوان یا نام ہے۔اس کی تفصیل اس طرح ہے:

پہلا مجموعہ ''جمعیت علمائے ہند: ایک تاریخی مطالعہ''

اس مجموعے میں مؤرخ ملتؒ کے تین کتابچے اور اخبارات سے ماخوذ دو مقالے شامل ہیں جن سے جمعیت علمائے ہند کے قیام کی اہمیت، اس کے نصب العین، اغراض و مقاصد سے لے کر ۱۹۳۷ء میں اور اس کے بعد کے زمانے میں اس کی امدادی خدمات روشنی پڑتی ہے۔

دوسرا مجموعہ ''وطن: اس کی اہمیت اور وقت کے تقاضے''

اس میں مؤرخِ ملت کا ایک مستقل رسالہ، ایک مقالہ، ایک استدراک اور تین ضمیمے شامل ہیں۔جن میں مسلمانوں کے لیے ہندوستان کی وطنی حیثیت اور ہندوستان سے مسلمانوں کی ترک سکونت کے مباحث پر نہایت فکر انگیز بحث کی گئی ہے۔

تیسرا مجموعہ ''ہندوستانی سیاست اور علمائے ہند۔۱۸۵۷ء کے بعد!''

یہ حضرت مؤرخِ ملتؒ کا صرف ایک جامع رسالہ ہے، لیکن اس کے آخر میں شامل پانچ ضمیموں نے اس کی معنویت اور افادیت میں بہت اضافہ کر دیا ہے۔اس کے مباحث میں کانگریس اور مسلم لیگ کے قیام کے مقاصد ومصالح، تحریک شیخ الہندؒ کے ظہور وفروغ اور اس کے سیکولر نظامِ حکومت کی اہمیت کے مضامین علمائے کرام کی بلند خیالی اور ان کے سیاسی شعور کی جامعیت پر دلیل ہیں۔

چوتھا مجموعہ :اس مجموعے کا عنوان ''ہندوستانی سیاست اور اس کا تقابلی مطالعہ'' ہے۔اس مجموعہ کی تشکیل میں مؤرخِ ملت کے ایک کتابچے اور دو مقالوں کی کارفرمائی

ہے۔کانگریس، مسلم لیگ اور جمعیت علمائے ہند کے قیام کے پس منظر، مقاصد کے اختلاف اوران کی تجاویز کی روشنی میں ان کے ان کے اندر اندازِ فکر وخدمات اوران کے فیصلوں اور اعمال کے تجزیےاوران کے رویوں پر بحث کی گئی ہے۔اس مجموعے کی اہمیت اورافادیت کا اندازہ اس کی فہرست مضامین پرایک نظر ڈالنے ہی سے ہوجاتا ہے۔

پانچواں مجموعہ ’’شرکتِ کانگریس کا جواز‘‘ تھانوی، عثمانی نقطہ نظر پر تنقید وتبصرہ کی ایک نظر‘‘

یہ مجموعہ مؤرخ ملت کے چار فکر انگیز اور مدلل رسایل ’’مولانا ظفر احمد تھانویؒ کے فتوے پر تبصرہ‘‘، مفتی محمد شفیع دیوبندیؒ کے رسالے ’’کانگریس اور مسلم لیگ کے متعلق شرعی فیصلہ‘‘ پر تنقید اوران کے اپنے فتوے ’’شرکت کانگریس اور شریعت غرّا‘‘ کا جامع ہے۔ حضرت مؤرخ ملتؒ کا یہ رسالہ جو دراصل مدرسہ شاہی مرادآباد کے دارالافتاء سے جاری شدہ ایک فتوی ہے، گویا مذکورۃ الصدور دونوں رسائل پر حسن محاکمہ کی مثال اورقول فیصل ہے۔یہ محاکمہ مولانا سیّد محمد میاں صاحبؒ کے ذوق نقفہ، سیاسی شعور، مطالعہ ونظر کی وسعت وبلندی اورنکتہ رسی پردال ہے۔

چھٹا مجموعہ ’’مسلم لیگ کے دعاوی اوران کی حقیقت۔تحریکِ پاکستان کے پسِ منظر میں‘‘

یہ ایک ہی رسالہ ہے،لیکن اس کے ساتھ نہایت معنی خیز طویل ومختصر آٹھ ضمیمے شامل ہیں۔اس رسالے میں مؤرخِ ملتؒ نے مسلم لیگ کے استقبال مرکز، دوقومی نظریے اوراس کے دوسرے دعاوی پر بحث کی ہےاور تاریخ،حقایق اورمشاہدات وتجربات کی روشنی میں ان کا تار پور بکھیر دیا ہے۔

یہ رسالہ ان کے سیاسی شعور کی پختگی وبلند خیالی کی بڑی دلیل ہےاور مسلمانوں کے لیےاس کا مطالعہ سبق آموز بھی! رسالے کی آخری بحث ’’جمعیت علمائے ہند کا شاہ راہِ مستقیم‘‘ جمعیت علمائے ہند کے رہنماؤں کی حقیقت پسندی کا بڑا ثبوت بھی ہے۔‘‘

یہاں ان رسائل پر تبصرہ مقصود نہیں، بلکہ ان کی تربیت وتدوین کی خصوصیات کی طرف توجہ دلانی چاہتا ہوں۔ جہاں تک ان رسایل کی تاریخی اہمیت اورافادیت کا تعلق ہے تو بعض رسایل پر مدون کے پیش لفظ، حرفے چند یا عرائض مرتب میں ان پر روشنی ڈالی گئی ہے اور وہ ضرورت کے لیے بس کرتی ہے۔ یہاں ان مطالب کو دہرانے کی ضرورت نہیں!''

(حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کی سیاسی ڈائری۔ جلد:۷، ص:۳۴ تا ۳۶)

(ی) مضامین ومقالات:

(۱) الوداع اے مفتی اعظم الوداع

مطبوعہ: الجمعیۃ دہلی، مولانا مفتی کفایت اللہ رحمہ اللہ نمبر، ۲۳رفروری ۱۹۵۳ء

(۲) خودنوشت سوانح حیات کا ایک اچھوتا باب

(۳) مشاطۂ قدرت

(۴) ہم نے دیکھا تھا ایک فنافی اللہ

(۵) فقیہانہ بصیرت اور مجددانہ شان

یہ چاروں مقالات الجمعیۃ دہلی کے شیخ الاسلامؒ نمبر میں شائع ہوئے۔

(۶) مجاہد ملت کے چند کارنامے

مطبوعہ: روزنامہ الجمعیۃ دہلی، مجاہدِ ملت نمبر، شوال المکرّم ۱۳۸۲ھ/ فروری ۱۹۶۳ء

(۷) اعلیٰ اَخلاق کا معلم

ماہنامہ انوارِ مدینہ، لاہور قدیم اشاعت: رمضان المبارک ۱۳۹۲ھ/ اکتوبر ۱۹۷۲ء

(۸) کفاح السیدہ فاطمۃ الزاہراءؓ

مطبوعہ: ماہنامہ دارالعلوم، دیوبند، ستمبر ۱۹۶۹ء

(۹) حضرت معاویہؓ اور یزید کی خلافت

مطبوعہ: ماہنامہ دارالعلوم، دیوبند، اپریل ۱۹۶۷ء

(۱۰) فرعون ہذہ الامۃ (ابوجہل) کا قتل

مطبوعہ: ماہنامہ دارالعلوم، دیوبند، ستمبر ۱۹۶۵ء

(۱۱) فتنہ وضع اَحادیث حق و باطل کا ایک معرکہ

مطبوعہ: ماہنامہ انوارِ مدینہ، لاہور قدیم اشاعت: جمادی الأُخریٰ ۱۳۹۳ھ/ جولائی ۱۹۷۳ء

(۱۲) تعارف اِسلام اور چند مسائل

مطبوعہ: ماہنامہ دارالعلوم، دیوبند، ستمبر ۱۹۶۶ء

(۱۳) تحویل قبلہ، انقلاب عظیم

مطبوعہ: ماہنامہ دارالعلوم، دیوبند، دسمبر ۱۹۶۹ء

(۱۴) سرمایہ ختم کیا جائے یا بخل؟

ماہنامہ انوارِ مدینہ، لاہور قدیم اشاعت: صفر المظفر ۱۳۹۳ھ/ مارچ ۱۹۷۳ء

(۱۵) اِسلام کیوں؟

ماہنامہ انوارِ مدینہ، لاہور قدیم اشاعت: رجب المرجب ۱۳۹۰ھ/ستمبر ۱۹۷۰ء

(۱۶) اسلام کو کس کی چھری نے ذبح کیا؟:

۱۹۳۰ء تا ۱۹۳۲ء کے زمانہ میں تحریک آزادی عروج پر تھی، اُس زمانہ میں جامع مسجد دہلی میں ایک نمائندہ جلسہ منعقد کیا گیا، اس جلسہ میں پڑھنے کے لیے حضرت مؤرخ ملتؒ نے یہ مضمون لکھا تھا۔ اس مضمون کی بھنک حکام کے کانوں پڑی تو آپ کو گرفتار کرلیا گیا۔ آپ نے یہ مضمون اپنے قابل اعتماد شاگرد اور مدرسہ شاہی مرادآباد کے مایہ ناز فاضل حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب مدظلہم کٹکی کے سپرد فرمایا۔ آپ نے حضرت مؤرخ ملتؒ کی نیابت میں یہ مضمون جلسہ میں سنایا۔ اللہ کرے کہ یہ مضمون دستیاب ہو سکے۔

(۱۷) عید

ماہنامہ انوارِ مدینہ، لاہور قدیم اشاعت: ذوالقعدہ ۱۳۹۰ھ/ جنوری ۱۹۷۱ء

(۱۸) رُوح کیا ہے؟

ماہنامہ انوارِ مدینہ، لاہور قدیم اشاعت: رمضان المبارک ۱۳۹۱ھ/ نومبر ۱۹۷۱ء

(۱۹) معراجِ سید المرسلین رحمۃ للعالمین ﷺ اور رؤیتِ باری تعالیٰ
ماہنامہ انوارِ مدینہ، لاہور قدیم اشاعت: رجب المرجب ۱۳۹۱ھ/ستمبر ۱۹۷۱ء
(۲۰) ایک امریکی مؤلف کی غلط بیانی
مطبوعہ: ماہنامہ دارالعلوم، دیوبند، مئی ۱۹۶۶ء
(۲۱) مجلس شوریٰ کے فیصلہ پر وضاحتی بیان
مطبوعہ: ماہنامہ دارالعلوم، دیوبند، ستمبر ۱۹۶۹ء
(۲۲) اسلامی اور انسانی برادری
مطبوعہ: ماہنامہ دارالعلوم، دیوبند، جمادی الاخری ۱۳۷۴ھ
(۲۳) رسول اللہ ﷺ تمام اَنبیاء سے افضل کیوں؟
مطبوعہ: قائد، مرادآباد، محرم الحرام ۱۳۵۷ھ/ مارچ ۱۹۳۸ء
(۲۴) آئین حکومت اور اسلام
مطبوعہ: قائد، مرادآباد، محرم الحرام ۱۳۵۷ھ/ مارچ ۱۹۳۸ء
(۲۵) نظامِ حکومت کے اَغراض ومقاصد
مطبوعہ: قائد، مرادآباد، رجب المرجب ۱۳۵۷ھ
(۲۶) کیا مذہب فطری جذبہ ہے؟
مطبوعہ: قائد، مرادآباد، رجب المرجب ۱۳۵۷ھ
(۲۸) خلفاء راشدین کا طرزِ زندگی، آمدنی اور خرچ
مطبوعہ: قائد، مرادآباد، رمضان المبارک ۱۳۵۸ھ/ اکتوبر ۱۹۳۸ء
(۲۹) وجودِ خالق پر فلسفی دلائل
مطبوعہ: قائد، مرادآباد، رمضان المبارک ۱۳۵۷ھ
(۳۰) زوالِ دَولت مغلیہ کے اَسباب
مطبوعہ: قائد، مرادآباد، رمضان المبارک ۱۳۵۷ھ

(۳۱) ناسخ اور منسوخ

مطبوعہ: قائد، مرادآباد، رمضان المبارک ۱۳۵۷ھ

(۳۲) عروج وزوال مسلم کے اَسباب

مطبوعہ: قائد، مرادآباد، رمضان المبارک ۱۳۵۷ھ

(۳۳) مسلمانانِ ہند کے مستقبل پر ایک نظر

مطبوعہ: قائد، مرادآباد، شعبان المعظم ۱۳۵۷ھ

(۳۴) شب براءت اور روزۂ شعبان

مطبوعہ: قائد، مرادآباد، شعبان المعظم ۱۳۵۷ھ

(۳۵) اسلام میں خلافت اور حکومت

مطبوعہ: قائد، مرادآباد، مارچ ۱۹۴۰ء

(۳۶) محمد رسول اللہ ﷺ بحیثیت داعی الی اللہ

مطبوعہ: خدام الدین، لاہور

(۳۷) فلاح انسانی کی حقیقی معراج

مطبوعہ: الفرقان لکھنؤ، سالنامہ ۱۳۵۵ھ

(۳۸) نظرات: ہم کہاں ہیں؟

مطبوعہ: برہان، دہلی مارچ ۱۹۵۰ء

(۳۹) جرم اور اِخفائے جرم

مطبوعہ: صدق، لکھنؤ، مارچ ۱۹۴۸ء

(۴۰) قرآن حکیم کے دو مکمل اور کامیاب نسخے

مطبوعہ: ماہنامہ بانو، دہلی، فروری، مارچ ۱۹۵۰ء

(۴۱) پیاسی دنیا کو روحانیت کا پانی پلاؤ

مطبوعہ: خدام الدین، لاہور ۲؍فروری ۱۹۶۸ء

(۴۲) حجۃ الوداع

مطبوعہ: خدام الدین، لاہور یکم دسمبر ۱۹۶۷ء

(ک) ابتدائی قاعدے (بچوں کے لیے):

(۱) قاعدہ حروف شناسی مع طریقہ تعلیم:

سولہ صفحات کے اس رسالہ میں بالکل ابتدائی بچوں کو حروف تہجی مختلف انداز سے سکھائی گئی ہے۔

(۲) بچوں کا چھوٹا قاعدہ اُردو عربی مع طریقہ تعلیم (۱):

سولہ صفحات کے اس رسالہ میں الف تا ے حروف تہجی کا تعارف کروایا گیا ہے، بعد میں مفردات کو زبر، زیر، پیش اور جزم کے ساتھ تلفظ سکھایا گیا ہے۔

(۳) اُردو عربی قاعدہ مع طریقہ تعلیم (۲):

بتیس صفحات کے اس رسالہ میں مرکبات کی اَشکال، کھڑی حرکات، حروف مدہ ولین، دوزبر، دوزیر، دوپیش، غنہ اور ساتھ ساتھ چند ہندی حروف کو مشقوں سے سمجھایا گیا ہے۔

(ل) مکاتیب:

راقم الحروف نے حضرت مؤرخ ملت کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ سو سے زائد مکاتیب کا ایک معتد بہ حصہ جمع کیا ہے۔ مکتوب الیہم میں حضرت مولانا عبدالحق صاحبؒ (اکوڑہ خٹک)، قاضی اطہر مبارکپوریؒ، پروفیسر ایوب قادریؒ، مولانا محمد اسحٰق بھٹیؒ، مفتی انتظام اللہ شہابیؒ، منشی عبدالرحمٰن، سید الطاف بریلوی، مولانا نور عالم خلیل امینی، مولانا سمیع الحق شہیدؒ، حاجی مبین احمد مرحوم، مولانا رشید احمد صاحبؒ (ڈھوک زمان) مولانا فضل محمد صاحبؒ، مولانا سید حامد میاں صاحبؒ، مولانا قاری شریف احمد صاحبؒ (کراچی) مولانا ازہر شاہ قیصر صاحبؒ، مولانا سعید احمد اکبرآبادیؒ، مولانا سید رشید میاں صاحب مدظلہم شامل ہیں۔

(م) تقریظ وتنقید:

حضرت مؤرخ ملتؒ نے کئی کتابوں کے پیش لفظ لکھے، کئی کتب پر تبصرہ فرمایا۔ راقم

الحروف اُنہیں جمع کرنے کی کوشش میں ہے اور چند ایک دستیاب ہو چکے ہیں۔

(ن) مرقعات:

(۱) اسلامی تعلیمات کا مرقع عہد رسالت وصحابہؓ (سال بہ سال باعتبار سن ہجری):

یہ چارٹ تحقیق وریسرچ کا نمونہ ہے۔ اس میں آنحضرت ﷺ کی ولادت باسعادت سے لے کر خلافت راشدہ کے ختم تک ۹۳ سال کے واقعات نہایت خوبصورت ترتیب کے ساتھ نمایاں کیے گئے ہیں۔اس چارٹ میں حجازِ مقدس کے چار نقشے بھی دیے گئے ہیں جن سے زمانہ ولادت مبارکہ، بعثت، اشاعت اسلام اور فتوحات اسلامی کے مختلف اَدوار اور اُن کی حدود واضح ہوتی ہیں۔

(۲) مرقعات (۱۸ حصے)

مذکورہ تصنیفات وتالیفات اور مقالات ومضامین وہ ہیں جو سرِ دست دستیاب اور معلوم ہو سکے، بعض کتب ورسائل کے متعلق خود مؤرخ ملتؒ فرماتے ہیں:

''تالیفات کی تعداد کم وبیش ستر ہے جن میں ضخیم کتابیں بھی ہیں اور مختصر رسالے بھی۔ بعض تحریریں وقت کی ضرورت کے تحت لکھی گئیں جو بعد میں ناپید ہو گئیں، بعض کتابیں اور نگارشات کسی مصلحت کے تحت دوسروں کے نام سے شائع ہوئیں۔'' (پس مرگ زندہ ص:۸۴)

ہندوپاک کے رسائل وجرائد مثلاً: الجمعیۃ (دہلی) قائد (مراد باد) مدینہ (بجنور) برہان (دہلی)، دارالعلوم (دیوبند)، انوارِ مدینہ (لاہور)، خدام الدین (لاہور)، الحق (اکوڑہ خٹک) وغیرہ میں آپ کے علمی وتحقیقی مقالات برابر شائع ہوتے رہتے تھے جنہیں جمع کرکے حضرت مؤرخ ملتؒ کے علمی جواہر ریزے منظر عام پر لائے جا سکتے ہیں۔ جس کے لیے راقم علم دوست حضرات کی خدمت میں درخواست گزار ہے۔

☆☆☆☆☆

مولانا سید محمد میاں کی کتاب مبارکہ محمد رسول اللہ ﷺ

ایک تنقیدی مطالعہ

ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی
پروفیسر، صدر، ڈائریکٹر (سابق) ادارہ علوم
اسلامیہ وشاہ ولی اللہ دہلوی ریسرچ سیل،
مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

سیرۃ مبارکہ مولانا سید محمد میاں کی وہ کتاب ہے جو سیرت کے چند پہلوؤں پر ایک خاص دعوتی اسلوب میں لکھی گئی ہے، اور تکمیل سے پہلے مصنف جوارِ رحمت میں بلا لئے گئے۔ جس کی وجہ سے یہ مکمل نہ ہوسکی۔ اس کتاب کا انداز عام کتب سیرت سے قدرے الگ بھی ہے۔ مولانا دریابادی لکھتے ہیں:

''کتاب جس قدر لوازم ظاہر کے لحاظ سے خوشنما اور دلفریب ہے اسی قدر معنوی حیثیت سے قابل داد اور اعلیٰ ہے ....اُسلوب بیان ایسا کہ بغیر دیکھے اور پڑھے اس کا ذہن میں آنا دشوار ہے، کتاب تمام تر بیسویں صدی کے ناظرین کو پیش نظر رکھ کر لکھی گئی ہے۔

فاضل مضمون نگار جو عصر حاضر میں علوم سیرت پر سند ہیں، انھوں نے اس کا تنقیدی جائزہ ایک عام کتب سیرت کے اعتبار سے لیا ہے، اس لئے ان کی ناقدانہ لے اور تنقیدی انداز کہیں کہیں بہت تیز ہوگیا ہے اور کتاب چونکہ نامکمل ہے، اس لیے اس کی تعبیر فاضل مضمون نگار کے قلم نے کئی جگہ لفظ ''ناقص'' سے کی ہے، اس سے بس نامکمل ہی سمجھا جائے اور کچھ نہیں۔ قارئین اس پہلو کو سامنے رکھ کر مضمون کا مطالعہ فرمائیں۔

موضوعاتی تجزیہ

اردو سیرت نبوی کی طویل اور قابل فخر فہرست میں بہت سی تالیفات سیرت شامل ہیں۔ ان میں سے ایک مولانا موصوف کی کتاب سیرت بھی ہے۔ اس کا ایک تشریحی عنوان ''قرآن اور تاریخ کے آئینہ میں'' ہے اور سرورق کی زینت حدیث حضرت عائشہؓ: کان خلقه القرآن '' بھی ہے۔ وہ ہندوستان کے عہد جدید کی تالیف لطیف ہے۔ ترقیمہ میں تاریخ تالیف ہے: شب چہارشنبہ ۲۱/۱۳۸۹/ ۳۱/دسمبر ۱۹۶۹ء اور سرورق کی پشت پر طبع اول کی تاریخ اشاعت ہے ''مارچ ۱۹۷۳''، ناشر کتابستان، گلی قاسم جان، دہلی-۶ ہے۔ سرورق پر مزید تشریح تالیف کے چند عناوین ہیں ''تزکیہ باطن، تہذیب اخلاق، تعمیر ملت، دعوت وتبلیغ کے قرآنی اصول اور امام الانبیاء رحمۃ للعالمین ﷺ کا کردار آیات واحادیث صحیحہ کی روشنی میں۔'' مصنف گرامی کی علمی ومنصبی لیاقت کا ذکر بھی ہے: شیخ الحدیث مدرسہ امینیہ اسلامیہ دہلی-۶۔ سرورق کے بعد کتاب کے عنوان کامل کے بعد دو صفحات پر مشتمل ایک مختصر تعارف ہے جس کے مصنف کا نام نامی درج نہیں ہے، اس میں کتاب مستطاب کی خصوصیات کا ذکر ہے۔ اول خصوصیت کہ ''اس کا اصل ماخذ کتاب اللہ ہے'' اور اس کی شرح میں دوسری کتب سیرت کے طریق تالیف بالخصوص کتاب اللہ کی آیات کریمہ کو موقع بموقع پیش کر دیا جاتا ہے جبکہ کتب سیرت تاریخ کی کتابوں پر مرتب کی جاتی ہیں اور اس کے پانچ نقائص اور کتاب موصوف کے خصائص بیان کیے گئے ہیں۔ اگلی دس خصوصیات مختصر یہ ہیں: عام کتب سیرت میں سلسلہ غزوات کو مقدم رکھنے کی وجہ سے دعوت وتبلیغ اور تزکیہ وارشاد اور پیغمبرانہ زندگی کا اصل رخ پس پردہ چلا جاتا ہے اور اس کتاب لطیف میں داعیانہ کردار اور تبلیغ کے اصول وآداب اور ان کے عملی نمونے پیش کیے گئے ہیں، داعی کے اوصاف اور مختلف مذاہب کے پیروؤں کو دعوت کے طریقے اجاگر کیے گئے ہیں، سرمایہ اور قومیت وغیرہ کے دور حاضر کے مباحث ومسائل میں سیرت نبوی کی رہنمائی واضح کی گئی ہے، تحویل قبلہ کی تاریخ مذاہب اور تاریخ انسانیت میں اہمیت پیش کی گئی ہے، آغاز کتاب میں ۶۴ صفحات پر مشتمل

مقدمہ میں حضرت آدم علیہ السلام سے خاتم الانبیا ﷺ کے عہد مبارک تک انسان اور انسانیت کی منزل بمنزل ترقی اور تکمیل دین کی نوعیت بیان کی گئی ہے۔ایک مختصر قصص الانبیاء مرتب کی گئی۔کتاب لطیف کا ایک ''دیباچہ-عرب قبل اسلام اپنے آئینہ میں قریش ومکہ اوران کا تمدن کا بیان دکھتا ہے۔ہجرت مدینہ کی مستند وصحیح تفصیلات، مدینہ کی تاریخ وجغرافیہ،انصارو مہاجرین کے مناقب اور حجۃ الوداع کے خطبہ کے اجزاء جمع کرنے پر کتاب کا اختتام کیا گیا ہےاور مستند حوالوں میں صفحات وغیرہ کی تفصیل بھی دی گئی ہے۔

مقدمہ سیرت مبارکہ میں سرگزشتہ انسان اور مختصر قصص الانبیاء میں انسان کیا ہے، انسانیت اورنبوت ورسالت اوروحی کی ضرورت،انسانی استعداد کی صلاحیت وترقی اورانبیاء علیہم السلام کی تعلیمات، دین کامل کی ضرورت اور تکمیل دین جیسے مباحث زیر بحث آئے ہیں۔ چونسٹھ صفحات کے اس مقدمہ میں نمبروار مباحث آئے ہیں۔ان مباحث میں قرآن مجید کی چند آیات کریمہ کا ذکر ہے جیسے سورہ جاثیہ:۴۵ آیت:۱۳ کائنات کی تسخیر برائے انسانی اور برائے تصرف اورافادیت انسانی وکائناتی،سورہ رعد:قرآن پاک اورتذکرہ انبیاء، برائے عبرت وموعظت، آدم علیہ السلام خلیفہ الٰہی قرآن شریف سورہ۲ (آیت...ندارد) بدن آدم علیہ السلام سے جوڑا/سب سے پہلی عورت (سورہ نساء۴۰ آیت ۱) حضرت نوح کی کشتی کا ذکر عام بیان قرآن کے حوالے سے،حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعائے بعثت خاتم الانبیاء بقرہ۲ آیات:۱۲۶-۱۲۹،ابراہیم رکوع:۶ قربانی/ذبیح اسمٰعیل (سورہ صافات)

خاتم الانبیا ﷺ کے ذکر خیر میں سورہ اخلاص،سورہ شوریٰ،سورہ انعام،سورہ حدید، بقرہ،آل عمران،نساء،ابراہیم،سورہ کہف وغیرہ تعلیمات نبوی کے حوالے سے ہیں۔مؤلف گرامی کے خیال میں اصل دین ایک ہی رہا کیونکہ حقیقتیں بہرحال حقیقی رہیں۔شریعتیں مختلف ہوتی ہور ہیں...(ص۲۶)'' دین وشریعت کا یہ تعلق خوب ہے۔انبیاء کرام میں حضرت آدم علیہ السلام کے مختصر تذکرہ کے بعد حضرت نوح علیہ السلام کا ذکر بھی مختصر ہے اور حضرات ہود وصالح علیہما السلام کا اور بھی مختصر۔تذکرہ حضرت ابراہیم علیہ السلام (۳۵-۳۸)

میں ان کی قوم کی بت پرستی اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی توحید اور قوم کی بربادی، حضرت اسمٰعیل علیہ السلام اور خانہ کعبہ (۳۸-۴۰)، حضرت اسحاق علیہ السلام (۴۰-۴۱) میں ذکر حضرت یعقوبؑ، یوسفؑ وغیرہ کا مختصر ذکر، حضرت موسیٰ علیہ السلام (۴۲-۴۷ و مابعد) میں بنواسرائیل اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر خیر۔ تلاطم نظریات میں رحمۃ للعالمین کی امت، دلیل صداقت، توحید، تصدیق انبیاء، حیثیت انبیاء، محمد رسول اللہ ﷺ کی حیثیت، رواداری، دین و مذہب دل سے ہے، انسان کا درجہ اور مقصد انسانی بھائی چارہ، مودت، عدل اور انصاف، نیکی، حرام کام، جہاد، مذہبی جنگ، روحانیت شرافت مکارم اخلاق کا عروج کے مباحث ہیں۔

دیباچہ سیرت مبارکہ ''عرب قبل اسلام اپنے آئینہ میں اور مکہ اور تمدن مکہ'' کے دوسرے ذیلی عناوین ہیں۔ آبادی، انقلابات، تعمیر، تہذیب، تنظیم مملکت و بناء کعبہ'' اور اس کے بعد مصنف گرامی کا نام نامی اور ناشر مذکور کا صراحت نامہ اسے دوسرا مضمون بناتا نظر آتا ہے جس کے سرورق کی پشت پر مصنف گرامی کے دو مزید نگارشات و تالیفات کا اشتہار ہے اور ان دونوں کا موضوع اسی کتاب سیرت کے دو مزید مباحث سے ہے: ''دور حاضر کے سیاسی اور اقتصادی مسائل اور اسلامی تعلیمات/ ہمارے پیغمبر مع عقائد و احکام اسلام''۔ دیباچہ کا مرکزی عنوان عرب قبل اسلام بہت سے دیگر مشرقی سیرت نگاروں اور علمائے کرام کی کوتاہ نظری یا درون بینی کا ثبوت پیش کرتا ہے۔ اس دیباچہ کے تمام مضامین و موضوعات روایتی ہیں جیسے عرب و عجم کا فرق، جاہلیت اولیٰ، اس کی شرح فانی کے اشعار، بدوی اور شہری قبائل کا فرق تمدن، خسرو پرویز اور نعمان بن منذر کے مکالمات کے ذریعہ ان کا اظہار بحوالہ طبری، قتل بنات۔

اس میں بعض مباحث بلاشبہ نئے اور دلچسپ ہیں جیسے عرب خدوخال کا حسن، نسب عالی کا تحفظ، صفات حسنہ جیسے سخاوت و حوصلہ، ادب اور تہذیب، دین و مذہب، قول و عہد کی پابندی وغیرہ۔ عمدہ گوشت/ اونٹ/ کوہان پھر خصوصیات عرب کے نئے عنوان سے

اوصاف حمیدہ کا بیان وشرح ہے اوران کے بیان میں اسلامی نبوی دور کے واقعات جیسے اسلام عمرؓ اوران کی جوار عاص بن وائل سہمی اور حدیث ہرقل کے حوالہ سے حضرت ابوسفیانؓ کی حدیث بخاری کا ذکر ہے، معاہداتی حکومت کے عنوان سے قبائل کے معاہدات کا عمدہ بیان ہے۔قبائلی جنگوں کے ذکر میں مقدس چار ماہ اور جنگ فجار کے چار ادوار کا ذکر ہے،اس مختصر بحث میں حماسہ کے علاوہ ابن ہشام، ابن قتیبہ، بخاری، اموی، معجم البلدان کے علاوہ جدید نگارشات میں شیخ محمود سید الطہطاوی، ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی کتاب عہد نبوی میں نظام حکمرانی کے حوالے ہیں۔بعض اکابر جاہلی کے بارے میں خاصی تفصیل کی ہے۔''شہریت (تمدن) اورشہری تہذیب'' کے مختصر مبحث میں محلات/قصور سدیر دارالقواریر (شیش محل) آرائش منزل، مسہری، چلمن، ملبوسات وظروف اور اشیاء روزہ مرہ کے اسماء جیسے چراغ، دسترخوان قلم مدار/ روشنائی، کھانے کی چوکیاں، کرسی کا عدم وجود، سنگھار خوشبو وغیرہ کے اہم و قیمتی مباحث ہیں۔ان میں سے بعض کو قرآنی اشارات سے بھی ثابت کیا گیا ہے جب کہ دوسرے مباحث کے لیے فتوح البلدان بلاذری، معارف ابن قتیبہ، بخاری، ابوداؤد اور کتب ادب کا حوالہ دیا ہے۔مولانا شبلی پر عرب تمدن کی پسماندگی پران کی دلیلوں کی تردید کی ہے (ص: ۴۰-۴۱)۔اپنے مباحث کے اثبات میں عہد نبوی کے واقعات وروایات سے استشہاد کیا ہے۔مکہ مکرمہ، اس کے محل وقوع، اہمیت اور تاریخ کا روایتی ذکر البدایہ والنہایہ، ابن ہشام، توریت، فتح الباری، معارف ابن قتیبہ، ابن سعد وغیرہ کتب سیرت وسوانح سے کیا ہے۔قریش کی تاریخ مختصر قصی بن کلاب اوران کی تعمیر کعبہ وتولیت کعبہ کے علاوہ ان کا سیاسی مسلک اور مذہبی مسلک بھی بیان کیا ہے۔شہر مکہ کی قدیم تنظیمات کے باقی رکھنے کے بعد قصی کے جدید تنظیمات کا ذکر کیا ہے جس میں شامل ہیں: نادی، دارالندوہ اور دوسرے شعبے اور منصب مذکورہ بالا۔جدید تنظیمات کی کارکردگی کا عمدہ ذکر ہے۔مختلف شعبے اور مناصب میں مختصر مختصر تشریح کے بعد تقسیم مناصب کی ایک جدول دی ہے جو طبقات ابن سعد، اخبار مکہ، العقد الفرید وسیرۃ ابن ہشام سے ماخوذ بتائی ہے۔پانچ شعبوں کے ذیلی مناصب

کی تعداد اٹھارہ بیان کی ہے جس میں بعض مناصب بڑے عہدوں کے ذیلی تھے اور اس میں خلط ملط بھی بہت ہے اور قبائل میں سے بعض کا نام غلط ہے جیسے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے خاندان کا نام بنو تیم کی جگہ بنوتمیم لکھا گیا ہے۔شاید کتابت کی غلطی ہے،نسی کے ذمہ/ منصب کا خاندان صوفہ بتایا گیا ہے جو قدیم خاندان تھا اور وہ منصب بھی نہ تھا، سقایہ، رفادہ اور وقادہ اور اجازہ کا منصبدار ابوطالب/عبد مناف بالکل جزوی ہے۔اس فہرست مناصب میں قیادہ اور اس کے منصبدار بنوامیہ کا ذکر تمام سیرت نگاروں میں مولانا مرحوم اور چند محققین عصر کا کارنامہ ہے۔قصی کے جانشین وغیرہ کا مبحث خالص روایتی ہے اور ہاشم اور اکابر خاندان نبوی کا کافی مبالغہ آمیز جیسے رحلۃ الشتاء والصیف کے طریقے کے ایجاد کی بات،عبدالمطلب کا اصل نام شیبہ (ص ۱/ ۳۶ وغیرہ) چاہ زمزم کا ظہور، بنوخزاعہ سے معاہدہ، ابوطالب اور قریش کا عرب پر ہمہ گیر اثر۔اس میں چند مباحث دلچسپ اور نئے ہیں جیسے اسواق العرب بحوالہ کتاب المحبر محمد بن حبیب مرزوقی، واقعہ اصحاب الفیل اسباب ونتائج، اس پورے دیباچہ میں تہذیب وتمدن عرب اور واقعہ فیل کے ضمن میں سورہ فیل اور اس کی تفاسیر جیسے تفسیر مظہری، معالم التنزیل وغیرہ مگر وہ سب کے سب روایتی ہیں (۱-۱۰۴؛ آخر میں فہرست مضامین عرب قبل اسلام ایک دلچسپ چیز ہے)۔

سیرۃ مبارکہ جلد اول کے مباحث کا آغاز اس کے بعد مؤلف گرامی کے ایک معروضہ کے بعد دعاء اور ظہور دعا سے ہوتا ہے اور وہ پورا باب سیرت مکی دور سے وابستہ ہے۔شروع کے ۵۶ صفحات قبل بعثت کے موضوعات سے متعلق ہیں اور بعد کے قریب ۸۳ صفحات نبوت محمدی کے عہد سے۔قبل بعثت کے مباحثِ مولانا سید میاں حسب ذیل ہیں:

۱- دعائے ونوید مسیحا- بقرہ: ۱۲۹ اور انجیل یوحنا کے حوالہ سے (آیت صف:...کا ذکر نہیں)، اسمائے گرامی محمد واحمد کی لغوی وتاریخی تحقیق مع اشعار حالی وسعدی، ظہور بشارت عظمیٰ میں تاریخ ولادت ۱۲/ربیع الاول/ ۲۵/اپریل ۵۷۱ء انورشاہ کشمیری اور شبلی کے حوالے سے محمود فلکی کی تاریخ ولادت ۹/ربیع الاول کا ذکر دادا کا تسمیہ، والد عبداللہ کا قبل ولادت

انتقال، نسب نامہ نبوی بروایت حدیث البدایہ کے حوالہ سے۔

۲- رضاعت کے بارے میں عام روایتی بیان، عرب زبان ٹکسالی، عجمی اثرات سے حفاظت، حضرت ثویبہؓ کی سات ماہہ رضاعت بحوالہ البدایہ، بخاری، اکمال، ابن ہشام وغیرہ متعدد مصادر کا ذکر بلاتعین باب وصفحات، رضاعت حلیمہ روایتی۔

۳- ''سیدہ آمنہ مدینہ میں'' کہ ان کا ننہالی رشتہ مدینہ میں تھا۔ تیرہ سال بعد آمنہ مدینہ گئیں'' ہجرت کے بعد کے واقعات کا حوالہ۔

۴- دادا عبدالمطلب کی سرپرستی اور خواجہ ابوطالب کی سرپرستی، قصہ کہانی کی مجلسیں اور حفاظت نبوی کی روایات/ ابوطالب کی ناکافی دولت بلکہ بدحالی میں رعی غنم کے ذریعہ امداد، خاندان ابوطالب کا ذکر حواشی میں۔

۵- مکہ تجارتی نقطہ نظر سے: رحلۃ الشتاء والصیف کی طریقت ہاشمی، رعی غنم، تعمیر کعبہ میں ازار کا واقعہ/ لنگی کھلنے نہ پائی تھی مراسم شرک سے حفاظت۔

۶- دور شباب اور جوہری کردار کے عنوان کے تحت تجارت نبوی، حضرت خدیجہؓ سے شادی، نام لینا بے ادبی سمجھتے تھے لہٰذا الصادق، الامین کہتے تھے۔ سورہ ضحیٰ کا حوالہ/ ترجمہ شاہ عبدالقادر، شرکاء تجارت کے واقعات و روایات، حضرت زیدؓ بن حارثہ کلبی کا ذکر خیر، نکاح کے تحت ذکر حضرت خدیجہؓ۔

۷- دور شباب... اخلاقی بدحالی، جذبہ اصلاح - امن پسندی اور صلح جوئی (ص:۱/ ۴۳-۴۷)۔ حلف الفضول کا ذکر نئی سرخی کے تحت تعمیر کعبہ اور نبوی ثالثی کا عام کتب سیرت سے ذکر (۱/ ۴۸-۵۳)، خداپرستی اور معرفت حق، بعثت سے قبل سوالات ذہن محمد/ جوار غار حرا (۵۳-۵۶)۔

''نبوت'' سے مکی دور نبوی کے عام واقعات روایتی انداز سے بیان کیے ہیں اور غار حراء میں سورہ اقراء کی تنزیل کا واقعہ/ حاشیہ میں نزول کا سنہ ۶۲۲ء اور ورقہ بن نوفل کی تصدیق کی روایات کتب سیرت اور حدیث (۵۷-۶۳) تبلیغ اور دعوت عام سے پہلے تربیت

پر ایک بحث آیات وسورہ قرانی سے، حضرت ابراہیم وغیرہ سے نا آشنا، صرف سنا تھا اور دوسرے انبیاء/ دین سے ناواقف، اولین مسلمانوں کا ذکر طبقہ وار (۶۴-۶۶)، نصاب اور طریقہ تربیت/ بنیادی تعلیمات آیات اور سورتوں کے حوالہ سے ایک عمدہ اور مختصر تجزیاتی مبحث (۱/ ۶۷-۷۴) داعی کے اوصاف اور تربیت (۷۵-۸۰)۔

-ردعمل اور سماجی حالات کے تحت اکابر قریش کا ذکر اور ان کا سیاسی وسماجی غلبہ اور ایک مختصر فہرست اور ان کے فکری اور عملی اخلاق کا ذکر اور تبلیغ وارشاد کے خلاف ردعمل اور مخالفت محدود، اول اول تبلیغ کا آغاز بحوالہ سورہ مدثر -۲''قم فانذر ''، خاندان بنوعبدمناف کی دعوت نبوی اور حضرت علیؓ کی حمایت کی روایت، فاران کی پہاڑی سے صدائے حق میں اول انجیل کی آیات کے حوالہ سے اوصاف محمدی، کوہ صفا کی تقریر، ابولہب کی مخالفت اور ابولہب پر عناد نبوی کا سارا الزام (۱/ ۸۰-۹۲)۔

-تعلیمات کا دوسرا رخ: پڑھنا لکھنا، تہذیب وتمدن کے تحت خاص مباحث ہیں۔ دلائل صداقت نبوی اور قرآنی تحدی (۹۳-۱۰۳)۔

-محمد ﷺ کی حیثیت: فرائض اور خصوصیات: سورہ احزاب سے شاہد، مبشر، نذیر، داعی اور سراج منیر اور خصائص نبوی پر بحث (۱۰۴-۱۴۱) اور اسی میں اہم واقعات سیرت جیسے تعذیب مسلمین وصحابہ، ہجرت حبشہ، اسلام عمرؓ، مقاطعہ، ابوطالب کی حمایت، سفر طائف کے روایتی مباحث از کتب سیرت وحدیث، کہیں کہیں آیات قرآنی کے حوالے۔

مدنی عہد نبوی پر بقیہ کتاب سیرۃ مبارکہ مشتمل ہے اور اس کے اہم ترین مباحث ہیں:

۱- یثرب- مدینۃ النبی ﷺ- کی تاریخ وجغرافیہ، آبادی وطبقات بحوالہ ابن ہشام، فتح الباری، معجم البلدان، بخاری وغیرہ (۱۴۲-۱۴۷)۔

۲- سفر ہجرت ایک نئے عنوان سے آنے والے نبی کا چرچا کے تحت، ذکر خیر نبوی، یثرب میں اسلام کے تحت بیعت عقبہ اول دوم، تعین نقباء اور ان کا تعارف مفصل

(۱۵۸-۱۶۹)، مکہ مکرمہ میں اصول کار کہ ہاتھ نہیں اٹھا سکتے اور اقامت صلوٰۃ و زکوٰۃ وغیرہ (۱۶۹-۱۷۰)، صحابہ کو اذنِ ہجرت نبوی دعا اور سورہ...(نام ندارد) کی آیات سے استشہاد (۸۷-۸۰)، ہجرت کا اشارہ اور واقعہ ہجرت بحوالہ سورہ طارق وانفال اور مخرج صدق کی شرح، غار ثور میں قیام، حضرت علیؓ کا بستر نبوی پر خواب کی روایت اور ابوبکر کی رفاقت اور سفر ہجرت کی مختصر سرگذشت، راستہ میں صحابہ اور اکابر عرب کی ملاقات۔(۱۷۱-۱۹۸)

۳- یثرب میں ورود مسعود کے تحت سورہ مومنون کی آیت: ''انـزلنی مبارکا'' ذکر اور ترانہ معصوم بچیوں کا، استقبال نبوی، قیام قباء، اولین خطاب نبوی، ابن سلام کا اسلام، قبا سے مدینہ روانگی، ناقہ کی ماموریت اور بنونجار کو شرف میزبانی، قرعہ کے ذریعہ منزل ابوایوب میں قیام نبوی، شبلی پر نقد حذف واقعات کا (حاشیہ: ۲۰۸/۳، قیام منزل ابوایوبؓ کے مختصر واقعات (۱۹۹-۲۱۳)۔

۴- ''نیا دور- غیر محدود میدان عمل میں'' عنوان کے تحت مباحث: دعوت الی اللہ اور داعی کے اوصاف و خصائل اور خصوصیات (۲۱۴-۲۴۴)، سورہ احزاب کی صفات نبوی پر پھر بحث، آداب دعوت وطریقہ، اہل کتاب کو آیات کریمہ کے حوالہ سے اور اس میں شرح آیات خاص ہے۔

۵- دعوت الی اللہ کی دشوار گزار گھاٹی، جہاد فی سبیل اللہ کی نئی بحث مختصر ہے (۲۴۵ ۲۴۸، صرف جہاد پر زور)۔

۶- خطبات وعمومی ارشادات کے تحت آپ کے خطابات، نماز جمعہ/ سالم بن عوف میں، مدینہ آمد پر اولین خطبہ جمعہ در مدینہ بحوالہ ابن کثیر، اولین اقدامات نبوی جیسے تعمیر مساجد واقامت صلوۃ: مسجد قبا، جماعت، مسجد مدینہ، تعمیر کے واقعات کتب حدیث وسیرت سے، حجرات امہات المومنین کی تعمیر، صفہ واصحاب صفہ، جنازہ/ نماز کی جگہ، نماز باجماعت، فوائد، اذان، دار ہجرت کا بیان اس کے بعد (۳۰۵)

اور مسجد و حجرات کے تعمیر پر دوبارہ نظر میں اقتصادی تعمیر، بنیادی نظریہ، طریقہ تعمیر اور دو حاضر کی اقتصادی تحریکات، مواخاۃ برائے سبق رہنمایان سیاسی، سیرت مبارکہ کے اشارات اور دور حاضر کے نظریات کا بنیادی فرق، انسان کی حیثیت، تزکیہ و تعلیم و تربیت، استحصال کی بندش، تیسرا کام قریش و اہل یثرب کا معاہدہ، یہود سے مصالحت یعنی دستور مدینہ پر مفصل بحث (۳۳۴-۳۴۹)۔

۶- تحویل قبلہ کی ذیلی سرخیاں ہیں: انقلاب عظیم، سب سے افضل امت، سب سے افضل قبلہ'' آیات سورہ بقرہ، تفسیر رازی، بخاری، مسلم، ابن کثیر، البدایہ، طبری، مسند اسحاق، فتح الباری وغیرہ۔ مصادر حدیث و سیرت سے اس کے وجوہ و اسباب و ثمرات سے بحث کی ہے اور اس میں متعدد دوسرے مباحث ہیں جیسے وعدہ رب ابراہیم علیہ السلام سے، بنو اسرائیل کی محرومی، امامت سے معزولی، مستحق شرف و امامت امت محمدی کا کعبہ کی قبلہ اعظم کی حیثیت کا ذکر ہے (۳۵۰-۳۶۳)۔

۷- ''نکاح السیدہ فاطمۃ الزہراؑ'' کی بحث تاریخی کا آغاز سورہ نور:۳۲ اور حدیث نبوی نکاح وقت دستیابی کفو از ترمذی سے کیا ہے اور اس شادی مبارک کی تفصیلات و روایات کا ذکر تفصیل سے کیا ہے اور اس میں بہت سے ضروری اور غیر متعلقہ روایات بھی شامل کی ہیں جیسے مکی مواخاۃ میں حضرت علیؑ کی مواخاۃ نبوی جو مدنی دور میں بھی شامل رہی، البدایہ والنہایہ سے تفصیل ماخوذ بتائی ہے۔ اس میں بہت سی باتیں اور نتیجے خود ساختہ ہیں یا غیر مستند جیسے زرہ علیؑ کی قیمت ۴۸۰ درہم کی ایک تہائی خوشبوؤں پر خرچ کی، دلہن کے لیے مکان کرایہ پر لیا، بنو قینقاع کے سنار کی شرکت میں کام کرنا چاہا (بحوالہ بخاری) حالانکہ وہ اجیری کا معاملہ تھا ناقہ علیؑ کے کوہان کاٹنے کا واقعہ حضرت حمزہؓ، نکاح سے کچھ عرصہ بعد رخصتی (بروایت استعیاب والبدایہ نو ماہ بعد) اور جہیز نبوی جو دیا ہی نہیں گیا (۳۶۴-۳۶۸)

۸- مقاصد بعثت۔ فرائض نبوت اور تکمیل کی بحث میں دعا اور قبول دعاء کے تحت آیات بقرہ و جمعہ کے حوالہ سے دعائے ابراہیمی اور اس کی قبولیت کی بحث پھر کی ہے اور

فرائض نبوت میں آیات کریمہ، تلاوت قرآن، نماز/ نبوی خصوصیت (بحوالہ شاہان دہلی، ولی اللہ وعبدالقادر)، روزہ، زکوٰۃ، تعلیم الکتاب، تعلیم الحکمہ، تزکیہ (آیت کا ترجمہ مولانا آزاد و عبدالقادر اور موخر الذکر کی ترجیح)، تزکیہ کی جہات، پھر حکومت کا نظام، اس کا مفہوم وعمل و حقیقت، مالی نظام وغیرہ اور حالات ومعمولات کا تزکیہ یعنی ادعیہ وماثورہ، معمولات وغیرہ۔ درمیان میں مثالوں اور فقہی مباحث کے حوالہ سے بعد کے خلافت فاروقی وغیرہ کے واقعات، آیات کریمہ کی تشریح، تغیر خلق اللہ میں خصال فطرت اور دوسرے تفسیری مباحث شامل ہیں۔ آداب ملاقات کے مختصر مبحث کے بعد دربار نبوی کی خصوصیات وآداب شمائل ترمذی سے ماخوذ کر کے بیان کی ہے اور یہ سب تزکیہ کے مباحث ہیں (۳۶۹-۴۲۴)۔

۹- حج البیت کا حکم قرآنی اور حج اسلام وبراءت کا نزول آخری مبحث ہے، اس میں فتح مکہ کے بعد حج اور حج درامارت حضرت صدیقؓ اور بعد میں حجۃ الوداع/ الاسلام کا کافی ذکر ہے اور خطبہ حج الوداع میں مختلف احکام اسلام اور وصایائے نبوی جیسے عورتوں کے حقوق، لونڈ ختم، مساوات انسانی کے علاوہ تکمیل دین کا ذکر کیا ہے اور سورہ نصر کے نزول کو اعلام رخصت بتا کر خاتمہ کتاب کیا ہے (۴۲۵-۴۳۷)۔ ترقیمہ میں دوسری جلد کے مباحث کا ذکر کیا ہے (ص: ۴۳۷) جو لکھی ہی نہیں گئی۔

تنقیدی تجزیہ

سیرۃ مبارکہ محمد رسول اللہ ﷺ مؤلفہ مولانا سید محمد میاںؒ ادھوری کتاب سیرت ہے۔ موجودہ مطبوعہ کتاب صرف جلد اول ہے جس کی صراحت نہیں کی گئی۔ ترقیمہ سے اس کے جلد اول ہونے کا پتہ چلتا ہے اور اسی سے جلد دوم کی تصنیف وتالیف کا اور اس میں شامل کیے جانے والے مضامین سیرت کا بھی مگر دوسری جلد سیرت مبارکہ کی تالیف کسی وجہ سے نہ ہوسکی۔ زمانی لحاظ سے وہ ہندوستان کے عہد جدید کی ایک ناقص کتاب سیرت ہے جو بیسویں صدی عیسوی کی ساتویں دہائی کے خاتمہ پر لکھی اور شائع کی گئی۔ اس سے قبل ادوار سیرت نگاری کا زریں دور- دور اول و دور دوم -بقول ڈاکٹر انور محمود خالد ختم ہو چکا تھا۔ ڈاکٹر

موصوف کے مطابق زمانی لحاظ سے ۱۹۰۱-۱۹۴۷ء کے درمیان کا عرصہ تھا جب اردو سیرت نگاری کی فن ساز اور رجحان نما کتب تالیف کی گئیں۔ان میں اہم ترین تصانیف میں قاضی سلمان منصور پوری کی رحمۃ للعالمین،شبلی وسلیمان کی سیرۃ النبی،مولانا تھانوی کی نشر الطیب، سید سلیمان ندوی کے خطبات مدراس، پروفیسر سید نواب علی کی سیرت رسول اللہ، مولانا عبدالروٗف دانا پوری کی اصح السیر ،مولانا مناظر احسن گیلانی کی النبی الخاتم، مولانا محمد ادریس کاندھلوی کی سیرت المصطفیٰ جیسی عہد ساز تالیفات شامل ہیں۔ان کے علاوہ اور بھی بہت سی عمدہ تحقیقی تالیفات سیرت ہیں لیکن سیرۃ النبی شبلی کو اس دور زریں کی سب سے اہم کتاب قرار دیا (انور محمود خالد، اردو نثر میں سیرت رسولﷺ، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور ۱۹۸۹ء طبع اول ۴۳۵-۶۹۵، نیز مابعد کی بحث کتب سیرت)۔ڈاکٹر موصوف نے عہد جدید یعنی ۱۹۴۷ء کے بعد بیسویں صدی عیسوی کے نصف آخر کے اردو سیرت نگاری کے شاہکاروں کو نہ جانے کیوں شامل نہ کیا حالانکہ وہ اصل عہد زریں دوم ہے۔بہر حال مولانا سید میاں کی کتاب سیرت کی تالیف واشاعت سے قبل سیرت نبوی کی کامل تصانیف عالیہ سکہ رائج الوقت اور رہنمائے نگارش بن چکی تھیں۔مولانا موصوف نے ان میں سے متعدد سے استفادہ بھی کیا ہے اور نقد واستدراک سے بھی کام لیا ہے۔اس کے باوجود فن سیرت کا فریم ورک اور دائرہ کار نہیں سمجھا۔ان کی تالیف سیرت میں اصولی مباحث نے خالص تاریخی واقعات،سوانح وحقائق اور وقت و ماحول کے شواہد کو نہ صرف اوجھل کر دیا بلکہ تاریخی بیانیہ کو بری طرح متاثر کر دیا۔ وہ سیرت نبوی کی کتاب سے زیادہ اسلامی تعلیمات اور قرآنی تشریحات اور تفسیری مباحث اور لطائف وظرائف کی رپورٹ بن گئی مثلاً داعی کے اوصاف اور دعوت کے اصول وآداب کی بحث سورہ احزاب کی آیت کریمہ کی قرآنی تفسیر اور مصنف گرامی کی تشریح سے اتنی بوجھل ہے کہ وہ کتاب سیرت سے کچھ علاقہ نہیں رکھتی اور اس میں تکرار شدید بھی ہے۔وہ دو مقامات پر بہت تفصیل سے آئی ہے اور دعوت نبوی اور اس کے اثرات وتاثیرات کو نظر انداز کرنے کا باعث بن گئی۔ایسی اور بھی بہت سے مثالیں ہیں جن کا

ذکر بطور حوالہ واشارہ موضوعاتی تجزیہ میں جا بجا کیا جا تا رہا ہے۔

کتاب سیرت کا اولین مضمون - مقدمہ سیرت مبارکہ انسان اور انسانیت - کی حقیقت کھولنے سے قاصر رہا۔ وہ دنیا دار اور بد عمل انسان کی سیہ کاریوں اور نیک بختوں اور صالح افراد کی نیکوکاریوں کے ذکر کے ارد گرد گھومتا رہا اور یہ نہ بتا سکا کہ قرآنی اصطلاح کے مطابق ان کے فجور و تقویٰ نے ان کی انسانی ساخت اور شخصیت کیا بنائی تھی۔ انبیاء کرام کی تربیت و تعلیم نے نیکوکاروں کے علاوہ بدکاروں کی انسانی شخصیت کی تشکیل کی تھی۔ یہ دعویٰ بھی غیر مستند ہے کہ وہ مختصر تاریخ انبیاء کرام ہے۔ قصص القرآن کا یہ باب بھی ناقص ہے اور ارادہ نبوت کی ترقی و تکمیل کا گراف بنانے سے قاصر ہے۔

دیباچہ سیرت کا عنوان ہی گمراہ کن ہے۔ ''عرب قبل اسلام'' کا تصور و بیان فاسد صرف مولانا محمد میاں کی فکر ناقص کا زائیدہ نہیں اس میں اردو سیرت نگاری کے امامان عالی مقام اور بیشتر مشرقی وروایتی علماء کرام اور دانشوران عظام بھی اسی دام فریب کے حلقہ صد کام کے اسیر ہیں۔ مولانا مرحوم نے یا ان کے بزرگ تر پیش رووں نے یہ حقیقت سمجھی ہی نہیں کہ اسلام دین واحد ہے جو حضرت آدم علیہ السلام کے ساتھ روئے ارض پر آیا اور اپنی تمام بنیادی مبادیات - عقائد وارکان واخلاق - کے ساتھ ہر دور کے نبی اکرم علیہ السلام کے ساتھ موجود و کارفرما رہا اور وحدت کا شہ کار رہا۔ عرب قبل اسلام سے بہتر بلکہ صحیح تر عنوان عرب جاہلی یا بعثت محمدی سے قبل کا عنوان بنایا جائے۔ اس نکتہ وحقیقت کو شاہ ولی اللہ دہلوی اوران کے پیشرو حکماء ومفکرین اسلام نے واضح کیا تھا۔ لیکن دین حنفی کی قدر و قیمت اور ابراہیم حنیف کی ملت بیضاء کا ادراک نہیں کیا گیا۔ عرب جاہلی میں قصی بن کلاب پر عمدہ تفصیل ہے اوران کے کارناموں کا ذکر بھی بہت خوب ہے لیکن قریش کے اکابر اور خاص کر اجداد نبوی پر بحث تشنہ ہی نہیں بلکہ ندارد ہے اور دین حنفی، مکہ وکعبہ کے مختلف مباحث بھی روایتی اور ناقص ہیں۔ اس بحث کے نادر اور قیمتی اور نئے زاویوں کا ذکر آگے آتا ہے۔ دوسرے مباحث سیرت کی مانند اس دیباچہ میں غلط روایات اور جانبدارانہ تشریحات کا ایک

انبار ملتا ہے۔ جد امجد ہاشم بن عبد مناف کو بنو عبد مناف میں عظیم ترین اور مثالی قرار دینا، ہاشم خطاب اور اس کی وجہ میں ''سیکڑوں من کیک بوری میں بھر کر قحط کے زمانے میں مکہ لانا اور ان کی ثرید بنا کر کھانا کھلانا؛ سقایہ و رفادہ دونوں مناصب پر فائز ہونا جبکہ رفادہ دوسرے بطن قریش کا موروثی منصب تھا اور حقیقتاً وہ قومی قریشی ذمہ داری تھی، رحلۃ الشتاء والصیف کا ایجاد کرنا اور فرزند اول عبد شمس کے جانشین، امیہ بن عبد شمس برادر زادہ سے منافست اور بنو امیہ و بنو ہاشم میں رقابت و مخالفت وغیرہ کا آغاز ہوا، نہ صرف غلط ہے بلکہ عبد شمس، مطلب اور نوفل خاندان بنی عبد مناف کے اسی طرح اکابر قومی تھے جیسے ہاشم اور رحلۃ الشتاء والصیف کی تجدید معاہدات میں برابر کے شریک، مبالغہ آمیز روایات ہیں بلکہ تاریخی حقائق کے خلاف اور افسانے ہیں۔ اسی طرح بعض اسماء اجداد نبوی کی تحقیق نہ کر سکے۔ دادا عبد المطلب کا نام اصل شیبہ بتایا ہے اور وہ غلط رہا۔ مطلب بن عبد مناف کا وقت انتقال ہاشم کے کچھ دنوں کے بعد بتایا ہے وہ بھی صحیح نہیں اور اسی طرح شیبہ کا مکہ لایا جانا بھی زندگی خراب ہونے سے بچانے کا شاخسانہ نہ تھی۔ سقایہ و رفادہ اور دوسرے مناصب ملاء قریش اور خاص کر اس کی جدول مولانا مرحوم کے تخیل اور غیر تاریخی ذہن کی پیداوار ہے۔ البتہ قیادہ کا بنوامیہ میں منصب بیان کر کے ایک گونہ اماماں سیرت پر فوقیت حاصل کر لی ہے کہ کوئی اس کا ذکر نہیں کرتا۔ متعدد منصب داروں کا تعین بھی غیر تاریخی و غیر واقعاتی ہے۔

مولانا سید محمد میاں روایتی سیرت نگاروں سے بھی چند قدم آگے جاتے ہیں اور مبالغہ آمیز بیانات دیتے ہیں اور اس ضمن میں وہ نہ صرف روایات تاریخی بلکہ احادیث صحیحہ سے بھی صرف نظر کر لیتے ہیں۔ اپنے مزعومات اور محبوب و پسندیدہ واقعات تاریخ اور عہد نبوی کے حقائق کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ چند مثالیں حاضر ہیں:

١- افراد و طبقات کے جان و مال کی حفاظت و تحفظ کے لیے صرف قبائل کے معاہدات کو ذمہ دار بنا دیا ہے جب کہ ہر قبیلہ اور اس کا بطن/ خاندان ہی اپنے اپنے ارکان و افراد کے تحفظ کا فریضہ ادا کرتا تھا۔ قریش کے بطون اور عرب قبائل کے سماجی تحفظ کی صدہا مثالیں اور

واقعات تاریخ وسیرت میں موجود ہیں۔ رسول اکرمﷺ کی حمایت ابوطالب اور ان کی حمایت کی پاسداری میں ان کے دونوں خاندان بنی عبدمناف بنوہاشم وبنومطلب کے آپ کی حمایت ونصرت ہرحال میں کی۔ مولانا مرحوم اسے جوش بیان میں نظر انداز کردیتے ہیں (ص:۹۰-۹۱ومابعد)۔

۲- مولانا مرحوم کا ایک اور بیان مبالغہ آمیز ہے: ''عرب میں نہ کوئی سلطنت تھی نہ حکومت، نہ فوج، نہ پولیس'' (ص۹۰ یہ معاہداتی حکومت کے ضمن میں ہے)۔ جنوبی عرب، مشرقی پٹی اور شمالی سلطنتوں اور مملکتوں کو موصوف نے یکسر قلم انداز کردیا۔ قریشی ملا/مناصب کی تنظیم کو بھی درخور اعتنا نہیں سمجھا، جنگ فجار اور جنگ بعاث اور بہت دوسری جنگوں میں ''فوجوں'' کو طاق جوش بیان پر رکھ دیا۔ یہود مدینہ، خیبر اور دوسرے طبقات کی افواج کو بھی سرے سے القط کردیا۔ ''خفارت'' کا تصور ونظریہ اور تشریح موصوف بھی دلچسپ ہے۔ حدیث نبوی منقولہ میں ''ذمة الله اور ذمةرسوله ''اصل ذمہ داری ہے، اور اس کا توڑنا خفارت ہے۔ آگے چل کر موصوف نے عرب حکومت کے مناصب بیان کیے ہیں اور ابرہہ کی فوج اور قیس عیلان وقریشی فوجوں اور ان کے مناصب کا ذکر کیا ہے، جنگ فجار اور مناصب کے بیان میں۔

۳- ایسے مبالغہ آمیز اور تعمیمی بیانات سیرت مبارکہ کے مختلف مباحث میں کثرت سے آتے ہیں۔

-کمزور روایات بلکہ موضوع روایات کا اخذ وقبول اور ان سے استدلال واستشہاد بھی صاحب سیرت مبارکہ کا ایک اور نگارشی کارنامہ ہے۔

۱- خاندانِ بنی عبدمناف کو دعوت نبوی کے بیان میں حضرت علیؓ کی حمایت ونصرت کا دلدوز بیان اس کا ایک شاہکار ہے۔ سید سلیمان ندوی نے اس کے اخذ وقبول پر اپنے محبوب ومکرم استاذ امام سیرت شبلی پر بھی نقد واستدراک کیا تھا۔ مولانا مرحوم بھی اس سے واقف تھے لیکن اس کے باوجود غلط ومنکر روایت کو قبول کیا۔

۲- حضرت حلیمہ سعدیہؓ کوفاقہ زدہ کمزور، سوکھی عورت وغیرہ قرار دینا اور ان کی رضاعت میں متعدد روایات ضعیفہ وموضوعہ کوقبول کر کے بیان خوش نما تیار کرنا مثلاً یہودی کا بچہ کو دیکھتے ہی قتل کر دینے کا افسانہ، واپسی مکہ کے سفر میں آپ کی گمشدگی اور ابوطالب کی بے تابی کا عنوان اوراس کے نیچے آیت قرآنی ''ووجدك ضالا فهدى'' کا اطلاق غلط بیانی اور غلط استدلال کا شاہکار ہے۔ابوطالب عبدالمطلب کی جگہ بٹھادیے گئے اور ہدایت ربانی کوضلال وبے ایمانی کی جگہ (۱۵-۱۶)۔

۳- سیدہ آمنہ کا مدینہ میں کوئی ننہالی رشتہ نہ تھا، وہ دادا عبدالمطلب کے اخوال کا معاملہ تھا۔سیدہ آمنہ کا ننہال مکہ کے قبیلہ بنوزہرہ میں تھا۔پھر تیرہ سال بعد مدینہ جانے کا بیان کس روایت پر مبنی ہے (ص:۱۶)۔ بلاذری وغیرہ نے اسے عبدالمطلب کے سالانہ یا وقتاً فوقتاً زیارات اخوال واقعہ بتایا ہے۔عبدالمطلب کی عمر سوسال کی روایت یکے از روایات ہے اور صحیح بیاسی/ بچاسی سال کی ہے۔کفالت وتربیت نبوی کے لیے سارا شرف ابوطالب کو دے دیا جیسا کہ عام جانبدارانہ خیال ہے اوروہ مولانا مرحوم کی خاندانی محبت وطرفداری کا بھی معاملہ تھا۔انتقال عبدالمطلب کے وقت حارث کوزندہ بتایا ہے جب کہ وہ باپ کی حیات میں فوت ہو چکے تھے اور حاشیہ میں اس روایت کا ذکر بھی کیا ہے۔(۱۹، حاشیہ-۳)۔رعی غنم کواپنا تکفل اور ابوطالب کی امداد کا نظریہ وخیال بھی ایسا ہی خیال خام ہے۔

۴- ہجرت حبشہ میں جانے والوں کو اپنی قوم/ خاندان کا تحفظ یا معاہدہ کا تحفظ حاصل نہ تھا لیکن اس قافلہ مہاجرین میں جعفر بن ابی طالب ہاشمی اور متعدد اکابر قریش کیوں شامل تھے۔

۵- حضرت فاطمۃ الزہراؓ کی شادی کے واقعہ میں بھی متعدد غلط روایات ہیں جیسے حضرت علیؓ کا مکان کرایہ پر لینا، حضرت فاطمہؓ کی نو ماہ بعد نکاح رخصت ، بنت عزیز کو جہیز دینے کا خیال خام، آپ نے کسی کو جہیز نہیں دیا اور نہ عرب میں جہیز کا رواج تھا۔وہ حضرت علیؓ کی کمائی/ مال سے سامان زیست کی فراہمی کا واقعہ ہے۔روایات سیرت وحدیث سے زہرا

بتول کی رخصتی نکاح کی رات ہی میں ہوگئی تھی۔

۶- حضرت رقیہؓ زوجہ حضرت عثمان بن عفان امویؓ کو ہجرت نبوی کے وقت حبش میں مقیم بتایا ہے جب کہ وہ دونوں میاں بیوی مکہ آ کر ہجرت مدینہ آپ سے قبل کر چکے تھے۔

۷- متعلقین خاندان نبوی و ابوبکرؓ کے بارے میں یہ بیان کہ سب کو حارثہؓ بن نعمان میں ٹھہرایا گیا بحوالہ طبقات ابن سعد غلط ہی نہیں مصدر کی روایات کا مذاق اڑانے کے مترادف ہے۔

-اہم ترین واقعات سیرت کو نظر انداز کر دینے کا داغ اس کتاب سید محمد میاں کو نہ صرف ناقص بلکہ پایہ اعتبار سے ساقط قرار دیتا ہے:

۱- مکہ مکرمہ اور قریشی سابقین اولین کا اسلام صرف چند افراد تک محدود کر دیا اور بیان بھی دیا تو البدایہ والنہایہ کے حوالے سے۔امام سیرت ابن اسحاق/ ابن ہشام کے مطابق قریشی قبائل وبطون میں سے ہر ایک میں اسلام پہنچ چکا تھا۔ان کی فہرست قبیلہ وار/ خاندان وار موجود ہے لیکن صاحب کتاب نے اسے نظر انداز کر دیا۔

۲- ہجرت حبشہ کا بیان بھی تشنہ اور ناقص ہے کہ خاندان وار تجزیہ وتحلیل نہیں ہے۔اور واقعات ہجرت ومہاجرت میں مہاجرین ومہاجرات کا کردار اجاگر نہیں کیا۔

۳- اسلام حضرت حمزہ بن عبدالمطلب ہاشمی کا واقعہ القط ہوگیا اور مکہ دور میں ان کی کار کردگی اور قربانی اور حمایت ونصرت نبوی کا باب ہی بند کر دیا۔پوری کتاب میں حضرت حمزہؓ کا سرے سے ذکر نہیں کیا۔

۴- مقاطعہ قریش کے خاتمہ میں پانچ اکابر قریش کی مساعی کا تذکرہ نہیں آیا اور صرف ''کیڑوں کے معجزہ'' پر پوری کہانی استوار کر دی۔ابوطالب کے منہ میں یہ بیان رکھ دیا کہ ''اگر یہ خبر جھوٹی ہے تو میں تمہارے ساتھ ہوں...'' ابوطالب اور ان کے زیر حمایت خاندان کسی طرح آپ کی حمایت سے دستبردار نہ ہو سکتے تھے۔

۵- معراج کا عظیم الشان واقعہ اور دین وشریعت کا عظیم ترین باب عالی صرف پنجگانہ

نماز کی فرضیت اور عباد اللہ الصالحین پر سلام بھیجنے تک محدود کردیا ہے۔

۶- سفر طائف کا واقعہ اور اس کا پس منظر ''مٹھی بھر مسلمانوں یا آل ہاشم کے علاوہ مکہ کا بچہ بچہ دشمن تھا'' زبردست تعمیم اور غلط بیانی ہے۔ سفر طائف کا بیان صرف تین سردار ان طائف کے متکبرانہ بیان اور بدقماشوں کی پتھرزنی تک محدود ہے۔

۷- سفر طائف سے واپسی اور جوار مطعم بن عدی میں داخلہ وتحفظ کے بعد تین سالہ مکی دور کے واقعات سیرت سب ندارد ہیں کہ اس کے بعد معاً یثرب کا ذکر آجاتا ہے، ابن اسحاق واماماں سیرت نے اس عرصہ کے واقعات کو ''عرض علی القبائل'' کے عنوان سے آپ کی طلب نصرت وحمایت اور دعوت وارشاد کے حوالہ سے بیان کیا ہے۔

۸- سفر ہجرت میں خانہ نبوی سے رات میں روانگی اور اپنے بستر پر حضرت علیؓ کو لٹانے کی کمزور روایت تو شرح وبسط سے بیان کی مگر بخاری کی روایت کہ بھری دوپہر میں بیت ابی بکرؓ سے (اس کے پچھواڑے کے خوخہ سے) غار ثور جانے کی روایت/نظرانداز کردی۔

۹- قبا میں حضرت کلثومؓ بن ہدم کے دولت خانے میں قیام کے ذکر خیر میں صاحب سیرت مبارکہ نے میزبان گرامی کے غیر مسلم ہونے کی روایت قبول کرلی اور بخاری کی روایات ترک کردیں۔

۱۰- مہاجرین مکہ کی ہجرت مدینہ کا پورا بیان قلمزد کردیا۔ صرف اکا دکا مہاجرین کا ذکر فرمایا۔ اسی طرح قیام قبا کے واقعات ومعاملات بھی قلمزد کردیے۔

۱۱- مکی دور میں دو ازواج مطہرات- حضرت سودہ حضرت عائشہؓ سے شادی ونکاح وغیرہ کے واقعات مشہور نظرانداز کردیے تو دوسری بنات طاہرات حضرت زینبؓ اور حضرت رقیہؓ وغیرہ کے نکاحوں کا ذکر کیسے کرتے کہ وہ تلاش وتحقیق اور تجزیہ وتحلیل کے طالب تھے۔

۱۲- مدنی دور کے اہم ترین واقعات میں سے بہت سے ایسے ہیں جو سیرت مبارکہ میں بار نہیں پاسکے جیسے: بعد ہجرت مدینہ میں تمام صحابہ کرام اور سید المرسلین کی قرعہ اندازی کی بنا پر آبادکاری اگرچہ حضرت ابوایوبؓ کے گھر میں آپ کے قیام کا ذکر اس قرعہ اندازی کے

حوالہ سے کیا ہے مگر حضرت عثمان بن مظعون جمحیؓ وغیرہ کا ذکر نہیں کیا جب کہ وہ بخاری کی احادیث میں ہے۔

روایتی طریق تالیف اور متابعت مصادر کی وجہ سے سیرت مبارکہ کے مصنف گرامی نے واقعات سیرت کو ان کے مقامات میں نہیں بیان کیا اور جہاں اور جس طرح ان کو مصادر سے غیر مقامات -تقدیم وتاخیر- کے طریق کورانہ میں بیان کیا تھا اسی طرح بیان کر دیا۔

۱- مدنی واقعہ مواخاۃ کے ذکر کے بعد ایک پیراگراف میں مکی مواخاۃ کا ذکر بھی کر دیا ہے جیسا کہ بعض مصادر میں ہے اور ادریس کاندھلوی کے ہاں بھی ہے۔

۲- حضرت علیؓ کی مواخاۃ نبوی کو مکی دور کا واقعہ ایک ضعیف یا منکر روایت پر بتانے کے علاوہ اس مدنی دور میں بھی جاری ساری بتاتے ہیں کہ موصوف صحابی کا مدنی برادر کا ذکر معدوم ہے، حالانکہ وہ معروف و محقق ہے، فہرست برادران دینی کی پیروی میں عیون الاثر، فتح الباری اور ابن ہشام سے فہرست نقل کر دی جس میں شدید غلطیاں ہیں مثلاً حضرت عثمان بن مظعون جمحیؓ کو حضرت ابوالھیثمؓ بن التیہان کا برادر بتایا گیا ہے جب کہ بخاری میں وہ ''آل ام العلاء'' کے برادر تھے۔ حضرت حمزہؓ کا نام نامی بھی اس میں بار نہ پاسکا۔ پوری کتاب میں حضرت حمزہؓ کا کردار وذکر غائب ہے۔

مثبت نکات وخصائص

سیرت مبارکہ میں تاریخی بیانیے کے فقدان اور مورخانہ بصیرت کی کوتاہی کے باوجود مولانا سید محمد میاں نے مصادر سیرت وحدیث اور نگارشات سلف سے استفادہ کر کے اور اپنی جستجو وتحقیق سے بھی متعدد نئی جہات سیرت پیش کی ہیں اور پیشروؤں کے تسامحات کی نشاندہی کی ہے اور ان میں اضافات بھی کیے ہیں۔ ان کا ایک مختصر تجزیاتی بیان چند عناوین کے تحت پیش کرنا موزوں لگتا ہے۔

عرب جاہلی کے اوصاف حمیدہ

۱- دور جاہلیت کو صرف دور وحشت وحیوانیت، تہذیب وتمدن سے ناآشنا اور علم وہنر

سے بے بہرہ، شرافت وسنجیدگی سے عاری اور ادب سے ناواقف نہیں سمجھا اور مولانا حالی پر نقد کیا ہے اور ان کے اوصاف حمیدہ گنائے ہیں جیسے عرب قوم کی شکل وصورت اور ظاہری وجاہت (جو کسی سیرت نگار کے ہاں نہیں ملتی) خالص النسل اور محفوظ النسب، سخاوت و حوصلہ، قول وعہد کی پابندی وغیرہ۔ دین و مذہب میں وہ دین حنفی کی کارروائی اور موجودگی کا پتہ نہ لگا سکے مگر شرافت وانسانیت کا ذکر ضرور کیا ہے۔ یہ بحث مکرر خصوصیت عرب کے تحت بھی مفصل آئی ہے (باب قبل اسلام کے صفحات: ۱-۱۱۲ اور ۱۳-۳۱)۔

۲- جاہلی شہریت وتمدن وتہذیب پر ان کا باب خاص امتیاز رکھتا ہے اور وہ جاہلی دور کے عرب تہذیب وتمدن کو اجاگر کرتا ہے۔ محلات، دارالقواریر، گھریلو سامان زیست و زیبائش، مسہری، چلمن وغیرہ کے بارے میں روایات حدیث وسیرت وادب سے اسے مدلل کیا ہے اور قرآنی آیات کریمہ سے مستند، مولانا شبلی پر عربوں کے تمدن سے بیگانہ ہونے کے خیال پر نقد کیا ہے، نہ صرف اشیاء کا بلکہ عرب مزاجِ تمدن کا ذکر کیا ہے (۳۲-۴۴)

۳- اکابر جاہلی میں سے متعدد کی معدلت گستری، شرافت وانسانیت کا ذکر کیا ہے جیسے عاص بن وائل سہمی، عتبہ بن ربیعہ اور دوسرے اکابر کا اور ان کے لیے احترام کا صیغہ استعمال کیا ہے، خاص طور سے ان اکابر قریش وشخصیات کا جو بعد میں اسلام لائے۔ ان کا تذکرہ کئی مقامات پر صحیح تناظر میں کیا ہے۔

۴- جغرافیہ مکہ اور تجارت نبوی کے سلسلہ میں متعدد نئی معلومات جمع کی ہیں جیسے سقیفہ بنی عائذ پر بزازہ اور اس کے قریب آپ کا مکان کرایہ پر لینے کا واقعہ اور مجالس اکابر کے مقامات وغیرہ (ص:۵۴) مناصب مکہ میں قیادہ کا منصب کا بنوامیہ میں ہونا صرف محمد میاں جیسے لوگوں نے کیا ہے (ص:۷۰)

مکی عہد نبوی: آغاز نبوت کی تاریخ سے قبل ولادت نبوی کی تاریخ ۱۲؍ربیع الاول عام الفیل جمہور کے حوالہ سے قبول کی ہے اور دوسری تواریخ پر نقد کیا ہے۔

مکی عہد نبوی کے اہم اور نئے مباحث میں تبلیغ اور دعوت عام سے پہلے تربیت کا

مبحث (۶۴-۶۶) نصاب اور طریقہ تربیت اور داعی کے اوصاف بھی کافی اہم ہیں مگر ان میں اصولی باتیں زیادہ ہیں اور از حد تفصیل (۷۲-۸۵)۔

-تبلیغ کے آغاز کا ذکر سورہ مدثر کی آیت کریمہ سے کیا ہے جو نئی بات ہے، عام طور سے دوسرے سیرت نگار بعد کی آیات سے استدلال کرتے ہیں۔

-تعلیمات کا دوسرا رخ: پڑھنا لکھنا اور تہذیب وتمدن کا مبحث بھی ایک عمدہ اور نیا مبحث ہے (۸۵،۹۳-۱۰۳)۔

-مکہ مکرمہ میں اصول کار (پروگرام) آیات قرآنی سے مدلل کر کے عدم قتال کے بارے میں مختصر ہے مگر جاندار (۱۹۶-۱۷۰)۔

-ہجرت مدینہ کے باب میں سورہ اسراء:۸، مخرج صدق و مدخل صدق سے استشہاد دلچسپ اور عمدہ ہے (۱۸۱ مابعد)۔

-۱۲/ربیع الاول بروز دوشنبہ ہجرت مدینہ کی تاریخ یا آمد مدینہ کی تاریخ دی ہے اور بعد میں آمد قبا اور قیام قبا اور آمد مدینہ کی تواریخ پر محاکمہ کیا ہے (۲۰۴)۔

-منزل ابی ایوبؓ میں قیام نبوی کا باعث قرعہ فال انصار کو قرار دیا ہے اور مسند کی روایت کے حوالہ سے مولانا شبلی پر نقد کیا ہے مگر دونوں نے خلط ملط کیا ہے۔

مدنی دور نبوی

۱- مسجد قبا میں جمعہ کا خطبہ نبوی حافظ ابن کثیر کے حوالہ سے نقل کیا ہے اور اس کا ترجمہ دیا ہے اور اس کا عنوان ''خطبہ التقویٰ'' رکھا ہے (۲۵۲ و مابعد)۔

۲- مساجد کی تعمیر بالخصوص مسجد نبوی مدینہ میں تعمیری تفصیلات کافی ہیں (۲۶۵ و مابعد)۔

۳- حجرات امہات المومنین کی تعمیر وغیرہ کے بارے میں کافی اہم فنی جزئیات واقعات سیرت سے جمع کی ہیں (۳۰۶ و مابعد)۔

۴- سلسلہ مواخات کو سیاسی رہنماؤں کے لیے ایک سبق نامی مبحث بہت دلچسپ اور فقہ السیرہ کا باب ہے (۳۱۱ و مابعد: عصری نظریات بھی)۔

۵- تزکیہ میں مال، جسم، شخصیت، نماز، روزہ، حج اور متعدد دوسرے جہات ومعاملات کا بیان تزکیہ کی ہمہ گیری واضح کرتا ہے (۳۲۴ و مابعد؛ دوسرے مباحث)۔

۶- دستور مدینہ/کتاب وصحیفہ نبوی کا دفعات وار تجزیہ بہت خاص مبحث ہے اور عام کتب سیرت پر اضافہ، ۳۹ دفعات میں تقسیم کیا ہے (۳۳۴ و مابعد) جدید تجزیہ نگاروں نے ۴۷ دفعات دی ہیں۔

۷- سیرت مبارکہ کے دوسرے مباحث میں بھی مصنف گرامی نے متعدد نئی جہات و معلومات وتشریحات کی ہیں جو سماجی مطالعہ کی خصوصیات ہیں۔

خاتمہ بحث

تجزیہ نگاروں نے مسالک ومکاتب فکر کی سیرت نگاری کے کئی خانے بنائے ہیں جیسے اہل حدیث سیرت نگار، دیوبندی سیرت نگار، بریلوی سیرت نگار، شیعہ سیرت نگار وغیرہ، ڈاکٹر انور محمود خالد کے شاہکار تجزیہ نامہ میں اور دوسرے سیرت نویسی کے مؤلفین کے ہاں یہ تقسیمات ملتی ہیں ان میں جماعت اسلامی کی سیرت نگار وغیرہ بھی شامل ہیں۔ خوش قسمتی سے ندوی سیرت نگاروں یا علی گڑھ/سرسیدی سیرت نگاروں کا خانہ نہیں بنایا گیا۔ ان کو عام سیرت نگاران عہد زریں میں رکھا گیا۔ مسلک ومشرب اور مکتب فکر وتدریس کا اختصاص بعض اوقات اور بعض اعتبار سے بجا بھی ہے۔ بہرحال مولانا سید محمد میاں کو ان کے حلقہ دیوبندی کے سیرت نگاروں میں ڈاکٹر موصوف نے شمار کیا ہے اور اسی حیثیت سے ان کی کتاب کا ذکر وتجزیہ کیا ہے۔ ایک عام فہرست کتب سیرت نقل کرنے کے بعد انفرادی تجزیہ میں مولانا سید محمد میاں کے بارے میں لکھا ہے: ''مولانا سید محمد میاں (۱۹۰۳-۱۹۷۵ء) کی کتاب سیرت محمد رسول اللہ ﷺ اپنے موضوع پر ایک وقیع کتاب ہے اور مولانا سید محمد میاں کی ذہانت ومحنت کا زندہ ثبوت ہے (۶۷۳) مگر ایسا لگتا ہے کہ موصوف کو یہ وقیع کتاب نہیں مل سکی، اس لیے تجزیہ وتحلیل کتاب سے باز رہے مگر اس کا ذکر بھی نہیں فرمایا کہ کوئی پوچھ بیٹھے کہ وقعت کیا ہے؟ البتہ مولانا سید محمد میاں کی ''تاریخ الاسلام'' کے بارے

میں لکھا ہے کہ اس نام سے تین حصوں میں بچوں کے لیے بھی ایک کتاب لکھی ہے جو آنحضرت کی حیات مبارکہ کے بارے میں مختلف سوالوں اور جوابوں پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کا ایک نیا ایڈیشن کراچی سے شائع ہوا ہے (دارالاشاعت کراچی غیر مورخہ)، کتاب کا پہلا حصہ ۸۰ صفحات کا دوسرا ۱۶۷ صفحات کا اور تیسرا ۱۵۶ صفحات کا ہے۔ ان تینوں حصوں میں آنحضرت ﷺ کی ولادت سے وفات تک کے سارے واقعات آ گئے ہیں۔ پہلا حصہ آنحضرت ﷺ کی ولادت سے شروع ہوتا ہے اور ہجرت حبشہ پر ختم ہوتا ہے۔ دوسرا حصہ مدینہ طیبہ میں اسلام کے آغاز سے شروع ہو کر وفات النبی پر اختتام پذیر ہوتا ہے اور تیسرا حصہ آنحضرت ﷺ کے حلیہ مبارک، اوصاف، اخلاق و عادات، طرز کلام، معاملات، آداب خورد و نوش، لباس و پوشاک، راحت و آرام، نکاح، ازواج مطہرات، اعزہ و اقربا، غلاموں اور لونڈیوں، جانوروں، ہتھیاروں اور گھریلو سامان کے بارے میں معلومات کے لیے وقف ہے۔ مصنف نے بڑے دلکش انداز اور سادہ انداز میں بچوں کے لیے پورے حالات طیبہ تحریر کیے ہیں''۔ اس سے قبل ڈاکٹر موصوف نے عہد حاضر کی کتب سیرت میں مولانا سید محمد میاں کی کتاب سیرت مبارکہ کا عام حوالہ دیا ہے (۶۷۳ اور ۶۶۸ و ماقبل) مولانا سید میاں کی ''تاریخ الاسلام'' ہمیں دستیاب نہیں اور سر دست اس سے بحث بھی نہیں۔ بہر حال آخری تجزیہ یہ بتاتا ہے کہ مولانا سید میاں کی سیرت مبارکہ سیرت نگاری کی ایک جزوی اور ناقص کوشش ہے کہ تمام واقعات سیرت و سوانح کو محیط نہیں۔ وہ اپنی نئی اور مفید جہات و معلومات کے باوجود ایک عام تشنہ کتاب سیرت ہے اور اس کو تاریخی بیانیہ سیرت سے معرا ہونے کے سبب اہم اور وقیع کتب سیرت میں شمار کرنا مشکل ہے۔

☆☆☆☆☆

بے مثال تصنیف ''صحابۂ کرام کا عہد زریں''
ایک مطالعہ اور جائزہ

مولانا محمد اسجد قاسمی ندوی
شیخ الحدیث جامعہ عربیہ امدادیہ مرادآباد

سید الملت حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب رحمہ اللہ ہمارے جامع الکمالات اکابر کے سلسلۃ الذہب کی بہت تابناک اور روشن کڑی تھے۔ دینی، ملی، علمی، اصلاحی، تعلیمی، تربیتی، تحریکی اور تصنیفی تمام میدانوں میں ان کی بے مثال خدمات کے نقوش نہ صرف یہ کہ روشن و درخشاں ہیں بلکہ اخلاف کے لئے مشعل راہ اور خضرِ طریق بھی ہیں۔

قدیم مرکزی اور بافیض دینی درسگاہ مدرسہ امینیہ کی مسند حدیث ہو یا جمعیۃ علماء ہند کے پلیٹ فارم سے انجام پانے والی متنوع دینی، علمی اور ملی خدمتیں ہوں یا دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے ذریعہ انجام پانے والی عظیم خدمات ہوں، ہر جگہ حضرت مرحوم کا نام اور کام زندہ اور نمایاں نظر آتا ہے۔

سوانحی خاکے اور جامع خدمات کے جائزے سے صرف نظر اس وقت راقم کا مرکزی موضوع حضرت مرحوم کی بے مثال تصنیف ''صحابۂ کرام کا عہد زریں'' کا ذکر جمیل ہے۔

کتاب کا پورا نام ہے ''صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کا عہد زریں: فضائل و مناقب، عظیم الشان کارنامے، طرزِ حکمرانی، انداز جہاں بانی اور ان کی مثالی حکومتیں''۔ کتاب دو ضخیم جلدوں اور سوا آٹھ سو سے زائد صفحات پر مشتمل ہے۔ کتاب کے سرورق کی پشت پر اس کا تعارف ان الفاظ میں ذکر ہوا ہے:

''صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی جماعت کے موضوع پر ایک انسائیکلو پیڈیا، خلافت، خلافتِ راشدہ اور اس کے مراتب، تاریخ اسلام میں خلافت راشدہ اور خلفائے راشدین کی اہمیت، قرآن وحدیث سے اس اہمیت کے دلائل وشواہد، سیرت مقدسہ کے وہ ضروری ابواب جو حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کی تاریخ کا اہم ترین جز ہیں۔ صحابہ کرام واجب الاحترام کیوں ہیں؟ انبیاء علیہم السلام کے بعد صحابہ کی جماعت کائنات کی آنکھ کا تارا ہیں، یہ محض عقیدہ ہے یا حقیقت؟ جماعت صحابہ کا ظہور مشیت الٰہی کا ایک منصوبہ تھا جو ازل سے طے تھا اور انبیاء علیہم السلام اس جماعت کے لئے دعائیں کرتے رہے اور کتب سابقہ بشارت دیتی رہی تھیں۔ کلام الٰہی نے اس جماعت کے کیا فضائل بیان کئے؟ وہ غیر معمولی کارنامے کیا ہیں جو انسانیت کی پوری تاریخ میں ایک امتیازی شان رکھتے ہیں جن کی بنا پر صحابۂ کرام کی جماعت کا احترام نہ صرف اخلاقی ودینی فریضہ بلکہ شرافت وانسانیت کا ایک تقاضا بن چکا ہے۔''

مسند الہند حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی بے نظیر اور موضوع پر حرف آخر سمجھی جانے والی کتاب ''ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء'' میں بنیادی طور پر انہیں موضوعات کا انتہائی جامعیت کے ساتھ مدلل اسلوب میں احاطہ ہے۔ یہ کتاب مختلف مرحلوں اور شکلوں میں طباعت کے بعد ابھی حال میں معروف وممتاز محقق ومحدث حضرت مولانا ڈاکٹر تقی الدین ندوی مظاہری دامت برکاتہم کی تحقیق سے اور ان کی نگرانی میں فارسی سے عربی ترجمہ کے بعد چھ جلدوں میں دیدہ زیب طباعت کے ساتھ عالم عربی میں منظر عام پر آئی ہے۔

ازالۃ الخفاء اصلاً فارسی زبان کی کتاب ہے۔ حضرت مولانا محمد میاں صاحبؒ نے ازالۃ الخفاء کو اردو قالب میں ڈھالنے کی خدمت اپنے ذمے لی اور باعث رشک بات یہ ہوئی کہ ہماری علمی تاریخ کی شہادت کے مطابق متنوع ان بلند پایہ علمی وفقہی خدمات کے مطابق جو اصحاب عزیمت اہل علم وفقہ کے ہاتھوں ان کے دورِ اسارت میں انجام پائیں، یہ بلند پایہ خدمت بھی بالعموم اس وقت انجام دی گئی جب حضرت مولانا مرحوم انگریز دور حکومت میں تحریک آزادی میں شامل وشریک ہونے کی پاداش میں زیر حراست تھے۔

حضرت مولانا نے ازالۃ الخفاء کی مقید اور پابند ترجمانی کے بہ جائے ایسا انداز اختیار کیا کہ زیر تذکرہ کتاب ''ترجمہ'' کے بہ جائے ایک مستقل کتاب بن گئی۔ اس کتاب میں ازالۃ الخفاء کی ترتیب کا التزام نہیں ہے، زمانے اور احوال کے اختلاف سے جو تقدیم و تاخیر، جو اضافہ و حذف اور جو تبدیلی ناگزیر تھی، سب عمل میں لائی گئی۔ موضوع سے متعلق بہت سے معارف و دقائق حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کی کتاب '' قرۃ العینین'' میں اور حضرت شاہ اسماعیل دہلوی کی کتاب ''منصب امامت'' میں مذکور تھے، ان کو حضرت مولانا نے اپنی کتاب میں شامل فرمایا۔ ابتداء میں انتہائی علمی اور فکری مباحث پر مشتمل مقدمے کا اضافہ فرمایا جو مؤلف کے وفور علم کا آئینہ دار ہے، پھر جا بہ جا حواشی میں انتہائی بیش قیمت تشریحات و توضیحات ذکر فرمائی ہیں جو ایک موضوع کے ضمن میں مختلف موضوعات کو حاوی ہیں اور ان کی وجہ سے یہ کتاب علوم و معارف کا ایک قیمتی گنجینہ بن گئی ہے۔

ازالۃ الخفاء کا مرکزی موضوع'' خلافت راشدہ، امامت امت اور خلفائے راشدین'' ہے۔ حضرت مولانا محمد میاں صاحب نے اپنی کتاب میں اس موضوع کو وسعت دی ہے اور اس کا دائرہ خلفاء اور خلافت تک محدود نہ رکھ کر صحابہ کی پوری جماعت اور ان کے عہد زریں تک وسیع کر دیا ہے۔ اس طرح بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ یہ کتاب ازالۃ الخفاء کا ترجمہ نہیں بلکہ اس کی ترجمانی، توسیع اور توضیح ہے۔

حضرت مولانا کی اس کتاب کی متعدد خصوصیات میں سب سے نمایاں:

(۱) موضوع کا احاطہ اور استیعاب و جامعیت ہے۔ قرآن و حدیث کی روشنی میں جماعت صحابہ کی عظمت، کمالات اور امتیازات اور افضلیت کو پوری تفصیل سے اجاگر کیا گیا ہے۔ صحابہ کی سیرت دراصل سیرت نبوی کا عکس و پرتو ہے، اس لئے پوری کتاب میں سیرت نبوی کے احوال و وقائع کا ذکر اور ان کے ضمن میں صحابہ کی عظمت شان، کمالِ ایمان و اخلاص اور جذبۂ فدائیت و ایثار اور مثالی اخلاق و اوصاف کا تذکرہ بڑی تفصیل سے موجود ہے۔

(۲) استدلالی اور معروضی انداز: پوری کتاب میں استدلالی، معقولی اور معروضی

انداز نمایاں ہے۔ جو کچھ کہا گیا ہے دلیل و برہان کی روشنی میں کہا گیا ہے۔ مصنف کا امتیاز یہ ہے کہ انہوں نے عظمت اصحاب رسول کے اثبات کے لئے قلبی اور جذباتی عقیدت کے اظہار پر بس نہیں کیا، دلائل، شواہد اور ثبوتوں کے انبار لگا دیئے ہیں۔ عظمت صحابہ کے منکروں کے ہر ہر شبہے اور مغالطے کا جواب اور رد کر دیا ہے، اور ہر وہ شگاف پاٹنے کی سعی محمود کی ہے جن سے معاندین صحابہ کچھ بھی در اندازی کر سکتے ہوں۔

(۳) استناد: کتاب کی ایک خصوصیت اس کا استنادی اعتبار بھی ہے۔ مصنف کے مراجع و مآخذ پر سرسری نگاہ بھی ڈالی جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قرآنیات، حدیثیات، فقہیات کے ساتھ ساتھ تاریخ وسیر کے تمام موثوق، معتمد اور معتبر مصادر مصنف کے پیش نگاہ ہوں اور ان سے لعل و گواہر چن چن کر اس کتاب میں جمع کر دیئے گئے ہوں۔ موضوع کا کوئی گوشہ تشنہ بھی نہیں اور کوئی حصہ بے حوالہ بھی نہیں۔ جو کچھ لکھا گیا ہے اس پر مستند حوالے موجود ہیں۔ یہ چیز اس کتاب کے اعتبار اور وقار میں اضافہ کرتی ہے۔

(۴) حسن اسلوب، ترتیب اور ادبیت: مصنف اردو کے باکمال اور صاحب طرز قلم کاروں میں شامل ہیں۔ کتاب کے ہر ہر فقرے سے حسن اسلوب اور ادبیت کا ترشح ہوتا ہے۔ پوری کتاب اردوئے معلّیٰ کا شاہکار ہے۔ مباحث انتہائی مرتب انداز میں ذکر کئے گئے ہیں، انداز تحریر عام فہم، دلچسپ اور شیریں ہونے کے ساتھ ہی فصاحت اور ادبیت کا روشن نمونہ ہے۔

(۵) ان چاروں امتیازات کے علاوہ پوری کتاب مصنف کے وفور علم، وسعت مطالعہ اور دقت نظر کا جیتا جاگتا نمونہ بھی ہے۔ اصل موضوع کے علاوہ بے شمار تفسیری، حدیثی، فقہی اور تاریخی نکتے اور اصول وضوابط اور متنوع نفیس مباحث کتاب میں جا بہ جا بکھرے ہوئے ہیں۔ مثلاً ھدھد اور بلقیس کے سلسلہ میں بہت قیمتی بحث موجود ہے۔ (ملاحظہ ہو حاشیہ جلد اول ۲۸۸) مشرکین کے جرائم کا تجزیہ بہت اچھی ترتیب کے ساتھ ذکر ہوا ہے۔ (جلد اول: ۳۷۷) غزوۂ بدر اقدامی غزوہ تھا یا دفاعی، اصل ہدف تجارتی قافلہ تھا یا

ابوجہل کا لشکر؟ یہ قدیم مختلف فیہ بحث ہے۔مصنف نے بے حد استدلالی انداز میں گفتگو کی ہےاور علامہ شبلی کے موقف کا رد کیا ہے۔(ملاحظہ ہو:۱/ ۵۰۷)

مذکورہ خصوصیات کی روشنی میں کتاب کا مطالعہ کیا جائے تو بہ یک وقت علم میں اضافہ بھی ہوتا ہے، ذہن وفکر کے دریچے بھی کھلتے ہیں،شکوک واوہام کا ازالہ بھی ہوتا ہے،صحابہ کی عقیدت دلوں کے اندرون میں سوا ہوتی ہےاور محسوس ہوتا ہے کہ قاری کے سامنے علمی معارف ودقائق کا ابرِرواں رم جھم برس رہا ہےاور قلب وروح ،فکر ونظر،بصیرت و بصارت کو سیراب و شاداب کررہا ہے۔مصنف کے قلم واسلوب کا یہ سحر ہر قاری کو اپنا اسیر بنا تا ہے۔

مصنف نے صحابہ کی عظمت شان کے اثبات واظہار میں انتہائی نفیس نکتہ آفرینیاں بھی فرمائی ہیں۔غزوۂ بدر کے محبوسین سے فدیہ لئے جانے اور قرآنی تنبیہ کے ذکر میں مصنف رقم طراز ہیں:

''حضرت شاہ صاحب کے ارشادات سے ہٹ کر یہاں چند باتیں قابل توجہ ہیں:

(۱) یثخن فی الارض کے معنی عام طور پر قتل اور خون کرنے کے لئے گئے ہیں۔یعنی ترجمہ یہ کیا گیا ہے کہ جب تک نہ خون کرے ملک میں،مگر امام بخاری نے ''یثخن'' کی تفسیر میں فرمایا ہے '' حتی یغلب فی الارض ''یعنی جب تک غالب نہ ہوجائے ملک میں۔ہم نے امام بخاریؒ کی تفسیر بموجب ترجمہ کیا ہے۔

(۲) ایک عجیب وغریب بات یہ ہے کہ فدیہ لینا اس وقت بھی جائز تھا جب یہ فدیہ لیا گیا۔چنانچہ واقعۂ بدر سے ایک سال پہلے حضرت عبداللہ بن جحش کی سرکردگی میں ایک دستہ آنحضرت ﷺ نے بھیجا تھا،اس نے ایک شخص کو گرفتار کیا،آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو فدیہ لیکر چھوڑ دیا تھ۔حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ کی روایت جس کو مسلم،ابوداؤد،ترمذی وغیرہ نے نقل کیا ہے،اس کے الفاظ یہ ہیں:

أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰـهِ صَلَّى اللّٰـهُ عَلَيْـهِ وَسَلَّمَ فَدَى رَجُلَيْنِ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ بِرَجُلٍ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ.

آنحضرت ﷺ نے ایک مشرک کے فدیہ میں دو مسلمانوں کو رہا کرایا۔

پھر جنگ بدر کے بعد قانون یہی بن گیا کہ اگر مفاد ملت کے پیش نظر فدیہ لینا بہتر سمجھا جائے تو فدیہ لے لیا جائے، اور یہ جو اسی آیت میں ارشاد خداوندی ہے:

لَوْلاَ کِتَابٌ مِّنَ اللّٰہِ سَبَقَ.

اگر پہلے سے اللہ کا حکم نہ ہو گیا ہوتا۔

اس کے معنی بھی یہی لئے گئے ہیں کہ اگر پہلے سے اللہ کے یہاں یہ طے نہ ہوتا کہ اس امت کے لئے مالِ غنیمت حلال ہوگا تو عذاب آ جاتا۔

اس کے باوجود اس موقع پر ''فدیہ'' کے مشورہ کو پسند نہیں کیا گیا اور عتاب آمیز خطاب کے بعد نتیجہ یہ ہوا کہ جنگ احد میں شکست اٹھانی پڑی تو اس عتاب و عذاب کا سبب اس لطیف نکتہ کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ وہ شفاف آئینہ جس میں اپنا چہرہ دیکھا جاتا ہے جتنا زیادہ شفاف ہوتا ہے اتنا ہی زیادہ صاف رکھا جاتا ہے، بدن اور کپڑوں پر مکھی کی بیٹ کا احساس بھی نہیں ہوتا لیکن آئینہ کی شفاف سطح پر بیٹ کا معمولی سے معمولی دھبہ بھی آپ کے لئے خلش بن جاتا ہے، سب سے پہلے اس کو آپ صاف کرتے ہیں پھر اپنا چہرہ دیکھتے ہیں۔

صحابہ کرام کے پاکیزہ قلوب جس طرح کفر و شرک سے متنفر تھے، ان علمبرداران کفر و شرک سے بھی متنفر تھے، لیکن اس موقع پر ''فدیہ'' لے لینے کا مشورہ قرابتی دلچسپی اور مالی منفعت کی طرف رجحان کا شبہ پیدا کرتا تھا جو فدا کاران حق اور محبین کاملین کی شان کے خلاف ہے۔ اس رجحان کی جھلملاہٹ ایک دھبہ تھی جو قلوب صحابہ کے شفاف آئینوں پر برداشت نہیں ہوئی اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم نے اس کو صاف کرنا صحابہ کی شان بالا و برتر کے تحفظ کے لئے ضروری سمجھا۔

جن کے رتبے ہیں سوا ان کے سوا مشکل ہے

کار پاکاں را قیاس از خود مگیر
گرچہ ماند در نوشتن شیر و شیر

(۳) پھر اس واقعہ سے اگرچہ بظاہر حضرت فاروق رضی اللہ عنہ کی ایک منقبت اور فضیلت معلوم ہوتی ہے لیکن حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی عظمت شان

پر بھی یہ واقعہ دلالت کرتا ہے۔ اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا مزاج اور ان کے رجحانات سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کے رجحانات کے کس قدر مشابہ تھے۔ سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم ''رحمۃ للعالمین'' تھے اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے متعلق سید الموجودات کا ارشاد ہے: ارحم امتی. میری پوری امت میں سب سے زیادہ رحم رکھنے والا سب سے زیادہ مہربان۔

یہی وصف تھا جس نے ان قیدیوں کے بارے میں دونوں کی رائے کو متفق کر دیا۔ واللہ اعلم بالصواب۔ (عہد زریں: ۱/ ۱۱۹-۱۲۱)

منصف نے ایک عنوان قائم کیا ہے ''یہ حضرات (صحابہ) دست قدرت کا آلہ تھے کہ اس کی مرضی پوری کریں''۔ پھر یہ آیت ذکر کی ہے:

فَلَمْ تَقْتُلُوهُمْ وَلَـٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَـٰكِنَّ اللّٰهَ رَمَى وَلِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِينَ مِنْهُ بَلاءً حَسَناً إِنَّ اللّٰهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ.

پس تم نے ان کو نہیں مارا، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو مارا، اور جب تم نے (خاک کی مٹھی) پھینکی تو وہ تم نے نہیں پھینکی تھی بلکہ اللہ تعالیٰ نے پھینکی تھی۔

آیت کریمہ میں جس طرح مسلمانوں کو اس غلط احساس سے روکا جا رہا ہے کہ وہ اس فتح کو خود اپنی تدبیر اور اپنی کوشش کی کامیابی سمجھنے لگیں اور اس پر ناز کرنے لگیں، اسی طرح اس آیت میں اس کی بھی وضاحت کر دی گئی ہے کہ اصل کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے، فاعل حقیقی وہی ہے اور جہاں تک ان مجاہدین اور خود ذات اقدس محمد مصطفیٰ ﷺ کا تعلق ہے تو یہ دست قدرت کا آلۂ کار ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

ان حضرات کی سب سے بڑی فضیلت یہ ہے کہ انہوں نے اپنے آپ کو رضاء مولیٰ کے حوالے اس طرح کر دیا جیسے کوئی بے حس وحرکت آلہ مالک کے حوالہ ہوتا ہے۔ یہ سب سے بلند منزل ہے شانِ عبدیت کی، ارباب طریقت اور اہل تصوف سے پوچھو کہ کیا فنا فی اللہ کا اس سے بلند کوئی درجہ ہے؟ اور سب سے بڑی بات جو اس جماعت کو پوری امت بلکہ من جملہ انبیاء علیہم السلام کی تمام امتوں سے ممتاز کر دیتی ہے، یہ ہے کہ کلام اللہ شریف کی آیت اس کا اظہار کر رہی ہے۔ یعنی خوبی یہ ہے کہ جن

کے لئے فنا ہو رہے ہیں، وہ خود اعتراف کر رہے ہیں کہ یہ میرے ہیں، مجھ پر فدا ہیں، میرے لئے فنا ہیں۔'' (۱/۱۷۳-۱۷۴)

صحابہ کے باہمی حسن تعلق اور دلوں کی صفائی کے تعلق سے مصنف نے لکھا ہے:

حضرت شعبی (مشہور تابعی ہیں جو حافظ حدیث اور جلیل القدر مفسر قرآن بھی ہیں، یہی شعبی) روای ہیں کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: فلاں شخص سے میری طبیعت بہت مکدر ہے اس کی طرف سے مجھے بغض ہے۔ اس شخص سے پوچھا گیا کہ کیا بات ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو تمہاری طرف سے بغض کیوں ہے؟ اس نے ابھی کچھ جواب نہیں دیا تھا، گفتگو ہو رہی تھی کہ اور لوگ بھی آ گئے، مکان آدمیوں سے بھر گیا، اسی وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی پہنچ گئے، تو اس شخص نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا: کیا میں نے اسلام میں کوئی رخنہ ڈالا ہے؟ حضرت عمرؓ نے فرمایا: نہیں، وہ شخص: کیا میں نے کوئی بدعت ایجاد کی ہے؟ عمر فاروقؓ: نہیں۔

وہ شخص: پھر آپ کس وجہ سے مجھ سے بغض رکھتے ہیں؟ حالانکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ'' جو لوگ نا کردہ گناہ مسلمان مردوں یا عورتوں کو اذیت پہنچاتے ہیں وہ ایک بہتان اور بہت بڑے گناہ کا بار اپنے اوپر لا د رہے ہیں۔'' بلا شبہ آپ نے مجھے اذیت دی ہے، میں معاف نہیں کروں گا، خدا بھی آپ کا یہ گناہ معاف نہیں کرے گا۔

حضرت فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: بیشک آپ نے کوئی جرم نہیں کیا، بلا شبہ یہ میرا قصور ہے کہ مجھے آپ اچھے نہیں لگتے، آپ کی طرف سے دل میں بوجھ رہتا ہے، بہر حال یہ میرے دل کی خرابی ہے آپ معاف کر دیں، اب عجیب صورت تھی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ معافی مانگ رہے تھے اور وہ انکار کر رہا تھا، بالآخر وہ متاثر ہوا اور اس نے حضرت عمر کو معاف کر دیا۔

بظاہر مفہوم روایت یہ ہے کہ مومن کے دل میں مومن کی طرف سے کوئی بوجھ نہ رہنا چاہئے، بلکہ محبت اور یگانگت کا ایسا رشتہ رہنا چاہئے کہ جب بھی ملاقات ہو، ایک دوسرے کو مسرت ہو۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اپنے دل میں اس شخص کی طرف سے یہ مسرت محسوس نہیں کرتے تھے۔ یہی حضرت فاروق کا جرم تھا اور آپ کے

دامن تقدس کا نکھار یہ ہے کہ اتنا بوجھ بھی برداشت نہیں، اپنے دل کی اس بیماری کا اظہار آپ نے خود کیا، یہاں تک کہ کھل کر بات چیت ہوئی اور یہ دھبہ صاف ہو گیا۔ (۱/۱۸۸-۱۸۹)

حضرت موسیٰ کے ساتھیوں اور صحابہ کا تقابل کرتے ہوئے کسی قدر تفصیل سے مصنف نے لکھا ہے:

موضوع کتاب اور سلسلہ کلام کا تقاضا ہے کہ اس موقع پر چند کارنامے حضرات صحابہ کے بھی پیش کر دیئے جائیں۔ خروج، باب۱۲، آیت ۱۳ر کے حوالے سے آپ نے چند صفحے پہلے یہ پڑھا تھا کہ:

(۱) جب بنی اسرائیل مصر سے نکلے تو ان کی تعداد علاوہ لڑکوں کے چھ لاکھ کے قریب تھی، بظاہر اس میں مبالغہ بھی نہیں ہے، کیونکہ توریت ہی کی روایت کے بموجب یہ چار سو تیس برس بعد مصر سے نکل رہے تھے اور ہر باپ کے اگر تین بیٹے مانے جائیں تو دسویں پشت میں صرف ایک شخص کے نسل کی تعداد ۴۹۰۴۹ اور گیارہویں پشت میں ۱۴۷۱۴۷ ہو سکتی ہے، اور یہاں حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ بیٹے آباد ہوئے تھے اور چار سو تیس برس میں گیارہ نہیں بلکہ بائیس نسلیں ہو سکتی ہیں، لہٰذا چھ لاکھ کی تعداد بتقاضائے فطرت وعادت مناسب بلکہ مناسب سے بھی کم ہے، لیکن توریت کی روایت ہے کہ جب فرعون کو اطلاع پہنچی کہ بنو اسرائیل مصر سے فرار ہونے کے لئے شہر سے نکل گئے ہیں اور فرعون فوج لے کر ان کے تعاقب میں دوڑا اور صبح ہونے سے پہلے پہلے ان کے سر پر جا پہنچا تو اس چھ لاکھ کے جم غفیر اور انبوہ کثیر کے ہوش گم ہو گئے اور یہاں تک حواس باختہ ہوئے کہ اپنے مربی اور محسن اعظم موسیٰ علیہ السلام کے ادب واحترام کو بالائے طاق رکھ دیا اور گھبرا کر کہنے لگے:

''کیا مصر میں قبریں نہ تھیں جو تو ہم کو مرنے کے لئے بیابان میں لے آیا ہے، تو نے ہم سے یہ کیا کیا کہ ہم کو مصر سے نکال لایا، کیا ہم تجھ سے مصر میں یہ بات نہ کہتے تھے کہ ہم کو رہنے دے کہ مصریوں کی خدمت کریں کیونکہ ہمارے لئے مصریوں کی خدمت کرنا بیابان میں مرنے سے بہتر ہوتا۔'' (خروج: باب۱۴، آیات ۱۱-۱۲)

یہ بنو اسرائیل بھوکے ننگے نہیں تھے ان کے پاس جو کچھ مویشی اور مال و اسباب اپنا تھا وہ سب ساتھ لائے تھے، اس کے علاوہ ان کے پاس مصری عورتوں کے زیورات اور قیمتی کپڑے بھی تھے جو ایک تہوار میں مستعار لئے تھے اور اس کو واپس نہ کر سکے تھے کہ کہیں مصریوں پر اصل حال نہ کھل جائے، اس کے باوجود بدحواسی کا یہ عالم تھا کہ موسیٰ علیہ السلام کو بھی بھول گئے اور موسیٰ علیہ السلام کے خدا کو بھی۔

اب آیئے مٹھی بھر (حضرات انصار رضوان اللہ علیہم اجمعین) کی ہمت ملاحظہ فرمایئے، جو اپنی معمولی کھیتی باڑی کو بھی مہاجرین میں تقسیم کر کے انہیں کی طرح بھوکے ننگے ہو گئے تھے۔ ان سے بیعت عقبہ کے وقت یہ طے ہوا تھا کہ مدینہ میں رہتے ہوئے سرور کائنات محبوب رب العالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کریں گے، لیکن جنگ بدر سے پہلے جب ان کو خبر ہوتی ہے کہ مکہ والوں کا مسلح لشکر ابو جہل کی قیادت میں مدینہ کی طرف آ رہا ہے اور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اور مہاجرین کا مشورہ یہ ہوتا ہے کہ آگے بڑھ کر ان کا مقابلہ کریں اور انہیں انصار سے جنہوں نے صرف مدینہ منورہ میں حفاظت کی ذمہ داری لی تھی، مشورہ کیا جاتا ہے تو حضرات انصار کو بیعت عقبہ کی اس شرط کا خیال بھی نہیں آتا کہ ہم نے صرف مدینہ میں حفاظت کی ذمہ داری لی تھی بلکہ بڑے حوصلہ اور ہمت سے والہانہ انداز میں فرماتے ہیں:

یارسول اللہ: ہم نے آپ کے دست مبارک پر بیعت کی ہے، مدینہ میں نہیں جہاں بھی آپ فرمائیں ہم قربان ہونے کے لئے تیار ہیں۔ خدا کی قسم آپ حکم فرمائیں تو ہم سمندروں میں گھوڑے ڈال دیں۔ یہ ہے ہمت اور حوصلہ ان کا جن کی کل تعداد تین سو تیرہ تھی۔ رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ۔

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا

(۲) غزوۂ احزاب کے بیان میں گزر چکا ہے، مسلمانوں کی تعداد سے تقریباً آٹھ گنا زیادہ مسلح ہجوم نے جس کو پورے عرب کا تعاون حاصل ہے، مدینہ منورہ کو گھیر رکھا ہے، پے در پے حملے ہو رہے ہیں، مسلمانوں کا تمام کاروبار بند ہے، جو کچھ اثاثہ تھا ختم ہو چکا ہے، فاقہ پر فاقہ ہے، پیٹ پر پتھر بندھے ہوئے ہیں، عورتیں بچے گھروں

سے بے گھر قلعہ میں بند ہیں۔ رحمۃ للعالمین کو خیال ہوتا ہے کہ کہیں انصار ہمت نہ ہار جائیں اس لئے آپ نے حملہ آوروں کے ایک بڑے جتھے یعنی قبیلہ غطفان کے سرداروں سے اس شرط پر معاہدہ کرنا چاہا کہ مدینہ کی پیداوار کا ایک تہائی ان کو دے دیا جائے، آپ حضرات انصار کے سربراہ حضرت سعد بن عبادہ اور حضرت سعد بن معاذ سے استصواب کرتے ہیں۔ آپ کو یاد ہے ان حضرات نے دربار رسالت میں کیا عرض کیا تھا، ان کا ادب اور سلیقہ بھی ملاحظہ فرمایئے اور ہمت و جرأت بھی۔

حضرات انصار رضوان اللہ علیہم اجمعین کے یہ دونوں سردار عرض کرتے ہیں:

یارسول اللہ: اگر اللہ تعالیٰ کا حکم یہی ہے تو انکار کی مجال نہیں لیکن اگر ایک رائے ہے تو نہایت ادب سے گذارش ہے کہ کفر کی حالت میں جب ہم اور وہ برابر تھے تب کسی کی ہمت نہیں ہوئی کہ ہم سے خراج یا ٹیکس کا ایک دانہ بھی وصول کر سکے اور اس وقت جب کہ آپ کے طفیل میں اسلام نے ہمارا درجہ بہت بلند کر دیا ہے، کیسے ممکن ہے کہ ہم کوئی ایسی شرط منظور کر سکیں۔

حضرات انصار کی یہ اولو العزمی ملاحظہ فرمایئے، پھر بنو اسرائیل کی یہ گڑ گڑاہٹ دیکھئے۔

''موسیٰ: کیا یہ وہی بات نہیں ہے جو ہم نے مصر میں تجھ سے کہی تھی کہ ہم سے ہاتھ اٹھا، تاکہ ہم مصریوں کی خدمت کریں کہ ہمارے لئے مصریوں کی خدمت کرنا بیابان میں مرنے سے بہتر ہے۔'' (خروج: باب۱۴، آیت ۱۱-۱۲)

(۳) تین سو تیرہ کی مٹھی بھر جماعت جس کے پاس پورا سامان جنگ تو کیا ہوتا، بدن پر پورے کپڑے بھی نہیں ہیں، مسلح دشمن سے جس کی بہادری کی پورے عرب میں دھاک ہے، لڑنے کے لئے بدر کے مقام پر پہنچی ہوئی ہے، میدان کے بہتر حصہ پر جہاں پانی بھی تھا، زمین بھی نرم تھی، دشمن قبضہ کر چکا ہے، مجاہدین کو اس حصہ میں قیام کرنا پڑتا ہے جہاں پانی کا نام نہیں ہے، ریت اتنا ہے کہ چلنا مشکل ہے، چلتے ہیں تو پیر دھنسے جاتے ہیں، حضرات انصار اور مہاجرین نے اس پریشانی میں کیا کیا؟ قرآن پاک میں ہے:

إِذْ تَسْتَغِيثُونَ رَبَّكُمْ.

جب تم اپنے رب سے مدد مانگ رہے تھے؟

اس خاموش دعا کا نتیجہ یہ ہوا کہ فرشتوں کی مدد بھی پہونچی جس سے حوصلے بلند ہوئے، ہمتیں بڑھیں اور دفعۃً بے موسم بارش بھی ہوگئی جس کی وجہ سے ریت دب گیا، پانی مہیا ہوگیا، مسلمان نہا دھوکر مطمئن ہوگئے۔ اب ایک واقعہ بنو اسرائیل کا ملاحظہ فرمائیے۔

جب دریائے نیل سے عبور کرکے بیابان ''سین'' سے گزرتے ہوئے قیدیم پہنچے تو وہاں پینے کو پانی نہ تھا۔

''سو لوگ موسیٰ سے جھگڑنے لگے اور کہا کہ ہم کو پانی دے کہ پئیں۔'' (خروج باب ۱۷، آیت ۲)

''سو لوگ موسیٰ پر جھنجھلائے کہ تو ہمیں مصر سے کیوں نکال لایا کہ ہمیں اور ہمارے لڑکوں اور ہمارے مواشی کو پیاس سے ہلاک کردے۔ موسیٰ نے خداوند سے فریاد کرکے کہا کہ میں ان لوگوں کا کیا کروں، وہ سب تو ابھی مجھے سنگسار کرنے کو تیار ہیں۔'' (خروج باب ۱۷، آیت ۲-۵)

بہرحال اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا قبول فرمائی، اللہ تعالیٰ کا حکم ہوا اس پتھر پر اپنا عصا مارو، حضرت موسیٰ کا عصا مارنا تھا کہ بارہ چشمے پھوٹ پڑے مگر دیکھنے کی بات یہ ہے کہ بنی اسرائیل کی فطرت کیا تھی، انہوں نے کیا انداز اختیار کیا اور حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کا انداز کیا رہا۔ یہی وہ صلاحیت اور سعادت تھی جس نے حضرات صحابہ کو کائنات کی آنکھ کا تارا بنا دیا۔ رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ۔ (۱/۲۵۲-۲۵۵)

غزوۂ بدر و احد میں صحابہ کی جاں نثاری اور فدا کاری کے مختلف نمونوں کا ذکر کرنے کے بعد مصنف نے سورۃ المجادلہ کی اس آیت کا حوالہ دیا ہے جس میں صحابہ کے کمال ایمان، جذبۂ قربانی اور فدا کاری کا ذکر انتہائی بلند الفاظ میں فرمایا گیا ہے۔ مصنف اس کے بعد لکھتے ہیں:

غزوۂ بدر اور غزوۂ احد میں صحابہ کرام کی جاں نثاری اور فداکاری کے کچھ واقعات آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں، ان پر دوبارہ نظر ڈال لیجئے اور فیصلہ فرمائیے کہ:

(الف) آیات کتاب اللہ اور ارشاد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حب فی اللہ اور بغض فی اللہ کے پرکھنے کی جو کسوٹی تجویز فرمائی ہے، صحابہ کرام اس کسوٹی پر کہاں تک صحیح اترتے ہیں۔

(ب) اگر یہ قبا صحابہ کرام کے تن زیبا پر بالکل ٹھیک اور نہایت موزوں ہے تو کیا خلعت فضیلت کے سب سے زیادہ مستحق یہی حضرات نہ ہوں گے، کیا کائنات کی آنکھ کا تارا ان بزرگوں کے علاوہ کسی اور جماعت کو قرار دیا جاسکتا ہے۔(۲/ ۸۷-۸۸)

سورۃ الفتح کی آیت میں فرمایا گیا ہے:

إِذْ جَعَلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا فِيْ قُلُوبِهِمُ الْحَمِيَّةَ حَمِيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ فَأَنزَلَ اللَّهُ سَكِيْنَتَهُ عَلَى رَسُولِهِ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَأَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوَى وَكَانُوا أَحَقَّ بِهَا وَأَهْلَهَا وَكَانَ اللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْماً. (الفتح:۲۶)

اور وہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے کہ جب ان کافروں نے اپنے قلوب میں اس غیرت و حمیت کو جگہ دی جو جاہلیت کی حمیت تھی، پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول اور مسلمانوں کو اپنی طرف سے ضبط اور اطمینان عطا فرمایا اور اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو پرہیزگاری کی بات پر جمائے رکھا اور یہی لوگ اس تقوی کی بات کے زیادہ حقدار اور اس کلمۂ تقوی کے حقیقی اہل ہیں، اور اللہ تعالیٰ ہر شئے کو خوب جانتا ہے۔

مصنف لکھتے ہیں:

آیت کا آخری حصہ صحابہ کرام کے کمالِ ایمان، اعلیٰ درجہ کے تقوی اور ان کی بہترین صلاحیتوں کے لئے نہایت واضح شہادت ہے۔ کیونکہ اس آیت میں:

(۱) صحابۂ کرام کو مومنین کا خطاب دیا گیا ہے۔

(۲) ان کے اوپر نزول سکینہ کی دوبارہ اطلاع دی گئی ہے۔

(۳) یہ واضح کیا گیا ہے کہ کلمۂ تقویٰ ان کے رگ وپے میں پیوست کر دیا گیا

ہے۔

(۴) وہ اس کلمہ تقویٰ کے سب سے زیادہ مستحق ہیں۔

(۵) وہ اپنے اندر کلمہ تقوی کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں۔(۲/۱۶۵)

سورۃ الفتح کی آخری آیت کے حوالے سے لکھتے ہیں:

یہاں بطور لطائف قرآنیہ صرف دو روایتیں پیش کی جاتی ہیں:

(۱) ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں" زرع" کی اصل عبد المطلب ہیں، "**اخرج شطأه**" محمد صلی اللہ علیہ وسلم (کا دور) "**فآزره**" یہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کا دور ہوا، "**فاستغلظ**" عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا دور، "**فاستوىٰ**" حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا دور، "**ليغيظ بهم الكفار**" یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا دور ہے۔ باوجودیکہ آپس میں خانہ جنگی ہو رہی تھی، لیکن تیسری طاقت کے مقابلہ میں اس دور میں بھی یہ سب متحد تھے، یہ بات کفار کے لئے غیظ وغضب کا باعث تھی۔

(۲) حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ "**اشداء على الكفار**" کا مصداق حضرت عمر، "**رحماء بينهم**" کا مصداق حضرت عثمان، "**ركعاً سجدا**" حضرت طلحہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہم، "**سيماهم في وجوههم**" حضرت عبدالرحمٰن بن عوف، حضرت سعد بن ابی وقاص اور ابوعبیدہ بن الجراح۔

"**فآزره**" ابوبکر رضی اللہ عنہ، "**فاستغلظ**" حضرت عمر رضی اللہ عنہ، "**فاستوى على سوقه**" حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، "**يعجب الزراع ليغيظ بهم الكفار**" حضرت علی رضی اللہ عنہ، "**وعد الله الذين آمنو الخ**" تمام صحابہ کرام۔(۲/۱۶۷)

غزوہ تبوک کے بعد بلا عذر شرعی شریک نہ ہونے والے تین صحابہ (حضرت کعب، حضرت ہلال، حضرت مرارہ) کا مقاطعہ کیا گیا، اور ۵۰/ دنوں تک یہ سلسلہ رہا، پھر یہ سزا موقوف ہوئی اور توبہ قبول ہوئی۔ صحابہ کی عظمت پر مصنف نے اس موقع سے خوب لکھا ہے:

(۱) دنیا کی تاریخ پڑھو کیا اس ایثار و اخلاص کی مثال مل سکتی ہے کہ ایک صاحب حیثیت جو ایسی قابلیت اور شہرت کا مالک ہے کہ دوسرے ملک کے بادشاہ اس کی آرزو رکھتے ہیں کہ وہ ان کا مشیر کار اور وزیر دربار ہو، اتنا اونچا شخص کس درجہ اپنے آپ کو فنا کر رہا ہے۔

(۲) یہ فنائیت اور یہ ایثار، اللہ اور رسول سے یہ عاشقانہ تعلق، صرف ایک دو کی بات نہیں بلکہ پوری فضا اسی رنگ میں رنگی ہوئی اور پورا ماحول اسی میں ڈوبا ہوا ہے۔ فرماں برداری اور اطاعت شعاری کا یہ عالم ہے کہ جوں ہی قطع تعلق کا حکم ہوا تمام شہر نے دفعۃً رخ پھیرلیا، چوری چھپے بھی کسی نے اس حکم کی خلاف ورزی نہیں کی، حتی کہ ان کے محبوب سے محبوب عزیزوں کو بھی یہ خیال نہیں گزرا کہ ایک لمحہ کے لئے اس پر عمل نہ کریں یا کم از کم تعمیل میں نرمی یا تساہل سے کام لیں۔ ابو قتادہ کو دیکھو، حضرت کعب نے اپنے ایمان واسلام کا واسطہ دیا، یہ یقین دلایا کہ انہیں اللہ اور رسول سے محبت ہے تو ابو قتادہ نے صرف یہی کہا اللہ ورسولہ اعلم۔ ان تین لفظوں میں اس دور کے مسلمانوں کی پوری تصویر موجود ہے۔ یعنی مجھے معلوم تو سب کچھ ہے، میں جانتا ہوں کہ تم پکے مسلمان ہو، لیکن اپنے جاننے کو کیا کروں، جاننا تو اللہ اور اس کے رسول کا ہے اور اس کا حکم یہی ہے کہ تم سے کوئی واسطہ نہ رکھوں۔

صوفیاء کرام کے یہاں لفظ فنا بہت بولا جاتا ہے، مگر کیا ان کے حلقوں میں ایسی مثال مل سکتی ہے کہ اپنی تمام مرادیں فنا، جو باقی وہ صرف مراد محبوب باقی۔

(۳) یہ اطاعت کوئی ضابطہ پری نہیں بلکہ ایک جذبہ ہے جو فطرت بن چکا ہے۔ چنانچہ اس کی تعمیل کے لئے نہ کوئی مادی قوت ہے، نہ کسی فرماں روا کی کوئی دھمکی، نہ کوئی عدالت نہ قانون، صرف ایک ذات ہے جس کے لبوں نے حرکت کی تھی اور اتنی بات سب کو معلوم ہوگئی تھی کہ اس کی مرضی یہی ہے، بس اتنی بات کا معلوم ہو جانا اس کے لئے کافی تھا کہ سب کے دل مجسم طاعت وامتثال بن گئے۔ کیا اجتماعی فدا کاری کی کوئی ایسی مثال کسی تاریخ میں مل سکتی ہے؟

(۴) پھر یہ بھی دیکھو کہ مسلمانوں کی باہمی اخوت ومحبت کا کیا حال تھا، اس سختی

کے ساتھ حکم کی تعمیل تو سب نے کی، لیکن عجیب بات یہ ہے کہ ان تینوں ساتھیوں کی مصیبت کے غم سے کوئی دل خالی بھی نہیں تھا، سب کے دلوں کو لگی تھی کہ ان کی توبہ قبول ہوجائے، پھر جوں ہی قبولیت کا اعلان ہوا ایک پر ایک دوڑنے لگا کہ سب سے پہلے مژدہ کون سنائے، کوہ سلع پر سے جس نے پکار کر سب سے پہلے بشارت سنائی تھی حضرت کعبؓ نے ان کا نام نہیں لیا، مگر وہ حضرت ابوبکرؓ تھے اور وہ جو گھوڑا دوڑا کر پہنچے تھے، بتایا گیا کہ وہ عمر فاروقؓ تھے۔

چونکہ یہ تینوں حضرات مومنین با اخلاص تھے اور واقعہ یہ ہے کہ ان کے اخلاص کامل ہی کا نتیجہ تھا کہ ایک لغزش پر ان کو یہ غیر معمولی اور انوکھی سزا دی گئی، تا کہ دامن اخلاص پر جو دھبہ پڑ گیا ہے وہ پوری طرح سے صاف ہوجائے تو اب فضل خداوندی نے یہ بھی چاہا کہ جب یہ دھبہ مٹ چکا ہے تو ان کی مساویانہ شان پھر نکھر جائے۔ چنانچہ قبولیت توبہ کی جو آیتیں نازل ہوئیں ان کا پیرایہ یہ ہے کہ پہلے خود سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم گرامی لایا گیا، پھر مہاجرین اور انصار کا، اس کے بعد ان تینوں صاحبان کی توبہ کا ذکر کیا گیا، گویا ایک ہی صف ہے اور ایک ہی جماعت ہے جس میں سب سے پہلے رسول خدا ﷺ ہیں، پھر مہاجرین وانصار ہیں پھر یہ تین صاحبان ہیں، اس پوری جماعت کی توبہ کو شرف قبولیت سے نوازا جا رہا ہے، اب یہ تینوں حضرات اس کے بجائے کہ اپنی پسماندگی پر ماتم کریں بڑی خوشی سے کہہ سکتے ہیں ؎

گدایان را ازیں معنی خبر نیست
کہ سلطان جہاں باماست امروز

اب آیات تلاوت کیجئے:

لَقَد تَّابَ اللّٰه عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهَاجِرِيْنَ وَالْأَنصَارِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِن بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ قُلُوبُ فَرِيْقٍ مِّنْهُمْ.(التوبۃ:۱۱۷)

یقیناً اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) پر متوجہ ہوگیا (بقول حضرت شاہ عبدالقادر صاحب مہربان ہوگیا) اور مہاجرین اور انصار پر جو بڑی تنگی اور بے سروسامانی کی گھڑی میں اس کے ساتھ رہے، اور اس وقت ساتھ رہے جب کہ

حالت ایسی ہو چکی تھی کہ قریب تھا کہ ان میں سے ایک گروہ کے دل ڈگمگا جائیں، پھر مہربان ہوا ان پر، بلاشبہ وہ شفقت رکھنے والا بہت رحمت فرمانے والا ہے، اور (ہاں) ان تینوں شخصوں پر بھی (مہربان ہوا) جو معلق حالت میں چھوڑ دیئے گئے تھے (کہ ارشاد ہوا تھا انتظار کرو) اور (اللہ کی یہ مہربانی اس وقت ہوئی جب) زمین اپنی ساری وسعت کے باوجود ان پر تنگ ہوگئی تھی اور وہ خود بھی اپنی جان سے تنگ آ گئے تھے اور سمجھ چکے تھے کہ پناہ مل سکتی ہے تو صرف رحمت حق کے دامن میں اور کہیں ان کو پناہ نہیں ہے، پس اللہ تعالیٰ نے نظر رحمت سے التفات فرمایا ان پر، تا کہ وہ بھی خدا کی طرف رجوع رہیں (پھر آئیں) بیشک اللہ ہی ہے مہربان رحم فرمانے والا۔ (سورہ توبہ ع ۱۳)

ترجمہ پر دوبارہ نظر ڈالئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مہاجرین وانصار کے ذکر میں جس طرح ایک نکتہ یہ ہے کہ ان خطا کاروں کی مساویانہ شان پھر نکھر آئے اور کہنے لگیں کہ ''سلطان جہاں باماست امروز'' اسی طرح ان آیات کا اشارہ یہ بھی ہے کہ ان تینوں ساتھیوں کی اس لغزش یا پھر ان کے اس امتحان وابتلا سے سب ہی دل گرفتہ اور پریشان تھے اور سب ہی کے دل تڑپ تڑپ کر ان کے لئے دعا کر رہے تھے کہ ان کی توبہ قبول ہو اور یہ اپنے منصب عالی پر فائز ہوں، چونکہ اس درد میں سب شریک تھے تو قبول توبہ کی بشارت میں بھی سب کو شریک فرمایا گیا۔ یعنی پورا معاشرہ جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اپنی پیغمبرانہ عظمت کے ساتھ شامل ہیں جسد واحد اور ایک جسم ہے جس کا تقاضا یہ ہے کہ۔

چو عضوے بدرد آورد روزگار
دگر عضو ہارا نماند قرار

(۲۳۷-۲۳۵/۲)

اس کے بعد مصنف نے کسی عذر سے تبوک کے جہاد میں شریک نہ ہو سکنے والوں کی کیسی خوب صورت منظر کشی کی ہے:

''اب عشاق بامراد کی باتیں سنئے، ان میں کچھ وہ بھی ہیں جو فی الحقیقت کامیاب ہیں مگر بظاہر ناکام، ان کی آنکھیں اشکبار ہیں کہ ہم نامراد ہیں اور رضائے

مولیٰ بشارت سنا رہی ہے کہ نہیں تم بامراد ہو، یہ کون ہیں؟ یہ وہی ہیں جن کے جذبات کی تصویر تو یہ ہے۔

عشق بستان وخویشتن بفروش

کہ ازیں خوب تر تجارت نیست

مگر کیفیت یہ ہے کہ کوئی آنکھوں سے معذور ہے، کوئی صحت سے مجبور ہے، کوئی پا شکستہ ہے کوئی پر شکستہ، کوئی ناتواں ہے کوئی بے سامان۔ ان کے متعلق ارشاد خداوندی ہے:

لَّيْسَ عَلَى الضُّعَفَاء وَلاَ عَلَى الْمَرْضَى وَلاَ عَلَى الَّذِيْنَ لاَ يَجِدُونَ مَا يُنفِقُونَ حَرَجٌ إِذَا نَصَحُواْ لِلّهِ وَرَسُولِهِ مَا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ مِن سَبِيْلٍ وَاللّهُ غَفُورٌ رَّحِيْمٌ. (التوبة: ۹۱)

ناتوانوں پر، بیماروں پر، ایسے لوگوں پر جنہیں خرچ کے لئے کچھ میسر نہیں کچھ گناہ نہیں ہے، بشرطیکہ اللہ اور اس کے رسول کی خیرخواہی میں کوشاں رہیں، کیونکہ ایسے لوگ احسان (نیک عملی) کے دائرہ سے باہر نہیں ہیں، نیک عملوں پر کوئی الزام نہیں، اور اللہ غفور رحیم ہے۔

کامیابی یہ ہے کہ کلام الٰہی ان کو زمرۂ محسنین میں شمار کر رہا ہے، زہے قسمت۔ اس پر ایک فاضل کا تبصرہ ملاحظہ فرمائیے:

کوئی بات دنیا میں اس سے زیادہ عجیب نہیں ہو سکتی کہ وحشی اور بہائم صفت انسان اچانک محبت واخلاص اور ایثار وجاں فروشی کے فرشتے بن جائیں، لیکن قرآن حکیم کی تعلیم نے ایسا ہی انقلاب پیدا کیا۔

اس وقت کے ناموافق حالات کا اندازہ کیجئے پھر ان دردمندان عشق کو دیکھئے کہ شدت درد وغم سے بے اختیار ہو کر رو رہے ہیں، کس بات پر؟ اس پر کہ عیش و راحت میں انہیں حصہ نہیں ملا؟ نہیں، بلکہ اس پر کہ راہ حق کی مصیبتوں اور قربانیوں میں شریک ہونے سے رہ گئے۔ (ترجمان القرآن مختصراً)

(۲) اس کے بعد اسی قسم کے کچھ اور بزرگوں کی عجیب وغریب شان ملاحظہ

فرمائیے جن کے متعلق ارشاد خداوندی ہے:

وَلاَ عَلَى الَّذِيْنَ إِذَا مَا أَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لاَ أَجِدُ مَا أَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ تَوَلَّواْ وَّأَعْيُنُهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَناً أَلَّا يَجِدُواْ مَا يُنفِقُونَ. (التوبۃ:۹۲)

نہ ان لوگوں پر کچھ الزام ہے کہ جن کا حال یہ تھا کہ آپ کے پاس آئے کہ ان کے لئے سواری بہم پہنچا دیجئے، اور جب آپ نے کہہ دیا کہ میں یہ گنجائش نہیں پاتا کہ آپ صاحبان کے لئے سواری کا انتظام کرسکوں تو وہ اس حالت میں واپس ہوئے کہ ان کی آنکھیں آنسو بہا رہی تھیں کہ افسوس ہمیں میسر نہیں کہ اس راہ میں کچھ خرچ کرسکیں۔

پہلے گذر چکا کہ اس دور میں نہ تو سرکاری فوج وجود میں آئی تھی، نہ رضا کاروں کی کوئی الگ قسم تھی، نہ سپاہیوں کے مصارف کے لئے حکومت کا کوئی خزانہ تھا، سبھی رضا کار تھے اور سب کے لئے ضروری تھا کہ اپنا خرچ خود اٹھائیں اور ہو سکے تو دوسروں کا بھی خرچ اٹھائیں۔ پس فرمایا جو لوگ فی الحقیقت مقدور نہیں رکھتے کوئی وجہ نہیں کہ ان پر الزام آئے، خصوصاً یہ لوگ جن کے ایمان و اخلاص کا عالم یہ ہے کہ جب ان کے لئے سواری کا انتظام نہ ہوسکا اور آپ کے ادب و احترام نے اس کی بھی اجازت نہیں دی کہ زیادہ اصرار کریں تو وہ خاموش ہوکر لوٹ گئے، لیکن آنکھیں جو دردِ دل کی غماز ہیں خاموش نہ رہ سکیں، غم وحسرت کے آنسو بے اختیار بہنے لگے۔

زچشم آستیں بردار واشکم را تماشا کن

پھر یہ رونا وقتی نہیں تھا کہ کچھ آنسو بہے اور آنکھیں تازہ ہوگئیں، بلکہ ابن جریر کی روایت ہے کہ گریہ کی کیفیت ان پر یہاں تک طاری رہی کہ لوگوں نے ان کا نام ''بکائین'' رکھ دیا۔ یعنی بہت رونے والے۔

یہ ہے فرق مومن اور منافق کا، کہاں وہ منافق کہ قدرت رکھنے پر بھی حیلے بہانے نکالتے ہیں اور کہاں یہ مومنین با اخلاص اور درمندان عشق کہ مقدرت نہ رکھنے پر دل کی لگن چین سے نہیں بیٹھنے دیتی، آنسوؤں کا طوفان ہے جو آنکھوں سے امنڈ رہا ہے۔ سبحان اللہ! ان آنسوؤں کی قدر و قیمت جو ایمان کی تپش سے بہے تھے کہ ہمیشہ

کے لئے ان کا ذکر کتاب اللہ نے محفوظ کر دیا۔ آج بھی کہ تقریباً چودہ صدیاں گزر گئیں ممکن نہیں کہ ایک مومن یہ آیت پڑھے اور اُن آنسوؤں کی یاد میں خود اس کی آنکھیں بھی اشکبار نہ ہو جائیں۔'' (۲/ ۲۳۸-۲۴۰)

یہ چند نمونے ذکر کئے گئے ہیں، انہیں دیکھئے اور اندازہ کیجئے کہ احاطہ، جامعیت، استیعاب، استدلال، استناد، معروضی انداز، حسن ترتیب و ادا، ادبیت اور علمی نکتہ آفرینی جیسی تمام خوبیاں کس طرح اس کتاب کا امتیاز بن گئی ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اردو لٹریچر میں یہ کتاب سیرت صحابہ اور عظمت صحابہ کے موضوع پر بنیادی مرجع اور انسائیکلوپیڈیا کا مقام رکھتی ہے اور مصنف کے علمی رسوخ، نبوغ، عمق اور وسعت پر شاہد عدل بھی ہے۔

❑❑❑

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حضرت مولانا سید میاں صاحب اوران کی کتاب
'تاریخ اسلام' کا ایک جائزہ

مولانا عبدالعظیم صاحب ناظم تحفیظ القرآن سکٹھی، مبارکپور اعظم گڈھ

سید الملت حضرت مولانا سید میاں صاحب دیوبندی سابق ناظم عمومی ان نابغۂ روزگار اسلامی شخصیات میں سے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے جامع الکمالات بنایا تھا اوران کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ وہ اس شعر کے سچے مصداق تھے۔

لیس علی الله بمستنكر　　　　أن يجمع العالم في واحد

تفسیر وحدیث، ادب وتاریخ، فقہ واصول فقہ، منطق وفلسفہ اور سیرت وسیاست وہ کون سا موضوع اور فن ہے جس میں ان کو یدطولیٰ حاصل نہیں تھا۔ وہ کثیر التصانیف، زود نویس عالم، مورخ اور ادیب تھے۔ ان کے شش جہت علمی وفکری، ادبی وتاریخی خدمات اور ہر موضوع پر معتبر ومقبول تصنیفات کو دیکھتے ہوئے بلاتردد اُن کو''جاحظ العصر'' کا خطاب دیا جاسکتا ہے۔

مولانا سید میاں صاحب کی سوانح حیات اور دینی وعلمی اور تاریخی نگارشات کے مطالعہ کے بعد کہا جاسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے صدیوں کا کام سالوں میں لیا اورانہوں نے تن تنہا اتنا سارا کام یکسوئی سے کرڈالا جس کو پورا کرنے کے لئے اکیڈمی کی ضرورت پڑتی ہے۔ ان کے تاریخ ساز کاموں میں سے جس پر اسلامیان ہند ناز کرسکتے ہیں بلکہ مولانا کے

احسان مند ہیں، وہ یہ ہے کہ مولانا نے مسلمانان ہند کے مستقبل کو ہندوستان میں محفوظ کرنے کے لئے جمعیۃ علماء ہند کے پلیٹ فارم سے اسلامی نصاب تعلیم کا نہ صرف خاکہ مرتب کیا اور اصول وضوابط وضع فرمائے بلکہ نصاب تعلیم کی ضرورت کو بھی پورا کیا اور ایسا معتدل، جامع، ہمہ جہت اور قابل عمل نصاب اپنے سیال قلم اور رسا ذہن کے ذریعہ کتابی شکل میں پیش کردیا جو نونہالان ملت کی ذہن سازی، کردار سازی اور اخلاق سازی میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے اور اللہ تعالی نے ان کے اس عمل کو قبول فرمایا۔ مولانا نے مرکزی تعلیمی بورڈ اور تعلیمی تحریک کے منصوبوں کو عملی جامہ پہنایا۔

مسلم بچوں کے لئے مولانا سید میاں صاحب نے تاریخ اسلام کے موضوع سے تین حصوں میں جو کتاب تیار کی ہے، سردست اس مختصر سے مقالہ میں اس کی افادیت اور جامعیت کی بات کرنی ہے اور یہ پیش کرنا ہے کہ مولانا کس پایہ کے تاریخ داں اور تاریخ نویس تھے۔

فن تاریخ ایک خاردار گنجان وادی کی طرح ہے جس میں حقائق کو تلاش کرنے اور درست بات تک پہنچنے کے لئے روایات کے نشیب وفراز سے گذرنا پڑتا ہے اور بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ اس راہ کا مسافر اپنے دامن تحقیق کو تار تار ہونے سے بچا کر کامیابی سے گذر جائے اور غیر جانبداری کے ساتھ اپنے نظریات وخیالات اور معلومات کی آمیزش سے پاک حقائق پر مبنی تاریخ پیش کر سکے۔

اسلامی مورخ جب تاریخ کو کھنگالتا ہے تو اس کو تاریخی کتابوں میں واقعات و بیانات کا تضاد بھی ملتا ہے اور خلط ملط روایتوں کا انبار بھی، اس کا کمال یہ ہے کہ پوری دیانتداری کے ساتھ نقل وعقل اور روایت و درایت کی روشنی میں وہی باتیں اخذ کرے جو بالکل صحیح ہیں۔

دوسری اہم بات ہمارے لئے تاریخ اسلام کتنی بڑی ملی وسماجی بلکہ اسلامی ضرورت ہے، خاص کر وہ حصہ جو رسول اللہ ﷺ کی سیرت طیبہ اور اسلام کی اشاعت، صحابہ کرام کے

عظیم تر کردار اور بعثت مبارکہ کے وقت کے حالات سے متعلق ہو۔

میں پورے جزم وحزم کے ساتھ یہ بات کہتا ہوں کہ مولانا سید محمد میاں صاحب نے نونہالان اسلام کے لئے جو تاریخ اسلام مرتب کی ہے وہ سیرت وتاریخ کا ایسا حسین امتزاج ہے جس میں بیک وقت سیرت النبی ﷺ کی حلاوت ولذت بھی ملتی ہے تو آغاز اسلام سے لیکر وفات النبی ﷺ تک کی سچی تاریخ اور داستان بھی ملتی ہے۔

دانشوروں کا کہنا ہے کہ کسی بھی قوم کو بے حیثیت اور بے وقعت بنانے اور اس کے مستقبل کو تاریک کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ماضی کی تاریخ سے اس قوم کا رشتہ کاٹ دیا جائے، وہ قوم خود بخود دفنا کے گھاٹ اتر جائے گی۔ اور ایسا دنیا میں بہت ہوا ہے کہ کتنی بڑی بڑی قومیں اس وجہ سے بے نام ونشان ہوگئیں کہ انہوں نے اسلاف کی تاریخ کو فراموش کردیا۔ تاریخ سے جس طرح گذشتہ قوموں کے حالات اور کارنامے کا علم ہوتا ہے اسی طرح ان کی ترقی اور عروج وارتقاء کے اسباب اور زوال وانحطاط کی وجوہات کا پتہ بھی چلتا ہے۔

مسلمانوں کے لئے یہ اس حیثیت سے بھی لازمی ضرورت ہے کہ ان کی عبادات و معاملات، اور معاشرت وتجارت یعنی اجتماعی معاشرتی زندگی ہو یا انفرادی زندگی ہو، اس کے لئے عہد رسالت اور عہد صحابہ پیمانہ ومعیار ہے، اس سے انحراف ہی زوال کا بنیادی سبب ہے۔ اس لئے کہ مسلمان وہ ملت اور قوم ہے جس کے لئے کامیابی کا زینہ رسول کائنات ﷺ کی اطاعت واتباع اور صحابہ کرام کو معیار عمل بنانے سے شروع ہوتا ہے۔ لہٰذا تاریخ وسیرت سے ناواقفیت مسلمانوں کے لئے مہلک مرض ہے جو نہ صرف اسلاف کے ورثہ سے محروم کرتا ہے بلکہ احساس کمتری اور ناامیدی کا شکار بنادیتا ہے۔

افسوس کہ عربی مدارس اور اسلامی درسگاہوں کے نصاب تعلیم میں تاریخ اسلام کو وہ توجہ نہیں دی گئی جتنی توجہ منطق وفلسفہ پر مبذول کی گئی جس کا خمیازہ ہم اپنی نسل نو کی اسلام کے عظیم المرتبت سپوتوں اور مجاہدین ومحدثین اور مفسرین کے اولوالعزم کارناموں سے عدم واقفیت کی شکل میں بھگت رہے ہیں جبکہ وہ قومیں جن کی کوئی روشن تاریخ نہیں ہے وہ اپنے

بزرگوں کے تھوڑے بہت سیاسی وتعمیری کارناموں کو سرمایہ اور آثار کی شکل میں محفوظ کرنے میں جٹی ہیں، یہاں تک کی تاریخ گھڑی جارہی ہے اور آثار قدیمہ ڈھونڈے جارہے ہیں۔

حضرت مولانا محمد میاں صاحب کی دوراندیشی اور تاریخی بصیرت پر قربان جایئے کہ انہوں نے اسلامی نرسری مکاتب اور مدارس کے ابتدائی عربی فارسی درجات کے لیے تاریخ اسلام کو لازمی مان کر تاریخ اسلام لکھی ہے، جس کے بارے میں جمعیۃ علماء ہند کے پہلے صدر مفتی کفایت اللہ صاحب نے تحریر فرمایا:

> ''تاریخ اسلام کو میں نے پڑھا، یہ کتاب یقیناً اس کا حق رکھتی ہے کہ اسکولوں، انجمنوں، مکاتب وغیرہ میں اس کو داخل درس کیا جائے۔'' (تاریخ اسلام دوم صفحہ نمبر ۳ مطبوعہ مکتبہ احسان لکھنؤ)

جب کہ شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی کو تاریخ اسلام کا یہ رسالہ اتنا پسند آیا کہ اس کو بذات خود بہت سے مدارس کے نصاب تعلیم میں داخل کروایا۔ ''تاریخ اسلام'' کی زبان اور اسلوب کی توصیف وتعریف فرماتے ہوئے رسالہ پر اپنی تقریظ میں یہ الفاظ رقم فرماتے ہیں:

> ''اس رسالہ میں نہ تو مغلق الفاظ ہیں نہ عقول سافلہ سے بالا مضامین، سلاست مضامین کا یہ حال ہے کہ متوسط درجہ کا ذہین بچہ بھی بآسانی سمجھ سکتا ہے، الفاظ میں اختصار ملحوظ رکھا ہے، جس قدر حالات ہیں اور جو بات لکھی ہے وہ مستحکم، میری رائے ہے کہ اس رسالہ کی ترویج مسلمانان ہند کا اولین فریضہ ہے، تبلیغی انجمنیں ان کے ذریعہ اپنے تبلیغی مقاصد میں بہ احسن وجوہ کامیاب ہوسکتی ہیں۔ اسلامی مدارس کو تو اس میں بہت سرگرمی سے کام کرنے کی ضرورت ہے۔'' (تاریخ اسلام حصہ دوم ۳)

تاریخ اسلام کی خصوصیات:

حضرت مولانا محمد میاں صاحب نے رسالہ 'تاریخ اسلام' کو تین حصوں میں تقسیم کیا۔ ہم ان تینوں حصوں کی اہم خصوصیات پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔ یہ بات ذہن میں رہنی ضروری ہے کہ تاریخ ایک خشک موضوع ہے، تاریخی واقعات وحقائق کو ادبی اور آسان

اسلوب میں پیش کرنا اسی مورخ کے بس کی بات ہے جس کا ادبی ذوق اعلیٰ معیار کا ہو اور اگر تاریخ کو کم عمر بچوں اور بچیوں کو پڑھانے کے لئے کتابی شکل میں پیش کرنا ہے تو ضروری ہے کہ وہ بچوں کی نفسیات اور ذہنی سطح اور صلاحیت سے مکمل واقف ہو۔

حصہ اول : تاریخ اسلام کا حصہ اول اپنے حجم کے لحاظ سے مختصر رسالہ ہے جو ۴۸ صفحہ پر مشتمل ہے۔ انداز ترتیب بہت سہل اور رواں ہے، مشکل الفاظ سے گریز کیا گیا ہے، چونکہ پیش نظر تدریسی اسلوب ہے، لہٰذا سوال و جواب کا طریقہ اختیار کیا گیا ہے، اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ مضمون کے تمام اجزا سامنے آجاتے ہیں جس کی وجہ سے اسی اجزاء پر دماغ اور ذہن مرتکز ہوجاتا ہے جو سوال میں پوچھا جاتا ہے۔ اس طرح جواب بھی آسان ہوجاتا ہے اور یاد کرنا بھی سہل معلوم ہوتا ہے۔ تجزیاتی تحریر زیادہ قابل فہم ہوتی ہے۔ فاضل مصنف نے عنوان وار سوالات و جوابات پر ہی اکتفاء نہیں کیا ہے بلکہ آخر میں خلاصہ مضمون کو اختصار کے ساتھ دیدیا، تاکہ کم فہم بچے بھی بآسانی یاد کرکے کام چلالیں، اسی کے ساتھ یادداشت کو مستحکم کرنے اور صلاحیت کو اجاگر کرنے کے لئے لمبے لمبے جملوں کے استعمال سے پرہیز کیا ہے۔ شروع میں بغیر کسی ہدایت وتمہید اور ضابطہ کے اصل موضوع پر گفتگو شروع کی ہے جس کی وجہ بچوں اور بچیوں کی عمر اور عقل کی رعایت کرنا ہے۔

اندازِ تحریر پر ایک نظر ''پہلا عنوان''

سوال:۔ یہ کتاب جو تم پڑھ رہے ہو کس فن میں ہے؟

جواب:۔ فن تاریخ میں۔

سوال:۔ تاریخ کس کو کہتے ہیں؟

جواب:۔ تاریخ اس علم کا نام ہے جو گزرے ہوئے اور موجودہ لوگوں کے حالات بتائے۔

سوال:۔ علم تاریخ کس کے لیے مفید ہے ؟

جواب:۔ ہر سمجھ دار کے لئے۔

سوال:۔تاریخ کا مقصد اور فائدہ کیا ہے؟

جواب:۔ جو حالات موجودہ زمانہ میں پیش آ رہے ہیں ان کو گزرے ہوئے زمانہ کی حالتوں سے ملا کر نتیجہ نکالنا اور اس پر عمل کرنا۔

بظاہر یہ چند سوالات اور ان کے جوابات ہی ہیں، لیکن انہیں میں فن تاریخ کی تعریف اس کا موضوع اور غرض و غایت کو مختصر اور آسان جملوں میں بیان کر دیا، جن پر لمبی لمبی تمہید اور تفصیل سے کام لیا جاتا ہے۔ قابل فخر مصنف کا کمال ہے کہ دریا کو کوزے میں بھر کر پیش کرنے کا کام کیا ہے، مزید براں مقصد اور فائدہ کو مثال سے سمجھا کر اس کا نتیجہ بھی سامنے کر دیا ہے اور آخر میں فن تاریخ کے سوال و جواب کا چند سطروں میں خلاصہ تحریر کرنے اور بچوں کا ذہن عام تاریخ سے موڑ کر تاریخ رسالت اور تاریخ اسلام کی جانب کس حکمت عملی سے کر رہے ہیں وہ بھی دیکھنے جاننے کی چیز ہے۔

سوال: اس کتاب میں جس کو تم پڑھ رہے ہو کس کے حالات بیان کئے جائیں گے؟

جواب: اس پاک نبی اور بزرگ پیشوا کے جن کا نام نامی محمد ﷺ ہے، قربان ہوں آپ پر ہمارے ماں باپ اور ہماری جانیں۔

اس انداز سے مکہ کا ذکر آنا لازمی ہے اور پھر مکہ کے باشندوں، مکہ کے حالات اور مکہ کا محل وقوع، اس کی آبادکاری، خانہ کعبہ کی تعمیر سب آ جاتے ہیں۔ گویا ایک دو صفحہ میں بچہ کے ذہن میں سیکڑوں صفحات کی بات اتار دی گئی، اور آخر میں پورے مضمون کا خلاصہ بھی پیش کر دیا اور ذہن سازی بھی کر دی آئندہ کے مضامین کی نوعیت کی جانب۔

مصنف کتاب حضرت مولانا محمد میاں صاحب نے فن تاریخ کے عنوان کے تحت اولاً فن تاریخ کی تعریف، موضوع اور مقصد کو بیان کیا پھر مکہ اور آپ ﷺ کو، آخر میں خلاصہ یوں تحریر کرتے ہیں:

خلاصہ:

حضرت محمد ﷺ جن کے حالات اس کتاب میں بیان کئے جائیں گے، مکہ کے

رہنے والے تھے قریشی خاندان سے، حضرت اسمٰعیلؑ کی اولاد سے، اور مکہ ایک شہر ہے عرب میں، اس جگہ وہ مشہور مقام ہے جس کو خانہ کعبہ کہتے ہیں۔ مکہ میں سب سے پہلے بسنے والے حضرت اسمٰعیلؑ اوران کی والدہ ماجدہ ہیں۔ قبیلہ جرہم کے کچھ لوگ اسی زمانہ میں آ بسے، انہیں کی اولاد رہتی ہے، انہیں کی اولاد سے فہر یا نظر بن کنانہ ہیں جن کی اولاد کو قریش کہتے ہیں۔ مکہ، کعبہ اور مسجد حرام میں فرق یہ ہے کہ مکہ شہر کا نام ہے، کعبہ اس میں ایک عمارت ہے اور اس کے اردگرد کے صحن کا نام مسجد حرام ہے۔ کعبہ کی تعمیر کرنے والے حضرت ابراہیمؑ اور اسمٰعیل ہیں۔ (تاریخ اسلام حصہ اول ۵)

چند سطروں پر مشتمل یہ خلاصہ بچوں کو یاد کرانا آسان بھی ہے اور ملکی حالات کی کہانی اور جغرافیہ بھی ہے۔

تاریخ اسلام حصہ اول کے عناوین:

آپ ﷺ کی ذات، رسالت، اسلام کی دعوت اور مشرکین مکہ کی مخالفت کے اردگرد گھومتی ہے جیسے (پیدائش مبارک، سلسلہ نسب شریف، رسول اللہ ﷺ کی پرورش، حضور ﷺ کے دودھ پینے کا زمانہ، نبوت سے پہلے کی زندگی، شام کا سفر، ازدواجی زندگی، نبوت سے پہلے حضور ﷺ کے اخلاق وتعلقات، حضور ﷺ کا نبی بنایا جانا، تبلیغ اور دعوت اسلام، کھلم کھلا اسلام کی تبلیغ، سچی آواز کی مخالفت، ہجرت یا جلاوطنی، اسلام کی ترقی اور حضور ﷺ کا مقاطعہ، دوبارہ ہجرت حبشہ) اہم عناوین میں ترتیب زمانی کا پورا خیال رکھا گیا ہے۔

حصہ دوم:

تاریخ اسلام کے دوسرے حصہ میں حضرت مولانا محمد میاں صاحب نے حصہ اول کے برعکس عرض والتماس کے عنوان سے تاریخ اسلام رسالہ لکھنے کے محرکات اور سبب تصنیف کو بھی بیان کیا ہے۔ میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ کتاب میں رسول کائنات ﷺ کی سیرت نگاری کو ہی ملحوظ رکھا گیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلامی تاریخ کا آغاز ہی ولادۃ النبی ﷺ سے ہوتا ہے اور نونہالان اسلام کو زندگی کے پہلے تعلیمی مرحلہ میں جب کہ لوحِ قلب پر حروف والفاظ

کی شکل میں جو داستان ایمان وعزیمت تحریر کی جاتی ہے اس کا حق یہ ہے کہ سیرت النبی ﷺ کو اولیت دی جائے، باقی اسلام کی چودہ سو سالہ تاریخ میں مسلم حکمرانوں اور ان کے عہد میں پیش آنے والے اچھے یا برے احوال کی تاریخ وسیرت بعد میں آتی ہے۔ بہر حال مولانا وجہ تصنیف کے اسباب یوں بیان کرتے ہیں:

''حق تو یہ ہے کہ حیات مقدس ﷺ کی مکمل سوانح کا فرض نہ تو آج تک کسی سے ادا ہوسکا ہے اور نہ بشری طاقت کے امکان میں ہے کہ قیامت تک اس فریضہ کی تکمیل سے سبک دوشی حاصل کر سکے، البتہ تفسیر قرآن کی طرح شیدائیان جمال اقدس نے بھی گاہ بگاہ قلم اٹھایا اور اپنے طبعی مذاق یا فطری افتاد کے بموجب مختصر یا ضخیم جلدیں لکھ ڈالیں مگر واقعہ یہ تھا۔

دریں ورطہ کشتی فروشد ہزار   کہ پیدا نہ شد تختۂ بر کنار

دفتر تمام گشت وبپایاں رسید عمر   باہم چناں در اول وصف تو ماندہ ایم

امت مسلمہ کی سیرت النبی ﷺ سے بے توجہی کو شکوہ شکایت کا عنوان دے کر یوں بیان کرتے ہیں:

''سیرت نگاروں کی حالت پھر بھی غنیمت ہے کہ انہوں نے جادۂ پیمائی کا قصد تو کیا، یہ دوسری بات ہے کہ منزل بعید تھی اور آخری مرحلہ پر رسائی ناممکن: **لا یکلف الله نفسا الا وسعها۔**

مگر عام مسلمانوں کے مذاق کی حالت بہت زیادہ قابل افسوس ہے، دنیا اپنے مقتدا اور پیشوا کے حالات، اجڑے ہوئے شہروں سے بر باد شدہ آثار قدیمہ سے تلاش کر رہی ہے مگر تاریخیت کی کوتاہی کے باعث وہ سراب ہی پر تھک جاتی ہے، جہاں چشمہ کا کہیں پتہ نہیں ہوتا، لیکن اس کے برعکس یہاں چشمہ ان کے لبوں کے پاس خود آرہا ہے، وہ تشنہ بھی ہیں مگر افسوس وہ آب حیات کی شناخت سے بالکل ناواقف ہیں، ان آنکھوں کے سامنے حیات مقدس کے عربی، فارسی، اردو مختصر، مطول، مختلف موضوع پر سیکڑوں رسالے موجود ہیں مگر گویا وہ رسائل کیا ہیں آفتاب ہیں جن کو چشم شپر دیکھ نہیں سکتی۔

سیہ بختان قسمت را چہ سود از رہبر کامل
کہ خضر از آب حیواں، تشنہ لب آرد سکندر را

ضرورت محسوس کی گئی کہ بچوں کو ابتدائی تعلیم کے سلسلہ میں حضور ﷺ کی سوانح پر ایک نظر ڈالوا دی جائے تا کہ آغاز زندگی کا یہ چسکا ممکن ہے کسی نتیجہ تک ان کو پہنچا سکے۔''

انداز تصنیف کیسا ہو؟

اور لکھتے ہیں کہ:

''اور ضروری معلوم ہوا کہ سوال و جواب کی شکل میں ایک مختصر رسالہ کا اور اضافہ کیا جائے جو زبان اور مضامین کے لحاظ سے دقتوں سے بالکل مبرا ہو، مگر یہ مقصد جس قدر آسان تھا اسی قدر اس کی تکمیل کے لئے اردو زبان دانی اور محاورات سے واقفیت کی بھی ضرورت تھی تا کہ عبارت کی سلاست اور الفاظ کی موزونیت کے ساتھ دلچسپی بھی حاصل ہو سکے۔''

تصنیف کے محرکات کیا تھے؟

''یہ ناکارہ کسی بھی طرح اس مقصد کا اہل نہ تھا مگر حضرت قبلہ سیدی و سندی، استاذ العلماء جناب مولانا الحاج حافظ محمد اعزاز علی صاحب مدظلہ العالی استاذ فقہ وادب وصدر دارالافتاء دارالعلوم دیو بند ادام اللہ شرفہا نے مجبور فرمایا کہ جس طرح بھی ممکن ہو اس کی تکمیل کی کوشش کی جائے۔'' (اقتباسات از عرض والتماس، ماخوذ از تاریخ الاسلام حصہ دوم)

مولانا محمد میاں صاحب کی ان تشریحات و عبارات کی روشنی میں تاریخ اسلام کے تینوں حصوں کی اہمیت، افادیت، ضرورت کے ساتھ مقصد نگارش کا خلاصہ ہو جاتا ہے کہ یہ تینوں حصے دراصل تاریخ کے ان ابواب سے متعلق ہیں جن میں سیرت النبی ﷺ سے بحث کی گئی ہے اور نونہالان اسلام کو ابتداء میں اسی موضوع اور عنوان سے روشناس کرانے کی ضرورت ہے، تا کہ ان کے دلوں میں محبت نبی کا بیج بو کر اس کو پروان چڑھایا جائے۔

تاریخ اسلام کی معتبریت:

فاضل مصنف اعتذار کے عنوان سے تاریخ اسلام کی جامعیت، معتبریت کو کتاب

کے مستند مراجع ومصادر اور مآخذ کے حوالے جات سے مستحکم کررہے ہیں کہ اگر چہ یہ تینوں مختصر مختصر رسالے اپنے حجم وسائز میں چھوٹے لگتے ہیں لیکن ہر بات مستند مراجع کی روشنی میں کہی اور لکھی گئی ہے۔ گویا یہ صرف معصوم بچوں کے لئے ہی مفید اور نافع نہیں ہے بلکہ بڑی عمر کے انسانوں اور خاص کر طلبۂ مدارس کے لئے بھی قابل اعتماد ذخیرۂ معلومات ہے۔

مولانا فرماتے ہیں: ''یہ ضرور ہے کہ جو کچھ حصہ تحریر میں لایا گیا ہے وہ صحاح ستہ، مشکوۃ شریف، جمع الفوائد، سرور المخزون (حضرت مولانا شاہ لی اللہ صاحب کی تصنیف) دروس التاریخ الاسلامی، شمائل ترمذی، مبسوط مصنفہ حضرت شمس الائمہ سرخسی، بدائع الصنائع (کتاب الجہاد)، درمختار وغیرہ وغیرہ معتمد کتابوں سے یقینی اخذ کردہ ہے اور جس میں کسی قسم کا کوئی شبہ بھی ہوا اس کو ساقط کر دیا گیا ہے۔''

نتائج ومفاد اخذ کرنے کا نرالا انداز:

فاضل مصنف نے حصہ دوم 'حق وباطل کی جنگ' کے عنوان کے تحت نتیجہ خیز تمہید رقم کی ہے اور کمال حکمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس طویل جنگ کے ساتھ مرتبے اور درجات کا خلاصہ اتنے مختصر انداز میں تحریر فرمایا کہ کسی بھی شخص کو نتائج اخذ کرنے میں دشواری نہیں ہوسکتی ہے۔

الحاصل مذکورہ بالا تحریر کا مفاد یہ ہے کہ حق وباطل کی جنگ کے سات مرتبے ہیں:

(۱) (الف) حق کی زبان بندی (ب) حق کی طرف کے غلط خیالات کا پھیلانا، بدنام کرنا (ج) اس کی آواز کو دوسروں تک نہ پہنچنے دینا، یعنی مجمعوں میں غل، غپاڑہ کرنا، ان کو منتشر کرنا، ان کو ناجائز قرار دینا۔

(۲)۔(الف) قید وبند (ب) زدوکوب، لاٹھی چارج

(۴)۔قتل

(۵)۔اہل حق کو جوابی جنگ اور تشدد سے مدافعت کی اجازت

(٦)۔لڑنے والوں سے لڑنے کا حکم

(۷)۔عام طور سے باطل طاقتوں کو اعلان جنگ

ورنہ تاریخ کے شناور حضرات انصاف سے فرمائیں کہ دنیا کا کوئی سچا انقلاب بھی ان مراتب سے خصوصاً آخری مراتب سے خالی رہا ہو۔

کن واقعات سے نتیجہ اخذ کرتے ہیں؟

قابل تقلید مورخ کی فراست اور اخاذ طبیعت کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ ہر واقعہ جو پیش آیا اس کے ہدف اور مقصد اور غرض کو سامنے کر دیا ہے۔مولانا کے تحریر کردہ اس نقشہ کو ملاحظہ فرمائیں اور اپنی رائے دیں۔دو تین مثالیں پیش کرتا ہوں:

☆مولانا بتانا چاہتے ہیں کہ پہلی پہلی دفعہ آپ نے جب خاندان کے خاص خاص لوگوں کو جمع فرما کر نبوت کا اعلان فرمایا اور ایمان لانے کی دعوت دی تو ابولہب نے انتہائی گستاخانہ سخت لہجہ میں آپ کو ڈانٹا تھا کہ اسی مقصد کے لئے ہم سب کو بلایا تھا تمہاری بربادی ہو۔

اس ڈانٹ کا مقصد تھا کہ آئندہ ایسی بات نہ کہیں، خاموشی اختیار کریں، اور صفا و مروہ کی تقریر پر قوم کا ردعمل کا خلاصہ یہی تھا کہ ہم آئندہ یہ باتیں نہیں سننا چاہتے، بہتر ہے کہ آپ اپنی زبان بند ہی رکھیں۔

☆حضرت بلال، حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما جیسے صحابہ کو مارنا پیٹنا، حضرت عمار کی والدہ محترمہ خاتون جنت مائی سمیہؓ کو ابوجہل کا شرمناک طرح پر شہید کرنا۔

خلاصہ مضمون: یعنی زدوکوب اور لاٹھی چارج

☆ اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقَاتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا جنگ لڑنے والوں کو اجازت دی جاتی ہے، اس وجہ سے کہ ان پر ظلم کیا گیا۔(سورۃ الحج:۳۹)

خلاصہ مضمون: یعنی جوابی جنگ کی اجازت

یہ چند مثالیں ہیں کہ مورخ اسلام مولانا سید محمد میاں صاحب نے تاریخ اسلام و سیرت النبی ﷺ کے متعدد واقعات سے جو خلاصہ نتائج اخذ کئے ہیں، ان کو چند لفظوں میں

بیان کر کے پڑھنے والوں کو نتائج اخذ کرنے کا شعور بخشا اور طریقہ بھی سکھایا، اس سلسلہ میں ان کی اپنی انفرادی حیثیت نمایاں ہو کر سامنے آتی ہے کہ تدریس سیرت و تاریخ کا کتنا مؤثر اسلوب انہوں نے مبتدی طلبہ کے لیے اختیار فرمایا ہے اور ان کی تصنیف کردہ تاریخ اسلام طلبہ عزیز کے لیے کس قدر مفید و نفع بخش ثابت ہوتی ہے۔

تاریخ اسلام حصہ دوم کی خصوصیت:

یہ ہے کہ اس میں انداز تحریر تو حصہ اول ہی جیسا رکھا گیا ہے لیکن چونکہ یہ دوسرے مرحلے کی کتاب ہے، ان بچوں کے لیے جو حصہ اول پڑھ کر بہت حد تک زبان بھی سیکھ چکے ہیں اور تاریخ سے واقف بھی ہو چکے ہیں، لہٰذا اس حصہ کی زبان کا معیار بھی کسی قدر بلند ہے اور اختصار کی جگہ کسی قدر وضاحتی تفصیلی عبارتیں بھی ہیں۔ اس کو کہتے ہیں تدریس کا تدریجی انداز تعلیم، نیز حواشی میں حوالہ جات مع جلد و صفحات تحریر فرمانے کا اہتمام بھی کیا ہے، تا کہ اساتذہ کو تدریس میں سہولت کے ساتھ ساتھ ان کو سمجھانے میں دشواری پیش نہ آئے اور ذہین طلبہ اپنے طور پر بھی کتاب کے واقعات کو مستند انداز میں جان سکیں اور یقین کر لیں کہ جس کتاب کو ہم پڑھ رہے ہیں وہ انتہائی معتبر و مستند اور مدلل کتاب ہے، سیرت و تاریخ کے اہم موضوع پر معلومات کا اہم ذریعہ ہے۔ اس طرح کتاب اور اس کے مندرجات پر بھروسہ مضبوط ہوگا۔

صفحہ نمبر ۱۴ پر جہاد کے عنوان کے تحت پہلا سوال

سوال: جہاد کس کو کہتے ہیں؟

جواب: اسلام اور مسلمانوں کے فائدے کے لئے اور مخالفین کو زک پہنچانے کے لئے آخری اور پوری پوری کوشش کا نام جہاد ہے خواہ وہ تلوار سے ہو یا کسی اور طرح سے۔ (اس پر حاشیہ ملاحظہ فرمائیں)

حاشیہ: **قال فی بدائع الصنائع فی الجزاء السابع: اما الجهاد فی اللغة عـن بـذل الـجهـد بـالضم وهو الوسع والطاقة أو عن المبالغة فی العمل من**

الجهد بالفتح،وفی عرف الشرع یستعمل فی بذل الوسع والطاقة بالقتال فی سبیل الله عزوجل بالنفس والمال واللسان وغیر ذلک او المبالغة فی ذلک (واللہ اعلم) حوالہ بدائع ۶ر مکتبہ رشیدہ کوئٹہ وھٰکذا فی کتاب اخریٰ

حضرت مولانا نے حواشی میں اصل عبارت کی ترتیب بھی منطقی و عقلی رکھی ہے کہ شروع شروع میں حوالوں کے تراجم اردو میں دیئے، پھر بتدریج اصل عربی عبارت کو نقل فرمایا ہے۔ حاشیہ کا سمجھنا بھی ذہانت کی بات ہے، اور اس کا اہتمام کرانے کی ضرورت ہے کہ طلبہ حواشی دیکھیں اور ازخود کتاب کی عبارت حل کرنے کی صلاحیت وسلیقہ پیدا کریں۔ لہٰذا کہیں اردو میں حاشیہ تحریر کیا تو کہیں اصل عربی عبارت ہی نقل فرمائی ہے۔

حصہ دوم کا آغاز مدینہ طیبہ میں اسلام کے عنوان سے ہوتا ہے اور آپ ﷺ کی وفات پر ختم ہوجاتا ہے۔ حصہ دوم ۴۴ صفحات پر مشتمل ہے اس میں سیرت النبی اور تاریخ اسلام کی زمانی ترتیب کا خاص لحاظ رکھا گیا ہے۔

تاریخ اسلام حصہ سوم:

تیسرے حصہ میں شمائل نبوت اور حلیہ مبارکہ، اخلاق، معاملات، عادات، اندرون خانہ زندگی، پوشاک، لباس وغیرہ، اور آخر میں امہات المؤمنین ازواج النبی ﷺ کے حالات، خاندان اور ان سے نکاح کا زمانہ اور نکاح کے وقت آپ کی ازواج کی عمر مبارک وغیرہ کو چارٹ کی شکل میں پیش کرنے کا اہتمام کیا گیا ہے۔ تیسرا حصہ بھی ۴۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس حصہ میں خلاصہ مضمون نہیں دیا گیا ہے، کیونکہ اس میں گفتگو آنحضور ﷺ کی ذاتی سیرت و صورت اور شمائل وخصائل سے کی گئی ہے۔

آخری بات:

میں سمجھتا ہوں کہ یہ تجزیاتی مقالہ حضرت مولانا محمد میاں صاحب کو ایک سیرت نگار مؤرخ اسلام کی حیثیت سے سمجھنے اور اس فن میں ان کے رسوخ وملکہ کو جاننے کے ساتھ ہی ان کی تصنیف کردہ کتاب تاریخ اسلام کی اہمیت وافادیت اور داخل نصاب کرنے کی ضرورت کا احساس دلانے میں بہت حد تک معین و مددگار ہوگا۔

ہندوستان کے ایک معروف مؤرخ ومصنف

حضرت مولانا سید محمد میاں دیوبندی

اوران کی اہم ترین تصنیف

علمائے ہند کا شاندار ماضی، طبع اول وطبع چہارم

ایک تعارف

نورالحسن راشد کاندھلوی

Mufti Elahi Bakhsh Academy
Maulviyan, Kandhla. Distt.Shamli (Muzaffar Nagar)247775 (U.P) India
Email:nhrashidkandhlavi@yahoo.com

نحمده ونصلی علی رسوله الکریم امابعد!

وہ دور ابھی بہت دور نہیں گیا جب ہماری صفیں ایسے علماء، اہل کمال، اہل نظر اور اہل قلم سے آراستہ تھیں کہ ان میں سے ہر ایک جید وصاحب نظر عالم، کامیاب استاد ومدرس، بہترین مقرر وواعظ، اعلیٰ درجہ کا منتظم، فعال وسرگرم، روشن دماغ، بیدار مغز اور سراپا جہد وعمل نظر آتا اور رہتا تھا، یہ ایسے اصحاب کمال اور ارباب فضل وافضال تھے کہ جو اگر مسند درس پر بیٹھیں، تو اس کو کمالات سے آراستہ کردیں، وعظ وتقریر میں آئیں، تو معلومات اور فصاحت وبلاغت کے دریا رواں کردیتے تھے اور کسی جماعت وتنظیم سے وابستہ ہوں، تو ان میں ادنی کارکنوں کی سی اطاعت گذاری اور اعلیٰ ترین منتظمین کی لیاقت وصلاحیت کا مظاہرہ کرتے تھے اور اگر تصنیف وتالیف کی دنیا میں وارد ہوتے تو اس کو گونا گوں مضامین اور متنوع

عنوانات سے اس طرح لبریز کر دیتے کہ لوگوں کی محبت وتوجہ کا محور بن جاتے تھے اور ان سب کے باوجود وہی سادگی، ویسی ہی بے نفسی، اسی طرح خود کو کچھ نہ سمجھنا اور کسی سے بھی کسی اجر اور دنیاوی نفع کی طلب تو دور کی بات ہے، اس کی امید بھی نہ رکھتے۔ مولانا سید محمد میاں صاحب بھی اسی قافلۂ اخلاص وعمل کے ایک فرد اور اسی راہ جہد واتقاء کے ایک مسافر تھے۔

خاندان اور اجداد:

ہندوستان میں سادات رضویہ کے معتبر سلسلے اور خاندان صدیوں سے مختلف مقامات پر آباد ہیں، جس کی شاخیں خیر آباد، زید پور، امروہہ، شیخ پور [برناوہ، ضلع میرٹھ] میں بکھری ہوئی ہیں، موجودہ صوبہ ہریانہ کے قصبات سونی پت، سفیدوں اور سامانہ میں بھی رہتے تھے، یہ بات قابل ذکر ہے کہ سادات امروہہ اور سر سید احمد خاں کا نسب بھی اسی خاندان سے جڑا ہوا ہے۔(۱)

اسی خاندان کا ایک بہت بڑا سلسلہ دیوبند میں ہے، جس کا آغاز سید محمد ابراہیم سے ہوا تھا۔ سید محمد ابراہیم [وفات: شوال ۱۰۳۴ھ/۱۶۲۴ء] گیارہویں صدی ہجری میں جہانگیر کے دور میں دیوبند تشریف فرما ہوئے، جہانگیر نے ان کے لئے محلّہ پیرزادگان، دیوبند میں ایک عالی شان خانقاہ اور مسجد تعمیر کرائی تھی، سید ابراہیم جو سلسلہ قادریہ شطاریہ کے مشائخ کبار اور کاملین میں سے تھے، اس خانقاہ میں جلوہ افروز ہوئے اور دیر تک اس خطہ کو اپنے روحانی کمالات سے نوازا،(۲) اور اہل فضل وکرم کو اخلاق اور تعلق مع اللہ جیسے اوصاف حمیدہ سے آراستہ کیا۔، ان کی اولاد میں ہمیشہ نئے نئے پھول کھلتے اور ان کے دم سے علم وعرفان کے چمن آباد ہوتے رہے، اسی سلسلہ کی ایک کڑی متأخر دور میں حاجی سید عابد حسین دیوبندی [وفات: ۲۸/ذی الحجہ ۱۳۳۱ھ - ۱۹۱۲ء] حاجی سید محمد انور [۱۳۱۲ھ - ۱۸۹۴ء] حاجی فضل حق، مہتمم دارالعلوم دیوبند کی تھی اور قریب میں اسی سلسلہ کا ایک اور روشن چراغ، مولانا سید محمد میاں صاحب تھے۔ مولانا سید محمد میاں صاحب کے والد سید منظور محمد تھے، جن کا سلسلہ اس طرح ہے:

''سید منظور محمد بن یوسف علی بن محمد علی بن ظہور ولی بن سید فردوس بن
سید شبلی بن بندگی محمد اسماعیل بن سید محمد ابراہیم''

سید ابراہیم کا نسب ۳۲ر واسطوں سے، حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جڑ جاتا ہے۔(۳)

سید منظور محمد صاحب کے دو بیٹے تھے:

(۱) مولانا سید محمد میاں (۲) سید احمد میاں

مولانا محمد میاں ۱۲ر رجب ۱۳۲۱ھ [۴؍اکتوبر ۱۹۰۳ء] کو بلند شہر میں پیدا ہوئے، اس وقت مولانا کے والد محکمۂ نہر کی ملازمت کی وجہ سے وہاں مقیم تھے، مولانا کا تاریخی نام مظفر میاں ہے۔ مظفر نگر کے ایک حافظ صاحب سے قرآن کریم پڑھا، فارسی کی تعلیم بلند شہر کے ایک گاؤں میں خلیل احمد نامی ایک صاحب سے حاصل کی، فارسی پڑھتے ہوئے ۱۳۳۱ھ [۱۹۱۲ء] میں دارالعلوم کے درجۂ فارسی میں داخل کئے گئے۔ درجہ بدرجہ پڑھتے بڑھتے ۱۳۴۳ھ [۱۹۲۵ء] میں حضرت علامہ انور شاہ کشمیری [م ۱۳۵۲ھ-۱۹۳۳ء] سے بخاری شریف پڑھنے کی سعادت حاصل کی۔

تدریس: شعبان ۱۳۴۴ھ [مارچ ۱۹۲۵ء] میں کلکتہ میں جمعیۃ علمائے ہند کا ساتواں اجلاس، علامہ سید سلیمان ندوی کی صدارت میں ہوا تھا، وہاں سے واپسی میں مدرسہ حنفیہ، آرا، ضلع شاہ آباد، بہار کے ذمہ داران نے حضرت شاہ صاحب سے ایک ایسے اچھے استاذ کی درخواست کی، جو عربی تحریر وتقریر کی مشق کرا سکے اور ادب کی اونچی کتابوں کا درس دے سکے۔ حضرت علامہ نے مولانا اعزاز علی کے مشورہ سے اس خدمت کے لئے مولانا محمد میاں کا انتخاب کیا، مولانا محمد میاں نے تقریباً ساڑھے تین سال آرا میں درس وتدریس میں گزارے۔ مولانا مدرسہ آرا سے اس لئے بددل اور علیحدہ ہوگئے تھے کہ وہ مدرسہ سرکاری امداد لیتا تھا اور وہاں انگریزی امتحانات کی تیاری بھی کرائی جاتی تھی، مولانا نے لکھا ہے:

''احقر نے تقریباً ساڑھے تین سال آرا میں قیام کیا، اول اول کچھ مشکلات پیش آئیں، پھر نہ صرف مدرسہ کے حضرات بلکہ شہر کے بھی بہت سے حضرات احقر

سے مانوس ہوگئے، صوبہ بہار کے دوسرے اضلاع کے علماء اور بزرگوں سے بھی کچھ تعارف ہوگیا، مگر احقر اس مدرسہ سے خاطر برداشتہ رہا، کیوں کہ اس مدرسہ کو سرکاری ایڈ ملتی تھی اور بہار یونیورسٹی کے درجات فاضل وغیرہ کی تیاری بھی یہاں کرائی جاتی تھی، یہ دونوں باتیں دارالعلوم کے اصول کے خلاف تھیں، احقر کے اکابر جو دارالعلوم کے بااثر اور بارسوخ حضرات تھے، انہوں نے وقتی طور پر احقر کا انتخاب فرمایا تھا، اور اس میں شک نہیں کہ اگر احقر وہاں کچھ عرصہ اور قیام کرتا تو شمس الہدیٰ، پٹنہ میں پروفیسر ہوسکتا تھا اور یہ بھی ممکن تھا کہ پروفیسر ہونے کے بعد پرنسپل بھی ہوجاتا''(۴)

کیا لوگ تھے وہ، کہاں گئے اور ان کا وہ اِخلاص اور اعتماد علی اللہ، توکل واستغناء کا جذبہ بعد کی نسلوں اور علماء سے کیوں ختم ہوگیا۔

شوال ۱۳۴۷ھ [مارچ ۱۹۲۸ء] (۵) میں مدرسہ شاہی مرادآباد میں استاذ مقرر کئے گئے (۶) اور سولہ سال تک اسی سے وابستہ رہے، درجہ بدرجہ ترقی کرتے ہوئے مدرسہ کے مفتی، منتظم اور ممبر مجلس شوریٰ وعاملہ کے عہدوں پر پہنچے۔

مولانا کی زیر درس کتابوں میں ہدایہ اور صحیح مسلم بہت ممتاز تھیں، مولانا نے مدرسہ شاہی مرادآباد کی توسیع، اس کے درجہ اور علمی مقام کو بڑھانے کے لئے، وسیع جدوجہد کی جس کا اثر مدرسہ شاہی کی تاریخ اور ترقی پر اب تک نظر آتا ہے۔

مولانا مرادآباد کے زمانۂ قیام میں، سیاسی خدمات میں بھی مشغول رہتے تھے، جس کی وجہ سے رمضان ۱۳۶۱ھ [اکتوبر ۱۹۴۲ء] سے ربیع الثانی ۱۳۶۳ھ [اپریل ۱۹۴۴ء] تک، الہ آباد اور بریلی کی جیل میں مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی رفاقت رہی۔ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے مولانا کی تنظیمی صلاحیت اور مجاہدانہ ذوق کو پہچان لیا اور اپنے ساتھ دہلی چلنے کا اصرار کیا، مولانا نے اس کو منظور نہ کیا تو ۱۳۶۴ھ [۱۹۴۵ء] میں حضرت مولانا حسین احمد مدنی [شیخ الاسلام] کو ساتھ لے کر مرادآباد آئے اور مہتمم مدرسہ شاہی، مولانا عبدالحق صاحب مدنی سے اصرار کرکے مدرسہ شاہی سے چھ مہینہ کی رخصت دلا کر، دہلی لے گئے۔

مولانا محمد میاں صاحب درس وتعلیم سے علیحدہ اور یکسو ہونے کے لئے آمادہ نہیں تھے، لیکن مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کے سامنے کچھ نہ چلی اور وہ اپنے ارادہ اور فرمائش پر اٹل رہے، تاہم مولانا محمد میاں صاحب چھ مہینے گذرنے کے بعد پھر اپنی جگہ پر، مدرسہ شاہی میں واپس آگئے تھے۔ ابھی اس پر کچھ زیادہ وقت نہیں گذرا تھا کہ ۱۹۴۷ء [۱۳۶۶ھ] کا المیہ پیش آگیا ،جس میں تمام مسلم آبادی اور دینی ادارے درہم برہم ہوگئے تھے، اس وقت مولانا محمد میاں صاحب نے یہ بہت ہی مجاہدانہ اور دلیرانہ فیصلہ کیا کہ ان کو دہلی جا کر، مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کے کام اور دہلی میں مسلمانوں کی حفاظت کی جدوجہد میں شریک ہونا چاہئے، اس لئے دہلی میں قیام کا ارادہ کرلیا۔ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب جو مولانا محمد میاں کی محنت، جدوجہد اور تنظیمی صلاحیتوں کا خوب اندازہ اور تجربہ کرچکے تھے، چاہتے تھے کہ مولانا محمد میاں صاحب ان کی جگہ سنبھال لیں اور جمعیۃ علمائے ہند کے ناظم عمومی (Secretary General) کا عہدہ قبول کرلیں، تو مولانا حفظ الرحمٰن صاحب اس عہدہ سے سبکدوش ہوجائیں، لیکن مولانا حفظ الرحمٰن کی زندگی تک مولانا محمد میاں اس کے لئے تیار نہیں ہوئے اور جمعیۃ کی انتظامی، دفتری خدمات انجام دیتے رہے۔

مدرسہ امینیہ دہلی سے وابستگی:

مولانا محمد میاں صاحب کا فطری، طبعی ذوق درس وتعلیم کا تھا، اور مدرسوں کے ماحول سے سب سے زیادہ مناسبت تھی، اس لئے دہلی میں بھی ہمیشہ یہ چاہتے رہے کہ کسی اچھے مدرسہ سے تعلق ہو اور بنیادی کتابیں پڑھانے کا موقع ملے، لیکن تقریباً پندرہ سال تک کسی بڑے مدرسہ سے باقاعدہ وابستگی نہیں ہوئی۔

مدرسہ امینیہ، دہلی کا ایک قدیم اور بہت ممتاز مدرسہ تھا، جس کا جمعیۃ علمائے ہند کے بانیان کرام سے خاص رشتہ تھا، مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب اپنی زندگی کے آخری لمحات تک، ان کے بعد مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی اور جمعیۃ کے متعدد علماء کی اس سے وابستگی رہی، مولانا محمد میاں صاحب ۲۵ ربیع الاول ۱۳۸۲ھ [اگست ۱۹۶۲ء] کو مدرسہ امینیہ سے

رکن مجلس شوریٰ کے طور پر وابستہ ہوئے، بعد میں یکم شوال ۱۳۸۴ھ [۱۹۶۴ء] کو مدرسہ میں باقاعدہ تقرر ہوا، ۱۳۸۴ھ سے ۱۳۹۴ھ [۱۹۶۴ء سے ۱۹۷۴ء] تک، مدرسہ سے بحیثیت استاذ، مدرس اور منتظم وابستہ رہے، مدرسہ کے انتظام کو بھی جزوی طور پر دیکھتے رہے۔ مولانا نے مدرسہ شاہی مرادآباد کی طرح، یہاں کے ماحول میں بھی تعلیم وتربیت کی ایک نئی روح پھونک دی تھی، جس کے اثر سے بڑی تعداد میں نئے طلباء کا مدرسہ کی طرف رجوع ہوا، خصوصاً دہلی کے نواح میں سے میوات اور راجستھان کے طلبہ نے مدرسہ میں کثرت سے داخلہ لیا اور مولانا سے پڑھتے، استفادہ کرتے رہے، اس عرصہ میں مولانا سے تقریباً ایک سو پچاس[۱۵۰] طلباء نے حدیث شریف، خصوصاً ترمذی وبخاری شریف پڑھ کر اجازت وفراغت حاصل کی۔(۷)

فقہ وفتاویٰ پر نظر اور تحریر فتاویٰ:

جیسا کہ اس زمانہ کا عام معمول تھا کہ اچھے فاضل اور ممتاز مدرس، فقہ کی مہارت اور تحریر فتاویٰ میں بھی کمال رکھتے تھے، مولانا محمد میاں بھی اسی طرح کے استادوں میں تھے، جہاں رہے، تحریر فتاویٰ کی خدمت انجام دیتے رہے، مدرسہ شاہی مرادآباد اور امینیہ کے زمانۂ تدریس میں بھی مسلسل فتاویٰ لکھتے رہے، جو وہاں کے رجسٹروں میں محفوظ ہیں۔ مفتی سلمان صاحب منصور پوری نے لکھا ہے کہ میں نے یہ تمام فتاویٰ کتابی صورت میں مرتب کر لئے ہیں، جو جلد ہی شائع ہوں گے،(۸) مگر راقم سطور کو ان کی طباعت کا علم نہیں۔

جب مدرسہ امینیہ میں استاذ ومدرس بنائے گئے، اس وقت بھی یہ کام جاری رہا، مدرسہ امینیہ کے کاغذات ورجسٹروں میں بھی مولانا کے لکھے ہوئے متعدد فتاویٰ موجود ہیں، جن میں سے کئی ایک فتاویٰ ایک خاصی تالیف اور فقہی بحث کا حکم رکھتے ہیں اور جمعیۃ، کانگریس اور مسلم لیگ کے قضیہ میں بھی، مولانا کے مرتبہ کئی فتوے کتابچوں کی صورت میں چھپے تھے، ضرورت ہے کہ ان فتاویٰ کو مرتب کر کے علمی انداز سے شائع کیا جائے۔

مولانا کی فقہی نظر اور وسعت مطالعہ کا ان رسائل اور سوال ناموں سے بھی اندازہ ہوتا ہے، جو مولانا نے ادارۃ المباحث الفقھیۃ کے تحت منعقد، مجالس فقہیہ کے سوال نامہ کے طور پر لکھے تھے۔ یہ تحریریں اور سوال نامے اپنے آپ میں ایک لائق استفادہ چیز ہیں، اسی سے جڑے ہوئے وہ مختصر رسائل بھی ہیں، جو ''رویت ہلال''، ''ہمارا وطن اور اس کی شرعی حیثیت'' اور ''ترک وطن کی شرعی حیثیت'' کے نام سے شائع ہوئے۔ ان کے بعض مندرجات اور مولانا کی اس سلسلہ میں رائے سے بلاشبہ اختلاف کیا جا سکتا ہے، لیکن ان کی فقہی، علمی حیثیت سے انکار کرنا درست نہ ہوگا۔

جمعیۃ علمائے ہند سے وابستگی اور سیاسی جدوجہد:

مولانا محمد میاں صاحب نے جس دور میں تعلیم حاصل کی اور دارالعلوم سے فارغ ہوئے، وہ سیاسی ہلچل اور کشمکش کا ایسا دور تھا، جس میں ملت کے ایک بڑے طبقہ میں، اپنے حقوق اور شرعی، سیاسی ذمہ داری کو ادا کرنے کے لئے ایک تحریک کی کیفیت تھی اور اکثر لوگ اس ماحول سے متأثر ہو کر کسی نہ کسی سیاسی، قومی کام میں مشغول ہونا چاہتے تھے۔ مولانا کا تعلیمی پس منظر دیوبند کا تھا، وہاں شیخ الہند [حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ] کے نظریات اور تحریکات کا چرچا اور تذکرہ رہتا تھا، اس لئے مولانا محمد میاں اسی وقت سے ان تحریکات و نظریات سے جڑ گئے تھے اور جمعیۃ علمائے ہند سے بھی وابستہ ہو گئے تھے۔

تذکرہ آ چکا ہے کہ کلکتہ میں شعبان ۱۳۴۴ھ [مارچ ۱۹۲۶ء] میں جمعیۃ علماء کا ساتواں اجلاس منعقد ہوا تھا، جس کی صدارت علامہ سید محمد سلیمان ندوی نے فرمائی تھی، مولانا محمد میاں صاحب اس اجلاس میں جمعیۃ علماء کے ذمہ داران کے ساتھ شریک ہوئے تھے اور اس وقت سے آخری دم تک، یہ وابستگی اور جمعیۃ کی رفاقت کا سفر جاری رہا، مولانا کو اول اول جمعیۃ علمائے شہر مرادآباد کا نائب ناظم، پھر ناظم مقرر کیا گیا۔ اس دور میں جمعیۃ علماء صوبہ متحدہ اودھ اور آگرہ، اس وقت کی سیاسی جغرافیائی تقسیم کے مطابق الگ الگ یونٹیں اور حصے تھے، مولانا کو اول صوبہ آگرہ کا ناظم جمعیۃ علماء بنایا گیا اور پھر صوبہ متحدہ اودھ اور آگرہ کا

بھی ناظم بنادیا گیا تھا، ۲۰ تا ۲۲ جمادی الاولیٰ ۱۳۶۴ھ [مئی ۱۹۴۵ء] میں جمعیۃ علمائے ہند کا چودھواں اجلاس عام سہارنپور میں منعقد ہوا تھا، جمعیۃ کے ناظم عمومی کے لئے مولانا محمد میاں صاحب کا نام آیا تھا، مولانا نے معذرت کی مگر حضرت مدنی کے اصرار پر ناظم مقرر کئے گئے، مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے اپنی وفات سے ایک سال پہلے اپنے زمانۂ علالت میں، مولانا سید محمد میاں صاحب کو قائم مقام ناظم نامزد کردیا تھا۔ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی وفات کے ایک سال بعد تک مولانا محمد میاں قائم مقام ناظم کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔

مولانا نے جمعیۃ علماء کے لئے بہت قربانیاں دیں اور اس کے کام کو آگے بڑھانے کے لئے ہر وقت تیار رہے اور ہر اک مشکل سے مشکل مرحلہ پر اور سخت سے سخت ترین حالات میں، کارواں کے ہراول دستہ میں شامل رہے، جیلیں کاٹیں، مشقتیں اٹھائیں اور ہر طرح کی جدوجہد میں مستعد اور ثابت قدم رہے۔ آخر عمر میں اگرچہ عملی وابستگی تو کم ہوگئی تھی، لیکن اس سے وفاداری اور اس کے مقاصد کے لئے اسی طرح کام کرتے رہے۔

کانگریس سے وابستگی:

جمعیۃ علماء کے اجلاس امروہہ میں جمعیۃ علماء کے ارکان کی کانگریس سے جڑنے کی تجویز سامنے آئی تھی، جس کی تائید میں مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری نے ایسی پُر جوش اور اپنے مزاج ومعمول کے مطابق، نہایت جذبات انگیز تقریر کی، جس کی وجہ سے بہت سے لوگوں کے خیالات بدل گئے اور وہ کانگریس سے جڑتے چلے گئے، ان ہی لوگوں میں سے ایک مولانا محمد میاں صاحب بھی تھے۔

اب مولانا کے لئے لڑائی اور جدوجہد کے دو میدان ہو گئے تھے، جمعیۃ کا اور کانگریس کا، مولانا دونوں کے لئے مخلص تھے، دونوں میں پوری جاں کاہی اور دلچسپی کے ساتھ لگے رہے، دونوں کے لئے یکساں قوت واستقلال کے ساتھ قدم اٹھائے، قدم بڑھائے، جیلیں کاٹیں اور سزائیں برداشت کیں، کانگریس کا ممبر بننے کے بعد مولانا جلد ہی گرفتار کر لئے گئے تھے، جس میں حضرت مولانا سید فخر الدین صاحب بھی مولانا کے ساتھ تھے۔

ایک اور موقع پر ۱۳۵۰ھ [۱۹۳۲ء] میں دلی اور مراد آباد میں گرفتار اور سزایاب ہوئے۔ ۱۳۵۹ھ [۱۹۴۰ء] میں قید و بند کا ایک اور امتحان پیش آیا۔ ۱۳۶۱ھ [۱۹۴۲ء] میں ''ہندوستان چھوڑ دو'' تحریک کے حصہ دار بنے اور جیل گئے یہ آخری گرفتاری تھی، اس سے دو سال بعد ۱۳۶۴ھ [۱۹۴۴ء] میں رہائی ہوئی، پھر ۱۳۶۵ھ [۱۹۴۵ء] میں دہلی آ گئے تھے۔

ایک دلچسپ واقعہ:

اس وقت ہمارے یہاں کیسے جذبات تھے، کس قدر قربانیاں دیتے تھے اور کس طرح اپنے آپ کو ہر امتحان کے لئے پیش کر دیا کرتے تھے، اس کا ایک واقعہ سے اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ افسوس کہ اب یہ روایت ختم اور یہ سلسلہ معدوم ہو گیا:

نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی، نہ وہ خم ہے زلف ایاز میں

اس واقعہ کی پوری تفصیل خود مولانا کے قلم سے پڑھئے:

''احقر جب دہلی سے رہا ہو کر دیوبند پہنچا، جہاں والدہ صاحبہ اور احقر کے متعلقین تھے، پھر فوراً ہی مراد آباد چلا گیا، جہاں صوبہ یوپی کانگریس کمیٹی کے ڈکٹیٹر کی حیثیت سے گرفتاری کا پروگرام طے تھا، سی آئی ڈی احقر کی تفتیش میں رہی ہو گی اور ممکن ہے اس کو حیرت ہوئی ہو، جب احقر دفعۃً مراد آباد کے چوک بازار میں اس حالت میں نمودار ہو گیا، کہ ایک ہاتھ میں کانگریس کا جھنڈا تھا، دوسرے میں جمعیۃ علماء ہند کا۔

ایک عزیز دوست پنجابی سوداگر، حافظ محمد شفیع صاحب نے آگے بڑھ کر سنہرا ہار گلے میں ڈالا، جس کو احقر نے منظور کیا، کیونکہ ہار پہننے اور پہنانے کے لئے اس سے بہتر وقت کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ چند منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ حاضرین کے اجتماع نے جلوس کی شکل اختیار کر لی اور اب یہ جلوس جس کی قیادت محمد میاں کر رہا تھا، [جس کے دونوں ہاتھ اس طرح گھرے ہوئے تھے کہ ایک میں ایک جھنڈا تھا، دوسرے میں دوسرا، اور گلے میں قرآن شریف] امروہہ گیٹ کی طرف بڑھنے لگا، ابھی تقریباً ایک فرلانگ چلا تھا کہ پولیس کے دستہ نے آ کر محاصرہ کر لیا، احقر کو گرفتاری کا حکم سنا کر اپنی تحویل میں لے لیا اور مجمع کو منتشر کرنے کے لئے لاٹھی چارج شروع کر دیا، احقر

حوالات میں پہنچا تو تھوڑی دیر بعد حافظ شفیع الدین صاحب درآمد ہوئے، جرم یہ تھا کہ کانگریس اور جمعیۃ کے ڈکٹیٹر کو ہار کیوں پہنایا تھا۔

پھر ابھی انگریزی حساب سے تاریخ ختم نہیں ہوئی تھی، یعنی رات کے بارہ نہیں بجے تھے کہ مرادآباد کانگریس کے تمام سربراہان، جن کی تعداد ستر تھی گرفتار کر کے احقر کے ساتھی بنادئے گئے، چند روز مقدمہ ہوا، چھ ماہ کی سزا با مشقت کلاس سی [C] اور مشقت میں احقر اور موجودہ کیبینٹ ڈوپلمنٹ منسٹر، یوپی [داؤ دیال کھنہ] کو چکی دی گئی، جس سے چند دنوں کے بعد حکیم انظار صاحب وغیرہ کی مساعی سے نجات مل گئی او رکلاس سی [C] کے بجائے بی [B] کر دی گئی۔ (ندائے شاہی نمبر صفحہ:۳۹۳، ۳۹۴)

یہ قید سخت اور سزائیں کیسی شدید اور تکلیف دینے والی تھیں، اس تحریر کے بعد کے مندرجات سے اس کا بھی علم ہو رہا ہے، ملاحظہ ہو:

''یہ جوش وولولہ اس وقت تھا جب کہ ابھی دہلی حوالات سے رہا ہو کر آئے تھے، یہاں تکلیف ومشقت کا جو حال تھا، وہ بھی مرحوم ہی کی زبانی سنئے:

غالباً اگست کا مہینہ تھا، شدید گرمی، حوالات سب طرف سے بند، نہ روشن دان، نہ کھڑکی، صرف ایک جانب دروازہ کے دو طرف جنگلے تھے، مگر سامنے چوڑا برآمدہ تھا، جس کی وجہ سے یہ جنگلے بھی ہوا سے ناآشنا رہتے تھے، پیشاب پاخانہ کے لئے صبح کو آٹھ بجے ایک گھنٹہ کے لئے کھولا جاتا، باقی ۲۳ر گھنٹے اسی کمرہ میں بند رہتے تھے، یہیں وضو بھی کیا جاتا تھا، پانی نکلنے کی کوئی نالی نہیں تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ وضو کا پانی کمرہ ہی میں بھرتا رہا، حسن اتفاق یہ تھا کہ کمرہ میں ڈھال کافی تھا، پانی اسی ڈھال میں رہتا تھا، رفتہ رفتہ صورت یہ ہوگئی کہ کمرہ کے نصف حصہ میں پانی بھر گیا اور نصف حصہ میں ہمارے چھ یا سات ساتھیوں کے بستر تھے......... اس حبس بے جا کا اثر یہ ہوا کہ تمام ساتھیوں کو عوارض لاحق ہوگئے، احقر کو پیچش ہوگئی۔'' (ندائے شاہی نمبر صفحہ:۳۹۴)

ماہنامہ ''قائد'' مرادآباد:

مولانا محمد میاں صاحب کے فکر وخیالات اور سیاسی نظریات اوران موضوعات

وعنوانات پر تحریر ونگارش کا سب سے زیادہ طاقتور اور مؤثر اظہار، ایک ماہنامہ سیاسی مجلّہ ''قائد'' مرادآباد سے ہوا۔

مولانا نے مرادآباد قیام کے زمانہ میں ''قائد'' کے نام سے جاری کیا تھا، جو جمعیۃ علماء اور کانگریس کے نظریات کا ترجمان تھا، مولانا کے ذاتی خیالات کی جھلک بھی اس میں ملتی تھی، مولانا نے ماہنامہ ''قائد'' کو سنجیدہ تحریرات ومضامین سے سجایا اور اوراس کے علمی وقار واعتبار میں اضافہ کی کوشش کرتے رہے۔

ماہنامہ ''قائد'' کا محرم، صفر ۱۳۵۷ھ [مارچ، اپریل ۱۹۳۸ء] میں اجراء ہوا، مگر اس کے علمی مضامین اور سیاسی مباحثہ کے باوجود، اس کی بہت زیادہ عمر نہیں ہوئی، ''قائد'' ڈیڑھ سال سے کچھ زیادہ جاری رہا، اس کے کل اٹھارہ شمارے شائع ہوئے، آخری اشاعت، رجب، شعبان ۱۳۵۸ھ [ستمبر ۱۹۳۹ء] کی تھی، اسی پر یہ رسالہ بند ہوگیا، اس کے بعد کوئی شمارہ نہیں چھپا۔(۹)

تصنیف وتالیف:

درس وتعلیم، جمعیۃ علماء کی تنظیم وترقی، متواتر اسفار اور بے پناہ تنظیمی اور دفتری مصروفیات کے باوجود مولانا نے ہمیشہ تحریر وقلم سے طاقتور رشتہ استوار رکھا اور یہ رشتہ ایسا مضبوط اور سدا بہار تھا کہ جس میں نہ مدرسہ کی تعلیم رکاوٹ بنی، نہ درس واستفادہ اس سے مانع ہوا، اور نہ ہی مقدمات اور جیل کی سلاخیں اس میں رخنہ ڈال سکیں۔ مولانا کا قلم تقریباً چالیس سال تک رواں دواں رہا، جس کو مولانا نے دینی، علمی، تاریخی، سیاسی موضوعات اور ملی مسائل کی نشاندہی اوران کی گرہ کشائی کے لئے مسلسل استعمال کیا۔

مولانا محمد میاں کثیر التصانیف اور سریع التحریر مصنف تھے، مولانا کی تصانیف ومؤلفات کی مکمل فہرست میرے علم میں نہیں، لیکن تقریباً ساٹھ [۶۰] مؤلفات وکتب مطبوعہ اور متعارف ہیں۔ مولانا کے معاصرین میں ایک صاحب قلم، مفتی انتظام اللہ شہابی تھے، ان کے بارے میں ان کے احباب ورفقاء کہا کرتے تھے: ''کہ مفتی انتظام اللہ کثرت تحریر میں

لکھنے کی مشین ہیں'' میرے خیال میں مولانا کو بھی ایسی ہی مشین سے تعبیر کیا جاسکتا ہے، لیکن مفتی انتظام اللہ صاحب کی تحریر و تالیف کے علاوہ کوئی اور مصروفیت نہیں تھی، مولانا سید محمد میاں صاحب کثیر مصروفیات، اسباق، اسفار، سیاسی جدوجہد، جمعیۃ کی انتظامی وسیع خدمات اور تمام سیاسی کاموں میں شرکت ان کے مشوروں اور کاموں میں گھرے رہتے تھے۔ ایسی وسیع اور ہمہ جہت مشغولیت کے باوجود کس طرح اتنا وقت نکال لیتے تھے کہ وہ مطالعہ بھی کرلیں اور اچھی علمی کتابیں بھی لکھتے، تحریر کرتے رہے، بلاشبہ **ذلک فضل اللّٰہ یؤتیہ من یشاء.**

مولانا کا، اگرچہ مؤرخ کی حیثیت سے زیادہ تعارف ہے، لیکن مولانا کی تصانیف وتحریرات صرف تاریخی عنوانات تک محدود نہیں، مولانا نے دسیوں موضوعات پر بے شمار عنوانات کے تحت لکھا، جو توجہ سے پڑھا گیا۔ کس کس موضوع اور عنوان کا تذکرہ کیا جائے، مولانا کے قلمی آثار و باقیات میں تفسیر، حدیث، فقہ، معاشیات، ملی، سماجی مسائل، سیرت پاک صلی اللہ علیہ وسلم، سیر الصحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین، تاریخ اسلام، احوال اکابر ومجددین، تذکرہ باقیات اسلاف اور جمعیۃ علمائے ہند کی تاریخ اور خدمات کے متعدد گوشوں پر مفید تصانیف و کتب یادگار ہیں۔ چند کتابوں کا مختصر تعارف یا نام یہاں پیش کیا جارہا ہے۔

● **مرادآباد جیل میں درس قرآن کی سات مجلسیں:** یہ حضرت مولانا مدنی کے تفسیری افادات ہیں، جس کا سلسلہ حضرت مولانا مدنی نے، مرادآباد جیل میں، محرم ۱۳۶۲ھ [جنوری ۱۹۴۳ء] میں جیل کے اسیران اور احباب ورفقاء کے اصرار پر شروع کیا تھا، جو حضرت مدنی کی مرادآباد سے دوسری جیل میں منتقل ہونے کی وجہ سے صرف سات دن جاری رہ سکا۔ مولانا محمد میاں صاحب نے اس درس وتعلم کے اشارات نوٹ کرلئے تھے، جس کو برسوں کے بعد مرتب کرکے شائع کیا۔

● **سورۂ فاتحہ کی سیاسی تفسیر:** دراصل مولانا محمد میاں منصور انصاری کے افادات ہیں، جن کو مولانا نے مرتب کرکے شائع کردیا تھا۔

● ’’مشکوٰۃ الآثار‘‘ مولانا کی مشہور ومتداول تالیف ہے، جو بہت سے مدارس کے متوسط نصاب تعلیم میں بھی شامل ہے۔(۱۰)

● ’’سیرت مبارکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم‘‘ سیرت پاک کا موضوع ایسا سدابہار، کثیر الفوائد، نئے نئے عنوانات ومباحث کا ایسا موضوع ہے، جس سے نہ کبھی سیری ہوسکتی اور نہ اس کے تمام پہلوؤں کا احاطہ ممکن ہے، امت کے ہزاروں ہزار افراد نے اپنی سعادت ومحبت میں اضافہ کے لئے ہر دور میں، ہر زبان میں نئی سے نئی کتابیں لکھی ہیں، اور اس میں تازہ سے تازہ تر معلومات وتحقیقات کا اضافہ کیا ہے، اسی سلسلہ کی ایک کتاب مولانا محمد میاں صاحب کی تالیف ’’سیرت مبارکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم‘‘ [قرآن اور تاریخ کے آئینہ میں] ہے۔ مولانا نے اس کی ابتداء ایک مفصل مقدمہ سے کی ہے جس میں انسان کیا ہے، انسانیت کیا ہے، نبوت، رسالت اور وحی کی ضرورت سے پہلے انسانی استعداد او رصلاحیت کی تدریجی ترقی، انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات، اس دین کامل کی ضرورت اور تکمیل دین کے عنوانات پر اچھی اور مفصل گفتگو کی ہے، اس کے بعد اصل کتاب کا آغاز ہوا ہے، جس سے پہلے باب میں، عرب قبل اسلام پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

عربوں کے رسوم ورواج، طریقۂ حیات، سماجی، معاشرتی، قومی پہلوؤں اور ان کی زندگی کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی گئی ہے اور یہ دکھایا ہے کہ اسلام سے پہلے عربوں کا کیا حال تھا، وہ کس احوال میں رہتے اور کس نہج پر زندگی گذارتے تھے۔ یہ حصہ یا باب ایک سو دو صفحات پر مشتمل ہے اور متعلقہ عنوانات کی اچھی علمی نشاندہی کررہا ہے، اس کے بعد اصل کتاب شروع ہوتی ہے، جس میں مصنف نے سیرت پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے اکثر گوشوں اور حیات مبارکہ کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے، اور اس میں صرف واقعات کا تذکرہ نہیں بلکہ ان کے منظر، پس منظر، ان کی حکمت، مصلحتوں اور ان سے اخذ نتائج پر بھی توجہ دلائی ہے، بحیثیت مجموعی ایک بہت ہی اچھی کاوش ہے، جس کے ذریعہ سے سیرت پاک اور اسلام کی بنیادی تعلیمات کو جانا، سمجھا جاسکتا ہے۔

تحریر رواں، سلیس ہے، مصنف ایک بات کو دوسری بات سے لڑی کی طرح جوڑتے، ملاتے چلے گئے ہیں، سیرت پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حصہ چار سو چالیس صفحات پر مشتمل ہے، گویا پوری کتاب چھ سو سے زائد صفحات پر آتی ہے۔

یہ کتاب کتابستان دہلی سے، پہلی بار محرم ۱۳۹۳ھ [مارچ ۱۹۷۳ء] میں چھپی تھی۔(۱۱)

آغاز کتاب میں مصنف نے دوصفحہ کا اضافہ کیا ہے، وہ گویا اس کتاب کا خلاصہ اور روح ہے۔

● **عقیدۂ رحمۃ للعالمینی کا اثر سیاسیات عالم پر:** یہ مختصر تالیف ہے جو مولانا نے مرادآباد کے قیام میں لکھی تھی اور اسی وقت چھپی تھی، ایک اور کتاب **"آنے والے انقلاب کی تصویر"** ہے۔

● **حضرات صحابہ کرامؓ کا عہد زریں اور مثالی حکومتیں:** سیرت پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد امت کا اتفاق ہے کہ سیر الصحابہ کا مرتبہ ہے، مولانا نے اس موضوع کی اہمیت کی وجہ سے اس پر بھی خاص توجہ فرمائی تھی، مولانا نے حضرت شاہ ولی اللہ کی بہت ممتاز اور نہایت غیر معمولی تصنیف ازالۃ الخَفاء عن خلافۃ الخلفاء کا ایک توضیحی، تشریحی ترجمہ کیا تھا، جو پورا کا پورا لائق استفادہ اور لائق مطالعہ ہے۔ اس میں مولانا نے حضرت شاہ صاحب کے علوم وافادات پر نفیس نکتوں اور گوشوں کا اضافہ کیا ہے اور اس کو موضوع کی نزاکت واہمیت کے لحاظ سے مفید سے مفید تر بنانے کا خیال رکھا ہے، یہ کتاب دو بڑی جلدوں میں شائع ہوئی تھی، پہلی جلد پونے چھ سو صفحات پر ہے، دوسری جلد ساڑھے تین سو صفحات پر آئی ہے، دوسری جلد کے آخر میں تیسری جلد کی متوقع اشاعت کا تذکرہ ہے، جو غالباً چھپی نہیں۔

● **شواہد تقدس:** مولانا ابوالاعلی مودودی نے خلافت کے ملوکیت میں تبدیل ہوجانے کے اسباب پر "خلافت وملوکیت" کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی، وہ چھپی تو بہت متنازعہ اور بحث طلب نکلی، جس میں خصوصاً حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے کمزور اور بعض نازیبا باتیں لکھیں تھیں، ہندو پاکستان کے متعدد بڑے علماء اور

اہل نظر اصحاب نے اس کا علمی جائزہ لیا اور مودودی صاحب کے اعتراضات وشبہات کے جوابات لکھے، ان ہی میں سے ایک تالیف مولانا محمد میاں صاحب کی ہے، جو [حضرت عثمان غنیؓ کے] ''شواہد تقدس'' کے نام سے منظر عام پر آئی اور مقبول ہوئی۔

- اسی سلسلہ کی ایک چھوٹی کتاب ''**خلافت راشدہ**'' بھی ہے، جو سب سے پہلے ایک حصہ میں دیوبند سے چھپی تھی، بعد میں آہستہ آہستہ پورے ملک کے نصاب تعلیم میں داخل ہوگئی، بار بار چھپتی رہتی ہے۔

- **پانی پت اور بزرگان پانی پت**: بھی مولانا کی تالیفات میں سے ہے، جو اگرچہ مولانا کے علمی معیار کی تو نہیں ہے اور نہ اس کو بہت مستند شمار کیا جاسکتا ہے، مگر اس کتاب سے بعد کے لوگوں کو، مرحوم پانی پت کے مشائخ واہل کمال کا علم ہوا اور یہ جاننے میں مدد ملی کہ پانی پت کبھی کیسا زندہ اور دیکھنے، سفر کرنے کے لائق شہر تھا۔ یہ کتاب مولانا لقاء اللہ عثمانی مرحوم پانی پتی کی فرمائش پر مرتب ہوئی اور پہلی مرتبہ ۱۳۸۳ھ [۱۹۶۳ء] میں کتابستان دہلی سے شائع ہوئی تھی۔ ۳۰۸ر صفحات پر مشتمل ہے، بعد میں ہند پاکستان دونوں جگہوں سے کئی مرتبہ چھپ چکی ہے۔

- مولانا کی مؤلفات وکتب میں حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی کے احوال پر دو تالیفات ہیں، ''**مرد جلیل**'' اور ''**حیات شیخ الاسلام**'' یہ دونوں بھی کئی کئی مرتبہ شائع ہو چکی ہیں۔

مولانا سید محمد میاں کے چند اور تصنیفی کام: مولانا کی تصانیف میں دو عنوانات اور قابل ذکر ہیں، ۱۳۶۶ھ [۱۹۴۷ء] سے پہلے کے سیاسی مباحث پر تحریرات ورسائل اور اس سے جڑی ہوئی چند چیزیں اور مؤلفات! تحریک کانگریس اور جمعیۃ علماء سے وابستہ عنوانات ومسائل پر بھی متعدد رسائل اور تحریریں ہیں۔ مثلاً: ''**خطرناک نعرے اور جمعیۃ علماء کی صراط مستقیم**'' جو دہلی سے ۱۳۶۵ھ/۱۹۴۶ء میں شائع ہوئی تھی۔

- کشف الغوایۃ عن الوقایۃ، پر عادلانہ تبصرہ جو ۴۰ صفحات کی ہے، یہ

بھی دہلی سے چھپی تھی۔

- جمعیۃ علمائے ہند، کانگریس اور مسلم لیگ! ایک تعارف، تجاویز اوران کی تشریح ۴۸:صفحات [مطبوعہ: دہلی]
- جمعیۃ علمائے ہند کی شرعی اہمیت [مطبوعہ ، کمال پرنٹنگ پریس، دہلی]۱۶:صفحات
- جمعیۃ علمائے ہند ہی ناموس ملت کی محافظ ہے۔۸:صفحات
- مولانا ظفر احمد صاحب کے فتوی پر تبصرہ، شرکت کانگریس جائز ہے! [مطبوعہ: دہلی]۱۶:صفحات
- اسی سلسلہ کی ایک نسبۃً مفصل تالیف ''جمعیۃ علماء کیا ہے؟'' ہے، جو دو حصوں میں چھپی تھی، اس میں جمعیۃ علمائے ہند کے ذریعہ سرانجام خدمات کی تفصیل اور متوقع منصوبوں کا تذکرہ ہے، یہ جمعیۃ علماء صوبہ متحدہ کے شعبۂ طباعت کی پہلی کتاب ہے، جو ۱۳۶۵ھ [۱۹۴۶ء] میں چھپی تھی، اس وقت مولانا محمد میاں، جمعیۃ علماء صوبہ آگرہ کے ناظم تھے۔ بعد میں بھی ہند پاکستان دونوں جگہ سے شائع ہوئی۔
- ''علمائے حق اوران کے مجاہدانہ کارنامے'' جو شاندار ماضی کی پہلی طباعت کے آخری پانچویں حصہ کی نئی ترتیب وتوضیح ہے، اس کا تعارف شاندار ماضی کے بعد آرہا ہے۔
- **تحریک شیخ الہند**: [یا ریشمی خطوط سازش کیس] یہ انڈیا آفس لائبریری، لندن میں، برطانوی حکومت کے دور میں، ہندوستان میں برپا سیاسی تحریکات میں سے ایک تحریک، ریشمی رومال کے متعلق سرکاری محکمہ خفیہ [سی آئی ڈی] کی رپورٹ کا فائل ہے، اس رپورٹ کا رفیق عزیز بیگ صاحب نے [جو اس وقت روزنامہ الجمعیۃ کے ایڈیٹر تھے] انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا تھا، مولانا محمد میاں نے اس کو مرتب کیا، جو غالباً ۱۳۹۵ھ [۱۹۷۵ء] میں دہلی سے چھپی، یہ کتاب بڑی پیمائش کے ۳۸۴ صفحات پر مشتمل ہے۔

مگر یہاں یہ عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ یہ مطبوعہ کتاب، سی آئی ڈی

رپورٹ کا مکمل اور مسلسل ترجمہ نہیں ہے اور اس کی ترتیب بھی وہ نہیں ہے، جو اصل رپورٹ کی ہے، اصل رپورٹ کے بعض مندرجات اور اس کتاب کی اطلاعات میں اختلاف ہے، میں نے اصل رپورٹ کا عکس دیکھا ہے، یہ رپورٹ با قاعدہ مرتب اور مکمل ہو کر اصل فائل کے مطابق شائع کی جارہی ہے، اس کی اشاعت کے بعد ایسی بعض اطلاعات وتحقیقات پر نظر ثانی ضروری ہو جائے گی، جو اس کتاب کے جزوی اور نا تمام ترجمہ پر اعتماد کی وجہ سے ہوگئی ہیں۔

● یہی کتاب **''تحریک ریشمی رومال''** کے نام سے مکتبۂ محمودیہ، لاہور پاکستان سے شائع ہوئی جو کئی مرتبہ چھپ چکی ہے، مکتبہ محمودیہ نے اس کو پہلی بار جمادی الاخریٰ ۱۴۲۰ھ [اکتوبر ۱۹۹۹ء] میں شائع کیا تھا۔

● **اسیران مالٹا:** یہ تالیف حضرت شیخ الہند اور ان کے ایسے رفقائے کرام کے احوال ہیں، جو مالٹا میں حضرت مولانا کے رفیق و ہم قدم تھے۔ یہ مولانا محمد میاں صاحب کی آخری تالیف ہے، جو مولانا کی وفات کے بعد چھپی تھی، اس کی طباعت دہلی سے ۱۳۹۶ھ [۱۹۷۶ء] میں ہوئی۔

●● مولانا کی اہم علمی خدمات میں حضرت نانوتوی کی تصانیف پر حاشیے تصحیح اور ذیلی عنوانات کا اضافہ بھی ہے۔

مولانا نے حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کی دو کتابوں: **انتصار الاسلام** اور **تقریر دل پذیر** پر حاشیے لکھے اور ان پر ذیلی عنوانات کا اضافہ کیا تھا، یہ دونوں کتابیں مطبع قاسمی، دیو بند سے شائع ہوئیں تھیں، تقریر دل پذیر جو ۱۳۴۶ھ میں چھپی، تین سو اٹھائیس صفحات پر مشتمل ہے۔ انتصار الاسلام ۱۳۴۸ھ میں شائع ہوئی تھی، چھیانوے صفحات میں آئی ہے۔

● مولانا کی ایک اور مفید تحریری یادگار، جس کو با قاعدہ تصانیف میں شمار کرنا تو شاید مناسب نہ ہو، لیکن اس کی افادیت ان سب چیزوں سے بڑھ کر اور عام ہے، وہ بچوں کے لئے دینی رسائل کا نصاب، **دینی تعلیم کے رسائل** ہیں، جو ابتداء سے آٹھ درجوں تک ہیں،

اس میں بچوں کی عمر اور لیاقت کے اعتبار سے، دینی معلومات اور ذہن کے لئے اسلامی غذا کا خیال کیا گیا ہے، یہ نصاب پچاس سال سے زیادہ عرصہ سے بہت سے مدارس اور اسکولوں میں پڑھایا جا رہا ہے۔ضرورت ہے کہ اس کو عمدہ طریقہ پر سلیقہ سے نفیس و رنگین شائع کیا جائے،اسی سے اس کے افادہ کا دائرہ وسیع ہوگا، اچھی تعلیم گاہوں اور اسکولوں کے بچے بھی اس کی طرف شوق سے متوجہ ہوں گے۔

علمائے ہند کا شاندار ماضی اور اس کی ذیلی تصانیف

ہندوستان میں اگرچہ مسلمانوں میں تاریخ، تذکرہ نویسی کی روایت بہت قدیم اور لائق تحسین رہی ہے،لیکن اس میں بعض بڑے خلا بھی ہیں، جہاں پہنچ کر طالب علم اور قاری حیران رہ جاتا ہے کہ ایسا کیوں ہے، اس باب کا، اس واقعہ کا، یا اس سلسلہ کا ہمارے تذکرہ نویسوں نے کیوں تذکرہ نہیں کیا، ان کی اِدھر نگاہ کیوں نہیں گئی۔اسی میں سے ایک یہ ہے کہ اگرچہ حضرت مجدد الف ثانی [شیخ احمد بن عبدالاحد سرہندیؒ] کے احوال وخدمات اور مقام بلند پر بیسیوں کتابیں لکھی گئیں، جس میں حضرت مجدد صاحب، ان کے اخلاف اور خلفائے کرام کے حالات مل جاتے ہیں لیکن ہماری تقریباً پوری نسل اس سے ناواقف تھی، اسی طرح حضرت شاہ ولی اللہ، ان کے فرزندان والا مرتبت اور اخلاف گرامی کے احوال تو گویا مفقود ہو گئے تھے، خود شاہ ولی اللہ اور حضرت شاہ عبدالعزیز کے احوال پر ''حیات ولی'' اور ''مقالات طریقت'' (۱۲) کے علاوہ کوئی بڑا وقیع تذکرہ ، بلکہ اچھی تحریریں بھی دستیاب نہیں تھیں اور اس خانوادہ کے آخری قافلہ سالار اور ہندوستان کے بعد کے دور کے اکثر علمائے کبار اور اساتذہ ومحدثین کے مرجع سند،حضرت شاہ محمد اسحاق محدث دہلوی کی ہندوستان سے ہجرت کے سو سال بعد تک بھی، شاہ محمد اسحاق کا کوئی عمدہ تذکرہ مرتب نہیں ہوا، کوئی لائق اعتماد کتاب وجود میں نہیں آئی، اس طرح اس پورے خانوادہ کے احوال کم یاب اور ان کی خدمات کا علم محدود تھا، سب سے پہلے مولوی رحیم بخش دہلوی نے اس ضرورت اور وقت کے مطالبہ کا خیال کرتے ہوئے، حضرت شاہ ولی اللہ کی ایک سوانح، جس

میں حضرت شاہ صاحب کے اخلاف کا بھی تذکرہ ہے، ''حیات ولی'' کے نام سے لکھی تھی، حیات ولی کی تالیف کے بعد، اس کمی کا مولانا محمد منظور نعمانی نے احساس کیا اور اس کی تلافی اور مجدّد دین دین کے تذکروں کو جلا بخشنے اور برصغیر ہند میں تجدید واحیائے اسلام کی تاریخ کو مرتب اور ان کے بڑے بنیادی سرچشموں کو جوڑنے اور ان کی یادوں کو زندہ و تازہ کرنے کے لئے اپنے مؤقر مجلّہ، ماہنامہ الفرقان بریلی کا سب سے پہلے ایک شاندار نمبر حضرت مجدد الف ثانیؒ پر اور اس سے بھی وقیع تر حضرت شاہ ولی اللہ پر علیحدہ شائع کیا، (۱۳) ایسی ہی ایک اور مفید اشاعت، حضرت شاہ محمد اسماعیل شہید پر مرتب اور شائع کی تھی، ان اشاعتوں نے ہندوستان میں مجدد دین اسلام، خادمان شریعت وسنت اور رہنمایان اصلاح وتربیت کے احوال کا تذکرہ تازہ کیا، ان کی حیات اور کارناموں سے سبق لینے، ان بزرگوں کی تعلیمات پر عمل کرنے اور ان کے کاموں کو آگے بڑھانے کا اک جذبہ پیدا ہوا، اسی جذبہ اور الفرقان کے خاص شماروں نے مولانا محمد میاں کو ان موضوعات پر کام کرنے کے لئے ایک توانائی اور تحریک بخشی۔ مولانا محمد میاں صاحب نے بھی دونوں سرچشمہائے علم وعمل کے کمالات وخدمات کا جائزہ اور ان میں ایک قدر مشترک اور جدوجہد کے یکساں طریق تلاش کرنے کی جستجو بھی شامل تھی ایک مفصل کتاب لکھنے کا ارادہ کرلیا۔

مولانا محمد میاں صاحب نے اس تالیف کے لئے ایک بہت مناسب نام **''علمائے ہند کا شاندار ماضی''** تجویز کیا۔ مولانا نے اس میں تاریخ احیائے دین، خدمت اسلام، تجدید صدائے قرآن وسنت کی تقریباً چارسو سالہ تاریخ پر توجہ فرمائی اور حضرت مجدد الف ثانی کی تاریخ تجدید واحیائے دین وشریعت سے قیام دارالعلوم، دیوبند اور اس کی خدمات تک کا احاطہ کرنے کا ارادہ کیا۔

اس کتاب کو اشاعت کے کچھ ہی دنوں بعد، انگریز افسران اور سی آئی ڈی کی نگاہ میں خطرناک اور لائق سزا سمجھ کر، بحق سرکار ضبط کرلیا تھا، اس کا چھاپنا ہی نہیں بلکہ رکھنا اور پڑھنا بھی جرم قرار پایا اور خلاف قانون قرار دے کر، اس کے تمام نسخے ضبط کرلینے کا حکم جاری

ہوا، نہ صرف کتب خانہ فخریہ اور مولانا محمد میاں کے سامان سے، بلکہ اور جہاں بھی اس کے ملنے، موجود ہونے کی امید تھی، وہاں پولیس نے چھاپے مارے اور تلاشی کے بعد کتاب ضبط کرلی۔ یہ چھاپے مرادآباد کے علاوہ دلّی، بجنور، دیوبند، مظفرنگر اور سہارنپور وغیرہ میں مارے گئے تھے، سہارنپور میں شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی کا، ذاتی، تجارتی کتب خانہ بھی اس کی زد میں آیا۔ ۱۵/ذی الحجہ ۱۳۵۹ھ [۱۴/جنوری ۱۹۴۱ء سہ شنبہ] کو پولیس نے اس کتب خانہ کی تلاشی لی اور ایک نسخہ ضبط کیا۔ شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی نے اپنے روزنامچہ میں اس کی یادداشت ان الفاظ میں تحریر فرمائی ہے:

> ''تلاشی کتب خانہ زکریا، درسلسلہ ''مسلمانوں کی شاندار ماضی'' بوقت گیارہ بجے دوپہر، تین پولیس مین، وحوالگی یک نسخہ مجلد، موجودہ''

لیکن اس طباعت کے نسخے بالکل معدوم اور ناپید نہیں ہوئے تھے، کہیں کہیں موجود ہیں، ایک مکمل نسخہ ہمارے ذخیرہ کتب میں بھی ہے، چوں کہ یہ اشاعت کمیاب ہے اس لئے اس کا کسی قدر تعارف مفید ہوگا۔

یہ پہلی طباعت پانچ حصوں پر مشتمل ہے، ہر اک حصہ کا عنوان اور صفحات درج ذیل ہیں:

حصہ اول: حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی ـــــ ایک سو اکہتر [۱۷۱] صفحات

حصہ دوم: سیرت حضرت شاہ ولی اللہ صاحب وحضرت شاہ عبدالعزیز صاحب ایک سو چوراسی [۱۸۴] صفحات

حصہ سوم: الشہیدین السعیدین [یعنی سیرت حضرت سید احمد شہید وسیرت حضرت مولانا شاہ اسماعیل صاحب ودیگر مجاہدین ہند] ـــ دوسو بہتر [۲۷۲] صفحات

حصہ چہارم: علمائے ہند کی شاندار ماضی، ۱۸۵۷ء کی خونی داستاں ـــ صرف اکہتر [۷۱] صفحات

حصہ پنجم: تحریک دارالعلوم دیوبند ـــ دوسو چونسٹھ [۲۶۴] صفحات

شاندار ماضی طبع اول کی ترتیب اور مضامین، موجودہ اشاعتوں سے خاصے مختلف ہیں،

یہ پہلی طباعت پانچ حصوں پر مشتمل تھی اور پوری کتاب [پانچ حصے] ایک ساتھ یکجا چھپے تھے، جس کے چند عنوانات اور گوشے اس طرح ہیں، پہلی طباعت اور بعد کی اشاعتوں کے ابواب، مضامین کی تقدیم وتاخیر، مندرجات کی معنویت اور تحقیق، ہر ایک میں خاصا اختلاف ہے۔

موجودہ اشاعتوں کی پہلی جلد، ڈیمائی سائز کے پونے چھ سو صفحات میں ہے، یہ جلد حضرت مجدد الف ثانی کے احوال، سوانح، خدمات اور ان کے دور کے تمام سیاسی اتفاقات اور حالات، ان کے اخلاف واولاد اور اس سلسلہ پر گفتگو کرتی ہے لیکن کتاب کی ابتدائی ترتیب میں مجدد صاحب کا تذکرہ شامل نہیں تھا، جب بعد کے حصے لائق اشاعت ہو گئے، ان کا چرچا ہوا اور طباعت کی بات آئی، اس وقت جناب محمود احمد عباسی امروہوی کی فرمائش پر، ایک حصہ کا اضافہ کیا، جو پہلا حصہ قرار پایا، پہلی اشاعت کا یہ پہلا حصہ، بڑی حد تک ماہنامہ الفرقان بریلی کے حضرت مجدد الف ثانی نمبر سے لیا گیا تھا، یہ حصہ ایک سو اکہتر [۱۷۱] صفحات پر آیا تھا۔

مصنف نے اس کتاب کی حضرت شاہ ولی اللہ کے تذکرہ سے ابتدا کی تھی، اس لئے کتاب کا مقدمہ اسی دوسرے حصے کے شروع میں آیا ہے، یہ مقدمہ ''اسلام اور تمدن'' کی بحث سے شروع ہوا ہے، اسی کو مصنف آگے بڑھاتے ہوئے ہندوستان کے سیاسی پس منظر سے وابستہ کرتے ہوئے آگے بڑھے ہیں، لیکن اس وقت تک بھی مصنف کے ذہن میں اس کتاب کی تالیف کا کوئی خاص مقصد اور مندرجات کا واضح تصور نہیں تھا، اس لئے ان میں سے کسی پر توجہ کی ضرورت نہیں سمجھی، بظاہر حضرت شاہ ولی اللہ کے صرف سیاسی خیالات اور ان کی عملی ترجمانی مقصد ہے۔

علمائے ہند کی شاندار ماضی کی موجودہ اشاعتیں، پہلی طباعت سے بہت مختلف ہیں، جو کثیر ترمیمات واضافات کے ساتھ مرتب ہو کر گویا بالکل نئی کتاب بن گئی ہے۔ بعد کی طباعتوں میں سے پہلی اشاعت کا خاصا حصہ، جو اندازاً چالیس فیصد ہوگا، نکال دیا گیا اور جو اضافات ہوئے ہیں، وہ پہلی ترتیب طباعت سے کئی گنا زیادہ ہیں۔ اس کی ترتیب عنوانات

بھی الگ ہے، مباحث بھی خاصے مختلف ہیں، یعنی بعد کی خصوصاً چوتھی اشاعت، پہلی طباعت سے بڑی حد تک الگ ہے۔ بعد کی طباعتوں میں مصنف محترم نے ہراک باب کے عنوانات وموضوعات کو مستقل موضوع بنایا ہے، ہراک پر خاصی توجہ کی ہے اور کتاب کو، اپنے ذہنی تصور کے مطابق پورا کرنے کی بہترین کوشش کی ہے، موجودہ اشاعتوں میں کتاب کا نام بھی تبدیل ہوگیا، پہلے یہ نام تانیث کے ساتھ ''**کی شاندار ماضی**'' تھا، موجود طباعتوں میں درست کرکے ''**کا شاندار ماضی**'' کردیا گیا، جو اصولاً بھی درست ہے۔

فکر وخیالات میں بھی تبدیلی محسوس ہوتی ہے، کہیں کم کہیں زیادہ، اکثر عنوانات کو مؤثر وبامعنی بنانے اور ان کی گرہ کشائی میں جو کوشش کی ہے، اس سے تاریخ کے طالب علموں کو اختلاف تو ہوسکتا ہے، لیکن مؤلف کی محنت کی تحسین کرنی ہوگی۔

جناب مؤلف کی فکر میں بڑی تبدیلی کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ انہوں نے پہلی اشاعت کے آخری پانچویں حصہ ''دارالعلوم'' کو، شاندار ماضی کی نئی ترتیب سے بالکل ہی نکال دیا ہے اور اس باب کو متعدد اضافوں اور واضح ترمیمات کے ساتھ علیحدہ مرتب کرکے، اس کا نام ''علمائے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے'' رکھ دیا، صرف یہی حصہ یا کتاب دو جلدوں اور نو سو صفحات پر مشتمل ہے۔

مصنف نے شاندار ماضی کی تالیف کا، غالباً کسی خاص منصوبہ کے بغیر آغاز کردیا تھا، جب یہ کتاب پہلی مرتبہ لکھی گئی اور چھپی تھی، اس وقت اس کے ذریعہ سے ہندوستانی مسلمانوں کے دینی اور باشعور طبقہ کو ملک میں برپا ملّی سیاست، خصوصاً جمعیۃ علماء کی تحریک سے وابستہ کرنا اور اس کے لئے مجاہدہ وقربانی کا ذہن بنانا مقصد معلوم ہوتا ہے، شاید یہی وجہ ہے کہ جناب مؤلف نے اس کے آغاز میں وجہ تالیف یا اپنے مقصد تصنیف کا کچھ بھی تذکرہ نہیں کیا، یہ کتاب جیسا کہ گذشتہ سطور سے واضح ہوا، پانچ حصوں پر مشتمل تھی، جس میں سب سے بڑا اور شاید خاص حصہ آخری حصہ تھا، جس کو تحریک دارالعلوم کے نام سے موسوم ومرتب کیا گیا تھا، یہ دوسو چونسٹھ [۲۶۴] صفحات پر آیا تھا اور اس سے پہلے کا چوتھا حصہ، جو ۱۸۵۷ء

کی جدوجہد کے تذکرہ پر مشتمل تھا اور سیاسی تحریکات کے رفقاء، خصوصاً جمعیۃ علماء کے کارکنان اور ذمہ داروں کے لئے دستاویز عمل اور رہنما کی حیثیت رکھتا تھا، سب سے مختصر تھا اور صرف اِکہتّر [۷۱] صفحات میں آیا تھا۔

اگرچہ کوئی حوالہ یا ثبوت میرے سامنے نہیں، لیکن بار بار یہ خیال آتا ہے کہ مولانا نے سب سے پہلے یہی حصہ لکھا ہوگا اور بعد میں اس کی تکمیل کے لئے تیسرا اور دوسرا حصہ لکھا گیا، کیونکہ مولانا نے سیاسی خیالات کی جو ترجمانی پانچویں حصہ کی تمہید میں کی ہے اور حصوں کے ابتدائی صفحات میں اس کا نشان نہیں ملا اور شاید تصنیف کی اس الٹی ترتیب کی وجہ سے، کتاب پر کوئی باقاعدہ مقدمہ یا وجہ تالیف بھی شامل نہیں ہے۔ یہ وضاحت آچکی ہے کہ مولانا نے اس کی ابتداء حضرت شاہ ولی اللہ سے کی تھی اور اسی پر کتاب کو مکمل کر دینے کا خیال تھا، مگر امروہہ کے ایک معروف فاضل، محمود احمد عباسی صاحب کے توجہ دلانے پر اس حصہ کی تالیف وترتیب عمل میں آئی، جو حضرت مجدد الف ثانی کے تذکرہ پر مشتمل ہے، جو پہلی اشاعت میں پہلے حصہ کے نام سے شامل ہے، مگر مصنف نے کہیں بھی اس کتاب کی وجہ تالیف نہیں لکھی، وہ اس کے ذریعہ سے کیا بات کہنا اور کیا پیغام پہنچانا چاہتے ہیں، اس کی بھی کچھ وضاحت نہیں کی، یہی نہیں کہ مؤلف نے کتابی طور پر اشاعت کے وقت ابتدائی صفحات میں اس کا کچھ تذکرہ نہیں کیا، بلکہ اس اشاعت میں جو پانچ حصے شامل ہیں، ان میں سے کسی پر بھی مقصد تالیف، طریقۂ تالیف، مختلف حصوں میں قدر مشترک اور ان میں درج کئی صدیوں کے اکابر وعلماء اور قائدین کا انتخاب، کس مناسبت سے کیا گیا ہے اور ان کے کاموں میں باہم کیا تناسب اور ترتیب ہے۔ اگرچہ پڑھنے والے اپنے طور پر اس سے کچھ مقاصد اخذ کر لیتے ہیں، لیکن مصنف سے جس رہنمائی اور اتحاد مقصد کی امید کی جاتی ہے، وہ اس کتاب میں کہیں درج نہیں ہے۔

● اگرچہ مؤلف پہلی اشاعت میں اس اہم ضرورت پر توجہ نہیں کر سکے تھے، تو اس کا بہت موقعہ اور گنجائش تھی کہ وہ آخری مکمل اشاعت کے وقت، اپنے مقصد تصنیف، اپنی

ترجیحات اور تالیف میں تذکرہ وتعارف کے لئے، منتخب اصحاب کی ترتیب وتعیین پر کچھ روشنی ڈالتے اور کتاب کے پیغام اور مقصد تالیف کو آغاز کتاب میں ہی منقح فرمادیتے، کہ بعد کی تمام بحثیں، عنوانات اور جلدیں اس سے جڑتی چلی جاتیں، مگرافسوس کہ ایسا نہیں ہوا۔

- یہ اس لئے بھی بے حد ضروری تھا کہ پہلی طباعت اور آخری طباعت میں بہت بڑا فرق اور ایک خاص فاصلہ ہے، ایسا کیوں ہوا، مصنف نے بعد کی طباعت میں جو کمی زیادتی اور ترمیمات کیں، اس پر کچھ روشنی ڈالنی چاہئے تھی اور جو اضافے کئے، ان کی افادیت کا تذکرہ بھی ضروری سا تھا۔

- پہلی اور آخری طباعت کی ترتیب ابواب اور عنوانات میں بھی ترمیمات اور کثیر تبدیلیاں واضح ہیں، پہلی طباعت میں حصہ اول، جس میں حضرت مجدد الف ثانی کا تذکرہ کیا گیا تھا، صرف ایک سوا کہتّر [۱۷۱] صفحات تھے، جو آخری نظر ثانی والی طباعت میں پونے چھ سو [۵۷۶] تک پہنچ گئے ہیں۔ آخری طباعت کا ناپ بھی پہلی طباعت سے بڑا ہے، اگر اس کو پہلی طباعت کے سائز اور کتابت میں لکھا جائے تو غالباً ساڑھے آٹھ سو [۸۵۰] صفحات ہوجائیں گے۔

- دوسرا حصہ، جو پہلی طباعت میں شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالعزیز کے عنوان سے شامل تھا، ایک سو چوراسی [۱۸۴] صفحات پر آیا تھا، لیکن نئی طباعت میں یہ حصہ اور عنوان موجود ہی نہیں، جلد دوم کا عنوان ''مسلمانان برصغیر اور تحریک آزادی'' ہے، جس میں صرف بتیس ۳۲ رصفحات شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک کو دئے گئے ہیں، اور تقریباً پچاس صفحوں پر شاہ عبدالعزیز کی سیاسی زندگی اور خدمات (۱۴) اور شاہ عبدالعزیز کے بعد تحریک سید احمد شہید کے اختتام تک، تقریباً پونے چار سو صفحات میں تحریک سید احمد شہید اس کے ممتاز رفقاء، شاہ اسماعیل شہید اور مولانا عبدالحی وغیرہ کا مختصر تذکرہ ہے، اس پوری جلد کی بھی ترتیب پچھلی جلد سے یکسر مختلف ہے، اس میں مولانا محمد میاں صاحب نے انقلابی پروگرام، عارضی حکومت، جنگی اقدامات اور اس کے لئے برپا تمام کوششوں کو، ہندوستان کی سیاسی تحریکات

خصوصاً کانگریس اور جمیعۃ علماء کا پہلا قدم دکھانے کی کوشش کی ہے، یہاں شاندار ماضی کی پہلی طباعت اور موجودہ طباعتوں میں ایسا بڑا اختلاف ہے کہ جس کی کوئی تاویل وتوجیہ مشکل ہے۔ اس لئے یہ خیال برمحل ہوسکتا ہے کہ یہ دونوں کتابیں، الگ الگ مقاصد کے لئے لکھی گئی تھیں۔ پہلی طباعت میں ایک عنوان بلکہ جلد سوم کا تقریباً ایک چوتھائی حصہ ''معرکۂ بالاکوٹ سے قیام دارالعلوم دیوبند تک'' کی بحث پر مشتمل ہے، لیکن نئی طباعت میں اس کا ذرا کوئی تذکرہ نہیں، اس کے بعد ہی تیسرا حصہ شروع ہوجاتا ہے، جس میں مصنف نے ''علماء صادق پور'' کی خدمات اور قربانیوں پر روشنی ڈالی ہے اور اس کو تحریک حضرت شاہ ولی اللہ کا دوسرا دور قرار دیا ہے، اس عنوان کے تحت جو کچھ لکھا گیا، اس میں سے کچھ بھی پہلی طباعت میں شامل نہیں تھا، گویا یہ حصہ اور اس سے پہلا حصہ جو حضرت شاہ ولی اللہ کے احوال پر مشتمل ہے، دونوں اشاعتوں میں الگ الگ مقاصد کی ترجمانی کرتے ہیں، وہاں بات کچھ اور تھی، یہاں بات کچھ اور ہے۔

- شاندار ماضی، طبع اول کا چوتھا حصہ صرف اکہتّر [۷۱] صفحات پر آیا ہے اور چوتھی جلد کی نئی طباعت پانچ سو بارہ [۵۱۲] پر ہے، پہلی کتاب کے سائز اور ناپ کے لحاظ سے اندازاً سات سو صفحات پر مشتمل ہے یعنی تقریباً دس گنا اضافہ ہوا ہے۔
- آخری پانچویں حصہ کا عنوان ''تحریک دارالعلوم، دیوبند'' تھا، یہ پانچواں حصہ نئی طباعتوں میں شامل نہیں۔
- پرانی اور نئی طباعتوں میں ایک واضح فرق یہ ہے کہ پہلی طباعت میں مؤلف کے مراجع بہت محدود ہیں، جلد اول جو بعد میں شامل کی گئی [جس میں حضرت مجدد الف ثانی کے احوال ہیں] کا بڑا حصہ، ماہنامہ الفرقان بریلی کے مجدد الف ثانی نمبر پر مبنی ہے، اس کے علاوہ ذرائع اطلاعات کا بہت کم تذکرہ ہے۔ اسی طرح آخری جلد [تحریک دارالعلوم دیوبند] میں گنتی کی چند کتابیں مصنف کے سامنے ہیں، جس میں بنیادی اہمیت مولوی طفیل احمد منگلوری کی ''حکومت خود اختیاری اور روشن مستقبل'' کو ہے، درالعلوم کے حالات کے لئے،

ماہنامہ القاسم، دیوبند کے چند شماروں اور دارالعلوم نمبر کو بنیاد بنایا گیا ہے، چوں کہ پانچویں حصہ کا ایک خاص عنوان شیخ الہند کی تحریک اور سیاست بھی ہے، اس لئے سفر نامۂ شیخ الہند سے بھی خاصا استفادہ ہوا ہے، دیگر ذرائع سے بہت کم استفادہ اور رجوع ہوا ہے، لیکن آخری طباعت کی صورت حال خاصی مختلف ہے، اس کے لئے مصنف نے کئی سال تک وسیع مطالعہ کیا، اور اُسے نئے انداز میں لکھنے کی کوشش کی ہے۔ مصنف کی جمعیۃ علمائے ہند سے جو جذباتی وابستگی اور کانگریس پارٹی سے جو گہرا، غیر معمولی اور قلبی تعلق ہے، وہ اس میں بھی جگہ جگہ چھلکتا نظر آتا ہے اور مؤلف اپنے نظریہ سے مجبور ہوکر، ان دونوں کی ہر ایک کڑی کو، تاریخ ماضی سے ملانے کی کوشش کرتے ہیں، جس کی تاریخ فی الحقیقت تصدیق ہی نہیں کرتی۔ (۱۵)

اس کتاب کی پہلی اور موجودہ طباعتوں میں مصنف کے مقاصد، مضامین کی ترتیب، تغیر، حذف واضافہ اور دونوں طباعتوں کے مختلف اتفاقی، اختلافی پہلوؤں پر بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے، جس کی ان مختصر صفحات میں گنجائش نہیں ہے، یہ ایک مفصل مقالہ یا علیحدہ مستقل کتاب کا موضوع ہے، بہر حال میرے ناچیز خیال میں شاندار ماضی کو ایک اجتماعی تذکرہ تو کہا جاسکتا ہے، مگر متعلقہ شخصیات وادوار پر معتبر ماخذ اور دستاویز قرار دینا بہت مشکل ہے۔

مولانا محمد میاں صاحب نے کتاب کی پہلی اشاعت میں جو پانچواں حصہ شامل کیا تھا، وہ موجودہ اشاعتوں میں نظر نہیں آتا، بلکہ اس کا حوالہ ونشان بھی موجود نہیں، مولانا نے اس حصہ کو شاندار ماضی سے علیحدہ کر کے ایک نئی کتاب کی صورت میں مرتب کیا اور اس کو ''علماء حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے'' کے نام سے دو جلدوں میں شائع کیا، اس میں اضافات کی کثرت کا اسی سے خاصا اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ طبع اول میں شامل حصہ پنجم، دوسو چونسٹھ [۲۶۴] صفحات پر مشتمل تھا اور بعد میں جب اس کو ''علماء حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے'' کے نام سے شائع کیا گیا، تو یہ دو جلدوں اور تقریباً نوسو سے زائد صفحات کی کتاب بن گئی تھی،

جس میں مؤلف نے اول تو ۱۹۲۰ء سے ۱۹۴۷ء تک برپا، جمعیۃ علماء کی سیاسی تحریک کو تاریخ دارالعلوم کا ایک حصہ شمار کرایا ہے اوراسی سے یہ بھی تأثر ملتا ہے کہ برصغیر میں ہندی ملت اسلامیہ کے وہ سینکڑوں علماء، قائدین اور رہنما، جس میں بہت سے علم وفضل میں ممتاز، شریعت وطریقت میں نمایاں فکر وتدبر اور غیرت وبصیرت کی مثال تھے اور جو اپنی اپنی جگہ جمعیۃ علماء کے علاوہ مختلف دینی، قومی، سیاسی خدمات انجام دے رہے تھے، وہ سب یک لخت علماء حق سے خارج تھے؟ میرے خیال میں ایسا نہیں ہے، جمعیۃ علماء ہند کے نظریہ سے اتفاق واختلاف اور شیخ الہند کی قیادت میں یا ان کے اصولوں کے مطابق کام کرنا یا نہ کرنا ایک الگ بات ہے، مگر اس کی وجہ سے نہ کوئی اہل حق میں شمار کیا جاسکتا ہے اور نہ اس کا اہل حق سے خارج کرنا درست ہے، اس لئے اس کتاب کا نام عجیب سا معلوم ہوتا ہے، اس کا نام:

جمعیۃ علماء ہند کی زیر قیادت ملی، سیاسی خدمات اور
قربانیاں دینے والے اصحاب اوران کے کارنامے

ہونا چاہئے تھا۔

ملک میں بہت سی تنظیمیں اور بے شمار اصحاب واہل علم ودانش اپنی جماعتوں اور مقاصد کے تحت جدوجہد کررہے تھے اوران میں سے کئی ایک کو، اگرچہ جمعیۃ علماء کے طریقۂ کار سے اتفاق نہیں تھا، لیکن پھر بھی اس کے کاموں میں جزوی شرکت رکھتے تھے، ظاہر ہے کہ یہ فکر کا اورطریقۂ کار کا اختلاف ہے، حق وباطل کی علامت نہیں ہے۔ (☆)

(☆) ''علماء حق'' کے بارے میں حضرت مولانا نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے یہ ایک مخصوص فکر کا اظہار ہے۔ میں نہایت ادب کے ساتھ یہ کہنا چاہوں گا کہ مولانا محمد میاں صاحب نے کہیں یہ دعویٰ نہیں کیا ہے کہ میں نے ''اس کتاب میں علماء حق کا استیعاب کیا ہے، یا یہ کہ جن کا ذکر اس میں نہیں ہے وہ علماء حق میں شامل نہیں ہیں۔'' اس کے بعد اس سے یہ سمجھنا کہ جن لوگوں کا اس میں ذکر نہیں ہے کیا وہ علماء حق میں نہیں تھے، قرین انصاف نہیں ہے۔

یہاں یہ بھی عرض کر دینا چاہئے کہ مولانا محمد میاں صاحب نے اس تالیف میں واقعات اور ترتیب سیاست کو اس طرح بیان کیا ہے، جس سے صرف جمعیۃ کی بعض خدمات کا تعارف ہوتا ہے، اس جدوجہد میں اوروں کا کیا حصہ تھا اور جمعیۃ علماء کے ذریعہ سے جو کام ہوئے ملت کے اس دور اور سیاست کے لمبے سفر میں دوسروں کا کیا تعاون رہا اور اس تاریخ کے کتنے موڑ ایسے ہیں کہ جن کی تعیین ونشاندہی میں اور لوگ بھی کچھ کم اور دوسروں سے پیچھے نہیں تھے، اس لئے تقریباً پینتالیس سالہ سفر، خدمات، قربانیوں اور کاموں کو صرف جمعیۃ کا کام اور امتیاز قرار دینا مشکل ہے، بات صرف اتنی ہے کہ وہ لوگ، ان کی جماعتیں وتنظیمات ۱۹۴۷ء کے بعد کمزور یا معدوم ہوگئیں، جمعیۃ علماء باقی رہی اور کام کرتی رہی لیکن اس وجہ سے اور ملی خادموں اور قائدین کو بالکل نظر انداز کر دینا، ان کے کاموں کو یکسر غلط سمجھنا یا فراموش کر دینا، کس طرح منصفانہ عمل ہوسکتا ہے؟ اس لئے اس کتاب کو بھی جمعیۃ کی تاریخ کے ایک حصہ کے طور پر دیکھنا چاہئے ملت کی مجموعی خدمات کا نہ اس میں تذکرہ ہے اور نہ غالباً مؤلف کا مقصد تھا۔

اور یہ بھی ایک عجیب بات اور ہے کہ جمعیۃ علماء کے سفر میں جو متعدد بڑے علماء اور ملی رہنما، ہم نوا اور شریک سفر رہے، مگر بعد میں کسی وجہ سے جمعیۃ سے دور ہوگئے، حالاں کہ جمعیۃ میں رہتے ہوئے انہوں نے بڑی خدمات انجام دیں تھیں، مؤلف محترم مولانا محمد میاں صاحب نے ان کے نام لینے سے بھی احتیاط برتی ہے، اس کتاب کے مرتب اور کانگریس کے نہایت پرجوش اور جذباتی ہم نوا ڈاکٹر ابوسلمان صاحب شاہجہاں پوری (۱۶) نے بھی اس کتاب ''مجاہدانہ کارنامے'' میں مولانا محمد میاں کی بعض فروگذاشتوں پر تنبیہ کی ہے، اسی سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مولانا کی اس تالیف میں کتنے سقطات، فروگذاشتیں اور بے اعتدالی ہوگئی ہے، اس کو ایک جذباتی خراج عقیدت کہہ سکتے ہیں، تاریخ قرار دینا زیادتی ہوگی۔

شاندار ماضی کی ترمیم وتوسیع والی اشاعت علمائے حق کو ابوسلمان شاہجہاں پوری صاحب نے اپنے معمول کے مطابق تفصیلی حواشی اور اضافوں کے ساتھ مرتب کیا جو تقریباً

چھ سو [۵۸۳] صفحات پر ۱۴۲۵ھ [۲۰۰۴ء] میں کراچی سے چھپی تھی، جس کا عنوان ہے:

علمائے ہند کا شاندار ماضی۔جلد پنجم

المعروف بہ

علمائے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے

یہ اور اس طرح کے کئی پہلو ہیں، جو اس کتاب کے مطالعہ کے وقت سامنے آتے ہیں اور اس سے رجوع کرنے والوں کو بھی ان پر نگاہ رکھنی چاہئے۔

کتاب کو دیکھ کر، پڑھ کر بعض لوگوں کا یہ تبصرہ یاد آتا ہے، جس کو معذرت کے ساتھ نقل کر دینے میں کوئی حرج نہیں کہ مولانا بعض مرتبہ مؤرخ نہیں وکیل بن جاتے ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ کا دور، مغل سلطنت کے زوال وتنزل کا دور تھا، جس میں ہر طرح کی دینی، اخلاقی برائیاں اور سماجی بگاڑ اپنے عروج پر تھا، سیاسی گروہ بندیوں اور خودغرضی کا دور دورہ تھا، مولانا محمد میاں صاحب نے ''شاندار ماضی'' کی آخری جلدوں کی نئی ترتیب وتالیف کے لئے، جب اس عہد کی تاریخ کا مفصل مطالعہ کیا تو یہ خیال ہوا کہ امت کے اساطین وعلماء کی حکایت عروج کے ساتھ، اس داستان زوال کا بھی تذکرہ ہونا چاہئے۔اس خیال سے مولانا نے مغلوں کے آخری دور کی روداد بھی لکھنی شروع کردی تھی، جس کا مولانا نے ''شاندار ماضی'' کی پہلی طباعت میں کئی جگہ ''داستان بربادی'' کے نام سے تذکرہ کیا ہے، مگر بعد میں اس کتاب کو ''ہندوستان شاہان مغلیہ کے عہد میں'' کے عنوان سے مکمل کیا، یہ کتاب مکتبہ برہان، دہلی سے چھپی، پیش نظر دوسری اشاعت ہے، جو شعبان ۱۳۹۸ھ [جولائی ۱۹۷۸ء] کی ہے۔

عرض مزید: علمائے ہند کا شاندار ماضی دسویں صدی ہجری کے تیرہویں صدی ہجری تک تجدید واحیائے اسلام اور اس کے ممتاز ترین رجال کار کی تاریخ ہے، جس کا آغاز حضرت مجدد الف ثانی سے ہوا اور اختتام دارالعلوم دیوبند کے مؤسسین اور رہنماؤں

پر ہوتا ہے۔ مولانا محمد میاں صاحب نے تاریخ، تجدید اور دعوت و اتباع سنت و شریعت کے علاوہ بھی ان سب کے احوال میں ایک قدر مشترک تلاش کرنے کی کوشش کی ہے، جو ان کی سیاست اور میدان عمل میں مجاہدانہ کردار سے عبارت ہے، لیکن اس کو پڑھنے والا تاریخ کا طالب علم یہ سوچنے پر مجبور ہوتا ہے کہ کیا یہ پوری ترتیب اسی طرح تھی جس طرح مصنف شاندار ماضی نے بیان کی ہے، کیا ماضی کا اپنے مستقبل سے رشتہ اسی طرح جڑا ہوا تھا، یا ان کے طریق کار، مقاصد اور ترتیب عمل میں کچھ فرق اور اختلاف تھا۔ اور کیا ۱۹۴۷ء سے پہلے کے سیاسی عمل، کانگریس پارٹی اور بعض نئی مذہبی، سیاسی تنظیمات حقیقت میں تحریک مجدد الف ثانی، فکر ولی اللّٰہی اور جماعت مجاہدین بالاکوٹ کا تسلسل تھیں، کیا واقعۃً ان جماعتوں اور تنظیموں نے ان مقاصد اور مطالبات کو کسی درجہ میں پورا کیا، جس کا ان بزرگوں اور اکابرین ملت اسلامیہ ہندیہ نے ارادہ کیا تھا، اس پہلو سے دیکھئے تو مولانا محمد میاں صاحب کی کتابوں میں ایک بڑی کمی اور واضح خلا محسوس ہوتا ہے اور کہا جاسکتا ہے کہ ہمارے ماضی قریب کا ماضی بعید سے بہت گہرا رشتہ نہیں رہا، ہر چند کہ ان میں ایک تناسب و یکسانیت ہے مگر راہ اور مقاصد کا تفاوت، ایک ایسی بڑی واضح حقیقت ہے جس کو تاریخ کا واقف اور دیانت دار طالب نظر انداز نہیں کرسکتا لیکن اس کے علمی، فنی تجزیہ کی ضرورت بہرحال باقی ہے:

مردے از غیب بیروں آید و کارے بکند

والحمدللّٰہ اولاً و آخراً

نورالحسن راشد کاندھلوی

۸؍ جمادی الاول ۱۴۴۰ھ

☆☆☆☆☆

(۱) معلومات وتفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو:

[تذکرہ سادات رضویہ، دیوبند ـــــ مؤلفہ: جناب سید محبوب رضوی] [دیوبند: ۱۳۹۴ھ۔ ۱۹۷۴ء]

(۲) **ضروری بات:** یہ بات اس خانوادہ کے افراد کے لئے شاید نئی ہوگی کہ سید محمد ابراہیم صاحب کے ایک فرزند سید عظیم الدین، دیوبند سے ترک وطن کر کے کاندھلہ آ گئے تھے اور ان کی اولاد کاندھلہ میں وارد

وآباد ہے، جس کا کچھ اشارہ سید محبوب رضوی نے ''تذکرہ سادات رضویہ'' میں صفحہ:۲۲ کے حاشیہ پر کیا ہے، اور راقم کے ذخیرہ میں دیوبند کے ایک ممتاز فاضل، مولانا اشتیاق احمد صاحب دیوبندی مُکمِّل ترجمہ ازالۃ الخفاء وغیرہ کے قلم کی ایک تحریر موجود ہے، جس میں اس کی تفصیل لکھی ہے۔ بعض اور معلومات کے لئے دیکھئے: تاریخ دیوبند۔ سید محبوب رضوی ص:۹۴ تا ۱۱۰[طبع دوم ۱۳۹۲ھ دیوبند] نیز تحقیق الانساب مؤلفہ: محمود احمد عباسی [طبع جدید ۲۰۱۷ء امروہہ]

(۳) شجرہ کی تفصیلات کے لئے دیکھئے: تذکرہ سادات رضویہ دیوبند، تالیف: جناب سید محبوب رضوی۔ ص:۲۳و۲۵

(۴) ماہنامہ ندائے شاہی مرادآباد کا مدرسہ شاہی نمبر۔ مرتبہ: مولانا مفتی محمد سلمان منصور پوری صفحہ:۳۸۶ [مطبوعہ: نومبر، دسمبر ۱۹۹۲ء]

(۵) متعدد تحریرات ومضامین میں یہ ۱۹۲۷ء لکھا ہے جو بظاہر سہو کتابت ہے، مارچ ۱۹۲۸ء کی، مولانا نے اپنی خودنوشت میں صراحت کی ہے۔ [نور]

(۶) ندائے شاہی کا شاہی نمبر، ص: ۳۸۷

(۷) مکرمی مولانا ذکاوت حسین امروہوی، استاذ مدرسہ امینیہ نے محنت کر کے مولانا محمد میاں صاحب سے مدرسہ امینیہ میں حدیث شریف خصوصاً صحیح بخاری پڑھنے والے طلباء کی فہرست بنائی ہے، یہ اطلاع اسی پر مبنی ہے۔ (مولانا ذکاوت حسین صاحب کا مقالہ اس مجموعہ میں شائع ہو رہا ہے۔ ''مولانا محمد میاں صاحب اور مدرسہ امینیہ''۔ ضیاء الحق خیرآبادی)

(۸) ندائے شاہی کا، مدرسہ شاہی نمبر، ص: ۳۸۸۔ (یہ فتاوے اب تک شائع نہیں ہو سکے ہیں، ضیاء الحق)

(۹) قائد کے اکثر شمارے ہمارے ذخیرہ، مفتی الٰہی بخش اکیڈمی کاندھلہ کی لائبریری میں موجود ہیں، مکمل فائل مولانا ضیاء الحق خیرآبادی نے جمع کر لیا ہے، راقم سطور نے بھی مولانا ضیاء الحق کی معلومات سے استفادہ کیا ہے۔

(۱۰) مولانا نسیم احمد غازی صاحب نے اس کی اردو میں مفصل شرح لکھی ہے اور بعض لوگوں نے اس پر تخریج وتعلیق کا کام بھی کیا ہے۔ (شرح کا نام ''مرآۃ الانوار'' ہے، یہ تین جلدوں میں مکتبہ نسیمیہ سرائے پختہ مرادآباد سے شائع ہوئی ہے۔ ضیاء الحق خیرآبادی)

(۱۱) اس کتاب کا وہ نسخہ جو مصنف نے اپنی تحریر کے ساتھ، مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی صاحب کو پیش کیا تھا، میں نے دیوبند میں مسجد رشید کے برابر میں، سڑک پر ردی میں فروخت ہو رہی کتابوں میں سے خریدا تھا۔

(۱۲) **مقالات طریقت**: حضرت شاہ عبدالعزیز کے واقعات وقصص کا مجموعہ ہے، جس کی اکثر روایات

مولانا عبدالقیوم بڈھانوی سے سنی ہوئی ہیں، اس کو عبدالرحیم ضیاء حیدرآبادی نے مرتب کیا تھا، پہلی طباعت ۱۲۹۱ھ میں حیدرآباد، دکن سے شائع ہوئی تھی، حال میں پاکستان سے چند اضافوں کے ساتھ چھپی ہے۔

''**حیات ولی**'' حضرت شاہ ولی اللہ کے احوال وکمالات پر مشتمل، مولوی رحیم بخش دہلوی کی تالیف ہے، ہندوپاکستان سے کئی مرتبہ شائع ہو چکی ہے۔

(۱۳) مجددالف ثانی نمبر کی اشاعت ۱۳۵۷ھ [۱۹۳۸ء] میں ہوئی یہ دوسو اٹھاسی [۲۸۸] صفحات پر مشتمل ہے اورشاہ ولی اللہ نمبر ۱۳۵۹ھ [۱۹۴۰ء] میں اشاعت پذیر ہوا، جو چارسو آٹھ صفحات [۴۰۸] پر مشتمل ہے۔

(۱۴) حضرت شاہ عبدالعزیز کی سیاسی خدمات کیا کیا ہیں، ان کا کوئی واضح تذکرہ نہیں آیا، صرف ایک فتوے کی بات کی گئی ہے، جس کا صحیح پس منظر آج تک معلوم ودریافت نہیں۔

(۱۵) یہ بات جو پڑھنے والوں کو حیرت میں ڈالتی ہے کہ مولانا محمد میاں صاحب، حضرت شاہ ولی اللہ کی ایمانی، اسلامی کوششوں سے ۱۸۵۷ء کی داستان قربانی وجانبازی تک، ہر ایک کو صرف انڈین نیشنل کانگریس [مولانا اسی طرح لکھتے ہیں] کے مقاصد کی تیاری اور ملک کی سیاسی جدوجہد کے ایک حصہ کے طور پر دیکھتے ہیں، میرے ناچیز خیال میں یہ بڑی زیادتی ہے، اوران حضرات کے بلند نظریات اور شہداء کے خون لالہ رنگ کی توہین ہے۔

پتہ نہیں ہمارے بعض مؤرخین یہ بات کیوں بھول جاتے ہیں کہ کانگریس پارٹی کی ابتدا تو بمبئی کے انگریز کمشنر مسٹر ہیوم [ ] نے ۱۸۸۵ء میں کی تھی اوراس کا مقصد پورے ملک سے ہندو، مسلمان، سکھ اور پارسی وغیرہ دانشوروں کو جمع کرکے، اس ملک کے اندرونی حالات پر بحث کرنا اورایسی تجویزیں منظور کرنا تھا کہ جس سے انگریزی حکومت مستحکم ہو، کانگریس اس وقت حرکت وسیاست میں آئی تھی، جب خلافت تحریک برپا ہوئی اوراس کی جدوجہد نے پورے ملک کو ہلا دیا تھا، اس وقت کانگریس نے کروٹ لی اوراپنے خاص مقاصد کے لئے پرانا چولا اتار کر، نئے لباس میں میدان سیاست میں آئی تھی۔ تفصیلات کے لئے دیکھئے: تواریخ کانگریس [ڈاکٹر پٹابھائی۔ سیتارامیہ]

(۱۶) جو کانگریس وجمعیۃ کے اختلاف کرنے والے تمام اصحاب کو، جس میں بڑے بڑے علماء، ائمہ اور رجال کار بھی ہیں، آخری درجہ کا [توبہ توبہ] گمراہ، نالائق اور انگریزوں کا ایجنٹ سمجھتے ہیں، ان سب کے لئے کسی حرف خیر کی بھی شاہ جہاں پوری صاحب کے یہاں گنجائش نہیں۔ (یہ مقالہ نگار کے اپنے احساسات وخیالات ہیں جن سے اختلاف کی پوری گنجائش ہے۔ مرتب)

مولانا سید محمد میاں دیوبندیؒ اور
''علمائے ہند کا شاندار ماضی''

(ایک سرسری جائزہ)

(ڈاکٹر) عبید اقبال عاصم علی گڑھ

دیو بند نے آزادی کی تحریک میں جن جیالوں کو پیدا کیا ان میں ایک نام مولانا سید محمد میاں دیو بندیؒ کا بھی ہے جو ۱۲؍رجب ۱۳۲۱ھ مطابق ۴؍اکتوبر ۱۹۰۳ء کو دیو بند کے محلّہ سرائے پیرزادگان میں پیدا ہوئے۔ آپ سید ابراہیم بندگی علیہ الرحمہ (جو سرائے پیرزادگان کے بانی بھی تھے) کے خانوادے سے تعلق رکھنے والے سید منظور محمد عرف اچھے میاں کے فرزند تھے۔ آپ کے والد صاحب محکمہ آب پاشی (جسے محکمۂ نہر کہا جاتا تھا) میں ملازمت کے باعث بلند شہر ضلع کے مختلف گاؤں میں رہے، اس لئے آپ کی پرورش انھیں دیہاتوں میں ہوئی۔ جب آپ کی تعلیم کا مسئلہ درپیش ہوا تو آپ کو والدہ کے ساتھ دیو بند بھیج دیا گیا۔ اس سے قبل آپ مختلف حضرات اور اپنی والدہ سے قرآن کریم پڑھ چکے تھے۔ ۱۹۱۶ء میں دیو بند پہنچنے کے بعد آپ کو دارالعلوم دیو بند میں داخل کر دیا گیا جہاں نو سال کی مسلسل محنت و ریاضت کے بعد آپ نے ۱۳۴۳ھ مطابق ۱۹۲۵ء میں سند فراغت حاصل کی۔ آپ علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے خاص شاگردوں میں تھے۔ علامہ کے حکم کے مطابق تعلیم سے فراغت کے بعد آرہ (بہار) کے ایک مدرسہ میں تدریسی فرائض انجام دینے لگے لیکن یہاں پر آپ کی دل جمعی اس لئے نہیں ہوسکی کہ وہ ایک سرکاری امداد یافتہ اسکول تھا، جو دارالعلوم دیو بند کی فکر سے ہم آہنگ نہیں تھا۔ چند سال آرہ میں تدریسی فرائض انجام دینے کے بعد آپ مدرسہ قاسمیہ

شاہی مراد آباد سے وابستہ ہوگئے اور یہاں کے شیخ الحدیث حضرت مولانا فخر الدین صاحبؒ کی معیت میں نہ صرف درس و تدریس بلکہ ہندوستان کو انگریزوں کے دامِ چنگل سے نجات دلانے والی تحریک آزادیِ ہند کے ساتھ ساتھ جمعیۃ علماء ہند میں شامل ہوگئے۔ شبانہ روز محنت کے نتیجے میں محض ایک سال بعد ہی آپ کو مراد آباد ضلع کی جمعیۃ علماء کا نائب سیکریٹری منتخب کیا گیا، جسے آپ نے نہایت ذمہ داری کے ساتھ نبھایا۔ ۱۹۲۹ء میں جمعیۃ علماء ہند نے شاردا ایکٹ کی تحریک چلائی تو مولانا نے پوری سرگرمی سے اس میں حصہ لیا، اس کے بعد اپنے پیرومرشد مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کی اجازت سے انڈین نیشنل کانگریس کا دامن تھاما اور باقاعدہ آزادی کی تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگے۔ آپ کی انتھک جدو جہد کے نتیجے میں پورے مراد آباد میں تحریک آزادی میں لوگ جوق در جوق جڑنے لگے۔ آپ کی بڑھتی سرگرمیوں کو دیکھ کر مولانا فخر الدین صاحب کے ساتھ مولانا محمد میاں کو بھی قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں۔ آپ دونوں حضرات کو ایک سال کی سزا تجویز کی گئی تھی مگر گاندھی، اروِن سمجھوتے کے نتیجے میں ساڑھے پانچ ماہ بعد ہی مارچ ۱۹۳۰ء میں آپ دونوں کو جیل سے رہائی مل گئی۔

گول میز کانفرنس کی ناکامی کے بعد نئے وائسرائے لارڈ لنگڈن کی تشدد پسند پالیسی کی وجہ سے کانگریس کے ساتھ مل کر جمعیۃ علماء ہند دوبارہ تحریک آزادی میں شامل ہوگئی۔ چونکہ آپ جمعیۃ کے اہم ترین رکن تھے، اس جرم کی پاداش میں آپ کو دوبارہ جیل کی ہوا کھانی پڑی۔ ایک طرف آزادی کی خواہش آپ کے دل میں مچل رہی تھی تو دوسری طرف آپ نے نئی نسل کی ذہنی تربیت اور راہِ حق میں پیش آنے والی قربانیوں کے تذکرے کو دل و دماغ میں محفوظ رکھنے کے لئے تصنیفی کارنامے بھی انجام دیئے۔ اسی زمانے میں آپ نے ''علماءِ ہند کا شاندار ماضی'' تصنیف فرمائی۔ اس کتاب کے طبع ہونے سے انگریز حکومت نے اسے ملکی بغاوت اور نوجوانوں کو بغاوت کے لئے اکسانے والا قرار دے کر نہ صرف کتاب ضبط کر لی بلکہ اسے طبع کرنے والے پریس کو بھی ضبط کر لیا گیا۔ مولانا مرحوم کو کتاب کے سلسلے

میں گرفتار کر کے سزا دی گئی۔۱۹۴۲ء میں بھارت چھوڑ وتحریک شروع ہوئی جس میں مولانا نے پوری سرگرمی کے ساتھ حصہ لیا۔ بزرگوں کے مشورے کے بموجب وہ اپنے آپ کو گرفتاری سے بچانے کی کوشش کرتے رہے لیکن اکتوبر ۱۹۴۲ء میں گرفتار کر لئے گئے۔تقریباً دوسال کے عرصہ تک آپ بریلی سینٹرل جیل میں ''ملک کو انگریزوں کی غلامی سے آزاد کرنے کی کوشش'' کے جرم میں قید رہے۔ بالآخر اکتوبر ۱۹۴۴ء میں آپ کو رہائی نصیب ہوئی۔ جنگ آزادی کے اس متوالے نے آزادی کی جستجو میں اپنے شب وروز صرف کرتے ہوئے علم وقلم سے اپنا رشتہ نہیں چھوڑا۔علامہ انور شاہ علیہ الرحمہ کی شاگردی کی لاج رکھتے ہوئے آپ نے حدیث شریف کی تدریس وتشریح کو اپنی مخصوص شناخت بنایا۔آپ کی تدریسی خدمات کی ابتداء مدرسہ حنفیہ آرہ (بہار) سے ہوئی تھی، اس کے بعد آپ کی وابستگی مدرسہ شاہی مرادآباد سے ہوگئی جہاں آپ نے کم وبیش تیرہ سال علم حدیث کی خدمت انجام دی۔صحاحِ ستہ کی معروف کتابوں بخاری شریف ومسلم شریف کی تدریس کے ساتھ مذکورہ بالا کتاب تحریر کر کے ملت اسلامیہ ہند کو ایسی تاریخی دستاویز عطا کی جس میں اُن کے بزرگوں واسلاف کے کارناموں سے نئی نسل کو بہت کچھ کرنے، سیکھنے اور سمجھنے کا حوصلہ ملتا ہے۔مرادآباد کے بعد آپ ملی ضروریات کے تقاضوں کے تحت دہلی منتقل ہوگئے جہاں مدرسہ امینیہ دہلی میں تدریسی خدمات انجام دیتے ہوئے مسلمانانِ ہند کی اُس وقت کی نمائندہ جماعت جمعیۃ علماء ہند کے ذریعہ قومی وملی خدمات انجام دیتے رہے۔

ہندوستان کی آزادی کے بعد فسادات کے لامتناہی سلسلہ میں مسلمانانِ ہند کو مضبوطی واستحکام کے ساتھ ہندوستان میں جمنے، انھیں قوت وتوانائی وحوصلہ عطا کرنے میں جن لوگوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ان میں مولانا سید محمد میاں کا نام سرفہرست آتا ہے۔ان سب پر مستزاد آپ کی عملی خدمات۔ان سب کے باوجود آپ نے اپنے اسلاف کے زندہ و روشن کارناموں سے نئی نسل کو روشنی فراہم کرانا بھی اپنے مشاغل میں بدستور جاری رکھا۔ ''علمائے ہند کا شاندار ماضی'' کی چار جلدوں کے علاوہ دو جلدوں میں ''علماءِ حق'' آپ کی

معرکتہ الآراء تاریخی وتحریکی تصنیفات ہیں۔ علاوہ ازیں ''حیاتِ شیخ الاسلام'' مجاہدِ جلیل، ''اسیرانِ مالٹا'' اور ''تحریک شیخ الہند'' و ''تحریک ریشمی رومال'' آپ کی ایسی معرکتہ الآراء تصنیفات ہیں جو زندہ وجاوید ہیں۔

مولانا مرحوم نے اول الذکر دونوں کتابوں میں مسلمانانِ ہند کی قدیم و جدید سیاسی، مذہبی وفکری صورتحال پر جو تبصرہ کیا ہے وہ ''آ تجھ کو بتاؤں میں تاریخ امم کیا ہے'' کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ پیش نظر مقالے میں مولانا مرحوم کی ان دونوں وسیع کتابوں کی روشنی میں مولانا کی ''سیاسی تاریخ نگاری'' کا جائزہ لیا جارہا ہے۔

''علمائے ہند کا شاندار ماضی'' چار جلدوں پر مشتمل ہے۔ پہلی جلد میں ہندوستان میں اکبر کے زمام حکومت سنبھالنے کے بعد اسلام کو درپیش مسائل اور اُن سخت ترین حالات میں اُن کا فکری علمی وعملی مقابلہ کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے جس باجرأت وہمت، اولوالعزم شخص کو منتخب کیا اس کو دنیا شیخ احمد سرہندی المعروف بہ حضرت مجدد الف ثانی کے نام سے جانتی ہے۔ اسی غرض سے مولانا نے جلد اول کو بطورِ خاص حضرت مجدد الف ثانی کی خدمات سے مختص کیا ہے۔ اس ضمن میں اکبر کے دربار میں علماء سوء کے پیدا کردہ نت نئے فتنوں اور ''دین الٰہی'' وغیرہ کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ شروع میں یہ ایک رسالے کی شکل میں تھا جو آگے چل کر ضخیم کتاب بن گیا۔ بقول مصنف یہ رسالہ ''بنیادی طور پر حضرت مجدد الف ثانی صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کی مختصر سیرت اور اکبر بادشاہ کے مذہبی اور سیاسی عقائد و رجحانات کا ناتمام مجموعہ تھا جو ۱۶۰؍صفحات پر مشتمل تھا'' لیکن بعد میں مصنف نے اس پر نظر ثانی کر کے اس کی ضخامت کو پانچ گنا سے بھی زیادہ ۸۵۰؍صفحات تک پہنچا دیا اور اس کو ابوابِ ذیل کا مجموعہ بنا دیا۔ (۱) حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کی مختصر سیرت (۲) آپ کی تعلیمات (۳) تجدید دین اور منصب مجدد کی مفصل تحقیق (۴) اکبر بادشاہ کے عقائد و خیالات اور سیاسی اصول (۵) حضرت مجدد صاحبؒ کے خلفاء (۶) ان کے خلفاء کے معاصرین (۷) خلفا حضرت مجدد صاحب کے خلفاء کے حالات (۸) جہاں گیر، شاہجہاں

اور عالمگیر رحمہم اللہ کے حالات، ان کے سیاسی و مذہبی رجحانات اور کارنامے (۹) داراشکوہ کے عقائد اور چاروں بھائیوں کی جنگ اور اس کے وجوہات ونتائج (۱۰) سلاطین مغلیہ کا نظامِ حکومت (۱۱) ہندوستان کی خوشحالی اور اس کی صنعتیں (۱۲) ایسٹ انڈیا کمپنی کی آمد اور اس کا ابتدائی دور وغیرہ وغیرہ۔ اس کے ساتھ مصنف نے یہ امید ظاہر کی کہ ان شاء اللہ یہ پہلے سے زیادہ مفید ثابت ہوگی۔ (علماء ہند کا شاندار ماضی مسمی باسم علمائے ہند کے شاندار کارنامے طبع دوم، ص ٦) (و)

کتاب کی ابتدا مذکورہ بالا ترتیب کے مطابق حضرت مجدد الف ثانی علیہ الرحمہ کے مختصر حالاتِ حیات سے ہوتی ہے، جس میں امام ربانی کی ولادت باسعادت، اسم گرامی اور سلسلۂ نسب، تحصیل علم، تحصیل طریقت، جامع کمالات، طریقہ کبرویہ کی تحصیل، طریقہ نقشبندیہ کا شوق اور بیعت، اوصاف وخصائل، حلیہ، اوصاف، اتباعِ سنت، عبادت، رات دن کا نظام الاوقات، مجالس، مہمان نوازی، حقوق عباد، ماحول اور خدمات جیسے عناوین کے ساتھ نہایت مختصر ترین جامع انداز میں حضرت مجدد الف ثانیؒ کی حیات کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

حضرت مجدد الف ثانی علیہ الرحمہ (۱۴؍شوال ۹۷۱ھ (مطابق ۱۵۶۳ء) وفات ۲۸؍صفر ۱۰۳۴ھ مطابق ۱۶۲۴ء) نے جب اس دنیائے فانی میں آنکھ کھولی تو یہ مغل شاہنشاہ جلال الدین محمد اکبر کا وہ عہد سلطنت تھا جس میں مغلیہ سلطنت کے اس بے لگام بادشاہ نے ہندوستان پر اپنا قبضہ واقتدار برقرار رکھنے کے لئے اسلامی عقائد وشعائر کو نہ صرف یہ کہ بالائے طاق رکھ دیا تھا بلکہ وہ ان کے استہزاء میں بھی فخر محسوس کرتا تھا اور اسلام کے علی الرغم اپنے فرسودہ وباطل نظریات پر ایک نئے مذہب کی تبلیغ وترویج میں مصروف تھا جو ''دینِ الٰہی'' کے نام سے متعارف کیا جارہا تھا۔

حضرت شیخ احمد سرہندی المعروف بہ مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ جس وقت عنوانِ شباب یعنی سترہ سال کی عمر کو پہنچے تو اس وقت شاہِ زماں اکبر کا مذہبی وسیاسی رنگ روپ بھی

اپنے شباب پر پہنچ چکا تھا، وہ ہر لحاظ سے ''فتنۂ اکبری'' تھا۔ مصنف کتاب نے اکبر کے فرسودہ و باطل عقائد و نظریات کو مجملاً ذکر کر کے اس کا ذمہ داران علماء کو قرار دیا ہے جو اس وقت دربار میں اپنا اثر و رسوخ بڑھانے کے لئے حلال و حرام کی تمیز کھو بیٹھے تھے۔ اکبر چونکہ بذاتِ خود ان پڑھ جاہل تھا اور کم عمری میں تاجِ سلطنت اس کے سر پر رکھ دیا گیا تھا، اس کی وجہ یہ تھی کہ اکبر کی پیدائش کے بعد ہمایوں مسلسل جنگوں میں الجھا رہا، اپنے قریبی حریف شیر شاہ سوری نے اسے اقتدار سے دور کر دیا۔ ہمایوں جنگلات میں روپوش رہ کر اپنی اور اپنے بیٹے کی جان بچانے اور شیر شاہ سوری سے جنگی مہمات میں الجھا رہا جب اس کا باپ ہمایوں شیر شاہ سوری کے مقابلے پے در پے شکست کھانے کے بعد فتح یاب ہوا تو اس کی عمر نے وفا نہ کی اور وہ اقتدارِ سلطنت ملنے کے فوراً بعد ہی پروانہ اجل کے سامنے بے بس ہو کر دارِ بقا کا راہی ہو گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اکبر کی کوئی ذہنی تربیت نہ ہو سکی۔ حکومت ہند پر حاصل شدہ اقتدار کا وہ صرف تیرہ سال کی عمر میں بااختیار مالک ہوا تو اس کے سامنے بہت سے چیلنجز تھے جن سے دست بردار ہونے کی صورت اپنی ذہنی کجی کے باعث یہی نظر آئی کہ وہ ہندوستان کے حالات کے پیش نظر اپنے آپ کو عام مسلمانوں کی روش سے ہٹ کر کچھ مظاہرہ کرے، حالانکہ اکبر ابتدائے عمر میں پکا سچا دیندار مسلمان تھا جو روزے نماز کے ساتھ بزرگوں سے بھی بہت زیادہ عقیدت رکھتا تھا لیکن اس کی کم عمری کا فائدہ اٹھا کر دنیا پرست مذہبی چولہ پہنے علماء نے اسے مذہب بیزار بنانے میں اہم کردار ادا کیا، اس میں اس کے ان نورتنوں کا زیادہ عمل دخل رہا جو خود تو عالم و فاضل، دانا و بینا تھے لیکن اپنی ذاتی اغراض کے پیش نظر بادشاہِ وقت کو مذہب اسلام کی صحیح صورت حال بتانے سے اس لئے ہچکچا رہے تھے کہ کہیں ان کے نجی مفادات متاثر نہ ہو جائیں۔

ملا عبدالقادر بدایونی نے ''منتخب التواریخ'' میں اکبر کے دربار، اس کے عقائد، درباری علماء کی حرکات، وغیرہ پر تفصیلی گفتگو کی ہے جسے مولانا محمد میاں صاحب نے اپنی کتاب کا بنیادی ماخذ بنایا ہے۔

مولانا محمد میاں صاحب نے اس پورے ماحول کی بڑی خوبصورت منظر کشی کی ہے اور اکبر نے اپنے عقائد کا جس طرح پر چارو پرسار کیا ان کی تفصیلات پیش کرنے کے بعد اس وقت کے مذہبی پیشواؤں کی عیاریوں و مکاریوں کی داستان بھی بیان کی فرماتے ہیں کہ:

''اکبری عہد میں عوام ہی نہیں بلکہ خواص علماء بھی بہت سے مشرکانہ افعال کے مرتکب ہوتے تھے۔ ملا صاحب نے زمیں بوسی کے وقت کی ایک عالم کی تصویر کھینچی ہے۔ کہ ''یہ مولوی جس وقت دربار میں حاضر ہوا تو گردن ٹیڑھی کر کے کورنش بجالایا اور دیر تک ہاتھ اور آنکھیں بند کئے کھڑا رہا۔ کافی دیر کے بعد جب اس کو بیٹھنے کا حکم ملا تو فوراً سجدے میں چلا گیا اور بے کینڈے اونٹ کی مانند بیٹھ گیا۔'' (علماء ہند کا شاندار ماضی، جلد ا، ص ۲۸)

بات یہیں پر نہیں رکی بلکہ اسلام کی بنیادی تعلیمات کے علی الرغم سود، جوئے اور شراب کو حلال قرار دیا گیا۔ ڈاڑھی کو صرف وجہ استہزاء بنانے پر ہی اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ اس کے مونڈنے پر علمائے سوء نے من گھڑت حدیثیں وضع کیں۔ غسلِ جنابت، زنا کی ترویج، نکاح کے سلسلہ میں رکاوٹیں اور موجودہ دور میں اسلام کو درپیش چیلنجز اس وقت بزعم خود مسلمان کہلانے والے سلطنت ہند کے مالک کے قصر سے جاری ہو رہے تھے اور اکبر کی خوشنودی کے لئے علمائے سوء قطار اندر قطار غلط کو درست اور حرام کو حلال کرنے میں لگے ہوئے تھے۔

مولانا محمد میاں نے تاریخی حوالوں سے اکبر کی دینداری کو ثابت کرتے ہوئے بتایا ہے کہ ابتداءً اکبر شدت کے ساتھ اسلامی عبادات کا پابند تھا۔ سفر و حضر میں نماز باجماعت کا اہتمام رکھتا تھا۔ شیخ عبدالنبی سے حدیث سننے کے لئے کبھی کبھی ان کے گھر پر بھی جاتا۔ حضرت شیخ سلیم چشتیؒ سے عقیدت و احترام کے باعث ہی اس نے فتح پور کو دار السلطنت بنایا۔ علماء کو محبوب رکھتا تھا جس کے نتیجے میں علماء سوء کی جماعت اس کے اردگرد جمع ہوگئی اور بادشاہ سے قربت کی خواہش میں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوششیں ہونے لگیں اور شرعی مسائل کو باہم دیگرے دست و گریبان کا ذریعہ بنانے لگے، اس کا جو نتیجہ ہونا تھا وہی ہوا۔ کسی

مسئلہ پر کوئی ایک عالم حرام ہونے کا فتویٰ صادر کرتا تو دوسرا عالم بادشاہ کی نظر کو دیکھتے ہوئے اسے حلال کہنے پر ہی اکتفانہ کرتا بلکہ اُسے ''فرضِ عین'' قرار دینے کی کوشش کرتا۔

مخدوم الملک ملا عبداللہ سلطانپوری اور شیخ عبدالنبی کی رقیبانہ کشمکش نے بھی اکبر کو اسلام سے برگشتہ کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ یہ دونوں اکبر کی نظر میں رازی وغزالی کا درجہ رکھتے تھے لیکن ان کی ہوس مال وزر نے حرام وحلال کی تمیز کو اٹھا دیا تھا۔ ایک اور عالم دین ملا مبارک نے اپنے معاصر علماء سے انتقاماً اسلام کی جو تشریحات وتعبیرات پیش کیں وہ سراسر اسلام مخالف تصور کی جاتی ہیں۔

ملا مبارک ناگوری اور اس کے دو بیٹوں ابوالفضل اور فیضی نے شاہی دربار میں اپنا اثر ورسوخ بڑھا کر اپنے شخصی انتقام کا نشانہ ہندوستان کے سنی مولویوں ہی کو نہیں بلکہ مکمل اسلام کو بنالیا۔

الغرض علمائے سوء اُس وقت اپنی دنیا بنانے کے لئے آخرت کے مقابلے میں دنیا کو ترجیح دینے لگے اور بظاہر قرآنی تعبیر ''وما له فی الآخرة من خلاق'' کا مصداق معلوم ہونے لگے۔ حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے یہ سودے بازی کر کے اپنے انجام کو خراب کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ حضرت مجدد الف ثانی کی کوشش یہی تھی کہ کسی طرح یہ علماء بھی راہِ راست پر آجائیں اور شاہی قربت میں رہتے ہوئے اپنے اعمال وافعال سے ''فی الدنیا حسنة و فی الآخرة حسنة'' پر عمل پیرا ہو جائیں۔ کیونکہ بادشاہ کے عقائد باطلہ اور علماء سوء کی مکمل تائید کی وجہ سے اکبر کا عہدِ حکومت مسلمانوں کے مذہبی تشخص کے لئے ایک مسئلہ بنا ہوا تھا۔ حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کو اکبری عہد ملت اسلامیہ کی آنے والی سینکڑوں سال کی تاریخ پر بھاری پڑتا نظر آرہا تھا۔ اللہ تعالیٰ کو چونکہ اپنے اس دین کی حفاظت کرنی تھی اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس دورِ پرفتن میں حضرت شیخ مجدد الف ثانی علیہ الرحمہ کو پورے حوصلہ و ہمت کے ساتھ ان تعلیماتِ باطلہ کے سامنے اشاعتِ حق کے لئے منتخب کیا جنھوں نے قید و بند کی پرواہ کئے بغیر طوق و زنجیر کو خاطر میں نہ لا کر جرأت وشجاعت کا مظاہرہ کرتے ہوئے

ایوانِ شاہی میں زلزلہ برپا کردیا۔

اس ضمن میں مصنف کتاب نے حضرت شیخ احمد سرہندی المعروف بہ مجدد الف ثانی کی ان تمام کاوشوں وکوششوں کی تفصیلات پیش کی ہیں جو انھوں نے فتنۂ اکبری کے استیصال کے لئے کیں۔ اس کے لئے انھیں جیل بھی جانا پڑا اور آہنی سلاخوں کا بھی سامنا کرنا پڑا لیکن اس جبلِ ہمت وعزیمت نے کسی مشکل کی کوئی پروا نہیں کی۔ اکبر کے بعد اس کا لڑکا جہاں گیر تخت آرائے سلطنت ہوا تو اس کے عہد میں بھی شروع میں حضرت مجدد الف ثانی مشکلات کا شکار رہے لیکن اللہ نے جہاں گیر کے دل میں رحم پیدا کیا تو اس نے حضرت مجدد صاحبؒ کی قدر ومنزلت کا اعتراف کیا اور ان کو قید سے رہائی دے کر اپنی عاقبت کی درستگی کا سامان کیا۔ بقولِ مصنف:

''حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تبلیغی کوششوں کو بہر طور جاری رکھا۔ جب قلعہ گوالیار میں قیدی کی حیثیت سے پہنچے تو وہاں کئی ہزار غیر مسلم بھی قید میں تھے۔ حضرت مجدد صاحب نے تبلیغ کی ان کو مشرف باسلام کیا اور سینکڑوں آدمیوں کو ارادت سے سرفراز کر کے درجاتِ ولایت پر پہنچایا۔'' (ایضاً ص ۱۵۲) مولانا محمد میاں صاحب کا یہ بھی ماننا ہے کہ ''چونکہ حضرت مجدد صاحب حتی الوسع انبیاء علیہم السلام کی کسی سنت کو نہیں چھوڑتے تھے تو تقدیر الٰہی کا تقاضا ہوا کہ جیل خانہ میں حضرت یوسف علیہ السلام کی اس سنت کو بھی ادا کردیا جائے۔'' (ایضاً ص ۱۵۲)

اس کے بعد مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت شیخ مجدد صاحب کے ان خطوط کے کچھ حصے بھی نقل فرمائے ہیں جو حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے صاحبزادگان، مریدین، متوسلین ومعتقدین کو جیل کی چہار دیواری میں رہتے ہوئے تحریر فرمائے تھے۔ یہ خطوط وعظ و نصیحت کا بیش قیمت ذخیرہ ہیں۔ ان خطوط سے قارئین کو نصیحت ملتی ہے کہ ''مصیبت ورنج وغم کو برضا ورغبت برداشت کرنا اور تکالیف کو منجانب اللہ تصور کر کے اس پر واویلا مچانے سے گریز کرنا انھیں لوگوں کا شیوہ ہوتا ہے جو یادِ خدا میں مستغرق ہو کر ''من تو شدم، تو من شدی''

کا عملی نمونہ ہوتے ہیں۔''

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے تئیں مصنف کتاب کو جو عقیدت ہے وہ ان کے عملی مجاہدانہ کارناموں، علمی نگارشات، ذکر واشتغال، فنافی اللہ وغیرہ جیسے اوصاف کی بنا پر تو ہے ہی مزید برآں اس بنا پر بھی ہے کہ حضرت شیخ احمد سرہندی علیہ الرحمۃ الف کے مجدد تھے، اس سے پہلے جو مجدد ہوتے تھے وہ صدی کے مجدد کہلاتے تھے۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد چونکہ کوئی نبی آنے والا نہیں بلکہ کارِ نبوت کے لئے اللہ نے اپنے احکام، رسول اللہؐ کے طریقۂ کار کو عام کرنے نیز مذہب اسلام کی تبلیغ واشاعت کے لئے ایسے بندوں کو منتخب کیا جو کارِ نبوت کو آگے بڑھاتے رہیں۔ یہ کام ہر دور میں ہوا، ہر صدی میں کوئی نہ کوئی ایسی شخصیت ظہور پذیر ہوئی جس نے تعلیماتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے اعراض کرنے والے مسلمانوں کو صحیح راہ دکھانے کا کام کیا۔ حضرت مجدد الف ثانی علیہ الرحمہ چونکہ اس زمانے میں عالم وجود میں آئے جب رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کو ایک ہزار سال سے زائد کا عرصہ گذر چکا تھا اور ملت اسلامیہ شاہی سرپرستی میں ضلالت وگمراہی کی طرف جارہی تھی۔ ایسے وقت میں بھٹکے ہوئے انسانوں کو صحیح راہ پر لانے کی کوشش کرنا جان جوکھم میں ڈالنا تھا، اس کام کو وہی شخص کرسکتا تھا جو اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ کے واحد ہونے، اس کے پیغامِ توحید کو عوام وخواص تک پہنچانے اور کارِ رسالت کو اپنوں وغیروں تک پہنچانے کے لئے اپنا سب کچھ قربان کرنے کی ہمت کرسکتا ہو، اس راہ میں پیش آنے والی مشکلات کو محض رضائے رب کی خاطر خندہ پیشانی سے قبول کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو، جسے شاعر کی زبان میں یہ معلوم ہو کہ۔

یہ شہادت گہہ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

حضرت شیخ احمد سرہندی نے اپنی گفتار، کردار، علم اور عمل ہر ہر طریقہ سے اس نیک کام کو انجام دیا اور اس راہ میں پیش آمدہ مشکلات کی پرواہ کئے بغیر بے لگام بادشاہ کی فکری کجی

کو برسرِ عام للکارا اور ہزار رخصت کی راہوں کے ہوتے ہوئے بھی عزیمت کی راہ کو اختیار کیا۔ عیش وعشرت کی زندگی پر تنگی وعسرت کو ترجیح دی۔ ایسا شخص یقیناً اس قابل ہے کہ وہ اسلام کے دوسرے ہزارے کا سرخیل کہا جائے۔ اسی لئے انھیں دنیائے اسلام نے ''مجدد الف ثانی'' کا لقب عطا کیا جو بہرطور مناسب و درست ہے۔ مصنف کتاب مولانا سید محمد میاں مرحوم نے حضرت مجدد الف ثانی علیہ الرحمۃ کی خدمات سے ہی متعارف نہیں کرایا بلکہ اُن کی علمی کاوشوں و عملی کارناموں کے تئیں جا بجا اپنی عقیدت ومحبت کا بھی اظہار کیا جو ان کی اسلام سے محبت کا مظہر ہے۔

یہی وجہ ہے کہ مولانا محمد میاں صاحب علیہ الرحمہ نے اس کتاب کا بیشتر حصہ حضرت مجدد الف ثانی اور ان کے عہد کے ساتھ ہی مختص رکھا۔ امام ربانی حضرت مجدد الف ثانی علیہ الرحمہ کی ولادت، عبادت، طریقت، ریاضت سے ہوتے ہوئے جو چیزیں ان کی راہ میں بشکل فتنۂ اکبری سدراہ بنی ہوئی تھیں، ان کا بھی تفصیل سے ذکر کیا۔ علماء سوء کے فتنوں کی بھی تفصیلات فراہم کیں تو جہاں گیر کے عہد میں پیش آنے والی پریشانیوں پر بھی کسی قدر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ کے طریقۂ کار کو بیان کیا تو حضرت مجدد صاحبؒ کے خاندان، خلفاء، صاحبزادگان، خلفاء کرام کے خلفاء، نبیرگان حضرت مجدد صاحب وغیرہ کے تذکرے کے ساتھ ساتھ دربارِ شاہی سے باہر کے فتنوں کے استیصال میں مجددانہ کوششوں کو بھی شرح وبسط کے ساتھ بیان کیا۔ انھیں واقعات کے ذیل میں شیخ محمد طاہر پٹن، شیخ وجیہہ الدین گجراتی، شیخ جلال الدین تھانیسری، شیخ یعقوب صرفی، کشمیری ملا عبدالقادر بدایونی، مولانا جمال الدین دہلوی، ملا قطب الدین شہید سہالوی جیسے لاتعداد علماء کی داستانِ حریت کو بھی نذر قارئین کیا اور ہندوستان کے اس وقت کے سیاسی حالات وئئی سیاسی صورت حال، جہاں گیر کی شیخ احمد سرہندی سے عقیدت، ملکۂ عظمیٰ نور جہاں کی واقفیت، اندرونِ خانہ اس کی حضرت مجدد الف ثانی کے تئیں نفرت، جہاں گیر کی شیخ سے ناراضگی کے نتیجہ میں قید میں چلا جانا اور پھر من جانب اللہ رہائی کی سبیل کا نکلنا اور حضرت شیخ

مجدد صاحب کا بایں طور کامیاب ہونا کہ جہاں گیر اُن کا مطیع وفرمانبردار ہوگیا۔ اکبر جیسے بے دین بادشاہ کے بیٹے جہاں گیر کا شیخ احمد سرہندیؒ سے عقیدت ومحبت کا اظہار یہاں تک ہوا کہ اس نے کشمیر جاتے آتے دومرتبہ حضرت شیخ کے مستقر سرہند شریف میں قیام کیا جس کا تذکرہ مصنف کتاب نے توزک جہاں گیری کے صفحات ۳۲۴ تا ۳۴۶ ر کے حوالے سے کیا ہے۔ نیز اخیر عمر میں جہاں گیر کے اس قول کو بھی ذکر کیا ہے کہ ''میں نے ایسا کوئی کام نہیں کیا کہ جس سے نجات کی امید ہو۔ البتہ میرے پاس ایک دستاویز ہے اس کو اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کروں گا، وہ دستاویز یہ ہے کہ مجھ سے ایک روز شیخ احمد سرہندی نے فرمایا تھا کہ ''اگر اللہ تعالیٰ ہمیں جنت میں لے جائے گا تو تیرے بغیر نہ جائیں گے۔'' (علمائے ہند کا شاندار ماضی، جلد ا، ص ۲۷۲)

مصنف کا یہ بھی ماننا ہے کہ حضرت شیخ احمدؒ کی پیدا کردہ دینی فضا کے نتیجے میں ہی شاہجہاں اور عالمگیر اپنی کامل دینداری کے ساتھ تقریباً ایک صدی تک عظیم ہندوستان پر حکمرانی کرتے رہے۔

حضرت شیخ احمد مجدد الف ثانی کی وفات حسرت آیات ۲۸ رصفر ۱۰۳۴ھ کو ہوگئی اور سرہند میں ان کا مزار مرجع خلائق بنا ہوا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہندوستان میں مذہب اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی ذمہ داری حضرت مجدد صاحب کو تفویض کی جس کی وجہ سے مسلمانانِ ہند اپنے اس عظیم محسن کے احسانات کو فراموش نہیں کرسکتے۔ اس سلسلے میں مصنف کتاب نے کافی تفصیلات فراہم کی ہیں جو بہر طور مستحسن و قابل قدر ہیں۔ حضرت مجدد صاحب کی عمومی دعوت کو ''اتباع سنت اور ''تمسک بظاہر الشریعۃ'' کو تمام فتنوں کی اصلاح کرنے والا مانا ہے۔ (ص ۳۹۲)

کتاب کے اسی حصہ کے ضمن میں حضرت مجدد صاحبؒ کی اولاد صلبی خواجہ محمد معصوم اور شاہ محمد یحییٰ صاحب کے حالات وخدمات اس کے بعد حضرت مجدد صاحب کے خلفاء خواجہ سید محمد آدم، شیخ محمد طاہر لاہوری، خواجہ ہاشم، شیخ بدیع الدین، مولانا بدرالدین، حاجی خضر

روغانی، شیخ عبدالحئی و مولانا عبدالواحد قدس سرھم کے مختصر حالات درج کئے گئے ہیں۔ اس کے بعد شیخ احمد سرہندی کے خلفاء کے بہت سے خلفاء کا تذکرہ کتاب کی زینت کو چار چاند لگائے ہوئے ہے۔ حضرت شیخ کے تذکرے کے بعد آپ نے حضرت شیخ احمد کی اصلاحات کے ساتھ ساتھ ان قدیم بزرگوں وعلماء کا بھی ذکر کیا ہے جن کی اچھائیوں سے تحریک پا کر اور جن کی برائیوں کے خلاف شیخ احمد ''تحریک اتباع سنت'' چلانے پر گامزن ہوئے۔ علاوہ ازیں حضرت مجدد صاحب کا ایک اور اہم کارنامہ افراط وتفریط سے ہٹ کر اعتدال کا راستہ اپناتے ہوئے شریعت وطریقت کو رطب و یابس سے پاک صاف کرنا ہے۔ آپ نے شریعت میں درآمدہ بہت سی من گھڑنت باتوں کو بھی الگ کیا اور طریقت میں صوفیاء کی وضع کردہ بہت سی فرسودہ و بےہودہ باتوں کو واضح کر کے صحیح طریقۂ تعلیم اپنے متبعین کے ذریعہ آگے تک بڑھایا۔ اس ضمن میں مصنف کتاب نے بہت سے اُن علمائے کرام کے تذکرے کے ساتھ ان کی خدمات کو اجاگر کیا ہے۔ جنھوں نے گیارہویں صدی ہجری میں حضرت مجدد الف ثانی علیہ الرحمہ کے اصلاحی مشن کو آگے بڑھایا۔

''علمائے ہند کا شاندار ماضی'' میں حضرت مجدد الف ثانیؒ کے بعد شاہ ولی اللہ اور شاہ اسماعیل شہید کو بھی مجددیت کا درجہ دیا ہے۔ اس ذیل میں آپ نے مولانا ابوالکلام آزاد کا ایک مبسوط تبصرہ بھی نقل کیا ہے۔ ''خلفاء مجددی کا سیاسی ماحول'' عنوان کے تحت شاہجہاں، داراشکوہ اور عالمگیر کے مذہبی افکار پر بحث کرنے سے قبل مصنف کتاب نے اکبر کے زمانہ سے عہدِ عالمگیر تک کی مذہبی حیثیت کو بایں طور واضح کیا ہے کہ ''اکبر، لا مذہب، جہانگیر، مذہبیت اور لا مذہبیت میں متوسط، شاہجہاں مذہبیت میں پختہ، چشتیت اور مجددیت میں متوسط، عالمگیر مذہبیت میں پختہ اور خالص مجددی،'' صاحب کتاب کے بقول ''یہ تدریجی انقلاب ثمرہ ہے حضرت مجدد صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کی جدوجہد اور قربانیوں کا'' (ایضاً، ص۵۲۳) اس کے بعد مولانا مرحوم نے شاہجہاں اور عالمگیر کے عہد کے تعلق سے دونوں بادشاہوں کے مذہبی وسیاسی افکار اور ملک عزیز کے حالات پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔ جن میں

ثابت کیا ہے کہ اورنگ زیب عالمگیر اپنے والد شاہجہاں کو قید کرنے میں بالکل حق بجانب تھا کیونکہ حالات اس نوعیت کے ہوگئے تھے کہ اگر شاہجہاں کو قید نہ کیا جاتا تو ملک میں انارکی پھیل جاتی اور وطن عزیز اس وقت ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا۔ اس ذیل میں آپ نے اورنگ زیب کے بھائیوں داراشکوہ اور مراد وغیرہ کی عیاریوں ومکاریوں کو طشت از بام کیا۔ اورنگ زیب پر ہندو دشمنی کے جو الزامات عائد کئے جاتے ہیں ان کا بھرپور مدلل دفاع کرتے ہوئے اورنگ زیب رحمۃ اللہ علیہ کو ایسا عادل ومنصف حکمراں ثابت کیا جس کے یہاں عدل وانصاف میں کمال احتیاط پایا جاتا تھا۔ وہ زہد وتقویٰ کی زندگی گذارنے میں اپنی مثال آپ تھا۔ اس پر لگنے والے اس الزام کا کہ ''وہ مذہبی بادشاہ تھا'' اور یہی اس کا سب سے بڑا جرم مانا جاتا ہے۔ اس کا دفاع کرتے ہوئے مولانا نے بہت ہی پرزور الفاظ میں اس کی مذہبیت کو اس کی انسانیت سے تعبیر کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ ''بیشک وہ مذہبی تھا اور اس کے تمام اعمال و افعال پر مذہبیت غالب تھی۔ مگر غور طلب یہ ہے کہ اس کی مذہبیت نے کس قسم کے جذبات پیدا کئے اور ان کے عملی نتائج کیا تھے۔ ہمارا یقین ہے اور یہی حق ہے کہ اسلام وہ مذہب ہے جس کی پابندی ہی عدل وانصاف، رعایا پروری اور رحم گستری کے بےلوث جذبات انسان میں پیدا کر دیتی ہے۔ عالمگیر کے کارنامے اس کی مثال ہیں۔'' (ایضاً، ص۱۷۶) اسی کے ساتھ اورنگ زیب کی عبادت گزاری، روحانی کمالات، احتساب، علم وفضل اس کے ذوقِ تصنیف وتالیف، علم پروری، مساوات پسندی، فراست ودوراندیشی، جفاکشی، داد ودہش اور شجاعت جیسے اوصاف کو اجاگر کیا ہے اور تاریخی حوالوں سے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ عالمگیر کے عہد حکومت میں لڑی جانے والی شمالی وجنوبی ہندوستانیوں کی لڑائی کو متعصبین نے ہندو مسلم لڑائی کی نظر سے دکھایا ہے جو تاریخی طور پر قطعاً غلط ہے۔ اس ضمن میں ہندو امراء کی فہرست پیش کر کے قارئین تک یہ معلومات بہم پہنچائی ہیں کہ ''اکبر اعظم کے عہد سے بھی تقریباً چہار چند ہنود حکومت عالمگیری کے ارکان ہیں'' بطورِ ثبوت آپ نے ہفت ہزاری، شش ہزاری، پنج ہزاری، چہار ہزاری، سہ ہزاری، دو ہزار پانصدی، دو ہزاری، یک ہزاری ہفت صدی، و

پانصدی ہندو امراء کی فہرست پیش کی ہے۔ مزید برآں آپ نے یہ بھی فرمایا کہ ’’کوئی ضلع ہندوستان بھر میں ایسا نہ ہوگا جس کی حدود میں کسی ہندو کے نام شاہی زمانہ کی جاگیر نہ ہو ،تحقیق کی جائے تو ان میں سے بیشتر جائیدادیں وہ ہیں جن کو عالمگیر نے عطا فرمایا۔‘‘ (ایضاً، ص ۶۹۵)

جلد اول کا تتمہ ’’شاہانِ مغلیہ کا نظامِ حکومت‘‘ سے متعلق ہے جن میں عہدِ مغلیہ میں ہندوستان کی زراعتی ترقی، کاشتکاروں کی خوشحالی، تعلیمی ارتقاء، مدارس، عدل و انصاف، یکساں شہری حقوق اور مساوات، حقوقِ ملازمت، داد و دہش، مذہبی حقوق کی حفاظت، ہندو مسلم تعلقات، صنعت و حرفت کے ساتھ ان چیزوں کا بطورِ خاص ذکر کیا ہے جو اس زمانے میں ہندوستان سے باہر بھیجی جاتی تھیں اور ہندوستان کے عزت و وقار میں اضافے کا باعث تھیں۔ الغرض مغلوں کے زمانے میں ہندوستان ایک ایسا ملک تھا جو ہر ہر میدان میں ترقی پذیر تھا۔ سوئی سے لے کر بحری جہازوں کے بیڑے تک بنانے میں یہ ملک خود مختار تھا۔ ہر طرف خوشحالی و فارغ البالی پائی جاتی تھی۔ کتاب کے آخیر میں مغلیہ سلطنت کے زوال کی وجوہات، یوروپین اقوام، پرتگالیوں، فرانسیسیوں و انگریزوں کی ہندوستان آمد، ایسٹ انڈیا کمپنی کے قیام وغیرہ کے سلسلے میں بہت سی تفصیلات ملتی ہیں۔

کتاب کی جلد دوم شاہ ولی اللہ دہلوی علیہ الرحمہ اور ان کے خانوادے کی علمی، ملکی و سیاسی خدمات کا احاطہ لئے ہوئے ہے۔ جس کے اثرات پورے ہندوستان کی تاریخ پر مرتب ہوئے۔ شاہ ولی اللہ دہلوی علیہ الرحمہ نے اس عالم آب وگل میں ۲۱؍فروری ۱۷۰۳ء (مطابق ۴؍شوال ۱۱۱۴ھ) کو اس وقت آنکھ کھولی جب اورنگ زیب عالمگیرؒ اپنی زندگی کی پچاسی سے زائد بہار دیکھنے کے بعد عمر کے آخری پڑاؤ پر تھے۔ شاہ ولی اللہ دہلوی کے والد شاہ عبدالرحیم رحمۃ اللہ علیہ علمی دنیا میں اپنا خاص مقام رکھتے تھے۔ فتاویٰ عالمگیری کی تدوین میں جن علمائے کرام پر اورنگ زیب کی نظر پڑی تھی ان میں شاہ عبدالرحیم کی شخصیت بھی تھی۔ اورنگ زیب ان کے علم و فضل، تقویٰ وطہارت کا معترف تھا، ان کے گھرانے میں شاہ ولی

اللہ دہلوی کی پیدائش ہوئی۔ ابھی وہ ایام طفولیت میں ہی تھے کہ ۲۸؍ذی قعدہ ۱۱۱۸ھ کو اورنگ زیب کا وقت موعود آ پہنچا اور ہندوستان جس کو عظیم بنانے میں اورنگ زیب نے اپنی تمام زندگی صرف کردی تھی اور جس پر اُس نے پچاس سال تک حکومت کر کے بہت سے فتنوں کا قلع قمع کیا تھا اور اسے دنیا کی عظیم حکومتوں میں لا کھڑا کیا تھا۔ اس کے انتقال کے بعد اُتھل پُتھل کا شکار ہوگیا۔ شاہ ولی اللہ دہلوی نے جب ہوش کی آنکھیں کھولیں تو ہندوستان میں ہر چہار سو انارکی پھیلی ہوئی تھی ان کا دائرہ اگرچہ علم میں محدود تھا لیکن ملک کے سیاسی حالات نے انھیں میدانِ عمل میں آنے پر مجبور کردیا۔ مغلیہ سلطنت کا شیرازہ منتشر ہو چکا تھا خود شاہ ولی اللہ کی انسٹھ سالہ زندگی (وفات ۲۰؍اگست ۱۷۶۲ء مطابق ۲۹؍محرم ۱۱۷۶ھ) میں متعدد کمزور مغل حکمراں ہوئے جن میں سے بیشتر نے بہت کم مدت کے لئے حکومت کی باگ ڈور سنبھالی۔

شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور اُن کے خانوادے نے اس موقع پر ملک کی ضروریات کے پیش نظر جو خدمات انجام دیں اور ملت اسلامیہ کے تشخص کے بقاء کے لئے جس فکر مندی کا مظاہرہ کیا اُس سے متاثر ہو کر مولانا محمد میاںؒ نے ''علمائے ہند کا شاندار ماضی'' کی جلد دوم، شاہ ولی اللہ کے سیاسی نظریات، ان کی تعلیم وتربیت کے مراکز، شاہ عبدالعزیز، شاہ اسماعیل شہید، سید احمد شہید اور ان کے رفقاء کے مجاہدانہ کارناموں اور قربانیوں کے لئے مختص کردی۔

شاہ ولی اللہ اور شاہ اسماعیل شہید کو صاحب کتاب، حضرت مجدد الف ثانی کے ساتھ تجدیدی مقام پر رکھتے ہیں۔ مصنف کے خیالات کو الفاظ کا جامہ پہنایا جائے تو اس کا خلاصہ یہ نکلتا ہے کہ ''حضرت شاہ ولی اللہ کا مقام ہر رنگ میں کامل اور جامع ہے، علوم و معارف کی تجدید وتدوین کا سہرا حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے سر بندھتا ہے تو اس کے عمل و نفاذ اور ظہور وشیوع کا کام توفیقِ الٰہی کے سبب حضرت مولانا اسماعیل شہید قدس اللہ سرہ العزیز نے حضرت سید احمد شہید کی معیت میں کیا۔

شاہ ولی اللہ دہلوی کی علمی تحریک کے نتیجے میں حضرت شاہ عبدالعزیز، شاہ عبدالقادر

اور شاہ رفیع الدین علم وعمل کے آفتاب بن کر ابھرے تو عملی کارکردگیوں کے لئے مسلمانوں کو سکھوں و مرہٹوں کے مظالم سے نجات دلانے اور حکومت الٰہیہ کے قیام کے لئے اپنی زندگی کو وقف کرنے کا کام اسی خانوادے کے حضرت شاہ اسماعیل شہید اور حضرت سید احمد شہید کی معیت میں کیا۔ جنھوں نے اپنے جاں نثار ساتھیوں کے ساتھ مئی ۱۸۳۱ء میں بالاکوٹ کے میدان میں اپنی جانوں کا نذرانہ ''جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی۔ حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا'' کا عملی نمونہ بن کر جامِ شہادت نوش کیا۔'' علمائے ہند کا شاندار ماضی کی جلد دوم میں صاحب کتاب نے اپنے اسلاف کی قربانیوں کو بڑے مؤثر انداز سے پیش کیا ہے جو ان کی علماء، صلحاء واتقیاء سے عقیدت کا مظہر ہے۔

اسی کتاب کا تیسرا حصہ ''علمائے صادق پور اور ان کے پراسرار مجاہدانہ کارناموں'' پر مشتمل ہے، جس میں اپنے اسلاف کے کارہائے نمایاں کو پیش کر کے ان کی فتوحات اور سکھوں کی حکومت کے زوال وغیرہ کی تفصیلات پیش کی گئی ہیں۔

علمائے ہند کا شاندار ماضی کی چوتھی جلد ایسٹ انڈیا کمپنی کے مضبوطی سے پیر جمانے کے بعد ہندوستانیوں بالخصوص علمائے ہند کی تشویش اور اس کے نتیجہ میں کچھ کرنے کی دُھن پر مشتمل ہے۔ اس جلد میں ۱۸۵۷ء کی تحریک سے ماقبل اسبابِ ووجوہات اور پس منظر پر گفتگو کی گئی ہے۔

مصنف کتاب نے اپنے مطالعہ ومشاہدہ کی بنا پر ان حالات کی تلخیص اس طرح کی ہے جن سے اقتصادی وجوہات پر بھی روشنی پڑتی ہے اور زمینداری کی نوعیت پر بھی۔ اس جلد کے مطالعہ سے مصنف کا یہ احساس اجاگر ہوتا ہے کہ انگریزوں کے بڑھتے رسوخ نے مذہبی اور تہذیبی طور پر ہندوستانی باشندوں کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا کہ اگر اس طوفانِ بلاخیز کو پوری قوت کے ساتھ نہ روکا گیا تو وہ دن دور نہیں جب ساری اقدار خس وخاشاک کی طرح بہہ جائیں۔ اس پس منظر میں گفتگو کرتے ہوئے مصنف کا یہ کہنا بالکل سچ معلوم ہوتا ہے کہ ''ہندوستانی اگر ۱۸۵۷ء کی یہ قیامت برپا نہ کرتے تو فطرتِ انسانی کا فیصلہ ان کے خلاف

نہایت سخت ہوتا۔'' (جلد چہارم ۱۹۸۵ء، الجمعیۃ بک ڈپو، دہلی، ص ۳۵)

انگریزوں کی مذہب وتہذیب میں مداخلت کے اگرچہ تمام ہندوستانی مخالف تھے لیکن سب سے زیادہ اس سے مسلمان متاثر ہورہے تھے، کیونکہ اس کے پس پردہ وہ عوامل کار فرما تھے جو اسلام کی آمد کے معاً بعد یہود ونصاریٰ کو پے بہ پے شکست سے ہم کنار کر چکے تھے۔ اسی لئے انگریزوں کا وجود مسلم علماء کے لئے ہر مرحلہ پر ایک چیلنج کی شکل اختیار کرتا جارہا تھا۔

مصنف نے اپنے اسلاف کے کارناموں کو دوسری نسل تک منتقل کرنے کے لئے اس سلسلہ کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے ایک اور کتاب جسے اس کتاب کا اضافی ایڈیشن کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا ''علماء حق اور اُن کے مجاہدانہ کارنامے'' کے نام سے تصنیف کیا۔ اس کتاب کا پہلا حصہ ۱۸۵۷ء کے حالات تحریک آزادی (۱۸۵۷ء) میں علمائے کرام کے مجاہدانہ کارنامے، اس کے بعد پیش آمدہ مصائب ومشکلات کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے اور اس کے نتیجے میں ہزارہا علمائے کرام کی شہادت کی تفصیلات ملتی ہیں۔ علاوہ ازیں حافظ سید ضامن شہید اور حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کی قیادت میں ہونے والے جہاد شاملی، علمائے دیوبند کے سرخیل مولانا محمد قاسم نانوتوی اور مولانا رشید گنگوہی کے مجاہدانہ علمی کارنامے اور دیوبند کی علمی تحریک سے متعلق بہت سی تفصیلات ملتی ہیں۔ ''علمائے حق اور اُن کے مجاہدانہ کارنامے'' کی جلد دوم میں پہلی جنگ عظیم (۱۹۱۴ء) سے ۱۹۴۷ء تک ملکی حالات، انگریزوں کے مظالم، جمعیۃ علمائے ہند کا قیام، علمائے ہند کی آزادیِ وطن کے لئے کوشش وسرفروشانہ کارناموں، انڈین نیشنل کانگریس کے ساتھ علمائے کرام کی عمومی وابستگی جمعیۃ علمائے ہند اور اس سے وابستہ علمائے کرام کی قومی وملی خدمات پر بھرپور روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کتاب کی دونوں جلدوں میں بھی مصنف نے بجا طور پر یہ ثابت کیا ہے کہ اس ملک کی آزادی کی لڑائی میں علمائے کرام نے جو قربانیاں پیش کی ہیں وہ مثالی ہیں۔ جن کو ان مختصر صفحات میں پیش کرنا ممکنات میں سے نہیں ہیں۔ اپنے اسلاف کے کارناموں کو یاد رکھنے کے لئے یہ کتابیں

تاریخی دستاویز ہیں جن کا مطالعہ قارئین کے اندر ایک نئی امنگ پیدا کرتا ہے۔موجودہ دور کے تنگ نظر متعصب مؤرخین بھلے ہی ان کے تذکروں کو بالقصد فراموش کردیں لیکن اس ملک کی مٹی مسلم علمائے کرام کے خون کو اپنے اندر جذب کئے ہوئے ہے، یہ قربانیاں کبھی رائیگاں نہیں جائیں گی بھلے ہی وقتی طور پر اُن پر عصبیت کی گرد چڑھادی جائے البتہ جب بھی یہ گرد صاف ہوگی تو ہماری قربانیوں کی گواہی وطن کا ذرہ ذرہ دے گا۔‘‘

الغرض مولانا سید محمد میاں دیوبندی ایسے مصنف ہیں جنھوں نے اپنی دونوں معرکۃ الآراء تصانیف میں تاریخی و تحقیقی حوالوں سے علمائے ہند کی زرّیں خدمات کو اپنے اشہب قلم سے زندہ جاوید بنادیا ہے۔صفحات کی طوالت کا خوف نہ ہوتا تو سینکڑوں حوالوں سے مولانا محمد میاں کی عقیدتِ علماء کو باور کرایا جا سکتا تھا۔اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے مصنف کی ان خدماتِ جلیلہ کو قبول فرمائے۔آمین۔

حضرت مولانا محمد میاں دیوبند ثم الدہلوی نے علمی و تحقیقی انداز میں اپنے اسلاف کے جن کارناموں کو پیش کیا عملاً اس کا اظہار بھی کیا۔موصوف نے صرف ’’کاغذی میدان‘‘ میں ’’قلمی گھوڑے‘‘ نہیں دوڑائے بلکہ اکابر علماء کے نمونوں پر چلتے ہوئے ہر ہر محاذ پر کارہائے نمایاں انجام دیئے۔جمعیۃ علماء ہند کے پلیٹ فارم سے قومی وملی سیاست میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور دعوتی و اصلاحی کوششوں میں بھی مسلسل سرگرداں رہے۔انھوں نے فرقہ پرست قوتوں سے لوہا لیتے ہوئے ان جگہوں پر بطور خاص اپنی توجہ مرکوز کی جہاں مسلمان بہت زیادہ اقلیت میں آ گئے تھے۔میوات، ہماچل پردیش، راجستھان کے دور افتادہ علاقوں میں مسلمانوں کے دینی شعائر، عقائد اور ان کی مذہبی شناخت کو تحفظ فراہم کرنے کی خاطر دینی مکاتب و مدارس قائم کئے۔۱۹۴۹ء میں جمعیۃ علماء ہند نے جب دینی تعلیم پر ارتکاز کو اپنا بنیادی حق قرار دیا تو اس مہم کی سربراہی کے لئے آپ کا انتخاب عمل میں آیا جسے آپ نے بحسن وخوبی انجام دیا۔آپ کا ایک بڑا کام ’’دینی تعلیم کے رسالے‘‘ کے عنوان سے وہ تصنیفی سیریز ہے جو تقریباً نو حصوں پر مشتمل ہے، جن میں بچوں کی عمر اور صلاحیت کے

اعتبار سے بتدریج انھیں دینی علمی معلومات بھی دی جاتی ہے اوران کی اردوتحریروتقریر کی مشق بھی ہوتی ہے۔''دینی تعلیم کے رسالے'' سے بچوں کے عقائد بھی درست ہوتے اور اعمال میں پختگی آتی ہے۔ جمعیۃ علماء ہند کے آرگن''الجمعیۃ'' کا احیائے نو (۱۹۴۷ء کے بعد) آپ ہی کی کوششوں سے عمل میں آیا۔ ابتداء میں آپ نے ہی اس کی ادارت فرمائی۔ جمعیۃ علماء ہند کے اہم عہدوں پر فائز رہنے والے اوراس کی عملی خدمات کا فریضہ انجام دینے والے اس مجاہد جنگ آزادی کی خدمات کو جہاں قومی طور پر فراموش کردیا گیا وہیں اس مردِ مجاہد سے اپنوں نے بھی اغماض برتا۔

سرزمین دیوبند کا یہ سپوت کم وبیش بہتّر سال اس دنیائے آب وگل میں رہنے کے بعد ۲۴؍اکتوبر ۱۹۷۵ء (مطابق شوال ۱۳۹۵ھ) کو اپنی خدمات کا پٹارہ تو دنیا میں چھوڑ گیا لیکن عمل کے دفاتر کے دفاتر لے کر اللہ رب العزت کے حضور حاضر ہوگیا، جہاں ان شاء اللہ العزیز اُسے اجرِ عظیم سے نوازا گیا ہوگا۔ روح کے پرواز ہونے کے بعد جسدِ خاکی کو دہلی فیروزشاہ کوٹلہ کے قبرستان میں پیوندِ خاک کردیا گیا۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے اس مردِ مجاہد کے مجاہدانہ کارناموں، علمی، دینی و مذہبی خدمات اور سرمایۂ تحریر وتقریر کو قبول فرما کر خصوصی انعامات کی بارش فرمائے، حسنات کو قبول اور سیئات کو معاف فرمائے۔ آمین

•••

(ڈاکٹر) عبید اقبال عاصم
وادیٔ اسماعیل، نزد مسجد ابراہیم، دوہرّہ مافی، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۲
فون نمبر: ۰۹۳۵۸۳۱۸۹۹۵

E-mail: ubaidiqbalasim@gmail.com

مؤرخِ ملت اور علماءِ ہند کا شاندار ماضی

﴿مولانا قاری تنویر احمد صاحب شریفی، ناظم مجلس یادگارِ شیخ الاسلام پاکستان کراچی﴾

❁❁❁

آج تصنیفات و تالیفات کا مواد فراہم کرنا اور طباعت کی جو آسانیاں پیدا ہوگئی ہیں گزشتہ تاریخ میں ہم اہلِ قلم کی محنتوں اور طباعت و اشاعت کا یہ تصور نہیں کر سکتے، تصنیفی سروسامان کی فراہمی جس سے میرا اِشارہ علمی ماخذ کی تلاش اور اس سے استفاضے کی محنت اور مشکلات سے ہے اور ضرورت کے مطابق کاغذ کی کمیابی اور پتھر کی کتابت کے مرحلے سے آگے پتھر کی سلوں پر طباعت کی سست رفتاری کی آزمائش کا آج تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

آج ایک منٹ میں چار رنگوں کی ایک پلیٹ کئی ورق ہر دو طرف چھپے ہوئے مطبوعہ سائز میں تہہ کیے ہوئے فرموں کا ڈھیر لگا دیتی ہے، ذرا گزشتہ صدی کی پہلی دو دھائیوں کا تصور کیجیے کہ علی گڑھ کالج کے کارگزاروں نے اپنے آقاؤں کی خوشنودی کے لیے ان کے اشارۂ چشم و ابرو سے پہلے ہی کالج کے ایک قابل اور قومی خدمت گزار فارغ التحصیل کے ساتھ کیا برتاو کیا تھا؟ یہ مولانا حسرت موہانی مرحوم کا واقعہ ہے، ان کے رسالے کو کالج کے طلباء کے لیے پڑھنا ممنوع قرار دیا تھا، ان کے پریس پر دو ملازمین کو جن میں ایک مشین مین تھا اور دوسرا کاغذ دینے والا تھا، بھگا دیا گیا تھا۔ علی گڑھ کالج کا یہ گریجویٹ جو اپنے مکتب و مدرسے کا مایہ ناز طالب علم تھا قوم و ملت کا خدمت گزار تھا، حریت پسند تھا خود مشین چلاتا تھا اور اس کی رفیقِ حیات فخرِ نسواں پردہ نشین، دوپٹے کو کمر کا پٹکا بنائے مشین میں کاغذ دے رہی تھی، حکومت شرماتی ہے اور حسرت کو اِس محنت سے روکنے کے لیے جیل بھیج دیتی ہے اور علی

گڑھ کالج کے کارِداراور استعمار کے خدمت گزار آگے بڑھتے ہیں اور علاقے کے وکلا کو ان کا مقدمہ لڑنے سے روک دیتے ہیں۔حکومت سرکاری طور پر وکیل کا انتظام کرنا چاہتی ہے تو ملزم اس احسان سے مستفیض ہونے سے انکار کرتا ہے۔

کیا آپ یقین کریں گے کہ وکیل کا انتظام اس شخص نے کیا تھا جو خود بھی ایک خارج الوطن بنگال،کلکتہ کی رہائش اور عشرت کدہ خاندان سے سینکڑوں میل دُور صوبہ بہار کے ایک کوردہ رانچی میں خود بھی عسرت واسارت کی زندگی گزار رہا تھا۔آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ میرا اِشارہ ''امام الہند مولانا ابوالکلام آزادؒ '' کی طرف ہے۔

راقم الحروف نے آپ کے سامنے مولانا حسرت موہانی مرحوم کی زندگی اور خدمت قوم وملت کے میدان میں ان کی مشکلات کی جو تصویر کشی کی ہے وہ مشکلات اور آزمائشیں صرف ان ہی کا حصہ تھیں بلکہ اُس دور کے کتنے ہی اہلِ قلم ہیں جنہیں ان ہی حالات اور آزمائشوں سے گزرنا پڑا تھا،ان میں ایک نام مولانا ابوالکلام آزاد علیہ الرحمہ کا بھی ہے لیکن اِس وقت میرا موضوع مورخِ ملت حضرت مولانا سیّد محمد میاں صاحب نوراللہ مرقدہ ہیں اور میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ قوم وملت کی خدمت کے میدان میں تصنیف وتالیف کے حوالے سے حضرت مؤرخ ملتؒ کو کن مصائب اور آزمائشوں سے گزرنا پڑا تھا،اس سلسلے کے خاص پہلو یہ ہیں:

☆ تصنیف وتالیف کا شوق اور راہ کی مشکلات۔

☆ کتاب کی مٹیریل کی فراہمی کی مشکلات اور کاغذ وغیرہ کی عدم دستیابی وغیرہ۔

☆ حکومت کا روّیہ،کتاب کی ضبطی،مقدمات اور وکلا کی توجہ،ہمدردی اور مسلمان وغیر مسلمان کی عدم تفریق۔

☆ مصنف کی گرفتاری۔

شیخ الاسلام امامنا سیّدنا مولانا سیّد حسین احمد مدنی نور اللہ مرقدہٗ حضرت مؤرخ ملتؒ کو''حیوانِ کاتب'' کی اصطلاح سے یاد فرماتے تھے۔واقعی یہ صفت ان پر صادق بھی

تھی۔ میں نے اپنے جدِ امجد حضرت مولانا قاری شریف احمد صاحبؒ سے سنا تھا کہ حضرت مؤرخِ ملتؒ ریل میں سفر کے دوران اپنی سیٹ پر کسی دوسرے ضرورت مند کو بٹھا کر خود بوگی کے دروازے کے ساتھ فرش پر بیٹھ کر لکھنا شروع کر دیتے تھے۔ ریل کا سفر ہو یا بس کا، سواری کے چلتے ہوئے آپ بلا تکلف لکھتے تھے، اسی لیے آپ کو ''حیوانِ کاتب'' تو ہونا ہی چاہیے تھا۔ پھر یہ لکھنا لایعنی نہیں تھا بلکہ بڑی بڑی کارآمد اور مفید کتابیں مختلف موضوعات پر لکھیں، اگرچہ آپ کا خاص موضوع وقت کی سیاست اور تاریخ تھی۔

حضرت مؤرخِ ملتؒ تحریر فرماتے ہیں :

''جناب (پروفیسر ڈاکٹر محمد ایوب قادریؒ) کے علم میں ہوگا کہ علمائے ہند بالخصوص الفِ ثانی کے علماء احقر کا خاص موضوع ہے۔'' (تذکرہ مؤرخِ ملت ص۲۱۴)

نیز محترم مولانا محمد اسحاق بھٹی مرحوم کو ایک مکتوبِ گرامی میں لکھتے ہیں :

''احقر (مولانا سیّد محمد میاں صاحبؒ) ان تمام بزرگوں کے حالات تلاش کر رہا ہے جنہوں نے ۱۸۵۷ء جہادِ حریت میں حصہ لیا۔ یہ احقر کا خاص موضوع تحقیق ہے۔'' (تذکرہ مؤرخِ ملت ص۲۳۴)

حضرت مولاناؒ کی خدمات بہت زیادہ ہیں، تدریس تقریر اور تحریر میں خاص مہارت رکھتے تھے، جس فردِ واحد نے ہفت روزہ ''الجمعیۃ'' دہلی کے کئی نمبر مثلاً:

☆ شیخ الاسلامؒ (مولانا سیّد حسین احمد مدنی) نمبر
☆ مفتی اعظمؒ (مولانا محمد کفایت اللہ دہلوی) نمبر
☆ امام الہندؒ (مولانا ابوالکلام آزاد) نمبر
☆ مجاہدِ ملتؒ (مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی) نمبر
☆ خواجہ معین الدین اجمیریؒ نمبر

مشائخ و مجاہدینِ آزادی پر مرتب کر دیے، لیکن ان کے دنیا سے جانے کے بعد ان پر کچھ کام نہ ہو سکا۔ گمان تو یہ تھا کہ الجمعیۃ ان پر نمبر شائع کرتا، لیکن بقول مرشدی و سیدی

حضرت مولانا سیّد ارشد صاحب مدنی دامت برکاتہم (موجودہ صدر جمعیت علماءِ ہند):

''ہمارے ہاں اب کوئی قلم کار نہیں رہا جو ہماری تاریخ اور اکابر کے کارناموں کو اُجاگر کرے۔ اب ایسا قلم کار اور مؤرخ اللہ تعالیٰ نے پاکستان میں پیدا کر دیا اور وہ ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہانپوری کی شکل میں ہے۔ ہمارے ہاں اس سلسلے کی آخری کڑی حضرت مولانا سیّد محمد میاں صاحبؒ تھے۔'' اوکما قال!

حضرت مؤرخِ ملتؒ کے جانشین اُستاذ محترم حضرت مولانا سیّد حامد میاں صاحب نور اللہ مرقدہٗ نے آپ کی خدمات وحالات پر ایک مضمون قلم بند فرمایا تھا، آپ اپنی بیماری کی وجہ سے کام کو آگے نہیں بڑھا سکے، اُمید تھی کہ جامعہ مدنیہ لاہور کا ترجمان ماہنامہ ''انوارِ مدینہ'' اس کام کو انجام دے گا لیکن یہ بھی فقط گمان ہی رہا۔ برادرِ عزیز محترم مولانا محمد عابد صاحب حامدی مدظلہٗ نے جب یہ خوشخبری سنائی کہ ''مؤرخِ ملت سیمینار'' منعقد ہو رہا ہے، جس میں حضرت مولانا سیّد محمد میاں صاحبؒ کی خدماتِ عالیہ پر روشنی ڈالی جائے گی اور اُن مقالات کو یکجا کر کے اہتمام سے شائع کیا جائے گا تو اللہ کا شکر ادا کیا کہ اس طرح کافی چیزیں دستاویزات کی شکل میں مجھ جیسے طالب علموں کے سامنے آجائیں گی۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس میں مجھے بھی سعادت مل رہی ہے کہ مؤرخِ ملت کے موضوع پر قلم اُٹھا رہا ہوں اور اِسے بلاشک وشبہ ''محبت وعشقِ بزرگانِ دیوبند'' کہا جاسکتا ہے فللّٰہ الحمد۔

اکابر علمائے دیوبند کو اللہ تعالیٰ نے قبولیت کا درجہ عطا فرمایا ہے ان میں کامیاب ترین مفسر، محدث، مترجم، مصنف، مرشد، مجاہد، مقرر، ادیب وصحافی اور مؤرخ وغیرہ سب ملیں گے جہاں سیّدنا حجۃ الاسلام حضرت الامام مولانا محمد قاسم نانوتوی، امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی، حضرت حافظ محمد ضامن شہید، شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن محدث دیوبندی، حضرت مولانا محمد عاشق الٰہی میرٹھی، شیخ الاسلام حضرت مولانا سیّد حسین احمد مدنی، مفتی اعظم حضرت مولانا محمد کفایت اللہ دہلوی، امام انقلاب حضرت مولانا عبیداللہ سندھی، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی، رئیس القلم حضرت مولانا سیّد مناظر احسن گیلانی، حکیم

الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب قاسمی، سحبان الہند حضرت مولانا احمد سعید دہلوی، مجاہدِ ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی علیہم الرحمہ جیسے اکابر شامل ہیں، وہیں ع

''مولانا محمد میاں بھی اس کے جری دل بندوں میں'' (ساحر مبارک پوری)

ہیں، اور آگے بھی یہ فہرست طویل ہے:

جس کے محاسن کے ظہور کی اُستاذ محترم یقین دہانی کرائیں۔ اللہ اکبر! اُس کی کیا شان ہوگی! اعزاز العلماء حضرت مولانا محمد اعزاز علی امروہوی علیہ الرحمہ مدرسہ شاہی مرادآباد کے اربابِ اختیار کو تحریر فرماتے ہیں:

''آپ اِن (مولانا محمد میاں صاحب) کو بہت زیادہ محنتی اور اوصافِ حسنہ سے موصوف پائیں گے۔'' (تاریخ شاہی نمبر ص:۱۷۴)

دنیا نے دیکھا کہ محنتی بھی خوب تھے اور بہترین اوصاف کے مالک بھی ہوئے۔

اس تمہید کے بعد اب ہم حضرت مؤرخ ملت علیہ الرحمۃ والرضوان کی تاریخی تصنیف ''علماءِ ہند کا شاندار ماضی'' پر ایک نظر ڈالتے ہیں:

یہ عظیم الشان تاریخی تصنیف سب سے پہلے ''علماءِ ہند کی شاندار ماضی'' کے نام سے ۲۰×۳۰/۱۶ سائز پر ۱۹۵۸ء میں کتب خانۂ فخریہ مرادآباد سے شائع ہوئی تھی۔ مصنف حضرت مولانا محمد میاں صاحبؒ اس کے پس منظر میں تحریر فرماتے ہیں:

''سیاسیاتِ ہند کا موجودہ دور چونکہ اُن حالات کا نتیجہ ہے جو سلطان عالمگیر رحمہ اللہ کے بعد پیدا ہوئے لہٰذا علمائے ہند کی شاندار ماضی کا آغاز سیّدنا شاہ ولی اللہ صاحب قدس سرہ العزیز کے حالات سے کیا گیا تھا۔ کیونکہ آپ کے زمانے سے جس طرح سیاسیاتِ ہند کا ایک نیا باب شروع ہوتا ہے، اسی طرح علمائے ربانیین کی اصلاحی اور انقلابی خدمات کا بھی ایک جدید سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ چنانچہ تقریباً نصف حصے کی کتابت ہوچکی تھی مگر اس خیال سے کہ ملت اسلامیہ کی روایات ''الف ثانی'' (دوسرے ہزارہ) کو ایک سنجیدہ دور قرار دیتی ہیں، نیز اس

لیے کہ وہ گلشن ربانی جو آج کائناتِ علمی کے لیے فردوس بنا ہوا ہے، اس کے سب
سے پہلے باغبان حضرت مجدد صاحب قدس اللہ سرہ العزیز ہی ہیں۔ضروری معلوم
ہوا کہ اس شجرۂ طوبیٰ کے موسسِ اوّل کے مختصر حالات سے اس ناچیز کی تصنیف کو
شرف اندوز کیا جائے۔'' (علماءِ ہند کی شاندار ماضی حصہ اوّل ص ۱،۲ طبع اوّل)

غور فرمایئے کہ اُس وقت کی دُشواریاں اور نصف کتاب کتابت کے مراحل سے گزر چکی ہو، اُس کے بعد شروع میں اضافت کی ٹھانی ہو تو مصنف سے زیادہ کاتب کو کتنی دُشواری ہوئی ہوگی؟ اور مصنف پر بھی مالی بوجھ پڑا ہوگا جبکہ اس وقت آمدنی ہی شاید سوڈیڑھ سو روپے ہوگی ؟ اور پھر حضرت مولانا سیّد محمد میاں صاحبؒ بلا جھجک فرماتے ہیں کہ اس اضافے کا خیال کیسے آیا؟ تحریر فرماتے ہیں :

''ناسپاسی ہوگی اگر تاریخ اور انساب کے مبصر اور ماہر جناب محمود احمد صاحب
عباسی امروہوی (۱) کا ذکرِ خیر اس موقع پر نہ کیا جائے۔ واقعہ یہ ہے کہ آپ کی
فہمائش و فرمائش ہی سے اس اضافے کا داعیہ احقر (مولانا سیّد محمد میاںؒ) کے دل
میں پیدا ہوا، نیز یہ اعتراف بھی ضروری ہے کہ مولانا محمد منظور صاحب نعمانی کے
رسالہ ''الفرقان'' کا ''مجدد نمبر'' خاکسار کے لیے اس اضافے کی تکمیل میں بہت
زیادہ معین ثابت ہوا۔'' (علمائے ہند کا شاندار ماضی حصہ اوّل ص ۱ حاشیہ)

☆ اس کتاب کے حصہ اوّل میں حضرت مجدد صاحبؒ کے حالات اور خدمات، رسومات کے خلاف ان کے جہاد، ان کے خلفاء اور صاحبزادگان کی خدمات کا تذکرہ ہے۔ اس حصے کے ۱۷۱ صفحات ہیں، اس پر ۱۵ ؍شوال المکرّم ۱۳۵۸ھ/ ۲۸ ؍نومبر ۱۹۳۹ء کی تاریخ درج ہے۔

☆ حصہ دُوم میں حکیم الہند حضرت مولانا شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور سراج الہند حضرت مولانا عبدالعزیز محدث دہلویؒ کے حالات و خدمات، اسلام اور سیاست، سیاست اور علماء، ان کے سیاسی ماحول کا ذکر ہے۔ یہ حصہ ۱۸۴ صفحات پر مشتمل ہے۔

☆ حصہ سوم میں سیّدنا حضرت سیّد احمد شہیدؒ بریلوی اور حضرت مولانا شاہ محمد

اسماعیل دہلوی شہیدؒ کے حالات، جہادی خدمات، لفظ وہابی کی ایجاد، انگریز سے دشمنی اور دیگر عنوانات زیر بحث آئے ہیں۔اس حصے کے ۲۸۲ صفحات ہیں۔

☆ حصۂ چہارم میں ''۱۸۵۷ء کی خونی داستان'' کے عنوان کے تحت وجوہات جہاد، خاندانِ ولی اللّٰہی اور اکابر دیوبند کی خدمات کا مختصر تذکرہ ہے۔ یہ حصہ ۷۱ صفحات پر مشتمل ہے۔اس پر حضرت مولاناؒ نے ۴؍ربیع الاوّل ۱۳۵۸ھ/۲۴؍اپریل ۱۹۳۹ء کی تاریخ درج کی ہے۔

☆ حصہ پنجم میں تحریک دارُالعلوم دیوبند، شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن محدث دیوبندیؒ اور آپ کے ہم عصر تلامذۂ کرام خصوصاً شیخ الاسلام حضرت مولانا سیّد حسین احمد مدنی قدس سرہٗ کی خدمات عالیہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے ۲۶۲ صفحات ہیں اور ۷؍ شعبان المعظم ۱۳۵۸ھ/۲۲ ستمبر ۱۹۳۹ء کی تاریخ درج ہے۔(۲)

اس کتاب کو تصنیف کرنے کی غرض وغایت نہایت ہی لطیف پیرائے میں بیان کرتے ہوئے حضرت مؤرخِ ملتؒ تحریر فرماتے ہیں :

> ''آج کی دنیا میں سیاست کا لفظ دین اور حاملِ دین یعنی مولوی کے لیے مشکوک ہے، بیس پچیس سال پیشتر یہ لفظ قطعاً بے جوڑ مانا جاتا تھا، قیادت اور سیادت کے خود ساختہ مدعی آج بھی یہی فرماتے ہیں کہ ''مذہب کو سیاست سے کیا واسطہ؟ علماء کو سیاست سے کیا تعلق؟''
>
> لیکن سوال یہ ہے کہ جو شخص دینِ اسلام کو اس درجہ ناقص سمجھے، اُس کو دعوائے اسلام سے کیا واسطہ؟ مسلمانوں کی قیادت وسیادت سے کیا تعلق ؟
>
> ﴿كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ اِنْ يَّقُوْلُوْنَ اِلَّا كَذِبًا﴾(سورۃ الکہف)
>
> ''کسی قدر نازیبا بات ہے جو اِن کے منہ سے نکلی؟ سراسر جھوٹ بول رہے ہیں۔''
>
> اچھا آپ سیاست کے اجزا کی تحلیل کیجئے اور پھر دیکھئے کہ علما کو سیاست سے کیا تعلق ہے؟ ممکن ہے لفظ سیاست سے آپ بآسانی اس کے اجزا تک نہ پہنچ سکیں، ممکن ہے لفظ سیاست کے لیے دوسرا لفظ ''تدبیر ملک'' یعنی ملکی انتظامات ہوں ! ہاں ایک قسم

سیاست کی اور بھی ہے یعنی ''تدبیر ملت!''

تدبیر ملک یعنی ملکی انتظامات کے بہت سے باب آپ کے سامنے آئیں گے مثلاً:

(۱) باہمی تعلقات کا قانون (۲) بین الاقوامی روابط کا قانون

(۳) قانونِ اراضی (۴) قانونِ زراعت (۵) قانونِ صنعت

(۶) قانونِ تجارت (۷) قانونِ حفظانِ صحت (۸) قانونِ عدالت

(۹) قانونِ تحفظ (۱۰) قانونِ مدافعت وغیرہ۔

لیکن تمام ابواب صرف تین لفظوں میں مدغم ہو جاتے ہیں :

قانون بنانا، جاری کرنا، اس کو محفوظ کرنا۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ اسلام کیا ہے؟ ممکن ہے آپ جواب دیں کہ مجموعۂ عبادات اور اخلاق کا نام اسلام ہے، لیکن یقین جانیے کہ یہ جواب دے کر آپ اسلام کی سخت ترین توہین کریں گے، نیز آپ ثابت کر دیں گے کہ آپ یورپ کے پروپیگنڈے سے پوری طرح متاثر ہو چکے ہیں جس کا منشاء ہے کہ اسلام کو سیاست سے بیگانہ قرار دے کر مسلمانوں کو بحیثیتِ مذہب پالیٹکس سے نابلد کر دیا جائے، تاکہ کسی سیاسی معاملے میں بھی حمیتِ اسلام کا جوش ان کے دل میں پیدا نہ ہو اور اس طرح اقتدارِ یورپ لازوال ہو جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ آپ کتنے ہی مصنف مزاج، معاملہ فہم، قانون داں یا مدبر کیوں نہ ہوں، آپ ہر ملک اور ہر قوم کے طبعی رجحانات، مقامی یا قومی ضروریات سے ہرگز واقف نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا آپ کی معاملہ فہمی، مصنف مزاجی اور قانون دانی صرف اُسی قوم اور ملک تک محدود ہو جاتی ہے جس سے آپ کا تعلق ہے بلکہ صرف اُسی طبقے تک جس کے آپ ایک فرد ہیں۔ اگر آپ زمین دار ہیں تو آپ کو کاشتکاروں کے درد اور دُکھ کا پورا احساس نہیں، اگر آپ مزدور ہیں تو آپ کو مالکانِ مل کی ضروریات کا صحیح انداز نہیں۔

دوسری صورت یہ ہے کہ دنیا میں بسنے والے تمام طبقے ایک دوسرے سے اس طرح جکڑ بند ہیں کہ کسی ایک طبقے کی بے چینی تمام طبقات پر اثر انداز ہوتی ہے اور رُوس

فرانس جیسے انقلابات پیدا کر دیتی ہے ۔ہاں انسانی طبقات کے تمام افراد کے میلانات اور رُجحانات ان کی قومی اور ملکی ضروریات سے اگر کوئی صحیح اور مکمل طور سے واقف ہوسکتا ہے تو صرف وہی جس نے ان سب کو پیدا کیا جس نے طبقات انسانی کی کشاکش کے وقت ،فرعونیت اور نمرودیت کے مظاہروں کے وقت ،غریب اور کمزور بندوں کی لاچاری اور بے بسی کے وقت انبیاء علیہم السلام کو بھیج کر اعلان کیا

﴿ نُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِي الْاَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ اَئِمَّةً وَّنَجْعَلَهُمُ الْوَارِثِيْنَ وَنُمَكِّنَ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ ﴾ (سورۂ قصص : ۵، ۶)

''ہم چاہتے ہیں کہ احسان کریں اُن پر جو کمزور بنائے گئے ملک میں اور یہ کہ ہم ان کو سردار بنادیں اور ان کو قائم مقام (وارثِ ملک) کر دیں اور ان کو مُلک میں جمادیں۔''

اور پھر جب کمزور یا مفلس انسانوں نے اپنی بدتدبیری، جہالت اور نادانی کو چھپاتے ہوئے محض عناد یا حسد اور بغض کے طور پر اہلِ ثروت کو بری نگاہ سے تاکنا شروع کیا تو ان کو تنبیہ فرمائی :

﴿ نَحْنُ قَسَمْنَابَيْنَهُمْ مَعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ رَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا ﴾ (سُورۂ زخرف : ۳۲)

''ہم نے دنیاوی زندگی میں ان کے درمیان ان کی روزی تقسیم کر دی اور ایک کے ایک پر درجے بڑھائے تاکہ ایک دوسرے پر قابو پا سکے اور اس طرح نظامِ دنیا درست رہے۔''

﴿ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ﴾ (سُورة الجمعة : ۴)

''یہ اللہ کا احسان ہے جس کو چاہتا ہے بخش دیتا ہے۔''

اس نے کامل اور مکمل قانون انسان کو عطا فرمایا جس کا نام ''قرآن'' ہے جس کا آغاز ہی رَحْمٰن اور رَحِيْم کے نام سے ہوا اور افتتاحی خطبے میں پہلی وصف رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ فرمائی اور اس کو اپنے ایسے مقرب اور کامل ترین بندے کے ذریعے سے پہنچایا جس کا خطاب رَحْمَةٌ لِلْعَالَمِيْنَ ہے جس نے اپنے ارشاداتِ مبارکہ کے

ذریعے اس کی تشریح اور تفسیر فرمائی۔

بے شک یہی قانون ہر انسان اور ہر طبقہ انسان کے ساتھ مساویانہ اور مربیانہ عدل و انصاف کرسکتا ہے اور یہی قانون اور اولادِ آدم کی ہر ایک مصیبت کو دُور اور اس کی ہر ایک ضرورت کو پورا کرسکتا ہے۔ اس کتاب مکمل کے اصولی دستور اور اس کی نبوی تشریحات کی روشنی میں جزوی قوانین (بائی لاز) مرتب کیے گئے، ان کا نام ''فقہ'' ہے۔

آپ حدیث یا فقہ کی کسی کتاب کو اُٹھا کر دیکھیے اور محض ابواب کی فہرست پر نظر ڈال لیجئے، آپ نماز، روزے کے متعلق اگر دس صفحات دیکھیں گے تو کم از کم سو صفحات اُن ہی ابواب کے متعلق پائیں گے جن کو ملکی انتظامات کے سلسلے میں ہم نے بیان کیا۔ پھر کیا اسلام کی اس ہمہ گیری کے باوجود بھی آپ کہہ سکتے ہیں کہ اسلام کو سیاست سے کیا واسطہ؟ علما کو سیاست سے کیا تعلق؟

سیاست کی دوسری قسم تدبیر ملت اور علماء کی قیادت اسی قانونِ الٰہی کو دنیا میں نافذ کرنا اور اس کے نافذ کرنے کی قوت کو فراہم اور محفوظ رکھنا تدبیر ملت ہے جو مخصوص طور پر مسلمانوں کا فرض ہے! چنانچہ ارشادِ ربانی ہے :

﴿ وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا وَجَائَتْكُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ وَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا كَذٰلِكَ نَجْزِ الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلَائِفَ فِي الْاَرْضِ مِنْ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ﴾ (سورۂ یونس:۱۴،۱۳)

''ہم نے تم سے پہلے قوموں کو ہلاک کر دیا جبکہ وہ ظالم ہوگئے حالانکہ ان کے سامنے اُن کے رسولوں (علیہم السلام) نے کھلی کھلی نشانیاں پیش کی تھیں مگر وہ ایمان لانے والے نہ تھے، ہم اِسی طرح مجرم قوموں کو سزا دیا کرتے ہیں پھر ہم نے تم کو ان کے بعد زمین میں قائم مقام بنا دیا تاکہ دیکھیں تم کس طرح عمل کرتے ہو۔''

نیز ارشاد ہوا :

﴿ وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّ مِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ ﴾ (سُورة الانفال : ٦٠)

''ان (مخالفینِ اسلام) کے لیے جس قدر بھی طاقت اور سرحدی

چھاؤنیوں پر بندھنے والے گھوڑے تیار رکھ سکو، رکھو، جس سے تم اپنے دشمنوں اور خدا کے دشمنوں کو خوفزدہ کرتے رہو۔'' پھر اس قانونِ مکمل کی مہارت اور اس کی بصیرت حاصل کرنے کے متعلق ارشاہوا :

﴿ فَلَوْ لَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْ فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ ﴾ (سُورة التوبة : ۱۲۲)

''مسلمانوں کے ہر ایک گروہ میں سے ایک جماعت کیوں نہیں کوچ کرتی تا کہ دین کی بصیرت حاصل کریں اور جب وہ اپنی قوم کی طرف ہوں تو ان کی اصلاح و اِمداد کریں، توقع ہے کہ قوم کے لوگ (بری باتوں سے) بچنے لگیں گے۔''

آپ نے ملاحظہ فرمایا! ماہرینِ قانون کا فرض کیا قرار دیا گیا ہے؟ وہی جو انبیاء علیہم السلام کا فرض ہے۔ یعنی بے دینی کے خطرات سے ڈر کر دین کی پابندی پر آمادہ کرنا۔ اسی بناء پر احادیث میں علماءِ کرام کو انبیاء کا وارث قرار دیا گیا، ان کو انبیاءِ بنی اسرائیل سے تشبیہہ دی گئی ہے۔

ارشاد ہوا: عُلَمَاءِ اُمَّتِيْ كَاَنْبِيَاءِ بَنِيْ اِسْرَائِيْلَ. (الحديث)

تو کیا ملتِ اسلامیہ کا قائد انبیاء علیہم السلام کے بعد وارثانِ انبیاء علیہم السلام کے سوا کوئی اور ہوسکتا ہے؟'' (علمائے ہند کی شاندار ماضی ج۱ ص۱۳ تا ۱۷)

☆غور فرمایئے! کتنی وضاحت کے ساتھ قرآن وحدیث کے دلائل سے ثابت ہو گیا کہ علماءِ کرام کی ذمہ داریاں کیا ہیں ؟

جن علماء کو اللہ تعالیٰ نے سیاسی ذوق دیا ہے وہ اسے ضرور پورا کریں اور مروجہ سیاست دانوں کو دکھلائیں کہ سیاست ''ایمان داری'' سے ہی ہوسکتی ہے، بے ایمانی سے سیاست کی تو کیا کی؟

''علماءِ ہند کا شاندار ماضی'' کا پس منظر ابھی آپ کے سامنے گزرا، دل پر ہاتھ رکھ کر بتایئے کہ جس وقت یہ کتاب پہلی مرتبہ بازار میں آئی ہوگی اور حاکمِ وقت جو خائن ہونے کے ساتھ ساتھ قابض بھی تھا، اُس تک بھی پہنچی، کیا وہ اسے برداشت کرسکتا تھا؟ جواب

اثبات میں نہیں ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا ''علماءِ ہند کا شاندار ماضی'' جیسے ہی انگریز حاکم کی میز پر پہنچی فوراً احاکمانہ جابرانہ فرمان آ گیا کہ کتاب کو ضبط کر لیا جائے اور مصنف کو گرفتار کر کے مقدمہ چلایا جائے۔

حضرت مصنف علام علیہ الرحمہ ہی کے قلم سے اس کی تفصیل بھی ملاحظہ فرما لیجئے، اس سے کتاب کے لکھنے کا مقصد بھی واضح ہو رہا ہے۔ فرماتے ہیں:

''مقصد خطرناک نہیں تھا، ایک تاریخی حقیقت کا اظہار مقصود تھا اور تجرباتِ ماضی سے مستقبل کے لیے سبق حاصل کرنا، مگر نوکر شاہی حکومت جس کی بنیاد آرڈینیسوں پر قائم تھی اور ڈیفنس آف انڈیا رُولز کی سنگینوں سے اپنی حفاظت کر رہی تھی، اس بہتر مقصد کو برداشت نہ کر سکی۔ پریس ایکٹ اور ڈیفنس انڈیا رُولز کی متعدد دفعات کے ماتحت احقر (مولانا سیّد محمد میاں صاحب) پر مقدمہ دائر کر دیا، کتاب کی ضبطی اور احقر کی گرفتاری کے احکام نافذ کر دیے۔ تقریباً دو ماہ تک جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مراد آباد کی درسگاہ کے بجائے مجسٹریٹ کے کورٹ میں مجرمانہ طور پر حاضری دینی پڑی۔''

یہ جرم عجیب تھا ہر ایک ہندوستانی کو اس جرم سے دلچسپی تھی لہٰذا پاداشِ جرم عوام کی بے پناہ ہمدردی کا باعث بن گیا اور مقدمے کی ہر ایک تاریخ پر کثرتِ ہجوم کچہری کے کمروں کا گلا گھونٹنے لگا، خصوصی کرم فرما اور رُفقاءِ کرام کے علاوہ وکلاء صاحبان نے جس ہمدردی کا ثبوت دیا اس کا تذکرہ کتاب کی زندگی تک باقی رہنا چاہیے۔ (۳)

سیّد ظفر حسن صاحب واسطی وکیل بابو ہردے نارائن صاحب وکیل، حافظ جمیل صاحب (اومری) وکیل، بابو جیورام صاحب وکیل، حبیب الحسن صاحب وکیل نے اپنی خدمات پیش فرمائیں اور وکالت نامے پر دستخط کر دیے۔ بابو رگھندن کشور شوق وکیل اور بابو نمی سرن صاحب ایڈوکیٹ بجنور نے بحث میں کامیاب حصہ لیا۔

بابو ہردے نارائن صاحب وکیل، سیکٹری بار ایسوایشن مراد آباد و سیکریٹری برجرتن اور لاہریری مراد آباد نے جس جانفشاں اور ہمدردی کے ساتھ اس مقدمے میں کام کیا، اس کی نظیر ملنی مشکل ہے۔ آپ نے اس مقدمے کو اپنا مقدمہ سمجھا اور اس کے لیے وہی

کوشش کی جو اپنے مقدمے کے لیے ہوسکتی ہے۔ مقدمے سے فراغت کے بعد احقر نے ایک ہدیہ پیش کرنا چاہا مگر ہردے نارائن کی وفا شعار طبیعت نے اس کو گوارا نہ کیا، پیشانی پر شکن پڑ گئی کہ آپ نے مجھے دوست نہیں سمجھا۔ مجھے فوراً سرور کائنات ﷺ کی حدیث یاد آ گئی!

اَلنَّاسُ مَعَادِنُ كَمَعَادِنِ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ خِيَارُهُمْ فِي الْجَاهِلِيَّةِ خِيَارُهُمْ فِي الْإِسْلَامِ إِذَا فَقِهُوْا. (مشکوۃ شریف کتاب العلم رقم الحدیث ۲۰۱)

''سونے چاندی کے معادن (کانوں) کی طرح انسان بھی معادن ہیں، جو زمانہ جاہلیت میں بہتر تھے وہ اسلام میں بھی بہتر ہیں، بشرطیکہ ان میں مہارت اور بصیرت حاصل کریں۔''

طبیعت چاہتی ہے کہ ایسے شریف انسان، دولتِ اسلام سے مشرف ہوں تاکہ دنیا و عقبیٰ کا شرف جاوداں حاصل کرلیں۔ خدا کرے کہ یہ دعا قبول ہو؟

احقر (مولانا سیّد محمد میاں صاحبؒ) کی مخلصانہ خواہش یہی ہے کیونکہ احقر کے نزدیک سب سے بڑی دولت یہی ہے۔ **وللناس فیما یعشقون مذاهب**

مقدمہ مرتب (قائم) کرنے میں سی آئی ڈی نے کافی محنت کی، کوئی حصہ اعتراض سے خالی نہ تھا، فل اسکیپ کے چوبیس صفحات ان عبادتوں سے پُر ہو گئے تھے مگر کاسہ چشم سی آئی ڈی پُر نہ ہوا تھا۔ جب احقر نے جوابات مرتب کر کے پیش کیے تو معلوم ہوا کہ سی آئی ڈی کی ہوس ''هَلْ مِنْ مَّزِيْد'' نے اور عبارتوں کا اضافہ کر دیا ہے، بالآخر سٹی مجسٹریٹ رام گوپال مصرا نے پولیس کو ہدایت کی کہ ۲۴؍جون ۱۹۴۰ء تک وہ تمام عبارتیں معین کر دیں جن پر اس کو اعتراض ہے۔

قانون دان حضرات کا خیال تھا کہ عبارتوں کا حوالہ پیش کر دینا کافی نہیں کیونکہ دفعہ ۱۲۴۔الف کے ماتحت حکومت کے برخلاف برانگیختہ کرنے کا الزام پھر بھی باقی رہ جائے گا اور رام گوپال مصرا کی شدت پسند طبیعت طویل سزا کا تعین دلا سکتی تھی، لیکن جب تا اختتام اجلاس سزا تجویز کی گئی اور حکم بھی ایسے وقت سنایا کہ پندرہ بیس منٹ بعد

اجلاس ختم ہورہا تھا تو احقر کی حق پسندی نے مجبور کیا کہ حاضرین کے ہجوم کو مخاطب کر کے اس حقیقت کا اظہار کرنے کا منشائے کتاب کو معلوم کرنا بہت زیادہ کاوش کا محتاج تھا۔ یہی سبب ہوا کہ سی آئی ڈی نے یہ مقدمہ دائر کیا مگر مجھے (مولانا محمد میاں صاحب کو) احساس ہے کہ مجسٹریٹ صاحب نے اس مقدمے میں پوری توجہ سے کام لیا۔ میں نے دورانِ مقدمہ میں اندازہ کیا کہ آپ ایک صحیح فیصلے تک پہنچنے کے لیے مضطرب تھے، ادائے فرض کے لیے آپ کی جدوجہد مجھے شکریہ پر مجبور کررہی ہے اور مرادآباد کی بیشتر آبادی جس کی ہمدردی میرے ساتھ ہے، وہ بھی جناب کی شکرگزار ہے۔ مجسٹریٹ صاحب نے میری انصاف پسندی کا شکریہ ادا کیا اور اجلاس برخواست ہوگیا۔'' (علمائے ہند کی شاندار ماضی ج اص الف با تا ج)

اللہ اکبر! پہلے دور میں کتاب کا تصنیف کرنا یا تالیف کرنا نہایت ہی دُشوار تھا پھر اس کے بعد اس کی اشاعت میں دُشواری دو چند تھی اور پھر اگر وہ کتاب حاکم کی میز پر پہنچ جائے تو کورٹ کچہری کے لیے جوتیاں گھسنے نہیں بلکہ توڑ دینے والے چکر سر چند بلکہ اس سے بھی کہیں بڑھ کر ''آفات'' بابت ہوتی تھیں۔

آج تو کتاب لکھنا، جمع کرنا عموماً نااہلوں کا کاروبار بن گیا ہے۔ ہمارے محترم مولانا مفتی محمد اسرار صاحب زادمجدہٗ (فاضل جامعہ علوم اسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی) مولانا محمد ارسلان ابن اختر میمن کے متعلق فرمایا کرتے ہیں کہ ''اگر کتابیں چھاپنے پر سزائے موت ہوتی تو عدالت میں اس پر مقدمہ دائر کرتا۔'' یہ تو ایک مثال ہے ایسے کتنے ہوں گے؟

ہمارے محبوب حضرت مولانا سیّد محمد میاں صاحب علیہ الرحمہ حقیقی مصنف تھے اور آفات کی زد میں بھی آئے۔ جس مقدمے کا سطورِ بالا میں ذکر ہوا یہ ۸/اگست ۱۹۴۰ء کو ختم ہوگیا۔ حضرت مصنف علامؒ نے اس موقع پر جن حضرات کا شکریہ ادا کیا ہے اُن میں :

(۱) حضرت مولانا عبدالحق صاحب مدنی، مہتمم جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مرادآباد
(۲) حضرت مولانا سیّد فخرالدین احمد صاحب، شیخ الحدیث جامعہ قاسمیہ مرادآباد
(۳) جناب مولوی عبدالحفیظ صاحب، رئیس اعظم بچھراوں ضلع مرادآباد

(۴) جناب مولوی عبدالسلام صاحب، رئیس بچھرایوں
(۵) جناب قاضی ثروت حسین صاحب، مرادآباد
(۶) جناب قاضی اتفاق حسین صاحب، رئیس مرادآباد
(۷) مولانا حافظ محمد اعلیٰ صاحب دیوبندی، ناظم مدرسہ اعزاز العلوم
(۸) مولانا حکیم انظار احمد صاحب، طبیب مرادآباد
(۹) حافظ سیّد سادات حسن صاحب
(۱۰) جناب منشی سراج الدین خاں صاحب

حضرت مولانا سیّد محمد میاں صاحبؒ ان ناموں کو ذکر کرنے بعد تحریر فرماتے ہیں :

''(ان) جیسے بزرگوں اور دوستوں کی خصوصی عنایات نے ہمیشہ کے لیے شکر گزار بنادیا۔''

حضرت شیخ الاسلام مولانا سیّد حسین احمد صاحب مدنی، صدر جمعیۃ علماءِ ہند اور اُستاذ العلماء حضرت مولانا اعزاز علی صاحب مفتی اعظم دارُالعلوم دیوبند کی پدرانہ شفقت اور بزرگانہ عنایت کو شمار کرانا غیر محدود کو محدود کرنے کے مرادف ہے۔ (علماءِ ہند کی شاندار ماضی: ج۱،ص د)

اس مقدمے میں ''صفائیِ شہادت'' جن بزرگوں نے دی ان کے متعلق حضرت مؤرخ ملتؒ فرماتے ہیں:

''اس مقدمے میں صفائی شہادت کے یہ معنٰی تھے کہ جن الفاظ یا عبارتوں پر اعتراض تھا اُن کے متعلق یہ ثابت کردیا جائے کہ جس کتاب کا حوالہ دیا گیا ہے وہ واقعتاً اس میں موجود ہے۔ احقر (مولانا سیّد محمد میاں صاحبؒ) نے تمام حوالوں کو مرتب کردیا تھا اور حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب ناظمِ اعلیٰ جمعیۃ علمائے ہند، حضرت مولانا بشیر احمد صاحب رُکن مجلس مرکزیہ جمعیۃ علمائے ہند، حضرت الحاج مولانا محمد اسماعیل صاحب ایم ایل اے مدرس مدرسہ شاہی مرادآباد، جناب عبداللطیف صاحب چیئر مین بجنور جناب قاضی اتفاق حسین صاحب رئیس مرادآباد، جناب الطاف حسین سہنس پور نے

گواہِ صفائی کی حیثیت سے ان عبارتوں کو اصل کتابوں میں سے پڑھ مقابلہ کر دیا۔''
(علماءِ ہند کی شاندار ماضی ج ا ص د)

اس مقدمے میں مجسٹریٹ نے کتاب کی ضبطی کا کوئی حکم نہیں دیا تھا لیکن پولیس نے ڈیفنس آف انڈیا رُولز کے ماتحت اس کی طباعت واشاعت ممنوع قرار دی۔ پولیس کا یہ اقدام ماورائے عدالت تھا۔ عدالت نے تو کتاب کے ضبط شدہ نسخے واپس کر دیے لیکن پولیس نے ان کی تلاش جاری رکھی اور لطیفہ یہ ہوا کہ جب تمام ایڈیشن ختم ہو گیا اور مقدمے کو بھی چھ ماہ گزر چکے تھے، تب پولیس کو خیال آیا کہ حضرت مولانا حکیم انظار احمد صاحبؒ کے مکان کی تلاشی لی جائے، جب تلاشی لی گئی تو کچھ بھی نہ نکلا حالانکہ سات ماہ پہلے کتاب کا اسٹاک ان ہی کے گھر تھا۔

یہاں تک ''علماءِ ہند کی شاندار ماضی'' کے پہلے ایڈیشن کی بات تھی، اس سے ہمیں کتاب کی تصنیف، اس کی اشاعت اور اس کے بعد کی مشکلات کا علم ہو گیا، لیکن جب اس کی دووسری اشاعت ہونے لگی تو حضرت مؤرخِ ملت نور اللہ مرقدہٗ نے اس میں اضافات فرمائے۔ پہلے کتاب کا نام ''علمائے ہند کی شاندار ماضی'' تھا۔ راقم الحروف نے اپنے جدامجد حضرت مولانا قاری شریف احمد صاحبؒ سے بارہا سنا کہ مجاہدِ ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب قدس اللہ سرہ العزیز نے مولانا سے فرمایا کہ ''کی'' کی جگہ ''کا'' ہونا چاہیے۔ حضرت مؤرخ ملتؒ نے حضرت مجاہدِ ملتؒ کی اصلاح قبول فرمالی۔ اصلاح کے قبول کی صفت بھی آج کل کے مؤلفین اور مصنفین میں عنقا ہے۔

اس کتاب میں نظرِ ثانی اور اضافات کی تفصیل بھی حضرت مؤرخِ ملتؒ کے قلم سے پڑھ لیجئے۔ یہ فرماتے ہیں:

''جس شخص کا عقیدہ یہ ہو کہ مناظرہ اور مقابلے کے وقت پر وہ سنجید حرکت جو اَعداءِ ملک وملت کے کیمپ میں غیظ وغضب پیدا کر دے عنداللہ مستحق ثواب ہے اور اس عقیدے نے اس درجے پختگی حاصل کر لی ہو کہ ایسے اضطراب انگیز افعال و

اعمال بھی اُس کے دل میں سکون پیدا کریں جو مخالف کیمپ میں کھلبلی ڈال دیں تو کسی آرڈیننس کی سخت گیری کسی ہنگامی یا دوامی قانون کی پاداش وعقوبت اُس کے ارادوں میں کمزوری اور عمل میں سستی نہیں پیدا کرسکتی۔ چنانچہ احقر (مولانا سیّد محمد میاں صاحبؒ) نے فوراً ہی طبع ثانی کا ارادہ کرلیا اور اگرچہ دُشواری سامنے تھی کہ ڈیفنس آف انڈیا رُولز کے دور میں کوئی پریس طباعت کے لیے تیار نہ ہوگا، مگر تاہم بہ نام خدا کتابت شروع کرادی۔ (۴) اور چونکہ طبع اوّل میں بہت سے تفصیل طلب اجزا نہایت اختصار کے ساتھ آئے تھے اوران کے متعلق اہلِ بصیرت حضرات کو اِیجاز واجمال کی شکایت باقی رہ گئی تھی، لہٰذا کتابت کے ساتھ احقر نے نظر ثانی کا سلسلہ بھی شروع کردیا اور حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحبؒ سابق ناظمِ اعلیٰ جمعیت علماءِ ہند نائب امیر شریعت صوبہ بہار کی خواہش کے بموجب ''علماءِ ہند کے شاندار کارنامے'' اس کا نام تجویز کیا۔'' (۵)

ایک طرف کاموں کا ہجوم دوسری جانب کتابت کی سست رفتاری! نتیجہ یہ ہوا کہ کتابت اُس زمانے میں مکمل ہوئی کہ ۱۹۴۲ء کی تحریک کا بگل بج چکا تھا اور حضرت شیخ الاسلام مولانا سیّد حسین احمد صاحب گرفتار ہو چکے تھے۔ حضرت مدظلہ العالی کے مقدمے کی بے پناہ مشغولیت سے ابھی فراغت نہ ہوئی تھی کہ ۸/ اگست ۱۹۴۲ء کا دورآ پہنچا اور مطبع کے بجائے جیل کا راستہ اختیار کرنا پڑا ع

مادرچہ خیالیم وفلک درچہ خیال

۸/ جون ۱۹۴۲ء کو رہائی کے بعد اگرچہ پریس تک پہنچنا ممکن ہو گیا تھا مگر کاغذ مفقود تھا اور پرمٹ ان کتابوں کے لیے مخصوص تھا جو انگریز کی مدح سرائی اور انگریزی افواج کی حوصلہ افزائی کریں۔ (۶)

طباعت کی ایک امکانی صورت یہ تھی کہ کسی ایسے کتب خانے سے معاملہ کیا جائے جس کے پاس کاغذ کا کوٹہ ہو، چنانچہ تقریباً ایک سال بعد کتب خانہ رشیدیہ دہلی اس کے لیے تیار ہوا مگر اتفاقات کی بوقلمونی ملاحظہ ہو کہ اِسی اثنا میں الیکشن کی گرم بازاری نے تمام پریسوں کو اپنے اندر مشغول کرلیا اور اس سے فراغت ہوئی تو

مارکیٹ سے کاغذ ناپید ہو گیا۔ بہر حال خدا خدا کر کے جولائی ۱۹۴۶ء میں طباعت کا سلسلہ شروع ہو سکا اور اب ذی الحجہ ۱۳۶۵ھ/ نومبر ۱۹۴۶ء میں خدا کے فضل و کرم سے یہ نوبت آئی ہے۔ کتاب کے پہلی جلد ناظرین کرام کی خدمت میں پیش ہے۔'' (علماءِ ہند کا شاندار ماضی: ج۱، ص ۵و)

استدراک :

''علماءِ ہند کا شاندار ماضی'' کا حصہ پنجم جس میں اکابر علماءِ دیوبند کی سیاسی اور ملی خدمات کا ذکر تھا، حضرت مؤرخ ملت رحمۃ اللہ علیہ نے اسے ''شاندار ماضی'' سے الگ کر کے ''علماءِ حق اور اُن کے مجاہدانہ کارنامے'' کے نام سے دو جلدوں میں مرتب کر دیا تھا۔ حضرت مؤرخِ ملتؒ نے اس کتاب کو ۱۹۳۹ء میں تالیف فرمایا اس کے شروع میں ہندوستان سے متعلق انگریزوں کی پالیسی، سر سیّد احمد خاں فریب خوردہ عقل مند، دارُ العلوم دیوبند کا قیام، درس کے اصول اور حالات، امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ کی انڈین نیشنل کانگریس کا قیام اور اس کے مقاصد بھی تفصیل سے ذکر کیے گئے ہیں۔ یہ کتاب بھی ۱۶/۳۰×۲۰ میں شائع ہوئی تھی۔ یہ اس کا پہلا ایڈیشن تھا۔

حضرت مؤرخ ملتؒ کے صاحبزادے محترم حضرت الاستاذ شیخ الحدیث مولانا سیّد حامد میاں صاحبؒ کے ایما اور اجازت سے پاکستان میں سب سے پہلے اسے حضرت مولانا قاری شریف احمد صاحبؒ نے اپنے مکتبہ (مکتبہ رشیدیہ کراچی) میں شائع کیا تھا۔ راقم الحروف نے اس کے نام کو برقرار رکھتے ہوئے ''علمائے ہند کا شاندار ماضی'' کا جلد پنجم اور ششم کے طور بھی لکھ دیا جو آج تک اسی طرح ہے۔ اُس وقت میرے خواب وخیال میں بھی نہیں تھا کہ حضرت مؤرخِ ملتؒ نے خود ہی اسے علمائے ہند کا شاندار ماضی کا حصہ بنایا تھا؟ اب جب زیرِ نظر مضمون تحریر کیا تو یہ صورت سامنے آئی اور باری تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ میرا یہ کام حضرت مؤرخِ ملتؒ کی منشا کے مطابق تھا۔ والحمدللہ

۲۰۰۳ء میں اُستاذ محترم ڈاکٹر ابوسلمان صاحب شاہ جہانپوری مدظلہٗ نے ''علمائے

حق اور اُن کے مجاہدانہ کارنامے'' کے حصہ اوّل پر نظرِ ثانی فرمائی اور بہت سے اضافے کیے۔
آپ تحریر فرماتے ہیں:

''۱۹۳۹ء تک جبکہ حضرت مؤرخِ ملتؒ نے یہ کتاب تالیف فرمائی تھی، تاریخ کے بہت سے راز پردۂ خفا میں تھے، وہ تمام کارنامے بھی آشکارانہ ہوئے تھے جو خود اس تاریخ کے بنانے والے راہنماؤں اور حضرت مؤرخ ملتؒ کے قریبی بزرگوں نے ۱۹۱۵ء کے بعد حجاز اور مالٹا میں انجام دیے تھے۔ حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ ۱۹۲۰ء میں مالٹا کی قید سے نجات پا کر وطن لوٹے تھے لیکن بعض حالات کے اظہار میں مصلحتیں مانع تھیں۔ سفر نامہ اسیر مالٹا میں بعض حالات پر پردہ پڑا رہا، جو نقش حیات میں اُٹھایا گیا۔ مولانا عبید اللہ سندھیؒ ۱۹۳۹ء میں وطن لوٹے تھے لیکن ان کی رہائی حکومت سندھ کی ضمانت پر ہوئی تھی جو بعض شرائط سے مشروط تھی اور شرائط کی خلاف ورزی کے نقصانات قومی وملی مصالح اور ان کے فوائد سے زیادہ شدید اور مضرت رساں تھے، اس لیے ان کے تذکرہ کے سلسلہ میں بیان پر سکوت کو ترجیح دی گئی۔'' (۷)

اب وہ وقت گزر چکا تھا، حالات تبدیل ہو گئے تھے، تاریخ کا مخفی گوشہ سامنے آ گیا تھا، ضرورت اس بات کی تھی کہ طالب علم کے لیے تاریخ کی یہ تشنگی دُور کی جائے، چنانچہ محترم ڈاکٹر صاحب مدظلہٗ نے اس طرف توجہ فرمائی اور یہ اضافات کیے۔

اضافـــات : حواشی

باب اوّل : (۸۷ تا ۱۰۳) حاشیہ ۱ تا ۶................۱۷

باب سوم : (ص ۱۳۹ تا ۱۴۲) حاشیہ ۲ تا ۳ ....۵

باب پنجم : (۱۶۸ تا ۱۷۰) حاشیہ ۱ تا ۴.........۳

باب ششم : (صفحہ ۱۶۸ تا ۱۹۳) حاشیہ ۴ تا ۷ ....۵

باب ہفتم : (ص ۲۰۹ تا ۲۱۹) حاشیہ ۳،۴،۶،۱۰،۲۰......۱۰

تحریک شیخ الہندؒ ۳ (ص ۲۲۶ تا ۲۷۴) حاشیہ نمبر ۵ تا ۱۱......۹

باب ہشتم : (ص۳۱۲ تا ۳۱۳) حاشیہ نمبر۱۲،۱۵ ....۲
باب نہم : (ص۳۲۶) حاشیہ نمبر۴...............۱
باب یازدہم : (ص ۳۶۶ تا ۳۶۹) حاشیہ۴ تا ۷.........۴
باب دوازدہم : (ص۳۸۸)حاشیہ ۴ ، ۵..........۱
باب سیزدہم : (ص ۴۱۴ تا ۴۱۶) بعداز حواشی قابلِ توجہ...........۳
باب سیزدہم : اصحابِ عزائم اور رجالِ کار۔۳ (ص۴۸۱ تا ۴۸۳)....۳
باب سیزدہم : اصحابِ عزائم اور رجالِ کار۔۶ (ص۵۷۹ تا ۵۸۳)....۴
ضمائم وغیرہ :
چند شخصیات (متعلق باب ہفتم) ص ۲۲۰ تا ۲۴۲) و حواشی۲۴۳.....۲۳
ضمیمہ نمبر۱،۲ (متعلق تحریک شیخ الہندؒ۔۳) (ص۲۷۵ تا ۲۸۸).....۱۴
ضمیمہ میثاقِ لکھنو پر تبصرہ باب ہشتم ص۳۱۴ تا ۳۲۰
باب دہم جمعیت علمائے ہند۔ تاریخ قیام و مقاصد اور نظام (مع تحریرات ثلاثہ)
(ص۳۲۷ تا ۳۵۳).........۲۷
ضمیمہ : ۱،۲(باب یازدہم) (ص۳۷۰ تا ۳۸۲) ۱۳
تمہیدی مضمون : (باب دوازدہم) (ص۳۸۳ تا ۳۸۵).........۳
استدراک : (باب دوازدہم) (ص ۳۹۰).........۱
اصحاب عزائم ورجالِ کار۔۲ مولانا عبیداللہ سندھیؒ (ص۴۲۸ تا ۴۷۰)(اضافہ تقریباً)۴۲
تکملہ : (باب دوازدہم) (ص۴۷۱ تا ۴۷۸).........۸
اصحابِ عزائم ورجالِ کار۔۴ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ (ص۴۸۴ تا ۴۹۲)......۹
اصحاب عزائم ورجالِ کار۔۵ مفتی اعظم حضرت مولانا محمد کفایت اللہؒ (ص۴۹۴ تا ۵۵۱)۵۸
حضرت ڈاکٹر صاحب مدظلہم کے اضافات سے حضرت مؤرخ ملتؒ کی تحریر پر کوئی اثر نہیں پڑا، وہ اپنی جگہ اسی طرح ہے۔

''علمائے حق اوران کے مجاہدانہ کارنامے'' حصہ دوم (شاندار ماضی کی جلد ششم) پر نظر ثانی اور تدوین کا کام حضرت ڈاکٹر صاحب کی نگرانی میں راقم الحروف نے کر دیا ہے اور ان شاء اللہ العزیز بہت جلد منظر عام پر آ جائے گی۔

مجھے اعتراف ہے کہ زیر نظر مضمون مقالہ کہلائے جانے کے قابل نہیں ہے، لیکن اس کی خوشی ہے کہ یہ مضمون حضرت مؤرخِ ملتؒ کی تحریرات کے انتخاب سے آ رہا ہے اور یہ مقالہ لکھے جانے سے بہت بلند ہے اللہ تعالیٰ اسے قبول فرمائے اور علمائے حق کے ساتھ محشور فرمائے۔ آمین بجاہ سیّد المرسلین ﷺ

(۲۸ر جمادی الاولیٰ ۱۴۳۹ھ/ ۱۵ر فروری ۲۰۱۸ء)

حواشی

(۱) جناب محمود احمد عباسی پاکستان آنے کے بعد بگڑے اور پیٹ پوجا کے لیے انہوں نے اہلِ سنت کا راستہ چھوڑا ''رحمٰن برادرز'' کراچی میں ایک اشاعتی ادارہ ہوتا تھا اُس کے مالکوں میں ایک مرحوم شفیق الرحمٰن صاحب تھے، انہوں نے مجھے خود بتلایا تھا کہ میں نے عباسی صاحب سے خود سنا ہے کہ اہل الروافض میں سے علامہ رشید ترابی سے عباسی صاحب نے کہا کہ آج کل فاقوں کی زندگی گزر رہی ہے کیا کیا جائے؟ ترابی صاحب نے کہا کہ تم ایک کتاب حضرت معاویہؓ اور یزید پر لکھ کر چھاپو، میں تمہاری اس کتاب کے خلاف بولوں گا، کتاب خوب بکے گی اور تمہارا پیٹ بھرتا رہے گا لیکن عباسی صاحب نے جب حضرت مؤرخِ ملتؒ کو مشورہ دیا تھا تو وہ صحیح العقیدہ تھے اس لیے ہمارے لوگ ناک منہ نہ چڑھائیں۔ (اشرفی)

(۲) ''علماءِ حق اور اُن کے مجاہدانہ کارنامے'' کے نام سے یہ بعد شائع ہوا۔ (شریفی)

(۳) افسوس کہ موجودہ اشاعت میں ایسا نہ ہو سکا، اس کی وجہ بھی بظاہر کوئی معلوم نہیں ہوتی، سوائے اس کے کہ کوتاہی سے تعبیر کیا جائے، لیکن اب انشاء اللہ ہمارے ادارے ''مکتبہ رشید کراچی'' سے جو ایڈیشن ''علمائے ہند کا شاندار ماضی'' شائع ہوتا ہے اُس میں شامل کیا جائے گا۔ (شریفی)

(۴) اُس زمانے میں کتاب کے ہر ایڈیشن کے لیے نئی کتابت ضروری تھی جب کتابت دوبارہ سہ بارہ ہوتو ہر مرتبہ تصحیح کا صبر آزما مرحلہ الگ ہے۔ اب تو بڑی آسانی ہوگئی کہ کتابت کی کاپیاں محفوظ رہتی ہیں۔ راقم

الحروف کو بھی شرف حاصل ہے کہ قدیم طرزِ کتابت کی پریشانیاں دیکھا ہوا ہے، اگرچہ اُس کی ہیئت پتھر کی کتابت سے تبدیل ہوکر......آ گئی تھی میں بھی پرانا آدمی ہوں۔(شریفی)

(۵) میری معلومات کے مطابق اس نام کو استعمال نہیں کیا گیا۔(شریفی)

(۶) آج ناشرین کو تو کاغذ جیسا چاہتے ہیں مل جاتا ہے بلکہ جیسا چاہتے ہیں فیکٹری سے بنوا لیتے ہیں ذرا اُس وقت کو تصور میں لائیں جسے حضرت مؤرخ ملتؒ تحریر فرمارہے ہیں۔(شریفی)

(۷) علمائے حق اور مجاہدانہ کارنامے، حصہ اوّل بسلسلہ شاندار ماضی، ج۵ ص۲۹ طبع کراچی

’’پانی پت اور بزرگانِ پانی پت‘‘
تعارف وتجزیہ

ڈاکٹر مولانا محمد محامد ہلال اعظمی قاسمی
ایڈیٹر صدائے شبلی حیدرآباد
موبائل:9392533661
ای میل:muhamidhilal@gmail.com

علماء ہند، علماء دیوبند اور جمعیۃ علماء کی تاریخ اٹھالیں تو ان میں ایک اہم ہمہ جہت عالم دین کا نام ضرور شامل ہوگا، جنہیں ہم اور دنیا سید الملت حضرت مولانا سید محمد میاںؒ صاحب کے نام سے جانتی ہے۔

سید الملت حضرت مولانا سید محمد میاںؒ کی تالیفات کی تعداد کم وبیش ستر (۷۰) ہے، جن میں ضخیم کتابیں بھی ہیں اور مختصر رسالے بھی۔ اہم کتابوں میں سیرت مبارکہ، صحابہ کرامؓ کا عہد زریں اور مثالی حکومتیں، تاریخ الاسلام، ہمارے پیغمبرؐ، حضرت عثمان ذی النورین کے شواہد تقدس معرکۃ الآرا کتاب علمائے ہند کا شاندار ماضی (چار جلدوں میں) دورِ حاضر کے سیاسی واقتصادی مسائل اور اسلامی تعلیمات وارشادات، پانی پت اور بزرگانِ پانی پت ہیں۔ آخر الذکر کتاب کا مطالعہ ہی ہمارے اس مضمون کا موضوع ہے۔ اس کتاب کے تعلق سے مولانا نور عالم خلیل امینی دامت برکاتہم لکھتے ہیں:

’’پانی پت اور بزرگانِ پانی پت حضرت شاہ قلندرؒ اور آپ کے معاصرین اور پانی

پت کی تاریخ پر مشتمل ہے، یہ ایک دلچسپ اور معلوماتی کتاب ہے''۔(پسِ مرگ زندہ، ص:۸۸)

یہ دلچسپ اور معلوماتی کتاب حضرت مولانا سید محمد میاںؒ نے اس مردِ مجاہد یعنی مولانا لقاءاللہ عثمانیؒ کی خواہش وتقاضے کی بنیاد پر تالیف فرمائی، جنہوں نے تقسیم ہند کے موقع پر اپنی جان کی بازی لگا کر شعائر اللہ کی حفاظت کی، انہی کی انتھک کوششوں کی وجہ سے پانی پت میں دوبارہ احیاءالاسلام ہوا، مساجد آباد اور مزارات ومقابر بحال ہوئے۔ **جزاء اللہ عنا وعن جمیع المسلمین خیرا**۔ مولانا لقاءاللہ عثمانیؒ کا جمعیت علماء ہند سے تعلق ہونے کی بنا پر سید الملت حضرت مولانا محمد میاں صاحبؒ سے گہرا تعلق تھا۔ آپ نے مولانا کو پانی پت آنے کی دعوت دی اور اولیاء پانی پت کے حالات لکھنے کا شدید تقاضا کیا۔ بہر کیف یہ عظیم تالیف آج جو ہمارے ہاتھوں میں آئی ہے یہ کتاب ۱۹۶۳ء میں چھپی اور چھپتے ہی ہاتھوں ہاتھ سر پر اٹھائی گئی۔ چند ہی دنوں میں سابقین اولین کے ہاتھوں میں پہنچ کر کمیاب ہوگئی۔ دوبارہ اشاعت ناگزیر تھی مگر اس کی نوبت نہ آنے کی وجہ سے نایاب ہوچکی تھی۔ اہل علم اور شائقین اس کے پڑھنے کے مشتاق تھے۔ اللہ جزائے خیر دے مولانا نعیم الدین صاحب (پاکستان) کو کہ انہوں نے اس کتاب کو دوبارہ شائع کرنے کا عزم مصمم کر لیا۔ (مولانا نعیم الدین جامعہ مدینہ لاہور میں استاد حدیث ہیں اور ایک درجن کتابوں کے مصنف ہیں) انہوں نے دورہ ہندوستان کے موقع پر باقاعدہ دیوبند میں قیام کیا۔ مصنف کے گھر نسخہ کو تلاش کیا، تلاش بسیار کے بعد انہیں دارالعلوم دیوبند کی لائبریری میں گوہر مقصود ہاتھ آ ہی گیا۔ بہر کیف انہوں نے ذاتی دلچسپی لے کر اس کتاب کی تدوین کی۔ ۳۷/سال کے بعد یعنی فروری ۲۰۰۰ء میں محمد ریاض درانی کی زیر نگرانی جمعیت پبلی کیشنز لاہور سے اس کتاب کی دوبارہ اشاعت ہوئی۔ پہلی اشاعت میں صفحات کی تعداد ۲۸۶/تھی، دوبارہ اشاعت میں ۶۸/صفحات پر مشتمل ریاض درانی کے اصرار پر مولانا نعیم الدین صاحب نے تصوف اور صوفیاء کرام پر کیے جانے والے اعتراضات کا جائزہ لیا ہے۔ کیونکہ عام طور پر لوگ اولیاء کرام کے معاملہ میں افراط وتفریط کے شکار ہیں، کچھ لوگ انہیں تمام تر اختیارات کا

مالک گردانتے ہیں اور کچھ لوگ تفریط کا اس قدر شکار رہے کہ اولیاء کرام کا جو مرتبہ ہے، اسے بھی دینے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ استقامت کی راہ افراط وتفریط کے مابین ہے، یعنی راہ اعتدال ہے۔ چونکہ سید الملت حضرت مولانا سید محمد میاںؒ کی زیرنظر کتاب پانی پت اور بزرگانِ پانی پت اولیاء پانی پت کا تذکرہ ہے۔ بیسویں صدی میں تصوف اور صوفیاء کرام پر بہت سارے لوگ اعتراض کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ ان کے مقاصد شریعت سے ہٹے ہوئے ہیں اور فرقہ باطلہ سے ماخوذ ہیں۔ اس اعتراض کو رد کرتے ہوئے مولانا نعیم الدین صاحب نے قرآن وحدیث کی روشنی میں ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ تصوف، تزکیہ و احسان ہے، کیونکہ تزکیہ واحسان کے مقاصد وہی ہیں جو تصوف کے مقاصد ہیں۔ اس طرح تصوف کی اہمیت وافادیت شرعی نقطہ نظر سے ثابت ہو جاتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''صوفیاء کرام چاہتے ہیں کہ انسان کا کام اللہ کی رضا کے لیے ہو، وہ خدا آگاہ و خداشناس ہو، اس سے اللہ تبارک وتعالیٰ راضی ہو جائے اور اس کی دنیا جنت نظیر بن جائے گی''۔ (ص:۱۸)

انہوں نے اس مقدمے میں یہ ثابت کیا ہے کہ صوفیا کرام متبع سنت اور دین و شریعت کے محافظ تھے اور کیونکہ ان کی روحانی عظمت کا معیار اتباع سنت وشریعت ہے۔ اگر ان میں اتباع وسنت وشریعت پائی جائے تو وہی حقیقی صوفی ہے اور اگر نہ پائی جائے تو صوفی کہلانے کے بھی مستحق نہیں۔

بایزید بسطامیؒ فرماتے ہیں:

''لو نظرتم الی رجل اعطی من الکرامات حتی یرتفع فی الهواء، فلاتغتروا به حتی تنظروا کیف تجدونه عند الامر والنهی وحفظ الحدود۔ (رسالہ قشیریہ، ص:۵۱)

اگر تم کسی شخص کو دیکھو کہ اسے کرامات دی گئی ہیں یہاں تک کہ وہ ہوا میں اڑتا ہے تو پھر بھی اس سے دھوکا نہ کھاؤ، یہاں تک کہ تم یہ نہ دیکھ لو کہ وہ اوامر ونواہی اور حدود اللہ کی

محافظت میں کیسا ہے۔

مقدمے میں دلائل اور نظائر کے انبار لگانے کے بعد صاحب مقدمے نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ تصوف و احسان شریعت میں داخل ہے اور اگر مولانا سید محمد میاںؒ نے پانی پت کے اولیاء کرام کا ذکر کیا ہے تو ضرور اس میں کوئی راز پنہاں ہے کہ جس میں عبرت کے لیے ذخیرہ نظر آئے۔

پانی پت! اے مرجع اہل صفا و علم فن   تیرا شہرہ تھا جہاں میں انجمن در انجمن

کتاب پانی پت اور بزرگانِ پانی پت، عام عقیدت کے اسباب کے عنوان سے شروع ہوتی ہے۔ حضرت لکھتے ہیں کہ پانی پت ہندوستان کا مشہور شہر ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ہندوستان کے مشہور سپہ سالار اور فاتح ''ارجن'' نے اس کی بنیاد رکھی تھی۔ دہلی یہاں سے جنوب کی جانب ۵۳ میل کے فاصلے پر ہے اور جانب شمال تقریبا ۴۰ میل کے فاصلہ پر برادران وطن کا مشہور ''تیرتھ'' کورک شیتر ہے، جس کا دوسرا نام ''تھان ایشور'' تھا، جو بعد میں تھانیسر ہو گیا۔

پانی پت کی شہرت کی وجہ:

ہندوستان کی تاریخ قدیم میں اگر کورک شیتر اس لیے شہرت رکھتا ہے کہ یہاں ایک خونریز معرکے نے حق و ناحق کا فیصلہ کیا تھا تو بعد کی تاریخ میں پانی پت اس لیے مشہور ہے کہ یہ بہت سی فیصلہ کن لڑائیوں کا میدان جنگ بنا، جہاں متعدد بار حکمراں خاندانوں یا جنگجو قوموں کا فیصلہ کیا گیا، جس کی تفصیل تاریخی کتابوں میں موجود ہے۔

وجہ تالیف:

دنیا کے چشم حیرت نگار نے ۱۹۴۷ء جیسا کوئی انقلاب نہیں دیکھا کہ حکمراں محفوظ، فوجیں محفوظ، مگر پنجاب و بنگال کے عوام تباہ و برباد۔ اس انقلاب نے پانی پت کا بھی روپ بدل دیا۔ تقریبا ۵۰/ ہزار کی مسلم اکثریت شہر بدر، مسجدیں ویران، مدرسے برباد، مقابر و مزارات تباہ، جس شہر میں ہزاروں حافظ قرآن مرد عورتیں اس شہر میں صرف ایک کلمہ گو باقی رہ

گیا، جس کی قوت ایمانی نے اس کے قدم استقلال کو پہاڑ سے زیادہ مضبوط بنادیا۔ یہ مولانا لقاء اللہ صاحب عثمانی کا نفسِ نفیس تھا۔ ان حالات میں مولانا تعمیر نو کے لیے کافی جدوجہد کررہے تھے۔ انہوں نے سید الملت سے اصرار کیا کہ پانی پت کے اکابر واولیاءؒ کے حالات شائع کیے جائیں۔ اکابر واولیاء سے فطری انس کی بناء پر حضرت سید الملت نے ان کے اصرار کو قبول کرلیا۔

تاریخ پانی پت کا ایک نظر انداز پہلو:

ہندوستان کی تاریخ میں پانی پت کی شہرت سیاسی لڑائیوں کی وجہ سے ہے مگر افسوس اس اقتدار پرست اور نفرت خیز ہنگاموں میں تاریخِ پانی پت کا وہ پہلو قطعاً نظر انداز ہوتا رہا، جس کا تعلق اخلاق، روحانیت اور سماجی زندگی سے تھا۔ انگریزوں نے ہندو مسلم منافرت کے بیج ایک صدی سے بوئے تھے ان کے کڑوے پھل پوری طرح پک گئے تھے، جس کی وجہ سے وطن عزیز کے دو ٹکڑے ہوگئے اور خونریز فساد برپا ہوا، مگر کیا حیرت کی بات نہیں ہے کہ عقیدت کے وہ رشتے جو بزرگان دین پانی پت سے ہندو اور مسلمانوں کے مشترک طور پر صدہا سال سے جڑے چلے آرہے تھے، ان کی ایک گرہ بھی نہیں ٹوٹی، کیونکہ ۱۹۴۷ء کے بعد جہاں مسلمان نہیں رہے وہاں صرف ہندو ہی ان کی خدمت کرتے رہے، ان پر چادریں چڑھاتے ہیں، چراغ جلاتے ہیں، منتیں مانتے ہیں۔ آخر کیا بات ہے؟ عقیدت کا ترکہ پشتہا پشت سے ان کو کیوں ملا؟ کس طرح ملا؟

تاریخی حقیقت:

جب مسلمانوں نے دہلی فتح کیا تو ملکیت اور شہنشاہیت کی وہ ساری زبان اختیار کی جس سے اسلام نے نفرت کی تھی۔ انہیں بادشاہوں کا عقیدہ تھا کہ **الملک عقیم** بادشاہت کوئی رشتہ داری نہیں رکھتی۔

۱۱۹۳ء سے انگریزوں کے اقتدار تک مسلمانوں کے اقتدار کی ایک طویل تاریخ ہے، ان مسلمان بادشاہوں نے بہت سی بلند بلند عمارتیں بنوائیں، مسجدیں، مزارات،

گنبدان، رعایا کے فائدے کے لیے بھی بہت سے کام کیے، ملک کی صنعت، تجارت اور زراعت کو ترقی دی، ہندو مسلمان کی تفریق مٹائی، مسلمانوں کی طرح ہندوؤں کو اونچے اونچے عہدے اور منصب دیئے، ان کی مندروں کو بڑی بڑی جاگیریں عطا کیں۔ یہ سب کچھ کیا، مگر ان سب کی تہہ میں جو جذبہ سب سے زیادہ کارفرما تھا، وہ بادشاہت کا جذبہ تھا اور وہ بادشاہت ہی کو سب سے بڑا رشتہ دار اور ناتہ سمجھتے تھے۔ جو ان کی بادشاہت کی حفاظت کرے وہ اگر غیر بھی ہے تو عزیز رشتہ دار اور جو اس سے کچھ بھی بیر رکھے، کچھ اختلاف بھی کرے یا اگر بادشاہ کو شک ہو جائے کہ اس شخص سے ان کی بادشاہی کو خطرہ ہے، پھر وہ رحم اور انصاف کو بھول جاتے ہیں، چاہے وہ شخص پیر، باپ، ماں، اولاد، دوست بھائی کوئی بھی ہو، وہ کسی کی پرواہ نہیں کرتے اور سب کو فنا کر دینا اپنے بادشاہی کا ایمان و قانون سمجھتے ہیں۔

حضرت سید الملت لکھتے ہیں:

''ہمیں بادشاہوں کی تاریخ لکھنی نہیں ہے، ہمیں بزرگانِ پانی پت اور سر دست حضرت قلندر صاحب کے کچھ حالات لکھنے ہیں۔ اسی مناسبت سے اس زمانہ کی بادشاہت کا مختصر سا نقشہ کھینچا ہے تاکہ یہ معمہ حل ہو سکے کہ ہندو بھائیوں کے دلوں میں ان بزرگوں کی اتنی عقیدت کیوں ہے کہ سینکڑوں سال اور پچاسوں پشتیں گزر گئیں اور یہ عقیدت ختم نہیں ہوئی''۔

یہ انصار صفت درویش اور قلندر جن کے یہاں خانہ دل میں اللہ کی محبت کے بعد اگر کسی کی محبت تھی تو وہ اس کے رسولؐ کی تھی۔

اللہ رب العالمین ہے، محمد رسول اللہؐ رحمۃ للعلمین ہیں۔ اللہ مسلمان غیر مسلمان انسان اور غیر انسان سب کا رب، سب کا پالنہار ہے، وہ سب سے بے نیاز ہے اور ہر ایک کا کارساز ہے۔ محمد رسول اللہؐ کو نوع انسانی کے ساتھ مخلوق خدا کے ساتھ ہمدردی تھی کہ اس کی فلاح و بہبود کی فکر میں خود اپنی جان کی فکر سے بے نیاز ہو گئے تھے، بلکہ یہ تمنا اور آرزو تھی کہ وہ اپنی جان قربان کر دیں اور یہی غم خواری خلق اللہ نے ان کو خلق خدا کا محبوب بنا دیا تھا۔ بس یہ

قدرتی بات تھی کہ جس طرح ان کو انسانوں سے محبت تھی انسانوں نے ان سے محبت کی، نہ صرف زندگی میں بلکہ وفات کے بعد بھی محبت کی اور کررہے ہیں۔ سینکڑوں برس کی تاریخ نے ہزاروں لاکھوں واقعات پر پردہ ڈال دیا، مگر جس حقیقت پر کوئی پردہ نہ پڑ سکا وہ ان درویشوں کی محبت ہے۔

حضرت مولانا سید الملت سید محمد میاںؒ پانی پت اور بزرگان پانی پت میں باب اول کے تحت حضرت شاہ بوعلی قلندرؒ کا تذکرہ کیا ہے:

شاہ شرف الدین قلندر صاحب جذب وسلوک
فخر سے قدموں میں جس کے سر جھکائے تھے ملوک

خاندان اور نسب:

آپ کا سلسلہ نسب چند واسطوں سے دین و مذہب کے بڑے مزاج شناس، مذہبی قانون کے نکتہ داں، تفقہ فی الدین کے جلیل القدر امام اعظم حضرت نعمان بن ثابت ابوحنیفہ تک پہنچتا ہے۔ آپ کے والد کا اسم گرامی فخر الدین ہے۔ سالار خطاب ہے۔ فوجی خدمات پشتوں سے چلی آرہی تھی، اس وجہ سے سالار نام کا جزو بن گیا۔ آپ باکمال بزرگ، علم معقول و منقول میں ممتاز ومشہور تھے۔ سالار فخر الدین صاحب کو حضرت خواجہ شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ سے شرف دامادی حاصل تھی، لیکن یہ اہلیہ لاولد فوت ہوگئیں۔ اس کے بعد شیخ فخر الدین عراق سے ہمدان تشریف لے گئے، وہاں حضرت سید نعمت اللہ ہمدانی کرمانی کی ہمشیرہ سے آپ نے نکاح کرلیا۔ ان کا نام جمال النساء تھا، بی بی جمال کے نام سے مشہور ہوئیں۔ وہ حافظ قرآن نہایت متقی اور پابند خاتون تھیں۔ ان سے ایک فرزند نصیب ہوا، جن کا نام نظام الدین رکھا، ان کی پرورش عراق میں ہوئی۔ آپ کی عمر جب بارہ تیرہ سال کی ہوئی تو والدین سے اجازت لے کر بغرض تجارت ہندوستان تشریف لائے۔ جب آپ نے خطہ پانی پت کے سرسبز وشاداب علاقوں کو دیکھا تو یہاں کی خوبصورتی نے ان کے دل کو موہ لیا اور یہیں مستقل قیام کا فیصلہ کرلیا۔ کچھ دنوں کے بعد والدین بھی یہیں پانی پت اپنے

فرزندرشید کے پاس آگئے۔تشریف آوری کے چار سال بعد۶۰۴ھ میں شیخ شرف الدین بوعلی قلندرقتال پیدا ہوئے۔

تعلیم وخدمت:

آپ کی تعلیم پانی پت میں ہوئی،آپ کے اساتذہ کا نام معلوم نہیں ہوسکا۔''شرف المناقب'' نامی کتاب کے ایک جملہ سے ایک نام مولانا سراج الدین مکی کا ملتا ہے،لیکن ان کی تصانیف سے پتہ چلتا ہے کہ وہ فارسی،عربی،قانونی زبان،شعروسخن اور جواس زمانے کے علوم وفنون تھے سبھی میں دسترس رکھتے تھے۔

عمر عزیز کے چالیس سال آپ نے پانی پت میں گزارے، پھر دہلی تشریف لائے۔سوانح نگاروں نے تو یہ لکھا ہے کہ آپ نے مسجد قوت الاسلام کودرس وتدریس کا مرکز بنالیا اور سالوں قطب مینارہ کے نیچے درس وتدریس میں گزار دیئے،اسی اثنا میں آپ کی عظمت کا سکہ تمام علمی اور سیاسی حلقوں میں بیٹھ چکا تھا،امرائے دولت اور ارباب حکومت نے انہیں منصب قضا سپرد کردیا۔آپ نے بیس سال تک فرائض قضا پوری احتیاط اور دیانت سے انجام دیتے رہے۔آپ پر اکابر علماء ومشائخ کا اس قدر اطمینان تھا کہ آپ کے فتاوی و فیصلے کوحرف آخر مانا جاتا اور ایک وقت ایسا بھی آیا کہ حضرت شاہ بوعلی قلندر نے اپنے علم کے سفینوں کوخود ہی دریائے استغراق میں غرق کردیا۔

دیوان حضرت شاہ بوعلی قلندر کے آخر میں پانچ صفحات پر مشتمل ہے ایک حکم نامہ ہےاس میں آپ فرماتے ہیں:

''اس درویش کوچار علم بتمام وکمال عطا ہوئے:علم شریعت،علم طریقت،علم حقیقت اورعلم معرفت۔وہ لکھتے ہیں کہ دہلی کے جملہ فضلاء نے متفرق کتابوں کے کچھ اسباق پڑھنے کی گزارش کی،مگر مجھ پر جذبہ شوق کا غلبہ ہوا۔دہلی سے نکل کر صحرا کی راہ لی،دریا جمنا کے کنارے قیام کیا۔صبح ہوئی،جتنی کتابیں میرے پاس تھیں سب کو دریا میں ڈال دیا''۔
(ص:۹۹)

پانی پت دوبارہ آمد۔مشائخ اورمریدین:

اس کے بعد آپ پانی پت تشریف لائے، یہیں سے شان قلندری شروع ہوتی ہے۔آپ متعدد مشائخ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور فیضیاب بھی ہوئے، بیعت کے تعلق سے مختلف اقوال ہیں: کچھ لوگ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی سے بیعت ہونے کے بارے میں لکھتے ہیں اور کسی کا خیال ہے کہ آپ شیخ شہاب الدین عاشق خدا سے بیعت تھے اور کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ آپ کی تربیت براہ راست صدرنشین منصف حضرت علی بن ابی طالب کی روحِ مقدس سے ہوئی۔اس ضمن میں مولانا شیخ عبدالحق محدث دہلوی اپنی مشہور تصنیف ''اخبار الاخبار'' میں تحریر فرماتے ہیں،وہ تحریر فارسی میں ہے، اس کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیں:

اس زمانے کے مشہور مشائخ میں سے کسی سے بھی ان کو ارادت وبیعت کا تعلق نہیں ہے۔بعض علما کہتے ہیں کہ قطب الدین بختیار کاکیؒ سے بیعت تھے،کسی کا خیال ہے کہ حضرت نظام الدین اولیاء سے تعلق اورارادت رکھتے تھے،ان میں سے کوئی بھی صحیح نہیں ہے۔(ص:۱۰۳)

شرف المناقب کے حوالے سے حضرت سیدالملت نے مولانا سراج الدین مکی کا ایک قول نقل کیا ہے۔وہ کہتے ہیں:

''میں خود شیخ شرف الدین صاحبؒ کی زبان سے بار بار سنا ہے کہ وہ فرمایا کرتے تھے(فارسی سے اردو ترجمہ ملاحظہ فرمائیں)

''جس طرح آفتاب کی کرنیں دیوار پر پڑتی ہیں تو دیوار منور ہوجاتی ہیں، اسی طرح حضرت علیؓ کے آفتاب فیض کی شعاعوں نے میری تربیت فرمائی ہے''۔(ص:۱۰۴)

اوراسی طرح سوانح نگار شیخ بن شیخ عبدالرحیم ابن شیخ پناہ حکیم چشتی عثمانی اپنی مشہور تصنیف ''سیرت الاقطاب''میں تحریر فرماتے ہیں:

ترجمہ آپ کا شجرہ بیعت وخلافت جو حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ تک پہنچتا ہے،اس کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت قلندر شیخ شہاب الدین کے خلیفہ میں جو عاشق خدا

کے لقب سے مشہور تھے، شیخ شہاب الدین شیخ امام الدین ابدال کے خلیفہ شیخ امام الدین نے شیخ بدرالدین غزنوی سے خرقہ خلافت حاصل کی اور شیخ بدرالدین حضرت قطب صاحب کے خلیفہ مجاز تھے۔اس بحث کو کہ حضرت قلندر کس کے مرید تھے؟ سید الملت نے ان الفاظ سے حل کیا:

''مختصر یہ کہ حضرت قلندر صاحب قاعدے کے مطابق حضرت شیخ شہاب الدین عاشق خدا سے بیعت تھے۔ البتہ فیض روحانی آپ کو سیدنا حضرت علیؓ سے حاصل ہوا۔''
(واللہ اعلم بالصواب)

حضرت قلندرؒ نے ''حکم نامہ'' میں اپنے مریدوں کے تعلق سے ارشاد فرمایا:

''جو شخص اس درویش (قلندر صاحب) کے پاس آتا تھا اپنی مراد میں کامیاب ہوجاتا تھا۔ چنانچہ میرے کچھ مرید ایسے ہوئے ہیں جو گرم تنور میں نماز پڑھ لیا کرتے تھے، کچھ مرید ایسے تھے جو آب رواں پر مصلی بچھا لیا کرتے تھے اور وہ مصلی تر نہیں ہوتا''۔(ص:۱۰۷)

پانچ چھ تاجدار بادشاہ اس درویش کے آستانہ پر حاضر ہو کر آستانہ بوسی کیا کرتے تھے۔

حضرت سید الملت نے اس اقتباس پر جو تبصرہ کیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

''آستانہ قلندری پر بادشاہوں کی حاضری مسلم ہے، باقی جہاں تک تنور میں نماز پڑھنے اور آب رواں پر مصلیٰ بچھانے کا تعلق ہے تو اگرچہ ہمارا عقیدہ ہے کہ کرامات الاولیاء حق ہے، مگر یہ بھی نظر انداز نہ ہونا چاہئے کہ حضرت مجدد الف ثانیؒ اور ان جیسے دوسرے اکابر اس طرح کی کرامتوں کو مقبولیت اور تقرب الی اللہ کا مدار قرار نہیں دیتے، بلکہ ان لوگوں کا خیال ہے کہ بسا اوقات کرامتیں قرب کے بجائے بعد کا سبب بن جاتی ہیں۔ یہ خدا بینی کے بجائے خود بینی کے دامن میں الجھا دیتی ہیں''۔

علماء حضرات کے عقیدے کے مطابق قرب اور مقبولیت عنداللہ کا مدار اتباع سنت ہے۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ آنحضرتؐ جملہ مقربین کے سرتاج ہیں اور ان بالا باتوں کی روشنی میں

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کی تحقیق جو کہ حکم نامہ کے تعلق سے ہے، فراموش نہ ہونی چاہئے کہ حکم نامہ از مخترعات عوام است۔ حکم نامہ عوام کی گڑھی ہوئی باتیں ہیں۔

ایک وقت ایسا بھی آیا کہ اب نہ پیری رہی اور نہ ہی مریدی، بس جو کچھ ہے قلندری ہی قلندری ہے۔

عشق اول، عشق آخر، عشق کل، عشق شاخ و عشق نخل و عشق گل

استغنا اور بے نیازی:

بے نیازی یہی نہیں ہے کہ کتابوں کو دریا برُد کر دیا بلکہ اپنے خزانے کے دینار کو راہ خدا میں صدقہ کر دیا۔ بادشاہوں سے ایک حبہ یا ایک درہم منظور نہیں کیا، اب انہیں اللہ رب العزت کا خزانہ کافی ہے۔ کیونکہ سرور کائنات کا ارشاد ہے:

خیر الغنا غنی القلب۔ سب سے بہتر دولت مندی قلب کا استغنا ہے۔

قلندر صاحبؒ کہتے ہیں:

زہد و تقوی چیست اے مرد فقیر لاطمع بودن ز سلطان و امیر
گر بدست آید ترا گنج نقود در اندازی ہمت عالی چہ سود

ترجمہ: اے مرد فقیر زہد و تقوی کیا ہے؟ زہد و تقوی یہ ہے کہ کسی بادشاہ دولت مند سے کوئی توقع نہ رکھنا، اگر بے شمار سکوں کا خزانہ تمہیں مل جائے، اگر تمہاری ہمت بلند نہیں ہے تو یہ دولت مندی بے فائدہ ہے۔

تصنیفات:

دیوان مثنوی بوعلی شاہ قلندر، کلام قلندری، حکم نامہ وغیرہ کی تصانیف سے پتہ چلتا ہے کہ وہ عشق حقیقی میں یعنی اللہ اور اس کے رسولؐ کی محبت میں ڈوبے ہوئے ہیں۔

مثنوی کا پہلا اور دوسرا شعر ملاحظہ فرمائیں ؎

مرحبا اے بلبل باغ کہن از گل رعنا بگو با ما سخن

اے پرانے باغ کی بلبل خوب آئی۔ اس گل رعنا کی کچھ باتیں ہم سے کہو ؎

عشق بازی می کنم با او مدام　　　　یافت آدم از طفیل عشق کام

میں ہمیشہ اس سے عشق بازی کرتا ہوں عشق بازی وہ جوہر ہے، اس کی بنیاد پر حضرت آدم علیہ السلام مقصد میں کامیاب ہوئے۔

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ، حضرت قلندرؒ کے ایک مکتوب کی تصدیق کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''آپ کا ایک مکتوب ہے، یہ مکتوب عشق و محبت کی زبان میں لکھا ہے۔ معارف و حقائق توحید، ترک دنیا، طلب آخرت اور محبت ولی کے مضامین اس میں سمود یئے گئے ہیں۔ اختیارالدین صاحب مکتوب الیہ ہیں۔ اس مکتوب گرامی کے بنیادی نکتے ذیل ہیں:

(۱) خود حضرت حق جل مجدہ عاشق حقیقی ہیں۔ ارشاد ہے اے برادر! دل کی آنکھ کھولو اور خوب غور سے دیکھو۔ عاشق نے اپنے عشق سے تمہارے لیے کیسی کیسی چیزیں پیدا کیں اور کیسے کیسے حسین مناظر سے تمہاری نگاہوں کو تازگی اور دلوں کو فرحت بخشی۔ اپنے حسن کا پرتو ہر درخت پر ڈالا، طرح طرح کے میوے پیدا کیے۔ ہر میوے کا الگ الگ مزا رکھا، اس درخت کو نہ اپنی خبر نہ اپنے پتوں کی خبر نہ اپنے پھل کی خبر۔ آہوئے ختن کے نافہ کو مشک سے بھرپور کر دیا، یہ سب اس کے عشق و محبت کی کرم فرمائی ہے۔

(۲) معشوق حقیقی محبوب رب العلمین کو تیری ہی صورت (انسانی صورت میں) پیدا کیا، تمہارے درمیان میں بھیجا تاکہ سیدھے راستہ کی دعوت دے۔

(۳) انسان کو حکم ہے کہ جہاں تک اس کا اختیار اور اس کی قدرت ہے اللہ تعالی کی صفات اور اس کی خصلتیں اختیار کرے۔ وہ عاشق ہے تو انسان کو بھی عاشق ہونا چاہئے اور جس طرح ہر مخلوق عشق خالق کا آئینہ ہے، اسی طرح ہر مخلوق انسان کی بھی معشوق ہو۔ ارباب تصنیف اس مکتوب پر توجہ کرتے تو حضرت قلندر صاحب کے اس مکتوب کی شرح سیکڑوں صفحات میں لکھی جاسکتی ہے اور جو سچا عاشق ہوتا ہے اس کا قول صرف قول نہیں ہوتا بلکہ حال ہوتا ہے۔ غور کیجئے رحمۃ العلمینؐ کے دامن سے وابستہ ہونے والا جب سراسر رحمت

یا قلندرانہ الفاظ میں سراسر عشق ہو جائے تو خدا کی کسی بھی مخلوق سے اس کو نفرت کیسے ہو سکتی ہے۔اس کے یہاں تو محبت ہی محبت ہو گی ؎

کفر است در شریعت ما کینہ داشتن　　　آئین ماست سینہ چو آئینہ داشتن

ہماری شریعت میں کسی سے کینہ رکھنا کفر ہے، ہمارا آئین ہے سینہ کو آئینہ کی طرح صاف رکھنا۔ جب ان کو کسی سے نفرت نہیں تو ان سے کسی کو نفرت کیوں؟ کہا جاتا ہے کہ انسان تو انسان وحشی جانوروں کو بھی حضرت قلندر صاحب سے انسیت تھی۔

من کا ن للّٰہ کا ن اللّٰہ لہ۔ جو اللہ کا ہو جاتا ہے اللہ اس کا ہو جاتا ہے۔

قلندری اور شانِ قلندری:

قلندر کون ہوتے ہیں؟ کیسے ہوتے ہیں؟ قلندری کیا ہے؟ قلندری کی حقیقت وہی بیان کر سکتا ہے جو خود قلندر ہو، مقام قلندری کا تجربہ کر کے آگے بڑھ چکا ہو۔ اہل لغت نے اسم قلندر پر بڑا ظلم کیا ہے۔اس کا معنی کندہ ناتراش لکھا ہے۔ مدعیان تصوف اور حضرت شیخ سعدیؒ وغیرہ نے قلندر کی ایسی تصویر بنائی جو بھیانک ہی نہیں بلکہ بڑی حد تک گھناؤنی ہے،جس میں نہ تہذیب وسلیقہ ہے۔ نہ شرم وحیا، گویا ڑند مشرب وبارمست (معاذ اللہ)

اس منظر میں حضرت سید الملت لکھتے ہیں:

''مگر واقعہ یہ ہے کہ قلندری تہذیب وشائستگی،علم ومعرفت، بلکہ توحید وتفرید کی وہ آخری حد ہے جہاں انسان خود محو ہو جاتا ہے،سمندر کی موجیں اس کو باہر نہیں پھینکتیں بلکہ خود اپنے اندر گم کر لیتی ہیں''۔(ص:۱۲۱)

ترا خیال ہے ترا جمال ہے تو ہے　　　مجھے یہ فرصت کہاں کہ ہوں کیا میں

زعم، انا، انانیت کو فنا کر دینا ہی قلندری ہے اور یہ سبق بزرگوں کو حضور اکرمؐ سے ملا ہے۔ ایک طرف اللہ کے بہت ہی قریب اور دوسری طرف کمزور لوگوں سے دعا کی درخواست کر رہے ہیں۔

(حدیث) ایک بڑھیا کے دروازے پر حضرت محمدؐ دستک دے کر فرمایا کرتے تھے

کہ بڑی بی مجھے دعا میں یاد رکھنا۔ (ص:۱۲۶)

قلندری اور پابند شریعت:

کہا جاتا ہے کہ قلندر کو شریعت سے تعلق نہیں رہتا۔ انہیں رکوع اور سجدہ کی ضرورت باقی نہیں رہتی، اس طرح کی باتیں ایک مکالمہ کے طور پر حضرت شرف الدین بوعلی شاہ قلندر کی طرف منسوب کی جاتی ہے۔

ترجمہ: اے درویش اس بنا پر کہ تو ہمارا ہے اور ہم تیرے ہیں تو ہم نے اپنا فرض بھی تجھ کو بخش دیا۔

محدث دہلوی حضرت مولانا شیخ عبد الحق صاحبؒ کی تحقیق یہ ہے کہ یہ مکالمہ اختراع ہے، مگر اتنی تو بات یہ طے ہے کہ اس زمانے میں آزاد منش فقیر اسی کیفیت کو مقصود اصلی قرار دیتے ہیں، لیکن یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ مخلوق خدا میں سب سے افضل اور سب سے محبوب محمدؐ ہیں۔ آپؐ کی ہر ایک حالت تمام حالتوں سے افضل ہے۔ وحی الٰہی اور سنتِ رسولؐ سے کہ رضائے مولی کا ذریعہ عبادت ہی ہوا کرتی ہے اور اللہ کا شکر ادا ہوسکتا ہے تو صرف عبادت کے ذریعہ ہی ہوسکتا ہے۔

صحیح قلندر یعنی جو شخص واقعی عشق مولی کے جذبے سے وارفتہ اور مغلوب ہوجاتا ہے اس کی شان یہ ہوتی ہے کہ وہ آگہی، احترام شریعت بلکہ احکام شریعت سے عشق کی صورت میں جلوہ افروز ہوتی ہے۔

حضرت سید الملت لکھتے ہیں:

''کسی اور قلندر کی یہ شان ہو یا نہ ہو لیکن جس قلندر کے احترام میں ہمارا قلم سرنگوں ہے، یعنی شرف الدین بوعلی شاہ قلندر ان کی شان تو یہی تھی، ان کی طرف خلافِ شرع باتیں اختراع ہیں''۔

حضرت قلندر صاحب اور شاہان دہلی:

حضرت قلندر صاحب کی پیدائش قطب الدین ایبک کے دور حکومت میں ہوئی

۶۰۴ھ مطابق ۱۲۰۶۔

اس کے بعد بالترتیب بادشاہوں کے نام یہ ہیں۔

قطب الدین ایبک از ۶۰۴ھ ۱۲۰۶ء تا ۶۰۸ھ ۱۲۱۰ء

شمس الدین التمش از ۶۰۸ھ ۱۲۱۰ء تا ۶۳۴ھ ۱۲۳۶ء

رضیہ سلطانہ از ۶۳۴ھ ۱۲۳۶ء تا ۶۳۷ھ ۱۲۳۹ء۔ معزول کر کے قیدی بنادی گئی

معز الدین از ۶۳۷ھ ۱۲۳۹ء تا ۶۳۹ھ ۱۲۴۱ء۔ معزول

علاؤالدین مسعود از ۶۳۹ھ ۱۲۳۹ء تا ۶۴۴ھ ۱۲۴۶ء۔ معزول

ناصر الدین محمود از ۶۴۴ھ ۱۲۴۶ء تا ۶۸۶ھ ۱۲۸۷ء

غیاث الدین بلبن از ۶۶۴ھ ۱۲۶۵ء تا ۶۸۶ھ ۱۲۸۷ء

معز الدین کیقباد از ۶۸۶ھ ۱۲۸۷ء تا ۶۸۹ھ ۱۲۹۰ء

شمس الدین کیومرث از ۶۸۹ھ ۱۲۹۰ء

غیاث الدین بلبن کے دور میں طوائف الملو کی بھیانک ماحول میں آ چکی تھی جس کی وجہ سے حضرت قلندر صاحبؒ کی حساس طبیعت پر گہرا اثر ہوا اور وہ بالکلیہ ہی سماج سے کنارہ کش ہو گئے، آخر الذکر کو بچپن میں تخت بیٹھایا گیا اور چند ماہ بعد قتل کر دیا گیا۔ یہ قتل کیا ہوا اس خاندان غلامان کی سلطنت ہی ختم ہوگئی۔

خاندان خلجی از ۶۸۹ھ ۱۲۹۰ء ت ۶۹۵ھ ۱۲۹۵ء

علاؤالدین خلجی از ۶۹۵ھ ۱۲۹۵ء تا ۷۱۵ھ ۱۳۱۵ء

شہاب الدین عمر از ۷۱۵ھ ۱۳۱۵ء۔ اسی سال قطب الدین مبارک اول نے قتل کر دیا۔

قطب الدین مبارک اول از ۷۱۶ھ ۱۳۱۶ء تا ۷۲۰ھ ۱۳۲۰ء۔ مقتول

ناصر الدین خسرو از ۷۲۰ھ ۱۳۲۰ء تا ۷۲۵ھ ۱۳۲۴ء۔ مقتول

آخر الذکر پر خلجی خاندان کی سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔

غیاث الدین تغلق اول از ۷۲۰ھ ۱۳۲۰ء تا ۷۲۵ھ ۱۳۲۴ء

آخر الذکر بادشاہ ہی کے دور میں آپ بوڈھ کھیڑہ کے جنگل میں ۹ ؍ رمضان ۷۲۴ھ کی شب کو اس جہانِ فانی سے تن تنہا عالم جاودانی کی طرف رخصت ہوگئے۔ کچھ لکڑ ہاروں کی اطلاع کی بنیاد پر باشندگان کرنال انہیں کرنال لے آئے۔ جہاں غسل دیا گیا ابھی غسل سے فراغت نہیں ہوئی تھی کہ پانی پت کے حضرات پہنچ گئے اور اصرار کیا کہ وہ جنازے کو پانی پت لے جائیں گے، کیونکہ خود حضرت قلندر صاحب پانی پت میں اپنی قبر کی جگہ تجویز کر چکے ہیں۔ اس طرح آپ کو ۱۲ ؍ رمضان المبارک کو آپ کی پسندیدہ جگہ میں دفن کر دیا گیا۔

ہم عصر اصحاب کمال اور حضرت قلندر صاحبؒ:

طوالت سے بچتے ہوئے ہم ان کے نام پر اکتفاء کرتے ہیں۔ حضرت خواجہ علاؤ الدین علی احمد صابر کلیری، حضرت خواجہ شمس الدین ترک پانی پتی، مخدوم المشائخ جلال الدین کبیر الاولیاء، سلطان المشائخ نظام الدین محبوب الٰہی اور حضرت امیر خسرو وغیرہ ہیں۔ یہاں پر ایک قابل اعتماد واقعہ کا ذکر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ علاو الدین خلجی نے حضرت امیر خسرو کو حضرت قلندر صاحب کی خدمت میں کچھ ہدیے دے کر بھیجا تھا، انہوں نے کہا کہ اس کی مجھے ضرورت نہیں ہے اور حضرت امیر خسرو نے واپسی کے وقت درخواست کی کہ قلندر صاحب بادشاہ کے لیے کچھ تحریر فرما دیں تو حضرت قلندر صاحب نے ایک پرزہ کاغذ پر لکھ کر دے دیا تھا۔

علاؤالدین خلجی خوطہ دہلی مقرر دارند کہ بہ بندگان خدا تعالیٰ زندگانی نیکو کند

اس مختصر فقرہ میں ایک طرف بادشاہ کو اس کی حقیقت بتادی گئی دوسری جانب اس کے فرض سے اس کو آگاہ کیا گیا ہے۔ یعنی خدمت خلق اور ہمدردی بندگان خدا۔

سلطان علاؤالدین خلجی کے علاوہ سلطان محمد تغلق، فیروز شاہ وغیرہ کے سلسلے میں بھی حضرت قلندر صاحب کے واقعات ملتے ہیں۔

بہر کیف حضرت قلندر صاحبؒ کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر اس مضمون میں روشنی ڈالی گئی

اوراس بات کو ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ اولیاء اللہ کا احترام ہمارا عقیدہ اوران کے کرامات کے بھی قائل ہیں، جس میں شریعت مطہرہ پر کوئی آنچ نہ آتی ہو، اور واقعی میں اولیاء اللہ سبھی مخلوق خدا سے محبت اور یادالٰہی میں مصروف رہتے ہیں، جیسا کہ اس کائنات کے سب سے بڑے محسن رسولؐ کی سنت ہے۔

حضرت شیخ شمس الدین ترک پانی پتی:

حضرت شیخ شمس الدین ترک پانی پتی شیخ احمد بسوی کے فرزندوں میں ہیں، چند واسطوں سے آپ کا سلسلہ نسب حضرت محمد بن حنیفہ بن علیؓ سے ملتا ہے۔ آپ کا وطن اصل ترکستان ہے اور آپ سادات میں سے ہیں۔ حضرت مولانا لقاء اللہ عثمانی پانی پتی کی تحقیق یہ ہے کہ حضرت شیخ شمس الدینؒ کے لیے جو لفظ بطور خطاب استعمال ہوتا ہے وہ ترک، تا کے زبر کے ساتھ ہے، جس کی ہندی تیاگ ہے۔ کیونکہ انہوں نے وطن چھوڑا، اہل وعیال، مال ومتاع کو چھوڑ کر راہ خدا میں قدم رکھا۔ آپ اپنے وطن ہی میں علوم ظاہری کی تکمیل کی۔ آپ صاحب اہل وعیال بھی ہوگئے، لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ آپ طلب حق میں اپنے وطن سے روانہ ہوئے، ماورء النہر پہنچے۔ وہاں کے علماء ومشائخ سے استفادہ کیا، پھر ہندوستان کا رخ کیا۔ سینکڑوں میل کی مسافت طے کر کے آپ اجودھن پہنچے، جہاں حضرت بابا فرالدین گنج شکرؒ کا دربار جما ہوا تھا، جہاں درددل کے مریضوں کا دارالشفاء تھا۔ آپ اسی دارالشفاء سے یہاں تک فیضیاب ہوئے کہ عشق حقیقی کی سند یعنی خرقہ خلافت آپ کو عطا ہوگیا۔

جب حضرت شمس الدین ترکؒ نے اس جذبہ کے ساتھ آستانہ فریدی پر نظر ڈالی تو جواب یہ ملا کہ ساقی میکدہ بننا ہے تو ہمارے صابر کی خدمت میں حاضری دو۔ حضرت خواجہ علاؤ الدین صابر کلیریؒ حضرت فریدالدین گنج شکرؒ کے بھانجے ہیں، حضرت صابرؒ ۱۲ سال تک ماموں کے کے لنگر خانے میں خدمت کی مگر ایک نوالہ کسی کھانے سے نہیں چکھا۔ جب حضرت گنج کو علم ہوا تو وجد آفریں کیفیت پیدا ہوئی اور بے اختیار زبان مبارک سے نکلا۔

علاؤالدین علی احمد صابر است۔ ہمارا علاؤالدین علی احمد صابر ہے۔

حضرت شیخ شمس الدین ترک پانی پتی حضرت صابر کی خدمت میں حاضر ہوئے اور وہی صفت اختیار کی جو حضرت صابرؒ نے اختیار کی تھی۔ یعنی محتاط خدمت۔ چنانچہ پندرہ سال تک حضرت شیخ کے وضو، غسل، عام مہمانوں کے لیے کھانا پکانے، جنگل سے لکڑیاں لانے کی خدمت اپنے ذمے رکھی اور اس کو خوش اسلوبی سے انجام دیتے رہے کہ حضرت شیخ کی طرف سے جب خرقہ خلافت عطا ہوا تو فرزند کا خطاب بھی سونے پر سہاگہ کا کام کر رہا تھا۔

اس کے بعد غیاث الدین بلبن کی فوج میں بھرتی ہوئے اور ایک عرصہ تک فوجی خدمات انجام دیتے رہے اور اخفا کی زندگی بسر کر رہے تھے، جب کشف و کرامات کے ذریعہ اخفا کا پردہ چاک ہوگیا تو آپ فوج سے مستعفی ہوگئے اور ۶۸۲ھ میں پھر حضرت صابرؒ کے آستانہ پر آپڑے، اب انہوں نے آخری تربیت اور تکمیل اسی آستانہ سے حاصل کی اور ان کو پانی پت کا حلقہ سپرد ہوا۔

صاحب معارج الولایت نے لکھا ہے:

''جب حضرت خواجہ علی احمد کلیریؒ کی وفات کا زمانہ قریب آیا تو آپ نے خرقہ خلافت عطا فرمایا اور پانی پت جانے کی اجازت بخشی مگر یہ بھی ارشاد فرمادیا کہ میری وفات کے بعد تین روز یہاں قیام کریں پھر پانی پت تشریف لے جائیں''۔ (ص:۲۳۱)

پانی پت میں آپ کی تشریف آوری:

آپ قلندرانہ چرمی لباس پہنے ہوئے پانی پت میں رونق افروز ہوئے اور ایک دیوار کے سائے میں بیٹھ گئے۔ حضرت قلندر صاحبؒ کو نور باطن اور کشف کے ذریعہ آپ کی تشریف آوری کا علم تو ہوگیا۔ آپ نے اپنے عزیز منظور حضرت جلال الدین سے فرمایا کہ تمہارے پیر آگئے اور ایک حلوائی کے لڑکے سے بھی کہا: جاؤ زیارت کرلو اور خود بوریا بستر باندھ کر شہر سے باہر نکل گئے اور تواضع میں اپنا مسکن ہی پیش کردیا۔

حضرت سید الملت لکھتے ہیں کہ اگر وہ خاطر مدارت کرتے تو انہیں قلندر ہی کیوں

کہا جاتا۔ (دروغ برگردن راوی)

اب اس نو وارد مہمان کی پیش کش ملاحظہ فرمائیں۔

سیر الاقطاب کی روایت ہے:

حضرت خواجہ شمس الدین ترکؒ نے پانی پت میں قیام کے بعد ایک پیالہ دودھ بھر کر خادم کے ہاتھ حضرت قلندر صاحب کی خدمت میں بھیجا اور سلام پیش کرنے کے لیے کہا، دودھ سے لبریز پیالہ ان کی خدمت میں پیش ہوا تو انہوں نے ایک گلاب کا پھول ڈال دیا اور یہ فرمایا کہ برادرم شمس الدین کی خدمت میں سلام کے بعد پیش کر دیں۔

اس معمہ کا مطلب یہ ہے کہ ولایت آپ کو مبارک ہو، میں اس شہر میں آپ کی ولایت کے باوجود پھول کی طرح تیرتا رہوں گا۔ ان دونوں بزرگوں میں گہرے مراسم تھے اور حضرت جلال الدین صاحب پر دونوں بزرگوں کی غیر معمولی شفقت تھی۔ اچنبھا سا معلوم ہوتا مگر اس کو قول سعدی سے حل کیا جا سکتا ہے۔

دو بادشاہ در یک اقلیم نہ گنجند۔ دو بادشاہ ایک مملکت میں نہیں سما سکتے اور درویشوں کی شان یہ ہے کہ ہفت درویش در یک گلیم بخسپند۔ ایک کمبل میں سات درویش سو سکتے ہیں۔

کرامت کے ذریعہ ہونے کا ثبوت:

پانی پت کے سادات کو جب علم ہوا کہ آپ بھی سید ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں تو آپ سے ثبوت طلب کیا۔ آپ نے فرمایا میں نے اپنے آباؤ اجداد سے یہی سنا اور ہمارے شجرہ نسب بھی موجود ہیں۔ معترض مطمئن نہیں ہوئے اور عوام میں مشہور ہے کہ جو شخص صحیح النسب حضرت علیؓ کی اولاد سے ہوتا ہے، آگ میں اس کا بال بھی نہیں جلتا۔ حضرت خواجہ شمس الدینؒ کو جوش آ گیا۔ آگ میں کودنے کے لیے تیار ہو گئے اور قریب دھکتے ہوئے تنور میں کود پڑے اور پانی پتی سید کو آگ میں آنے کی دعوت دی۔ جب حضرت شمس الدین تنور سے باہر تشریف لائے تو پانی پتی سید بہت نادم ہوئے اور توبہ کی اور حضرت شمس الدینؒ سے بیعت ہو گئے۔

اس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے سید الملت لکھتے ہیں:

''ہم اولیاء کرام کی کرامات کے قائل ہیں، ہمیں بھی یقین ہے کہ سید کے بال نہیں جلتے، مگر یہ کرامت اس کوئلے اور لکڑی کی آگ میں ظاہر نہیں ہوتی۔ ہاں ظلم اور مصائب کی آگ میں اس کرامت کا ظہور ہوتا ہے۔ سید وہی ہے کہ جبر وقہر کا تنور اس کو جلانے کے بجائے اور نکھار دے''۔

حضرت جوہر نے فرمایا: ''اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد''۔

اور آپ فرما سکتے ہیں سادات زندہ ہوتے ہیں ہر کربلا کے بعد۔

حضرت شمس الدینؒ کی خدمات اور وفات:

آپ کی جلیل القدر خدمات کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ سلسلہ صابریہ کے وہ آفتاب ہیں کہ نور وہدایت کی جتنی بھی شعاعیں پھوٹ رہی ہیں وہ آپ کی طرف سے آئی ہوئی کرنیں ہیں اور آپ کے متوسلین ومریدین کی تعداد بہت ہے، جس کی روحانی کیفیت کو آج بھی صوفیاء اور عوام کے یہاں موجود ہے۔

آپ ۷۱۵ھ میں اس جہان فانی سے کوچ کر گئے اور ساڑھے تین سو سال کے بعد شاہجہاں کے دور میں ان کے لڑکے کا نام منصۂ شہود پر ظاہر ہوا جن کا نام نامی سید احمد ہے، جس کو وہ اپنے وطن میں چھوڑ کر آئے تھے۔

مخدوم المشائخ محمد جلال الدین کبیر الاولیاء:

شہہ جلال الدین کبیر الاولیاء مخدوم ما سالک راہ طریقت مخزن کودوسخا

وطن، سلسلہ نسب، تعلیم، شوق:

خواجہ عبد الرحمٰن گاذرونی پانچویں صدی ہجری کے ایک بزرگ تھے، سلسلہ نسب حضرت عثمان غنیؓ سے ملتا ہے۔ آپ کے ایک مورث ان کا نام بھی عبد الرحمٰن تھا، مدینہ طیبہ سے منتقل ہوکر گاذرون آ گئے تھے۔ خواجہ عبد الرحمٰن محمود غزنوی کی فوج میں کسی منصب پر فائز

تھے۔محمود غزنوی ہندوستان پر حملہ کرکے واپس چلا گیا اور یہ پانی پت میں سکونت پذیر ہوگئے۔حضرت مخدوم خواجہ محمد جلال الدین کبیر الاولیاء آپ ہی کی اولاد میں ہیں۔

حضرت خواجہ محمد جلال الدین کے والد ماجد کا سایہ بچپن ہی میں سر سے اٹھ گیا تھا۔ ان کے چچا نے پرورش کی تھی اور حضرت قلندر صاحبؒ کی آپ پر بچپنے ہی سے خاص شفقت و محبت تھی اور آپ پر ان کی سیرت و اخلاق کا گہرا اثر پڑا۔علوم ظاہری کی تعلیم کا کچھ پتہ ان سے نہیں چلتا، البتہ آپ کی مشہور تصنیف ''زاد الابرار'' سلسلہ ارشاد وطریقت کی مفید کتاب ہے، وہ آپ کے اعلیٰ قابلیت کی شہادت ہے اور آپ کو شکار کا شوق بہت تھا، ان کی طبیعت میں رنگینی تھی، اس وجہ سے گھوڑا سرخ اور لباس بھی گلگوں گلاب کے پھول جیسا سرخ، لیکن حضرت قلندر صاحبؒ کی خاص کرم فرمائیوں نے رنگینی طبیعت کو بدل کر رکھ دیا۔گھوڑے کو راہ خدا میں بخش دیا اور لباس گلگوں کو جدا کر دیا اور آبادی کے بجائے صحرا کا راستہ اختیار کیا۔

بیعت وخلافت:

آپ کو حضرت قلندر صاحبؒ مدارج معرفت طے کرائے، مگر مرید نہ کیا۔شیخ جلال الدین جب کبھی مرید ہونے کی درخواست کرتے تو خوبصورت اور معقول عذر بنا کر ٹال دیتے۔چنانچہ جب خواجہ شمس الدین ترک پانی پتی تشریف لائے تو حضرت قلندر صاحبؒ نے خود شیخ جلال الدین کو حضرت خواجہ شمس الدین ترکؒ کی خدمت میں مرید ہونے کے لیے بھیجا۔ اس طرح شیخ جلال الدین دولت قلندری سے مالا مال ہو کر دولت صابری کے وارث بنے۔

حضرت شیخ کی خدمت، سند خلافت اور نکاح:

بیعت ہونے کے بعد ہمہ وقت حضرت شیخ کی خدمت میں حاضر رہتے اور آپ کی خدمت کرنے کو حضرت کبیر الاولیاء نے زندگی کا نصب العین بنا لیا تھا اور آپ نے اپنی روحانی فیوض وکمالات سے یہاں تک مالا مال کر دیا کہ جو کچھ خواجہ شمس الدین ترکؒ کے پاس تھا، انہوں نے اپنے چہیتے خلیفہ حضرت خواجہ جلال الدینؒ کے حوالے کر دیا۔آپ نکاح سے گریز کر رہے تھے تو خواجہ شمس الدینؒ نے فرمایا، آنحضرتؐ کی سنت مبارکہ کا درجہ ان تمام

آرزوؤں اور تمناؤں سے بڑھا ہوا ہے۔ نکاح سنت رسولؐ ہے، اس پر ضرور عمل ہونا چاہئے۔ بہر حال کافی ردوقدح کے بعد نکاح کے لیے تیار ہو گئے اور کرنال میں آپ کا نکاح ہو گیا۔

کمالات و کرامات:

سیر الاقطاب میں آپ کا ایک کمال یہ بیان فرمایا گیا ہے:

ترجمہ: آنحضرت مخدوم صاحب جہاں چاہتے پلک کے ایک جھپکے میں وہاں پہنچ جاتے، پھر اسی طرح واپس آ جاتے، خواہ وہ مقام کتنا ہی دور ہوتا۔ چنانچہ جمعہ کی نماز اکثر آپ خانہ کعبہ میں ادا کرتے تھے۔

اس پر تبصرہ کرتے ہوئے حضرت سید الملت لکھتے ہیں:

''مگر یہ کمال کسی ایثار، جفاکشی اور قربانی کی خبر نہیں دیتا اور فقہی نقطہ نظر بھی اس کی کچھ زیادہ تائید نہیں کرے گا۔ کیونکہ پنج وقت نمازوں میں تو شریعت نے مسجد محلّہ کی جماعت میں شرکت کی تاکید فرمائی۔ ہندوستان سے مکہ معظّمہ پہنچنے پر مسافر کے احکام عائد ہوں گے، اس وجہ سے جمعہ کی بھی وہ اہمیت باقی نہیں رہتی''۔

آپ لکھتے ہیں کہ ہمارے خیال میں حضرت مخدومؒ کا سب سے بڑا کمال یہ تھا کہ باہر لنگر خانے میں ہر روز ایک ہزار مہمان کھانا کھاتے تھے اور گھر کی حالت یہ کہ ''قوت لایموت'' بھی مشکل سے میسر ہوتا تھا۔ یہ ایثار اور نثار والا معاملہ ہی ایسا ہے کہ خلق خدا کی غمخواری ہے۔ یہ غمخواری اور یہ ہمدردی خلق خدا کی وہ کیمیا ہے جو مشت خاک کو کندن بنا دیتا ہے اور فرشتوں سے افضل ہو جاتا ہے، اب ان کی زبان مبارک پر جو کچھ آتا ہے، وہی ہوتا ہے، اور یہ مقام تعجب کی بات نہیں ہے، کیونکہ زبان مبارک پر دعا کے لیے ہاتھ اسی کی خاطر اٹھیں گے جو ہمدرد خلق خدا کی چھلنی میں چھنا ہوا ہوگا اور وہ بادشاہ وقت کی کسی بھی دولت کو ہاتھ نہیں لگائے گا۔ چنانچہ جب فیروز شاہ اپنی قیمتی اشیاء اور تحفے کے ساتھ حاضر ہوا اور خوشامد کی کہ ہمارا تحفہ قبول کر لیں تو انہوں نے کہا کہ اللہ نے ہمیں سب کچھ دے رکھا ہے، ہمیں کیا ضرورت ہے کہ فقر اور استغنا کو چھوڑ دیں۔

آخری دور اور استغراق:

آپ کی اگر اندازاً ولادت ۶۳۵ھ مانی جائے اور سال وفات ۷۶۵ھ میں تو آپ کی عمر ۱۳۰ سال ہوتی ہے اور بعض لوگوں نے ۱۷۰ سال بھی لکھا ہے۔ اس عمر میں فطری طور پر بڑھاپے کا زور بڑھ جاتا ہے، اسی وقت میں آپ ہر وقت ۔حق ۔حق ۔حق ۔کہا کرتے تھے، اسی عالم میں اس جہان فانی سے کوچ کر گئے۔

صاحبزادگان:

حضرت مخدوم کبیر الاولیاء کے پانچ صاحبزادے تھے۔ پانچویں صاحبزادے ولایت کے پانچ خزانے تھے (۱) خواجہ عبدالقادرؒ (۲) خواجہ ابراہیمؒ (۳) خواجہ شبلیؒ (۴) خواجہ کریم الدین صاحبؒ (۵) حضرت خواجہ عبدالواحد۔ اور آپ کے خلفاء کی تعداد چالیس بتائی جاتی ہے۔

پانی پت کے اکثر اولیاء اللہ کی بنیاد حضرت مخدوم محمد جلال الدین کبیر الاولیاء سے ملتی ہے۔ آپ کے صاحبزادوں میں حضرت خواجہ شبلی کا نام نمایاں ہے۔ وہ ذکر الٰہی میں ہمیشہ مشغول رہتے، وقار، استقامت اور توکل، امراء اور دولت مندوں سے دور رہنا، علماء و فضلاء کی صحبت اختیار کرنا، یہ ان کا طرہ امتیاز رہا۔ ان کے بیٹے شیخ عبدالقدوس پانی پتی تھے اور ان کے بیٹے شیخ عبدالکبیر بالا پیران کو بھی پانی پت کے اکابر اولیاء میں شمار کیا جاتا ہے۔ ان کے بیٹے شیخ عثمان زندہ پیر صاحب کشف و کرامات بزرگ تھے۔ آپ کو معاملہ فہمی اور فراخی حوصلہ کے جوہر بھی عطا ہوئے۔ ۹۹۰ھ میں وفات پائی گنبد کلاں پانی پت میں مدفون ہیں۔ آپ کے بیٹے شیخ نظام الدین تھے، ان کو خاندانی شرف کے ساتھ ساتھ ذاتی سعادت و شرافت سے بھی بھرپور حصہ ملا تھا۔ ۹۷۱ھ سال ولادت ہے سنہ وفات ۱۰۱۸ھ ہے۔

شاہ اعلیٰ چشتی ولادت ۸۹۰ھ حضرت نظام الدین کے فرزند ارجمند ہیں، ظاہری علوم کی تکمیل کے بعد باطنی کمالات کی طرف متوجہ ہوئے اور آپ کے والد ماجد نے خرقہ خلافت عطا کیا۔ والد ماجد کے چشمہ فیض اور خرقہ خلافت سے پیاس نہیں بجھی تو آپ پانی

پت کے قصبہ نارنول کے مشہور بزرگ نظام نارنول کی خدمت میں حاضر ہوئے۔حضرت نارنولی کو بھی ایسے جوہر نایاب کی تلاش تھی۔آپ نے اپنی طرف سے ان کو بھرپور نوازا۔

حضرت شاہ اعلیٰ چشتی کو اسلحہ رکھنے کا بہت شوق تھا اور اسی کا نتیجہ تھا کہ آپ فوج میں شامل ہوگئے۔جب ۹۴۷ھ ۱۵۴۰ء میں شیر شاہ سوری نے ہمایوں کو شکست دے کر اپنی حکومت قائم کرلی تو آپ اسی شورش میں اپنے فوجی منصب سے علاحدہ ہوگئے،اس کے بعد پانی پت آئے اور خاندانی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے تصوف وتزکیہ کی خاطر اپنے والد شیخ نظام الدین (وفات ۱۰۱۸ھ) کے در پر آ گئے۔یہی زمانہ اکبر کی وفات [۱۰۱۴ھ ۱۶۰۵ء] اور جہانگیر کی تخت نشینی کا ہے۔ایسے ماحول میں خدمت خلق اور یادِالٰہی میں مصروف رہتے ہوئے پانی پت میں ۱۰۳۳ھ ۱۶۲۳ء میں بروز چہارشنبہ کو اس جہان فانی سے کوچ کر گئے۔

حضرت سید الملت نے اس کتاب یعنی پانی پت اور بزرگان پانی پت کی شیخ حضرت شاہ اعلیٰ چشتی پر تکمیل کی ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ ہم نے اس کتاب میں جو کچھ بھی لکھا ہے،اس کا بیشتر حصہ سیر الاقطاب سے ماخوذ ہے۔مصنف سیر الاقطاب نے اپنی اس اہم تصنیف کی ۱۰۳۶ھ میں شروع کرکے ۱۰۵۶ھ میں تکمیل کی ہے۔سیر الاقطاب میں آخرالذکر بزرگ تک کے حالات درج ہیں۔

اختتامیہ:

آزادی کے بعد جو پانی پت میں خاک وخون کی ہولی کھیلی گئی اور تقسیم ہند کا جو سانحہ پیش آیا اس کو پڑھ کر اور سن کر بدن پر کپکپاہٹ طاری ہوجاتی ہے کہ کس طرح انسان جنگلی جانور سے بھی زیادہ خونخوار اور بداخلاق ہوگیا تھا۔برسہابرس تک ہندو مسلمان ایک ساتھ سکھ دکھ میں رہنے والے کچھ بھی ترس نہیں کھائے،بستیاں کی بستیاں آن واحد میں جلا کر راکھ کردیں اور لوگوں کو بے گھر کردیا۔اس وقت اگر کوئی مرد مجاہد بے سروسامانی کے عالم میں تن تنہا ثابت قدم رہا،وہ ہیں مولانا لقاء اللہ عثمانی نور اللہ مرقدہ۔انہوں نے آبادکاری،مغویہ عورتوں کی بازیابی،اوقاف کی واگزاری،مسلمانوں کی ارتداد سے واپسی،دینی تعلیم کا مکتب اور سب

سے بڑی بات لوگوں کے زخموں پر مرہم رکھنا وغیرہ۔ یہ سب امور خیر آپ انجام دے رہے تھے اور آپ جمعیت علماء ہند سے وابستہ تھے۔ساری مصائب وآلام کی کیفیات کو دہلی آ کر جمعیت علماء ہند کے ذمہ داروں کے گوش گزار کرتے اور جمعیت علماء ہند کے ذمہ داروں بالخصوص حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا مفتی کفایت اللہ صاحبؒ، مولانا سعید صاحبؒ اور مولانا سید محمد میاں صاحبؒ اور دیگر جمعیت کے تمام ارکان نے پانی پت کی آبادکاری میں اور حالات کو درست کرنے میں اپنے تن من دھن کو قربان کیا۔آخر کیا وجہ تھی کہ جہاں پر صدیوں سے پریم، محبت، رواداری، اپنوں پرایوں سے اچھا سلوک، ایک دوسرے پر اعتماد، خداشناسی اور خداترسی تھی، اس کو ملیا میٹ کر دیا گیا؟، وہ انگریزوں کا ڈالا ہوا نفاق تھا، جس کے پودے کو انہیں لوگوں نے لگایا اور اس کے کڑوے پھل آج بھی ہندوستان کو برباد کر رہے ہیں۔مولانا لقاءاللہ عثمانی کے دل میں ضرور یہ بات آئی ہوگی کہ کس طرح پانی پت میں بزرگان پانی پت کا فیض بلالحاظ مذہب وملت کے جاری تھا، آج اس سبق کو دہرایا جائے تو ممکن ہے اور اللہ کی ذات سے قوی امید ہے کہ دوبارہ پھر اسی طرح محبت لوٹ آئے۔ یہی بنیاد بنی اور انہوں نے حضرت سید الملت سے اس کتاب کے لکھنے کی خواہش کی اور حضرت سید الملت نے اس کتاب میں بزرگان دین کے حالات، کشف وکرامات کو معروضی طور پر جو کہ کتاب وسنت کے عین مطابق ہو، پیش کرتے ہوئے محبت ورواداری کی جھلک کو ہر جگہ پیش کیا ہے۔

☆☆☆☆☆

نوٹ: اس مضمون میں جس کتاب کا تعارف کرایا گیا ہے، اس کی عبارتیں بکثرت نقل کی گئی ہیں لیکن اس کے حوالہ کا اہتمام نہیں کیا گیا ہے، جس سے یہ اشتباہ ہوجاتا ہے کہ یہ تعارف نگار کی عبارت ہے یا اصل کتاب کی؟ حالانکہ اس کا اہتمام ضروری تھا۔

تعلقات سید الملت : یعنی سید الملت کی تدریسی وتذکراتی وابستگیاں :

سید الملت مولانا محمد میاں دیوبندیؒ اور مدرسہ شاہی

مولانا محمد اجمل صاحب قاسمی
استاذ شعبۂ عربی ادب/ جامعہ قاسمیہ، مدرسہ شاہی رمراد آباد

بڑے اداروں کو لائق وفائق افراد کی ضرورت ہوتی ہے جو ادارے کے وقار واعتبار کو نہ صرف بحال رکھ سکیں ؛ بلکہ اس کو ترقی دے کر اس میں اضافہ بھی کریں۔ اور لائق وفائق افراد کو اچھے ادارے درکار ہوتے ہیں جہاں ان کی شخصیت کے جوہر نکھر سکیں ، اور ان کی گوناں گوں صلاحیتوں کے پھلنے پھولنے اور برگ وبار لانے کا موقع فراہم ہو سکے۔ جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مراد آباد کو روز اول سے یہ سعادت حاصل رہی کہ باکمال، باخدا، یگانۂ روزگار اور بحر علم وتحقیق کی شناور شخصیات اس کے دامن سے وابستہ رہیں، ان شخصیات کو جہاں مدرسہ شاہی کی صورت میں ایک بہترین پلیٹ فارم ملا جہاں سے انہوں نے ملک وملت کے لیے عظیم خدمات انجام دے کر ایک عالم کو فیض یاب کیا، وہیں ان کے عظیم کارناموں نے مدرسہ شاہی کو بھی شہرت کے بام عروج تک پہنچایا، اس کے وقار کو بلند کیا، اور اسے وہ مرجعیت عطا کی جس کی وجہ سے وہ دارالعلوم دیوبند کا ثنی اور اس کا مثیل سمجھا جانے لگا۔

اس ادارے کا شمار ان چند خوش نصیب اداروں میں ہوتا ہے جس کی تاسیس ہندستان میں تحریک قیام مدراس کے سرخیل ام المدارس دارالعلوم رد یوبند کے بانی حجۃ الاسلام امام محمد قاسم نانوتویؒ کے ہاتھوں ۱۲۹۶ مطابق ۱۸۷۸ میں عمل میں آئی، دارالعلوم دیوبند کے اکابر نے ہی اس کی سرپرستی فرمائی، اور وہیں کے نابغۂ روزگار فضلاء نے اپنے خون جگر سے اس چمن کی آبیاری کی۔ مدرسہ کے بانی نے مراد آباد میں منڈی چوک سے متصل شاہی مسجد میں

مدرسہ کا قیام کرتے ہوئے مدرسہ کا نام ''مدرسۃ الغرباء'' تجویز فرمایا، یہ نام اسم با مسمی ثابت ہوا، اور ایک طویل زمانہ تک مدرسہ میں بے سروسامانی کا وہ عالم رہا جس کا تصور بھی آج مشکل ہے۔ ۱۳۸۴ھ مطابق ۱۹۶۵ء تک مدرسہ کی کائنات شاہی مسجد اور اس کے ارد گرد واقع چند کمروں پر مشتمل تھی۔ (تاریخ شاہی: ۱۶۰) بعد کو جب یہ عمارت طلبہ کے لیے ناکافی ہوئی تو مدرسہ نے کرائے کے مکانات لیے اور اس میں طلبہ کو رکھا گیا۔ (تاریخ شاہی: ۴۶۱) مدرسہ میں طلبہ کے کھانے کا کوئی باقاعدہ نظام نہ تھا، شہر کے مخیّر حضرات کے یہاں سے طلبہ کے کھانے کا نظم ہوتا تھا، بعض طلبہ کو مدرسہ وظیفہ دیا کرتا تھا جس سے وہ اپنے کھانے کا نظم کیا کرتے تھے، بعد کو یہ صورت بھی اختیار کی گئی کہ کسی ہوٹل کو مدرسہ پیسے دے دیا کرتا اور وہ طلبہ کو کھانا فراہم کیا کرتا تھا۔ یہ صورت حال تقریباً ۱۳۹۶ مطابق ۱۹۷۶ تک قائم رہی۔ (تاریخ شاہی: ۴۶۱ و ۶۲۲) مگر اس بے سروسامانی اور سہولتوں کے فقدان کے باوجود مدرسہ کے عظیم بانی اور باخدا سرپرستوں کے خلوص اور اس کے جلیل القدر علماء و مشائخ کی بے لوث خدمات کا نتیجہ تھا کہ ملک کے مختلف خطوں سے علم کے پروانے دور دراز کا سفر کر کے یہاں آتے اور اس مرکز علم و ہنر میں ہونے والی علم کی ضیا پاشیوں سے اپنے کے منور اور روشن کرتے۔

جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی کے انھیں جلیل القدر مشائخ میں ایک اہم نام اور اس کی محسن شخصیات کے زریں سلسلے کی ایک سنہری کڑی سید الملت حضرت مولانا محمد میاں دیوبندی رحمہ اللہ ہیں۔ آپ ایک ہمہ جہت عالم دین، بافیض مدرس، باکمال منتظم و مدبر، بلند پایہ فقیہ و مفتی و محدث، دیدہ ور مورخ، ممتاز مصنف، فکر مند داعی و مصلح، میدان سیاست کے سرگرم شہ سوار، جہاد آزادی کے پرجوش غازی و پرعزم سپاہی اور ان سب کے ساتھ ایک باخدا، متقی اور شب بیدار انسان تھے۔ ان گوناگوں کمالات کی وجہ سے آپ تنہا ایک جماعت، ایک انجمن اور ایک کارواں تھے۔ قدرت کے عطا کیے ہوئے متنوع بلکہ متضاد کمالات کی قدر کرتے ہوئے آپ نے اپنی تمام صلاحیتوں کو اللہ کے دین کی حفاظت، اسلام کی نشر و اشاعت، امت مسلمہ کی خیرخواہی اور ملک و ملت کی سربلندی کے لیے ساری زندگی وقف

کیے رکھا۔ آپ کی عظیم علمی، تصنیفی، ملی وقومی خدمات اور مجاہدانہ کارناموں نے نہ صرف ملک و ملت کے مستقبل کو سنوارنے میں اپنا مثالی کردار ادا کیا؛ بلکہ ان سے مدرسہ شاہی کے وقار اور اس کی قدر ومنزلت میں بھی اضافہ ہوا۔

علم وتحقیق کے شناوران بے مثال اساتذۂ کرام کی زیر سرپرستی آپ کے جوہر کھلے، اور آپ کی فطری صلاحیتیں خوب برگ وبار لائیں۔ آپ نے درس نظامی میں شامل تمام علوم بالخصوص حدیث، فقہ وادب میں کامل دسترس حاصل کی، تاریخ آپ کا فطری ذوق تھا۔ دارالعلوم میں اس فطری ذوق کو جلا ملی۔ علامہ کشمیریؒ کی صحبت اور شاگردی نے آپ میں بحث وتحقیق کا مزاج پیدا کیا۔ (''اشتات محمد میاں'' ملحقہ از ''پس مرگ زندہ'': ۹۴) اللہ تعالی نے آپ کو تحریر کا زبردست ملکہ عطا فرمایا تھا، زمانۂ طالب علمی سے ہی پرورش لوح وقلم کا سلسلہ جاری رہا اور بہت جلد آپ ایک پختہ اور سیال قلم کے مالک ہوگئے۔ نیک نہادی اور موروثی شرافت کے ساتھ ساتھ ان گوناں گوں صلاحیتوں کی وجہ سے آپ اساتذہ کے منظور نظر، اور ان کی نگاہوں میں معتبر ہوگئے۔

مدرسہ شاہی سے وابستگی:

دارالعلوم / دیوبند میں زمانۂ طالب علمی میں ایک ذی استعداد اور مثالی طالب علم ہونے کی وجہ سے آپ اکابر دارالعلوم کے منظور نظر رہے تھے، آپ کی قابلیت سے صاحب نظر اکابر نے آپ کی اقبال مندی کا اندازہ کرلیا تھا؛ چناں چہ فراغت کے بعد بھی ان اکابر کو آپ کی علمی سرگرمیوں سے دلچسپی رہی اور غالباً مدرسہ حنفیہ میں موصوف محترم کی بے اطمینانی اور دل برداشتگی سے یہ اکابر بھی متفکر تھے۔ اسی اثنا مدرسہ شاہی میں درجات علیا میں تدریس کے لیے ایک استاد کی جگہ خالی ہوئی، اکابر کو علم ہوا تو انھوں نے اس جگہ کے لیے مدرسہ شاہی کے ارباب انتظام سے مولانا محمد میاں صاحبؒ کی سفارش کی، جو منظور ہوئی۔ صاحب تذکرہ اپنی خود نوشت سوانح میں مدرسہ شاہی سے اپنی وابستگی کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''احقر کسی ایسے مدرسے میں خدمت کا خواہاں تھا، جو دارالعلوم دیوبند کی

طرح سرکاری امداد اور سرکاری اثرات سے پاک ہو۔حسن اتفاق کہ جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی میں ایک ایسے استاد کی ضرورت ہوئی جو درجات علیا کی تعلیم دے سکے اور دیوبند کے اکابر خصوصاً حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مہتمم دارالعلوم نے احقر کی سفارش فرمادی، حضرت مولانا اعزاز علی صاحب نے اس سفارش کی تائید فرمائی اور مجھے تحریر فرمایا کہ اب ایسے مدرسے میں بھیجا جارہا ہے جو علم کا مرکز ہے''۔(''اشتات محمد میاں''ملحقہ از''پس مرگ زندہ'' :۹۵)

مدرسہ شاہی کے ارباب انتظام کے نام مہتمم دارالعلوم دیوبند کے گرامی نامہ پر حضرت شیخ الادبؒ نے جو تائیدی کلمات تحریر فرمائے تھے،اس کے الفاظ درج ذیل ہیں:

''براہ راست مولانا مولوی سید محمد میاں صاحب سرائے پیرزادگان دیوبند کے نام ہے ،ان کی تنخواہ کی تصریح فرمادیں کہ شوال کی فلاں تاریخ کومراد آباد آجائیں۔ مجھے خدا کی ذات سے امید ہے کہ آپ ان کو بہت زیادہ محنتی اوراوصاف حسنہ سے موصوف پائیں گے۔'' خادمکم محمد اعزاز علی عفی عنہ

(تاریخ شاہی:۱۷۴)

تاریخ شاہی کے مطابق آپ بزمانۂ اہتمام الحاج سید مرتضیٰ علی مرحوم ماہ شوال ۱۳۴۷ھ م ۱۹۲۸ھ میں تدریسی خدمات پر مامور ہوئے،اور پھر آئندہ سال ۲۸ ربیع الثانی ۱۳۴۸ھ میں باضابطہ تقرری کی توثیق کی گئی،اور پھر آپ مدرسہ شاہی کے ایسے ہوکے رہے کہ تادم حیات اس سے آپ کا تعلق قائم رہا۔(تاریخ شاہی:۱۵۵و۳۸۷)

مدرسہ شاہی کے فضاو ماحول سے سید الملتؒ کی ہم آہنگی:

مدرسہ شاہی مرادآباد میں حضرت سید الملتؒ کوایک ایسا ماحول میسر آیا جوفکری اور نظریاتی اعتبار سے مکمل طور پرآپ کے مزاج سے ہم آہنگ اورآپ کی افتادطبع کے موافق تھا۔آپ کوایک ایسے ادارے کی تلاش تھی جو دارالعلوم دیوبند کے نہج پر ہو؛ چناں چہ آپ کو مدرسہ شاہی کی شکل میں ایک ایسا ادارہ ملا جسے شروع ہی سے اکابر دارالعلوم دیوبند نے اپنی

سرپرستی کے ذریعہ پروان چڑھایا ،جس کی وجہ سے یہ ادارہ اساس فکر،مسلک ومشرب ، اصول کار،نصاب تعلیم اور طرز تدریس میں نہ یہ کہ صرف دارالعلوم سے ہم آہنگ رہا؛ بلکہ وہ دارالعلوم دیوبند کی ان مزاجی خصوصیات میں ہندستان کے دیگر معتبر اداروں میں دارالعلوم سے سب سے قریب تر مانا جاتا ہے۔نیز یہ ادارہ شروع ہی سے ایسے افراد کی آماجگاہ رہا جوحضرت شیخ الہند کی تحریک سے وابستہ اس کے پرجوش حامی اور عملی طور پر اس میں سرگرم تھے۔یہ حضرات شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے اس نظریے کو حق بجانب سمجھتے تھے کہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ کی تحریک ِقیامِ مدارس کا مقصد محض ایک اسلامی مدرسہ کا قیام نہیں، جہاں سے صرف علوم اسلامیہ کی نشرواشاعت کا کام ہو؛ بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اس تحریک کا مقصد ایسے رجالِ کار کو تیار کرنا ہے جو اسلام ومسلمانوں کی حفاظت اور ظالم غیرملکی حکمرانوں سے ملک کو آزادی دلانے کے جذبہ سے سرشار ہوں،اوراس کو اپنی زندگی کا نصب العین سمجھتے ہوں۔چناں چہ حضرت شیخ الہندؒ کی تحریک سے وابستہ ان اکابر علماء کی وجہ سے مدرسہ شاہی کی فکری بنیادیں حضرت شیخ الہند کی فکر پر استوار ہوئیں ،اورانھیں وجوہات کی بناپرخود حضرت شیخ الہندؒ کا تعلق اس مدرسہ سے بڑا والہانہ رہا،اورنہ صرف تعلیمی؛ بلکہ انتظامی امور میں بھی آپ کی رائے حرف آخر مانی جاتی رہی۔(تاریخ شاہی:۲۱۹و۲۲۱)

یہی وجہ تھی کہ اس مدرسہ کے ارباب انتظام سے لے کر اساتذہ اورطلبہ تک جوش خروش کے ساتھ تحریک آزادی سے وابستہ رہے ،اورسرگرم جدوجہد کا حصہ بنے۔یہاں انتظامیہ کی طرف سے ہرفرد کو تحریک آزادی میں شرکت کی آزادی تھی؛ بلکہ حضرت مولانا عبدالحق مدنی رحمہ اللہ کے زمانۂ اہتمام میں(آپ کا زمانۂ اہتمام ۱۳۵۱ سے ۱۳۷۴ھ تک ہے)مدرسہ کے اساتذہ کو تحریک آزادی میں حصہ لینے کے لیے یہ سہولت فراہم ہوگئی کہ جوبھی استاد تحریک میں شریک ہوتا اوراسے جیل ہوتی تو حضرت مولانا عبدالحق مدنیؒ ان کے تمام اسباق اپنے ذمہ میں لے لیتے ،اوران کی پوری کی پوری تنخواہ ان کے گھر بھیجوادیتے۔بعض لوگوں نے آپ سے عرض کیا کہ جب ان کا کام آپ نے کیا ہے تو تنخواہ بھی آپ کو لینی

چاہیے، تو اس پر آپ کا جواب تھا کہ 'کیا عبدالحق اتنا بے غیرت ہے کہ ایک شخص جہاد آزادی کی پاداش میں قید و بند کی صعوبت برداشت کر رہا ہو اور میں اس کی تنخواہ لے کر کھا جاؤں۔'
(تاریخ شاہی: ۳۷۵)

مولانا کی یہ بات آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہے، اور ایثار و خیر خواہی کا اعلی ترین نمونہ ہے۔ یہ وجوہات تھیں جن کے پیش نظر مدرسہ شاہی ملک کا ایسا منفرد ادارہ بنا جو ادارے کی حیثیت سے جدوجہد آزادی کا حصہ بنا، اور یہ بات اس کے امتیاز میں شمار کی گئی۔ باقی دوسرے اداروں کی شرکت افراد کی سطح پر تھی، ادارے کی حیثیت سے نہیں تھی۔

حضرت سید الملت رحمہ اللہ مدرسہ شاہی آنے سے پہلے گرچہ عملی طور سے سیاست اور جدوجہد آزادی میں شریک نہیں ہوئے تھے، مگر آپ فکری طور پر حضرت شیخ الہندؒ کے نظریے کے حامی تھے، اور سیاست میں سرگرم شرکت کو وقت کا اہم فریضہ اور ملک وملت کی ناگزیر ضرورت سمجھتے تھے۔ یہ وہ اسباب تھے جن کی وجہ سے گلشن قاسمی کی بہار آگیں فضا آپ کو خوب راس آئی اور علم وسیاست کے مثالی امتزاج نے آپ کو ایسا مسحور کیا کہ آپ ساری زندگی کے لیے اس کی زلف گرہ گیر کے اسیر ہو گئے، اور اس کے دامن دل پسند سے وابستہ ہو کر آپ نے گراں قدر تدریسی، علمی، صحافتی، تصنیفی اور سیاسی خدمات انجام دیں۔ مدرسہ شاہی سے اپنی مزاجی موافقت اور ہم آہنگی کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''احقر ۱۹۲۸ء کے مارچ میں مدرسہ شاہی پہنچا، ....مدرسہ شاہی کی فضا احقر کے مزاج کے مطابق تھی۔ دارالعلوم دیوبند کی طرح یہ مدرسہ بھی سرکاری امداد اور سرکاری اثرات سے پاک تھا، اس مدرسے کے صدرالمدرسین حضرت مولانا فخرالدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ تھے، جو بعد میں دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث اور جمعیۃ علماء ہند کے صدر ہوئے۔ مولانا موصوف شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب کے خاص شاگرد اور سیاسی خیالات میں ان کے پختہ معتقد تھے۔ (آپ کو حضرت علامہ محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ سے بھی شرف تلمذ حاصل تھا اور حضرت علامہ کی تحقیقات علمیہ کا بڑا ذخیرہ آپ کے سینے میں محفوظ تھا) تحریک خلافت میں

اگرچہ جیل نہیں گئے تھے؛ مگر کام بہت کیا۔ زیادہ تر آپ ہی کی خدمات تھیں، جن کی وجہ سے مدرسہ شاہی نے سیاسی تحریک کے سلسلے میں خاص امتیاز حاصل کیا''۔

(''اشتات محمد میاں''، ملحقہ از ''پس مرگ زندہ'': ۹۵و۹۶)

درس وتدریس کے میدان میں:

یوں تو آپ ہشت پہلو انسان تھے، اور آپ کا ہر پہلو شاندار اور جاندار تھا، آپ کو بیک وقت کئی چیزوں سے اچھی مناسبت تھی۔ یہی وجہ تھی کہ مختلف بلکہ متضاد میدانوں میں گراں قدر خدمات انجام دیں؛ مگر جو لگاؤ آپ کو درس وتدریس کے مشغلے سے رہا کسی اور چیز سے نہیں رہا۔ آپ کی دلچسپیوں میں درس وتدریس سب سے پہلا مقام رکھتی تھی۔ ایک مقام پر تحریر فرماتے ہیں:

''مجاہد ملت رحمۃ اللہ علیہ نے بارہا فرمایا کہ وہ نظامت علیا سے سبک دوش ہونا چاہتے ہیں، یہ ذمہ داری احقر منظور کرلے، مگر احقر کا جواب یہی ہوتا تھا کہ احقر اپنی افتادِ طبع کے لحاظ سے مدرس ہے، آپ کی امداد کے لیے خدمت تدریس ترک کیے ہوئے ہے، نظامت سے طبعاً دلچسپی نہیں ہے، آپ کو اگر امداد کی ضرورت نہیں تو احقر کا مقام مدرسہ شاہی ہے، نظامت علیا نہیں''۔

درس وتدریس سے اپنی فطری مناسبت کا تذکرہ کرتے ہوئے مزید تحریر فرماتے ہیں:

''احقر کا پیشہ مدرسی رہا، اگرچہ بیس سال ایسے گذرے کہ قید وبند یا جمعیۃ علماء کی وجہ سے اس پیشہ پر قائم نہ رہ سکا؛ مگر پھر خود خدا نے توفیق عطا فرمائی کہ قال اللہ و قال الرسول کے حلقہ میں احقر حاضر ہوگیا''۔ (روز نامہ الجمعیۃ خصوصی اشاعت: ۵/ مئی ۱۹۲۷ء مضمون بعنوان: ''خوش نوشت بے نوا'' بحوالہ تاریخ شاہی: ۳۸۹)

درس وتدریس سے مناسبت، ذوق مطالعہ، علمی وتحقیقی مزاج، شرافت نفسی اور نیک کرداری کے علاوہ حضرت میں دو ایسی خوبیاں اور جمع ہوگئی تھیں جو ایک مثالی استاد اور کامیاب مربی کے لیے ازبس ضروری ہیں: ایک آپ کا بڑھا ہوا عالمانہ وقار اور بارعب شخصیت اور دوسرے طلبہ کے ساتھ آپ کی حد درجہ شفقت اور ہمدردی کا برتاؤ۔ آپ کی

بارعب شخصیت کی وجہ سے ہر طالب علم آپ کے احترام اور آپ کے حکم کی بجا آوری پر اپنے کو مجبور پاتا تھا۔ بعض وہ طلبہ جو قابل ہونے کے ساتھ حضرت کے بہت خاص اور ہر دل عزیز ہوتے وہ بھی چاہنے کے باوجود حضرت سے بہت زیادہ بے تکلف نہیں ہو پاتے تھے۔ دوسری طرف طلبہ کے ساتھ آپ کی غایت درجہ کی شفقت اور ہمدردی نے طلبہ کے لیے آپ کی شخصیت میں عجیب مقناطیست اور کشش رکھ دی تھی، طلبہ آپ کی طرف کھنچتے اور آپ کا قرب حاصل کرنے میں فخر محسوس کرتے۔ حضرت کی ان دوخوبیوں کا تذکرہ آپ کے تین جلیل القدر شاگرد: حضرت مولانا قاضی اطہر مبارکپوری، حضرت مولانا اسیر ادروی اور استاذ محترم حضرت مولانا نور عالم خلیل امینی نے اپنی اپنی تحریروں میں خصوصیت کے ساتھ کیا ہے۔ آخرالذکر نے حضرت سے مدرسہ امینیہ دہلی میں پڑھا، اور اول الذکر دو بزرگوں نے مدرسہ شاہی میں آپ سے تعلیم پائی۔ ذیل میں مولانا اسیر ادروی دامت برکاتہم کا اقتباس پیش خدمت ہے۔ مولانا اپنے استاد کا سراپا بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

> ''لمبا قد، گورا چٹا رنگ،......آنکھوں پر زیادہ پاور کا چشمہ، بڑی مگر چھدری داڑھی، اونچی دیوار کی ٹوپی، دبلا پتلا جسم، چہرے پر ایک خاص طرح کا جلال، ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ چہرہ ہمیشہ مسکراہٹ سے ناآشنا رہتا ہے، پہلی ہی نگاہ میں مرعوبیت کا احساس ہوتا تھا۔ یہ تھے مشہور اہل قلم صاحب طرز ادیب، درجنوں کتابوں کے مصنف حضرت مولانا سید محمد میاں دیوبندی جو بعد میں ترمذی شریف میں ہمارے استاذ ہوئے۔ یہ پہلی ملاقات کا تاثر تھا؛ لیکن ان کی شفقت وعنایت حاصل ہوئی تو دل ناعاقبت اندیشی پر شرمندہ ہوا، اب اسی دل نے کہا جسم ضرور فولاد ہوسکتا ہے؛ لیکن سینہ میں جو دل ہے وہ یقیناً موم کا بنا ہوا ہے۔'' (تاریخ شاہی: ۴۵۷)

تحریر میں آپ کا قلم نہایت رواں دواں اور آپ کا اسلوب نہایت پرکشش اور جاذب تھا؛ مگر درس وتدریس میں آپ کے تلامذہ کے بیان کے مطابق آپ کا انداز سادہ تھا۔ گفتگو میں ٹھہراؤ ہوتا، کلام مختصر مگر جامع کرتے، جو وسیع مطالعہ کا خلاصہ اور نچوڑ ہوتا۔ دوران درس غیر ضروری گفتگو اور مزاح سے اجتناب فرماتے۔ (پس مرگ زندہ: ۴۰)

آپ کے تدریس کا عام انداز تو یہی تھا؛مگر شمائل ترمذی میں آپ کا رنگ کچھ اور ہوتا تھا۔مولانا اسیر ادروی تحریر فرماتے ہیں:

''استاد موصوف کا درس ترمذی اتنا ہی سادہ تھا؛ البتہ شمائل ترمذی میں ان کی تقریر بہار آفریں اور ان کی زبان پھول برساتی تھی۔کیوں کہ وہ عربی ادب کا شاہکار ہے اور آپ اردو ادب کے ماہر اور صاحب طرز اہل قلم تھے۔''(تاریخ شاہی:۴۶۵)

حضرت سید الملت رحمۃ اللہ اپنے اساتذہ اور مشائخ کی طرح حد درجہ امانت دار اور محتاط واقع ہوئے تھے؛ چناں چہ اگر مدرسہ کے وقت میں کچھ تاخیر ہوتی تو اس کا حساب لگا کر تنخواہ سے وضع کرادیا کرتے تھے۔آپ کے شاگرد مولانا اشفاق حسین صاحب لکھتے ہیں:

''آپ ورع وتقوی کے اعلی مقام پر فائز اور اخلاص کے پیکر تھے، مدرسہ کے وقت کے علاوہ ملی خدمات انجام دیتے تھے، اور مدرسہ کے وقت میں اگر کچھ تاخیر ہوجاتی تو اس کی تنخواہ کا حساب لگا کر وضع کروایا کرتے تھے۔''(تاریخ شاہی:۲۳۹)

مدرسہ شاہی میں آپ سے درس نظامی کی اعلی کتابیں، مسلم شریف، ترمذی شریف، شمائل ترمذی، مشکوۃ شریف، ہدایہ اخرین، مختصر المعانی، مقامات حریری وغیرہ وابستہ رہیں۔ تاریخ شاہی سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو ایک ادیب استاد کی حیثیت سے مدرسہ شاہی لایا گیا تھا۔غالبًا اسی وجہ سے شمائل ترمذی اور مقامات حریری آپ سے متعلق رہی تھیں۔۱۳۴۷ سے ۱۳۶۶ھ تقریباً اٹھارہ سال تک آپ اس گلشن قاسمی میں علم وحکمت کے موتی بکھیرتے رہے، اور اپنی قابل قدر خدمات کے ذریعہ اس درس گاہ کے وقار ومعیار کو بلند کیا۔(تاریخ شاہی:۴۴۴و۴۴۳)

مثالی مربی:

آپ ایک بہترین مؤرخ، مصنف اور معلم ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بہترین مربی بھی تھے۔طلبہ میں ہمت وحوصلہ کی روح پھونکتے، ان کے عزائم کو بیدار کرتے، ان میں فکر و شعور پیدا کرنے لیے کوشاں رہتے۔ان کے کارناموں کی تعریف کرتے، انھیں مفید مشوروں سے نوازتے، طالب علم کے ذوق کا خیال کرتے ہوئے اسے آگے بڑھانے کی کوشش کرتے اور اس طرح خیر خواہی اور ہمدردی کا معاملہ فرماتے کہ انتہائی بارعب اور

باوقار ہونے کے باوجود بھی طلبہ آپ پر جان چھڑکتے۔ آپ کے خصوصی تربیت یافتہ اور اپنے عہد کے معروف مستند مؤرخ اور مصنف حضرت مولانا قاضی اطہر مبارکپوری اپنے محسن استاد کی کرم فرمائیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''میں مضامین اور نظمیں بھیجتا رہا اور مولانا (اپنے رسالہ قائد میں) شائع فرماتے رہے۔ مولانا کی اس عنایت اور توجہ سے میری ہمت اور حوصلہ میں بڑی توانائی پیدا ہوگئی اور قلم مضمون نگاری اور دماغ شاعری میں رواں دواں ہوگیا۔ ان کی نگاہ شفقت میں میرے مضامین بہت بلند پایہ ہوتے تھے، اپنے خطوط میں خوب خوب تشجیع وتشویق فرماتے۔ ایک مرتبہ...... لکھا کہ آپ کے مضامین اعلی درجہ کے اور معیاری ہوتے ہیں، زیادہ تعریف اس لیے نہیں کی جاتی کہ کہیں آپ رسالہ قائد کو ان کے لیے نااہل نہ سمجھنے لگیں۔''

حضرت قاضی صاحب پر مولانا کی یہ عنایتیں اس وقت تھیں جب ابھی آپ مدرسہ احیاء العلوم رمبارکپور میں طالب علم تھے۔ اس کے بعد جب آپ مدرسہ شاہی تشریف لائے تو الطاف کریمانہ کا سلسلہ مزید بڑھ گیا۔ قاضی صاحب اپنے استاد کی عنایتوں کا تذکرہ کرتے ہوئے اسی سلسلۂ کلام میں مزید تحریر فرماتے ہیں:

> ''واقعہ یہ ہے کہ تصنیف وتالیف میں مولانا مرحوم میرے اولین محسن اور مربی ہیں، اگر ان کی توجہ نہ ہوتی، اور رسالہ قائد میں میرے مضامین شائع نہ ہوتے تو شاید میں تصنیف وتالیف کے لائق نہ ہوتا۔'' (تاریخ شاہی: ۴۴۳ وماہنامہ ضیاء الاسلام کا قاضی اطہر مبارکپوری نمبر جلد نمبر: ۳ شمارہ: ۸، ص: ۳۱)

آپ تحریک آزادی کے فعال، مخلص اور سچے سپاہی اور انگریزی حکومت کے سخت مخالف تھے، اور اس کے خلاف جدوجہد کو وقت کی سب سے بڑی ملی وقومی ضرورت سمجھتے تھے۔ آپ کے اندر اس حوالے سے ایک بے چینی اور ایک تڑپ تھی جسے آپ اپنے ہر نیازمند کے دل میں منتقل کر دینا چاہتے تھے۔ آپ کو شدت سے اس کا احساس تھا کہ طلبہ میں سیاسی شعور بیدار کرنے اور ملک وملت کے لیے ان میں قربانی اور جاں نثاری کے جذبات پیدا

کرنے کی سخت ضرورت ہے؛ چناں چہ اپنی تحریر وتقریر اور اپنے اسباق اور مختلف طرز و انداز سے طلبہ کی ذہن سازی اور تربیت کرتے، ان میں قربانی کی روح پھونکتے۔ آپ کے جاں نثار شاگرد مولانا اشفاق حسین قاسمی لکھتے ہیں:

''غرضیکہ یہ ایسی دھن تھی جس میں دن ورات انہاک اور مشغولیت تھی، اوقات درس میں طلبہ کے اندر آزادی وطن کا جذبہ پیدا کرنے والی اور طلبہ کو ان کی ذمہ داریوں کا احساس دلانے والی ولولہ انگیز تقریریں ہوتیں تھیں، جنھوں نے طلبہ کے دلوں کو گرمادیا تھا۔ حضرات اساتذۂ کرام کے حکم پر اپنی جانوں کو قربان کردینے کے جذبات پیدا ہوگئے تھے، خصوصاً حضرت مولانا محمد میاں صاحب کا معمول تھا کہ روز آنہ ہی کسی نہ کسی انداز سے طلبہ کی سیاسی تربیت اور ذہن سازی فرماتے تھے؛ چناں چہ طلبہ وطن عزیز کی آزادی کو اپنا فریضۂ مذہبی سمجھنے لگے تھے۔'' (تاریخ شاہی:۴۸۸)

ایک اور مضمون میں آپ کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:

''طلبہ کو خاص انداز پر تربیت دینے کا بہترین ملکہ حاصل تھا۔ ایک مرتبہ ۴۲ء میں ہدایہ کا سبق پڑھانے کے لیے تشریف لائے، کتاب کی ابتدا تھی اور کوئٹ انڈیا کی تحریک شروع ہوچکی تھی۔ آپ نے درس گاہ میں آتے ہی فرمایا کہ 'پتہ نہیں، ہوسکتا ہے کل ہندوستان آزاد ہوجائے، اسلامی حکومت قائم ہو اور قاضیوں کے تقرر کی ضرورت پیش آئے؛ لہٰذا پہلے کتاب القضاء پڑھ لو۔' اور یہ کہہ کر کتاب القضاء شروع فرمادی، اس سے طلبہ کا ذہن کیسا بنا ہوگا آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں۔'' (تاریخ شاہی:۲۳۹)

آپ کے ایک اور شاگرد مولانا اسیر ادروی حضرت ممدوح کا ایک اہم واقعہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''......جوں ہی طلبہ ترمذی شریف کے لیے حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب کی درس گاہ میں پہنچے تو حضرت استاد پہلے سے موجود تھے، چہرے پر تفکرات کا سایہ تھا، آنکھیں بتارہی تھیں کہ رات کو سکون سے سو نہیں سکی ہیں، حرکات وسکنات سے کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ آپ بڑی عجلت میں ہیں اور بہت اہم اور ضروری امور پیش

نظر ہیں اور وقت بہت کم ہے؛ اس لیے وہ جلد از جلد اس بات کو بتانا چاہتے تھے جسے بتانے کے لیے وہ کانٹوں پر چل کر آئے تھے، کیوں کہ شہر میں پولیس کو چوکنا کر دیا گیا تھا، کسی بھی لمحہ انگریزی پولیس گرفتار کر سکتی تھی۔ آپ نے فرمایا:

''میں آپ لوگوں سے ایک غیر معینہ مدت کے لیے رخصت ہو رہا ہوں، اگر زندگی رہی تو پھر کبھی ملاقات ہوگی، آپ حضرات کے کندھوں پر قوم، ملک اور ملت کی بہت بڑی ذمہ داریاں آ رہی ہیں، ان سے عہدہ برآ ہونے کی جدوجہد میں کوتاہی نہیں کریں گے، انگریزی اقتدار کو ہندوستان سے ختم کرنا ہمارے فرائض میں سب سے بڑا فریضہ ہے، اچھا خدا حافظ۔''

اور پھر حضرت استاد نگاہوں سے اوجھل ہو گئے تو برسوں کے بعد ہی آپ کی خیریت کی خبر مل سکی۔'' (تاریخ شاہی: ۴۶۸)

قارئین اندازہ لگا سکتے ہیں کہ حضرت مولانا کے ان چند جملوں نے طلبہ کے جذبات میں کس قدر تلاطم اور ولولوں میں کیسا تموج برپا کیا ہوگا۔

مولانا کی اسی مثالی تربیت کا نتیجہ تھا کہ طلبہ کی ایسی جماعت تیار ہوگئی جو جنگ آزادی میں جوش وخروش کے ساتھ آپ کے ہمرکاب رہی۔ ان طلبہ نے اپنے اساتذہ کے ہمراہ اپنی جانوں کو جوکھم میں ڈال کر کئی سرگرمیوں میں حصہ لیا، گولیاں کھائیں، زخمی ہوئے، جیل گئے، قید بامشقت کی مصیبتوں سے گذرے؛ مگر ان کے حوصلے ماند نہ پڑے۔ ان بلند حوصلہ طلبہ اور ان کے اصحاب عزیمت اساتذہ کی بدولت مرادآباد اور اطراف میں مدرسہ شاہی تحریک آزادی کا مرکز بن گیا، اس زمانے میں مرادآباد میں جو بھی تحریکیں اٹھتیں ان کا آغاز مدرسہ شاہی کے انھیں جیالوں سے ہوتا، اور پھر راہ رو آتے رہتے اور کارواں بنتا جاتا۔

حضرت مولانا سید فخر الدین مرادآبادیؒ، حضرت مولانا سید محمد میاں دیوبندیؒ و دیگر اساتذہ کی سرپرستی اور نگرانی میں طلبہ نے جو زبردست سرگرمیاں انجام دیں ان کی روداد بڑی دلچسپ اور موجودہ دور میں طلبۂ مدارس کے لیے ناقابل یقین سی ہے۔ یہ صفحات ان کے ذکر کے متحمل نہیں ہیں؛ البتہ ایک واقعہ کا قدرے اختصار سے نقل کر دینا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ یہ واقعہ

ہے طلبۂ مدرسہ شاہی کے ذریعہ مولانا عبید اللہ سندھی رحمۃ اللہ کے استقبال کا۔مولانا سندھی تقریباً پچیس سال جلاوطنی کی گذار کر جب ہندستان آئے تو جمعیۃ علماء مرادآباد نے ایک اجلاس کی صدارت کے لیے آپ کو دعوت دی جسے آپ نے منظور فرمایا۔اس وقت مرآدآباد میں جمعیۃ علماء کے روح رواں حضرت مولانا فخر الدین مرادآبادی شیخ الحدیث مدرسہ شاہی اور حضرت مولانا محمد میاں دیوبندی رحمہما اللہ تھے۔مولانا اشفاق حسین صاحب جو ایک اہم رضا کار کی حیثیت سے اس استقبال میں شریک رہے تحریر فرماتے ہیں:

''ربیع الثانی ۱۳۵۸ھ کی صبح کو پنجاب میل سے علامہ سندھی اسٹیشن مرادآباد پر رونق افروز ہوئے تو حسب اعلان طلبہ مدرسہ شاہی نے شاندار استقبال کیا۔پچاس سرخ پوش طلبہ جو کہ تلواروں سے مسلح تھے دورویہ صف باندھے کھڑے تھے۔حضرت سندھی جب گیٹ پر پہنچے تو طلبہ مدرسہ شاہی نے سلامی دی، پریڈ کے مخصوص اشارات کے بموجب تلواروں کو دونوں طرف بلند کرکے ان کی نوکیں ملالیں، اب تقریباً پندرہ گز رستہ تلواروں کے سائے میں تھا، جس پر حضرت سندھی تواضع وانکساری کے ساتھ سر جھکائے ہوئے خاموشی کے ساتھ گذر رہے تھے۔یہ منظر نہایت عجیب تھا، جسے دیکھنے والوں نے نہایت حیرت اور دلچسپی سے دیکھا۔اس طرح پر تلواروں کے سایہ میں حضرت سندھی اس گاڑی تک پہنچے جوان کی سواری کے لیے اسٹیشن گیٹ کے باہر کھڑی تھی۔طلبہ مدرسہ شاہی اسی طرح اپنی جگہ نہایت نظم وضبط کے ساتھ کھڑے رہے۔جب آپ کی گاڑی قیام گاہ کی طرف روانہ ہوئی تو طلبہ کے دستہ کے کمانڈر نے سیٹی بجائی جو اشارہ تھا اس بات کی طرف کہ وہ اپنی تلواریں میان میں رکھ لیں۔کمانڈر نے دوسری سیٹی بجائی جو اس طرف اشارہ تھا کہ یہ دستہ اپنی جگہ چھوڑ کر شہر میں گشت کرے۔چناں چہ طلبہ کے دستہ نے مسلح اور باوردی گشت کیا جس سے عوام میں بہت زیادہ دلچسپی پیدا ہوئی۔پھر جامع مسجد میں جلسہ ہوا، پھر عصر کے بعد جامع مسجد سے حضرت سندھی کا جلوس روانہ ہوا، یہ جلوس عجیب نرالے انداز کا تھا۔اس سے قبل ایسا جلوس اہل مرادآباد نے نہیں دیکھا تھا....علامہ سندھی کا استقبال شہر مرادآباد میں ایک مثالی تھا جو پورے ہندستان میں مشہور ہوا۔'' (تاریخ شاہی: ۴۹۸ تا ۵۰۰)

اس سے اس عزم وحوصلے کا اندازلگایا جاسکتا ہے جو مدرسہ شاہی کے اکابر بالخصوص حضرت مولانا محمد میاں صاحبؒ نے طلبہ میں پیدا کیا تھا۔

فقہ وفتاوی:

حضرت مولانا محمد میاں دیوبندی رحمہ اللہ کو دیگر کمالات کے ساتھ فقہ وفتاوی میں بھی دستگاہ حاصل تھی۔آپ نے پہلے مدرسہ شاہی کے دارالافتاء اور پھر مدرسہ امینیہ میں فتوی نویسی کا کام کیا،اور پھر جمعیۃ علماء ہند کے ادارہ مباحث فقہیہ کے مدیر رہے۔دارالافتاء مدرسہ شاہی کے مفتی اول حضرت مولانا مصلح الدین احمد صاحبؒ کے مدرسہ سے مستعفی ہونے کے بعد آپ نے ۱۳۵۸ھ میں بحیثیت مفتی دارلافتاء کی ذمہ داری سنبھالی اور ۱۳۶۶ھ تک آپ نے فتوی نویسی کی خدمت انجام دی۔آپ کے تحریر کردہ فتاوی کی نقول دو رجسٹروں میں درج ہیں۔ آپ نے خودہی اپنے فتاوی رجسٹرنقول فتاوی میں درج فرمائے ہیں۔آپ کے تحریر کردہ فتاوی کی تعداد ۴۵۸ ہے۔ان فتاوی پر حضرت مولانا مفتی محمد سلمان صاحب منصورپوری مفتی مدرسہ شاہی نے کافی عرصہ پہلے ترتیب اورتحشیہ کا کام کیا ہے،مگرابھی طباعت کا کام نہیں ہوسکا ہے۔ مفتی صاحب کا مرتب کردہ مسودہ فل اسکیپ سائز پر ۲۰۹ صفحات پر مشتمل ہے۔

ناچیز نے مسودہ کے متفرق مقامات پرنظرڈالی،سوالات کے جواب واضح ہیں،زبان سادہ اورعام فہم ہے،سوال کی نوعیت کے اعتبار سے جوابات مختصر بھی ہیں اورطویل بھی۔بعض وہ مسائل جوآپ کے زمانے میں علمی حلقوں میں موضوع بحث بنے ہوئے تھے،جیسے عدالت صحابہ اوران کا معیارحق ہونا۔ان پرآپ نے نہایت مدلل اور تفصیلی جوابات تحریرفرمائیں ہیں،اس سلسلے کےبعض جوابات تو اپنے موضوع پر جامع اوروقیع رسالے کی حیثیت رکھتے ہیں۔آپ نے جوابات میں عموماً حوالوں کے ساتھ مستند فقہی کتابوں سے عبارتوں کے بھی نقل کرنے کا اہتمام فرمایا ہے۔

ملی سرگرمیاں اورنا قابل فراموش خدمات:

جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے کہ فکری طور پرآپ کو جمعیۃ علماء ہند سے مناسبت اور تعلق

زمانہ طالب علمی سے ہی تھا، فراغت کے بعد آپ نے جمعیۃ کے بعض اجلاس میں شرکت بھی فرمائی تھی؛ مگر مناسب ماحول نہ ملنے کی وجہ سے آپ عملی طور سے سرگرم نہیں ہوئے تھے۔ مدرسہ شاہی میں آمد کے بعد آپ کو جمعیۃ کے پلیٹ فارم سے ملک وملت اور قوم و وطن کے لیے عملی سرگرمیاں انجام دینے کا ایک نہایت سازگار ماحول ملا، اور یہاں سے آپ کا شوق منزل کچھ ایسا آمادۂ سفر ہوا کہ پھر راستے کی پر خار وادیاں اور سنگلاخ گھاٹیاں آپ کے عزم سفر کو کمزور نہ کر سکیں۔ آپ نے زبان وقلم اور حرکت وعمل کی ساری صلاحیتوں کو تحریک آزادی کے لیے وقف کر دیا، اس راہ میں کئی بار آپ کو قید و بند کے مراحل سے گذرنا پڑا؛ مگر عشق حریت کے جرم میں آپ کو جس قدر سزائیں دی جاتی رہیں آپ کا شوق جنوں اتنا ہی عناں تاب ہوتا رہا۔ مولانا اشفاق حسین قاسمی حضرت مولانا محمد میاں صاحب رحمہ اللہ اور مدرسہ شاہی کے دوسرے اکابر کی سرگرمیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

> ''حضرت مولانا فخر الدین احمد صاحب، حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب، حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب، حضرت مولانا قاری عبداللہ صاحب یہ حضرات تحریک آزادی کے روح رواں تھے، جن کا حال یہ تھا کہ دن درس وتدریس میں مشغولیت، اوراوقات فارغہ میں مرادآباد کے محبان وطن کے ساتھ مشوروں میں شرکت اور تحریک آزادی کو کامیاب بنانے میں مشغول۔ شب کو محلوں میں وعظ وتقریر اور سیاسی جلسوں میں شرکت اور تقریریں۔ غرضیکہ یہ ایسی دھن تھی جس میں دن ورات انہماک اور مشغولیت تھی۔'' (تاریخ شاہی: ۴۸۷)

مدرسہ شاہی کے زمانۂ قیام میں آپ کی انگریز مخالف سرگرمیاں کس تسلسل اور جوش و خروش کے ساتھ جاری تھیں، اس کا اندازہ کرنے کے لیے بس یہی بات کافی ہے کہ آپ کو جدوجہد آزادی کے سفر میں کل چھ بار گرفتار کیا گیا، پانچ بار سزا ہوئی اور قلیل یا طویل مدت کے لیے جیل گئے۔ گرفتاری اور قید وبند کے یہ سارے واقعات مدرسہ شاہی میں قیام کے دوران پیش آئے۔ حضرت کی ملی وسیاسی خدمات کا تذکرہ چوں کہ دوسرے مقالہ نگار حضرات کا حصہ ہے، اس لیے یہاں آپ کی محض ان سرگرمیوں کا اجمالی تذکرہ کیا جاتا ہے جو آپ

نے مدرسہ شاہی سے وابستگی کے زمانے میں انجام دیں۔

جمعیۃ علماء سے وابستگی اور سیاسی سفر کا آغاز:

۱۳۴۷ھ م ۱۹۲۸ء کو آپ مدرسہ شاہی سے وابستہ ہوئے، اسی سال جمعیۃ علماء مراد کا انتخاب ہوا تو آپ کو جمعیۃ علما شہر مراد آباد کا نائب ناظم بنایا گیا، پھر کچھ دنوں کے بعد ناظم بنا دیا گیا۔ اس وقت جمعیۃ علماء کے نظام میں آگرہ اور اودھ الگ الگ صوبے تھے۔ اس زمانہ میں جمعیۃ نے تبلیغ کا سلسلہ شروع کیا تو آپ کو جمعیۃ علماء صوبہ آگرہ کا ناظم تبلیغ بنایا گیا۔ ناظم تبلیغ کے بعد آپ کو صوبہ آگرہ پھر صوبہ متحدہ کی جمعیۃ علماء کا ناظم بنایا گیا۔ ۱۳۶۴ھ ۱۹۴۵ کو حضرت مجاہد ملت سہارنپور کے ایک اجلاس میں جمعیۃ علماء کے ناظم اعلیٰ منتخب ہوئے تو آپ کو ان کا معاون بنایا گیا، پھر دو سال کے بعد ۱۹۴۷ میں ملک آزاد ہوا، اور آزادی کے ساتھ ہی فتنے فسادات اور ملی مسائل کا ایسا ہجوم ہوا کہ اس کے ساتھ مدرسہ شاہی میں تدریسی مشاغل کا جاری رکھنا ناممکن تھا۔ اس لیے بادل ناخواستہ آپ کو مدرسہ شاہی سے تدریسی وابستگی کو ختم کرنا پڑا۔ (تاریخ شاہی: ۳۸۸و۳۹۰)

۱۹۲۹ میں جمعیۃ علماء کا امروہہ میں ایک اہم اجلاس ہوا، اجلاس اس لیے اہمیت کا حامل تھا کہ اس میں مسلمانوں کے لیے مستقبل کا لائحۂ عمل تیار کرنا تھا۔ چناں چہ اس اجلاس میں یہ لائحۂ عمل تیار کیا گیا کہ مسلمان کانگریس کے اشتراک سے جدوجہد آزادی میں حصہ لیں۔ اس اجلاس میں آپ بھی شریک ہوئے تھے اور اجلاس کے اختتام کے بعد آپ نے تنہائی میں اپنے شیخ حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے استصواب کیا کہ آپ کو کانگریس اور تحریک آزادی میں حصہ لینا چاہیے یا نہیں؟ مولانا کا جواب لامحالہ اثبات میں تھا۔ مزید فرمایا: یورپ خصوصاً گورمنٹ برٹش نے دنیا کے بہت سے ممالک کو اپنے شکنجے میں کس رکھا ہے، برٹش کی یہ طاقت ہندستان کی وجہ سے ہے۔ ہندستان پر برٹش کی گرفت کچھ بھی ڈھیلی پڑتی ہے تو ان کمزور ممالک پر بھی اثر پڑتا ہے اور انھیں سانس لینے کا موقع ملتا ہے۔ حضرت کے اس ارشاد کے بعد آپ کو انشراح ہو گیا؛ چناں چہ آپ نے حضرت مولانا

فخر الدین صاحب کا دست بازو بن کر تحریک میں کام شروع کر دیا۔

کچھ عرصہ کے بعد مراد آباد یو پی کونسل کا ضمنی الیکشن ہونا طے ہوا تو جمعیۃ علماء نے اس کے بائیکاٹ کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ الیکشن شروع ہوتے ہی جمعیۃ کے رضا کاروں نے ہنگامہ شروع کر دیا۔ مجمع بے قابو ہو گیا اور پولیس نے فائرنگ شروع کر دی، کئی رضا کار شدید زخمی ہوئے، ان میں مدرسہ شاہی کے بعض طلبہ بھی شامل تھے۔ اس بائیکاٹ کے محرک مولانا فخر الدین اور مولانا محمد میاں صاحب تھے جو خود بھی بائیکاٹ میں شریک تھے اور بڑی حکمت سے اپنے کو پولیس فائرنگ سے بچانے میں کامیاب ہوئے۔ اس واقعہ کے دو ہفتے کے بعد ان دونوں بزرگوں کو گرفتار کیا گیا اور ایک ایک سال کی سزا ہوئی، مگر جیل سے رہائی ساڑھے پانچ مہینے میں ہو گئی۔ یہ آپ کی پہلی گرفتاری تھی۔

اس واقعہ کے تقریباً ایک سال کے بعد تحریک میں نیا موڑ آیا، جمعیۃ علماء نے اپنے اہم ذمہ داران کی ڈیوٹیاں متعین کیں۔ آپ کے لیے یہ طے کیا گیا کہ آپ ہر ہفتے مراد آباد سے دہلی جایا کریں گے اور جمعہ کو جامع مسجد میں تقریر کر کے فوراً واپس ہو جائیں گے۔ یہ تقریریں عوام الناس کو حکومت کے خلاف برانگیختہ کرنے کے مقصد سے کی جاتی تھیں۔ کئی ہفتے یہ سلسلہ جاری رہا، اس کے بعد آپ کو گرفتار کر لیا گیا؛ مگر سزا نہیں ہوئی، البتہ چھ ماہ کے لیے دہلی میں آپ کا داخلہ ممنوع ہو گیا۔ (اشتات بحوالہ پس مرگ زندہ: ۹۸ تا ۱۰۱)

جن دنوں جامع مسجد میں تقریر کے لیے آپ کی دہلی آمد و رفت تھی انھیں دنوں آپ نے ایک مضمون لکھا تھا ''اسلام کو کس چھری نے ذبح کیا؟'' اس مضمون میں آپ کے شعلہ بار قلم نے انگریزی حکومت کے خلاف آگ اگلی تھی۔ آپ نے اپنی مذکورہ بالا گرفتاری سے کچھ ہی وقت پہلے جامع مسجد کی تقریر کے لیے یہ انتظام کیا کہ اپنے ایک خاص تربیت یافتہ شاگرد مولانا فضل الرحمٰن کٹکی کو جو کہ اس وقت مدرسہ شاہی کے طالب علم تھے، اپنا یہ مضمون دیا اور کہا کہ میری جگہ جا کر جامع مسجد دہلی میں یہ مضمون سنا دینا۔ مولانا نے جامع مسجد پہنچ کر استاد محترم کی گرفتاری کی خبر دی اور منبر سے ایک جوشیلی تقریر کی اور پھر استاد محترم کا مضمون

پڑھ کر سنایا۔ مضمون کا سننا تھا کہ مجمع میں انگریزی حکومت کے خلاف زبردست اشتعال پیدا ہوا۔ انگریز حکمراں کی غضب ناک نگاہیں آپ پر پڑ رہی تھیں۔ چناں چہ آپ جیسے ہی جامع مسجد سے باہر آئے، گرفتار ہو گئے اور دو سال قید با مشقت کی سزا ہوئی۔ جیل سے رہائی کے بعد تعلیم کی تکمیل کے لیے پھر مدرسہ شاہی آئے اور آتے ہی حضرت مولانا فخر الدین کی زیر سرپرستی اور مولانا محمد میاں کی زیر نگرانی اصلاح البیان کے نام سے ایک انجمن قائم کی اور طلبہ میں آزادی کی روح پھونکی۔ چنانچہ اس انجمن کے افراد نے تحریک آزادی میں وہ اہم کارنامے انجام دئے جن کا آج تصور بھی مشکل ہے۔ (تاریخ شاہی: ۴۸۹)۔

سابقہ گرفتاری میں سید الملت کو سزا تو نہیں ہوئی تھی البتہ ایک ہفتہ پولیس کی حراست میں رہے تھے۔ چنانچہ جب آپ کو حراست سے آزاد کیا گیا تو آپ فوراً مرادآباد آئے اور چند ہی دنوں کے بعد ایک روز ایک ہاتھ میں جمعیۃ اور دوسرے ہاتھ میں کانگریس کا جھنڈا لے کر دفعتاً چوک بازار میں نمودار ہوئے، جمعیۃ اور کانگریس کے رضا کار پروگرام کے تحت پہلے سے چھپے ہوئے تھے، وہ بھی ساتھ ہو گئے اور ایک جلوس کی شکل ہو گئی، تھوڑی دور چلنے کے بعد پولیس نے آپ کو گرفتار کیا اور مجمع پر لاٹھی چارج کر کے اسے منتشر کر دیا۔ مقدمہ چلا اور چھ ماہ قید با مشقت کی سزا ہوئی۔

پھر اس کے بعد آپ کی انقلابی کتاب ''علماء ہند کا شاندار ماضی'' طبع ہوئی۔ کتاب کے تین حصے طبع ہوئے اور ضبط ہو گئے، چوتھے حصہ میں آپ کا قلم انگریز حکومت کے خلاف زیادہ شعلہ بار ہو گیا، جس کی وجہ سے کتاب کے ساتھ پریس بھی ضبط ہوا اور مولف کو جیل بھی ہوئی، پھر ضمانت پر رہا کیا گیا۔

اسی زمانے میں حضرت شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کو ان کی ایک تقریر کی وجہ سے گرفتار کیا گیا تھا، اس مقدمہ کی پیروی کی ذمہ داری آپ نے لے لی۔ حضرت شیخ الاسلامؒ کو عدالت میں جو بیان دینا تھا اسے آپ ہی نے مرتب کیا تھا۔ آپ کو حضرت شیخؒ کی ذات سے والہانہ شیفتگی تھی، آپ ان کے صحیح مزاج داں تھے۔ بقول مولانا اسیر ادروی: ''دونوں شخصیتوں میں

قدرے مشترک بات یہ تھی کہ حضرت شیخ الاسلام کی زبان میں انگریزی حکومت کے خلاف تقریر کرتے ہوئے تلوار کی کاٹ تھی، تو استاد محترم کی نوک قلم برطانوی اقتدار کے خلاف لکھتے ہوئے زہر میں ڈوب ڈوب جاتی تھی۔'' چنانچہ جو بیان آپ نے مرتب کیا شیخ الاسلام نے وہی عدالت میں پڑھا اور داخل بھی کیا۔ حضرت شیخ الاسلام کی رہائی ابھی نہیں ہوئی تھی کہ حضرت مجاہد ملت اور ان کے ہمراہ آپ بھی جیل میں پہنچ گئے۔

پھر ۱۹۴۲ء میں جمعیۃ علماء کی مجلس عاملہ میں شرکت کی۔ اس مجلس میں ایک تجویز پاس کی گئی جس میں مسلمانوں سے تحریک آزادی میں شرکت کی اپیل کی گئی تھی۔ اس تحریر کو چھپوا کر مسلمانوں میں تقسیم کے لیے آپ نے مختلف مقامات کا دورہ کیا، بالآخر انھیں سرگرمیوں میں آپ کو اکتوبر ۱۹۴۲ء میں گرفتار کیا گیا اور جیل ہوئی، اور ۱۹۴۴ء میں رہائی ہوئی۔ یہ آپ کی سب سے لمبی اسیری تھی، اس کے بعد پھر جیل کی نوبت نہیں آئی۔

(اشتات بحوالہ پس مرگ زندہ: ۱۰۱ تا ۱۰۴ و تاریخ شاہی ۴۵۸)

مدرسہ شاہی سے وابستہ رہتے ہوئے جمعیۃ علماء کے پلیٹ فارم سے جو آپ نے قربانیاں پیش کیں یہ اس کا بہت سرسری اور اجمالی خاکہ ہے۔ تحریک آزادی کے علاوہ آپ نے اس پلیٹ فارم سے جو دوسری ملی اور تبلیغی خدمات پیش کی وہ ان کے علاوہ ہیں۔

مدرسہ شاہی سے تالیفی اور قلمی سرگرمیاں:

آپ ایک خوب نویس زود نویس اور بسیار نویس اہل قلم اور بہت بڑے مصنف تھے۔ آپ فطری قلم کار تھے۔ رنج ہو راحت ہو، سفر ہو حضر ہو، اسیری ہو رہائی ہو، مسائل کا ہجوم ہو یا فارغ البالی ہو، آپ کے قلم کی جولانیاں ہر وقت شباب پر رہتی تھیں۔ اتنی الجھنوں اور متنوع مسائل اور افکار کے باوجود جو تصنیفی و تالیفی و تحریری سرمایہ آپ نے چھوڑا ہے وہ ایک فرد کا نہیں؛ بلکہ ایک اکیڈمی کا کارنامہ ہے۔ آپ کی تصانیف کا بڑا حصہ مدرسہ شاہی کے زمانۂ قیام کی یادگار ہے۔ ''علماء ہند کا شاندار ماضی'' جو آپ کی تصانیف میں ایک اہم مقام رکھتی ہے، وہ یہیں تصنیف کی گئی۔ مولانا اسیر ادروی قیام شاہی کے زمانے میں مولانا

کی قلمی سرگرمیوں، نیز آپ کے اسلوب تحریر، کثرت نگارش اور آپ کے پسندیدہ موضوعات کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

اس وقت مولانا موصوف کے تصنیفی مشاغل شباب پر تھے، ایسا لگتا تھا کہ شب وروز آپ کا قلم برق رفتاری کے ساتھ چلتا ہے۔ آپ اردو تحریر میں ایک خاص طرز تحریر کے مالک تھے۔ چھوٹے چھوٹے جملے ادب وانشاء کے شاہکار، اور تحریر میں ادب کی چاشنی لطف دیتی تھی......اسلامی ہند کے دور آخر کی تاریخ ان کا خاص موضوع تھا، ان کی بیشتر کتابیں اسی دور کی تاریخ سے وابستہ ہیں۔ آزادی کے بعد اسلامیات کو آپ نے اپنا موضوع سخن بنایا۔ جمعیۃ علماء کی صف میں جماعت کے بھرپور تعارف کے سلسلے میں اگر کوئی اپنی تحریروں کے ذریعہ زندہ جاوید ہو گیا تو یہی ہمارے استاد محترم مولانا محمد میاں ہیں۔ یہ جماعت آپ کے زرنگار قلم کے احسانات سے کبھی سبک دوش نہیں ہوسکتی۔'' (تاریخ شاہی: ۴۶۵و۴۶۶)۔

حضرت ممدوح کی تصانیف پر تبصرہ دوسرے مقالہ نگار حضرات کا حصہ ہے؛ اس لیے یہاں اسی سرسری اور اجمالی تبصرے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

ماہنامہ ''قائد'':

قیام شاہی کے زمانے میں آپ کا ایک اہم کارنامہ ماہنامہ ''قائد'' کا اجراء ہے۔ محرم ۱۳۵۷ھ مطابق ۱۹۳۸ء میں مرادآباد سے آپ نے اس ماہنامہ کا اجراء کیا تھا۔ آپ اس رسالہ کے قائد التحریر اور مولانا سید اختر اسلام قاسمیؒ صاحبزادہ شیخ الحدیث حضرت مولانا فخر الدین احمد صاحبؒ اس کے مدیر مسؤل تھے۔ یہ رسالہ ضابطے میں مدرسہ شاہی کا ترجمان نہیں تھا؛ بلکہ شاہی کمپنی سے جاری ہوتا تھا جسے مولانا محمد میاںؒ اور آپ کے مخلص احباب نے قائم کیا تھا، مگر اسے مدرسہ شاہی کے اکابر کی بھرپور سرپرستی اور تائید حاصل تھی۔ مدرسہ شاہی کے علاوہ دارالعلوم دیوبند کے اکابر میں سے مولانا حسین احمد مدنیؒ اور شیخ الادب مولانا اعزاز علی امروہیؒ کی سرپرستی بھی اسے حاصل تھی۔ آخر الذکر کو اس رسالے سے بڑی دلچسپی تھی۔

اس رسالے کی اہم خصوصیت یہ تھی کہ دولسانی اردو-عربی رسالہ تھا۔ مدرسہ شاہی

کے مہتمم ذی وقار مولانا عبدالحق مدنی جنھوں نے مدینہ پاک میں تعلیم پائی تھی، وہ اس رسالے کے عربی مضمون نگار تھے۔ یہ ایک کثیر المقاصد رسالہ تھا، اس کے اہم مقاصد میں ایک مقصد سیرت رسول وسیرت صحابہ سے مستند حوالے کے ذریعہ ایسے اسباق اخذ کرنا تھا جس سے مسلمانوں میں سیاسی واقتصادی اصلاح کا عزم پیدا ہو۔ دوسرا مقصد یہ تھا کہ تاریخ عالم اورقوموں کے عروج وزوال کے اسباب وعوامل پر بحث کرکے مسلمانوں کو بیدار کیا جائے، اوران کے اندرترقی اورآگے بڑھنے کا حوصلہ پیدا کیا جائے۔ اس طرح اس کا ایک اہم مقصد مدارس کے طلبہ میں عربی زبان کا مذاق پیدا کرنا اورعرب وہند کے درمیان صحافتی رابطہ قائم کرنا تھا۔ (قائد: شمارہ:۱جلد:۱محرم ۱۳۵۷ھ)

مگراس رسالہ کی عمر بہت زیادہ نہ رہی، تقریباً دوسال تک پابندی سے جاری رہا، پھر ہمیشہ کے لیے بند ہوگیا۔ یہ رسالہ ہندستان کے مایہ ناز مؤرخ جناب قاضی اطہر مبارکپوری کا بہت ہی محسن رسالہ ہے، ان کی شخصیت سازی میں اس رسالہ اوراس کے قائدالتحریر کا بنیادی رول ہے۔ چنانچہ قاضی صاحب لکھتے ہیں:

> واقعہ یہ ہے کہ کہ تصنیف وتالیف میں مولانا مرحوم میرے اولین محسن ومربی ہیں، اگران کی توجہ نہ ہوتی اوررسالہ ''قائد'' میں میرے مضامین شائع نہ ہوتے تو شاید میں تصنیف وتالیف کے لائق نہ ہوتا۔'' (تاریخ شاہی:۴۴۳)

اس رسالہ کا اگرکوئی اورفائدہ نہ ہوتا تواس کی افادیت کے لیے تنہا یہی بات کافی ہے کہ اس نے قاضی صاحب جیسی شخصیت کوایک لائق وفائق انسان بنانے میں بنیادی رول ادا کیا ہے۔

مدرسہ شاہی کا انتظام وانصرام:

جیسا کہ پہلے گذرا کہ ۱۹۴۷ء میں آزادی کے واقعہ کے بعد ملی مسائل کے ہجوم اور جمعیۃ علماء کی بڑھتی ہوئی ذمہ داریوں کے سبب آپ کو نا چاہتے ہوئے بھی مدرسہ شاہی سے اپنا تدریسی رشتہ ختم کرنا پڑا تھا۔ اِدھرآپ نے مدرسہ سے اپنا تدریسی تعلق توڑا، اُدھرمدرسہ کے

ارباب حل وعقد نے اپنے جاں نثار اور مخلص کارکن کے لیے مدرسہ سے وابستگی کا دوسرا راستہ ڈھونڈ نکالا اور آپ کو مدرسہ کی موقر مجلس شوری کا رکن رکین بنالیا۔ پھر مدرسہ کے مہتمم مولانا محمد تقی دیوبندی کے وصال کے بعد اجلاس مجلس شوری منعقدہ ۱۲؍ربیع الثانی ۱۳۸۱ھ آپ کو مدرسہ کا مہتمم اور پھر رجب ۱۳۸۲ھ میں آپ کو صدر مہتمم بنادیا گیا، اور آپ تاحیات اسی عہدے پر قائم رہے۔ آپ ایک انتہائی مدبر، معاملہ فہم، صائب الرای اور سوجھ بوجھ کے انسان تھے۔ مجلس شوری کی کاروائیوں کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ زمانۂ تدریس میں بھی آپ کی ان صلاحیتوں سے فائدہ اٹھایا جاتا رہا؛ چناں چہ مختلف مسائل اور نزاعات کے تصفیہ کے لیے شوری کی طرف سے بعض دفعہ جو کمیٹیاں تشکیل دی گئیں، آپ کو بھی بطور خاص اس میں شامل کیا گیا۔ آپ کے صدارت اہتمام کے زمانے میں اہم فیصلے آپ کی رائے مشورے سے ہوتے تھے؛ البتہ آپ کا قیام چوں کہ مستقل دہلی میں رہتا تھا؛ اس لیے ایک ماتحت مہتمم بھی ہوتا تھا، جو مدرسہ کی رسیدات اور واؤچر وغیرہ پر دستخط کرتا اور مدرسہ کے عملی انتظام وانصرام کے کاموں کو انجام دیتا تھا۔

آپ کی صدارت اہتمام کے زمانہ میں دو اہم کام سرانجام پائے: ایک تو یہ کہ مدرسہ شاہی کی توسیع ہوئی۔ پہلے مدرسہ شاہی، شاہی مسجد اور اس کے صحن کے تین طرف بنے ہوئے چند کمروں پر مشتمل تھا۔ مدرسہ کی یہ کل کائنات مدرسے کی ضرورت کے لیے ناکافی تھی؛ اس لیے مدرسہ کی توسیع کے لیے محلّہ لال باغ میں ایک وسیع رقبہ پر دارالطلبہ کی تعمیر کا آغاز ہوا۔ ۱۸؍رجب ۱۳۸۴ھ میں ایک روحانی تقریب میں اس عمارت کا سنگ بنیاد رکھا گیا، اب اسی رقبہ پر مدرسہ شاہی کی سب سے بڑی اور اہم عمارت واقع ہے، اور یہیں سے اس کی بیشتر تعلیمی سرگرمیاں انجام پاتی ہیں۔ دارالطلبہ کی قدیم عمارت بوسیدہ ہونے کے ساتھ پلاننگ کے بغیر بنی ہوئی تھی؛ اس لیے پچھلے سالوں میں پلان کے تحت دارالطلبہ کی از سرنو تعمیر کی گئی۔ یہ عمارت جدید طرز پر تعمیر ہوئی ہے اور دیدہ زیب ہے۔

دوسرا اہم کام جو آپ کے صدارت اہتمام کے زمانہ میں انجام پایا وہ حفظ الرحمٰن ادارۂ

تعلیم وتربیت کا قیام ہے، جو مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاریؒ کی طرف منسوب ہے۔ یوں تو مدرسہ شاہی میں شروع سے ہی اردو اور دینیات کی تعلیم ہوتی تھی؛ مگر آزادی کے بعد ہندی جب سرکاری زبان قرار پائی تو مسلمانوں کے سامنے اردو کی بقا کے ساتھ اپنے تہذیب وکلچر کی بقا کا مسئلہ بھی ایک اہم چیلنج بن کر سامنے آیا۔ اس چیلنج کا سامنا کرنے لیے حضرت مولانا محمد میاں صاحبؒ نے ایک ماہر تعلیم کی حیثیت سے ایک تعلیمی نصاب تیار فرمایا۔ اسی زمانہ میں مجلس شوری میں مدرسہ شاہی کے زیر انتظام اردو ودینیات کی تعلیم کے دائرے کو مزید وسیع کرنے اور اسے مستحکم بنانے کے لیے ادارہ حفظ الرحمٰن کے قیام کی تجویز پیش کی گئی۔ مجلس شوری میں غور وخوض کے بعد تجویز منظور ہوگئی اور طے یہ پایا کہ پہلے مصارف کا تخمینہ لگایا جائے۔ چنانچہ حضرت والا نے ادارہ حفظ الرحمٰن کا خاکہ تیار کیا، ادارہ کے سابق ہیڈ ماسٹر جناب ماسٹر طیب حسین زیدیؒ اور ان کے بعض رفقاء اس سلسلے میں آپ کے معاون رہے، اور مصارف کا بھی تخمینہ لگایا گیا۔ مجلس شوری کے اجلاس کے انعقاد میں ابھی کافی وقت تھا اور آپ اس کام کو جلد از جلد شروع کرنا چاہتے تھے؛ اس لیے آپ نے بذریعہ خطوط ارکان شوری سے اس ادارہ کے افتتاح کی منظوری لی، اور ۱۳۸۵ھ مطابق ۱۹۶۶ء میں باقاعدہ اس ادارے کا افتتاح ہوگیا۔ یہ ادارہ حکومت سے منظور شدہ ہے، جس میں قرآن کریم باتجوید اور دینیات کے ساتھ اردو میڈیم میں پنجم پرائمری تک تعلیم ہوتی ہے۔ یہ ادارہ اس وقت سے اب تک متحرک وفعال ہے۔ (تاریخ شاہی ۱۶۰ و ۲۵۳ و رجسٹر کاروائی شوری، فائل ۱۵ اص ۲۱)

زمانۂ شاہی کے کچھ اہم تلامذہ:

مدرسہ شاہی میں آپ سے استفادہ کرنے والوں کی فہرست خاصی طویل ہے۔ ذیل کی سطور میں آپ کے کچھ اہم تلامذہ کا مختصراً تذکرہ کیا جاتا ہے۔

قاضی محمد اطہر مبارکپوریؒ: قاضی صاحب آپ کے ان تلامذہ میں ہیں جن کی شخصیت سازی میں آپ کا کردار بہت بنیادی ہے۔ قاضی صاحب کی خواہش پر آپ نے انھیں مقامات زمخشری اور دیوان حماسہ کا کچھ حصہ خارج میں پڑھایا۔ قاضی صاحب پر آپ

کی عنایتیں اور شفقتیں اخیر تک کم نہیں ہوئیں،اور نہ ہی قاضی صاحب کی طرف سے نیاز مندی اوراحسان سناشی میں کوئی کمی آئی ۔ ہندستان کے چوٹی کے محققین اور مصنفین میں قاضی صاحب کا نام سرفہرست ہے،بطور خاص عہد ماضی میں عرب و ہند تعلقات پر آپ کی تحقیقات حرف آخر کی حیثیت رکھتی ہیں۔آپ کی عربی واردو کی تصانیف کی تعداد چالیس سے متجاوز ہے، جوعلم وتحقیق کا اعلی شاہ کار ہیں،ان کے علاوہ آپ کے علمی وتحقیقی مقالات بھی ہیں جن کی تعداد کی فہرست کافی طویل ہے۔

مفتی محمود صاحب پاکستانیؒ سابق وزیر اعلی صوبہ سرحد: مفتی صاحب کا بھی شمار آپ کے عظیم تلامذہ میں سے ہوتا ہے۔مفتی صاحب نے ۱۹۳۶ء میں مدرسہ شاہی میں داخلہ لیا۔آپ کو شیخ الاسلام مولانا حسین احمد صاحب سے بے انتہا عقیدت تھی ۔یہی وجہ تھی کہ آپ مدرسہ شاہی آتے ہی جمعیۃ علماء کے سرگرم کارکن بن گئے اور یہیں سے آپ کی سیاسی زندگی کا آغاز ہوا ۔آپ کے استاد مولانا سید محمد میاں دیوبندی رحمہ اللہ نے جب اپنی معروف ومشہور کتاب ''علماء ہند کا شاندار ماضی''تحریر فرمائی تو آپ نے مسودات کی نقل وتصحیح میں ان کا ہاتھ بٹایا۔آپ نے پاکستان میں سیاست اور جمعیۃ علماء اسلام کے پلیٹ فارم سے بہت سے تاریخی کارنامے انجام دئے ۔آپ ہی کی مساعی جمیلہ سے قادیانیوں کو پاکستان میں غیر مسلم اقلیت قرار دیا گیا۔

مولانا نظام الدین اسیرادروی: آپ ہندستان کے ممتاز اہل قلم مصنف اور ادیب ہیں ۔آپ نے مشکاۃ تک اپنے علاقہ کے مختلف مدراس میں تعلیم پائی ،پھر دورۂ حدیث کے لیے ۱۹۴۲ء آپ مدرسہ شاہی تشریف لائے اور حضرت ممدوح سے ترمذی اور شمائل ترمذی پڑھی۔آپ کی مطبوعہ تصانیف کی تعداد پچیس سے متجاوز ہے اور مقالات و مضامین کی فہرست کافی طویل ہے ۔جامعہ اسلامیہ بنارس کے قدیم استاد ہیں اور معروف رسالہ ''ترجمان الاسلام'' آپ کی ادارت میں نکلتا رہا ہے ۔آپ کا ایک مضمون '' مدرسہ شاہی: کچھ یادیں کچھ باتیں'' کے عنوان سے تاریخ شاہی میں موجود ہے جس سے اس

مضمون میں استفادہ کیا گیا ہے۔

مولانا سید حامد میاں دیوبندیؒ: آپ حضرت ممدوح کے فرزند عزیز ہونے کے ساتھ شاگرد رشید بھی ہیں۔آپ اپنے والد بزرگوار کے ساتھ مرادآباد میں مقیم رہے۔چنانچہ ابتدائی اردو سے لے کر موقوف علیہ تک کی تعلیم آپ نے مدرسہ شاہی میں ہی مکمل کی اورفراغت دارالعلوم دیوبند میں ہوئی۔پھر آپ نے مدرسہ شاہی میں درس وتدریس کے ساتھ افتاء کے بھی فرائض انجام دیئے۔تقسیم کے بعد پاکستان چلے گئے اور لاہور میں اپنے شیخ مولانا حسین احمد مدنیؒ کی طرف نسبت کرکے جامعہ مدنیہ کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا،اس ادارے نے بہت جلد ترقی کی اوراس کا شمار اہم اداروں میں ہونے لگا۔

قاری صدیق احمد باندویؒ: آپ ہندستان کے دوراخیر کے ان صاحب عزیمت علماء میں سے ہیں جوعبادت وریاضت،خلوص وللّٰہیت،ورع وتقوی،تواضع وانکساری،دین کے لیے قربانی وجفاکشی،خلق خدا کے ساتھ ہمدردی وخیرخواہی میں سلف صالحین کے واقعی سچے نمونہ تھے۔خواص وعوام میں اللہ نے جومحبت ومقبولیت آپ کوعطا فرمائی وہ کم ہی لوگوں کے حصے میں آئی۔۱۳۶۲ھ میں مدرسہ شاہی میں داخل ہوئے اورمشکاۃ وہدایہ اخیرین وغیرہ کتابیں پڑھیں۔آپ حضرت ممدوح کے شاگرد ہونے کے ساتھ آپ کے صاحبزادے سید حامد میاںؒ کے درسی ساتھی بھی تھے۔

مولانا عبدالحی چشتیؒ: آپ بھی حضرت ممدوح کے اہم شاگردوں میں ہیں۔ضلع اعظم گڑھ کے موضع انجان شہید کے رہنے والے تھے۔۱۹۴۵ء میں مدرسہ شاہی میں داخل ہوئے،متوسطات تک کی تعلیم حاصل کرکے دیوبند چلے گئے،وہاں حضرت مدنیؒ کے دست حق پرست پر بیعت ہوکر سخت مجاہدات کئے اوردوسال کے قلیل عرصے میں سلوک و احسان کے اس مقام پر پہنچ گئے کہ حضرت مدنیؒ نے دورۂ حدیث میں اعلان کرکے آپ کو خلافت سے نوازا۔آپ کا شمار حضرت مدنیؒ کے اجل خلفاء میں ہوتا ہے۔کئی مدارس میں درس وتدریس کی خدمت انجام دی،اخیر میں مدرسہ فرقانیہ گونڈہ،پھر جامعہ حسینیہ جونپور

میں درس وتدریس کی خدمت انجام دی، اوران دونوں مدرسوں کے مہتمم بھی رہے۔

مولانا اشفاق حسین مرادآبادیؒ: آپ حضرت مولانا فخر الدین احمد مرادآبادیؒ کے خادم خاص اور حضرت مولانا سید محمد میاں دیوبندیؒ کے جاں نثار شاگردوں میں ہیں۔ان اکابر کے ساتھ تحریک آزادی میں شریک رہے۔ چنانچہ ان دونوں بزرگوں اوران کے تلامذہ نے تحریک آزادی کے سلسلے میں جو کارہائے نمایاں انجام دئے تھے، آپ ان کے عینی شاہد تھے۔جن شخصیات کے مختصر تذکرے ابھی اوپر گذرے آپ ان کے یا تو ساتھی تھے یا ان کا زمانہ پائے ہوئے تھے۔از اول تا آخر آپ کی مکمل تعلیم مدرسہ شاہی میں ہوئی اور پھر یہیں مدرس ہوگئے۔متوسطات تک کتابیں پڑھائیں۔مدرسہ شاہی میں آپ کی خدمت کا زمانہ کافی طویل ہے۔آپ کے دو اہم مضمون تاریخ شاہی میں موجود ہیں۔یہ دونوں مضامین تحریک آزادی میں اکابر شاہی کے کارناموں سے واقف ہونے کا اہم ذریعہ ہیں۔زیر نظر تحریر میں آپ کے دونوں مضامین سے کافی استفادہ کیا گیا ہے۔

مولانا عبد الرؤف کوپا گنجی: آپ کوپا گنج مئو کے رہنے والے تھے۔۱۳۵۷ھ میں مدرسہ شاہی سے فارغ ہوئے۔آپ حضرت ممدوح کے شاگرد اور بعض کتابوں میں جناب قاضی اطہر مبارکپوری کے ساتھی تھے۔جمعیۃ علماء اور کانگریس پارٹی کے پلیٹ فارم سے سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لیا، مگر جلد ہی سیاست سے کنارہ کش ہوکر درس وتدریس میں لگ گئے۔آپ نے زندگی کا بڑا حصہ مدرسہ اشاعت العلوم پورہ معروف میں تدریسی خدمت میں گذارا اوراس کے مہتمم بھی رہے، اور تادم آخر ان دونوں ذمہ داریوں کو انجام دیا۔آپ حضرت شاہ وصی اللہ فتح پوریؒ کے دست گرفتہ اوران کے خاص متوسلین میں سے تھے۔

(مذکورہ شخصیات کے تذکرہ میں تاریخ شاہی سے بنیادی استفادہ کیا گیا ہے)

☆☆☆☆☆

محمد اجمل قاسمی　　استاد شعبۂ عربی ادب جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی رمرادآباد

بوقت صبح　بروز یک شنبہ　　۲۹رذالحجہ۱۴۳۹ھ=۱۲راگست ۲۰۱۸ء

مؤرخ اسلام، ماہر تعلیم، صاحب قلم، سید الملت، مجاہد آزادی

شیخ الحدیث حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب دیوبندیؒ اور مدرسہ امینیہ اسلامیہ دہلی

ذکاوت حسین قاسمی امروہوی
[خادم حدیث وافتاء، مدرسہ امینیہ دہلی]
Mb: 09891541754-9136946868

مدرسہ امینیہ دہلی:

دہلی کو دینی علوم کی نشر واشاعت اور قرآن وحدیث کی تعلیم وتعلم کے حوالے سے ہر دور میں امتیاز حاصل رہا ہے، بلکہ مسند الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی دینی درس گاہ کو تو مرکزیت حاصل تھی، اسی سلسلۃ الذہب میں شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ [ولادت:۱۸۵۱ھ وفات:۱۹۲۰ھ] کے تلمیذ رشید حضرت مولانا محمد امین الدین اورنگ آبادی[ولادت: ۱۲۸۷ھ مطابق ۱۸۷۰ء۔ وفات:۱۳۳۸ھ مطابق ۱۹۲۰ء] کا قائم کردہ مدرسہ امینیہ دہلی بھی شامل ہے۔مولانا امین الدین صاحبؒ نے اس مدرسہ کی ابتداء دہلی کے دل چاندنی چوک میں واقع سنہری مسجد [نزد فوارہ، متصل گرودوارہ] سے ماہ ربیع الثانی ۱۳۱۵ھ مطابق ۱۸۹۷ء میں خلوص وللّٰہیت اور توکل علی اللہ کے ساتھ کی تھی، جو جگہ کی قلت کی وجہ سے ۱۸/سال بعد ۱۳۳۶ھ مطابق ۱۹۱۸ء میں موجودہ جائے وقوع کشمیری گیٹ مسجد پانی پتیان کی طرف منتقل کیا گیا۔

اس کے اولین سرپرست تاحیات خود حضرت شیخ الہند رہے، تو اس کے سب سے

پہلے صدر مدرس محدث عصر حضرت علامہ مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ [ولادت: ۱۲۹۲ھ مطابق ۱۸۷۵ء۔ وفات: ۱۳۵۱ھ مطابق ۱۹۳۳ء] تھے، مدرسہ کے قیام کے بعد اولین مالی معاونین میں حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ، امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، حضرت شیخ الہند دیوبندیؒ، محدث جلیل حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ، حضرت مولانا حافظ محمد احمد بن حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی دیوبندی جیسے پاک باز نفوس کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔

مفتی اعظم ہند حضرت علامہ مفتی کفایت اللہؒ [ولادت: ۱۲۹۲ھ مطابق: ۱۸۷۵ء۔ وفات: ۱۳۷۲ھ مطابق ۱۹۵۲ء] کی پچاس سالہ جہد مسلسل اور سعیِ پیہم نے مدرسہ امینیہ کو عالمی اور بین الاقوامی شہرت کا حامل ادارہ بنا کر ترقی کی معراج عطا کی۔

الحاصل: مدرسہ امینیہ کو اپنے قیام کے روز سے ہی عالمی، علمی روحانی شخصیات کی سرپرستی، رکنیت ومشاورت، دعائیں، توجہات وخدمات کا شرف حاصل رہا ہے۔ ایسی ہی قدر آور اور علمی وروحانی شخصیات میں حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی [ولادت: ۱۳۱۸ھ مطابق: ۱۹۰۰ء وفات: ۱۳۸۲ھ۔ مطابق ۱۹۶۲ء] سابق ناظم عمومی جمعیۃ علماء ہند اور مؤرخ اسلام، ماہر تعلیم وصاحب قلم حضرت سید الملت مولانا سید محمد میاں دیوبندیؒ [ولادت: ۱۳۲۱ھ مطابق ۱۹۰۳ء۔ وفات: ۱۳۹۵ھ مطابق ۱۹۷۵ء] کے اسمائے گرامی بھی درج ہیں۔ ذیل کی تحریر میں حضرت مولانا سید محمد میاں دیوبندی، سابق ناظم جمعیۃ علماء ہند کی مدرسہ امینیہ سے وابستگی، رکنیت ومشاورت، تدریس بخاری شریف اور صدارتِ تدریس وغیرہ کا تذکرہ ہے۔

رکنیت مجلس منتظمہ مدرسہ امینیہ:

مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ کی وفات پر اظہار افسوس اور تجویز تعزیت والے خصوصی جلسہ میں ہی حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب دیوبندی کو ان کی جگہ پر مجلس شوریٰ کا رکن نامزد کیا گیا اور نامزدگی سے متعلق رجسٹر کارروائی میں مندرجہ ذیل کلمات تحریر کئے گئے:

''مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کی وفات کی وجہ سے ان کی خالی نشست پر مولانا سید محمد میاں صاحب ناظم جمعیۃ علماء ہند کو مجلس منتظمہ مدرسہ امینیہ کا رکن باتفاق رائے نامزد کیا گیا''۔

کارروائی جلسہ مجلس منتظمہ مدرسہ امینیہ دہلی

۲۵ رربیع الاول ۱۳۸۲ھ۔ ۲۷ راگست ۱۹۶۲ء بروز پیر

عارضی تدریس مع رکنیت مجلس:

اس تاریخی ریکارڈ سے معلوم ہوا کہ حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب کا پہلا تعلق مدرسہ امینیہ دہلی سے ۲۵ رربیع الاول ۱۳۸۲ھ مطابق ۲۷ راگست ۱۹۶۲ء دوشنبہ کو رکن مجلس شوریٰ کے طور پر قائم ہوا اور پھر رفتہ رفتہ ضرورت کے حساب سے یہ تعلق تدریس، صدارت و افتاء میں تبدیلی ہوتا گیا، جس کی صورت غیبی طور پر یہ ہوئی کہ مفتی اعظم حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب نوراللہ مرقدہٗ کے خصوصی تلمیذ و لائق شاگرد حضرت مولانا مفتی محمد عبدالغنی صاحب پٹیالوی شاہ جہاں پوری [ولادت: ۱۳۱۰ھ۔ وفات: ۱۳۸۸ھ] مدرسہ امینیہ کے شیخ الحدیث و صدر مفتی تھے، انہوں نے اپنے امراض واعذار کی بنا پر مدرسہ کی شوریٰ کے نام ایک تحریری استعفیٰ ۳ رربیع الاول ۱۳۸۲ھ کو پیش کرتے ہوئے مدرسہ سے سبکدوشی کا ارادہ ظاہر فرمایا، مدرسہ سے ان کے دیرینہ تعلق اور طویل خدمات کی وجہ سے شوریٰ نے ۳۰ رربیع الثانی ۱۳۸۲ھ کو منظوری ملتوی کردی اور ان کی صحت وعافیت کے لئے امیدوار اور دعا گو رہے۔ چونکہ مفتی عبدالغنی صاحب ۸ رذی الحجہ ۱۳۸۳ھ کو وطن تشریف لے جاچکے تھے اور واپسی کی امید تھی، جو مقدر نہیں تھی، اس لئے مجلس شوریٰ مدرسہ امینیہ نے مفتی عبدالغنی صاحب کی غیر موجودگی میں بخاری شریف وترمذی شریف کے اسباق حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب رکن مدرسہ سے پڑھانے کی درخواست کی اور ان کو اسی وقت صدر مدرسی کا عہدہ اور شیخ الحدیث کا عظیم منصب بھی سونپنے کی پیش کش کی، اور اُن کو عارضی تدریسی خدمات پر باقاعدہ حق المحنت اور تنخواہ طے کرنے پر گفت وشنید اور فہمائش کے ذریعے آمادہ وراغب کرتے رہے۔

مدرسہ کی فوری ضرورت وتقاضہ کے پیش نظر مولانا سید محمد میاں صاحب نے تدریس

کی خدمت کو تو قبول فرمالیا اور دیگر چیزوں سے متعلق ارشاد فرمایا کہ: موجود تعلیمی سال [۱۳۸۴ھ-۱۹۶۴ء] کے اختتام تک میں محض اعزازی طور پر مدرسہ کی خدمت انجام دوں گا، شعبان سے قبل اس معاملہ [صدر مدرسی و تنخواہ] کو زیر بحث نہ لایا جائے۔ بقول ارکان شوریٰ: چونکہ مولانا موصوف فوری طور پر باضابطہ عہدہ قبول کرنے کے لئے کسی طرح رضامند نہ ہوئے، اس لئے طے پایا کہ اس معاملہ کو آئندہ جلسے میں پھر پیش کر کے صدر مدرسی کے معاملہ کو قطعی طور پر طے کر دیا جائے گا۔''

مجلس اس نکتے پر غور کرنے کے بعد طے کرتی ہے کہ حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب کی باضابطہ صدر مدرسی کے ساتھ ہی بقدر ضرورت اختیارات وفرائض کی منتقلی کا مسئلہ بھی طے کر دیا جائے گا، اور چونکہ مدرسہ ہذا کی سابقہ روایات کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ مناسب نہیں معلوم ہوتا کہ صدر مفتی کا عہدہ صدر مدرس سے علیحدہ کیا جائے، لہٰذا صدر مدرسی کے آخری فیصلے کے ساتھ صدر مفتی کا مسئلہ بھی طے کر دیا جائے گا۔

کارروائی جلسہ مجلس منتظمہ مدرسہ امینیہ دہلی
۲۴؍ربیع الثانی ۱۳۸۴ھ۔۲۴؍ستمبر ۱۹۶۴ء بدھ

منصب شیخ الحدیث پر جلوہ گری:

چونکہ حضرت مولانا محمد میاں صاحب عارضی طریقے پر مفتی عبدالغنی صاحب کے اسباق بخاری وترمذی شریف تبرعاً پڑھا رہے تھے، جب کہ مفتی صاحب ۸؍ذی الحجہ ۸۳ھ کو نہایت اعذار وامراض کی حالت میں وطن تشریف لے گئے تھے، مگر طبیعت میں سدھار نہ ہونے کی وجہ سے اُن کے صاحبزادے مدرسہ تشریف لائے اور اپنے والدگرامی کے احوال سنا کر معذرت کے ساتھ مدرسہ میں موجود ان کے برتن وبستر اور کتابیں وغیرہ کل سامان بھی لے گئے، اس لئے مدرسہ امینیہ کی منتظمہ نے حسب موقع مولانا سید محمد میاں صاحب کو منتظمہ کی رکنیت کے ساتھ مدرسہ امینیہ کا عہدۂ صدر مفتی، منصب شیخ الحدیث اور ناظم تعلیمات بھی باتفاق رائے مکمل طور پر بااختیار بنا کر حوالے کر دیا اور اس کارروائی وضرورت شدیدہ کی

تکمیل کے لئے مدرسہ کے دفتر میں باقاعدہ مجلس منتظمہ کا جلسہ ۲۲؍نومبر ۱۹۶۴ء - ۱۷؍رجب ۱۳۸۴ھ بروز اتوار منعقد ہوا اور باقاعدہ ان مذکورہ بالا عہدوں پر مولانا سید محمد میاں صاحب کی تقرری کے لئے یہ تجویز لکھی گئی:

''حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب، جو سال رواں میں بخاری شریف اور ترمذی شریف اعزازی طور پر تبرعاً پڑھا رہے ہیں، مولانا موصوف کا تقرر یکم شعبان ۱۳۸۴ھ [مطابق ۵؍دسمبر ۱۹۶۴ء] سے منظور کیا گیا''۔

مولانا سید محمد میاں صاحب کی تقرری کی چند منفرد تجاویز:

حضرت مولانا سید محمد میاں نے اس تقرری سے قبل ایک تحریر بھی مجلس شوریٰ کے نام لکھی تھی، جس میں بلا مشاہرہ تبرعاً خدمات کی پیش کش اور دیگر ضروری باتیں مندرج تھیں۔ اس تحریر کے جواب میں مجلس شوریٰ نے حضرت مولانا کی قابلیت وصلاحیت اور ان کی ذمہ داریوں اور کثرت کار کے پیش نظر جو تجاویز منظور کی تھیں، وہ بھی بہت اہم اور مولانا کی شان عظیم کے عین مناسب تھیں۔ چند تجاویز درج ذیل ہیں:

(۱) مدرسہ کے صرف ابتدائی چار گھنٹے روزانہ [مولانا موصوف پوری ذمہ داری کے ساتھ] وقت دے سکیں گے۔ [یعنی مکمل تدریسی وقت دینے کے پابند نہیں ہوں گے]

(۲) دوسرے مشاغل کی وجہ سے ایام تعلیم میں ہر ماہ چار روز کی رخصت علاوہ دستوری استحقاقی رخصت کے ملے گی۔ [یعنی ہر ماہ چار یوم کی مزید رخصت اعزازی ملے گی]

(۳) نظام تعلیم کی اصلاح وترقی اور شعبۂ تعلیم پر کنٹرول کرنے کے لئے موصوف کو جس قدر اختیارات کی ضرورت پیش آئے اور مہتمم صاحب جس قدر مولانا موصوف کو سہولت بہم پہنچانا چاہیں بے تکلف عمل میں لائیں۔

(۴) مجلس مولانا کے مخلصانہ جذبات کا شکریہ ادا کرتے ہوئے خدمت بلا معاوضہ یا قلیل تر مشاہرہ کی پیش کش کو منظور کرنے کے لئے تیار نہیں، البتہ ادارے کے حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے مبلغ ۲۰۰؍ روپئے ماہانہ مولانا موصوف کے لئے مقرر کرتی ہے۔

(۵) مولانا موصوف کی رکنیت مجلس شوریٰ دفعہ:۱۲ کی رو سے برقرار رہے گی۔

رودادکارروائی جلسہ مجلس منتظمہ مدرسہ امینیہ دلی

منعقدہ: ۷؍رجب ۱۳۸۴ھ۔۲۲؍نومبر ۱۹۶۴ء

تعلیمی احوال کو بہتر کرنے کی کاوش:

مولانا سید محمد میاں صاحب کو ارکان مدرسہ امینیہ ایک لائق فائق عالم دین، عمدہ اور جید فاضل دیوبند، قابل مدرس، مقبول مؤلف، وسیع النظر وعمیق المطالعہ مؤرخ اور ایک بے مثال ماہر تعلیم جانتے اور مانتے تھے، اسی لئے مولانا موصوف کو مدرسہ کی تدریس وصدارت سے پہلے ہی رکنیت مجلس کے زمانے میں مدرسہ کے تعلیمی احوال کا جائزہ لینے اور اس کی رپورٹ پیش کرنے کے لئے آمادہ کیا گیا تھا۔ مولانا نے اس ذمہ داری کو بشاشت سے قبول کرتے ہوئے نہایت تدبر اور باریک بینی سے مجلس میں ایک تعلیمی رپورٹ پیش کی تھی، جس پر مجلس منتظمہ نے لکھا تھا کہ: مولانا سید محمد میاں صاحب نے اپنے معائنہ جات کی رپورٹ پیش فرمائی اور مجلس نے پورے غور وفکر کے ساتھ مدرسہ کے موجودہ تعلیمی نظام کے بگاڑ پر اور اس کے دور کرنے کی تدابیر پر بحث کی، وقت کی کمی وجہ سے بحث ناتمام رہی، اس لئے یہ طے کیا گیا کہ آئندہ کے جلسہ میں پھر اس مسئلہ کو پیش کیا جائے۔

رودادکارروائی جلسہ مجلس منتظمہ

۲۹؍جمادی الثانی ۱۳۸۴ھ۔۱۷؍نومبر ۱۹۶۳ء اتوار

اس تجویز سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب نے

مدرسہ امینیہ کے تعلیمی معیار کو بلند سے بلند تر کرنے کے لئے کیا کیا کوششیں فرمائی ہوں گی اور جب آپ خود ہی صدر مدرس رہے تب مدرسہ کا معیار تعلیم کیا رہا ہوگا۔ مولانا صرف مدرسہ کے تاریخی وقار اور سابقہ تعلیمی معیار کو باقی رکھنے کے لئے بے لوث خادم بن کر پیہم سعی فرماتے اور کسی صلہ یا ستائش کی بالکل پرواہ نہ فرماتے۔

مدرسین سے ہمدردی وخیر خواہی کا جذبہ اور اپنے مشاہرہ سے بے نیازی:

ایک بار صدر مدرس کی حیثیت سے مدرسین کی تنخواہوں میں اضافہ کی آواز بلند کی مگر اپنے لئے کسی بھی اضافہ یا تبرع سے صاف انکار کر دیا، جب کہ آپ کا مشاہرہ تقرر کے وقت سے ہی آپ کے طلب پر ذمہ داری کے حساب سے صرف نصف طے کیا گیا تھا۔ مولانا کی اس مخلصانہ کاوش اور مشاہرہ یا تنخواہ سے بے نیازی پر مجلس مدرسہ نے شوریٰ کے جلسہ میں غور کیا اور یوں تحریر کیا:

مولانا موصوف نے اپنی پیش کردہ اس تحریر [۲۹ر محرم ۱۳۸۵ھ] میں باصرار کہا ہے کہ اگر صدر مدرس کا مشاہرہ مبلغ دوسو روپئے ہے تو وہ مدرسہ کی طرف سے تبرع نہیں چاہتے بلکہ کام کے بموجب معاوضہ لینا چاہتے ہیں۔ مجلس کی رائے پہلے سے یہی ہے کہ مبلغ دوسو روپئے جو مولانا موصوف کے لئے طے کئے گئے ہیں، وہ ان کی پوری تنخواہ نہیں ہے، بلکہ مولانا [کی جانب سے پیش کردہ تقرر کے وقت] کی تمام شرائط کو سامنے رکھ کر یہ پیشکش تجویز کی ہے۔ [اب] دوسو روپئے میں سے کم کر دینے کے کوئی معنی نہیں ہیں۔

[روداد: ۱۶ر جون ۱۹۶۵ء]

امراض واعذار اور سفر آخرت:

حضرت مولانا سید محمد میاںؒ مدرسہ امینیہ کی تقریباً ۱۳ر سال مسلسل خدمت فرماتے رہے اور جب آخر میں امراض واعذار نے مہلت نہ دی بلکہ ان میں مسلسل اضافہ ہی ہوتا رہا اور امراض کی وجہ سے طلبہ کے اسباق کا نقصان محسوس ہوا تو پھر آپ نے واضح اور صاف الفاظ میں افسوس کا اظہار بھی فرمایا اور شوریٰ کے نام ایک تحریر لکھی، جس کے جواب میں شوریٰ

نے اپنے جلسہ میں باہمی گفت وشنید اور مشورے سے یہ طے کیا کہ: مولانا موصوف نے اپنی تحریر میں امسال اپنی طویل علالت کی وجہ سے اسباق متعلقہ کی عدم تکمیل پر اظہارِ افسوس فرمایا ہے اور آئندہ سال کے لئے اسباق میں تخفیف چاہی ہے۔ مجلس دعا کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ مولانا موصوف کو صحت وتوانائی عطا فرمائے، اور امید کرتی ہے کہ ۱۱؍شوال ۱۳۹۵ھ [مطابق ۱۷؍اکتوبر ۱۹۷۵ء] تک مولانا موصوف اپنے پورے اسباق [بخاری شریف مکمل، ترمذی شریف مکمل] پڑھانے کے قابل ہو جائیں گے، ان شاء اللہ!

ادھر نوشتۂ تقدیر کی تکمیل کا وقت آپہنچا تھا اور آپ اسی ضعف وبیماری کی حالت میں موت سے قریب تر ہوتے جا رہے تھے، بالآخر ۱۱؍شوال تک صحت پانے کے بجائے ۱۶؍شوال ۱۳۹۵ھ مطابق ۲۲؍اکتوبر ۱۹۷۵ء کو اس دنیا سے عالم آخرت کے سفر پر روانہ ہو گئے۔ **انا للّٰہ وانا الیہ راجعون**

مدرسہ امینیہ دہلی سے آپ کا جو تعلق ۱۳۸۲ھ مطابق ۱۹۶۲ء سے ایک رکن ومشیر کی حیثیت سے شروع ہوا تھا، وہ ۱۳۹۵ھ مطابق ۱۹۷۵ء تک بلا انقطاع قائم رہا اور مفتی صدر مدرس، شیخ الحدیث اور ناظم تعلیمات کی شکل میں آپ نے مدرسہ کی ہر قسم کی خدمت کی اور مدرسہ کی ترقی وبہتری کے لئے کوئی کسر نہیں چھوڑی۔

تعزیتی تجویز از مدرسہ امینیہ

حضرت مولانا سید محمد میاں شیخ الحدیث وصدر مفتی مدرسہ امینیہ دہلی کی ۱۶؍شوال ۱۳۹۵ھ۔ ۲۲؍اکتوبر ۱۹۷۵ء کو وفات ہوئی۔ مدرسہ امینیہ کی مجلس شوریٰ کی طرف سے مولانا مرحوم کے لئے مندرجہ ذیل تجویز تعزیت منظور ہوئی:

''مجلس منتظمہ مدرسہ امینیہ کا یہ جلسہ شیخ الحدیث مدرسہ حضرت مولانا سید محمد میاں نور اللہ مرقدہ کی وفات کو علمی طبقے کا بہت بڑا سانحہ اور نقصان عظیم تصور کرتا ہے، مولانا مرحوم مجاہد علماء کی صف میں ایک ممتاز درجہ رکھتے تھے۔ آپ محرم ۱۳۸۴ھ سے مدرسہ امینیہ کے صدر مدرس وصدر مفتی اور ناظم تعلیمات تھے۔ افسوس کہ کارپردازان مدرسہ آپ کی برکات

وخدمات سے محروم ہوگئے۔ انا للّٰہ و انا الیہ راجعون. ہم ارکان مجلس حضرت مولانا کے پس ماندگان کے غم میں شریک ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ مولانا مرحوم کی روح پر اپنی خاص رحمتیں اور برکتیں نازل فرمائے اور ان کی مغفرت فرمائے۔آمین''

مولانا سید محمد میاں چونکہ مجلس کے رکن بھی تھے، ان کی نشست پر ایک رکن کو نامزد کرنے کا معاملہ آئندہ جلسے کے لئے ملتوی کیا گیا، مولانا موصوف کی جگہ صدر مدرس کا تقرر بھی آئندہ جلسے کے لئے ملتوی کیا گیا، فی الحال بخاری شریف وترمذی شریف کے اسباق ملتوی رکھ کر باقی اسباق شروع کرادیئے جائیں۔[کارروائی مجلس منعقدہ: ۲۳رشوال ۱۳۹۵ھ۔ ۲۹راکتوبر ۱۹۷۵ء]

ایک رکن مجلس کی نشست جو مولانا سید محمد میاں صاحب مرحوم کی وفات کی وجہ سے خالی ہوگئی تھی، اس پر باتفاق آراء مولانا سید محمد فاروق نگراں بچوں کا گھر دریا گنج دہلی کو نامزد کیا گیا۔مولانا سید محمد میاں صاحب مرحوم کی جگہ صدر مدرس کی تقرری کے لئے متعدد حضرات کے اسمائے گرامی پیش نظر رہے، کافی تلاش وجستجو، بحث وتمحیص اور غور وفکر کے بعد، آخر اس عہدہ پر مولانا عبدالسمیع صاحب سرونجی، سابق صدر انجمن سیف الاسلام دہلی وحال استاذ مدرسہ عالیہ مسجد فتح پوری دہلی کا تقرر بہ تنخواہ مبلغ چار سو روپئے ماہانہ باتفاق رائے منظور کیا گیا۔[۱۱رشوال ۱۳۹۶ھ۔۶راکتوبر ۱۹۷۶ء]

مدرسہ حسین بخش کی تعزیتی تجویز:

حضرت مولانا سید محمد میاں دیوبندیؒ بہت سے اداروں اور مدرسوں کے سرپرست اور رکن تھے، مدرسۃ العلوم مدرسہ حسین بخش، مٹیا محل جامع مسجد دہلی [قائم شدہ: ۱۲۶۸ھ مطابق ۱۸۵۲ء] کے بھی ۱۹-۱۸ سال اہم رکن رہے۔ابتدا اور انتہا کی تمام تاریخیں یہ ہیں:

پہلی شرکت: مجلس شوریٰ مدرسہ حسین بخش
۳رذی الحجہ ۱۳۷۶ھ۔۳رجولائی ۱۹۵۷ء
آخری شرکت: مجلس شوریٰ مدرسہ حسین بخش

۴؍رجب ۱۳۹۵ھ ۔۱۳؍اگست ۱۹۷۵ء بدھ
مدرسہ حسین بخش کی طرف سے بھی تعزیتی تجویز منظور کی گئی۔

الفاظ تجویز: حضرت مولانا سید محمد میاں صاحبؒ کی وفات کے سلسلہ میں طے پایا کہ منتظمہ کمیٹی حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی وفات حسرت آیات کو ملک وقوم کے لئے ایک ناقابل تلافی نقصان سمجھتی ہے۔ حضرت مولانا کی علمی ودینی جدوجہد اسلاف کا نمونہ تھی۔ منتظمہ کمیٹی دست بدعا ہے کہ حضرت حق جل مجدہ ان کی روح کو اپنے جوار رحمت میں بلند مقام عطا فرمائے اور ہم سب کو صبر کی توفیق عطا فرمائے۔ دستخط ارکانِ مجلس

مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی
مولانا قاضی سجاد حسین
مولانا مفتی فضل الرحمٰن فاروقی
حکیم شریف الدین بھائی
حاجی محمد شفیع صاحب

[۱۱؍صفر ۱۳۹۶ھ ۔۱۲؍فروری ۱۹۷۶ء جمعرات]

تجویز تعزیت از مدرسہ عبدالرب دہلی:

حضرت مولانا محمد میاں صاحب مدرسہ مولوی عبدالرب، کشمیری گیٹ، دہلی [قائم شدہ: ۱۲۹۲ھ مطابق ۱۸۷۵ء] کے بھی ۱۹۴۹ء سے ۱۹۷۵ء تک مؤقر اور اہم رکن مجلس شوریٰ رہے ہیں۔ مولانا کی وفات حسرت آیات پر مندرجہ ذیل الفاظ میں تعزیتی تجویز لکھی گئی:

''مجلس شوریٰ مدرسہ مولوی عبدالرب صاحب مرحوم کا یہ جلسہ مجلس کے قدیم اور معزز رکن حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب مرحوم کی وفات پر دلی رنج وغم کا اظہار کرتا ہے۔ حضرت مولانا اپنی گونا گوں خصوصیتوں کے لحاظ سے اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ مرحوم نے سالہا سال تک مدرسہ مولوی عبدالرب صاحب کی شاندار اور بے لوث خدمات انجام دیں اور مدرسہ نے ہمیشہ ان کے قیمتی مشوروں سے

رہنمائی حاصل کی۔ مرحوم کا شمار ملک کے چوٹی کے علماء میں ہوتا تھا، وہ نہ صرف ایک مقدس اور بلند پایہ عالم دین تھے بلکہ بہت بڑے مؤرخ اور مصنف بھی تھے۔ ملک کے خدمت گذاروں میں بھی ان کا مقام نمایاں ہے، وہ حقیقی معنی میں مجاہد آزادی تھے۔ ملک کی جدوجہد آزادی میں ان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ انہوں نے حق وصداقت کی راہ میں بارہا قید وبند کی صعوبتیں برداشت کیں، ان کی زندگی اہل علم کے لئے مشعل راہ تھی۔

مرحوم کی رحلت سے ملک وملت کو عموماً اور مدرسہ مولوی عبدالرب صاحب کو خصوصاً ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے، یہ جلسہ دست بہ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنی رحمت خاص سے نوازیں۔'' [منقول: از محافظ ربانی، یعنی تاریخ مدرسہ عبدالرب دہلی]

مدرسہ امینیہ اور تلامذہ:

حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب نے مدرسہ امینیہ دہلی میں مکمل بارہ سال بخاری شریف وترمذی شریف کا باقاعدہ درس دیا ہے۔ اس بارہ سال کی مدت میں شعبان ۱۳۸۴ھ سے شوال ۱۳۹۵ھ تک کل ایک سو پچاس [۱۵۰] طلبہ نے آپ سے بخاری وترمذی پڑھ کر سند فراغت حاصل کی اور حسب صلاحیت بتوفیق الٰہی ملک کے مختلف حصوں میں دین وقوم کی خدمت انجام دی اور دے رہے ہیں۔ **فالحمد للّٰہ علی ذلک!**

مولانا موصوف سے شرف تلمذ حاصل کرنے والے اور بخاری وترمذی پڑھ کر سند فضیلت حاصل کرنے والے حضرات اہل علم کے اسمائے گرامی مع ولدیت وسن فراغت مندرجہ ذیل ہیں:

نمبر شمار	اسمائے گرامی	مقام	سن فراغت
۱	مولوی روشن علی بن کرم علی	پانچ ستھا،۲۴ ر پرگنہ، بنگال	شعبان۱۳۸۴ھ
۲	مولوی رفیع احمد بن لعل الدین	کاندی وارہ، اسلام آباد کشمیر	شعبان۱۳۸۴ھ

۳	مولوی منظور احمد بن عبد الشکور	کھیڑا مبارک پور اعظم گڈھ	شعبان۱۳۸۴ھ
۴	مولوی اختر حسین بن تفضّل حسین	چٹپرا بکھاری، پورنیہ بہار	شعبان۱۳۸۴ھ
۵	مولوی عبد المجید بن نظیم خاں	سنگیل، گڑگانوہ، ہریانہ	شعبان۱۳۸۴ھ
۶	مولوی فخر الدین بن کمال الدین	لکھنا کا، گڑگانوہ، ہریانہ	شعبان۱۳۸۴ھ
۷	مولوی زبیر احمد بن مہتاب	اڈبر، گڑگانوہ، ہریانہ	شعبان۱۳۸۴ھ
۸	مولوی محمد اسحاق بن یامین	باؤپور، گڑگانوہ، ہریانہ	شعبان۱۳۸۴ھ
۹	مولوی عبد القدوس بن عبد الجبار	آنندنگر، ضلع مرشدآباد، بنگال	شعبان۱۳۸۴ھ
۱۰	مولوی محمد اسرائیل بن نہال خاں	منڈانہ، الور، ہریانہ	شعبان۱۳۸۴ھ
۱۱	مولوی دین محمد بن رحمت خاں	نوگانواں، گڑگانوہ، ہریانہ	شعبان۱۳۸۴ھ
۱۲	مولوی محمد یوسف بن مولوی عبد الستار	سنگار، گڑگانوہ، ہریانہ	شعبان۱۳۸۵ھ
۱۳	مولوی نیاز الدین بن چاؤ خاں	شولاکا، گڑگانوہ، ہریانہ	شعبان۱۳۸۵ھ
۱۴	مولوی سراج الدین بن کڑے خاں	ری ٹھٹھ، پنگواں گڑگانوہ، ہریانہ	شعبان۱۳۸۵ھ
۱۵	مولوی اشتیاق احمد بن عبد اللطیف	پکڑیا، محمدیہ، ضلع پورنیہ بہار	شعبان۱۳۸۵ھ
۱۶	مولوی عبد السبحان بن اعتباری	سنگار، گڑگانوہ، ہریانہ	شعبان۱۳۸۵ھ
۱۷	مولوی سراج الحق بن ایوب علی	دری بش:۲، ضلع کوچ بہار	شعبان۱۳۸۵ھ
۱۸	مولوی محمد قاسم بن قاری اسماعیل	ٹوڈا بھیم، ضلع سوائی مادھوپور	شعبان۱۳۸۵ھ
۱۹	مولوی بشیر احمد بن مولوی عبد اللہ	مال پوری، روپڑاکا، گڑگانوہ، ہریانہ	شعبان۱۳۸۵ھ
۲۰	مولوی عبد الرحمٰن بن عبد الغفار	بنیتھو، لوہرسن، ضلع بستی	شعبان۱۳۸۵ھ
۲۱	مولوی عبد القادر بن کرامت اللہ	جورہی، سنگھا، ضلع دیوریا	شعبان۱۳۸۵ھ
۲۲	مولوی عبد الرحیم بن نور محمد	اَوں رَ ہوا، دھوائی، ضلع گونڈہ	شعبان۱۳۸۵ھ
۲۳	مولوی محمد صدیق بن حافظ عبد الرحمٰن	ماہونی، گڑگانوہ، ہریانہ	شعبان۱۳۸۵ھ
۲۴	مولوی حافظ عمر جی بن ولی پٹیل	ٹنکاریہ، ضلع بھروچ، گجرات	شعبان۱۳۸۶ھ

۲۵	مولوی سید راشد حسین بن مولانا سید طاہر حسین	امروہہ، مرادآباد	شعبان۱۳۸۶ھ
۲۶	مولوی عطاء اللہ بن رسول محمد خاں	بشن پورہ، ضلع گورکھپور	شعبان۱۳۸۶ھ
۲۷	مولوی سید مذکور الحسن بن سید حسن	عمری، ضلع مرادآباد	شعبان۱۳۸۶ھ
۲۸	مولوی سید ضیاء الحسن بن سید ابوالحسن	رام پور، موہن پور، ضلع پورنیہ	شعبان۱۳۸۶ھ
۲۹	مولوی محمد اصطفاء بن عبدالحمید	عمری، ضلع مرادآباد	شعبان۱۳۸۶ھ
۳۰	مولوی حافظ محمد شفیق بن شیخ نعیم	بھوپال	شعبان۱۳۸۶ھ
۳۱	مولوی نذیر احمد بن شیر علی خاں	کھیڑا افغانان، سہارنپور	شعبان۱۳۸۶ھ
۳۲	مولوی نور محمد بن قمرالدین	تیڑ، گڑگانوہ، ہریانہ	شعبان۱۳۸۶ھ
۳۳	مولوی شیر محمد بن اسماعیل	تر واڑہ، گوڑ گانوہ، ہریانہ	شعبان۱۳۸۶ھ
۳۴	مولوی فخرالدین بن مالے خاں	سنگار، گڑگانوہ، ہریانہ	شعبان۱۳۸۶ھ
۳۵	مولوی عبدالرب بن شمس اللہ خاں	نبی نگر، ضلع گونڈہ	شعبان۱۳۸۶ھ
۳۶	مولوی شمیم الرحمٰن بن محمد امین	اوتراہوا، ضلع گونڈہ	شعبان۱۳۸۶ھ
۳۷	مولوی محمد یوسف بن روپا	سیل کھو، گڑگانوہ، ہریانہ	شعبان۱۳۸۶ھ
۳۸	مولوی محمد ہاشم بن رمضان علی	دولت پور، ضلع بہرائچ	شعبان۱۳۸۷ھ
۳۹	مولوی عبدالعزیز بن محمد حدیث	مَہوآوا، مظفرپور، بہار	شعبان۱۳۸۷ھ
۴۰	مولوی عبدالقدیر بن نجی خاں	امام نگر، کھینچاتان، گڑگانوہ، ہریانہ	شعبان۱۳۸۷ھ
۴۱	مولوی حبیب احمد بن نظر خاں	ملائی، گڑگانوہ، ہریانہ	شعبان۱۳۸۷ھ
۴۲	مولوی شمس المعارف بن غیاث الدین	باسول، پورنیہ، بہار	شعبان۱۳۸۷ھ
۴۳	مولوی محمد صادق بن مولانا سید حامد حسن	امروہہ، مرادآباد	شعبان۱۳۸۸ھ
۴۴	مولوی محمد بلال بن حاجی شہاب الدین	دہلی	شعبان۱۳۸۸ھ
۴۵	مولوی جمیل احمد بن مولوی عبدالرشید	دہلی	شعبان۱۳۸۸ھ
۴۶	مولوی محمد اشرف بن سلطان محمد	خارگام، پونچھ، کشمیر	شعبان۱۳۸۸ھ

۴۷	مولوی نصیر الدین بن محمد اسحاق	اسناہان، منسہولہ، بھاگلپور	شعبان ۱۳۸۸ھ
۴۸	مولوی سعید اللہ بن عبد الحق خاں	عالم پور، ۲۴ ر پرگنہ، بنگال	شعبان ۱۳۸۹ھ
۴۹	مولوی منہاج الحق بن بھیکھاری	شیرنی، کرماوا، ضلع چمپارن، بہار	شعبان ۱۳۸۹ھ
۵۰	مولوی مقصود عالم بن عبد العزیز	بسیون پور، ضلع بارہ، صوبہ بیرگنج، نیپال	شعبان ۱۳۸۹ھ
۵۱	مولوی محمد خواجہ شریف بن محمد شہاب الدین	حیدرآباد	شعبان ۱۳۸۹ھ
۵۲	مولوی محمد اقبال بن عظیم بخش	منڈریلہ، ضلع جھنجھنوں راجستھان	شعبان ۱۳۸۹ھ
۵۳	مولوی عبد القیوم بن عبد الغنی	منڈریلہ، ضلع جھنجھنوں راجستھان	شعبان ۱۳۸۹ھ
۵۴	مولوی عبد السلام بن محمد سلیمان	منڈریلہ، ضلع جھنجھنوں راجستھان	شعبان ۱۳۸۹ھ
۵۵	مولوی عبد الجبار بن محمد سلیمان	منڈریلہ، ضلع جھنجھنوں راجستھان	شعبان ۱۳۸۹ھ
۵۶	مولوی عابد حسین بن عبد الحمید	شیرنی، کرماوہ، چمپارن، بہار	شعبان ۱۳۸۹ھ
۵۷	مولوی عبد الصمد بن محمد قربان	ناواٹانڈ، گل گلو، ضلع ہزاری باغ	شعبان ۱۳۹۰ھ
۵۸	مولوی ذاکر حسین بن عبد الحمید میاں	گسن مہوا، چندن بارہ، چمپارن	شعبان ۱۳۹۰ھ
۵۹	مولوی تسنیم احمد بن مولانا قاضی سجاد حسین صاحب	احاطہ کالے خاں گلی قاسم جان، دہلی	شعبان ۱۳۹۰ھ
۶۰	مولوی تنویر احمد بن مشیر احمد	رٹول، باغپت، میرٹھ	شعبان ۱۳۹۰ھ
۶۱	مولوی غلام قادر بن خواجہ حبیب جو	گوندیان، پونچھ، کشمیر	شعبان ۱۳۹۰ھ
۶۲	مولوی اسلام الدین بن ہمت خاں	سنگار، گڑگانوہ، ہریانہ	شعبان ۱۳۹۰ھ
۶۳	مولوی محمد الیاس بن حسین خاں	سنگار، گڑگانوہ، ہریانہ	شعبان ۱۳۹۰ھ
۶۴	مولوی محمد طاہر بن مولوی ابو الفضل	حوض قاضی، دہلی	شعبان ۱۳۹۰ھ
۶۵	مولوی محمد ابراہیم بن اسماعیل خاں	بھادس، نگینہ، گڑگانوہ، ہریانہ	شعبان ۱۳۹۰ھ
۶۶	مولوی عبد الحق بن عبد الاحد	دیوان بازار کٹک: ۱، اڑیسہ	شعبان ۱۳۹۰ھ
۶۷	مولوی عزیز الرحمٰن بن حاجی امانت اللہ	امپھال، منی پور	شعبان ۱۳۹۰ھ

۶۸	مولوی عبد الحفیظ بن عبد اللطیف	حسن منزل شہر الہ آباد	شعبان ۱۳۹۰ھ
۶۹	مولوی خلیل الرحمٰن بن عظیم خاں	تیٹر، پنگواں، گڑگانوہ، ہریانہ	شعبان ۱۳۹۰ھ
۷۰	مولوی محمد روزدار بن امرت خاں	روپڑاکا، گڑگانوہ، ہریانہ	شعبان ۱۳۹۰ھ
۷۱	مولوی عبد المعبود عاصم بن میانجی عبد اللہ	دھیرن کا، گڑگانوہ، ہریانہ	شعبان ۱۳۹۰ھ
۷۲	مولوی نصیر الدین بن رتن خاں	بھادس، نگینہ، گڑگانوہ، ہریانہ	شعبان ۱۳۹۰ھ
۷۳	مولوی نور عالم بن حافظ محمد خلیل الرحمٰن	ہر پور بیشی، اورائی، مظفر پور	شعبان ۱۳۹۱ھ
۷۴	مولوی برہان احمد بن مولوی علی احمد قاسمی	مرزاپور، سہارنپور	شعبان ۱۳۹۱ھ
۷۵	مولوی محمد الیاس بن محمد رمضان	ٹانڈہ، چھپرولی، باغپت، میرٹھ	شعبان ۱۳۹۱ھ
۷۶	مولوی عبد اللہ بن حافظ عبد المجید	گاجوکا، پہاڑی، بھرت پور، راجستھان	شعبان ۱۳۹۱ھ
۷۷	مولوی محمد ہارون بن حشمل	پاپڑہ، پہاڑی، بھرت پور، راجستھان	شعبان ۱۳۹۱ھ
۷۸	مولوی محمد فاروق بن عبد الرحمٰن	سرولی، پونہانہ، گڑگانوہ، ہریانہ	شعبان ۱۳۹۱ھ
۷۹	مولوی محبوب علی بن حاجی منصور علی	لیباؤ کھونگ، امپھال، منی پور	شعبان ۱۳۹۱ھ
۸۰	مولوی رحیم الدین بن امیر الدین	میانگ، امپھال، منی پور	شعبان ۱۳۹۲ھ
۸۱	مولوی عبد الرحمٰن بن کاظم علی	سنگرام پور، ۲۴؍ پرگنہ، بنگال	شعبان ۱۳۹۲ھ
۸۲	مولوی نثار احمد بن محمد حسین	دھن پوری، شہڈول، ایم پی	شعبان ۱۳۹۲ھ
۸۳	مولوی محمد اقبال بیگ بن مرزا اسد اللہ بیگ	نل گنڈہ، حیدرآباد، دکن	شعبان ۱۳۹۲ھ
۸۴	مولوی محمد سلیمان بن سائے خاں	نئی، گڑگانوہ، ہریانہ	شعبان ۱۳۹۲ھ
۸۵	مولوی محمد عثمان بن سفید خاں	اٹاوڑ، گڑگانوہ، ہریانہ	شعبان ۱۳۹۲ھ
۸۶	مولوی شبیر احمد بن حافظ محمد یاسین	گھاسیڑہ، گڑگانوہ، ہریانہ	شعبان ۱۳۹۲ھ
۸۷	مولوی محمد ادریس بن محمد الیاس	کھنداولی، بلب گڈھ، گڑگانوہ	شعبان ۱۳۹۲ھ
۸۸	مولوی محمد خاں بن امید خاں	گھاٹ میکا، بھرت پور، راجستھان	شعبان ۱۳۹۲ھ
۸۹	مولوی محمد اسماعیل بن عبد المجید	کنواڑی، گھاٹ میکا بھرت پور	شعبان ۱۳۹۲ھ

۹۰	مولوی محمد جمیل بن تول خاں	گھاٹ میکا، بھرت پور، راجستھان	شعبان۱۳۹۲ھ
۹۱	مولوی محمد حنیف بن عبد الرحمٰن	گھاٹ میکا، بھرت پور، راجستھان	شعبان۱۳۹۲ھ
۹۲	مولوی عبدالصمد بن رستم خاں	گھاٹ میکا، بھرت پور، راجستھان	شعبان۱۳۹۲ھ
۹۳	مولوی زبیر احمد بن عبدالغفور	دھاندوکا، نوح، گڑ گانوہ، ہریانہ	شعبان۱۳۹۲ھ
۹۴	مولوی قمر الدین بن نصیبا	رانھیاں کی، تاؤڑو، گڑ گانوہ، ہریانہ	شعبان۱۳۹۲ھ
۹۵	مولوی محمد ہارون بن رحیم خاں	مہرانہ، تجارہ، الور، راجستھان	شعبان۱۳۹۲ھ
۹۶	مولوی محمد عالم بن موج خاں	سنگار، گڑ گانوہ، ہریانہ	شعبان۱۳۹۲ھ
۹۷	مولوی نور محمد عرف حور خاں بن اکبر خاں	نئی، گڑ گانوہ، ہریانہ	شعبان۱۳۹۲ھ
۹۸	مولوی حکیم الدین بن محمد خاں	اماواں کلاں، بسولی، جونپور، یوپی	شعبان۱۳۹۲ھ
۹۹	مولوی محمد یوسف بن محمد سلیمان	گنگوانی لہینگا کلاں، گڑگانوہ، ہریانہ	شعبان۱۳۹۲ھ
۱۰۰	مولوی محمد اسحاق بن ڈاکٹر محمد اسماعیل	خورجہ، بلند شہر، یوپی	شعبان۱۳۹۲ھ
۱۰۱	مولوی عبدالرحمٰن بن نواز خاں	سلاہیڑی، نوح، گڑ گانوہ، ہریانہ	شعبان۱۳۹۲ھ
۱۰۲	مولوی شرف الدین بن فیض الدین	ریبرتی، ورنگل، آندھرا پردیش	شعبان۱۳۹۲ھ
۱۰۳	مولوی مقبول احمد بن محمد کرامت	پڑریا، کوچلہ پرسا، دُمکا، بہار	شعبان۱۳۹۲ھ
۱۰۴	مولوی محمود الحسن بن میانجی پیر خاں	چلنی، روپڑاکا، گڑ گانوہ، ہریانہ	شعبان۱۳۹۳ھ
۱۰۵	مولوی قمر الدین بن حاجی چھٹمل	اٹاوڑ، گڑ گانوہ، ہریانہ	شعبان۱۳۹۳ھ
۱۰۶	مولوی جمیل احمد بن امیر الدین	مانکی، دیوبند، سہارنپور، یوپی	شعبان۱۳۹۳ھ
۱۰۷	مولوی جمیل احمد بن حاجی اشرف	پپاکا، تاؤڑو، گڑ گانوہ، ہریانہ	شعبان۱۳۹۳ھ
۱۰۸	مولوی انوار احمد بن سروپ خاں	گھاسیڑہ، گڑ گانوہ، ہریانہ	شعبان۱۳۹۳ھ
۱۰۹	مولوی سعید احمد بن عبدالرحمٰن	ہجرہ، بڈیڈ، گڑ گانوہ، ہریانہ	شعبان۱۳۹۳ھ
۱۱۰	مولوی محمد یوسف بن مراد	روپڑاکا، گڑ گانوہ، ہریانہ	شعبان۱۳۹۳ھ
۱۱۱	مولوی نور محمد بن ہیرے خاں	ریٹھٹ، پنگواں، گڑ گانوہ، ہریانہ	شعبان۱۳۹۳ھ

۱۱۲	مولوی جمال الدین بن حاجی کنول خاں	مالب، گڑگانوہ، ہریانہ	شعبان ۱۳۹۳ھ
۱۱۳	مولوی محمد یامین بن اشرف علی	مالب، گڑگانوہ، ہریانہ	شعبان ۱۳۹۳ھ
۱۱۴	مولوی بدرالدجی نوری بن عبدالغفور	جمال گڈھ، گڑگانوہ، ہریانہ	شعبان ۱۳۹۳ھ
۱۱۵	مولوی محمد ادریس خاں عارف بن زبیر خاں	جمال گڈھ، گڑگانوہ، ہریانہ	شعبان ۱۳۹۳ھ
۱۱۶	مولوی مطیع الحق بن ممتاز احمد	کوہریاواں، سمریاواں بازار، بستی	شعبان ۱۳۹۳ھ
۱۱۷	مولوی محمد صدیق بن حاجی منشی صاحب	اینچ واڑی، بڈیڈ، گڑگانوہ، ہریانہ	شعبان ۱۳۹۳ھ
۱۱۸	مولوی محمد مسلم بن شیخ پانچو	بیل ڈھیہ، کوچاپرسا، سنتھال پرگنہ	شعبان ۱۳۹۴ھ
۱۱۹	مولوی علیم الدین بن سراج الدین	سنتھیل، سک مائی جین، امپھال، منی پور	شعبان ۱۳۹۴ھ
۱۲۰	مولوی رحمت اللہ بن محمد سعید فاروقی	چاندچور، رحیم ٹولہ، بیلامیگھ، دربھنگہ	شعبان ۱۳۹۴ھ
۱۲۱	مولوی روح القدس بن مولوی عین الدین	گوبندپور، بھے بیا، ۲۴/ پرگنہ، بنگال	شعبان ۱۳۹۴ھ
۱۲۲	مولوی محمد حنیف بن نور محمد	آلی میو، گڑگانوہ، ہریانہ	شعبان ۱۳۹۴ھ
۱۲۳	مولوی حافظ محمد شاکر بن محمد صابر	مبارک پور، اعظم گڈھ، یوپی	شعبان ۱۳۹۴ھ
۱۲۴	مولوی غلام رسول بن شہاب الدین	ریسمبا، بڑوا، سنتھال پرگنہ	شعبان ۱۳۹۴ھ
۱۲۵	مولوی محمود الحسن بن موجی	لہرواڑی، پنہانہ، گڑگانوہ، ہریانہ	شعبان ۱۳۹۴ھ
۱۲۶	مولوی نصیر الدین بن لیلا ابراہیم	کھلوکا، ہتھین، گڑگانوہ، ہریانہ	شعبان ۱۳۹۴ھ
۱۲۷	مولوی علی محمد بھورا بن فضلو	آلی میو، گڑگانوہ، ہریانہ	شعبان ۱۳۹۴ھ
۱۲۸	مولوی رشید الدین بن سید سکندر	اکربارہ، پوٹلہ پلی، رنگاریڈی گوڑہ، محبوب نگر، حیدرآباد	شعبان ۱۳۹۴ھ
۱۲۹	مولوی حافظ محمد طیب بسمل بن حافظ اسلام الدین	شہر دہلی	شعبان ۱۳۹۴ھ
۱۳۰	مولوی حافظ حسن نور بن اعظم علی	چن سرپور، مدناپور، بنگال	شعبان ۱۳۹۴ھ
۱۳۱	مولوی محمد حسن بن امام خاں	سُنیڑہ، پنہانہ، گڑگانوہ، ہریانہ	شعبان ۱۳۹۴ھ
۱۳۲	مولوی امتیاز عالم بن مستقیم خاں	کلوٹ، بردوان، بنگال	شعبان ۱۳۹۴ھ
۱۳۳	مولوی حافظ نور محمد بن ماسٹر معصوم علی	بہروڑہ، ماچھرا، کٹھور، میرٹھ، یوپی	شعبان ۱۳۹۵ھ

۱۳۴	مولوی محمد اصغر بن عبد الغفور	جالیکا، گلالتا، گڑگانوہ، ہریانہ	شعبان ۱۳۹۵ھ
۱۳۵	مولوی عبد الوکیل بن محمد اسحاق	رہپورہ، پنگواں، گڑگانوہ، ہریانہ	شعبان ۱۳۹۵ھ
۱۳۶	مولوی محمد یعقوب بن حاجی حیات	اَوتھا، شاہ چوکھا، گڑگانوہ، ہریانہ	شعبان ۱۳۹۵ھ
۱۳۷	مولوی محمد ہارون رہبر بن عبد الشکور	اٹاوڑ، گڑگانوہ، ہریانہ	شعبان ۱۳۹۵ھ
۱۳۸	مولوی عبد الرحمٰن بن عبد اللہ	گڈول، سری نگر، کشمیر	شعبان ۱۳۹۵ھ
۱۳۹	مولوی حافظ ظہیر محمد بن نذیر محمد	ناگ پور، مدھیہ پردیش	شعبان ۱۳۹۵ھ
۱۴۰	مولوی محمد ایوب بن شمع خاں	سہ شن، جرہیڑا، گڑگانوہ، ہریانہ	شعبان ۱۳۹۵ھ
۱۴۱	مولوی حافظ عبد الحفیظ بن عبد الرحمٰن	دریاباد، پرتولڈا، امراوتی برار	شعبان ۱۳۹۵ھ
۱۴۲	مولوی حفظ الرحمٰن بن محمد یاسین	مڑھیاکی، پنہانہ، گڑگانوہ، ہریانہ	شعبان ۱۳۹۵ھ
۱۴۳	مولوی دین محمد بن نصیر الدین	ہجرہ، گھاٹ میکا، گڑگانوہ، ہریانہ	شعبان ۱۳۹۵ھ
۱۴۴	مولوی حافظ سید احمد بن مولوی سید عبد اللہ بخاری	شاہی جامع مسجد، دہلی	شعبان ۱۳۹۵ھ
۱۴۵	مولوی حافظ عبد الکریم بن عبد الرحیم	دہلی	شعبان ۱۳۹۵ھ
۱۴۶	مولوی فیض الحق بن عبد القادر	ساتکرا کاندی، دنہری، کچھار، آسام	شعبان ۱۳۹۵ھ
۱۴۷	مولوی سعید احمد بن مولوی یاسین	پائری پوک سنگھا، امپھال، منی پور	شعبان ۱۳۹۵ھ
۱۴۸	مولوی بشیر احمد بن جمال	نیوانا، پنہانہ، گڑگانوہ، ہریانہ	شعبان ۱۳۹۵ھ
۱۴۹	مولوی ابو الکلام بن عبد الرحمٰن	ہاؤریبی مکھا لکائی، لاٹرابا کھونگ، امپھال، منی پور	شعبان ۱۳۹۵ھ
۱۵۰	مولوی محمد سردار بن حشمل	بڈیڈ، گڑگانوہ، ہریانہ	شعبان ۱۳۹۵ھ

☆☆☆☆☆

مؤرخِ ملت مولانا سید محمد میاں

اور

میوات

ڈاکٹر مفتی محمد مشتاق تجاروی
اسسٹنٹ پروفیسر
ڈپارٹمنٹ آف اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی
E-mail:muftimushtak@gmail.com

مؤرخ ملت مولانا سید محمد میاں (۱۹۰۳-۱۹۷۵) اپنے دور کے ایک عظیم قائد، مصنف، عالم دین، مؤرخ، اور بہترین استاد تھے۔ وہ دیوبند میں پیدا ہوئے، دارالعلوم دیوبند سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد پہلے بہار کے ایک مدرسے میں استاد رہے پھر مرادآباد کے مدرسہ شاہی سے وابستہ ہو گئے۔ حالاں کہ مولانا درس و تدریس کی خدمات انجام دے رہے تھے لیکن ان کا مزاج سیاسی اور تحریکی مزاج بھی تھا۔ اس لیے شروع سے ہی تحریک آزادی میں سرگرم ہو گئے اور جمعیۃ علماء ہند سے بھی وابستہ ہو گئے۔ ۱۹۲۹ء سے ۱۹۴۵ء کے دوران جمعیۃ علماء ہند کی زیر قیادت تحریک آزادی میں عملی حصہ لیا۔ کئی مرتبہ جیل بھی گئے۔ ۱۹۴۵ء میں جمعیۃ علماء ہند کے ناظم عمومی کے عہدے پر فائز ہوئے اور ۱۹۶۳ء تک اس عہدے پر فائز رہے۔ کم و بیش بیس سال ہندستانی سیاست کے انتہائی ہنگامہ خیز دور میں قیادت کی ذمہ داری سنبھالی، تقسیم وطن کے سانحہ میں انھوں نے ہندستان میں رہ جانے والے مسلمانوں کی تعمیر کا کام کیا اور پاکستان سے ترک وطن کر کے آنے والے ہندو بھائیوں

کی بھی امداد کی۔ اسلامیانِ ہند کی تاریخ کے اس نازک موڑ پر مولانا نے قائدانہ کردار ادا کیا۔ نہایت سرگرم سیاسی زندگی گزارنے کے بعد ۱۹۶۳ء میں جمعیۃ علمائے ہند کی نظامت چھوڑ کر مدرسہ امینیہ میں تدریسی مشاغل میں مصروف ہو گئے۔ یہاں شیخ الحدیث بھی رہے اور مفتی بھی۔ اسی ذمہ داری کے دوران ۱۹۷۵ء میں مولانا کی وفات ہوگئی۔

مولانا سید محمد میاں دیوبند کے ایک ذی علم گھرانے کے فرد تھے۔ علم دین کی خاندانی روایت کے ساتھ آپ نے دارالعلوم دیوبند جیسے اہم علمی ادارے کی علمی فضاؤں نے ان کے ذوق کی مزید آبیاری کی، حدیث مولانا انور شاہ کشمیری سے پڑھی۔ اس کے بعد کئی سال خود استاد رہے اور سیاسی مصروفیات اور آخر عمر میں دوبارہ درس و تدریس۔ اس پورے منظر نامے میں مولانا کی شخصیت کا ایک نمایاں پہلو ان کا ذوق تصنیف و تالیف ہے۔ درس و تدریس اور سرگرم سیاسی زندگی کے ساتھ انھوں نے متعدد اہم علمی کام کیے۔ ان کی کتابوں کی تعداد کم وبیش ۹۰ ہے۔ ان تصنیفات میں مولانا نے درسیات، سیرت طیبہ، تاریخ، سیاست، تذکرے اور بچوں کے لیے دینی کتابیں شامل ہیں۔ مولانا نے بعض ایسی کتابیں بھی تصنیف کی ہیں جو بذاتہٖ حوالہ ہے۔ ان کے حوالے کے بغیر ہندستان کی تاریخ لکھی ہی نہیں جاسکتی۔ جیسے علماء ہند کا شاندار ماضی، ۳ جلد، اسیران مالٹا، تحریک شیخ الہند وغیرہ اور جمعیۃ علماء کی تاریخ کے مدون کرنے والے ہی وہ ہیں۔ جیسا کہ عرض کیا گیا مولانا خود تحریکی ذہن رکھتے تھے۔ ان کی حیات حرکت و عمل سے عبارت تھی اور ان کا یہ فعال کردار ان کی تصنیفات میں بھی نظر آتا ہے۔ ان کی بیشتر تصنیفات با مقصد ہیں، وہ تصنیف برائے تصنیف نہیں ہیں۔ ان کو ڈاکٹریٹ کرنی تھی نہ ایوارڈ لینا تھا۔ انھوں نے جو کچھ لکھا امت کی بہتری کے لیے لکھا، اسلامیان ہند کی بیداری کے لیے لکھا۔ اس لیے آج بھی ان کی کتابیں زندہ و تابندہ ہیں اور نئے لکھنے والوں کے لیے مرجع کا کام کرتی ہیں۔ (۱)

مولانا نے ہندستان کی تاریخ کے بعض پہلوؤں پر تفصیل سے لکھا ہے۔ جنگ آزادی کی تاریخ پر بھی ان کی کتابیں اہم حوالے کی حیثیت رکھتی ہیں اور جمعیۃ علماء کی تاریخ پر

انھوں نے کئی کتابیں لکھی ہیں۔ان کتابوں میں ضمناً میوات اور اہل میوات کا بھی تذکرہ آگیا ہے۔اس مضمون میں کوشش یہ ہوگی کہ میوات کے تعلق سے مولانا کی جو خدمات قرطاس وقلم میں مقید ہیں ان کو یک جا کر دیا جائے۔

میوات کا علاقہ دہلی سے متصل ہے۔میواتی ہمیشہ سے اپنی ضرورتوں کے لیے دہلی آتے رہے۔تبلیغی جماعت کے آغاز کے بعد تو دہلی میواتیوں کا گویا وطن ثانی ہی بن گیا تھا، کیوں کہ تبلیغی جماعت کا مرکز بستی حضرت نظام الدین میں ہے جو دہلی میں واقع ہے۔ مسلمانانِ میوات کے مربی حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلوی رحمہ اللہ وہیں رہتے تھے۔اس کے علاوہ جمعیۃ علمائے ہند، مدرسہ سبحانیہ، مدرسہ امینیہ اور دیگر مدارس سے اہل میوات کا گہرا رابطہ رہا ہے۔مولانا محمد میاں جمعیۃ علمائے ہند کے سکریٹری تھے اور بعد میں مدرسہ امینیہ کے استاد بھی رہے، اس لیے بھی مولانا کا تعلق میوات سے بہت گہرا استوار ہو گیا۔میوات کے لوگوں سے مولانا کی ملاقاتیں تھیں۔میوات میں مولانا کے شاگردوں کی ایک بڑی تعداد رہی ہے اور میوات کے لوگوں کی فکر کرنے اور ان کے لیے سہولت پہنچانے میں مولانا ہمیشہ پیش پیش رہے۔ذیل میں ہم پہلے تحریک آزادی ہند اور میوات کے حوالے سے دو اکابر کا تذکرہ کرتے ہیں:

میوات اور میو قوم سے متعلق مولانا محمد میاں کی تحریروں میں ایک اہم حوالہ شاہزادہ فیروز شاہ کا ہے۔شاہزادہ فیروز کا پورا نام شاہزادہ فیروز صاحبِ عالم مرزا ناظم بخت تھا۔وہ شاہ عالم ثانی کے بیٹے تھے۔اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔علوم کی تکمیل کے بعد حجاز مقدس کی زیارت کے لیے گئے ہوئے تھے۔جب واپسی میں ہندستان پہنچے تو یہاں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کا آغاز ہو چکا تھا۔یہ بھی وطن میں آکر جدوجہد آزادی میں سرگرم ہو گئے انھوں نے وطن عزیز کی حفاظت اور اس کی آزادی کے تحفظ کے لیے بڑی جدوجہد کی۔خاص بات یہ ہے کہ ان کا میوات کے لوگوں سے خاص تعلق تھا اور وہ بھوپال کے علاقے مندسور میں بھی رہے جو میواتیوں کا گڑھ ہے اور اس کے بعد میوات میں آکر بھی انھوں نے آزادی کی جنگ جاری

رکھی۔مولانا محمد میاں نے ان کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک انگریز مورخ کے حوالے سے لکھا ہے:

''وسط اگست میں مالوہ کے اندر سرکشی نے خطرناک صورت اختیار کر لی تھی۔ان کی سالاری کا منصب فیروز شاہ نام کے ایک مذہب دوست اور مجاہد شہزادے نے سنبھال لیا۔ مندسور کے مسلمانوں نے دوسرے فرقوں کو ملا کر گوالیار کی حکومت فتح کر لی اور شاہزادہ کی حکمرانی کا اعلان کر دیا۔وہاں بہت سے میواتی،مکرانی اور افغانی موجود تھے وہ ساتھ ہو گئے۔ مندسور کا حاکم اور کوتوال زخمی ہوا۔ایک افسر مارا گیا۔پھر حاکم کے محل پر حملہ ہوا۔خزانہ لوٹ لیا گیا۔دفاتر جلا دیے گئے۔یہاں کے قدیمی امراء میں ایک شخص مرزا جی تھا اس کو وزیر اعظم بنا دیا گیا۔ایسا بہتر نظم ونسق قائم کیا گیا کہ جنوب سے تمام روابط منقطع کر دیے گئے۔سرکاری ڈاک کا سلسلہ بند کر دیا گیا۔انگریزوں نے قاصدوں کے ذریعہ خبریں بھیجنے کی کوشش کی تو انھیں پکڑ کر موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

'دہلی چلو' کا نعرہ اس وقت بھی بلند ہوا ہوگا، چنانچہ شاہزادہ گوالیار سے دہلی کی طرف بڑھا۔اول دھول پور پہنچا۔یہاں کے تحصیلدار سے ایک لاکھ روپیہ وصول کیا۔افغانی ملازم رکھے۔ابھی آگے نہیں بڑھا تھا کہ شکست دہلی کی خبر اس کے کانوں میں پڑی۔لہٰذا دہلی کے بجائے آگرہ کا رخ کیا۔انگریزی فوج نے کالی ندی پر آ کر مقابلہ کیا اور شکست کھائی، قلعہ بند ہو جانے پر مجبور ہوگئی۔خدا جانے کیا مصلحت تھی کہ شہزادہ یہاں سے میوات کی طرف چلا گیا۔شیخ فضل علی رسالدار، جنرل عبدالصمد اور اس علاقہ کے میواتیوں نے بڑی ہم نوائی کی۔دہلی کے بقیۃ السیف مجاہد بھی آ آ کر مل گئے۔''(۲)

شاہزادہ فیروز کی داستان تو طولانی ہے۔کئی سال وہ شمالی ہند کے مختلف خطوں جیسے لکھنو،شاہجہاں پور،مراد آباد،سندیلہ،محمدی،صفی پور اور بریلی وغیرہ میں مردانگی کے ساتھ انگریز کا مقابلہ کرتے رہے۔بیگم حضرت محل،احمد اللہ شاہ اور تانتیا ٹوپے کے ساتھ مل کر ملک کی آزادی کے لیے قربانیاں دیں،لیکن جب سارے راستے مسدود ہو گئے تو مجبوراً ہندستان سے ترک وطن کر کے روس پھر وہاں سے حجاز چلے گئے اور وہیں ۱۸۹۵ء میں ان کی وفات ہوگئی۔

پہلی جنگ آزادی کے حوالے سے ایک اہم نام قاضی عنایت علی کا ہے۔ قاضی عنایت علی تھانہ بھون کے رہنے والے تھے۔ بڑے مرد مجاہد تھے۔ جہاد شاملی وتھانہ بھون میں شریک رہے۔ ان کے اندر آزادی کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ جہاد شاملی وتھانہ بھون کے بعد حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی نے میدان جنگ تبدیل کر کے تعلیم کو آزادی کا عنوان بنایا، لیکن قاضی عنایت علی برابر جہاد میں مصرف رہے۔ تحصیل جانسٹھ اور ضلع بجنور میں انھوں نے متعدد مقامات پر انگریزوں کو شکست دی اور ایک بھاری جمعیت اپنے ساتھ فراہم کر لی۔ ایک جنگ میں ان کے نہایت قریبی ساتھی چودھری ہمنجل کی شہادت ہوئی اور وہ اپنے دوست کے آخری لمحات کی رفاقت میں ایسے مصروف ہوئے کہ میدان جنگ کی بساط ہی الٹ گئی۔ ان کے بہت سے ساتھی مارے گئے اور باقی بھاگ گئے۔

تنہا رہ جانے کے بعد قاضی عنایت علی نے بھوپال کا رخ کیا۔ وہاں جلد ہی اچھی ملازمت مل گئی لیکن ان کی شخصیت کے ذاتی جوہر چھپ نہ سکے اور رفتہ رفتہ ان کی شہسواری اور فنون حرب میں مہارت کا شہرہ ہوگیا جس سے لوگ ان کے بارے میں شکوک وشبہات میں مبتلا ہونے لگے۔ اس لیے بھوپال کو چھوڑ کر جودھ پور چلے گئے۔ لیکن وہاں بھی قرار نہ مل سکا۔ آخر میں میوات آ گئے اور میوات میں ہی ان کی وفات ہوئی۔ مولانا سید محمد میاں نے ان کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے۔ میوات میں ان کی آمد کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''وہ بھوپال چھوڑ کر جودھ پور چلے گئے۔ وہاں بھی ان کی شہسواری اور سپہ گری نے ان کو پوشیدہ نہ رہنے دیا اور بعض عمائدین ان پر شک کرنے لگے تو وہ ریاست الور میں قصبہ تجارہ کے قریب ایک موضع میں اپنے ایک شمشیر ساز دوست کے یہاں تشریف لے آئے اور دمِ واپسیں تک خاموشی سے وہیں مقیم رہے۔ غالباً ۱۹۱۰ میں تراسی یا پچاسی سال کی عمر میں اس شیر بیشہ جرات نے داعی اجل کو لبیک کہا اور اسی گاؤں میں مدفون ہوئے۔ انتقال کے بعد ان کے شمشیر ساز دوست کو پتہ چلا کہ مرحوم تھانہ بھون کے مشہور مجاہد قاضی عنایت علی خاں

تھے۔''(۳)

جنگ آزادی خاص طور پر پہلی جنگ آزادی میں میوات کے مجاہدین کی داستان آب زر سے لکھنے کے قابل ہے۔مولانا سید محمد میاں کا یہ منصب تھا کہ وہ اس پر لکھتے تو حق ادا کردیتے۔لیکن ان کے پیش نظر دراصل علماء کی خدمات کا تعارف تھا۔اس لیے ضمناً میوات کا تذکرہ آ گیا۔ویسے میوات پر مختلف حوالوں سے مولانا نے اتنا لکھا ہے کہ اگر اس کو جمع کر دیا جائے تو ایک چھوٹی سی کتاب تیار ہو سکتی ہے۔

میوات کے حوالے سے مولانا کی اصل خدمات دراصل وہ تاریخ ہے جو میو قوم اور میوات سے متعلق جمعیۃ علماء ہند کی خدمات کے تعارف میں شامل ہے۔اس میں ۱۹۴۷ میں میوات کے حالات کا کافی تفصیلی تذکرہ ہے۔ ۱۹۴۷ء کے خونیں فسادات میں میوات کا علاقہ بھی بری طرح متاثر ہوا تھا۔میو قوم کی جمعیت منتشر ہو رہی تھی۔آدھی سے زیادہ میوات قوم اپنے گھر سے بے گھر ہو چکی تھی۔لوگ کیمپوں میں گھرے پڑے تھے اور کسی کو خبر نہیں تھی کہ کل کا سپیدہ صبح رنج والم کی کون سی داستان لے کر آئے گا۔اس موقع پر جمعیۃ علماء ہند نے بڑا اہم کردار ادا کیا۔مولانا سید محمد میاں نے اس کا تذکرہ کیا ہے۔انھوں میوات میں جمعیۃ علمائے ہند کی خدمات پر ایک مفصل رپورٹ لکھی ہے جو ان کی کتاب 'مختصر خدمات جمعیۃ علماء ہند' حصہ دوم میں شامل ہے۔مولانا کی پوری رپورٹ اس لائق ہے کہ اس کو یہاں نقل کیا جائے۔لیکن وقت کی تنگی کی بنا پر اس کے کچھ اہم اقتباسات ہی دیے جائیں گے۔

مولانا سید محمد میاں نے ۱۹۴۷ء کی تباہی و بربادی کا ذکر کرنے کے بعد ایک مستقل عنوان مشرقی پنجاب کے نام سے قائم کیا ہے۔ اس میں خاص طور پر میوات کے ضلع گوڑ گانواں اور میوات کی مناسبت سے الور اور بھرت پور میں آباد میواتیوں کا ذکر کرتے ہوئے ان کے سماجی پس منظر کو اس طرح بیان کیا ہے:۔

''ضلع گوڑ گانواں کی سرحدیں الور اور بھرت پور سے ملی ہوئی ہیں۔اس علاقے میں زیادہ تر جاٹوں کی آبادی ہے۔۔۔ان تینوں اضلاع (گوڑ گانواں،الور اور بھرت پور)

میں میووں کی تعداد تقریباً دس لاکھ تھی۔ میووں اور جاٹوں کے تعلقات ہمیشہ اچھے رہے۔ یہ ایک طرح کی قبائلی زندگی کے عادی ہیں۔ ان کے یہاں پنچایتی نظام بہت اچھا ہے۔ ان کی پنچایتیں مشترک ہوتی ہیں۔ اس علاقے میں گوتوں اور خاندانوں کی مرکزی پنچایتیں جن کو وہ پال کہتے ہیں ۱۴ ہیں۔ (۴) پال یا جرگہ کے باقاعدہ اجلاس ہوتے ہیں۔ ان کے فیصلے 'قضاء مبرم' کا حکم رکھتے ہیں۔ ان چودہ پالوں میں تھوک بندیاں بھی ہیں۔ ان میں آپس میں صلح بھی ہوتی ہے اور جنگ بھی اور جنگ وصلح کے عہد و پیمان بھی ہوتے ہیں۔ یہ جرگے ہمیشہ فرقہ واریت سے ناآشنا رہے تھے۔''(۵)

امن واتحاد اور قومی یکجہتی کے اس پس منظر میں ریاست بھرت پور میں فرقہ وارانہ ماحول پیدا ہوگیا۔ مہاراجہ بھرت پور بھی ان فرقہ پرستوں کے چنگل میں پھنس گئے اور انھوں نے اپنی فوجوں کو میواتیوں کے انخلا پر مامور کر دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ طوفان الور میں بھی پہنچ گیا اور جاٹ میووں کا قومی اتحاد اور صدیوں کا پڑوس ناآشنا ہوگیا۔ مولانا محمد میاں ان سب کے چشم دید گواہ تھے۔ انھوں نے ان حالات کا تذکرہ کرتے ہوئے بحیثیت مورخ لکھا ہے:

''سب سے پہلے ریاست بھرت پور کی اندرونی سیاست نے ارباب اقتدار کو میواتیوں کے خلاف مشتعل کر دیا۔ ریاست کی فوجیں جن کا فرض حفاظت امن تھا، میواتیوں کے مقابلے میں صف آرا ہوگئیں۔ کئی ہفتے تک گوریلا قسم کی لڑائی کا سلسلہ جاری رہا۔ بالآخر جان و مال کی تباہی و بربادی کے خسارے کے ساتھ میواتیوں کو ریاست بھرت پور سے نکلنا پڑا۔ اس متعدی مرض نے میو سے گزر کر تمام مسلمانوں پر اثر کیا اور پھر ریاست الور اور ضلع گوڑگانواں کی آب وہوا بھی مسموم ہوگئی۔''(۶)

الور اور بھرت پور کے میو تو ان ریاستوں سے نکالے جا چکے تھے لیکن ضلع گوڑ گانواں برطانوی عملداری میں تھا۔ اس لیے وہاں ایسی صورت پیدا نہ ہوئی اور الور اور بھرت پور کے تباہ حال لوگوں کے لیے بھی وہاں پناہ ملی۔ لیکن گوڑگانواں کے جاٹ اور میو آپس میں ٹکرا گئے، اور دونوں قوموں میں باضابطہ جنگ کی سی کیفیت پیدا ہوگئی۔ یہ عجیب جنگ تھی۔

اس کا ایک منظر نامہ وہ ہے جو مولانا نے اسی روداد میں بیان کیا ہے۔لکھا ہے:

''فرقہ واریت کے شعلے ہر گاؤں اور ہر قریہ میں بھڑک رہے تھے۔ضلع گوڑ گانواں کا یہ علاقہ رزم گاہ بنا ہوا تھا۔خشک پہاڑیاں، متحارب جماعتوں کی کمین گاہیں تھیں۔رات کے وقت دونوں فریق کے ہزاروں جنگ جو میدان میں اتر آتے، رات بھر خانہ ساز توپوں سے گولہ باری ہوتی۔ بندوقوں اور رائفلوں کا آزادانہ استعمال ہوتا اور سپیدہ صبح نمودار ہوتے ہی دونوں فریق اپنے زخمیوں اور لاشوں کو اٹھا کر لے جاتے اور پہاڑوں میں روپوش ہو جاتے۔میدان جنگ سے ہٹتے تو دیہاتوں پر شب خون مارتے۔ جاٹوں نے تقریباً ایک ہفتہ میں میواتیوں کے ۲۸ دیہات پر چھاپہ مارا۔میواتیوں نے ایک شب میں جاٹوں کے ۲۷ دیہات پر شب خون مار کر اپنی چستی اور چابک دستی کا سکہ جما دیا۔''(۷)

میواتیوں کے لیے یہ جنگ اپنے وجود کے بقا کی جنگ تھی۔لیکن اس جنگ میں اعلیٰ ظرفی، بہادری اور غیرت کی بھی میواتی اور جاٹوں نے مثال قائم کر دی۔جس کا اعتراف پنڈت سندر لال نے بھی اپنی رپورٹ میں کیا ہے۔مولانا نے بھی لکھا ہے کہ''اس تمام لڑائی کے دوران کسی میو نے عورت یا بچہ پر ہاتھ نہیں ڈالا۔جاٹوں نے بھی بہادری کے اس قاعدہ پر عمل کیا۔''(۸)

جاٹ اور میووں کی یہ جنگ آپسی صلح اور عہد نامہ پر ختم ہوئی۔ پنڈت سندر لال کا بیان مولانا نے نقل کیا ہے کہ:

''بالآخر ایک شام کو ہر دو فریق نے محسوس کیا کہ آپس کی لڑائی ختم کر دی جائے۔ اگلی صبح کو ضلع مجسٹریٹ کو بلوایا گیا۔مجسٹریٹ ضلع اور فوج والوں کی موجودگی میں میو اور جاٹوں نے عہد و پیمان کیا کہ وہ آئندہ نہ لڑیں گے۔ ہر دو فریق نے باہر کے لوگوں پر جنھوں نے ان کو ایک دوسرے سے لڑایا تھا، لعنت بھیجی۔لڑائی کے بعد جب صلح ہوئی تو یہ صلح ایسی پائیدار تھی کہ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ کا انقلاب بھی اس پر کوئی اثر نہ ڈال سکا۔''(۹)

میوات میں ۱۹۴۷ کے ہنگاموں کا تذکرہ بکثرت کیا جاتا ہے۔ان تمام حالات پر

میواتی زبان میں نظمیں ہیں، کہاوتیں ہیں، لیکن وہ سب زبانی روایات پر مبنی ہیں، ان کا واقعات کا ایک بڑا تاریخی استناد مولانا محمد میاں کی تحریروں سے سامنے آتا ہے۔ اپنی کتاب 'علماء حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے' میں بھی مولانا نے ان واقعات کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے بلکہ وہاں اس کا بھی تذکرہ کیا ہے کہ جب یہ لڑائی دن میں ہوتی تھی تو دونوں فریق دن بھر لڑتے اور شام ہوتے ہی باہم پنچایت جما کر بیٹھ جاتے اور اس جنگ کے لیے ایک دوسرے پر الزام رکھتے کہ یہ تم نے شروع کر رکھی ہے آخر ایک ایسی ہی پنچایت میں انھوں نے فیصلہ کیا کہ اب نہیں لڑیں گے۔ میوات کے لوگ اس لڑائی کو ''کوٹ بہین'' کی لڑائی کہتے ہیں۔ مولانا نے اپنی دونوں تحریروں میں ان واقعات کی منظر کشی بڑی خوب صورتی سے کی ہے کہ ''بہادر قومیں جنگ بھی کرتی ہیں تو کس طرح کرتی ہیں۔''

ضلع گوڑ گانواں کی میو آبادی کے مسائل تو کسی طرح کم ہو گئے تھے مگر میوات کا ایک بڑا مسئلہ الور اور بھرت پور کی میو آبادی کا تھا۔ وہ دباؤ میں اپنے وطنوں سے نکل آئے تھے لیکن وہ کسی قیمت پر اپنے وطن کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ کچھ ایسے عناصر ضرور موجود تھے جو اُن کو پاکستان جانے پر اکسا رہے تھے لیکن اکثریت اس پر جمی ہوئی تھی کہ ہم اپنے وطن میں ہی رہیں گے۔ مولانا نے ان کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''اگر میواتیوں کی یہ پوری تعداد مشرقی پنجاب کے مسلمانوں کی طرح ترک وطن کا عزم کر لیتی تو ہند یونین کی تاریخ سے ان کا نام بھی مٹ جاتا اور ہمیں بھی ضرورت نہ ہوتی کہ ان کے ذکر خیر کے لیے ایک مستقل باب قائم کریں۔ لیکن عجیب بات یہ تھی کہ الور اور بھرت پور کی تمام جفا کاریوں کے باوجود اُن میواتیوں کے علاوہ جن پر لیگ کا رنگ چڑھ چکا تھا (اور وہ خوش حال، ملازمت پیشہ اور زمینداروں کا طبقہ تھا) تقریباً چار لاکھ میواتیوں کا عزم یہی تھا کہ جس سرزمین پر انھوں نے جنم لیا، جس مادر وطن کی پیداوار سے غذا حاصل کر کے وہ جوان اور بوڑھے ہوئے، جہاں ان کے کھیت اور جھونپڑیاں ہیں، وہیں رہیں گے، وہیں مریں گے اور وہیں دفن ہوں گے۔'' (۱۰)

میواتیوں کے مسئلہ کو حل کرنے کے لیے جمعیۃ علماء ہند نے بھی بڑی جدوجہد کی۔ خاص طور پر میوات کے سرگرم اور مشہور رہنما مولانا محمد ابراہیم الوری نے اس مسئلہ میں بڑا اہم کردار ادا کیا، گھاسیڑہ میں ایک کانفرنس بلائی گئی۔ اس میں گاندھی جی بھی شریک ہوئے اور مشرقی پنجاب کے وزیروں کو بھی اس میں دعوت دی گئی۔ لیکن مسئلہ حل نہیں ہوا۔ اس لیے دوبارہ کانفرنس ہوئی اور اس میں گاندھی جی کو پھر بلایا گیا۔ بقول مولانا سید محمد میاں ''میواتیوں کے قوم پرور رہنماؤں کا جن میں مولانا محمد ابراہیم صاحب صدر جمعیۃ علماء ضلع الور (ایم ایل اے، راجستھان) کا اسم گرامی خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ گاندھی جی سے اور مرکزی حکومت کے ارباب اقتدار سے تعلق قائم کرایا۔'' (۱۱)

عام طور پر میوات پر مشہور ہے کہ گاندھی جی ایک مرتبہ گھاسیڑہ تشریف لائے تھے، لیکن مولانا محمد میاں کے بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ دو مرتبہ تشریف لائے۔ البتہ یہ تحقیق طلب ہے کہ یہ کانفرنس دوبارہ بھی گھاسیڑہ میں ہی ہوئی تھی۔ مولانا نے گاندھی جی کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ گاندھی جی کا فیصلہ تھا کہ ''میو قوم ہند یونین کا گاڑھا خون ہے، وہ اپنے ملک کی فوجی طاقت کو اپنے ہاتھ سے ضائع نہیں کریں گے۔''

گاندھی کی اچانک اور حادثاتی موت نے میوات کو بہت متاثر کیا۔ میوات میں اب بھی ایک گانا گایا جاتا ہے کہ

بھروسو اُٹھ گو میون کو　　　　گولی باپو کے لگی ہے چھاتی بیچ

گاندھی جی پر میو بھروسہ کرتے تھے۔ ان کی موت کے بعد ہوسکتا ہے کہ میو حوصلہ چھوڑ دیتے لیکن بقول مولانا محمد میاں گاندھی کے بعد ان کے شاگردوں جیسے ونوبا بھاوے اور پنڈت سندر لال نے اس علاقے کے دورے کیے۔ لوگوں کو بھروسہ دلایا اور لوگوں کو دوبارہ آباد کرنے میں اہم کردار ادا کیا بلکہ ونوبا جی نے اس علاقے میں ہندو مسلم تعلقات کو خوش گوار بنانے کے لیے ہندو مسلمانوں کا ایک مشترکہ عملہ مقرر کیا اور رفتہ رفتہ نفرت وعناد کی فضا کم ہوئی اور میو اپنے گاؤں اور اپنی زمینوں پر واپس آئے، لیکن یہاں دوسرے مسائل بھی

تھے۔ان کی زمینیں پرشارتھیوں کوالاٹ ہوچکی تھیں۔اس لیے بڑے مسائل تھے۔مولانا نے اس کا تذکرہ کرتے ہوئے میوقوم کی وطن دوستی کا ذکر کس والہانہ انداز میں کیا ہے۔دیکھیے:

''اب بھی ہزاروں میو اپنی زمینوں سے محروم ہیں۔وہ مزدوری کر کے اپنی زندگی بسر کر رہے ہیں اور اگرچہ ان کے کھیت اور زمینیں دوسروں کے نام الاٹ ہیں۔مگر وہ اس پر قانع اور شکرگزار ہیں کہ ان کو مزدوری مل جاتی ہے۔اور مالک کی حیثیت سے نہ سہی مزدور کی حیثیت سے وہ اپنے کھیت کی ہوا کھا لیتے ہیں اور اس کے کنویں کا پانی پی لیتے ہیں۔۔۔بہر حال جس طرح میو برادری کا استقلال مستحق صد ستائش ہے کہ ہر طرح کی تلخیوں اور بے پناہ مصائب کے باوجود اس برادری کی اکثریت نے وطن نہیں چھوڑا۔''(۱۲)

میواتیوں کی یہ داستان خوں چکاں لرزہ خیز بھی ہے اور طولانی بھی۔آخری بات یہ ذکر کرنی ضروری ہے کہ مولانا محمد میاں نے میوات کے ان لوگوں سے متعلق اور میوات کے دیگر مسائل سے متعلق پانچ اہم کاموں کا تذکرہ کیا ہے جو جمعیۃ علماء نے اہل میوات کے لیے انجام دیے۔طوالت کے خوف سے ان کا مختصر تذکرہ کیا جاتا ہے تاکہ وہ کام بھی سامنے آجائیں اور مولانا محمد میاں اور جمعیۃ علماء ہند کی خدمات کا بھی تعارف ہوجائے۔

مولانا نے پہلا بنیادی کام تو یہ بتایا کہ مشرقی پنجاب کی حکومت اہل میوات کو اپنا حصہ تسلیم کرلے۔گھاسیڑہ کانفرنس کا ایک بنیادی مقصد یہ بھی تھا۔چنانچہ یہ پورا ہوگیا۔اس کی کسی قدر تفصیل ہم نے اس مضمون میں بیان بھی کردی ہے۔دوسرا بنیادی کام یہ تھا کہ الور اور بھرت پور سے جو لوگ نکال دیے گئے ان کو دوبارہ آباد کیا جائے اور ان ریاستوں میں جو نفرت کا ماحول ہے وہ ختم ہوجائے۔اس کے لیے جمعیۃ علماء ہند کے وفد خود مولانا کی قیادت میں اس علاقے میں گئے۔لوگوں میں اعتماد بحال کیا اور رفتہ رفتہ لوگ دوبارہ اپنے آبائی مکانوں میں آباد ہونے لگے۔مولانا نے بعض بڑی لرزہ خیز داستانیں بھی ذکر کی ہیں۔

مولانا کے بقول تیسری بنیادی خدمت یہ تھی کہ پرشارتھیوں اور مقامی مسلمانوں کے درمیان تعلقات خوشگوار قائم کیے جائیں اور باہمی اعتماد کی فضا استوار ہو۔سو یہ کام

ونوبا بھاوے اور پنڈت سندر لال کے تعاون سے انجام پذیر ہوا۔ چوتھا بنیادی کام یہ تھا کہ دین وایمان کے تحفظ کے لیے یہاں مدارس اور مکاتب قائم کیے جائیں، تو اس مقصد کے تحت تقریباً پچاس مکتب اور مدرسے قائم کیے گئے۔ بے شمار مساجد شہید ہوگئی تھیں۔ ان کا تو کوئی پرسان حال تھا ہی نہیں۔ مسجدوں پر قبضے تھے۔ گوڑ گانواں اور بھرت پور کی مساجد کو آزاد کرایا۔

پانچویں بنیادی خدمت یہ تھی کہ آباد ہونے والوں کے مکانات اور زمینیں ان کو واپس دلائی جائیں۔ یہ معاملہ مولانا کے نزدیک معقول تو تھا لیکن پیچیدہ تھا۔ تاہم اس میں بھی اس وقت تک اسّی فیصدی کامیابی مل چکی تھی۔ (۱۳)

۱۹۴۷ کے ہنگاموں میں میوقوم کے مسائل اوران کے حل کی کاوشوں کا سب سے تفصیلی تذکرہ مولانا محمد میاں نے کیا ہے۔ مولانا کی تحریروں کے ذریعہ اس دور کی کافی حد تک معتبر اور مکمل تصویر ہمارے سامنے آجاتی ہے اور جو قصے ہم اپنے بزرگوں سے زبانی سنتے آرہے ہیں ان کے لیے تاریخی استناد بھی مل جاتا ہے۔

مولانا محمد میاں نے بعض اور مقامات پر بھی اس داستان کا تذکرہ کیا ہے ان میں سے مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی پر مولانا کے مضمون میں بھی اہم حوالہ ہے، اگرچہ اس کے تذکرے سے کسی حد تک تکرار لازم آتی ہے لیکن اس میں ضمنی طور بعض بڑی اہم معلومات ہیں، اس لیے اس کا یہاں تذکرہ کرنا ضروری ہے۔

روزنامہ الجمعیۃ دہلی کے مجاہد ملت نمبر میں مولانا سید محمد میاں نے اپنے مفصل مضمون میں ایک مستقل عنوان ''میواتیوں کا مسئلہ'' قائم کر کے اس موضوع پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ اس کے بعد مجاہد ملت کی خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''بلاخوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ مجاہد ملت کی عظیم الشان شخصیت ان لاکھوں مسلمانوں کے لیے وہ کوہ استقلال ثابت ہوئی جس کی ان کو ضرورت تھی۔ مجاہد ملت نے کبھی خود ان علاقوں کا دورہ کر کے اور کبھی اپنے رفیقوں کو بھیج کر صرف اطمنان کا پیغام نہیں پہنچایا

بلکہ آپ نے سب سے بڑا کام یہ کیا کہ ان کی اہمیت گاندھی جی کے ذہن نشین کرائی اوران کو اس درجہ متاثر کیا کہ گاندھی جی میواتیوں کی حفاظت اوراجڑے ہوئے میواتیوں کوان کی جگہ آباد کرانا اپنی زندگی کا نصب العین بنالیا۔مشرقی پنجاب کی حکومت الور بھرت پور کی ریاستیں جن کے اخراج کا فیصلہ کر چکی تھیں ان کے بارے میں مہاتما گاندھی نے کھلے اجلاس میں فرمایا 'میواتی بھارت کی ریڑھ کی ہڈی اور ہمارے ملک کا گاڑھا خون ہیں، میں کبھی برداشت نہیں کرسکتا کہ وطن کا گاڑھا خون ان کے بدن سے نکال دیا جائے۔' مجاہد ملت نے ایک طرف ان میواتیوں کو کانفرنس میں جمع ہونے کا مشورہ دیا، گھاسیڑہ مقام پر کانفرنس ہوئی جس میں پنجاب کے چیف منسٹر مسٹر بھارگو بھی شریک ہوئے اور مجاہد ملت مہاتما گاندھی کو بھی اس کانفرنس میں لے گئے۔اس موقع پر بھارگو کی تقریر میواتیوں کو کیا خود مہاتما گاندھی کو بھی مطمئن نہیں کرسکی۔لیکن گاندھی جی نے حکومت کے ذرائع سے علیحدہ ہوکر اپنے خاص ورکروں کواس علاقے میں لگایا جوکئی سال تک یہاں کام کرتے رہے۔گاندھی جی کے مشہور چیلے ونوبا بھاوے نے بھی گاندھی جی کے حکم سے اس علاقے کا دورہ کیا جو مسلمان دہشت و رعب کی وجہ سے ہندو ہوگئے تھے ان کی چوٹیاں کٹوائیں۔'' (۱۴)

میوات کے جن لوگوں سے مولانا کا تعلق تھا اور جس طرح کا تعلق تھا افسوس نہ وہ لوگ رہے اور نہ ہی ان کے تعلق کو قید قرطاس وقلم کیا گیا، جستہ جستہ کہیں کچھ تذکرہ مل جاتا ہے جن سے اس قریبی تعلق کا اشارہ مل جاتا ہے۔ایک تذکرہ تجارہ کی کانفرنس کا ہے اس میں نواب امین الدین خاں بھی موجود تھے اور میوات کے مشہور وکیل ولی محمد خاں بھی تھے۔مولانا نے اس کی رپورٹنگ کرتے ہوئے لکھا کہ:

''۲ دسمبر ۱۹۶۲ کو میواتی صاحبان کی کانفرنس ضلع الور راجستھان کے مشہور قصبہ تجارہ میں ہوئی۔آنرایبل حافظ محمد ابراہیم صاحب نے بھی اس کانفرنس میں شرکت فرمائی۔ نواب محمد امین خاں صاحب آف لوہارو مجلس استقبالیہ کے صدر تھے۔معزز مہمان مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی جنرل سکریٹری جمعیۃ علمائے ہند کا استقبال کرتے ہوئے

استقبالیہ کے معزز رکن ولی محمد خاں صاحب وکیل نے جمعیۃ علما بالخصوص مجاہد ملت کی خدمات کا ذکر کیا پھر خود اپنے متعلق فرمایا کہ میری یہ آزادی مجاہد ملت کے طفیل ہے، کچھ مخالفوں نے مجھے قتل کے مقدمے میں جکڑ دیا تھا، مجاہد ملت نے شہادت دی کہ میں اس وقت دہلی میں ان کی خدمت میں حاضر تھا۔ یہی شہادت میری برات کا ذریعہ بن گئی۔'' (۱۵)

مولانا کی تحریروں میں بعض دوسرے مقامات پر بھی ضمناً میوات کا حوالہ آیا ہے۔ میوات میں مدارس کے قیام اور ان میں جمعیۃ علمائے ہند کی امداد سے قائم شدہ تقریباً چالیس مکاتب و مدارس کا تذکرہ کئی مرتبہ کیا ہے۔ مولانا نے ایک مضمون ''جمعیۃ علمائے ہند اور مذہبی تعلیم وتربیت'' کے عنوان سے ماہنامہ دارالعلوم دیوبند میں لکھا تھا، اس میں اس علاقے میں جمعیۃ علمائے ہند کی خدمات کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے کہ:

''مندرجہ ذیل علاقے خاص طور پر قابل ذکر ہیں، جو پہلی اور ابتدائی کوشش کا مرکز قرار دیے گئے۔ کیوں کہ یہاں تباہی بھی سب سے زیادہ آئی تھی۔ الور، بھرت پور ان دونوں ریاستوں سے مسلمانوں کو جبراً نکالا گیا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ جمعیۃ علمائے ہند کے مخلص خدام کی جد و جہد کامیاب ہوئی اور تقریباً ۱۹۴۹ سے ان علاقوں میں مسلمان دوبارہ آباد ہونے لگے اور ساتھ ساتھ جمعیۃ علمائے ہند کی طرف سے دینی مکاتب کا جال پھیلایا جانے لگا۔ اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ اس وقت ان دونوں ریاستوں میں جواب صوبہ راجستھان کے دوضلع ہیں کم وبیش چار لاکھ مسلمان دوبارہ آباد ہو چکے ہیں اور ساٹھ سے زیادہ اسلامی مکاتب و مدارس یہاں قائم کیے جا چکے ہیں۔'' (۱۶)

میوات کے مدارس کی تعلیمی سرگرمیوں سے بھی مولانا پوری طرح باخبر رہتے تھے اور میوات کے لوگ بھی تعلیم کی ترقی کے لیے مولانا سے مشورے لیتے رہتے تھے۔ دارالعلوم دیوبند کے عربی رسالہ 'الداعی' کے مدیر اور استاد گرامی قدر مولانا نور عالم خلیل امینی نے مولانا کے خاکے میں اس طرح کے ایک واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا کہ:

''ایک مشورہ یہ بھی تھا کہ آپ چاہیں تو میوات کے نوح کے مدرسے میں جو مولانا

نور محمد صاحب (شاگرد و خلیفہ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی) (۱۷) کی سرپرستی میں چلتا ہے صدر مدرس کی جگہ خالی ہے اور وہاں کے ذمے دار حضرات اس جگہ کو پر کرنے کے لیے مجھ سے مسلسل رابطے میں ہیں۔'' (۱۸)

میوات کے ایک مرد مجاہد مولانا عبدالرحیم بڈیڈوی بھی تھے۔ وہ جمعیۃ علمائے ہند کے سرگرم رکن تھے اور میوات کی جمعیۃ کے صدر بھی تھے انھوں نے چند کتابیں بھی لکھی تھیں۔ مولانا سید محمد میاں نے ان پر مختصر تقریظیں لکھی ہیں۔ ان سے بھی میوات سے مولانا کے تعلق کا اظہار ہوتا ہے۔ ان میں سے ایک یہاں نقل کی جاتی ہیں۔ مولانا عبدالرحیم بڈیڈوی نے رسالہ احکام جمعہ کے نام سے ایک رسالہ لکھا تھا، اس پر مولانا محمد میاں نے لکھا کہ:

''احقر محمد میاں نے یہ رسالہ دیکھا، مولانا عبدالرحیم صاحب بڈیڈوی نے جس جذبہ سے یہ رسالہ لکھا ہے وہ قابل قدر ہے، جو باتیں اس میں لکھی گئی ہیں ان کے حوالے درج ہیں جو صحیح ہیں۔ اللہ تعالی مولانا کی محنت اور لگن کو قبول فرمائے اور اس کے بہتر نتائج ظاہر ہوں۔'' (۱۹)

میوات کے ایک بڑے عالم مولانا حبیب الرحمٰن خاں میواتی تھے۔ وہ بڑے جید عالم اور عربی فارسی و اردو کے ماہر تھے۔ انھوں 'تذکرہ صوفیہ میوات' کے نام سے میوات کے صوفیہ کا بھی ایک تذکرہ لکھا ہے۔ انھوں نے مولانا سید محمد میاں کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی کی وفات کے بعد الجمعیۃ نے ایک خصوصی نمبر شائع کیا تھا۔ اس کے لیے مولانا عبدالمنان الدہلوی مرحوم نے ایک قصیدہ عربی زبان میں لکھا۔ میں وہ قصیدہ اور اس کا اردو ترجمہ کر کے مولانا سید محمد میاں کی خدمت میں حاضر ہوا۔ مولانا نے قصیدہ پڑھ کے بہت دیر مولانا عبدالمنان الدہلوی اور ان کے والد گرامی استاذ العلماء مولانا عبدالسبحان میواتی کا تذکرہ کیا۔ اس کے بعد مجھ سے پوچھا کہ یہ ترجمہ تم نے کیا ہے؟ میں نے اثبات میں جواب دیا تو بہت خوش ہوئے اور مجھ سے بھی مضمون لکھنے کی فرمائش کی۔ میں نے چند دن میں عربی میں ایک مضمون لکھ کر پیش کیا، اسے دیکھ کر مولانا حیرت میں

پڑ گئے، کبھی مضمون کو دیکھتے اور کبھی مجھے، جیسے ان کو یقین نہ آیا ہو، بار بار پڑھا۔ فرمایا اتنا کم عمر اور اس پائے کا مضمون! پھر مجھ سے مسکرا کر فرمایا بھائی! ہم نے تم سے اردو میں مضمون کے لیے کہا تھا تم تو عربی میں مضمون لکھ لائے۔ پھر ہنس کر فرمایا کہ بھائی! کیا واقعی یہ تم نے لکھا ہے؟ اس پر میں عربی میں ہی جواب دیا، اس کے بعد مولانا سے ساری گفتگو عربی میں ہوئی ساتھ ساتھ مولانا مضمون کو پڑھتے بھی جاتے تھے اور میری طرف دیکھ کر تحسین آمیز لہجے میں ماشاءاللہ بھی کہتے جاتے تھے۔ اس کے بعد ان کے ارد گرد بیٹھے علما سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ یہ مضمون اس میواتی بچے نے لکھا ہے اور فرمایا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ میوات کی سرزمین تبلیغ وتعلیم سے نم ہو کر زرخیز ہوگئی ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ اب اس میں سے لعل و جواہر پیدا ہونے شروع ہو گئے ہیں۔ اس کے بعد میرا مضمون اور مولانا عبدالمنان کا قصیدہ میرے ترجمے کے ساتھ الجمعیۃ کے اس خصوصی شمارے میں شائع کیا۔

میوات میں مولانا کے متعدد تلامذہ بھی گذرے ہیں۔ حق تھا کہ ان کا بھی تذکرہ کیا جاتا لیکن مضمون میں اس کی گنجائش نہیں ہے۔ بہر حال یہ تو اندازہ ہوتا ہے کہ میوات سے مولانا کا کتنا گہرا رابطہ تھا۔ مولانا مستقل میوات آتے جاتے رہتے تھے اور میوات کے لوگوں اور ان کے مسائل سے پوری طرح باخبر تھے۔ میوات کو دوبارہ آباد کرانے میں اور بزرگوں کے ساتھ مولانا محمد میاں کی خدمات بھی غیر معمولی ہیں۔ اللہ تعالی سے دعا ہے کہ وہ اپنے فضل سے ان کے درجات بلند فرمائے اور ان کی خدمات کا اچھا بدلہ عطا فرمائے۔

(اس مضمون کی تکمیل میں برادرم شبیر احمد خاں میواتی (لاہور) نے بڑی مدد فرمائی اللہ ان کو جزائے خیر عطا فرمائے۔)

حواشی

(۱) مولانا محمد میاں کی سوانح کے لیے دیکھیے:

مولانا نور عالم خلیل امینی: پس مرگ زندہ، ادارہ علم وادب، افریقی منزل قدیم، دیوبند، ۲۰۱۰ ص ۳۷ تا ۱۰۷

(۲) مولانا محمد میاں: علماء ہند کا شاندار ماضی، مکتبہ محمودیہ، لاہور جلد ۴، ص ۴۶۳-۴۶۴

(۳) ایضاً، ص ۵۰۶

(۴) میوات میں خاندانی نظام بارہ پال اور ۵۲ گوتوں پر مشتمل ہے مولانا نے یا تو تسامح میں ۱۴ لکھ دیا ہے یا پھر سہو کتابت ہے۔

(۵) مولانا محمد میاں: مختصر خدمات جمعیۃ علماء ہند، الجمعیۃ بک ڈپو، دہلی، ۱۹۶۳، جلد ۲، ص ۲۵

(۶) ایضاً

(۷) ایضاً ص ۲۶

(۸) ایضاً ص ۲۷

(۹) ایضاً ص ۲۸

(۱۰) ایضاً ص ۲۹

(۱۱) ایضاً ص ۳۰۔۳۱

(۱۲) ایضاً ص ۳۲

(۱۳) ایضاً ص ۳۲۔۳۵

(۱۴) الجمعیۃ، دہلی، مجاہد ملت نمبر ۱۵ مارچ ۱۹۶۳ ص ۶۵۔۶۶

(۱۵) ایضاً ص ۸۷

(۱۶) ماہنامہ دارالعلوم، اپریل ۱۹۵۹ [یہ مضمون پہلے روزنامہ الجمعیۃ کی اشاعت ۳/مارچ ۱۹۵۸ء ص: ۳ پر شائع ہوا، اس کے بعد ماہنامہ دارالعلوم میں شائع ہوا۔ (ضیاء الحق خیرآبادی)]

(۱۷) نوح کے مدرسے کے سرپرست مولانا نیاز محمد صاحب تھے مولانا نور محمد نہیں، شاید استاد گرامی سے نام لکھنے میں تسامح ہو گیا۔

(۱۸) مولانا نور عالم خلیل امینی: پس مرگ زندہ، ادارہ علم وادب، افریقی منزل قدیم، دیوبند، ۲۰۱۰ ص ۸۰

(۱۹) مولانا عبدالرحیم بڈیڈوی: رسالہ احکام جمعہ۔ مکتبہ اعزازیہ، دیوبند، بدون سنہ

☆☆☆☆☆

ماتم گساران سید الملت :

حضرت مولانا سید محمد میاں دیوبندیؒ

کی وفات پر معاصر شخصیات اور اخبارات و رسائل کے تاثرات

نوشاد احمد معروفی مدرسہ عربیہ منبع العلوم خیر آباد، مئو

اس دنیائے آب و گل میں آنے والی بعض شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں جو اپنے شاندار کردار اور نمایاں کارنامے کی بدولت اپنے زمانے کی انتہائی معزز و محترم ہستی بن جاتی ہیں۔ ہر مجلس کی جان اور ہر تحریک کی روح بن کر پوری تندہی اور جانفشانی کے ساتھ شریک عمل ہوتی ہیں اور عوام و خواص کی نگاہوں کا مرکز اور ان کی توجہات کا محور بن جاتی ہیں۔ بیک وقت علم و فن کے کئی میدانوں میں ان کا اشہب قلم محوسفر رہتا ہے، قرآن و حدیث، فقہ و فتاویٰ، ادب و بلاغت، خطابت و صحافت، تعلیم و تدریس، تصنیف و تالیف، تاریخ و تذکرہ ہر حیثیت سے ان کی جولانیِ فکر اور جودت طبع کا مظاہرہ ہوتا رہتا ہے، ایسے آفتاب علم و فن کے روشن اجالے کی وجہ سے کفر و شرک، ظلم و ستم، بدعت و جہالت اور ناخواندگی کی ظلمتیں اور تاریکیاں اپنا دامن سمیٹ لیتی ہیں، لوگوں کو کسی کمی کا احساس اور کسی نقص کا گمان بھی نہیں ہوتا؛ مگر جب وہ شخصیت اس دنیا سے جاتی ہے اور ماہتاب کمال کی منور کرنیں ماند پڑ جاتی ہیں تب لوگوں کو ان کی عدم موجودگی کا شدید احساس ہوتا ہے اور ایسی تاریک راتوں میں بدر کامل کی تلاش ہوتی ہے۔ **وفي الليلة الظلماء يفتقد البدر**

مجاہد حریت، عالم باعمل، مؤرخ بے بدل، عظیم مصنف، شیخ الحدیث مدرسہ امینیہ دہلی و سابق ناظم جمعیۃ علماء ہند حضرت مولانا محمد میاں صاحب دیوبندی کا انتقال آج سے

ٹھیک ۴۵ ؍برس پہلے ۱۹۷۵ء مطابق ۱۳۹۵ھ میں ہوا تھا، اتنا طویل عرصہ گزر جانے کے بعد اس بلند مرتبہ شخصیت، ان کی خدمات کی عظمت ورفعت اور تصنیفات کی اہمیت وافادیت و نافعیت کا صحیح اندازہ کرنے کے لیے ہمیں اس وقت میں شائع ہونے والے اخبارات و رسائل اور جرائد کے صفحات کی ورق گردانی کرنی ہوگی۔ جس شخصیت نے قرآن اور تاریخ کے آئینے میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک سیرت سے دل ودماغ کو معطر کیا، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے عہد زریں کے خطوط ونقوش کو واضح کیا، خورد وکلاں کو اسلامی تاریخ اور دینی تعلیم سے روشناس کرایا، ہندوستان کے شاندار ماضی کی لازوال داستان سنائی اور علماء حق کے زندہ جاوید کارناموں کو اجاگر کیا، تحریک ریشمی رومال کے خدوخال کو کتابی شکل میں جمع فرماکر آزادیٔ ہند کے لیے علماء دیوبند کی فکرمندی، حوصلہ مندی، منصوبہ بندی، جرأت و بیباکی اور ایثار وقربانی کو تحریک آزادی کی سچی حقیقت کے طور پر خلود ودوام عطا کیا، تقسیم ہند کے بعد ارتداد وبے دینی کے بڑھتے ہوئے طوفان پر بند لگایا، مکاتب کے قیام اور مساجد کی واگذاری کے لیے کامیاب کوششیں کیں۔ کتب ورسائل کی اس ورق گردانی سے ہمیں معلوم ہوگا کہ ان کے سانحۂ ارتحال کے وقت لوگوں کی کیا کیفیت تھی؟ کس قدر خلا کا احساس تھا؟ ان کے ہم عصر علما نے انھیں کس طرح خراج تحسین پیش کیا؟ ان کی کوششوں اور کاوشوں کو کس قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھا؟ اتنی بلندی پر پہنچنے کے لیے شبانہ روز اُن کی کیا محنتیں رہی ہیں؟ ان کی پوری زندگی میں ایک طالب کمال کے لیے کیا پیغام ہے؟

اس لیے ضروری ہے کہ علمائے امت، زعمائے قوم وملت اور ہر میدان کی عالی مرتبت شخصیات کے تأثرات وبیانات کی روشنی میں مولانا مرحوم کی ذات، ان کے کمالات، ان کی متنوع خدمات اور لازوال کارناموں پر ایک طائرانہ نظر ڈالی جائے، جس سے حضرت ممدوح کی حقیقی شخصیت نگاہوں کے سامنے آجائے، دلوں میں ان کی صحیح قدر ومنزلت سما جائے اور ان کی تالیفات وتصنیفات سے مستفید ہونے کی راہ آسان ہوجائے۔ کیوں کہ مصنّف کی اہمیت وافادیت کا اندازہ مصنف کے مقام ومرتبہ سے ہی لگایا جاتا ہے۔

شہنشاہوں کی باتیں بھی شاہانہ ہوا کرتی ہیں: **کلام الملوک ملوک الکلام**۔

رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کے صاحبزادے ''مولانا محمد احمد صاحب رحمانی لدھیانوی'' کو ۲۳؍اکتوبر کے اخبار ''پرتاب'' کے ذریعہ انتقال کی خبر ملی تھی، وہ اس سے چند روز پہلے ہی بغرض زیارت وعیادت دلی ان کے دولت خانے پر حاضر ہوئے تھے۔ مرض الوفات کی کیفیت انھوں نے قریب سے دیکھی تھی۔ وہ لکھتے ہیں:

''میری پہلی ہی نظر نے پہچان لیا کہ ایسی عظیم شخصیت چند روز کی مہمان ہے، سفر آخرت کی مکمل تیاری ہے اور خالق حقیقی سے ملنے کے لیے ان کی روح بیتاب ہے۔ میں نے مزاج پرسی کی تو حضرت مولانا نے فرمایا کہ میں سخت بیمار ہوں، بواسیر کا خون کسی طرح بند نہیں ہو رہا ہے، ضعف اور کمزوری ہے، اور یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ رمضان المبارک میں، میں نے روزے پابندی سے رکھے۔ ۲۱؍رمضان کے بعد مجھے خون آنے لگا، ایسی حالت میں میرے دو روزے چھوٹ گئے، تو میں نے بارگاہ الٰہی میں دعا کی کہ کسی طرح رمضان المبارک پورا ہو جائے۔ چنانچہ دوسرے ہی دن سے مرض میں افاقہ ہو گیا اور میں نے دوبارہ روزے رکھنے شروع کر دیئے، پھر پورے رمضان کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ جیسے ہی رمضان المبارک کی برکتیں رخصت ہوئیں، مرض اپنی پوری شان وشوکت کے ساتھ لوٹ آیا، بس اب تو ایک ہی آرزو ہے کہ خاتمہ ایمان پر ہو جائے۔ مولانا محمد میاں صاحب میرے والد محترم رئیس الاحرار حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی کے قریبی ساتھیوں میں سے تھے، میں ان کی خدمت میں بیٹھا ہوا رنجیدہ، غم زدہ اس مجسم نور کو دیکھ رہا تھا، جس نے اپنی پوری زندگی تعلیم وتبلیغ اور تصنیف وتالیف میں، سیاسی اور مذہبی رہنمائی اور ملک وملت کی خدمت میں گزار دی''۔ [الجمعیۃ دہلی، ۱۴؍نومبر ۱۹۷۵ء]

۲۵؍اکتوبر کو شائع ہونے والے الجمعیۃ کے شمارے میں جنازہ وتدفین کے متعلق خبر کو مناسب جگہ دی گئی ہے:

''مولانا مرحوم کا جنازہ پروگرام کے مطابق صبح ساڑھے آٹھ بجے ان کے دولت کدہ

سے روانہ ہوکر لگ بھگ سوا نو بجے ترکمان گیٹ کے نزدیک درگاہ فیض الٰہی پہنچا، جہاں نو بج کر ۳۵ رمنٹ پر نماز جنازہ ادا کی گئی۔ جنازہ کی نماز مولانا زید میاں صاحب امام عیدگاہ نے پڑھائی۔ نماز بعد جنازہ جدید قبرستان دلی گیٹ کے لیے روانہ ہوا، جہاں انھیں دلی و بیرون کے علماء وفضلاء، جماعتی رفقاء، مدارس دینیہ کے اساتذہ وطلبہ، سیاسی وسماجی شخصیات، ممبران پارلیمنٹ، وزرائے حکومت ہند، غیر ملکی سفارتی نمائندے اور مولانا کے اعزہ واقرباء کے ساتھ ساتھ ہزاروں سوگواروں کی موجودگی میں سپرد خاک کردیا گیا''۔

دارالعلوم دیوبند نے اپنے اس لائق وفائق اور نامور فرزند کی وفات کو علمی دنیا کا ایک عظیم حادثہ قرار دیا اور ختم قرآن وایصال ثواب کے بعد تعطیل کا اعلان کردیا۔ صدر المدرسین حضرت مولانا سید فخر الحسن صاحب نے جلسہ سے پُر مغز فاضلانہ خطاب فرمایا:

''مولانا سید محمد میاں صاحب صدر مدرس مدرسہ امینیہ دہلی ورکن مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند کا حادثۂ رحلت علمی حلقہ کے لیے عظیم حادثہ ہے، علمی دنیا میں بہت مشہور ومعروف تھے، مولانا کی ذات اوران کی دینی، ملی، مذہبی، سیاسی اور سماجی خدمات اظہر من الشمس ہیں اوران سے ہندوستان کا ہر چھوٹا بڑا واقف ہے۔ حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب کے بعد مدرسہ امینیہ دہلی کے صدر منتخب ہوئے اور بخاری شریف کا درس دیتے ہوئے دنیا سے رخصت ہوئے۔ مولانا مرحوم ایک عظیم محدث کی حیثیت سے دینی حلقوں میں ہمیشہ یاد کئے جاتے رہیں گے۔

آپ نے جمعیۃ علماء میں رہ کر اہم خدمات انجام دیں، حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ کے زمانۂ نظامت میں آپ نائب ناظم کے عہدہ پر فائز رہے، ان کے انتقال کے بعد جمعیۃ کے ناظم اعلیٰ کی حیثیت سے کام کرتے رہے، شب وروز آپ تعلیم وتعلم، کتب بینی اور علمی کتب کی تصنیف وتالیف میں مصروف رہتے۔ تاریخ اور فقہ اسلامی پر خاص مہارت اور دستگاہ حاصل تھی، جس کا ثبوت ان کے بہت سے مضامین اور کتابوں سے ملتا ہے۔ جہاں آپ ایک متبحر عالم، بہترین مصنف اور اونچے درجہ کے مفتی تھے، وہیں خلوت نشین اور وظائف سے دل چسپی رکھنے والے صوفی اور بزرگ بھی تھے۔

آپ ایک طویل عرصے سے دارالعلوم کی مجلس شوریٰ وعاملہ کے اہم رکن تھے اور ہمیشہ آپ پوری دل جمعی کے ساتھ حصہ لے کر مجلس کا کافی بوجھ ہلکا کرتے تھے۔تمام ممبران شوریٰ وعاملہ مولانا کی رائے کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے‘‘۔[رسالہ دارالعلوم دیوبند ماہ دسمبر ۱۹۷۵ء]

صدر محترم جمعیۃ علماء ہند فدائے ملت حضرت مولانا سید اسعد مدنی (رحمۃ اللہ علیہ) صدر کانگریس مسٹر بروا، ناظم عمومی جمعیۃ علماء ہند حضرت مولانا سید احمد ہاشمیؒ اور دوسرے اکابرین نے حضرت مولانا سید محمد میاں صاحبؒ کے سانحۂ ارتحال پر اپنے گہرے رنج وغم کا اظہار کیا۔ صدر محترم جمعیۃ علماء ہند نے اپنے تعزیتی برقیہ میں تحریر فرمایا:

’’سید الملت حضرت مولانا سید محمد میاں کی وفات ایک عظیم دینی، ملی اور جماعتی نقصان ہے، جس کی تلافی ممکن نہیں ہے۔مولانا مرحوم جمعیۃ علماء ہند کے ان اکابرین میں تھے، جن سے ہر مشکل کے وقت رجوع کیا جاتا تھا اور جن کے مشورے نشان راہ ثابت ہوتے تھے۔ان کی وفات سے جمعیۃ علماء ہند اپنے ایک عظیم رہنما، مفکر اور اپنے بے باک قلم سے محروم ہوگئی ہے۔‘‘

ناظم عمومی جمعیۃ علماء ہند حضرت مولانا سید احمد صاحب ہاشمی نے فرمایا:

’’آج وہ درویش صفت، بے ریا ذات ہم سے جدا ہوگئی، جو جامع کمالات تھی، جو مرجع خواص وعوام تھی، جو ہر نوع کی فقہی، سیاسی وتاریخی گتھیوں کو اپنے ناخن بصیرت و تدبر سے پلک جھپکتے سلجھا دیا کرتی تھی، ہر دشواری والجھن میں ان سے رہنمائی طلب کی جاتی تھی۔وہ ایک عظیم مجاہد تھے، وہ بہت بڑے مفکر تھے، وہ ایک صوفی تھے، وہ بے بدل مؤرخ تھے، ان کی تحریر سند تھی، ان کی کتابیں ماخذ اور حوالے کا کام دیتی تھیں، یورپ وامریکہ کے ریسرچ اسکالر بھی ان کی کتابوں کے حوالے دیا کرتے تھے۔ انھوں نے اپنی خداداد صلاحیتوں سے ہر شعبۂ زندگی میں اپنی ملت کی، قوم کی اور اپنے ملک کی خدمت کی۔

آزادی کی لڑائی میں وہ سپاہی بھی تھے اور کمانڈر بھی، انھوں نے ’’ہندوستان چھوڑو‘‘

تحریک میں عملی حصہ بھی لیا اور انتخابی مہمات میں بھی پیش پیش رہے۔ آزادی کے بعد وہ ملت کے تحفظ کی جدوجہد میں ہمہ تن مصروف ہوگئے۔ ان کا سب سے بڑا کام ارتداد کے فتنہ کو روکنا اور غیر محفوظ علاقوں میں گاؤں گاؤں گھوم کر دینی مراکز قائم کرنا تھا۔ بنیادی تعلیم کے تصور کو عام کرنے کی کوشش کی، دینی تعلیم کی بقا و تحفظ کے لیے حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰنؒ کی رہنمائی و تعاون کے ساتھ عظیم خدمات انجام دی ہیں۔ ان کے سیر حاصل ذکر کے لیے تو ایک دفتر درکار ہے۔

مولانا مرحوم نے علماء حق اور علماء ہند کے شاندار ماضی جیسی کتب تحریر فرما کر ہندوستانی مسلمانوں پر ایسا احسان فرمایا کہ جس سے ہم کبھی بھی عہدہ برآ نہیں ہوسکتے۔ اگر وہ تاریخ پر قلم نہ اٹھاتے تو ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ مکمل نہ ہوتی۔ جمعیۃ علماء ہند میں ان کا رتبہ اساسی رتبہ تھا، وہ جماعت کے ایسے رہنما تھے کہ جب کسی معاملہ میں ہم لوگوں کو پریشانی یا دقت پیش آتی تو سب کی نظریں مولانا محمد میاں صاحب کی جانب اٹھتی تھیں اور مولانا مرحوم اس سلسلے میں ایسا مشورہ عنایت فرماتے تھے کہ جو نہایت وقیع اور جامع ہوتا تھا۔ مولانا کی قوت فیصلہ اس درجہ پختہ تھی کہ مرحوم جب کوئی فیصلہ کرلیا کرتے تھے تو بڑی سے بڑی رکاوٹ بھی ان کو اس سے ہٹا نہیں سکتی تھی۔ وہ جہاں علم حدیث، تاریخ، تفسیر اور فقہ میں درک و مہارت رکھتے تھے، وہیں ان میں حلم و مروّت اور وضع داری بھی غایت درجہ پائی جاتی تھی۔ ایسے علم و عمل کے پیکر اور اخلاق و مروّت کے خوگر لوگ نایاب نہ سہی کمیاب ضرور ہیں''۔

فاضل جلیل، مجاہد عظیم، مفکر ملت، بطل حریت حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب کے حوالے سے قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی کے تأثرات بھی پڑھتے چلیں:

''مولانا مرحوم نے نصف صدی تک خدمت ملک و ملت کے میدانوں میں جو عظیم الشان مختلف النوع خدمات انجام دیں، وہ ہندوستان کی تاریخ میں سنہری حروف سے لکھی جائیں گی اور ملت اسلامیہ انھیں ممنونیت کے ساتھ یاد رکھے گی۔ وہ مدرسہ امینیہ دہلی کے صدر المدرسین اور شیخ الحدیث، مجلس مباحث فقہیہ جمعیۃ علماء ہند کے مدیر اعلیٰ، جمعیۃ علماء ہند کے نائب صدر اور ناظم اعلیٰ، مدرسہ شاہی مراد آباد کے مہتمم ہونے کے

ساتھ ساتھ ایک درجن سے زیادہ بلند پایہ علمی وتحقیقی کتابوں کے مصنف تھے۔

ہندوستان میں جمعیۃ علماء ہند کے پلیٹ فارم سے اپنے شیخ حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنیؒ کی رہنمائی میں جنگ آزادی میں انھوں نے مردانہ وار حصہ لیا اور پانچ مرتبہ سنت یوسفی ادا کی۔ ہندوستان میں علماء اسلام کی مجاہدانہ کوششوں کی خونی داستان کو انھوں نے اپنے قلم سے تاریخ کے صفحات میں ہمیشہ کے لیے محفوظ کردیا، وہ اس سلسلہ میں اتھارٹی (سند) سمجھے جاتے تھے اور ان کی کتابیں یورپ وامریکہ تک کے مصنفین کتب حوالہ کی حیثیت سے استعمال کرتے تھے۔ ہزاروں فتوے ہی ان کے قلم سے نہیں نکلے؛ بلکہ مجلس مباحث فقہیہ کے مدیر اعلیٰ کی حیثیت سے جدید پیدا شدہ فقہی مسائل کی گتھیاں سلجھا کر انھوں نے علماء ہند کی طرف سے فرض کفایہ ادا کیا۔ مسلمان بچوں کی دینی تعلیم کے لیے جو کتابیں ان کے قلم سے نکلیں، وہ نہ صرف زبان وبیان کے اعتبار سے بے نظیر ہیں؛ بلکہ استناد واعتبار کے لحاظ سے بھی ان پر پورا بھروسہ کیا جاسکتا ہے۔

ان تمام فضائل وکمالات کے ساتھ سادگی، کسر نفسی، تواضع، تقویٰ اور خشیت الٰہی میں بھی وہ اس زمانے میں اپنی نظیر آپ تھے۔ الغرض وہ علم وعمل، فتویٰ وتقویٰ، شریعت وطریقت اور علمی بصارت اور دینی بصیرت کے بہترین جامع تھے۔ اس قحط الرجال کے دور میں ان کی وفات ہندوستان کی علمی محفلوں کا ایک ایسا خلا ہے، جس کا پُر ہونا بظاہر مشکل نظر آتا ہے۔'' [الجمعیۃ ۲۵؍اکتوبر ۱۹۷۵ء]

مولانا شمیم احمد صاحب ناظم جمعیۃ علماء اترپردیش نے اپنے ایک بیان میں کہا:

''جمعیۃ علماء ہند اپنی ایک عظیم شخصیت، ایک عظیم مفکر اور زبردست معمار سے محروم ہوگئی، دیوبند کی سرزمین سے مولانا مرحوم کا گہرا تعلق تھا''۔

حکیم خورشید عالم صاحب صدیقی اس وقت لکھنؤ اور مرادآباد کے سفر پر تھے، اخبار الجمعیۃ سے بھی ان کا رابطہ منقطع تھا، مولانا مرحوم کی وفات کی اطلاع دیر سے ملی۔ سانحۂ ارتحال سے ورطۂ حیرت میں غرق، مولانا کے ساتھ تعارف وملاقات اور ان کی خوبیاں بیان

کرتے ہیں:

''مولانا مرحوم سے میرا تعارف اس وقت سے تھا جب وہ مدرسہ شاہی مراد آباد میں مدرس تھے، حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ نے اپنی صدارت جمعیۃ کے زمانے میں موصوف کو دفتر مرکزی جمعیۃ علماء ہند دہلی میں طلب فرمایا تو میرا تعارف ترقی کر کے تعلق کی منزل میں پہنچ گیا اور ہمیشہ میرے ساتھ بزرگانہ شفقت فرماتے رہے۔افسوس کہ وہ آخری چراغ بھی گل ہو گیا جو ہماری جماعت اور بالخصوص طبقہ علماء میں حدیث وفقہ اور ملت اسلامیہ کی مذہبی وسیاسی تاریخ کی انسائیکلوپیڈیا تھے اور بزرگوں کے روایتی اخلاق وتواضع کا نمونہ بھی''۔ [الجمعیۃ ۲۹؍اکتوبر ۱۹۷۵ء]

رسالہ دارالعلوم دیوبند میں مفتی ظفیر الدین صاحب مفتاحی نے دسمبر ۱۹۷۵ء کے شمارے میں ''حرف آغاز'' کے ابتدائی کالم میں حضرت مولانا مرحوم کی شرافت وبزرگی، اخلاق ومروّت، فیاضی وایثار اور خداترسی اور خلوص وللّٰہیت کا، ہمہ وقت لکھنے پڑھنے میں انہماک اور قلم وقرطاس سے وابستگی کا، جمعیۃ علماء ہند سے گہرے لگاؤ اور بے پناہ تعلق کا، علمی، دینی اور سیاسی وسماجی خدمات کا جامع تذکرہ کرتے ہوئے تحریر فرمایا:

''کیا خبر تھی کہ سید العلماء حضرت مولانا محمد میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس قدر جلد ہم سے جدا ہو جائیں گے۔۲۳؍اکتوبر ۱۹۷۵ء کی صبح کو اخبار میں یہ خبر دیکھ کر زمین پاؤں تلے سے نکل گئی کہ کل شام میں مولانا مرحوم رفیق اعلیٰ سے جا ملے۔إنا للّٰہ وإنا إلیہ راجعون۔

مولانا موصوف علمائے دیوبند کی جماعت میں اپنے بعض مخصوص اوصاف وکمالات کی وجہ سے ممتاز تھے اور ہر بڑا چھوٹا ان کا احترام کرتا تھا۔چہرے سے شرافت، خداترسی اور متانت وسنجیدگی ٹپکتی تھی، علم وفضل، اخلاق ومروّت اور فیاضی وایثار میں اپنی آپ مثال تھے، اپنے چھوٹوں کے ساتھ بڑی محبت وشفقت کے ساتھ پیش آتے تھے۔نماز باجماعت اور اوراد وظائف کے بڑے پابند تھے۔آپ کی دین داری اور تقویٰ سے ہم سب متأثر تھے۔

خاکسار کی ابتدائی طالب علمی کا زمانہ تھا کہ ۱۹۳۶ء یا ۱۹۳۷ء میں مرادآباد سے ایک ماہنامہ ''قائد'' کے نام سے نکلا، [رسالہ ''قائد'' مرادآباد کی ابتدا: محرم، صفر ۱۳۵۷ھ مطابق مارچ، اپریل ۱۹۳۸ء، انتہا: رجب، شعبان ۱۳۵۸ھ مطابق ستمبر ۱۹۳۹ء۔ بشکریہ مولانا ضیاء الحق صاحب خیرآبادی: از معروفی] مولانا اس کے قائد التحریر تھے۔ مجھے اس زمانہ میں دینی رسائل پڑھنے کا نیا نیا ذوق وشوق تھا، اس رسالہ میں بیشتر مضامین مولانا کے ہی ہوتے تھے، میں بڑے شوق سے پڑھتا تھا۔ پھر اسی دور میں مولانا کی مشہور کتاب ''علماء ہند کا شاندار ماضی'' پانچ جلدوں میں شائع ہوئی۔ میں نے پہلی فرصت میں اسے منگوایا اور مجھے یاد ہے کہ ایک رات دن میں پانچ کی پانچ جلدیں پڑھ گیا۔ میں نے ابھی تک مولانا کی صورت نہیں دیکھی تھی۔ غالباً جون ۱۹۴۷ء میں امیر شریعت ثالث کا انتخاب ڈھاکہ ضلع چمپارن میں ہورہا تھا، اس اجلاس کی صدارت کے لیے مولانائے محترم وہاں تشریف لائے۔ یہیں سب سے پہلے میں نے مولانا کو دیکھا اور کہنا چاہیے دور سے دیکھا، نہ جان پہچان، نہ بات چیت۔

۱۳۷۶ھ میں قسمت مجھے دیوبند کھینچ لائی اور اس طرح یہاں میرا مستقل قیام ہوگیا، ہر مجلس شوریٰ اور مجلس منتظمہ میں عموماً مولانا تشریف لاتے اور ملاقات ہوتی رہتی تھی، اب دوری ختم ہوچکی تھی۔ تصنیف وتالیف کے رشتے نے اور بھی قریب کردیا تھا۔ جس جس طرح نزدیکی بڑھتی گئی، مولانا کی عظمت اور آپ کے تقدس کا سکہ دل پر بیٹھتا گیا۔ خاکسار کی بعض کتابوں پر مولانا نے بڑا عمدہ اور حوصلہ افزا تبصرہ بھی لکھا اور زبانی بھی حوصلہ افزا کلمات سے نوازتے رہتے۔

مولانا موصوف کا آبائی وطن دیوبند کا ہی محلّہ پیرزادگان تھا اور آپ نے تعلیم بھی یہیں دارالعلوم میں حاصل کی تھی، جامعہ شاہی مرادآباد میں درجہ علیا کے مدرس تھے اور ممتاز مدرسین میں آپ کا شمار ہوتا تھا؛ مگر اسی کے ساتھ سیاست میں بھی سرگرم حصہ لیتے تھے۔ جمعیۃ علماء ہند اور کانگریس دونوں سے منسلک تھے اور اخیر تک ان جماعتوں سے وابستہ رہے۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ انگریزی دور حکومت میں جمعیۃ علماء سے وابستگی یا کانگریس سے تعلق کتنا صبر آزما مسئلہ تھا۔ آج کی جمعیۃ اور کانگریس پر اسے

ہرگز قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ اگر آج ان جماعتوں سے وابستگی پھولوں کی سیج ہے تو یقین کیجیے ۱۹۴۷ء سے پہلے انگاروں پر لوٹنا تھا اور شیر سے پنجہ آزمائی کرنا۔

اکابر جمعیۃ کے ایماء سے آپ نے مدرسہ کی مدرسی ترک کردی اور اپنی تمام تر خدمات جمعیۃ کے لیے وقف کردیں۔ مجاہد ملت کے دورِ نظامت میں آپ بہت دنوں تک جمعیۃ علماء ہند کے ناظم رہے، جمعیۃ کی سیاسی خدمات سے دنیا کو متعارف کرانے والے مولانا موصوف ہی تھے۔ دسیوں کتابیں آپ نے لکھیں اور بڑی محنت وجانفشانی سے لکھیں۔ سیاسی علماء پر مولانا کے قلم سے جو احسانات ہیں وہ بھلائے نہیں جاسکتے۔ مجاہد ملت کے دور نظامت میں آپ نے ''دینی تعلیم کا رسالہ'' سات حصوں میں چھوٹے بچوں کے لیے لکھا اور اسے اپنے اہتمام میں عمدہ کتابت وطباعت سے شائع کرایا اور بحیثیت مصنف اس پر اپنا نام بھی درج نہیں کیا۔ یہ مولانا کے اخلاص کا نتیجہ تھا کہ ''دینی تعلیم کا رسالہ'' پورے ملک میں بہت مقبول ہوا۔ اس سے پہلے آپ نے بچوں کے لیے ''تاریخ اسلام'' نام کا رسالہ تین حصوں میں لکھا تھا۔ کہا جاسکتا ہے کہ آج کوئی بچے والا گھر ان رسالوں سے خالی نہیں ہے۔

میرا اندازہ ہے کہ چھوٹی بڑی کوئی پچاس کتابوں کے آپ مصنف ہیں، ان کتابوں میں قابل ذکر ''علماء ہند کا شاندار ماضی''، ''علمائے ہند کے مجاہدانہ کارنامے''، ''شواہد تقدس محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم''، ''تحریک شیخ الہند''، ''مشکوٰۃ الآثار'' اور ''ترجمہ ازالۃ الخفاء'' وغیرہ ہیں۔

مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن کے بعد آپ نے دوبارہ مدرسہ کو اپنی خدمت کا میدان بنایا، جسے علماء کا قلعہ اور چھاؤنی کہہ سکتے ہیں اور مدرسہ امینیہ دہلی کے شیخ الحدیث بنائے گئے اور زندگی کے اخیر لمحے تک اس رشتہ سے منسلک رہے۔ ہر سال آپ درس حدیث دیا کرتے تھے؛ مگر اسی کے ساتھ جمعیۃ علماء سے بھی وابستہ رہے اور اس سے آپ کا رشتہ منقطع نہیں ہوا، اس کا شعبہ مباحث فقہیہ آپ کے زیر نگرانی کام کرتا تھا۔

آپ بہت پہلے سے دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے بھی ممبر تھے اور عموماً پابندی سے اس کے اجلاسوں میں تشریف لاتے تھے اور مجلس کی تجویزیں عام طور پر آپ ہی

قلم بند فرماتے تھے۔ سنا ہے کہ لکھنے اور تصنیف وتالیف کا شغف دیکھ کر حضرت شیخ الاسلام قدس سرہٗ آپ کو مذاق میں ''حیوان کاتب'' کہا کرتے تھے۔

اخیر عمر میں صحت کے اضمحلال کے باوجود کسی علمی کام کے کرنے میں آپ کو تکلف نہیں ہوتا تھا، لکھنے پڑھنے کا مشغلہ برابر جاری رہتا۔ آپ پابندی کے ساتھ اپنی ہر تصنیف کے کم از کم دو نسخے ضرور کتب خانہ دارالعلوم دیوبند کو مرحمت فرماتے تھے۔ طبیعت کے فیاض تھے، ایک دفعہ مہمان خانہ دارالعلوم میں امیر شریعت بہار واڑیسہ حضرت مولانا منت اللہ صاحب رحمانی نے مولانا موصوف سے فرمایا کہ آپ مٹھائی کھلائیں۔ مولانا نے فوراً جیب سے اپنا بٹوا نکالا اور جو کچھ رقم تھی پیش کردی۔ امیر شریعت نے فرمایا: واقعی آپ سید ہیں، مشہور ہے کہ سید بخیل نہیں ہوتا، یہ آپ نے سچ کردکھایا۔ آپ اپنے استاذ زادوں کی برابر خبر گیری رکھتے تھے اوران کی مدد کرنے میں پیش پیش رہتے تھے۔ مولانا ہر اہل علم کے قدرداں تھے۔ آپ کو محدث العصر حضرت مولانا انور شاہ کشمیری قدس سرہٗ سے شرف تلمذ تھا؛ بلکہ ممتاز تلامذہ میں آپ کا شمار ہوتا تھا، علمی ذوق استاذ محترم سے ورثہ میں ملا تھا''۔ [ماہنامہ دارالعلوم دیوبند ماہ دسمبر ۱۹۷۵ء]

حضرت مولانا محمد میاں صاحب کی تدفین کے اگلے روز ۲۴ر اکتوبر ۱۹۷۵ء کو بعد نماز جمعہ دہلی کی شاہجہانی مسجد میں تعزیتی اجلاس منعقد ہوا، جس میں صدر اجلاس مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی نے مولانا مرحوم کی خوبیوں، کمالات اوران کے ساتھ اپنے ۵۰ر سالہ خصوصی تعلقات کا خاص طور پر تذکرہ کیا:

''حضرت مولانا محمد میاں صاحب کی پوری زندگی نیک نفسی اور پاکیزگی سے معمور تھی۔ انھوں نے اپنے کردار وعمل کے ذریعہ اپنے اور خداوند کریم کے درمیان مضبوط رشتہ قائم کیا؛ بلکہ اجتماعی زندگی سے بھی اپنے گہرے تعلقات قائم کیے۔ مرحوم کا ذوق عبادت قابل رشک تھا، وہ اس کثرت سے تلاوت قرآن کیا کرتے تھے کہ وہ تقریباً حافظ ہوگئے تھے اور چند ہی سال قبل انھوں نے قرآن پاک باقاعدہ حفظ کرلیا تھا''۔

زمانۂ طالب علمی کا تذکرہ کرتے ہوئے انھوں نے فرمایا:

''ویسے تو بہت لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ جو پختہ عمر ہو جانے پر نیکی و بردباری اختیار کرتے ہیں؛ مگر مولانا محمد میاں صاحب کے بارے میں دارالعلوم کے طلبہ واساتذہ کہا کرتے تھے کہ ''یہ کیسا فرشتہ صفت لڑکا ہے''۔

مولانا قاضی سجاد حسین صاحب نے مولانا محمد میاں صاحب کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا:

''مولانا مرحوم کی زندگی صحابہ کرام کی اس زندگی کی یاد تازہ کرتی ہے، جس کی راتیں تو خداوند کریم کی عبادت میں صرف ہوتی تھیں اور دن کا وقت ایک جاں باز سپاہی کے فرائض انجام دیتے ہوئے بسر ہوتا تھا۔ میں ایک عینی شاہد کی حیثیت سے کہہ سکتا ہوں کہ نماز میں تکبیر اولیٰ کی بے پناہ لگن سے ان کو موسم کی شدت بھی باز نہیں رکھ سکتی تھی۔ عبادات کے ساتھ اس درجہ لگن کے ساتھ ساتھ اجتماعی زندگی سے ان کا گہرا تعلق صحابہ کرامؓ کے کردار کی یاد تازہ کرتا تھا''۔

شاہجہانی مسجد اس کے اجلاس عام میں جو تعزیتی قرارداد پاس کی گئی، وہ بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ یہاں اسے بعینہٖ نقل کرتے ہیں:

تعزیتی قرارداد مسجد شاہجہانی دلی

''مسلمانان دہلی کا یہ جلسہ عام سید الملت حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب شیخ الحدیث مدرسہ امینیہ دہلی و نائب صدر جمعیۃ علماء ہند کے سانحۂ ارتحال پر اپنے دلی رنج وغم کا اظہار کرتا ہے۔ حضرت مولانا موصوف ایک عالم دین، مجاہد جنگ آزادی، محدث، فقیہ، صوفی اور درویش صفت انسان تھے، اپنی تمام زندگی مسلمانوں کی دینی و علمی وسیاسی رہنمائی کرتے رہے۔ وہ ایسے جامع کمالات شخص تھے کہ آج ان کی جدائی بہت شدت سے محسوس کی جارہی ہے۔

مسلمانان دہلی کا یہ جلسہ عام حضرت مولانا مرحوم کو ان کی دینی، علمی اور مسلمانوں کی قومی، وطنی خدمات پر اپنا خراج تحسین پیش کرتے ہوئے مرحوم کے لیے دعائے

مغفرت کرتا ہے''۔[روزنامہ الجمعیۃ دہلی، ۲۶/اکتوبر ۱۹۷۵ء]

دکانداران جامع مسجد دہلی کی جانب سے، چوک جامع مسجد پر منعقد جلسۂ تعزیت میں انھیں ان قوم پرست مسلمانوں میں شمار کیا گیا، جنھوں نے تحریک آزادی کی بنیادیں استوار کی تھیں۔ حصول آزادی کے بعد بھی وہ اپنے اس بلند مرتبہ کام میں لگے رہے اور اپنی خدمات کا معمولی سا بھی بدل حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ ہندوستان کی تاریخ ان کو فراموش نہیں کر سکے گی۔

حضرت مولانا محمد میاں صاحب اور ان کے خاندانی پس منظر اور ہر دور میں اس سلسلۂ فضل وکمال کی نمایاں کڑیوں پر ''مولانا سید آل حسن صاحب میرٹھی'' نے ''روزنامہ الجمعیۃ'' میں شائع اپنے تعزیتی مضمون میں اچھی طرح روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''مولانا محمد میاں صاحب خاندان سادات رضویہ کے چشم وچراغ تھے، مغلیہ دور میں تین صدیوں تک یہ خاندان علم وفضل، زہد وتقویٰ، رشد وہدایت میں مقبول عام و خاص اور مرجع الخلائق رہا۔ تحصیل علوم شریعت وطریقت میں مسلمانان ہند اس خاندان کے آج تک رہین منت ہیں۔ شاہان مغلیہ کو اس خاندان سے والہانہ عقیدت وتعلق تھا۔ فرامین شاہی و پروانہ جات میں اس خاندان کے بزرگوں کو حقائق ومعارف آگاہ، شیخت پناہ، مغفرت پناہ اور غفران پناہ، القاب سے یاد کیا جاتا تھا۔''

مولانا محمد میاں صاحب کے تعلق سے ان کا قلم جوہر رقم رقم طراز ہے:

''مولانا مرحوم کی ذات گرامی اس دور فتن ومادہ پرستی میں سرمایۂ افتخار، آفتاب علم و ہدایت، ماہتاب ورع وتقویٰ اور مہر امانت تھی۔ خدمت خلق میں آپ کا وجود مسعود صحیح طور پر نمونۂ اسلاف رہا۔ دن میں درس حدیث میں انہماک، زبان وقلم سے رشد و ہدایت میں مشغولیت اور رات میں اظہار عبدیت میں مصلیٰ پر سربسجود، تعلق مع اللہ سے قلب ہمہ وقت روشن''۔

اخیر میں انھوں نے عربی شاعر ابوالعتاہیہ کے اشعار پیش کر کے مرحوم کی وفات پر اشکبار متعلقین ومنتسبین کو صبر جمیل کی تلقین کی ہے:

اِصْبِرْ لِکُلِّ مُصِیْبَةٍ وَّتَجَلَّدِ ☆ وَاعْلَمْ بِأَنَّ الْمَرْءَ غَیْرُ مُخَلَّدِ
وَإِذَا ذَکَرْتَ مُصِیْبَةً تَشْجیٰ بِهَا ☆ فَاذْکُرْ مُصَابَکَ بِالنَّبِیِّ مُحَمَّدِ

(ترجمہ: ہر مصیبت پر صبر واستقامت اور ہمت وحوصلے سے کام لو اور یاد رکھو کہ انسان کو دوام وخلود اور ہمیشگی حاصل نہیں۔ جب تمھیں کوئی ایسی مصیبت اور پریشانی یاد آئے جس سے تم غمگین ہو جاؤ تو نبی کریم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی وجہ سے پیش آنے والے سانحہ کو یاد کرلو۔ [نوشاد احمد معروفی] [روزنامہ الجمعیۃ دہلی، ۱۲؍دسمبر ۱۹۷۵ء، عید نمبر، ص:۴]

مفسر قرآن حضرت مولانا اخلاق حسین صاحب دہلوی مولانا مرحوم کے اچھے اخلاق اور بلند کردار کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میں نے ملت اسلامیہ کے پچھلے ۲۸؍سالہ ہنگامہ خیز دور میں مولانا مرحوم کے خادم کی حیثیت سے کام کیا۔ ہماچل پردیش کے سنگلاخ علاقہ کا دورۂ ہند، راجستھان کے ریگستانی دیہات کا، یا میوات کے گاؤں میں جانے اور وہاں دینی مدارس قائم کرنے کا، تقریباً ان تمام علاقوں میں مولانا مرحوم نے دینی تعلیم وتبلیغ کے لیے اکثر مجھے اپنے ساتھ رکھا۔ میں مولانا کی انکساری، روحانی اور اخلاقی بلندی اور چھوٹوں کے ساتھ غیر معمولی جذبے کو الفاظ میں بیان نہیں کرسکتا۔ عام طور پر زندگی کی نفسا نفسی میں ایک دوسرے کی حوصلہ شکنی کی جاتی ہے؛ لیکن مولانا مرحوم اپنے چھوٹوں کی ہر طرح سے حوصلہ افزائی فرماتے تھے''۔

انھوں نے مولانا مرحوم کی شش جہتی حیثیت کو بڑے نرالے اور والہانہ انداز میں پیش کرتے ہوئے لکھا ہے:

''مولانا محمد میاں صاحب اگر حدیث وفقہ میں اپنے استاد حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ کی یادگار تھے، تو زہد وتقویٰ اور ریاضت میں اپنے شیخ حضرت مدنیؒ کی روشن نشانی تھے۔ اہل وطن کہہ رہے ہیں کہ مجاہد آزادی اٹھ گیا، ارباب حدیث وفتویٰ رو رہے ہیں کہ حضرت مفتی کفایت اللہ کا صدمہ پھر تازہ ہوگیا، تاریخ کے قدردان چلا رہے ہیں کہ جس قلم نے مسلمان مجاہدین کی تاریخ کو زندۂ جاوید بنادیا، وہ قلم خشک

ہوگیا، جمعیۃ علماء ہند کے رہنما واکابرین افسوس کررہے ہیں کہ اب کون ہمیں ماضی کی روایات کی روشنی میں راستہ دکھائے گا، اب کون مجاہد ملتؒ، حضرت سجاد بہاریؒ، حضرت نورالدین بہاریؒ، مولانا احمد سعیدؒ اور مفتی کفایت اللہؒ کی بیباک اور مدبرانہ حکمت عملی کا سبق دے گا! اوران سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اب کون ہمارے لیے اور اسلامیان ہند کے راتوں کو اٹھ کر روئے گا اور دعائیں کرے گا؟''

مولانا محمد میاں صاحب دلی میں رہ کر جمعیۃ علماء ہند کے وسیع پلیٹ فارم سے ہندوستانی مسلمانوں کی رہنمائی فرمارہے تھے۔ مولانا دہلوی بجاطور پر اعتراف کرتے ہیں:

''خاص طور پر دہلی والوں پر مولانا مرحوم کا بڑا حق ہے۔ مولانا نے اپنی بہترین زندگی دلی میں گزار دی۔ اگر ہم دلی والے مجاہد ملتؒ اور مولانا احمد سعیدؒ کی خدمات کو فراموش نہیں کرسکتے تو حضرت مولانا سید محمد میاںؒ کی بےلوث جدوجہد سے بھی صرف نظر نہیں کرسکتے۔ مولانا نے شاہ ولی اللہؒ کی دلی کے علمی وروحانی وقار کو سنبھال رکھا تھا، راجدھانی دلی کی علمی شان اور دینی آبرو مولانا کے دم سے قائم تھی''۔[الجمعیۃ، ۷/نومبر ۱۹۷۵ء]

مولانا مفتی محمد مکرم احمد صاحب شاہی امام مسجد فتح پوری نے فرمایا:

''میں علم کی اس عظیم شخصیت کو خراج عقیدت پیش کرتا ہوں، جن کی سب سے بڑی خدمت ان کے تصنیفی کارنامے اور سماجی خدمات ہیں''۔

الجمعیۃ ۲۴/۲۵/ اکتوبر ۱۹۷۵ء کے ادارتی کالم میں حضرت مولانا محمد میاں صاحب کے متنوع کارناموں کا انتہائی جلی حروف میں تذکرہ ہے، ان کی حیات کے مختلف گوشوں کو سامنے لاکر ان کی زریں خدمات کو سراہا گیا ہے:

''منها خلقناكم وفيها نعيدكم ومنها نخرجكم تارة أخرىٰ ان کلمات کی گونج میں آج اس جسد خاکی کو سپرد آغوش رحمت کردیا گیا، جو کل تک حضرت مولانا سید محمد میاں شیخ الحدیث مدرسہ امینیہ وسابق ناظم جمعیۃ علماء ہند کے نام سے پکارا جاتا تھا، جو علماء کے شاندار ماضی کا مؤلف، تحریک شیخ الہند کا مرتب اور علماء کی تحریک حریت

کا زندہ انسائیکلوپیڈیا تھا،جس نے جمعیۃ علماء اور کانگریس کے پلیٹ فارم سے ''ہندوستان چھوڑو'' تحریک میں بڑا اہم کردار ادا کیا تھا،مرادآباد سے اس تحریک کے دوران جب کہ جمعیۃ علماء اور کانگریس دونوں کو خلاف قانون قرار دیا گیا تھا،جمعیۃ کے نویں ڈکٹیٹر کی حیثیت سے ایک خلاف قانون جلوس کی قیادت کرتے ہوئے اس طرح گرفتار ہوا تھا کہ دائیں کاندھے پر جمعیۃ علماء کا پرچم اور بائیں کاندھے پر کانگریس کا جھنڈا اور گردن میں قرآن کریم آویزاں تھا اور سر پر والدین کی غائبانہ دعائیں سایہ افگن تھیں۔

مولانا مرحوم تحریک آزادی کے سلسلے میں پانچ مرتبہ گرفتار ہوئے،چار مرتبہ مرادآباد سے اور ایک مرتبہ دلی سے۔''ہندوستان چھوڑو'' تحریک کے سلسلے میں شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی،مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی،حافظ محمد ابراہیم رحمہم اللہ کو گرفتار کر کے اول مرادآباد پھر بریلی جیل میں رکھا گیا تو حضرت مولانا مرحوم بھی ان کے ہمراہ تھے۔گرفتاری کی مدت دو سال تھی۔

مولانا مرحوم نے تقریباً ۳۵/برس تک ضلع،صوبہ اور آل انڈیا جمعیۃ علماء کی نظامت کے فرائض انجام دیئے،تقریباً ایک برس ناظم عمومی رہے،اس وقت مرحوم جمعیۃ علماء کے نائب صدر تھے۔آزادی سے پہلے اور بعد انھوں نے ملک اور ملت کی جو خدمات انجام دیں،ان کے تذکرہ کے بغیر آزادی کی تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی۔تقسیم وطن کی تباہ کن تحریک کا مقابلہ کرنے والوں میں آپ پیش پیش رہے اور اس کے بعد کے انتہائی نامساعد حالات کا بڑی جرأت واستقلال کے ساتھ سامنا کیا اور آزمائش کے اس کٹھن دور میں شیخ الاسلام اور مجاہد ملت کے دست راست بنے رہے اور تقسیم کار کے اصول کے تحت الیکشن سے علاحدہ رہ کر ملت اور امت کی دینی و مذہبی،تدریسی و تعلیمی خدمات میں مصروف رہے۔۱۹۵۴ء اور ۱۹۵۷ء میں آپ کو لوک سبھا کی سیٹیں پیش کی گئیں؛لیکن آپ نے قبول نہ کیں۔

بنیادی دینی،تعلیمی تحریک کے تحت مولانا مرحوم نے مشرقی پنجاب،ہماچل پردیش اور راجستھان ومہاراشٹر کے غیر محفوظ علاقوں میں پہنچ کر فتنۂ ارتداد کا مقابلہ کیا،دینی

تعلیم کے مراکز قائم کیے اور مساجد کے خاموش دالانوں اور میناروں کو پھر اذان و تکبیر و تہلیل کے نعروں سے گونجا دیا۔ آپ نے دینی تعلیم کا نصاب ترتیب دے کر وقت کی ایک بڑی ضرورت کو پورا کیا۔

حضرت مولانا کی ادبی، سیاسی، مذہبی اور تاریخی شعبوں میں بے شمار تصانیف ہیں۔ علماء اور مسلمانوں نے آزادی کے لیے جو قربانیاں اور جو خدمات انجام دی ہیں، ان کے بارے میں مرحوم کو اتھارٹی اور سند تسلیم کیا جاتا تھا۔

جمعیۃ علماء کے دوسرے اکابر کی طرح آپ اس وقت سرگرم رہے، جب کہ دوسرے لوگ پناہ گاہوں میں چھپے بیٹھے تھے اور سانس لیتے ہوئے بھی ڈرتے تھے۔ حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب نے تقریباً ۶۰ر برس تک جس استقلال و استقامت اور جس خاموشی اور یکسوئی کے ساتھ نام و نمود سے دور رہ کر اپنے وطن کی اور ملت کی خدمت کی، اس کا احاطہ کرنے کے لیے ویسا ہی صاحبِ قلم چاہیے جو آج زیرِ خاک ہے۔''

۲۷ر اکتوبر کے الجمعیۃ کے شمارے میں اس وقت کے مدیر محترم جناب ناز انصاری صاحب نے بڑی تفصیل سے مولانا کا ذکر خیر کیا ہے اور اپنے اداریے کا عنوان ''**سید القوم خادمهم**'' قائم کیا۔ اس عنوان کے پیچھے ایک بہت ہی حیرت انگیز واقعہ ہے۔ ایسے کتنے لوگ آپ کو مل جائیں گے جو اپنے ناموں کے سابقہ اور لاحقہ پر بڑی توجہ دیتے ہیں اور بوقت ضرورت اپنے لوگوں کو متوجہ بھی کرتے ہیں۔ مولانا مرحوم کی کیفیت کیا تھی؟ اس سلسلے میں آپ ناز انصاری صاحب کی مایہ ناز تحریر پڑھیں:

''الجمعیۃ کے آرڈر بک میں یہ آرڈر محفوظ ہوگا، جس میں حضرت مولانا سید محمد میاںؒ نے بحیثیت نگراں اخبار الجمعیۃ یہ تحریر فرمایا تھا کہ میرے نام کے ساتھ ''سید ملت'' نہ لکھا جائے، صرف حضرت مولانا حسین احمد مدنی علیہ الرحمہ کے نام کے ساتھ ''شیخ الاسلام'' اور حضرت مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب کے نام کے ساتھ ''مجاہد ملت'' لکھا جائے۔

یہ ۱۹۴۹ء کا واقعہ ہے اور آج ۱۹۷۵ء ہے، وہ ہم سے جدا ہو گئے، مجھے ان کے حکم کا آج بھی پابند ہونا چاہیے؛ لیکن آج میرا دل حضرت مولانا کو ''سید ملت'' کے سوا کسی

اور نام سے پکارنے کو تیار نہیں ہے؛ اسی لیے میں اس عربی مقولہ کا سہارا لے رہا ہوں:

''سَیِّدُ الْقَوْمِ خَادِمُھُمْ''

انھوں نے جس طرح نام ونمود کی کسی خواہش کے بغیر اپنی زندگی کے کم وبیش ۵۰ ر برس ملک وملت کی خدمت میں گزارے، اس کے بعد کون ہے جو اس قول کی صداقت سے انکار کرے گا! یہ مولانا کی عالی ظرفی تھی، اپنے اسلاف کا ادب واحترام تھا کہ انھوں نے یہ حکم صادر فرمایا، ورنہ امر واقعہ یہ ہے کہ وہ صرف نام یا ذات کے ''سید'' نہیں تھے، فی الحقیقت ''سید القوم'' تھے۔ وہ ہوں یا نہ ہوں، ان کے مرتبہ شناس ہمیشہ یہی سمجھیں گے''۔

مولانا محمد میاں صاحب اور ان کے جیسے علمائے دین، اکابرین ملت اور مشائخ امت ہر طبقے میں مقبول ومحبوب، ہر ایک کی نگاہ میں ان کی قدر ومنزلت، تمام لوگوں کے دلوں میں ان کی عزت اور وقار واحترام کیوں ہے؟ اس پہلو پر محترم ناؔز انصاری صاحب نے اپنے ناز وانداز اور پیرایۂ بیان کی خوبی کے ساتھ روشنی ڈالی ہے:

''مولانا ایک صالح بزرگ تھے، بہت بڑے عابد تھے، خدا پرست تھے، مومن تھے، عالم باعمل تھے، ہوا کریں! یہ ساری خوبیاں ان کی عاقبت کا توشہ ہیں اور اُس عظیم سفر کے لیے زادِراہ جو انھوں نے اب شروع کیا ہے۔ قوم وملت کو اس سے کیا مل سکتا ہے؟ قوم وملت کے ایک ''خود غرض جز'' کی حیثیت سے اگر میں بھی اسی پہلو سے غور کرتا ہوں تو میں قارئین سے معذرت خواہ ہوں۔

مولانا محمد میاں صاحب کے چار فرزند ہیں اور یہ باور کرنے کے لیے وجوہ موجود ہیں کہ وہ اپنے نیک نام والد محترم کی اعلیٰ روایات اور نیک نامیوں کو چار چاند لگائیں گے؛ لیکن تاریخ وسیاست کے ایک ادنیٰ طالب علم اور علمی دنیا کے ایک خادم کی حیثیت سے میرے نزدیک جس چیز سے ہندوستان کی تاریخ میں، ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ میں، ہماری جنگ آزادی کی تاریخ میں، ہندوستان کے علمی اور تاریخی سرمایہ کی تاریخ میں، ہندوستانی علماء بالخصوص جمعیۃ علماء ہند کی تاریخ میں، ان کا نام زندہ رہے گا

اور علمی و تحقیقی کام کرنے والوں سے خراج حاصل کرتا رہے گا، دینی درس وتدریس کے حلقوں میں، دینی علوم وفنون کے میدان میں، دینی فکر ونظر رکھنے والوں اور دینی تصنیف وتالیف کا کام کرنے والوں میں، مجاہدین آزادی کی صف میں، مؤرخوں کے حلقے میں، تحقیقی کام کرنے والوں میں، برصغیر ہندوپاک اور اسلامی دنیا میں ان کا نام عزت واحترام سے لیا جائے گا اور ان کا نام ہمیشہ ہمیشہ زندہ وتابندہ رکھنے والی-ان کی حقیقی اولاد اور لخت ہائے جگر- وہ گراں قدر کتابیں ہیں، جوانھوں نے آنے والی نسلوں کے لیے چھوڑی ہیں۔ یہ مولانا کی سب سے بڑی اور تاریخی خدمت ہے۔ اگر وہ اور کچھ بھی نہ کرتے تو یہ اور صرف یہی کام ایسا ہے کہ جو دوسرے لوگوں کے ہزاروں کاموں پر بھاری اور مولانا کو زندہ رکھنے والا ہے''۔

کسی بھی تنظیم اور تحریک سے منسلک شخصیت کے ہر پہلو پر گہری نظر ان کے ماتحت کام کرنے والوں کی ہوا کرتی ہے۔ مسلسل رابطہ اور بار بار کے معاملات کے نتیجے میں اُس فرد بشر کی خوبیاں اور خامیاں عیاں ہوجاتی ہیں اور اُس جمعیۃ یا جماعت یا ادارے کے تعلق سے اُس کی نیک نیتی اور خلوص، کامیابی اور ناکامی ظاہر ہوجاتی ہے۔ نازؔ انصاری صاحب کی نظر میں مولانا مرحوم کا کیا مقام تھا؟ اور جمعیۃ علماء ہند کی مشکل گھڑی میں ان کا کیا کردار تھا؟ مجاہد ملتؒ کے ہمراہ آزادیِ ہند کے بعد پیش آنے والے دشوار گذار مرحلے سے وہ کس محنت و مشقت اور مجاہدہ کے ساتھ گزر کر جمعیۃ علماء ہند کو بقاء واستحکام عطا کیا؟ اس کے لیے آپ ذیل کا یہ اقتباس غور سے پڑھیں:

''دلی آنے کے بعد حضرت مولانا محمد میاںؒ سے میری پہلی باقاعدہ ملاقات یکم نومبر ۱۹۴۸ء کو اس وقت ہوئی، جب میں نے ''روزنامہ انصاری'' چھوڑ کر ادارہ الجمعیۃ سے وابستہ ہونے کے سلسلے میں گفتگو کی۔ حضرت مولانا اس وقت ناظم جمعیۃ علماء ہند کے علاوہ ''اخبار الجمعیۃ'' کے بھی نگراں تھے۔

الجمعیۃ میں آنے کے بعد مولانا مرحوم کو قریب سے دیکھنے اور بار بار پرکھنے کا موقع ملا۔ ''پرکھنا'' میں نے ادائیگیِ مفہوم کے لیے استعمال کیا ہے؛ ورنہ ''چہ نسبت خاک را

باعالم پاک''۔ یہ انتہائی پُرآشوب دور تھا اور اس وقت جمعیۃ علماء ہند کے کندھوں پر بار آپڑا تھا، خصوصاً دلی جس دور سے گزر رہی تھی، بلاشبہ مجاہد ملت ؒ نے اس کو بہادری اور اولوالعزمی کے ساتھ اٹھایا؛ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ ناظم کی حیثیت میں اگر دفتر کے اندر اور جماعتی تنظیم کے معاملات اور ان کا بار حضرت مولانا محمد میاں ؒ کے کندھوں پر نہ ہوتا تو مجاہد ملت ؒ کے راستہ کی دشواریاں کئی گنا ہوتیں، مولانا محمد میاں ایسے ستون تھے جس پر یہ عمارت قائم رہی۔

۱۹۴۷ء کے بعد کی جمعیۃ علماء کی بقایا جمعیۃ علماء کی حیات نو یا تعمیر نو میں جن لوگوں کی محنت اور کوششیں شامل ہیں، ان میں سے ایک نمایاں نام حضرت مولانا محمد میاں ؒ کا اسم گرامی بھی ہے۔ اس زمانے میں جب جمعیۃ علماء کی ممبر سازی ہوئی تو وہ کئی لاکھ تک پہنچ گئی تھی اور اس پر سردار پٹیل اور اس وقت کی وزارت داخلہ کے ایوانوں میں زبردست زلزلہ پیدا ہوگیا تھا؛ لیکن اتنی بڑی تعداد میں جمعیۃ علماء کی ممبر سازی جہاں جمعیۃ علماء کے ماضی اور اس کی اس وقت کی زبردست اور بے لوث خدمات اور مجاہد ملت کی مساعیِ جمیلہ کا نتیجہ تھیں، وہاں یہ اعتراف نہ کرنا ناسپاسی ہوگی کہ وہ حضرت مولانا محمد میاں کی تنظیمی اور جماعت کو آرگنائز کرنے کی بے پناہ صلاحیتوں کا بھی نتیجہ تھی''۔

حضرت مولانا محمد میاں صاحب اس سلسلۃ الذہب کی نمایاں کڑی تھے، جو توحید خداوندی، رسالت محمدی، عظمت صحابہ اور احترام اکابر کو مضبوطی کے ساتھ تھام کر سرزمین ہند میں مذہب اسلام کی محافظ اور اس کی حقانیت وابدیت اور آفاقیت وعالمیت کی پاسبان وامین ہے۔ اسلامیانِ ہند کے مذہبی تشخص کے تحفظ کے سلسلے میں ان کی بے لوث قربانیاں اور ان کی دینی غیرت وحمیت بے نظیر ہے۔ مولانا مرحوم کس قدر خوش نصیب ہیں کہ انھیں سنت صدیقی کے احیا کا موقع ملا اور وہ اس میں کامیاب ہوئے:

''حضرت مولانا میں دینی حمیت اور خدا کی اس سرزمین پر خدا کی وحدانیت اور اسلامی عظمت وسربلندی کے لیے کس قدر جوش وجذبہ تھا، اس کا اندازہ ارتداد کے واقعات پر ان کے ردعمل سے خاص طور پر ہوا، جو اس دور میں سننے میں آئے۔

ان میں ایک گجرات کے کسی علاقے کا تھا، جس کا نام اس وقت مجھے یاد نہیں (بھڑوچ اور سورت کے علاقے ہیں: معروفی) وہاں مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد مرتد ہوگئی تھی، حضرت مولانا وہاں تشریف لے گئے اور الحمدللہ اپنے مشن میں کامیاب رہے۔

دوسرا علاقہ میوات کا تھا، وہاں بھی جمعیۃ علماء نے اس سلسلے میں بڑی خدمت کی ہے اور مولانا اس میں بھی پوری طرح سرگرم رہے۔

تیسری جگہ ہماچل پردیش کا علاقہ تھا، اس علاقے کی کیفیت اور وہاں کے دشوار گذار اور خطرناک راستوں کا حال مجھے پچھلے دنوں مولانا خلیل الرحمٰن لدھیانوی نے ان الفاظ کے ساتھ سنایا کہ- ''میں حیرت میں رہ گیا اور عش عش کر اٹھا کہ میرے جیسے صحت مند پنجابی کے لیے اس علاقہ کا دورہ مشکل ہو رہا ہے اور مولانا محمد میاں صاحب نے بڑھاپے میں (مولانا کی صحت اور جسمانی ساخت بھی ملحوظ رہے) کس طرح ان دشوار گذار راستوں اور پُرخطر ماحول میں (۴۷ء کے بعد کا ماحول مراد ہے) سفر کیا ہوگا''- حقیقت یہ ہے کہ یہ ان کی دینی حمیت اور مسلمانوں کو ارتداد سے بچانے کا جذبہ تھا، جس نے ان میں اس سفر کا حوصلہ، ہمت اور جذبہ پیدا کر دیا تھا''۔

حضرت مولانا محمد میاں صاحب نے متعدد علوم وفنون میں کارآمد کتابیں تحریر فرمائی ہیں، جن کو دستاویزی حیثیت اور بلند معیاری مقام حاصل ہے۔ ان کی تصانیف وتالیفات پر، ان کے انداز تحریر پر اور سیاسی وسماجی شور وہنگامے کے ساتھ علمی وتصنیفی کاموں پر- جس کے لیے سکون واطمینان اور یکسوئی مطلوب ہے، دین وسیاست کا باہم ہونا کارِشیشہ وآہن ہے، جو جمعیۃ علماء ہند کا شعار ہے اور اس کے اکابرین کا طرۂ امتیاز بھی- حضرات علمائے کرام کی گراں قدر آرا موجود ہیں؛ حتیٰ کہ حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی نور اللہ مرقدہٗ بطور مزاح انھیں ''حیوان کاتب'' کہا کرتے تھے۔ لیکن ان کے بیانات کی کیا کیفیت تھی؟ کس انداز میں وہ عوامی اجتماعات میں خطاب کیا کرتے تھے؟ علمی، تصنیفی، سیاسی اور سماجی ہر میدان میں بلند قامت اس ہستی کا دوسروں کے ساتھ کیا رویہ تھا؟ دوسروں کی ذات کا اور ان کے رائے اور مشوروں کا کس درجہ احترام تھا؟ یہ حصہ بھی ان کی بلند مرتبہ شخصیت کا

ایک اہم جزو ہے، اداریہ کا یہ حصہ کس قدر اہم ہے:

''مولانا محمد میاں صاحب شعلہ بار اور دھواں دھار قسم کے مقرر نہیں تھے، بہت مدھم سروں میں تقریر فرماتے تھے، دھاڑتے نہیں تھے، وہ عوامی اجتماعات کے سید عطاء اللہ شاہ بخاری، سحبان الہند حضرت مولانا احمد سعید جیسے سحر البیان مقرر نہیں تھے؛ لیکن ان کی تقریر میں منطق اور دلائل ہوتے تھے۔ مواقع کے اعتبار سے ایک دو بار میں نے ان کی تقاریر میں بھی جوش پایا ہے۔ جمعیۃ کے اجلاس میں انھیں قراردادوں کو پائلٹ کرتے دیکھا ہے۔ انھوں نے معقول ترمیمات، اعتراضات اور تجاویز کو قبول کرنے سے کبھی گریز نہیں کیا اور اپنی ہی بات منوانے کی کوشش نہیں کی؛ بلکہ جمعیۃ مرکزیہ کے ایک اجلاس میں جب میں نے اپنی قرارداد کو واپس لینے سے انکار کیا اور تقسیم آرا پر اصرار کیا تو میں نے دیکھا: ان کی پیشانی پر ذرہ برابر شکن نہیں آئی، اس سے پہلے حالانکہ وہ میری ایک آدھ ترمیم قبول کر چکے تھے؛ لیکن پھر بھی انھیں اس بات کا ملال نہیں ہوا کہ میں نے ان کی بات کیوں نہیں مانی''۔ [الجمعیۃ ۲۷/اکتوبر ۱۹۷۵ء]

حضرت مولانا انظر شاہ کشمیریؒ نے اپنے مخصوص لہجے اور البیلے انداز میں، مولانا مرحوم کا نقشہ کھینچا ہے، ان کی ذاتی خصوصیات اور تصانیف کی خوبیوں کا تذکرہ کیا ہے:

''ایک منحنی جسم، چہرہ پر رونقِ تقویٰ، آنکھوں میں شبابی وشادابی، سر پر دو پلی ٹوپی، لمبا کرتا، ہاتھ میں ایک چھوٹا سا تولیہ، آنکھوں پر چشمہ، جو حقائق کو گہری نظر سے دیکھنے کا عادی بن چکا تھا، ہاتھ میں قلم، سامنے کاغذات کا پلندہ، سب سے بے نیاز اور سب کا نیازمند نظر آتا۔

مرحوم کی حیات میں شفقتِ برادرانہ کچھ اس انداز میں نصیب ہوئی کہ ہر مشکل کا حل، ہر اُلجھن سے نجات، ہر پریشانی کا مداوا اور ہر ابتلاء سے گلوخلاصی چٹکیا بجنے میں حاصل ہوتیں۔ بیچارے مولانا محمد میاں مرحوم یوں بھی خاموش، زاویہ پسند، عزلت نشیں اور مرنجاں مرنج قسم کے آدمی تھے، نہ دربارداری، نہ رونقِ مجلس نہ کسی کو ان کی ضرورت نہ وہ کسی کی ضرورت رکھتے۔ دیوبند آتے، مہمان خانہ میں قیام ہوتا، شوریٰ میں شرکت فرماتے اور یہیں کے کتب خانہ سے مستعار کتابیں لے کر مطالعہ کرتے۔ یہ تھیں ان کی

مصروفیات۔ کبھی کبھار دار العلوم کی مسجد میں مل جاتے تو خود ہی سراپائے نیاز بن کر مصافحہ کرتے، خیر و عافیت پوچھتے۔ اللہ اللہ باقی خیر صلا۔

مرحوم کی تصانیف، مضمون کی زرخیزی، عنوانات کی جاذبیت، ذیلی سرخیوں کی شوکت، فتویٰ اور تقویٰ، علم و عمل، ورع و پرہیزگاری، سیاسی دلچسپیاں، قید و بند کے آلام، شاندار کارناموں پر بہت کچھ لکھا جائے گا؛ مگر مجھ بے بضاعت کو تو ان کی زندگی کے اس نادر باب نے گہرا تأثر دیا کہ وہ مدرسہ شاہی سے نکلے، جمعیۃ علماء کی نظامت تک پہنچے پھر نیابت صدارت دہلی، وہاں کے اُونچے حلقوں میں پذیرائی اور دوڑتی بھاگتی دنیا سے رابطہ، یہ ممبرانِ پارلیمنٹ، وہ وزیر باتدبیر، یہ امیر طناز، وہ رئیس کج کلاہ، مگر مولانا محمد میاں مرحوم کی کھدر کی شیروانی، کھادی کا لمبا کرتہ، شرعی پاجامہ، دھوڑی کا جوتہ، سر پر دو پلی ٹوپی، ہاتھ کا تولیہ، چھری کی ڈاڑھی، مسجد کی نمازیں، آہِ سحر گاہی، شب بیداری، جلوتوں میں خلوت، حدیث کا درس، فتوے کے لیے قلم، جیب کی تسبیح نہ چھوٹنا تھی اور نہ چھوٹی۔ کہنے کو تو بات معمولی ہے، لیکن اپنے ڈگر پر یہ استواری اصل ایمان ہے۔ اور یہی ان کی زندگی کا وہ روشن باب تھا، جس کی یادیں زمزمۂ افلاک میں ان شاء اللہ ہمیشہ باقی رہیں گی۔''

مولانا سعید احمد اکبرآبادی صاحب اپنے شاندار ادبی انداز میں مولانا محمد میاں صاحب کے کمالات و محاسن اور لکھنے کی زبردست قوت کے سلسلے میں تحریر فرماتے ہیں:

مولانا گوناگوں علمی و عملی کمالات کے- جو ایک شخص میں شاذ و نادر ہی جمع ہوتے ہیں- جامع تھے۔ ایک طرف وہ بلند پایہ عالم، فقیہ و محدث تھے اور دوسری طرف جنگِ حریت و آزادی کے نہایت بہادر اور بے خوف سپاہی۔ ایک طرف مؤرخ و محقق اور کثیر التصانیف مصنف اور دوسری جانب اعلیٰ دفتری اور تنظیمی صلاحیتوں کے مالک۔ ایک طرف عابد شب زندہ دار اور دوسری طرف نہایت متواضع اور خلیق و ملنسار، بے لوث و بے غرض، نام و نمود سے دُور، شہرت و جاہ طلبی سے نفور، نرم دمِ گفتار اور گرم بوقتِ پیکار۔ لکھنے پر مولانا کو اس درجہ قدرت تھی کہ جب چاہتے بے تکلف لکھتے اور لکھتے ہی چلے

جاتے تھے، قلم انہیں اس درجہ عزیز تھا کہ وفات سے دو دن پہلے بھی وہ ایک مضمون لکھنے کا ارادہ کر رہے تھے۔ درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کی ہمہ گیر مصروفیتوں، جسمانی اسقام و عوارض اور کبرسن کے باعث ضعف و اضمحلال کے باوجود کیا مجال کہ ان کے معمولات، عبادت و اوراد و وظائف میں کوئی فرق آجائے۔ وہ چلے گئے اور نئی نسل کے لیے اخلاص و عمل، جد و جہد اور اعلیٰ اقدار حیات کے لیے ہمہ تن سعی و کوشش کی ایک مثال قائم کر گئے۔''

فطری ادیب، قادر الکلام مترجم، کامیاب صحافی، باکمال انشاء پرداز، خالص فصیح عربی اور عمدہ سلیس اردو لکھنے والے، ہر دو زبان میں متعدد کتابوں کے مصنف، مجلّہ ''البعث الاسلامی''، لکھنؤ کے مدیر، استاذ محمد الحسنی نور اللہ مرقدہٗ کی تعزیتی تحریر مع ترجمہ پیش ہے:

"فجع المسلمون في الهند بوفاة فضيلة الشيخ محمد ميان في شهر شوال ١٣٩٥هـ رئيس قسم الحديث الشريف والإفتاء بالمدرسة الأمينية بدهلي، وكانت وفاته خسارة كبيرة لهذه البلاد في جميع مجالات الإسلامية، فإنا لله وإنا إليه راجعون، وكان الفقيد خير مثال للعالم المعاصر الذي يجمع باتزان وقصد بين العلم والدين والتأليف والسياسة والعبادة، له مؤلفات وأبحاث قيمة باللغة الأردية تعالج المواضيع العلمية والدينية والسياسية والاقتصادية والفقهية؛ فكتابه "علماء الهند وماضيهم الزاهر" نال من القبول والإعجاب من جميع الأوساط العلمية والسياسية، مايزيد في قيمته وأهميته، وكذلك كتابه "محمد رسول الله صلى الله عليه وسلم" و"المشكلات السياسية والاقتصادية وحلولها في ضوء تعاليم الإسلام" وغير ذلك من الكتب يحمل أهمية موضوعية.

وقد كان شديد الحرص على الحضور في المهرجان التعليمي لندوة العلماء، ولكن الأجل لم يمهله، وقد كتب في ذلك كتابًا إلى

سماحة الشيخ الندوي، إلا أنه لم يتمكن من إتمامه، ووافاه أجله -رحمه الله رحمة واسعة- وأنزل عليه شآبيب رضوانه، وألهم أهله الصبر والسلوان. [البعث الإسلامي لكناؤ ج:۲۰، ص:۲۹۹، ۳۰۰]

ترجمہ:''شوال ۱۳۹۵ھ میں دہلی میں مدرسہ امینیہ کے شعبۂ حدیث شریف اور افتاء کے صدر حضرت مولانا سید محمد میاں کی وفات سے ہندوستان کے مسلمان دوچار ہوئے۔آپ کی وفات اس ملک کے تمام اسلامی حلقوں کے لیے ایک بڑا خسارہ ہے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

مرحوم عصر حاضر کے ایک بہترین عالم تھے، جنھوں نے توازن اور میانہ روی کے ساتھ علم، دین، تالیف اور سیاست وعبادت کے درمیان جامعیت قائم کی۔مرحوم کی اردو میں بہت سی تالیفات اور ایسے قیمتی تحقیقی مقالات ہیں، جو علمی، دینی، سیاسی، اقتصادی اور فقہی موضوعات پر مشتمل ہیں؛ چنانچہ آپ کی کتاب ''علماء ہند کا شاندار ماضی'' نے تمام علمی اور سیاسی حلقوں میں قبولیت حاصل کی، جس کی قیمت اور اہمیت میں مزید اضافہ ہو رہا ہے، اسی طرح ان کی کتاب ''محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم'' اور ''دور حاضر کے سیاسی واقتصادی مسائل اور اسلامی تعلیمات وارشاد'' اور اس کے علاوہ دیگر کتابیں بھی اہمیت کی حامل ہیں۔

مرحوم ندوۃ العلماء کے جشن تعلیمی میں شرکت کے بڑے مشتاق تھے، لیکن وقت موعود نے ان کو مہلت نہ دی، اس سلسلہ میں آپ نے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کو ایک خط لکھا، لیکن اس کو پورا نہ کر پائے تھے کہ وقت مقررہ آپہنچا۔ رحمہ اللہ [تذکرہ مولانا سید محمد میاں، ص:۱۰۹،۱۰۸]

دارالمصنفین اعظم گڑھ کا ترجمان ''معارف''، علمی وادبی اور تاریخی دنیا کا بڑا وقیع ماہوار علمی رسالہ ہے۔اس کی اپنی نمایاں شناخت اور خصوصی پہچان ہے۔ابتدا ہی سے اس نے اپنا جو بلند معیار اور اونچا نصب العین مقرر کیا، اس پر اب تک قائم ودائم ہے۔مجلّات و رسائل عام طور پر اپنے مدیر کی زندگی کے مرہونِ منت رہتے ہیں، مدیر کی موت سے رسالہ

بھی دم توڑ دیتا ہے؛ لیکن بزم شبلی وسلیمان کا یہ ماہتاب اپنی اسی آب وتاب کے ساتھ اب بھی آسمان علم وادب پر روشن ہے۔ اس کے نومبر ۱۹۷۵ء کے شمارے میں مرتب رسالہ مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی نے شذرات کے کالم میں تحریر فرمایا:

''مولانا محمد میاں صاحب سے قارئین ''معارف'' بخوبی واقف ہیں، ان کی علمی و عملی خدمات محتاج تعارف نہیں۔ وہ ''در کفے جام شریعت در کفے سندان عشق'' کے قائل تھے۔ انھوں نے علمی شغف اور قومی خدمت کو اپنی زندگی میں سمو رکھا تھا۔ مطالعہ و تحقیق اور تصنیف وتالیف کے لیے سکون قلب اور فراغ خاطر ضروری سمجھا جاتا ہے؛ لیکن محمد میاں نے سیاست کے شور ہنگاموں اور قید و بند کی پریشانیوں میں یہ منزل طے کی ہے۔ انھوں نے نہ کبھی دار ورسن کا خوف کیا نہ آبلہ پائی کا گلہ، وہ مطالعہ میں مصروف ہوتے یا درس وتدریس میں منہمک یا خاندانی مشاغل میں مشغول، جیسے ہی جنگ آزادی کا بگل بجتا میدان میں نکل آتے اور اس راہ کی ہر پریشانی خندہ پیشانی سے برداشت کرتے۔ وہ زندگی بھر اس روش پر چلتے رہے، سیاست کے ساتھ تقویٰ پر عمل بہت مشکل ہے؛ مگر انھوں نے سیاسی زندگی کو پاکیزگی سے کبھی جدا نہیں ہونے دیا۔ ان کی خدمت بے لوث اور ان کی سیرت بے داغ تھی۔ جماعتی زندگی میں کشمکش عام ہے، ہر شخص سیادت کا طالب ہوتا ہے؛ لیکن ان کا دامن اس عیب سے پاک تھا۔ انھوں نے اپنے مفاد پر جماعت کے مفاد کو ہمیشہ مقدم رکھا اور اس راہِ ایثار میں ہر پریشانی کو خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کرتے رہے۔

افسوس ہے کہ علم وعمل اور ایثار وخدمت کا یہ مجسمہ دنیا سے رخصت ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ انھیں اپنی رحمت سے سرفراز فرمائے اور دوسروں کو ان کی پاکیزہ اور پُرخلوص زندگی کو نمونۂ عمل بنانے کی توفیق عطا فرمائے''۔ [معارف اعظم گڑھ، نومبر ۱۹۷۵ء]

مولانا سید محمد میاںؒ کے انتقال کی خبر سن کر ہر شخص مغموم ہوا۔ غازی پور جمعیۃ علماء کے کارکنوں نے ایک تعزیتی جلسہ میں مولانا مرحوم کو خراج عقیدت پیش کیا اور ان کے اوصاف وکمالات پر روشنی ڈالی۔ مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی استاذ مدرسہ دینیہ غازی پور

نے اپنے بیان میں فرمایا:

''حضرت مولانا محمد میاں صاحب کی رحلت ملت اسلامیہ کا زبردست نقصان ہے، وہ صرف ایک عالم ہی نہیں ایک بڑے مؤرخ بھی تھے، ان کی تصنیفات اور علمی تحقیقات ان کو نامور مصنفین کی صف میں کھڑا کرتی ہے''۔[الجمعیۃ ا/نومبر ۱۹۷۵ء]

گلستان تاریخ وتذکرہ کے گل سرسبد، دورِحاضر کے مشہور مصنف، اسلامی مؤرخ، ہندوستان کی اسلامی تاریخ پر مستند شخصیت، مولانا محمد میاں صاحب کے شاگرد رشید اور تاریخ نویسی میں ان کے سچے جانشین حضرت مولانا قاضی اطہر صاحب مبارکپوری نے اپنے رسالہ ''البلاغ''، میں انتقال کے بعد مختصر مگر بہت ہی جامع تأثرات ثبت فرمائے:

''افسوس کہ ایک ماہ کے اندر ہندوستان کے دو زبردست عالم و بزرگ اور ساتھی نے انتقال کیا۔ حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب ۱۶/شوال ۱۳۹۵ھ مطابق ۲۲/اکتوبر ۱۹۷۵ء بروز چہارشنبہ دہلی میں اور حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب سنبھلی نومبر ۱۹۷۵ء کے آخر میں اپنے وطن سنبھل میں فوت ہوئے۔ رحمہما اللہ رحمۃً واسعۃً وغفر لہما دونوں حضرات راقم کے حدیث کے استاد تھے، اور دونوں ہی بزرگ جمعیۃ علماء ہند کے بنیادی اراکین، جامعہ قاسمیہ مرادآباد کے مدرس اور ملکی وقومی رہنما تھے اور متعدد بار اس راہ میں قید و بند سے دوچار ہوئے۔

مولانا سید محمد میاں صاحب اپنے علم وفضل، اخلاص و ایثار اور خدمت میں سلف صالحین کی سچی یادگار تھے۔ نام ونمود اور شہرت سے کوسوں دور رہ کر علمی، دینی، سیاسی اور مختلف قسم کی خدمات انجام دیں۔ زندگی بھر درس وتدریس، تصنیف وتالیف اور علم و آگہی میں لگے رہے۔ ایک زمانہ تک جامعہ قاسمیہ مرادآباد میں حدیث اور عربی ادب کے مدرس رہے۔ آخر میں جمعیۃ علمائے ہند کے ناظم، اس کے بعد مدرسہ امینیہ دہلی کے صدر مدرس اور مفتی ہوئے، اسی حال میں وصال فرمایا اور ہر دور میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری رکھا، حتیٰ کہ آخر دنوں میں بھی دو تین کتابیں زیر تصنیف تھیں۔ ان کی تصانیف میں ''علمائے ہند کا شاندار ماضی''، ''علمائے حق''، ''سیرت رسول''،

’’تاریخِ اسلام‘‘اور’’دینی تعلیم کے رسالے‘‘بہت مشہور ہیں۔راقم کے حال پر بے حد مہربان تھے اور میری ہر کتاب پر تشجیع فرماتے تھے۔آخری ملاقات ۲۹؍شعبان ۱۳۹۵ھ کو ان کے مکان پر ہوئی۔میں نے اپنی نئی کتاب’’خلافت امویہ اور ہندوستان‘‘پیش کی تو مولانا نے اپنی جدید کتاب’’تحریک شیخ الہند‘‘عنایت فرمائی۔ اس وقت بھی بے حد کمزور اور چلنے پھرنے سے تقریباً معذور تھے۔میں نے عرض کیا کہ مولانا! کیا اس عالم میں تصنیف وتالیف کا کچھ سلسلہ جاری ہے؟ فرمایا: ہاں! تین کتابیں زیرِ کتابت ہیں۔خلوص وایثار، بے نفسی، خیرخواہی اور بے لوث خدمت میں مولانا اپنی مثال آپ تھے۔انتقال کے وقت ۷۲؍سال کی عمر تھی‘‘۔[البلاغ دسمبر ۱۹۷۵ء]

مولانا رضا احمد انصاری قاسمی ناظم جمعیۃ علماء بھاگلپور نے بہت ہی اچھے انداز میں مولانا مرحوم کو خراج عقیدت پیش کیا۔وہ لکھتے ہیں:

’’حضرت شیخ الاسلام کے معتمد خاص ورفیق زنداں، مجاہد ملت کے دست راست، مخلص رفیق کار، جمعیۃ علماء ہند کے دماغ سید ملت حضرت مولانا محمد میاںؒ کی جدائی کا غم عرصہ تک نہ مٹ سکے گا۔ایسے دورِ انحطاط میں آپ کی علمی شخصیت اسلاف کی یاد تازہ کرتی تھی، آپ کی ذات والا صفات ہم خدام جمعیۃ وابناء دارالعلوم دیوبند کے لیے بہترین مشعل راہ تھی۔آپ نے جس خاموشی ویکسوئی کے ساتھ نصف صدی تک ولی اللہی قافلہ کی رہنمائی اور ملت کی بے لوث خدمت کی، علم حدیث کی اشاعت کا ملی فریضہ انجام دیا، وہ ہمیشہ کے لیے یادگار رہے۔

جنگ آزادی کی جدوجہد میں بھی قائدانہ رول ادا کیا، برسوں قید وبند کی صعوبتیں برداشت کیں،تصنیف وتالیف آپ کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔آہ! آج علم وعمل کا یہ آفتاب غروب ہوگیا، جمعیۃ علماء ہند کی مباحث فقہیہ، دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ وعاملہ سونی ہوگئی، ملت اسلامیہ ایک مدبر رہنما سے محروم ہوگئی۔۱۹۴۷ء کے بعد مجاہد ملت کی رفاقت میں مظلوم مسلمانوں کی ہر طرح خدمت کی، ارتداد کے فتنہ کا مقابلہ کیا، مقابر و مساجد کی واگذاری، اغوا شدہ عورتوں کی بازیابی کے لیے آپ نے اہم رول ادا کیا۔

یقیناً آپ کی وفات ایک بہت بڑا المیہ ہے‘‘۔ [الجمعیۃ ۵؍نومبر ۱۹۷۵ء]

مولانا سمیع الحق صاحب اکوڑہ خٹک نے ماہنامہ الحق ذی قعدہ ۱۳۹۵ھ کے تعزیتی شذرہ میں اپنے برحق تأثرات قلم بند فرمائے اور مؤرخ شہیر مولانا محمد میاںؒ کی علمی و دینی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے تحریر فرمایا:

’’مولانا محمد میاں مرحوم نے زندگی بھرحق کا ساتھ دیا، جہاں وہ مجاہدین جادۂ حق کے ایک شہ سوار تھے، وہاں انھوں نے مغل سلطنت کے طاغوت اکبر، اکبر کے عہد لا دینی سے لے کر تقسیم ہند تک علماءِ حق کی داستان جہاد وعزیمت کو مرتب اور مدون کیا۔ دجل وتلبیس کی تاریکیوں اور ایمان فروشی کے بازاروں سے علم ویقین اور جہد وعمل کے ہیروں کو نکال نکال کر علماءِ حق کے شاندار ماضی کو اجاگر کیا۔ وہ جمعیۃ علماء ہند کے ترجمان اور شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے معتمد خاص تھے، اس کے ساتھ علوم قرآن وسنت کی تدریس سے بھی اپنی زندگی آراستہ رکھی۔ آخری زندگی میں انھوں نے حضرت شیخ الہند کی عالم گیر اور محیر العقول تحریک ریشمی رومال پر دستاویزی حقائق شائع کیے۔ آج وہ خادم علم ودین اور مجاہد جلیل جس کی زندگی علماءِ حق کی روشن مثال تھی، خود علماءِ حق کے شاندار ماضی کا ایک روشن باب بن چکا ہے۔ حق تعالیٰ عالم بالا کے اسلامی افق پر مجدد الف ثانی سے لے کر شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی تک ائمہ رشد وہدایت اور ارباب صدق وصفا کی جو بزم سجی ہوئی ہے، اس میں بہترین مقام عطا فرمائے۔ [ماہنامہ الحق اکوڑہ خٹک، ذی قعدہ ۱۳۹۵ھ]

حضرت مولانا فاضل حبیب اللہ صاحب رشیدی ساہیوال نے اداریہ ماہنامہ ’’الرشید‘‘ ساہیوال نومبر ۱۹۷۵ء میں تحریر فرمایا:

سیّد مرحوم صحیح معنوں میں انسانی شرافت ومروت اور اسلامی علم وعمل کے پیکر تھے، اَز ابتدا تا انتہاء پوری تعلیم دنیائے اسلام کی مایہ ناز درس گاہ دار العلوم دیوبند سے حاصل کی اور فراغت کے فوراً بعد تحریک آزادی میں حصہ لینا شروع کر دیا اور اپنی قائدانہ صلاحیتوں اور مجاہدانہ کارناموں کی وجہ سے دو چار سال ہی میں اپنے وقت کے اہم

قائدین کی نظر میں ممتاز مقام حاصل کر لیا اور تھوڑے ہی عرصے میں صفِ اوّل کے مجاہدین میں شمار ہونے لگے۔

مولانا ابوالکلام آزادؒ، حضرت مدنیؒ اور مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ کی وفات کے بعد بھارت میں ملتِ اسلامیہ کی سیاسی و دینی رہنمائی و رہبری کا زیادہ تر بوجھ ان ہی کے کندھوں پر تھا۔ نظم وضبط اور پابندی اوقات کے ساتھ کام کرنے کی عادی تھے۔ لاتعداد سیاسی و ملی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ تصنیف وتالیف کا کام بھی کرتے رہے اور اسی پابندیٔ وقت اور تقسیم کار کا نتیجہ ہے کہ اپنے پیچھے بہت سی تاریخی علمی اور دینی کتب کا ذخیرہ چھوڑ گئے ہیں۔ [ماہنامہ ''الرشید'' ساہیوال نومبر ۱۹۷۵ء]

مولانا سید محمد میاں مدرسہ امینیہ دہلی میں شیخ الحدیث تھے، وہاں کے لوگ آپ کے انتقال سے راست طور پر متأثر تھے، رنج وغم کی کیسی فضا ہوگی! در و دیوار پر کیسا سناٹا طاری ہوا ہوگا! حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب کے صاحبزادۂ محترم مولانا حفیظ الرحمٰن صاحب واصفؔ مہتمم مدرسہ امینیہ اسلامیہ کشمیری دروازہ دہلی کی زبانی جذبات حسرت وقلق کے ساتھ اس اندوہ ناک گھڑی کا تصور کیجئے:

''حضرت مولانا محمد میاں صاحب شیخ الحدیث وصدر مفتی مدرسہ امینیہ کی رحلت علمی دنیا کا ایک بڑا حادثہ ہے۔ مولانا کی ہستی ہندوستان کے مجاہد علماء کی تاریخ کا ایک اہم باب تھی۔ مولانا نے کسی صلہ کی خواہش کے بغیر جنگ آزادیٔ ہند میں اہم فریضہ ادا کیا۔ کانگریس کی تحریکات میں انھوں نے اپنے مقتدا ومرشد شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ کے نقش قدم پر بجان ودل شرکت فرمائی اور آخر تک اس وضع داری کو نبھایا۔

سابق شیخ الحدیث وصدر مفتی حضرت مولانا مفتی محمد عبدالغنیؒ کے بعد محرم ۱۳۸۴ھ سے آپ ہی مدرسہ امینیہ دہلی میں درس وافتا کی خدمات انجام دے رہے تھے۔ افسوس کہ کارپردازان مدرسہ آپ کی خدمات اور سرپرستی سے محروم ہوگئے''۔ [الجمعیۃ ۲۹/اکتوبر ۱۹۷۵ء]

مولانا مفتی ضیاء الحق صاحب استاذ مدرسہ امینیہ دہلی کے تأثرات ہیں:

''کچھ لوگوں کی موت پر صرف گھر والے روتے ہیں، کچھ کی موت پر محلے والے روتے ہیں اور کچھ کی موت پر ان کو پورا شہر روتا اور انھیں یاد کرتا ہے؛ مگر مولانا محمد میاںؒ کی موت پر پورے ہندوستان نے آنسو بہائے ہیں اور ان کی خدمات کو ہمیشہ یاد کرتا رہے گا''۔

جناب شکر اللہ صاحب ۲۴ پرگنوی متعلم مدرسہ امینیہ دہلی لکھتے ہیں:

''حضرت مولانا محمد میاں صاحب کی رحلت کا حادثہ میرے لیے اتنا سخت ہے کہ میں اسے الفاظ میں بیان نہیں کرسکتا، ان کی روحانی کشش نے مجھے مدرسہ امینیہ میں بلایا تھا؛ لیکن میری قسمت میں نہ تھا کہ میں ان سے فیض حاصل کرتا''۔ [روزنامہ الجمعیۃ دہلی، ۵/نومبر ۱۹۷۵ء، ص:۳]

مدرسہ امینیہ دہلی میں زیر تعلیم بشیر احمد افضل صاحب کے منظوم تأثرات الجمعیۃ دہلی، ۱۰/نومبر ۱۹۷۵ء کی اشاعت میں شائع ہوئے:

روحِ علم و فضل تیری موت پر ☆ دیدۂ ہندوستاں گریاں ہے آج
باغبانِ قوم کے مرنے کے بعد ☆ زندگانی کا چمن ویراں ہے آج
ہر زباں ہے نوحہ خواں تیرے لیے ☆ آہ بر لب، سینۂ بریاں ہے آج
مردِ مومن کی وفات پاک پر ☆ زندگانی خود ہی زخم جاں ہے آج
ایک دنیا وقفِ ماتم ہوگئی ☆ موتِ عالم موتِ عالَم ہوگئی

گورنر اڑیسہ عالی جناب اکبر علی خان نے حضرت مولانا سید محمد میاں کے سانحۂ ارتحال کو جمعیۃ علماء کے علاوہ ملک اور محبان وطن کے طبقہ کے لیے بھی ایک نقصان قرار دیا۔ انھوں نے اپنے تعزیتی پیغام میں لکھا:

''مجھ کو یہ معلوم کرکے بے حد ملال ہوا کہ جناب محمد میاں صاحب نے داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ صاحب ممدوح بہت خوبیوں کے حامل تھے، علاوہ تبحر علمی کے وطن سے بے حد محبت رکھتے تھے۔ ممدوح سے بعض مسائل میں تحریراً تبادلۂ خیال کا موقع ملا، ان

کے انتقال سے نہ صرف جمعیۃ علماء کے حلقہ میں، بلکہ ملک اور وطن عزیز میں بڑی کمی ہوگئی''۔

خواجہ احمد فاروقی پروفیسر وصدر شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی دہلی جن کی اردو زبان وادب کے حوالے سے بڑی خدمات ہیں، کئی ایک کتابوں کے مصنف ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''حضرت مولانا محمد میاں نوراللہ مرقدہٗ کی رحلت تمام ہندوستان کے حریت پسندوں کے لیے سانحہ عظیم ہے۔ ان کے انتقال سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ کی جماعت کا ایک رکن رکین ہمارے درمیان سے اٹھ گیا، تحریک آزادی کا ایک سرخیل ہم سے چھین لیا گیا اور خاموش اور بے لوث خدمت کا ایک دور ختم ہوگیا۔ وہ بڑے مجاہد، بڑے مصنف، بڑے مؤرخ، بڑے محدث اور بڑے مدرس ہی نہیں تھے؛ بلکہ بڑے دل نواز اور دردمند انسان تھے۔

مولانا محمد میاں کی شخصیت ہمہ جہت تھی، ان کی نمایاں خصوصیت علم وفن کی محبت اور ملک وملت کی خدمت تھی۔ آزادی کی تحریک میں جمعیۃ علماء ہند کا بڑا حصہ ہے۔ تمام غیر جانبدار مؤرخین اس پر متفق ہیں کہ ہم نے اپنی آبادی کے تناسب سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔ کیا مولانا محمد میاں کی یاد میں ان کی کتابیں دوبارہ اہتمام سے شائع ہوں گی؟ کیا دہلی کی کوئی شاہراہ ان کے نام سے منسوب ہوگی؟ کیا کوئی کتب خانہ ان کے نام سے قائم ہوگا، جس سے ہمارے علماء کا شاندار ماضی آنکھوں کے سامنے آجائے؟

بعد از وفات تربت ما در زمیں مجو ☆ در سینہ ہائے مردم عارف مزار ما

حضرت مولانا محمد رفیع صاحب مہتمم وصدرالمدرسین مدرسہ عبدالرب دہلی، مولانا مرحوم کے دوست، ساتھی اور قریبی رشتہ دار تھے۔ ان کا بیان ہے:

''قدرت نے ان کے اندر ذہانت، استعداد اور ملک وملت کی خدمات کے لیے بے پناہ صلاحیت پیدا کی تھی، ان کی بے لوث خدمات اور لازوال کارناموں کو قوم کبھی فراموش نہیں کرسکتی۔ ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر نظر ڈالتے ہیں تو ایک ولی کامل اور قرون اولیٰ کی یاد تازہ ہوجاتی ہے''۔

جناب الحاج شیخ عبدالعزیز صاحب صدیقی ناظم جمعیۃ علماء اترپردیش نے ان کی موت کو ایک عالم کی موت بتایا اور کہا کہ آج ہم ایک مؤرخ، ایک محدث اور ایک بے لوث مجاہد جنگ آزادی سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو گئے۔

مولانا مقیم الدین فاروقی نے کہا:

''مولانا مرحوم نے ہمیشہ ہی قوم پرست عناصر کے ایک سربراہ کی حیثیت سے ملک کے لیے قربانیاں دیں۔ نئی نسل اور خاص طور پر مسلم نوجوانوں کے لیے مولانا کی زندگی ایک مشعل راہ کا درجہ رکھتی ہے۔ ان کی سادہ اور بااصول زندگی قابل تقلید ہے''۔

مولانا سیف الدین کاشمیری ناظم عمومی جمعیۃ علماء کلکتہ نے روشن دماغ عالم اور دیدہ ور مؤرخ مولانا محمد میاں کو خراج عقیدت و محبت پیش کرتے ہوئے لکھا:

''مولانا مرحوم اسلامیانِ ہند کے ان چند مخصوص نفوس میں سے تھے، جن پر علامہ اقبالؔ مرحوم کا یہ شعر صادق آتا ہے:

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

جمعیۃ علماء کی نصف صدی کی تاریخ اور اس کے مجاہدانہ کارہائے نمایاں میں مرحوم کا بے داغ کردار سنہری حروف سے جگمگا رہا ہے۔ آزادیِ وطن اور برطانوی غلامی سے استخلاص کے لیے سربکف مجاہدین کے گویا سرخیل تھے۔ ۴/بار قید و بند کے مصائب و آلام کو خوشی خوشی گزارا تھا اور آخری معرکۂ آزادیِ وطن ''ہندوستان چھوڑو'' (کویٹ انڈیا) میں دیگر سرفروشان قوم کے دوش بدوش رہے''۔ [الجمعیۃ دہلی، ۹/نومبر ۱۹۷۵ء]

آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے صدر مسٹر دیوکانت بروا نے حضرت مولانا سید محمد میاں کے سانحۂ ارتحال پر مندرجہ ذیل جامع تعزیتی پیغام ادارہ الجمعیۃ کو روانہ کیا تھا:

''مولانا سید محمد میاں کی موت سے مجھے شدید صدمہ ہوا، یہ قوم کا ایک ناقابل ازالہ نقصان ہے۔ سید محمد میاں صاحب ایک عظیم مجاہد آزادی تھے، انھوں نے قومی تحریک

کے دوران طویل قید وبند برداشت کیے اور مشکلات ومصائب کے باوجود اپنے خیالات، اعتقادات اور عمل پر ثابت قدم رہے۔ انھوں نے ماہر اسلامیات کی حیثیت سے اسلام کے زبردست عواقب وجوانب کو واضح کیا اور قومی تعلق سے اسلام کے لیے سمجھ بوجھ پیدا کی۔ انھوں نے عالمانہ اور تاریخی تحریروں کا زبردست ذخیرہ ورثے میں چھوڑا ہے، جو آئندہ نسلوں خاص طور سے مسلم نوجوانوں کو مہمیز کرتا رہے گا۔ میں ان کے غم زدہ خاندان کے لیے اظہار تعزیت کرتا ہوں اور ان کے ساتھیوں کے نقصان میں شریک ہوں''۔ [الجمعیۃ ۲۵/اکتوبر ۱۹۷۵ء]

مسز سبھد را جوشی (ایم پی) نے مولانا مرحوم کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا:

''عالی شان عمارتوں کی بنیاد میں پڑی ہوئی چیزیں بظاہر نظر نہیں آتیں، مولانا محمد میاں صاحب ہماری آزادی کی بنیاد رکھنے والوں میں سے تھے۔ افسوس کی بات ہے کہ آزادی کی تاریخ میں مولانا مدنیؒ اور مولانا محمد میاں کی قربانیوں کا حقیقی تذکرہ نہیں کیا گیا ہے۔ مسز جوشی نے جمعیۃ علماء سے گزارش کی کہ وہ مولانا مدنیؒ، مولانا محمد میاںؒ وغیرہ کی تحریریں اور اکابرین جمعیۃ کے عظیم الشان کارناموں کو زیادہ سے زیادہ تشہیر دیں؛ تاکہ مسلمانانِ ہند کے بارے میں کئے گئے منفی پروپیگنڈہ کا سدباب ہو سکے۔ انھوں نے کہا کہ مولانا مرحوم کو ہندوستان کی تاریخ کبھی بھی فراموش نہیں کر سکتی''۔

[الجمعیۃ ۲۹/اکتوبر ۱۹۷۵ء]

میر مشتاق احمد چیئر مین میٹرو پولیٹن کونسل کا بیان بھی ملاحظہ فرمائیں:

''مولانا محمد میاں ایک عظیم مجاہد آزادی تھے، وہ ۱۹۳۲ء میں انھیں گرفتار کر کے ایک سال کے لیے جیل میں ڈال دیا گیا، پھر ''ہندوستان چھوڑو'' تحریک کے دوران بھی انھیں دو سال کے لیے نظر بند کر دیا گیا تھا، سیاسی سرگرمیوں کے علاوہ وہ عظیم محبّ وطن اور عربی زبان کے بڑے عالم تھے، انھوں نے کئی تاریخی اور مذہبی کتابیں بھی لکھی ہیں۔ زندگی بھر فرقہ واریت کی سخت مخالفت کی، دلی کے مدرسہ امینیہ کے شیخ الحدیث تھے۔ ان کی تصانیف آئندہ نسلوں کے لیے مشعل راہ ثابت ہوں گی''۔ [الجمعیۃ ۲۵/

اکتوبر ۱۹۷۵ء]

جناب شمیم احمد صاحب صدیقی جنرل سکریٹری ضلع کانگریس کمیٹی وشہری حلقہ نے اپنے دلی جذبات کا اظہار کرتے ہوئے مولانا مرحوم کی وفات کو ملک وقوم کے لیے ناقابل تلافی نقصان قرار دیا۔انھوں نے اپنے اخباری بیان میں کہا:

''مولانا کے انتقال پر ہندوستان نہ صرف ایک جید عالم دین، بلکہ ایک باعمل اور عظیم رہنما سے محروم ہوگیا ہے۔اور یہ ایک ایسا خلا ہے جس کا پُر ہونا مشکل ہے۔ملک وقوم کے لیے مولانا کی قربانیوں کو ہمیشہ یاد رکھیں گے''۔[الجمعیۃ ۲۹/اکتوبر ۱۹۷۵ء]

جناب یونس سلیم صاحب (ایم پی) نے کہا:

''مولانا نے جنگ آزادی کے دوران بے پناہ قربانیاں دیں؛ مگر آزادیِ وطن کے بعد اس کے ثمرات ومنافع حاصل کرنے کی جانب کبھی بھی متوجہ نہیں ہوئے، ان کے توکل اور اعتماد علی اللہ کا یہ عالم تھا کہ انھوں نے وہ آسانیاں، سہولتیں اور مدد بھی حاصل نہیں کی تھیں جو آج کل مجاہدین آزادی کو دی جارہی ہیں، ان کی قربانی وایثار اور ملک و قوم کی خدمت کی بنا پر ان کا سانحۂ ارتحال قومی زندگی کا ایک المناک حادثہ ہے''۔

سابق وزیر یوپی مسٹر عزیز الرحمٰن (ایم ایل اے) نے کہا:

''مولانا مرحوم نے عوام کی لازوال خدمات انجام دیں؛ کیوں کہ وہ حدیث پاک کے مطابق پوری مخلوق کو اللہ تعالیٰ کا ایک کنبہ تصور فرماتے تھے''۔

عالم، دانشور، مجاہد آزادی اور خطیب، اپنی شاعری میں مستانہ روی اور صوفیانہ رنگ کے لیے معروف علامہ انور صابری کے منظوم تأثرات ملاحظہ فرمائیں:

حق آشنا، محبّ وطن، نازش حیات ☆ ذی علم، خوش شعور، ہمہ خوبی وصفات
رمزِ تغیراتِ زمانہ سے باخبر ☆ تاریخ کائنات کے آگاہ معتبر
اسلاف کے اصول کی تصویر زندگی ☆ قربانیِ حسین کی تفسیر زندگی
عزم جہاد، روح عمل، مقصد خیال ☆ حاصل خدا کے فضل سے ایثار کا کمال

سادہ مزاج، خاکۂ محمود کردگار ☆ سادات کے چمن کی نکھرتی ہوئی بہار
ذکر خدا میں فکر کی عادت رفیق شوق ☆ شیخ العرب کے ذوق کا آئینہ دار ذوق
نظم جماعت علماء کے امین کار ☆ دانشوروں کی صف میں بڑے ناز سے شمار
بیشک وہ سوئے خلد گئے باسکون تام ☆ انورؔ نہ مٹ سکے گا محمد میاںؔ کا نام

دنیا سے جانے والی شخصیت کے محاسن وکمالات اور کارناموں کو مادہائے تاریخ کے ذریعہ پیش کرنے کا عمل بہت پسندیدہ نگاہوں سے دیکھا اور توجہ واہتمام سے پڑھا جاتا ہے۔ ہر دور اور ہر زمانے میں ایسے باکمال، ہنرمند اور نظم ونثر میں قابو یافتہ حضرات موجود رہے ہیں، جو اپنی اس صلاحیت کو بروئے کار لاتے ہوئے ایسے انداز میں جملوں کو ڈھالتے اور قطعات تیار کرتے ہیں، جس سے مرنے والے کی سن ولادت ووفات برآمد ہوتی ہے۔ تاریخ گوئی کے اس لطیف فن میں حروف ابجد یہ کے اعداد کے ذریعہ بڑے بڑے واقعات کو چند لفظوں اور مختصر جملوں میں سمیٹ دیا جاتا ہے، جس سے ان کا محفوظ رکھنا آسان ہو جاتا ہے۔ کبھی کبھی یہ عمل اتنا عمدہ، دلچسپ اور بہتر ہوتا ہے کہ بس سر دھنتے جایئے۔ ہمارے دیار کی ایک باوقار، بافیض، علمی وروحانی شخصیت حضرت مولانا اعجاز احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے سانحۂ ارتحال پر ایسا شاندار اور معنی خیز شعر تیار کیا، جس سے سن ولادت اور سال وفات معلوم ہو جاتی ہے۔ آپ بھی اسے پڑھئے اور اس کی عمدگی کو محسوس کیجئے:

فروغ جمال ولادت ہے تیری ☆ ترا سال رحلت فروغ حنیف
۱۳۶۰ھ ۱۴۳۴ھ

حضرت مولانا محمد میاں صاحب کے سانحۂ ارتحال کا سال ۱۳۹۵ھ مطابق ۱۹۷۵ء ہے۔ جناب غوث محمد صاحب ایٹوی نے اس موقع سے ایک تاریخی مقالہ تحریر فرمایا، جس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی ہر سطر سے مرحوم کی تاریخ وفات نکلتی ہے۔ کل ملا کر ۷۰؍ مادے ہوتے ہیں۔ یہ انداز نایاب نہ سہی، کمیاب ضرور ہے۔ آیئے اس مادہائے تاریخ کی حسین وادی میں علم وہنر کی قدر دانی اور پذیرائی کے جذبے کے ساتھ قدم رکھتے ہیں:

’’آپ ماہ اکتوبر کی چھبیس وستائیس کا الجمعیۃ دیکھئے گا [۱۹۷۵ء] جس میں چند اکابرین وطن نے مولانا کی وفات پہ اپنی اپنی رائے پیش کی ہے [۱۹۷۵ء] میں نے انھیں کے پاک جملوں سے تاریخیں نکالی ہیں [۱۹۷۵ء] ہمزہ کے کہیں اک، کہیں دس اور کہیں کچھ شمار نہیں کیا گیا ہے [۱۳۹۵ء] مولوی محمد میاں کی موت کا آج زمانے کو غم ہے [۱۹۷۵ء] جمعیۃ علمائے ہند دہلی کے ناظم عمومی [۱۹۷۵ء] جناب مولانا سید احمد صاحب ہاشمی نے بھی ایک تقریر میں کہا [۱۹۷۵ء] کہ مولانا الحاج محمد میاں صاحب نے آج قوم کی جو کلی خدمات انجام دی ہیں [۱۹۷۵ء] ان کے ذکر کے لئے ایک کتاب درکار ہے [۱۹۷۵ء] ناظم صاحب نے کہا: اگر مولانا ایسی کتابیں نہ لکھتے [۱۹۷۵ء] اسلام کی تاریخ بھی وجود میں نہ آتی [۱۹۷۵ء] مولانا مرحوم کا، کارناموں سے آج مسلمانوں پہ، یہ اتنا بڑا احسان ہے [۱۹۷۵ء] کہ ہم تازیست اس سے کبھی بھی عہدہ برآ نہیں ہوسکتے [۱۹۷۵ء] اچھا ہاشمی صاحب نے یہ بھی بتایا کہ جمعیۃ علمائے ہند کے لئے مولانا کا [۱۹۷۵ء] یقین کیجئے اساسی رتبہ تھا [۱۹۷۵ء] وہ والا جاہ جماعت کے ایسے راہ نما تھے [۱۳۹۵ء] کہ جب کسی معاملہ میں ہم لوگوں کو کوئی نئی یا اہم دقت پیش آتی [۱۹۷۵ء] تو مولانا موصوف سے ایک مشورہ ہی نہ لیتے بلکہ [۱۹۷۵ء] ہم مولانا ممدوح کے ہر فیصلے کو قبول کر لیتے تھے [۱۹۷۵ء] ان کی موت دلی کا نقصان نہیں، ہند کا بھی نقصان نہیں؛ بلکہ ایک جہان کا نقصان ہے [۱۹۷۵ء] واقعی یہ نقصان اپنا ایک ناقابل برداشت نقصان ہے [۱۹۷۵ء] آج علم وعمل کے ایسے پیکر شاید ہی عالم وجود میں آسکیں گے [۱۹۷۵ء] مفتی عتیق الرحمٰن صاحب نے بھی فرمایا کہ [۱۹۷۵ء] مولانا محمد میاں صاحب کی پوری زندگی نیک نفسی و پاکیزگی سے بھی معمور تھی [۱۹۷۵ء] بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں جو بوڑھے ہو جانے پہ از حد نیک بن جاتے ہیں [۱۹۷۵ء] مولانا کے بارے میں آدمی ایسا فرمایا کرتے تھے [۱۹۷۵ء] کہ واقعی ایک فرشتہ صفت انسان تھے [۱۹۷۵ء] آج تو ہم لوگ ایک زبردست الم ہی محسوس کر رہے ہیں [۱۹۷۵ء] لیکن کچھ روز بعد ہم سب کو یہ بھی محسوس ہوگا کہ وہ علمی میدان میں اب کتنا اہم کام انجام دے گئے ہیں [۱۹۷۵ء] مولوی

قاضی سجاد حسین نے بحسن کرم فرمایا: آج [۱۹۷۵ء] مولانا ممدوح کی وہ زندگی صحابہ کرام کی زندگی کی یاد کو تازہ کرتی ہے [۱۹۷۵ء] جناب یونس سلیم صاحب ایم. پی نے سچ کہا ہے کہ مولانا کی موت ایک المناک حادثہ ہے [۱۹۷۵ء] مولانا اخلاق حسین قاسمی نے کہا: ہم [۱۹۷۵ء] کو تو آج بے شک مولانا ممدوح کی موت نے اکابرین کی موت کو یاد دلا دیا [۱۹۷۵ء] مولانا سید فخر الحسن صاحب نے کہا: مولانا دینی حلقوں میں یاد کئے ہی [۱۹۷۵ء] جاتے رہیں گے، ہمیشہ ہمیشہ جب تک بھی یہ دنیا آباد ہے [۱۹۷۵ء] جناب ظہیر الدین صاحب نے حق کہا کہ الحاج مولانا نے آزادی وطن کے لئے [۱۹۷۵ء] ہاں! اپنی جان پہ قید و بند کی مصیبتیں برداشت کیں [۱۹۷۵ء] آپ اچھی شخصیت کے مالک بھی تھے [۱۹۷۵ء] جناب سادگی، تقویٰ، قناعت کے اچھے پیکر تھے [۱۹۷۵ء] دراصل آج ان کی پاک زندگی نوجوان نسل کے لئے سبق آموز اور قابل تقلید ہے [۱۹۷۵ء] ان کی خدمت کے نقوش ایسے پائیدار ہیں [۱۹۷۵ء] بلکہ وہ خدمات آج سنہری حروف سے لکھی جائیں گی [۱۹۷۵ء] سابق وزیر مسٹر عزیز الرحمٰن صاحب ایم. ایل. اے نے کہا: مولانا آج [۱۹۷۵ء] بھی اپنی عالی خدمات کے صلہ میں حیات ہیں [۱۹۷۵ء] جناب ناز انصاری نے بھی مولانا کی بابت تحریر کیا ہے [۱۹۷۵ء] انھوں نے جس طرح نام ونمود کی کسی خواہش کے بلا اپنی زندگی کے زاید کہ [۱۹۷۵ء] کم پچاس سال ملک وملت کے کاموں میں گذار دیئے [۱۹۷۵ء] مولانا الحاج محمد میاں ایسے اچھے ستون تھے [۱۳۹۵ء] کہ اسی پہ جمعیۃ علماء کی بنیادی تعمیر قائم رہی [۱۹۷۵ء] ہاں وہ کون ہے جو اس صداقت سے انکار کرے [۱۳۹۵ء] مولانا خدا پرست [۱۳۹۵ء] ہونے کے علاوہ پاک دل بھی، پاک باطن بھی، پاک باز بھی، پاک طینت بھی تھے [۱۳۹۵ء] مولانا ممدوح ایک صالح بزرگ بھی تھے اور بڑے عابد بھی تھے [۱۹۷۵ء] یہ کل باتیں ان کی آخرت کا توشہ ہیں [۱۹۷۵ء] کل دینی درس وتدریس کے حلقوں میں [۱۳۹۵ء] دینی علوم وفنون کے یک پاک میدان میں بھی فکر رکھنے والوں [۱۳۹۵ء] اور ہاں تصنیف وتالیف کا کام کرنے والوں میں [۱۹۷۵ء] آپ کا نام عزت واحترام سے لیا جائے گا [۱۳۹۵ء]

(از جانب) حقیر جہاں غوث محمد [۱۹۷۵ء]

(مخدوم اترولوی) بے شبہ صحیح ہے کہ دنیائے اسلام کا چراغ گل ہوگیا [۱۹۷۵ء] مولوی محمد میاں مرے ایک بڑے محسن ومہربان تھے [۱۹۷۵ء] قلبی دعا ہے کہ وہ واحد قدوس مولانا احمد میاں صاحب نیز پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے [۱۹۷۵ء] اور مرحوم کو اللہ جنت فردوس میں ایک اچھی جگہ عطا کرے آمین [۱۹۷۵ء] والاحسب واعلیٰ نسب مولوی محمد میاں صاحب نور اللہ مرقدہٗ [۱۳۹۵ء] جناب حاجی مولانا محمد میاں خلد آشیاں [۱۳۹۵ء] سید الملت سید القوم سیدزادہ جناب مولانا محمد میاں صاحب [۱۳۹۵ء]

قطعہ اخراجیہ

فلک ہے گریاں محمد میاں کے ماتم میں
زمین ہند پہ ایسے بھی آدمی گذرے
جو نکلی آہ! تو فوراً یہ بول اٹھا مصرعہ
خدا کرے تری پھولوں میں زندگی گذرے

[۱۹۸۲-۷=۱۹۷۵ء]

قطعہ اتمامیہ

ہوکر خفا جہاں سے محمد میاں گئے
احباب پوچھتے ہیں وہ آخر کہاں گئے
آواز آئی غوث محمد یہ غیب سے
مولانا، کہہ بھی دو، سوئے باغ جناں گئے

[۱۹۷۵ء]

قطعہ ادخالیہ

ہے کہی غوثِ محمد کی دعا شام و سحر
قصر اعلیٰ دینا یارب! جنت فردوس میں

خواب میں مجھ کو پیام حضرت آدم ملا
مرنے والا پہونچا دیکھ اب جنت فردوس میں

۱۳۹۵=۴۵+۱۳۵۰ء

دیکھو! بحساب ابجد ہنوز کل تعداد ستر مادے نکلتے ہیں [۱۹۷۵ء] حقیر جہاں غوث محمد [۱۹۷۵ء] قیام امام پور ڈسٹرکٹ ایٹا یوپی [۱۹۷۵ء]''

[روزنامہ الجمعیۃ دہلی ،۱۲ر دسمبر ۱۹۷۵، عید نمبر، ص:۹]

جناب حکیم عزیز قدوسی صاحب نے مولانا سید محمد میاں مرحوم ومغفور کے سانحۂ ارتحال کو صدمہ عظیم قرار دیا اور درج ذیل تاریخی قطعہ تحریر فرمایا:

طاقت نہیں ہے، دل میں شکیب و قرار کی
عالم کی موت اصل میں غم اک جہاں کا ہے
دل نے کہا یہ مصرعۂ تاریخ ارتحال
صدمہ عظیم آہ! محمد میاں کا ہے

۱۳۹۵ھ

دل ہے بے تاب تو آنکھیں پُرنم
جتنا افسوس کریں ہم، کم ہے
سال رحلت یہ کہا دل نے عزیز
نیک دل عالم دیں کا غم ہے

۱۳۹۵ھ

جناب بشیر صدیقی انبالوی نے لکھا:

نہیں موت سے جب کسی کو مفر
کیا آپ نے بھی جہاں سے سفر

خبر آہ! کتنی ہے وحشت اثر
کریں کیا کہ مجبور ہے ہر بشر
ہیں اللہ والے جہاں میں مگر
کہاں آپ سا آج صاحب نظر

۱۳۹۵ھ

[روزنامہ الجمعیۃ دہلی، ۲۷/اکتوبر۶، ۱۰/نومبر ۱۹۷۵ء]

☆☆☆☆☆

حصہ دوم

مقالات قدیم

اس حصہ میں وہ مضامین ومقالات ہیں، جو مولانا پر ان
کی وفات سے لے کر سیمینار سے پہلے تک لکھے گئے۔

حضرت مولانا سیّد محمد میاں صاحب رحمہ اللہ

مولانا سیّد حامد میاں بن مولانا سید محمد میاں صاحبؒ

بانی جامعہ مدنیہ لاہور

والد ماجد حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب نوراللہ مرقدہٗ کی تاریخ پیدائش ۱۲ر رجب ۱۳۲۱ھ/ ۴ر اکتوبر ۱۹۰۳ء ہے، جائے پیدائش دیوبند کا ''محلّہ سرائے پیرزادگان'' ہے، تاریخی نام ''مظفر میاں'' ہے

خاندان اور وطن:

وطن مالوف دیوبند تھا، نسباً ساداتِ حسینی میں ہیں، دیوبند میں سادات کے متعدد خاندان ہیں لیکن یہ خاندان سب سے قدیم ہے۔ گیارہویں صدی کے اوائل میں جدامجد سیّد محمد ابراہیم صاحبؒ دیوبند قیام فرما ہوئے تھے۔ یہ جہانگیر کا دور تھا۔ جہاں آپ قیام فرما ہوئے تھے وہ جگہ بستی سے کچھ الگ ہے، اسے ''سرائے پیرزادگان'' کہا جاتا ہے۔ وہیں مسجد، خانقاہ اور آپ کا مزار ہے۔ ان کی وفات ۱۰۳۴ ھ میں ہوئی اور محلّہ ''سرائے پیرزادگان'' ہی میں مدفون ہوئے۔

شجرۂ نسب :

اس خاندان کے حالات ''تاریخ دیوبند'' میں بھی دیے گئے ہیں، نیز دیوبند سے ایک رسالہ ''تذکرۂ ساداتِ رضویہ'' کے نام سے شائع ہوا ہے، اس میں شجرۂ نسب بھی ہے۔

والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے درمیان چالیس واسطے ہوتے ہیں۔

ترتیبِ نزولی کے اعتبار سے ملاحظہ فرمائیں :

(۴۱) مولانا سیّد محمد میاں ابن (۴۰) سیّد منظور محمد ابن (۳۹) سیّد یوسف علی ابن (۳۸) سیّد محمد علی ابن (۳۷) سیّد ظہور ولی ابن (۳۶) سیّد محمد فردوس ابن (۳۵) سیّد شاہ شبلی ابن (۳۴) حضرت بندگی محمد اسمٰعیل ابن (۳۳) حضرت سیّد محمد ابراہیم قدس اللہ سرہٗ ابن (۳۲) سیّد سعد اللہ ابن (۳۱) سیّد محمود قلندر ابن (۳۰) سیّد احمد ابن (۲۹) سیّد فرید ابن (۲۸) وجیہ الدین ابن (۲۷) علاء الدین ابن (۲۶) سیّد احمد کبیر ابن (۲۵) سیّد شہاب الدین ابن (۲۴) حسین علی ابن (۲۳) عبدالباسط ابن (۲۲) ابو العباس ابن (۲۱) اسحاق عندلیب المکی ابن (۲۰) القاری حسین علی ہادی ابن (۱۹) لطف اللہ ابن (۱۸) تاج الدین احمد ابن (۱۷) حسین ابن (۱۶) علاء الدین ابن (۱۵) ابو طالب ابن (۱۴) ناصر الدین احمد ابن (۱۳) نظام الدین حسین ابن (۱۲) موسیٰ ابن (۱۱) محمد الاعرج ابن (۱۰) ابو عبداللہ احمد ابن (۹) موسیٰ الـمُبَرْقَعُ ابن (۸) امام محمد تقی ابن (۷) امام موسیٰ علی رضا ابن (۶) امام موسیٰ کاظم ابن (۵) امام جعفر صادق ابن (۴) امام محمد باقر ابن (۳) امام زین العابدین ابن (۲) امام ابو عبداللہ الحسین ابن (۱) سیّدۃ النساء فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا بنت سرورِ کائنات محمد رسول اللہ ﷺ و زوجۃ علی ابن ابی طالب کرم اللہ وجہہٗ (۱)

اس شجرہ میں (۲۴) سیّد حسین علی بن عبدالباسط حمص (شام) سے ترک وطن کر کے اَوَش (۲) چلے گئے وہاں سے دہلی آئے، حضرت خواجہ بہاؤالدین زکریاؒ سے مرید ہوئے کسبِ فیض کیا اور حضرت بابا فرید الدین شکر گنج رحمۃ اللہ علیہ کے مشائخ سے کسبِ فیض کیا، ان کے ساتھی رہے، پھر سندھ کے قدیم شہر بھکر میں اقامت گزیں رہے اور وہیں بعہدِ سلطان الدین خلجی وفات پائی۔ ان کا سالِ وفات ۶۹۵ھ ہے، اور حضرت بابا صاحبؒ کا ۶۹۰ھ۔ پھر ان کی اہلیہ اپنے دو کم سن بچوں شہاب الدین وغیرہ کو لے کر حمص واپس چلی گئیں۔ اَوَش فرغانہ کے علاقہ میں واقع ہے، یہی ظہیر الدین بابر کا بھی وطن تھا اور حضرت

خواجہ قطب الدین بختیار کا کی رحمۃ اللہ علیہ کا بھی۔(۳)

بچپن اور تعلیم :

دادا جان رحمۃ اللہ علیہ جن کا اسم گرامی منظور محمد تھا ان کی طبیعت میں قناعت وصبر رچا ہوا تھا۔مولانا راشد حسن صاحب عثمانی (۴) مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ میں نے ان سے زیادہ خوددار نہیں دیکھا۔مولانا راشد حسن صاحب حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب کے بھائی جناب حامد حسن صاحب رحمہما اللہ تعالیٰ کے صاحبزادے تھے۔ان کا یہ قول اس لیے زیادہ وزنی ہے کہ خود مولانا راشد حسن صاحب بھی نہایت عسرت کے دور سے گزرے تھے۔جناب سیّد منظور محمد صاحب بسلسلۂ ملازمت دیوبند سے باہر رہتے تھے تو آپ بھی مع والدۂ محترمہ (بنت سیّد ریاض حسینؒ) انہیں کے ساتھ رہتے تھے۔پانچ یا چھ برس کی عمر ہوئی تو والدین کو آپ کی تعلیم کی فکر ہوئی،موضع بچولہ ضلع بلندشہر جو دادا جان رحمۃ اللہ علیہ کا ہیڈ کوارٹر تھا،چھوٹا سا گاؤں تھا،جہاں کوئی تعلیمی ادارہ موجود نہیں تھا۔والد صاحب کی نانی صاحبہ نے شفقت فرمائی اور آپ کے والدین کی درخواست پر بسم اللہ کرادی۔وہ بہت صالح صابر و شاکر خاتون شمار ہوتی تھیں،ان کے یہاں دو ہی بچے ہوئے تھے:ایک آپ کی والدہ اکرام النساء اور دوسرے ماموں سیّد بشیر احمد (۵) پھر نانا صاحب کا انتقال ہو گیا تھا،بیوگی کے عالم میں انہوں نے ان دونوں بچوں کی تربیت و پرورش کی۔وہ صوم وصلاۃ کے علاوہ دیگر اَوراد کی بھی پابند تھیں۔سونے سے پہلے سورۂ ملک اور سورۂ واقعہ کے علاوہ ایک طویل مناجات پڑھنے کا معمول تھا جس میں اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام ہیں۔

آپ کے والد ماجد اس تاریک قریہ میں تھوڑا عرصہ رہے پھر موضع ٹنڈھیرہ ضلع مظفر نگر تبادلہ ہو گیا جہاں دینی تعلیم کا مکتب تھا۔آپ مکتب میں داخل کرا دیے گئے پھر آپ کے والد صاحب کا قصبہ بیلسونہ تبادلہ ہو گیا،وہاں ایک صاحب تھے خلیل احمد صاحب ان کا اسم گرامی تھا پیشہ چرم دوزی (چمڑہ کی سلائی کا پیشہ) تھا مگر فارسی کی قابلیت بہت عمدہ تھی۔آپ قرآن شریف ختم کرتے ہی موصوف کے حوالے کر دیے گئے کہ موصوف فارسی پڑھائیں مگر

یہ سب عارضی انتظامات تھے اور چونکہ تقریباً چھ ماہ بعد آپ کے والد صاحب کا تبادلہ ہوتا رہتا تھا تو یہ انتظامات بھی ناکافی رہتے تھے۔

خاندان کے نئے رواج کے مطابق آپ کو انگریزی پڑھانے کے لیے سرکاری اسکول میں داخل کرنا چاہیے تھا، مگر انگریزی تعلیم کے مصارف غیر قابلِ برداشت سمجھے گئے اور یہی بہت بہتر ہوا۔ خداوند کریم نے ان کی اعلیٰ ذہنی صلاحیت اپنے دین کے لیے قبول فرمائی۔ چنانچہ آپ کو دارالعلوم دیوبند کے درجہ فارسی میں داخلہ کر دیا گیا جہاں تعلیم کی فیس نہ تھی۔ یہ غالبًا ۱۹۱۶ء کا واقعہ ہے۔ درجاتِ فارسی کی تکمیل کے بعد آپ درجاتِ عربی میں داخل ہوئے اور ۱۳۴۳ھ/ ۱۹۲۵ء میں فراغت ہوئی۔

دورۂ حدیث شریف علامہ عصر حضرت مولانا محمد انور شاہ صاحب کشمیری نور اللہ مرقدہٗ سے پڑھا۔ ازہر شاہ صاحب قیصر مدظلہم نے ''ماہنامہ دارالعلوم'' کے اداریہ میں لکھا ہے کہ ''آپ کو محدث العصر حضرت مولانا انور شاہ صاحب کشمیری قدس سرہٗ (م۲:۱۳۵۲ھ) سے شرفِ تلمذ حاصل تھا بلکہ ممتاز تلامذہ میں آپ کا شمار ہوتا تھا۔ علمی ذوق شوق استاد محترم سے ورثہ میں ملا تھا۔

تدریسی خدمات :

مارچ ۱۹۲۶ء میں کلکتہ میں جمعیۃ علماء ہند کا دوسرا اجلاس زیرِ صدارت علامہ سیّد سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ ہوا تھا۔ حضرت علامہ انور شاہ صاحب صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند اور دارالعلوم دیوبند کے جملہ اکابر اس میں شامل ہوئے۔ واپسی پر مدرسہ حنفیہ آرہ شاہ آباد کے ارکان نے صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند حضرت علامہ کشمیریؒ سے ایسے مدرس کی فرمائش کی جو عربی تقریر و تحریر کی مشق کرا سکے اور خصوصاً فنِ ادب کی اُونچی کتابیں پڑھا سکے۔ حضرت موصوف دیوبند واپس ہوئے تو شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علی صاحب رحمہ اللہ کے مشورہ سے اس کے لیے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کو منتخب کیا گیا۔ وہاں آپ نے تقریباً ساڑھے تین سال قیام فرمایا۔ اوّل اوّل کچھ مشکلات پیش آئیں پھر نہ صرف مدرسہ کے

حضرات بلکہ شہر کے بھی بہت سے حضرات مانوس ہو گئے۔ والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک دفعہ وہاں کے واقعات کا ذکر فرمایا تو ارشاد فرمایا کہ پہلے پہل کچھ دُشواریاں پیش آئیں مگر بعد میں اہلِ مدرسہ ایسے مانوس ہوئے کہ میری بات کو دلیل اور حجت کا درجہ دینے لگے۔ صوبہ بہار کے دوسرے اضلاع کے علماء اور بزرگوں سے بھی تعارف ہو گیا لیکن آپ خود اس مدرسہ سے خاطر برداشتہ رہے، جس کی وجہ یہ تھی کہ اس مدرسہ کو سرکاری ایڈ ملتی تھی اور بہار یونیورسٹی کے درجات فاضل وغیرہ کی تیاری بھی یہاں کرائی جاتی تھی۔ یہ دونوں باتیں دارالعلوم دیوبند کے اصول کے خلاف تھیں۔ آپ کے اکابر جو دارُالعلوم کے بااثر اور بارسوخ حضرات تھے، انہوں نے اگرچہ وقتی طور پر آپ کا وہاں انتخاب فرمادیا تھا اور اس میں بھی شک نہیں کہ کچھ عرصہ اگر وہاں اور قیام رہتا تو شمس الہدیٰ میں پروفیسر ہو سکتے تھے اور یہ بھی ممکن تھا کہ پروفیسر ہونے کے بعد پرنسپل بھی ہو جاتے، کیونکہ وہاں تعلقات کا دائرہ وسیع ہو گیا تھا اور وہاں کی پرنسپل شپ کے لیے کسی ڈگری کی ضرورت نہ تھی۔ اس زمانہ میں مولانا محمد سہول صاحب پرنسپل تھے جو صرف فاضل دارالعلوم دیوبند تھے اور دیوبند وغیرہ میں بااثر اُستاد رہ چکے تھے، ان کے پاس کوئی اور ڈگری نہیں تھی اور وہ بظاہر انگریزی کے حروف سے بھی واقف نہ تھے، لیکن والد صاحب کسی ایسے مدرسہ کے خواہاں تھے جو دارالعلوم دیوبند کی طرح سرکاری امداد اور سرکاری اثرات سے پاک ہو۔

حسنِ اتفاق کہ جامعہ قاسمیہ (مدرسہ شاہی) مراد آباد میں ایک ایسے استاذ کی ضرورت ہوئی جو درجات علیا کی تعلیم دے سکے۔ اس جگہ کے لیے دیوبند کے اکابر خصوصاً حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند نے آپ کو تجویز فرمایا اور سفارش فرمائی، حضرت مولانا اعزاز علی صاحبؒ نے اس سفارش کی تائید فرمادی اور والد صاحب کو تحریر فرمایا کہ:

''اب ایسے مدرسہ میں بھیجا جا رہا ہے جو علم کا مرکز ہے''۔

نامناسب نہ ہوگا اگر یہاں مراد آباد کے علمی وفکری حالات کا کچھ خاکہ پیش کردیا

جائے :

جامعہ قاسمیہ مرادآباد جسے عرفاً ''مدرسہ شاہی'' کہا جاتا ہے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہ کا قائم کردہ ہے۔اس کا نام حضرتؒ نے ''مدرسۃ الغرباء'' رکھا تھا، جس کی ایک وجہ یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ آپ کی اپیل پر جس نے سب سے پہلے چندہ دیا تھا وہ کوئی نیک بخت مسافر تھا، پھر حضرت کی نسبت سے اس کا نام'' جامعہ قاسمیہ'' ہوگیا اور چونکہ یہ مدرسہ'' شاہی مسجد'' میں تھا، اس لیے اسے''شاہی مدرسہ'' بھی کہا جاتا ہے۔ مدرسہ میں جونام کندہ کرایا گیا ہے یہ ہے''مدرسۃ الغرباء جامعہ قاسمیہ واقع شاہی مسجد''۔ یہ مدرسہ ۱۲۹۶ھ/ ۱۸۷۸ء ماہ صفر سے جاری ہوا۔سب سے پہلے مدرس مولانا سیّد احمد حسن صاحب امروہوی تھے جو مولانا رحمت اللہ صاحب کے شاگرد رشید تھے۔ مولانا رحمت اللہ صاحب بہت بڑے مناظر تھے،عیسائیوں کے پاس ان کا جواب نہ تھا،انگریز اُن کی جان کے دُشمن ہوگئے، انہوں نے یہ دیکھ کر سفر ہجرت کیا اور مکہ مکرمہ میں قیام اختیار فرمایا، وہاں'' مدرسہ صولتیہ'' شروع کیا،''اظہار الحق'' نامی کتاب تحریر فرمائی جو عربی میں دو جلدوں میں ہے اور عیسائی مذہب کے بارے میں اعلیٰ ترین مناظرانہ کتاب شمار ہوتی چلی آئی ہے۔

مصر میں پادری فنڈر کے مناظرہ میں علماء مصر کو تشویش ہوئی تو آپ کو مکہ مکرمہ سے بلایا۔آپ نے فرمایا کہ اسے میرے آنے کی خبر نہ دیں ورنہ مناظرہ کوٹلا جائیگا، ایسے ہی ہدایت پر عمل کیا، وہ جب بالکل لا جواب ہوگیا تو اس نے اگلے دن جوابات دینے کے لیے مہلت مانگی اور رات کو خودکشی کرلی۔ یہ اُس زمانہ میں عیسائیوں کا سب سے بڑا چرب زبان پادری تھا۔مولانا رحمت اللہ صاحب کی وفات مکہ مکرمہ میں ہوئی، وہیں جنت المعلٰی میں مدفون ہیں۔حضرت حاجی امداداللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی ایک کمرے میں قیام فرما تھے، وہ کمرہ مدرسہ صولتیہ میں اب بھی بحالہ موجود ہے۔حضرت مولانا زکریا صاحب دامت برکاتہم مکہ مکرمہ میں اسی میں قیام فرماتے ہیں اور قبر مبارک بھی جنت المعلٰی میں مولانا رحمت اللہ کے پہلو بہ پہلو ہے۔غرض مولانا سیّد احمد حسن صاحب ان کے شاگرد تھے، انہوں نے

تدریس کا آغاز کیا، تنخواہ ۳۵ روپے ماہانہ مقرر کی گئی تھی۔(از رُوداد ۱۲۹۶ھ)

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی قدس سرہٗ نے ۱۳۰۰ھ میں مدرسہ کا سالانہ امتحان لیا تو تعلیمی حالت سے خوش ہو کر فرمایا: اگر چند سال ایسی صورت رہی تو یہ مدرسہ تمام مدارس عربیہ میں مثل مدرسۂ دیوبند نہایت نام آور اور مشہور ہوگا'' (٦) اس مدرسہ سے بہت بڑے بڑے حضرات فارغ التحصیل ہوئے۔ حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ ابن حضرت اقدس مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہٗ، مفتی اعظم ہند حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحبؒ، ریاض الدین صاحب افضل گڑھی صدر مفتی دارالعلوم دیوبند، مولانا عبدالغفور صاحب غزنوی قاضی القضاۃ غزنی محمود طرزی وزیراعظم افغانستان، اپنے حضرت مفتی محمود صاحب اور دیگر بہت بڑے بڑے اکابر اسی مدرسہ کے فارغ شدہ ہیں۔

حضرت نانوتوی قدس سرہٗ کے تعلقات اہلِ مرادآباد سے چلے آرہے تھے، آپ کے ایک خلیفہ حضرت مولانا محمد صدیق صاحب مرادآباد کے رہنے والے تھے اور حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ ان کے زمانہ سے لے کر ان کے پڑپوتوں کے زمانہ تک ہمیشہ ان کے اسی مکان میں محلّہ ''بَغیہ'' میں قیام فرماتے رہے، حالانکہ مکان نہایت خستہ ہو چکا تھا اور ٹھہرنے کے لیے عمدہ سے عمدہ انتظام ہوسکتا تھا۔

مرادآباد میں ایک محلّہ کا نام ''گل شہیدٗ'' ہے، وہاں شہداء ۱۸۵۷ء کے مزارات ہیں۔ یہ لفظ گلہ اور شہید سے مرکب معلوم ہوتا ہے۔ مرادآباد میں انگریزوں نے کئی اضلاع کے لیے اپنا ہیڈ کوارٹر بنالیا تھا۔ اہلِ مرادآباد میں یہ روایت چلی آرہی ہے کہ وہاں ۱۸۵۷ء کے بعد ساڑھے سولہ ہزار مجاہدین حریت کو سولی پر چڑھایا گیا، یہ مجاہدین مرادآباد کے علاوہ اس کے اطراف سے بھی لائے جاتے رہے۔ مرادآباد سے نینی تال جیسے بلند پہاڑ کا فاصلہ صرف چالیس میل ہے۔

حضرت نانوتوی قدس سرہٗ کا قیام ۱۸۵۷ء سے پہلے دہلی میں رہا تھا جو مرکز اور پایۂ تخت تھا، ایسی جگہ ہر طرف سے آنے جانے والے ہمیشہ رہتے ہیں جس سے حلقہ تعلقات

میں اضافہ ہوتا ہے۔ خود حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ مجاہد تھے، انہوں نے شاملی میں انگریز کی فوج سے جہاد بھی کیا تھا جس میں اُن کے چچا پیر حافظ ضامن صاحب رحمۃ اللہ علیہ (۷) نے جام شہادت نوش فرمایا تھا۔ اس معرکہ میں خود حضرت حاجی صاحب اور مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہم سب ہی شریک تھے۔ تفصیل ''علماء ہند کا شاندار ماضی'' میں ہے۔ ان مجاہدین کے دُور دُور تعلقات تھے اور ربط تھا، اس طرح بھی حضرت نانوتوی قدس سرہٗ کا اہلِ مراد آباد سے رشتۂ جہاد منسلک تھا۔ یہ گفتگو تو درمیان میں مراد آباد کے کچھ تعارف کے لیے آ گئی تھی۔

تذکرہ تھا کہ والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ مجاہدین حریت کے مرکز جامعہ قاسمیہ میں تشریف لے آئے، وہاں آپ نے ترمذی شریف، بیضاوی شریف، جلالین، ہدایہ اخیرین، اور ادب کی تمام کتابیں پڑھائیں۔ منطق میں ''ملاحسن'' بھی پڑھائی پھر آخری دور میں ''مدرسہ امینیہ'' دہلی میں ترمذی شریف اور ہدایہ اخیرین کے ساتھ بخاری شریف بھی پڑھانی نصیب ہوئی اور افتاء کا کام تو مراد آباد سے جو شروع ہوا تو اخیر وقت تک چلتا رہا۔ جامعہ قاسمیہ میں شعبۂ افتاء مستقل حیثیت سے قائم نہ تھا، وہ آپ نے ہی شروع فرمایا۔ تصنیف و تالیف عبادت و ریاضت کا سلسلہ اخیر وقت تک قائم رہا۔

تصانیف :

۱۹۳۹ء میں جرمنی کی جنگ شروع ہوئی، اُسی زمانہ میں آپ نے مشہور کتاب ''علماء ہند کا شاندار ماضی'' تحریر فرمائی جو ضبط کر لی گئی، پریس بھی ضبط کر لیا گیا، آپ کو گرفتار کر لیا گیا مگر ضمانت پر رہا کر دیا گیا۔ آپ کے پیشِ نظر ''شاندار ماضی'' کی تصنیف کے دو مقصد تھے :

اوّل یہ کہ سیاسی تحریک میں علماء کی شرکت کو علماء کی شان کے خلاف ایک طرح کی بدعت قرار دیا جا رہا تھا، اس کتاب میں ظاہر کیا گیا ہے کہ علماء نے ہر دور میں اسی دور کی سیاست کے مطابق عملی حصہ لیا اور سزائیں بھگتی ہیں۔ لہٰذا اس دور میں اسی دور کے تقاضا کے مطابق تحریک میں حصہ لینا علماء کی شان کے خلاف نہیں بلکہ ان کی تاریخی روایات کو زندہ کرنا

ہے۔ دوسرا مقصد تحریکِ آزادی کو تقویت دینا تھا، اس لیے ان مظالم کی تاریخ بیان کی گئی تھی جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے آغاز سے اس وقت تک انگریزوں نے کیے تھے۔ اس کے قریب قریب زمانہ میں ایک بار خانہ تلاشی بھی لی گئی تھی لیکن پولیس کو کوئی مواد نہیں ملا۔

سیاسیات :

والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ مارچ ۱۹۲۸ء میں مدرسہ شاہی پہنچے (۸) ان کی تحریرات میں ہے کہ مدرسہ شاہی کی فضا مزاج کے موافق مل گئی کہ دارالعلوم دیوبند کی طرح یہ مدرسہ بھی سرکاری امداد اور سرکاری اثرات سے پاک تھا۔ اس مدرسہ کے صدرالمدرسین حضرت مولانا سیّد فخرالدین صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ تھے جو بعد میں دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث اور جمعیۃ علماء ہند کے صدر ہوئے۔ مولانا موصوف شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحبؒ کے خاص شاگرد اور سیاسی خیالات میں اُن کے پختہ معتقد تھے۔ تحریکِ خلافت میں اگرچہ جیل نہیں گئے مگر کام بہت کیا تھا، زیادہ تر آپ ہی کی خدمات تھیں جن کی وجہ سے مدرسہ شاہی نے سیاسی تحریک کے سلسلہ میں خاص امتیاز حاصل کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ ''سائمن کمیشن'' ہندوستان پہنچ کر ناکام واپس ہوا تھا اور تقریباً سات سال کی خاموشی کے بعد جب ۱۹۳۹ء شروع ہوا تو ہندوستان میں مختلف تحریکوں نے جنم لینا شروع کیا۔ اُس وقت ولبھ بھائی پٹیل اور گاندھی نے تحریک شروع کی تھی، لہٰذا یہ سوال پیدا ہوا کہ مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیے؟ جمعیۃ علماء ہند نے اس سوال پر غور کرنے اور مسلمانوں کی صحیح رہنمائی کے لیے امروہہ میں اجلاس کیا۔ مولانا معین الدین صاحب اجمیری رحمہ اللہ اس اجلاس کے صدر تھے۔

مسلمانوں میں ایک جماعت وہ تھی جو تحریکِ آزادی میں شرکت سے پہلے ہندو مسلم معاہدہ کو ضروری سمجھتی تھی۔

لیکن دوسری جماعت جن کی سربراہ جمعیۃ علماء ہند تھی، اس کا یقین یہ تھا کہ جدوجہد آزادی ایسا فرض ہے جو دوسرے برادرانِ وطن (۹) سے زیادہ مسلمانوں پر عائد ہوتا ہے۔ برادرانِ وطن اس کو صرف سیاسی مسئلہ سمجھتے ہیں مگر مسلمانوں کے لیے اس کی نوعیت مذہبی

مسئلہ کی بھی ہے جس کا مدار کسی معاہدہ پر نہیں ہے، علاوہ ازیں وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ برطانیہ کے سیاسی اقتدار بلکہ اس کے سیاسی جبروت کے دور میں کسی متفقہ معاہدہ کا تصور جوئے شیر کے تصور سے کم نہیں ہے، چنانچہ جیسے ہی جمعیۃ علماء ہند نے امروہہ میں اجلاس عام کا اعلان کیا دوسری جماعت جمعیۃ علماء اسلام کے نام سے کھڑی ہوگئی اور اس نے بھی ان ہی تاریخوں میں امروہہ میں اپنی جمعیۃ کا اجلاس کیا۔

والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کو مدرسہ شاہی مرادآباد میں کام کرتے ہوئے ابھی ایک سال ہی ہوا تھا کہ سیاسی فضا میں یہ گرمی پیدا ہوگئی، اسی سال جب جمعیۃ علماء مرادآباد کا انتخاب ہوا تو آپ کو نائب ناظم بنادیا گیا۔

کچھ روز بعد جمعیۃ علماء ہند نے ''شاردا ایکٹ'' کی تحریک چلائی تو آپ نے پوری سرگرمی سے اس میں حصہ لیا حتی کہ موٹو (۱۰) وغیرہ اپنے ہاتھ سے تحریر فرمائے۔ ضابطہ کے لحاظ سے جمعیۃ علماء ہند کے اجلاس میں شریک نہیں ہو سکتے تھے، کیونکہ اس کے رکن نہیں تھے لیکن بہرحال شرکت کا موقع ملا۔ وہ تحریر فرماتے ہیں کہ میں نے علماء کی بحثیں سنیں، کچھ قانون دان وکیل اور ایک بیرسٹر صاحب اور ایک بڑے عالم (۱۱) جو سرکار کے حامی تھے، صدر کی اجازت سے وہ بھی اجلاس میں شریک ہوئے اور جناب صدر نے اُن کو بھی بحث میں حصہ لینے کی اجازت دی، انہوں نے کانگریس کے خلاف تقریریں کیں اور یہ کہ مسلمانوں کو اس میں حصہ نہ لینا چاہیے۔ ان کے پیش کردہ دلائل ان کی نظر میں مضبوط ہوں گے مگر مجھے نہایت لچر معلوم ہوئے۔

جمعیۃ علماء کے ارکان میں سے حضرت سیّد سلیمان صاحب ندوی اور مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب، حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ کی تقریروں نے مجھے متاثر کیا۔ سیّد صاحب کی تقریر تاریخی اور سیاسی نوعیت کی تھی اور شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے مذہبی حیثیت سے روشنی ڈالی تھی، مولانا حفظ الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس تجویز کے محرک تھے، آخر میں اُن کی تقریر بھی ہوئی مگر وہ اس وقت اتنے اُونچے درجہ کے مقرر نہیں تھے۔

رات کو جلسۂ عام ہوا جس میں مولانا شاہ عطا اللہ صاحب بخاری کی تقریر ہوئی، غالباً تین گھنٹے تک وہ تقریر جاری رہی، معلوم ہوتا تھا کہ آگ کے شعلوں کی بارش ہو رہی ہے۔ ''چیرز'' [cheers] تالی، مستی وغیرہ نہیں ہوتے تھے بلکہ مضطربانہ نعرے بلند ہوتے تھے، کچھ پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ بہر حال میں جذباتی لحاظ سے اس تقریر سے متاثر ہوا۔

اجلاس ختم ہوا تو میں مرادآباد واپس ہوا اور حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ بھی مرادآباد تشریف لائے۔ میں نے چاہا کہ اجلاس اور جلسہ کی ہماہمی کے علاوہ سکون اور اطمینان کی صورت میں بھی حضرت شیخ سے استصواب کروں۔ چنانچہ احقر نے تنہائی میں حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ سے عرض کیا کہ کیا مجھے تحریک میں حصہ لینا چاہیے؟ مولانا کا جواب لامحالہ اثبات میں تھا!

مزید فرمایا یورپ خصوصاً برٹش نے دنیا کے بہت سے ممالک کو اپنے تسلط اور چیرہ دستی کے شکنجہ میں کس رکھا ہے اور برٹش کی یہ طاقت ہندوستان کی وجہ سے ہے ہندوستان پر برٹش کی گرفت کچھ بھی ڈھیلی پڑتی ہے تو ان کمزور ممالک پر بھی اس کا اثر پڑتا ہے اور انہیں سانس لینے کا موقع ملتا ہے۔

حضرت شیخ کے اس ارشاد کے بعد احقر کو پوری طرح انشراح ہو گیا، چنانچہ حضرت مولانا فخر الدین صاحب کا دست و باز و بن کر تحریک پر کام شروع کر دیا۔ چند روز میں پورے مرادآباد پر تحریک چھا گئی اور صوبہ سرحد کے بعد مرادآباد کی یہ خصوصیت تھی کہ یہاں کانگریس پر مسلمان چھائے ہوئے تھے۔

مجاہدانہ کارنامے اور شجاعت :

۱۹۳۰ء میں مرادآباد کے الیکشن میں جو ٹاؤن ہال میں ہو رہا تھا پولیس نے مجمع پر گولی چلائی اور لاٹھی چارج کے بعد گھوڑے دوڑا دیے۔ والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں کہ:

''وہ اسی میدان میں تھے اور آخر تک رہے، خدا کی حفاظت تھی کہ عجیب وغریب طرح گھوڑوں کی ٹاپوں اور فائرنگ کی گولیوں سے بچے، فائرنگ بند ہوگئی تو زخمیوں کو اُٹھوایا! عبدالنبی ایسا مجروح ہوا کہ جاں بر نہ ہوسکا، دوسرے زخمی اچھے ہوگئے۔''

والد صاحب نے تحریر فرمایا ہے کہ پشاور میں قصہ خوانی بازار کے فائرنگ کے بعد یہ یوپی میں پہلا فائرنگ (کا واقعہ) تھا، اس کے بعد برابر پامردی اور تسلسل کے ساتھ ساری عمر تدریس وافتاء تصنیف وتالیف عبادت وریاضت کا سلسلہ بھی جاری رہا۔

حضرت مولانا مفتی محمود صاحب مدظلہم نے بھی اسی دور میں والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ سے ادب کی کتابیں اور ترمذی شریف پڑھی ہے۔ حضرت مفتی محمود صاحب والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا مذکورہ بالا واقعہ بھی ذکر فرماتے تھے اور فرماتے تھے کہ اَلنَّفْسُ لَا تَتَوَجَّهُ اِلٰی شَیْئَیْنِ فِیْ اٰنٍ وَّاحِدٍ کا قاعدہ ان کے یہاں منقوض تھا۔ وہ سبق پڑھاتے پڑھاتے بھی لکھ لیا کرتے تھے۔

میں نے اپنے بچپن میں دیکھا تھا کہ والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ باقاعدہ ورزش کیا کرتے تھے مُگدر (مونگریاں) بھی گھمایا کرتے تھے، گویا جہاد کیلئے ہر وقت تیاری رکھتے تھے۔

بے تاج بادشاہ :

والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ تقریباً سولہ سال مرادآباد رہے اور جماعتی کام اور تصانیف اسی دور میں شروع فرمائیں، اس لیے عموماً لوگ انہیں مرادآبادی سمجھنے لگے۔ ان سے اہلِ مرادآباد کے تعلق کا یہ حال تھا کہ حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ ان کو مرادآباد کا ''بے تاج بادشاہ'' فرمایا کرتے تھے۔ اہلِ مرادآباد کی پرخلوص محبت ہی تھی کہ والد صاحبؒ کی وجہ سے مرادآباد آنے والے رشتہ دار اب تک وہیں ہیں اور بعض حضرات وہیں پیوندِ خاک ہوگئے۔

قید وبند :

۱۹۳۴ء میں جیل جانا ہوا، رہائی کے بعد مرادآباد میں کرایہ پر مکان لیا اور سب اہلِ

خانہ کو محترم دادا جان اور دادی صاحبہ سمیت دیوبند سے بُلا لیا۔ میں نے دیوبند میں جناب مولانا قاری اصغر علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے الف با کا قاعدہ شروع کیا تھا، مراد آباد آنے پر قرآنِ کریم شروع کیا۔

والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا حافظہ بہت قوی تھا، غیر متعلق کتابیں بھی یاد تھیں۔ میں نے ان سے صرف ایک کتاب پڑھی ہے ''مقامات حریری'' ورنہ ادب کی تعلیم حضرت مولانا عبدالحق صاحب مدنیؒ (۱۲) سے حاصل کی ہے، لیکن اگر میں والد صاحبؒ سے مقامات نہ پڑھتا تو لغت میں دقتِ نظر جو ہمارے ہندوپاک کا خصوصی حصہ چلا آ رہا ہے، نہ پیدا ہوتی۔

''مقامات'' پر والد صاحبؒ کی تعلیقات ہیں جو بیشتر فِقْـهُ اللُّغَةِ لِلثَّعَالِبِیْ سے لی گئی ہیں لیکن یہ سب ان کو اتنی یاد تھیں کہ مطالعہ کے لیے صرف ایک نظر ڈالا کرتے تھے اور اثناء درس تمام تفاصیل دُہرا دیا کرتے تھے جو اَز بر تھیں، اسی طرح اور بھی درسی کتب پر تعلیقات ہیں جو انہوں نے پڑھائی ہیں، ان کے علاوہ کافی ضخیم نوٹ بکیں علیحدہ ہیں۔ یہ سارا علمی ذخیرہ غیر مطبوعہ ہے۔

دوپہر کے وقت گھر جانے کے بجائے جو محلّہ مغل پورہ مراد آباد میں تھا، مدرسہ ہی میں وقت گزارتے اور افتاء کا کام انجام دیتے۔ میں گھر سے کھانا لے آتا تھا، کھانے کا وقت بھی ڈبل کاموں میں صرف فرماتے تھے کہ ظہر کے بعد کے اسباق کا مطالعہ ساتھ ساتھ فرماتے، انہیں شام کے سبق پڑھانے کیلئے اتنا مطالعہ کافی ہوتا تھا اور صبح کے وقت کے اسباق کا مطالعہ نماز فجر کے بعد تلاوت وذکر بارہ تسبیح سے فراغت کے بعد چائے پیتے وقت فرماتے تھے۔

میں نے والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے کبھی کبھی مختلف کتابوں کے مقامات بھی حل کیے ہیں جنہیں وہ بلا مطالعہ ہی زبانی حل کرا دیتے تھے اور وہ اُستاذِ کتاب سے بہتر طرح حل ہوتا تھا۔

میں نے بھی تقریباً تمام ہی کتابیں جامعہ قاسمیہ مراد آباد میں پڑھی ہیں، شمس بازغہ، شرح چغمینی، شرح عقائد دوّانی، توضیح وتلویح۔ حضرت مولانا عجب نور صاحب رحمۃ اللہ علیہ

(۱۳) سے پڑھنے کا موقع ملا، البتہ آخری دو سال سے کچھ زیادہ دارُالعلوم دیوبند میں پڑھتا رہا ہوں۔

جیل خانے یا عبادت گاہیں، ان حضرات کے مشاغل کی ایک جھلک :

۱۹۲۸ء سے ۱۹۴۴ء تک والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ چار مرتبہ مراد آباد سے اور ایک مرتبہ دہلی سے گرفتار ہوئے، بامشقت سزا بھی دی گئی! جیل ہی میں حفظ قرآن پاک شروع کیا سولہ پارے متعدد جیلوں میں یاد کیے!

۸؍اگست ۱۹۴۲ء کو وہ تحریک شروع ہوئی جس کا نام ''کوئیٹ انڈیا'' ''ہندوستان چھوڑ دو'' والی تحریک مشہور ہوا، حسنِ اتفاق کہ اس میں گرفتار شدگان اکابر سب ہی مراد آباد جیل میں جمع ہو گئے۔

حضرت اقدس مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ حسن پور ضلع مراد آباد میں ایک تقریر کی وجہ سے پہلے ہی گرفتار کر لیے گئے تھے، والد صاحب اس وقت باہر تھے، اس دوران حضرت مدنیؒ کے جو گرامی نامے والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نام صادر ہوتے رہے وہ ''گورنر'' یا ''صوبہ دار'' کے عنوان سے معنون (۱۴) آتے رہے جیسا کہ مکتوباتِ شیخ الاسلامؒ کے مطالعہ سے معلوم ہوگا۔ حضرت اقدس مولانا حسین احمد مدنی، مولانا حفظ الرحمٰن صاحب، مولانا محمد اسمٰعیل صاحب سنبھلی (جو اِس قید کے بعد حضرت مدنیؒ کی خلافت سے مشرف ہوئے) حضرت مولانا الحافظ القاری المقری محمد عبداللہ صاحب تھانوی (۱۵) اور حافظ محمد ابراہیم صاحب سب ہی اسی جیل میں تھے۔ چند روز بعد رمضان شریف آ گیا تو جیل خانہ کی پارک تراویح گاہ بن گئی!

شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ تراویح پڑھاتے تھے اور مولانا حافظ قاری عبداللہ صاحب سماعت کیا کرتے تھے! ! ! **رحمهم الله رحمة واسعة.**

اکتوبر میں والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی (گرفتار ہو کر) ان میں شامل ہو گئے تھے۔ وہاں شیخ الاسلامؒ سے درسِ قرآن پاک کا سلسلہ بھی شروع کیا گیا مگر یہ درس ایک ہفتہ

ہونے پایا تھا(۱۶) کہ حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ العزیز کو مراد آباد سے نینی جیل (الہٰ آباد) منتقل کر دیا گیا۔ یہ حضرات جن کے لیے یہ جیل خانہ ایک عبادت گاہ اور درس گاہ بن گئی تھی حضرت اقدسؒ کی مفارقت پر تڑپتے رہ گئے۔

کچھ عرصہ بعد والد صاحبؒ اور حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ کو بھی بریلی سینٹرل جیل منتقل کر دیا گیا اور دوسرے بقیہ حضرات کو بھی مختلف مقامات پر۔ والد صاحب جیل ہی میں تھے کہ دادا جان رحمۃ اللہ علیہ کی وفات ہوئی۔ دادا جان رحمۃ اللہ علیہ کو تنفس (دمہ) کا عارضہ تھا۔ ۱۹۳۴ء کے بعد ایک دفعہ جب والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ اسیر تھے، ایک دن میں کچھ اشعار پڑھ رہا تھا، دادا جان مرحوم پر اِن کا بہت اثر ہوا! اب مجھے اس نظم کے صرف تین مصرعے یاد ہیں یہ نظم مخمس کے طرز پر تھی۔

بلبلِ بے خانماں اب تو چمن سے دور ہے　　　گردشِ تقدیر سے لاچار ہے مجبور ہے

اس کا چھٹا مصرعہ یہ تھا :

کیوں میرا نورِ نظر آنکھوں سے میری دُور ہے

اس زمانے میں متعدد بار ایسا ہوا کہ دادا جان رحمۃ اللہ علیہ یہ نظم رات کو مجھ سے سنتے اور ہر دفعہ اُن پر اس کا شدید اثر ہوتا، لیکن وہ نہایت متحمل مزاج اور صابر تھے، کبھی اثر بھی ظاہر نہیں ہوتا تھا حتی کہ والد صاحب سے بھی ان کے جیل آنے یا جانے پر کسی قسم کی بیتابی وغیرہ کا کبھی اظہار نہیں ہوا نہ کبھی انہیں سیاست سے روکا۔

جب ۱۹۴۴ء میں والد صاحب جیل میں گئے تو دادا جان رحمہ اللہ کی علالت بڑھی حتی کہ آپ نے وفات پائی۔ ہماری رہائش محلّہ مغلپورہ میں تھی، مغل خاندان کے حضرات ان کا بزرگوں کی طرح اکرام کرتے رہے اور ہم سے رشتہ داروں کی طرح ملتے رہے۔ ان ہی حضرات کی ایک مسجد ہے اس کے گرد اُن کے خاندان کے لوگ مدفون ہیں ان ہی میں صحنِ مسجد کے مشرقی حصہ سے متصل ان کی قبر مبارک ہے۔ مکتوبات شیخ الاسلام جلد چہارم میں مکتوب نمبر ۱۰۰ میں ان کی وفات پر تعزیت فرمائی گئی ہے۔ یہ واقعہ ربیع الاوّل ۱۳۶۳ھ جون

یا جولائی ۱۹۴۴ء کا ہے۔

۲۶ راگست ۱۹۴۴ء ۶ ر رمضان ۱۳۶۳ھ کو حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ کی رہائی ہوئی، فوری آرڈر دیا گیا کہ وہ نینی جیل سے باہر تشریف لے جائیں، انگریز کی طاقت بھی جنگ کے اثرات سے مضمحل ہوگئی تھی، وہ ہندوستان سے اپنی گرفت ڈھیلی کرنا چاہتا تھا۔

جمعیۃ علماء ہند کی نظامت :

سہارنپور میں جمعیۃ علماء ہند کا اجلاس ۲۱ رجمادی الاوّل ۱۳۶۴ھ ۴ رمئی تا ۷ رمئی ۱۹۴۵ء کو رکھا گیا جس میں مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کو ''ناظم اعلیٰ'' اور والد صاحبؒ کو ''ناظم جمعیۃ علماء ہند'' چنا گیا۔ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے عہدہ قبول کرنے کے لیے یہ شرط رکھی تھی کہ والد صاحب ناظم بنیں اور حضرت اقدس مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا ایسا حکم والد صاحب کے لیے دُوسری بار تھا۔ نظامت کے فرائض بہت تھے، اس لیے رفتہ رفتہ مرادآباد کو خیر باد کہنا پڑا۔

۱۹۴۷ء کے بعد حالات اور خدمات :

۱۹۴۸ء میں کرایہ پر مکان لے کر اہلِ خانہ کو مرادآباد سے دہلی بلا لیا اور مستقل طور پر دہلی رہنے لگے، درس وتدریس کا مشغلہ چھوڑنا پڑا۔

لیکن اس وقت ملک میں مسلمانوں کی حالت ناگفتنی تھی، مشرقی پنجاب اور ہماچل میں مسلمان ہندوانہ وضع یا سکھوں کی وضع اختیار کرکے زندگی گزار رہے تھے، جہاں تباہ شدہ مسلمانوں کی تعداد ایک فی ہزار رہ گئی تھی۔

جمعیۃ علماءِ ہند کے حضرات نے وہاں دورے کیے، حوصلے دلائے، شبینہ مکاتب (نائٹ کلاسیں) شروع کیے، مسلمان جو چھپے ہوئے تھے برآمد ہونے لگے۔

اس کے لیے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ نے آٹھویں جماعت تک دینیات کا بارہ رسائل پر مشتمل ایک نصاب تحریر فرمایا، اس کے لیے معاون تعلیمی چارٹ بھی بنوائے۔ میں نے دیکھا ہے کہ وہ یہ رسائل باوضو تحریر فرمایا کرتے تھے۔ رسائل دینیہ کا یہ نصاب ہندوستان بھر میں مقبول ہوا۔

از ہر شاہ صاحب قیصر مدظلہم ابن حضرت مولانا انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ رسالہ ''دارالعلوم'' کے ایک تعزیتی نوٹ میں جو انہوں نے دسمبر ۱۹۷۵ء کے پرچہ میں لکھا تھا تحریر فرماتے ہیں (☆) :

''جمعیۃ کی سیاسی خدمات سے دنیا کو متعارف کرانے والے مولانا موصوف ہی تھے، دسیوں کتابیں آپ نے لکھیں اور بڑی محنت و جانفشانی سے لکھیں، سیاسی علماء پر مولانا کے جو احسانات ہیں وہ بُھلائے نہیں جاسکتے۔ مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب رحمہم اللہ کے دورِ نظامت میں آپ نے ''دینی تعلیم کا رسالہ'' سات حصوں میں چھوٹے بچوں کے لیے لکھا اور اسے اپنے اہتمام میں عمدہ کتابت و طباعت سے شائع کرایا اور بحیثیت مصنف اس پر اپنا نام درج نہیں کیا۔ یہ مولانا کے اخلاص کا نتیجہ تھا کہ دینی تعلیم کا رسالہ پورے ملک میں بہت مقبول ہوا!
اس سے پہلے آپ نے بچوں کے لیے ''تاریخ الاسلام'' نام کا رسالہ تین حصوں میں لکھا تھا، کہا جاسکتا ہے کہ آج کوئی بچے والا گھر ان رسالوں سے خالی نہیں!!!
میرا اندازہ ہے کہ چھوٹی بڑی کوئی پچاس کتابوں کے آپ مصنف ہیں''۔(۱۷)

(☆) یہ تعزیتی نوٹ از ہر شاہ قیصر نے نہیں مفتی ظفیر الدین صاحب مفتاحیؒ نے لکھا تھا، تقریباً ۱۷رسال اداریہ نویسی کی خدمت مفتی ظفیر صاحب نے انجام دی ہے، از ہر شاہ قیصر کا نام بحیثیت مدیر کے رسالہ پر رہتا تھا، نہ جانے کس مصلحت کی وجہ سے مفتی کا نام نہیں دیا جاتا تھا۔ اس اداریہ میں یہ تحریر ہے:

''میں نے ابھی تک مولانا کی صورت نہیں دیکھی تھی، غالباً جون ۱۹۴۷ء میں امیر شریعت ثالث کا انتخاب ڈھاکہ ضلع چمپارن میں ہو رہا تھا، اس اجلاس کی صدارت کے لیے مولانائے محترم وہاں تشریف لائے، یہیں سب سے پہلے میں نے مولانا کو دیکھا اور کہنا چاہیے دور سے دیکھا، نہ جان پہچان، نہ بات چیت۔ ۱۳۷۶ھ میں قسمت مجھے دیوبند کھینچ لائی اور اس طرح یہاں میرا مستقل قیام ہو گیا۔''

ظاہر ہے کہ یہ بات از ہر شاہ قیصر تو نہیں لکھ سکتے ہیں، وہ تو دیوبند ہی کے تھے، چونکہ اداریہ عموماً ایڈیٹر کے قلم سے ہوتا ہے اس لئے سب نے اسے از ہر شاہ قیصر کی طرف منسوب کر دیا ہے۔ واضح رہے مفتی ظفیر صاحب کی تقرری دیوبند میں ۱۳۷۶ھ میں ہوئی تھی۔ (ضیاء الحق خیرآبادی)

یہ رسالے اوران کے معاون عمدہ چارٹ ایک نہایت عمدہ تعلیمی سیٹ ہے اوراب یہ رسالے گیارہ حصوں میں ہیں۔ بچوں کے لیے ابتداء سے آٹھویں جماعت تک کے لیے ان میں آداب واخلاق، عقائد وعبادات اورضروری مسائل سب دلچسپ پیرایہ میں ہیں۔

☆ ''علماءِ حق اوراُن کے مجاہدانہ کارنامے'' دوحصوں میں ہیں :

پہلے حصے میں ۱۸۵۷ء سے حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہ العزیز کے دورتک کے حالات ہیں۔

دوسرا حصہ زیادہ ضخیم ہے، اس میں ان علماء کے حالات ہیں جنہوں نے قید وبند کی صعوبتیں برداشت کیں یا اُن کے معاون رہے۔ یہ کتاب اسی نقطۂ نظر سے شاندار ماضی کی طرح لکھی گئی ہے۔ اس میں ۱۹۴۷ء تک کے حالات ہیں۔

☆ ''جمعیۃ علماءِ ہند کیا ہے؟'' اور

☆ ''مختصر تذکرہ خدماتِ جمعیۃ علماء ہند'' دوحصوں میں تحریر فرمائیں۔ یہ بھی اسی طرح کی کتابیں ہیں۔

۱۹۴۷ء کے بعد ایک طرف تو یہ تھا کہ (خوف زدہ چھپے ہوئے) مسلمانوں کو برآمد کیا جائے، دوسری طرف ان کی تصانیف سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی نظر اس چیز پر منعطف ہوکر رہ گئی تھی کہ مسلمانوں کو اسلام پر کیسے قائم رکھا جائے۔

آخر عمر میں آپ نے پھر پڑھانا بھی شروع کردیا تھا، مدرسہ امینیہ میں شیخ الحدیث وصدر مفتی کے فرائض انجام دینے کے ساتھ ساتھ اپنے نقطۂ نظر سے بلند پایہ محققانہ تصانیف کا کام انجام دیتے رہے۔

مجھ سے ایک مرتبہ گفتگو فرمارہے تھے تو یہ جملہ ارشاد فرمایا کہ

''مجھے دوبار ہندو مسلم لیڈروں نے متفقہ طور پر بلا مقابلہ ممبر منتخب ہو جانے کی پیشکش کی لیکن میں نے اسے پسند نہیں کیا۔''

میں نے عرض کیا کہ ضرور قبول کرلینی چاہیے تھی بہت سے کام ہوسکتے تھے۔

اس پر ذرا خفگی سے جواب دیا کہ ''تم بھی ایسی باتیں کرتے ہو!''
مطلب یہی تھا کہ ان کا ذہن اس طرف رواں تھا کہ ایسی تحریرات سامنے آنی چاہئیں جو مسلمانوں کی بقاء اور ترویجِ اسلام کا ذریعہ بنیں او رممبر ہونے کے بعد آدمی اور کاموں میں پھنس جاتا ہے۔

سیّد محبوب صاحب رضوی لکھتے ہیں :

''مولانا سیّد محمد میاں علم وعمل کا پیکر اور مشہور عالم ہیں بہار اور پھر مراد آباد میں عرصہ تک درس وتدریس کا مشغلہ رہا۔ پھر مرکزی جمعیۃ علماء ہند کی نظامت کے فرائض انجام دیتے رہے۔
علماء کی سیاسی خدمات سے عوام کو روشناس کرانے میں آپ نے زبردست تصنیفی کارنامہ انجام دیا ہے۔
☆ جمعیۃ علماء کی سیاسی تاریخ اور اس کے ریکارڈ کے آپ تنہا مصنف ہیں۔
☆ تاریخ اسلام ☆ علماءِ ہند کا شاندار ماضی ☆ علماءِ حق کے مجاہدانہ کارنامے وغیرہ کتابیں ان کی گراں قدر تصانیف ہیں۔
☆ جمعیۃ علماءِ ہند کا تعلیمی نصاب بھی آپ ہی کے قلم کا رہینِ منت ہے۔
☆ بچوں کے لیے نصابی کتابیں ان کی نفسیات کے مطابق لکھنے کا اُن کو خاص ملکہ ہے، ان کی تصانیف کو قبولِ عام حاصل ہے۔
اس وقت مدرسہ امینیہ کے شیخ الحدیث اور ادارۂ مباحث فقہیہ کے معتمد ہیں۔''(۱۸)

۱۹۴۷ء کے بعد پیش آنے والے حالات کے ضمن میں ایک جگہ والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے تحریر فرمایا ہے :

''۱۵/اگست ۱۹۴۷ء کے بعد فرقہ واریت کے وہ ہنگامے شروع ہوگئے جو آج تک ختم نہیں ہوئے، ان کی داستان طویل بھی ہے اور درد ناک بھی۔ ان ہنگاموں نے خدمات کا ایک نیا باب قائم کیا جس کا عنوان ''ریلیف'' ہے یعنی کُشتگانِ ستم (ظلماً قتل ہونے والے) کو دفنانا، مجروحوں کے جسم پر دوا کی پٹیاں

باندھنا اور زخمی دلوں پر تسکین اور دلداری کا مرہم لگانا، اُجڑے ہُوؤں کو بسانا۔"

جدید دفتر جمعیۃ علماء ہند :

آپ نے متعدد مساجد واگزار کرائی تھیں جن میں ایک مسجد "عبدالنبی" تھی جو نئی دہلی میں ہے، اس سے ملحق کافی جگہ تھی، وہاں آپ کی خواہش تھی کہ جمعیۃ علماءِ ہند کا مرکزی دفتر بنائیں جو اَب بحمداللہ بن گیا ہے۔

ایک شاہی دور کی وسیع مسجد جو تقریباً مسجد فتح پوری کے برابر ہوگی، سنگِ سرخ کی بنی ہوئی ہے، لبِ دریائے جمنا ہے، اس کا نام غالباً حسنِ منظری کے باعث "گھٹا مسجد" پڑا ہے، انہیں بہت پسند تھی۔ اس کے گرد مکانات بنے ہوئے تھے جن پر "شرنارتھیوں" (بے وطن ہندوں) کا قبضہ تھا وہ مسجد بھی واگزار کرائی۔ وہاں ایک سہ ماہی تربیتی کورس فضلاء مدارس کے لیے شروع کیا تھا اور خود ہی پڑھاتے تھے۔

آخری دور کی تصانیف :

انہوں نے ہر موضوع پر ایسی کتابیں تحریر فرمائیں جن سے مسلمانوں کو علمی مواد فراہم ہو جائے اور غیر مسلموں کو اسلام کی دعوت بھی ہو۔

☆ "اسلام کے اقتصادی اور سیاسی مسائل" کے نام سے اقتصادیات پر ایک کتاب تحریر فرمائی

☆ "آنے والے انقلاب کی تصویر" ۱۹۳۸ء میں یہ ایک رسالہ تحریر فرمایا تھا اس میں جو معلومات جمع کی گئی ہیں اور خاکہ مرتب کیا ہے وہ اس دور میں اُن کی نگاہِ دور بین کا شاہکار ہے۔ یہ کتاب اگرچہ زمانہ تحریر کے اعتبار سے پرانی ہے مگر مضمون کے لحاظ سے جدید ہے۔

☆ "سیرتِ مبارکہ" کے نام سے ایک ضخیم کتاب سیرت پر لکھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب غیر مسلموں کو دعوت دینے ہی کے لیے لکھی ہے، اسی لیے اسے سب سے پہلے "انسان" کے عنوان سے شروع کیا گیا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ عجیب معلومات سے پُر ہے۔ اس کے بارے میں عبدالماجد دریابادیؒ لکھتے ہیں :

''کتاب جس قدر لوازمِ ظاہر کے لحاظ سے خوشنما اور دلفریب ہے اسی قدر معنوی حیثیت سے قابلِ داد اور اعلیٰ ہے۔ سیرتِ مبارکہ پر بڑی چھوٹی کتابیں اب تک اُردو میں بے شمار لکھی جا چکی ہیں اور بعض بڑی بلند پایہ ہیں (مثلاً شبلیؒ وسلیمانؒ کی سیرۃ النبی) لیکن یہ سب سے نرالی سب سے انوکھی سب سے البیلی ہے، فاضلانہ مگر خشک مطلق نہیں، مختصر مگر مجمل کہیں سے نہیں، مفصل مگر بارِ خاطر کہیں سے بھی بننے والی نہیں، عام پسند مگر عامیانہ ہونے کے شائبہ سے بھی پاک، نُدرت سے لبریز مگر غرابت واجنبیت سے سراپا پرہیز وگریز، اسلوبِ بیان ایسا کہ بغیر دیکھے اور پڑھے اس کا ذہن میں آنا دُشوار ہے۔ کتاب تمام تر بیسیوں صدی کے ناظرین کو پیشِ نظر رکھ کر لکھی گئی ہے۔ الخ''

☆ ''عہدِ زریں'' مغازی (آپ علیہ السلام کے جہادی معرکے) رسالت مآب ﷺ پر ایک بیش قیمت کتاب تصنیف فرمائی، اس میں صحابہ کرامؓ کے احوال مبارکہ بھی ہیں۔ اس کی دونوں جلدیں سیرت مبارکہ کی جلد دوم وسوم کا درجہ رکھتی ہیں۔ یہ کتاب ''ازا لۃ الخفاء'' مصنفہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے طرز پر لکھی گئی ہے اور اس میں اُس کے مضامین کی تشریح بھی ہے۔ عام فہم ہے اور علماء میں بہت مقبول۔

☆ ''شواہد تقدس'' سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ پر مودودی صاحب کے اعتراضات کے جوابات میں تحریر فرمائی تھی۔

☆ ''مشکوٰۃ الآثار'' احادیث کی ایک کتاب جو دارالعلوم دیوبند کے نصاب میں داخل ہے۔

☆ ''ترجمہ نورالایضاح'' فقہ میں۔

☆ ''ہمارے پیغمبر'' اور

☆ ''تاریخ اسلام'' بچوں کے رسائل میں بہت پہلے کی تصانیف ہیں۔

☆ ''اسیرانِ مالٹا'' مالٹا میں قید وبند کی صعوبتیں برداشت کرنے والے حضرات کے احوال پر مشتمل ایک کتاب۔

۱۹۷۴ء میں والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مجھے تحریر فرمایا تھا کہ جب حضرت مدنی نوراللہ مرقدہٗ نے خودنوشت سوانح حیات تحریر فرمائی تو میں نے دیکھ کر عرض کیا کہ یہ سوانح حیات تو نہیں نقشِ حیات ہے، معلوم ہوتا ہے کہ حضرت اقدسؒ کو اِن کا یہ جملہ پسند آیا تو آپ نے اس کا نام ''نقشِ حیات'' رکھ دیا، اسی گرامی نامہ میں یہ اطلاع بھی تھی کہ اب آپ (۱۹۷۵ء) میں حضرت مدنی رحمہا اللہ تعالیٰ کی سوانح حیات تحریر فرما رہے ہیں جو غالبًا مفصل ہوتی لیکن اس کے بارے میں پھر کچھ علم نہیں ہوسکا۔

☆ ''تحریکِ شیخ الہندؒ'' ۱۹۷۵ء ہی میں آپ نے انڈیا آفس لائبریری کی سی آئی ڈی کی رپورٹوں سے ایک کتاب مرتب فرمائی جس کا افتتاح غالبًا ۵؍جولائی ۱۹۷۵ء کو صدرجمہوریۂ ہند نے اپنے قصرصدارت میں کیا جس میں تقریباً تمام وزراء مع وزیراعظم، ارکانِ اسمبلی ومعززین سب ہی کو بڑی تعداد میں مدعو کیا گیا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ سے بہت عقیدت تھی اور شاید اسی بناء پر ہندوستان کے صدر فخرالدین علی احمد صاحب نے اس کا افتتاح اس بڑے پیمانہ پر کیا، نیز یہ منشاء بھی ہوگا کہ حقیقتاً قربانی دینے والے حضرات کے احوال سامنے آنے چاہئیں۔ حقیقتاً جدوجہدِ آزادی شروع کرنے والے اور اِسے پروان چڑھانے والے حضرات میں خصوصاً طبقۂ علماء ہی تھا، نہ کہ نواب، جاگیردار اور سَر وغیرہ کے خطابات حاصل کرنے والے لوگ، یہ لوگ تو خال خال ہی ہوں گے جنہوں نے جدوجہد آزادی میں حصہ لیا ہو۔

زہدوللّٰہیت :

کیونکہ والد ماجدؒ جدوجہد آزادی میں پانچ مرتبہ گرفتار ہوئے تھے، اس لیے ۱۹۷۵ء میں آپ کو حکومت ہند کی طرف سے وظیفہ اور مکان کی سہولتوں وغیرہ کی پیشکش کی گئی، ''تانبر پتر'' (شیلڈ) بھی دیا گیا، جس پر کارنامے کندہ ہوتے ہیں اور وزیراعظم کے دستخط ثبت ہوتے ہیں۔

تانبر پتر انہوں نے رکھ لیا اور یہ فرما کر رکھا کہ یہ میں اس لیے لے رہا ہوں کہ جہاد

آزادی میں مسلمانوں کی شمار میں اس سے اضافہ ہوگا، باقی چیزیں قبول نہیں کیں۔
حضرت اقدس مدنی رحمۃ اللہ علیہ کو بھی یہ چیزیں اور سرکاری لقب پیش کیا گیا تھا، اُنہوں نے بھی یہ تختی رکھ لی تھی باقی چیزیں قبول نہیں فرمائی تھیں، اسی طرح والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے کیا۔

سلوک واحسان :

جب ہم ۱۹۳۴ء میں مراد آباد آئے تو مجھے اس وقت سے یاد ہے کہ مغرب بعد پابندی سے ذکرِ جہر کیا کرتے تھے۔ صبح کو ورزش بھی کرتے تھے وہ ذکر و جہاد اور علم و تبلیغ کے جامع تھے۔

حضرت اقدس مدنی قدس سرہٗ نے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کی تعلیم سلوک ۱۳۶۳ھ کے قریب قریب مکمل فرمادی تھی، سلوک کا آخری سبق اَنْ تَعْبُدَاللّٰہَ کَاَنَّکَ تَرَاہُ ہے جسے ''احسان'' سے تعبیر فرمایا گیا ہے اور اہلِ طریقت اس مراقبہ کا نام ''مراقبۂ ذات مقدسہ'' ''مراقبہ ذاتِ بُحت'' اور ''لاتعین'' وغیرہ رکھتے ہیں جیسا کہ حضرت تھانوی قدس سرہٗ نے ''اَلتَّکَشُّفُ'' میں تحریر فرمایا ہے۔

مکتوباتِ شیخ الاسلامؒ جلد اول ص۴۳ مکتوب ۱۳ سے جو مولانا مظفر صاحب دیوبندی کے نام مکاتیب ہیں اور وہ ۱۹۴۴ء میں نینی جیل (الہ آباد) سے تحریر فرمائے گئے ہیں اسی مضمون کے ہیں۔ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کا تاریخی اسم مبارک مظفر میاں تھا اور میرے چچا سیّد احمد میاں صاحب مدظلہ کا تاریخی نام مظفر علی ہے۔ (۱۹)

یہ بھی عرض کیا جا چکا ہے کہ ان کی طبیعت میں اخفاءِ حال ودیعت رکھا گیا تھا، اس لیے اپنا مشہور نام طبع نہیں کرایا۔ بہر حال حضرت اقدسؒ تحریر فرماتے ہیں :

اَمَّا مَا ذَکَرْتُمْ مِنَ الذِّکْرِ وَ مُشَاهَدَةِ الْقَلْبِ فَمُبَارَکٌ زَادَ اللّٰهُ هٰذِهِ الْمَسَاعِیَ وَ الْمُشَاهَدَاتِ .	بہر حال ذکرِ قلبی اور مشاہدہ جیسا کہ تذکرہ آپ نے کیا ہے تو وہ مبارک ہے اللہ تعالیٰ ان کی مساعی اور مشاہدات میں ترقی دے

اسی مکتوب میں آگے چل کر تحریر ہے :

فَعَلَيْكَ يَا اَخِیْ بِتَوَجُّهِ الْقَلْبِ اِلَی الذَّاتِ الْبُحْتِ مَهْمَا اَمْكَنَ فَاِنَّ ذِكْرَ اللِّسَانِ لَقْلَقَةٌ وَذِكْرَ الْقَلْبِ وَسْوَسَةٌ وَذِكْرَ الرُّوْحِ هُوَ الذِّكْرُ .	لہٰذا برادرِ من تم پر لازم ہے کہ جہاں تک ہو سکے ذات بحت مقدسہ کی طرف دل کو متوجہ رکھو۔

یہ مکتوب گرامی ۱۹؍ربیع الاوّل ۱۳۶۳ھ کا ہے۔

پھر مکتوب گرامی نمبر ۱۴ میں اس کی مزید تشریح فرما کر بتلا دیا ہے :

اَمَّا الذِّكْرُ الرُّوْحِیْ فَذَالِكَ التَّوَجُّهُ بِالْقَلْبِ اِلَی الذَّاتِ الْبُحْتَةِ الَّتِیْ مُتَنَزِّهَةٌ عَنِ الْكَمِّ وَالْكَيْفِ وَسَائِرِ الْاَعْرَاضِ .الخ	ذکرِ رُوحی قلب کی توجہ کا نام ہے حضرتِ حق جل مجدہٗ کی ذاتِ خاص کی طرف جو کم اور کیف اور جملہ اعراض سے منزہ ہے

اسلام میں سب سے بڑی نعمت اس مراقبہ کا حصول ہے اسی کا نام ''معرفت'' ہے، یہی وصول اِلی اللہ ہے، یہی سلوک کا آخری سبق ہے، یہیں سے ''سیر فی اللہ'' شروع ہوتی ہے۔ خداوند کریم نے ان کو اس نعمت عظمیٰ سے نوازا تھا، خدا کرے اب عالمِ آخرت میں بھی اس ''صلاۃ'' کا سلسلہ جاری ہو۔

اہتمامِ مدرسہ شاہی

جولائی ۱۹۵۵ء میں حضرت مولانا عبدالحق صاحب مدنی مہتمم جامعہ قاسمیہ مراد آباد کی وفات کے بعد سے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کو اہلِ مراد آباد نے وہاں کا مہتمم مقرر کیا۔ یہ اہلِ مراد آباد کی محبت اور تعلق ہی تھا۔ آپ نے آخری وقت تک اسے نباہا۔ بحمداللہ مدرسہ بھی ترقی کرتا رہا۔ آپ نے وہاں لبِ دریا ایک وسیع جگہ لے کر ''ادارہ حفظ الرحمن'' جامعہ قاسمیہ و مدرسہ شاہی کے تحت وسیع پیمانہ پر قائم کیا، وہاں ہی آج کل مولانا ارشد صاحب ابن حضرت مولانا مدنی قدس سرہٗ تقریباً چار سال سے کام کر رہے ہیں۔

ناظمِ عمومی جمعیت :

حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد آپ ناظم عمومی جمعیۃ علماءِ ہند منتخب ہوئے لیکن کچھ عرصہ بعد اس عہدہ سے کنارہ کش ہوگئے تھے، علمی اور تصنیفی مشاغل زیادہ کردیے تھے۔

مشاغل ومناصب :

پھر مرادآباد کے علاوہ

- دہلی کے چار مدارس کا اہتمام بھی آپ کے سپرد تھا۔
- ادارہ المباحث الفقہیہ کے رئیس اور
- اوقاف جمعیۃ کے چیئرمین تھے
- دارالعلوم دیوبند کی شورٰی اور عاملہ کے رکن تھے وہاں بھی بیشتر شورٰی وغیرہ کی کارروائیاں ان کے دستِ مبارک سے لکھی جاتی تھیں،
- مدرسہ امینیہ کے شیخ الحدیث تھے، بخاری شریف اور ترمذی شریف کے علاوہ ہدایہ اخیرین بھی پڑھاتے تھے، وہاں کے صدر مفتی تھے۔ یہ سب کام اخیر وقت تک جاری رہے۔ افتاء کا کام جو مرادآباد میں اور مدرسہ امینیہ میں انجام دیا ہے نیز نظامت جمعیۃ کے دوران بھی جو فتاوٰی تحریر کیے ہیں، وہ اگر کبھی جمع کیے گئے تو یہ بھی اُن کے علمی کام کا بہت بڑا ذخیرہ ہوگا۔

خطوط :

ان کے مکاتیب بھی علمی افادیت سے خالی نہیں ہوتے تھے۔ مجھے ایک دفعہ تحریر فرمایا کہ ''ذہن میں آتا ہے کہ ظہر کی نماز سے جو تعلیم صلٰوۃ شروع ہوئی ہے، وہ قرآن پاک کی آیت مبارکہ ﴿اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوْکِ الشَّمْسِ﴾ کے حکم کے مطابق ہوئی ہے۔ یہ آسان توجیہ ہے۔

شاگرد کو نصیحت :

حضرت مولانا مفتی محمود صاحب جب صوبہ سرحد (صوبہ خیبر پختونخوا) کی وزارت اعلیٰ پر فائز ہوئے تو ان کے نام ایک گرامی نامہ میں چند نصائح اور مبارکباد تحریر فرمائی تھی، اس کا پورا مضمون تو مجھے یاد نہیں، البتہ نصیحت میں ایک آیت بھی تحریر فرمائی تھی ﴿ اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَل لَّكُمْ فُرْقَانًا﴾

والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بہت سے علمی گرامی نامے بہت سے لوگوں کے پاس ہوں گے، کیا اچھا ہو کہ وہ مہیا ہو سکیں۔

جناب حاجی عبدالحی خانصاحب ۳۴۰/ ۱۵ دستگیر کالونی نے ان کا ایک والا نامہ مع ایک کارنامہ کے ارسال فرمایا ہے جو ایک مذہبی خاص معاملہ میں ہے۔خاں صاحب موصوف اس زمانہ میں مسلم لیگ کے سیکرٹری تھے اور اب عرصہ سے کراچی پاکستان میں ہیں اور والد صاحب ناظم جمعیۃ علماء ہند تھے۔

آٹو گراف :

رشید میاں سلمہٗ نے ان کی خدمت میں آٹو گراف کے لیے کچھ کارڈ بھیج دیے، اس پر انہوں نے حسبِ ذیل جواب تحریر فرمایا کہ جس سے ان کی استقامت کا اندازہ ہوتا ہے اس حالت ضعف میں آخری وقت تک کس درجہ دین پر استقامت اور جذبۂ تبلیغ واصلاح غالب تھا۔

> ''آٹو گراف وغیرہ محدثات (بے فائدہ ایجادات) میں سے ہیں: اِيَّاكُمْ وَالْمُحْدَثَاتِ اپنے بزرگوں کے طریقے معلوم کرو عَضُّوا عَلَيْهَا بِالنَّوَاجِذِ یہ تقشّف وتصلبُ (دقیانوسی یا لکیر کا فقیر بنے رہنا) نہیں بلکہ دین متین کو اصل خدوخال میں باقی رکھنے کی صورت یہی ہے۔اللہ تعالیٰ اتباعِ سلف کی توفیق بخشے یہی سعادتِ عظمیٰ ہے اور عالم دین کے لیے یہی حقیقی ترقی ہے''۔

ہمیں یہ والا نامہ ان کی وفات کے دو دن بعد جمعہ کے دن نماز کے بعد موصول ہوا جو ہم سب کے لیے وصیت کا درجہ رکھتا ہے اور وصیت مسنونہ کے انتہائی قریب ہے۔وَبِاللّٰهِ

التَّوْفِیْق وَھُوَ الْمُسْتَعَانُ

یہ مکتوب انہوں نے ہمشیرہ سے تحریر کرایا تھا، کمزوری کی وجہ سے خود نہیں تحریر فرما سکے مگر یہ سطور خط کے آخر میں خود اپنے قلم سے تحریر فرمائیں۔

اگر علماءِ اُمت میں ایسے لوگ جو صرف دینِ اسلام پر ہی عمل پیرا رہیں نہ ہوتے تو اسلام کا عملی نمونہ دنیا سے اُٹھ گیا ہوتا۔ یہ اسلام کا معجزہ ہے اور خدا کا وعدہ ہے اور ایسے حضرات اس معجزہ کا نمونہ مصداق اور مظہر ہوتے چلے آئے ہیں۔

رشتہ داروں سے سلوک :

حُسنِ اخلاق اور حقوق العباد پر خاص طور پر زور دیتے تھے، تمام ہی رشتہ دار اُن کے رہینِ منت رہے ہیں، وہ سب کے لیے باپ کی سی شفقت رکھتے تھے اور اُن کی امداد کی وجہ سے خود ہمیشہ مقروض رہتے تھے۔

اس قدر مشغولیت کے باوجود ہر رشتہ دار کے یہاں کبھی نہ کبھی جاتے رہنے کا وقت نکالتے تھے، چاہے دس ہی منٹ بیٹھیں۔ میرے چچا سیّد احمد میاں عرصہ سے علیل ہیں، والد صاحب صبح کو ٹہلنے کے بعد واپسی پر اُن کے یہاں روزانہ تشریف لے جاتے تھے اور صرف پانچ چھ منٹ بیٹھ کر تشریف لے آتے تھے، شاید اِنَّکَ لَتَصِلُ الرَّحِمَ وَتَحْمِلُ الْکَلَّ (۲۰) وغیرہ پر عمل فرماتے تھے جو رفتہ رفتہ طبیعت بن گیا تھا، اور نہایت ہی عجیب بات یہ تھی کہ وہ صرف یہ خیال رکھتے تھے کہ دوسرے کا حق اُن پر کیا ہے، اس لیے اس کی ادائیگی کے لیے کوشاں رہتے تھے اور ہمیشہ ممنون، اور یہ جانتے ہی نہ تھے کہ ان کا حق دوسرے پر کیا ہے اور وہ ادا کرتا ہے یا نہیں۔

مخلوق پر مہربان :

ان کی شفقت بڑھتے بڑھتے شفقتِ عامہ کے درجہ میں داخل ہوگئی تھی۔ ایک روز شام کے وقت پکانے کے لیے سبزی لے آئے حالانکہ ہمیشہ میرے بھائی سودا لاتے ہیں۔ والدہ نے دیکھا تو وہ تقریباً نصف خراب تھی، انہوں نے عرض کیا کہ یہ آپ کیا لے آئے ہیں

آدھی تو خراب ہی ہے۔فرمایا کہ ''اس سبزی والے کے پاس یہی رہ گئی تھی اوراب اس سے کون خریدتا اور صبح تک اس کی سبزی ساری ہی خراب ہو جاتی، اس لیے میں لے آیا۔''

والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ نے حدیث شریف کی کتاب لکھی ہے جس کا نام ''**مشکوٰۃ الآثار**''ہے، وہ بھی اخلاقیات پر ہے۔انہوں نے اس کا ایک نسخہ بھیجا کہ محمود میاں اور وحید میاں کو یہ پڑھائیں اور تحریر فرمایا:

> ''موطا امام محمد سے آغاز بہت بہتر ہے مگر مشکوٰۃ الآثار بھی ضرور پڑھوایئے! میرا خیال تو یہ ہے کہ اس کو حفظ کرایا جائے۔فقہی مسائل کے متعلق احادیث پر تو بہت زور دیا جاتا ہے، اخلاقیات کے متعلق صرف مشکوٰۃ کا نصف آخر ہے مگر وہ عموماً نہیں پڑھایا جاتا ہے اور پڑھایا جاتا ہے تو اس کو اہمیت نہیں دی جاتی تھی، مشکوٰۃ الآثار میں اسی کوتاہی کی تلافی کی کوشش کی گئی ہے کہ طالب علم ابتداء ہی میں اخلاقیات سے بھی واقف ہو جائے اور شفیق اُستاد ہو تو اُن پر عمل کی تربیت بھی کرتا رہے۔
>
> الحمد للہ ہندوستان میں اس کی مقبولیت بڑھ رہی ہے، پہلا ایڈیشن ختم ہو گیا، اب عربی حروف کے ٹائپ سے طباعت کا انتظام ہو رہا ہے۔اللہ تبارک وتعالیٰ مکمل فرمائے۔''

عبادت وریاضت :

جمعیۃ علماء کی نظامت کے فرائض کے دوران بھی کبھی ایسا نہ ہوتا تھا کہ نماز باجماعت میں کوتاہی ہو، سوائے اس کے کہ حضرت مدنی قدس سرہ دفتر میں تشریف فرما ہوں اور وہ مسجد میں نہ جاسکیں تو دفتر ہی میں حضرت کے ساتھ جماعت میں شرکت فرما ہوتے تھے۔

بعد مغرب نوافل میں قرآن پاک یاد رکھنے کے لیے کافی دیر تلاوت فرماتے تھے، صبح کو نماز فجر کے بعد ٹہلنے جاتے تھے، اُس وقت بھی تلاوت فرماتے تھے، واپس آکر نوافل اشراق پڑھا کرتے تھے۔

بڑھاپا اور حفظِ قرآن :

۱۹۶۴ء میں مجھ سے ارشاد فرمایا تھا کہ خداوندِ کریم نے حفظِ قرآنِ پاک مکمل کرادیا ہے، گویا محققانہ معیار پر تصنیف و تالیف، درس و تدریس اہتمام مدارس اسفار اور مکاتبت و ملاقاتوں وغیرہ کے جاری رکھتے ہوئے حفظ قرآن پاک کی تکمیل بھی فرمائی، یہ برکت اور توفیق ہی ہوسکتی ہے۔

فنا در فنا :

وفات سے ڈیڑھ ماہ قبل والا نامہ صادر ہوا تھا، اُس میں اپنی کمزوری کا حال تھوڑا سا تحریر فرمایا تھا اور حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کے شعر کا نا تمام حصہ ''اِنْ یَّشَاءُ یُبَارِکُ عَلٰی اَوْصَالِ شِلْوٍ مُمَزَّعٍ'' بھی، میں نے اس پر تشویش کا اظہار کیا تو تحریر فرمایا: ''مگر حقیقت یہ ہے کہ انسان بے حقیقت ہے، چند اعضاء کے جوڑ کا نام انسان ہے، خالقِ انسان جب تک چاہے یہ جوڑ باقی رکھے، جب چاہے توڑ دے۔ وہ ''جبّارِ ھضیم'' بھی ہے! لیکن وفات کی خبر کے بعد اندازہ ہوا کہ وہ بقول ابونواس ؎

دَبَّ فِیَّ الْفَنَاءُ سِفْلاً وَّ عُلْوًا وَاَرَانِیْ اَمُوْتُ عُضْوًا فَعُضْوًا ۲؎

(ترجمہ) مجھ میں فنا نیچے اور اُوپر سے سرایت کرگئی ہے اور میں اپنے آپ کو دیکھ رہا ہوں کہ ایک ایک عضو کرکے مر رہا ہوں۔ حامد میاں غفرلہٗ

کی کیفیت محسوس فرما رہے تھے۔

آخر وقت تک عزیمت پر عمل پیرا رہنے کی کوشش :

لیکن توفیق شاملِ حال تھی جس سے میرے علاوہ دہلی میں اپنے گھر کے اندر موجود رہنے والوں کو بھی یہ خیال نہیں آیا کہ وہ چند روزہ مہمان ہیں، کیونکہ آخر وقت تک عزیمت پر عمل پیرا رہے۔

رمضان مبارک میں جو والا نامہ صادر ہوا اس میں اس بات پر بہت اظہارِ قلق فرمایا تھا کہ میں کمزوری کے باعث مسجد تک بیس منٹ میں راستہ طے کرپاتا ہوں، اس بناء پر

ظہر اور عشاء کے علاوہ جماعتوں میں شرکت نہیں کرسکتا، مکان سے مسجد کچھ فاصلہ پر ہے اور صحنِ مسجد سیڑھیاں چڑھ کر ہے وہاں تک جانے کی پابندی کی کوشش فرماتے تھے۔

علالت :

خونی بواسیر سب سے بڑا عارضہ تھا جس کا دورہ اس سال ۱۵ر رمضان سے شروع ہوا، اُس میں اس قدر شدت ہوتی تھی کہ بدن کا جیسے سارا خون نکل گیا ہو لیکن اس کے باوجود میرے پھوپھا سیّد سادات حسن صاحب کی وفات پر ۱۹ر رمضان کو سفر مرادآباد کیا اور روزہ سے رہے، صرف تین روزے قضاء ہوئے اور تین دن تراویح نہیں پڑھ سکے۔ جتنے کام وہ کرتے تھے یقیناً وہ بغیر توفیقِ خاص کے ناممکن ہیں۔

وفات :

رمضان کے بعد ڈاکٹروں نے تجویز کیا کہ خون چڑھانا ضروری ہے جسے انہوں نے پسند نہ فرمایا، اس کا بدل جوس وغیرہ تجویز کیے گئے لیکن غذا کی اشتہاء ختم ہو چکی تھی، بالآخر کمزوری بڑھتی گئی۔

ایک عزیز حافظ طاہر صاحب وفات سے دو دن پہلے مزاج پُرسی کے لیے آئے تو فرمانے لگے بھائی! میں تو یہ آیت تلاوت کر رہا ہوں :

﴿فَاطِرَ السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضِ اَنْتَ وَلِيّ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِيْ بِالصَّالِحِيْنَ﴾ اور انتظار میں ہوں کہ کب رُوح پرواز کر جائے۔

زندگی کی آخری شب عشاء کی نماز اذان ہوتے ہی پڑھی، پھر سانس میں دقت محسوس ہونے لگی۔ ڈاکٹروں خصوصاً حکیم اجمل خان صاحب مرحوم کے پوتے ڈاکٹر علیم صاحب کے مشورہ سے ہسپتال میں آکسیجن کے لیے جانا ضروری سمجھا گیا تو گیارہ ساڑھے گیارہ بجے وہاں داخلہ ہوا، اگلے روز صبح سے وقفہ وقفہ سے ''سبحان اللہ'' وغیرہ کلمات فرماتے رہے، کوئی بات کرتا تھا تو اس کا جواب عنایت فرماتے تھے لیکن کمزوری کے باعث آواز بہت ہلکی تھی، شام کو سب کا خیال ہوا کہ گھر لیجایا جائے، خود والد صاحب نے بھی یہی فرمایا لیکن

خون کی تین اُلٹیاں آئیں، اس کے بعد طبیعت جیسے پرسکون ہوگئی ہو۔ ساڑھے پانچ بجے ڈاکٹر راؤنڈ پر آئے تو اُن سے گھر لانے کی اجازت لی گئی، ڈاکٹر سے اجازت ملتے ہی گلوکوز کی بوتل الگ کر دی گئی اس سے ان کے چہرے پر مزید سکون ظاہر ہوا۔

میرا چھوٹا بھائی شاہد میاں سلمہٗ آخری شب جب انہیں ہسپتال لے جایا گیا حاضرِ خدمت رہا، اُس نے بیان کیا کہ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ گھر سے ہسپتال جاتے وقت ہی سمجھ گئے تھے اور انہیں خود کو آخری لمحات کا اندازہ ہوگیا تھا جسے انہوں نے ہم سے نہیں ظاہر کرنا چاہا۔ کیونکہ انہوں نے وہاں جا کر کسی سے بات نہیں کرنی چاہی اور صرف ذکرِ الٰہی کی طرف متوجہ رہے سانس سے بھی اور زبان سے بھی۔ شاہد میاں نے کہا کہ شب کے اڑھائی بجے کے قریب ایک دفعہ جب ہاتھ سے سوئی نکالی گئی تو انہوں نے ہاتھ ایسے رکھے جیسے نماز میں باندھے جاتے ہیں۔ میں نے بات کر کے دریافت کرنا چاہا تو ہاتھ سے اشارہ سے منع فرما دیا کہ بات نہ کرو، بعد میں وفات تک اگر چہ وہ باتوں کا مختصر جواب دیتے رہے لیکن زیادہ تر پوری توجہ ذکرِ الٰہی کی طرف رہی۔

حُسنِ خاتمہ :

ایک مسلمان کے لیے حسنِ خاتمہ بہت بڑی دولت ہے، اللہ پاک ہم سب کو نصیب فرمائے۔ شام کو خون کی اُلٹیاں آنے کے بعد نظر آ رہا تھا کہ ہر سانس پر اللہ اللہ کا ذکر جاری تھا، عزیزوں میں سے دو حضرات نے زیرِ لب تلاوت شروع کر دی، اسی اثناء میں ایک اور عزیز حافظ طاہر صاحب پہنچے انہوں نے سورۃ یٰسین کی تلاوت شروع کر دی، پڑھ کر دم کرتے رہے اور چمچہ سے پانی دیتے رہے، اسی دوران تھوڑے تھوڑے وقفہ سے سبحان اللہ باآوازِ بلند کہا جو سب ہی نے سنا، تیسری بار آنکھیں بھی کھولیں اور جیسے اِدھر اُدھر نظریں گھومتی ہوئی آہستگی سے جھک گئیں، اس وقت طاہر صاحب سے فرمایا کہ ''اب اِدھر دیکھو'' اللہ اللہ کی آواز اب اور آہستہ ہوتی چلی گئی اور اس کے ساتھ آنکھیں بند ہوتی گئیں، نہ کوئی جھٹکا، نہ تشنج، نہ گھبراہٹ، بے حد سکون چھاتا چلا گیا۔ (۲۲) چہرہ پر ایسی ابدی مسکراہٹ رقصاں تھی

کہ دیکھنے والوں کو سکون عطا کر رہی تھی۔ ۱۶؍شوال ۱۳۹۵ھ/۲۲؍اکتوبر ۱۹۷۵ء چہار شنبہ ساڑھے چھ بجے (شام) وفات پائی، عمر مبارک سنین ہجریہ سے ۷۴ سال اور عیسوی سے ۷۲ سال ہوئی۔

اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ. اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلَنَا وَلَهٗ وَتَغَمَّدْنَا وَاِیَّاهُ بِرَحْمَتِکَ وَرِضْوَانِکَ وَاَدْخِلْهُ الْفِرْدَوْسَ الْاَعْلٰی مِنْ جَنَانِکَ وَاجْعَلْنَا وَاِیَّاهُ مِمَّنْ یَّدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ بِغَیْرِ حِسَابٍ.

تجہیز و تکفین :

ان کے لیے مفتی عتیق الرحمٰن اور قاضی سجاد صاحب نے حضرت مولانا مملوک علی صاحبؒ کی قبر مبارک کے قریب قبر کا انتظام کیا تھا۔ آپ کی قبر مبارک احاطہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ میں ہے جو ''قبرستان مہندیاں'' کہلاتا ہے، لیکن والد صاحب کو مسجد عبدالنبی کے قریب جو ''گورِ غریباں'' ہے، وہ بہت پسند تھا، وہیں انہوں نے اپنے پھوپی زاد بھائی سیّد عقیل صاحب کے لیے ۱۲؍رمضان ۱۳۹۵ھ کو جگہ تجویز کی تھی اور اظہار کیا تھا کہ انہیں اپنے لیے بھی یہ جگہ پسند ہے۔ یہ قبرستان بہت قدیم ہے، دہلی میں دہلی دروازہ کے باہر ہے۔

نمازِ جنازہ :

نمازِ جنازہ شاہ ابوالخیر قدس سرہٗ کے جانشین مولانا زید صاحب نے پڑھائی، مولانا اسعد صاحب مدنی غالبًا دورہ مدراس پر تھے، البتہ مولانا ارشد صاحب پہنچ گئے تھے۔ جنازہ میں تمام مسلم وزراء اور مسلم ممالک کے سفراء بھی شریک ہوئے۔ مجھے حاجی عبدالغنی صاحب کلکتہ والوں نے یہ تفصیل لکھی تھی، وہ نظام الدین تبلیغی جماعت میں آئے ہوئے تھے، نماز میں شریک ہوئے تھے۔

حضرت شیخ الحدیث مدظلہم (مولانا محمد زکریا صاحب) اسہال کی شکایت کے باعث بہت کمزور تھے اور سہارنپور میں قیام تھا، اس لیے سفر کے قابل نہ تھے مگر وہاں سے سب لوگوں کو دہلی بھیج دیا حتی کہ اپنے خاص خدام کو بھی ارشاد فرمایا کہ ہم سب کو ہی وہاں ہونا

چاہیے تھا اور جنازہ میں شریک ہونا چاہیے تھا، لیکن میں سفر کے قابل نہیں ہوں، آپ لوگ شرکت کریں۔ جزاہ اللہ خیرالجزاء۔

تاثرات کی جھلک :

مولانا محمد الحسنی صاحب مدیر ''البعث الاسلامی'' (عربی) ندوۃ العلماء لکھنؤ آپ کے انتقال پر تعزیتی نوٹ میں یوں لکھتے ہیں :

''فَجَعَ الْمُسْلِمُوْنَ فِی الْهِنْد بِوَفَاةِ فَضِيْلَةِ الشَّيْخِ مُحَمَّدُ مِيَانُ فِیْ شَهْرِ شَوَّالْ ۱۳۹۵ ه رَئِيْسِ قِسْمِ الْحَدِيْثِ الشَّرِيْفِ وَالْاِفْتَاءِ بِالْمَدْرَسَةِ الْاَمِيْنِيَّةِ بِدِهْلِیْ وَكَانَتْ وَفَاتُهُ خَسَّارَةً كَبِيْرَةً لِهٰذِهِ الْبَلَادِ فِیْ جَمِيْعِ الْمَجَالَاتِ الْاِسْلَامِيَّةَ. فَاِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ

وَكَانَ الْفَقِيْدُ خَيْرَ مِثَالٍ لِلْعَالَمِ الْمُعَاصِرِ الَّذِیْ يَجْمَعُ بِاتِّزَانٍ وَقَصْدٍ بَيْنَ الْعِلْمِ وَالدِّيْنِ وَالتَّالِيْفِ وَالسِّيَاسَةِ وَالْعِبَادَةِ .

لَهُ مُؤَلَّفَاتٌ وَاَبْحَاثٌ قَيِّمَةٌ بِاللُّغَةِ الْاُرْدُ وِيَّةِ تُعَالِجُ الْمَوَاضِيْعَ الْعِلْمِيَّةِ وَالدِّيْنِيَّةِ وَالسِّيَاسِيَّةِ وَالْاِ قْتَصَادِيَّةِ وَالْفِقْهِيَّةِ.

فَكِتَابُهُ ''عُلَمَاءُ الْهِنْدِ وَمَا ضِيْهِمُ الزَّاهِرُ'' نَالَ مِنَ الْقُبُوْلِ وَالْاِعْجَابِ مِنْ جَمِيْعِ الْاَوْسَاطِ الْعِلْمِيَّةِ وَالسِّيَاسِيَّةِ مَا يَزِيْدُ فِیْ قِيْمَتِهٖ وَاَهَمِيَّتِهٖ.

وَكَذٰلِكَ كِتَابُهُ ''مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ'' ﷺ .

وَ '' اَلْمُشْكِلَاتُ السِّيَاسِيَّةِ وَالْاِقْتِصَادِيَّةِ وَحُلُوْلِهَا فِیْ ضَوْءِ تَعَالِيْمِ الْاِسْلَام'' وَغَيْرُ ذَالِكَ مِنَ الْكُتُبِ يَحْمِلُ اَهَمِيَّةً مَّوْضُوْعِيَّةً .

وَقَدْ كَانَ شَدِيْدُ الْحِرْصِ عَلَى الْحُضُوْرِ فِی الْمَهْرَجَانِ التَّعْلِيْمِیْ لِنَدْوَةِ الْعُلَمَاءِ وَلٰكِنَّ الْاَجَلَ لَمْ يُمْهِلْهُ وَقَدْ كَتَبَ فِیْ ذَالِكَ كِتَابًا اِلٰى سَمَاحَةِ الشَّيْخِ النَّدْوِیْ اَلَّا اَنَّهُ لَمْ يَتَمَكَّنْ مِنْ اِتْمَامِهٖ وَوَافَاهُ اَجَلُهُ .

–رحمه الله رحمة واسعة– وأنزل عليه شآبيب رضوانه، وألهم أهله الصبر والسلوان. [البعث الإسلامي لكناؤ ج: ۲۰، ص: ۲۹۹، ۳۰۰]

حواشـــــــی

(۱) تذکرہ سادات رضویہ دیوبند ص۳ و ص۲۵ مصنفہ سیّد محبوب رضوی شائع کردہ علمی مرکز دیوبند

(۲) ''اَوَش'' کرغیزستان کا ایک شہر ہے جو وادی فرغانہ میں واقع ہے۔ محمود میاں غفرلہٗ

(۳) تذکرہ ساداتِ رضویہ دیوبند ص۴

(۴) مولانا سیّد رشید میاں صاحب کی والدہ ماجدہ کے حقیقی ماموں۔ محمود میاں غفرلہٗ

(۵) والد ماجد مولانا حافظ سیّد محمد اعلیٰ صاحب مدظلہم

(۶) از رُوداد مدرسہ ۱۳۰۰ھ

(۷) حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کے پیر بھائی۔ حامد میاں غفرلہٗ

(۸) ۱۹۲۸ء ہی میں حضرت اقدس مولانا مدنی قدس سرہٗ دارالعلوم دیوبند شیخ الحدیث کے عہدہ پر تدریسی فرائض انجام دینے کے لیے تشریف لائے۔ حامد میاں غفرلہٗ

(۹) ہندو و دیگر اہلِ مذہب (۱۰) مقصد (moto)

(۱۱) ان کا نام والد صاحبؒ نے تحریر نہیں فرمایا۔ حامد میاں غفرلہٗ

(۱۲) حضرت والد ماجد کی پہلی اہلیہ صاحبہ کے والد محترم ہیں، اس اعتبار سے حضرت والد صاحبؒ کے خسر ہوئے جبکہ آپ کی اہلیہ محترمہ حضرت والد صاحبؒ کی خوشدامن ہوئیں جو حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحبؒ کی سگی بھتیجی تھیں، ان کے والد ماجد کا اسم گرامی حامد حسن تھا، آپ حضرت شیخ الہندؒ سے عمر میں چھوٹے تھے۔ محمود میاں غفرلہٗ (مولانا عبدالحق مدنی علیہ الرحمہ پر ایک تفصیلی مضمون مولانا سید محمد میاں صاحب کا اسی مجلّہ میں شائع ہو رہا ہے۔ ضیاء الحق خیر آبادی)

(۱۳) حضرت مولانا عجب نور صاحبؒ بن مولانا صلاح الدین صاحبؒ ۱۸۸۷ء میں بوزہ خیل سوارنی بنوں میں پیدا ہوئے، ۹/ مارچ ۱۹۶۶ء میں بوزہ خیل بنوں میں وفات پائی۔ محمود میاں غفرلہٗ

(۱۴) یعنی گورنر یا صوبہ دار کے نام سے آتے رہے۔ محمود میاں غفرلہٗ

(۱۵) آپ کا وطن تھانہ بھون تھا، نیکی پارسائی، علمی اور سیاسی بصیرت انتہا درجہ کی خدا نے بخشی تھی، حضرت اقدس مولانا تھانوی قدس سرہٗ نے اپنے فتاویٰ میں مسئلہ ''ضاد'' پر اشکالات کا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے حتی کہ عزیزی قاری عبداللہ آئے........... پھر اُن سے گفتگو کے بعد رفع اشکالات کا ذکر فرمایا تھا۔

حضرت مولانا مفتی محمود صاحب نے قرأتِ عشرہ اِن ہی سے پڑھی ہیں۔ جولائی ۱۹۴۴ء میں جیل سے آنے کے بعد وفات پائی، آپ کی وفات کے عرصہ بعد قبر بیٹھ گئی، جسم مبارک سالم نکلا۔ آپ کی ذات بہت چھوٹی تھی لیکن میں سوچتا ہوں کہ اپنے آپ کو سیّد صدیقی فاروقی اور عثمانی وغیرہ کہلا کر خوش ہو جانے والے حضرات کو عبرت حاصل کرنی چاہیے کہ کل قیامت کے دن جناب رسول اللہ ﷺ کے قریب وہ ہوں گے یا آپ کا وہ اُمتی ہوگا جو عمل ورع اور تقویٰ اور اتباعِ سنت سے مزین رہا ہو، چاہے وہ حضرت قاری صاحب ہوں یا مفتی اعظم ہند حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب ہوں رحمہا اللہ ورفع درجاتہا۔ آمین۔ حضرت مولانا مفتی محمود صاحب مدظلہم ایک بار اس بات پر اظہارِ افسوس فرما رہے تھے کہ فتاوٰی کے نئے ایڈیشن میں حضرت اقدس تھانوی قدس سرہٗ العزیز کی اس تمہیدی عبارت کو حذف کر دیا گیا ہے جس میں حضرت مولانا عبداللہ صاحبؒ کا ذکر حضرت نے فرمایا تھا۔ حضرت مفتی صاحب حضرت قاری صاحبؒ کے حالات پر عجب انداز میں روشنی ڈالتے ہیں! کیا اچھا ہو کہ وہ حالات ضبطِ تحریر میں آجائیں۔

(۱۶) والد ماجد نور اللہ مرقدہ نے یہ دروس تحریر فرمائے تھے جو کتابی شکل میں شائع ہو چکے ہیں، اس کا نام ہم نے ''مجالسِ سبعہ'' رکھا ہے، کیونکہ سات ہی مجلسیں ہونے پائی تھیں۔ یہاں اس کا فوٹو لے کر طبع کرا دی ہے۔ حامد میاں غفرلہٗ

(۱۷) ویسے درحقیقت تقریباً اسّی کتابیں لکھی ہیں۔ حامد میاں غفرلہٗ

(۱۸) سیّد محبوب رضوی تذکرہ سادات رضویہ دیوبند ۱۹۷۴ء ص ۲۱

(۱۹) آپ کی وفات ۹۷ برس کی عمر میں مؤرخہ ۱۹؍ جمادی الثانی ۱۴۰۹ھ/ ۲۷؍ جنوری ۱۹۸۹ء بروز جمعہ دہلی میں ہوئی اور قبرستان گور غریباں میں تدفین عمل میں آئی۔ محمود میاں غفرلہٗ

(۲۰) بخاری شریف کتاب بدء الوحی رقم الحدیث ۳

(۲۱) میں نے مدرسہ میں شرح وقایہ کے ساتھ موطا امام محمد پڑھوانا شروع کی تھی اس کی اطلاع دی تھی کہ یہ دونوں موطا پڑھ رہے ہیں۔ حامد میاں غفرلہٗ

(۲۲) دہلی سے رشتہ داروں کے سب خطوط میں یہی الفاظ لکھے ہوئے تھے اور یہ بھی ہے کہ انہوں نے جو اشارہ کیا یوں محسوس ہوا کہ وہ ملائکہ کی طرف تھا، جو لوگ وہاں موجود تھے، ان سب کے ذہن میں یہی بات آئی جو قرین قیاس ہے۔ قرآن پاک میں یہی مضمون آیا ہے ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا﴾ اور استقامت کا حال ان کے آخری گرامی نامہ سے واضح ہے۔ حامد میاں غفرلہٗ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مولانا سید محمد میاں سے

ایک ملاقات

مولانا سید محمد میاں صاحب ۱۹۷۰ء میں حج سے واپس آئے تو ہفت روزہ ''الجمعیۃ'' کے ایڈیٹر مولانا وحید الدین خاں نے مولانا سے ایک انٹرویو لیا، اور اسے ۸؍مئی ۱۹۷۰ء کی اشاعت میں شائع کیا، اس انٹرویو میں مولانا نے اپنے ذاتی احوال، جمعیۃ علماء ہند سے متعلق بہت سی قیمتی معلومات بیان کی ہیں، اور سفر حج سے متعلق تاثرات بھی ہیں، جو خاصے دلچسپ اور مفید ہیں۔ (ضیاء الحق خیرآبادی)

مولانا محمد میاں صاحب (ولادت: ۱۳۲۱ھ ۱۹۰۳ء) تاریخی نام؛ مظفر میاں، ان چند زندہ افراد میں سے ہیں جو جمعیۃ علماء ہند کی تاریخ سے بے حد قریبی طور پر وابستہ رہے ہیں، مولانا ابھی حال ہی میں دوسرے سفر حج سے فارغ ہوکر واپس آئے ہیں ماہ اپریل کی ایک ملاقات میں مولانا نے جمعیۃ کی قدیم تاریخ نیز سفر حج کے تأثرات تفصیل سے بیان فرمائے۔

مولانا نے فرمایا: موجودہ صدی کے دوسرے دہے کے آخر میں ملک کے جو حالات تھے، وہ جمعیۃ علماء کی تنظیم کے محرک ہوئے اس وقت ایک طرف خلافت کا غلغلہ بلند تھا، ترکی میں خلافت عثمانیہ کو نقصان پہنچانے کی وجہ سے انگریز سے شدید نفرت پیدا ہوئی، اور خلافت عثمانیہ کے احیاء کے جذبے نے خلافت کمیٹی کی شکل اختیار کی، دوسری طرف کانگریس تھی جو ملک کے مشترک مسائل اور وطن کی آزادی کے لیے جدوجہد کررہی تھی، عام مسلمان اور ان کے سنجیدہ دانشور اور رہنما جس طرح ایک مذہبی جذبہ کی بنا پر خلافت کمیٹی کی تنظیم میں سرگرم عمل تھے اسی طرح حب وطن کے جذبہ نے ان کو کانگریس کے اسٹیج پر نمایاں کردیا تھا، حتی کہ وہ کانگریس پر چھا گئے تھے۔ یہ دونوں نظام اس قوت اور ایسے جوش وخروش کے ساتھ

مصروف عمل تھے کہ یقین ہوتا تھا کہ ہر طرح کی کامیابی عنقریب ان کے قدم چومے گی، علماء جوش وخروش اور سعی عمل میں کسی سے پیچھے نہیں تھے، مگر جس طرح تحریک کے سلسلہ میں ان کے قدم تیزی سے اٹھ رہے تھے ان کی نظر مستقبل کے خیالی نقشے پر جمی ہوئی تھیں۔

وہ سمجھتے تھے کہ تحریک خلافت اور اس سلسلے میں جو تنظیم ہے وہ وقتی ہے، آج اگر مسئلہ خلافت حل ہو جاتا ہے تو یہ تنظیم بھی تاریخ گزشتہ کا ایک باب بن جائے گی، آزادی وطن کی مشترک تحریک اگرچہ دیرپا ہے اور وہ قوت وعمل کو طویل عرصہ تک زندہ رکھ سکتی ہے اور کامیابی کی صورت میں وہ حفاظت وترقی ملک کی ضامن ہوسکتی ہے مگر وہ مسلمانوں کی تہذیب وثقافت اور ان کی مذہبی وملی امتیازات کی متکفل نہیں ہوسکتی۔

مسلمانوں کے کچھ مخصوص مسائل ہیں جن کا تعلق ان کے دین ومذہب سے ہے، کوئی مشترک جماعت ان کی حفاظت کی ذمہ دار نہیں ہوسکتی، ان کے لیے مسلمانوں کی تنظیم اور ان کی زیر قیادت ضروری ہے جو مسلمانوں کے ان مخصوص مسائل کے ماہرین یعنی علمائے کرام ہیں۔ یہ احساس تھا جس نے جمعیۃ علماء ہند کو وجود دیا، علماء نے امت کو کبھی حالات کے حوالے کرنا گوارا نہیں کیا اور نہ امت میں تفریق کی، اس میں دیوبندی، غیر دیوبندی، شیعہ، سنی سب شریک تھے۔ ۱۹۵۷ء میں زیر صدارت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی جمعیۃ علماء ہند کا اجلاس عام سورت میں ہوا تھا، اس کی مجلس استقبالیہ کے سکریٹری سورت کے مشہور بوہری محسن حضوری صاحب تھے۔

تحریکات سے دلچسپی کب سے شروع ہوئی؟ اس کے جواب میں مولانا نے بتایا کہ ''آغاز زندگی سے'' کیونکہ خاندانی بزرگ بھی وہ تھے جنہیں ہندوستانیوں کے زوال کا سخت صدمہ اور انگریزوں سے سخت نفرت تھی، اور جن بزرگوں سے تعلیم حاصل کی ان کا ذوق بھی یہی تھا اور یہی ان کے جذبات تھے۔ دارالعلوم دیوبند جو احقر کا مادر علمی ہے اس کی بنیاد اسی کے جذبات پر رکھی گئی تھی، اپنے علوم اور اپنی تہذیب کی حفاظت، انگریز اور انگریزی طریقوں سے نفرت۔

پھر انیسویں صدی کے آخر تقریبا ۱۸۹۰ء میں جب یورپین حکومتوں کی متعدد قومیں ترکوں کو بلقان و یونان، ہنگری وغیرہ سے نکالنے میں کامیاب ہوگئیں تو اکابر دیوبند کے یہ جذبات اور بڑھ گئے۔ شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب نے جنگ بلقان کے زمانہ میں ترکوں کے لیے عام چندہ کیا، دارالعلوم دیوبند کے جملہ اساتذہ اور اراکین نے چندہ کی تحریک میں سرگرمی سے حصہ لیا، انہیں بزرگوں کی آغوش میں میری تربیت ہوئی تو تعلیم کے ساتھ ساتھ ان بزرگوں کے جذبات کی امانت بھی مجھے میسر آئی، پھر ذی شعور زندگی کا آغاز کیا کہ ۱۹۱۴ء والی جنگ جرمنی شروع ہوگئی، ابھی جنگ ختم نہیں ہوئی تھی کہ شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب دیوبند سے حجاز تشریف لے گئے، پھر شریف مکہ نے انگریزوں سے ساز باز کر کے ترکوں سے غداری کی اور شیخ الہند کو انگریزوں کے حوالہ کر دیا، جس کے بعد ان پر مصر میں مقدمہ چلا پھر وہ مالٹا میں محبوس کئے گئے۔

حضرت شیخ الہند دیوبند کی مقدس ترین شخصیت تھے، نہ صرف دارالعلوم دیوبند بلکہ پورا دیوبند ان واقعات سے متأثر ہوا۔ حضرت شیخ الہند سے میرا خاندانی تعلق بھی تھا، ان کے واقعات کا چرچا گھر میں ہوتا تھا، پھر ابھی یہ سلسلہ ختم نہیں ہوا تھا کہ پورے ہندوستان میں تحریک خلافت شروع ہوگئی، دارالعلوم دیوبند کے اساتذہ اور طلبہ نے بھی اس میں حصہ لیا۔

اس وقت میری عمر تقریبا ۱۷؍سال تھی تنہا سفر کی نہ اجازت تھی اور نہ کبھی نوبت آئی تھی، لیکن اس وقت جس طرح اپنی والدہ سے اصرار کر کے کھدر کے کپڑے بنوائے، ان سے اصرار کر کے یہ اجازت بھی حاصل کی کہ طلبہ کے وفد میں نکل کے چندہ کیلئے دیہات میں جاؤں۔ سہارنپور کے دیہات میں چندہ کے لیے گیا، سردیوں کا موسم تھا اس طرح کا پہلا سفر تھا ، چنانچہ دوسرے روز ہی بخار آ گیا لیکن بخار کی حالت میں پروگرام کو پورا کیا۔ ۱۹۲۸ء میں با قاعدہ جمعیۃ علماء کا ممبر بن گیا اور اس کے بعد جلد ہی مراداباد کی جمعیۃ علماء سکریٹری بنادیا گیا۔

۱۹۲۹ء کے آغاز میں شاردا ایکٹ کے خلاف سارے ہندوستان میں ''ڈے'' منایا گیا مرادآباد میں بھی اس کے خلاف ایک جلوس نکالا گیا، یہ سیاسی زندگی میں داخل ہونے

کے بعد میرا پہلا عملی کام تھا۔

جمعیۃ میں آپ کس کس عہدہ پر رہے ہیں؟ اس کے جواب میں مولانا نے فرمایا: شہری جماعت کے نائب سکریٹری کے مقام سے جنرل سکریٹری تک تمام عہدوں پر، اس سلسلے میں مولانا نے ایک لطیفہ بیان فرمایا کہ ۱۹۳۲ء میں مَیں اتر پردیش کی جمعیۃ علماء کا سکریٹری تھا اور مولانا حفظ الرحمٰن صاحب آل انڈیا جمعیۃ کے سکریٹری تھے، چنانچہ شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی مجھ کو گورنر صاحب اور مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کو وائسرائے صاحب لکھا کرتے تھے۔

مولانا آپ جیل میں کتنی بار گئے؟ مولانا نے فرمایا: گرفتار ہوا پانچ مرتبہ، ایک بار تا اختتام عدالت۔ ایک بار ایک ہفتہ کی سزا ہوئی، اور تین بار بالترتیب ایک سال، چھ مہینہ اور اٹھارہ مہینہ جیل میں رہا۔ مرادآباد جیل میں چار مہینے تک حضرت شیخ (مولانا مدنیؒ) کا ساتھ رہا، مرادآباد جیل کا ایک دلچسپ واقعہ مولانا نے یوں بیان فرمایا کہ حضرت شیخ خطوط میں اپنے نام کے ساتھ ''ننگ اسلاف حسین احمد'' لکھا کرتے تھے، ایک سی آئی ڈی والے نے خط دیکھا تو اس نے سمجھا کہ یہ کوئی ''اسلاف حسین'' ہیں، چنانچہ وہ تحقیق کرتا پھرتا تھا کہ اسلاف حسین کون ہیں بتاؤ؟

۱۹۴۴ء میں جب جمعیۃ علماء کا نیا نظم قائم ہوا، اور حضرت شیخ صدر اور مولانا حفظ الرحمٰن صاحب جنرل سکریٹری مقرر ہوئے تو اس وقت مجھے سکریٹری منتخب کیا گیا، اس وقت میں مرادآباد کے مدرسہ میں استاذ تھا، مولانا عبدالحق مدنی جو مدرسہ کے مہتمم تھے مجھے چھوڑنے کے لیے راضی نہیں تھے، چنانچہ حضرت شیخ اور مولانا حفظ الرحمٰن (صدر اور جنرل سکریٹری) دونوں مرادآباد گئے، جب ان کے سامنے چائے پیش کی گئی تو مدرسہ کے مہتمم سے فرمایا: ہم عربی قاعدہ کے مطابق ''طالب'' بن کر آئے ہیں اسی لیے اس وقت تک کچھ قبول نہیں کر سکتے جب تک ہماری طلب پوری نہ کی جائے، اس کے بعد فرمایا کہ ہماری طلب یہ ہے کہ محمد میاں کو ہمارے حوالے کر دو۔

اس طرح مولانا محمد میاں صاحب دہلی تشریف لائے اور درمیان کے چند مختصر وقفوں کو چھوڑ کر اس وقت سے اب تک مرکزی جمعیۃ کی خدمت کر رہے ہیں، آپ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب جنرل سکریٹری شپ کے زمانے میں مرکزی جمعیۃ کے سکریٹری تھے اور اب جمعیۃ ٹرسٹ کے چیرمین ہیں، مولانا نے ایک سال تک جمعیۃ کے جنرل سکریٹری کے فرائض انجام دئے ہیں۔

آپ کی جنرل سکریٹری شپ کے زمانے میں جو واقعات پیش آئے ان میں سے چند ایک کا ذکر فرمائیں؟ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے مولانا نے فرمایا: کوئی فرقہ وارانہ ہنگامہ اس عرصہ میں پیش نہیں آیا، دینی تعلیم کے مکتب اور مرکز قائم کرنے کی طرف توجہ دی، جمعیۃ علماء کا ریکارڈ مرتب کرنے کی کوشش کی جس سے اس کی تاریخ مرتب ہو سکے، اس کے علاوہ اہم مسئلہ یہ تھا کہ مقامی جمعیۃ سے لے کر مرکزی جمعیۃ سب کے جملہ انتخابات باضابطہ ہوں اور ایسے اجلاس میں جو صحیح طور پر نمائندگی کرتا ہو۔ جمعیۃ علماء کی ذمہ داریاں جدید عہدہ داروں کو سپرد کی جاسکیں۔

تصنیفات کے سلسلہ میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے مولانا نے فرمایا کہ میری مطبوعہ تصنیفات کی تعداد تقریبا ساٹھ ہے، کئی کتابیں تیار پڑی ہیں مگر ابھی وہ چھپ نہیں سکیں۔

جمعیۃ علماء کے تعارف اور اس کی خدمات کے تذکرہ پر پہلی کتاب مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحب نے تحریر کی تھی، وہ ایک رسالہ تھا اس کے بعد اس کام کو زیادہ تفصیل کے ساتھ مولانا نے انجام فرمایا۔ مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحب نے سن وار واقعات تحریر کئے تھے، اس کے برعکس مولانا نے مقاصد کے عنوانات مقرر کئے اور اس کے تحت خدمات کا ذکر کیا، مولانا نے جمعیۃ علماء کی خدمات اور اس کے تعارف پر اور بھی کئی کتابیں لکھیں۔

جمعیۃ علماء کے دینی تعلیمی کام کی تفصیل بتاتے ہوئے مولانا نے فرمایا: ۱۳/اکتوبر ۱۹۴۷ء کو مولانا آزاد نے دہلی میں ایک کانفرنس مسلم قائدین کی طلب کی تھی، کانسٹی ٹیوشن

کلب میں دو تین روز تک اس کا اجتماع ہوتا رہا اور ہر فکر کے مسلم رہنما اس یں شریک ہوئے، مولانا آزاد نے اس میں کہا کہ پاکستان ایک حقیقت بن چکا ہے، اس کا انکار نہیں کیا جاسکتا، ہمیں اپنی جگہ پر ہندوستان میں رہنے کے لیے ایک راہ عمل طے کرنی ہے، اور راہ عمل یہی ہوسکتی ہے کہ ہماری سیاسی جدوجہد مشترک ہو، سیاست کے بارے میں ہمارا پلیٹ فارم الگ نہ ہو، باقی رہا مذہب اور کلچر، اس کی حفاظت کے لیے ہمیں الگ انتظام کرنا ہے۔

اس کے بعد دسمبر ١٩٤٧ء میں مشہور لکھنؤ کانفرنس ہوئی، جس میں طے کیا گیا کہ مسلمان کسی فرقہ وار سیاسی جماعت میں شریک نہیں ہوں گے، لکھنؤ کانفرنس کے بعد مولانا آزاد نے جمعیۃ علماء کے ورکروں کو دہلی میں جمع کیا اور اخبار الجمعیۃ کے دفتر میں ان سے خطاب فرمایا، ان کے سامنے یہ بات کہی کہ جمعیۃ علماء کے لیے کام کرنے کا اب وقت آیا ہے۔ مولانا نے بڑے اصرار اور وضاحت کے ساتھ کہا کہ مسلمانوں کو یہ اعلان کرنا چاہیے کہ ہماری تہذیب اور کلچر الگ ہے اور جمعیۃ علماء کا فرض ہے کہ اس کو محفوظ رکھنے کی کوشش کرے۔ مولانا نے یہ بھی فرمایا کہ شہروں کے بچے اپنے ماحول سے متأثر ہوکر مذہبی بن جاتے ہیں اور مذہبی معلومات حاصل کر لیتے ہیں مگر دیہات میں یہ ممکن نہیں ہے، لہٰذا جمعیۃ علماء کا یہ اہم فرض ہے کہ دیہات کے بچوں میں دینی تعلیم پھیلانے کی کوشش کرے۔

مولانا کی یہ تحریک اکابر جمعیۃ علماء کی رائے اور ان کے خیالات کے عین مطابق تھی چنانچہ اس سلسلہ میں کوشش کا آغاز ہوگیا اور فروری ١٩٤٨ء میں جمعیۃ علماء ہند کے دفتر میں ماہرین تعلیم کا ایک اجتماع کیا گیا جس میں جامعہ ملیہ کے مایہ ناز ماہر تعلیم شفیق الرحمٰن مرحوم نے بھی شرکت فرمائی نیز لکھنؤ وغیرہ کے علماء بھی اس میں شریک ہوئے، اس وقت یہ طے کیا گیا کہ دیہات کے نصاب کے واسطے ایک سیلبس مرتب کرکے اس کے بموجب کتابیں لکھوائی جائیں اور اس تحریک کو عام کرنے کے واسطے جگہ جگہ کانفرنسیں کی جائیں، چنانچہ احمد آباد، الہ آباد، اور دیگر مقامات پر اجتماعات کئے گئے، اور پھر ١٩٥٤ء میں ممبئی میں دینی تعلیمی کنونشن ہوا جس میں طے کیا گیا کہ حکومت کے ذرائع سے قطع نظر کرکے دینی تعلیم کا انتظام

مسلمان خود کریں، اور یہ بھی طے کیا گیا کہ ہر فرقہ اپنے فرقے والوں کے لیے ایک نصاب مرتب کرے، نصاب کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم دینے والوں کی ٹرینگ کا انتظام بھی کیا گیا، دہلی میں گھٹا مسجد میں تربیتی مرکز قائم ہوا اور تین سال تک یہ سلسلہ جاری رہا۔

مولانا محمد میاں صاحب اس کے انچارج تھے، اس سے پہلے گھٹا مسجد بالکل ویران تھی، مولانا محمد میاں نے پہلی بار اس کو آباد کیا اور اسی غرض سے وہاں ایک سال اعتکاف کیا۔ دینیات کا نصاب مرتب کرنے کے لیے مولانا نے مختلف اہل علم سے خط وکتابت کی اور ربط قائم کیا، مگر جب کسی عملی توجہ نہ دی تو خود قلم اٹھایا، اس سلسلے میں جماعت وار رسالے مرتب کئے، طریقہ تعلیم پر بھی ایک کتاب لکھی، ایک ایسا سلسلہ بھی جاری کیا کہ بچہ دس دن میں پارہ پڑھ سکے، پھر ہر جماعت کے لیے الگ الگ چارٹ بھی تیار کئے، چنانچہ اٹھارہ چارٹ اس سلسلہ میں شائع ہو چکے ہیں۔ مولانا نے قاعدہ کے علاوہ دینی تعلیم رسالہ تیار کیا جس کے بارہ حصے ہیں، یہ رسالے بے حد مقبول ہیں۔

مکاتب کے قیام کے سلسلہ میں جمعیۃ علماء کی خصوصی توجہ ان علاقوں میں رہی جو ۱۹۴۷ء میں تباہ ہو گئے تھے، اور وہاں اکا دکا مسلمان باقی رہ گئے تھے، مثلاً مشرقی پنجاب اور بھرت پور، راجستھان، نیز اجمیر شریف کا دیہاتی علاقہ، ان علاقوں میں مکاتب کے قیام کو اولین اہمیت دی گئی، پھر ضلع سورت اور کھیڑا وغیرہ میں شدھی کی تحریک کا خطرہ ہوا تو وہاں بھی مکاتب قائم کئے گئے اور دورے کئے گئے، ان علاقوں تقریباً دوسو مکاتب قائم کئے گئے۔

☆☆☆☆☆

دوسری مجلس میں۔۔۔۔۔۔

سفر حجاز کے تأثرات بیان کرتے ہوئے مولانا نے فرمایا: آزادی کے بعد سے ہمارے ملک میں ترقیات کا بہت شور ہے، مگر واقعہ یہ ہے کہ ترقیات حجاز میں جا کر دیکھیں، کہنا چاہیے کہ انہوں نے بنجر زمین کو گلزار بنا دیا، جہاں ریت اڑتی تھی وہاں ہرے بھرے باغ کھڑے ہیں۔ ۲۰ برس پہلے جب میں حجاز گیا تو جدہ ایسا تھا جیسے یوپی کا شہر امروہہ، مگر وہ

آج ممبئی نظر آتا ہے۔

''یہ صحیح ہے'' مولانا مزید وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ تمام ترقیات امریکہ اور یورپ کے بل پر ہیں، وہاں ایک ایک چیز امریکہ سے آتی ہے، اس سلسلے میں مولانا نے بتایا کہ آپ مکہ معظّمہ سے مدینہ منورہ تشریف لے گئے تو راستے میں ایک مقام پر تقریباً ایک فرلانگ تک پہاڑی سلسلہ تھا، ایک ہفتہ بعد جب واپسی ہوئی تو یہ جگہ بالکل ہموار ہو چکی تھی، معلوم ہوا کہ بڑی بڑی مشینوں کے ذریعہ یہ کام انجام پایا ہے، یہ ساری چیزیں امریکہ سے آتی ہیں حتیٰ کہ آپ انگور کا جو شربت وہاں خرید کر پیتے ہیں وہ بھی باہر لے جا کر نچوڑا جاتا ہے اور وہاں سے پیک ہو کر آتا ہے، حجاز کے بازار کی تمام رونق یورپ اور امریکہ کے دم قدم سے ہے، مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حکومت اس صورت حال کی اصلاح کے لیے شدت سے متوجہ ہے، کیونکہ جدید ترقیات کا تمام تر انحصار تعلیم پر ہے اور وہاں تعلیم پر بے حد توجہ دی جا رہی ہے۔ ہر طالب علم کو کوئی وظیفہ دیا جا رہا ہے اور ملک سے لے کر باہر تک جتنا بھی وہ پڑھنا چاہے حکومت اس کے اخراجات کی کفیل ہوتی ہے، جب تعلیم عام ہو جائے گی تو گویا وہ بنیاد فراہم ہو جائے گی جس کے اوپر خود کفیل حجاز کی تعمیر کی جا سکے۔

حجاز کی دیانت داری ذکر کرتے ہوئے مولانا نے بہت سے واقعات بتائے جو خود ان پر گزرے تھے، مثلاً مدینہ منورہ میں آپ نے ۱۴/ریال کے کپڑے خریدے تھے اور دکاندار کو دو نوٹ دیئے ایک دس ریال کا دوسرا پانچ ریال کا، دوکاندار نے نوٹ اپنے بکس میں ڈال لئے اور مولانا کو چھ ریال واپس کیے، مولانا نے کہا کہ مجھے صرف ایک ریال چاہیے کیونکہ میں نے ۱۵ ریال کے نوٹ دیئے ہیں، مگر دوکاندار اصرار کرتا رہا کہ نہیں آپ نے دس دس ریال کے دو نوٹ دیئے ہیں وہ کسی قیمت پر پانچ ریال لینے پر تیار نہیں ہوا، مولانا کپڑے لے کر واپس ہو گئے، بعد میں آپ نے جیب کا حساب کیا تو مکمل یقین ہو گیا کہ انہوں نے ۱۵ ریال ہی دوکاندار کو دیئے تھے، چنانچہ دوبارہ تشریف لے گئے اور ان کے اصرار پر دوکاندار نے اپنی نقدی کا حساب کیا اور بڑی مشکل سے ۵/ریال کو قبول کیا۔

مولانا نے بتایا کہ سڑکوں پر خوانچہ والے ہر طرح کی چیزیں بیچتے رہتے ہیں مثلاً خوانچہ میں گھڑیاں بھری ہوئی ہیں، ان کا کہیں جانے کا وقت ہو وہ خوانچہ پر ایک کپڑا ڈال کر چلے گئے، کوئی چیز کہیں گر جائے تو کوئی نہیں اٹھا سکتا، یہ لقطہ صرف پولس کا آدمی اٹھاتا ہے، غرض دیانتداری کے مناظر اتنے عام ہیں کہ ان کو بیان کرنا بھی مشکل ہے۔

وہاں کے سماج میں کیا ہندوستان کے لیے کوئی انتظامی سبق ہے؟

یقیناً! مولانا نے فرمایا: اگرچہ وہاں علمیت کی بہت کمی ہے نیز مفکرانہ قیادت بھی انہیں حاصل نہیں ہے، مگر وہ ایک فعال اور باحوصلہ قوم ہیں، اور انہوں نے جو سماج بنایا ہے وہ ہمارے عظیم ملک کے لئے بہت سے پہلوؤں سے سبق رکھتا ہے، ان کی ترقیات اگرچہ دیگر ممالک کی رہنمائی میں ہو رہی ہیں، مگر ان کی رفتار ترقی ہمارے یہاں کی رفتار ترقی سے بہت زیادہ ہے۔ ہندوستان اور پاکستان میں ترقیات کے نعرے تو بہت ہیں مگر ان کی حقیقت ۲۵/۳۰/ فیصد سے زیادہ نہیں، جب کہ جدہ مدینہ اور مکہ کو دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ ترقی یہ ہے، ہندوستان و پاکستان کی ترقیات کے یہ معنی ہیں کہ ایک شاداب گلشن میں کچھ درخت اور لگا دیئے گئے، لیکن سرزمین حجاز اور نجد میں جو ہوا ہے وہ بلا تمثیل بنجر کو گلزار بنانے کے ہم معنی ہے۔

یہاں جو صورت حال ہے کہ بلڈنگ بنتی ہے مگر مسالہ خراب لگانے کی وجہ سے چند سال میں مرمت کے قابل ہو جاتی ہے، دفتر میں جائیے تو رشوت کے بغیر کام نہیں ہوتا، ان معاملات میں عرب کا حال کیا ہے؟ بہت کم، مولانا نے زور دیتے ہوئے کہا، جدہ کی ایک مجلس میں وہاں کے حالات کا تذکرہ تھا۔ فرید الوحیدی، خالد سیف اللہ، خورشید عالم، پرویز وغیرہ جو کہ سفارت خانہ کی ملازمت کے تحت مستقل وہیں مقیم ہیں، ان حضرات نے اپنا عام تجربہ وہاں کے بارے میں بتایا کہ یہاں حاکم اور محکوم کا تعلق نہیں پایا جاتا، ایک عام آدمی افسر کے یہاں جائے تو وہ حضور وغیرہ کچھ نہیں کہے گا بلکہ نام لے کر (یا فلاں) پکارے گا اور وہ خندہ پیشانی کے ساتھ جواب دے گا، اس کو اپنی توہین کا مطلق احساس نہیں ہوگا، کارکردگی کے معاملہ میں بے حد چست، جو کام ہمارے دفاتر میں ایک ہفتہ میں ہوتا ہے وہ وہاں ایک

دن میں ہو جاتا ہے۔

''فعال جماعت ہے'' مولانا نے فرمایا: مگر قیادت ان کے پاس نہیں، اگر انہیں اعلیٰ درجہ کی قیادت حاصل ہو جائے تو وہ دنیا کے امام بن سکتے ہیں، حجاز میں شریف حسین کی حکومت ختم کر کے جب سلطان عبدالعزیز آل سعود برسر اقتدار آئے تو ابتدائی زمانے میں انہوں نے اعلان کیا کہ ان کا مقصد سنت رسول اللہ کا اجراء، حرمین شریفین کی خدمت اور اسلامی حکومت کا قیام ہے، مگر جب اصلاحات کا کام شروع ہوا تو نجدیت نے زور کیا اور حکومت کے اہتمام میں قبے وغیرہ شہید کر دیئے گئے، اس کے خلاف احتجاج ہوا چنانچہ حکومت سعودیہ نے موتمر اسلامی کے نام سے عالم اسلام کے علماء کا اجتماع کیا، جس کا منشا یہ تھا کہ یہ طے کیا جائے کہ حکومت کا انداز کیا ہونا چاہیے، چنانچہ اس وقت ہندوستان سے حکومت کی دعوت پر دو وفد گئے ، ایک خلافت کمیٹی کا وفد، دوسرا جمعیۃ علماء کا وفد جس میں مولانا کفایت اللہ صاحب اور مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا احمد سعید صاحب اور مولانا عبدالحلیم صدیقی شریک تھے۔

اس تاریخ کا ذکر کرتے ہوئے میں نے مولانا سے دریافت کیا کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ ۴۰؍ برس پہلے سعودی عرب میں علماء اسلام کے اجتماع میں ہندوستان کی نمائندگی خصوصیت سے جمعیۃ علماء کو حاصل تھی مگر آج ایسا نہیں ہے، حالانکہ خلافت عثمانیہ اور ہندوستان سے انگریزوں کے احتجاج کے سلسلہ میں جمعیۃ علماء نے جو کام کیا ہے اس سے بالواسطہ طور پر جن ممالک کو فائدہ پہنچا ان میں سے ایک سعودی عرب بھی ہے۔

مولانا نے بتایا کہ اس کی کوئی نفسیاتی یا اختلافی وجہ نہیں ہے، اب بھی ہمیں وہاں اعلیٰ نمائندگی مل سکتی ہے مگر ضرورت ہے کہ عربی میں کام کیا جائے، اس سلسلے میں مولانا نے تین چیزوں پر زور دیا، شخصی تعلق، پریس اور لیٹریچر۔ مولانا نے کہا کہ ہمارا عربی پریس قائم ہونا چاہیے، مراسلت کے ذریعہ وہاں کی شخصیتوں سے ربط قائم کرنا چاہیے اور عرب ممالک میں دورے کرنے چاہئیں، اس طرح وہ فضاء بنے گی جب ہم کو دوبارہ وہاں مقام مل سکے جو پہلے وہاں ہمیں حاصل تھا۔ ☆☆☆☆☆

افسوس ہے کہ ہماری انجمن علم وعمل کی ایک اور شمع روشن بجھ گئی
حضرت مولانا سید محمد میاں صاحبؒ

حضرت مولانا سعید احمد اکبرآبادی، مدیر برہان دہلی

افسوس ہے ہماری انجمن علم وعمل کی ایک اور شمع روشن بجھ گئی۔ یعنی مولانا سیّد محمد میاں نے مختصر علالت کے بعد ۷۴ برس کی عمر میں ۲۲/اکتوبر کو عین مغرب کے وقت اُردن ہسپتال میں داعی اجل کو لبیک کہا اور راہی ملک بقا ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

مولانا گوں ناگوں علمی وعملی کمالات کے جو ایک شخص میں شاذ و نادر ہی جمع ہوتے ہیں، جامع تھے، ایک طرف وہ بلند پایہ عالم، فقیہ ومحدث تھے، دوسری طرف جنگِ حریت و آزادی کے نہایت بہادر اور بے خوف سپاہی، ایک طرف مؤرخ ومحقق اور کثیر التصانیف مصنف اور دوسری جانب اعلیٰ دفتری اور تنظیمی صلاحیتوں کے مالک، ایک طرف عابد شب زندہ دار اور دوسری طرف نہایت متواضع اور خلیق وملنسار، بے لوث و بے غرض، نام ونمود سے دُور، شہرت وجاہت طلبی سے نفور، نرم دمِ گفتار اور گرم بوقتِ پیکار۔ مرحوم دیوبند کے سادات رضوی سے تعلق رکھتے تھے۔ دیوبند میں پیدا ہوئے اور وہیں اَزاوّل تا آخر تعلیم حاصل کی۔ فراغت کے بعد بعض مقامات پر مدرس رہے مگر پھر جمعیت علماء سے وابستہ ہوئے تو اسی کے ہو کر رہ گئے۔ وہ مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی رحمۃ اللہ علیہ کے دستِ راست تھے، اس سلسلے میں کئی مرتبہ جیل بھی گئے۔ باتیں کم کرتے تھے اور کام زیادہ، نہایت سمجھ بوجھ اور ہوش وگوش کے انسان تھے اور نہایت چست اور مستعد۔ حقیقت یہ ہے کہ جمعیت کے دفتری نظم ونسق کا

بھرم ان کے دم سے قائم تھا۔ اگرچہ ایک عرصہ سے درس وتدریس کا باقاعدہ سلسلہ نہیں رہا تھا لیکن مطالعۂ کتب اور تصنیف وتالیف کا ذوق فطری تھا، اس بنا پر جمعیت علماء کی ہنگامہ خیز اور شبانہ روز مصروفیات کے باوجود وہ پابندی سے اس میں بھی لگے رہے۔ چنانچہ اسی زمانہ میں دو کتابیں ''علماءِ ہند کا شاندار ماضی'' (تین جلدوں میں) اور ''علماءِ حق'' (۲ جلدوں میں) ان کے قلم سے نکلیں اور شائع ہوتے ہی اربابِ علم وذوق کے حلقوں میں مقبول ومشتہر ہوگئیں۔

مشرق ومغرب میں ان سے استفادہ کیا گیا اور ان دونوں کتابوں کی حیثیت ''حوالہ کی کتاب'' Reference Book کی ہوگئی۔ چنانچہ اس وقت بھی جبکہ یہ سطریں لکھی جارہی ہیں راقم الحروف کی میز پر کنیڈا کے زمانۂ قیام کے اپنے شاگرد ڈاکٹر یوحنا فریڈمان پروفیسر عبرانی یونیورسٹی یروشلم کا ایک خط رکھا ہوا ہے جس میں انہوں نے مولانا مرحوم کی بعض کتابوں سے متعلق استفسار کیا ہے، اس سے پہلے ان ہی کی نگرانی میں مرتب کی ہوئی ایک کتاب ''عہدِ حاضر کے علماءِ اسلام'' کے نام سے انگریزی میں یروشلم یونیورسٹی سے شائع ہوچکی ہے جس پر راقم الحروف کا تبصرہ اسلامک کلچر، حیدرآباد میں نکل چکا ہے، اس کتاب میں بھی کئی جگہ مولانا مرحوم کی ان کتابوں کے حوالے موجود ہیں۔

تقسیم کے بعد ملک میں جو حالات پیدا ہوئے انہوں نے بہت سے شیران بیشہ شجاعت وقوم پروری کو دل شکستۂ وبیزار کرکے عملی سیاسیات سے ترک تعلق پر مجبور کردیا، مرحوم بھی انہیں میں سے تھے، لیکن جب تک مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ حیات رہے وہ جمعیت سے لگے چمٹے رہے اور اس دور میں انہوں نے ایک بڑا کام یہ کیا کہ جمعیت کے منصوبۂ دینی تعلیم کے ماتحت مکاتب کے لیے ایک اعلیٰ درجہ کا نصابِ تعلیم مرتب کرکے اس کے مطابق بچوں اور بچیوں کے لیے کتابیں لکھ ڈالیں جو گھر گھر مقبول ہوئیں اور مشہور ہوگئیں۔ ۱۹۶۲ء میں مولانا حفظ الرحمٰن خدا کو پیارے ہوئے تو کچھ دنوں کے بعد مولانا سیّد محمد میاں جمعیۃ علماء کی نظامتِ علیٰ سے مستعفی ہوکر خانہ نشین ہوگئے اور اب انہوں نے اپنے تئیں درس و

تدریس، تصنیف وتالیف، افتاء اور رکن مجلس شوریٰ کی حیثیت سے دارالعلوم دیوبند کی خدمت کے لیے ہمہ تن وقف کردیا۔ اس زمانہ میں مدرسہ امینیہ دہلی میں شیخ الحدیث کی حیثیت سے حدیث کا درس دیتے رہے اور سیرت اور دوسرے دینی وتاریخی موضاعات پر متعدد چھوٹی بڑی کتابیں تصنیف کیں جو ان کے قبائے علم وفضل کا تکمہ زریں ہیں۔ لکھنے پر مولانا کو اس درجہ قدرت تھی کہ جب چاہتے بے تکلف لکھتے اور لکھتے ہی چلے جاتے تھے، قلم انہیں اس درجہ عزیز تھا کہ وفات سے دو دن پہلے بھی وہ ایک مضمون لکھنے کا ارادہ کررہے تھے۔ درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کی ہمہ گیر مصروفیتوں، جسمانی اسقام وعوارض اور کبرسن کے باعث ضعف واضمحلال کے باوجود کیا مجال کہ ان کے معمولات، عبادت واوراد وظائف میں کوئی فرق آجائے۔ وہ چلے گئے اور نئی نسل کے لیے اخلاص وعمل، جدوجہد اور اعلیٰ اقدار حیات کے لیے ہمہ تن سعی وکوشش کی ایک مثال قائم کرگئے۔ رَحِمَهُ اللّٰهُ رَحْمَةً وَاسِعَةً۔

(ماہنامہ برہان نومبر ۱۹۷۵ء)

مولوی محمد میاں کی موت کا آج زمانے کو غم ہے

[۱۹۷۵ء]

جناب غوث محمد صاحب ایٹوی

حضرت مولانا محمد میاں صاحب کے سانحۂ ارتحال کا سال ۱۳۹۵ھ مطابق ۱۹۷۵ء ہے، جناب غوث محمد صاحب ایٹوی نے اس موقع سے ایک تاریخی مقالہ تحریر فرمایا، جس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی ہر سطر سے مرحوم کی تاریخ وفات نکلتی ہے، کل ملاکر ۷۰ ر مادے ہوتے ہیں، یہ انداز نایاب نہ سہی، کمیاب ضرور ہے، اس کی یہی خصوصیت اور اہمیت اشاعت کی وجہ بنی۔ (مرتب)

آپ ماہ اکتوبر کی چھبیس وستائیس کا الجمعیۃ دیکھئے گا [۱۹۷۵ء] جس میں چند اکابرین وطن نے مولانا کی وفات پہ اپنی اپنی رائے پیش کی ہے [۱۹۷۵ء] میں نے انھیں کے پاک جملوں سے تاریخیں نکالی ہیں [۱۹۷۵ء] ہمزہ کے کہیں اک، کہیں دس اور کہیں کچھ شمار نہیں کیا گیا ہے [۱۳۹۵ء] مولوی محمد میاں کی موت کا آج زمانے کو غم ہے [۱۹۷۵ء] جمعیۃ علمائے ہند دہلی کے ناظم عمومی [۱۹۷۵ء] جناب مولانا سید احمد صاحب ہاشمی نے بھی ایک تقریر میں کہا [۱۹۷۵ء] کہ مولانا الحاج محمد میاں صاحب نے آج قوم کی جو کلی خدمات انجام دی ہیں [۱۹۷۵ء] ان کے ذکر کے لئے ایک کتاب درکار ہے [۱۹۷۵ء] ناظم صاحب نے کہا: اگر مولانا ایسی کتابیں نہ لکھتے [۱۹۷۵ء] اسلام کی تاریخ بھی وجود میں نہ آتی [۱۹۷۵ء] مولانا مرحوم کا، کارناموں سے آج مسلمانوں پہ، یہ اتنا بڑا احسان ہے [۱۹۷۵ء] کہ ہم تا زیست اس سے کبھی بھی عہدہ برآ نہیں ہوسکتے [۱۹۷۵ء] اچھا ہاشمی

صاحب نے یہ بھی بتایا کہ جمعیۃ علمائے ہند کے لئے مولانا کا[۱۹۷۵ء] یقین کیجئے اساسی رتبہ تھا[۱۹۷۵ء] وہ والا جاہ جماعت کے ایسے راہ نما تھے[۱۳۹۵ء] کہ جب کسی معاملہ میں ہم لوگوں کو کوئی نئی یا اہم دقت پیش آتی[۱۹۷۵ء] تو مولانا موصوف سے ایک مشورہ ہی نہ لیتے بلکہ[۱۹۷۵ء] ہم مولانا ممدوح کے ہر فیصلے کو قبول کر لیتے تھے[۱۹۷۵ء] ان کی موت دلی کا نقصان نہیں، ہند کا بھی نقصان نہیں؛ بلکہ ایک جہان کا نقصان ہے[۱۹۷۵ء] واقعی یہ نقصان اپنا ایک ناقابل برداشت نقصان ہے[۱۹۷۵ء] آج علم وعمل کے ایسے پیکر شاید ہی عالم وجود میں آسکیں گے[۱۹۷۵ء] مفتی عتیق الرحمٰن صاحب نے بھی فرمایا کہ[۱۹۷۵ء] مولانا محمد میاں صاحب کی پوری زندگی نیک نفسی وپاکیزگی سے بھی معمور تھی[۱۹۷۵ء] بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں جو بوڑھے ہوجانے پہ ازحد نیک بن جاتے ہیں[۱۹۷۵ء] مولانا کے بارے میں آدمی ایسا فرمایا کرتے تھے[۱۹۷۵ء] کہ واقعی ایک فرشتہ صفت انسان تھے[۱۹۷۵ء] آج تو ہم لوگ ایک زبردست الم ہی محسوس کررہے ہیں[۱۹۷۵ء] لیکن کچھ روز بعد ہم سب کو یہ بھی محسوس ہوگا کہ وہ علمی میدان میں کتنا اہم کام انجام دے گئے ہیں[۱۹۷۵ء] مولوی قاضی سجاد حسین نے بحسن کرم فرمایا: آج[۱۹۷۵ء] مولانا ممدوح کی وہ زندگی صحابہ کرام کی زندگی کی یاد کو تازہ کرتی ہے[۱۹۷۵ء] جناب یونس سلیم صاحب ایم. پی نے سچ کہا ہے کہ مولانا کی موت ایک المناک حادثہ ہے[۱۹۷۵ء] مولانا اخلاق حسین قاسمی نے کہا: ہم[۱۹۷۵ء] تو آج بے شک مولانا ممدوح کی موت نے اکابرین کی موت کو یاد دلا دیا[۱۹۷۵ء] مولانا سید فخر الحسن صاحب نے کہا: مولانا دینی حلقوں میں یاد کئے ہی[۱۹۷۵ء] جاتے رہیں گے، ہمیشہ ہمیشہ جب تک بھی یہ دنیا آباد ہے[۱۹۷۵ء] جناب ظہیر الدین صاحب نے حق کہا کہ الحاج مولانا نے آزادی وطن کے لئے[۱۹۷۵ء] ہاں! اپنی جان پہ قید وبند کی مصیبتیں برداشت کیں[۱۹۷۵ء] آپ اچھی شخصیت کے مالک بھی تھے[۱۹۷۵ء]

جناب سادگی، تقویٰ، قناعت کے اچھے پیکر تھے [۱۹۷۵ء] دراصل آج ان کی پاک زندگی نوجوان نسل کے لئے سبق آموز اور قابل تقلید ہے [۱۹۷۵ء] ان کی خدمت کے نقوش ایسے پائیدار ہیں [۱۹۷۵ء] بلکہ وہ خدمات آج سنہری حروف سے لکھی جائیں گی [۱۹۷۵ء] سابق وزیر مسٹر عزیز الرحمٰن صاحب ایم .ایل .اے نے کہا: مولانا آج [۱۹۷۵ء] بھی اپنی عالی خدمات کے صلہ میں حیات ہیں [۱۹۷۵ء] جناب ناز انصاری نے بھی مولانا کی بابت تحریر کیا ہے [۱۹۷۵ء] انھوں نے جس طرح نام ونمود کی کسی خواہش کے بلا اپنی زندگی کے زاید کہ [۱۹۷۵ء] کم پچاس سال ملک وملت کے کاموں میں گذار دیئے [۱۹۷۵ء] مولانا الحاج محمد میاں ایسے اچھے ستون تھے [۱۳۹۵ء] کہ اسی پہ جمعیۃ علماء کی بنیادی تعمیر قائم رہی [۱۹۷۵ء] ہاں وہ کون ہے جو اس صداقت سے انکار کرے [۱۳۹۵ء] مولانا خدا پرست [۱۳۹۵ء] ہونے کے علاوہ پاک دل بھی، پاک باطن بھی، پاک باز بھی، پاک طینت بھی تھے [۱۳۹۵ء] مولانا ممدوح ایک صالح بزرگ بھی تھے اور بڑے عابد بھی تھے [۱۹۷۵ء] یہ کل باتیں ان کی آخرت کا توشہ ہیں [۱۹۷۵ء] کل دینی درس وتدریس کے حلقوں میں [۱۳۹۵ء] دینی علوم وفنون کے یک پاک میدان میں بھی فکر رکھنے والوں [۱۳۹۵ء] اور ہاں تصنیف وتالیف کا کام کرنے والوں میں [۱۹۷۵ء] آپ کا نام عزت واحترام سے لیا جائے گا [۱۳۹۵ء] (از جانب) حقیر جہاں غوث محمد [۱۹۷۵ء]

(مخدوم اترولوی) بے شبہ صحیح ہے کہ دنیائے اسلام کا چراغ گل ہوگیا [۱۹۷۵ء] مولوی محمد میاں مرے ایک بڑے محسن ومہربان تھے [۱۹۷۵ء] قلبی دعا ہے کہ وہ واحد قدوس مولانا احمد میاں صاحب نیز پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے [۱۹۷۵ء] اور مرحوم کو اللہ جنت فردوس میں ایک اچھی جگہ عطا کرے آمین [۱۹۷۵ء] والاحسب واعلیٰ نسب مولوی محمد میاں صاحب نور اللہ مرقدہٗ [۱۳۹۵ء] جناب حاجی مولانا محمد میاں خلد آشیاں [۱۳۹۵ء] سید الملت سید القوم سیدزادہ جناب مولانا محمد میاں صاحب [۱۳۹۵ء]

قطعہ اخراجیہ

فلک ہے گریاں محمد میاں کے ماتم میں
زمین ہند پہ ایسے بھی آدمی گذرے
جو نکلی آہ! تو فوراً یہ بول اٹھا مصرعہ
خدا کرے تری پھولوں میں زندگی گذرے

[۱۹۸۲-۷=۱۹۷۵ء]

قطعہ اتمامیہ

ہوکر خفا جہاں سے محمد میاں گئے
احباب پوچھتے ہیں وہ آخر کہاں گئے
آواز آئی غوث محمد یہ غیب سے
مولانا، کہہ بھی دو، سوئے باغ جناں گئے

[۱۹۷۵ء]

قطعہ ادخالیہ

ہے کہی غوثِ محمد کی دعا شام و سحر
قصر اعلیٰ دینا یارب! جنت فردوس میں
خواب میں مجھ کو پیام حضرت آدم ملا
مرنے والا پہونچا دیکھ اب جنت فردوس میں

۱۳۵۰+۴۵=۱۳۹۵ء

دیکھو! بحساب ابجد ہنوز کل تعداد ستر مادے نکلتے ہیں [۱۹۷۵ء]

حقیر جہاں غوث محمد [۱۹۷۵ء] قیام امام پور ڈسٹرکٹ ایٹایوپی [۱۹۷۵ء]''

[روزنامہ الجمعیۃ دہلی، ۱۲ر دسمبر ۱۹۷۵، عید نمبر، ص:۹]

حضرت مولانا محمد میاںؒ

پروفیسر خواجہ احمد فاروقی صدر شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی

’’حضرت مولانا محمد میاں نور اللہ مرقدہٗ کی رحلت تمام ہندوستان کے حریت پسندوں کے لیے سانحہ عظیم ہے، ان کے انتقال سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ کی جماعت کا ایک رکن رکین ہمارے درمیان سے اٹھ گیا، تحریک آزادی کا ایک سرخیل ہم سے چھین لیا گیا اور خاموش اور بے لوث خدمت کا ایک دور ختم ہو گیا۔ وہ بڑے مجاہد، بڑے مصنف، بڑے مؤرخ، بڑے محدث اور بڑے مدرس ہی نہیں تھے؛ بلکہ بڑے دل نواز اور دردمند انسان تھے۔

حضرت مولانا مرحوم میرے چچا مولوی عبد الواحد صاحب اور مولوی عبد الحفیظ صاحب رئیس نچھرایوں کے بے تکلف دوست تھے، اور اس رشتہ سے وہ میرے ساتھ وہی سلوک فرماتے تھے جو آبا اپنی اولاد کے ساتھ کرتے ہیں۔ میں نے ان کی تقریریں سنی ہیں اور ان کی آتش بیانی کو سن کر یہ دعا مانگی ہے کہ اے اللہ! اس سوزِ قلب کی ایک چنگاری مجھے بھی عطا کر۔ ’’ذرۂ دردے دلِ عطار را

مولانا محمد میاں کی شخصیت ہمہ جہت تھی، لیکن ان کی سیرت کی سب سے نمایاں خصوصیت علم وفن کی محبت اور ملک وملت کی خدمت تھی۔ مجھے ہرگز امید نہیں کہ ان اوصاف کا جامع جیسے کہ مولانا تھے مستقبل قریب میں کوئی پیدا ہو سکے گا، جو جگہ ان کے جانے سے خالی ہوئی ہے وہ مستقبل قریب میں بھر سکے گی۔ مجھے سب سے زیادہ افسوس علم وفن کی بے کسی اور خاموشی اور بے لوث خدمت کی یتیمی پر ہے

چوں شمع سر بلندیٔ عشاق مفت نیست آخر بقدر سوزش است آبروئے ما

آزادی کی تحریک میں جمعیۃ علماء ہند کا بڑا حصہ ہے، تمام غیر جانبدار مؤرخین اس پر متفق ہیں کہ ہم نے اپنی آبادی کے تناسب سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔ کیا مولانا محمد میاں کی یاد میں ان کی کتابیں دوبارہ اہتمام سے شائع ہوں گی؟ کیا دہلی کی کوئی شاہراہ ان کے نام سے منسوب ہوگی؟ کیا کوئی کتب خانہ ان کے نام سے قائم ہوگا، جس سے ہمارے علماء کا شاندار ماضی آنکھوں کے سامنے آجائے؟

بعد از وفات تربت ما در زمیں مجو در سینہ ہائے مردم عارف مزار ما

(روزنامہ الجمعیۃ: ۲۵؍شوال ۱۳۹۵ھ مطابق ۳۱؍اکتوبر ۱۹۷۵ء جمعہ)

☆☆☆☆☆

سَیِّدُ الْقَوْمِ خَادِمُھُمْ

جناب ناز انصاری سابق ایڈیٹر روزنامہ الجمعیۃ

الجمعیۃ کے آرڈر بک میں یہ آرڈر محفوظ ہوگا، جس میں حضرت مولانا سید محمد میاںؒ نے بحیثیت نگراں اخبار الجمعیۃ یہ تحریر فرمایا تھا کہ میرے نام کے ساتھ ''سید ملت'' نہ لکھا جائے، صرف حضرت مولانا حسین احمد مدنی علیہ الرحمہ کے نام کے ساتھ ''شیخ الاسلام'' اور حضرت مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب کے نام کے ساتھ ''مجاہد ملت'' لکھا جائے۔

یہ ۱۹۴۹ء کا واقعہ ہے اور آج ۱۹۷۵ء ہے، وہ ہم سے جدا ہو گئے، مجھے ان کے حکم کا آج بھی پابند ہونا چاہیے؛ لیکن آج میرا دل حضرت مولانا کو ''سید ملت'' کے سوا کسی اور نام سے پکارنے کو تیار نہیں ہے؛ اسی لیے میں اس عربی مقولہ کا سہارا لے رہا ہوں:

''سَیِّدُ الْقَوْمِ خَادِمُھُمْ''

انھوں نے جس طرح نام ونمود کی کسی خواہش کے بغیر اپنی زندگی کے کم وبیش ۵۰/ برس ملک وملت کی خدمت میں گزارے، اس کے بعد کون ہے جو اس قول کی صداقت سے انکار کرے گا! یہ مولانا کی عالی ظرفی تھی، اپنے اسلاف کا ادب واحترام تھا کہ انھوں نے یہ حکم صادر فرمایا، ورنہ امر واقعہ یہ ہے کہ وہ صرف نام یا ذات کے ''سید'' نہیں تھے، فی الحقیقت ''سید القوم'' تھے، وہ ہوں یا نہ ہوں، ان کے مرتبہ شناس ہمیشہ یہی سمجھیں گے''۔

''مولانا ایک صالح بزرگ تھے، بہت بڑے عابد تھے، خدا پرست تھے، مومن تھے، عالم باعمل تھے، ہوا کریں! یہ ساری خوبیاں ان کی عاقبت کا توشہ ہیں اور اُس عظیم سفر کے لیے زادِراہ، جو انھوں نے اب شروع کیا ہے، قوم وملت کو اس سے کیا مل سکتا ہے؟ قوم و

ملت کے ایک ''خودغرض جز'' کی حیثیت سے اگر میں بھی اسی پہلو سے غور کرتا ہوں تو میں قارئین سے معذرت خواہ ہوں۔

مولانا محمد میاں صاحب کے چار فرزند ہیں اور یہ باور کرنے کے لیے وجوہ موجود ہیں کہ وہ اپنے نیک نام والدمحترم کی اعلیٰ روایات اور نیک نامیوں کو چار چاند لگائیں گے؛ لیکن تاریخ وسیاست کے ایک ادنیٰ طالب علم اور علمی دنیا کے ایک خادم کی حیثیت سے میرے نزدیک جس چیز سے ہندوستان کی تاریخ میں، ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ میں، ہماری جنگ آزادی کی تاریخ میں، ہندوستان کے علمی اور تاریخی سرمایہ کی تاریخ میں، ہندوستانی علماء بالخصوص جمعیۃ علماء ہند کی تاریخ میں، ان کا نام زندہ رہے گا اور علمی وتحقیقی کام کرنے والوں سے خراج حاصل کرتا رہے گا، دینی درس وتدریس کے حلقوں میں، دینی علوم و فنون کے میدان میں، دینی فکر ونظر رکھنے والوں اور دینی تصنیف وتالیف کا کام کرنے والوں میں، مجاہدین آزادی کی صف میں، مؤرخوں کے حلقے میں، تحقیقی کام کرنے والوں میں، برصغیر ہندو پاک اور اسلامی دنیا میں، ان کا نام عزت واحترام سے لیا جائے گا اور ان کا نام ہمیشہ ہمیشہ زندہ وتابندہ رکھنے والی - ان کی حقیقی اولاد اور لخت ہائے جگر - وہ گراں قدر کتابیں ہیں، جو انھوں نے آنے والی نسلوں کے لیے چھوڑی ہیں۔ یہ مولانا کی سب سے بڑی اور تاریخی خدمت ہے، اگر وہ اور کچھ بھی نہ کرتے تو یہ اور صرف یہی کام ایسا ہے کہ جو دوسرے لوگوں کے ہزاروں کاموں پر بھاری اور مولانا کو زندہ رکھنے والا ہے''۔

دلی آنے کے بعد حضرت مولانا محمد میاںؒ سے میری پہلی باقاعدہ ملاقات یکم نومبر ۱۹۴۸ء کو اس وقت ہوئی، جب میں نے ''روزنامہ انصاری'' چھوڑ کر، ادارہ الجمعیۃ سے وابستہ ہونے کے سلسلے میں گفتگو کی۔ حضرت مولانا اس وقت ناظم جمعیۃ علماء ہند کے علاوہ ''اخبار الجمعیۃ'' کے بھی نگراں تھے۔

الجمعیۃ میں آنے کے بعد مولانا مرحوم کو قریب سے دیکھنے اور بار بار پرکھنے کا موقع ملا۔ ''پرکھنا'' میں نے ادائیگیِ مفہوم کے لیے استعمال کیا ہے؛ ورنہ ''چہ نسبت خاک را با عالم

پاک''۔ یہ انتہائی پُر آشوب دور تھا اور اس وقت جمعیۃ علماء ہند کے کندھوں پر بار آپڑا تھا، خصوصاً دلی جس دور سے گزر رہی تھی، بلاشبہ مجاہد ملتؒ نے اس کو بہادری اور اولوالعزمی کے ساتھ اٹھایا؛ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ ناظم کی حیثیت میں اگر دفتر کے اندر اور جماعتی تنظیم کے معاملات اور ان کا بار حضرت مولانا محمد میاںؒ کے کندھوں پر نہ ہوتا تو مجاہد ملتؒ کے راستہ کی دشواریاں کئی گنا ہوتیں، مولانا محمد میاں ایسے ستون تھے جس پر یہ عمارت قائم رہی۔

۱۹۴۷ء کے بعد کی جمعیۃ علماء کی بقایا جمعیۃ علماء کی حیات نو یا تعمیر نو میں جن لوگوں کی محنت اور کوششیں شامل ہیں، ان میں سے ایک نمایاں نام حضرت مولانا محمد میاںؒ کا اسم گرامی بھی ہے۔ اس زمانے میں جب جمعیۃ علماء کی ممبر سازی ہوئی تو وہ کئی لاکھ تک پہنچ گئی تھی اور اس پر سردار پٹیل اور اس وقت کی وزارت داخلہ کے ایوانوں میں زبردست زلزلہ پیدا ہوگیا تھا؛ لیکن اتنی بڑی تعداد میں جمعیۃ علماء کی ممبر سازی جہاں جمعیۃ علماء کے ماضی اور اس کی اس وقت کی زبردست اور بے لوث خدمات اور مجاہد ملت کی مساعیِ جمیلہ کا نتیجہ تھیں، وہاں یہ اعتراف نہ کرنا ناسپاسی ہوگی کہ وہ حضرت مولانا محمد میاں کی تنظیمی اور جماعت کو آرگنائز کرنے کی بے پناہ صلاحیتوں کا بھی نتیجہ تھی''۔

حضرت مولانا میں دینی حمیت اور خدا کی اس سرزمین پر خدا کی وحدانیت اور اسلامی عظمت و سربلندی کے لیے کس قدر جوش وجذبہ تھا، اس کا اندازہ ارتداد کے واقعات پر ان کے ردعمل سے خاص طور پر ہوا، جو اس دور میں سننے میں آئے۔

ان میں ایک گجرات کے کسی علاقے کا تھا، جس کا نام اس وقت مجھے یاد نہیں (بھڑوچ اور سورت کے علاقے ہیں: معروفی) وہاں مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد مرتد ہوگئی تھی، حضرت مولانا وہاں تشریف لے گئے اور الحمدللہ اپنے مشن میں کامیاب رہے۔

دوسرا علاقہ میوات کا تھا، وہاں بھی جمعیۃ علماء نے اس سلسلے میں بڑی خدمت کی ہے اور مولانا اس میں بھی پوری طرح سرگرم رہے۔

تیسری جگہ ہماچل پردیش کا علاقہ تھا، اس علاقے کی کیفیت اور وہاں کے دشوار

گذار اور خطرناک راستوں کا حال مجھے پچھلے دنوں مولانا خلیل الرحمٰن لدھیانوی نے ان الفاظ کے ساتھ سنایا کہ ''میں حیرت میں رہ گیا اور عش عش کر اٹھا کہ میرے جیسے صحت مند پنجابی کے لیے اس علاقہ کا دورہ مشکل ہورہا ہے اور مولانا محمد میاں صاحب نے بڑھاپے میں (مولانا کی صحت اور جسمانی ساخت بھی ملحوظ رہے) کس طرح ان دشوار گذار راستوں اور پُرخطر ماحول میں (۴۷ء کے بعد کا ماحول مراد ہے) سفر کیا ہوگا۔'' حقیقت یہ ہے کہ یہ ان کی دینی حمیت اور مسلمانوں کو ارتداد سے بچانے کا جذبہ تھا، جس نے ان میں اس سفر کا حوصلہ، ہمت اور جذبہ پیدا کردیا تھا۔

مولانا محمد میاں صاحب شعلہ بار اور دھواں دھار قسم کے مقرر نہیں تھے، بہت مدھم سروں میں تقریر فرماتے تھے، دہاڑتے نہیں تھے، وہ عوامی اجتماعات کے سید عطاء اللہ شاہ بخاری، سحبان الہند حضرت مولانا احمد سعید جیسے سحر البیان مقرر نہیں تھے؛ لیکن ان کی تقریر میں منطق اور دلائل ہوتے تھے، مواقع کے اعتبار سے ایک دو بار میں نے ان کی تقاریر میں بھی جوش پایا ہے۔ جمعیۃ کے اجلاس میں انھیں قراردادوں کو پائلٹ کرتے دیکھا ہے، انھوں نے معقول ترمیمات، اعتراضات اور تجاویز کو قبول کرنے سے کبھی گریز نہیں کیا اور اپنی ہی بات منوانے کی کوشش نہیں کی؛ بلکہ جمعیۃ مرکزیہ کے ایک اجلاس میں جب میں نے اپنی قرارداد کو واپس لینے سے انکار کیا اور تقسیم آرا پر اصرار کیا تو میں نے دیکھا: ان کی پیشانی پر ذرہ برابر شکن نہیں آئی، اس سے پہلے حالانکہ وہ میری ایک آدھ ترمیم قبول کرچکے تھے؛ لیکن پھر بھی انھیں اس بات کا ملال نہیں ہوا کہ میں نے ان کی بات کیوں نہیں مانی۔

[الجمعیۃ ۲۷/اکتوبر ۱۹۷۵ء]

تعارف

(مولانا سید محمد میاں صاحبؒ)

مولانا قاضی سجاد حسین صاحبؒ صدر مدرس عالیہ عربیہ دہلی

یہ سطریں مولانا محمد میاں کی آخری تصنیف ''اسیران مالٹا'' کے تعارف کے طور پر لکھی گئی ہیں، جس میں کتاب سے زیادہ صاحب کتاب کا تعارف آ گیا ہے، یہ مولانا کے بارے میں ایک ایسے معاصر کی شہادت ہے جو شب وروز کے ساتھی تھے۔ اس کی اہمیت پیش نظر اسے مجموعہ میں شامل کیا جار ہا ہے۔ (مرتب)

۱۹۲۶ء کا واقعہ ہے کہ میں بحیثیت طالب علم دار العلوم دیوبند پہنچا۔ شیخ الادب و الفقہ حضرت مولانا اعزاز علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے شرف تلمذ حاصل ہوا۔ یہ دار العلوم کا وہ دَور تھا جبکہ اساتذہ سے طلبا کے تقرب بنیاد صرف پڑھنے میں جانفشانی اور طلبِ علم کا شوق ہی تھا۔ خصوصاً شیخ الادب کے ماحول میں وہی طالب علم مقرب ہوسکتا تھا جو اپنا سب کچھ علم کے سپرد کر چکا ہو۔ حضرت مرحوم کی صرف زبان ہی نہیں بلکہ پوری زندگی شاہد تھی کہ **العلم لا یعطیک بعضہ حتیٰ تعطیہ کلک۔**

شہرت سنی کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا ایک مخصوص شاگرد تھا جو حضرت کے علوم وفنون خصوصاً ادب وفقہ سے بھر پور فیض حاصل کر کے آرہ (بہار) ملازم ہوکر چلا گیا ہے۔ اس یگانہ استاد کا یہ شاگرد فرید کون تھا؟ یہ وہی مولانا سیّد محمد میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ تھے جن کے بارے میں یہ چند سطور لکھنے کی سعادت کرر ہا ہوں۔

میں دیوبند سے فارغ ہوکر مدرسہ عالیہ فتح پور دہلی میں بحیثیت مدرس ملازم ہو گیا اور مولانائے مرحوم آرہ (بہار) سے مدرسہ شاہی مراد آباد میں منتقل ہو گئے تو گاہے گاہے جمعیۃ علماء ہند کے اجتماعات میں ملاقات ہوتی رہیں۔

۱۹۴۴ء کے بعد مولانا مرحوم کا دفتر جمعیۃ علماء ہند سے مستقل تعلق ہو گیا اور مولانا مستقل طریقہ پر دہلی میں مقیم ہو گئے تو بکثرت ملاقاتیں ہونے لگیں۔ ۱۹۴۷ء کے بعد تو پھر شاید ہی کوئی ایسا دن ہوتا ہوگا کہ مولانا سے شرفِ صحبت حاصل نہ ہوا اور مولانا کے فاصلے دن بدن کم ہوتے چلے گئے اور آخر میں تو سالہا سال ایسے گذرے کہ دن بھر میں کئی بار ملاقاتیں ہونے لگیں اور احاطہ کالے صاحب (گلی قاسم جان) کی مسجد دونوں کے لئے پنج وقتہ ملاقات کا سبب بن گئی۔

زندگی کے بہت سے مشاغل اور مسائل میں اشتراک پیدا ہوا اور مجھے مولانا کو بہت ہی قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا۔ مولانا کی شخصیت میں عبقریت نہ سہی لیکن جامعیت اس درجہ تھی کہ اُن کی وفات سے پیدا شدہ خلا کو ہر حلقہ میں محسوس کیا جا رہا ہے۔ ایک طرف اگر وہ سیاست داں، مؤرخ اور انشاء پرداز تھے، تو دوسری جانب وہ بہترین استاذ اور مفتی بھی تھے۔ دہلی کے قیام میں ابتدائی دس پندرہ سال میں مولانا ہمہ تن جمعیۃ علماء ہند کی نظامت اور اس کے کاموں میں مصروف رہے، نظامت کے گوناگوں مشاغل کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف میں بھی اس قدر مصروف رہے کہ اس کے نتیجہ میں آج ہمارے سامنے مولانا کی مفید اور مستند کتابیں درجنوں کے حساب سے موجود ہیں، لیکن مولانا کا درس وتدریس کا مشغلہ بالکل چھوٹ گیا۔

جمعیۃ علماء کا نظام بدل جانے پر مولانا کو جمعیۃ کے کاموں سے قدرے فرصت ملی تو مدرسہ امینیہ (کشمیری گیٹ دلی) میں بحیثیت استاد حدیث درس دینا شروع کیا۔ درس و تدریس ایک ایسا مشغلہ ہے کہ طویل تعطیل کے بعد جب پھر مسند درس پر بیٹھنا پڑتا ہے تو چند دن لامحالہ ایک اجنبیت سی محسوس ہوتی رہتی ہے۔ مولانا تو ایک ایک طویل عرصہ تک مدرسی سے غیر متعلق رہے تھے، لیکن جب دوبارہ اس طرف توجہ کی تو اللہ کے فضل و کرم سے بہترین انداز سے کامیابی کے ساتھ درس دینا شروع کر دیا۔ مدرسہ امینیہ کو حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے دور سے فتویٰ کے لئے بھی ایک مرکزی حیثیت حاصل رہی ہے۔

مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال کے بعد سے وہاں شعبہ افتاء میں ایک خلا تھا۔ مولانا نے انتہائی انہماک سے اس شعبہ کی طرف بھی توجہ کی اور افتاء کی خدمت کو بھی نہایت کامیابی کے ساتھ انجام دینا شروع کردیا۔

جیسا کہ مولانا کی بعض تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا کا گھرانا کوئی خاص علمی گھرانا نہ تھا، البتہ سیادت کے ساتھ تقویٰ اور طہارت اس گھرانے کی شانِ امتیازی تھی۔ ۲۲؍رجب ۱۳۲۱ھ میں جس وقت مولانا کی پیدائش ہوئی تو مولانا کے والد محترم سید منظور محمد صاحب چونکہ محکمۂ نہر میں ملازم تھے، مولانا ان کے ساتھ بعض دیہات میں مقیم رہے اور مولانا کی تعلیم و تربیت مولانا کی نانی صاحبہ کی زیر نگرانی شروع ہوئی۔ موصوفہ ایک عبادت گذار نیک نفس خاتون تھیں۔ کچھ عرصہ بعد ۱۹۱۶ء میں مولانا کو دارالعلوم دیوبند کے فارسی خانہ میں داخل کردیا گیا۔ مولانا ۹ سال تک دارالعلوم میں مختلف علوم وفنون حاصل کرتے رہے اور ۱۹۲۵ء میں دورۂ حدیث سے فارغ ہوئے۔

مولانا کی نانی صاحبہ کی تربیت اور فطری نیکی کے اثرات مولانا پر بچپن ہی سے نمایاں تھے۔ مولانا مرحوم کے ساتھیوں سے میں نے سنا ہے کہ مولانا بچپن اور جوانی میں بھی اسی صلاح و تقویٰ کے ساتھ متصف تھے جو آخر عمر تک ان کا طرّۂ امتیاز رہا۔ دارالعلوم کی پوری زندگی علمی انہماک کی تھی۔ مطالعہ کتب اور اساتذہ کی صحبت اور ان سے استفادہ کے علاوہ مولانا کا کوئی شغل نہ تھا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ مولانا کی شخصیت ایک عالم باعمل کی جامع شخصیت تھی۔ مولانا کی خوبیوں اور صفات کا تنوع تو اس امر کا متقاضی ہے کہ کوئی صاحب قلم مولانا کی شخصیت پر قلم اٹھائے اور ان کی زندگی کے ہر ہر گوشہ پر سیر حاصل بحث کرے۔ مجھ جیسے کوتاہ قلم کی صورتِ حال تو یہ ہے کہ حیران ہوں کہ مولانا کی کس کس خصوصیت کا تذکرہ کروں؟ جس طرف نگاہ اٹھاتا ہوں میری یہ حالت ہوتی ہے کہ

زفرق تا قدم ہر کجا کہ می نگرم　　کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجا ست

مولانا کی طالب علمی کے بعد ہندوستان میں انگریزی حکومت کے خلاف جس قدر

تحریکیں بھی چلیں، اس مردِ مجاہد نے ان میں بھرپور حصہ لیا۔ اس سلسلہ میں قید و بند کی مصیبتیں جھیلیں، لیکن پائے استقلال میں کبھی کوئی اضمحلال نہ آیا۔ پھر خوبی یہ تھی کہ ان تمام تحریکات میں مولانا کا اصل مقصد چونکہ محض رضائے رب ہوتا تھا، لہٰذا جس نوعیت کی بھی خدمت کا موقعہ ملا، اسے نہایت تندہی سے انجام دیا۔ بحیثیت رضا کار بھی خدمت کی اور بحیثیت جماعتوں کے ڈکٹیٹر کے بھی کام کیا۔

جمعیۃ علماء ہند کی نظامت کے جلیل القدر عہدے پر عرصۂ دراز تک فائز رہے لیکن عہدے کی جلالت کبھی مولانا کے لیے ادنیٰ سے ادنیٰ خدمت سے مانع نہ ہوئی۔ مولانا کا مقصد کام اور خدمت ہوتی تھی خواہ وہ کسی بھی نوعیت کی کیوں نہ ہو۔

۱۹۴۷ء کے ہنگاموں میں جب کہ ہندوستان ایک جہنم کدہ بنا ہوا تھا اور مظلوموں کی چیخ و پکار سے اہل ہند کے دل دہل رہے تھے، مولانا نے انتہائی استقامت کے ساتھ مظلوموں کی خدمت کی۔ جہاں کہیں بھی مسلمانوں پر ظلم و ستم ہوا، مولانا بے دھڑک وہاں ریلیف اور امداد کے لیے پہنچے۔ پنجاب کے خوں چکاں واقعات کے بعد جب کہ مسلمانوں کے کچھ افراد پنجاب اور ہماچل کی دور دراز آبادیوں میں اکا دکا رہ گئے تھے، مولانا نے پنجاب کے دیہات کے دورے کیے۔ ہماچل کے پہاڑوں میں پھیلے ہوئے دیہات میں دشوار گزار راستے طے کر کے پہنچے اور وہاں ان کے زخموں پر مرہم رکھا اور ان کے دین و ایمان کے تحفظ کے لیے مکاتب اور مدارس قائم کیے۔

مولانا پورے طور پر اپنے وقت کی قدر کرتے تھے اور وقت کو صحیح طور پر استعمال کرنا جانتے تھے۔ مولانا کی صدہا خدمات میں سے ایک اہم خدمت یہ بھی ہے کہ مولانا نے حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے لے کر آج کے دور تک کے علماء کی مذہبی اور سیاسی خدمات کو اپنے قلم سے اس قدر اجاگر کر دیا ہے کہ اس سلسلہ میں مولانا کی قیمتی تصانیف مؤرخین کے لئے مشعلِ راہ ہیں۔ علماء کا شاندار ماضی اور علماء حق کی جلدیں ریسرچ اور تحقیق کرنے والوں کے لئے ماخذ کی حیثیت اختیار کر چکی ہیں۔

عمر کے آخری دور میں مولانا کی توجہ کا مرکز ''تحریک شیخ الہند'' بنی ہوئی تھی۔ چند سال قبل جب انڈیا آفس لندن نے اس تحریک سے متعلق برٹش گورنمنٹ کے محکمہ خفیہ کی رپورٹ کی فائل کو عام ملاحظہ کی اجازت دی تو اس کی فوٹو کاپیاں حاصل کی گئیں، حضرت مولاناؒ نے نہایت جانفشانی اور لگن کے سے اس پر کام شروع کیا اور چونکہ یہ ریکارڈ انگریزی میں تھا اس لئے اس کا ترجمہ کرا کے ایک مبسوط مقدمہ کے ساتھ ''تحریک شیخ الہند......ریشمی رومال سازش'' کے نام سے چند ماہ پیشتر ہی شائع کی۔

اسی موضوع پر زیر نظر تالیف (اسیران مالٹا) ہے، جو شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے رفقاء کار کی سوانح پر مشتمل ہے۔ مولانا مرحوم کی حیات میں ہی اس کی کتابت کے مراحل مکمل ہو چکے تھے۔ افسوس کہ ان کی زندگی نے وفا نہ کی اور ۲۲/ اکتوبر ۱۹۷۵ء بروز چہارشنبہ تقریباً چھ بجے شام انھوں نے داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

''اسیر مالٹا'' کے موضوع پر اس سے قبل شیخ العرب والعجم استاذی حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف بھی عرصہ دراز ہوا کہ شائع ہو چکی ہے، لیکن یہ اس دور کی تصنیف ہے جبکہ ملک برٹش گورنمنٹ کے آہنی پنجوں میں تھا اور کھل کر ساری بات کہنا اور لکھنا کسی طرح ممکن نہ تھا۔ اب جبکہ ملک آزاد ہو چکا ہے اور واقعات کو تفصیل سے بیان کیا جا سکتا ہے تو مولانا نے ''اسیرانِ مالٹا'' کے حالات از سر نو مرتب کئے ہیں۔ یقین ہے کہ یہ تصنیف بھی مولاناؒ کی دیگر تصانیف کی طرح مقبول ہوگی اور مطالعہ کرنے والوں اور مؤرخین کے لئے اس موضوع پر کافی مواد مہیا کر دے گی۔

اخیر میں اس کتاب کی مقبولیت کی دعا کے ساتھ مولانا مرحوم کے لئے دست بدعا ہوں کہ خدا ان کی خدمات کو شرف قبولیت اور ان کے مراتب عالیہ میں بیش بیش اضافہ فرمائے۔ آمین (تاریخ تحریر: ۱۹/ جون ۱۹۷۶ء)

☆☆☆☆☆

ہمارا دعا گو اُٹھ گیا

مولانا اخلاق حسین صاحب قاسمی دہلویؒ

حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کے بعد یہ عنوان حضرت مولانا محمد میاں صاحبؒ کے لئے بالکل موزوں ہے۔ مولانا محمد میاںؒ اگر حدیث وفقہ میں اپنے استاد حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ کی یادگار تھے، تو زہد وتقویٰ اور ریاضت میں اپنے شیخ حضرت مدنیؒ کی روشن نشانی تھے۔

مولانا محمد میاںؒ جامع الصفات بزرگوں میں تھے۔ اہل وطن کہہ رہے ہیں کہ مجاہد آزادی اٹھ گیا، ناقدردانوں کو پھر اعتراف کرنا پڑ رہا ہے کہ مسلمانوں کے مذہبی پیشواؤں نے بڑے اخلاص کے ساتھ آزادیِ وطن میں حصہ لیا۔

ارباب حدیث وفتویٰ رو رہے ہیں کہ حضرت مفتی کفایت اللہ کا صدمہ پھر تازہ ہوگیا، تاریخ کے قدردان چلا رہے ہیں کہ جس قلم نے مسلمان مجاہدین کی تاریخ کو زندۂ جاوید بنادیا، وہ قلم خشک ہوگیا، جمعیۃ علماء ہند کے رہنما واکابرین افسوس کررہے ہیں کہ اب کون ہمیں ماضی کی روایات کی روشنی میں راستہ دکھائے گا، اب کون مجاہد ملتؒ، حضرت سجاد بہاریؒ، حضرت نورالدین بہاریؒ، مولانا احمد سعیدؒ اور مفتی کفایت اللہؒ کی بیباک اور مدبرانہ حکمت عملی کا سبق دے گا!

میں اور میری طرح بہت سے جماعتی اور دینی خدام آنسو بہا رہے ہیں کہ اب کون مشفق باپ کی طرح ہماری سرپرستی کرے گا، کون تقریر وتحریر میں خاموش اصلاح دے گا،

کون دردمندی کے ساتھ معاملات کو سنے گا اور تسلی دے گا۔

بہر حال یہ سب کچھ صحیح ہے ....لیکن اس سے بڑی بات یہ ہے کہ اب کون ہمارے لیے اور اسلامیان ہند کے راتوں کو اٹھ کر روئے گا اور دعائیں کرے گا؟

خاصانِ خدا کی دعائیں، شب بیداریاں اور نوافل گذاریاں امت کی طرف سے خدا کے غصہ کو ٹھنڈا کرنے کے لئے ہوتی ہیں۔ خدا تعالیٰ نے اپنے گناہ گار نام لیواؤں کے لئے دعا کا ایک مستقل نظام قائم کر رکھا ہے۔

عرش کے حامل فرشتے ہمارے لئے دعا میں مشغول ہیں، رحمۃ للعالمین ﷺ نے زندگی بھر امت کے لئے دعا کر کے حکمِ الٰہی کی تعمیل فرمائی: **واستغفر لذنبک وللمومنین وللمومنات** ۔ اور آج عالم قدس میں بھی امت کے غم خوار امت کے حق میں رحمت و بخشش کی دعائیں فرما رہے ہیں۔

یہ کام رسول رحمت کے بعد اہل اللہ کے سپرد ہے۔ یہ دن کو امت کے زخموں پر مرہم رکھتے ہیں، رات کو ان زخموں کے صحت یاب ہونے کی دعا کرتے ہیں۔ حضرت مولانا سید محمد میاں بھی اسی طبقہ کے اولیاء میں سے تھے۔ وہ سید تھے، حضرت حسینؓ کی اولاد میں سے تھے، اپنے نانا جان کی امت کے ساتھ غم خواری اور دردمندی انھیں ورثہ میں ملی تھی۔

حضرت مولانا احمد سعید صاحبؒ مولانا کو جمعیۃ علماء کا بایزید بسطامی کہا کرتے تھے، وہ بلاشبہ ہمارے بایزید بسطامی تھے۔

انھوں نے انکساری وخاکساری میں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور حضرت مدنیؒ کا نمونہ پیش کیا اور آخر وقت میں عام مسلمانوں کے ساتھ گورغریباں میں دفن ہونے کی وصیت کر کے ایک مثال قائم کر گئے۔

کچھ بخشش خداوندی کے لئے دوسروں کا سہارا چاہتے ہیں اور کچھ لوگ بے سہارا لوگوں کے لئے خود سہارا بنتے ہیں، خدا جانے کتنی بے قرار روحیں گورغریباں میں پڑی اس عبادت گزار سیّد کا انتظار کر رہی تھیں۔ اب ان کے پہلو میں ایک ولی اللہ، ایک باقی باللہ اور

ایک محبوب الٰہی آرام فرما رہے ہیں۔

میں نے ملت اسلامیہ کے پچھلے ۲۸؍سالہ ہنگامہ خیز دور میں مولانا مرحوم کے خادم کی حیثیت سے کام کیا۔ ہماچل پردیش کے سنگلاخ علاقہ کا دورہ ہو یا راجستھان کے ریگستانی دیہات کا، یا میوات کے گاؤں میں جانے اور وہاں دینی مدارس قائم کرنے کا۔ تقریباً ان تمام علاقوں میں مولانا مرحوم نے دینی تعلیم وتبلیغ کے لیے اکثر مجھے اپنے ساتھ رکھا۔ میں مولانا کی انکساری، روحانی اور اخلاقی بلندی اور چھوٹوں کے ساتھ غیر معمولی جذبے کو الفاظ میں بیان نہیں کرسکتا۔ عام طور پر زندگی کی نفسانفسی میں ایک دوسرے کی حوصلہ شکنی کی جاتی ہے؛ لیکن مولانا مرحوم اپنے چھوٹوں کی جس طرح حوصلہ افزائی فرماتے تھے، مجھے اپنی تعلیمی، تبلیغی اور تحریری زندگی کے ہر قدم پر اس کا بھرپور تجربہ ہوا۔

مولانا محمد میاںؒ کا ایک خاص مسلک تھا، وہ دیوبندی تھے، وہ بعض علماء سے اختلاف بھی رکھتے تھے، اختلاف پر کتابیں بھی لکھی ہیں......لیکن کیا ان کی دعائیں، کیا ان کے آنسو کسی حد بندی کے قائل تھے؟ نہیں.......جس طرح ان کی عملی جدوجہد بلا امتیاز مسلک ومذہب ہوتی تھی اسی طرح ان کی ''آہِ سحر'' بھی پوری امت محمد رسول اللہ ﷺ کے لئے تھی۔

مولانا محمد میاں صاحبؒ اجتماعی سرگرمیوں کے آدمی تھے، جماعتی سرگرمیوں میں مرحوم کو بڑے بڑے جھٹکے جھیلنے پڑے، نہ باہر والوں نے اس شب بیدار عابد پر رحم کیا اور نہ گھر والوں نے اس پر ترس کھایا اور یہ منزل مولانا کے لئے ایک آسمانی ابتلاء تھا۔ میں نے اس موقعہ پر اس ''بھولے سیّد'' کو واقعی بڑی شدید کش مکش میں پایا، مگر ایک مخلص مومن کی طرح ان کی ثابت قدمی میں فرق نہیں آیا، کیونکہ وہ اپنے نانا جان کی امت کے لئے کھڑے تھے اور اس کے مقابلہ میں ان کے سامنے ہر مسئلہ ایک ضمنی اور فروعی مسئلہ تھا۔ کسی شاعر نے کہا ہے

میں کیوں کہوں کہ غم زندگی گراں گذرا ۔۔۔ وہ ساتھ ساتھ رہے میں جہاں جہاں گذرا

ہر مشکل قدم پر ان کا نامۂ سحر گاہی ہمارے لئے راستہ صاف کر دیتا تھا؎

مجھے آہ و فغانِ نیم شب کا پھر پیام آیا　　　　تھم اے رہ رو کہ شاید پھر کوئی مشکل مقام آیا

پوری ملت کا فرض ہے کہ وہ مولانا مرحوم کے لئے برابر دعا کرتی رہے، اپنی دعاؤں میں انھیں یاد رکھے۔ ان کی اولاد کے ساتھ حسن سلوک کا معاملہ کرے، ان کی قلمی یادگاروں سے فائدہ اٹھائے، ان کے مشن کو زندہ رکھے۔ وہ آخر وقت تک جمعیۃ علماء ہند کو زندہ اور متحرک بنائے رکھنے کے خواہش مند رہے۔

خاص طور پر دہلی والوں پر مولانا مرحوم کا بڑا حق ہے۔ مولانا نے اپنی بہترین زندگی دلی میں گزار دی اور دلی والوں کے ہر دکھ درد میں شریک رہے۔ اگر ہم دلی والے مجاہد ملتؒ اور مولانا احمد سعیدؒ کی خدمات کو فراموش نہیں کر سکتے تو حضرت مولانا سید محمد میاںؒ کی بے لوث جد و جہد سے بھی صرف نظر نہیں کر سکتے۔ مولانا نے شاہ ولی اللہؒ کی دلی کے علمی و روحانی وقار کو سنبھال رکھا تھا، راجدھانی دلی کی علمی شان اور دینی آبرو مولانا کے دم سے قائم تھی۔ خدا تعالیٰ مولانا کا نعم البدل ہمیں عطا فرمائے۔ (آمین) [الجمعیۃ، ۷/نومبر ۱۹۷۵ء]

☆☆☆☆

مولانا محمد میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ

مولانا محمد سعید صاحب مہتمم جامعہ حسینیہ راندیر گجرات

''کُلُّ مَنْ عَلَیْهَا فَانٍ'' گزشتہ ماہ ایک عظیم ہستی ہم سے رخصت ہوگئی، ایسی ہستی جس کے لیے زمانہ مدتوں چشم براہ رہتا ہے، نگاہیں سراپا منتظر رہتی ہیں تب کہیں لوگوں کی قسمت جاگتی ہے۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

مولانا محمد میاں صاحب مرحوم کا شمار ہندوستان کے نامور اور مایۂ ناز علماء میں سے ہوتا ہے، آپ آل انڈیا جمعیۃ العلماء کے رُوحِ رواں شیخ الاسلام مولانا مدنیؒ کے معتمد و رفیقِ جیل اور مجاہد ملتِ مولانا حفظ الرحمٰن کے دست راست اور رفیق کار تھے۔ مرحوم اعلیٰ پیمانہ کے مورخ مصنف اور ماہر تعلیم تھے، آپ کی فیض مآب ذاتِ گرامی لوگوں کے لیے رہنما کی حیثیت رکھتی تھی، آپ کی ذات سے جیسے لوگوں کو رہنمائی حاصل تھی اسی طرح بہت سے ادارے بھی آپ کے مفید مشوروں سے مستفیض ہوتے تھے۔ مرحوم نے جس ہمت و استقلال اور قربانیوں کے ساتھ قوم و ملت کی خاموش خدمات انجام دی ہیں اُن کو اُجاگر کرنے لیے ان کے جیسے ہی کس مؤرخ کی ضرورت ہے، تاہم مولانا کی مختصر سوانح یہ ہے:

مولانا کی ولادت ۱۳۲۱ھ مطابق ۱۹۰۳ء دیوبند میں ہوئی، ابتداء سے انتہا تک دار العلوم دیوبند میں تعلیم حاصل کر کے ۱۳۴۳ھ میں دیوبند سے سندِ فراغ حاصل کی۔ دورۂ حدیث آپ نے علامہ العصر مولانا سیّد محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھا۔ حضرت

کے علوم سے آپ کو خاص تعلق اور مناسبت تھی، اکثر اپنے مضامین میں حضرت شاہ صاحب کے حقائقِ علمیہ کو حل فرماتے تھے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد پہلے مدرسہ عربیہ اسلامیہ شاہ آباد اور پھر مدرسہ شاہی مرادآباد میں درس وتدریس کی خدمت انجام دی۔ تحریکِ آزادی میں ۱۹۳۰ء میں کانگریس کے ساتھ رہ کر جمعیۃ علماء کے پلیٹ فارم سے شیخ الاسلام مولانا مدنیؒ اور مجاہدِ ملت کے ساتھ زبردست حصہ لیا اور آزادی کے لیے اپنی زندگی وقف کردی۔ تحریک آزادی کے سلسلہ میں مرحوم مولانا پانچ مرتبہ گرفتار ہوئے۔

۱۹۴۲ء میں ''ہندوستان چھوڑو'' کی تحریک میں شیخ الاسلام اور مجاہدِ ملت کے ساتھ مولانا کو بھی گرفتار کیا گیا، بریلی جیل میں مجاہدِ ملت کے ساتھ آپ بھی دو سال تک جیل میں رہے۔ ۱۹۴۲ء کی انقلابی تحریک ''ہندوستان چھوڑو'' میں مرحوم نے ایسے خطرناک کام انجام دیے کہ اگر پکڑ لیے جاتے تو پھانسی کی سزا ہوجاتی، مگر انہوں نے جو کچھ کیا تھا جہاد فی سبیل اللہ سمجھ کر کیا تھا، پھر ایک وقت آیا کہ جمعیۃ العلماء کے مرکزی دفتر کا کام سنبھالنے کی ضرورت پڑی تو شیخ الاسلام مولانا مدنیؒ اور مولانا حفظ الرحمٰنؒ نے آپ کو مستقل طور پر دہلی منتقل ہوجانے کے لیے فرمایا اور آپ نے دہلی قیام فرما کر جمعیۃ علماء کی نظامت سنبھالی۔ تقریباً ۳۸ سال تک نظامت کے فرائض انجام دیے اور مرتے دم تک اپنے شیخ مولانا مدنیؒ کے منشاء کے موافق جمعیۃ کے ساتھ وابستہ رہ کر بے لوث خدمات انجام دیتے رہے اور اس طرح اپنے شیخ کی روح پرفتوح کو اپنے سے ہمیشہ کے لیے خوش رکھا۔ رَحْمَةُ اللّٰهِ عَلَيْهِمَا رَحْمَةً وَّاسِعَةً

آزادی کے بعد مسلمانوں کو جبکہ اپنے دین پر قائم رہنا مشکل ہوگیا اور اِرتداد کا فتنہ پیدا ہوا تو ہندوستان میں مسلمانوں کے پیر جمانے اور فتنۂ اِرتداد کا مقابلہ کرنے میں شیخ الاسلام اور مجاہدِ ملت کے ساتھ مولانا محمد میاں صاحبؒ نے بھی اہم کردار ادا کیا ہے اور فتنۂ اِرتداد کو روکنے کے لیے جان توڑ کوشش کی اور اس مقصد کے لیے آپ نے مشرقی پنجاب، ہماچل پردیش، راجستھان، سوراشٹر اور کھیڑا ضلع میں پہنچ کر دین کی خوبیاں سمجھائیں اور لوگوں کو دین اسلام پر قائم رکھا۔ تقسیمِ ہند کے بعد مرحوم مولانا نے انتہائی ناموافق حالات کا

بڑی جرأت واستقلال کے ساتھ مقابلہ کیا اور آزمائش کے اس کٹھن دور میں شیخ الاسلام اور مجاہدِ ملت کے ساتھ ملک وملت کی خاموش خدمات انجام دیتے رہے۔آزادی کے بعد ۱۹۵۲ء اور ۱۹۵۷ء میں جب مرحوم کولوک سبھا کے لیے ٹکٹ پیش کیے گئے تو آپ نے اسے قبول نہ کیا۔

حضرت مولانا کثیر التصانیف تھے، سیرتِ مبارکہ، علماءِ ہند کا شاندار ماضی، طریقہ تعلیم اور مسئلہ تعلیم، اربعین، اسلام وغیرہ حدیث، تاریخ سیرت پر قابلِ قدر کتابیں لکھی ہیں نیز بہت سے اخبارات اور رسائل میں خصوصاً رسالہ دارالعلوم اور الجمعیۃ اخبار میں آپ کے نہایت مفید مضامین اور مقالات شائع ہوتے رہتے تھے، اس طرح مرحوم نے اپنے قلم کے ذریعہ علمی مذہبی اور سیاسی خدمات انجام دی ہیں جو رہتی دنیا تک یادگار رہیں گی۔

من نمانم ایں بماند یادگار

اس زود نویسی اور تصنیف و تالیف کا انہاک دیکھ کر مولانا مدنیؒ آپ کو مذاقاً ''حیوانِ کاتب'' فرمایا کرتے تھے اور سحبان الہند مولانا احمد سعید صاحبؒ آپ کو جمعیۃ کے ''بایزید بسطامی'' کے خطاب سے نوازتے تھے۔

مرحوم زندگی کے آخری حصے میں بھی آزادی کے مسلم مجاہدین کی ایک تاریخی کتاب ترتیب دے رہے تھے اور اس سلسلہ کی ایک کتاب ''تحریکِ شیخ الہند'' چھپ چکی ہے، اس کتاب کو محترم صدر جمہوریہ نے ۵؍جولائی ۱۹۷۵ء کو راشٹر پتی بھون میں خاص اہتمام کے ساتھ ریلیز کیا تھا۔

''تحریک شیخ الہند'' مسلم محبانِ وطن کی تاریخی سلسلہ کی پہلی کڑی ہے، اس سلسلہ کی دوسری کتاب ''اسیرانِ مالٹا'' زیرِ طبع ہے، تیسری کتاب کا مسودہ آپ تیار کر رہے تھے اور علالت کے دوران بھی مولانا مرحوم اس تاریخی سلسلہ کی تکمیل میں مشغول تھے اور سلسلہ تصنیف و تالیف جاری تھا کہ خداوند کریم کا حکمِ ازلی آپہنچا اور آپ کی وفات سے یہ کام نامکمل رہا گیا۔

مولانا نے بچوں کے لیے بھی دینی تعلیمی نصاب مقرر کیا اور اس کے لیے از خود رسائل اور چارٹ تیار کیے جو آسان ہونے کے ساتھ ساتھ پُر از معلومات ہیں، اور یہ رسائل بہت سے مکاتیب میں داخلِ درس ہیں اور پورے ہندوستان میں بے حد مقبول ہو کر مفید ثابت ہوئے ہیں۔ اس طرح آپ نے دینی تعلیم کا نصاب ترتیب دے کر وقت کی ایک بڑی ضرورت کو پورا کیا۔

ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

حدیث میں ہے کہ ''سَیِّدُ الْقَوْمِ خَادِمُھُمْ'' مرحوم حقیقتاً قوم کے سردار تھے، اس لیے صرف نصابی کتابوں کی ترتیب پر اکتفا نہیں کیا بلکہ بچوں کو اچھی طرح تعلیم مل سکے، اس نیت سے دہلی میں ۱۹۵۶ء اور ۱۹۵۷ء میں اساتذہ کی ٹریننگ کے لیے ایک کلاس بھی شروع کیا تھا اور ہندوستان کے تمام مدارس اور دار العلوم کے مہتممین کو اس کی طرف توجہ دلا کر اپنے یہاں کے فارغ التحصیل طلباء میں سے ایک ایک نمائندہ کو بھیجنے کے لیے دعوت دی۔ الحمد للہ آپ کی آواز پر اربابِ مدارس نے لبیک کہا اور اپنے یہاں سے فارغ ہونے والے طلباء کو دہلی بھیجا، مولانا مرحوم نے خود بھی ٹریننگ دی اور جامعہ ملیہ نئی دہلی او مدرسہ فتح پوری سے ماہر تعلیم حضرات کو بھی وقتاً فوقتاً دعوت دے کر بلاتے رہے۔ آپ کی خصوصی دعوت پر مولانا محمد یوسفؒ بھی اپنے رفقاء کے ساتھ تشریف لائے اور دین کی بات پیش کی۔

مرحوم دار العلوم دیوبند کی مجلسِ شوریٰ کے رکن (مجلس کی تجویزیں عام طور پر آپ ہی قلمبند فرماتے تھے، تمام ممبرانِ شوریٰ مولانا کی رائے کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے) مدرسہ شاہی مراد آباد کے مہتمم ۱۳۸۴ھ مطابق ۱۹۶۳ء سے مدرسہ امینیہ دہلی کے شیخ الحدیث اور صدر مفتی اور جمعیۃ علماء کے ادارۂ مباحث فقہیہ کے ذمہ دارِ اعلیٰ تھے، اور اس کے علاوہ بھی بہت سے اداروں کے ساتھ وابستہ تھے۔

مرحوم مولانا بہت ہی سادہ طبیعت، خوش طبع، ملنسار، عالم باعمل اور منکسر المزاج تھے۔ ۱۹۴۹ء میں جبکہ آپ اخبار الجمعیۃ کے نگران تھے، اُس وقت آپ نے کارکنان سے

فرمایا کہ:

''میرے نام کے ساتھ ''سیّد ملت'' نہ لکھا جائے ،صرف مولانا حسین احمد مدنیؒ کے نام کے ساتھ ''شیخ الاسلامؒ'' اور مولانا حفظ الرحمٰن کے نام کے ساتھ ''مجاہدِ ملت'' لکھا جائے۔'' اور اب تک الجمعیۃ کے آرڈر بک میں یہ آرڈر محفوظ ہوگا۔''

مگر حدیث میں ہے کہ ''مَنْ تَوَاضَعَ لِلّٰهِ رَفَعَهُ اللّٰهُ'' جتنا آپ نے تواضع کیا اللہ تعالیٰ نے اتنا ہی آپ کو مشہور کیا۔ اور اس کا بین ثبوت آپ کی تصنیفات کی مقبولیت ہے کہ فائدہ حاصل کرنے والوں کے لیے دستاویز کا کام دیں گی اور آپ کے مذہبی علمی و تاریخی کارناموں کی وجہ سے ہمیشہ آپ کی یاد باقی رہے گی ۔

فنا کے بعد زندہ ہے شانِ رہبری تیری
ہزاروں رحمتیں ہوں اے میرے کارواں تجھ پر

مرحوم مولانا مدنیؒ سے بیعت تھے۔ افسوس کہ ایسے عظیم مورخ اور عالم باعمل کا ۱۶ر شوال ۱۳۹۵ھ مطابق ۲۲ر اکتوبر ۱۹۷۵ء کی شام کو تقریباً ساڑھے چھ بجے انتقال ہوگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

اس زمانہ میں قحط الرجال میں آپ کی وفات سے مذہب اور علم و تاریخ کی دنیا میں جو خلا پیدا ہوا ہے اُس کا پر ہونا بظاہر مشکل معلوم ہوتا ہے۔ عربی کا مقولہ ''مَوْتُ الْعَالِمِ مَوْتُ الْعَالَمْ'' اس کی صحیح تصویر کشی کرتا ہے۔ حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے دعا فرمائی تھی:

اَللّٰهُمَّ اَحْيِنِىْ مِسْكِيْنًا وَّ اَمِتْنِىْ مِسْكِيْنًا.

''اے اللہ مجھے مسکینی کی حالت میں زندہ رکھ اور مسکینی ہی کی حالت میں موت دے۔''

مولانا نے آخری دم تک اس پر عمل کیا اور نام و نمود کو کبھی پسند نہیں کیا۔ اُردن ہسپتال میں جنرل وارڈ میں علاج کے لیے رہے اور آپ کی خواہش تھی کہ مجھے عام لوگوں سے الگ دفنایا نہ جائے بلکہ گورِ غریباں میں دفن کیا جائے تو آپ کو آپ کی خواہش کے موافق دلی گیٹ کے گورِ غریباں میں دفن کیا گیا ہے۔ اس طرح ﴿يٰاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ

اِرْجِعِیْ اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَۃً مَّرْضِیَّۃً﴾ کی ایک عملی تفسیر ہمارے سامنے ہے۔

مرحوم اپنے پیچھے چار لڑکے اور تین لڑکیاں چھوڑ گئے ہیں مگر آپ کا نام تا ابد زندہ رکھنے والی مرحوم کی وہ حقیقی اولاد اور گرانقدر کتابیں ہیں جو آنے والی نسلوں کے لیے آپ چھوڑ گئے ہیں اور مستفیدین کے لیے راہ اور دستاویز کا کام دیں گی۔

لایا ہوں اس طرح دل صد پارہ ڈھونڈ کر
ٹکرا جہاں پڑا ہوا پایا اُٹھا لیا

مرحوم کو جامعہ حسینیہ راندیر کے ساتھ ایک خاص تعلق تھا، کئی مرتبہ جامعہ میں تشریف لا چکے ہیں، خصوصی اہتمام کے ساتھ قرآن خوانی کر کے مرحوم کی رُوح کو اِیصال ثواب کیا گیا۔ خدائے پاک مرحوم کی مغفرت فرما کر جنت الفردوس میں بلند درجات عطا فرمائے۔ آمین

بر تو باشد رحمت باری مدام　　　پس سخن کوتاہ باید والسلام

(ماہنامہ دارالعلوم دیوبند ۱۹۷۵ء)

ایک چراغ اور بجھا......اور بڑھے گی تاریکی
حضرت مولانا سیّد محمد میاں صاحبؒ

حضرت مولانا انظرشاہ صاحب کشمیریؒ

دنوں کو گزرتے کیا دیر لگتی ہے، کہنے کو تیس سال سے زائد عرصہ گزرا لیکن تصور اور عالم خیال میں بیتا ہوا یہ زمانہ اب بھی اس طرح گشت کرتا ہے کہ شاید آج ہی کی بات ہے حالانکہ قصہ ۱۳۵۸ء کا ہے جبکہ ایک بے نام ونشان دار العلوم کے شعبہ فارسی میں کودکی (بچپن) کے ایام دبستان علم وفن میں گزار رہا تھا، فارسی کا پہلا درجہ، ہاتھوں میں ایک کتاب آئی، یہ ''تاریخ اسلام'' تھی جس کے مصنف مولانا سیّد محمد میاں مرحوم، دیوبند ہی کے کتب خانہ ''اعزازیہ'' سے شائع ہوئی تھی۔ اب یہ تو یاد نہیں کہ پڑھانے والے نئے مصنف سے بچوں کے ذہنوں کو کچھ قریب کرنے کی کوشش کرتے بھی یا نہیں اور اگر مرحوم اُستاذ کچھ اس طرح کی کوشش کرتے بھی تو بچپن کی غفلتیں اور طالب عالمانہ لااُبالی پن اسے کیوں محفوظ رکھتا، پھر یہ بھی یاد نہیں کہ سید الملت مرحوم سے کب اور کہاں اور کس حال میں پہلا نیاز حاصل ہوا، البتہ آوارہ گردی کی تمام سنتیں تازہ کرنے جب ایک جہول وظلوم دارالعلوم کے شعبہ فارسی میں داخل ہوا اور مطالعہ کا شغف دل ودماغ کی کائنات میں چٹکیاں لینے لگا تو علمائے حق اور اُن کے شاندار کارناموں سے واقفیت کے لیے مرحوم مولانا محمد میاں صاحبؒ کی تیارہ کردہ دستاویز سامنے تھی۔

''دِلی'' کے شب وروز:

۱۹۴۳ء کا زمانہ جو کھینچ کر ۱۹۴۷ء کی حدود میں جا پہنچا، اس فقیر بے نوا کا دہلی میں

گزرا، مسجد فتح پوری کے ایک گوشہ میں موجود ''اورینٹل کالج''، جس میں پنجاب یونیورسٹی کے امتحان ہوتے تھے، ان ہی میں شرکت کے لیے چند سال دہلی میں رہنا ہوا جو واقعی دہلی تھی یعنی ہندوستان کا دل اور اپنے زائرین کا دل لینے والی، جس دہلی کا ترجمہ خواجہ حسن نظامی مرحوم نے ''دل لی'' صحیح کیا تھا، جس کی راتیں اس قدر پر امن تھیں کہ شب کے وسطی حصہ میں فتح پوری سے طلباء روانہ ہوتے اور صدر بازار کے ایک مشہور مسلم ہوٹل میں جا کر چائے کی چسکیاں لیتے۔ یہاں چائے کی پیالی ایک آنہ میں ملتی، کڑھا ہوا دودھ اور اس پر بالائی کی جمی ہوئی تہہ، گرمیاں آتیں تو نئی سڑک پر شب کے ابتدائی حصہ سے لے کر درمیانی حصہ تک ایک قلفی فروش بیٹھتا، طلباء کا یہ ہجوم کبھی ان ہی لذیذ قلفیوں سے کام و دہن کو لطف اندوز کرنے کے لیے جا نکلتا، دن اتنے پر رونق کہ جدھر نکل جاتے دلی کی مشہور و مخصوص رونقیں جاذب نظر بنتیں، دلی اب بھی ہے مگر دل لینے والی اب وہ ادا کہاں۔

بہر حال بلیماران میں جمعیۃ العلماء کے مرکزی دفتر میں کبھی فقیرانہ صدائیں لگانے کے لیے جا نکلتا تو مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن مرحوم کی گھنی داڑھی سفید بھنویں، سر پر کلاہِ قلپاقی تن زیبی، آواز کی گرج اور لب و لہجہ کی شوکت، مسلمان کے عہد شباب کی یاد دلاتی۔ شب کی مجلسوں میں مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب کی فکر انگیز گفتگو، متین لب و لہجہ اور اس میں شوخی و ظرافت، مسلمانوں پر آنے والے ہولناک مصائب کی خبر دیتی جس میں موت کے ساتھ حیات اور زیست کے پہلو بہ پہلو کشمکش زندگی دیکھی جا سکتی تھی۔

دفتر جمعیۃ کی رونق :

ایک جانب ایک منحنی جسم، چہرہ پر رونقِ تقوی، آنکھوں میں شبابی و شادابی، سر پر دو پلی ٹوپی، لمبا کرتا، ہاتھ میں ایک چھوٹا سا تولیہ آنکھوں پر چشمہ، جو حقائق کو گہری نظر سے دیکھنے کا عادی بن چکا تھا، ہاتھ میں قلم، سامنے کاغذات کا پلندہ، سب سے بے نیاز اور سب کا نیاز مند نظر آتا۔

یہی تھے ہمارے مرحوم ''مولانا محمد میاں دیو بندیؒ''۔ کبھی نماز ہوتی اور عشاء کے

لیے دفتر ہی میں صفیں آراستہ ہوتیں تو امام مفتی عتیق الرحمٰن صاحب ہوتے یا مرحوم مولانا محمد میاں، رہ گئے مولانا حفظ الرحمٰن تو امام ہونے کے باوجود ہمیشہ مقتدی ہی نظر آتے۔

دارُالعلوم کی شوریٰ کا نقشہ :

۱۹۴۷ء کے ہچکولے دلی کے لیے زلزلہ ثابت ہوئے، محفلیں اُجڑ گئیں، مجلسیں درہم برہم ہوگئیں، ایک دوسرے سے جدائی اور ہجر کی شبِ دراز، پھر یہ دیوبند ہے اور یہاں کے علمی چرچوں میں سکونِ دل ودماغ کی تلاش۔ مجلس شوری کے جلسے ہوتے تو مولانا محمد میاں صاحب مرحوم بھی دلی سے آنے والی جماعت کے ایک رُکن ہوتے۔ دیوبند کی مجلس شوریٰ اوراس کے اجلاس جنہوں نے نہیں دیکھے انہیں کون سمجھا سکتا ہے کہ یہاں کا زمین وآسمان جدا، نشیب وفراز، عروج وزوال ترقی وتنزل کے ہنگامے صحیح معنی میں جمہوریت اور شورائیت یا پھر حاکمیت اور کج کلاہی، اراکینِ شوریٰ سے اس ماحول میں کون بے نیاز ہوسکتا ہے اور رہ سکتا ہے۔ طالب علمی ختم ہوئی اور وہ دور آیا جس کے متعلق دہلی مرحوم ہی کے ایک بزرگ و دانا ''غالب مرحوم'' نے کہا تھا ع

وہ دن گئے کہ کہتے تھے، نوکر نہیں ہوں میں

یہیں دارُالعلوم میں تدریس کی سعادت میسر آئی اور ضرورتوں نے اراکینِ شوریٰ کی بارگاہ تک پہنچادیا۔ مرحوم مجاہدِ ملت کی حیات میں شفقتِ برادرانہ کچھ اس انداز میں نصیب ہوئی کہ ہر مشکل کا حل، ہر اُلجھن سے نجات، ہر پریشانی کا مداوا اور ہر ابتلاء سے گلوخلاصی چٹکیاں بجنے میں حاصل ہوتیں۔ بیچارے مولانا محمد میاں مرحوم یوں بھی خاموش، زاویہ پسند، عزلت نشیں اور مرنجاں مرنج قسم کے آدمی تھے، نہ درباداری، نہ رونق مجلس، نہ کسی کو ان کی ضرورت نہ وہ کسی کی ضرورت رکھتے، دیوبند آتے مہمان خانہ میں قیام ہوتا، شوریٰ میں شرکت فرماتے اور یہیں کے کتب خانہ سے مستعار کتابیں لے کر مطالعہ کرتے۔ یہ تھیں ان کی مصروفیات! کبھی کبھار دارالعلوم کی مسجد میں مل جاتے تو خود ہی سراپائے نیاز بن کر مصافحہ کرتے، خیروعافیت پوچھتے، اللہ اللہ باقی خیر صلا۔

اس زمانہ کا صرف ایک واقعہ یاد ہے کہ اس عاجز نے دارالعلوم میں ترقی کے لیے درخواست دی۔ ''ملا کی دوڑ مسجد تک'' مجاہدِ ملت مرحوم کو یہ درخواست دی گئی، اس وقت سربراہ تعلیم شیخ الاسلام مولانا سیّد حسین احمد مدنی مرحوم تھے، دستوری اعتبار سے درخواست پہلے ان ہی کی خدمت میں پہنچنی چاہیے تھی، لیکن مجاہدِ ملت مرحوم کی موجودگی میں اس سلیقہ و قرینہ کو استعمال کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی مگر مولانا حفظ الرحمٰن برادر بزرگ بھی تھے اور شفقت مآب ہستی بھی۔ میری یہ درخواست لی، پڑھی اور مرحوم مولانا محمد میاں کو فرمایا کہ آپ اس درخواست اور خود عرضی گزار کو لے کر حضرت شیخ الاسلام مرحوم کی خدمت میں لے جائیں۔

تنبیہ کا لطیف انداز :

درخواست دہندہ کی جہالت اور بے مائیگی عنوان درخواست ''حضرت شیخ اسلام'' تھا، تعظیمی القاب اور بعد میں مضمون و مدعا، مولانا محمد میاں مرحوم عنوان پر ٹھٹکے، نگاہِ خوردبین نے غلطی پکڑی لیکن تنبیہ کا لطیف انداز دیکھئے۔ سوال یہ تھا:

''کیا دیوبند میں بھی حضرت شیخ الاسلام عام طور پر کہا جاتا ہے۔''

جواب تھا: ''جی ہاں''۔ اس سوال و جواب کے باوجود بوجہل اپنی بوجہلی پر پھر بھی مطلع نہ ہوا۔ مرحوم نے قلم جیب سے نکالا اور پھر فرمایا کہ :

''آپ شیخ الاسلام لکھنا چاہتے ہوں گے'' یہ فرما کر ''لام الف'' کا درمیان میں اضافہ کر دیا، یقیناً دل میں یہ خیال آیا ہوگا کہ صحیح عنوان بھی نہیں لکھ سکتا اور درخواست ترقی کی، لیکن کیسے عالی دماغ تھے یہ انسان اور وسیع الحوصلہ کہ راقم السطور کو زجر و توبیخ تو درکنار اُس کی غلطی پر شرمندہ بھی نہ ہونے دیا۔ دن گزرتے گئے مجاہدِ ملت مرحوم پیوند خاک ہوگئے اور بقول حافظ شیرازی ع

طوق زریں ہمہ در گردنِ خرے بینم

دارُالعلوم کے شعبہ تعلیمات میں کہاں مسند آراء حضرت شیخ الادب مولانا اعزاز علی مرحوم، علامہ بلیاوی رحمۃ اللہ علیہ اور نہ جانے کون کون اور اور پھر یہ تہی دست و تہی مایہ اب

تعلیمی کارروائی میں شرکت کے لیے مجلس شوریٰ کی بعض نشستوں میں خاکسار کی بھی شرکت ہوئی۔

دارُالعلوم کی شوریٰ میں آپ کی شرکت :

یہاں مولانا محمد میاں مرحوم کو ایک اور ہی دنیا میں پایا، ایک ننھے سے گاؤتکیہ پر ٹیک لگائے ہوئے قلم ہاتھ میں، شوریٰ کی کارروائی کی تحریر اور اس کو ضبط کرنے کا کام ان ہی سے متعلق۔ حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب اپنی مخصوص بے تکلف مجلسوں میں مرحوم کو ''حیوانِ کاتب'' فرماتے۔ واقعی وہ حیوانِ کاتب دکھائی دیتے، مجلس کی بحث وتمحیص میں شرکت برائے نام ہوتی، زیادہ وقت ان کا لکھنے لکھانے میں گزرتا، کارروائی کی رپورٹ ایسے چست انداز میں لکھتے کہ قیل وقال کی گنجائش نہ رہتی، کبھی کسی خاص مسئلے پر بولتے تو قلم ہاتھ سے رکھ دیتے، جو کچھ کہتے اُسے مجلس ہمہ تن ہو کر سنتی۔ لہجہ کی شوکت، تعبیر کی ندرت، استدلال کی قوت، سب کچھ ہی ہوتا اور اس میں بھی شک نہیں کہ کبھی گڑے ہوئے مُردوں کو بھی اُکھاڑ لیتے۔ یعنی طے شدہ اُمور جن میں مدتیں گزر چکی ہوتیں، مولانا محمد میاں مرحوم ان پر بحث کا دروازہ کھولتے اور دادِ انصاف لیتے۔

اُستادزادے کی مدد :

ایک دو سال گزرتے ہیں کہ ان کے ایک مرحوم استاذ کے صاحبزادے کے متعلق یہ فیصلہ ہوا کہ آئندہ انہیں کوئی بھی کتاب پڑھانے کے لیے نہ دی جائے۔ یہ صاحبزادے غیر مسلح نہتے بھاگ کر دلی جا پہنچے، اور دیوبند سے تا دلی خدا جانے مولانا محمد میاں مرحوم کے پاس کتنے خطوط لکھ ڈالے۔ یاد کچھ ایسا پڑتا ہے کہ اس فیصلہ کے بعد ایک دو نشستوں میں مرحوم نے اپنی علالت کی بناء پر شرکت نہیں کی، جب آئے تو پہلے اسی مسئلے کو لیا جس کی تمہید بھی خوب تھی۔ الحاصل مسئلہ طے کرایا، یہ پابندی اس غریب استاذ سے اُٹھالی گئی، اس روز محسوس ہوا کہ یہ مختنی جسم مسائل پر شافی گفتگو بھی کرسکتا ہے اور اپنے مرحوم اساتذہ کی نیاز مندی اور شاگردی کے حقوق بھی ادا کرنے کی سعادتوں سے بہرہ ور ہے۔

خوف زدہ راقم الحروف :

راقم الحروف کو بھی ایک حادثہ پیش آیا، خوفزدہ ہو کر مرحوم کو خط لکھا، وہ شوریٰ میں شریک ہوئے، ملاقات میں فرمایا کہ:

''اس بار حاضری کا ارادہ نہیں تھا لیکن آپ کا خط دیکھ کر حاضر ہوا ہوں اور پوری طرح تیار ہو کر، اگر مسئلہ زیر بحث آیا تو ان شاء اللہ آپ کی بھرپور حمایت ہوگی۔''

ان کے وعدے میں استحکام اور لہجہ میں رس، افسوس کہ اب یہ والہانہ تعلق رکھنے والی ہستیاں نایاب ہوتی جاتی ہیں۔

قصرِ صدارت، کتاب کی نقاب کُشائی :

ایک اور قصہ سن لیجئے! یہ دہلی ہے اور ''تحریک شیخ الہند'' پر مرحوم کے قلمی تازہ شاہکار کی نقاب کشائی کی رسم راشٹر پتی بھون کی سر بفلک عمارت جس میں عروج و زوال کی داستانیں وہاں کے ذرّوں میں منتشر، خود صدر جمہوریہ (مرحوم فخر الدین علی احمد) کو نقاب کشائی کرنا تھی۔ یہ خاکسار بھی شریک ہے، آج ایک نیا منصوبہ لے کر دیوبند سے یہاں حاضری ہوئی، جیب میں ایک عزیز کی درخواست ہے جس پر مرحوم کی سفارش مطلوب ہے۔ قریب بمغرب رسم ختم ہوئی، ہجوم اُٹھا، کچھ دروازے سے باہر نکلنے لگا اور کچھ موقع سے فائدہ اُٹھا کر راشٹر پتی بھون کے شاندار در و دیوار میں عظمتِ رفتہ کے آثار تلاش کر رہا ہے۔

جرأت بیجا اور آپ کا حلم :

میں نے آگے بڑھ کر مصافحہ کیا، انہوں نے آنکھ اُٹھائی، وہی نیاز مندانہ انداز، وہی متواضعانہ لہجہ، لیکن نقاہت اس پر مستزاد، بھلا کیا وقت تھا اس ہماہمی میں کسی گزارش کا، لیکن پھر بھی عرض کیا کہ ایک درخواست پر آپ کی سفارش مطلوب ہے۔ فوراً کرسی پر تشریف فرما ہو گئے، پہلے جیب سے قلم نکالا درخواست لی، پڑھی اور قلم چل پڑا۔ نہ انکار نہ لیت و لعل، کیسا رد و قدح، کہاں کا تغافل، لکھ کر میری جانب یہ کہتے ہوئے بڑھایا کہ:

''شاید یہ سفارش کارگر نہ ہو مگر مجھے تو حکم کی تعمیل کرنا تھی۔''

اب سوچتا ہوں کہ یہ کیسی جرأت بیجا تھی اور کیسا تھا مرحوم کا حلم کہ وقت کی تنگی مانع ہوئی اور نہ کوئی انکار و تامل کیا۔ ان کی یہ ادا دل میں اس وجہ سے اور خانہ نشین ہوئی کہ اسی صبح میں ایک صاحب سے سفارش لینا چاہی تھی تو انہوں نے صاف انکار کر دیا تھا، اور یہیں راشٹر پتی بھون میں ایک اور صاحب ملے تھے جن کے پیکر طناز کو دیکھ کر میں اس درخواست کی جرأت بھی نہیں کر سکا تھا۔

ممبئی میں سیّد الملت اپنے کپڑے دھوتے ہوئے :

یہ عروس البلاد بمبئی کا دیوہیکل مسافر خانہ ہے کئی منزلہ میں، یہاں کی بالائی منزل میں اپنی والدہ مرحومہ کے ساتھ مقیم ہوں، جو کینسر کے مہلک مرض سے صحت کی تلاش میں ساحل بمبئی تک جا پہنچی تھیں۔ ایک صبح بالائی منزل سے نیچے آیا تو دیکھا کہ ''ایک بوڑھا بیٹھا ہوا خود اپنے ہاتھ سے اپنے کپڑے دھونے میں مصروف ہے، تو یہ کوئی جانی پہچانی شخصیت ہے جس کے خدوخال سے نگاہیں اگر چہ دُور بین نہ سہی مگر آشنا ہیں۔'' یہ تھے سید الملت مرحوم مولانا محمد میاں! جمعیۃ علمائے ہند کے ناظمِ اعلیٰ! جو جمعیۃ کی فراہمی مالیات کے لیے سفر کرتے ہوئے بمبئی وارد ہوئے تھے! کہنے کو تو یہ بات چھوٹی ہے مگر ان کی اس ادا میں ان کی تواضع، فروتنی اور خاکساری کی ایک داستانِ عبرت پنہاں ہے۔ خدا تعالیٰ نے مرحوم کو متانت اور سنجیدگی کی دولت فراواں عنایت فرمائی تھی اور یہ ان کے لیے ایک حفاظتی سامان تھا لیکن پھر بھی بے تکلف احباب ان سے چھیڑ چھاڑ کر لیتے، جس سے خود مرحوم بھی محظوظ ہوتے۔

اتباعِ سنت بھی، دل لگی بھی :

ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ مرحوم مجاہدِ ملت کو چاٹ اور چٹ پٹی چیزوں کا بڑا شوق تھا، ضلع بجنور کی روایتی غذا آڑو اور دیہات کا مرغوب کھانا چنے کا ساگ اور بیسن کی روٹی رغبت سے لیتے۔ ادھر میری والدہ مرحومہ ان چیزوں کو پکانے کا خاص سلیقہ رکھتیں، مجلس شوریٰ کا اجلاس ہو رہا تھا، سردی کا زمانہ، چنے کے ساگ کی ریل پیل، میں نے اکثر اراکین کی دعوت اسی ساگ پات سے کر دی۔ مرحومہ والدہ صاحبہ نے بھی خاص اہتمام سے دونوں چیزیں تیار

کرائیں اور واقعتاً کھانے والے اُنگلیاں چاٹنے لگے۔ کھانا نمٹ گیا سب فارغ ہوگئے، مرحوم سید الملت پہلے تمام پلیٹوں سے ساگ صاف کرتے رہے اور بعد میں بچی ہوئی روٹی کے ٹکڑے بتدریج لینے لگے۔ مدعوئین منتظر کہ مولانا اُٹھیں تو وہ بھی چھوٹیں، مسلسل انتظار کے بعد مجاہدِ ملت بولے کہ: ''مولانا آپ تو لپٹ ہی گئے'' ؟

سیّد الملّت : ''جی ہاں! آپ کو تو سنت پر عمل کی توفیق ہے نہیں، مجھے تو کعبہ میں جھاڑو دینا ہی ہے۔''

مجاہدِ ملت کہاں خاموش رہنے والے تھے بولے: ''مولانا آپ کا ادب مانع ہے ورنہ جس توے پر یہ روٹیاں تیار ہوئیں وہ بھی آپ کے سامنے پیش کرتا کہ اِس حجر اسود کو بھی بوسہ دے دیجئے۔''

اب یہ یادیں سینہ کا داغ ہیں، نہ وہ ظرافت رہی اور نہ وہ محفلوں کا جھرمٹ، سب پیوندِ خاک ہوئے اور خاک کا بستر ان کا گوشۂ عافیت ہے! رہے نام اللہ کا!

دامنِ بے داغ :

مرحوم کی تصانیف، مضمون کی زرخیزی، عنوانات کی جاذبیت، ذیلی سرخیوں کی شوکت، فتوی اور تقویٰ، علم و عمل، ورع و پرہیز گاری، سیاسی دلچسپیاں، قید و بند کے آلام، شاندار کارناموں پر بہت کچھ لکھا جائے گا مگر مجھ بے بضاعت کو تو ان کی زندگی کے اس نادر باب نے گہرا تاثر دیا کہ وہ مدرسہ شاہی سے نکلے، جمیۃ علماء کی نظامت تک پہنچے، پھر نیابت صدارت دہلی، وہاں کے اُونچے حلقوں میں پذیرائی اور دوڑتی بھاگتی دنیا سے رابطہ، یہ ممبرانِ پارلیمنٹ، وہ وزیر با تدبیر، یہ امیر طناز، وہ رئیس کج کلاہ، مگر مولانا محمد میاں مرحوم کی کھدر کی شیروانی، کھادی کا لمبا کرتہ، شرعی پاجامہ، دھوڑی کا جوتہ، سر پر دو پلی ٹوپی، ہاتھ کا تولیہ، چہرہ کی ڈاڑھی، مسجد کی نمازیں، آہِ سحر گاہی، شب بیداری، جلوتوں میں خلوت، حدیث کا درس، فتوے کے لیے قلم، جیب کی تسبیح نہ چھوٹنا تھی اور نہ چھوٹی۔ کہنے کو تو بات معمولی ہے، لیکن اپنے ڈگر پر یہ استواری بڑی بات ہے بقول شاعر ع

وفاداری بشرط استواری اصل ایماں ہے

اور یہی ان کی زندگی کا وہ روشن باب تھا جس کی یادیں زمزمہ افلاک میں ان شاء اللہ ہمیشہ باقی رہیں گی۔عنوان میں دیے ہوئے سر بریدہ مصرعہ کو اب پورا کیجئے جس سے صورتحال کی تاریکی اوراس سے مہیب پہلو کھل کر سامنے آجائیں گے ع

ایک چراغ اور بجھا،اور بڑھے گی تاریکی

(روزنامہ الجمعیۃ:۲۸رشوال ۱۳۹۵ھ مطابق ۳رنومبر ۱۹۷۵ء دوشنبہ)

آہ حضرت مولانا سیّد محمد میاںؒ

حضرت مولانا فاضل حبیب اللہ صاحب رشیدی، ساہیوال

گزشتہ صدی میں برصغیر میں قدرت نے عظیم انسانوں کو جنم دیا اور ایسے ایسے رجال کار پیدا ہوئے کہ جن کے تدبر و سیاست، ایثار و قربانی، علم و عمل اور قومی و ملی غیرت و حمیت نے تاریخ کے صفحات پر ایسے اُجلے اور اَنمٹ نقوش ثبت کیے جو تا قیامت سنہری حروف میں چمکتے رہیں گے اور آنے والی نسلوں کے لیے نشانِ راہ ثابت ہوں گے۔ اسی جماعت اور قافلہ کے ایک نامور سالار حضرت مولانا سیّد محمد میاںؒ گزشتہ ماہ بھارت میں انتقال فرما گئے۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ.

صفِ اوّل کا مجاہد :

حضرت مولانا مرحوم الامام المحدث حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے علمی و عملی، فکری و نظری سلسلة الذهب کی ایک ایسی آخری کڑی تھے کہ جن کے جانے کے بعد برصغیر پاک و ہند میں ان کے پائے کا اب دوسرا کوئی شخص موجود نہیں ہے۔ سیّد مرحوم صحیح معنوں میں انسانی شرافت و مروت اور اسلامی علم و عمل کے پیکر تھے۔ اَز ابتدا تا انتہاء پوری تعلیم دنیائے اسلام کی مایہ ناز درس گاہ دارالعلوم دیوبند سے حاصل کی اور فراغت کے فوراً بعد تحریک آزادی میں حصہ لینا شروع کر دیا اور اپنی قائدانہ صلاحیتوں اور مجاہدانہ کارناموں کی وجہ سے دو چار سال ہی میں اپنے وقت کے اہم قائدین کی نظر میں ممتاز مقام حاصل کر لیا اور تھوڑے ہی عرصے میں صفِ اوّل کے مجاہدین میں شمار ہونے لگے۔

حضرت شیخ الاسلام مولانا سیّد حسین احمد مدنی نور اللہ مرقدہٗ سے بیعت ہو کر خلیفہ مجاز ہوئے، آزادی ملک و ملت کی خاطر قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں تا آنکہ برصغیر

آزاد ہو گیا۔ تقسیمِ ملک اور مسلمانوں پر آئے دن نت نئے مصائب اور مسلسل قربانیوں کی وجہ سے اگر چہ نڈھال ہو چکے تھے، لیکن ملک وملت کے تقاضوں پر جوانوں کے حوصلے اور عزم سے کام کرتے رہے!

مولانا ابو الکلام آزادؒ، حضرت مدنیؒ اور مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ کی وفات کے بعد بھارت میں ملتِ اسلامیہ کی سیاسی و دینی رہنمائی ورہبری کا زیادہ تر بوجھ ان ہی کے کندھوں پر تھا۔ نظم وضبط اور پابندی اوقات کے ساتھ کام کرنے کی عادی تھے۔ لاتعداد سیاسی وملی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ تصنیف وتالیف کا کام بھی کرتے رہے اور اسی پابندیِ وقت اور تقسیم کار کا نتیجہ ہے کہ اپنے پیچھے بہت سی تاریخی علمی اور دینی کتب کا ذخیرہ چھوڑ گئے ہیں۔

عمر کے آخری سال میں ''ریشمی خطوط کی تحریک'' کے متعلق انڈیا آفس لائبریری لندن سے لائی ہوئی سی آئی ڈی رپورٹوں کو مرتب کیا اور شروع میں ڈیڑھ صد صفحات کا ایسا پر مغز تاریخی مقدمہ لکھا کہ جس میں انگریز کی سیہ کاریوں کو نہایت جامع اور مختصر انداز میں اس طرح بیان کیا ہے کہ شاطرانِ برطانیہ کی پوری تاریخ کے ساتھ ساتھ گزشتہ صدی کے سیاسی و دینی حالات کی پوری تاریخ سامنے آجاتی ہے۔ یہ کتاب اس سال انڈیا میں طبع ہوئی اور انڈیا کے صدر فخر الدین علی احمد نے (برصغیر کے) پانچ ہزار منتخب مدعوین کی موجودگی میں لال قلعہ دہلی (۱) میں اس کی رسمِ افتتاح ادا کی۔

پاکستان میں بھی سی آئی ڈی کی ان رپورٹوں کی اشاعت کا اہتمام ہو رہا تھا، اس کی کتابت مکمل ہوئی ہی تھی کہ حضرت مولانا کے انتقال پر ملال کی خبر ملی اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ

علماءِ حق نے برصغیر میں دین کی حفاظت کے ساتھ ساتھ تحریکِ آزادی میں جو قائدانہ کردار ادا کیا وہ کسی سے مخفی نہیں ہے۔ انگریز کے ہندوستان پر جابرانہ تسلط وغلبہ کے خلاف ۱۸۵۷ء میں جو مقدس جنگِ آزادی لڑی گئی اُس کے قائد وسالار حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور ان کے ساتھی تھے جو اپنے شیخ حضرت حاجی

امداد اللہ مہاجر مکیؒ کی قیادت میں شاملی کے میدان میں اُترے۔ انگریز کے جبر و تشدد اور بے پناہ تاریخی ظلم و ستم کی آگ نے اگرچہ بزعم خویش اس کو ختم کر دیا تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان ہی مجاہدین کی خاکستر میں سے تحریکِ آزادی نے دوبارہ جنم لیا۔ یہ تحریک حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے شاگردِ رشید اور دیوبند کی مسند تدریس پر بخاری شریف کا درس دینے والے درویش مولانا محمود حسنؒ نے شروع کی جنہیں آج دنیا ''شیخ الہندؒ'' کے نام سے جانتی اور پہچانتی ہے۔ یہ تحریک کتنی سخت اور ہمہ گیر و جامع تھی اس کی گواہ (انگریز) سی آئی ڈی کی وہ رپورٹیں ہیں جو اِس کتاب میں ملتی ہیں۔

کانگریس نے ۱۹۲۹ء کے لگ بھگ مکمل آزادی کا مطالبہ کیا، لیکن دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث ۱۹۱۲ء میں انگریز کو نکالنے کا ایسا منصوبہ بنا چکے تھے کہ اگر وہ فاش نہ ہوتا تو انگریز اس صدی کے دوسرے عشرے ہی میں برصغیر سے نکل چکا ہوتا۔

ان ہی اُولوالعزم جانشینانِ رسولِ مقبول ﷺ کی آخری نشانی حضرت مولانا سیّد محمد میاںؒ تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے۔ اِدارۃ الرشید اور جامعہ رشیدیہ حضرت مولاناؒ کے تمام پسماندگان خصوصًا حضرت مولانا سیّد حامد میاں مہتمم جامعہ مدنیہ کریم پارک لاہور سے اظہارِ ہمدردی کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت مولانا سیّد حامد میاں کو اپنے پیشرو اکابر کی طرح خدمتِ دین و ملت کی زیادہ سے زیادہ توفیق دے جس کے لیے انہوں نے کئی سال سے لاہور میں جامعہ مدنیہ قائم کر کے سلف کی روایات، کتاب و سنت کی تبلیغ و اشاعت کا پرچم تھام رکھا ہے۔

ہم جیسا پھر کوئی خاک چمن سے شاذ اُٹھے گا
پھرو گے ڈھونڈتے لیکن ہمیں ہرگز نہ پاؤ گے

(اداریہ ماہنامہ ''الرشید'' ساہیوال نومبر ۱۹۷۵ء)

(۱) نہیں بلکہ قصر صدارت دہلی میں، جس کو ''راشٹر پتی بھون'' کہتے ہیں۔ محمود میاں غفرلہٗ

مؤرخ ملت مولانا سیّد محمد میاںؒ
اوران کی سیاسی خدمات پر ایک نظر

ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہاں پوری

ہمارے ممدوح مؤرخ ملت مولانا سیّد محمد میاں صاحبؒ جن کے ’’مقالاتِ سیاسیہ‘‘ کا یہ مجموعہ شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ کی سیاسی ڈائری کی ساتویں جلد کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے، ساداتِ رضویہ کی ایک شاخ سے تعلق رکھتے ہیں جو قدیم زمانے سے دیوبند میں آباد ہے۔ حضرت ممدوح کے والد ماجد سیّد منظور محمد کا شجرۂ نسب چالیس واسطوں سے حضرت نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم سے ملتا ہے۔ مولانا سیّد محمد میاںؒ کی پیدائش ۴؍ اکتوبر ۱۹۰۳ء کو محلّہ سرائے پیرزادگان دیوبند میں ہوئی ان کا تاریخی نام مظفر میاں ہے۔

مولانا کے والد گرامی محکمۂ انہار میں ملازم تھے اور اہل خانہ ساتھ تھے، مختلف مقامات پر تبادلہ ہوتا رہتا تھا، اس لیے مولانا کی ابتدائی تعلیم کسی ایک جگہ اور کسی ایک استاذ سے نہ ہوسکی، لیکن اب جب کہ وہ ابتدائی تعلیم سے گزر چکے تھے ضرورت تھی کہ کسی ایک جگہ کسی مدرسے میں ادب وفن کے خاص اساتذہ سے حاصل کی جائے۔ اس فیصلے کے بعد انہوں نے اہل وعیال کو دیوبند بھیج دیا اور نورِ نظر محمد میاںؒ کو دارالعلوم دیوبند میں داخل کرادیا گیا۔ یہ ۱۹۱۶ء کا واقعہ ہے، اس واقعے کا دوسرا سرا یہ ہے کہ ۱۹۲۵ء میں ہمارے ممدوح نے تحصیلِ علمی سے فراغت حاصل کرلی۔ ممدوح محترم کے اساتذہ میں مولانا انور شاہ کشمیری، شیخ الادب مولانا اعزاز علی صاحب اور مولانا محمد ابراہیم بلیاوی رحمہم اللہ اور اس دور کے دیگر نامور ماہرین علوم وفنون کے نام شامل ہیں۔

وہ تعلیم سے ابھی فارغ ہوئے ہی تھے کہ بہار کے مشہور مدرسہ حنفیہ آرہ ضلع شاہ آباد میں مدرس کی اسامی پر ان کا تقرر ہو گیا۔ تقریباً ساڑھے تین برس مدرسہ حنفیہ آرہ میں پڑھانے کے بعد مدرسہ شاہی مراد آباد میں انہیں بہ حیثیت مدرس و مفتی خدمات انجام دینے کا موقع مل گیا۔ مدرسہ شاہی میں تقرر سے وہ دیوبند سے بھی قریب ہو گئے۔ یہ کا ماحول ان کے ذوق کے مطابق اور طبیعت فضا سے آشنا تھی۔

مدرسے میں درس وافتا کے ساتھ مؤرخ ملتؒ نے عملی سیاست میں بھی حصہ لینا شروع کر دیا۔ پہلے وہ جمعیت علمائے مراد آباد کے نائب ناظم بنائے گئے، پھر انہیں ناظم کے عہدے پر فائز کیا گیا، تحریک سول نافرمانی میں وہ جمعیت علمائے ہند کے نویں ڈکٹیٹر تھے، گرفتار کیے گئے، اسی ذوق و منصب اور گرفتاری نے کانگریس کے حلقے میں ان کا تعارف اور رسوخ پیدا کر دیا۔ ان کے لیے یہ دونوں حلقے خدمت کا ایک میدان تھا۔ انہوں نے اپنے سیاسی جدوجہد اور بے لوث خدمتِ خلق کی بدولت حریت پسند اور قوم پرور حلقے میں بھی مقبولیت کا ایک مقام پیدا کر لیا۔

مراد آباد کے زمانہ قیام میں ان کی خدمات کے نہایت واضح تین دایرے تھے۔ تعلیم و تدریس اور افتا کے میدان میں وہ نہایت مستعد مدرس اور اچھے مفتی تھے۔ اور ناظم کی حیثیت سے اپنی صلاحیت کو ثابت کر دیا تھا اور اب اونچے مناصب کے لیے فتح مندی کا دروازہ کھل چکا تھا۔ ان کی خدمات کا تیسرا میدانِ تصنیف و تالیف تھا۔ ان کی علمی قابلیت کے واقعی اندازہ شناس تو بہت کم لوگ تھے لیکن ان کے شوق علمی کی دھوم پورے شہر میں مچی تھی۔ حضرت شیخ الاسلامؒ نے انہیں از راہِ تفنن حیوانِ کاتب کہا تھا اور پورے حلقے میں ان کے اس لقب کی شہرت ہو گئی تھی۔ مولانا سیّد محمد میاںؒ لکھتے ہیں :

> ''مصروفیات کے باوجود ہر وقت لکھتے رہنے کی وجہ سے حضرت اقدس نے انہیں ایک دفعہ ''حیوانِ کاتب'' فرمایا۔ منطق میں ان کی تعریف میں کہ وہ کیا ہے؟ حیوانِ ناطق کہا جاتا ہے۔ آپ (حضرت مدنیؒ) نے اسے از راہِ تلطف والد

صاحبؒ کے لیے بدل کر ’’حیوانِ کاتب‘‘ فرمایا۔‘‘

مؤرخِ ملت مولانا سیّد محمد میاں علیہ الرحمہ نے حصہ تو سیاست میں بھی لیا اور پورے جوش اور سرگرمی کے ساتھ لیا، وہ مسند آرائے درس وتدریس علوم وفنون بھی رہے۔ وہ ایک مستند عالمِ دین تھے، مفسر، محدث اور مفتی تھے اور خطیب ومقرر بھی تھے، لیکن ان کا اصلی میدان تصنیف و تالیف تھا۔ ان کی شخصیت کے اصل جوہر قلم وقرطاس کی صحبتوں میں کھلے ہیں۔ وہ اپنی تمام حیثیتوں میں مصنف سب سے بڑے تھے۔ ان کی تصانیفات مختلف علوم و فنون میں ہیں۔

کسی علم وفن میں ان کی کوئی تصنیف اٹھا کر دیکھئے، معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ذوق کو سب سے زیادہ مناسبت اسی فن سے ہے۔

تاریخ اسلام، تذکرہ، بزرگانِ دین، تعلیم، سیرت، سیرت وسوانح، فقہ وافتاء تاریخ آزادی وتحریکات سیاسی، تفسیر میں حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنیؒ کے افادات کی تالیف و تشریح سے لے کر افسانہ نویسی تک انہوں نے بے شمار موضوعات پر اور مختلف فنون میں کم و بیش ان کی ضخیم تالیفات ومختصر رسالہ جات تقریبًا پچاس اور سینکڑوں چھوٹے بڑے مقالات اور دیگر تحریرات یادگار ہیں اور ہر دائرہ فن کی تحریرات میں انہوں نے مقاصد کی بلندی، خیالات کی اہمیت، مطالب کی افادیت، مباحث کی جامعیت، فکر کی معنویت، مطالعے کی وسعت، تحریر کی سلاست اور بیان کی شگفتگی کا نقش بٹھا دیا ہے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کی سیاسی تالیفات وتحریرات اپنی کمیت اور کیفیت، ہر دو لحاظ سے تاریخ سیاسیات ہند پاکستان کے لٹریچر میں اپنی مثال نہیں رکھتیں۔

☆ مؤرخِ ملت مولانا سیّد محمد میاںؒ نے مراد آباد کے قیام کے زمانے میں تصنیف و تالیف کا ایک منصوبہ بنایا تھا اور اس پر کام بھی شروع کر دیا تھا۔ یہ منصوبہ دو حصوں میں منقسم تھا۔

منصوبے کا پہلا حصہ حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ کی دعوتِ احیائے دین واصلاحِ ملت سے شروع ہو کر ۱۸۵۷ء کے جہادِ آزادی اور اس کی ناکامی کے بعد

ہندوستان کی تباہی اور ہنگامۂ دارو گیر کے تذکرے پر ختم ہوتا ہے۔ یہ حصہ گویا کہ علماء متاثرین اور متوسلین کی تاریخِ عزیمت دعوت ہے۔

منصوبے کا دوسرا حصہ دارالعلوم دیوبند کے قیام کی تاریخ سے شروع ہوکر تحریکِ آزادی وطن کی کامیابی (۱۹۴۷ء) پر ختم ہوتا ہے۔ یہ حصہ علمائے حال کی اصلاح وملت میں فداکاریوں اور حریت کے لیے ان کی قربانیوں اور جاں بازیوں کی تاریخ ہے۔

حضرت مؤرخِ ملتؒ نے منصوبے کا پہلا حصہ ''علمائے ہند کا شاندار ماضی'' کے عنوان سے چار جلدوں میں مرتب کیا تھا، جبکہ منصوبے کا دوسرا حصہ ''علمائے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے'' کے عنوان سے دو جلدوں میں شائع ہو چکا ہے۔

علمائے ہند کا شاندار ماضی :

شاندار ماضی کی پہلی جلد جو ''حضرت مجدد الف ثانیؒ اور ان کے خلفاء اور ان کے اصلاحی کارناموں کے تذکرے میں ہے، ۱۹۳۹ء میں چھپ گئی تھی اور اگرچہ اس کا تعلق وقت کی کسی انقلابی اور اصلاحی تحریک سے ہرگز نہ تھا لیکن ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کے تحت اسے خطرناک سمجھا گیا، اسے ضبط کرلیا گیا، ساتھ ہی اس کے مصنف کو چند دن کے لیے حوالات جانا پڑا۔ مصنف کی توضمانت پر رہائی ہوگئی لیکن جمعیت علماء کے احتجاج اور ضبطی کے خلاف مقدمہ کے باوجود کتاب کی ضبطی کا حکم واپس نہیں لیا گیا۔

دوسری جلد حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے حالات وافکار کے تذکرے سے شروع ہوکر ان کے ابنائے عظیم کی خدمات کے تذکرے کے بعد سیّد احمد شہیدؒ اور شاہ اسماعیل شہیدؒ کی تحریکِ عزیمت دعوت کے حادثۂ بالاکوٹ (۱۸۳۱ء) پر ختم ہوجاتی ہے۔

تیسری جلد علمائے صادق پور کے ایثار وعزیمت کی داستان کی تفصیل اور اس کے اطراف کے تذکرے میں ہے۔

چوتھی جلد ۱۸۵۷ء کے حادثۂ کبریٰ کے تذکرے کے لیے مخصوص ہے۔ اس میں ۱۸۵۷ء کے وقوعہ کے پس منظر، برِ اعظم ہند پاکستان کے دور دراز گوشوں تک حادثے کی

تفصیلات مجاہدین آزادی کی شکست، ہنگامۂ دار و گیر اور انتقام کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔ شاندار ماضی کی چاروں جلدیں ۲۵/اپریل ۱۹۳۹ء تک مکمل ہو گئیں تھیں۔

اگرچہ ان میں ترمیم و اصلاح کا عمل بعد تک رہا، اس کے بعد ملک کے سیاسی حالات روز بہ روز ایسے سنگین اور پیچیدہ ہوتے گئے کہ اس کی اشاعت کی نوبت نہ آسکی۔ ۱۹۵۳ء میں تحریکِ آزادی ہند کی تاریخ مرتب کرنے کے لیے کمیٹی کا قیام عمل میں آیا اور ڈاکٹر سیّد محمود مرحوم کمیٹی کے چیرمین مقرر ہوئے تو مؤرخِ ملتؒ نے اس کے مسودوات کو تلاش کیا اور اشاعت کا سروسامان کیا گیا۔ جولائی ۱۹۵۷ء میں اشاعت عمل میں آئی، لیکن اس کی اشاعت کا تعلق حکومت کی مقررہ کمیٹی یا اس کے کسی تعاون سے کچھ نہ تھا۔ فروری ۱۹۵۹ء تک اس کی چاروں جلدیں شائع ہو گئیں۔

علمائے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے :

منصوبے کا دوسرا حصہ جو علمائے حق کے مجاہدانہ کارنامے کے عنوان سے دو جلدوں میں مرتب کیا گیا تھا۔ اس کی پہلی جلد ۲۲/ستمبر ۱۹۳۹ء کو مکمل ہوئی تھی، اس میں جنگِ عظیم دوم کے آغاز سے پہلے کے حالات، تحریکات اور رجال کار کی خدمات کا احاطہ کیا گیا ہے اور جلد دوم جنگِ عظیم ثانی اور اس کی تباہ کاریوں کے تذکرے سے لے کر گاندھی جی کے قتل (۱۹۴۸ء) اور حالات مابعد پر تبصرے کے ساتھ اپنے اختتام کو پہنچتی ہے۔ اس کی پہلی جلد کی اشاعت اول کتب خانہ فخریہ۔ مراد آباد سے اور دوسری اشاعت الجمعیۃ بک ڈپو۔ نئی دہلی سے عمل میں آئی تھی۔ دوسری جلد کی اشاعت ۱۹۵۷ء کے بعد ہوئی تھی۔

جمعیت علماء کیا ہے؟

اسی زمانے کا ایک اہم اور مفید کام جو حضرت مؤرخ ملتؒ نے انجام دیا، دو حصوں میں چند ضمیموں کے ساتھ ''جمعیت علمائے کیا ہے؟'' کے نام سے مشہور ہوا۔

یہ سلسلہ حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ کے ایما پر مؤرخ ملتؒ نے تالیف کیا تھا۔ اس کی پہلی جلد ۱۹۴۵ء میں مرکزیا مجس لیٹوا کی اسمبلی کے انتخاب کے موقع پر شائع

ہوئی تھی۔ یہ جلد جمعیت علماء کی اسلامی اور سیاسی خدمات کے تعارف میں ہے۔اس کا دوسرا حصہ جنوری ۱۹۴۶ء میں صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات سے قبل شائع کیا گیا تھا۔اس کے چند ضمیمے بھی تھے جن میں ان سے قبل وبعد کے اجلاسوں کی اہم تجاویز مرتب کردی گئی ہیں۔

جمعیت علماء کیا ہے؟ حصہ دوم جمعیت علمائے ہند کی مجلس عاملہ کے اجلاس مورخہ ۱۳/تا ۱۵/، ۱۱مئی ۱۹۴۷ء اور مجلس عاملہ جمعیت علمائے ہند کے اجلاس مورخہ ۲۴، ۲۵/جون ۱۹۴۷ء کی تجاویز مرتبہ مولانا سیّد محمد میاںؒ بہت قیمتی اضافہ ہیں۔

مختصر تذکرہ خدمات جمعیت علمائے ہند :

چار حصوں میں جمعیت علمائے ہند کی خدمات کا تعارف :

حصہ اول: جمعیت علمائے ہند کی بنیادی خدمات،نومبر ۱۹۵۲ء شعبہ نشر واشاعت جمعیت علمائے ہند نئی دہلی صفحات ۳۰

حصہ دوم: جمعیت علمائے ہند امدادی خدمات، اکتوبر ۱۹۶۲ء شعبہ نشر واشاعت جمعیت علمائے ہند۔نئی دہلی صفحات ۸۰۔

حصہ سوم: جمعیت علمائے ہند کی تعمیری خدمات اکتوبر ۱۹۶۲ء شعبہ نشر واشاعت جمعیت علمائے ہند۔نئی دہلی صفحات ۱۸۔

حصہ چہارم: مجاہد ملتؒ کی تاریخی تقریریں، الجمعیۃ بک ڈپو۔نئی دہلی صفحات ۱۹۲۔

تحریکِ شیخ الہندؒ :

دہلی کے زمانہ قیام کی چند اور کتب بھی یادگار ہیں۔ان میں ایک کتاب تحریک شیخ الہندؒ ہے، یہ تحریک ریشمی رومال کا دوسرا نام ہے۔

۱۹۱۵ء میں حضرت شیخ الہندؒ نے ایک منصوبے کے تحت مولانا عبیداللہ سندھیؒ کو کابل بھیجا تھا اور خود حجاز تشریف لے گئے تھے۔ یہ دونوں سفر ایک ہی مقصد کے تحت تھے۔ پیش نظر یہ تھا کہ برطانیہ عالمی جنگ میں پھنسا ہوا ہے اور ہندوستان میں اس کی کوئی خاص فوجی قوت موجود نہیں ہے۔اس موقع پر ترکی اور افغانستان کی مدد سے اگر ہندوستان پر حملہ کیا

جائے اور اندرونِ ملک بغاوت کر دی جائے تو ہندوستان سے برطانوی اقتدار کا خاتمہ کیا جا سکتا ہے۔

مولانا سندھیؒ کے کابل پہنچنے سے دس روز قبل ہندوستان کے انقلابی راجہ مہندر پرتاب اور برکت اللہ بھوپالی جرمنی اور ترکی کے نمایندوں پر مشتمل ایک مشن لے کر کابل پہنچ چکے تھے۔ وہ بھی اسی مقصد سے کابل پہنچے تھے کہ وقت کے سیاسی حالات اور عالمی تناظر میں ہندوستان کی آزادی کے لیے کوئی راہ نکالی جائے۔

انہوں نے ۱۹۱٦ء کے آغاز میں ہندوستان کی عارضی حکومت بھی قائم کر لی۔ مولانا سندھیؒ عارضی حکومت کے قیام کے مشورے میں شریک نہیں تھے لیکن ہندوستان کے ترکی جرمن مشن کے ارکان اور حکومت کے بانیان نے ان کی اہمیت اور کابل کے اونچے حلقے میں ان کے رسوخ کو دیکھ کر عارضی حکومت میں شامل ہونے کی انہیں پیش کش کی اور انہوں نے پیش کش کو قبول کر لیا۔ وہ حکومت میں وزیر داخلہ بنالیے گئے۔ اسی زمانے میں مولانا سندھیؒ نے مسلم سالویشن آرمی یا جنودِ ربانیہ کا منصوبہ بنایا تھا۔ مولانا سندھیؒ نے ہندوستان کی عارضی حکومت کے قیام اور مسلم سالویشن آرمی کے منصوبے اور دیگر حالات سے اپنے استاذ اور سیاسی مربی مولانا محمود حسنؒ کو مطلع کرنا چاہا اور ریشمی کپڑے کے دو ٹکڑوں پر خوش خط لکھ کر عبدالحق نامی ایک شخص کے ہاتھ سندھ کے ایک نومسلم سیاسی رہنما شیخ عبدالرحیم (حیدرآباد۔ سندھ) کو بھیجے اور ہدایت کی کہ وہ ان خطوط (ریشمی کپڑے پر لکھے ہوئے) کو کسی ذریعے سے مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کو (جو بعد میں شیخ الہندؒ کے لقب سے ملقب ومشہور ہوئے) حجاز پہنچادیں لیکن یہ خطوط شیخ صاحب تک نہ پہنچنے سے پہلے ہی حکومت کے ہاتھ لگ گئے ہندوستاب میں ان خطوط سے حاصل شدہ معلومات کی روشنی میں سلسلۂ دار و گیر شروع ہو گیا۔

اسی طرح حضرت شیخ الہندؒ حجاز پہنچے تو انہوں نے وہاں اپنی کوششیں شروع کر دیں۔ گورنر حجاز غالب پاشا سے ملاقات کی، ان کا اعتماد حاصل کیا اور ان سے اپنی تحریک کے بارے میں ایک تحریک حاصل کی، جو غالب نامہ کے نام سے مشہور ہوئی۔

ترکی زعما کے نام ان کے اعتماد اور ملاقات کے لیے خطوط حاصل کیے اور اس تعارف کے ذریعے مدینہ منورہ میں انور پاشا اور جمال پاشا سے ملاقاتیں کیں، آزادی ہند کے منصوبے پر ان سے مشورے کیے اور ان سے کئی وثیقے حاصل کیے۔ لیکن یہ تمام باتیں راز نہ رہ سکیں۔ حجاز میں حسین شریف مکہ کی ترکی خلافت سے بغاوت نے قید کردیا گیا۔ ہندوستان میں بھی تحریک کے کارکنوں اور دیگر افراد کے لیے پریشان کن حالات پیدا ہوگئے اور بساطِ سیاست کا پانسہ یک سر پلٹ گیا۔

حکومتِ ہند کو کابل اور حجاز میں تحریکِ آزادیٔ ہند کی کوششوں کے بارے میں اطلاعات ملی تھیں، پھر خطوط و تحریرات اور وثایق بھی ہاتھ لگ گئے۔ ان کی بنیاد پر ایک مقدمہ تیار کیا گیا، اس میں استغاثے کے بڑے ملزم مولانا عبیداللہ سندھیؒ تھے اور ان کے انسٹھ شریک ملزمان تھے، ان کے ثبوت میں مولانا سندھیؒ کے خطوط، غالب نامہ اور دیگر تحریرات شامل تھیں۔ استغاثے کے ساتھ تقریباً دوسو بیس افراد کے بارے میں محض ضروری معلومات اور تعارف میں ایک ڈایریکٹری بھی تھی جو انٹیلی جنس نے اپنی ضرورت اور سہولت کی خاطر تیار کر کے شامل کردی تھی۔ اگرچہ ریشمی رومال سازش کیس باقاعدہ چلانے کی نوبت نہیں آئی تھی لیکن کیس تیار کرلیا گیا تھا۔

یہ تمام کاغذات انڈیا آفس لائبریری میں محفوظ تھے، جو کسی ذریعے سے مورخِ ملت مولانا سیّد محمد میاںؒ کو حاصل ہوگئے۔ انہوں نے اس تمام مواد کو مرتب کر کے چھپوا دیا تھا۔ اس کے ساتھ چند بیرونی تحریریں شامل ہیں۔ جن کی تفصیل یہ ہے :

(۱) پیش لفظ: از قلم حضرت مولانا سیّد اسعد مدنیؒ (وفات ۶ر فروری ۲۰۰۶ء) صفحہ ۱۵ تا ۲۴۔

(۲) تعارف: از قلم حضرت مولانا سیّد محمد میاںؒ (م: ۲۲ر اکتوبر ۱۹۷۵ء) صفحہ ۲۵ تا ۱۶۴

مورخِ ملتؒ نے اس تحریک کے پیش منظر، اس کے نشو ونما اور فروغ کی تفصیلات، حضرت شیخ الہند کے منصوبے کی تفصیلات، استغاثہ کے ساتھ شامل مواد انٹیلی جنس کی حقیقت

تک رسائی، استغاثہ کے ساتھ شامل مواد کی حیثیت اور استغاثے کی تالیف میں اہم غلطیوں کی نشاندہی بھی کی ہے۔

(۳) کتاب کے شروع میں مولانا عبید اللہ سندھیؒ (وفات ۲۱/اگست ۱۹۴۴ء) کا ایک اہم مضمون ''شاہ ولی اللہؒ اور ان کی تحریک'' بطور پیش لفظ شامل کیا ہے۔ یہ مضمون ولی اللٰہی تحریک کو دار العلوم دیوبند کی تحریک سے اس مقام پر جوڑ دیتا ہے جہاں سے مولانا سیّد اسعد مدنیؒ نے اپنے پیش لفظ کا آغاز کیا تھا۔ اس طرح ریشمی رومال تحریک کو تاریخ کا دوسوسالہ پس منظر مل جاتا ہے۔

اس سے ثابت ہو جاتا ہے کہ تحریک شیخ الہندؒ کا ظہور دوسوسالہ تاریخ کے واقعات اور تحریک ولی اللٰہی کا لازمی تسلسل ہے۔ تاریخ کے اس سفر میں نشیب وفراز، مشکلات اور آزمائشیں ضرور پیش آئیں لیکن کوئی پیچ وخم نہیں، جس میں مقصد کبھی دھندلا گیا ہو یا منزل کبھی نظروں سے اوجھل ہوگئی ہو۔

''تحریک شیخ الہندؒ'' کی ہندوستان اور پاکستان میں بڑی پذیرائی ہوئی۔ دہلی میں ایوانِ صدر میں اس کا افتتاح ہوا۔ پانچ ہزار اہلِ علم و دانش اور حکومت کے وزراء، ارکان اسمبلی کو دعوت دی گئی۔ ہندوستان کے وزیر اعظم اور فخر الدین علی احمد نے، جو اس وقت جمہوریہ ہند کے صدر تھے، اس کے افتتاح میں بذاتِ خود دلچسپی لی اور ایک سابق صدر ڈاکٹر راجندر پرشاد نے مقالہ افتتاحیہ پیش کیا۔ ڈاکٹر راجندر پرشاد کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ۱۹۵۰ء، ۱۹۵۲ء اور ۱۹۵۷ء میں تین مرتبہ جمہوریہ ہند کے صدر منتخب ہوئے تھے۔

یہ جلسہ ۵/جولائی ۱۹۷۵ء کو منعقد ہوا تھا۔ مولانا محمد میاںؒ کو اس تالیف کی تدوین و اشاعت پر خراجِ تحسین پیش کیا گیا تھا۔ پاکستان کے تین اداروں نے اب تک اس کے پانچ ایڈیشن شائع کیے ہیں۔ تاریخ وسیاست کے مطالعے کا ذوق رکھنے والوں میں یہ کتاب بہت مقبول اور جمعیت علمائے ہند کے بزرگوں کی نیک نامی اور شہرت میں اضافے کا موجب ہوئی۔

اسیرانِ مالٹا :

اسی تحریک کا شاخسانہ تھا کہ مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے چوبیس سال تک جلاوطنی کی زندگی گزاری اور مارچ ۱۹۳۹ء سے پہلے انہیں اپنے وطن کے ساحل پر قدم رکھنے کی اجازت نہ ملی اور حضرت شیخ الہندؒ اوران کے رفقاء کو دسمبر ۱۹۱۶ء میں گرفتاری کے بعد وسط جون ۱۹۲۰ء تک ساڑھے تین سال وطن سے دوری، اعزہ واحباب کی صحبت وملاقات سے محرومی، قید کی تکالیف کے بعد وطن لوٹے تھے۔ اگرچہ وطن سے دوری ومہجوری، قید اور واپسی کے سفر کا تذکرہ حضرت مولانا سیّد حسین احمد مدنیؒ نے ''سفر نامۂ اسیر مالٹا'' میں کیا تھا، لیکن جس زمانے میں مذکورہ سفر نامہ شائع ہوا تھا قید بند کے واقعات کی بعض تفصیلات اور تاثرات حالات کی سنگینی اور مصالح وقت کی بناپر زبانِ قلم پر نہ آسکے تھے یا تشنہ تفصیل رہ گئے تھے۔

ضرورت تھی کہ سازگار حالات میں ان کی تفصیل بیان کی جائے۔ اسیرانِ مالٹا درحقیقت اسی ضرورت کی تکمیل ہے۔ یہ کتاب مورخ ملتؒ نے اپنی زندگی کے آخری دور میں تالیف فرمائی تھی، لیکن ابھی اس کی واشاعت کی نوبت نہ آئی تھی کہ وہ اللہ کو پیارے ہوگئے۔ کتاب کی اشاعت مرحوم کی وفات کے تقریباً آٹھ ماہ بعد ۱۹۷۶ء میں عمل میں آئی۔ اس کا تعارف قاضی سجاد حسین صاحبؒ صدر مدرس مدرسۂ عالیہ فتح پوری۔ دہلی کے قلم سے یادگار ہے۔ اس کے مضامین کی تفصیل یہ ہے۔

مجاہد جلیل :

یہ مختصر رسالہ حضرت شیخ الاسلامؒ کے حالات زندگی میں ہے۔ ۱۹۴۷ء میں شائع ہوا۔ صفحات ۱۶، ناشر سیّد احمد میاں مالک کتب خانہ اسلامیہ۔ دیوبند۔

حیاتِ شیخ الاسلامؒ :

مولانا سیّد حسین احمد مدنیؒ کے سوانح اور سیرت وخدمات میں یہ کتاب حضرتؒ کی حیات میں مرتب کی گئی تھی۔ اسی لیے اس میں حضرت کے آخری دور کے حالات، حضرت کی وفات اور اس حادثہ فاجعہ کی تفصیلات اور اس پر تاثرات کا ذکر نہیں ہے۔

آنے والے انقلاب کی تصویر :

یہ حضرت مورخ ملتؒ کا ایک تاریخی رسالہ ہے۔ تحریکِ پاکستان کے شور وہنگامے میں کسی موقع پر لکھا گیا۔ دو باتیں خاص طور پر قابلِ غور ہیں :

(۱) برٹش حکومت کے استحصال کی تاریخ اور استحصال کے ظالمانہ طریقوں اور وقت کی سیاسیات پر تبصرہ۔

(۲) مسلم لیگ کے طرزِ فکر اور اس کے فرقہ پرستانہ انداز سیاست پر تنبیہ! جس نے صدیوں کی مشترک سماجی، معاشرتی اور تہذیبی اقدار کو تباہ کر کے سوسائٹی کو نفرت اور اشتعال کے جذبات سے بھر دیا ہے۔

متفرق سیاسی مقالات :

۱۹۴۵ء میں ان کے دہلی منتقل ہو جانے کے بعد انہوں نے جمعیت علماء ہند کے مقاصد کے تعارف میں اس کی تجاویز اور فیصلوں کی اہمیت کے پیشِ نظر لیگی پروپیگنڈے کے جواب اور اس کے لیڈروں کی غلط بیانیوں کی تردید میں، حضرت شیخ الاسلامؒ کے دفاع میں، الزامات کے جواب میں، کارکنانِ جمعیت کی رہنمائی کے لیے ہدایات، وقت کے اہم سیاسی مسائل ومباحث میں جمعیت کے نقطۂ نظر اور موقف کی وضاحت کے لیے خاص طور پر

مرکزی اسمبلی کے انتخابات کی سرگرمیوں کے آغاز سے صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات کے خاتمے اور اس کے کچھ بعد تک انہوں نے اخبارات میں مضامین، مراسلات اور چوورقوں اور کتابچوں کی شکل میں اتنا لکھا ہے کہ اس کا شمار ممکن نہیں۔ ان میں بہت سے بیانات و مضامین اور کتابچوں کی مقالاتِ سیاسیہ کی زیرِنظر جلد میں مستقل رسالے کی حیثیت سے یا ضمیموں کی شکل میں شامل کر لیا ہے۔ اس طرح ان سے حال و مستقبل میں استفادے کی راہ ہموار ہوگئی ہے تا کہ جمعیت علمائے ہند کی خصوصیات اور خدمات کا چھوٹے سے چھوٹا نقش بھی محفوظ ہو جائے۔

مودودی صاحب کے رد میں :

مؤرخِ ملت ؒ کی دو کتابیں سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کے افکار و تحقیقات کے رد میں ہیں :

(۱) ایک کتاب ''شواہدِ تقدس اور تردید الزامات'' مودودی صاحب کی حضرات عثمان و معاویہ رضی اللہ عنہما پر (کتاب کے) رد میں ہے۔

(۲) دوسری کتاب ''دو ضروری مسئلے'' کے عنوان سے مودودی صاحب کے ایک فتوے کے رد میں ہے، جس میں انہوں فرمایا تھا کہ جو خواتین ہندوستان میں رہ گئی ہیں اور ان کے شوہر پاکستان آ گئے ہیں یا خواتین پاکستان آ گئی ہیں اور ان کے شوہر ہندوستان میں رہ گئے ہیں اور ان میں سے کوئی اپنی جگہ چھوڑنے کے لیے تیار نہیں، ان میں طلاق واقع ہوگئی۔ دوسرا مسئلہ وراثت کے بارے میں ہے۔ مودودی صاحب کی تحقیق یہ ہے کہ ہندوستان پاکستان کی قومیت رکھنے والوں میں اسلامی وراثت کے اصول پر عمل نہیں کیا جا سکتا۔ مولانا سیّد محمد میاں ؒ نے ان دونوں فتوؤں کا رد کیا ہے۔

مولانا محمد اعزاز علی ؒ شیخ الادب والفقہ دار العلوم دیو بند نے ''علمائے حق اور مودودیت'' کے عنوان سے اس رسالے ''دو ضروری مسئلے'' پر تقریظ تحریر فرمائی ہے۔

دیگر تصانیف :

میں نے اپنے خاص ذوق کی بنا پر حضرت مورخ ملتؒ کی سیاسی تصانیف وتالیفات کو اہمیت دی اور انہیں کی ترتیب وتدوین اور تصانیف میں ہمت صرف کی لیکن خدانہ خواستہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ حضرتؒ کی دیگر خدمات ناقابل التفات ہیں۔ اسلامی تاریخ اور علوم و فنون کے مختلف موضوعات اور مباحث میں انہوں نے نہایت عظیم الشان تالیفات یادگار چھوڑی ہیں۔ میں یہاں ان کی ایک فہرست مرتب کر دینے کی کوشش کر رہا ہوں۔

(۱) مقاماتِ حریری :ایک درسی کتاب ہے۔ مولانا محمد میاںؒ نے اس کی تعلیقات تحریر فرمائی ہیں۔ جو بہ قول مولانا سیّد حامد میاں مرحوم کے ثعالبی کی فقہ اللغۃ سے لی گئی ہیں۔ مولانا کی تعلیقات سے اساتذہ وطلبا دونوں کے لیے تدریس وتفہیم میں سہولت پیدا ہوگئی ہے۔

(۲) نورالاصباح فی نورالایضاح: فقہ کی ایک درسی کتاب ہے۔ مولانا نے اپنے استاد گرامی مولانا محمد اعزاز علیؒ کی فرمایش پر اس کا ترجمہ وشرح تحریر فرمائی تھی اور مکتبۂ اعزازیہ دیوبند سے شائع ہوئی تھی۔ اس کا پورا نام ''نورالاصباح فی نورالایضاح'' (اردو) ہے۔

(۳) صحابہ کرام کا عہد زریں: ''ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء'' کے نام سے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی ایک نہایت اہم اور مشہور تالیف ہے۔ مولانا محمد میاںؒ نے اس کے ترجمہ وتشریح کے لیے قلم اٹھایا تھا، لیکن مولانا کے حسنِ ذوق اور شوق تحریر نے اسے بڑے سائز کے ساڑھے سات سو صفحوں کی ایک مستقل اور بلند پایہ تالیف بنا دیا۔ حضرت شاہ صاحبؒ کی تالیف کا دائرہ بحث خلفائے راشدین تک محیط تھا، لیکن ہمارے ممدوح مورخِ ملتؒ نے اس دائرے کو صحابہ کرامؓ کی پوری جماعت پر محیط کر دیا ہے۔ یہ کتاب دہلی اور لاہور سے شائع ہوئی ہے۔

(۴) مشکوۃ الآثار ومصباح الابرار: یہ کتاب اخلاقیات میں احادیث مبارکہ کا ایک خوبصورت انتخاب ہے، جو حضرت مولانا محمد میاںؒ کے حسن ترجمہ وتالیف نکات کی

بدولت ایک ایسی کتاب بن گئی ہے جو ہر گھر کی ضرورت ہے۔ایک مدت تک بعض مدارس عربیہ کے نصاب درس میں شامل رہی ہے۔

(۵) دینیات کا نصاب: آزادی کے بعد شمال مغربی ہندوستان میں مسلمان بچوں کی دینیات کی تعلیم وتربیت کی جوضرورتیں پیش آئیں،ان میں پہلی جماعت تا آٹھویں جماعت کے طلباء و طالبات کے لیے گیارہ رسائل پر مشتمل ایک سیٹ تیار کیا تھا، جوایک مدت تک جمعیت علمائے ہند کے قائم کردہ سینکڑوں مدارس میں اور دیگر مدارس میں پڑھایا جاتا رہا،اوراب جب کہ مختلف اہل علم واصحابِ قلم نے اپنے اپنے ذوق کے مطابق نصاب تیار کر لیے ہیں،مولانا محمد میاںؒ کے نصاب کی اہمیت برقرار ہےاور پچاسوں مدارس ومکاتب کے نصابِ تعلیم میں اب تک شامل ہے۔

(۶) تاریخ اسلام: مسلمان بچوں اور بچیوں کی اسلامی، تاریخی اور اخلاقی و مذہبی تعلیم کے لیے سوال و جواب کی صورت میں مورخ ملتؒ نے تین نمبروں میں تاریخ کا ایک نصاب مرتب کیا تھا۔ یہ نصاب ابتدائی درجات کے طلباء وطالبات کے لیے نہایت مفید تھا۔اس کی تحریک مولانا کے گرامی مرتبت استاد مولانا محمد اعزاز علی صاحبؒ نے فرمائی تھی اور انہیں بزرگ نے اپنے مکتبۂ اعزازیہ۔دیوبند سے شائع کیا تھا۔

تاریخ اسلام نمبر ا (مکی زندگی کے حالات) نومبر ۱۹۳۲ء صفحات ۱۳۳

تاریخ اسلام نمبر ۲ (مدنی زندگی کے حالات) دسمبر ۱۹۳۲ء صفحات ۲۲۳

تاریخ اسلام نمبر ۳ (فضائل وعبادات، حلیہ مبارک، آداب اور روز و شب کے معمولات وغیرہ۔)

نمبر ا کے آخر میں اس سلسلۂ تالیف کی افادیت اور زبان کی صحت اور حسن بیان کے تذکرہ وتعارف میں ان کے استاذ شیخ الادب والفقہؒ کی گرامی قدر رائے بھی شامل ہے۔ (صفحہ ۱۲۰ تا ۱۳۳)

(۷) حضرت مولانا محمد میاںؒ نے سیرتِ مبارکہ اور ہمارے پیغمبر کے عنوان

سے دو کتابیں سیرتِ نبوی میں مسلمان بچوں کے لیے تالیف فرمائیں۔ غیر مسلموں کے لیے خاص دعوت کے نقطۂ نظر سے ''محمد رسول اللہ'' تالیف فرمائی۔

(۸) **اسلام اور اسلامی فکر کیا ہے؟** مولانا سیّد محمد میاںؒ نے اس کتاب میں صرف اپنے خیالات ہی تالیف نہیں فرمائے بلکہ اس میں مولانا ابوالکلام آزادؒ اور مولانا محمد عثمان فارقلیط کے نتائج فکر اور رشحات قلم بھی مرتب کر دیے ہیں۔

(۹) **مسئلہ تعلیم اور طریقہ تعلیم** : مولانا سیّد محمد میاںؒ مرحوم نے مسلمان بچوں کی تعلیم اور ان کی اخلاقی تربیت کے لیے دینیات، تاریخ اسلام، اخلاقیات کے نصاب ہی مرتب نہیں کر دیے بلکہ اساتذہ کی رہنمائی کے لیے طریقہ تعلیم اور مسئلہ تعلیم کی اہمیت پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

(۱۰) مولانا نے ایک نہایت اہم کام یہ انجام دیا ہے کہ زبانی اور درسی تعلیم کے ساتھ بچوں کی تربیت اور اخلاق و تاریخ کے مطالب کو ذہن نشیں کرانے کے لیے رسالت اور خلافتِ راشدہ کے دور کے بارے میں معلومات کو چارٹوں کی صورت میں مرتب کر دیا ہے، یہ چارٹ مکتب و مدرسہ میں اور گھروں میں بھی مناسب جگہوں پر آویزاں کیے جا سکتے ہیں۔ ان کی افادیت اس سے بہت زیادہ ہے جس کا ہم تصور کر سکتے ہیں۔

ان کتب و سائل کے علاوہ مختلف سیاسی دینی، اخلاقی موضوعات میں مورخ ملتؒ مولانا سیّد محمد میاںؒ کی تالیفات وتصنیفات یادگار ہیں۔ جن کے صرف نام درج کیے جاتے ہیں :

اسلام اور انسان کی حفاظت وعزت
ہندوستان شاہانِ مغلیہ کے عہد میں
سیاسی واقتصادی مسائل اور اسلامی تعلیمات
مصالح جمہوریت اور اس کی تعمیر
جمہوریت اپنے آئینے میں
حیاتِ مسلم

چاند، تارے اور آسمان
دینِ کامل
رحمۃ اللعالمین اور سیاسی انقلاب
پانی پت اور بزرگانِ پانی پت
دورِ جدید کی ہندوستان سیاست اور مسلم علما کا کردار
اسلامی تقریبات چہل حدیث وغیرہما۔

☆☆☆☆☆

حضرت مؤرخِ ملتؒ کی فتویٰ نویسی :

دینی مسائل کی تحقیق اور زندگی میں ان کی رہنمائی سے حضرت مرحوم کو خاص دلچسپی تھی، اسی ذوق کا نتیجہ تھا کہ مدرسۂ شاہی مراد آباد میں جوں ہی انہوں نے فضا کو ساز گار پایا شعبۂ افتا کا آغاز کر دیا۔ ۱۹۲۸ء تک مدرسۂ شاہی میں اس شعبے کا وجود نہ تھا۔ اگر کبھی کوئی استفتا آتا تو اس کا جواب ضرور دے دیا جاتا، لیکن فتوؤں کا ریکارڈ رکھنے کا کوئی اہتمام نہ تھا۔ مولانا سیّد محمد میاںؒ نے اس کا خاص اہتمام کیا۔ مولانا کے ذوق و توجہ عالی سے شعبۂ افتا کی تاسیس کا عمل انجام پایا اور بعض بہت اہم فتوؤں کا اجرا ہوا۔

حضرت مولاناؒ کا ایک فتویٰ جس کی اہمیت کا تو تعلق صرف اس کے مضمون اور موضوع ہی سے نہیں بلکہ اس کی تحقیق کے معیار، دلایل کی پختگی اور اس کے حسنِ اطلاق سے بھی ہے۔ یہ فتویٰ زیرِ نظر مجموعۂ مقالات میں شامل ہے۔ اس کے بارے میں کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ قارئینِ کرام بہ یک نظر اس کی اہمیت کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

۱۹۴۵ء کے بعد مرکزیہ جمعیت علمائے ہند سے تعلق کے زمانے میں بھی ان کا یہ شوق قائم رہا، اس زمانے میں مولانا نے بہت فتوے لکھے جو مستفتیین کو بھیج دیے جاتے اور بعض الجمعیۃ میں شائع کر دیے جاتے تھے۔ لیکن ستر کی دھائی میں جب وہ مدرسہ امینیہ دہلی میں شیخ الحدیث اور مفتی مقرر کیے گئے تو انہوں نے شعبۂ افتا کی تجدید اور فتویٰ نویسی کے عمل

کے احیا پر خاص توجہ فرمائی اور حضرت مفتی اعظم مولانا محمد کفایت اللہؒ کے انتقال کے بعد شعبۂ افتا کی خدمات میں جو خلل پیدا ہو گیا تھا اسے دور کر دیا۔ مولانا سیّد محمد میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی یہ بہت بڑی علمی دینی خدمت ہے، اس کا ایک پہلو سیاسی بھی ہے اور اس سے جمعیت علمائے ہند کی ایک اہم خصوصیت پر روشنی بھی پڑتی ہے۔

مولانا سیّد حامد میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مولاناؒ کے فتوؤں کی جمع و ترتیب کی اہمیت اور ضرورت پر توجہ دلائی ہے۔ فرماتے ہیں :

> ''افتا کا کام جو مراد آباد میں اور مدرسہ امینیہ میں انجام دیا ہے، نیز نظامتِ جمعیت کے دوران بھی جو فتوئ تحریر کیے ہیں، وہ اگر کبھی جمع کیے گئے تو یہ بھی ان کے علمی کام کا ذخیرہ ہوگا۔''

جمعیت علمائے ہند سے وابستگی :

اگر چہ خاک سار کا موضوع حضرت مورخ ملتؒ کی سیاسی تصنیفات اور عملی خدمات ہے، لیکن اس حقیقت سے انکار تو نہیں کیا جا سکتا کہ انہوں نے ۱۹۲۵ء سے ۱۹۴۵ء تک اپنی عمر عزیز کے کامل بیس برس تعلیم و تدریس کی دنیا میں گزارے تھے۔ اسی میں ان کا ذوق پختہ اور علوم و فنون اسلامی رسوخ حاصل ہو گیا تھا۔ کسی ایسے شخص کا اچانک اس کے مقام سے الگ اور بے تعلق کر دیا جانا ایک حادثہ ہی ہو سکتا ہے لیکن زندگی میں ایسے حوادث بھی پیش آتے ہیں کہ زندگی کی عزیز متاع اور شوق کو بھی قربان کر دینا پڑتا ہے۔ یہ بات مولانا کی عزیمت اور ذوق ایثار کا ثبوت ہے۔

جب ملی مفاد کا تقاضا ہوا اور خدمت کے ایک نئے میدان میں ان کی قابلیت کی ضرورت پیش آئی تو انہوں نے پورے انشراح قلب کے ساتھ کمالِ ایثار کا ثبوت دیا اور ایک مدت تک اس چھوڑی ہوئی دنیا کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔

جمعیۃ علمائے ہند کے مرکزی ناظم کا عہدہ قبول کر کے مولانا سیّد محمد میاںؒ نے اپنے آپ کو آزمائشوں کے حوالے کر دیا تھا۔ ایک آل انڈیا جماعت جو نہایت ذمہ دار، حساس اور

سرگرم ہو، جس کی سینکڑوں شاخیں ملک کے دور دراز علاقوں پر پھیلی ہوئی ہوں، جس کے ہزاروں کارکن اور رہنما ملت اور قوم و وطن کی خدمت کے کاموں میں مصروف ہوں، بیسیوں قومی و ملی جماعتوں میں جسے مرکزیت حاصل ہو اور ان کے رہنماؤں سے رابطے کی ضرورتیں ہوں اور ہر سطح پر ذاتی ذوق، دلچسپی اور تعلقات کا تقاضا ہو، ایک ناظم کی ذمہ داریوں اور اس کی مشکلات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ مولانا سیّد محمد میاں رحمہ اللہ نے اپنے ذوقِ خدمت کو اور اپنی صلاحیتوں اور فکر و عمل کی قابلیتوں کو کسوٹی کے حوالے کر دیا تھا۔ جس کے کھرے کھوٹے نکلنے پر ایک عالم کی نظریں لگی ہوئی تھیں۔ لیکن ان کی ذمہ داریوں کی حد اور آزمائش کا سلسلہ اسی مقام پر ختم کہاں ہو جاتا تھا؟ یہ تو آغاز تھا، اس سے آگے بھی سخت مرحلے اور جانِ نحیف و نزار کے لیے قدم قدم پر آزمائش تھیں۔

جمعیت مرکزیہ اور شاخوں کے درمیان مراسلت کے ذریعے رابطہ، فیصلوں کی اطلاع، ہدایات کا اجراء، مجالس شوریٰ و عاملہ کے اجلاسوں کی تیاری اور ایجنڈے کی ترتیب سے لے کر جلسوں کی رودادوں اور اعلامیوں کی تالیف و اجرا اور شاخوں تک ان کے فیصلوں کی اطلاعات کی ذمہ داریاں، جلسوں میں شرکت، واقعات و حوادث کی تحقیقات کے لیے کمیٹیوں کی تشکیل، روپورٹوں کی تیاری، ریلیف کے انتظامات، ضرورت مندوں سے ملاقاتیں، پورے ملک سے آئے ہوئے خطوط کے ذریعے حالات و مسائل پر نظر، سوالات کے جوابات اور مراسلت کے ذریعے رہنمائی، ایک بڑی ذمہ داری اخبارات کے مطالعے کے ذریعے حالات اور رفتار سیاست پر نظر رکھنے کی تھی اور پھر حالات اور خبروں کے مطابق وضاحت، صفائی، دفاع، انکار، تردید، تبصرہ، تنقید جو بھی وقت کا تقاضا ہو اس کا بروقت اور برمحل اقدام و انتظام کی صدر اور ناظمِ اعلیٰ سے زیادہ فکر بھی۔

اپنے فرائض کے ساتھ دوسروں کے کاموں کی نگرانی اور جواب دہی خیال اور اچانک پیش آ جانے والے حوادث و واقعات اور ان کے تقاضے۔ صبح سے شام تک کاموں کا ایک لامتناہی سلسلہ اور کبھی نہ ختم ہونے والی مصروفیات تھیں اور حضرت مولانا سیّد محمد میاں

صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تنہا جان ناتواں! لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں کاموں کی انجام دہی کا ایسا سلیقہ اور ہمت عطا فرمائی تھی کہ ہر کام بروقت اور حسن وخوبی کے ساتھ انجام پا رہا تھا۔

میں نے مولانا کے تیس سالہ شوق تصنیف وتالیف کا ذکر نہیں کیا لیکن حقیقت یہ ہے کہ زیادہ تیز رفتاری سے نہ سہی آہستہ آہستہ وہ بھی پورا ہو رہا تھا۔ اور اگر اس میں جمعیت کی ضرورتوں کو بھی شامل کر لیا جائے تو پھر رفتار کی آہستگی کا عذر پیش کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ اس چیز کو بھی نظر انداز نہ کر دینا چاہیے کہ مولانا ١٩٤٥ء کے میں سہارنپور کے اجلاسوں کے کاموں سے فارغ ہو کر دہلی تشریف لے گئے تھے اور ١٩٤٧ء کے آخر تک جو وقت آیا تھا اس میں ہر صبح وشام کو ان کی ذمہ داریوں اور مصروفیتوں میں اضافہ ہو رہا تھا اور آخر میں تو یہ اہتمام اتنا بڑھ گیا تھا کہ جب وہ جمعیت کے دفتر سے نکلتے تو جان کو پہلے اپنی ہتھیلی پر رکھ لیتے تھے۔

اس دور میں جان سے بے نیازی اور خدا پر بھروسے کی کیفیت کے بیان کے لیے کوئی مثال پیش کی جاسکتی ہے تو سیرت نبوی کے اس واقعے میں کہ ایک سیر کے موقع پر کہ فضا خطرات سے بوجھل تھی، نبی کریم علیہ الصلوۃ والتسلیم اپنی تلوار کو درخت کی ایک شاخ میں لٹکا کے درخت کے سایے میں لیٹ کر سو گئے تھے اور ایک دشمن نے موقع پا کر پہلے تلوار پر قبضہ کیا پھر آپ کو متوجہ کیا کہ بتاؤ! اب تمہیں میرے ہاتھ سے کون بچائے گا؟ صاحب مقام نبوت علیہ السلام کا جواب قارئین کو معلوم ہے۔ ہمارے ممدوح مولانا سیّد محمد میاںؒ کا اطمینان اور بے خوفی اسی پیغمبرانہ سیرت سے مستفاد تھی۔ میں اس موقع پر اتنا اور کہہ دینا چاہتا ہوں کہ اس خوبی میں جمعیت علمائے ہند کے تمام اکابر واصاغر سیرت نبوی کے اسی عشق سے سرشار تھے۔

قاضی سجاد حسین صاحبؒ لکھتے ہیں :

> ''١٩٤٧ء کے ہنگاموں میں جب کہ ہندوستان ایک جہنم کدہ بنا ہوا تھا اور مظلوموں کی چیخ و پکار سے اہل ہند کے دل دہل رہے تھے، مولانا نے انتہائی استقامت کے ساتھ مظلوموں کی مدد کی۔ جہاں کہیں بھی مسلمانوں پر ظلم وستم ہوا،

مولانا بے دھڑک وہاں ریلیف اور امداد کے لیے پہنچے۔ پنجاب کے خوں چکاں واقعات کے بعد جب کہ مسلمانوں کے کچھ افراد پنجاب اور ہماچل کی دور دراز آبادیوں میں اکادکا رہ گئے تھے، مولانا نے پنجاب کے دیہات کے دورے کیے۔ ہماچل کے پہاڑوں میں پھیلے ہوئے دیہات میں دشوار گزار راستے طے کر کے پہنچے اور وہاں ان کے زخموں پر مرہم رکھا اور ان کے دین و ایمان کے تحفظ کے لیے مکاتب اور مدارس قائم کیے۔'' (''اسیرانِ مالٹا'' دہلی، ۱۹۷۶ء صفحہ و)

۱۹۴۷ء میں مصیبت زدگان اور کشتہ گانِ ستم امداد اور دادرسی کے بارے میں مولانا سیّد حامد میاںؒ اپنے والد گرامی پر مضمون میں لکھتے ہیں :

''۱۵/اگست ۱۹۴۷ء کے بعد فرقہ واریت کے وہ ہنگامے شروع ہو گئے جو آج تک ختم نہیں ہوئے ان کی داستان طویل بھی ہے اور دردناک بھی۔ ان ہنگاموں نے خدمات کا ایک نیا باب قائم کیا، جس کا عنوان ریلیف ہے۔ یعنی کشتہ گانِ ستم کو دفنانا، مجروحین کے جسم پر دوا کی پٹیاں باندھنا اور زخمی دلوں پر تسکین اور دل داری کا مرہم لگانا، اجڑے ہوؤں کو بسانا۔ مشرقی پنجاب اور ہماچل میں مسلمان ہندوانہ وضع اختیار کر کے زندگی گزار رہے تھے جہاں تباہ شدہ مسلمانوں کی تعداد ایک فی ہزار رہ گئی تھی۔ جمعیت علمائے ہند کے حضرات نے وہاں دورے کیے حوصلے دلائے، شبینہ مکاتب شروع کیے۔ مسلمان جو چھپے ہوئے تھے برآمد ہونے لگے۔''

وہ ادارے جن سے مولانا کا تعلق رہا :

زندگی میں ہمارے ممدوح مورخِ ملت مولانا سیّد محمد میاںؒ کا مختلف قسم کے متعدد اداروں سے تعلق رہا۔

پہلا ادارہ جس سے ان کا تعلق پیدا ہوا دارالعلوم دیوبند کا تھا۔ اس کی تعلیمی فضاؤں میں انہوں نے تعلیم کے مراحل طے کیے تھے۔ اس کے نامور اور نیک سیرت اور فاضل

اساتذہ نے ان کی تعلیم وتربیت میں حصہ لیا تھا اوران کی تشکیل سیرت اورتہذیب اخلاق سے ان کی شخصیت کوآراستہ وپیراستہ کیا تھا۔مولانا کی شخصیت اورسیرت پران بلند پایہ اساتذہ کا بہت گہرا اثرا تھا، وہ زندگی کے ہر دور میں ان کے شکرگزار رہے۔آخر میں انہوں نے دارالعلوم کی خدمات میں بھی حصہ لیا، جب کہ وہ اس کی شوریٰ کے رکن منتخب کیے گئے۔مولانا نے اپنے اوپراس کا قرض چکانے کی ہرممکن کوشش کی۔

دوسرا ادارہ آرہ (بہار) کا مدرسہ حنفیہ تھا،جس میں مولانا نے اپنی جوان عمری کے ساڑھے تین برس گزارے تھے۔مولانا کووہ مدرسہ اس کے منتظمین اورجن اساتذہ کے ساتھ انہوں نے درس وتدریس کی خدمات انجام دی تھیں، ہمیشہ یادرہے اوران سے لطف ومحبت کا رشتہ قائم رہا۔

تیسرا ادارہ مرادآباد کا مدرسہ شاہی تھا۔اس میں مولانا نے اپنی زندگی کے سولہ قیمتی سال گزارے تھے اوراگر حالات کے نئے تقاضے پیدا نہ ہوتے تو وہ اپنی قناعت پسند طبیعت کے مطابق اپنی پوری زندگی مدرسہ شاہی میں گزار دیتے۔مولانا کو مدرسے کی علمی، سیاسی، تعلیمی فضا بہت پسند تھی اورمرادآباد کی معاشرتی زندگی اورسیاسی ماحول سے مانوس ہوگئے تھے اوراس میں انہوں نے اپنے لیے عزت کا مقام پیدا کرلیا تھا۔

۱۹۵۵ء میں مدرسہ شاہی کے مہتمم مولانا عبدالحق مدنیؒ کے انتقال کے بعد مدرسے کوایک مخلص، انتظام کے ماہرعالمِ دین مہتمم کی ضرورت پیش آئی تو ارباب بست وکشاد کی نظر مولانا سیّد محمد میاںؒ پر پڑی،مولانا کا مدرسے سے اس کی تاریخ ومقاصدِ قیام سے،اس کی روایات سے علم واخلاص کا بہت قریبی تعلق تھا، وہ سولہ برس تک مدرسے کے سرگرم رکن رہ چکے تھے۔اب اس کے وجود کوان کی امداد وحمایت کی ضرورت تھی اوراس نے اپنی بقا کے لیے ان کے اخلاص اورقابلیت کوآواز دی تھی۔

مولانا کے لیے اس آواز سے اعراض اورسنی ان سنی کردینا ممکن نہ تھا،مولانا کا خاندان دیوبند میں اوران کے بیوی بچے دہلی میں تھے اوران کی ضرورت دس سال قبل

چھوڑے ہوئے ان کے محبوب ادارے کو تھی۔ مولانا نے اس کی آواز پر لبیک کہا اور اگر چہ پتھر بھاری تھا لیکن انہوں نے آگے بڑھ کر اسے اٹھا ہی لیا، اور جب تک حالات کا تقاضا ہوا ذمہ داریوں سے منہ نہیں پھیرا۔

مراد آباد کے اسی قیام کے زمانے میں مولانا نے ''ادارۂ حفظ الرحمٰن'' کے نام سے شہر سے باہر رام گنگا کے کنارے ایک نئے ادارے کی بنیاد ڈالی، مولانا اس کے بانی تھے، وہی اس کے ناظم تھے اور وہی اس کے کارکن بھی تھے۔ مولانا جب تک مراد آباد میں رہے اور مدرسۂ شاہی سے اہتمام کا تعلق رہا اس ادارے کو بھی چلاتے رہے اور جب مراد آباد سے روانہ ہوئے تو اسے بھی قابل اعتماد، صاحبِ اخلاص اور باصلاحیت ہاتھوں میں دے کر روانہ ہوئے۔

جمعیت علمائے ہند، اس کی سیاست، اس کے رہنماؤں، اس کے مقاصد اور اس کے اصول سے لے کر فرع تک سے مورخِ ملتؒ کا تعلق جسم و جان کا سا تھا۔ جمعیت علمائے ہند کے ایک دور کی کہانی مولانا محمد میاںؒ کی کہانی تھی۔ مجاہدِ ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ کی حیات (اگست ۱۹۶۲ء) تک جمعیت کے روح رواں رہے۔ ان کے انتقال کے بعد ایک سال تک وہ جمعیت کے ناظمِ اعلیٰ کے منصب پر فائز رہے تھے، اس کے بعد منصب کی ذمہ داری کے بغیر جمعیت سے ان کا تعلق اسی ذوق وخدمت کا تعلق رہا۔

جمعیت کی خدمت کے لیے انہوں نے اپنے منصب کے وقار کی بھی کبھی پروا نہیں کی تھی۔ مولانا قاضی سجاد حسینؒ کے بہ قول :

> ''جمعیت علمائے ہند کی نظامت کے جلیل القدر عہدے پر عرصۂ دراز تک فائز رہے لیکن عہدے کی وجہ کبھی مولانا کے لیے ادنیٰ سے ادنیٰ خدمت میں مانع نہ ہوئی۔ مولانا کا مقصد کام اور خدمت ہوتی تھی خواہ وہ کسی بھی نوعیت کی ہو۔''

وہ جمعیت ٹرسٹ سوسایٹی کے صدر بھی رہے تھے۔ جمعیت علمائے ہند کی نظامتِ علیا سے فراغت کے بعد اگر چہ جمعیت سے ان کا اخلاص و تعاون کا تعلق زندگی کے آخری

لمحوں تک رہا، لیکن اب انہوں نے مدرسہ امینیہ سے تعلق میں اپنے قلب کا اطمینان وسکون تلاش کرلیا تھا۔ انہوں نے مدرسہ امینیہ میں شیخ الحدیث اور صدر مفتی کی ذمہ داریاں قبول کر لی تھیں۔ گویا کہ ۱۹۴۵ء میں مدرسہ شاہی کی جس مسند تدریس وافتاء سے اٹھ کر قوم کی سیاسی رہنمائی کے لیے میدانِ عمل میں نکل گئے تھے، ۱۹۶۳ء میں جمعیت کی خدمت اور سیاسی میدان سے نکل کر پھر اسی درس وتدریس اور خدمت افتا کی مسندوں کو زینت بخشی تھی۔ یہ خدمت ہمیشہ ان کے ذوق ومزاج کے مطابق رہی تھی۔ ان کے اصل مقام کو ہمیں درس وافتا کے ہنگاموں اور تصنیف وتالیف کے کاموں ہی میں تلاش کرنا چاہیے۔

خدمات کا اعتراف :

مولانا سیّد محمد میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جس جماعت کے پلیٹ فارم سے سیاست میں حصہ لیا تھا اس کا جو اندازِ سیاست اور موقف تھا اور جن مواقع پر اور جن کی تحریکات میں قوم کی رہنمائی کی تھی، ان میں نہ انہیں شاباشی مل سکتی تھی نہ ان پر پھول برسائے جاسکتے تھے۔

اس سیاسی راہ میں تو ان کے لیے صرف دار ورسن کی آزمائش ہی پیش آسکتی تھی اور وہی پیش آئی۔ انہیں اپنی سیاسی زندگی میں قید وبند کی آزمائش سے ۱۹۲۸ء سے ۱۹۴۴ء تک چار مرتبہ مراد آباد کے زمانۂ قیام میں اور ایک مرتبہ دہلی میں اس منزل سے گزرنا پڑا۔

قومی وملی خدمات کے ذریعے انہوں نے عوام اور خواص میں عزت اور احترام کا مقام پیدا کرلیا تھا۔ ان کے ہندو اور مسلمان دوستوں نے کئی بار راجیہ سبھا کے الیکشن میں حصہ لینے کے لیے اصرار کیا بلکہ انہیں بلا مقابلہ منتخب کرانے کا وعدہ کیا، لیکن انہوں نے تصنیف و تالیف کے شوق میں یہ پیشکش قبول نہیں کی۔ ان کا یہ خیال تھا کہ عملی خدمت کے مقابلے میں مسلمانوں کی سیاسی خدمات کو تاریخ میں اجاگر کرنے، مسلمانوں کی معاشرتی اصلاح اور ان کی تعلیم وتربیت کے پائیدار انتظام کی زیادہ اہمیت ہے اور اسی کے لیے وہ اپنے آپ کو زیادہ موزوں سمجھتے تھے۔

وہ اگر کسی جائز ذریعے سے بھی اپنی معاشی حالت کو بہتر بنانا چاہتے تو اس کے مواقع موجود تھے، لیکن انہوں نے تو اپنے دوستوں اور حکومت کی پیشکش کو بھی قبول نہ کیا تھا۔ حکومت سے کوئی درخواست کرنے پر کس طرح رضامند ہو سکتے تھے۔ ان کی خود داری اور بے غرضی کا تو یہ عالم تھا کہ اصحابِ رسوخ کی کسی پیشکش کو رد کر دینے پر ان کے صاحبزادے مولانا سیّد حامد میاں صاحبؒ نے کہا کہ آپ کو قبول کر لینی چاہیے تھی؟ تو ان پر ناراض ہوئے اور فرمایا یہ بات تم مجھ سے کہہ رہے ہو!؟ سیاسی خدمات کے انعام میں حکومت کی طرف سے وظیفہ ٔمکان لینے سے انہوں نے انکار کر دیا تھا لیکن اس کے ساتھ سیاسی خدمات کے اعتراف میں سند ''تانبر پتر'' قبول کر لی تھی۔ سندِ اعتراف پر سیاسی یا علمی ادبی یا کسی فن میں خدمات اور کارناموں کی تفصیل اور وزیرِ اعظم کے دستخط ہوتے ہیں۔ مولانا سیّد حامد میاں صاحبؒ نے لکھا ہے :

> ''تانبر پتر انہوں نے رکھ لیا اور یہ فرما کر رکھا کہ یہ میں اس لیے لے رہا ہوں کہ جہادِ آزادی میں مسلمانوں کی خدمات کے شمار میں اس سے ایک شخص کا اضافہ ہوگا۔ باقی چیزیں انہوں قبول نہیں کیں۔''

وفات :

مراد آباد میں اپنی تعلیم کے زمانے میں حضرت مورخِ ملتؒ کو دور و نزدیک سے دیکھنے کا بہت اتفاق ہوا۔ ان کا مستقبل قیام دہلی میں تھا۔ مولانا سیّد حامد میاں صاحب رحمہ اللہ دار العلوم دیوبند میں دورۂ حدیث کے آخر سالوں میں تھے۔ ان کی بیوی مریم بنتِ مولانا عبدالحق مدنیؒ (والدہ ماجدہ مولانا رشید میاں) اپنے والدین کے ساتھ مراد آباد میں تھیں۔ مولانا حامد میاںؒ مہینے میں ایک دو بار ضرور آتے تھے۔ اسی طرح مولانا سیّد محمد میاںؒ کا گاہے گاہے مراد آباد آنا ہوتا تھا۔

اسی زمانے میں مجھے انہیں دیکھنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ وہ دبلے پتلے، متوسط قد اور کمزور کاٹھی شخص تھے۔ علی گڑھ وضع کی کھدر کی شیروانی، اسی کپڑے کی حامد کیپ، تنگ

موری کا ٹخنوں سے اونچا پاجامہ پہنتے اور ہلکے فریم کا چشمہ لگاتے تھے۔

چہرے پر جھری، ڈاڑھی نہ زیادہ بڑی نہ چھوٹی، چہرے کی مناسبت سے نہایت موزوں۔ پاؤں میں موکیشن ٹائپ کا ہلکا جوتا، پوشش میں سادگی، انداز میں خاکساری، ٹپ ٹاپ سے بے نیازی، چہرے پر بھولا پن برستا تھا۔ ان کے تصنیفی کاموں، جمعیت علماء میں ان کے منصب کی بلندی اور ان کی خدمات کی اہمیت سے تو ناواقف تھا اور اس لحاظ سے ان کی شخصیت سے متاثر ہونا نہ ہونا بے معنی تھا، البتہ انہیں دیکھنے سے پہلے مدرسہ شاہی کے ماحول میں ان کا ذکر اکثر سنا تھا اور ان کے نام سے واقف ہو چکا تھا۔ مولوی محمد اسماعیل (ابن مولانا عبدالحق مدنیؒ) کی رات دن کی معیت میں ان کا تذکرہ اتنا سنا تھا کہ ان کے لیے دل میں گہری عقیدت ہوگئی تھی اور جب انہیں دیکھا تو ایک لمحے کے لیے اجنبیت محسوس نہیں ہوئی۔ ان کی شخصیت میں ایک کشش اور ان کی سادگی میں ایک حسن تھا جو دل کو بہت بھایا تھا اور نگاہیں عقیدت سے ان کے حضور جھک گئی تھیں۔

انہیں دیکھ کر کوئی اندازہ نہ کرسکتا تھا کہ وہ کس بلند مرتبے کے عالمِ دین، وقت کے کتنے بڑے مصنف اور کس پائے کے مورخ ہیں اور ۱۹۴۷ء کے عہد پرآشوب میں ستم زدگان دہلی کا وہ کتنا بڑا سہارا تھے یا قریب کے زمانے میں انہوں نے ہماچل پردیش اور مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کی کتنی عظیم الشان خدمات انجام دی تھیں۔

۱۹۶۲ء میں جب پہلی بار ہندوستان گیا تھا اور دہلی بھی جانا ہوا، گلی قاسم جان میں دفتر جمعیت علماء کے دفتر میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ انہوں نے مجھے دیکھ کر پہچان لیا، بہت شفقت سے پیش آئے۔ جمعیت علما کیا ہے؟ اپنی تالیف مجھے عنایت فرمائی۔ حال ہی میں مجاہدِ ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ کا انتقال ہو چکا تھا۔ طبیعت پر اس کا اثر تھا اور میں نے محسوس کیا کہ وہ کمزور بھی ہیں۔ اس وقت تک مجھے معلوم نہ تھا کہ مولانا سیّد حامد میاںؒ پاکستان تشریف لے آئے ہیں اور لاہور میں جامعہ مَدنیہ قائم کیا ہے، ان کا پتہ میں دہلی سے لے کر آیا تھا۔

دہلی میں حضرت مورخِ ملت مولانا سیّد محمد میاںؒ سے ملاقات ہوئی تو وہ تقریباً ساٹھ برس زندگی کے گزار چکے تھے۔ کمزور تھے لیکن بڑھاپے کے آثار نمایاں نہ ہوئے تھے لیکن زندگی کا آخری دور تو شروع ہو ہی چکا تھا۔ وہ زندگی میں کبھی کسی طویل اور تکلیف دہ بیماری میں مبتلا نہ ہوئے تھے اور نہ کبھی ہسپتال میں داخل ہونے کی نوبت آئی تھی۔ صبح وشام اور موسم کے اثرات سے نزلہ، زکام، کھانسی کی شکایت ضرور پیدا ہوتی رہیں۔ بواسیر کی شکایت انھیں اس کے بعد ہی کے زمانے میں پیدا ہوئی اور چونکہ خونی بواسیر تھی، اس لیے نئے خون کی رفتار تولید اور اخراج میں توازن نہ رہا تھا۔ اس صورتِ حال نے ان کے اعصاب پر بُرا اثر ڈالا تھا اور صحت تباہ ہوگئی تھی۔ ان میں صبر اور برداشت کی قوت انتہا درجے کی تھی، اور تحریر و مطالعہ ہمیشہ اور ہر وقت جاری رہتا تھا۔ اس لیے ان کی خرابی صحت کا نہ کوئی اندازہ کرسکتا تھا اور نہ وہ خود اپنی تکلیف کو بیان فرماتے تھے، اس لئے کوئی دوسرا نہ ان کے دکھ درد سے واقف ہوتا تھا نہ تشویش میں مبتلا ہوتا ہے۔

مولانا محمد میاںؒ کی صحت روز بہ روز گرتی رہی، کمزوری میں لحمہ بہ لحمہ اضافہ ہوتا رہا اور وقت موعود آہستہ آہستہ قریب آتا رہا۔ وہ آیا اور ایسے دبے پاؤں آیا کہ اگر چہ خود انہوں نے اس کی آہٹ کو سن لیا تھا لیکن کوئی اور اسے محسوس نہ کرسکا تھا۔ ۱۵؍رمضان ۱۳۹۵ھ کے آتے آتے بواسیر کی کہنہ شکایت نے شدت اختیار کرلی۔ خون کے نکل جانے سے کمزوری بہت بڑھ گئی۔ ان کی ہمت اور قوتِ برداشت کی داد دیجئے کہ مرادآباد کا ایک ضروری سفر پیش آگیا اور اسی حالت میں وہ مرادآباد تشریف لے گئے، لوٹے تو علالت نے طول کھینچا اور نقاہت انتہا کو پہنچ گئی۔ اب ان میں اٹھنے بیٹھنے کی سکت بھی نہ رہی۔ نقاہت کی وجہ سے آواز سنی جاتی تھی۔ ۱۶؍شوال ۱۳۹۵ھ مطابق ۲۲؍اکتوبر ۱۹۷۵ء کو چھ بجے شام کو وقت موعود آپہنچا اور وہ اپنے نفس مطمئنہ کے ساتھ اپنے رب کے قرب وملاقات کے سفر پر روانہ ہوگئے۔

دہلی میں مسجد عبدالنبی (جہاں جمعیت علمائے ہند کا دفتر ہے) کے قریب دہلی دروازے کے باہر قدیم قبرستان میں تدفین عمل میں آئی اور جوارالٰہی میں اعلیٰ علیین ان کا

مقام ٹھہرا۔ ان کی وفات کے ساتھ ولی اللّٰہی مکتبِ فکر کی دیو بندی شاخ کا ترجمان، نام ور مورخ اور سب سے بڑا مصنف ہم سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گیا۔ اناللہ وناالیہ راجعون

پچھلے صفحات میں حضرت مورخِ ملتؒ کی علمی و تاریخی اور سیاسی خدمات کے تذکرے اور اس کے ساتھ ان کے سوانحِ حیات پر ایک نظر ڈالی جا چکی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ نظر سرسری سے بھی بہت کم ہے اور ہمیں ہرگز یہ دعویٰ نہیں کہ حق کا ایک شمہ بھی ادا ہوا ہے۔ خصوصًا مولانا مرحوم کی سیاسی خدمات کا تذکرہ بالکل تشنہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس گوشے کو میں تحریر میں پیش کرنے کے بجائے قارئینِ کرام کے سامنے سر کی آنکھوں سے دیکھے جانے والے مواد (Material) کی شکل میں پیش کر دینا چاہتا تھا۔ زیرِ نظر تالیف ''مقالاتِ سیاسیہ'' کی پیشکش اسی عزم کی صورت گری ہے۔ یہ حضرت مولف کے قلم سے یادگار سیاسی لٹریچر کی تحقیق کا ایک نمونہ ہے۔ اگر چہ یہ پیشِ نظر منصوبے کا ایک ضروری جزوی کام ہے جو حضرت شیخ الاسلامؒ کی سیاسی ڈائری کے تکملے کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے۔

یہ چھوٹے بڑے گیارہ مستقل کتابچے ہیں جو پہلے شائع ہو چکے ہیں اور پانچ طویل و مختصر مقالے یا سلسلہ مضمون ہیں جو ماہنامہ ''دار العلوم'' دیو بند سے اور سہ روزہ اخبار ''زمزم'' لاہور سے ماخوذ ہو کر مقالاتِ سیاسیہ میں شامل کیے گئے ہیں۔ کئی مقالات کے ساتھ نہایت فکر انگیز ضمیمے شامل ہیں، ان کی تعداد پندرہ ہے، ان کی شمولیت سے مقالات کی علمی و فکری حیثیت میں اضافہ ہوا ہے۔

پیشِ نظر سولہ کتابچے اور مقالے، مضامین و مباحث کی مناسبت سے چھ مجموعوں میں مرتب کیے گئے ہیں اور ہر مجموعے کا ایک عنوان یا نام ہے۔ اس کی تفصیل اس طرح ہے۔

پہلا مجموعہ ''جمعیت علمائے ہند: ایک تاریخی مطالعہ''

اس مجموعے میں مورخِ ملت کے تین کتابچے اور اخبارات سے ماخوذ دو مقالے شامل ہیں جن سے جمعیت علمائے ہند کے قیام کی اہمیت، اس کے نصب العین، اغراض و مقاصد سے لے کر ۱۹۴۷ء میں اس کے بعد کے زمانے میں اس کی امدادی خدمات پر روشنی

پڑتی ہے۔

دوسرا مجموعہ ''وطن۔اس کی اہمیت اور وقت کے تقاضے''

اس میں مورخ ملت کا ایک مستقل رسالہ، ایک مقالہ، ایک استدراک اور تین ضمیمے شامل ہیں۔ جن میں مسلمانوں کے لیے ہندوستان کی وطنی حیثیت اور ہندوستان سے مسلمانوں کی ترک سکونت کے مباحث پر نہایت فکر انگیز بحث کی گئی ہے۔

تیسرا مجموعہ ''ہندوستانی سیاست اور علمائے ہند۔۱۹۵۷ء کے بعد ! ''

یہ حضرت مورخِ ملتؒ کا صرف ایک جامع رسالہ ہے۔لیکن اس کے آخر میں شامل پانچ ضمیموں نے اس کی معنویت اور افادیت میں بہت اضافہ کر دیا ہے۔اس کے مباحث میں کانگریس اور مسلم لیگ کے قیام کے مقاصد و مصالح، تحریکِ شیخ الہندؒ کے ظہور و فروغ اور اس کے نتائج، تقسیمِ ملک اور تبادلہ آبادی کی قیامت خیزیاں اور ہندوستان کے سیکولر نظامِ حکومت کی اہمیت کے مضامین علمائے کرام کی بلند خیالی اور ان کے سیاسی شعور کی جامعیت پر دلیل ہیں۔

چوتھا مجموعہ ''اس مجموعے کا عنوان ''ہندوستانی سیاست اور اس کا تقابلی مطالعہ'' ہے۔اس مجموعے کی تشکیل میں مورخِ ملت کے ایک کتابچے اور دو مقالوں کی کارفرمائی ہے۔ کانگریس، مسلم لیگ اور جمعیت علمائے ہند کے قیام کے پس منظر، مقاصد کے اختلاف اور ان کی تجاویز کی روشنی میں ان کے اندازِ فکر و خدمات اور ان کے فیصلوں اور اعمال کے تجزے اور ان کے رویوں پر بحث کی گئی ہے۔اس مجموعے کی اہمیت اور افادیت کا اندازہ اس کی فہرست مضامین پر ایک نظر ڈالنے ہی سے ہو جاتا ہے۔

پانچواں مجوعہ ''شرکت کانگریس کا جواز۔ تھانوی، عثمانی نقطہ نظر پر تنقید و تبصر کی ایک نظر''

یہ مجموعہ مورخ ملت کے چار فکر انگیز اور مدلل رسائل ''مولانا ظفر احمد تھانویؒ کے فتوے پر تبصرہ،'' مفتی محمد شفیع دیوبندیؒ کے رسالے'' کانگریس اور مسلم لیگ کے متعلق شرعی

فیصلہ'' پر تنقید اور ان کے اپنے فتوے ''شرکت کانگریس اور شریعت غرا'' کا دار الافتاء سے جاری شدہ ایک فتوی ہے۔ گویا مذکورۃ الصدور دونوں رسایل پر حسن محاکمہ کی مثال اور قولِ فیصل ہے۔ یہ محاکمہ مولانا سیّد محمد میاں صاحبؒ کے ذوق تفقہ، سیاسی شعور، مطالعہ ونظر کی وسعت وبلندی اور نکتہ رسی پر دال ہے۔

چھٹا مجموعہ ''مسلم لیگ کے دعاوی اور ان کی حقیقت۔تحریکِ پاکستان کے پس منظر میں''

یہ ایک ہی رسالہ ہے لیکن اس کے ساتھ نہایت معنی خیز طویل ومختصر آٹھ ضمیمے شامل ہیں۔اس رسالے میں مورخِ ملتؒ نے مسلم لیگ کے استقلال مرکز، دوقومی نظریے اور اس کے دوسرے دعاوی پر بحث کی ہے اور تاریخ، حقایق اور مشاہدات وتجربات کی روشنی میں ان کا تار پود بکھیر دیا ہے۔ یہ رسالہ ان کے سیاسی شعور کی پختگی، بلند خیالی کی بڑی دلیل ہے اور مسلمانوں کے لیے اس کا مطالعہ سبق آموز بھی! رسالے کی آخری بحث ''جمعیت علمائے ہند کا شاہ راہِ مستقیم'' جمعیت علمائے ہند کے رہنماؤں کی حقیقت پسندی کا بڑا ثبوت بھی ہے۔

یہاں ان رسایل پر تبصرہ مقصود نہیں، بلکہ ان کی ترتیب وتدوین کی خصوصیات کی طرف توجہ دلانی چاہتا تھا۔ جہاں تک ان رسایل کی تاریخی اہمیت اور افادیت کا تعلق ہے تو بعض رسایل پر مدون کے پیش لفظ، حرفے چند یا عرائض مرتب میں ان پر روشنی ڈالی گئی ہے اور وہ ضرورت کے لیے بس کرتی ہے۔ یہاں ان مطالب کو دہرانے کی ضرورت نہیں !

(حضرت شیخ الاسلام کی سیاسی ڈائری جلد ہفتم، ص:۹ تا۳۶)

استاذی حضرت مولانا سید محمد میاں دیوبندی علیہ الرحمہ سے میرا تعلق

حضرت مولانا قاضی عبدالحفیظ صاحب اطہرؔ مبارک پوری

''حضرت مولانا قاضی اطہر صاحب مبارک پوری دورِ حاضر کے مشہور مصنف اور اسلامی مؤرخ ہیں، خاص کر ہندوستان کی اسلامی تاریخ پر آپ کی رائے سند کا درجہ رکھتی ہے، آپ کی پوشیدہ صلاحیتوں کو اجاگر کرنے میں ''مدرسہ شاہی'' اور اس کے اساتذہ کا کتنا دخل ہے! اس کی ایک جھلک خود حضرت قاضی صاحب کی زبانی درج ذیل مقالہ میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔'' [مرتب]

گرچہ خوردیم نسبتے ست بزرگ
ذرۂ آفتاب تابانیم

جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مرادآباد اپنے مقاصد وخدمات کے اعتبار سے دارالعلوم دیوبند کا مثنیٰ یا اس کا ایک حصہ ہے۔ حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ نے ۱۲۹۶ھ میں شاہی مسجد میں اس کی تاسیس فرما کر، اس کا نام ''مدرسۃ الغرباء قاسم العلوم'' رکھا، جو بعد میں ''جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی'' کے نام سے مشہور ہوا، اس کی تاسیس پر تقریباً ۱۱۶/ سال گزر چکے ہیں۔ اس مدت میں اس سے استفاضہ واستفادہ کرنے والوں کی تعداد بلامبالغہ لاکھوں سے زیادہ ہے، جن میں ساڑھے چار ہزار سے زائد علما وفضلاء ہیں، جن میں محدث، فقیہ، مفتی، مفسر، مصلح، مدرس، مصنف، قائد، وزیر، قاضی، متکلم، سب ہی شامل ہیں

اوران فرزندانِ جامعہ قاسمیہ نے اپنے اپنے دور میں دینی علوم وفنون اور مسلمانوں کی بیش بہا خدمات انجام دی ہیں۔

راقم الحروف بھی اسی درس گاہ اور تربیت گاہ کا فیض یافتہ ہے اور اس کی علمی وفکری نشو ونما میں یہاں کے اساتذہ وشیوخ کی خصوصی عنایت وتوجہ کا بہت بڑا حصہ ہے، یہیں سے میرے حوصلے کو بڑھاوا ملا، میری ہمت افزائی ہوئی اور یہاں کے شیوخ واساتذہ کی شفقت و محبت نے ذرے کو آفتاب کی روشنی دی اور ان بزرگوں کی نسبت نے بڑا کام کیا۔

جامعہ قاسمیہ کے اساتذہ میں حضرت مولانا سید فخر الدین صاحبؒ، حضرت مولانا محمد میاں صاحبؒ، حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحبؒ اور حضرت مولانا عبد الحق صاحب مدنی وغیرہ رحمہم اللہ سے میں نے خصوصی فیض پایا ہے اور ان حضرات کی خورد نوازی اور شفقت و محبت نے آگے بڑھنے کا حوصلہ دیا ہے۔ ان تمام حضرات کا اور دیگر علمی ودینی محسنوں اور مربیوں کا علمی ودینی شکریہ اور ذکرِ خیر اور ان کے حق میں مغفرت لازم ہے، اپنے اساتذہ کا ذکر خیر اور استفاضہ کا اظہار اور ان کے حق میں دعائے خیر علم کی زیادتی کا باعث ہے، اور ان کی طرف سے غفلت اور اس کا اخفا، احسان فراموشی اور کفرانِ نعمت ہے۔ اسلاف نے خاص طور سے اپنے تلامذہ کو اس کی تاکید کی ہے۔ اندلس کے مشہور محدث امام ابو محمد رزق اللہ بن عبد الوہاب تمیمیؒ نے ایک مرتبہ اپنے شاگردوں کو مخاطب کر کے فرمایا:

يقبح بكم أن تستفيدوا منا، ثم تذكرونا ولاتترحموا علينا.

تمہارے حق میں یہ برا ہے کہ ہم سے علمی ودینی فائدہ حاصل کرتے ہو اور ہم کو یاد کر کے ہمارے حق میں دعائے خیر نہیں کرتے۔

وہ حضرات اپنے شاگردوں کے حق میں بھی دعائے خیر کیا کرتے تھے۔ امام اسحٰق بن راہویہؒ کے صاحبزادے محمد بن اسحٰق نے اپنے والد کا بیان نقل کیا ہے:

قل ليلة إلا وأنا أدعو لمن كتب عنا وكتبنا عنه.

[برنامج الشيخ الرعيني، ص:٥]

تقریباً ہر رات میں ان لوگوں کے لیے دعا کرتا ہوں، جنھوں نے ہم سے پڑھا اور ہم نے جن سے پڑھا ہے۔

میں اس وقت مدرسہ شاہی کے اساتذہ میں سے حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب دیوبندیؒ (ولادت: ۱۲/رجب ۱۳۲۱ھ، ۴/اکتوبر ۱۹۰۳ء ☆ وفات: چہارشنبہ، ۱۶/شوال ۱۳۹۵ھ، ۲۴/اکتوبر ۱۹۷۵ء) کا ذکر خیر کررہا ہوں، جن کی خصوصی شفقت ومحبت اور توجہ نے میرے علم وتحقیق اور تصنیف وتالیف کے ذوق کو جلا بخشی ہے اور میری علمی زندگی پر ان کا احسان عظیم ہے۔

۱۳۵۷ھ میں جمعیۃ الطلبہ مدرسہ احیاء العلوم مبارک پور کے اجلاس کی صدارت کے لیے مولانا مرحوم تشریف لائے تھے، اس وقت میں غالباً ہدایہ وغیرہ پڑھ رہا تھا، مولانا کی زیارت کا یہ پہلا موقع تھا، میرے دوست مولانا محمد عثمان صاحب نے مولانا کو میری ایک نظم سنائی، جس کو مولانا نے بہت پسند فرمایا اور رسالہ ''قائد'' کے سالگرہ نمبر ۱۳۵۸ھ میں ''رحمۃ للعالمین ﷺ کا انقلابی کارنامہ'' کے عنوان سے شائع فرمایا۔ اس کے بعد میں یہاں سے مضامین اور نظمیں بھیجتا رہا اور مولانا شائع فرماتے رہے۔ مولانا کی اس عنایت اور توجہ سے میری ہمت وحوصلے میں بری توانائی پیدا ہوگئی اور قلم مضمون نگاری میں اور دماغ شاعری میں رواں دواں ہوگیا۔ مولانا مرحوم اس رسالہ کے قائد التحریر تھے، ان کی نگاہ شفقت میں میرے مضامین بہت بلند پایہ ہوتے تھے، اپنے خطوط میں خوب خوب تشجیع وتشویق فرماتے تھے۔ ایک مرتبہ مجھ کو ''مولانا قاضی عبدالحفیظ صاحب اطہر مبارک پوری فاضل دیوبند'' کے الفاظ سے نواز کر لکھا کہ آپ کے مضامین اعلیٰ درجہ کے اور معیاری ہوتے ہیں، زیادہ تعریف اس لیے نہیں کی جاتی کہ کہیں آپ رسالہ ''قائد'' کو ان کے لیے نااہل نہ سمجھنے لگیں۔ میں نے نہایت ادب واحترام سے جواب دیا کہ میں طالب علم اور ہدایہ وغیرہ پڑھتا ہوں۔

میں پہلی بار ۱۳۵۴ھ میں جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی گیا، مگر چند ماہ کے بعد واپس چلا آیا تھا۔ اس وقت میں نے مولانا مرحوم سے مقامات زمخشری اور دیوان حماسہ کا پہلا باب

پڑھا تھا، پھر شوال ۱۳۵۸ھ میں دوبارہ گیا، یہ میری تعلیم کا آخری سال تھا، مولانا سے سنن ترمذی وغیرہ پڑھی۔ ان ہی ایام میں ایک مرتبہ میں نے مولانا سے امام قاضی ابو یوسفؒ کی کتاب ''الخراج'' کے مطالعہ کی خواہش ظاہر کی، مولانا نے بڑی محبت وشفقت کا اظہار فرماتے ہوئے کتاب عنایت فرمائی اور چند دن کے بعد میں نے کتاب کے اوپر عمدہ کاغذ کا غلاف چڑھا کر اور کتاب کا نام، مصنف کا نام اور مولانا مرحوم کا نام عربی رسم الخط میں جلی اور خوشخط لکھ کر کتاب واپس کی تو مولانا نے ہاتھ میں لیتے ہی فرمایا کہ میں نے سمجھا کہ آپ نے یہ کتاب لکھی ہے۔ میں نے نہایت ادب سے عرض کیا کہ حضرت! دعا فرمائیں۔

اور جب اس واقعہ کے تقریباً ۲۰؍سال کے بعد ۱۳۷۷ھ میں میری کتاب ''رجال السند والہند'' بمبئ میں چھپی اور میں نے مولانا مرحوم کی خدمت میں بھیجی تو اس واقعہ کی طرف اشارہ کر کے لکھا کہ یہ آپ کی دعا اور توجہ کی برکت ہے کہ میں اس لائق ہوا۔ واقعہ یہ ہے کہ تصنیف وتالیف میں مولانا مرحوم میرے اولین محسن ومربی ہیں، اگر ان کی توجہ نہ ہوتی اور رسالہ ''قائد'' میں میرے مضامین شائع نہ ہوتے تو شاید میں تصنیف وتالیف کے لائق نہ ہوتا۔

میں نے اسی زمانے میں حضرات اصحاب صفہ رضی اللہ عنہم کے حالات واسماء میں تقریباً ڈھائی سو اشعار پر مشتمل ایک نظم لکھی تھی، جس کو مولانا کی خدمت میں پیش کیا اور مولانا نے اس کی کور درست کرنے کے لیے حضرت مولانا اعزاز علی صاحبؒ کے پاس بھیج دیا اور تھوڑے عرصہ کے بعد وہ نظم مجھے عنایت فرمادی، اور بعد میں بمبئ کے ایک مشہور تاجر کتب کو میں نے دیا؛ مگر افسوس کہ اس کا پتہ اب تک نہ چل سکا، خاصے کی چیز تھی۔

یہ زمانہ بڑا پرُ آشوب تھا اور ہندوستان کی آزادی کی منزل قریب آرہی تھی، ان ہی ایام میں مولانا مرحوم نے یوپی کے مشرقی اضلاع میں جمعیۃ علما کا تنظیمی دورہ فرمایا، تو اعظم گڑھ، بنارس، غازی پور، بلیا اور گورکھپور کے سفر میں راقم خادم کی حیثیت سے ساتھ ساتھ رہا، مگر مولانا کی شفقت ومحبت نے خدمت کا موقع ہی نہیں دیا اور پورے سفر میں اپنے سے

زیادہ مجھے آرام پہنچایا۔

فراغت کے بعد میں نے مدرسہ احیاء العلوم مبارک پور میں شوال ۱۳۵۹ھ سے ۱۳۶۴ھ (۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۴ء) تک مدرسی کی، اس کے بعد نومبر ۱۹۴۴ء میں مرکز تنظیم اہل سنت امرتسر میں ملازمت کی اور ۱۹۴۵ء میں وہاں سے لاہور گیا اور زمزم کمپنی کے زیر اہتمام ساڑھے نوسو صفحات میں ''منتخب التفاسیر'' مولانا محمد عثمان فارقلیط کی زیر نگرانی لکھنا شروع کی، اس کے بعد جنوری ۱۹۴۷ء میں روز نامہ ''زمزم'' لاہور میں شریک ادارت ہوا اور مولانا فارقلیط صاحب سے صحافت سیکھی۔ تقسیم ملک کے بعد ایک سال ہفتہ وار ''انصار'' بہرائچ کی ادارت کی، اس کے بعد ۱۹۴۸ء میں جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں تدریسی خدمت انجام دی، پھر یہاں سے ترک تعلق کر کے نومبر ۱۹۴۹ء میں بمبئی پہنچا۔

۱۳۵۹ھ سے ۱۳۶۸ھ تک کا یہ نو دس سالہ دور میرے حق میں بڑے ابتلا کا تھا، تقریباً یہ پورا دور ''صبر ایوب اور گریۂ یعقوب'' میں گزرا ہے اور آخر میں مولانا مرحوم کی توجہ سے میرا قیام بمبئی میں ہوا، جہاں بڑے سکون واطمینان اور شان کے ساتھ رہ کر علمی کام کیا۔ صورت یہ ہوئی کہ ہر طرف سے مایوسی کے بعد میں نے اپنے ایک نادیدہ بزرگ اور قدر دان جناب حکیم اعظمی صاحب مرحوم ناظم جمعیۃ علما صوبہ بمبئی کو لکھا کہ بمبئی میں کوئی مناسب جگہ ہو تو مجھے مطلع کریں۔ (مولانا حکیم فصیح اللہ خاں صاحب جمید پور ندوہ سرائے ضلع اعظم گڑھ کے رہنے والے تھے اور بمبئی میں مستقل طور سے قیام کرتے تھے) میرا یہ خط جمعیہ علماء کے دفتر میں ایسے موقع پر پہنچا، جب کہ مولانا سید محمد میاں صاحبؒ، مولانا حفظ الرحمٰنؒ اور مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحبؒ حج کے لیے تشریف لے جا رہے تھے، ان حضرات نے حکیم اعظمی صاحب سے میرے بارے میں سفارش کی اور مجھے بمبئی بلا لینے پر زور دیا، خاص طور سے مولانا سید محمد میاں صاحب نے۔ اس کے بعد حکیم اعظمی صاحب نے مجھے بلا لیا اور میرے طائر علم کے بازو پھیلنے لگے۔ یہاں نومبر ۱۹۴۹ء میں آنے کے بعد سب سے پہلے میں نے اخبار ''زمزم'' لاہور کے اپنے اخلاقی اور دینی مضامین کو جمع کر کے ''حیات جمیلہ'' کے نام سے

چھپوایا، جس کا مقدمہ مولانا مرحوم نے دسمبر ۱۹۴۹ء میں لکھا۔ مولانا اس وقت جمعیۃ علماء ہند کے ناظم کی حیثیت سے بمبئی تشریف لے گئے تھے۔ یہ مقدمہ خورد نوازی اور خصوصی عنایت کا مظہر ہے۔ ۱۵ر جون ۱۹۵۰ء کو جمعیۃ علماء صوبہ بمبئی کے اراکین و متعلقین کی ایک کمپنی کی طرف سے روزنامہ ''جمہوریت'' جاری ہوا۔ مولانا حامد الانصاری غازی صاحب کو اس کا ایڈیٹر اور راقم کو نائب ایڈیٹر بنایا گیا؛ مگر ادارۂ تحریر کی طرف سے میرے خلاف ایسے حالات پیدا کیے گئے کہ اخبار جمہوریت میں میرا رہنا مشکل ہو گیا، میں کئی ماہ تک ذہنی پریشانیوں میں مبتلا رہا۔ میں نے مولانا مرحوم کو لکھا ہے کہ آپ مجھے دہلی بلالیں، مگر چونکہ اس وقت وہاں کوئی مناسب جگہ نہیں تھی، اس لیے مولانا نے سخت تاکید کے ساتھ لکھا کہ حالات کا مقابلہ کر کے آپ کو بمبئی ہی میں رہنا ہے اور میں حسب الحکم ۲۳ر فروری ۱۹۵۱ء کو روزنامہ ''انقلاب''، بمبئی سے منسلک ہو گیا، جس سے چالیس سال سے زائد مدت تک منسلک رہ کر اِسی سال اپریل ۱۹۹۱ء میں علاحدگی اختیار کر لی ہے۔ قیام بمبئی کا پورا دور میرے علمی و تحقیقی کاموں کا دورِ شباب ہے۔

دارالعلوم دیوبند کے اجلاس صد سالہ سے پہلے مجلس شوریٰ نے طے کیا کہ دارالعلوم کے ترجمان کی حیثیت سے ایک پندرہ روزہ اخبار نکالا جائے، ادارت کے لیے راقم کا نام تجویز ہوا، حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ نے اہتمام کی طرف سے مجھے اس کی باقاعدہ اطلاع دی۔ حضرت مولانا محمد میاں صاحبؒ کی خواہش تھی کہ میں دارالعلوم میں آجاؤں، مگر میرے حالات اس سے مانع تھے۔ میں ان ہی ایام میں بمبئی سے دہلی آیا اور مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا۔ مولانا نے پہلی فرصت میں دریافت فرمایا: کہاں سے آرہے ہو؟ دیوبند یا بمبئی سے؟ میں نے عرض کیا: بمبئی سے حاضری ہو رہی ہے، پھر میں نے اپنا عذر بیان کر کے کہا کہ دارالعلوم میں فلاں صاحب ہیں، اخبار کا کام ان کے سپرد کیا جاسکتا ہے، مولانا نے فرمایا کہ ان کی اردو زبان غیر معیاری ہے۔

مولانا مرحوم سے آخری ملاقات وصال سے تقریباً دو ماہ پہلے شعبان ۱۳۹۵ھ میں

ہوئی۔ میں بمبئی سے دہلی آیا اور ملاقات کے لیے مکان پر پہنچا، ان کو بواسیر کے مرض نے کافی نحیف اور کمزور کر دیا تھا، کھانا کھلایا، گھر میں نماز پڑھی، مجھ کو آگے بڑھایا۔ میں نے عرض کیا: حضرت! کیا اس حال میں تصنیف و تالیف کا مشغلہ جاری ہے؟ فرمایا: ہاں! تین کتابوں کی کتابت ہو رہی ہے۔

حضرت مولانا مرحوم کی اس بے پناہ شفقت اور خوردنوازی کے باوجود میں ان سے جتنا ڈرتا تھا، اپنے کسی استاذ سے اتنا نہیں ڈرتا تھا، ان کا رعب مجھ پر چھایا رہتا تھا، کھل کر بات نہیں کر سکتا تھا، بعض اوقات بھرے مجمع میں مولانا مجھے سخت انداز میں ڈانٹ دیا کرتے تھے اور میں خاموشی سے سن لیتا تھا اور معلوم ہوجاتا کہ یہ عتاب بھی اظہار تعلق کا ایک ذریعہ ہے۔

مولانا اپنے معاصرین میں کئی باتوں میں ممتاز تھے، زہد و تقویٰ، استغنا و بے نیازی، عزت نفس و خودداری کے ساتھ پوری زندگی تدریس و تعلیم، تصنیف و تالیف، علمی و دینی خدمات اور ملی و قومی کاموں میں بسر کی۔ مولانا مرحوم محدث، فقیہ، مفتی اور مصنف سب کچھ تھے، ان کے مختلف الجہات علمی و دینی کارنامے خصوصاً تصنیفی و تالیفی خدمات ایک اکیڈمی کی کارکردگی کے برابر ہیں۔

آخر میں راقم کے نام مولانا مرحوم کے چند مکاتیب درج کیے جاتے ہیں، جن کی سطر سطر سے مولانا کی خوردنوازی، عجز و انکساری اور علم دوستی کا پتہ چلتا ہے۔

خط نمبر (۱)

جمعیۃ علمائے ہند دہلی، ۵؍ربیع الثانی ۱۳۷۸ھ، ۱۹؍اکتوبر ۱۹۶۸ء

محترم قاضی صاحب دام لطفکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ   مزاج گرامی!

گرامی نامہ سے کئی روز ہوئے، مشرف ہو چکا تھا، مگر کتابیں آج پہنچیں، (۱) مبارکباد قبول فرمائیے، اللہ تعالیٰ آپ کی اس خدمت کو قبول فرمائے اور یہ خود آپ کے لیے بھی ہر طرح نافع ہو اور اہل علم کے لیے بھی۔ آمین

مولانا فارقلیط صاحب کے نام کی کتاب ان کی خدمت میں بھیج دی ہے، اور اگر چہ وہ خود آپ سے قلبی تعلق رکھتے ہیں؛ مگر پھر بھی احقر نے بہتر تقریظ کی سفارش کردی ہے۔ ان کی تقریظ اسی سنڈے ایڈیشن میں شائع ہوجائے گی، جو ۲۶ر یا ۲۷ر اکتوبر کو شائع ہوگا، اس کے بعد احقر بھی اتباع واقتدا کی کوشش کرے گا۔ مکرر مبارکباد عرض ہے، احباب و رفقائے حاضرین کی خدمت میں سلام عرض ہے۔

نیازمند: محمد میاں

(۱) رجال السند والہند، طبع بمبئی کے نسخے۔

خط نمبر (۲)

دہلی، ۲۸ر جمادی الثانی ۱۳۸۳ھ، ۱۶ر نومبر ۱۹۶۳ء

مولانا قاضی اطہر مبارک پوری

محترم مولانا صاحب! دام لطفکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ مزاج گرامی!

خدا کرے آپ بخیریت ہوں، عرصہ ہوگیا، ملاقات نہیں ہوئی، اس وقت ایک تکلیف دے رہا ہوں۔ احقر مدرسہ شاہی مرادآباد کے سالانہ جلسہ میں مرادآباد گیا تھا، فتح پوری لائبریری سے شیخ جلال الدین سیوطیؒ کی تصنیف ''تدریب الراوی'' مستعار لے رکھی تھی، واپسی کے وقت راستہ میں اس کا مطالعہ کرتا رہا، کئی اقتباسات بھی نقل کیے، جب شاہدرہ سے گاڑی گزری تو سامان درست کرنے کے لیے کتاب اوپر تختہ پر رکھ دی، پھر سامان کے خیال میں ایسا محو ہوا کہ کتاب یاد نہ رہی، جب مکان پر پہنچ کر پھر باقی حصے کے مطالعہ کا خیال آیا تو اپنی اس غلطی کا احساس ہوا اور سخت صدمہ ہوا، اب یہ کتاب لائبریری کو دینی ہے، کتاب کی قیمت سے لائبریری والے مطمئن ہو سکتے ہیں؛ مگر خود احقر کو اطمینان اسی صورت میں ہوگا کہ کتاب ہی دی جائے۔ مہربانی فرما کر آپ یہ کتاب تلاش کریں اور بہتر تو یہ ہے کہ دو نسخے احقر کے نام وی، پی کردیں۔ احقر اس لائبریری کا چیئرمین بھی ہے، اس

لیے اور بھی زیادہ ذمہ داری کا احساس ہے اور ناکامی میں بہت ندامت ہوگی۔ متن امام نووی کا ہے، اس پر شرح شیخ جلال الدینؒ نے لکھی ہے، جس کا نام ''تدریب الراوی'' ہے۔

خالد میاں سلمہ سے آپ واقف ہیں، ان کو جرمنی پڑھنے کا شوق ہوا، تین سال جرمنی زبان پڑھی، یہاں سفارت خانہ میں اس کی کلاس ہوتی ہے، اس سال ان کو جرمنی جانے کا اسکالرشپ مل گیا؛ لہٰذا ۱۵/نومبر کو وہ جرمنی روانہ ہوگئے؛ مگر نہ ہوائی جہاز سے، نہ بحری جہاز سے؛ بلکہ بس کے ذریعہ، جو غالباً لندن سے آئی ہوئی تھی، آج کل ایران میں ہوں گے، ایران سے ترکی، پھر بلغاریہ وغیرہ۔ اللہ تعالیٰ خیریت سے پہنچائے۔ دماغ پر اس کا اثر بھی ہے، باقی اور کیا عرض کروں، جواب کا منتظر۔

نیازمند محتاجِ دعا، خادم قدیم

محمد میاں عفی عنہ

خط نمبر (۳)

الجمعیۃ بکڈپو قاسم جان اسٹریٹ دہلی، ۷/ذی قعدہ ۱۳۹۲ھ، ۱۴/دسمبر ۱۹۷۲ء

محترم مولانا زادت معالیکم دام لطفکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ مزاج گرامی!

خدا کرے مزاج گرامی بعافیت ہوں، ابھی ''صدق جدید'' مورخہ ۸/دسمبر میں فتاوی عزیزی (۱) قلمی کے متعلق آپ کا بیان نظر نواز ہوا، مختصر یہ کہ الجمعیۃ بکڈپو اس کو طبع کرائے تو آپ کی شرائط کیا ہوں گی؟ جواب سے جلد مطلع فرمائیے۔

والسلام نیازمند: محمد میاں

(۱) فتاوی عزیزیہ کا کچھ حصہ میرے نانیہال میں تھا، مولانا مفتی محمد ابراہیم صاحب بنارسی کے کتب خانہ میں، اس کا ایک کامل ومکمل نسخہ نہایت خوشخط ہے، اس کی اشاعت کے لیے ''صدق جدید'' میں مراسلہ شائع ہوا تھا، بعد والے مکتوب میں مولانا ابراہیم صاحب کے صاحبزادے مولانا محمد اسحٰق صاحب بنارسی کی کتاب ''کلمات اکابر'' کا ذکر ہے اور یہ کہ وہ اور میں فتاویٰ عزیزی کے نسخوں کا مقابلہ کریں۔

خط نمبر (۴)

الجمعیۃ بکڈ پو قاسم جان اسٹریٹ دہلی،

۲۲؍ذی قعدہ ۱۳۹۲ھ، ۲۹؍دسمبر ۱۹۷۲ء

محترم مولانا دام لطفکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ مزاج گرامی!

خلاف توقع اپنے عریضے کے جواب سے بہت جلد مشرف ہوگیا، جزاکم اللہ۔ وہ صاحب ذوق ذی استعداد فاضل ہیں، تعجب ہے انھوں نے اقوال اکابر اور افعال زریں شائع کیے اور اس متاع گراں مایہ کو طشت از بام نہیں فرمایا، غالباً اس لیے کہ گراں مایہ ہے؛ مگر متاع علم تو انفاق ہی کے لیے ہے، اس میں تقتیر واحتکار ناجائز۔ یہ حکم آپ پر بھی نافذ ہوتا ہے؛ لہٰذا آپ دونوں کا فرض ہے کہ پہلی فرصت میں ان کی اشاعت کا اہتمام کریں، دونوں نسخوں کا مقابلہ کیا جائے، فرق ہو تو ظاہر کردیا جائے، یہ آپ دونوں کی بڑی خدمت ہوگی، اتنا تعاون احقر بھی کرے گا کہ الجمعیۃ بکڈ پو کے ارباب بسط وکشاد کو متوجہ کرے گا کہ معقول تعداد میں اس کے نسخے خرید لیں اور روزنامہ الجمعیۃ میں اس کی تشہیر کریں۔

کنونشن میں حاضری سے معذور رہا، زیادہ تر اپنے عوارض کے باعث کہ چلنا پھرنا اور سفر کرنا بہت مشکل ہوگیا اور کچھ اس لیے کہ کنونشن کا منشا مشتبہ رہا؛ لہٰذا یکسوئی کو بہتر سمجھا۔

والسلام نیازمند محتاجِ دعا: محمد میاں

خط نمبر (۵)

۲۰؍ربیع الاول ۱۳۹۳ھ، ۲۴؍اپریل ۱۹۷۳ء

محترم مولانا مبارک پوری صاحب دام لطفکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ مزاج گرامی!

رجسٹرڈ پارسل کے ذریعہ ایک کتاب ''سیرت مبارکہ'' ارسال خدمت ہے، اس کو

ملاحظہ فرمائیں، پھر تنقید تحریر فرما کر اپنے اخبار میں شائع کریں یا تقریظ، اس کو آپ تبصرہ کا عنوان بھی دے سکتے ہیں، پھر جس پرچے میں شائع ہو، احقر کے نام ارسال فرمادیں تو نوازش ہوگی، ہمرشتہ اشتہار بھی ملاحظہ فرمالیں، اس سے تبصرہ کرنے میں سہولت ہوگی، کتاب کا بالاستیعاب مطالعہ کرنا نہیں پڑے گا، اگرچہ درخواست یہ ہے کہ تبصرہ سے پہلے یا تبصرہ شائع کرنے کے بعد بالاستیعاب مطالعہ ضرور فرمائیں اور غلطیوں سے احقر کو متنبہ فرمائیں۔

دوسری گزارش یہ ہے کہ ہمرشتہ اشتہار اخبار ''انقلاب'' میں بااجرت شائع کرادیں، دو مکمل کالموں میں یہ اشتہار آجائے گا، اجرت (بشرط رعایت) سے پہلے مطلع فرمائیں تو احقر بذریعہ منی آرڈر بھیج دے یا بعد کو مطلع فرمائیں، احقر بھیج دے گا۔ الجمعیۃ میں یہ اشتہار دو کالموں میں شائع ہوا ہے، بشارت عظمیٰ کا اضافہ احقر کے قلم سے کیا ہے، وہ بھی شائع ہوگا۔ خیریت اور حالات سے مطلع فرما کر ممنون فرمائیں۔

والسلام نیازمند محتاج دعا: محمد میاں

خط نمبر (۶)

دہلی کتابستان گلی قاسم جان

۲۴ ؍ربیع الاول ۱۳۹۳ھ، ۲۸ ؍اپریل ۱۹۷۳ء

محترم مولانا مبارک پوری صاحب دام لطفکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ مزاج گرامی!

''سیرت مبارکہ'' کا پارسل پہنچ چکا ہوگا، تبصرہ فرمایئے، عریضہ کے ساتھ اشتہار بھی بھیجا ہے کہ اخبار میں شائع کرادیجیے، جو اجرت ہوگی احقر ادا کرے گا، رعایت کی ضرور رعایت رہے، اس اشتہار کے آخر میں مدارس عربیہ کے لیے اعلان ہے کہ صرف محصول ڈاک بھیجنے پر ان کو کتاب مفت دی جائے گی، اگر ابھی اشتہار شائع نہ ہوا تو یہ حصہ خارج کردیجیے؛ کیوں کہ فرمائشیں اتنی آگئی ہیں کہ تعمیل کی گنجائش نہیں رہی، فرمائشیں مدارس عربیہ

کی آئی ہیں، اس رعایت کی بنا پر، ورنہ اصل کتاب کے آرڈر ابھی پانچ بھی نہیں آئے۔
بہر حال یہ حصہ ضرور خارج فرمادیجیے۔

والسلام نیازمند محتاج دعا: محمد میاں

خط نمبر (۷)

۱۹؍رجب ۱۳۹۳ھ، ۱۹؍اگست ۱۹۷۳ء

محترم مولانا دام لطفکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ مزاج گرامی!

عزیز نامہ باعث مسرت ہوا اور تبصرہ مستوجب شکریہ، جزاکم اللہ، دیر آید درست آید، مگر آپ نے استاذ محترم لکھ کر تبصرہ کا وزن کم کردیا، استاذ کی تصنیف کی تو تعریف کی ہی جاتی ہے، بہر حال آپ کا تبصرہ باوزن ہے، پھر آپ نے خصوصیات تحریر فرماکر اشتہار بھی مفت میں شائع کردیا اور اس کا کوئی... مطالبہ ہوسکتا ہے تو مطلع فرمایئے تاکہ پیش کیا جائے۔

اچھا آپ کا بمبئی سے دل گھبرا گیا؟ اب کیا ارادہ ہے؟ وطن میں دل لگتا ہے تو کیا پارچہ بافی کا کارخانہ قائم کریں گے یا مدرسہ احیاء العلوم میں تعلیمی اور تدریسی خدمت انجام دیں گے؟ اگر ایسا ہوجائے تو بمبئی سے دل گھبرا جانا مبارک! مگر شاید یہ بھی نہ ہوسکے تو پھر کیا؟ صرف مطالعہ کریں گے یا مطالعہ کا کوئی حاصل بھی پیش کرسکیں گے؟

احقر کے ذہن میں آپ کے مناسب چند کام ہیں:

(۱) انسائیکلوپیڈیا آف انڈیا، بہت بڑا کام ہے اور اگر وسائل مہیا ہوں تو حکومت سے اس میں امداد بھی مل سکتی ہے؛ مگر عربی اور فارسی کی واقفیت سے کام نہیں چلے گا، ہندی سے بھی واقفیت ہونی چاہیے اور انگریزی سے بھی؛ مگر کام بہت بڑا ہوگا، ہندوستان کی تمام اہم لائبریریوں کو کھنگھالنا پڑے گا۔

(۲) اگر یہ نہ ہو تو دوسرا کام ہے: ''تاریخ مذاہب ہند'' یہ پہلے کے مقابلے میں

آسان ہے، ابوریحان بیرونی کی ''الہند'' سے بہت مدد مل سکتی ہے؛ مگر کم از کم ہندی کی واقفیت بھی اس میں ضروری ہے۔

(۳) تیسرا کام جو اِن کے مقابلے میں آسان ہے، وہ ''تاریخ علماء اور مشائخ ہند'' اس میں بہت مواد آپ کو مل سکتا ہے، مگر یہ استیعاباً ہونا چاہیے، اس میں اتنا اضافہ اور کرلیں اور ان کے سیاسی وسماجی ماحول یعنی ''تاریخ علماء ومشائخِ ہند، ان کے سیاسی اور معاشرتی ماحول اور خدمات''، ''علمائے ہند کا شاندار ماضی'' اسی انداز پر مرتب کیا گیا ہے؛ مگر وہ صرف سلسلۂ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی حدود میں محدود ہے۔ وہ آپ کو نمونہ کا کام دے سکتا ہے؛ مگر مبارکپور میں یہ بھی نہیں ہوسکتا ہے، اس کے لیے بھی آپ کو قدیم کتب خانوں سے استفادے کے لیے سفر کرنے پڑیں گے، تب وہ قابل قدر چیز ہوگی۔ تینوں کام کے لیے جانفشانی اور ہمت مردانہ کی ضرورت ہے، کیا بمبئی میں کوئی گانٹھ کا پورا مل سکتا ہے؟

تقریباً ایک ماہ ہوا، بواسیر کا شدید دورہ ہوا، کم از کم دو بوتل خون نکل گیا، چلنا پھرنا مشکل ہوگیا، مگر الحمد للہ قلم چلتا رہا، چندروز کے علاوہ سلسلۂ درس بھی جاری ہے۔ الحمد للہ، بخاری شریف کی پریشانی ہے۔ والسلام

قدیم دعا گو محتاج دعا: محمد میاں

خط نمبر (۸)

۱۹۷۴ء، کتابستان گلی قاسم جان دہلی

عزیز محترم مولانا اطہر

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ مزاج گرامی!

''صدق جدید'' مورخہ ۲۵/ نومبر، آپ کی جدید تصنیف ''خلافت راشدہ اور ہندوستان'' پر تبصرہ پڑھا، مسرت ہوئی، مگر یہ بھی خیال ہوا کہ آپ پر اخفائے واردات کا جرمانہ کیا جائے، آپ اپنی ہر ایک تصنیف احقر کے نام بھیجا کرتے ہیں، یہ تصنیف آپ نے

نہیں بھیجی، تکلیف کی ضرورت نہیں ہے، وی، پی کر دیجیے، نوازش ہوگی۔
خدا کرے آپ بمبئی ہوں اور یہاں بھی قیام طے کر رکھا ہو۔ والسلام
نیازمند محتاج دعا: محمد میاں

خط نمبر (۹)

۲۹؍ ربیع الثانی ۱۳۹۴ھ، ۲۲؍ مئی ۱۹۷۴ء

محترم قاضی صاحب دام لطفکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ مزاج گرامی!

گرامی نامہ مورخہ ۲۴؍ ربیع الاول نے جس ہدیہ مبارکہ کی بشارت دی تھی، ''خلافت راشدہ اور ہندوستان'' اس سے مشرف ہوا۔ پھر دفعتاً ایک اور علمی ہدیہ نے شاد کام کیا، یعنی ''جواہر الاصول فی علم حدیث الرسول'' دونوں ہدیے بیش بہا، گرانقدر، مستحق صد شکریہ و ہزار تحسین وآفریں۔ احقر فرصت کا منتظر ہے کہ دونوں کا از اول تا آخر مطالعہ کرلے اور پوری طرح مستفیض ہو۔ آج کل کچھ ایسے پیچ در پیچ مشاغل درپیش ہیں کہ یہ عریضہ بھی کئی روز کے وقفہ کے بعد لکھ سکا۔ بہرحال ان ہدیوں پر آپ کا بھی اور صاحبزادۂ عزیز کا بھی بہت بہت شکریہ۔ جزاکم اللہ تعالیٰ

نیازمند محتاج دعا: محمد میاں

خط نمبر (۱۰)

رجب ۱۳۹۴ھ، ۲۶؍ جولائی ۱۹۷۴ء

محترم مولانا زادت مزایاکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ مزاج گرامی!

گرامی نامہ مورخہ ۸؍ جولائی میں جو بشارت دی گئی تھی، بفضلہٖ تعالیٰ وہ پوری ہوگئی،

عزیزم ظفر مسعود صاحب نے تینوں کتابیں بھیج دیں اور احقر کو موصول ہوگئیں، ''اسلامی ہند کی عظمت رفتہ''، ''ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں'' اور ''عرب و ہند عہد رسالت میں''۔ کیا ہدیہ میں صرف جزاک اللہ کافی ہے، صرف جزاک اللہ پر قناعت مناسب نہیں، اجازت دیجیے کہ قیمت پیش کرسکوں۔

آپ کو شکایت تھی کہ آپ کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھا گیا، یہ شکایت شاید ہلکی ہوگئی ہو، آپ کو ممکن ہو اس کا احساس نہ ہو، مگر مجھے تو بڑی خوشی ہوئی کہ ڈاکٹر محمد اسلم صاحب صدر شعبۂ تاریخ پنجاب یونیورسٹی کا جو مضمون ''عربوں کے عہد میں سندھ میں علم و ادب'' ماہ جولائی کے ''برہان'' میں شائع ہوا، ڈاکٹر صاحب نے اس میں آپ کی تصنیف سے استفادہ کیا ہے اور علامہ بلاذری، ابن اثیر اور ابن بطوطہ جیسے مشاہیر کے ناموں کے ساتھ آپ کا نام نامی بھی حوالوں میں درج کیا ہے۔ اللھم زد فزد۔

''قدرِ گوہر شاہ داند یا بداند جوہری''

خدا کرے مزاج گرامی بعافیت ہو، تینوں کتابیں محفوظ ہیں، اب ان سے استفادہ کے لیے فرصت کا انتظار ہے۔

نیازمند محتاج دعا: محمد میاں

خط نمبر (۱۱)

۱۱/ جمادی الثانیہ ۱۳۹۴ھ، ۲۰/ جولائی ۱۹۷۴ء

محترم مولانا دام لطفکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ مزاج گرامی!

احقر پر ہدیہ علمی ''خلافت راشدہ اور ہندوستان'' کا شکریہ واجب تھا۔ ''شجرۂ مبارکہ'' نے دوسرا شکریہ لازم اور واجب بلکہ فرض کردیا۔ ''خلافت راشدہ اور ہندوستان'' کو احقر نے از اول تا آخر پڑھا، بہت محظوظ ہوا، اور اس نے اس سلسلہ کی باقی تصنیفات ''عرب

وہند عہد رسالت میں''، ''ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں''، ''اسلامی ہند کی عظمت رفتہ'' کے مطالعہ کا بھی شوق پیدا کر دیا۔ اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمائے۔

ماشاءاللہ اس سلسلے میں آپ کو عبقریت حاصل ہے، معلومات با حوالہ اور تاریخ کے ساتھ جغرافیائی معلومات کا دامن بھی وسیع، ماشاءاللہ وبارک اللہ، اللہم زد فزد، مگر ایک گزارش قابل توجہ ہے کہ آپ نے نقل روایات میں امام بخاریؒ کا طرز اختیار کیا ہے۔ مثلاً مکران و قندابیل وغیرہ کے سلسلے میں حکم بن ابی العاصؓ کی تحقیق کا جہاں بھی ذکر آیا، پورا قصہ نقل کر دیا، اس سے مضامین میں تکرار ہو گیا، اس کی طرف توجہ کی ضرورت ہے۔ باقی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو بیش از بیش توفیق بخشے اور آپ کے اخلاف آپ کے صحیح جانشین اور خدا کرے آپ سے بالا اور برتر ہوں۔ آمین

محافظین بیت المال کا قتل احقر کے خیال میں سبائیوں کا فعل ہے اور اس کو حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ وابن الزبیر رضی اللہ عنہم کی طرف منسوب کر دیا، فی الواقع الیہ بن گیا۔ اس کی تحقیق ہونی چاہیے، یہ واقعہ کب ہوا؟ جنگ جمل زیادہ عرصہ نہیں چلی، حضرت زبیر رضی اللہ عنہ اس جنگ کے دن شہید ہو گئے، وہ کوفہ یا بصرہ کب گئے؟ احقر کے پاس کتابیں نہیں ہیں، دہلی کے کتب خانوں میں بھی زیادہ کتابیں نہیں ہیں۔ صرف بلاذری، ابن سعد، البدایہ والنہایہ وغیرہ چند کتابیں ہیں، آپ نے سب کی کتابوں کا حوالہ دیا ہے، آپ کا مطالعہ وسیع ہے۔ اس معاملے کی تحقیق کیجیے۔ والسلام

نیازمند محتاجِ دعا: محمد میاں

(ماہنامہ ندائے شاہی نومبر [تاریخ شاہی نمبر]، دسمبر ۱۹۹۲ء، ص: ۴۴۰ تا ۴۵۶)

☆☆☆☆☆

سید الملّت حضرت مولانا

سید محمد میاں دیوبندی ثم الدہلویؒ

۱۳۲۱ھ/۱۹۰۳ء — ۱۳۹۵ھ/۱۹۷۵ء

مولانا نور عالم صاحب خلیل امینی
استاذ ادب دارالعلوم دیوبند و چیف ایڈیٹر ''الداعی''

کبھی حیرت، کبھی مستی، کبھی آہِ سحر گاہی
بدلتا ہے ہزاروں رنگ، میرا دردِ مہجوری

نحیف الجسم، دراز قد، سرخ وسفید رنگ، بڑی بڑی آنکھیں جو نیم باز رہتی تھیں، کشادہ پیشانی، گھنیریں بھنویں، کھڑی سُتواں ناک، کتابی چہرہ، ہاتھ میں چھڑی، پاؤں میں سادے جوتے جو عموماً علما وصلحا استعمال کرتے ہیں، بدن پر معمولی سوتی کپڑے کا کرتا پاجامہ، عموماً کھدّر کے کپڑے کا۔ پاجامہ مخنیٰ ہوتا —— جو صالح علما کا شعار رہا ہے —— جوانی اور اُدھیڑ عمری تو راقم نے نہیں دیکھی، بڑھاپے میں، اُنھیں چھڑی کے سہارے آہستہ روی سے چلتے ہوئے دیکھا، گفتگو میں ٹھہراؤ، عالمانہ وقار اور شریفانہ شرمیلا پن۔ شخصیّت کی ہیئتِ کذائی سے ہر دیکھنے والے کو نہ صرف ضعیف الجسم؛ بل کہ ضعیف الاِرادہ ہونے کا اِحساس ہوتا؛ لیکن اُنھیں ذرا بھی برتنے والے کو فوراً ہی اُن کے غیر معمولی آہنی اِرادے والے ہونے کا یقین ہوجاتا تھا۔ ایک ہاتھ میں چھڑی اور دوسرے میں کاغذات سے بھرا پرس، یا برہنہ کاغذات ہوتے، کبھی خالی نہ بیٹھتے یا تو مطالعہ کرتے یا لکھتے رہتے، مطالعہ اور تحریر اُن کا لازم

تھی۔ چہرے سے مُترشّح تمام تر حلم و بردباری، مکمل خاک ساری، ہر رویّے سے اُبلتی ہوئی شرافت و مروّت کے باوجود ایسا رُعب کہ اُن کی خواہش؛ بل کہ ''تمنّا'' کے باوجود، یہ، راقم اُن سے بے تکلّف ہوسکا نہ کھل کے بات کرسکا، ہاں مراسلت میں اپنی کسی ضرورت کا کوئی پہلو، قدرے بے تکلفی سے اُن کے سامنے پیش کرپاتا تھا؛ لیکن اُس میں بھی یہ، خوف ہمیشہ دامن گیر رہتا کہ اردو زبان کے کسی ''لب و لہجے'' میں ذرا سی غلطی ہوئی کہ وہ ضرور روک ٹوک کریں گے۔ اُن کی صورت سے شب بیداری، زہد و اِتّقا، عفاف و قناعت اور صلاح و تقویٰ کے اثرات از خود ہویدا ہوتے تھے۔

تہذیب و شایستگی گھُٹّی میں پڑی تھی، درس گاہ میں طلبہ کو کسی مسئلے پر گفتگو کے بعد ہمیشہ کہتے: ''خیال فرمایا مولانا!'' اپنے شاگردوں کو ہمیشہ ''مولانا'' ہی کے لفظ سے مخاطب کرتے، کسی طالب علم کو ''مولوی'' کہتے نہ ''تم'' سے خطاب کرتے؛ بل کہ ہر ایک کو ''آپ'' ہی کہتے، حال آں کہ وہ مغربی یوپی کے تھے، جہاں ''پنجاب'' سے قربت کی وجہ، سے باپ کو بھی بیٹا ''تم'' ہی کہتا ہے اور کوئی باپ بُرا نہیں مناتا۔ اُن کے حلم و شرافت سے ہم لوگ اتنے مُتاَثِّر تھے کہ اُنھیں مدرسے کے ماحول میں ہمیشہ ''مولانا شریف'' ہی کہتے تھے۔ ہماری طالبِ علمی میں وہ ستّر کے پیٹے میں تھے، بواسیر کی شدّت رہتی تھی، خلقتاً کم زور اور نازک تھے، بڑھاپے نے رہی سہی کسر پوری کردی تھی، ایسے میں جھنجھلاہٹ چڑچڑاپن اور غصّہ آنا عام سی بات ہوجاتا ہے؛ لیکن وہ میری طالبِ علمی کے مکمل یک سالہ دورانیے میں کبھی ہم لوگوں سے بے مزہ ہوے، نہ ناراض، نہ کبھی سخت لہجے میں ڈانٹا، نہ کسی بیہودگی پر جو طالب علموں سے ضرور سرزد ہوتی رہتی ہے، آزردہ ہوے نہ افسردہ۔ اُن کے مکان (جو کرایے کا تھا) واقع اندرون اِحاطہ کالے صاحب، گلی قاسم جان، بلیماران، دہلی، اور مدرسہ امینیہ واقع ''کشمیری گیٹ'' دہلی ٦ کے درمیان کم از کم ۲ کلومیٹر کا فاصلہ ضرور ہوگا۔ حضرت اس فاصلے کو روزانہ آمد و رفت دونوں صورتوں میں پیدل طے کرتے تھے۔ یہ، راستہ انتہائی بھیڑ والا اور دہلی کے اہم بازاروں سے گزرتا ہے، خود ''گلی قاسم جان'' کی گھنیری آبادی اور بھیڑ والی گلی،

پھر ''چاندنی چوک'' تک کا ''بلی ماران'' کا علاقہ جو ہمیشہ سے انسانوں کا جنگل معلوم ہوتا ہے۔ وہاں سے ٹاؤن ہال کی عمارتوں کو عبور کر کے پرانی دہلی کے ریلوے اسٹیشن تک کے علاقے کا یہی حال ہے۔ اب تو پرانی دہلی کے اسٹیشن کے سامنے کی بڑی شاہ راہ پر سڑک پار کرنے کے لیے پل بن گیا ہے، اُس زمانے میں یہ، پل نہیں تھا، سڑک کو عبور کرنا ہم جیسے لڑکوں کے لیے بھی مشکل تھا؛ لیکن حضرت اپنی چھڑی ٹیکتے ہوئے آہستہ روی سے ہی اُس سڑک کو پار کر کے، دوسری طرف جانبِ جنوب آتے، پھر مشہور ''کوڑیا'' (۱) پل کو پار کرنے کے لیے اُس کے زینوں پر اپنے ڈنڈے کے سہارے چڑھتے، اِس پل پر ہمیشہ آنے جانے والوں کی دورویہ بہت بھیڑ ہوتی؛ لیکن وہ اپنی آہستہ خرامی کے ساتھ ''کشمیری گیٹ'' کی طرف اُتر جاتے، وہاں سے مزید جانبِ شمال تقریباً ۲۰۰ قدم کے فاصلے پر مدرسہ امینیہ کی عمارت واقع ہے۔ یہاں بھی اگر دفتر میں جاتے تو دوسری منزل تک چڑھنا ہی تھا اور اگر درس گاہ میں جاتے تو وہ تیسری منزل پر واقع تھی؛ لہٰذا یہ، سارے زینے وہ آہستہ آہستہ طے کر کے جہاں جانا ہوتا وہاں پہنچ جاتے۔ صبر، تحمل، قناعت اور سادگی اُن کی شناخت تھی۔ یہ، وصف اُن کی زندگی کے ہر رنگ میں سب سے زیادہ شوخ نظر آتا تھا۔ اُن کی عمر کے ہم ایسے لوگ ہوتے، تو ایسے کٹھن راستے کو، روزانہ پیدل عبور کرنے کی سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ میں یہ، سطریں لکھ رہا ہوں اور حضرت میرے آگے آگے میری نظروں کے سامنے چلتے ہوئے مجھے دِکھ رہے ہیں، لگتا ہے یہ، ماضی کا واقعہ نہیں، یہ، اِسی وقت کی تازہ اور زندہ حقیقت ہے۔

ہمہ جہت عالم دین

حضرت مولانا سید محمد میاں دیوبندی دہلویؒ ہمہ جہت عالمِ دین تھے۔ وہ بڑے بافیض و باتوفیق مدرس تھے۔ اُن کا درس صرف مغز کا حامل ہوتا، وہ بہت مختصر گفتگو کرتے، جس سے فائدہ اٹھانا اور متعلق موضوع کو سمجھنا اور سمیٹنا طلبہ کے لیے آسان ہوتا۔ کبھی لایعنی گفتگو کرتے، نہ دراز کلامی کرتے، نہ بیجا مزاح کرتے، نہ کبھی زور سے ہنستے، نہ ہنسانے کے

لیے کسی چٹکلے کا سہارا لیتے۔ اُن کا طرزِ کلام مفکرانہ، مدبرانہ اور مؤرخانہ ہوتا، درسِ حدیث میں اِسی کے ساتھ محدثانہ وفقیہانہ ہوتا۔ اُن کے اکثر جملوں میں غیر معمولی غور وفکر کی دعوت چھپی ہوتی۔ اُن کے اِن تدریسی صفات وخصوصیّات کی وجہ، سے، ذہین اور ہوش مند طلبہ کے لیے، اُن کے درس سے ایک ہمہ صفات عالم وداعی اِلی اللہ بننے کی راہ ہم وار ہوتی۔ زبان اور لب ولہجہ بہت پاکیزہ ہوتا، لفظ لفظ سے شرافت ٹپکتی، ہر تعبیر سے دین کا درد، ایک زاہد شب بیدار کا کرب، ایک مؤرخِ اسلام کی بے قراری، ایک پرسوز عالم کا اضطراب اور عالَم کے لیے ہدایت کا ذریعہ بننے والی امت کی زبوں حالی کا بے کراں دُکھ چھلکتا ہوا محسوس ہوتا تھا، ظاہر ہے کہ درس گاہ کے سارے طلبہ، اُن کے درس کی اِن ساری خوبیوں کو یکساں طور پر محسوس نہیں کر پاتے تھے؛ بل کہ ہر طالبِ علم، اپنے ظرف اور مبلغِ فہم وذکا کے مطابق ہی اُن سے فائدہ اٹھاتا تھا۔

بلند پایہ محدث وفقیہ ومفتی

وہ بلند پایہ مُحدِّث تھے اور حدیث میں اپنے عصر کے سب سے بڑے مُحدِّث علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ کے شاگرد تھے۔ کم وبیش ۳۲ سال تدریسی خدمت انجام دی (۳ سال مدرسہ حنفیہ آرا میں، جہاں سے آپ نے تدریس کا آغاز کیا، ۱۶ سال مدرسہ شاہی مرادآباد میں اور ۱۳ سال مدرسہ امینیہ دہلی میں)، جس میں حدیث شریف کی اعلیٰ کتابوں: صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی تدریس سرفہرست رہی۔ وہ اعلیٰ پایے کے فقیہ، ومفتی تھے، فقہ، وفتاویٰ کی اُمّہات الکتب کا نہ صرف عرصۂ دراز تک درس دیا؛ بل کہ مدرسہ شاہی مرادآباد اور مدرسہ امینیہ اسلامیہ دہلی میں مدرسی کے سارے دورانیے میں جو کم از کم ۲۹ سالوں پر محیط ہے، ہمیشہ فتاویٰ بھی تحریر فرماتے رہے۔ فقہ، وفتویٰ میں وہ اپنے زمانے میں علمائے برِصغیر کے درمیان ایک اہم ستون سمجھے جاتے تھے اور بڑے بڑے پیچیدہ مسائل میں عموماً، علمائے کرام آپ ہی سے رجوع فرماتے تھے، آپ کے فرعی اجتہاد ونقطۂ نظر کو اُن اہم مسائل میں بڑی اہمیّت دی جاتی تھی۔

شان دار و پیغام رساں اہلِ قلم

وہ بہت بڑے اہلِ قلم اور مؤلّف تھے۔ اُن کی چھوٹی بڑی تصنیفات کی تعداد ستّر تک پہنچتی ہے۔ بعض کتابیں متعدد جلدوں میں ہیں۔ مختلف علمی و دینی و قیع رسالوں میں جو لاتعداد علمی و تحقیقی فکر انگیز مقالات لکھے، وہ اِن کے علاوہ ہیں، جنھیں جمع کر دیا جائے تو متعدد الا جزا دسیوں کتابیں تیار ہو جائیں گی۔ اُن کے قلم میں عالم کا وقار، فقیہ، و مفتی کی جز رسی، مؤرخ کی دیدہ وری و پختہ کاری، ادیب کی فن کاری، چاشنی اور فصاحت و بلاغت و جاذبیت کے ساتھ، دہلوی اردو کا بانکپن اور ممتاز رنگ و آہنگ، ہر قاری کو محسوس ہوتا ہے۔ دردمند عالم کا سوز اُن کی ہر تحریر کا امتیاز ہے۔ ''علماے ہند کا شان دار ماضی'' اُن کی ساری تصنیفات میں بالخصوص شان دار مقام کی حامل ہے۔ اُن کی یہ تصنیفِ لطیف اُن کی جوانی اور توانائی کے دور کی تصنیف ہے، اُس میں قلم کی جولانی، اِنشا پردازی کے خوب صورت رنگ، سوانح نویسی کے خاص انداز، تاریخ نگاری کی طرح داری، مجاہدانہ کارناموں کی جمع و ترتیب کے نرالا پن، ماضی کی تاب ناکیوں سے مستقبل کے لیے نتیجہ خیز اُجالا اخذ کرنے کی دُھن، علماے سلف کے مجاہدانہ حالات سے حاضر کے کم ہمّت مسافرانِ راہ کے لیے، بھرپور توشۂ راہ بہم پہنچانے کی لگن کی قوسِ قزح کی خوش رنگی اور غیر معمولی جاذبیت، قاری کو اپنی طرف مقناطیس کی طرح کھینچتی ہیں، ویسے اُن کی ہر تحریر کا تقریباً یہی رنگ ہے، جو کسی کسی تحریر میں زیادہ نمایاں اور شوخ نظر آتا ہے۔

حیوانِ کاتب

جمعیّت علماے ہند کی تاریخ، کارناموں، طریقۂ فکر و عمل اور آزادی سے قبل اور اُس کے بعد مسلمانوں کی مختلف الانواع خدمات اور قوم و وطن کی ٹھوس راہ نمائی کے حوالے سے، اُنھوں نے اِتنا کچھ لکھا، جو بعد کے سارے مؤرّخین کے لیے زبردست اور بھرپور سرمایے کی حیثیت رکھتا ہے۔ جمعیّت نہ صرف اِس حوالے سے؛ بل کہ بہت سارے حوالوں سے، اُن کے اِحسان کے بار سے سبک دوش نہیں ہوسکتی۔ پُر نویسی و کثرتِ تالیف کی وجہ سے شیخ

الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ اُنھیں ''حیوانِ کاتب'' کہا کرتے تھے، نہ صرف جمعیّت؛ بل کہ دارالعلوم دیوبند اور علما کے ماحول میں یہ، لقب زبان زدِ خاص وعام ہو گیا تھا۔ وہ علماے دیوبند میں کثرتِ نگارش کے تعلّق سے گنے چنے سعادت نصیبوں میں تھے۔

ممتاز مؤرخ وسوانح نگار

وہ ممتاز مؤرِّخ اور سوانح نگار تھے۔ ''علماے ہند کا شان دار ماضی''، ''علماے حق اور اُن کے مجاہدانہ کارنامے''، ''حیات شیخ الاسلام''، ''مجاہد جلیل''، ''اسیرانِ مالٹا''، ''تحریکِ شیخ الہند'' وغیرہ اُن کی تاریخ نگاری اور ساتھ ہی سوانح نویسی کا بہترین نمونہ ہیں اور اُن کی خوب صورت وچاشنی بھری نثر کا نقشِ دوام بھی۔ اِن کتابوں سے جہاں فرنگی سامراج کی چیرہ دستیاں اَلم نشرح ہوتی ہیں، وہیں پچاسوں علماے حق کی سرفروشیوں کی ولولہ انگیز داستانوں کی شعور خیز جان کاری بھی ہوتی ہے اور یہ، سبق بھی ملتا ہے کہ علمانے ہر زمانے میں، اُس زمانے کے تقاضے کے مطابق، سیاسی سرگرمیوں میں نہ صرف حصّہ لیا ہے؛ بل کہ قید وبند کی صعوبتیں برداشت کی ہیں اور دار ورسن کو بھی بہ خوشی لبیک کہا ہے؛ اِس لیے زمانۂ حال میں، اُس کے تقاضے کے مطابق سیاسی تحریک میں، دین وملت کی خدمت کے لیے، مخلصانہ طور پر حصّہ لینا، علُما کی شان کے خلاف ہے، نہ کوئی بدعت ہے؛ بل کہ اصحابِ دعوت وعزیمت علُما کی سنہری روایات کو زندہ کرنا ہے۔

شب بیدار وخوش اوقات عالم

وہ شب بیدار اہلِ دل اور خوش اوقات عالمِ دین تھے، مشاغل کی بے پناہی، کبھی باجماعت نماز میں خلل انداز ہوتی تھی نہ شب بیداری، تہجّد گزاری اور آہِ سحر گاہی میں، وہ صحیح معنی میں فارس بالنّہار اور راہب باللیل تھے؛ کیوں کہ وہ جن اَساتذہ کے شاگرد تھے، وہ صرف حرفِ علم کے پجاری نہ تھے؛ بل کہ وہ علم وعمل دونوں کے شہ، سوار تھے؛ اِس لیے اُن کی گود میں پلا بڑھا ہر عالم صحیح معنی میں علم وعمل کا جامع ہوتا تھا۔ حضرت مولانا سید محمد میاں دیوبندی دہلوی اِس کی نمایاں مثال تھے۔ اِس راقم نے اُن کی انتہائی کم زوری، پیرانہ سالی

اور بیماریوں کی مسلسل یلغار سے، اُنھیں زار ونزار رہنے کا دور دیکھا ہے؛ لیکن وہ جہاں ہوتے، جس حال میں ہوتے، موسم جاڑے کا ہو یا لُو کا، برسات کی جھری ہو یا رات کی تاریکی وہ اپنی چھڑی ٹیکتے ہوئے مسجد پہنچتے اور باجماعت نماز ادا کرتے۔ عبادت کا ذوق، ذکرِ الٰہی کا شوق، تلاوت اور اوراد و وظائف کی پابندی، اُن کی ذات کا امتیازی وصف تھا۔ مدرس وفقیہ، ومفتی ومحدث، ومؤلف وسیاسی میدان کے سرگرم قائد مولانا سید محمد میاں، دراصل ایک متقی، خدا ترس اور زاہدِ اَوّاب عالمِ دین تھے، اُن کی زندگی کا یہی وصف درحقیقت سب سے زیادہ نمایاں اور اُن کی عظمت کے ہار کا سب سے قیمتی موتی ہے کہ اِس کے بغیر سارے کارنامے لفظِ بے معنی اور نقشِ ناتمام؛ بل کہ سعیِ ناکام ہوتے ہیں۔

علامہ اقبال نے صحیح کہا ہے:

عطّار ہو، رومؔی ہو، رازؔی ہو، غزاؔلی ہو
کچھ ہاتھ نہیں آتا، بے آہِ سحر گاہی

شیخ الاسلام کے خوانِ سلوک واِحسان کے خوشہ چیں

وہ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے دست گرفتہ اور اُن کے خوانِ سلوک واِحسان کے ممتاز خوشہ چینوں میں تھے۔ اُنھوں نے اپنے شیخ کی اِحسانی تعلیم وتربیت اور اِیمانی حرارت وعبادتی ذوق وشوق سے صرف خانقاہ کی خلوتوں ہی میں فائدہ نہیں اُٹھایا؛ بل کہ ملک وملّت کی بھرپور خدمتوں اور جمعیّتِ علماے ہند کی بے پناہ سرگرمیوں کی جلوتوں میں بھی، اُن کے نفسِ گرم کی تاثیر کو جذب کیا تھا۔ اُن کی خاک ساری اور تواضع اور فروتنی ہوسکتا ہے کہ اُن کے موروثی ساداتی رنگ کی عکّاس ہو؛ لیکن اُس کی شوخی و گہرائی، بالیقین شیخ الاسلامؒ کی صحبتِ اِکسیری کی رہینِ منّت تھی۔ شیخ الاسلامؒ کی خاک ساری ضرب المثل تھی؛ لیکن اِس راقم آثم کو اِس کے تجربے کی سعادت حاصل نہیں؛ لیکن حضرت الاستاذ مولانا سید محمد میاںؒ کی خاک ساری میں نے دیکھی اور برتی ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں چند ہی خدا ترسوں کو، اُن کے ایسا خاک سار اور منکسر المزاج پایا ہے۔

میدانِ سیاست کے تکان نا آشنا شہ سوار

اِسی کے ساتھ وہ میدانِ سیاست کے پُر جوش اور تکان نا آشنا شہ، سوار تھے۔ آزادیِ وطن کی سرگرمیوں میں، اُنھوں نے سرفروشانہ حصّہ لیا اور علمی و تدریسی مشاغل کے گم بھیر بوجھ کے باوجود، زبان و قلم اور حرکت و عمل کی ساری توانائیوں سے، تحریکِ آزادی کے انتہائی فعال، مخلص اور سچّے سپاہی کا بے مثال کردار ادا کیا۔ اِس سلسلے میں وہ ساحل کے تماشائی نہ تھے؛ بل کہ طرح طرح کی سختیوں، آزمایشوں، چکی کی مشقّتوں اور جیل کی سلاخوں، حوالات کے عذابوں، گرفتاریوں کی دردناکیوں اور خوف و دہشت کی تلاطم خیزیوں سے دیوانہ وار مقابلہ کیا، جس کی کچھ تفصیل اِن شاءاللہ آیندہ صفحات میں بالخصوص مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی خود نوشت بہ شکل مضمون میں قاری کے سامنے آئے گی، جس سے اندازہ ہوگا کہ فرنگی سامراج کے خلاف نفرت و عداوت کا جو بیج، اُن کے عظیم اساتذہ اور پیش رو علما نے بویا تھا، وہ اِس باشعور تاریخ کے مزاج آشنا اور اُمّت کے عروج و زوال کے اسباب کا اِدراک رکھنے والے دردمند عالم کے دل میں کیسا تناور اور بارآور درخت بن گیا تھا۔ اِس حوالے سے حضرت رحمۃ اللہ علیہ غالب کے اِس شعر کا مصداق تھے:

خانہ زادِ زلف ہیں، زنجیر سے بھاگیں گے کیا
ہیں گرفتارِ وفا، زنداں سے گھبراویں گے کیا

وہ منحنی الجسم، دبلے پتلے اور چھریرے بدن کے تھے، اُنھیں دیکھ کر کسی کو قطعاً اندازہ نہیں ہوسکتا تھا کہ نسبتاً ایسے کم زور ڈھانچے میں شیر دل شخصیت چھپی ہوگی اور وہ تحریکِ آزادی کے میدان کے فولادی اِرادے کے سپاہی رہے ہوں گے، جن کی عزیمت کو استعماری حکومت کی کوئی تدبیر کبھی چیلنج کرسکی نہ راہ کی سختیاں اور حالات کی دھوپ چھاؤں اُن کے پاے استقلال میں لرزش پیدا کرسکی۔ عربی شاعر نے بہت صحیح کہا ہے:

تَرَى الرَّجُلَ النَّحِيفَ فَتَزْدَرِيهِ
وَفِي أَثْوَابِهِ أَسَدٌ مَزِيرٌ

تم ایک نحیف الجسم انسان کو دیکھ کر اُس کو ہیچ سمجھو گے، حال آں کہ اُس کے اندر ایک پختہ دل شیر چھپا ہوگا (جس کا صحیح اندازہ تجربے کے بعد ہی ہو سکے گا)

ایک ہی حقیقت کی دو تعبیریں

سیاسی میدان میں آپ کی تگ ودو اور جمعیۃ علماے ہند سے وابستگی، دونوں ایک ہی حقیقت کی دو تعبیریں ہیں۔ فراغت کے بعد ہی مارچ ۱۹۲۶ء میں جمعیۃ علما کے ساتویں اِجلاس کلکتہ میں دارالعلوم کے اکابر کے ساتھ آپ نے شرکت فرمائی (۲) لیکن سیاسی سرگرمیوں کا اصل دور ''مدرسہ شاہی'' مرادآباد آمد کے بعد شروع ہوا، جو تا حیات باقی رہا۔ سب سے پہلے آپ جمعیۃ علما مرادآباد کے نائب ناظم منتخب ہوے، پھر جمعیۃ علماے ہند کے ناظم اعلیٰ چنے گئے اور دگر بڑی بڑی ذمے داریاں انجام دیں۔

جمعیۃ علما کے تاریخی اِجلاس منعقدہ امروہہ کی معنویّت اور حضرت کا بہ حیثیت ذمے دار انتخاب

مئی ۱۹۳۰ء میں جمعیۃ علما کا تاریخی اِجلاس شہر ''امروہہ'' میں منعقد ہوا، اِس کی بڑی اہمیت یہ تھی کہ اس میں کانگریس کے ساتھ شراکتِ عمل کی قرارداد پاس کی گئی۔ اِس اجلاس سے کچھ پہلے جمعیۃ علما شہر مرادآباد کی مجلس منتظمہ کے اِجلاس میں آپ کو شہر مرادآباد کی جمعیت کا نائب ناظم منتخب کیا گیا، کچھ دنوں بعد باقاعدہ ناظم بنادیا گیا، پھر جمعیۃ علما صوبہ آگرہ کا ناظم تبلیغ بنایا گیا؛ کیوں کہ اُس وقت جمعیۃ علما تبلیغ کی سرگرمیاں بھی انجام دیتی تھی۔ پھر آگرہ اور صوبۂ متحدہ آگرہ واودھ کے ناظم جمعیۃ بنادیے گئے، پھر اجلاس جمعیۃ سہارنپور ۴ تا ۷/ مئی ۱۹۴۵ء میں جمعیۃ علماے ہند کے ناظم منتخب ہوے، اِسی اجلاس میں مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ (۱۳۱۸ھ/ ۱۹۰۱ء-۱۳۸۲ھ/۱۹۶۲ء) جمعیۃ کے ناظمِ اعلیٰ منتخب ہوے۔ مولانا حفظ الرحمٰنؒ کی وفات کے بعد ایک سال جمعیۃ کے ناظم اعلیٰ رہے۔ آپ جمعیۃ کی نظامت کے عہدے پر تقریباً ۳۵ سال فائز رہے۔ نظامتِ علیا سے علاحدگی اختیار کرنے کے بعد بھی، آپ جمعیۃ کی مجلسِ عاملہ کے رکن اور اُس کے ادارے ''ادارہ مباحثِ فقہیہ'' کے ناظم اور جمعیۃ ٹرسٹ کے سکریٹری رہے۔

قید و بند کی آزمایشیں اور حفظِ قرآن پاک

جدوجہد آزادی کے دوران آپ پانچ مرتبہ قید و بند کی آزمایشوں سے گزرے، جس کے دوران آپ نے قرآنِ پاک حفظ کرنے کی سعادت حاصل کی؛ کیوں کہ بچپن میں آپ قرآن پاک حفظ نہیں کر سکے تھے۔ مرادآباد، دہلی، میرٹھ، بریلی اور فیض آباد کی جیلوں میں آپ قید رہے۔ جیل میں آپ نے چکی کی مشقت بھی سہی اور طرح طرح کی سختیاں بھی جھیلیں؛ لیکن اپنے اسلاف و مشایخ سے صبر و استقلال کا جو سبق سیکھا تھا، اُس کی وجہ، سے آپ کے عزم و استقلال میں کبھی کوئی تزلزل پیدا نہ ہوا۔

ارتداد کے خطرے کا سدِّ باب اور مجاہدانہ سرگرمیاں

ملک کی آزادی کے بعد، جہاں مسلمان تھوڑی تعداد میں رہ گئے تھے، وہاں ارتداد کا شدید خطرہ پیدا ہو گیا تھا، ان مسلمانوں کو مسلمان باقی رکھنا بڑا نازک مسئلہ بن گیا تھا، آپ نے اِس سلسلے میں بڑا بنیادی کردار ادا کیا، راجستھان، میوات، ہماچل پردیش اور مشرقی پنجاب کے دور دراز علاقوں میں شب و روز دورے کیے، دینی مکاتب قائم کیے، اُن مسلمانوں کو دینی معلومات بہم پہنچائیں، اُنھیں حکمتِ عملی سے اسلام کی قیمت و اہمیت بتائی، اِس سلسلے میں بعض ایسی جگہوں کا سفر کیا، جہاں جانا بڑی ہمت اور عزیمت کا کام تھا، اُن کے کم زور جسم میں آہنی اِرادے کا ایک بہت طاقت ور انسان نہ ہوتا، تو وہ ہرگز یہ، مہم انجام نہیں دے سکتے تھے۔ اُنھوں نے اس سلسلے میں متعدّد رفقاے کار کو کام پر لگایا اور اُن کی علمی و فکری تربیت کی۔ اِس طرح اَن گنت مسلمانوں کو ارتداد سے بچایا۔ یہ، اُن کے دینی و ملی کارناموں میں بڑا تاریخی کارنامہ ہے۔

آزادی کے بعد نسلِ نو کے لیے اِیمانی و عقائدی حفاظتی دیوار کی تعمیر میں بنیادی کردار

اِسی طرح آزادی کے بعد کے مرحلے میں مسلمانوں کی نئی نسلوں میں دین کی

حفاظت اور عقیدۂ اسلام پر اُنھیں برقرار رکھنا بھی دینی وملی فریضے میں بنیادی حیثیت کا کام تھا، جمعیۃ علماے ہند نے اپنے سولھویں اجلاس منعقدہ لکھنؤ ۱۶ تا ۱۸/اپریل ۱۹۴۹ء میں دینی تعلیم پر ارتکاز کو اپنا بنیادی پروگرام قرار دیا اور اس مہم کو انجام دینے کی ذمے داری آپ ہی کے ذمے کی گئی، آپ نے نہ صرف اُسے مطلوبہ معیار پر انجام دیا؛ بل کہ اِس کے لیے نصابی رسالے بھی مرتب فرمائے، جو دینی ''تعلیم کے رسالے'' کے نام سے بہت مشہور ومقبول ہوے اور آپ کی میزانِ حسنات میں گراں قدر اِضافے کا باعث بنے۔

اِدارۂ مباحثِ فقہیہ کا قیام اور اُس کی ذمے داری

آپ ہی کی تحریک وترغیب پر جمعیۃ علما نے ''ادارہ مباحثِ فقہیہ'' قائم کیا؛ تا کہ بدلتے ہوے حالات میں، پیدا شدہ مسائل پر تحقیق اور غور وخوض کر کے، ملت کی اُن کے سلسلے میں رہ نمائی کی جائے۔ اِس کے تحت متعدد اہم موضوعات پر آپ نے تحقیقی کام کیے، جو ملک کے نام وَر علما وفقہا کے نزدیک بنیادی اہمیت کی نظر سے دیکھے گئے۔

الجمعیۃ کا اِحیاے نو اور اس کی اِدارت

جمعیۃ علما نے ۲۳/دسمبر ۱۹۴۷ء سے روز نامہ ''الجمعیۃ'' دوبارہ جاری کیا تو اُس کی اِدارت کی ذمے داری آپ ہی نے انجام دی، اِس تاریخ سے ۹ سال پہلے برطانوی حکومت نے اسے بند کر دیا تھا، اس وقت وہ سہ روزہ نکلا کرتا تھا۔

جمعیۃ علما کی تاریخ ودستاویزات کے تعلّق سے، آپ کی تحریریں ہی اصل سرمایہ ہیں، آپ نے اِس موضوع پر بہت کچھ لکھا اور تاریخ نویسوں کے لیے بنیادی مواد فراہم کر دیا۔

راقم السطور کے لیے، حضرت کی حیثیت

میرے لیے وہ شفقتِ پدری اور مہر مادری کا مجموعہ تھے۔ میں تین ماہ کا تھا کہ باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا؛ اِس لیے میں نے اپنے باپ کی شفقت نہیں دیکھی، البتہ ماں کی

مہربانی اور پیار کا تسلسل الحمد للہ آج بھی (بہ روز یک شنبہ ۱۷/شعبان ۱۴۳۰ھ مطابق ۹/ اگست ۲۰۰۹ء) قائم ہے، جب کہ میری عمر کی چھٹی دہائی کی تکمیل میں صرف ۳ سال رہ گئے ہیں۔ اللہ صحت کے ساتھ اُن کی عمر دراز کرے۔ مولانا رحمۃ اللہ علیہ میرے لیے ذاتی طور پر والدین کی ساری خوبیوں کا پیکر تھے۔ یادش بہ خیر کہ حضرت مولانا مفتی ظفیر الدین صاحب مفتاحی مدظلہ (۲۵/ربیع الثانی ۱۴۳۲ھ مطابق ۳۱/ مارچ ۲۰۱۱ء کو اپنے وطن وفات پا گئے) (سابق مفتی ومرتب فتاویٰ دارالعلوم دیوبند ومشہور اہلِ قلم) نے ذی قعدہ ۱۳۹۰ھ/ دسمبر ۱۹۷۰ء میں دہلی کے اپنے سفر کے دوران، جو اُنھوں نے میری درخواست پر، میری خاطر کیا تھا اور مدرسہ امینیہ ہی میں قیام فرمایا تھا، مدرسہ امینیہ کی مسجد میں جانبِ شمال کے گوشے میں، جہاں اُس وقت حضرت الاستاذؒ بخاری شریف اور ترمذی شریف کا درس دیا کرتے تھے؛ کیوں کہ شدید ٹھنڈک کی وجہ، سے اپنی درس گاہ میں، جو تیسری منزل پر واقع تھی، اُن کے لیے جانا دشوار ہوتا تھا؛ حضرت الاستاذ سے ملاقات کی، میرا نام لے کر تعارف کراتے ہوے فرمایا کہ اپنی دارالعلوم دیوبند کی خادمانہ زندگی میں جن چند طلبہ سے میں بے حد مُتأثِّر ہوا، اُن میں سے ایک یہ، مولوی نور عالم مظفر پوری ہیں۔ یہ، اِن کی بے حد سعادت کی بات ہے کہ یہ، آپ کے تلمُّذ میں آ گئے ہیں۔ اِن شاء اللہ آپ اِن سے خوش ہوں گے۔ صرف یہ، کہنا ہے کہ یہ، بہت نادار ہیں، شیر خوارگی سے ہی سایۂ پدری سے محروم ہیں، بے مایہ والدہ کے سوا کوئی اِن کا کفیل نہیں۔ بے سروسامانی اور محرومی کے تکلیف دہ اِحساس کے باوجود، الحمد للہ اِنھوں نے اپنے وقت کی قدر کرنا سیکھا ہے۔

محرومی کی تلخی اور دست گیری کی شیرینی

یہ، چند جملے جو عاجلانہ طور پر حضرت الاستاذ کے کان میں پڑے، میں دل ہی دل میں اُن کے تعلّق سے سوچتا رہا کہ یہ، بہ جلد کافور ہو جائیں گے۔ یہ، بزرگ سال حضرت بھلا اِنھیں کہاں یاد رکھ سکیں گے اور یاد رہے بھی تو اِن جملوں کا اُن کی طرف سے مجھے کیا فائدہ ہو سکتا ہے؟ لیکن دسمبر کا نصفِ آخر آیا اور شدید ٹھنڈک نے دہلی اور مغربی یوپی کے اس

پورے علاقے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا، شب و روز جیسا کہ یہاں اِس موسم میں ہمیشہ ہوا کرتا ہے، یخ بستہ ہوائیں چلنے لگیں۔ میرے پاس یہاں کی ٹھنڈک سے بچنے کے لیے ہمہ وقت پہننے کے کپڑے تھے یا کھدّر کی چادر، جو اُس زمانے میں ہمارے وسیع تر اَطراف کے سارے طلبہ کے جسم پر نظر آتی تھی؛ کیوں کہ اُس وقت ہر گھر میں خواتین چرخے پر سوت کاتتیں اور کھادی بھنڈاروں میں، جو ہر ممتاز گاؤں بالخصوص بلاک والے گاؤں میں ہوا کرتے تھے، فروخت کرتیں، اُس کے بدلے میں کچھ نقد روپے اور کھادی کے کپڑے، اوڑھنے کی چادریں اور بیڈ شیٹس حاصل کرتیں۔ اِس طرح نادار خواتین کسی نہ کسی طرح روز مرہ کے مصارف کے لیے پندرہ روز یا ایک ماہ کے بعد کچھ نہ کچھ نقد پا لیتیں۔ صبح اور شام کے وقت بالعموم اور چلّے کی سردی میں بالخصوص جسم کے مُجَرَّد کپڑے اور یہ، بے چاری چادر جسم کے اندر پیوست ہوتی ہوئی برفیلی ہواؤں کو نہیں روک پاتی تھی؛ لیکن یہ سمجھ کر میں برداشت کرتا تھا کہ اِس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ لڑکپن کی مدافعانہ قوت، قناعت کی طاقت اور یہ، سوچ کہ سردی کا بہ ہر صورت اِسی ناتواں ہتھیار سے مقابلہ کرنا ہے، ایک طرح کی بھرپور قوّتِ مدافعت کو جنم دیتی تھی۔

اِسی حال میں، مَیں ایک روز صبح کے گھنٹے میں حضرت الأستاذ کے سامنے سمٹا، سکڑا ہوا ٹھنڈک کی بھرپور جارحانہ وتمام تر بے رحمانہ یلغار کا مقابلہ کرتے ہوئے بیٹھا ہوا تھا کہ درس کی تقریر کے دوران، اچانک حضرت الأستاذ کی نگاہ میرے کپکپاتے ہوئے جسم پر پڑ گئی۔ میں قدرے شرم سار ہوا کہ شاید آج میری بے مائگی اِن کے سامنے برہنہ ہو گئی ہے۔ اِنسان بڑے سے بڑے مشفق کے سامنے بھی اگر وہ بے تکلّف اور دیرینہ درد آشنا نہ ہو، تو اپنے کسی زخم کی ٹیس کے آشکارا ہو جانے سے بہت شرمندہ ہوتا ہے؛ حال آں کہ اُس کا علاج اُسی وقت ہو سکتا ہے جب اُس کو کسی چارہ ساز نیک نہاد کے سامنے بیان کیا جائے، یا از خود اُس کو اِس کا علم ہو جائے؛ لیکن انسانی فطرت اگر وہ خارجی عوامل کے ہاتھوں مسمار نہ ہو چکی ہو، اپنے دکھ کا حال، درد آشنائے ہم راز کے سامنے کہنے سے بھی اِبا کرتی ہے۔

دوسرے روز صبح کے گھنٹے کے ختم پر حضرت الاستاذ نے مسجد ہی میں مجھے روک لیا۔ اور دگر طلبہ کو اپنے اپنے کمروں میں جانے دیا۔ جب تنہائی سی ہوئی، تو اخبار کے کاغذ میں لپٹی ہوئی نرم سی ایک چیز میری طرف بڑھاتے ہوے فرمایا۔ آپ اِس کو استعمال کریں، یہ، جرسی ہے، ہے تو مستعمل لیکن ابھی درست حالت میں ہے اور آپ کے پاس کچھ نہ ہونے سے بہتر ہوگا کہ یہ، پُرانی جرسی ہی سہی بدن پر رہے۔ میں نے حضرت الاستاذ کے ہدیے کو جہاں اپنی سعادت سمجھا وہیں شرمندگی اور محرومی کے ملے جلے جذبات نے میرے زخمی دل کے تاروں کو بُری طرح چھیڑ دیا، کافی دیر تک میرے آنسو کسی طرح نہیں تھمے۔ حضرت نے فرمایا: تم اِس قدر مُتَاَثِّر کیوں ہو؟ مجھے کوئی جواب اِس کے سوا نہ بن پڑا کہ شکستہ اور لڑکھڑاتے ہوئے الفاظ میں، میں نے جزاک اللہ کہا اور کمرے میں جا کے آنکھیں پوچھ، دوسرے گھنٹے کی تیاری کر مسلم شریف کے لیے، حضرت مولانا سیّد محمد مشہود الحسن امروہوی مدظلہ (۳) کی درس گاہ میں حاضر ہوگیا۔

حضرت کی عنایتوں کا تسلسل

اِس کے بعد حضرت کی عنایتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ وہ درس گاہ میں سبق کی تفہیم کے دوران، اکثر مجھے ہی مخاطب کرتے، شاید اُنھیں اندازہ ہوگیا تھا کہ یہ، سبق کو زیادہ غور سے سنتا، اُس سے دلچسپی لیتا اور اُس کو صحیح طور پر سمجھنے کی کوشش کرتا ہے؛ لہٰذا میری تقریر و تفہیم کی امانت کا یہی زیادہ حق دار ہے۔ مُدَرِّس اور مُقَرِّر، مُخَاطَبین میں سے عموماً اُنھی لوگوں کی طرف زیادہ روئے سخن مرکوز کرتا ہے، جن کے چہرے سے دلچسپی، تَوَجُّہ،، سمجھ داری اور پیش کی جارہی باتوں کی قدر دانی آشکارا ہوتی ہے۔ مدرس اور مقرر کسی جانب روئے سخن کے ارتکاز کے حوالے سے مجبور ہوتا ہے؛ کیوں کہ اِس سلسلے میں اُس کے اِرادے کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ حاضرین وسامعین کی تَوَجُّہات میں، خدائے حکیم نے مقناطیسی جاذبیّت رکھی ہے۔

مدرسوں میں عموماً سنہ ہجری کی پہلی دوسری تاریخ کو مدرّسین وملازمین کو تنخواہیں ملا کرتی ہیں۔ پہلی یا دوسری تاریخ کو جب حضرت الاستاذ کو تنخواہ ملتی، تو ہر مہینے تو نہیں؛ لیکن

دوسرے تیسرے مہینے وہ اپنے سبق کے ختم پر، تیسری منزل پر واقع اپنی درس گاہ سے نیچے اترنے کے لیے زینے پر قدم رکھنے سے قبل، مجھے بلاتے اور دس یا پندرہ روپے عنایت فرماتے۔ چوں کہ جب بھی وہ یہ، رقم ہدیہ فرماتے تو اِسی جگہ، فرماتے تھے؛ اِس لیے مجھے اِس جگہ، سے ایک طرح کی انسیّت سی ہوگئی تھی، مُتَنَبّی نے سچ کہا ہے:

وَکُلُّ امْرِئٍ یُولِي الْجَمِیْلَ مُحَبَّبٌ
وَکُلُّ مَکَانٍ یُنْبِتُ الْعِــــــزَّ طَیِّبٌ

ہر احسان کنندہ انسان، انتہائی محبوب ہوتا ہے اور عزت دہندہ ہر جگہ، خوش گوار اور مسرت انگیز ہوتی ہے۔

یہاں پہلے مصرع کے حوالے سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اُس کا مضمون ہر ایک کے لیے عیاں ہے؛ لیکن دوسرے مصرع کو ایک لفظ کی ترمیم کے ساتھ پڑھ دیا جائے، تو وہ تمام تر میرے مطلب کا ہو جائے گا:

وَکُلُّ مَکَانٍ یُنْبِتُ النَّقْدَ طَیِّبٌ

یعنی ہر وہ جگہ، جہاں رقم یا روپے پیسہ ملا کرتا ہے وہ جاے خوشی ہوتی ہے۔

علمی ہدیے اور تاریخی یادیں

حضرت کی اُس زمانے میں ایک سے زائد تصنیفات شائع ہوئیں۔ ''حضرت عثمانِ ذی النورین کے شواہد تقدّس'' زیورِ طبع سے آراستہ ہوئی، تو بانس کے کاغذ میں پیک کر کے باقاعدہ میرا نام لکھ کے ہدیہ کیا، جیسے میں بھی کوئی اہلِ علم واہلِ قلم ہوں۔ اُن کے الطاف کے سامنے مجھے بہت شرمندگی ہوتی تھی؛ لیکن اُن کا رُعب نہ صرف میری عقل وخرد پر؛ بل کہ میری زبان پر بھی ایسا مُسلّط رہتا تھا کہ میں تایید یا تردید میں ایک لفظ بھی نہیں کہہ پاتا تھا۔ یہ، کتاب مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ (۱۳۲۱ھ/ ۱۹۰۹ء- ۱۳۹۹ھ/ ۱۹۷۹ء) کی مشہور کتاب ''خلافت وملوکیّت'' کے اُس حصّے کو جواب میں لکھی گئی تھی، جس میں اُنھوں نے حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ پر نازیبا اعتراضات کیے ہیں، جن کے جواب میں

علماے دیوبند میں سے مُتَعَدّد اہلِ علم وقلم نے مُحَقِّقانہ کتابیں لکھیں۔ حضرت الاستاذ کی یہ، کتاب جب منظرِ عام پر آئی، تو مولانا مودودیؒ کے مُعْتَقِدِین میں سے کئی اہلِ قلم نے اِس کے ردّ میں تیز وتند لہجے والی کتابیں تصنیف کیں، جن میں انتہائی سخت کتاب مولانا مودودیؒ کے ایک پُر جوش دیوبندی اہلِ قلم وشاعر وصحافی مولانا عامر عثمانیؒ (پ: ۱۵؍ربیع الاول ۱۳۳۹ھ مطابق ۳۰؍نومبر ۱۹۲۰ء، متوفی شب ۳۰؍ربیع الاول - یکم ربیع الثانی ۱۳۹۵ھ=۱۲-۱۳؍اپریل ۱۹۷۵ء) کی تھی، جس میں دریدہ دہنی کی حد کردی گئی تھی۔ مجھے یاد ہے، اُن کے یہ مضامین جو پہلے اُن کے ماہ نامہ ''تجلّی'' میں چھپے اور پھر کتابی شکل میں شائع ہوے، جب حضرت الاستاذ کے مُطالعے میں آئے، تو آپ کو سخت قلبی اذیت ہوئی؛ کیوں کہ مولانا عامر عثمانی کا سوقیانہ اور تمسخر کا انداز دل کو چھلنی کرنے والا تھا۔ مولانا عثمانیؒ چوں کہ مزاحیہ نگار بھی تھے اور اُنھیں کسی بڑے سے بڑے اہلِ فضل کے خلاف انتہائی نُکیلے الفاظ کے استعمال میں کوئی باک نہ ہوتا تھا؛ اِس لیے یہی اندازِ تحریر اُنھوں نے حضرت الاستاذ کے خلاف بھی استعمال کیا تھا۔ آج دونوں حضرات اِس دنیا میں نہیں؛ لیکن حضرت مولانا سیّد محمد میاں کا ذکرِ حسن بہت بڑے دینی وعلمی حلقے کی زبان پر رہا کرتا ہے اور اِن شاءاللہ رہے گا؛ جب کہ مولانا عامر عثمانؒی کا نام، اُن کی تحریروں کی تمام تر چاشنی اور شاعری کے سارے نرالے پن کے باوجود، شاید وباید ہی کوئی لیتا ہوگا۔ یہ صورتِ حال باعثِ عبرت بھی ہے اور سبق آموز بھی۔

اِسی کے کچھ عرصے بعد حضرت الاستاذ کی ''سیرتِ مبارکہ محمد رسول اللہ ﷺ'' شائع ہوئی، تو حضرت نے اسی اہتمام سے ناچیز کو ہدیہ کیا اور فرمایا کہ مطالعے کے بعد اگر طباعت وغیرہ کی غلطیاں نظر آئیں، تو ضرور بتایئے گا؛ تاکہ آیندہ اِشاعت کے وقت اُن کی تصحیح ہوجائے۔

دہلی کی دل بری ودل ستانی

کئی بار حضرتؒ کے ساتھ اُن کی مسجد ''مسجدِ نواب قاسم جان'' (جو ''اِحاطہ کالے صاحب'' کے باہر گلی قاسم جان کی سڑک پر واقع ہے) یا اُن کے مکان واقع اندرون ''اِحاطہ

کالے صاحب'' جانے کا موقع ملا۔ عموماً وہ کسی تحریر کو اُس وقت صاف کرنے کی خدمت میرے سپرد کرتے، جب اُن کے اِس کام کے لیے مخصوص تبییض کنندہ بڑے میاں موجود نہ ہوتے یا دگر تبییضی کاموں میں لگے ہوتے۔ حدیث شریف کی موٹی موٹی کتابیں صرف تعلیمی گھنٹوں کے محدود دورانیے میں عموماً ختم نہیں ہو پاتیں؛ اِس لیے اِن کتابوں کے مدرسین بالخصوص صحاحِ ثلاثہ: صحیح بخاری شریف، صحیح مسلم شریف، اور جامع ترمذی شریف کے اساتذہ اِنھیں فرصت کے دگر اوقات میں پڑھانے پر مجبور ہوتے ہیں۔ ہم لوگ بھی صحیح بخاری اور جامع ترمذی پڑھنے کے لیے، جمعہ کے دن علی الصباح اور دگر ایّام میں مغرب سے ذرا پہلے ''مسجد نواب قاسم جان'' قاسم جان اسٹریٹ، بلّی ماران آتے اور مذکورہ کتابوں کے اسباق حضرت الاستاذؒ سے پڑھتے۔ ایک بزرگ تاجر مسجد کے پڑوس کے حضرتؒ کے بے حد معتقد تھے، اللہ اُنھیں غریقِ رحمت کرے، وہ ہم سارے طلبہ کو کبھی لسّی اور کبھی پھلوں کا رس پلاتے اور بہت خوش ہوتے تھے۔ دہلی کا گلی کوچہ ویسے بھی ہر مسلمان کو محبوب ہے؛ کیوں کہ بہ قول علامہ حالی (مولانا الطاف حسین انصاری شمس العلما ۱۲۵۳ھ/ ۱۸۳۷ء-۱۳۳۳ھ/ ۱۹۱۵ء):

چپے چپے پہ ہے یاں گوہرِ یکتا تہِ خاک
دفن ہوگا نہ کہیں ایسا خزانہ ہرگز

اور بہ قول شاعرِ اسلام علامہ محمد اقبال (ڈاکٹر سر محمد اِقبال ۱۲۹۰ھ/ ۱۸۷۳ء-۱۳۵۷ھ/ ۱۹۳۸ء):

سرزمیں دِلّی کی مسجودِ دلِ غم دیدہ ہے
ذرّے ذرّے میں لہو اسلاف کا خوابیدہ ہے
پاک اِس اُجڑے گلستاں کی نہ ہو کیوں کر زمیں
خانقاہِ عظمتِ اسلام ہے یہ، سرزمیں
سوتے ہیں اِس خاک میں خیرالاُمم کے تاج دار
نظمِ عالم کا رہا جن کی حکومت پر مدار

دل کو تڑپاتی ہے اب تک گرمیِ محفل کی یاد
جل چکا حاصل؛ مگر محفوظ ہے حاصل کی یاد
دہلی.. آئی جب اُس کی یاد تو آتی چلی گئی

یہاں کے گلی کوچوں میں چلیے تو ایسا لگتا ہے، جیسے روحانیت اور ایک خاص قسم کی دینی کیفیّت نہ صرف مصافحہ ومعانقہ؛ بل کہ ہر سانس کے ساتھ روح کی گہرائیوں میں سرایت کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے، جس کی لذّت کا جس ہمہ گیر طور پر ایک باشعور مسلمان کو اِدراک ہوتا ہے، اُس کو وہ زبان وبیان کی ساری صلاحیتوں کے باوجود، صحیح طور پر بیان نہیں کرسکتا۔ ذرّے ذرّے میں دینی کیف اور اَن گنت خاصانِ خدا وشب زندہ دار علما وصلحا اور ہر فن کے باکمال اِنسانوں کی آہِ سحر گائی کے اثرات اور اُن کی بوسیدہ ہڈیوں کے سفوف کی جاں فزا وکیف آور ویقین افروز خوشبوئیں مشامِ جاں کو مُعطّر کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں ۔ فراؔق گورکھپوری (رگھوپتی سہائے ۱۸۹۶ء-۱۹۸۲ء) نے سچ کہا تھا:

دل جلے روئے ہیں شاید اس جگہ، اے کوئے یار!
خاک کا اتنا چمک جانا، ذرا دشوار تھا

لیکن بلّی ماران کا یہ بڑا علاقہ اور گلی قاسم جان کا نسبتاً چھوٹا خطّہ، جہاں ۱۹۷۰-۱۹۷۱ء میں ان گنت بار آنا جانا ہوا، اِتنا پیارا اور بھلا معلوم ہونے لگا تھا کہ جب اگست ۱۹۸۲ء/ شوال ۱۴۰۲ھ میں مادرِ علمی دارالعلوم دیوبند میں، بہ حیثیت استاذ ومدیر ''الداعی'' عربی تقرر ہوا اور اللہ پاک کی تقدیر سے اِنھی گلی کوچوں میں (جمعیت بلڈنگ، قاسم جان اسٹریٹ، دہلی میں) قیام کے لیے ''الداعی'' کے کاموں سے لاتعداد مرتبہ دہلی آنے جانے کے موقع سے، آنے جانے کا موقع ملا، تو وہ خوب صورت دن یاد آئے، جب حضرت الاستاذؒ کی حیات میں، اُن سے استفادے کے لیے، بار بار یہاں آتا تھا، شروع شروع میں کئی بار خوشی کے اِحساس سے آنکھیں اشک بار ہوگئیں۔ ''مسجد نواب قاسم جان'' میں بھی ''جمعیۃ بلڈنگ'' میں واقع دفتر ''الکفاح'' (۴) پندرہ روزہ عربی کے دفتر میں قیام کے دوران کئی

مرتبہ جمعہ کی نمازیں اور بہت سی مرتبہ پنج وقتہ نمازیں ادا کرنے کی سعادت حاصل ہوئی، کئی سال تک مسجد ہو بہ ہو وہی تھی، جو حضرت الاستاذؒ کے زمانے میں تھی، اُس میں کسی طرح کی ترمیم نہیں ہوئی تھی، اِسی مسجد کے ایک کمرے میں حضرت الاستاذ کا ذاتی تجارتی کتب خانہ ''کتابستان'' تھا؛ لیکن ۱۹۹۰ء اور ۲۰۰۰ء کے عرصے میں یہ، مسجد شہید ہوکر دوبارہ بہت خوب صورت، کئی منزلہ آر سیسی کی انتہائی مضبوط بن گئی ہے۔

جمعیۃ بلڈنگ گلی قاسم جان کا ذکر قلم کی زبان پر آ ہی گیا ہے، تو یہ بھی کیوں نہ ذکر کردیا جائے کہ اِسی جمعیۃ بلڈنگ میں اُس زمانے میں پابندی سے شائع ہونے والے جمعیۃ کے اردو ترجمان روز نامہ ''الجمعیۃ'' کا دفتر بھی تھا اور اُس وقت ۱۹۷۱ء-۱۹۷۲ء میں، اُس کے ایڈیٹر مشہور صحافی مولانا محمد عثمان فارقلیط (۱۳۰۴ھ/ ۱۸۸۷ء - ۱۳۹۶ھ/ ۱۹۷۶ء) تھے، جن سے بہتر اِداریے اور تبصرے کوئی اردو صحافی نہیں لکھ پاتا تھا، اِسی جمعیۃ بلڈنگ میں ہفت روزہ ''الجمعیۃ'' کا دفتر بھی تھا، اِس ہفت روزہ کے ایڈیٹر اُس وقت مولانا وحید الدین خاں تھے، جن کی رہایش بھی اِسی بلڈنگ میں تھی۔ اِسی ''جمعیۃ بلڈنگ'' میں ''جمعیۃ علما'' کا مشہور فقہی و تحقیقی ادارہ ''إدارۃ المباحث الفقہیۃ'' تھا، جس کے حضرت الاستاذ ہی مُحرِّک اور مُؤَسِّس تھے۔ یادش بہ خیر کہ اِسی اِدارہ مباحث فقہیہ کے دفتر میں، ۱۹۷۱ء (۱۳۹۱ھ) کی کسی تاریخ کو ملتِ اسلامیۂ ہندیہ کے بے باک قائد، دور بیں عالم اور مسلم پرسنل لا بورڈ کی تاسیس کے مُحرِّک و اولین جنرل سکریٹری امیرِ شریعت سید شاہ منت اللہ رحمانیؒ (۱۳۳۲ھ/ ۱۹۱۳ء-۱۴۱۱ھ/ ۱۹۹۱ء) حضرت الاستاذ کے مہمان کی حیثیت سے قیام پذیر ہوے اور اِس راقم کی خوش قسمتی کہ حضرت الاستاذ کے حکم سے یہی اُنھیں پرانی دہلی کے اسٹیشن سے اپنے ساتھ لاکر یہاں رکا یا اور جب تک وہ دہلی رہے اُن کی خدمت کی۔

دہلی سے دوری کی ناگزیر وجہ،

مدرسہ امینیہ میں شوال ۱۳۹۰ھ سے شعبان ۱۳۹۱ھ تک کا تعلیمی سال اِس طرح گزر گیا کہ کچھ زیادہ احساس نہ ہوا، شعبان کے بعد رمضان آیا، میں نے رمضان کے ابتدائی

ایّام مدرسہ امینیہ ہی میں گزارے۔ ایک روز صبح کو ۸-۹ بجے کے قریب مسجد کے حوض پر، جو مدرسے کے صدر دروازے کے مدخل پر مسجد کے صحن کے کنارے شمالاً وجنوباً لمبائی اور شرقاً وغرباً چوڑائی میں واقع ہے، وضو کررہا تھا کہ روز کی طرح رمضان کے آج کے مبارک دن کی ابتدا بھی تلاوتِ قرآنِ پاک سے کروں کہ اچانک صدر گیٹ سے حضرت الاستاذ کو اپنی چھڑی ٹیکتے مدرسے میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا؛ کیوں کہ میں مشرق کی طرف ہی رخ کرکے بیٹھا ہوا تھا، جدھر مدرسے کا صدر دروازہ ہے۔ میں نے وضو کو نا تمام چھوڑ آگے بڑھ کر حضرت کو سلام کیا اور ان کے دائیں ہاتھ میں دبے ہوئے کاغذات کے بوجھ کو اپنے ہاتھ میں لینا چاہا، تو حضرت نے منع فرمادیا۔ خیر خیریت دریافت فرماتے ہوئے استفسار فرمایا کہ آپ رمضان میں یہیں رہیں گے یا کہیں جانے کا اِرادہ ہے؟ میں نے عرض کیا: حضرت! میں تو یہیں رکوں گا؛ کیوں کہ میں نے سنا ہے کہ حال ہی میں مدینۂ منورہ میں کوئی جامعہ ''جامعہ اسلامیہ'' کے نام سے قائم ہوئی ہے(۵)۔ مجھے وہاں داخلہ لینے اور تعلیم حاصل کرنے کی بڑی خواہش ہے۔ اِس سلسلے میں حضرت کی خصوصی دعا اور مدد کا طلب گار ہوں۔ یہ سن کر حضرت حوض کے چبوترے پر بیٹھ گئے اور فرمایا: یہ، آپ نے بہت مشکل معاملہ میرے سامنے رکھ دیا ہے۔ بیرونِ ملک مجھے کوئی جانتا نہیں، سعودی عرب کے کسی عالم سے میرے تعلقات نہیں اور نہ یہ، معلوم ہے کہ وہاں داخلے کا طریقۂ کار کیا ہے؟ پھر معاً فرمایا: ہاں ایک بات ذہن میں آتی ہے کہ حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ (۱۳۱۹ھ/ ۱۹۰۱ء - ۱۴۰۵ھ/۱۹۸۴ء) سے اِس سلسلے میں معلوم کیا جائے۔ اُن کے تعلقات علما اور مشاہیرِ وقت سے میری بہ نسبت زیادہ ہیں۔ وہ شاید اِس سلسلے میں دست گیری اور راہ نمائی کریں۔ ایسا ہے کہ کل فجر کی نماز آپ میرے ساتھ ''مسجد نواب قاسم جان'' میں پڑھیں۔ میں آپ کو حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی صاحب کے ہاں لے چلوں گا اور اِس مسئلے میں اُن سے مدد کی درخواست کروں گا۔

حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ سے اُن کے دفتر میں ملاقات

راقم نے حضرت کے حکم کے مطابق، فجر کی نماز مسجد نواب قاسم جان، گلی قاسم جان

میں ادا کی، دعا کے بعد حضرت سے ملا، حضرت نے فرمایا کہ ابھی تو بہت سویرا ہے، میں تلاوت کے معمول سے فارغ ہو جاتا ہوں۔ آدھے گھنٹے بعد چلتے ہیں۔ حضرت اپنی چھڑی ٹیکتے ہوئے آگے آگے اور میں پیچھے پیچھے چلتا رہا، چاوڑی بازار کے راستے ہم جامع مسجد اردو بازار میں ''ندوۃ المصنّفین'' کے دفتر پہنچے، اندر داخل ہوئے، بھاری بھرکم سی دو منزلہ چوڑی چوڑی دیواروں والی دو منزلہ عمارت۔ ہم کشادہ گیلری میں جو خوب صورت خوب صورت گول گول پُر شکوہ کھمبوں پر قائم تھی، لکڑیوں کے پُرانے طرز کی شان دار کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ وہاں موجود خادم سے حضرت نے فرمایا کہ مفتی صاحب ہیں کہ نہیں؟ اُس نے کہا: ہیں؛ لیکن اِس وقت گھر ہوں گے، میں خبر کیے دیتا ہوں کہ مہمان آئے ہیں۔ حضرت نے فرمایا: یہ، کہنا کہ مدرسہ امینیہ سے محمد میاں آیا ہے۔ چند منٹ بعد مفتی صاحب تشریف لے آئے، علیک سلیک کے بعد، مفتی صاحب نے حضرت سے تشریف لانے کی وجہ، معلوم کی۔ حضرت نے فرمایا: یہ، مولوی نور عالم ہیں، ذی استعداد ہیں، عربی زبان سے خاصا شغف ہے، یہ، کہتے ہیں کہ مدینۂ منورہ میں کوئی جامعہ اِسلامیہ قائم ہوئی ہے اور وہاں دوسرے ملکوں کے طلبہ بھی لے لیے جاتے ہیں۔ یہ، بھی وہاں داخلے کی خواہش رکھتے ہیں۔ مجھے تو یہ، نہیں معلوم کی وہاں داخلے کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟ اِنھوں نے کل مجھ سے اپنی خواہش کا اِظہار کیا، تو میں نے اِن سے کہا کہ مفتی صاحب ہی کو اِس سلسلے میں کچھ معلوم ہو سکتا ہے؛ لہٰذا اُن سے مل کے کوئی صورت نکل سکتی ہے؛ میں صبح سویرے اِس لیے آ گیا کہ آپ کہیں نکل نہ جائیں۔

مفتی صاحب نے فرمایا: میری معلومات کے مطابق یہاں ہندوستان سے حضرت مولانا سید ابوالحسن ندوی اور پاکستان سے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کو اُس کی مجلسِ شوریٰ یا مجلسِ منتظمہ میں لیا گیا ہے، میرا اندازہ ہے کہ اگر مولانا ندوی نے سفارش لکھ دی، تو اِن کا داخلہ بالضرور وہاں ہو جائے گا، میں اُنھیں خط لکھے دیتا ہوں، یہ، اپنی درخواست کے ساتھ اِس کو اُن کے پاس رجسٹری بھیج دیں۔ اِن شاء اللہ وہ ضرور سفارش لکھ دیں گے۔ حضرت نے فرمایا: آپ تو خط تحریر فرما ہی دیں، میں بھی اُنھیں لکھوں گا؛ تاکہ مزید تاکید ہو جائے۔ ایک

اچھی تقریب یہ، بھی بن گئی ہے کہ ابھی چند روز قبل مولانا نے اپنی کتاب ''مختارات'' کی جلدیں میرے پاس رائے جاننے کے لیے بھیجی ہیں۔ میں کتاب پر اپنی رائے کے ساتھ ساتھ؛ اِن کے لیے سفارش کی درخواست بھی کر دوں گا۔

اُسی چاوڑی بازار، جو جامع مسجد کے جانبِ غرب میں واقع ہے، کے راستے سے ہم لوگ گلی قاسم جان کے لیے روانہ ہوے۔ حضرت نے راستے میں اِس ناچیز سے کہا: آپ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں داخلے کی درخواست عربی میں تیار کرلیں اور اپنے خطِ نسخ میں، جسے آپ خوب صورت لکھتے ہیں، اُس کو خوش خط لکھ لیں۔ میں آج ہی مولانا ندوی کے نام خط لکھ رکھتا ہوں، اِن شاء اللہ کل ہم رجسٹری بھیج دیں گے۔

جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں داخلے کے لیے، درخواست

اردو بازار جامع مسجد میں اُن دنوں خوش نویسی کے لوازمات کی ایک دُکان تھی۔ راقم نے چند ہی روز قبل اُس دکان سے جرمنی کا بنا ہوا قلم کا ایک پرس نما بکس خریدا تھا، جس میں خطِ نستعلیق وخطِ نسخ وخطِ رقعہ لکھنے کے لیے، کئی طرح کے موٹے اور باریک قلم اور لکیر کھینچنے کے بھی دو تین قلم تھے۔ میں اُنھیں لے کر بیٹھ گیا۔ میرے پاس بہت اچھا سفید قدرے دبیز کاغذ تھا، ''سن لائٹ'' میں نے اُس میں سے فُلس کیپ (Foolscap) سائز کے دو تین صفحات علاحدہ کیے۔ پہلے فاؤنٹین پن (Fountain pen) سے ایک صفحے پر عربی میں درخواست لکھی، پھر اُنھی مذکورہ قلموں سے دوسرے صفحے پر خطِ نسخ میں، جیسے حضرت الاستاذ مولانا وحید الزماں قاسمی کیرانویؒ (۱۳۴۹ھ/ ۱۹۳۰ء - ۱۴۱۵ھ/ ۱۹۹۵ء) نے ٹائپ رائٹر (Type writer) کی تحریر کی طرح کٹے کٹے انداز میں لکھنا سکھایا تھا، اُسے بڑے اہتمام سے خوش خط لکھا اور دوسرے دن ۸-۹ بجے صبح کو مدرسہ امینیہ میں حضرت کی آمد کے وقت، اُن کی خدمت میں پیش کیا۔ حضرت کا معمول تھا کہ وہ رمضان المبارک میں بھی پابندی سے ۸-۹ بجے مدرسے آتے اور ۱۲ بجے کے قریب تشریف لے جاتے؛ کیوں کہ وہ شیخ الحدیث وصدر مدرس کے ساتھ ساتھ، صدر مفتی بھی تھے اور رمضان المبارک میں بھی لوگ

کثرت سے فتویٰ لینے آیا کرتے تھے؛ اِس لیے کہ مفتیِ اعظم حضرت مولانا محمد کفایت اللہؒ (۱۲۹۲ھ/ ۱۸۷۵ء-۱۳۷۲ھ/۱۹۵۲ء) کی ذاتِ گرامی کی وجہ، سے فقہ، وفتویٰ کے حوالے سے، مدرسہ امینیہ کو جو شہرت ملی تھی، وہ ہنوز قائم تھی۔ دہلی کا کوئی اور مدرسہ اِس حوالے سے مدرسہ امینیہ کا ہم سر نہ تھا۔

حضرت کچھ دیر تک تحریر کو دیکھتے رہے۔ میں نے دل میں خیال کیا کہ شاید حضرت کو حسنِ تحریر پسند آیا ہے؛ اِسی لیے اسے بار بار اُلٹ پلٹ کے دیکھ رہے ہیں؛ لیکن زبان سے میرے سامنے پسندیدگی کی غمازی کرنے والا کوئی لفظ نہیں کہا۔ دوسرے روز صبح کو اِرشاد فرمایا کہ میں نے حضرت مولانا علی میاں صاحب کو لکھا ہے کہ ہم رشتہ درخواست کی عربی زبان اور اُس کی کتابت دونوں ہی درخواست دہندہ کی ہیں، اگر اِن سے اُس کی کسی صلاحیّت کا اندازہ ہو، تو آں محترم اُس کے لیے ضرور سفارش تحریر فرمادیں، بہ صورتِ دگر میں آپ کو مجبور نہیں کرسکتا۔ اُس وقت میں نے محسوس کیا کہ حضرت کو نہ صرف میری خوش خطی؛ بل کہ درخواست کی عربی زبان بھی، اِس حد تک پسند آئی کہ آپ نے حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ کو پُراعتماد لہجے میں سفارش تحریر فرمادینے کی بات کہی، گویا آپ کو یقین تھا کہ عربی زبان کے مولانا علی میاں جیسے رمز آشنا فاضلِ بے بدل، ایک نوعمر طالبِ علم کی اِس تحریر کے ''ظاہر'' و ''باطن'' سے اِتنا مُتأثّر تو ضرور ہوں گے کہ وہ ایسی سفارش لکھ دیں گے کہ جامعہ اِسلامیہ مدینۂ منورہ میں اُس کا داخلہ یقینی ہو جائے گا۔

درخواست پر حضرت مولانا علی میاںؒ کی تصدیق

یہ، درخواست اور ہم رشتہ حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ، حضرت الأستاذؒ، نیز حضرت مولانا حفیظ الرحمٰن واصفؒ (۱۳۲۸ھ/ ۱۹۱۰ء-۱۴۰۷ھ/ ۱۹۸۷ء) مہتمم مدرسہ امینیہ کے خطوط اواخرِ رمضان میں حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ کو رجسٹرڈ ڈاک سے بھیجے گئے، جو یقیناً حضرت مولاناؒ کو شوال میں موصول ہوے ہوں گے۔ رمضان کے معمولات کی وجہ، سے، شوال میں بھی علمی وتالیفی کاموں کی بھیڑ رہی ہوگی اور ہوسکتا ہے کہ ضروری اَسفار

بھی رہے ہوں، جو وہ کثرت سے کیا کرتے تھے؛ اِس لیے میری درخواست پر اُن کی سفارش اور حضرت الاستاذؒ کے نام اُن کا مکتوب گرامی، حضرت الاستاذؒ کو ذی قعدہ کے اواخر میں ملا۔ یہ، ناچیز اُن دنوں دیوبند گیا ہوا تھا، جہاں عیدالاضحیٰ کے ایّام اپنے ہم درسوں اور ہم قریہ، دوستوں کے ساتھ گزرے۔ یہاں ایک ماہ کے قریب قیام رہا۔ میں احتیاطاً حضرت کو دو ایک لفافے دے آیا تھا، جن پر دیوبند کا میرا پتہ درج تھا کہ حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ کا اگر اِس اثنا میں جواب آئے اور حضرت مجھے اُس سے بروقت مطلع کرنا ضروری سمجھیں، تو مطلع فرما دیں۔

عیدالاضحیٰ ۱۳۹۱ھ کے نصف اور فروری ۱۹۷۲ء کے اوائل کی کسی تاریخ کو میں اپنے دیرینہ حجرے ۳۰/۳ دارجدید (جو مدنی گیٹ اور باب الظاہر سے آتی ہوئی دارجدید کے کمروں کی دونوں لائنوں کے سنگم پر دوسری منزل پر واقع تھا اور اُس کے سامنے نسبتاً کم اونچا ایک کمرہ بنا ہوا تھا، جس کی چھت اُس کمرے ۳۰/۳ کے لیے صحن کا کام دیتی تھی) کے صحن میں بیٹھا غسلِ آفتابی کر رہا تھا؛ کیوں کہ یہ جاڑے کے دن تھے، کہ ۱۱ بجے کے قریب ''پیارے'' ڈاکیہ نے ''نور عالم مظفر پوری'' کہ کر صحن میں میرے نام کا لفافہ اُچھال دیا۔ لفافے کی پشت پر جیسے ہی میں نے محمد میاں، کتابستان، گلی قاسم جان، دہلی ۶ لکھا ہوا دیکھا کہ میں سمجھ گیا کہ حضرت الاستاذؒ نے، حضرت مولانا علی میاںؒ کے جواب کے تعلق سے کوئی بات لکھی ہوگی۔ میں نے جلدی میں لفافے کو چاک کیا، تو حضرتؒ کی اِس مضمون کی تحریر میرے سامنے تھی:

> عزیز محترم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ
>
> مزاجِ عزیز؟۔ حضرت مولانا علی میاں صاحب نے آپ کی درخواست پر بہت اچھی سفارش لکھی دی ہے، ساتھ ہی اُنھوں نے میرے نام اپنے مکتوبِ گرامی میں جو کچھ تحریر فرمایا ہے، اُس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ آپ کی تحریر کی زبان اور حسنِ خط سے بہت مُتأثّر ہوئے۔ اُنھوں نے لکھا ہے کہ میں عرصے سے ندوۃ العلما کا ناظم ہوں، مجھے یاد نہیں پڑتا کہ کسی نوعمر طالب علم کا اِتنا

پاکیزہ خط میری نظر سے گزرا ہو۔ درسِ نظامی میں میرے علم کے مطابق عموماً عربی تحریر و انشا کی مشق کما حقہ نہیں کرائی جاتی؛ لیکن اِس طالب علم کی عربی درخواست میں، جو اُس نے آں محترم کی تحریر کے مطابق، خود تیار کی ہے، زبان اور صرف و نحو کے حوالے سے کسی طرح کی فروگزاشت نہ ہونا، خوش آیند بات ہے۔ توقّع ہے کہ جامعہ اسلامیہ، مدینۂ منورہ میں اُنھیں قبول کرلیا جائے گا۔ اِس کارروائی میں عموماً خاصا وقت لگ جاتا ہے اور گنجایش نہ ہونے کی صورت میں جامعہ کی انتظامیہ امیدوار طالبِ علم کے داخلے کو آیندہ تعلیمی سال کے لیے معلّق کر دیتی ہے۔ ہندوستان میں مَیں بھی عربی زبان کا طالب علم ہوں، آپ کے تلمیذِ رشید اگر مجھ سے یہاں لکھنؤ یا رائے بریلی میں ملیں، تو مجھے خوشی ہوگی۔

حضرت مولانا علی میاں صاحب کے اِس انتہائی حوصلہ افزا خط کے بعد، اب آپ کا کام اِس وقت یہ، ہے کہ آپ بہ عجلت تمام دہلی آجائیں اور مولانا سے ملنے کے لیے لکھنؤ چلے جائیں۔ کرایے کے لیے روپے شاید آپ کے پاس نہیں ہوں گے، تو وہ میں دوں گا۔

دعا گو و دعا جو

محمد میاں

حضرت مولانا علی میاں کی خدمت میں

دو تین دن کے اندر میں دہلی آیا، حضرتؒ سے ملا اور لکھنؤ کے سفر کی ترتیب قائم کی۔ ذی الحجہ ۱۳۹۱ھ کے اواخر اور فروری ۱۹۹۲ء کے اواسط میں، میں دہلی لکھنؤ میل سے، نئی دہلی سے لکھنؤ کے لیے ۹-۱۰ بجے رات میں روانہ ہوا۔ صبح کو ۷-۸ بجے لکھنؤ ''چار باغ اسٹیشن'' اور وہاں سے گومتی ندی کے ساحل پر، ٹیگور مارگ پر واقع دارالعلوم ندوۃ العلما پہنچا، دہلی کے ایک طالبِ علم (جو دارالعلوم ندوۃ العلما میں زیرِ تعلیم تھے) جس کا حضرت نے ہی نام و پتا دیا تھا، سے ملا، خبر خیریت معلوم کرنے کے بعد وہ مجھے لے کر مہمان خانہ آئے کہ حضرت مولانا علی میاں صاحب ابھی صبح کو یہیں تھے؛ لہٰذا اُن سے بروقت ملاقات ہوجائے گی؛ لیکن وہاں موجود ایک صاحب نے بتایا کہ حضرت مولانا ابھی چند منٹ پہلے رائے بریلی روانہ ہوگئے

ہیں۔ آپ فوراً اسٹیشن ''چار باغ'' چلے جائیے، آپ کو فلاں گاڑی مل جائے گی اور آپ ظہر کے وقت تک مولانا کے گاؤں ''تکیہ کلاں'' رائے بریلی پہنچ جائیں گے۔

الغرض میں اسٹیشن آیا، رائے بریلی کا ٹکٹ لیا، گاڑی میں بیٹھا ہی تھا کہ وہ چل پڑی رائے بریلی اسٹیشن پر اُتر کر میں نے رکشا لیا اور مولانا کے گاؤں ''تکیہ کلاں'' پہنچا۔ مہمان خانے میں اپنا سامان رکھا، وہاں موجود ایک صاحب سے میں نے کہا کہ مجھے حضرت مولانا علی میاں صاحب سے ملنا ہے۔ اُنھوں نے کہا: وہ بھی ابھی ابھی لکھنؤ سے آئے ہیں، چوں کہ ظہر کی اذان ہو چکی ہے؛ اِس لیے وہ مسجد تشریف لے گئے ہیں، آپ بھی مسجد ہی چلے جائیے، وضو وغیرہ کا وہیں نظم ہے، وہیں حضرت مولانا سے ملاقات بھی ہو جائے گی۔ میں مسجد آیا، تو حضرت مولانا سنّت پڑھ رہے تھے۔ اُن کے خادم عبدالرزاق صاحب (اور اب الحاج عبدالرزاق صاحب) نے مجھے اجنبی جان کر فوراً مجھ سے پوچھا کہ آپ کون ہیں اور کہاں سے آئے ہیں؟ میں نے اپنا نام بتایا اور یہ، کہ میں دہلی سے آیا ہوں، حضرت مولانا سید محمد میاں دہلوی کا شاگرد ہوں، اُنھوں نے حضرت مولانا علی میاں صاحب کی فرمایش کے مطابق مجھے اُن سے ملنے کے لیے بھیجا ہے۔ میں وضو کر کے آیا، تو حضرت مولانا سنّت سے فارغ ہو چکے تھے اور بھائی عبدالرزاق میری بابت اُنھیں بتا چکے تھے۔ میں نے حضرت کو سلام کیا اور مصافحہ کرنے کے لیے ہاتھ بڑھایا، تو اُنھوں نے فرمایا کہ آپ حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب کے صرف شاگرد ہیں یا عزیز قریب؟ میں نے عرض کیا: صرف ایک ادنیٰ شاگرد۔ حضرت نے فرمایا اِس زمانے میں کوئی استاد اپنے شاگرد سے شاید و باید ہی اتنی محبت کرتا ہوگا، جتنی مولانا آپ سے کرتے ہیں۔ اِس سال مختلف تقریبوں سے اُن کے میرے پاس جتنے خطوط آئے، ہر ایک میں اُنھوں نے آپ کا ذکرِ خیر ضرور کیا اور یہ، کہ آپ کو عربی زبان سے بہت تعلق ہے۔

دنیا میں عام طور پر یہ، ہوتا ہے کہ لوگ کسی کے تعلُّق سے کرتے کم ہیں اور کہتے زیادہ ہیں؛ بل کہ بعض لوگ تو ایسے ستم ظریف بھی ہوتے ہیں کہ کچھ بھی نہیں کرتے؛ لیکن

جتاتے بہت ہیں۔ اور اگر تھوڑا بہت بھولے بھٹکے میں واقعی کچھ کر دیں، تب تو اِتنا اِحسان دھرتے ہیں کہ وہ بیچارہ شرم سے گٹھری ہو جاتا ہے۔ حضرت الأستاذ رحمۃ اللہ علیہ کی شرافت ورحم دلی اور بے کسوں کی تاحدِّ اِمکان دست گیری کی صفات کا مجھے اُن کی یک سالہ صحبت میں اچھی طرح اندازہ ہو گیا تھا؛ لیکن مجھے یہ، قطعاً اندازہ نہ تھا کہ وہ مجھے اپنے لختِ جگر کی طرح سمجھتے اور میری ذات کی تعمیر اور مستقبل کو سنوارنے کے لیے، اُسی طرح کوشاں رہتے ہیں جیسے کوئی دردمند باپ اپنے سپوت اور اِنتہائی فرماں بردار بیٹے کے لیے ہی ہوا کرتا ہے۔ حضرت مولانا علی میاںؒ جس وقت مذکورہ بالا اَلفاظ اِرشاد فرما رہے تھے، حضرت الاستاذؒ کے تئیں شکر وسپاس کے بے طرح جذبات سے میرا سینا اِس طرح لبریز ہو رہا تھا کہ لگتا تھا کہ وہ شق ہو جائے گا۔

تکیے کا قیام

حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ کا معمول تھا کہ دوپہر کا کھانا وہ مہمانوں اور اپنے خدام واَعزّہ کے ساتھ، اپنے مہمان خانے میں ظہر کی نماز کے بعد تناول فرماتے تھے، چناں چہ دسترخوان بچھا اور حضرت کے ساتھ سارے حاضرین کھانے پر بیٹھ گئے، حضرت نے مجھے اپنے سامنے بٹھایا، کھانے کے دوران میرا اور حضرت الأستاذ کا اَحوال معلوم کرتے رہے۔ کھانے کے بعد قیلولے کے لیے گھر جانے سے قبل، مہمان خانے کی اَلماریوں میں سے ایک اَلماری سے مشہور اہلِ قلم و ادیب ومؤرخ ڈاکٹر احمد اَمین مصریؒ (۱۲۹۵ھ/ ۱۸۷۸ء-۱۳۷۳ھ/۱۹۵۴ء) کی خود نوشت سوانحِ عمری ''حَيَــاتِـي'' نکال کر مجھے دی اور فرمایا کہ آپ یہ، کتاب پڑھیے، آپ کا جی بھی لگے گا اور بہت فائدہ ہوگا۔ دوسرے روز صبح ناشتے پر حضرت نے فرمایا: آپ نے یہ، کتاب کتنی سمجھی؟ میں نے عرض کیا: ۶۵-۷۰ فی صد سمجھ میں آتی ہے اور ۳۰-۳۵ فی صد الفاظ وتعبیرات میرے لیے یکسر نامعلوم ونامانوس ہیں۔ حضرت نے فرمایا: یہ، آپ کی بہت بڑی کام یابی ہے؛ کیوں کہ آپ جس نصابِ تعلیم کے فارغ ہیں، عموماً وہاں آج کی عربی نثر ونظم کا چلن نہیں ہے؛ اِس لیے آپ کا اِتنا سمجھ لینا، آپ

کی ذاتی محنت اور عربی سے تعلق کی دلیل ہے۔ پھر حضرت نے فرمایا کہ آپ دہلی میں اِس وقت کیا کرتے ہیں؟ میں نے عرض کیا: بس یوں ہی آزاد مطالعہ کرنے کے لیے، ٹھکانے کے طور پر فراش خانہ دہلی ٦ کے ''کٹرہ ہنجّی'' کی ایک مسجد میں امام کے طور پر ذمے داری لے رکھی ہے۔ حضرت نے فرمایا: آپ چاہیں تو میرے ساتھ رہیے۔ میں رائے بریلی رہوں تو یہیں رہیے، لکھنؤ جاؤں تو وہاں ساتھ رہیے اور اگر اندرونِ ملک یا بیرونِ ملک میرا طویل سفر ہو، تو آپ دارالعلوم ندوۃ العلما میں رہیے، وہاں کتب خانے سے فائدہ اٹھایئے، میں وہاں آپ کے قیام وطعام کا نظم کردوں گا۔ آپ کا خط بہت پاکیزہ ہے، میں بھی آپ سے فائدہ اُٹھاؤں گا، بالخصوص عربی تحریر کے حوالے سے۔ میں نے عرض کیا: حضرت! میں تو صرف تین دنوں کے لیے بہ حیثیت مہمان آیا تھا؛ کیوں کہ حضرت الأستاذؒ کا حکم تھا کہ صرف تین دن رہنا، اِس سے زیادہ قیام کی شکل میں آدمی مہمان نہیں رہتا؛ بل کہ میزبان کا کھانا صدقے کا کھانا ہوجاتا ہے؛ چناں چہ میں نے کل کا ٹکٹ لے رکھا ہے، آج حضرت کے ہاں قیام کا دوسرا دن ہے، اب آپ کا حکم ہو، تو میں لکھنؤ جاکر خود یا کسی کو بھیج کر ٹکٹ لکھنؤ تا دہلی واپس کروادوں اور حضرت الأستاذ کو رجسٹری جوابی خط لکھ کے اُن کا عندیہ معلوم کرلوں؟ حضرت نے فرمایا: ہاں آپ حضرت مولانا سے اُن کی رائے معلوم کرلیں، اُن کی اِجازت کے بغیر آپ کا اپنے تئیں کوئی فیصلہ ناروا ہوگا۔ ٹکٹ واپس کرنے کے لیے آپ خود نہ جایئے، ہمارے ہاں سے کوئی نہ کوئی ابھی تھوڑی دیر میں یا شام کو لکھنؤ ضرور جائے گا، میں اُس کے ذریعے مولوی طاہر (٦) کو آپ کا ٹکٹ بھجوادوں گا، وہ واپس کرادیں گے۔

تکیے پر قیام کے لیے حضرت کی منظوری

ہفتہ عشرہ میں حضرت الأستاذ کا جواب آیا کہ آپ حضرت مولانا علی میاں کی فرمایش کی ضرور تعمیل کریں، یہ، بڑی سعادت کی بات ہے کہ اُنھوں نے ازخود اپنے پاس رُکنے کا مشورہ دیا، وہاں کے قیام سے آپ کی علمی صلاحیت پختہ ہوگی۔ البتہ روزمرّہ کے مصارف کے لیے آپ کو پریشانی ہوسکتی ہے، اِن شاء اللہ میں وقتاً فوقتاً کچھ نہ کچھ پیش کرنے

کی کوشش کروں گا۔

چناں چہ میں حضرت مولانا علی میاں کی خدمت میں رہ گیا۔ اکثر تو تکیہ ہی پر قیام رہا اور بیچ بیچ میں کچھ دنوں کے لیے دار العلوم ندوۃ العلما لکھنؤ میں۔ اُن دنوں حضرت مولانا، عربی خطوط یا عربی مضامین اور کتابیں، عموماً مجھے ہی اِملا کراتے تھے اور عربی تحریر سے مسرت کا اظہار فرماتے تھے۔ دگر کئی طرح کے علمی کاموں میں حضرت مجھ سے خدمت لیتے رہے۔ مجھے اِس قیام سے جو بے پناہ فائدہ ہوا، اُس کو صحیح طور پر بیان نہیں کیا جاسکتا۔

حضرت الاستاذؒ نے، حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ کی خدمت میں تکیہ کلاں اور لکھنؤ قیام کے دوران، نہ صرف اپنے مکتوبات کے ذریعے میری راہ نمائی کی، ڈھارس بندھائی اور ہم دردی وغم گساری کی؛ بل کہ دو تین دفعہ مادی مدد بھی کی، جس کی وہاں کے قیام کے دوران سخت ضرورت تھی؛ کیوں کہ حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ کے وطن ''تکیہ کلاں'' میں خور ونوش اُن کے ساتھ ہوتا تھا اور لکھنؤ میں قیام کے دوران دار العلوم ندوۃ العلما کے مطبخ سے اُنھی کے حکم سے ناشتہ دان میں صبح وشام کا کھانا آجاتا تھا؛ لیکن دگر ضرورتوں کے لیے مجھے نقد رقم کی سخت ضرورت رہتی تھی، سچ یہ ہے کہ میں نے یہ، دن بڑی کس مپرسی کے عالم میں گزارے، حضرت الأستاذ کی دو تین دفعہ کی اِمداد بھی کئی ماہ کے قیام کے دوران ناکافی ہوتی تھی؛ لیکن اللہ اُنھیں اپنی جنت میں بہترین بدلہ دے کہ اُنھوں نے میری دیکھ ریکھ اور خبر گیری میں اپنی حد تک کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ لکھنؤ آمد کے دو تین روز بعد ہی میں نے حضرتؒ کو جو خط لکھا، اُس کے جواب میں آپ نے ۱۵ روپے کا منی آرڈر اِرسال فرمایا اور اُس کے کوپن پر تحریر فرمایا کہ:

> عزیز محترم! زادتْ مزایاکم وفُزْتُمْ بمقاصدکم
>
> السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ
>
> لفافہ پہنچا، حالات معلوم ہوئے، اللہ تعالیٰ آپ کو اَعلیٰ مقاصد میں کام یابی بخشے۔ مبلغ پندرہ روپے، ضروریات کے لیے اِرسال ہیں۔ اللہ تعالیٰ توفیق

بخشے کہ آپ کے قیامِ لکھنؤ تک ماہانہ پیش کرتا رہوں۔ دعا فرمایئے۔ حضرت مولانا (علی میاں) کا خط ساجد سلمہ کو مل گیا تھا، سفیر صاحب سے تو ملاقات نہیں ہوئی، اُن کے سکریٹری نے ایک انگریزی مضمون کا عربی ترجمہ کرایا، تقرر کی اطلاع وہ بہ ذریعہ ڈاک دیں گے، پتہ لے لیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کامیابی بخشے۔ دعا کیجیے (۷)۔ حضرت مولانا کی خدمت میں نیاز مندانہ سلام پیش کر دیں۔

محمد میاں

۱۵؍محرم الحرام ۱۳۹۲ھ = ۴؍مارچ ۱۹۷۲ء

مذکورہ بالا مکتوب میں حضرت الاستاذؒ نے، صاحب زادۂ گرامی کے سعودی سفارت خانے میں ملازمت کے لیے ٹیسٹ دینے اور اُنھیں انتخاب میں ترجیح دینے کے لیے، حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ کے سفارشی مکتوب کے موصول ہو جانے کی طرف جو اِشارہ فرمایا ہے، تو دوسرے مکتوب میں، جس پر تاریخِ تحریر درج نہیں ہے، اُن کا وہاں تقرر کر لیے جانے اور اُن کے وہاں سرگرم کار ہو جانے کی اِن اَلفاظ میں خوش خبری دی اور حضرت مولانا علی میاںؒ کا اپنی طرف سے شکریہ ادا کرنے کا، اِس ناچیز کو مُکلَّف فرمایا:

عزیز محترم! زادت معالیکم

سلام مسنون۔ عرصے سے خط نہیں آیا، خیریت نہیں معلوم ہوئی۔ حضرت مولانا ابوالحسن علی میاں صاحب زاد مجدہم کا گرامی نامہ ہتھورا، باندہ سے آیا تھا، وہ واپس تشریف لے آئے ہوں گے، تو اُن کی خدمت میں سلام عرض کر دیجیے۔ ساجد سلمہ، کا تقرر فرمالیا گیا ہے، الحمدللہ۔ وہ بھی بھرپور کام کر رہا ہے، اگرچہ دن بھر کھانے سے محروم رہتا ہے، صبح ۸ بجے جاتا ہے، کھانا لے جانا خلافِ شان ہے؛ مگر الحمدللہ وہ مطمئن ہے اور کام سے بھی بفضلہٖ تعالیٰ مطمئن ہے۔ پہلے جو صاحب تھے، اُن کا مشاہرہ ۵۰۰ روپے تھا اور اس کا مشاہرہ ۷۰۰ سات سو روپے تحریر فرمایا ہے اور وہ ماہِ محرم کا ۱۲ دن کام کرنے کا ادا بھی کر دیا ہے۔ حضرت مولانا کا مزید شکریہ اور درخواست دعا۔ ''مشکاۃ الآثار'' (۸) حضرت مولانا کی

خدمت میں پہنچ چکی ہے؟ اُس کا تذکرہ فرما دیجیے۔ والسلام

نیاز مند محتاجِ دعا

محمد میاں

حضرت کا مکتوب کہ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں اِس سال راقم کا داخلہ نہیں ہو سکا

اپریل ۱۹۷۲ء کے اواخر میں حضرت الاستاذؒ کا خط ملا، جس سے معلوم ہوا کہ جامعہ اِسلامیہ مدینہ منورہ سے میری درخواست کے حوالے سے یہ، اِطّلاع دی گئی ہے کہ اِس سال داخلہ نہ ہو سکے گا، جگہ، پُر ہو چکی ہے؛ لیکن آیندہ سال ضرور لے لیا جائے گا؛ لیکن میں اپنی شدید بے مایگی کی وجہ، سے، آیندہ سال کے لیے اِنتظار نہیں کر سکتا تھا؛ کیوں کہ میرے گھر پر کوئی میرا سہارا نہ تھا، صرف والدہ محترمہ ــــ اللہ صحت کے ساتھ اُن کی عمر دراز کرے ــــ تھیں؛ اِس لیے وہاں داخلہ نہ ہونے کی صورت میں، اب ضروری تھا کہ میں تدریس وغیرہ کی خدمت کے ذریعے، روزی روٹی کی کوئی سبیل پیدا کروں۔ میرے ایسے بے بس و بے کس اِنسان کے لیے زندگی کے اِس مرحلے میں محض صلاحیت کی پختہ کاری ایک بے سود عمل تھا۔ میں نے جھجکتے ہوے یہ، سارا اَحوال تفصیل سے، حضرت الاستاذؒ کو لکھا اور گزارش کی کہ حضرت میرے لیے بہ عجلتِ ممکنہ کوئی راہ پیدا فرما دیں۔ حضرت نے اُس کے جواب میں یہ، والا نامہ تحریر فرمایا:

عزیزِ محترم مولانا نور عالم صاحب مظفر پوری زادت معالیکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاجِ عزیز؟

نامۂ عزیز مؤرخہ ۸؍ربیع الثانی ۱۳۹۲ھ = ۲۲؍مئی ۱۹۷۲ء، کاشفِ حالات ہوا۔ آپ کی پریشانیوں کا علم ہو کر سخت افسوس اور قلق ہوا۔ آپ کو بالواسطہ والدہ محترمہ کے حالات کا علم ہوا۔ کیا آپ نے والدہ محترمہ کو موجودہ پتے

کی خبر نہیں دی۔ آپ نے تحقیقِ حال کے لیے، مکان خط لکھا ہوگا۔ خدا کرے خیریت کی اِطّلاع آ گئی ہو اور آپ مطمئن ہوں۔

کسی مشغلے کا نہ ہونا واقعی بہت تکلیف دہ اور باعثِ پریشانی ہے، اِس سے اِنسان کی صلاحیتوں پر بُرا اثر پڑتا ہے۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ آپ کو کوئی بہتر مشغلہ عنایت فرما دے۔ جہاں تک دہلی یا دیوبند کا تعلق ہے، اگر کوئی صورت نکل سکتی، تو آپ کو کہنے کی ضرورت نہیں تھی، احقر خود کوشش کرتا؛ مگر اِن دونوں جگہ پر فی الحال کوئی صورت ہے، نہ مستقبل قریب میں کوئی توقع ہے۔

کلکتّے کے ایک صاحب ہیں شیخ غلام رسول، بہت دولت مند آدمی ہیں، تبلیغی جماعت کے اہم ترین کارکن؛ بل کہ بنیادی رکن، حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب سے خاص عقیدت رکھتے ہیں۔ مولانا علی میاں کا تعلق بھی بہت مؤثر ہے۔ اُن کا کلکتے میں ایک مدرسہ ہے، معلوم ہوا ہے کہ اُس مدرسے میں ایک استاد کی ضرورت ہے، احقر نے اُن کو آپ کے متعلق لکھا ہے، عربی کے سلسلے میں آپ کی خصوصیات بھی تحریر کر دی ہیں۔ احقر نے اُن کو لکھا ہے کہ اگر بالفرض کوئی جگہ، نہ بھی ہو تب بھی مولوی نور عالم صاحب کے لیے، جو عربیّت سے خاص شغف رکھتے ہیں اور عربیّت میں اُن کو خاصی دسترس ہے، کوئی جگہ، پیدا کریں۔ خدا کرے احقر کی تحریر کام یاب ہو اور آپ کے لیے کوئی مشغلہ نکل آئے۔ جواب آنے پر آپ کو مطّلع کروں گا؛ لیکن یہ نہیں معلوم کہ اب آپ کہاں ہیں؟ لکھنؤ ہیں یا مکان چلے گئے ہیں؟ احقر کے خیال میں آپ کو مکان چلا جانا چاہیے اور وہاں سے بہ ذریعہ مراسلت کسی جگہ، کام یابی کی کوشش کرتے رہتے۔

حضرت مولانا علی میاں صاحب بھی اُن کو خط تحریر فرما دیں، تو امید ہے کہ وہ احقر کے خط سے زیادہ مُؤثّر ہوگا۔ مناسب سمجھیں تو احقر کا یہ، عریضہ مولانا کو سنا دیں۔

باقی حالات بہ دستور ہیں، دعاؤں کا محتاج ہوں۔ ساجد اور اُن کے بہن بھائی وغیرہ سب خدا کے فضل سے خیریت سے ہیں۔ والسلام

نیاز مند محتاجِ دعا
محمد میاں
۱۵؍ربیع الثانی ۱۳۹۲ھ

حضرت مولانا علی میاںؒ کو، حضرت الاستاذ کے خط کے مضمون سے آگاہی

حضرت الأستاذؒ کے مشورے کے مطابق، ناچیز نے مذکورہ بالا مکتوبِ گرامی کے مضمون سے حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ کو آگاہ کیا اور اپنے طور پر بھی گزارش کی کہ حضرت! یہ، ناچیز یہاں حضرت کی خدمت میں کئی ماہ سے مقیم ہے، اِطمینان کی صورت ہوتی تو وہ جتنا حضرت کی خدمت میں رہتا، اُس کے لیے دینی وعلمی ہر اعتبار سے بہت مفید تھا؛ لیکن اُس کی بے مایگی اِس بات کی متقاضی ہے کہ وہ بغیر کسی تاخیر کے، کسی جگہ، تدریسی یا غیر تدریسی مشغلے میں لگ جائے۔ حضرت نے سنتے ہی فرمایا: مولوی نور صاحب(۹) میں نے تو اپنے رفقاے کار سے مشورے سے طے کرلیا ہے کہ مئی کی چھٹی(۱۰) کے بعد آپ کو اِن شاءاللہ دارالعلوم ندوۃ العلما میں تدریسی خدمت کے لیے رکھ لیں گے، آپ کہیں اور جگہ، کے لیے تگ ودو چھوڑ دیجیے۔ میں حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب کو بھی، اُن کی رائے جاننے کے لیے، آج کل میں عریضہ لکھنے والا ہوں۔ توقّع ہے کہ وہ آپ کی یہاں تدریس کے لیے رضامند ہو جائیں گے۔

حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ کے یہ، فرمانے کے بعد میں یک سو ہو گیا اور اُسی دن حضرت کو لکھا کہ حضرت مولانا علی میاں صاحب دارالعلوم ندوۃ العلما میں تدریسی خدمت کی انجام دہی کے لیے تقرر فرمانے کی بات کہ، رہے تھے، شاید آپ کو بھی حضرت نے بہ راہِ راست لکھا ہوگا، جیسا کہ وہ فرما رہے تھے؛ لیکن حضرت کے مشورے اور رضامندی کے بغیر ظاہر ہے کہ یہ، ناچیز کوئی فیصلہ نہیں کرسکتا؛ اِس لیے حضرت بہ عجلت تمام، اپنی رائے گرامی سے مطّلع فرمائیں۔ حضرت کا ۸-۹ روز کے اندر ہی جواب آگیا کہ مجھے بے حد خوشی ہوئی کہ حضرت مولانا علی میاں نے، آپ کو اپنے دارالعلوم کے لیے منتخب فرمالیا ہے۔ آپ بے چون

وچرایہ، پیش کش قبول فرمالیں، ان شاءاللہ آپ کے لیے ہرطرح باعثِ خیر وبرکت ہوگا اور عربی زبان سے آپ کو جوشغف ہے، اُس کا دارالعلوم ندوۃ العلما بہترین میدان ہے۔ حضرت مولانا علی میاں صاحب دامت برکاتہ، کا گرامی نامہ بھی، اِس مضمون کا موصول ہوا تھا، جس سے اندازہ ہوا کہ وہ آپ پر بہت اعتماد کرتے ہیں، یہ، بڑی سعادت کی بات ہے۔

ندوۃ العلما میں تدریسی خدمت اور حضرت کو اِس کی اطلاع

تقرّر کے بعد جب میں نے اوئلِ جون۱۹۷۲ء (اواخر جمادی الاولیٰ۱۳۹۲ھ) سے تدریسی کام شروع کردیا، تو حضرت کو اِس کی اِطلاع دینے، نیز یافت کی مقدار بتانے کے لیے، عریضہ اِرسال کیا تو حضرت کا اُس کے جواب میں عاجلانہ شفقت نامہ موصول ہوا، جس میں حضرت نے اِظہارِ مَسَرَّت کے ساتھ دعا اور نصیحتوں سے نوازا تھا:

عزیز گرامی قدر! زادت معالیکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

مزاجِ گرامی

نامۂ عزیز باعثِ صد مَسَرَّت ہوا۔ اللہ تعالیٰ مبارک فرمائے، عارض کو مستقل اور زہید کو کثیر بھی بنادے گا۔ محنت شرط ہے اور ایسی لگن گویا آپ کو ہمیشہ یہیں رہنا اور یہیں کام کرنا ہے۔ مطالعہ پوری توجّہ، سے کیجیے، طلبہ کو مانوس رکھیے، ہرایک کا احترام کیجیے، کسی کی بُرائی نہ کیجیے، مطالعہ وسیع کیجیے، ہرمضمون کو خود حل کیجیے، البتہ ضرورت کے وقت ارشادِ ربّانی فَاسْئَلُوْا اَهْلَ الذِّكْرِ کی تعمیل کیجیے، کما قالوا: ''شِفَاءُ العِيِّ السُّؤَالُ''۔

والدہ محترمہ کی دعائیں حاصل کرنے کی کوشش کیجیے، اِس کے بغیر برکت مُیَسَّر نہیں آسکتی۔ والسلام

محتاجِ دعا، محمد میاں

۸/ جمادی الثانیہ۱۳۹۲ھ/ ۲۰/ جون۱۹۷۲ء

ایک دو ماہ تدریسی خدمت میں گزارنے کے بعد، اپنی کارکردگی کی تفصیل حضرت

الاُستاذ کو لکھی، تو حضرت نے مندرجۂ ذیل عنایت نامہ تحریر فرمایا اور اِداروں اور اجتماعی کام کی جگہوں میں، برسرِ عمل رہنے کے دوران، جس اُصول پر مضبوطی سے کاربند رہنا چاہیے، اُس کی طرف راہ نمائی فرمائی:

۹/شعبان ۱۳۹۲ھ = ۱۹/ستمبر ۱۹۷۲ء

عزیز محترم! زادت مزایاکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ مزاج شریف؟

طویل انتظار کے بعد، نامۂ عزیز کاشفِ حالات اور موجبِ تسکین و طمانینتِ قلب ہوا۔ میری مَسَرَّت یہ، ہے کہ آپ تدریسی مشاغل میں منہمک ہیں، طلبہ اور حضراتِ اربابِ اِدارہ آپ سے مطمئن ہیں۔ یہ، سب بڑی کام یابی ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اِس کام یابی سے بہرہ اندوز فرمائے۔

حضرت الاُستاذ شیخ الادب (مولانا محمد اعزاز علیؒ) نے احقر کو ہدایت فرمائی تھی کہ مدرس کا فرض درسی مشاغل میں اِنہماک ہے، اُس کو اِدارے کی سیاسیّات میں دخل دینا چاہیے نہ اندرونی معاملات میں۔ حضراتِ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی کام یابی بھی یہی ہے۔ ان سے منقول ہے کہ ہمارے لیے (اور تمام مسلمانوں کے لیے) آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت یہ تھی ''لَا تُنَازِعِ الْأَمْرَ أَهْلَهُ''۔ امید ہے کہ آپ بھی یہی مسلک اختیار کریں گے۔ والسلام

نیاز مند محتاجِ دعا

محمد میاں

۲۶/ذی الحجہ ۱۳۹۲ھ کے عریضے میں ناچیز نے یہ، لکھا تھا کہ بعض دفعہ یہ، حقیر چاہنے کے باوجود حضرت کو خط نہیں لکھتا کہ اُس کے جواب کی زحمت میں مبتلا نہ کروں؛ کیوں کہ پیرانہ سالی، بیماری اور کثرتِ مشاغل کی وجہ، سے، حضرت ویسے ہی بوجھل رہتے ہیں؛ اِس لیے جب بھی کوئی عریضہ تحریر کرتا ہوں، تو ڈرتے ڈرتے ہی کرتا ہوں۔ اُس کے جواب میں حضرت نے تحریر فرمایا:

عزیزِ محترم! زادت مزایاکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ مزاجِ عزیز؟

احقر کو خطوطِ موصولہ کے جوابات سے اِتنی فرصت نہیں ملتی کہ از خود کسی کو خط لکھ سکوں؛ مگر آپ کے خط کا انتظار اور خیریت کا اشتیاق مسلسل رہتا ہے۔ الحمد للہ مکتوبِ سامی مؤرخہ ۲۶؍ ذی الحجہ ۱۳۹۲ھ سے اشتیاق نے انبساط وابتہاج حاصل کیا۔ جزاکم اللہ

عید الاضحیٰ کے بعد سے، طبیعت خراب چل رہی ہے، ۴؍فروری ۱۹۷۳ء کو خونی بواسیر کے شدید دورے نے صاحبِ فراش بنادیا۔ الحمد للہ اب دورہ نہیں رہا؛ لیکن صحت کی رفتار شافی الامراض صحیح رکھے، تو کم از کم ایک مہینے کے بعد، مدرسے جانے کی بحث ہو سکے گی۔ دعا کی ضرورت ہے۔ احباب اور اکابر سلام قبول فرمائیں۔ الحمد للہ سب خیریت سے ہیں۔ مشفق محترم مولانا علی میاں صاحب کی خدمت میں سلام عرض کردیں۔

نیازمند محتاجِ دعا

محمد میاں

یومِ شنبہ: ۶؍محرم الحرام ۱۳۹۳ھ

حضرت الاستاذ کا ایک خط جو راقم کے لیے وثیقۂ سعادت ہے

۲۲؍شعبان ۱۳۹۳ھ = ۲۱؍ستمبر ۱۹۷۳ء کے مکتوبِ گرامی میں، حضرت الاستاذؒ نے ناچیز کے حوالے سے، حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ کے خط کا ایک اقتباس نقل فرمایا، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت الاستاذؒ نے ہمیشہ کی طرح، اپنے کسی مکتوب میں حضرت مولاناؒ کی مزید توجّہ، میری طرف مبذول کرائی ہوگی۔ حضرت الاستاذ کا یہ، خط اور حضرت مولاناؒ کے خط کا مضمون، جو حضرت الاستاذؒ نے اپنے گرامی نامے میں درج فرمایا ہے، اِس ناچیز کے لیے سعادت وبرکت کا بہترین وثیقہ ہیں:

عزیزِ محترم! زادت معالیکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ مزاج گرامی؟

حضرت مولانا کا مکتوبِ گرامی صادر ہوگیا ہے، تحریر فرمایا ہے:

(عزیزی مولوی نور عالم صاحب سے مجھے خود تعلق خاطر ہے۔ آپ نے اُن کو یہاں بھیج کر ہم کو ایک اچھا تحفہ دیا ہے۔ میں اِن شاء اللہ اُن کے معاملے پر جلد توجہ، کروں گا اور جو کچھ اُن کی مدد ہو سکے گی، اُس سے اِن شاء اللہ دریغ نہ ہوگا۔ اُن کو کسی موقع سے باہر بھیجنے کا بھی انتظام ہو جائے گا؛ تا کہ وہ زیادہ مفید بن سکیں۔ رمضان وہ اپنے وطن کرنا چاہتے ہیں، شادی کا بھی اِرادہ ہے، اِس سلسلے میں جو خدمت کی جا سکے گی، کی جائے گی۔)

حضرت مولانا کی اس تحریر کے بعد احقر کا کام تو یہ، رہ جاتا ہے کہ دعا کروں کہ اللہ تعالیٰ مولانا کے اعتماد کو زیادہ کرے اور آپ کو اللہ تعالیٰ توفیق بخشے کہ آپ زیادہ سے زیادہ مفید اور قابلِ اعتماد ہوں۔

مولانا کو جواب، اس لیے نہیں لکھا کہ اُنھوں نے ایک رسالہ بھیجا ہے: ''إِسْمَعِيْ يَا إِيْرَانُ!'' اس کے مطالعے کے بعد جواب لکھوں گا، اِن شاء اللہ۔

دوسری بات: احقر کی صحت رو بہ تنزل ہے، چند تالیفی کام ادھورے باقی ہیں، دعا فرمایئے اللہ تعالیٰ اُن کی تکمیل کی توفیق بخشے۔ والسلام

نیاز مند، محمد میاں

۲۲؍شعبان ۱۳۹۳ھ = ۲۱؍ستمبر ۱۹۷۳ء

حضرت الاستاذ کی میرے لئے مسلسل دل سوزی

حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ نے ناچیز کی شادی کی طرف جو اِشارہ فرمایا ہے، وہ اُس وقت بہ وجوہ ٹلی، تو کئی سال کے لیے مؤخر ہوگئی اور بالآخر وہ شنبہ - یک شنبہ: ۱۵-۱۶؍شوال ۱۳۹۹ھ مطابق ۸-۹؍ستمبر ۱۹۷۹ء کی شب میں انجام پذیر ہو سکی۔

پیرانہ سالی، جسمانی کم زوری اور اَمراض ومشاغل کی کثرت کے باوجود، کبھی ایسا نہ ہوا کہ حضرت الاستاذؒ نے میرے کسی عریضے کا جواب نہ دیا ہو۔ اُن کے ہر مکتوب سے، اُن

کی میرے لیے دل سوزی کا بہ خوبی اندازہ ہوتا تھا۔ مجھے بے حد قلق ہے کہ اُن کے چند خطوط ہی محفوظ رہ سکے۔ اللہ پاک اُن کی شفقتوں کا بہترین بدلہ اُنھیں عطا کرے اور جنّت الفردوس میں حضور ﷺ اور آپؐ کے صحابہ کا جوار نصیب کرے۔

ایک بار میں شدید طور پر کافی دنوں تک بیمار رہا، میں نے حضرت کو اپنا احوال لکھا اور دعا کی درخواست کی، تو حضرت نے نصیحتوں اور ہم دردیوں بھرا ذیل کا مکتوب ارسال فرمایا:

۲۱ر صفر ۱۳۹۴ھ = ۱۶ر مارچ ۱۹۷۴ء

عزیز محترم! زادت معالیکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ مزاجِ عزیز؟

ایک عرصے کے بعد، دستی مکتوب موصول ہوا، حالات کا علم ہوا۔ آپ کی علالت سے تشویش ہے۔ اللہ تعالیٰ صحت عطا فرمائے۔ علاج کی طرف پوری توجّہ ، کیجیے۔ بہ ظاہر نزلے کا اثر ہے اور تنقیے کی ضرورت ہے، طبیعت کا علاج ہی اِن شاء اللہ مفید ہوگا۔ غذا میں احتیاط کی ضرورت ہے، بڑا گوشت تو استعمال نہ ہونا چاہیے اور گوشت کے بہ جاے سبزی ترکاری کا استعمال زیادہ مفید ہوگا اور بیماری کی اصل علّت احقر کے خیال میں یہ، ہے کہ آپ ورزش نہیں کرتے، اِس عمر میں ورزش ضروری ہے اور بہترین ورزش یہ، ہے کہ نمازِ صبح سے پہلے یا فوراً بعد کم از کم دو میل کا گشت کریں اور کچھ دور دوڑا کریں۔ یہ، آپ کے لیے بہت آسان ہے، ندوہ شہر سے باہر ہے، کھلی ہوا میں آپ صبح کی گشت کرلیں، تو چند روز ہی میں آپ صحّت میں نمایاں فرق دیکھیں گے۔ احقر اب چلنے پھرنے سے معذور ہو گیا ہے؛ ورنہ آپ کی عمر میں جب تھا تو ڈنڈ لگایا کرتا تھا، پھر دہلی آکر اِس ورزش کا موقع نہیں ملا؛ مگر صبح کو ایک ڈیڑھ گھنٹہ گشت کا معمول رہا۔

دین وملت کی خدمت اگر اہمیّت رکھتی ہے، تو تحفّظ صحّت بھی اُتنی ہی اہم ہے؛ کیوں کہ خدمت کے لیے صحّت شرط ہے اور فرض کا مقدمہ بھی فرض ہوتا ہے۔

والسلام

نیاز مند محتاجِ دعا

محمد میاں

حضرت کی احقر کو حسنِ خط کی داد

ایک خط میں حضرت الاستاذؒ نے، اِس ناچیز کو حسنِ خط کی بہت داد دی، خط کا آغاز ہی تحسین آفریں الفاظ سے فرمایا:

عزیز محترم! زادت معالیکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاجِ گرامی؟

نامۂ عزیز سے محظوظ ومسرور ہوا۔ باطن کی طرح آپ کے خط کا ظاہر بھی دل کش ہوتا ہے، یعنی قلم نفیس اور دیدہ زیب، تحریر میں روانی بھی بہت ہوتی ہے.....۔ والسلام

دعا گو محتاجِ دعا

محمد میاں

یکم جمادی الاولیٰ ۱۳۹۳ھ=۳/جولائی ۱۹۷۳ء

مذکورہ بالا خط بہت لمبا ہے اور ''انتر دیشی پتر کارڈ'' (Inland letter card) کے تینوں صفحات پر حضرت کی باریک تحریر میں لکھا ہوا ہے، طوالت کی وجہ، سے میں یہاں پورا خط نقل نہیں کرسکا۔ حضرتؒ نے اِس خط میں سابقہ دِگر کئی خطوں کی طرح تنخواہ کی قلّت پر تشویش کا اِظہار کرتے ہوئے میری بہت سی گھریلو ذمّے داریوں کے پیش نظر کئی طرح کے مشورے دیے تھے۔ ایک مشورہ یہ، بھی تھا کہ آپ چاہیں تو لکھنؤ سے آجائیں ''میوات'' کے ''نوح'' کے مدرسے میں جو مولانا نور محمد صاحبؒ (شاگرد وخلیفہ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ) کی سرپرستی میں چلتا ہے، صدر مدرس کی جگہ، خالی ہے اور ہاں کے ذمّے دار حضرات اِس جگہ، کو پُر کرنے کے لیے، مجھ سے مسلسل رابطے میں ہیں۔ دوسرا مشورہ یہ، تھا کہ دارالعلوم دیوبند کے چند فضلا ایک مدرسے میں کام کررہے ہیں، اُنھوں نے وہاں اچھا

تعلیمی معیار قائم کیا ہے، وہ آپ جیسے عربی داں کی تلاش میں ہیں، تنخواہ حسبِ طلب دیں گے؛ لیکن یہ، ناچیز بہ وجوہ حضرت کے اِن مشوروں پر اُس وقت عمل نہ کرسکا اور یافت کی قلّت اور ضروریات کی کثرت کے باوجود، لکھنؤ میں تدریس کو ترجیح دی؛ کیوں کہ حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ کی صحبت تمام پریشانیوں کو برداشت کرنے پر آمادہ کرتی رہتی تھی۔

راقم کے درد کو اپنا درد بنالینے کی حضرت کی سعی

حضرت الاستاذؒ نے جس طرح میرے درد کو اپنا درد بنالیا تھا، اُس کی مثال اِس زمانے میں مولانا رومؒ (۶۰۴ھ/ ۱۲۰۷ء-۶۷۲ھ/۱۲۷۳ء) کا چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی شاید ہی ملے گی۔ یوں تو ہر اُس آدمی کا یہ، ناچیز بے پناہ احسان مانتا ہے اور روزانہ اُس کے لیے دعائیں کرتا ہے، جس نے ایک لفظ کا بھی اُس کو فائدہ پہنچایا؛ لیکن چند اَساتذہ جنھوں نے مجھے ذرّے سے آفتاب بنانا چاہا اور میری راہ کے سارے کانٹوں کو اپنے ہاتھوں سے چننے کی کوشش کی؛ اُن میں حضرت الأستاذ مولانا سیّد محمد میاںؒ سرِ فہرست ہیں۔ اکثر دفعہ آدمی کسی مُحسِن کے احسان کی ہمہ گیری، اُس کی اِفادیّت کی بے شمار سمتوں اور اُس کے دُوررَس اثرات کا بروقت اِحساس نہیں کرپاتا، بالخصوص نوعمری اور ناتجربہ کاری کی حالت میں، جب مُحسِن کے اِحسان کے اَتھاہ پن کا اُسے قطعاً اندازہ نہیں ہوتا۔ حضرت الأستاذؒ کے اِحسانات کے حوالے سے، اُس وقت جب یہ، میرے اوپر ہورہے تھے، اِس کم عمر، کم عقل اور ناتجربہ کار کا یہی رویّہ رہا۔ آج جب اُن اِحسانات کی وُسعتوں اور گہرائیوں پر غور کرتا ہوں تو بے حد شرمندگی اور افسوس ہوتا ہے کہ اگر حضرت کی حیات میں، اُن کے اِحسانات کی قدر ہوتی، تو میں اُن کی تمناؤں پر پورا اُترنے کی اپنی سی کوشش تو ضرور کرتا، اِس طرح اُن کا دل خوش ہوتا اور وہ مزید دعائیں دیتے۔

لکھنؤ سے دہلی کا ایک سفر اور حضرت کی زیارت سے شرف یابی

اَواخرِ ذی الحجہ ۱۳۹۱ھ = اَواسطِ فروری ۱۹۷۲ء میں، حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ کی خدمت میں آمد اور تکیہ اور لکھنؤ میں کئی مہینے قیام کے بعد، اَوائلِ جون ۱۹۷۲ء

(اواخرِ جمادی الاُولیٰ ۱۳۹۲ھ) میں دار العلوم ندوۃ العلما میں اُستاذ مقرر کیے جانے کے بعد، حضرت الاُستاذؒ کی حیات میں صرف ایک بار: جمادی الاولیٰ ۱۳۹۳ھ/مئی ۱۹۷۳ء میں دہلی کے سفر کا موقع ملا اور حضرت سے ملاقات اور کئی روزہ صحبت کی سعادت حاصل ہوئی۔ اُس کے بعد اپنی مشغولیتوں کی وجہ، سے، چاہنے کے باوجود، دہلی کا سفر ہوا نہ حضرت کی زیارت کی سعادت حاصل ہو سکی۔ یہ، سفر اِس لیے بھی یادگار تھا کہ حضرت نے ایک روز دوپہر میں اپنے گھر واقع اندورنِ ''اِحاطہ کالے صاحب'' گلی قاسم جان، اِس ناچیز کی دعوت کی اور اپنے ساتھ کھانا کھلایا۔ کچھ تو حضرت کا رعب جو ہمیشہ میرے اوپر طاری رہتا تھا اور کچھ یہ، بات کہ زندگی میں پہلی بار میں نے دیکھا کہ روٹیاں ایک کپڑے میں لپٹی ہوئی ڈھکی ہیں اور حضرت ایک ایک نکال کے دے رہے ہیں؛ اِس لیے ایک آدھ چپاتی ہی لے سکا۔ ہمارے دیارِ بہار میں اُس وقت تک روٹیوں کو ڈھک کر دسترخوان پر رکھنے کا چلن نہیں ہوا تھا، اب آمد ورفت کی کثرت اور مختلف علاقوں کے لوگوں کے آپسی اختلاط کی وجہ، سے، تہذیب وتمدن کا لین دین زیادہ ہو گیا ہے؛ اِس لیے ہمارے ہاں کے لوگ بھی اِس کلچر کو برتنے لگے ہیں۔ بہ ہر کیف میں نے روٹیوں کے ڈھکی ہونے اور ایک ختم ہونے کے بعد دوسری نکال کے دیے جانے کی وجہ، سے یہ، سمجھا کہ شاید حضرت کے ہاں کسی وجہ، سے روٹیاں کم پکی ہیں، اِس لیے اُنھیں ڈھک دیا گیا ہے اور اُن میں سے ایک ایک نکال کے دی جا رہی ہے؛ اِس لیے مجھے کم کھانا چاہیے، چناں چہ میں نے بہ مشکل ایک چپاتی لی اور ذرا سا چاول، حضرت نے جھڑکنے کے انداز میں فرمایا بھی کہ مولانا! آپ اور کھانا لیں؛ لیکن مزید لینے کے لیے میں کسی طرح بھی ہمت جٹا نہیں سکا۔ شام کو لال کنواں کے کوچہ پنڈت کی ایک مسجد کے، طالبِ علمی کے زمانے سے امام، اپنے ایک رفیقِ درس مولانا برہان احمد سہارنپوری سے، اُن کی مسجد میں ملاقات ہوئی، تو میں نے اُن سے کہا: بھئی! آج دوپہر میں حضرت الاُستاذؒ نے کھانے پر بلایا تھا، دسترخوان پر روٹیاں ڈھکی ہوئی تھیں، میں نے سمجھا کہ کسی وجہ، سے کم پکی ہوں گی؛ اِس لیے ڈھک دی گئی ہیں؛ تاکہ مہمان احتیاط سے کھائیں اور تھوڑی بہت چھوڑ دیں۔ مولانا

برہان بہت کھلکھلا کے ہنسے اور کہا: بھئی! یہ، تو ہمارے خطّے: مغربی یوپی اور دہلی کا عام رواج ہے کہ روٹیوں کو خواتین پکانے کے دوران ہی ڈھک دیتی ہیں؛ تا کہ گرم رہیں؛ کیوں کہ ٹھنڈی روٹیاں کھائی نہیں جاتیں، بے مزہ سی لگتی ہیں؛ بل کہ عموماً عورتیں، اگر کوئی مجبوری یا معذوری نہ ہو، دسترخوان پر لوگوں کے بیٹھ جانے کے بعد پکانا شروع کرتی ہیں؛ تا کہ گرم گرم روٹیاں تازہ تازہ دسترخوان پر پہنچتی رہیں۔

سیاسی واقتصادی مسائل کے بعض ابواب کا عربی ترجمہ

اِسی سفر میں، ناچیز نے حضرت الأستاذ کو اُن کی مشہور کتاب ''سیاسی واقتصادی مسائل اور اِسلامی تعلیمات واِرشادات'' کے ایک معتد بہ حصّے کا عربی ترجمہ دکھایا، جو اُس نے دارالعلوم ندوۃ العلما کے عربی ترجمان ''البعث الإسلامی'' میں قسط وار شائع ہونے کے لیے دیا تھا، وہی شائع شدہ صفحات حضرت کی خدمت میں پیش کیے، جنھیں دیکھ کر اُنھیں خوشی ہوئی اور دعائیں دیں؛ لیکن فرمایا کہ اِس عربی ترجمے کو کتاب کی شکل میں چھاپنے کی کیا صورت ہوگی؟ میں تو اِس کی قدرت نہیں رکھتا۔ ناچیز نے عرض کیا کہ ''البعث الاسلامی'' میں شائع کرنے کا مقصد اصلاً تو یہ، ہے کہ اِس طرح ترجمے کی میری صلاحیت پختہ ہوگی اور فی الجملہ علماے عرب آپ جیسے علما سے واقف ہوں گے، اب اگر یہ، ترجمہ کتاب کی شکل میں کسی طرح چھپ جاتا ہے، تو وہ ایک مستقل فائدے کی چیز ہوگی؛ لیکن اِس کی کیا صورت ہوگی؟ یہ، میری سمجھ میں بھی نہیں آرہی؟

اِس کتاب کے بعض مباحث کا میں اُس وقت ترجمہ نہ کرسکا، تو اِس وقت تک بھی نہ ہوسکا؛ ورنہ عربی کے کسی ناشر سے رابطہ کیا جاسکتا تھا۔

حضرت کی وفات پر حضرت مولانا علی میاںؒ کی راقم سے تعزیت

دارالعلوم ندوۃ العلما میں ۸۵ سالہ جشنِ تعلیمی کے انعقاد کی تیاری شباب پر تھی، حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ نے، حضرت سے نہ صرف اُس میں شرکت؛ بل کہ علمی وفکری مشارکت کی فرمایش کی تھی کہ اچانک ایک روز یہ، اطّلاع ملی کہ چہارشنبہ: ۱۶ر شوال

۱۳۹۵ھ مطابق ۲۲/اکتوبر ۱۹۷۵ء کی شام کو ساڑھے ۶/ بجے حضرت کا انتقال ہوگیا۔ اِس ناچیز کے لیے یہ، خبر بڑی صاعقہ اثر ثابت ہوئی۔ کئی ماہ تک کسی کام میں جی نہ لگا، ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی سایۂ ہما میرے سر سے اٹھ گیا ہے۔ ایک روز حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ، اپنے نائب وشاگردِ عزیز مولانا معین اللہ صاحب ندویؒ (متوفی ۱۱/ جمادی الاولی ۱۴۲۰ھ مطابق ۲۳/ اگست ۱۹۹۹ء) نائب ناظم ندوۃ العلما کے ساتھ میرے کمرے میں، جو سلیمانیہ ہاسٹل کی بالائی منزل پر تھا، تشریف لائے، میں بہت اَچنبھا ہوا کہ حضرت نے کیسے اِتنی زحمت کی؟ بیٹھے نہیں کھڑے کھڑے فرمایا: عزیزم! یہاں حضرت مولانا سید محمد میاں کا تمھارے سوا کوئی قریب اور عزیز نہیں، تم اُن کے لیے قریب ترین عزیز سے عزیز تر تھے۔ اُنھیں تم سے جو تعلق تھا وہ بہت کم اساتذہ کو اپنے شاگردوں سے ہوتا ہے؛ اِس لیے اُن کی وفات پر ہم دونوں تم سے دلی تعزیت کرتے ہیں۔ اللہ اُنھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ یہ، کہہ، کر دونوں حضرات واپس ہوگئے، میری گزارش کے باوجود نہیں رکے۔ اُن کے تشریف لے جانے کے بعد اور شدّت کے ساتھ غم کا سایہ میرے اوپر دراز ہوتا ہوا محسوس ہوا۔ اِس کے بعد حضرت مولانا علی میاں صاحب نے کئی موقعوں سے میرے سامنے، حضرت الاستاذ کی مدح سرائی کی اور فرمایا: حضرت مولانا سید محمد میاں، علم وعمل کے صحیح معنی میں جامع تھے، زہد واستغنا اور دنیا سے بے نیازی میں وہ ممتاز تھے۔ اپنے علم وقلم سے ملّت کی بے لوث خدمت کی، وہ بڑے قد کے عالم تھے؛ لیکن خلوت نشینی اور شہرت ونمود سے دوری کی وجہ، سے، کم لوگ اُن کے مقام ومرتبے سے واقف ہیں۔

اہم تالیفات

حضرت کے صاحب زادے مولانا سید ساجد میاں دہلوی مدظلہ، کے مخطوطہ مضمون جو اُنھوں نے والد ماجد پر لکھا ہے، میں تحریر ہے کہ حضرت نے اپنے کسی مضمون میں خود تحریر فرمایا ہے کہ اُن کی تالیفات کی تعداد کم وبیش ستّر ہے، جن میں ضخیم کتابیں بھی ہیں اور مختصر رسالے بھی، بعض تحریریں وقت کی ضرورت کے تحت لکھی گئیں، جو بعد میں ناپید ہوگئیں، بعض کتابیں

اور نگارشات کسی مصلحت کے تحت دوسروں کے نام سے شائع ہوئیں۔اہم کتابوں کی ایک فہرست اور مختصر تعارف درجِ ذیل ہے:

سیرتِ مبارکہ

۱۔سیرۃ مبارکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چھ سو صفحات کی اس کتاب کے مضامین کا اصل ماخذ قرآن مجید کی آیات ہیں، جن کی مزید تشریح احادیث صحیحہ اور اقوال صحابہ کے ذریعہ کی گئی ہے۔اس وجہ سے سرور کائنات حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ شخصیت سامنے آئی جو قرآن مجید نے پیش فرمائی ہے۔کتاب کے شروع ایک مبسوط مقدمہ ہے جس میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے عرب معاشرہ کی تفصیل پیش کی گئی ہے۔تاریخی حقائق کے دلچسپ تذکرہ کے ساتھ مصنف کی زبان کی ادبی چاشنی نے کتاب کو بار بار مطالعہ کرنے اور ساتھ رکھنے کے قابل بنا دیا ہے۔

۲۔صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کا عہد زریں اور مثالی حکومتیں

اس کتاب کا اصل ماخذ **ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء**، مصنفہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ہے جس کا اردو ترجمہ مصنف نے زمانہ اسارت میں شروع کیا تھا لیکن بعد میں مضامین کے پھیلاؤ اور کثرت کی وجہ سے ایک مستقل کتاب بن گئی ہے۔دو جلدوں اور تقریباً نو سو صفحات پر مشتمل اس کتاب میں یہ وضاحت کی گئی ہے کہ حضرات صحابہؓ رضوان اللہ علیہم واجب الاحترام کیوں ہیں۔صحابہ کرام اہل اسلام کی آنکھ کا تارا ہیں۔یہ محض ایک عقیدت ہے یا حقیقت۔کلام الٰہی نے اس جماعت کے کیا فضائل بتائے۔خلافت راشدہ اور اس کے مراتب، تاریخ اسلام میں خلافت راشدہ اور خلفاء راشدین کی اہمیت اور قرآن وحدیث سے اس اہمیت کے دلائل وشواہد بلاشبہ یہ کتاب جس کا نام عہد زریں ہے، مصنف کی زندگی کے عہد زریں کی بہترین علمی صلاحیتوں کا نچوڑ اور شاہکار ہے اور کتاب کا بنیادی مقصد حضرات صحابہ کی مقدس جماعت پر تنقید وتنقیص کے دروازے کو بند کرنا ہے جو تحقیق کے نام پر کھول دیا گیا ہے۔مصنف کا طرزِ تحریر نہ صرف حقائق کو بیان کر کے حضرات صحابہ کی مبارک شخصیات

سے غبار کو صاف کرتا ہے بلکہ قاری کا دل ان کی محبت وعقیدت سے سرشار کر دیتا ہے۔

۳۔تاریخ الاسلام: بچوں کے لیے سوال وجواب کے انداز میں لکھی گئی یہ کتاب تین حصوں پر مشتمل ہے پہلا حصہ سرور کائنات حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی، دوسرا مدنی زندگی اور تیسرا حصہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق وعادات کے ذکر میں ہے۔ یہ کتاب مدارس کے نصاب میں شامل ہے۔ زبان انتہائی سادہ اور انداز دلچسپ لیکن معتبر ہے۔

۴۔ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم: یہ سب سے پہلی تصنیف ہے جو استاذ محترم مولانا اعزاز علی صاحب کے حکم کی تعمیل میں بچوں کے لیے لکھی گئی۔ بچوں کے لیے لکھی گئی اس مختصر کتاب میں سیرت مبارکہ کو آسان انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ بھی داخل نصاب ہے۔ کتاب کے دوسرے حصہ میں اسلامی عقائد کی وضاحت کی گئی ہے۔ اس کا انگریزی ترجمہ بھی شائع ہو گیا ہے۔

۵۔شواہد تقدس: علمی تحقیق وجستجو کے نام پر جن صحابہ کرامؓ کو ہدف تنقید بنایا گیا ہے ان میں خلیفہ ثالث حضرت عثمان بن عفان ذی النورین رضی اللہ عنہ کا اسم مبارک سرفہرست ہے۔ اس کتاب میں ناقدین کے حوالوں اور دعوؤں کی حقیقت بیان کی گئی ہے اور حضرت ذی النورینؓ کی مقدس شخصیت کے شواہد پیش کیے گئے ہیں۔

سیاسی تاریخ اور تحریک آزادی

۶۔علماء ہند کا شاندار ماضی: مصنفؒ کی شہرۂ آفاق اور بے نظیر کتاب ہے جس کی پہلی اشاعت پر کتاب ضبط ہوگئی۔ پریس بند کر دیا گیا اور مصنف پر مقدمہ چلا۔ چار جلدوں پر مشتمل اس کتاب میں مجدد الف ثانیؒ جن کی زندگی میں تین مغل بادشاہ، اکبر، جہانگیر اور عالمگیر سریر آرائے سلطنت ہوئے اور بادشاہ اکبر کے زمانہ میں دین الٰہی کی شکل میں جو کفر والحاد کا فتنہ اٹھا تھا اس کا سدباب کیا اور اس جدوجہد میں قید وبند کی مصیبت برداشت کی حضرت مجدد الف ثانیؒ کی جدوجہد وقربانیوں کے نتیجہ میں بادشاہ عالمگیرؒ کے زمانہ تک اس فتنہ کا قلع

وقمع ہو چکا تھا۔ حضرت مجدد الف ثانی، ان کے خلفاء اور خلفاء کے خلفاء کے سوانح ان کے معاصرین کے حالات اور سیاسی کارنامے اور اس زمانہ کا سیاسی و حکومتی نظام نہایت خوبی سے پیش کیا گیا ہے۔ دوسرا حصہ: حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے سیاسی نظریات، ان کی تعلیم و تربیت کے مراکز، حضرت سید احمد شہید ان کے رفقاء کے مجاہدانہ کارنامے اور قربانیاں۔

تیسرا حصہ علماء صادق پور اور ان کے پراسرار مجاہدانہ کارنامے، سکھوں کی حکومت کا زوال وغیرہ۔

چوتھا حصہ جو برطانوی استعار کے خلاف علماء کرام کی جدوجہد کی تاریخ پر مشتمل ہے، اور علماء کی جدوجہد کی چار سو سالہ تاریخ کے سب سے خونیں دور سے متعلق معلومات کا انسائیکلوپیڈیا ہے۔ یہ تمام واقعات انتہائی مستند اور قابل اعتبار حوالوں سے ماخوذ ہیں۔ مصنف کی یہ کتاب بہت مشہور ہے اور اسے اپنے موضوع پر ایک ریفرنس مانا جاتا ہے۔

۷۔ علماء حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے: تحریک آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد برطانوی حکومت کے دوران علماء کا کردار اور جدوجہد اور اس کے نتیجہ میں ہونے والی قربانیاں اس کتاب کے دوسرے حصے میں ملک کی آزادی اور تقسیم کے بعد کے حالات اور اس دور میں جمعیۃ علماء ہند کی خدمات کا ذکر ہے۔

۸۔ ہندوستان شاہان مغلیہ کے عہد میں: بقول مصنف یہ 'علماء ہند کا شاندار ماضی' کا تتمہ ہے دوسرے الفاظ میں وہ شاندار ماضی کی داستان تھی اور یہ 'داستان بربادی' ہے۔

۹۔ پانی پت اور بزرگان پانی پت، حضرت شاہ قلندرؒ اور آپ کے معاصرین اور پانی پت کی تاریخ پر ایک دلچسپ اور معلوماتی کتاب ہے۔

۱۰۔ دورِ حاضر کے سیاسی و اقتصادی مسائل اور اسلامی تعلیمات کے اشارے۔

۱۱۔ ہمارا وطن اور اس کی شرعی حیثیت۔

۱۲۔ اسلام اور حفاظت جان۔

۱۳۔ مسلم سوشلسٹ۔
۱۴۔ صالح جمہوریت اور معتبر جمہوریت۔
۱۵۔ سورہ فاتحہ کی سیاسی تفسیر۔ اقامت امت کا دستور اساسی۔
۱۷۔ اسلام اور اسلامی فکر کیا ہے؟
۱۸۔ دین و دنیا کا سنگم۔
۱۹۔ حیات مسلم۔ مسلمان کی زندگی مہد سے لحد تک۔
۲۰۔ اسلام کیوں؟
۲۱۔ قرآن حکیم اور تفسیر انسانیت۔
۲۲۔ انسان اور انسانیت منزل بمنزل۔
۲۳۔ مرادآباد جیل میں درس قرآن کی سات مجلسیں (شیخ الاسلام کی تقاریر)
۲۴۔ آنے والے انقلاب کی تصویر۔
۲۵۔ خطرناک نعرے۔
۲۶۔ دو منشورہ (بسلسلہ مودودیت)
۲۷۔ حواشی بر تقریر دل پذیر (از حضرت مولانا نانوتویؒ)
۲۸۔ حواشی بر انتصار
۲۹۔ مشکوۃ الآثار۔ احادیث مبارکہ کا ایک مختصر مجموعہ جو درس نظامی میں مشکوۃ سے پہلے پڑھایا جاتا ہے۔ دارالعلوم دیوبند کے نصاب میں شامل ہے۔
۳۰۔ اسلامی تعلیمات کا مرقع۔ ایک چارٹ کی شکل میں ابتدائی تعلیمات درجہ کی گئی ہیں۔
۳۱۔ مسنون دعائیں۔ دعاؤں کا ایک مختصر مجموعہ ہے جس کے شروع میں ایک مفید مقدمہ ہے۔
۳۲۔ اربعین۔ چالیس احادیث کا مجموعہ ہے ترجمہ وشرح۔

۳۳۔مجموعہ خطبات ماثورہ ومنقولہ: جمعہ وعیدین کے لیے خطبات کا مجموعہ جس کا ترجمہ تقریر کے انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

۳۴۔روزہ وزکوۃ۔

۳۵۔اسلامی تقریبات بچوں کے لیے

۳۶۔رویت ہلال رمضان وعید: رویت ہلال کے بارے میں جمعیۃ علماء ہند کا فتویٰ

۳۷۔چاند تارے، زمین وآسمان، تسخیر کائنات کی کوششوں کے ساتھ جو سوالات پیدا ہوتے ہیں ان کے بارے میں شرعی رہنمائی۔

۳۸۔حیات آدم- دنیا کی پہلی آبادکاری۔

دینی تعلیم وتربیت

بطور معلم اور ماہر تعلیم مولانا سید محمد میاں کا ایک بڑا کارنامہ وہ تعلیمی تصانیب ہے جو آپ نے مرتب فرمایا جس میں نہ صرف طلباء کیل یے ٹیکسٹ بکس ہیں بلکہ استادوں کی تربیت کے لیے بھی مواد موجود ہے۔

۳۹۔دینی تعلیم کے رسائل، ۱۲ حصوں میں جمعیۃ علماء ہند کے مکاتب میں رائج ہے۔

۴۰۔طریقۂ تقریر۔ دوحصوں میں

۴۱۔تعلیمی چارٹ اور تعلیم کارڈ

۴۲۔مسئلہ تعلیم اور طریقۂ تعلیم۔

نوٹ: کتاب کے تعارف وفہرست کے سلسلے میں، حضرت کے صاحب زادے، محترم مولانا سیّد ساجد میاں مدظلہ کی تحریر سے فائدہ اٹھایا گیا ہے۔

حضرت کے پس ماندگان

حضرت مولانا سید محمد میاںؒ کے ایک بھائی تھے: احمد میاں اور دو بہنیں تھیں: صغیرہ

خاتون اور سعیدہ خاتون۔ مولاناؒ کی پہلی اہلیہ سے صرف ایک صاحب زادے تھے: مولانا سید حامد میاں، تاریخ پیدائش: بہ روز جمعرات: ۱۰؍ جمادی الاخری ۱۳۴۵۔ تاریخ وفات: بہ روز جمعرات شام ۴ بجے ۱۳؍ رجب ۱۴۰۸ھ۔ مولانا حامد میاں جلیل القدر عالم، عظیم المرتبہ شیخ و مربی اور بڑے مقبول، محبوب صاحبِ نسبت بزرگ تھے، وہ حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی کے خلیفہ ومجاز تھے اور چاروں سلسلوں میں اُنھیں خرقۂ خلافت عطا ہوا تھا۔ ۱۳۷۱ھ/۱۹۵۲ء میں وہ پاکستان کے مشہور ثقافتی شہر لاہور منتقل ہوگئے اور وہیں کی سکونت اختیار کی، وہاں اُنھوں نے ۱۳۷۱ھ/۱۹۵۲ء میں جامعہ مدنیہ کے نام سے ایک اِدارہ قائم کیا، جس نے بڑی ترقی کی اور پاکستان کے چند مدرسوں میں سے ایک شمار ہونے لگا۔ شروع میں اِس مدرسے کا نام ''مدرسہ اِحیاء العلوم'' تھا۔

مولانا حامد میاں کی پہلی شادی ۱۳۶۳ھ/۱۹۴۴ء میں مرادآباد میں ہوئی اور دوسری شادی ۱۳۷۳ھ/۱۹۵۴ء میں لاہور پاکستان میں ہوئی۔ اُن کے ۵ لڑکے ہیں: حافظ مولانا سید رشید میاں، مولانا سید وحید میاں، مولانا سید محمود میاں، مولانا سید مسعود میاں، حافظ سید مقصود میاں۔

حضرت مولانا سید محمد میاںؒ کی دوسری اہلیہ محترمہ سے تین صاحب زادے ہوے: حافظ سید خالد میاںؒ، جنھوں نے حضرت کی تالیفات کی اِشاعت کے لیے ''علماے حق اور اُن کے مجاہدانہ کارنامے'' کی نئی اِشاعت کے ساتھ، ایک اِدارہ ''کتابستان'' قائم کیا، اس اِدارے کا مقصد حضرتؒ کی کتابوں کو بالخصوص اور دیگر علماے مصنّفین کی تصنیفات کو بالعموم جدید معیاری انداز میں شائع کرنا تھا۔ ۱۹۶۳ء میں وہ جرمنی چلے گئے، جہاں کمپیوٹر کی تربیت حاصل کی اور ایک لائق پروگرامر بنے، حضرتؒ کی حیات میں وہ کئی بار وطن دہلی آئے۔ آخری بار وہ رمضان المبارک گزارنے ۱۴۱۳ھ/۱۹۹۳ء میں دہلی آئے، دوہی روز تراویح میں شریک ہوے کہ ہارٹ اٹیک ہوا اور ۲۹؍ رمضان مطابق ۳۰؍ مارچ کی شب میں اللہ کو پیارے ہوگئے اور تیس سال والد ماجد سے دور رہنے کے بعد موت کے بعد اُنھی کے قدموں

میں مدفون ہوئے۔

دوسرے صاحب زادے مولانا سید ساجد میاں ہیں، جو مدرسہ عالیہ فتح پوری دہلی سے فارغ ہیں، اُس کے بعد دہلی یونیورسٹی سے عربی میں ایم اے کیا۔۱۹۷۲ء سے سعودی سفارت خانے میں اہم عہدے پر فائز ہیں۔ اپنی نیکی، دیانت داری اور مفوضہ کاموں کی صلاحیت کے ساتھ، محنت ولگن کی وجہ، سے سارے ذمے داروں اور رفقائے کار میں محبوب ہیں۔اُن کے ۴لڑکے اور ایک لڑکی ہے۔لڑکوں کے نام یہ، ہیں: سید ارشد میاں، حافظ مولانا علی میاں، سید اَطیب میاں، سید حسن میاں۔

حضرت مولانا سید محمد میاںؒ کے تیسرے صاحب زادے سید شاہد میاں ہیں، جو گریجویٹ ہیں اور کمپیوٹر کے ایک ماہر پروگرامر ہیں اور اِسی لائن میں برسرِ ملازمت ہیں۔ اُن کے ۴لڑکیاں ہیں۔

حضرت کے ۳ صاحب زادیاں ہوئیں: خالدہ خاتون، عائشہ خاتون اور میمونہ خاتون۔اول الذکر مولانا قاری قاضی سعید عالم (محلّہ قاضیان مظفرنگر) کے نکاح میں تھیں۔ قاری سعید عالم مرحوم دارالعلوم وقف میں استاذ تھے۔ دوسری صاحب زادی حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیبؒ کے منجھلے صاحب زادے مولانا محمد اسلم قاسمی کے نکاح میں ہیں، تیسری صاحب زادی ''ڈھکا''، سنبھل کے جناب بذل الرحمٰن فاروقی کو منسوب ہیں۔ساری بچیاں صاحبِ اولاد ہیں۔

☆☆☆☆☆

حواشی

(۱) نہ معلوم اُس کا یہ نام کیوں اور کس نے رکھا تھا۔ یہ پل پرانی دہلی کے اسٹیشن سے جانبِ شرق میں جمنا کے پل، شاہدرہ اور غازی آباد کی اُور جاتی ہوئی ریلوے کی گھنیری لائنوں کو عبور کر کے فوّارے کے علاقے سے سیدھا کشمیری گیٹ کو جوڑتا ہے اور لوگ بہ عجلت اِس ''کوریا کے پل'' کے ذریعے فوّارے کی طرف سے پانچ یا سن رسیدہ ہونے کی صورت میں ۷-۸ منٹ میں کشمیری گیٹ اور اُدھر سے فوّارے

کی طرف پہنچ جاتے ہیں۔ یہ پل انگریزی حکومت نے ۱۹۰۳ء میں تعمیر کیا تھا۔ اب ربیع الثانی ۱۴۳۱ھ مطابق اپریل ۲۰۱۰ء میں اخبارات میں یہ خبر چھپی ہے کہ ۱۰۷ سال پرانے اِس پل کو ریلوے انتظامیہ نئے ٹریفک پلان کے تحت عن قریب توڑنے کو ہے۔

(۲) ماہ نامہ ''ندائے شاہی'' شمارہ اپریل-مئی ۱۹۹۰ء، ص: ۱۳۔

(۳) اور اب اِس مضمون کے کتابی شکل میں طباعت کے لیے لاسٹ ٹچنگ سے گزارے جانے کے وقت رحمۃ اللہ علیہ؛ اِس لیے کہ اُنھوں نے ۲۵ر صفر ۱۴۳۱ھ مطابق ۱۰ر فروری ۲۰۱۰ء کو داعیِ اجَل کو لبیک کہا۔ اُن کی تاریخ پیدائش ۲۹ر مئی ۱۹۲۷ء مطابق ۲۶ر ذی الحجہ ۱۳۴۵ھ ہے۔

(۴) ''الکفاح'' ''جمعیۃ علماے ہند'' کا پندرہ روزہ عربی ترجمان تھا، جو ۱۹۷۲ء (۱۳۹۲ھ) سے نکلنا شروع ہوا تھا۔ یکم دسمبر ۱۹۸۷ء (۸ر ربیع الثانی ۱۴۰۸ھ) کا شمارہ شائع ہونے کے ساتھ ہی بند ہوگیا۔ اس کے بانی اور چیف ایڈیٹر حضرت الاستاذ مولانا وحید الزماں قاسمی کیرانوی (۱۳۴۹ھ/ ۱۹۳۰ء- ۱۴۱۵ھ/ ۱۹۹۵ء) تھے اور نائب ایڈیٹر حضرت کے شاگرد مولانا مزمل الحق قاسمی میرٹھی ثم الدہلوی، ٹیچر سینئر سکنڈری اسکول جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی تھے۔

(۵) یہ جامعہ، مدینۂ منورہ میں بہ روز منگل ۲۵/۳/۱۳۸۱ھ مطابق ۱۹۶۱/۸/۸ء کو قائم ہوئی تھی۔

(۶) مولانا طاہر حسینی مظاہری بن سید محمد یوسف حسینی منصور پوری مظفر نگری ثم اللکھنوی، اصلاً منصور پور ضلع مظفر نگر کے باسی تھے؛ لیکن حضرت مولانا علی میاں صاحب کی برادرزادی، یعنی مولانا ڈاکٹر عبدالعلی حسنیؒ (۱۳۱۱ھ/۱۸۹۳ء-۱۳۸۰ھ/ ۱۹۶۱ء) کی صاحب زادی کے اُن کی زوجیّت میں آجانے کے بعد، وہ لکھنؤ کے باسی ہوگئے، پھر ندوۃ العلما کے دفتر نظامت کے ذمّے دارِ اعلیٰ کی حیثیت سے تاحینِ حیات وصحت ذمے داری ادا کی۔ کبار علماے صالحین کے صحبت وتربیت یافتہ تھے، بڑے نیک، عبادت گزار اور شب بیدار تھے۔ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ (۱۳۱۵ھ/ ۱۸۹۷ء-۱۴۰۲ھ/ ۱۹۸۲ء) کے نہ صرف دست گرفتہ؛ بل کہ اُن کے خلیفۂ مجاز تھے۔ مشہور عالم دین وداعی الی اللہ مولانا سید سلمان حسینی ندوی اُنھی کے فرزندِ اکبر ہیں۔ تقریباً ۷۲ سال کی عمر میں بہ روز سموار، بہ وقتِ فجر ۸ر شوال ۱۴۲۲ھ مطابق ۲۴ر دسمبر ۲۰۰۲ء کو ''خاتون منزل''، گولا گنج لکھنؤ میں وفات پائی اور حضرت مولانا علی میاں کے وطن ''تکیہ کلاں''، رائے بریلی میں تدفین عمل میں آئی۔

(۷) سعودی سفارت خانہ نئی دہلی میں ملازمت کے لیے، حضرت الاستاذؒ کے صاحب زادے:

محترم مولانا ساجد میاں صاحب درخواست دینی چاہتے تھے، حضرت الاستاذؒ نے یہ سوچ کر کہ صلاحیت کے باوجود بعض دفعہ کسی اہم شخصیت کی سفارش سے نسبتاً کم صلاحیت کے آدمی کو لے لیا جاتا ہے۔ مولانا سید ساجد میاں کا جس جگہ تقرر ہونا تھا اُس کے لیے کئی امیدوار تھے اور گورنمنٹ کے اعلیٰ عہدوں کے حضرات اُن کے سفارشی تھے؛ حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ سے اِس ناچیز کی وساطت سے سفارشی تحریر لینی مناسب سمجھا۔ اِس خط میں اُسی کی طرف اِشارہ ہے۔ الحمد للہ کہ اُن کا اُس جگہ پر تقرر کر لیا گیا۔ وہ اِس تحریر کے بہ روز شنبہ: ۷ر رمضان ۱۴۳۰ھ = ۲۹ر اگست ۲۰۰۹ء، لکھے جانے کے وقت بھی، سعودی سفارت خانے میں برسرِ عمل ہیں۔ اِس وقت وہ وہاں کے اہم اہل کاروں اور دیرینہ ذمے داروں میں سے ایک ہیں۔

(۸) یہ حضرت الاستاذؒ کی حدیث کے موضوع پر کتاب ہے، جس میں آپ نے منتخب حدیثیں جمع فرمادی ہیں، جن کی روزمرہ کی ضروریات میں مسلمانوں کو ضرورت ہوتی ہے، بہت سے مدرسوں بالخصوص دارالعلوم دیوبند میں داخلِ نصاب ہے۔

(۹) حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ اِس ناچیز کو ہمیشہ ''مولوی نور صاحب'' کے لفظ سے ہی مُخَاطَبْ کرتے تھے، البتہ تحریراً خط وکتابت میں ''عزیز گرامی مولوی نور عالم صاحب'' سے خِطَاب کرتے تھے یا ان سے ملتے جلتے الفاظ سے۔

(۱۰) دارالعلوم ندوۃ العلما میں عصری تعلیم گاہوں کی طرح، مئی کے مہینے میں گرمی کی چھٹی ہوا کرتی تھی

سوانحی نقوش

❁ **اسم گرامی:** (مولانا) سیّد محمد میاں بن سیّد منظور محمد بن سیّد یوسف علی بن سیّد محمد علی بن سیّد ظہور ولی بن سیّد محمد فردوس بن سیّد شاہ شبلی بن حضرت بندگی محمد اسماعیل بن حضرت سیّد محمد ابراہیم قدس اللہ سرہ بن سیّد سعد اللہ بن سیّد محمود قلندر بن سیّد احمد بن سیّد فرید بن وجیہ، الدین بن علاء الدین بن سیّد احمد کبیر بن سیّد شہاب الدین بن حسین علی بن عبد الباسط بن ابو العباس بن اسحاق عندلیب المکی بن القاری حسین علی ہادی بن لطف اللہ بن تاج الدین احمد بن حسین بن علاء الدین بن ابی طالب بن ناصر الدین احمد بن نظام

الدین حسین بن موسی بن محمد الاعرج بن ابی عبداللہ احمد بن موسی المبرقع بن محمد تقی بن موسی علی رضا بن موسی کاظم بن جعفر صادق بن محمد باقر بن زین العابدین بن ابی عبداللہ الحسین بن علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ و سیّدۃ النساء فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا بنتِ سرور کائنات محمد رسول اللہ ﷺ۔(۱)

گیارہویں صدی ہجری کے اوائل میں خاندانِ سادات کے ایک بزرگ سید محمد ابراہیم (متوفی ۵؍شوال ۱۰۳۴ھ مطابق ۲۲؍جون ۱۶۲۵ء نے بعض اہل اللہ کے مشورے سے، اسلام کی دعوت وتبلیغ اور رشد وہدایت کے لیے دیوبند کا انتخاب فرمایا۔ دیوبند میں سیّد صاحب کے قیام کے لیے دہلی کی مغلیہ حکومت کی طرف سے مسجد اور وسیع خانقاہ تعمیر کرائی گئی، جس میں اِفادۂ باطنی کے حلقے کے ساتھ ساتھ، علومِ ظاہری کی تعلیم وتعلم کی مسند بھی بچھی ہوئی تھی۔(۲)

❁ **ولادت:** ۱۲؍رجب ۱۳۲۱ھ=۴؍اکتوبر ۱۹۰۳ء۔

❁ **جاے ولادت:** محلّہ ''سرائے پیرزادگان'' دیوبند، سہارنپور، یوپی۔

❁ **تعلیم:** تعلیم کا آغاز گھر سے ہوا، نانی صاحبہ سے قرآن پاک وغیرہ پڑھا، اردو اور فارسی کی بعض کتابیں ''ٹنڈ ھیڑہ''، ضلع مظفرنگر اور قصبہ ''بسونہ'' میں خلیل احمد سے پڑھیں۔ ۱۹۱۶ء میں دارالعلوم دیوبند میں درجۂ فارسی میں داخل ہوے، اُس کو عبور کرنے کے بعد درجاتِ عربی میں داخل ہوے ۱۳۴۴ھ/ ۱۹۲۵ء میں دارالعلوم سے فارغ ہوے، دورۂ حدیث میں آپ کے استاذ علامہ محمد انورشاہ کشمیریؒ (۱۲۹۲ھ/ ۱۸۷۵ء-۱۳۵۲ھ/۱۹۳۳ء) تھے۔ اُن کے علاوہ آپ کے اساتذہ میں علامہ شبیر احمد عثمانیؒ (۱۳۰۵ھ/ ۱۸۸۷ء- ۱۳۶۹ھ/ ۱۹۴۹ء) شیخ الادب والفقہ، مولانا محمد اعزاز علی امروہویؒ (۱۳۰۰ھ/ ۱۸۸۲ء-۱۳۷۴ھ/۱۹۵۴ء) مولانا سیّد اصغر حسین دیوبندیؒ (۱۲۹۴ھ/ ۱۸۷۷ء-۱۳۶۴ھ/۱۹۴۴ء) مولانا غلام رسول ہزارویؒ (متوفی ۱۸؍محرم ۱۳۳۷ھ= ۲۵؍ستمبر ۱۹۱۸ء) جیسے اَساطین رُوزگار بھی تھے۔

❁ **حفظ قرآن کریم:** بچپن میں قرآن پاک حفظ نہیں کرسکے تھے، یہ، سعادت جدوجہدِ آزادی کے زمانے میں قید وبند کی صعوبتوں کے دوران حاصل کی۔

❁ **اصلاحی تعلق:** تزکیۂ نفس کے لیے، آپ نے شیخ الاسلام مولانا سیّد حسین احمد مدنی سے تعلق قائم فرمایا اور اُن سے بیعت ہوکر اِحسان کی منزلیں طے کیں اور اِجازت وخلافت سے سرفراز ہوے۔

❁ **درس وتدریس:** تدریس کی ابتدا آپ نے ''مدرسہ حنفیہ'' شہر ''آرہ'' سے کیا، یہاں آپ نے یہ،

خدمت ۱۹۲۶ء سے ۱۹۲۸ء تک انجام دی۔ مارچ ۱۹۲۸ء (شوال ۱۳۴۷ھ) سے مدرسہ شاہی مرادآباد میں درس وتدریس کی خدمت انجام دینی شروع کی۔ یہاں سے آپ مدرس، مفتی، منتظم، مہتمم اور رکن شوریٰ ورکن عاملہ کی حیثیت سے تاحیات وابستہ رہے، حتی کہ دہلی میں جمعیۃ علما کے ناظم اور مدرسہ امینیہ کے شیخ الحدیث کے عہدے پر فائز رہنے کے دوران بھی۔ مدرسہ شاہی مرادآباد میں آپ نے بہ حیثیت مدرس ومفتی ومنتظم ۱۶؍سال باقاعدہ قیام فرمایا۔

﴿ **جمعیۃ علماے ہند کی خدمت کے لیے دہلی آمد:** ۱۹۴۵ء میں جمعیۃ کی خدمت کے لیے دہلی آئے اور ۱۹۴۷ء کے ہنگامۂ آزادی وتقسیم ملک کے بعد مستقلاً دہلی میں قیام فرمالیا، دہلی آمد کے بعد، مدرسہ شاہی کے رکن شوریٰ منتخب ہوئے، ۱۳۸۰ھ میں اعزازی مہتمم ہوئے، ۱۳۹۵ھ میں صدر مہتمم بنائے گئے۔ ۱۹۳۰ء میں جمعیۃ مرادآباد کے ناظم بنے، پھر ناظم ہوئے، پھر ناظم شعبۂ تبلیغ جمعیۃ صوبہ آگرہ ہوئے، پھر ناظم جمعیۃ آگرہ، پھر ناظم صوبہ آگرہ واودھ منتخب ہوئے۔ ۴-۷؍مئی ۱۹۴۵ء میں جمعیۃ کے اجلاس سہارنپور میں جمعیۃ علماے ہند کے ناظم منتخب ہوئے، مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کے انتقال کے معاً بعد، ناظم اعلیٰ جمعیۃ علماے ہند منتخب کیے گئے، مگر صرف ایک سال ہی اِس عہدے پر فائز رہ کر اِس سے سبک دوش ہوگئے، پھر رکن عاملۂ جمعیۃ منتخب ہوئے اور جمعیۃ ٹرسٹ کے ناظم اور اِدارۂ مباحثِ فقہیہ کے مدیر کے عہدوں پر تاحیات فائز رہے۔

﴿ **شیخ الحدیث وصدر مفتی مدرسہ امینیہ دہلی:** ۱۹۶۲ء (۱۳۸۱ھ) میں دہلی کی مشہورِ عالم درس گاہ اور علامہ مفتیِ اعظم مولانا محمد کفایت اللہ کی یادگار مدرسہ امینیہ دہلی میں شیخ الحدیث اور صدر مفتی کے عہدے پر فائز ہوئے اور تاحیات یہ، خدمت انجام دیتے رہے۔

﴿ **جد وجہد آزادی میں حصہ:** آزادیِ وطن کی سرگرمیوں میں آپ نے سرگرم حصّہ لیا اور مرادآباد، دہلی، میرٹھ، بریلی، فیض آباد کی جیلوں میں قید وبند کی مصیبتیں جھیلیں۔

﴿ **مسلمانوں کو ارتداد سے بچانے کی سعیِ مشکور:** ہنگامۂ آزادی کے دوران، جہاں جہاں سے مسلمان ہجرت کر گئے تھے، وہاں ارتداد کا خطرہ پیدا ہوگیا تھا اور بہت سے مسلمان ایمان کے حوالے سے متزلزل ہوگئے تھے۔ مشرقی پنجاب، ہماچل پردیش اور راجستھان کا ایک بڑا علاقہ، اِس صورت حال سے

دوچار ہوگیا تھا، آپ نے وہاں شبانہ روز محنت کی اور گاؤں گاؤں جاکر لوگوں کو ڈھارس بندھائی اور ایمان پر اُنھیں قائم رکھنے کی ٹھوس جد وجہد کی اور مکاتب کے جال کے ذریعے، وہاں دینی تعلیم وتبلیغ کا باقاعدہ نظام قائم فرمایا۔

❁ **وفات:** بہ روز چہار شنبہ: ۱۶رشوال ۱۳۹۵ھ مطابق ۲۲/اکتوبر ۱۹۷۵ء شام ساڑھے چار بجے جان، جانِ آفریں کے سپرد کردی۔ غفر لہ اللّٰہ و أدخلہ فسیح جنّاتہ۔ ''گورِغریباں'' قبرستان میں (جو آج کل کے آئی ٹی او کے علاقے میں، جمعیۃ علماے ہند کے مرکزی دفتر واقع مسجد عبدالنبی کے قریب واقع ہے) تدفین عمل میں آئی۔(۳)

(۱) تذکرہ سادات رضویہ دیوبند، ص:۳ و ص:۲۵۔ مصنفہ سیّد محبوب رضوی (متوفی ۲۵/مارچ ۱۹۷۹ء) شائع کردہ علمی مرکز دیوبند۔ (۲) تذکرہ سادات رضویہ، ص:۳۔

(۳) اِس مضمون کو، راقم الحروف نے بہ راہِ راست اردو میں یک شنبہ: ۱۷/شعبان ۱۴۳۰ھ مطابق ۹/اگست ۲۰۰۹ء کو لکھنا شروع کیا تھا۔ رمضان المبارک میں اس کا اکثر حصہ تحریر ہوگیا تھا؛ لیکن بعض ناگزیر وجوہات کی وجہ سے، اِس کی تکمیل سہ شنبہ: ۲۹/ربیع الاول ۱۴۳۱ھ مطابق ۱۶/مارچ ۲۰۱۰ء کو ہوسکی۔

❁❁❁❁❁

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مولانا سید محمد میاں کی علمی وسیاسی خدمات

مولانا بدر الدین الحافظ نئی دہلی

ذرا غور سے دیکھئے تو انسان اپنی ایک مختصر سی زندگی کے اندر کتنی ہی مختلف زندگیاں بسر کرتا ہے، اور اس کی ہر زندگی الگ رنگ وروغن سے سجی نظر آتی ہے۔ مولانا سید محمد میاں بھی ایسی ہی ہمہ رنگ، ہمہ صفت، زندگی کا ایک نمونہ تھے، ان کے علمی مقام کو دیکھئے تو ایک بحر بے کراں نظر آئیں گے اور مجاہد جنگ آزادی کے روپ میں ''آئین جواں مردی حق گوئی و بے باکی'' کا پیکر۔ آپ دیوبند ضلع سہارن پور کے قدیم خاندان سادات رضویہ کے چشم و چراغ تھے، جد اعلیٰ سید ابراہیم مرحوم، جہاں گیر کے عہد میں اس قصبہ میں تشریف لائے اور سرائے پیرزادگان میں قیام فرمایا۔ مولانا مرحوم کا سن پیدائش ۱۹۰۳ء اور تاریخی نام مظفر میاں ہے، آپ کے والد ماجد سید منظور محمد سرکاری محکمہ انہار میں ملازم تھے، اکثر دیہات میں قیام رہتا؛ اس لیے مولانا کی بنیادی تعلیم کا سلسلہ گھر سے شروع ہوا، پھر ۱۹۱۲ء میں باقاعدہ دارالعلوم دیوبند کے فارسی خانہ میں داخل کرایا گیا اور ۱۹۲۵ء میں آپ نے درس نظامی کی تعلیم مکمل کی۔ حضرت مولانا انور شاہ کشمیری سے دورۂ حدیث پڑھا۔

مارچ ۱۹۲۶ء میں جمعیۃ علماء ہند کا دوسرا اجلاس علامہ سید سلیمان ندوی کی زیر صدارت کلکتہ میں منعقد ہوا، جس میں دیوبند کے دوسرے علماء کے ساتھ مولانا محمد میاں صاحب نے بھی شرکت فرمائی، اس اجلاس سے واپسی کے بعد مدرسہ حنفیہ آرہ شاہ آباد کے ارکان نے دارالعلوم دیوبند کے اکابر سے ایک ایسے مدرس کی فرمائش کی، جو اعلیٰ درجات کی تدریس کے ساتھ، عربی تقریر وتحریر کی بھی مشق کرا سکے، اس منصب کے لیے حضرت شاہ

صاحب اور دوسرے اساتذہ نے مولانا محمد میاں صاحب کا نام تجویز کیا؛ لہٰذا پہلی بار مدرس کی حیثیت سے آپ وہاں تشریف لے گئے۔

اس مدرسہ میں آپ کو جلد ہی اچھی مقبولیت حاصل ہوگئی؛ مگر خود آپ نے اس کو اس لیے پسند نہیں فرمایا کہ اسے حکومت سے امداد ملتی تھی، جو دارالعلوم جیسے مدارس کی روش کے خلاف تھا۔ حسن اتفاق سے اسی دوران جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مرادآباد میں ایک اعلیٰ مدرس کی ضرورت پیش آئی، تو مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند اور دوسرے اساتذہ نے آپ کو منتخب فرمایا۔ اس طرح ۱۹۲۸ء میں آپ مدرسہ شاہی مرادآباد تشریف لے گئے اور مزاج کے مطابق فضا پاکر نہایت ذوق وشوق سے کام شروع کر دیا۔

مدرسہ شاہی میں آپ کو کام کرتے ہوئے ایک سال ہی ہوا تھا کہ ملک میں سیاسی فضا گرم سے گرم تر ہوگئی اور جمعیۃ علماء ہند کے ارکان بڑی تن دہی سے جنگ آزادی کے مختلف پروگراموں میں حصہ لینے لگے، اس سال جمعیۃ علماء مرادآباد کے انتخاب میں آپ کو نائب ناظم بنا دیا گیا۔ امروہہ کے سالانہ اجلاس کے بعد آپ نے شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی سے کانگریس میں شمولیت کے سلسلہ میں مشورہ چاہا تو انھوں نے فرمایا: ''یورپ اور خصوصاً برطانیہ نے دنیا کے بہت سے ممالک کو اپنے تسلط اور چیرہ دستی کے شکنجہ میں کس رکھا ہے، اور برطانیہ کی یہ ساری طاقت ہندوستان کی وجہ سے ہے، اگر ہندوستان پر برطانیہ کی گرفت کچھ بھی ڈھیلی پڑتی ہے تو ان کمزور ممالک پر بھی اس کا اثر پڑتا ہے اور انھیں سانس لینے کا موقع ملتا ہے۔'' اس مشورہ کے بعد مولانا محمد میاں صاحب نے حضرت مولانا سید فخر الدین احمد صاحب کا دست وبازو بن کر تحریک آزادی میں کام شروع کر دیا۔

۱۹۳۰ء میں مرادآباد میں الیکشن ہوا، کچھ ہنگامہ کے دوران پولیس نے زبردست لاٹھی چارج اور فائرنگ سے کام لیا، اس میں بہت سے لوگ زخمی ہوئے، خاص طور پر گھوڑسوار پولیس کی ٹاپوں سے کچلے گئے، اس موقع پر مولانا محمد میاں صاحب بھی موجود تھے، مگر اللہ کے فضل وکرم سے آپ کسی طرح زخمیوں کی خدمت کرتے رہے اور بہت سے لوگوں کو محفوظ نکال کر لائے۔

اس کے بعد تقریباً ۱۶؍سال تک مولانا مرحوم مرادآباد میں قیام پذیر رہے اور سیاسی مصروفیات کے ساتھ درس وتدریس، تصنیف وتالیف اور افتاء کا کام برابر جاری رکھا، اس دوران یعنی ۱۹۲۸ء سے ۱۹۴۴ء تک آپ چار بار مرادآباد سے اور ایک دفعہ دہلی سے گرفتار کئے گئے، جس میں قید بامشقت بھی شامل تھی، مگر یہ چار پانچ مرتبہ کی قید وبند یا زنداں میں داخلہ بھلا اس شخص کے پایۂ استقلال کو کیا ضرر پہنچا سکتا تھا، جو اس گلی میں جسم وجان کو داؤ پر لگا کر ہی اس للکار کے ساتھ داخل ہوا تھا:

''دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے''

اس سلسلے کا یہ عجیب حسن اتفاق ہے کہ متعدد جیلوں میں قیام کے دوران مولانا مرحوم نے کلام پاک حفظ کرنا شروع کیا اور سولہ سپارے مکمل کئے، پھر بعد میں تمام مصروفیات اور علالت کے باوجود حفظ کا سلسلہ جاری رہا؛ یہاں تک کہ ۱۹۶۴ء میں جب ''ہندوستان چھوڑو'' تحریک شروع ہوئی تو گرفتار شدگان کی بڑی تعداد مرادآباد جیل ہی میں تھی، ان میں شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی، مولانا حفظ الرحمٰن صاحب، مولانا اسماعیل سنبھلی، مولانا قاری عبداللہ صاحب سابق مرکزی وزیر، حافظ محمد ابراہیم صاحب اور مولانا محمد میاں صاحب کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔ ان تمام حضرات کو زنداں کی دیواروں کے پیچھے ڈال کر شاید دشمن نے یہ اطمینان کرلیا تھا کہ اب ان کی زبان ونگاہ، علم وقلم اور ایمان وعقیدہ ہر چیز پر تالے ڈال دیئے گئے ہیں؛ مگر ان ناعاقبت اندیشوں کو شاید یہ خبر نہیں تھی کہ جیل کی سلاخوں کے پیچھے سامان عیش وعشرت اور عزیز واقرباء کی محبت بھری نگاہیں تو موجود نہیں ہیں؛ مگر وہ سعادت کا سرچشمہ ان کے پہلو میں ہے، جس کے لیے منفلوطی نے کہا تھا: ''إن السعادة ينبوع يتفجر من القلب'' وہ ایمان وعقیدہ کا پختہ جوہر ان کی رگ رگ میں موجود ہے، جس کو کسی طرح کی بیڑیاں پہنانا ممکن ہی نہیں ہے۔ الحمد للہ کہ یہ حضرات جیل میں اپنے معمولات کی پابندی کرتے رہے، رمضان المبارک میں حضرت شیخ الاسلام نے تراویح میں کلام پاک سنایا اور قاری عبداللہ صاحب نے سماعت کے فرائض انجام دیئے،

باقی تمام حضرات بھی ان تمام سعادتوں سے بہرہ اندور ہوتے رہے۔ کچھ عرصہ کے بعد مولانا مدنی کو نینی تال جیل میں اور مولانا حفظ الرحمٰن صاحب اور مولانا محمد میاں صاحب کو بریلی سینٹرل جیل میں منتقل کر دیا گیا۔

رہائی ہوئی تو پھر وہی شب وروز، ''وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے، ہم اپنی وضع کیوں بدلیں''، مولانا محمد میاں صاحب نے بدستور اپنا درسی اور علمی مشغلہ شروع کر دیا۔ ۱۹۳۸ء میں جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی سے ایک اردو ماہنامہ ''قائد'' جاری کیا گیا، جس کے قائد التحریر مولانا محمد میاں صاحب اور مدیر مسئول مولانا سید فخر الدین احمد صاحب کے صاحبزادے مولانا اختر الاسلام قاسمی مقرر کئے گئے۔

یہ پرچہ عرصہ تک جاری رہا اور اس میں اس دور کے مشہور علماء مولانا عبدالحق مدنی، شیخ الادب مولانا اعزاز علی، مولانا سید فخر الدین احمد اور دیگر حضرات اہم موضوعات پر مضامین تحریر فرمایا کرتے تھے۔ ستمبر ۱۹۳۸ء کے شمارہ میں مولانا سید محمد میاں صاحب نے ''کیا مذہب فطری جذبہ ہے؟'' کے موضوع پر ایک مضمون تحریر فرمایا جس کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''بلاشبہ وہ (انسان) خود اپنی ذات پر اور اپنے ماحول پر غور کرے گا تو ایک صحیح جذبہ، صحیح تفکر اس کو حیران کر دے گا، وہ پریشان ہو کر پوچھے گا: اے آسمانو! اے فلک بوس پہاڑو! مجھ کو بتاؤ، اے طوفان بپا سمندرو! مد وجزر کے محشر بداماں دریاؤ! اے پہاڑوں سے ٹکرانے والی لہرو! خبر دو، اے نیز شنگرف! اے ماہِ تاباں، اے دھیمی دھیمی نشاط پرور کرنو، اے لہلہاتے ہوئے مرغزارو، اے سبک رفتار ندیو، اے فضائے آسمانی میں پرے باندھ کر اڑنے والو پرندو، دامن آب میں تیرنے والی مچھلیو، اے زمین کی پشت پر رینگنے والے جانورو! بتاؤ کس نے تم سب کو میرا خادم بنایا، کس نے تم کو میرے لیے مسخر کر دیا، ہاں ہاں ضرور کوئی فاطر ہستی ہے، مگر وہ مجھ سے کیا چاہتا ہے؟ میں کیوں پیدا کیا گیا؟ مجھے کہاں جانا ہے؟ تم سب برہنہ ہو، خانہ بدوش، بے سروسامان، مگر میں دولت بداماں، سرمایہ کا مالک، عمران سے بہرہ اندوز، آبادیوں پر قابض، لباس، پوشاک، زیورات سے مزین، آخر یہ کیوں؟ ضرور کوئی مقصد ہے، میری پیدائش عبث

نہیں، بے شک مجھے جانا ہے، اس اضطراب اور پریشانی میں جو تخیل اس کی امداد کرے اور اضطراب کو سکون سے بدلے، وہی مذہب ہے''۔

۱۹۳۹ء میں دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی، اس زمانہ میں آپ نے اپنی مشہور کتاب ''علماء ہند کا شان دار ماضی'' تحریر فرمائی، اس کتاب نے سامراجی طاقت کے کالے کرتوت اور ظلم و جبر کی داستانوں کو واشگاف کر کے اس حکومت کو جھنجھوڑ ڈالا، جس کی فرماں روائی میں کبھی سورج غروب نہ ہوتا تھا۔ مولانا نے انگریزی دور کے بہت سے علماء کرام کے مجاہدانہ کارناموں کو واضح کرتے ہوئے جب انگریزوں کی چیرہ دستیوں کو کھل کر بیان کیا تو وہ بوکھلا اٹھے۔ مثلاً شاندار ماضی کے دوسرے حصے میں آپ نے حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کے فتوے کو ان الفاظ میں تحریر فرمایا:

''(۱) قانون سازی کے جملہ اختیارات عیسائیوں کے ہاتھ میں ہیں۔

(۲) مذہب کا احترام ختم ہے اور شہری آزادی سلب کر لی گئی ہے، لہٰذا ہر محبّ وطن کا فرض ہے کہ اس اجنبی طاقت سے اعلان جنگ کرے اور جب تک اس کو ملک بدر نہ کر دے، اس ملک میں زندہ رہنا اپنے لیے حرام جانے۔''

اس طرح کے سیکڑوں واقعات اور بیانات اس کتاب میں موجود ہیں۔ اصل میں اس وقت فساد اور جہاد، بغاوت اور جنگ آزادی یہ اہم نکتے تھے، جن کی ہر طرح سے وضاحت ضروری تھی۔ انگریزوں کی بھرپور کوشش یہ تھی کہ ۱۸۵۷ء سے شروع ہونے والی جنگ آزادی کو فساد اور بغاوت قرار دے کر اس میں شامل تمام ہندوستانیوں کو پھانسی اور گردن زدنی کا مستحق ثابت کر دیا جائے؛ تاکہ عوامی ذہن سرکاری مشینری کی طرف سے بدظن نہ ہو اور یہ سمجھے بیٹھا رہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے، یہ عین انصاف کے مطابق ہے۔

اس موقع پر جہاں ایک طرف سیاسی سطح کی ملاقاتیں، کانفرنسیں، مظاہرے، مقاطعے ضروری تھے، وہاں علمی سطح پر عوام کو ان تفصیلات سے آگاہ کرنا بھی ضروری تھا کہ انگریز حکومت کے خلاف جو پُر امن جد و جہد ہوتی رہی ہے اور اپنے حق آزادی کے لیے جو کوششیں کی جاری ہیں، یہ ہمارا پیدائشی حق ہے اور ظلم کے خلاف جہاد ہے، اس کے برخلاف ایک غیر

ملکی حکمراں جس کا ہماری تہذیب، مذہب، زمین سے کوئی تعلق نہیں ہے، غاصب ہے، ظالم ہے اور فساد کا بیج بونے والا ہے، جس کے خلاف ہمارا جہاد فساد نہیں، قاطع فساد ہے۔

اس مقصد کے لیے مولانا نے پورے ہندوستان میں چلنے والی آزادی کی تحریکوں کی تفصیلات پیش کیں اور اس جدوجہد کو کچلنے کے لیے انگریزوں کی طرف سے جو مظالم کیے گئے، ان خونچکاں واقعات کو کھل کر بیان کیا؛ تاکہ عوام کی فکر کو بیدار کیا جائے، جو کسی بھی جدوجہد کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے؛ اسی لیے مولانا مرحوم کی دوسری کتابوں کے مقابلے شاندار ماضی کو بے حد مقبولیت حاصل ہوئی۔

۱۹۴۴ء میں جمعیۃ علماء ہند کا سالانہ اجلاس سہارنپور میں ہوا، اس میں مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کو ناظم اعلیٰ اور مولانا محمد میاں صاحب کو ناظم مقرر کیا گیا، اس کے ساتھ یہ بھی طے پایا کہ آپ مرادآباد کی رہائش گاہ کو خیر باد کہہ کے دہلی آجائیں؛ تاکہ پورا وقت جمعیۃ کے کاموں میں صرف کرسکیں۔ چنانچہ آپ نے دہلی میں مکان کرایہ پر لیا اور وہیں مقیم ہوگئے۔

تقسیم ہند کے بعد پنجاب میں مساجد اور مدارس تباہ ہوگئے تھے، جو بچے کھچے مسلمان کہیں پڑے رہ گئے تھے، ان کی وضع قطع بدل گئی تھی، اس لیے ضرورت تھی کہ وہاں بڑے پیمانے پر اصلاح و بحالیات کا کام کیا جائے؛ چنانچہ مولانا مرحوم نے اپنی ایک ٹیم بنا کر پنجاب کا دورہ شروع کیا اور جگہ جگہ مکاتب و مدارس قائم کر کے مسلمانوں کی تعلیم کا نظام قائم کیا۔

اس سلسلے میں آپ نے ابتدائی مدارس میں پڑھانے کے لیے آٹھویں جماعت تک کے طلبہ کا ایک نصاب تیار کیا، جو گیارہ سالوں پر مشتمل تھا، اس کے علاوہ معلمین کے لیے ایک کتاب ''مسئلہ تعلیم اور طریقۂ تعلیم'' اسی کے ساتھ معاون چارٹس تیار کیے، جو تدریس میں اساتذہ کے کام آسکیں۔

مولانا مرحوم کے علمی کارناموں پر نگاہ ڈالئے تو یہ فیصلہ کرنا ہی مشکل ہے کہ وہ مؤرخ تھے، ادیب تھے یا محدث وفقیہ، آپ نے عرصہ تک مدرسہ شاہی مرادآباد میں مسلم شریف اور ہدایہ کا درس دیا اور آخر میں مدرسہ امینیہ دہلی میں شیخ الحدیث کی حیثیت سے

خدمات انجام دیتے رہے، اسی دوران آپ نے محسوس کیا کہ درس نظامی میں احادیث کی جو کتابیں پڑھائی جاتی ہیں، ان میں اخلاقیات کے ابواب پر کوئی خاص توجہ نہیں دی جاتی؛ کیوں کہ وہ ہر کتاب کے آخر میں ہیں، جو سال کے اخیر میں کبھی پڑھائے جاتے ہیں اور کبھی چھوڑ دیئے جاتے ہیں۔ اس نقطۂ نظر سے آپ نے احادیث کا ایک مجموعہ ''مشکوۃ الآثار ومصباح الابرار'' کے نام سے مرتب کیا، جس میں ایک سو بائیس اخلاقی موضوعات کی مستند احادیث جمع کی گئی ہیں۔ یہ کتاب دارالعلوم دیوبند میں داخل نصاب ہے۔ سیرت مبارکہ اور تاریخ اسلام تین حصوں میں بہت سے مدارس میں داخل نصاب ہیں۔

فقہ کی مشہور کتاب نورالایضاح کا اردو ترجمہ وتشریح نورالاصباح شرح نورالایضاح آپ کی مشہور کتاب ہے، عام مطالعہ کے لیے حضرت عثمانؓ کی حیات پاک پر شواہد تقدس اور صحابہ کا عہد زریں، تاریخی کام میں اہم اضافہ ہے۔ عام اسلامی موضوعات پر حیات مسلم، دین کامل، اسلام اور انسان کی حفاظت وعزت، روزہ، زکوۃ، خطبات ماثورہ مترجم، نماز مترجم، چاندتارے اور آسمان نیز بزرگان پانی پت عام طور پر مشہور ومقبول ہوئیں۔

حصول آزادی کے بعد جب ایک متعصب طبقہ نے جنگ آزادی سے مسلمانوں کی خدمات کو بالکل قلم زد کردینے کا عمل شروع کیا تو مولانا مرحوم کا قلم مسلمانوں اور خاص طور پر علماء ہند کے کارناموں کو ثابت کرنے کے لیے وقف ہوگیا، اس موضوع پر آپ نے علماء حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے، حیات شیخ الاسلام، اسیران مالٹا، مختصر تذکرہ خدمات جمعیۃ علماء ہند، صالح جمہوریت اور تعمیر جمہوریت، جمہوریت اپنے آئینے میں تحریر فرمائیں اور اس سلسلے کی اہم کتاب تحریک شیخ الہند، انڈیا آفس لائبریری لندن کی سی آئی ڈی رپورٹ کی بنیاد پر مرتب فرمائی، جس کا رسم اجرا نائب صدر جمہوریہ ہند جناب فخر الدین علی احمد مرحوم کے دست مبارک سے ۵؍جولائی ۱۹۷۷ء کو عمل میں آئی، اس کتاب کو خاص طور پر اس لیے اہمیت حاصل ہوئی کہ اس میں جنگ آزادی کی ایک اہم کڑی ریشمی رومال کی تحریک کا مفصل ذکر ہے۔

اس زمانے میں مولانا مرحوم کی سیاسی اور علمی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے

حکومت ہند نے آپ کو تانبر پتر عطا فرمایا اور وظیفہ، مکان کی سہولیات کی پیش کش کی، آپ نے تانبر پتر کا اعزاز تو یہ کہہ کر قبول فرمالیا کہ اس سے جہاد آزادی میں مسلمانوں کی خدمات کا ریکارڈ قائم ہوگا، باقی سہولیات قبول نہیں کیں؛ کیوں کہ یہی عمل حضرت شیخ الاسلام علیہ الرحمہ کا تھا۔

اس کے علاوہ سیاسی واقتصادی مسائل، اسلامی تعلیمات وارشادات، ہندوستان شاہان مغلیہ کے عہد میں، ہماری اور ہمارے وطن کی حیثیت اور ترک وطن کا شرعی حکم، آنے والے انقلاب کی تصویر، خطرناک نعرے اور جمعیۃ علماء ہند کا صراط مستقیم آپ کی اہم تصنیفات ہیں۔

جمعیۃ علماء ہند کے کارناموں کو مرتب کرنے اور علماء ہند کی خدمات کو یکجا کر دینے کا حضرت مولانا نے جو کارنامہ انجام دیا ہے، میرے خیال میں یہ ان سے پہلے کسی نے یہ کام کیا نہ ان کے بعد کوئی قلم اٹھا سکا، اس موضوع پر مولانا مرحوم کی کتابیں تاریخی دستاویز اور کتب حوالہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔

ان تمام تدریسی وتصنیفی مشغولیات کے علاوہ آپ کی دوسری مصروفیات بھی بدستور جاری رہیں، آپ دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوری اور عاملہ کے اہم رکن تھے اور آخر وقت تک اس کے مسائل میں دلچسپی لیتے رہے۔ جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مرادآباد میں مولانا عبدالحق صاحب مدنی کی وفات کے بعد ربیع الثانی ۱۳۸۱ھ سے رمضان المبارک ۱۳۸۴ھ تک مہتمم کے فرائض انجام دیئے اور اس مدرسہ کی مجلس عاملہ اور شوری کے اہم رکن رہے۔ دہلی کے بعض مدارس کی نگرانی بھی آپ کے سپرد تھی، جمعیۃ علماء ہند کی نظامت کے علاوہ آپ اس کے ادارہ المباحث الفقہیہ کے صدر اور اوقاف جمعیۃ کے چیئرمین بھی تھے، صدر مفتی کی حیثیت سے آپ نے مرادآباد اور دہلی کے مدرسہ امینیہ میں جو اہم فتاوے تحریر فرمائے، اگر ان کو کبھی مرتب کیا گیا تو یہ بھی ایک ممتاز علمی ذخیرہ ہوگا۔

۶ رشوال ۱۳۹۵ھ مطابق ۲۴ را کتوبر ۱۹۷۵ء چہارشنبہ کو ۷۴ رسال کی عمر میں اس مرد باخدا اور مجاہد جلیل نے داعی اجل کو لبیک کہا اور اپنی پسند کے مطابق فیروز شاہ دہلی کے عوامی قبرستان میں آخری آرام گاہ پائی۔ خدا ان کی قبر پر رحمتوں کے پھول برسائے۔ آمین

(ماهنامه ندائے شاهی اپریل ومئی ۱۹۹۰ء، ص: ۱۱ تا ۱۹)

مدرسہ شاہی کے عظیم محسن سید الملت

حضرت مولانا سید محمد میاں دیوبندیؒ متوفی: ۱۳۹۵ھ

کی زندگی کے چند اوراق

مولانا معز الدین احمد صاحب قاسمی

حضرت مولانا سید محمد میاں دیوبندیؒ (۱۹۰۲☆۱۹۷۵) کی ذات ستودہ صفات مختلف النوع صفات کی حامل تھی، آپ کی زندگی ہمہ رنگ اور ہمہ صفت زندگی کا ایک مرقع تھی، آپ کے تبحر علمی پر نظر ڈالیے تو ایک بحر بیکراں نظر آتے ہیں، اور جہد و جہاد کے میدان میں دیکھئے تو ''آئین جواں مرداں حق گوئی و بے باکی'' کا پیکر۔ ایک طرف آپ مسند تدریس پر فائز المرام نظر آتے ہیں تو دوسری طرف میدان تصنیف وتالیف کے کامیاب شہسوار، آپ کی راتیں بارگاہِ خداوندی میں الحاح وزاری، مناجات وسرگوشی، تہجد اوراوراد و وظائف اور عبادت وریاضت میں بسر ہوتی ہیں، تو دن اسلام اور مسلمانوں کی فلاح و بہبودی اور ملک وملت کی خیرخواہی میں ہمہ تن مصروف پایا جاتا ہے۔ یعنی صحیح معنوں میں آپ کی ذات ''**بالليل رهبان وبالنهار فرسان**'' کی مصداق ہے۔

مولانا اخلاق حسین قاسمی، مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی متوفی: ۱۹۶۲ء اور آپ کے متعلق رقم طراز ہیں:

> ''یہ دونوں ہستیاں مسلمانانِ ہند کے لیے قدرت کا خاص عطیہ تھیں، صوفیا کی اصطلاح میں ایسی ہستیوں کو رجال الغیب اور مردانِ غیب کہا جاتا ہے۔''
>
> [شاہ ولی اللہ اور ان کا نسبی وفکری خاندان، ص: ۵۱]

خاندان، ولادت اور تعلیم:

آپ سرزمینِ دیوبند کے قدیم خاندانِ سادات رضویہ کے چشم و چراغ تھے، آپ کے جد امجد مولانا سید محمد ابراہیم ؒ متوفی: ۱۰۳۳ھ جہانگیر کے عہد میں اس قصبہ میں تشریف لائے اور محلّہ سرائے پیرزادگان میں قیام فرمایا، اسی محلّہ میں آپ کا مزار ہے، اس محلّہ میں عہد جہانگیری کی ایک مسجد بھی ہے۔

جناب سید منظور محمد مرحوم کے گھر آپ کی ولادت باسعادت ہوئی، آپ خود لکھتے ہیں:

> ''محمد میاں ولد سید منظور محمد عرف اچھے میاں مرحوم، والدہ محترمہ کا نام اکرام النساء بنت سید ریاض احمد، تاریخ پیدائش: ۱۲/رجب ۱۳۲۱ھ مطابق ۴/اکتوبر ۱۹۰۳ء، مسقط راس: محلّہ پیرزادگان دیوبند ضلع سہارن پور۔''
>
> [ماہنامہ دارالعلوم مئی ۱۹۷۶ء ص: ۱۱، مضمون بعنوان: اشتات سوانح محمد میاں، جو آپ ہی کا تحریر فرمودہ ہے، آپ کی وفات کے بعد آپ کے صاحبزادے مولانا ساجد میاں صاحب نے اشاعت کے لیے رسالہ دارالعلوم میں بھیجا]

تعلیم کا آغاز گھر سے ہوا، نانی مرحومہ وغیرہا سے قرآن شریف وغیرہ پڑھا، اور پھر درجات فارسی سے دورۂ حدیث شریف تک دارالعلوم دیوبند میں تعلیم حاصل کی، جیسا کہ موصوف کا خود بیان ہے۔ والد صاحب محکمہ نہر میں ملازم تھے، قیام دیہات میں رہتا تھا، احقر بھی مع والدۂ محترمہ انھیں کے ساتھ رہتا تھا، پانچ چھ برس کی عمر ہوئی تو احقر کی تعلیم کی فکر ہوئی، موضع ''بچولہ''، ضلع بلندشہر جو والد صاحب کا ہیڈ کوارٹر تھا، چھوٹا سا گاؤں تھا، کوئی تعلیمی ادارہ نہیں تھا، تو محترمہ نانی صاحبہ نے شفقت فرمائی اور والدین کی درخواست پر انھوں نے بسم اللہ کرادی، نانی صاحبہ بہت صالحہ، صابر و شاکر خاتون تھیں، صوم وصلوۃ کے علاوہ اوراد کی پابند تھیں، سونے سے پہلے سورۂ ملک اور غالبًا سورۂ واقعہ کے علاوہ ایک طویل مناجات پڑھنے کا معمول تھا، والد صاحب مرحوم کا پھر ''ٹنڈ ھیڑہ''، ضلع مظفرنگر تبادلہ ہوگیا، جہاں دینی تعلیم کا مکتب تھا، احقر مکتب میں داخل کردیا گیا، پھر والد صاحب کا قصبہ ''ببونہ'' تبادلہ ہوا،

وہاں ایک صاحب تھے، خلیل احمد صاحب ان کا اسم گرامی تھا، پیشہ چرم دوزی تھا، مگر فارسی کی قابلیت بہت عمدہ تھی، احقر قرآن شریف ختم ہونے پر موصوف کے حوالے کیا گیا کہ فارسی پڑھائیں، مگر یہ عارضی انتظام تھا، پھر غالباً ۱۹۱۶ء میں دارالعلوم دیوبند کے درجۂ فارسی میں داخل کر دیا گیا۔

درجات فارسی کی تکمیل کے بعد احقر درجات عربی میں داخل ہوا، ۱۳۴۳ھ، ۱۹۲۵ء میں فارغ ہوا، دورۂ حدیث میں میرے گرامی قدر استاذ حضرت علامہ سید محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ متوفی: ۱۳۵۲ھ ہیں، جن کے فیوض علمی سے مجھ پر علم وحقیقت کی راہیں کھلیں۔ [ماہنامہ دارالعلوم مئی ۱۹۷۶ء، ص: ۱۲]

محدث العصر علامہ کشمیریؒ کے علاوہ علامہ شبیر احمد عثمانیؒ (م: ۱۳۶۹ھ) مفتی اعظم مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی (م: ۱۳۴۷) شیخ الادب مولانا اعزاز علی امروہویؒ (م: ۱۳۷۴) عارف باللہ مولانا سید اصغر حسین دیوبندیؒ (م: ۱۳۶۴ھ) امام المعقولات حضرت مولانا غلام رسول خاں ہزارویؒ (م: ۱۳۳۷ھ) وغیرہ جیسے اساطین فضل وکمال خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ بچپن میں حفظ کلام اللہ کی دولت حاصل نہ ہوسکی، پھر درس وتدریس کی مشغولیات نے موقع نہ دیا، آخر جہادِ آزادی کے زمانے میں متعدد جیل خانوں میں قیام کے دوران یہ سعادت حاصل ہوئی اور ۱۹۶۴ء میں تکمیل کے موقع پر انتہائی مسرت کا اظہار فرمایا۔

[ندائے شاہی، اپریل، مئی ۱۹۹۰ء، ص: ۱۳]

درس وتدریس:

فراغت کے بعد آپ کی جامعیت، اعلیٰ قابلیت اور کمال استعداد کا شہرہ تھا، جو ہر شناس اساتذہ کرام نے آپ کو مدرسہ عالیہ کلکتہ کی شاخ مدرسہ حنفیہ آرہ شاہ آباد بھیج دیا، جہاں سے تدریس کا سلسلہ شروع ہوا، چند سال قیام کے بعد طبیعت کی عدم مناسبت کی وجہ سے واپس آ گئے، جانے اور آنے کا واقعہ آپ ہی کے قلم سے ملاحظہ فرمائیں:

''مارچ ۱۹۲۶ء میں کلکتہ میں جمعیۃ علماء ہند کا ساتواں اجلاس زیر صدارت علامہ سید

سلیمان ندویؒ ہوا تھا، حضرت علامہ انور شاہ صاحب صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند اور دارالعلوم دیوبند کے جملہ اکابر اس میں شامل ہوئے۔

واپسی پر آرہ شاہ آباد کے اسٹیشن پر مدرسہ حنفیہ آرہ شاہ آباد کے ارکان نے صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند حضرت علامہ کشمیریؒ سے ایسے مدرس کی فرمائش کی، جو عربی تقریر وتحریر کی مشق اور خصوصاً فنِ ادب کی اونچی کتابیں پڑھا سکے، حضرت موصوف دیوبند واپس ہوئے، تو حضرت شیخ الادب مولانا اعزاز علی صاحب کے مشورے سے اس خدمت کے لیے احقر کو منتخب کیا گیا، احقر نے تقریباً ساڑھے تین سال آرہ میں قیام کیا۔

اول اول کچھ مشکلات پیش آئیں، پھر نہ صرف مدرسہ کے حضرات بلکہ شہر کے بھی بہت سے حضرات احقر سے مانوس ہو گئے، صوبہ بہار کے دوسرے اضلاع کے علماء اور بزرگوں سے بھی کچھ تعارف ہو گیا، مگر احقر اس مدرسے سے خاطر برداشتہ رہا؛ کیوں کہ اس مدرسے کو سرکاری ایڈ ملتی تھی اور بہار یونیورسٹی کے درجات فاضل وغیرہ کی تیاری بھی یہاں کرائی جاتی تھی، یہ دونوں باتیں دارالعلوم کے اصول کے خلاف تھیں، احقر کے اکابر جو دارالعلوم کے بااثر اور بارسوخ حضرات تھے، انھوں نے وقتی طور پر احقر کا انتخاب فرمایا تھا، اور اس میں شک نہیں کہ اگر احقر وہاں کچھ عرصہ اور قیام کرتا تو شمس الہدیٰ پٹنہ میں پروفیسر ہو سکتا تھا اور یہ بھی ممکن تھا کہ پروفیسر ہونے کے بعد پرنسپل بھی ہو جاتا۔'' [ماہنامہ دارالعلوم مئی ۱۹۷۶ء، ص:۱۲]

مدرسہ شاہی مرادآباد میں تشریف آوری:

مدرسہ حنفیہ آرہ سے علاحدگی کے ۱۹۲۸ء میں آپ زیب دہِ مسند تدریس جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی ہوئے۔ واقعہ کی تفصیل مولانا مرحوم سے ہی سنئے، لکھتے ہیں:

''احقر کسی ایسے مدرسے کی خدمت کا خواہاں تھا، جو دارالعلوم دیوبند کی طرح سرکاری امداد اور سرکاری اثرات سے پاک ہو، حسنِ اتفاق کہ جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مرادآباد میں ایک ایسے استاذ کی ضرورت ہوئی، جو درجات علیا کی تعلیم دے سکے، تو

دیوبند کے اکابر خصوصاً حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند نے احقر کی سفارش فرمادی، حضرت مولانا اعزاز علی صاحبؒ نے اس سفارش کی تائید فرمادی اور مجھے تحریر فرمایا کہ اب ایسے مدرسہ میں بھیجا جارہا ہے، جو علم کا مرکز ہے۔ احقر ۱۹۲۸ء کے مارچ میں مدرسہ شاہی پہنچا۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ سائمن کمیشن (برطانوی حکومت کا یہ کمیشن ۳؍فروری ۲۸ء کو ساحل بمبئی پر اترا، اور ۳۱؍مارچ ۲۸ء کو ناکام واپس ہوا۔ اس کمیشن کا مقصد آمد بقول رئیس احمد جعفری یہ تھا کہ ''ہندوستان کو پھر مجلس آئین واصلاح رعایت حقوق کا شیریں مگر خواب آور شربت پلادیا جائے؛ تاکہ ایک عرصۂ دراز تک یہ مرغ زریں بال اسیرِ دام رہے''۔ [بیس بڑے مسلمان]) ہندوستان پہنچ کر ناکام واپس ہوا تھا، مدرسہ شاہی کی فضا احقر کے مزاج کے مطابق تھی، دارالعلوم دیوبند کی طرح یہ مدرسہ بھی سرکاری امداد اور سرکاری اثرات سے پاک تھا، اس مدرسہ کے صدرالمدرسین حضرت مولانا فخرالدین صاحبؒ تھے، جو بعد میں دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث اور جمعیۃ علماء ہند کے صدر ہوئے۔ مولانا موصوف شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحبؒ کے خاص شاگرد اور سیاسی خیالات میں ان کے پختہ معتقد تھے، (آپ کو حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ سے بھی شرف تلمذ حاصل تھا، اور حضرت علامہ کی تحقیقات علمیہ کا بڑا ذخیرہ آپ کے سینے میں محفوظ تھا) تحریک خلافت میں اگرچہ جیل نہیں گئے؛ مگر کام بہت کیا، زیادہ تر آپ ہی کی خدمات تھیں، جن کی وجہ سے مدرسہ شاہی نے سیاسی تحریک کے سلسلہ میں خاص امتیاز حاصل کیا۔'' [ماہنامہ دارالعلوم مئی ۱۹۷۶ء، ص: ۱۳]

رجسٹر کارروائی اجلاس مجلس شوریٰ مدرسہ شاہی اور اس کی روداودں سے پتہ چلتا ہے کہ آپ بزمانۂ اہتمام الحاج سید مرتضیٰ علی مرحوم ماہ شوال ۱۳۴۷ھ میں تدریسی خدمات پر مامور ہوئے، اور اجلاس مجلس شوریٰ منعقدہ ۲۸؍ربیع الثانی ۱۳۴۸ھ میں باضابطہ توثیق تقرری ہوئی، پھر مدرسہ شاہی کی علمی اور انقلابی فضا آپ کو ایسی راس آئی کہ یہ وابستگی دوامی ثابت ہوئی اور اس گلشن قاسمی کی بہاروں نے ایسا مسحور کیا کہ تاعمر رشتۂ ارتباط کو باقی رکھا، مدرس،

مفتی، منتظم، مہتمم اور ممبر شوریٰ وعاملہ کی حیثیت سے وہ کارہائے نمایاں انجام دیے جو تاریخ شاہی کا زریں باب ہے۔

مدرسہ شاہی کا یہ عہد، عہدِ زریں تھا؛ کیوں کہ آپ کے علاوہ حضرت مولانا عبدالحق مدنیؒ متوفی ۱۳۵۴ھ اور شیخ الحدیث حضرت مولانا فخر الدینؒ جیسی باکمال ہستیاں اس کو دارالعلوم ثانی بنائے ہوئے تھیں، یہ مدرسہ شہرۂ آفاق کا حامل ہوگیا تھا، طالبان علوم کشاں کشاں آ کر فیض یاب ہورہے تھے، اس درس گاہِ نانوتویؒ میں تقریباً ۱۶؍سال علم کے دریا بہاتے رہے، مختلف علوم وفنون کی کتابیں بالخصوص ہدایہ اور مسلم شریف زیرِ درس رہیں، ایک عرصہ تک فتاویٰ بھی آپ تحریر فرماتے رہے، جن کو برادرم مولانا محمد سلمان منصور پوری نائب مفتی مدرسہ شاہی نے بحکم حضرت مولانا سید رشید الدین صاحب مہتمم مدرسہ ترتیب دیا ہے، ان شاء اللہ عنقریب جلوہ آرائے طباعت ہوکر سرمایہ علمی ہوگا۔

درس وتدریس کے ساتھ سیاسی سرگرمیاں بھی جاری رہیں، تصنیف وتالیف کا مشغلہ بھی، اور ''بجرمِ عشقِ حریت'' قید وبند کا سلسلہ بھی، اولاً ۱۹۴۵ء میں جمعیۃ علماء ہند کی خدمت کے لیے دہلی تشریف لائے، پھر ہنگامہ ۱۹۴۷ء کے بعد مستقلاً دہلی کا قیام اختیار کیا، جس کی کہانی خود موصوف کی زبانی سنئے:

''مجاہد ملت (مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی ناظم عمومی جمعیۃ علماء ہند متوفی ۱۹۶۲ء) زمانۂ اسارت میں احقر سے اتنے مانوس ہوگئے تھے کہ پھر احقر کو اپنی قید سے رہا کرنا گوارا نہ کیا، (مرادآباد اور بریلی کے جیلوں میں یہ اسارت کی رفاقت اکتوبر ۴۲ء تا اپریل ۴۴ء رہی) ۱۹۴۵ء میں حضرت شیخ الاسلامؒ کو ساتھ لے کر مرادآباد پہنچے، اور مدرسہ شاہی کے مہتمم حضرت مولانا عبدالحق صاحب مدنیؒ اور صدر مدرس حضرت مولانا سید فخر الدین احمد صاحب سے اصرار کرکے، مدرسہ شاہی سے چھ ماہ کی رخصت دلوائی اور دہلی لے آئے، حضرت مجاہد ملت تیار نہیں تھے؛ مگر احقر کو سلسلۂ درس ترک کرنا، گوارا نہیں تھا، چھ ماہ بعد واپس ہوگیا، لیکن چند روز بعد ۱۹۴۷ء کا مشہور ہنگامہ ہوگیا، ابتداء ہنگامہ میں تو حالت یہ تھی کہ دہلی میں کسی طرف سے بھی کسی مسلمان کا آنا خودکشی

کے مرادف تھا؛ لیکن جیسے ہی دہلی پہنچنے کا موقع ملا، احقر دہلی آ گیا اور یہاں آ کر محسوس کیا کہ اس وقت مجاہد ملت جو خدمت انجام دے رہے ہیں، وہی بہترین خدمت بلکہ افضل ترین جہاد ہے؛ لہٰذا احقر نے دہلی ہی میں اس وقت تک قیام کا ارادہ کر لیا، جب تک مجاہد ملت کو ضرورت ہو۔ رحمہ اللہ

اس طرح تقریباً ۱۴ر سال گزر گئے، مجاہد ملتؒ نے بارہا فرمایا کہ وہ نظامت علیا سے سبکدوش ہونا چاہتے ہیں، یہ ذمہ داری احقر منظور کر لے، مگر احقر کا جواب یہی ہوتا تھا کہ احقر اپنی افتادِ طبع کے لحاظ سے مدرس ہے، آپ کی امداد کے لیے خدمت درس ترک کیے ہوئے ہے، نظامت سے طبعاً دلچسپی نہیں ہے، آپ کو اگر امداد کی ضرورت نہیں تو احقر کا مقام ''مدرسہ شاہی'' ہے، نظامت علیا نہیں، بہرحال نتیجہ یہ ہوا ''آں قدح بشکست وآں ساقی نماند''۔ [روزنامہ الجمعیۃ دہلی، خصوصی اشاعت بموقع اجلاس بست وسوم جمعیۃ علماء ہند، ۵ر مئی ۷۲ء، ص: ۱۳۰، مضمون بعنوان: خودنوشت بے نوا]

الحاصل ۱۹۴۷ء کے بعد آپ دہلی کے ہو رہے، مگر مدرسہ شاہی سے تعلق ختم نہ ہوا، بلکہ اب تک مدرس تھے، اب مجلس شوریٰ کے رکن بنا دیے گئے، پھر ۱۳۸۰ھ میں مولانا محمد تقی دیوبندی کے وصال کے بعد آپ کو اعزازی مہتمم بنایا گیا اور تا دمِ واپسیں ۱۳۹۵ھ تک آپ نے مدرسہ شاہی کے صدر مہتمم رہ کر مدرسہ کو پروان بخشا۔ [از روداد ہائے مدرسہ شاہی مرادآباد]

ایک طویل عرصہ تک درس وتدریس سے انقطاع کے بعد ۱۹۶۲ء میں دہلی کی مشہور درس گاہ مدرسہ امینیہ میں شیخ الحدیث کے عہدہ پر فائز ہوئے، جس پر زندگی کے آخری وقت تک برقرار رہے، بخاری شریف جیسی عظیم الشان کتاب کے درس کے ساتھ، افتاء کی عظیم ذمہ داری کو بھی نبھایا، آپ خود تحریر فرماتے ہیں:

> ''احقر کا پیشہ مدرسی رہا، اگرچہ بیس سال ایسے گزرے کہ قید وبند یا جمعیۃ علماء کی وجہ سے اس پیشہ پر قائم نہ رہ سکا، مگر پھر خدا نے توفیق عطا فرمائی کہ پڑھ قال اللہ وقال الرسول کے حلقہ میں احقر حاضر ہو گیا۔ آخری سال جب حضرت مجاہد ملت بیمار تھے، مدرسہ امینیہ کے مہتمم مولانا حفیظ الرحمٰن واصف (۱) نے احقر سے مدرسہ امینیہ کے

لیے مدد چاہی کہ مدرسہ کے صدر مدرس بیمار ہیں، ایک مدرس حج کے لیے تشریف لے گئے ہیں، ایک رخصت پر پاکستان گئے ہوئے ہیں، مدرسہ میں درس حدیث کے لیے کوئی نہیں ہے، احقر سے فرمائش کی کہ یہ خدمت احقر انجام دے، احقر نے اعزازی طور پر یہ خدمت منظور کرلی اور درس شروع کرادیا۔ ایک سال تک اعزازی خدمت انجام دیتا رہا، پھر جناب مہتمم صاحب اور حضرات اراکین نے اصرار فرما کر دوامی خدمت کا وعدہ لے لیا۔''

[روزنامہ الجمعیۃ، خصوصی اشاعت، ۵/مئی ۷۲ء، ص: ۱۳۰، ۱۳۱]

(۱) آپ مفتی اعظم مفتی کفایت اللہ متوفی: ۱۳۷۲ھ کے خلف الرشید اور علم وادب کے استاذ تھے، زاہدانہ کردار کے حامل، مزاج میں قناعت پسندی تھی، ۱۳/مارچ ۱۹۸۷ء کو وصال ہوا، قبرستان شاہ ولی اللہ میں مدفون ہیں۔

اس طرح ان تمام تفصیلات کے ساتھ آپ نے تقریباً ۳۲/سال درس وتدریس میں گزارے، تین سال مدرسہ حنفیہ آرہ میں، ۱۶/سال مدرسہ شاہی مرادآباد میں، اور ۱۳/سال مدرسہ امینیہ دہلی میں۔ اس عرصۂ تدریس میں نامعلوم کتنے طالبان علوم نے اکتساب فیض کیا، یقیناً یہ تعداد ہزاروں سے متجاوز ہوگی۔

سیاسیات اور جمعیۃ علماء ہند سے وابستگی:

جمعیۃ علماء ہند کے ساتھ اگرچہ آپ کا رشتہ زمانہ حصول تعلیم ہی میں قائم ہوگیا تھا اور فراغت کے بعد مارچ ۱۹۲۶ء میں جمعیۃ علماء ہند کے ساتویں اجلاس کلکتہ میں اکابر علماء کے ہمراہ آپ نے بھی شرکت فرمائی تھی۔ مگر اس سلسلہ کی سرگرمی مدرسہ شاہی میں تشریف آوری کے بعد شروع ہوئی، جو پھر زندگی بھر ختم نہ ہوئی، اور آپ نے جمعیۃ علماء ہند کے پلیٹ فارم سے ملک وملت اور قوم ووطن کے لیے ناقابل فراموش خدمات انجام دیں، اور خود جمعیۃ علماء کی وہ خدمت انجام دی، جو جمعیۃ علماء کی تاریخ میں سنہرے حرفوں سے لکھے جانے کے لائق ہے۔ جمعیۃ علماء مرادآباد کی نیابت نظامت سے لے کر جمعیۃ علماء ہند کی نظامت علیا تک مختلف عہدوں پر فائز رہے، جن کی کچھ تفصیل خود موصوف کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں:

''۱۹۲۹ء میں جمعیۃ علماء ہند کا اجلاس امروہہ میں ہوا، جس میں شرکتِ کانگریس کا ریزولیشن پاس کیا گیا، اس اجلاس سے کچھ پہلے جمعیۃ علماء شہر مرادآباد کی مجلس منتظمہ کا اجلاس ہوا، جس میں احقر کو جمعیۃ علماء شہر مرادآباد کا نائب ناظم منتخب کیا گیا، کچھ دنوں بعد نائب کے بجائے ناظم بنادیا گیا، اس وقت نظام جمعیۃ علماء سے وابستہ کیا گیا تھا تو احقر کو جمعیۃ علماء صوبہ آگرہ کا ناظم تبلیغ بنادیا گیا، ناظم تبلیغ کے احقر جمعیۃ علماء صوبہ آگرہ پھر پورے صوبہ متحدہ کی جمعیۃ علماء کا ناظم ہوگیا۔'' [روزنامہ الجمعیۃ، خصوصی اشاعت،ص:۱۲۹، ۱۳۰]

پھر اجلاس سہارنپور میں جمعیۃ علماء ہند کا ناظم منتخب کیا گیا۔ لکھتے ہیں:

''۴رمئی تا ۷رمئی ۱۹۴۵ء کو بڑی شان کے ساتھ جمعیۃ علماء ہند کا اجلاس سہارنپور میں ہوا، حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ صدر، اور مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ ناظم اعلیٰ منتخب کیے گئے، احقر کا نام زبانوں پر آیا تو احقر نے اسٹیج پر کھڑے ہوکر معذرت کرنی چاہی؛ مگر سیدی شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ نے جو اسٹیج پر تشریف فرما تھے، خلاف معمول احقر کا دامن جھٹک کر کھینچا اور احقر کو نیچے بٹھادیا، اب بجز تسلیم ورضا چارہ ہی کیا تھا! قہرِ درویش بر جان درویش۔'' [مجاہد ملت نمبر،ص:۵۶]

مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کے انتقال کے بعد ناظم اعلیٰ منتخب ہوئے، لکھتے ہیں:

''حضرت مجاہد ملتؒ نے زمانۂ مرض میں از خود احقر کے قائم مقامی کا اعلان کرادیا تھا، مرحوم کی وفات کے بعد ایک سال تک اس اعلان کا احترام کرتے ہوئے یہ خدمت انجام دی۔'' [خصوصی اشاعت:ص:۱۳۰]

دوسری جگہ تحریر فرماتے ہیں:

''پھر یہ منصب اس کے سپرد کیا گیا جس کو اللہ تعالیٰ نے اس کی اہلیت عطا فرمائی تھی، حضرات اراکین اگرچہ احقر کے بھی مخالف نہیں تھے؛ مگر ان کے جذبات اس کے ساتھ تھے، جس کو جناب صدر نے اس منصب کے لیے نامزد فرمایا، یعنی نوجوان صالح مولانا اسعد صاحب زادت مزایاہ، بہرحال یہ درست ہے کہ نظامت کا لیبل احقر پر تقریباً ۳۵ر

سال چسپاں رہا۔'' [ایضاً:ص:۱۲۹]

جمعیۃ علماء ہند کی نظامت علیا کے بعد بھی جمعیۃ علماء کے ساتھ رشتۂ انسلاک میں کمی نہ آئی، بلکہ آپ اس کی مجلس عاملہ کے رکن رکین، ادارۂ مباحث فقہیہ کے مدیر اور جمعیۃ ٹرسٹ کے سکریٹری رہے۔

اجلاس امروہہ میں مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی متوفی: ۱۹۶۲ء نے شرکت کانگریس کی تجویز پیش کی، جس کی تائید میں امیر شریعت مولانا عطاء اللہ شاہ بخاریؒ متوفی: ۱۳۸۱ھ نے شعلہ بار تقریر کی، جس کا سلسلہ تین گھنٹے تک جاری رہا، جس نے بہت سے دلوں کی دنیا بدل دی۔ مولانا محمد میاں صاحب لکھتے ہیں:

''جن سے خود یہ راقم الحروف بھی ہے کہ پہلے صرف ایک گوشہ نشین مدرس تھا، اور اب جنگ آزادی کا سپاہی بن گیا، جس کو قید و بند اور دار و رسن کے خواب آنے لگے۔'' [الجمعیۃ مجاہد ملت نمبر ص:۴۴]

اسی اجلاس کے بعد شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی نور اللہ مرقدہ متوفی: ۱۳۷۷ھ کے مشورہ سے ہندوستان کی مشہور سیاسی جماعت کانگریس میں شریک ہوئے، پھر جمعیۃ علماء اور کانگریس کے پلیٹ فارم سے جہادِ آزادی میں سرفروشانہ حصہ لیا اور قائدانہ رول ادا کیا۔

جمعیۃ علماء کے پلیٹ فارم سے قومی وملی خدمات:

آپ نے ملک وملت کے لیے جو خدمات اور قربانیاں پیش کی ہیں، ان سب کو احاطۂ تحریر میں لانا جوئے شیر لانے سے کم نہیں، اور اس مختصر مضمون میں اس کی گنجائش بھی نہیں، تاہم ان خدمات کا ایک سرسری خاکہ پیش کر دینا فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔

(۱) آزادی کے متوالے کو ''بجرم عشق حریت'' پانچ بار قید و بند کی آزمائش میں ڈالا گیا، مرادآباد، دہلی، میرٹھ، بریلی، فیض آباد کی جیلوں میں سلاخوں کے پیچھے رکھا گیا۔ موصوف خود لکھتے ہیں:

''کانگریس کا باقاعدہ ممبر بننے کے چند ہفتے بعد ہی احقر گرفتار ہوا، اس وقت حضرت مولانا سید فخر الدین احمدؒ سابق صدر جمعیۃ علماء ہند نے بھی احقر کا ساتھ دیا، اس کے بعد احقر ۱۹۳۲ء میں پہلے دہلی پھر مراد آباد میں گرفتار ہوکر سزایاب ہوا، پھر ۱۹۴۰ء میں یہ شرف حاصل ہوا، ۱۹۴۲ء کی تحریک میں آخری بار گرفتار ہوا۔'' [خصوصی اشاعت: ص: ۱۳۰]

جی چاہتا ہے کہ اس موقع پر گرفتاریوں کی تفصیل بیان کردوں، مگر مضمون کی تنگ دامانی اجازت نہیں دے رہی ہے؛ تاہم ایک واقعہ موصوف کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں، سول نافرمانی ۱۹۳۲ء کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''احقر دہلی سے رہا ہوکر دیوبند پہنچا، جہاں والدہ صاحبہ اور احقر کے متعلقین تھے، پھر فوراً ہی مراد آباد چلا گیا، جہاں صوبہ یوپی کانگریس کمیٹی کے ڈکٹیٹر کی حیثیت سے گرفتاری کا پروگرام طے تھا، سی آئی ڈی احقر کی تفتیش میں رہی ہوگی، اور ممکن ہے کہ اس کو حیرت ہوئی ہو، جب احقر دفعتاً مراد آباد کے چوک بازار میں اس حالت میں نمودار ہوگیا کہ ایک ہاتھ میں کانگریس کا جھنڈا تھا اور دوسرے میں جمعیۃ علماء ہند کا۔

ایک عزیز دوست پنجابی سوداگر حافظ محمد شفیع صاحب نے آگے بڑھ کر سنہری ہار گلے میں ڈالا، جس کو احقر نے منظور کیا، کیوں ہار پہننے اور پہنانے کے لیے اس سے بہتر وقت کوئی نہیں ہوسکتا تھا، چند منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ حاضرین کے اجتماع نے جلوس کی شکل اختیار کرلی اور اب یہ جلوس جس کی قیادت محمد میاں کررہا تھا (جس کے دونوں ہاتھ اس طرح گھرے ہوئے تھے کہ ایک میں ایک جھنڈا تھا اور دوسرے مین دوسرا اور گلے میں قرآن شریف) امروہہ گیٹ کی طرف بڑھنے لگا، ابھی تقریباً ایک فرلانگ چلا تھا کہ پولیس کے دستہ نے آکر محاصرہ کرلیا، احقر کو گرفتاری کا حکم سنا کر اپنی تحویل میں لے لیا اور مجمع کو منتشر کرنے کے لیے لاٹھی چارج شروع کردیا، احقر حوالات میں پہنچا تو تھوڑی دیر بعد حافظ شفیع الدین صاحب بھی درآمد ہوئے، جرم یہ تھا کہ کانگریس اور جمعیۃ کے ڈکٹیٹر کو ہار کیوں پہنایا تھا، پھر ابھی انگریزی حساب سے تاریخ ختم نہیں ہوئی تھی، یعنی رات کے بارہ نہیں بجے تھے کہ مراد آباد کانگریس کے تمام سربراہ جن کی تعداد سترہ تھی، گرفتار کرکے احقر کے ساتھی بنادیے گئے۔

چندروز مقدمہ ہوا، چھ ماہ کی سزا با مشقت کلاس سی اور مشقت میں احقر اور موجودہ کیبن ڈوپلمنٹ منسٹر یوپی (داؤ دیال کھنہ) کو چکی دی گئی۔ جس سے چند دنوں کے بعد حکیم انظار صاحب وغیرہ کی مساعی سے نجات مل گئی اور کلاس سی کے بجائے بی کر دیا گیا۔‘‘

یہ جوش وولولہ اس وقت تھا جب کہ ابھی دہلی حوالات سے رہا ہوکر آئے تھے، جہاں تکلیف ومشقت کا جو حال تھا، وہ بھی مرحوم کی زبانی سنئے:

’’غالباً اگست کا مہینہ تھا، شدید گرمی، حوالات سب طرف سے بند، نہ روشن دان نہ کھڑکی، صرف ایک جانب دروازہ کے دوطرف جنگلے تھے، مگر سامنے چوڑا برآمدہ تھا، جس کی وجہ سے یہ جنگلے بھی ہوا سے نا آشنا رہتے تھے، پیشاب پاخانہ کے لیے صبح کو آٹھ بجے ایک گھنٹہ کے لیے کھولا جاتا تھا، باقی ۲۳ر گھنٹے اسی کمرے میں بند رہتے تھے، یہیں وضو بھی کیا جاتا تھا، پانی نکلنے کی کوئی نالی نہیں تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ وضو کا پانی کمرے ہی میں بھرتا رہا، حسن اتفاق یہ تھا کہ کمرہ ڈھال کافی تھا، پانی اسی ڈھال میں رہتا تھا، رفتہ رفتہ صورت یہ ہوگئی کہ کمرہ کے نصف حصہ میں پانی بھر گیا اور نصف حصہ میں ہمارے چھ یا سات ساتھیوں کے بستر تھے۔ اس حبس بے جا کا اثر یہ ہوا کہ تمام ساتھیوں کو عوارض لاحق ہوگئے، احقر کو پیچش ہوگئی۔‘‘

مگر یہ قید وبند، زنداں وسلاسل اس مردِ حق آگاہ کے پایۂ استقلال میں لغزش نہ دے سکے، کیوں کہ میدان سیاست کی اس خارزار وادی میں جسم وجان کو داؤ پر لگا کر ہی اس للکار کے ساتھ داخل ہوا تھا: ؎

دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

(۲) ۱۹۳۲ء میں جب تحریک سول نافرمانی شباب پر تھی، پورے ملک میں سول نافرمانی اور خلاف ورزی قانون کے نظام کو زندہ رکھنے کے لیے کانگریس نے جنگی کونسل اور جمعیۃ علماء ہند نے ’’ادارۂ حربیہ‘‘ قائم کیا تھا، اور اس نظام کی کلید حضرت مولانا ابوالمحاسن سجاد صاحبؒ کے ہاتھ میں تھی، جن کی ہدایت پر مولانا محمد میاں صاحب مرحوم کا یہ کام تھا کہ ہر ہفتہ جمعہ کو صبح کو مرادآباد سے چل کر دہلی پہنچا کریں اور نماز جمعہ کے بعد جامع مسجد میں تقریر

کرکے واپس ہوجایا کریں۔ اس طرح انتہائی احتیاط اور ہوشیاری کے ساتھ چند جمعہ گزرے، پھر ایک جمعہ کو پولیس کی حراست میں آ گئے، ایک ہفتہ حوالات میں رکھ چھوڑے گئے اور چھ ماہ کے لیے دہلی میں داخلہ ممنوع قرار دے دیا گیا، اس موقع پر جمعیۃ علماء ہند نے ڈکٹیٹر شپ کا نظام قائم کیا تھا، جس کے آپ نویں ڈکٹیٹر تھے اور اتر پردیش کانگریس کمیٹی کے بھی ڈکٹیٹر ہونے کا شرف حاصل تھا۔

(۳) ۸/اگست ۱۹۴۲ء کو انڈین نیشنل کانگریس نے ''کوئٹ انڈیا'' (ہندوستان چھوڑو) کی تجویز پاس کی، جس کی پاداش میں رہنمایان وطن کی داروگیر کا سلسلہ شروع ہوگیا، اس اقدام کی حمایت کے لیے جمعیۃ علماء ہند کے ناظم عمومی مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی متوفی: ۱۹۶۲ء نے مجلس عاملہ کا ہنگامی اجلاس بلایا، جو ۷، ۸/اگست ۴۲ء کو دہلی میں بصدارت: سحبان الہند مولانا احمد سعید دہلوی نائب صدر جمعیۃ علماء ہند ہوا، کیوں کہ صدر جمعیۃ علماء ہند شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی ۲۵/جون کو گرفتار ہو چکے تھے، اس اجلاس میں مولانا محمد میاں صاحب کیسی کیسی صعوبتیں اٹھا کر شریک ہوئے، اور پھر حسب ہدایت ملک کے گوشہ گوشہ میں مجلس عاملہ کی تجویز کو پہنچایا، اس کی کہانی خود مرحوم کی زبانی سنئے، مولانا مرحوم کا یہ ایک عظیم الشان کارنامہ ہے اور ان کے جذبۂ آزادی کی ایک تابناک مثال۔ لکھتے ہیں:

''اس زمانہ میں احقر کا تعلق مدرسہ شاہی مرادآباد سے تھا، مگر رفقاء محترم کو بجرم عشق حریت ۸/اگست کو مرادآباد سے گرفتار کیا گیا تو احقر نے فوراً ہی روپوش ہوجانا ضروری سمجھا، چنانچہ پولیس گرفتاریوں میں مصروف تھی اور احقر تاریک اور غیر معروف گلیوں کوچوں میں ہوتا ہوا مرادآباد نکل رہا تھا، میرے نسبتی بھائی حافظ سادات حسن صاحب از راہِ ہمدردی احقر کے ساتھ ہولیے، ہم دونوں ۸/میل پاپیادہ طے کرکے قصبہ حکیم پور پہنچے، جب چند گھنٹہ بعد دہلی جانے والا پسنجر حکیم پور پہنچا تو احقر اس سے روانہ ہوگیا؛ لیکن ٹرین میں زیادہ دیر تک بیٹھنا بھی مناسب نہیں تھا، لہذا سمبھاؤلی اسٹیشن پر اتر گیا اور موضع ''ویٹ'' میں جو اسٹیشن سمبھاؤلی سے تقریباً تین میل کے فاصلے پر ہے، اپنے ماموں زاد بھائی مولانا سید محمد اعلیٰ صاحب صدر مدرس مدرسہ اعزازیہ قصبہ ویٹ کے

یہاں دو تین روز قیام کیا، پھر کچھ پا پیادہ اور کچھ بس سے سفر کرتے ہوئے دہلی پہنچنا چاہتا تھا کہ جمنا کے پل پر راستہ روک دیا گیا کہ شہر میں کانگریسیوں نے فساد برپا کر رکھا ہے، فساد کا تماشہ میں خود بھی جمنا پار سے دیکھ رہا تھا، کیوں کہ پیلی کوٹھی کو جس میں ریلوے کا ریکارڈ تھا، آگ لگا دی گئی تھی اور اس کے شعلے آسمان سے باتیں کر رہے تھے، یہ شعلے جمنا پار بلکہ شاہ درہ سے نظر آ رہے تھے، اس وقت جمنا برج سے واپس ہو کر غازی آباد پہنچا، پھر غازی آباد سے دہلی پہنچنے کی داستان طویل ہے۔[مجاہد ملت نمبر،ص:۵۳]

الحاصل دہلی پہنچ کر بحیثیت مدعو خصوصی مجلس عاملہ کے اجلاس میں شریک ہوئے، مجلس عاملہ نے انڈین نیشنل کانگریس کے اقدام کی حمایت کرتے ہوئے ایک تجویز منظور کی اور یہ طے کیا کہ اس کو کثیر تعداد میں طبع کرا کر ملک کے گوشہ گوشہ میں پہنچایا جائے اور یہ خدمت مولانا محمد میاں اور مولانا عبدالماجد دہلوی کے سپرد کی گئی۔ دہلی سے مشرقی ہندوستان کے آخری کنارہ تک پہنچانا مولانا مرحوم کے ذمہ کیا گیا، حسب ہدایت اراکین عاملہ تجویز اور اعلان کا بنڈل لے کر کلکتہ روانہ ہو گئے۔ سفر کی داستان آپ ہی سے سنئے:

جگہ جگہ ہڑتالیں ہو رہی تھیں، پولیس اور فوج کی گولیاں موت کی بارش برسا رہی تھیں، ریل کی پٹریاں اکھاڑی جا رہی تھیں، ٹلیفون اور ٹیلی گراف کے تار کاٹ کر نظام حکومت خصوصاً ریلوے کے نظام کو معطل کیا جا رہا تھا اور بارش کی مسلسل جھڑیوں نے جس طرح پولیس اور سی آئی ڈی کے کام کو دشوار کر دیا تھا، مسافروں کے لیے بھی صعوبتیں پیدا کر دی تھیں، بہر حال ان حالات کو انگیز کرتے ہوئے دہلی سے روانہ ہو کر مغل سرائے تک تو رسائی ہو گئی، لیکن مغل سرائے کے بعد سفر کی تمام صورتیں ناممکن ہو گئیں، کیوں ریلوے کی پٹریاں تو تحریک کی نذر ہو گئی تھیں اور عام راستوں اور سڑکوں کو سیلاب نے ناقابل عبور بنا دیا تھا، مجبوراً احقر جون پور واپس ہوا اور محترم حاجی ولی محمد صاحب مرحوم کے ایک مکان میں گوشہ نشیں ہو کر اس لٹریچر کو مختلف صورتوں سے ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں پہنچانے کا انتظام کیا۔[ایضاً،ص:۵۳]

یہ ہیں آپ کے مجاہدانہ عزائم اور کارنامے، نہ معلوم اس تحریک میں اس طرح کے

کتنے واقعات پیش آئے ہوں گے۔

(۴) تحریک ۴۲ء کے موقع پر گرفتار شدہ بزرگوں کی جانب سے آپ موقع بموقع باغیانہ سرکلر جاری کیا کرتے تھے، ایک سرکلر جو سراسر باغیانہ تھا، اس کو پشاور کالج کے طلبہ نے پشتو میں ترجمہ کر کے شائع کیا اور مولانا مرحوم کا نام بھی لکھ دیا، جس کی پاداش میں گرفتار ہوئے اور اکتوبر ۴۲ء تا اپریل ۴۴ء مرادآباد اور بریلی کی جیلوں میں رہے۔ اس موقع پر مرادآباد جیل میں شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی اور مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کی رفاقت اور معیت حاصل ہونے کے ساتھ، مدرسہ شاہی مرادآباد کے بہت سے اساتذہ اور طلبہ بھی شریک اسارت رہے۔ جن کی تفصیل علماء حق جلد دوم میں ملاحظہ کیا جائے۔

(۵) ہنگامہ ۴۷ء کے بعد وہ علاقے جو مسلمانوں کی آبادی سے خالی ہوکر کمزور ہوگئے تھے، ان علاقوں کے بچے کھچے مسلمانوں کو ارتداد سے بچانے کے لیے مولانا مرحوم نے انتھک جدوجہد کی اور ہماچل پردیش، راجستھان اور میوات کے پہاڑی وریگستانی علاقوں میں دن ورات دورے کیے، ان کو ڈھارس بندھائی، دینی مکاتب قائم کیے، مجدد الف ثانیؒ کے مزار کو شرنارتھیوں سے محفوظ رکھنا آپ ہی کا کارنامہ ہے۔

(۶) آزادی کے بعد فوراً نئی نسلوں میں دین کی حفاظت کا کام بنیادی تھا، جمعیۃ علماء ہند نے اپنے سولہویں اجلاس منعقدہ لکھنؤ ۱۶ر تا ۱۸ر اپریل ۴۹ء میں دینی تعلیم کی مہم کو اپنا سب سے اہم پروگرام قرار دیا، اس تحریک کو چلانے کا کام مولانا مرحوم کے ہاتھ میں تھا اور آپ نے کامیابی کے ساتھ چلایا، اور مجوزہ نصاب کی ترتیب وتدوین کی سعادت بھی آپ ہی کے حصے میں آئی او آپ نے ''دینی تعلیم کے رسالے'' تحریر فرمائے۔

(۷) جب جمعیۃ علماء ہند نے اپنے اجلاس اجین منعقدہ ۹ر تا ۱۱ر دسمبر ۱۹۶۰ء میں شرعی پنچایتوں کے نظام کو جاری کرنے کا فیصلہ کیا تو آپ نے ہی اس کا ضابطۂ عمل، اختیارات وفرائض اور احکام تیار کیے۔

(۸) ہندوستان کے بدلتے ہوئے حالات کے پیش نظر آپ کی تحریک پر جمعیۃ

علماء ہند نے مباحث فقہیہ کا شعبہ قائم کیا تو آپ ہی اس کے مدیر بنائے گئے اور آپ نے ''رویت ہلال''، حقوق طبع، کوآپریٹو سوسائٹیوں وغیرہ پر بحث وتحقیق کا کارنامہ انجام دیا۔

(۹) ۴۷ء کے بعد مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی نے الجمعیۃ کو دوبارہ جاری کرنے کا فیصلہ کیا تو آپ ہی نے اس کی ذمہ داری کو سنبھالا، مولانا مرحوم لکھتے ہیں:

> ''ابھی ۴۷ء کا پُر آشوب دور ختم نہیں ہوا تھا کہ لکھنؤ میں ۲۹، ۳۰ ؍دسمبر ۴۷ء کی تاریخین آزاد کانفرنس کے لیے طے کر دی گئیں، وسط دسمبر میں احقر چند ضرورتوں سے دہلی سے باہر گیا ہوا تھا، ۲۰ ؍دسمبر کو سہارنپور میں مجاہد ملت کا تار پہنچا اور احقر خطرناک راستے طے کرتا ہوا خدا کے فضل سے دہلی پہنچ گیا، یہاں مجاہد ملت روزنامہ الجمعیۃ کے جاری کرنے کا عزم فرما چکے تھے اور احقر کو اسی لیے طلب فرمایا تھا کہ بلاتوقف الجمعیۃ روزنامہ جاری کر دیا جائے۔ چنانچہ ۲۳ ؍دسمبر ۴۷ء سے یہ روزنامہ پھر جاری ہوگیا، جو ۹ ؍سال پہلے برطانوی حکومت کے ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کی نوازشوں کا شکار ہو چکا تھا، فرق یہ ہوا کہ پہلے سہ روزہ تھا اور اس مرتبہ مجاہد ملت کے حوصلۂ عالی نے اس کو روزنامہ قرار دیا۔''
>
> [مجاہد ملت نمبر ؍ص: ۸۰]

(۱۰) آپ کے قلم نے جمعیۃ علماء ہند کے دستاویز کو محفوظ کر دیا، اور علماء حق کے کارناموں کو زندۂ جاوید کر دیا، جمعیۃ علماء ہند کے پاس آج جو بھی تاریخ ہے، وہ مولانا مرحوم کی رہینِ منت ہے، یقیناً آپ جمعیۃ علما کے قلم تھے اگر مجاہد ملت زبان تھے۔ **تلک عشرۃ کاملۃ.** یہ ''مشتے نمونہ از خروارے'' ہے۔

تصنیف وتالیف:

درس وافتاء کی مصروفیتوں اور سیاسی ہنگامہ آرائیوں کے ساتھ تصنیف وتالیف کا سلسلہ بھی آپ نے جاری رکھا، یہ آپ کا کمال ہے کہ طوفانی سیاسی زندگی کے باوجود متعدد اہم تصانیف یادگار چھوڑیں، آپ اپنی تصنیفات میں ایک مشّاق مصنف اور صاحب قلم، تحریر وانشاء پردازی میں ایک صاحب طرز ادیب، تحقیق ودرایت میں ایک نکتہ رس فقیہ اور صاحب بصیرت مؤرخ نظر آتے ہیں۔ آپ کا شمار دارالعلوم دیوبند کے کثیر التصانیف فضلا میں ہوتا

ہے، آپ کی تصانیف کی تعداد ۱۰۰ر کے قریب ہیں، جن میں چند حسب ذیل ہیں:

(۱) ''علماء ہند کا شاندار ماضی'' ۴ر جلدیں

یہ آپ کی شاہ کار تصنیف ہے، اس کتاب نے سامراجی طاقت کے کالے کرتوت اور ظلم وتشدد کی داستانوں کو واشگاف کر کے اس حکومت کو جھنجھوڑ ڈالا، جس کی فرماں روائی میں سورج غروب نہ ہوتا تھا، یہ کتاب مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ متوفی ۱۰۳۴ھ سے لے کر ۱۸۵۷ء کے مجاہدین حریت کے مجاہدانہ کارناموں پر مشتمل ہے۔ اولاً مدرسہ شاہی کے قیام کے دوران ۱۹۳۹ء میں تحریر فرمائی، جس کو جابر حکومت نے ضبط کرلیا اور مصنف کو گرفتار کر کے مقدمہ چلایا، دوبارہ آزادی کے بعد غالباً ۱۹۵۷ء میں ازسرنو اضافوں کے ساتھ ترتیب دیا۔

(۲) ''علماء حق اوران کے مجاہدانہ کارنامے'' ۲ر جلدیں

یہ کتاب ''علماء ہند کا شاندار ماضی'' کا تکملہ ہے، جس میں ۱۸۵۷ء کے بعد سے ۱۹۴۷ء تک مجاہدین حریت کے کارناموں کو بیان کیا گیا ہے، بالخصوص شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ اور شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے مجاہدانہ کردار کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

(۳) ''جمعیۃ علماء کیا ہے؟'' دو حصے مع ضمیمہ

اس کتاب میں جمعیۃ علماء ہند کی خدمات اور اس کی تجاویز کو مرتب کیا گیا ہے، تاریخ جمعیۃ میں یہ کتاب سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔

(۴) ''حیات شیخ الاسلام'' (۵) ''مجاہد جلیل''

ان دونوں کتابوں میں شیخ الاسلام مولانا مدنیؒ کے حالات قلم بند کیے گئے ہیں، اول الذکر میں تفصیلی اور ثانی الذکر میں اجمالی، آپ کی سوانح میں یہ کتابیں بنیادی اور ماخذ کی حیثیت رکھتی ہیں۔

(۶) ''اسیرانِ مالٹا''

اس کتاب میں اسیران مالٹا شیخ الہند، شیخ الاسلام، مولانا حکیم نصرت حسین، مولانا

وحید احمد مدنی اور مولانا عزیر گل کے حالات مرقوم ہیں۔

(۷)''تحریک شیخ الہند''

انڈیا آفس لندن کی سی آئی ڈی رپورٹ کی بنیاد پر ترتیب دی گئی ہے، جس کی رسم اجرا صدر جمہوریہ فخر الدین علی احمد مرحوم کے دست مبارک سے ۵/جولائی ۱۹۷۵ء کو عمل میں آئی، اس کتاب میں جنگ آزادی کی ایک اہم کڑی ریشمی رومال تحریک کا مفصل ذکر ہے، اس زمانہ میں مولانا مرحوم کی سیاسی وعلمی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے حکومت ہند نے آپ کو ''تانبر پتر'' عطا فرمایا اور وظیفہ، مکان کی سہولیات کی پیش کش کی، آپ نے ''تانبر پتر'' کا اعزاز یہ یہ کہہ کر قبول کرلیا کہ اس سے جہادِ آزادی میں مسلمانوں کی خدمات کا ریکارڈ قائم ہوگا، باقی سہولیات قبول نہیں کیں۔ یہی عمل حضرت شیخ الاسلام کا تھا۔

(۸) مختصر تذکرہ خدمات جمعیۃ علماء ہند، ۴/حصے

(۹) صالح جمہوریت اور تعمیر جمہوریت

(۱۰) جمہوریت اپنے آئینہ میں

(۱۱) ۱۸۵۷ء تا ۱۹۴۷ء مسلم علماء کا کردار

(۱۲) ترک وطن کا شرعی حکم

(۱۳) حیات مسلم

(۱۴) چاند، تارے اور آسمان

(۱۵) آنے والے انقلاب کی تصویر

(۱۶) خطرناک نعرے اور جمعیۃ علماء ہند کا صراط مستقیم

(۱۷) مسئلہ تعلیم اور طریقہ تعلیم

(۱۸) سیاسی، اقتصادی مسائل اور اسلامی تعلیمات وارشادات

(۱۹) ہندوستان شاہان مغلیہ کے عہد میں

(۲۰) پانی پت اور بزرگان پانی پت

(۲۱) دین کامل
(۲۲) اسلام اور انسان کی حفاظت وعزت
(۲۳) مشکوۃ الآثار عربی، جو دارالعلوم دیوبند جیسے مدارس میں داخل نصاب ہے
(۲۴) نورالاصباح ترجمہ وشرح نورالایضاح
(۲۵) عہد زریں ۲؍جلدیں
(۲۶) سیرت مبارکہ
(۲۷) شواہد تقدس، مودودی صاحب کی خلافت وملوکیت کا جواب ہے۔
(۲۸) تاریخ الاسلام ۳؍حصے
(۲۹) دینی تعلیم کے رسائل ۱۲؍حصے
(۳۰) روزہ، نماز
(۳۱) ہمارے پیغمبر...وغیرہ

مذکورۃ الصدر تصنیفات کے علاوہ ہندوستان کے مشہور جرائد: ''الجمعیۃ''، ''مدینہ''، ''برہان''، ''دارالعلوم'' وغیرہ میں آپ کے علمی وتحقیقی مقالات برابر شائع ہوتے رہے، جن کو اگر جمع کیا جائے تو کئی ضخیم جلدیں تیار ہوجائیں، اس وسعت تالیف وکثرت تصنیف کی وجہ سے شیخ الاسلامؒ آپ کو مزاحاً ''حیوان کاتب'' فرمایا کرتے تھے۔

مدرسہ شاہی کے دورانِ تدریس شاہی کمپنی قائم کرکے اس کی طرف سے مارچ ۱۹۳۸ء میں ''قائد'' نامی رسالہ جاری فرمایا، جس کے قائد التحریر خود آپ تھے، مدیر مسئول مولانا اختر الاسلام صاحب صاحبزادۂ حضرت مولانا فخر الدین احمد شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند اور منیجر حکیم انظار احمد مرحوم۔

ان درسی، تصنیفی وسیاسی مشاغل کے ساتھ دیگر اہم ملی مصروفیات بدستور جاری رہیں، ۱۳۷۰ھ سے تادم وفات از ہر ہند دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ اور عاملہ کے رکن رکین رہے۔ پابندی کے ساتھ ان مجالس کے اجلاسوں میں شرکت فرماتے، مسائل میں

پوری دلچسپی لیتے اوران مجالس کی تجاویز بالعموم موصوف ہی قلم بند کرتے، کاروائی کی رپورٹ ایسے چست انداز میں لکھتے کہ قیل وقال کی گنجائش نہ رہتی، مجلس ہمیشہ مولانا مرحوم کی رائے کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتی۔ دارالعلوم کے علاوہ بہت سے مدارس اورا داروں کے رکن، نگراں اور سر پرست رہے۔ مدرسہ حسین بخش دہلی کی نشأۃ ثانیہ آپ کی مرہونِ منت ہے۔

المختصر مولانا مرحوم نے جس ہمت واستقلال اور قربانیوں کے ساتھ قوم وملت کی خاموش خدمات انجام دی ہیں، ان کو اجاگر کرنے کے لیے، ان کے جیسے ہی کسی مورخ کی ضرورت ہے، آپ کے علمی، مذہبی اور تاریخی کارنامے ہمیشہ یاد کیے جاتے رہیں گے: ؎

فنا کے بعد زندہ ہے شانِ رہبری تیری
ہزاروں رحمتیں ہوں اے میرِ کارواں! تجھ پر

خصائل واوصاف

تبحر علمی اور شان جامعیت کے ساتھ، اخلاق ومروّت، فیاضی وایثار، تقوی وطہارت میں آپ اپنی مثال تھے، بہت سادہ طبیعت، خوش طبع، ملنسار، عالم باعمل اور منکسر المزاج تھے، اخلاص وجفاکشی شعار تھا، تواضع وانکساری، عاجزی وفروتنی آپ کا نمایاں وصف تھا، آپ کی طبیعت میں خود بینی کی خاموش دل فریبی کا گزر بھی نہ تھا۔

۱۹۴۹ء میں جب آپ الجمعیۃ کے نگراں تھے، اس وقت کارکنان سے فرمایا کہ میرے نام کے ساتھ ''سید ملت'' نہ لکھا جائے، صرف مولانا حسین احمد مدنی کے نام کے ساتھ ''شیخ الاسلام'' اور مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کے نام کے ساتھ ''مجاہد ملت'' لکھا جائے، اب تک الجمعیۃ کے آرڈر بک میں یہ آرڈر محفوظ ہے، نام ونمود سے اس قدر اجتناب تھا کہ آپ کی یہ خواہش رہی کہ عام لوگوں سے الگ دفن بھی نہ کیا جائے، بلکہ گورِ غریباں میں دفنایا جائے، اس خواہش کا احترام بھی کیا گیا۔ کسی نے سچ کہا ہے: ؎

فروتنی است دلیلِ رسیدگان کمال
کہ چوں سوار بہ منزل رسد پیادہ شود

مولانا مرحوم قطب دوراں، شیخ العرب والعجم، شیخ الاسلام والمسلمین حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی نور اللہ مرقدہٗ کے دست حق پرست پر بیعت تھے، اوراد ووظائف کے نہایت پابند تھے، باجماعت نماز مسجد میں ادا کرنے کا اہتمام فرماتے تھے، اپنے پیرومرشد کی طرح اتباع سنت آپ کا شیوہ تھا، یقیناً آپ اسلاف کی یادگار تھے، مولانا اخلاق حسین قاسمی سابق ناظم جمعیۃ علماء ہند کا بیان ہے:

''ہم خدام نے مولانا مرحوم کے اخلاص اور جفاکشی اور دن کو زبان وقلم کی سرگرمی اور رات کو عبادت گزاری کے وہ منظر دیکھے ہیں، جن کی داستانیں اسلاف کے تذکروں میں پڑھی تھیں، مولانا احمد سعید صاحب مولانا مرحوم کو جمعیۃ علماء کا ''ذوالنون مصری'' کہا کرتے تھے۔'' [شاہ ولی اللہ اوران کانسبی وفکری خاندان، ص:۵۰]

وصال:

۱۶؍شوال ۱۳۹۵ھ مطابق ۲۲؍اکتوبر ۱۹۷۵ء بروز چہارشنبہ شام ساڑھے چھ بجے آسمان علم وفضل کا یہ آفتاب عالمتاب ہمیشہ کے لیے غروب ہوگیا اور پوری علمی دنیا کو ماتم کناں چھوڑ کر یہ مرد باصفا دہلی کے گورغریباں میں ابدی نیند سوگیا:

بر تو باش رحمت باری مدام
پس سخن کوتاہ باید والسلام

(ماہنامہ ندائے شاہی نومبر [تاریخ شاہی نمبر]، دسمبر ۱۹۹۲ء، ص:۳۸۳ تا ۴۰۲)

حصہ سوم

منتخب تحریریں

اس میں مولانا سید محمد میاں کی کچھ تحریروں کا انتخاب پیش خدمت ہے

قرآنِ حکیم کے دو مکمل اور کامیاب نسخے

خوف و ہراس کو دُور کرنے کا نسخہ اور مخالفین کو مسخر کرنے تدبیر

حضرت مولانا محمد میاں صاحب سابق ناظم جمعیۃ علماء ہند

محترمہ مدیرہ صاحبہ رسالہ ''بانو'' دہلی کی فرمائش ہے کہ رسالہ ''بانو'' کے ''قرآن نمبر'' کے لیے مضمون پیش کروں، یہ فرمائش جس قدر جاذبِ توجہ ہے کم از کم میرے لیے اتنی ہی مشکل بھی ہے، سینکڑوں موضوع قرآنِ پاک سے متعلق ہیں اور ہر ایک موضوع کی وسعت داماں بے پایاں! ادھر وقت کی تنگی کسی وسعت کو بھی برداشت نہیں کرسکتی لیکن موجودہ دور میں یہ فرمائش نظرانداز نہیں کی جاسکتی اور بظاہر ہماری موجودہ مشکلات کا قرآنی علاج اس مضمون کا بہترین موضوع ہو سکتا ہے، چنانچہ اسی سلسلہ میں چند سطریں لکھنے کا مقصد ہے۔ (محمد میاں عفی عنہ)

آج ہمارا بہت بڑا مرض خوف و ہراس ہے جو گزشتہ واقعات یا مستقبل کے خطرات کی بنا پر تقریباً ہر ایک مسلمان کو گھیرے ہوئے ہے، مسلمان یہ سمجھتے ہیں کہ یہ خوف و ہراس صرف ان کے ساتھ مخصوص ہے اور ان کے سوا ہر قوم، ہر فرقہ اور ہر ایک طبقہ مطمئن اور خوف و ہراس سے محفوظ ہے لیکن اگر حالات کا گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے تو معاملہ برعکس معلوم ہوتا ہے۔

آج دنیا میں کوئی قوم اور کوئی فرقہ بھی بے خوف اور مطمئن نظر نہیں آتا۔ بے شک خوف اور خطرے کی نوعتیں مختلف ہیں مگر خوف و ہراس سے خالی کوئی بھی نہیں، بڑے بڑے زمینداروں یا راجاؤں اور نوجوانوں کا تو ذکر ہی کیا ہے، ان کی زمینداریاں اور ریاستیں تو ختم

ہو ہی رہی ہیں اور وہ تو خوف و ہراس کے عجیب عالم میں مبتلا ہیں، آپ کے قرب و جوار میں کوئی سیٹھ صاحب رہتے ہوں گے بڑے دولتمند، لکھ پتی کروڑ پتی، ملوں اور کارخانوں کے مالک، آپ ان کی شان وشوکت اور ٹیپ ٹاپ کو دیکھ کر یہی سمجھیں گے کہ ان کو کوئی خوف و ہراس نہیں، یہ پوری طرح مطمئن ہیں اور ۱۵/اگست ۱۹۴۷ء کے بعد تو گویا ان کی حکومت ہی ہوگئی ہے، اب خوف و ہراس کا کیا کام، جو پہلے کانگریسی تھے یا نہ تھے مگر اب تو کانگریس کے شیدائی ہیں اور کانگریس کی زبان میں ''دانی'' ہیں، پہلے راجہ، مہاراجہ، سر اور رائے بہادران کے یہاں ٹھہرا کرتے تھے، اب صوبہ کے وزیر اعظم اور مرکز کے ہوم منسٹر سردار پٹیل (جو ہندوستان کی سب سے بڑی طاقت ہیں) اور راجندر بابو صدر کانسٹی ٹیوٹ اسمبلی ان کے یہاں ٹھہرتے ہیں۔ ان کو کسی قسم کا کیا خطرہ ہوسکتا ہے، لیکن اگر فی الواقع یہ مطمئن ہیں تو اندرونی طور پر راشٹریہ سیوک سنگھ کی امداد کر کے کانگریس گورنمنٹ کو فیل کرنے کی کیوں کوشش کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ سیٹھ جی کو رات دن اپنی دولت کی فکر ہے کہ اگر کانگریس گورنمنٹ کو کچھ بھی اطمینان حاصل ہوا تو ریاستوں کی طرح ان کا بھی خاتمہ ہوجائے گا، ان کا مِل حکومت کی مِلک قرار دے دیا جائے گا اور ان کو گھر کی چہار دیواری میں بند کر دیا جائے گا۔ وہ ایک طرف کانگریسی بن کر کانگریس گورنمنٹ پر منتر پڑھ رہے ہیں اور دوسری طرف راشٹریہ سیوک سنگھ وغیرہ کی پرورش کر کے کانگریس حکومت کو ناکام کرنے کوشش کرر ہے ہیں۔ بہرحال ہندوستان کے یہ تینوں گروہ زمیندار، راجہ، نواب اور پونجی پتی (سرمایہ داروں) کی حالت تو یہ ہے۔ بے شک نوعیت تو دوسری ہے مگر خوف و ہراس ان کو ہم سے زیادہ لاحق ہے۔

اب ہندوستان کے باہر نظر ڈالیے! امریکہ جو دنیا کی سب سے زیادہ دولت مند سلطنت ہے روس سے خائف ہے اور روس امریکہ کے ایٹم بم سے لرز رہا ہے اور غریب برطانیہ کو ایک طرف امریکہ کی دولت وعظمت ہولا رہی ہے کہ اس کا بے پناہ قرض اور اس کا سود اس کو ہمیشہ کے لیے غلام بنا لے گا اور دوسری طرف روس کا ساز وسامان اور اس کا انقلابی

جوش وخروش اس کے لیے سرخ خطر بنا ہوا ہے۔

دنیا کی یہی سب سے بڑی طاقتیں ہیں جو ایک دوسرے سے ہراساں ہیں اور رات دن پریشانیوں اور خطرات کی اُلجھنوں میں پھنسی ہوئی ہیں اور خطرات کو زائل کرنے کے لیے طرح طرح کی تدبیریں کر رہی ہیں۔ یو، این، او کی نمائش، پاکستان کی اسلامی اقتصادی کانفرنس، انڈونیشیا کی آزادی، انہیں خطرات کو دُور کرنے کے لیے ہے، ایک نیا خطرہ اتحاد ایشیا کا پیدا ہو گیا ہے۔ لہٰذا کشمیر کی جنگ سے ہندوستان و پاکستان کو اُلجھایا جا رہا ہے۔

پاکستان میں اسلامی اقتصادی کانفرنس کر کے ایشیا کو مسلم وغیر مسلم پر تقسیم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے اور آزاد پٹھانستان کے مطالبہ کو مسترد کر کے مسلم طاقتوں کو بھی دست و گریباں کرنے کا پانسہ پھینکا جا رہا ہے۔

مگر لطف یہ ہے کہ خطرات کو دفع کرنے کی جو تدبیریں کی جا رہی ہیں وہ بجائے ختم کرنے کے خطرات میں اضافہ کر رہی ہیں۔ مثلاً جرمن اور جاپان کے خطرے کو ایٹم بم نے ختم کیا تھا لیکن یہ خطرناک ایجاد خطرے کو دُور کرنے کے بجائے خود مستقل خطرہ بن گئی ہے۔ اب یہ فکر ہے کہ یہ محشر نما خطرہ کس طرح دُور کیا جائے۔

یہ تو آخری چیز ہے، اس سے پہلے بھی ہمیشہ یہی ہوتا رہا ہے کہ خطرے کو دُور کرنے کے لیے جو مادّی صورت اختیار کی گئی وہ خود خطرہ بن گئی۔ لاٹھی کے خطرے کو دُور کرنے کے لیے خنجر اور تلوار ایجاد کیے گئے، جب وہ خطرہ بن گئے تو ان کے توڑ کے لیے منجنیق ایجاد ہوا جس نے رفتہ رفتہ بندوق اور توپ کی شکل اختیار کر لی جو پہلے ہی سے خطرہ تھیں، ان کی مدافعت کے لیے مشین گن ''دُور مار توپیں'' اور بم ایجاد ہوئے جو سراسر خطرہ تھے، اس خطرے کی مدافعت ہوائی جہازوں اور آب دوز کشتیوں سے کی گئی اور جب اس سامانِ مدافعت نے بھی لاکھوں انسانوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا تو مدافعت کا سب سے بڑا آلہ ''ایٹم بم'' ایجاد کیا گیا جس کے دو ہی حملوں نے جاپان کے خطرے کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا

مگر وہ ایجاد خود اتنا بڑا خطرہ بن گیا کہ اب دنیا کے تمام فلاسفر حیران ہیں کہ اس خطرے کی مدافعت کس طرح کریں؟ بہرحال خطرے کو دفع کرنے کی جو مادّی صورت اختیار کی گئی وہ خطرہ بن گئی۔

اب آیئے مادّی ذرائع سے ہٹ کے! قرآنِ حکیم مرکز روحانیت ہے، روحانی تعلیمات کا مخزن ہے یہ آپ کو نہایت خاموشی، پوری سنجیدگی اور پوری قوت کے ساتھ ایک مشورہ دے رہا ہے اور ہر قسم کے خوف و ہراس ختم کرنے کا ایک مکمل نسخہ پیش کر رہا ہے۔ اس کا اعلان ہے کہ:

﴿ اِنَّ الَّذِیۡنَ قَالُوۡا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسۡتَقَامُوۡا فَلَا خَوۡفٌ عَلَیۡہِمۡ وَلَا ھُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ ﴾ (سورۂ احقاف ع ۲)

''یہ ایک حقیقت ہے کہ جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے پھر ثابت قدم رہے تو نہ ڈر ہے اُن پر نہ وہ غمگین ہوں گے۔''

دوسرے موقع پر ارشاد ہے :

﴿ اِنَّ الَّذِیۡنَ قَالُوۡا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسۡتَقَامُوۡا تَتَنَزَّلُ عَلَیۡہِمُ الۡمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوۡا وَلَا تَحۡزَنُوۡا ﴾ (سورۂ حم السجدہ ع ۴)

''اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ جنہوں نے کہا رب ہمارا اللہ ہے پھر اسی پر قائم رہے (اور مضبوطی سے اس پر جم گئے) ان پر فرشتے نازل ہوتے ہیں (جو اطمینان دلاتے ہیں) کہ نہ ڈرو اور نہ غم کھاؤ۔''

یعنی ہر قسم کا خوف و ہراس، مستقبل کی تمام مایوسیاں اور تمام خطرات کو دُور کرنے کا نہایت پختہ اور نہایت مضبوط ذریعہ یہ ہے کہ اللہ رب العالمین کو رب مان لو پھر اس پر مضبوطی کے ساتھ جم جاؤ۔

اصل مایوسی اور حقیقی خرابی ہماری ایمانی کمزوری ہے جس کو اگر منافقت بھی کہہ دیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ ہم زبان سے بار بار کہتے ہیں کہ اللہ ہمارا رب ہے، پنج وقتہ نمازوں کی ہر

رکعت میں ہم اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ کو رب العالمین کہہ کر اس کی حمد کرتے ہیں لیکن اگر اللہ کو رب یعنی پروردگار، محافظ اور مربی مانتے ہیں تو پھر ہمیں اکثریت کا خطرہ کیوں ہے؟ ہم اپنی اقلیت کے باعث مایوس کیوں ہیں؟ ہم کیوں ہراساں ہیں کہ اکثریت ہماری روزی بند کردے گی؟ ہم کیوں لرز رہے ہیں کہ ہماری زندگیوں کے رشتے اکثریت کے ہاتھوں منقطع ہوجائیں گے؟ ہماری ہستی فنا ہوجائے گی، ہم کیوں اپنے حقوق کے لیے کاسۂ گدائی لے کر اکثریت کے دروازے پر جاتے ہیں؟ ہم کیوں اپنی روزی کی کنجیاں دوسرں کے ہاتھوں میں سمجھتے ہیں اور اپنی ترقی و برتری کے لیے کیوں للچائی ہوئی نظروں سے اکثریت کو دیکھتے ہیں؟

ہمارا پہلا کام یہ ہے کہ ہم رب کے معنی پر نظر کریں، اس کی عمومیت اور ہمہ گیری کو ذہن میں جمائیں۔ اللہ ہمارا رب ہے یعنی ہمارا خالق بھی ہے، ہمارا روزی رساں بھی ہے، ہمارا پرورش کرنے والا بھی ہے، ہمارا مربی بھی ہے اور ہمارا محافظ بھی ہے۔

دوسرا کام یہ ہے کہ اس تصور کو عقیدہ بنائیں اور پھر عقیدہ کو اتنا راسخ کریں کہ ہمارے دماغ پر اسی کا تسلط ہو، ہمارا فکر اسی عقیدہ کا تابع ہو اور ہمارے تمام ذہنی خیالات (آئیڈیا) اور تمام تفکرات، تمام عملی طاقتیں اور ہمارے تمام پروگرام اور تمام لائحہ عمل اسی کے مطابق اور اسی کے ماتحت ہوں۔ جو شخص اس عقیدے کے ساتھ زندگی بسر کررہا ہے اس کی کامیابی یقینی ہے۔ اگر بالفرض دنیا میں اس کو خاطر خواہ راحت و آرام میسر نہیں ہوا تو دنیا کی ہر ایک زحمت آخرت کی رحمت، یہاں کی ہر تکلیف جنت الفردوس کی راحت ہوگی۔

جب مومن کا منتہائے نظر اور نصب العین آخرت ہے تو دنیا کی تکالیف اور پریشانیوں سے مایوس اور ہراساں ہونا قطعاً بے معنی ہے۔

منزل کی ناموافقت یا محمل کی ناسازگاری سے مسافر کبھی بھی مایوس نہیں ہوسکتا، اس کی نظر آخری منزل پر رہتی ہے جہاں اُس کو پہنچنا ہے اور قیام کرنا ہے۔ ﴿اِنَّ الْاٰخِـرَةَ هِیَ دَارُ الْقَرَارُ﴾ (آخرت ہی ٹھہرنے کی جگہ ہے)

﴿اِنَّ الدّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِیَ الْحَيَوَان﴾ (العنکبوت:۶۴) ”آخرت ہی حقیقی زندگی ہے“

چنانچہ سورہ (حم سجدہ) کی موخر الذکر آیت کا دوسرا ٹکڑا ہے

﴿ وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ فِي الْاٰخِرَةِ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْٓ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ نُزُلًا مِّنْ غَفُوْرٌ الرَّحِيْمِ ﴾ (پارہ:۲۴حم سجدہ)

''فرشتے ان لوگوں کو اطمینان دلاتے ہوئے یہ بھی کہتے ہیں کہ خوشخبری سنو اُس جنت کی جس کا تم سے وعدہ تھا، ہم ہیں تمہارے رفیق دنیا میں اور آخرت میں اور تمہارے لیے وہاں ہر وہ چیز موجود ہوگی جس کی تمہیں خواہش ہو اور ہر وہ شے مہیا ہوگی جو تم مانگو۔ یہ بخشنے والے مہربان رب العالمین کی طرف سے بطور مہمانی ہوگا۔''

بہر حال ایک مختصر سا نسخہ ہے جو نہ صرف دلی اختلاج، اضطراب اور خوف و ہراس کی پریشانیوں کے لیے تریاق ہے بلکہ:

(۱) جس طرح غزوۂ بدر کے مقدس مجاہدین کے اطمینان قلب اور ہمت افزائی کے لیے فرشتوں کا نزول ہوا تھا، جو اگرچہ آنکھوں سے ہر ایک کو نظر نہیں آئے مگر اُن کے نزول مبارک کے اثر سے حوصلے بلند ہو گئے، ہمتیں بڑھ گئیں، حتی کہ اپنی اقلیت اکثریت محسوس کرنے لگے اور مخالفین کی اکثریت حقیر سے حقیر اقلیت نظر آنے لگی، اسی طرح ﴿ رَبُّنَا اللّٰهُ ﴾ کے عقیدے پر مضبوطی سے جمنے والوں کو زیادہ سے زیادہ ہیبت ناک موقع پر بھی قلبی اطمینان اور دلی سکون حاصل ہوگا، کوئی خوف و ہراس ان کے پاس بھی نہیں پھٹکے گا۔

(۲) تنہائی میں بھی اُس کو وہ سرور حاصل رہے گا جو اقارب اور احباب کے مجمع میں حاصل ہوتا ہے حتی کہ اگر موت بھی آتی ہے تو جشن بن کر آتی ہے اور ''مرگ انبوہ جشنے دارد'' کا سماں آنکھوں کے سامنے لے آتی ہے، کیونکہ عالمِ لاہوت کے مقدس دوست ''اولیاء'' اس کے ہم نفس اور ہمدم ہوتے ہیں جو نہ صرف مرنے تک ساتھ رہیں گے بلکہ آنکھیں بند ہونے کے بعد بھی نہ صرف یہ کہ اُن کی رفاقت باقی رہے گی بلکہ اُن کی اُنسیت

اور محبت اور تازگی پیدا ہو جائے گی اور ان کا یہ اعلان کہ:

﴿ نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ فِى الْاٰخِرَةِ ﴾

(سورہ حمٓ سجدہ)

''ہم تمہارے دوست ہیں دنیاوی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی''

بے حجاب و بے نقاب ہو کر روشن اور حقیقت بن جائے گا۔

(۳) اس زندگی کے مدو جزر اور نشیب و فراز میں جو ناکامیاں پیش آئی تھیں اب وہ کامیابیاں بن جائیں گی، تلخیاں شیرینی سے بدل جائیں گی اور نامرادی کی جگہ مقصد براری اور بامرادی ان کے قدم چومے گی، کیونکہ یہ طے ہے کہ :

﴿ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِىٓ اَنفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ ﴾

(سُورہ حم سجدہ : ۳۱)

''تمہارے لیے وہ تمام چیزیں مہیا کیں جن کی تم خواہش کرو اور جن کی تمہیں تمنا ہو۔''

(۴) اور یہ جو کچھ تمنا براری اور کامیابی ہوگی وہ ﴿نُزُلًا مِّنْ غَفُوْرٍ رَّحِيْمٍ ﴾ ہوگی یعنی رب غفور اور رب الرحیم کی طرف سے انتہائی مدارت اور معمولی درجہ کی خاطر تواضع ہوگی، کیونکہ حقیقی مدارات تو کچھ ایسی ہے کہ انسان اس تیرہ و تاریک اور لپت و ذلیل عالم میں جس کا نام ''دنیا'' ہے تصور میں بھی نہیں لا سکتا، کیونکہ اس کی حقیقت تو یہ ہے:

لاعين رأت ولا اذن سمعت ولا خطر على قلب بشر (اوکما قال ﷺ)

''نہ کسی آنکھ نے دیکھا، نہ کسی کان نے سنا، نہ کسی انسان کے دل میں اس کا تصور آیا''

دوسرا نسخہ:

خوف و ہراس کے دُور ہونے کے بعد کامیابی کا دوسرا قدم یہ ہے کہ دشمن مغلوب ہو اور مخالف طاقتیں مسخر ہوں۔ ہمارے دماغ اس درجہ آلودہ ہو گئے اور مادّہ پرستی کے اصنام نے ان کو اس درجہ ماؤف کر دیا ہے کہ جب بھی دشمن کو مغلوب کرنے اور مخالف کو مسخر کرنے کا

سوال آتا ہے تو دفعتاً بحری ابتری اور ہوائی فوجیں ہلاکت بار اسلحہ اور تباہی خیز آتشیں میگزین نظروں کے سامنے آجاتے ہیں جو آباد شہروں کو برباد کررہے ہوں، پُر رونق بازاروں کو ویران، خوبصورت مناظر کو وحشت ناک کھنڈر بنا رہے ہوں، فلک بوس قلعوں کو مسمار کررہے ہوں اور عالی شان عمارتوں اور محلات کو پیوند خاک بنا رہے ہوں اور خدا کی مخلوق کو سہمے ہوئے دلوں اور لرزتے ہوئے انسانوں کو سجدہ کرنے پر مجبور کررہے ہوں۔ یہ جبر وقہر مرعوب اور خوف زدہ کر کے فرمانبردار بنا سکتا ہے مگر دشمن کو دوست نہیں بنا سکتا، ٹھوکریں کھاتے ہوئے انسانوں کو زمین بوسی پر مجبور کرسکتا ہے مگر ان کے دلوں کو رام نہیں کرسکتا، ہاتھ پیروں کو بیشک اپنے حکم پر چلا سکتا ہے مگر دلوں کی دنیا کو زیرنگیں نہیں کرسکتا۔

قرآنِ حکیم مخالف کو موافق اور دشمن کو دوست بنانے کا ایک کامیاب نسخہ پیش کرتا ہے جس کے لیے نہ سونے چاندی کی ضرورت ہے نہ سرمایہ داروں کے خزانوں کی نہ اسلحہ اور آلات کی اور نہ فوج ولشکر کی، جو صرف انسانوں کو نہیں جھکاتا بلکہ دلوں کو رام کرلیتا ہے، جو جغرافیائی نقشہ پر حکومت قائم نہیں کرتا بلکہ دلوں کی ناقابلِ تسخیر سلطنت کو مسخر کرلیتا ہے۔ نسخہ بہت مختصر ہے :

﴿ اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ ﴾ (حٰمٓ سجدہ: ۳۴)

''برائی کا جواب ایسی بھلائی سے دو جو سب سے اچھی ہو۔''

اس نسخہ کا فوری اثر یہ ہوگا :

﴿ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَکَ وَبَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ کَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ ﴾

(سُورہ حٰمٓ سجدہ: ۳۴)

''تم دفعۃً دیکھو گے کہ وہ شخص جس کو تم سے عداوت تھی گویا سرگرم مخلص دوست بن جائے گا۔''

قرآنِ حکیم یہ نسخہ خصوصیت سے ان حضرات کے سامنے پیش کررہا ہے جو دعوتِ الی اللہ اور اشاعتِ اسلام کی خدمات انجام دینا چاہتے ہیں۔ اس نسخہ ہدایت وارشاد کی تمہید

میں ارشاد ہوا ہے۔اس سے زیادہ اچھی بات کیا ہوسکتی ہے کہ کوئی شخص اللہ رب العالمین کی طرف لوگوں کو بلائے اور خود نیک کام کرے اور یہ اعلان کرے کہ میں مسلمان ہوں، بے شک یہ تمام باتیں اچھی ہیں یہ بھی درست ہے کہ بھلائی اور برائی برابر نہیں ہوسکتی۔

اصولاً درست ہے کہ برائی کا بدلہ برائی سے اور بھلائی کا بدلہ بھلائی سے دو۔ برائی کے بدلہ میں بھلائی، مساوی بدلہ نہیں ہے یہ ایسا ہے کہ پلیدی کے بدلہ عطر پیش کردیا جائے۔

لیکن جو''دعوت الی اللہ'' کی خدمت انجام دینا چاہیں اور جن کا نصب العین یہ ہو کہ اسلام محفوظ رہے اور اس کو ترقی اور برتری حاصل ہو، ان کے لیے یہی لازم ہے کہ بدلے میں مساوات کا خیال چھوڑ دیں۔یعنی برائی کے بدلہ میں نہ صرف یہ کہ بھلائی اختیار کریں بلکہ ایسی بھلائی منتخب کریں جو سب سے اچھی ہو اور سب سے بہتر ہو۔

نسخہ کی تشریح وتفصیل اور اس کے لازمی نتیجہ کی وضاحت کے بعد اس سے بھی آگاہ کیا جارہا ہے کہ (ومَایُلَقّٰھَا) الخ الی ذُوْحَظٍ عَظِیْمٍ.

یہ نسخہ بظاہر سہل معلوم ہوتا ہے ہر ایک دل اس کو ماننے کے لیے تیار ہوسکتا ہے، لیکن عملاً دشوار ہے، اس لیے بہت زیادہ استقلال واستقامت کی ضرورت ہے۔معمولی شخص کا تو ذکر ہی کیا ہے، بڑی بڑی بااخلاق شخصیتوں کے قدم بھی ڈگمگا جاتے ہیں۔یہ صرف انہیں کا حصہ ہے جو بڑی قسمت والے اقبال مند خوش نصیب ہیں۔

نسخہ کی تشریح کی بعد ایک پرہیز یا بعنوان دیگر ایک''عارض'' کی طرف بھی اشارہ کیا جارہا ہے جو بسا اوقات پیش آجاتا ہے اور نسخہ کے تمام اثر کو فوراً ختم کردیتا ہے۔اس عارض اور اس سے پرہیز کے متعلق ارشاد ہے :

﴿وَاِمَّا یَنْزَغَنَّکَ مِنَ الشَّیْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمِ﴾

یعنی یہ ہوسکتا ہے کہ کسی وقت صبر وضبط کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جائے اور غصہ کی حرارت طبیعت میں پیدا ہو، تو یہ شیطانی وسوسہ ہوگا جس سے پناہ مانگنی چاہیے۔

بہرحال یہ ہیں دو نسخے جن پر اگر ہم عمل کریں تو نہ صرف دنیا کا سکون واطمینان حاصل ہو، بلکہ آخرت کی بے حد وحساب نعمتیں میسر آئیں اور جماعتی طور پر ہمارا وہ رسوخ اور وہ سکہ دوسروں پر قائم ہو جائے کہ غیظ وغضب اور نفرت کے بجائے ان کے دلوں سے محبت اور پریم کے چشمے پھوٹنے لگیں۔

یہی وہ لائحہ عمل تھا جس سے ہمارے بزرگوں نے برتری اور سر بلندی حاصل کی، اسلام کے پرچم کو سر بلند کیا اور اسی نسخہ کیمیا سے آج ہم دنیا میں سر بلند کیا اور آخرت میں سرخرو ہو سکتے ہیں۔ مقدس الفاظ کو بار بار پڑھیے، ان کے ترجمے کو ذہن نشین کیجئے اور ان پر عمل پیرا ہو جائیے۔ درحقیقت موجودہ حالات میں یہ آیتیں مسلمانوں کے روشن مستقبل اور ان کے عروج وترقی کے لیے مکمل ترین پروگرام ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آج کل کے حالات کے پیش نظر یہی یہ آیتیں نازل کی گئی تھیں۔ خداوند عالم ہم سب کو ان پر عمل کی توفیق بخشے۔

﴿ اِنَّ الَّذِیۡنَ قَالُوۡا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسۡتَقَامُوۡا تَتَنَزَّلُ عَلَیۡہِمُ الۡمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوۡا وَلَا تَحۡزَنُوۡا وَاَبۡشِرُوۡا بِالۡجَنَّۃِ الَّتِیۡ کُنۡتُمۡ تُوۡعَدُوۡنَ ○ نَحۡنُ اَوۡلِیٰٓؤُکُمۡ فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا وَفِی الۡاٰخِرَۃِ وَلَکُمۡ فِیۡہَا مَا تَشۡتَہِیۡۤ اَنۡفُسُکُمۡ وَلَکُمۡ فِیۡہَا مَا تَدَّعُوۡنَ ﴾ (پارہ : ۲۴ حم سجدہ)

یہ ایک حقیقت ہے کہ جنہوں نے یہ کہا کہ ''اللہ'' ہمارا رب ہے پھر اس پر مضبوطی جم گئے۔ ان پر فرشتوں کا نزول ہوتا ہے (جو اطمینان دلاتے ہیں) کہ نہ خوف اور نہ غم کھاؤ۔ اور خوشخبری سناؤ اس جنت کی جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔

ہم تمہارے رفیق ہیں دنیاوی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی (اور اگر آج تم کو کچھ پریشانیاں اور دنیاوی تکالیف درپیش ہیں تو تمہیں اطمینان رکھنا چاہیے کہ) آخرت میں تمہارے لیے وہ تمام

چیزیں مہیا ہوں گی جن کو تمہارا دل چاہے گا اور جن کی تم تمنا کرو گے۔
نُزُلًا مِّنْ غَفُوْرٌ الرَّحِیْمٍ وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًامِّمَّنْ دَعَا اِلَی اللّٰہِ وَعَمِلَ صَالِحًاوَّقَالَ اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ وَلَاتَسْتَوِی الْحَسَنَۃُ وَالسَّیِّئَۃُ اِدْفَعْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ فَاِذَالَّذِیْ بَیْنَکَ وَبَیْنَہٗ عَدَاوَۃٌ کَاَنَّہٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ وَّمَایُلَقّٰھَااِلَی الَّذِیْنَ صَبَرُوْا وَمَایُلَقّٰھَااِلَّاذُوْحَظٍّ عَظِیْمٍ وَاِماَّ یَنْزَغَنَّکَ مِنَ الشَّیْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰہِ اِنَّہٗ ھُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمِ﴾

(اخروی زندگی میں رب غفور تمہارا میزبان ہوگا اور) یہ غفور رحیم کی جانب سے مہمانی کے طور پر ہوگا۔ (یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے) کہ اس شخص سے بہتر بات کس کی ہوسکتی ہے جو اللہ کی طرف دعوت دے اور نیک کام کرے اور کہے کہ بلاشک وشبہ میں مسلم (حکم بردار) ہوں۔ (یہ بھی ظاہر ہے کہ) بھلائی اور برائی برابر نہیں۔ (لیکن اگر تم دعوت الی اللہ کے منصب کو ادا کررہے ہو تو تمہاری اخلاقی شان یہ ہوگی کہ) برائی کا جواب ایسی بھلائی سے دو جو بہت ہی بہتر ہو۔ (اس کا اثر یہ ہوگا) کہ وہ شخص تمہارے اور اس کے درمیان عداوت ہے وہ گویا گرم جوش دوست ہوجائے گا (لیکن اخلاق کا یہ بلند مرتبہ ہر ایک کو نصیب نہیں ہوتا یہ) انہیں کو نصیب ہوتا ہے جو تحمل اور برداشت رکھتے ہیں اور یہ انہیں کو میسر ہوتا ہے جو بڑی قسمت والے اور خوش نصیب ہوتے ہیں۔ اور اگر (کسی وقت) شیطان کا وسوسہ تمہیں گدگدائے (اور تمہیں غصہ آجائے تو فوراً) خدا کی پناہ مانگو اور شیطانی وسوسہ پر استغفار کرو) بے شک اللہ تعالیٰ تمام باتیں سنتا ہے اور جانتا ہے۔

(ماہنامہ بانو دہلی: فروری، مارچ ۱۹۵۰ء ص: ۹)

☆☆☆☆☆

پیاسی دنیا کو رُوحانیت کا پانی پلاؤ

حضرت مولانا سیّد محمد میاں صاحبؒ

''علماءِ ہند کا شاندار ماضی'' و دیگر مقبولِ عام کتب کے مصنف حضرت مولانا سیّد حامد میاں صاحب امیر جامعہ مدنیہ لاہور کے والد بزرگوار حضرت مولانا سیّد محمد میاں صاحب دیوبندی مدظلہٗ مفتی و شیخ الحدیث مدرسہ امینیہ دہلی بھارت سے چندروز کے لیے لاہور تشریف لائے ہوئے تھے تو حضرت مولانا عبیداللہ انور صاحب مدظلہٗ امیر انجمن خدام الدین کی دعوت پر آپ ۱۹رنومبر ۱۹۶۷ء مطابق ۱۶رشعبان المعظم ۱۳۸۷ء بروز اتوار بعد نمازِ عشاء خلفاء شیخ التفسیر رحمۃ اللہ علیہ کی خصوصی کانفرنس میں تشریف لائے، کھانے سے قبل آپ نے خلفائے کرام سے جو خطاب فرمایا اُس کو احقر نے قلمبند کرلیا اور مضمون ہٰذا شکل میں پیشِ خدمت ہے۔'' (محمد عثمان غنی غفرلہٗ)

نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ اَمَّابَعْدُ!

میرے بزرگو! حکم ہوا ہے کہ کچھ عرض کروں، ایک ارشاد کی تعمیل ہے ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ آپ حضرات ایک منزل پر چل رہے ہیں اور الحمد للہ ایک مرحلہ طے کر چکے ہیں، خلافت معمولی چیز نہیں ہے، یہ شرف آپ حضرات کو حاصل ہے جس کا معنی یہ ہے کہ شیخ نے اشارہ کردیا کہ آپ سیدھے راستہ پر چل رہے ہیں، آپ کا رُخ صحیح ہے، آپ دوسروں کو بھی اس راہ پر چلا سکتے ہیں۔ سند آپ کے پاس ہے، آپ سب صاحبان میرے لیے واجب الاحترام ہیں، میری حقیقت اس سے زیادہ نہیں ہے کہ دھوبی کا کتا نہ گھر کا نہ گھاٹ کا، نہ میں

سیاسی ہوں، نہ میں مولوی ہوں، نہ مفتی، میں کچھ بھی نہیں ہوں تو آپ سے ایسی صورت میں کیا کہوں؟ کس منہ سے عرض کروں ؟

ہندوستان میں ایک صاحب فرمانے لگے کہ جب تم پاکستان پہنچو گے تو نامہ نگار آئیں گے اور بڑے سوالات کریں گے، میں نے کہا کوئی نہیں آئے گا، نہ ہی میں جواب دوں گا، کیونکہ میرے ساتھ کوئی ٹائٹل نہیں ہے۔ اسی طرح آپ حضرات سمجھ لیں جس کے پاس کوئی ٹائٹل ہی نہیں وہ کیا کہہ سکتا ہے؟ ہاں ایک چیز ہے جو عرض کی جاسکتی ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما کا ارشاد ہے کہ:

''جو موجود ہے اُس کے فتنوں میں ابتلاء کا امکان ہے اور جو دنیا سے رخصت ہو گئے وہ لائقِ اتباع ہیں۔''

خدا جانے کس کا کیا حشر ہو، انجام بخیر ہونا چاہیے، لہٰذا ان حضرات کے راستے پر چلو جو اِیمان سلامت لے گئے، اُن اہلِ حق کا اتباع گویا ضمانت ہے اور اس سے اطمینان ہو سکتا ہے کہ میں صحیح راستے پر ہوں۔ حدیث میں ہے (اور غالبًا عمر فاروق رضی اللہ عنہ راوی ہیں) کہ ایک جنازہ گزرا اور لوگوں نے اس کی تعریف کی، حضور ﷺ نے فرمایا وَجَبَتْ پھر ایک اور جنازہ گزرا تو لوگوں نے اس کی برائی کی، حضور ﷺ نے فرمایا وَجَبَتْ پوچھنے پر فرمایا پہلے پر جنت واجب ہوئی اور دوسرے پر جہنم۔ فرمایا جو شخص مر جائے اور تین مسلمان اُس کے متعلق شہادت دیں اُس پر جنت واجب ہو جاتی ہے۔ عرض کیا اگر دو مسلمان شہادت دیں تو؟ فرمایا دو دیں تب بھی۔ حضور ﷺ نے یہاں تک فرمایا کہ اگر ایک مسلمان بھی جذبۂ قلبی کے ساتھ کسی کے متعلق شہادت دے دے تو اُس پر جنت واجب ہو جاتی ہے۔ زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھو۔ جن بزرگانِ دین کو ہم اپنے اکابر میں سے سمجھتے ہیں اہل اللہ تھے اور صاحبِ عظمت تھے، ہم شہادت دیں گے اور یہ شہادت صحیح ہے جن کے بارے میں ہمارے قلوب اجازت دیتے ہیں کہ یہ صحیح ہیں تو اُن کے اتباع کو لازم کر لینا چاہیے۔ اکابر نے ایک راستہ قائم کر دیا اصاغر اور اخلاف کا فرض ہے کہ اس کی منتہا تک پہنچنے کی کوشش کریں۔ حضرت

مولانا احمد علی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک چیز قائم کی اور امتیازی چیز قائم کی کہ یوں تو مدارس بہت ہیں، بڑے دار العلوم ہیں جنہیں یونیورسٹیاں کہہ لیں مگر وہ سب اس چیز کے محتاج تھے جو حضرت مولاناؒ کے پاس تھی، اس لیے وہاں سے سیرابی کرنے کے بعد بھی تشنگی محسوس کرتے تھے، یہاں آ کر سیرابی ملتی تھی، وہ کیا تھا؟ قرآنِ پاک سے تعلق تھا، وہ اس کے رموز کو پہچانتے تھے اور سکھلاتے تھے۔ یہ بہت لمبا کام ہے، صحابہ کرامؓ نے عمریں صرف کر دیں، ایک سورت ختم نہ ہوئی، جملہ رموز کو پہچان لیا جائے تو بڑی بات ہے۔ حضرت مولاناؒ کی یہ خصوصیت تھی کہ آپ قرآنِ پاک کی وہ چیزیں پیش کر دیا کرتے تھے کہ جن سے طالب علم کے اندر سوال کا مادّہ پیدا ہوتا تھا۔ سوال پیدا کرنا، سوال کا صحیح قائم کرنا بھی ایک علم ہے تو پھر صحیح جواب ملتا ہے اور تشفی ہوتی ہے۔

حضرت مولاناؒ کی خدمت میں حاضر ہونے سے یہ فائدہ ہوتا تھا کہ کتاب اللہ کے اندر سوال قائم کرنے کی صلاحیت پیدا ہوتی تھی، پھر صحیح جواب ملتا تھا اور اس سے تشفی ہوتی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ تعلق بالقرآن بڑی اہم چیز ہے اور ہم پر یہ فریضہ ہے کہ ہم قرآن کے ساتھ تعلق پیدا کریں، لوگوں کو دعوت اِلی القرآن دیں اور اُن کو اِس کی تعلیمات کی طرف متوجہ کریں۔

حضور رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجے گئے، کیا مطلب؟ تمام عالموں کے واسطے رحمت، کوئی عالم مخصوص نہیں تھا، ہر ایک عالم کے لیے آپ رحمت تھے، آپ کی دعوت رحمت ہے جو ہر خاص و عام تک پہنچنی چاہیے۔ حضور ﷺ نے وہ دعوت پہنچائی اپنے زمانے میں اور پھر یہ فریضہ حوالے کر دیا گیا اُمت کے، اس کا کام ہے پہنچانا بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ آیہ اور قرآنِ پاک میں فرمایا ﴿اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ﴾ یعنی پوچھا جائے گا کہ تجھے بات پہنچی کہ نہیں پہنچی؟ کہیے کہ جی ہاں پہنچی۔ فرضِ منصبی کا بھی احساس کرنا لازم ہے۔ حضرتؒ کا کام جو ہے اُس کا پھیلاؤ بہت ہے اور یہ چیز ایک کونے میں بند کوٹھری میں شروع ہوئی تھی، مولانا احمد علی صاحبؒ نے بند کوٹھری سے لے کر کم از کم ہندوستان کی حدود تک تو

پہنچادیا۔

ایک حدیث میں آتا ہے کہ قیامت کے دن جب جزائے اعمال کا وقت ہوگا تو اللہ تعالیٰ اپنے بندے سے فرمائیں گے کہ میں بیمار ہوا تو نے مجھے کھانا دیا؟ بندہ عرض کرے گا یا اللہ آپ کب میرے پاس آئے تھے؟ فرمائیں گے فلاں بھوکا تھا اگر تم اُس کو کھلاتے تو میری رضا حاصل کر لیتے۔

مجھے خیال ہوا کہ اِس حدیث کے مصداق وہ اہلِ علم اور اور وہ عوام بھی ہیں جو فی الواقع راہِ حق کے متلاشی ہیں مگر اُن کو صحیح رہنما نہیں ملتے۔

ریشمی خطوط اور لندن :

میرے ایک عزیز مولانا منصور انصاری محمد میاں منصور انصاری کے پوتے ہیں انگریزی پڑھی ہے، ایم اے کیا، پروفیسر ہیں، ولایت گئے تو وہاں سے تحریر کیا کہ ریشمی خطوط کی تحریریں لندن کی متفرق جگہوں پر محفوظ ہیں، میں چاہتا ہوں کہ اِن کو مرتب کردوں۔

قرآن کی کرید، یہود و نصاریٰ :

دوسرے انہوں نے لکھا کہ یہاں اسکالر ہیں جو یہودی بھی ہیں اور نصاریٰ بھی، وہ لوگ قرآنِ پاک اور احادیث کے سمجھنے میں لگے ہوئے ہیں مگر اُن کا منشا کوئی اچھا نہیں ہے۔ منشا یہ ہے کہ کھود کرید کر کے معائب نکالیں لیکن آج ہم سینکڑوں کو دیکھ رہے ہیں کہ ریسرچ کر رہے ہیں مگر ہمیں افسوس یہ ہے کہ ہم میں کوئی ہی شاید ہوگا جو یہودیت اور عیسائیت کی ریسرچ کر رہا ہو۔

وجہ؟ :

آپ جانتے ہیں یہ ریسرچ لوگ کیوں کر رہے ہیں؟ اس لیے کہ دنیا کو اقتصادیات اور معاشیات کے اندر اطمینان میسر نہیں ہے، اطمینان صرف اسلام کے نظامِ حیات میں ہے، جس کے سمجھانے کے لیے قرآنِ کریم کا بہتر انداز میں کہ مخاطب سمجھ سکیں پیش کرنا ضروری ہے۔

مولانا انور شاہ صاحبؒ فرماتے تھے محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعے جو دولت میسر آئی ہے وہ اطمینان ہے۔ فیثا غورث، افلاطون وغیرہ فلسفیوں نے دماغی کاوشوں کی انتہا کر دی مگر اس میں اطمینان نہیں ہے! کسی فلسفی سے پوچھا جائے کہ جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں اُس پر آپ کو یقین ہے؟ آخر کار یہی کہے گا کہ یقین نہیں ہے۔ دولتِ یقین اللہ ہی کی بتلائی ہوئی باتوں میں ہے!

حضور اکرم ﷺ کی تشریف آوری کے وقت نظریات کا ٹکراؤ تھا، بدھ اِزم بھی تھا، ہندو اِزم بھی تھا، عیسائیت تھی، زرتشت اِ تھا، یہودیت کے اندر بہت سے مسالک پیدا ہو گئے تھے۔ نظریات کا ایک ہیجان بپا تھا، اطمینان کسی کو نصیب نہ تھا، ایک طالبِ حق بچارا تھک ہار کر بیٹھ جاتا تھا، اطمینان حاصل نہ ہوتا تھا، سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کا واقعہ تو آپ حضرات کو خوب معلوم ہے، پہنچے یہودیوں اور عیسائیوں کے ہاں مگر اطمینان ملا تو آمنہ کے لال کے ہاں سے ملا (ﷺ)۔ حق ہے کہ اطمینان تعلق مع اللہ سے ہوتا ہے۔ ارشادِ ربانی ہے: ﴿ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُھُمْ بِذِکْرِ اللّٰہِ اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ﴾ سورۃ الرعد: ۲۸

عرض یہ کر رہا تھا کہ آج دنیا اضطراری طور پر اضطراب میں ہے، دنیا پیاسی ہے اور پانی ہمارے پاس ہے یا تو ہم پانی دبائے بیٹھے ہیں یا بے محل بہا رہے ہیں۔ اور حضرت مولانا احمد علیؒ کی زندگی کا حاصل یہ ہے کہ اس پانی کو پیچھے مت ڈالو خود بھی پیو، دوسروں کو بھی پلاؤ اور پھر جب پلانے لگو تو یہ دیکھو کہ اِس کے پیاسے صرف اس احاطے میں نہیں ہیں، یہاں لاہور میں ہی نہیں ہیں، پیاسے لندن میں بھی ہیں، جاپان میں بھی ہیں، افریقہ میں بھی ہیں۔ اُن پیاسوں کو پانی پہنچانا ہمارا فرض ہے۔

مجھے مسرت ہوئی اور یہ میری سعادت ہے کہ ہمارے مولانا عبید اللہ انور صاحب نے شفقت فرمائی اور مجھے موقع عطا فرمایا کہ میں اتنے بزرگوں سے بات کر سکوں مگر جو کچھ کہا وہ یہی ہے کہ اکابر نے جو کام کیا اُس کو بڑھانا ہمارا کام ہے۔ یہ فرما رہے ہیں کہ خدام الدین

کی اشاعت ہوئی ہے اور اس کے تراجم غیر ملکی زبانوں میں مخلص لوگ کرتے ہیں اور دوسرے ملکوں میں پہنچتے ہیں مگر کوئی باضابطہ نظام نہیں ہے اور قادیانیوں کے ہاں صورت یہ ہے کہ مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ حیات تھے اُنہوں نے ایک منصوبہ بنایا کہ فلاں صاحب ترجمہ کرائیں گے اور فلاں چھپوائیں گے، چنانچہ ایک پمفلٹ ہم نے مرتب کیا کہ معلوم نہیں وہ کیسے قادیانیوں کے ہاں پہنچ گیا! اُن لوگوں نے ہمیں کہلوایا کہ آپ جو کچھ کام کر رہے ہیں درست ہے مگر آپ کو ضرورت نہیں، کیونکہ ہمارے ۳۵ مشن کام کر رہے ہیں۔

ہمیں افسوس ہے کہ ہم اس پر بھی قادر نہیں کہ اسلام کی صحیح تعلیمات کو دوسری زبانوں میں منتقل کر کے غیر ملکوں میں پہنچا سکیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ قدرت کسی اور قوم کو اُٹھانا چاہتی ہو۔ قرآنِ حکیم کا ارشاد ہے ﴿ وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْا اَمْثَالَكُمْ ﴾ (سورۃ الفتح) ہمارے اعمال کیا ہیں؟ کیا ہم مقابلہ کر سکتے ہیں غیر قوموں کا؟ حالاتِ حاضرہ میں ہماری طاقت نہیں ہے، البتہ اللہ میاں کے لیے مشکل نہیں ہے۔ پہلے بھی فلسطین پر قبضہ ہو گیا تھا، مسلمانوں نے مقابلہ کیا اور چھڑا لیا، اب پھر مشکل پیدا ہو گئی ہے، خطرات عظیم ہیں! مگر ہمارا کام کیا ہے؟ ہمارا کام ہے تبلیغ دین اور دعوت الی الحق۔ ہماری مثال شکاری کی سی ہے! شکاری بیٹھتا ہے دریا کے کنارے پر وہ مچھلی کو نہیں دیکھتا وہ تو پھینکتا رہتا ہے جال جو بھی شکار پھنس جائے! ہمارا نام ہے **شهداء على الناس** اور ہمارا کام ہر دم تبلیغ کرنا ہے۔

اللہ تعالیٰ آپ تمام حضرات کو توفیق عطا فرمائے کہ پیاسی دُنیا تک قرآن و حدیث کا پیغام پہنچا کر ان کی پیاس بجھائیں۔

(خدام الدین لاہور: ۲رفروری ۱۹۶۸ء، ص: ۱۵)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عنوانِ حدیث

(مولانا قاضی اطہر مبارکپوری کی کتاب ''اسلامی نظام زندگی'' پرمولانا سید محمد میاں صاحب کی تقریظ)

محترم ومکرم مولانا قاضی اطہر صاحب مبارکپوری کا مجموعۂ مضامین جوآپ کے ہاتھوں میں ہے، میں نے اس کے اکثر مضامین کا مطالعہ کیا۔

یہ گلدستۂ مضامین موجودہ حالات میں ملّت کی بہت بڑی ضرورت کو پورا کررہا ہے یعنی مسلمانوں کے سامنے آیات واحادیث مقدسہ کے حوالوں کے ساتھ بلند اخلاق کی وہ تعلیم پیش کررہا ہے جسکی دورِ حاضر میں سب سے زیادہ ضرورت ہے۔

کس قدر تعجب اورافسوس کا مقام ہے کہ وہ امت جس کا سررشتہ اس ذات مقدس سے وابستہ ہے جس کا خطاب **رحمۃٌ للعالمین ، رؤف ، رحیم** ہے۔جواپنی بعثت کا مقصد اعلیٰ اخلاق کی تکمیل قرار دیتا ہے۔

بعثتُ لأتمم مكارم الأخلاق

آج وہ اخلاق سے اتنی دور ہو کہ دنیا اس کا مذاق اُڑائے اوردوسروں کومتاثر کرنے کے بجائے اخلاق کی ہر ایک نمایشی چوکھٹ پر جبہ سائی کرتی پھرے اورپھر بھی وہ عزت سے محروم رہے۔

اسلام تبلیغی مذہب ہے۔ وہ تبلیغ تلوار سے نہیں کرتا بلکہ ہر ایک مسلمان سے اور مسلمانوں کی جماعت سے ایسے انفرادی اوراجتماعی اخلاق کا مطالبہ کرتا ہے، جو دوسروں کو اپنی طرف کھینچیں اور ہر انصاف پسند کے دل کواس اعتراف پر مجبور کردیں کہ:

''بلا شبہ تم بہترین امت ہو، تم نوع انسان کو نفع پہونچانے کے لئے خدا کی طرف سے پیدا کئے گئے ہو'' **کنتم خیر امةٍ أخرجت للناس**

آج جو کچھ مشکلات ہمارے سامنے ہیں، جو ہمارے حواس کو معطل کئے ہوئے ہیں اُن کا واحد علاج صرف یہ ہے کہ مسلمان اپنے اخلاق درست کرلیں۔ لہٰذا آج سب سے زیادہ ایسے رسائل پمفلٹوں اور ایسے کتابچوں کی ضرورت ہے جو مسلمانوں کو اعلیٰ اخلاق کی طرف مائل کریں۔

مجھے مسرت ہے کہ مولانا قاضی اطہر صاحب نے اس مجموعہ کی اشاعت سے اس اہم ضرورت کو پورا کیا ہے۔ ضرورت ہے کہ یہ رسالہ ہر وقت مسلمان کے پاس رہے اور وہ اس کا بار بار مطالعہ کرے۔

دعا ہے کہ خداوند عالم اس رسالہ سے عام مسلمانوں کو اور خود مصنف کو دین دین و دنیا کے منافع عطا فرمائے، اور جناب حاجی عبداللہ سمکری بن حاجی احمد مکی کو اجر عظیم عطا فرمائے جنھوں نے اس رسالہ کو شائع کرکے مسلمانوں میں دو ہزار کاپیاں مفت تقسیم کیں۔

محمد میاں

۱۶/دسمبر ۱۹۴۹ء وارد حال بمبئی۔ دفتر جمعیۃ علماء ہند

(اسلام نظام زندگی، ص:۲۴ طبع دوم)

☆☆☆☆☆

مکاتیب رئیس الاحرار پر ایک نظر

مؤرخ اسلام حضرت سیّد محمد میاں رحمۃ اللہ علیہ

قارئین کو یاد ہوگا کہ گزشتہ سال ماہ ربیع الاوّل ۱۴۲۷ھ سے تین قسطوں میں ہم نے ''مکاتیب رئیس الاحرار'' سے رئیس الاحرار حضرت مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانویؒ اور حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہٗ کے درمیان خط وکتابت شائع کی تھی، اس کے بعد قارئین اور دوستوں کی طرف سے اس بات کا اصرار بڑھ گیا کہ اس سلسلہ کو جاری رکھا جائے، چنانچہ ہم نے اس سلسلہ کو وقتاً فوقتاً جاری رکھنے کا نظام بنایا ہے مگر ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ ان مکاتیب کے متعلق جو تبصرہ یا تقریظ دو مشہور اکابر نے لکھی ہے، وہ پہلے شائع کی جائے۔ چنانچہ ہم اس شمارے میں مشہور مستند مؤرخِ اسلام حضرت مولانا محمد میاںؒ کی وہ تحریر شائع کر رہے ہیں جو کہ اُنہوں نے ان مکاتیب پر بطورِ مقدمہ کے لکھی تھی۔ اگلے شمارے میں مفکر اسلام حضرت مولانا سیّد ابو الحسن علی ندویؒ کے تاثرات شائع کیے جائیں گے۔

غالبًا ۱۹۳۱ء کا واقعہ ہے کہ میرٹھ میں ایک کانفرنس ہوئی تھی، اُس میں خان عبدالغفار خان صاحب بھی تشریف لائے تھے، چونکہ جمعیۃ علماء ہند کی مجلس عاملہ کا اجلاس بھی تھا تو حضرت مولانا محمد کفایت اللہ صاحب مفتی اعظم ہند اور حضرت سحبان الہند مولانا احمد سعید رحمہما اللہ اور جمعیۃ علماء ہند کے دوسرے اکابر بھی شریک ہوئے تھے۔ سیاست کے نو آموز بلکہ نیم آموز کی حیثیت سے یہ راقم الحروف بھی پہنچ گیا! معلوم ہوا کہ رئیس الاحرار

مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ بھی تشریف لائے ہوئے ہیں! عرصہ سے مولانا موصوف سے ملاقات نہیں ہوئی تھی، احقر مدرسوں میں پڑا رہا اور مولانا زیادہ تر جیل خانوں میں! اس وقت بھی ایک طویل اسارت کے بعد مولانا رہا ہوئے تھے، اس لیے ملاقات کا اشتیاق تھا۔ یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ مولانا بیمار ہیں اور غالبًا بیماری کی وجہ سے کچھ قبل از وقت رہا کردیے گئے تھے۔ بہرحال مغرب کے بعد اجتماع شروع ہوا، مولانا تشریف لائے، احقر کو شرف مصافحہ حاصل ہوا۔ احقر نے قریب ہوکر دریافت کیا کہ کیسے مزاج ہیں؟ برجستہ جواب دیا:

عشق نے غالب نکما کر دیا　　　ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

اس وقت بظاہر یہ صحیح تھا، کیونکہ کمزوری اتنی تھی کہ اُٹھنا بیٹھنا بھی مشکل تھا مگر چند روز بعد خدا کے فضل سے صحت ہوگئی تو دنیا نے دیکھا کہ یہی آدمی جو اپنے بارے میں ''نکما'' ہونے کا فتویٰ صادر کرچکا ہے ''شیر برطانیہ'' کے مقابلہ میں دندنا رہا ہے۔ ایک عالی حوصلہ انسان جو ہمالیہ کی بلندی کو بھی نظر میں نہ لاتا ہو، جس کا نصب العین کہکشاں سے بھی بلند تر ہو، جب اُس کی نظر اپنی کسی پستی پر پڑتی ہے تو فورًا اپنے آپ کو نکما کہنے لگتا ہے، مگر نکمے پن کا یہ عارضی تصور اُس کی ہمت پست نہیں کرتا بلکہ بسا اوقات غیرت وحمیت کا جذبہ اُبھرتا ہے اور ہیجان انگیز ولولے کے ساتھ یہ کہتا ہوا کھڑا ہوجاتا ہے۔

یا جان رسد بجاناں　　　یا جان ز تن بر آید

کانگریس اور اس کی ہم نوا جماعتیں ایک رفتار کے ساتھ چل رہی تھیں مگر مسلم نوجوانانِ پنجاب کی تیزی طبع اس رفتار پر قناعت نہ کرسکی، انہوں نے قدم آگے بڑھایا، سرخ جھنڈا ہاتھ میں لیا اور مجلس احرار قائم کرلی! ان کو صدر کی تلاش نہ کرنی پڑی! صدر اُن کے پاس پہلے سے موجود تھا جو حوصلہ مند نوجوانانِ پنجاب کا قائد بنا اُس کو ''مولانا حبیب الرحمٰن'' کہا کرتے تھے۔ اب ایثار پسند اور قربانیوں کا جنون رکھنے والوں نے اس کو ''رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی'' کہنا شروع کردیا (جس کے لیے اب ''رحمۃ اللہ علیہ'' کہنا قدرشناسی ہے)

عام خطوط میں تذکرہ اُنس ومحبت ہوتا ہے یا شکوۂ ظلم و جفا! مگر جو خطوط ان اوراق میں آپ کے سامنے پیش ہو رہے ہیں، یہ اس ملکی اور ملی تاریخ کے جواہر پارے ہیں جس کا آغاز ۱۹۳۱ء سے ہوا تھا۔ یہ جواہر پارے رئیس الاحرارؒ کی ذہنیت کے عکاس ہیں۔

ایک مردِ باخدا جد و جہد آزادی کو اپنا فرض اور اپنے خاندان کا طرۂ امتیاز سمجھتا ہے اپنے پورے وسائل کے ساتھ جنگِ آزادی میں شریک ہے لیکن جس طرح اس کو ''آزادیِ وطن'' سے عشق ہے جس کے لیے وہ قربانیاں پیش کر رہا ہے اسی طرح وہ ''وقارِ ملت'' کا بھی عاشق ہے، اس کو ہمیشہ باعظمت اور باوقار دیکھنا چاہتا ہے، اس کو غلامی سے نفرت ہے۔

مگر وہ صرف ''انگریز'' سے باغی نہیں بلکہ ''انگریزیت'' سے بغاوت بھی اس کی فطرت ہے، وہ تمام گورکھ دھندے جو انگریز نے پھیلا رکھے ہیں اور جس طرح وہ اپنے وفاداروں کے ذریعہ کہیں مذہب کے نام پر ان سے کام لیتا ہے اور وہ ان کو سمجھتے ہیں، ہر وقت ان پر نگاہ رکھتے تھے اور جب ضرورت سمجھتے تو ان کے خلاف علم جہاد بلند کرتے۔

ذہنوں کے ''مسخ'' کر دینے کا ایک ''کارخانہ'' انگریز کی طرف سے ''قادیان'' میں قائم کیا گیا، رئیس الاحرار جب احرار کے صدر ہوئے تو انہوں نے سب سے پہلے اسی ''قادیان'' پر یورش کی۔ (کیونکہ ان ہی رئیس الاحرارؒ کے دادا مولانا محمد لدھیانوی رحمۃ اللہ علیہ نے سب سے پہلے مرزا غلام احمد قادیانی پر کفر کا فتوی دیا تھا)

اسی کارخانہ کی ایک فیکٹری ''کشمیر'' میں بھی قائم ہوئی، اسی قائد کی زیر قیادت مجلسِ احرار کے فداکاروں نے قربانیوں کے انبار سے اس فیکٹری کو پاٹ دیا، اس کی ساری مشینیں بیکار ہو گئیں۔

اسی کارخانہ کی ایک مشین ''وائسرائے ہاؤس'' میں نصب ہونے والی تھی، وہ بہت سے پردوں میں چھپی ہوئی تھی مگر رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰنؒ کی عقابی نگاہیں ان پردوں کو پار کرتے ہوئے اس مشین تک پہنچیں اور یہ مشین نصب نہ ہونے پائی تھی کہ اس کو چکنا چور کر دیا۔

ان اشارات کی تصریحات آپ ان کے مکاتیب میں ملاحظہ فرمائیں گے۔

ذہنوں پر انگریز کی وفاداری پالش کرنے کی ایک مشین ''علامہ مشرقی'' نے ایجاد کی! خدمت اور ہمدردیِ نوعِ انسانی کے چوکھٹے میں اس کو نصب کرنا تھا، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانویؒ نے اس پر نظر ڈالی اور فرمایا کہ:

بہر اندازے کہ آئی من ترا می شناسم

''اقامت دین'' کا فرض فراموش ہو گیا، ''جمہوریت'' کے شور میں لوگ ''حکومتِ الٰہیہ'' کو بھولتے جا رہے ہیں۔

من زندہ کنم رسمِ رامے کہن را

''سیّد ابو الاعلیٰ مودودی'' نے اسی اعلان اور اسی نعرہ کے ساتھ پٹھان کوٹ میں ایک مرکز قائم کرنا چاہا، وفادرانِ قدیم ان کے مویداور سادہ لوحانِ جدید ان کے حامی ہو گئے مگر اِس کے رگ و پے میں جو مضر جراثیم پنہاں تھے حضرت حبیب الرحمٰن لدھیانویؒ کی نگاہِ دُور رس کو ان کے دیکھنے کے لیے کسی خورد بین کی ضرورت نہیں تھی، جس انداز میں مودودی صاحب کو مخاطب کیا وہ مکتوب بنام مولانا مودودی میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

ہند کی جنگِ آزادی کے میدان میں پیش قدمی کرتے ہوئے مولانا حبیب الرحمٰنؒ کی ہمت و عزیمت ایک طرف وقار دین کو بلند کرنے اور ملتِ اسلامیہ کو باعظمت دیکھنے کی کوشش میں مصروف رہی، دوسری طرف آپ کی نظر ان خطرات کو بھی تاکتی رہی جو دن بدن اُمتِ اسلامیہ کو پیش آ رہے تھے، پھر خطرے کے دفاع میں وہ سرگرمی رہی جس کا ظہور جنگِ آزادی کے میدان میں ہوتا تھا۔

امیر المحد ثین حضرت مولانا انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کو قادیانیت سے سخت نفرت تھی، رئیس الاحرارؒ نے ان ہی کے اشارے پر بحیثیتِ جماعت قادیانیت سے ٹکر لی، شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا ساتھ نبھایا۔ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن کا ذہن وہ آتشیں شیشہ تھا جو اِن بزرگوں کے احساسات کو اپنے اندر سمیٹتا اور ہر سعی و عمل کی گرمی کے ساتھ ان کو اُبھارتا تھا، اس کی جھلک آپ ان کے مکتوبات میں ملاحظہ فرمائیں گے۔

مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانویؒ سے تقسیمِ ہند کے کٹر حامیوں کو ان کے ایمان میں بھی (معاذ اللہ) شک تھا، کیونکہ وہ ہندوؤں سے مل کر کام کیا کرتے تھے۔ بلا شبہ مولانا کی ہمدردیاں ہر باشندۂ ملک کے لیے یکساں تھیں اور ملکی معاملات میں اشتراک اور تعاون کو ضروری سمجھتے تھے مگر آپ ان خطوط کو ملاحظہ فرمائیں جو ہندو دوستوں کے نام ہیں جو اخبار کے ایڈیٹر ہیں اور حکومت کے ذمہ دار وزراء، ان خطوط میں اظہارِ مقصد کے ساتھ ایسا مضمون ضرور ہے جس میں اسلام کی دعوت ظاہر ہے۔ آپ کو جیل خانہ کی زندگی اس لیے پسند تھی کہ اس میں ہندو دوستوں کو اسلام سے متعارف کرانے کا موقع ملتا تھا اور تقسیمِ ہند سے آپ کو سب سے زیادہ افسوس اس پر تھا اور اسی کا صدمہ تھا کہ دعوتِ اسلام کی تحریک کو سخت دھکا لگا ہے، پھر تقسیم کے بعد زیادہ قلق اس کا تھا کہ ان لاکھوں انسانوں کو اسلام کے دروازے سے دھکے دے کر نکال دیا گیا جن کے ساتھ اگر پاکستانی کچھ بھی اسلامی اخلاق سے کام لیتے تو وہ حلقہ بگوشِ اسلام ہو جاتے۔

دسمبر ۱۹۴۷ء میں لکھنؤ میں جب ''آزاد کانفرنس'' منعقد ہوئی تو اس میں مولانا مرحوم نے اپنے بیان میں ایک تاریخ ساز جملہ کہا جو کہ آج تک میرے ذہن کے نہاں خانوں میں محفوظ ہے، وہ یہ کہ ''تقسیمِ ہند کی وجہ سے ہندوستان میں مسلمانوں کو ذبح کیا جاتا رہے گا اور پاکستان میں اسلام کو۔''

یہ احقر مولانا سے اگرچہ زیادہ قریب نہیں رہا، قربت نہ ہونے کے باوجود جو کچھ لکھا گیا ہے وہ کم ہے، البتہ ان مکتوبات کے تعارف کے لیے کافی ہے۔ اللہ تعالیٰ مکتوبات کو بھی قبول فرمائے اور اس تعارف کو بھی اور شائع کرنے والوں کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

نیازمند محتاجِ دعا محمد میاں

خادم افتاء و درسِ حدیث امینیہ دہلی۔ سابق ناظمِ عمومی جمعیۃ علماء ہند

۱۱؍ جمادی الاولیٰ ۱۳۹۲ھ/۱۳؍ جون ۱۹۷۳

(ماہنامہ ملیہ فیصل آباد: محرم ۱۴۲۸ھ [جنوری، فروری ۲۰۰۷ء] ص: ۸)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ابنائے دار العلوم دیوبند سے خطاب
حَاسِبُوْا قَبْلَ أَنْ تُحَاسَبُوْا

از: مولانا سید محمد میاں صاحب فاضل دیوبند و ناظم اعلیٰ جمعیۃ علماء صوبہ آگرہ

ہندوستان میں صرف یہی مرکز العلوم ہے، جس کے واجب الاحترام ابنا و فرزندان کی تعداد اس وقت ہزاروں سے کم نہیں، جو ہندوستان کے گوشے گوشے میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ابنائے دار العلوم سے مستفیضین کا شمار، شمار سے بہت زیادہ ہے۔ ہزارہا فرزندوں کے اس لشکر عظیم اور اس فوج جرار کا ہر فرد عالم، فاضل اور سند یافتہ مولوی ہے، جو ''اَلْعُلَمَاءُ وَرَثَةُ الْأَنْبِيَاءِ'' کے پُرشوکت اعلانِ نبوی کا طرۂ امتیاز، اپنی دستارِ فضیلت میں لگائے ہوئے ہے۔

ان کے ماسوا دار العلوم دیوبند کے بالواسطہ فیض یافتگان کا شمار ہزاروں سے گزر کر لاکھوں تک پہنچتا ہے، کوئی شبہ نہیں کہ ایک ہی مرکز سے تعلق رکھنے والوں کی یہ تعداد اسلامیانِ ہندوستان کے لیے نعمت عظمیٰ ہے اور اسی طرح اس سلسلۂ عالیہ کے ہر ایک متوسل کے لیے آیۂ رحمت اور وثیقۂ رفعت؛ لیکن بایں ہمہ فراوانی آج ہم قلت میں ہیں اور ''يَدُ اللهِ عَلَى الْجَمَاعَةِ'' کے برکات سے محروم۔

سوال یہ ہے کہ آج ہندوستان پر ہمارا تسلط کیوں نہیں؟ عروج و ترقی کے سربلند مینارہ پر ہمارا پرچمِ عظمت کیوں نہیں لہراتا؟ امارت و خلافت کی تاریخ جس کو ہم وردِ زبان رکھتے ہیں، عملاً کیوں نہیں دہراتے؟ مسلمانوں کے اخلاق پست کیوں ہیں؟ ان کی معاشرت کیوں تباہ ہے؟ مسرفانہ رسومات اور فضول مصارف نے ان کے اقتصاد کو کیوں

برباد کر رکھا ہے؟ جہالت کی تاریک چادران پر کیوں تنی ہوئی ہے؟ مساجد کیوں ویران ہیں؟ دیہات بلکہ شہروں میں بھی اسلامی نام رکھنے والے، کلمۂ اسلام تک سے کیوں ناواقف ہیں۔

اور پھر کیا وجہ ہے کہ وارثانِ انبیاء علیہم السلام کے احترام سے دلوں کی کوٹھریاں خالی ہیں، ان کے اقتدا کے سامنے مدعیانِ ملت کی گردنیں کیوں نہیں خم ہوئیں؟ اور کیا وجہ ہے کہ انھیں کو ملت اسلامیہ کا واحد نمائندہ کیوں نہیں تسلیم کیا جاتا؟ حالانکہ بانیِ ملت نظامِ ملت کا قائد اور جسدِ ملت کا قلب انھیں کو قرار دیا تھا۔

تسلیم ہے علمائے امت کو برباد کیا گیا، دار کے ہزاروں تختوں کو ان کے مقدس خون سے سیراب کیا گیا، پھانسیوں کے ہزاروں پھندے ان کی معصوم گردنوں کے گلوبند بنائے گئے، دار ورسن، سیف وسنان کے ماسوا قید وبند سے بھی ان کی آشنائی قدیمی ہے، بید اور تازیانوں کی ایجاد انھیں کمروں کے لیے ہوئی تھی، جو حق وصداقت کی پشت پناہ ہوا کرتی ہیں، انڈمان کے جزائر بھی ان کے قدومِ میمنت لزوم کی برکتوں سے محروم نہیں رہے۔ جب ضرورت پیش آئی کہ:

> ''ہمیں ایک ایسی جماعت بنانی چاہیے جو ہم میں اور ہماری کروڑوں رعایا کے درمیان مترجم ہو، اور یہ ایسی جماعت ہونی چاہیے جو خون اور رنگ کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہو؛ مگر مذاق اور رائے، الفاظ اور سمجھ کے اعتبار سے انگریز ہو'' [تاریخ التعلیم، از: میجر باسو]

تو فارسی کے بجائے انگریزی کو سرکاری زبان قرار دے کر ان کو سیاست سے خارج کیا گیا، علما کی ہر ایک قابلیت کو نظر انداز کر کے ان کو غیر تعلیم یافتہ مانا گیا، سرکاری ملازمتوں کے دروازے ان پر بند کر دیے گئے۔

اور پھر اپنوں نے بھی اسی نظریہ کی ہمنوائی کر کے انھیں پانی پی پی کر کوسا اور پیٹ بھر گالیاں دیں اور ان کی توہین وتذلیل میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا، ان کی ہر ایک چیز کا مذاق اڑایا اور عوام کو ان سے متنفر کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور صرف کر دیا۔ یہ سب کچھ ہوا اور جس

طرح دوپہر کے آفتاب کا انکار نہیں کیا جاسکتا، اسی طرح مسطورہ بالا واقعات میں سے کسی ایک کا انکار بھی نہیں کیا جاسکتا۔

ان تمام مراحل کے طے ہونے کے بعد ہی دارالعلوم دیوبند کی بنیاد رکھی گئی، اس تخریب واستیصال کا صرف تھوڑا سا حصہ باقی تھا، جو بعد میں پورا کیا گیا۔ یہ بھی تسلیم ہے کہ اسلامی تہذیب جو کچھ ہندوستان میں باقی ہے (جس کی نظیر سے آزاد ممالک اسلامیہ قاصر ہیں) وہ دارالعلوم دیوبند ہی کی برکت ہے۔

پابندیِ شریعت اور اتباع سنت کا جو غلغلہ طول وعرض ہند بلکہ کابل، ایران وغیرہ ممالک میں ہے، وہ اسی ایشیا کے واحد مرکز علمی کی بدولت ہے۔ اگر رسمی سارٹیفکٹوں کو نظر انداز کردیا جائے تو آسانی سے چیلنج کیا جاسکتا ہے کہ مسلمانوں کی تعلیم میں اس مرکز علمی کا حصہ ۵۰رفی صدی سے کم نہیں۔

ہندوستان کے طول وعرض میں ہزاروں مدارس اور مکاتب ہیں، جن کی قندیلوں کا روغن اسی شجرۂ زیتون سے لیا گیا، پھر جب کہ انگریزی اسکولوں اور کالجوں کے دروازے اور کھڑکیاں غریب اور نادار بچوں کے لیے بند کیے جارہے تھے، اسٹوڈینس کی جیبوں سے اربوں روپیہ کھسوٹ کر، پروفیسروں اور پرنسپلوں کے عشرت کدوں پر لٹایا جارہا تھا، اس مرکز علمی سے واسطہ رکھنے والے مدارس اور مکاتب نے اپنے پھاٹک غریبوں کے لیے کھول دیے، یتیم اور لاوارث بچوں کو آغوشِ تربیت میں لیا، کھانے پینے، رہنے سہنے، پڑھنے لکھنے وغیرہ کا تمام سامان کارکنانِ مدارس ومکاتب نے مسلمانوں سے بھیک مانگ کر کیا، بے انتہا زحمتیں اور اس مقصد خیر کے لیے بے انتہا ذلت واہانت برداشت کی اور اشاعتِ علم کی وہ خدمت انجام دی، جو بڑی بڑی حکومتوں سے اور خود حکومتِ ہند سے انجام پذیر نہ ہوسکی۔

غرض اس قسم کی بہت سی برکتیں ہیں، جو اس مرکز قدس وشرف سے ظہور پذیر ہوئیں۔ یہ بھی مجھے تسلیم ہے کہ موجودہ جہالت صرف اسی دور کی پیداوار نہیں، جس کو انگریزی

دور کہا جاتا ہے؛ بلکہ وہ نتیجہ ہے اس طوائف الملو کی کے دور کا جو سلطان عالم گیرؒ کے بعد شروع ہوا، جس کی عظیم الشان رکنیت ایسٹ انڈیا کمپنی کی ہندوستانی ایجنٹوں کو حاصل تھی، جس کے متعلق ۱۸۲۳ء میں آنریبل ایم. ایلفنسٹن اور آنریبل. ایف وارڈن نے ایک متفقہ یادداشت گورنمنٹ میں پیش کی تھی، جس کا اقتباس یہ ہے:

> ''انصاف یہ ہے کہ ہم نے دیسیوں کی ذہانت کے چشمے خشک کردیے، ہماری فتوحات کی نوعیت ایسی ہے کہ اس نے نہ صرف ان کی علمی ترقی کی ہمت افزائی کے تمام ذرائع کو ہٹالیا ہے؛ بلکہ قوم کے اصلی علوم بھی گم ہوجانے اور پہلے لوگوں کی ذہانت کی پیداوار فراموش ہوجانے کا اندیشہ ہے۔'' [روشن مستقبل، ص:۱۲۳]

دارالعلوم دیوبند نے اس ڈیڑھ سوسالہ دورِ جہالت کو اٹھانے کی کوشش کی اور اس تاریک فضا میں (جس کو لادینی اور لامذہبی انگریز پرستی اور خودفراموشی کی آندھیوں نے گردو غبار سے بھر دیا تھا) علم وفضل کے چراغ روشن کیے، تاہم سوال یہ ہے کہ اس وقت سلسلۂ فرزندانِ دارالعلوم کی کثیر تعداد کے باوجود جہالت، لادینی، اسراف اور فسق وفجور کی یہ پھیلی ہوئی فضا مسلمانوں میں کیوں موجود ہے؟ طلوعِ صبح صادق کے بعد شب دیجور کی یہ تاریکی کیسی؟ نشور رحمت کے بعد قلوب امت قنوط زدہ کیوں ہیں؟ نزول غیث کے ساتھ خیابان ملت تُفتیدہ جگر کیوں ہے؟ زمانہ اگر سازنہیں کرتا تو یہ ایک نیا زمانہ کیوں نہیں بنالیتے؟ ابنائے زمانہ اگر ان کا ساتھ نہیں دیتے تو یہ خودگراں پا کیوں ہوگئے؟

اسماعیل شہید، سید احمد شہید، امداد اللہ مہاجر، قاسم ورشید اور محمودالحسن کے یہ فرزند دنیا میں موجود ہوں اور مسلمانانِ ہندان کو اپنا واحد نمائندہ تسلیم نہ کریں، یاللعجب! یہ جمود کیسا؟ اگر یہ دہر ناپائیدار، بے وفا اور ناقدرشناس ہے تو اس کو پلٹ کیوں نہیں دیا جاتا؟ پیر فلک کی آخر شکایت کب تک، ایک نیا آسمان کیوں نہیں بنالیتے؟

کیا دوڑتے دوڑتے تھک گئے ہیں، بُعدِ مسافت نے آبلہ پا کردیا ہے، یا ابھی چلنا

ہی نہیں شروع کیا، کس قدر تعجب کی بات ہے، جن سے چلنے کے لیے نہیں کہا گیا، جن کی بلندی و برتری اور عروج وترقی کو ’’متاعِ قلیل‘‘ کہا گیا ہے، جس کا نتیجہ جہنم ہے، وہ سراسر جدو جہد بنے ہوئے ہیں، مصروفِ عمل ہیں؛ بلکہ پیکر کردار۔ اور جن کے لیے لازوال ابدی اور دائمی نعمتوں کے خزانے فراہم کیے جائیں گے، جن کو رضوانِ الٰہی کی دولتِ لازوال سے نوازا جائے گا، وہ افتادہ پا ہیں۔ آخر وجہ کیا ہے؟ یہ صحرا نورد، خانہ نشین کیوں ہیں؟ جن کے تلووں کی کھجلی خارِ دشت کی آرزو کیا کرتی تھی، وہ ٹوٹی جھونپڑیوں کے کونوں میں کیوں چھپ رہے ہیں؟ یہ دنیاداروں کے اور دنیا کے شاکی کیوں ہیں؟ دوشِ دنیا پر سوار کیوں نہیں ہو جاتے؟ اگر تنزل وتقاعد کے کچھ اسباب ہیں تو کیا ہیں؟ اور ان کا علاج کیا؟ آؤ آج اسی پر غور کریں۔

میرے خیال میں اس کا سبب ایک ہے اور صرف ایک ہے، ہم نے اپنا منصب نہیں پہچانا، دنیا کہتی ہے: آپ وارث انبیا ہیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ آپ وارث انبیا ہیں، قرآن پاک نے انبیا علیہم السلام کے فرائض اِن کے حوالے فرمائے اور ہم بھی فضائل علما بیان کرتے ہوئے یہی کہتے ہیں کہ یہ جماعت وارث انبیا ہے اور نہ صرف وارث بلکہ برسرِ منبر کہا کرتے ہیں اور پوری قوت سے کہا کرتے ہیں کہ ’’عُلَمَاءُ أُمَّتِي كَأَنْبِيَاءِ بَنِيْ إِسْرَائِيْلَ‘‘ مگر ہمیں خود اپنی حیثیت میں کبھی خیال بھی نہیں پیدا ہوتا کہ واقعی ہم وارث انبیا ہیں اور اگر کبھی خیال پیدا بھی ہوتا ہے تو نہایت کمزور۔

مختصر یہ کہ ہم کہتے ہیں، مگر سمجھتے نہیں کہ وارث انبیا علیہم السلام ہم ہی ہیں، کیا اس کا سبب انکسارِ نفس ہے؟ جو انکسار نفس ادائے فرائض سے قاصر رکھے، وہ انکسار نفس نہیں؛ بلکہ غفلت، عین بے حسی اور بے شعوری ہے، جو مدح کے بجائے مذمت اور ثواب کے بجائے عذاب کا مستحق گردانتی ہے۔ بیشک ہماری اس بے شعوری میں ’’مادرِ علمی‘‘ کا بھی کسی قدر قصور ہے۔ علم بغیر تربیت (ٹریننگ) ناتمام ہے، ہماری تعلیم ہوتی ہے؛ مگر اس کے بعد مستقبل کے متعلق اگر کوئی فیصلہ طلبہ کر بھی لیتے ہیں تو مادر علمی کی جانب سے اس فیصلے کے بموجب تربیت وتکمیل کی کوئی صورت مہیا نہیں ہوتی۔ مثلاً اگر کسی طالب علم نے فیصلہ کرلیا کہ اس کو آئندہ

زندگی تبلیغ میں صرف کرنی ہے تو تبلیغ کی کیا صورت ہونی چاہیے؟ اس کے آداب وقواعد کیا ہیں؟ کن کن کتابوں یا فنون کی یا زبانوں کی ضرورت ایک مبلغ کو ہوسکتی ہے؟ اس طالب علم کو ان کا مطالعہ کرنا چاہیے، غرض ان چیزوں کے متعلق ''مادرِ علمی'' کی جانب سے کوئی امداد نہیں فرمائی جاتی۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ مادر علمی کے قصور سے زیادہ خود ہمارا قصور ہے، ہم علم ضرور حاصل کرتے ہیں؛ مگر نصب العین نہیں متعین کرتے، اور اگر کچھ نصب العین ہوتا ہے تو صرف پڑھانا، گویا ایک مولوی دنیا میں صرف ''تدریس'' ہی کا کام کرسکتا ہے اور جو مولوی کسی مدرسے کا مدرس ہوجائے وہ کامیاب ہے۔ زمانۂ تعلیم میں نصب العین سے ہماری لاپروائی یا تردد کے مہلک نتائج ہی آج ہماری پستی کے اسباب ہیں، آج اسی خرابی کے باعث بلا مبالغہ ہم ۹۹ رفی صدی ناکام ہیں۔

چونکہ پہلے سے کوئی نصب العین معین نہیں؛ لہٰذا زمانۂ تعلیم میں اگر ہم محنتی اور مستعد طالب علم ہوتے بھی ہیں تو ہماری محنت اور مستعدی کا دائرہ صرف درسیات میں منحصر رہتا ہے، ان کے ماسوا تاریخ، جغرافیہ، اصلاحِ اخلاق تک کی فکر نہیں ہوتی، انتہا یہ ہے کہ اگر ہم نے پہلے سے حساب اور تحریر جیسی ضروری چیزیں نہیں سیکھی ہیں تو اب شرمناک خامیوں کے دور کرنے کی جانب بھی التفات نہیں ہوتا۔

جب ہم محنت کرکے درسیات کی تکمیل سے فراغت حاصل کرلیتے ہیں اور دورۂ حدیث شریف کے سخت امتحانات میں اعلیٰ نمبر حاصل کرکے ایک طویل وعریض سند حاصل کرلیتے ہیں تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ''کیا کرنا چاہیے؟'' اس وقت تک اگر آئندہ زندگی کے متعلق سوال پیدا ہوا تھا تو ''تدریس وتعلیم'' یہی اس کا جواب تھا؛ لہٰذا ہم سب سے پہلے کسی مدرسی کی جگہ کے متلاشی ہوتے ہیں، اس جستجو میں ہماری کج روی کس قدر جگر فگار ہے۔ **الأمان الحفيظ!**

ظاہر بات ہے کہ دارالعلوم دیوبند م مظاہر علوم سہارن پور، جامعہ قاسمیہ مدرسہ

شاہی مرادآباد اور دہلی، رام پور، بریلی، کان پور اور لاہور وغیرہ کے مدارس عربی سے جب ہر سال کم از کم پانسو علما تیار ہوں گے تو ہر ایک کو مدرسی نہیں مل سکتی۔ لہٰذا:

(الف) کوشش کی جاتی ہے کہ خود مدرسہ قائم کرلیا جائے۔

اگر تبلیغ واصلاح کے مقصود کو سامنے رکھ کر دیہات وقصبات میں مدارس قائم کیے جائیں اور حسب ضرورت ان میں مسلمان بچوں کو تعلیم دی جائے، انھیں کے ماتحت مسلمان لڑکیوں کی تعلیم کا انتظام بھی کیا جائے اور پھر اس مدرسہ کو ایک مرکز قرار دے کر دیگر مضافات میں تبلیغ کی جائے تو بلاشبہ یہ مدارس مسلمانوں کے لیے رحمت، برکت اور سراسر برکت ہیں۔ نیز ذیل ارشاد ربانی کی تعمیل کی بہتر اور آسان شکل ہے۔

فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوْا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ.

لیکن افسوس چند قسم کی بدقسمتیاں ہمارے اس پاکیزہ مقصد کو واژگوں کر دیتی ہیں۔ مثلاً اصلاح اخلاق، اصلاح معاشرت، غرض جملہ اصلاحات کو صرف بریلویت اور دیوبندیت کی جنگ میں منحصر کرلیا جاتا ہے۔

سلسلہ تعلیم میں عام مسلمانوں کی ضرورت کا لحاظ نہیں ہوتا؛ بلکہ اپنی استعداد کی افزونی مدنظر رہتی ہے، لہٰذا کوشش یہ ہوتی ہے کہ عربی پڑھنے والے طلبہ فراہم ہوں اور ''بخاری شریف وترمذی شریف یا قاضی، صدرا، شمس بازغہ'' کا درس ان کو دیا جائے۔ یعنی کوشش کی جاتی ہے کہ ہر ایک چھوٹے سے گاؤں میں بھی قائم کیا جائے تو دارالعلوم جو مرکز العلوم کا خطاب جلد حاصل کر سکے۔ بسا اوقات انھیں جذبات کے ماتحت ایک ایک شہر میں کئی کئی مدارس قائم کیے جاتے ہیں اور ہر ایک کو دارالعلوم بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس جذباتی جدوجہد میں مسلمانوں بچوں کی ابتدائی مذہبی تعلیم سے توجہ ہٹ جاتی ہے، جو درحقیقت فرض تھی اور جس کے لیے زائد سے زائد مدارس کے قیام کی شدید ترین ضرورت اس وقت بھی موجود ہے اور آئندہ بھی رہے گی جب تک مسلمانوں کے ہر ایک گاؤں اور ہر

ایک محلے میں مذہبی تعلیمات کا ایک مدرسہ قائم نہ ہو جائے اور جب تک ہر ایک مسلمان لڑکا اور لڑکی مذہبی تعلیم سے کما حقہ واقف نہ ہو جائے۔

ضرورت کے مطابق مسلمان بچوں کی ابتدائی تعلیم کی بجائے چونکہ انتہائی تعلیم ہماری توجہات کا مرکز بن جاتی ہے، لہٰذا ضرورت پڑتی ہے کہ ہر ایک مدرسے میں دو چار فضلائے دارالعلوم دیوبند ہوں، جو درسیات کو آخر تک پڑھا سکیں۔ یہ مدارس چونکہ مسلمانوں کی عام ضرورت سے چشم پوشی کر کے ان کی جائز خواہش کے خلاف ان کے سر پر ڈالے جاتے ہیں؛ لہٰذا ان کی مالی ضرورتوں کے پورا کرنے کی جانب مقامی مسلمان متوجہ نہیں ہوتے، یا متوجہ ہونے کی طاقت اور ہمت نہیں رکھتے، لہٰذا دیگر مقامات سے چندہ فراہم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دارالعلوم دیوبند، مظاہر علوم اور مدرسہ شاہی کا فارغ التحصیل طالب علم اپنے مرکزِ علمی کی امداد کے بجائے خود ان کی آمدنیوں پر حملہ کرتا ہے اور اس طرح غیر ارادی طور پر اپنے علمی مرکزوں کو کم از کم خاطر خواہ ترقی سے روک دیتا ہے۔

وہ گورنمنٹ جس کے نظریے کا علم ''لارڈ میکالے'' کے مسطورہ بالا قول سے ہو جاتا ہے، اور جس کے نظریے کو ناکام کرنے والے صرف علما ہی ہو سکتے تھے، اس نے مدارس کے بارے میں یہ ''طوائف الملوکی'' دیکھی تو خود بھی علوم مشرقیہ کی یونیورسیٹیاں قائم کر کے اپنے مذاق کے مولوی تیار کرنے کی فیکٹری تیار کر دیں۔ اور پھر علم پروری کے پردہ میں دیگر مدارس کو بھی امداد کی طمع دلا کر سرِ دآزادی کی چوٹی پر پرواز کرنے والے طائرانِ حریت کو من مانی شرائط کی تھیلیوں میں بند کر دیا۔ اب نہ صرف ایک عالم دین اور وارث نبی بلکہ پورا علمی ادارہ ایڈ کے چند سکوں کے لیے ملوکیت واستعماریت کے دست باطل پرست پر بیعت کرنے لگا۔ معاذ اللہ!

حضرات علما وفضلا کی ماشاء اللہ کثرت نے نکبت وافلاس کے اس طوفانی دور میں ملوکیت کے منحوس قدموں کو بہت جلد موقع دے دیا کہ وہ آگے بڑھیں اور دارالعلوم دیوبند

جیسے علمی مرکز کے وقار کو خاک میں ملا دیں۔ چنانچہ تدریس وتعلیم کے شوقین فضلاے جدید جب علم وفضل کی متاع گراں کو لے کر (افسوس صد افسوس) بازار ملازمت میں پہنچے تو انگریز پرستی کے ایجنٹوں کی طرف سے اعلان کر دیا گیا کہ آپ کے سینوں میں خواہ کتنا ہی علم ہو، ہمارے یہاں معیار قابلیت یونیورسٹی کا امتحان ہے۔ جن غریبوں کا نصب العین ہی ملازمت تھا، یا لیلیٰ تدریس کی منزل ہی کو مقصود زندگی بنا چکے تھے، ان کو دارالعلوم دیوبند کے وقار اور احترام سے کیا غرض! بلا سوچے سمجھے شیطنت کی فرعونی ندا پر لبیک کہا اور یونیورسٹی کے امتحان میں شرکت کر کے اول درجہ کی کامیابی حاصل کر لی۔

اب ایک جماعت اسکولوں اور کالجوں میں پہنچی، جس نے کھلم کھلا اپنی تمام علمی برتری نہیں؛ بلکہ حاصل کردہ ''وراثت نبوت'' کو معاذ اللہ انگریز کے قدموں پر نثار کر دیا۔ یہ وہی اسکول اور کالج ہیں، جن کے متعلق اکبرالہ آبادی نے کہا تھا: ؎

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

سیکڑوں مثالیں موجود ہیں کہ تدریس کے شوق میں علم حاصل کیا، فراغت کے بعد ایک عرصے تک کسی عربی مدرسے میں ملازمت کی تلاش رہی، محبوبۂ تدریس کے عشق نے کسی اور سلسلے کی جانب توجہ کی فرصت بھی نہ دی؛ مگر تعلیم وتدریس سے اس چند سالہ بے تعلقی رفتہ رفتہ علم کی تازگی کو ختم کر دیا، اب اگر کسی مدرسے میں جگہ مل بھی گئی تو نا قابلیت کے الزام میں جلد ہی خارج کر دیا گیا۔ یا چند سالہ جدوجہد کے بعد ضرورت معاش، عشق تدریس پر غالب آ گئی تو کسی مسجد کی بامشاہرہ خطابت وامامت کو غنیمت سمجھ لیا گیا۔

فی الواقع یہ منصب امامت بہتر تھا، اگر نماز کی طرح دیگر امور ملی وضروریات مذہبی میں شان امامت باقی رہتی، مگر بسا اوقات امامت صرف نماز میں یا چند اختلافی مسائل میں منحصر ہو جاتی ہے، دیگر ضروریات ملت میں امام صاحب مقتدی ہوتے ہیں اور جماعت یا منتظمان مسجد امام ہوتے ہیں۔ بہت سی مثالیں موجود ہیں کہ آزاد مدارس عربیہ کے فضلا نے

فکر معاش سے مجبور ہوکر میونسپلٹی یا ڈسٹرکٹ بورڈ کے پرائمری مکاتب کی ملازمت ہی کو ذریعہ معیشت قرار دیا۔کاش یہ حضرات ابتدا ہی سے نص قرآنی کے بموجب ''انذار و اصلاح'' کو اپنا نصب العین قرار دیتے اور تحصیل علم کے بعد اپنے وطن عزیز میں پہنچ کر سب سے پہلے وہاں کی اصلاحی ضرورتوں پر نظر ڈالتے اور انھیں اصلاحات کے پیش نظر مدرسہ یا مکتب یا تبلیغی ادارہ قائم کرکے ذریعۂ معاش بھی فراہم کر لیتے اور فرض منصبی بھی ادا کرتے۔

اگر اپنی بستی میں پہلے سے کسی ادارہ کے قیام کے باعث ضرورت نہ ہوتی تو قرب وجوار کے جس مقام پر ضرورت ہوتی، وہاں پہنچ کر کسی دارالعلوم کے قیام یا (اپنے صنم علم کی پرستش کے لیے نہیں؛ بلکہ وہاں کے مسلمانوں کی ملی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے) وہاں کی ضرورت کے موافق ادارہ قائم کرتے اور ارشاد الٰہی وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوْا إِلَيْهِمْ کی تکمیل کی ابدی سعادت حاصل کر لیتے۔اور ایسی مثالیں بھی موجود ہیں کہ اس قرآنی فلسفہ کو سمجھ کر کام کیا گیا تو دنیاوی اعتبار سے بھی کامیابی حاصل کی اور توقع ہے کہ آخرت میں بھی یہ حضرات کامیاب ہوں گے۔

ان تمام کج روی اور بے راہی کا سبب صرف ایک ہے اور وہ یہی کہ ہم ابتدا سے اپنا نصب العین متعین نہیں کرتے۔ دوم یہ کہ ہم دارالعلوم کو صرف ایک درس گاہ سمجھتے ہیں جس میں مختلف ممالک کے بہت سے طلبہ پڑھتے ہیں، وہاں اساتذہ بہت بہترین اور اس کی سند تمام مدارس عربیہ میں وقعت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے۔وہ اعلیٰ وارفع اور حیات پرور مقصد جس کے لیے دارالعلوم دیوبند قائم کیا گیا اور جس کی تکمیل ہر ایک فرزند دارالعلوم کا فرض ہے، ہمارے سامنے قطعاً نہیں ہوتا۔

میں اعتراف کرتا ہوں کہ میری حالت بھی وہی رہی، جو دارالعلوم کے کسی ایک طالب علم کی ہوسکتی ہے، بلاشبہ یہ خداوندی فضل وکرم ہے کہ تلاش ملازمت میں مجھے زیادہ دشواری پیش نہیں آئی اور حضرت سیدی العلامہ الاستاذ مولانا محمد اعزاز علی صاحب مدظلہ العالی، نیز استاذ العلما فخر المحدثین حضرت علامہ مولانا سید انور شاہ صاحب کشمیری قدس اللہ

سرہ العزیز کی توجہات سے تدریس کا بہتر منصب میسر آ گیا۔

البتہ اسلام کی بہتر خدمت کا شوق ابتدا سے تھا اور اب تک ہے، اور یہی دعا رہی اور ہے کہ ملت بیضا کی اعلیٰ اور احسن خدمت کی توفیق عطا ہو۔ اللھم آمین۔ البتہ تقریباً اٹھارہ سال کے مختلف تجربوں اور ہندوستان کے مختلف گوشوں کے حالات کے مشاہدہ نے ایک خاص درد پیدا کر دیا ہے جس کے لیے دوا کی تلاش ہے:

میں بلبل نالاں ہوں اس اجڑے گلستاں کا
تاثیر کا سائل ہوں، محتاج کو داتا دے

معلوم ہوا ہے کہ حضرت مہتمم صاحب دارالعلوم دیوبند و دیگر اکابر درجہ تکمیل قائم کرنا چاہتے ہیں، یہ درحقیقت احقر جیسے دلدادگانِ اضطراب کے لیے مژدۂ جاں بخش ہے۔ خدا کرے یہ ادارہ جلد از جلد منصۂ تکمیل پر جلوہ افروز ہو۔ یہ نوید جاں افزا تمناؤں کی ایک نئی دنیا سامنے کر دیتی ہے اور فکر و تخیل کا طائر بلند پرواز وہ نشاط حاصل کرتا ہے جو کسی طرح بھی نوک قلم کے خطوط و نقوش میں اسیر نہیں ہوسکتا۔ مختصر یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ آج ہم فرزندان و بہی خواہانِ دارالعلوم یہ بھی کہتے ہیں کہ اس دور پُرفتن و پُر آشوب میں صرف دارالعلوم دیوبند ہی حامیِ ملت اور محافظِ دین ہے، دارالعلوم دیوبند کے ارباب حل و عقد بھی یہی فرماتے ہیں اور اسی کا اعلان کرتے ہیں اور بلا شک وشبہ واقعہ بھی یہی ہے کہ ۷۹؍سال کے اس طویل دور میں صرف دارالعلوم ہی محافظ ملت رہا اور اسی نے مسلمانوں کے سامنے مذہبی اور ملی ترقی کی صحیح راہ عمل پیش کی اور مسلمانوں نے مذہب و ملت کے لحاظ سے جو کچھ ترقی کی، وہ صرف اسی ایک مرکز کے ذریعہ ہے۔

لیکن اس واقعی حقیقت کے باوجود انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ہم عزم کی کمزوری میں مبتلا ہیں، ہم اس حقیقت کو مبالغہ تصور کرتے ہیں، ہمیں شک وشبہ کی ہر ایک آلائش سے پاک ہوکر یہی یقین رکھنا چاہیے کہ دارالعلوم اور صرف دارالعلوم ہی حفاظت و ترقی ملت کے لیے قائم کیا گیا اور یوم آغاز سے آج تک صرف دارالعلوم ہی حفاظت و ترقی ملت کا واحد ذمہ دار

رہا، اور یہی مرکز علوم، قرآنی علوم اور اسلامی تہذیب کا قلعۂ معلیٰ اور ترقی ملت کا محور رہے گا۔

اس پختہ عقیدہ اور اس اذعان ویقین کا لازمی نتیجہ ہوگا کہ ملت اسلامیہ ہندیہ کی تمام ضرورتیں ہمارے سامنے آئیں گی، اور ہر ایک ضرورت کا ترقی پذیر لائحۂ عمل ہم مرتب کریں گے اور ملت بیضا کو موجودہ پستی واضمحلال سے نکال کر عروج کی سب سے اونچی سطح پر پہنچادیں گے۔ **واللہ علی ما نقول وکیل**

ہم محسوس کریں گے کہ ملت بیضا کو مبلغین کی شدید ضرورت ہے، علاوہ ازیں سیاست، اقتصاد اور معیشت میں بھی وہ ہماری رہنمائی کے بغیر موت کے کنارے پر پہنچ چکی ہے۔ ہم مبلغین کو چند جماعتوں پر تقسیم کریں گے؛ کیوں کہ تبلیغ کے چند میدان بیک وقت نہایت اہمیت کے ساتھ ہمارے سامنے آئیں گے:

(۱) مسلمانوں میں تبلیغ

(۲) غیر مسلم برادرانِ وطن میں تبلیغ

(۳) بیرونی ممالک میں تبلیغ

ایک ہی شخص ہر ایک حلقے میں تبلیغ نہیں کرسکتا، ہم طلبہ کی طبائع کا امتحان کریں گے اور پھر طبعی مناسبت کے بموجب درجہ تکمیل میں ان کی تربیت کریں گے اور سختی کے ساتھ دعوی ہمہ دانی سے انھیں روکیں گے۔ آج سیاست سے قطعاً غیر متعلق علمائے کرام سیاسیات میں فتاویٰ صادر کرکے اپنی جماعت میں اختلاف وافتراق کرکے جماعت کے عقائد کو کمزور کردیتے ہیں، ہمیں تقسیم کار کے اصول پر سختی سے پابند ہونا چاہیے اور درجہ تکمیل کے طلبہ کو اسی کا عادی بنائیں۔ تبلیغ کے لیے قرآن پاک کے اس کامیاب اصول کا لحاظ رکھنا اتنا ہی ضروری ہوگا، جتنا کہ کامیابی کو ضروری سمجھا جائے گا۔ ارشاد ربانی ہے:

"وَمَا أَرْسَلْنَا مِن رَّسُوْلٍ إِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ"

واقفیت زبان کے ساتھ لازمی ہے کہ قوم کے عادات وخصائل، اس کے مزاج عقلی، اس کی تاریخ اور اس کی نفسیات سے مبلغ پوری طرح واقف ہو، ورنہ کامیابی محال ہے۔

وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوْا إِلَيْهِمْ سے غالباً اسی جانب اشارہ ہے۔

یورپ نے دعوت اسلام کو قبول نہیں کیا اور یہی وہ براعظم ہے، جہاں دعوت اسلام ناکام رہی، حتیٰ کہ صدہا سال اندلس میں شان دار حکومت کے بعد نہایت غداری وسفا کی سے ایک ایک مسلمان کو ختم کر دیا گیا۔ تاریخ نے واضح کر دیا کہ سفید فام اقوام کے دل اتنے ہی سیاہ ہوتے ہیں، جتنا کہ وہ اپنی رنگت کے معبود، باطل کے پرستار ہیں، سنگ سیاہ اگر آبگینہ بن جائے تو شاید ہی اس کی اصلاح بھی ہو سکے:

زمین شور سنبل بر نیارد
درو تخم عمل ضائع مگرداں

لہٰذا ہمیں وہ شاداب اور زرخیز وادیاں تلاش کرنی ہیں، جہاں تخمِ عمل بارآور ہو سکے، جزائر مشرق سے پھر ایک چشمہ ابل رہا ہے، جیسا کہ چھ صدی پیشتر جب اسی گوشے سے ایک سیلاب اٹھا تھا اور ہر ایک دشت اور وادی کو تہہ و بالا کرتا ہوا بحیرۂ اسلام میں جا کر گرا تھا۔ اگرچہ ایک مرتبہ سارے بحیرہ کو تہہ و بالا کر دیا؛ لیکن اسی اچھکولے سے بحر اسلام میں ایک طوفان پیدا ہوا، کچھ وقفہ کے بعد دیکھا گیا تو سمندر کی موجیں ٹھاٹھیں مار رہی تھیں اور سیلاب کا نام ونشان بھی مشکل سے ملتا تھا۔

آج بھی وہی قرآن ہے، وہی اسلام ہے، وہی زمین ہے، وہی آسمان، وہی مشرق اور وہی مغرب ہے، پھر ناامیدی کے کیا معنیٰ!

''لَاتَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللهِ، لَاتَيْئَسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللهِ، إِنَّهٗ لَايَيْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللهِ إِلَّا الْقَوْمُ الْكَافِرُوْنَ''

کسی قوم کی اصلاح کے لیے اسی قوم کے نوجوان جواہر بے بہا ہیں، جس قیمت پر بھی میسر آجائیں، ارزاں ہیں۔

تبلیغ کے بعد دوسرا درجہ اسلامی سیاست کا ہے، جس کے لیے اسلام کے سیاسی نظریات کی پختگی اور پھر ان کے لیے جذبۂ عمل وغیرہ کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ اس مکرو

فریب اور دھوکے بازی وڈپلومیسی کی جس کا مرکز یورپ ہے اور جس کو آج کل سیاست کہا جاتا ہے، اصلی خزانوں سے بھی براہِ راست واقفیت ہو، تراجم کی حیثیت پوست سے زیادہ نہیں، حالانکہ کامیاب مدافعت کے لیے مغز کی ضرورت ہے۔

سیاست کی طرح یہ بھی لازم ہے کہ اسلام کے اقتصادی نظام کو دنیا کے سامنے رکھ کر ان تمام گتھیوں کو سلجھایا جائے، جو آج ساری دنیا کو نمونۂ جہنم بنائے ہوئے ہے۔ اسلام کا اصول ہے کہ سونے کی بیع سونے سے، چاندی کی بیع چاندی سے صرف اسی وقت جائز ہے، جب دونوں ہم وزن ہوں، کمی بیشی اور ادھار حرام ہے۔ مجھے یقین ہے اور میرے ضمیر کو پورا اطمینان ہے کہ اگر صرف اسی اصول پر عمل کیا جائے تو سلسلہ اقتصاد کی بہت سی الجھنوں سے ساری دنیا نجات پا جائے۔ سکہ کی قیمت، سود، نوٹ، تبادلہ کی وہ صورتیں جن کو شریعت غراء نے ''ربوا'' قرار دیا ہے، آج دنیائے انسانیت پر آگ اور خون کی بارشیں برسا رہی ہیں اور ''یَمْحَقُ اللّٰہُ الرِّبوا'' کا پُر ہیبت نظارہ خرمن تمدن کو برق کی نذر کر رہا ہے۔ لیکن میں اپنے اس یقین واطمینان کی کوئی دلیل نہیں پیش کر سکتا؛ کیوں کہ میں اقتصادیات کا ماہر نہیں:

زبانِ یارِ من ترکی، ومن ترکی نمی دانم

قرآن پاک ''تِبْیَانًا لِّکُلِّ شَیْءٍ'' ہے، یقیناً اس کی مقدس تعلیم ان تمام گتھیوں کو سلجھا سکتی ہے، لیکن اگر ہم علم سے ناآشنا ہیں، تو کیا یہ غلط ہے کہ پوری اسلامی جماعت ایک فرض کفایہ کی ادائیگی سے قاصر ہے، لامحالہ موجبِ گناہ ہے۔

علمائے ملت پر دقیانوسیت کا الزام لگانے والے بھی، افسوس یہ ہے کہ کوئی مفید کارنامہ ملت کے سامنے پیش نہیں کر سکتے اور بالخصوص مسئلہ اقتصادیات میں۔ اور ''کرنسی'' تو وہ پیچیدہ چیز ہے جس کا یا تو صحیح علم ہندوستان کو بتایا نہیں جاتا اور یا اس فن سے مسلمان گریجویٹوں کے پتّے جلتے ہیں؛ کیوں کہ وہ حساب وریاضی میں کمزور ہوتے ہیں، انھیں صرف انھیں ناتمام اور لغو چیزوں سے شغف ہوتا ہے، جو ان کی اسلامی تہذیب وتوقیر اور خاندانی کلچر کو برباد کر دیں اور وہ ان چیزوں کے پاس بھی نہیں بھٹکتے جو ملت کے لیے مفید

ہوسکتی ہیں، الا ماشاء اللہ! بہر حال وہ کچھ بھی کریں، ہمارے لیے عذر نہیں ہوسکتا؛ کیوں کہ ملت کی ذمہ داری بانیِ ملت علیہم السلام نے ان اغراض پرستوں اور ضمیر فروشوں کے سر نہیں ڈالی، یہ فریضہ تو صرف علماء امت پر عائد ہوتا ہے؛ کیوں کہ وہی وارث انبیا علیہم السلام ہیں۔

تبلیغ، سیاست اور اقتصاد کی تعلیم کے ساتھ درجہ تکمیل میں اس اہم ترین مقصود کو بھی نظر انداز نہ کیا جائے، جو بعثت رحمۃ للعالمین کا اصل منشا ہے یعنی مکارم اخلاق۔ ظاہر ہے کہ روحانیت، اخلاق فاضلہ، ملکات قدسیہ بھی اصلی اور حقیقی مقاصد ہیں اور جملہ علوم وفنون، آلات واسباب کے درجہ میں، اور صرف اسی حیثیت میں وہ مستحق ثواب ہو سکتے ہیں کہ ان کو ذرائع تسلیم کیا جائے، ورنہ وہ ''حجاب اکبر'' ہیں۔

لہٰذا درجہ تکمیل کا سب سے اہم اور سب سے مقدم مقصود تزکیہ نفس، اصلاح اخلاق اور روحانی تربیت ہونی چاہیے اور اسی نصب العین کو مدنظر رکھ کر اس درجہ کے پورے نظام کی تربیت ہونی ضروری ہے۔ واللہ الموفق وھو المعین۔

(ماہنامہ دارالعلوم جمادی الاولیٰ ۱۳۶۱ھ ص: ۲۱۸ تا ۲۲۸)

جہاں جمعیۃ علماء ہند کا مرکز قائم ہے

(مسجد عبد النبی آئی، ٹی، او)

مولانا سید محمد میاں صاحب

دریا گنج سے گزر کر دہلی دروازہ سے آپ نئی دہلی کی طرف بڑھیں، جب آپ اس چوراہے پر پہنچیں گے، جہاں سے منٹو برج جس پر ریلوے لائن گزر رہی ہے تقریباً ایک فرلانگ رہ جائے گا تو آپ کو اپنے بائیں ہاتھ، مشرق کی طرف بہت اونچے ٹیلے پر ایک پرانی عظیم الشان مسجد اور اس پر بہت بڑا گنبد نظر آئے گا۔ یہ چند سال پہلے ایک کھنڈر کی شکل اختیار کر گئی تھی مگر آج وہ ایک آباد اور بارونق مسجد اور اسی کے ساتھ ملک کی سب سے بڑی مسلم تنظیم کا مرکز ہے، جو مسجد کے شمال وجنوب اور مشرق کی جانب اٹھارہ کمروں میں واقع ہے۔

اگر آپ سڑکوں کے نام سے واقف ہیں تو مختصر تعارف یہ ہے کہ جس سڑک پر آپ کھڑے ہیں یہ متھرا روڈ ہے اور اس کو کاٹتی ہوئی (کراس کرتی ہوئی) سینٹرل ریونیو روڈ گزر رہی ہے، انہیں گوشوں میں جہاں سینٹرل ریونیو روڈ کو متھرا روڈ کراس کر رہی ہے ایک طرف انکم ٹیکس کا بڑا دفتر ''سینٹرل رینیو آفس'' ہے، اس کے بالمقابل شمال کی جانب مسجد عبد النبی ہے جو کیکر کی جھاڑیوں میں گھری ہوئی ہے، جہاں ایک بہت بڑا بورڈ بھی لگا دیا گیا ہے جس پر لکھا ہوا ہے ''مسجد عبد النبی (زیر اہتمام جمعیۃ علماء ہند)'' خان بہادر بشیر احمد صاحب دہلوی نے اپنی مشہور تصنیف واقعات دار الحکومت میں اس کا محل وقوع ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

''مہابت خان کی ریتی میں دہلی متھرا کی سڑک کے مشرقی رخ پر جیل خانے سے بجانب جنوب تھوڑی دور پر شیخ عبد النبی صاحب نعمانی کی ایک مسجد بہت شکستہ حالت میں ہے۔''

اسی کتاب میں دوسرے موقع پر اس کا محل وقوع ان الفاظ میں بیان کیا ہے: ''یہ مسجد فیروز شاہ کے کوٹلہ کے آگے نظام الدین جاتے ہوئے بالکل سڑک کے کنارے الٹے ہاتھ کی طرف ایک بلند ٹیلے پر بنی ہوئی ہے۔''

مولانا عبدالنبی جو اس مسجد کے بانی ہیں، سلسلہ چشتیہ صابریہ کے رکن اعظم سیدنا حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے پوتے ہیں۔ والد صاحب کا اسم گرامی شیخ احمد تھا، جو اپنے والد ماجد کے نقش قدم پر صاحب معرفت شیخ طریقت اور بلند پایہ عالم و فاضل تھے۔ آپ کی خصوصیت یہ تھی کہ اپنے والد ماجد حضرت شیخ عبدالقدوسؒ کو تراویح میں قرآن شریف آپ ہی سناتے تھے، روزانہ تین پاروں کا معمول تھا اور شب قدر میں پورا قرآن شریف، اس طرح رمضان شریف میں چار قرآن شریف سناتے تھے۔

شیخ عبدالنبی جلیل القدر عالم، صاحب تصانیف فاضل تھے۔ ہندوستان میں تکمیل علوم کے بعد آپ حجاز شریف تشریف لے گئے، شیخ شہاب الدین احمد ابن حجر مکی اور حرمین شریفین کے دوسرے اساتذہ حدیث اور مشائخ طریقت کی مجلسوں میں حاضر ہوئے، ان سے فیوض و برکات اور احادیث مقدسہ کی سندیں حاصل کیں، ہندوستان پہنچ کر علمی خدمات انجام دیں جن سے آپ کی شہرت عام ہوگئی۔

اپنے والد ماجد اور جد امجد کے مسلک سے آپ کسی قدر ہٹے یعنی والد صاحب اور دادا صاحب نے بادشاہوں کی تقریب سے گریز کیا تھا حتیٰ کی دادا صاحب (حضرت شیخ عبد القدوس گنگوہیؒ) کچھ عرصہ بابر بادشاہ کی فوج میں زیر حراست بھی رہے تھے مگر شیخ عبدالنبی کو جب اکبر بادشاہ نے منصب صدر الصدوری پیش کیا تو آپ نے یہ منصب قبول کرلیا لیکن شاہی تقرب اور یہ جلیل القدر منصب اتباع شریعت کے جذبۂ راسخ میں کوئی کمی نہیں کرسکا، بلکہ جب تک آپ کا اثر ورسوخ رہا اکبر بادشاہ بھی پابند شریعت اور یہاں تک کہ صوم صلوٰۃ کا پابند رہا کہ بسا اوقات اذان بھی خود ہی دیتا تھا۔

اکبر کا دار الحکومت اکبر آباد (آگرہ) رہا، آگرہ کے عظیم الشان قلعہ میں کوئی مسجد

نہیں تھی، نماز کے وقت دربارشاہی میں صفیں بچھتیں اور نماز باجماعت ادا ہوتی تھیں۔ صفیں بچھانے میں خود بادشاہ ''جلال الدین اکبر'' بھی شریک رہتا تھا، شیخ عبدالنبی امامت کرتے تھے اور بادشاہ سے کوئی بات خلاف دیکھتے تو فوراً تنبیہ کرتے تھے۔ تاریخ کی کتابوں میں درج ہے کہ ایک مرتبہ شیخ کے ہاتھ کا عصا بادشاہ کے سر پر لگ گیا، بادشاہ نے اپنی ماں سے شکایت کی تو ماں نے بادشاہ کو تسکین دی کہ یہ بھی تاریخ کا ایک انوکھا واقعہ ہمیشہ یادگار رہے گا کہ ایک بڑے عالم نے بادشاہ کو مارا تھا اور بادشاہ نے اس کو برداشت کیا تھا۔

یہ تاریخ کا افسوس ناک حادثہ ہے کہ اکبر کی روش بعد میں بدل گئی، حامی دین ہونے کے بجائے ''بانیِ دین'' بننے کا شوق ہوگیا، اس پر مولانا عبدالنبی معتوب ہوئے، پہلے ان کو شہر بدر کیا گیا جس کا خوبصورت عنوان یہ تھا کہ ستر ہزار روپیہ دے کر مکہ معظّمہ بھیج دیا گیا اور یہ ہدایت کردی گئی کہ جب تک اجازت نہ ملے واپس نہ آئیں۔ چند سال بعد وہاں سے خود ہی واپس آگئے، حساب فہمی کے شکنجہ میں کس کر ان کو جیل میں ڈال دیا گیا جہاں ان کی کتاب زندگی کا خاتمہ ہوا۔ ۹۷۱ھ اور ۱۵۶۳ء میں صدرالصدور بنائے گئے، پندرہ سال بعد ۹۸۶ھ ۱۵۷۸ء میں ان کو معزول کر کے مکہ معظّمہ بھیجا گیا، ۹۹۲ھ ۱۵۸۴ء میں ان کی وفات ہوئی۔ (اخبارالاخیار)

جہاں تک اس منصب سے علماء ومشائخ تعلیمی واصلاحی اداروں کی خدمت ہے تو علماء تاریخ کا متفقہ بیان ہے کہ جس قدر خدمت شیخ عبدالنبی نے کی کوئی صدرالصدور اتنی خدمت نہیں کرسکا۔

ملاعبدالقادر بدایونی (متوفی: ۱۰۰۴ھ) اس دور کے مشہور مؤرخ ہیں جو صاف گوئی اور بے لاگ تبصرہ اور تنقید میں اپنی مثال نہیں رکھتے، انہوں نے اپنے ولی نعمت اکبر بادشاہ تک کو معاف نہیں کیا، وہ شیخ عبدالنبی نعمانی کی صدرالصدوری............تک مداح ہیں کہ آپ کی رائے میں اس شان کا صدرالصدور کسی بادشاہ کے زمانے میں کوئی بھی نہیں گزرا ہے۔ آپ کی تحقیق یہ ہے کہ جتنے اوقات شیخ عبدالنبی نے اپنے پندرہ سالہ دورصدرالصدوری

میں کئے اس کا دسواں حصہ بھی اس کے بعد کے زمانے میں نہیں ہوا۔

ملا صاحب شیخ عبد النبی صاحبؒ کے تقویٰ طہارت، تزکیہ نفس اور کثرت عبادت سے بھی متأثر ہیں۔ ملا صاحب کے الفاظ یہ ہیں: بروش محدثین سلوک می نمود، وتقویٰ و طہارت ونزاہت وعبادت ظاہری اشتغال داشت وچوں بمنصب صدارت رسید جہاں جہاں زمین مدد معاش وظائف واوقاف بخلائق بخشید، چنانچہ درزمان، ہیچ بادشاہے ایں چنیں صدر باستقلال نگشتہ وعشرعشیر ایں اوقاف کہ اوداده، نہ داده۔''

درویشوں اور فقراء کے طرز پر نہیں بلکہ علماء محدثین کے مسلک پر آپ عمل کرتے تھے، تقویٰ طہارت، نفس کی پاکیزگی اور شریعت کے بموجب عبادت گزاری آپ کی زندگی کے خاص مشغلے تھے، جب منصب صدارت پر فائز ہوئے تو بے شمار جاگیریں مدد معاش کے طور پر مستحقین کے لیے نامزد کیں، خلق خدا کے وظیفے مقرر کئے اور مدارس اور خانقاہوں کے نام جگہ جگہ جائدادیں وقف کیں، کسی بادشاہ کے زمانے میں خود اپنے عزم اور ہمت حوصلہ سے کام کرنے والا اس شان کا کوئی صدر نہیں ہوا، اور جتنے اوقاف شیخ عبد النبی نے قائم کئے ان کا عشر عشیر (دسواں حصہ) بھی کوئی نہیں کر سکا۔

مسجد عبد النبی کی تعمیر:

مولانا شیخ عبد النبیؒ نے یہ مسجد اپنے دور عروج میں تعمیر کرائی، سنہ تعمیر ۹۸۳ھ (۱۵۷۵ء) ہے جس کو آج ۱۳۸۳ھ میں چار سو برس ہو چکے ہیں۔ ابو الفضل اور فیضی جو دربار اکبری کے مایۂ ناز فضلاء تھے، اگر چہ آخر میں شیخ عبد النبی کے حریف بن گئے تھے لیکن جب یہ مسجد تعمیر ہوئی تو اس وقت ان کا رویہ شیخ عبد النبی کے ساتھ دوستانہ اور نیازمندانہ تھا، چنانچہ جب مسجد تعمیر ہوئی تو علامہ فیضی نے یہ پانچ شعر موزوں کئے جن میں سے چار عربی میں ہیں اور آخری شعر جس میں مادۂ تاریخ ہے، اس کا پہلا مصرع فارسی میں ہے، جو عربی ادب کے لحاظ سے ایک صنعت سمجھی جاتی ہے۔

فی زمان الخلیفة الاکبر ایّد اللہ ذاتہ النفاع

اکبر بادشاہ کے زمانے میں اللہ تعالی اس بادشاہ کی نفع بخش ذات کی تائید فرمائے۔

قد بنی بقعة مقدسة　　　مثلها لا یکون فی الانقطا ع

ایک ایسی مقدس جگہ کی تعمیر کی کہ اس کا نمونہ دوسرے مقامات میں نہیں ہے۔

شیخ الاسلام زائر الحرمین　　　شیخ اهل الحدیث بالاجماع

یہ تعمیر اس نے کرائی جو شیخ الاسلام ہے جو حرمین شریفین کی زیارت کر چکا ہے جو بالاتفاق علماء حدیث کا شیخ ہے۔

شیخ عبد النبی نعمانی　　　معدن العلم منبع النفا ع

جس کا نام نامی شیخ عبدالنبی نعمانی ہے جو علم کی کان (معدن) اور افادت ومنافع کا سر چشمہ ہے۔

سالِ تاریخِ ایں بنا فیضی　　　**فسأل العقل قال خیر بقا ع**

فیضی نے اس کی تاریخ تعمیر (۹۸۳ھ) اپنی عقل سے دریافت کیا تو اس نے ''خیر بقاع'' مادۂ تاریخ تخریج کیا۔

یہ اشعار ایک لوح پر کندہ تھے، یہ لوح ''صدر محراب'' پر نصب تھی اور محترم بشیر الدین احمد صاحب کی روایت یہ ہے کہ مسجد کی جب حالت خستہ اور ابتر ہوگئی تو محکمہ آثار قدیمہ کے افسروں نے اس کو وہاں سے اتروا کر لال قلعہ کے عجائب خانہ میں رکھ لیا، جس جگہ یہ کتبہ نصب تھا اس کا نشان بیچ کی بڑی محراب میں نمایاں ہے جو فوٹو میں بھی نظر آرہا ہے۔

یہ بتانا بہت مشکل ہے کہ اکبر کے زمانہ میں جب یہ مسجد تعمیر ہوئی تو دہلی کا نقشہ کیا تھا، البتہ یہ ظاہر ہے کہ موجودہ دہلی جو شاہ جہاں بادشاہؒ کی بسائی ہوئی ہے جس کا نام شاہ جہاں آباد ہے، اس وقت نہیں تھی۔

دہلی اکبر کے زمانہ میں بھی میلوں میں پھیلی ہوئی تھی۔ مہرولی بستی نظام الدین، کوٹلہ فیروز شاہ، مسجد کلاں (کالی مسجد) خواجہ باقی باللہ جن کے لیے کم وبیش بیس میل کی مسافت طے کرنی پڑتی ہے، یہ سب دہلی کے حصے تھے۔ دہلی کے یہ حصے اور اس طرح کے

بہت سے حصے جدا جدا پاکٹوں میں تقسیم تھے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ہر پاکٹ کے گرد حصار (چہار دیواری) بھی تھی۔

یہ علاقہ جہاں مسجد عبدالنبی تعمیر کی گئی جو کوٹلہ فیروز شاہ سے تقریباً چار فرلانگ پر جنوب کی جانب ہے، ایک آباد حصہ تھا، مشرق کی جانب جمنا تھی اور آبادی کا زور جانب غرب تھا، اسی علاقہ میں کوٹلہ فیروز شاہ سے مغرب کی جانب تقریباً ایک میل کے فاصلہ پر مہندیوں کا قبرستان ہے، جہاں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب اور ان کے نامور فرزندان رشید اور مجاہد ملت حضرت مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب کے مزارات ہیں (رحمہم اللہ) سیدنا حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی اور ان کے والد ماجد مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب اور عم بزرگوار مولانا شاہ ابورضا محمد رحمہم اللہ جیسے اکابر اولیاء اللہ کے مکانات بھی اسی علاقہ میں تھے جو مسجد عبدالنبی سے غرب کی جانب مہندیوں کے قریب ہے۔

مسجد عبدالنبی کی تعمیر سے تقریباً ۵۵ سال بعد جب ۱۰۳۸ھ میں شاہ جہاں بادشاہ نے نواب مہابت خاں کو دہلی کا صوبہ دار بنایا تو اس نے اسی مسجد کی بائیں جانب یعنی جنوب کی جانب تھوڑا سا راستہ چھوڑ کر ایک عظیم الشان حویلی تعمیر کی جس کا پھاٹک شمال رویہ مسجد کے سامنے تھا، مشرق کی جانب جمنا تھی اور جانب غرب یہ سڑک تھی جو اب متھرا روڈ کہلاتی ہے۔ یعنی اس حویلی کا محل وقوع ٹھیک وہ تھا جہاں اب سینٹرل ریونیو آفس (انکم ٹیکس کا بڑا دفتر) اور اس کے عقب میں ڈاکٹر سین کا نرسنگ ہوم ہے۔

۵۰ برس پہلے ۱۳۳۷ھ اور ۱۹۱۹ء تک اس محل کا کھنڈر باقی تھا جس کا تذکرہ بشیر الدین احمد صاحب نے ''واقعات دارالحکومت'' میں کیا ہے۔ مسجد عبدالنبی کے بانی صدر الصدور تھے اور جب دہلی کے گورنر مہابت خاں (متوفی ۱۰۴۴ھ) جو نائب السلطنت کی حیثیت سے دہلی میں رہتا تھا جب اس کی قلعہ نما حویلی اس کے بالکل دامن میں بنی تو ظاہر ہے تو مسجد کی شان اور اس کی شہرت کو چار چاند لگ گئے اور اس کی رونق دوبالا ہوگئی۔

حویلی مہابت خاں کی تعمیر کے زمانہ ہی میں شاہ جہاں آباد یعنی موجودہ دہلی کی (جو

اب پرانی دہلی کہلاتی ہے) تعمیر شروع ہوگئی تھی اور جب ۱۰۴۸ھ میں شاہ جہاں آباد اور قلعہ مبارک (لال قلعہ) کی تعمیر مکمل ہوئی تو بیرونی علاقہ کی رونق گھٹنے لگی، کیوں کہ اراکین دولت کے علاوہ امراء اور رؤوساء بھی منتقل ہوکر یہیں آباد ہونے لگے۔

تقریباً سو سال بعد وہ وقت آتا ہے کہ ہندوستانی علماء کے استاذ الاساتذہ سیدنا حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ (جن کا خاندان اسی علاقہ میں مقیم تھا) مکہ معظّمہ سے واپس ہوکر درس حدیث کا سلسلہ شروع فرماتے ہیں، اس وقت یہ علاقہ دینی عظمت کا مرکز اور علوم نبویہ کا سرچشمہ بن جاتا ہے۔

لیکن بدقسمتی سے یہی وہ زمانہ ہے کہ سیاسی ہلچل نے پورے ہندوستان کو تہ و بالا کر رکھا ہے، دہلی میں آئے دن بادشاہتیں بدلتی رہتی ہیں اس پر طرہ یہ کہ دار السلطنت بیرونی حملوں کا آماجگاہ بنا ہوا ہے، کبھی نادر شاہ قتل کرا رہا ہے کبھی جاٹوں کے حملے ہو رہے ہیں، کبھی مرہٹوں کے ہاتھ لال قلعہ کے چھتوں تک پہنچ رہے ہیں اور کبھی چاندی کی چادریں نوچ رہے ہیں۔

محمد شاہ بادشاہ کا دور حکومت نسبتاً سکون کا زمانہ ہے، وہ اہل علم کا قدر دان بھی ہے، وہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے جانشین حضرت شاہ عبد العزیز صاحب کو نئی دہلی سے شاہجہاں آباد منتقل کرتا ہے، ان کے دار العلوم کے لیے جگہ دیتا ہے۔

خاندان ولی اللّٰہی کا یہاں سے منتقل ہونا اس وقت کی ایک ضرورت اور علمی دنیا کے لیے سعادت تھی لیکن جہاں تک اس علاقہ کا تعلق ہے تو یہ خاندان کیا منتقل ہوا، اس علاقہ کی جان نکل گئی۔ رفتہ رفتہ اس کی آبادی ختم ہوگئی اور پورا علاقہ جنگل بیابان بن گیا، علاقہ کی بربادی کے ساتھ مسجد عبد النبی بھی ویران ہوگئی۔

اس موقع پر ۱۸۵۷ء کی یاد تازہ ہوتی ہے، مسجد عبد النبی اور شہر پناہ کے بیچ میں وہ خونی دروازہ ہے جہاں کرنل ہڈسن نے شہزادوں کو گولی مار کر ان کے خون سے انتقام کی آگ بجھائی تھی۔ اس نے ہمایوں کے مقبرہ سے ان کو گرفتار کیا تھا اور مصنف قیصر التواریخ کی

روایت کے مطابق شہزادے رتھ پر سوار اور سواروں کے حلقہ میں چلے آرہے تھے، جیل خانے کے قریب پہنچے تو ہڈسن نے سامنے بلوا کر کپڑے اتروائے پھر اپنے ہاتھ سے تین تین گولیاں مقام قلب پر ماریں اور شہ رگ کو سنگین سے چیر دیا۔ جیل خانہ کی جگہ تو اب مولانا آزاد کالج بن گیا، البتہ وہ پھاٹک باقی ہے جس کو خونی دروازہ کہا جاتا ہے۔

۱۸۵۷ء کے بعد تقریباً دو سال ایسے گزرے کہ دہلی میں مسلمانوں کا وجود بہت کم رہ گیا تھا، پھر رفتہ رفتہ آبادی شروع ہوئی یہاں تک کہ ان کی تعداد ۱۹۴۰ء میں دہلی میں ۳۴ فیصد ہوگئی، مگر یہ علاقہ پھر بھی غیر آباد رہا۔ مہابت خان کے محل کے قریب جمنا کے کنارے ایک میدان تھا جس کو مہابت خان کی ریتی کہا جاتا تھا، گرمیوں کے موسم میں اس سے تو یہ کام لیا جاتا تھا کہ بقول بشیر الدین صاحب: غدر سے پہلے اور کچھ بعد بھی اس ریتی میں شہزادے اور شہر کے رئیس ہر جمعہ کو پتنگ بازی کیا کرتے تھے۔''

مگر عبد النبی کی جو حالت تھی اس کا نقشہ محترم بشیر الدین صاحب نے اپنی تصنیف ''واقعات دار الحکومت دہلی'' حصہ دوم میں (جو تقریباً پچاس سال پہلے ۱۳۳۷ء ۱۹۱۹ء میں شائع ہوئی تھی) ان الفاظ میں کھینچا ہے: ''جو حصہ عمارت کا باقی ہے سالہا سال کی کائی جم کر کالا اور ہیبت ناک ہوگیا ہے، گویا مسجد نے ایک ماتمی لباس پہن لیا ہے جس کی وجہ سے ایک ڈراؤنی شکل پیدا ہوگئی ہے، یوں سمجھئے کہ ایک بنی سنوری دلہن کا لباس زیور سب لوٹ گھسوٹ لیا گیا اور ننگی بچی جنگل و بیابان اور ایک لق ودق میدان میں کھڑی ہے، ایسی بھیانک صورت دیکھ کر ڈر لگنا چاہیے مگر جب اس کے بچے کھچے روپ میں پچھلے بناؤ سنگھار کو دیکھ کر ہم اپنے خیال کو وسعت دیتے ہیں اور کوئی چار سو برس پہلے کا خیالی نقرہ ذہن میں جمانے کی کوشش کرتے ہیں تو ہمارا خوف و ہراس اور وحشت دلچسپی اور شوق دید سے بڑھ جاتا ہے۔'' (صفحہ ۶۲۰ ج ۲)

موجودہ حالت:

جس علاقہ کو بشیر الدین صاحب نے جنگل بیابان اور لق ودق بتایا تھا یہ عجیب

انقلاب ہے کہ ابھی پچاس سال پورے نہیں ہوئے ہیں کہ یہی جنگل بیابان اور یہی لق ودق میدان شہر دہلی کا ایک بہت ہی اہم حصہ بن گیا ہے۔حکومت کا سکریٹریٹ یا حکومت کے فوجی دفاتر بیشک یہاں نہیں ہیں،لیکن تہذیبی اور کل ہند بلکہ بین الاقوامی تعلقات کے لحاظ سے جو اہمیت اس کو حاصل ہے دہلی کے کسی دوسرے حصہ کو یہ اہمیت نصیب نہیں ہے۔ جہاں تک آمد ورفت کا تعلق ہے تو محترم بشیر الدین صاحب کے زمانہ کے جنگل بیابان اور لق ودق میدان کی حالت اب یہ ہے آپ صبح سے رات کے گیارہ بجے تک کسی وقت بھی مسجد کی پشت کی جانب متھرا روڈ پر نظر ڈالیں تو کاروں ،ٹیکسیوں ،بسوں ،اسکوٹروں کی دورویہ لائنیں نظر آئیں گی جو اتنی تیزی سے دوڑ رہی ہوں گی کہ اجنبی آدمی کو دھوکہ ہوسکتا ہے کہ کہیں کوئی ہنگامہ ہوگیا ہے یا کوئی عجیب وغریب تماشہ ہورہا ہے کہ ساری دہلی دوڑی جارہی ہے،وجہ یہ ہے کہ پرانی اور نئی دہلی اور پرانی اور نئی سکریٹریٹ کو ملانے والی خاص سڑک یہی ہے۔

اس سڑک کے دوسری جانب مسجد کے بالکل پیچھے سائنسی تحقیقات کا مرکزی ادارہ دیال اسکول نیز غیر ممالک کے ڈاکخانہ اور بہت سی عظیم الشان بلڈگوں کا سلسلہ مولانا آزاد میڈیکل کالج کی فلک بوس عمارتوں تک پہنچتا ہے،جن کی پشت پر جانب غرب مہندیوں کا قبرستان ہے، جہاں خاندان ولی اللہی کی سکونت کی نشاندہی کی گئی ہے ۔میڈیکل کالج کی عمارتیں ارون ہسپتال کے قریب تک پہنچ گئی ہیں جو کئی میل مربع کے رقبہ میں پھیلا ہوا ہے۔

مسجد عبد النبی سے شمال کی جانب تقریبا چھ فرلانگ لمبا علاقہ اخبارات کے لیے مخصوص کردیا گیا ہے،انگریزی اور اردو اخبارات کے دفتر کی کچھ عمارتیں تعمیر ہوچکی ہیں کچھ زیر تعمیر ہیں۔یہی علاقہ پریسوں (مطابع) کے لیے بھی مخصوص کردیا گیا ہے۔مسجد عبد النبی سے مشرق کی جانب بلکہ مسجد کی سیدھ میں آزاد بھون کی وہ عجیب وغریب عمارت ہے جو مولانا آزادؒ کی یادگار کے طور پر بنائی گئی ہے،جس میں عربی رسالہ **ثقافة الهند** اور انڈین کونسل آف ریلیشنز (بین الاقوامی تہذیبی تعلقات کی ہندوستانی انجمن) کا دفتر ہے۔مسجد عبد النبی سے جنوب کی جانب انکم ٹیکس کا عظیم الشان مرکزی دفتر ہے، پھر ڈاکٹر سین کا نرسنگ ہوم

پھر کچھ فاصلہ پر سپریم کورٹ کی عظیم الشان عمارت ہے، جس کے دفاتر تقریباً چار فرلانگ لمبے احاطے میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اس کے بالمقابل نمائش گاہ ہے جس کی عمارتوں کا تقریباً دو میل لمبا سلسلہ پرانے قلعہ تک چلا گیا ہے۔

منٹو برج جو مسجد سے جنوب کی جانب ہے جس کے اوپر سے ریلوے لائن گزر رہی ہے، معلوم ہوا ہے کہ وہاں ریلوے کا ایک اسٹیشن عنقریب تعمیر ہوگا۔

مطلب یہ ہے کہ جس لحاظ سے بھی آپ دیکھیں اس علاقہ کو مرکزیت حاصل ہے۔ انکم ٹیکس، سپریم کورٹ، نمائش گاہ، میڈیکل کالج، اخبارات، ان سب سے مسلمانوں کا تعلق رہتا ہے اور اس تعلق کی وجہ سے سیکڑوں ہزاروں کا مسلمانوں کا یہاں روزانہ گزر ہوتا ہے۔ آزاد بھون جہاں سے عربی رسالہ ''ثقافة الهند'' نکلتا ہے، اسلامی دنیا کے مسلمان وہاں آتے رہتے ہیں، تاریخ اور تہذیب وکلچر سے متعلق بہت سے اجتماعات آزاد بھون میں ہوتے رہتے ہیں جن میں بیشتر عربی ممالک افغانستان وایران کے نمائندے شریک ہوتے رہتے ہیں۔

اور عظمت کے لحاظ سے چالیس پچاس میل لمبی دہلی میں بہت اونچا مقام رکھتا ہے، میر انگ دھڑنگ وجود سر اٹھائے کھڑا ہے اور سب طرف دیکھ رہا ہے۔ خدا کا شکر ہے میرے اشارے کو جمعیۃ علماء ہند نے سمجھا، آثار قدیمہ سے میری مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ کی کوشش تو یہ تھی مسجد کی شمالی جانب کا پلاٹ جو اسی ٹیلہ پر ہے جس کی سطح مسجد کے برابر ہے جو ۱۸۸۶ء کے کاغذات پٹواری وغیرہ کے لحاظ سے مسجد ہی کا ہے مسجد کے ساتھ یہ پلاٹ بھی ملے۔ کئی سال تک یہ کوشش جاری رہی اور جب یہ معلوم ہوا کہ اس کوشش کے کامیاب ہونے میں ابھی بہت مدت لگے گی اور بہت سے مرحلے طے کرنے پڑیں گے تو حضرت مجاہد ملتؒ کی زندگی میں طے کرلیا گیا تھا سر دست مسجد کو لے لیا جائے اور اس کو آباد کرنے کی کوشش کی جائے، اس کے حصول میں آثار قدیمہ اور سائنسی تحقیقات کے وزیر مرحوم مسٹر ہمایوں کبیر کی کوششوں کا بڑا دخل ہے۔

موسیو لیبان، جو دنیا بھر کا مانا ہوا مصنف اور حقیقت پسند مؤرخ ہے، مسلمانوں کی مساجد کے متعلق اس کی شہادت یہ ہے: ''اکثر قدیم مساجد سے متصل ایک میدان ہوتا ہے جس کے گرد مسافروں کے اترنے کے حجرے، اونٹوں اور گھوڑوں کے باندھنے کے طویلے، جانوروں کو پانی پلانے کے حوض اور حمام ہوا کرتے ہیں۔ قدیم مساجد نہ صرف عبادت گاہیں تھیں بلکہ مسافروں کے اترنے کی سرائیں بھی تھیں۔ (تمدن عرب ۲۴۵)

محکمہ آثار قدیمہ نے اس مسجد کو ایک رجسٹری شدہ معاہدہ کے ذریعہ جمعیۃ علماء ہند کے حوالہ کیا ہے، اس معاہدہ کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ مسجد کا انتظام ایک کمیٹی کے حوالہ ہوگا جس کا ایک ممبر محکمہ آثار قدیمہ کا کوئی افسر بھی ہوگا۔ چنانچہ جمعیۃ علماء ہند نے اس مسجد کے جملہ انتظامات کے لیے ایک کمیٹی بنادی ہے جس کے ارکان یہ ہیں (۱) مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب (ورکنگ صدر جمعیۃ علماء ہند، چیئر مین منتظمہ کمیٹی) (۲) میر مشتاق احمد صاحب صدر دلی پردیش کانگریس کمیٹی (۳) حاجی محمد فاروق صاحب (آئل کلاتھ مرچنٹ بلیماران) (۴) شیخ جمیل الرحمٰن صاحب چشمہ والے (چاندنی چوک دہلی) (۵) حاجی شیخ سلطان احمد صاحب خلف جناب حاجی شیخ اقبال احمد صاحب انڈے والے (جامع مسجد دہلی) (۶) حافظ عبدالعزیز صاحب سرائے خلیل دہلی (۷) مولانا وحیدالدین صاحب قاسمی ناظم جمعیۃ علماء ہند (۸) محمد میاں راقم الحروف (۹) اور محکمہ آثار قدیمہ کے نمائندہ کی حیثیت سے نویں ممبر وائی ڈی شرما۔

(ہفت روزہ الجمعیۃ، ص:۱۲۔ مورخہ: ۱۲/مئی ۱۹۷۲ء مطابق ۲۷/ربیع الاول ۱۳۹۲ھ جمعہ)

☆☆☆☆☆

دو طاقتیں
استقلال اور تعلق باللہ

از مولانا محمد میاں صاحب مدرسہ امینیہ دہلی

نصب العین معین کیجئے، اس پر مضبوطی سے جم جایئے، جو مصیبت آئے اس کو ہمت اور حوصلہ سے برداشت کیجئے۔ پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹ جائے مگر آپ کے پائے استقلال میں جنبش نہ آئے، قرآن حکیم کی زبان میں اس کا نام ''صبر'' ہے۔

گاندھی جی کو چودہویں صدی ہجری اور بیسویں صدی عیسوی میں احساس ہوا کہ ''ستیہ گرہ'' ایک طاقت ہے، مگر قرآن حکیم اس سے صدہا برس پہلے ''صبر'' کو ایک طاقت قرار دے چکا ہے۔

دوسری طاقت:

اللہ سے رشتہ جوڑنا اور تعلق باللہ کو مضبوط کرنا، جس کا ذریعہ ہے نماز، نمازی اپنے رب سے مناجات کرتا ہے۔ نماز جس طرح انسان کا رشتہ خدا سے جوڑتی ہے وہ مسلمان کو مسلمان سے قریب بھی کرتی ہے، ان میں ہم آہنگی اور یک جہتی پیدا کرتی ہے، اخوت و مساوات کا تماشہ دنیا کو دکھاتی ہے ؎

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز ۔۔۔ نہ کوئی بندہ رہا نہ کوئی بندہ نواز

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اے ایمان والو! مدد لو صبر سے اور نماز سے، بے شک اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ (سورہ بقرہ: ۱۵۳)

مگر شرط یہ ہے کہ آپ کا نصب العین معین ہو۔ آپ کا نصب العین ہے حق کی

حمایت، مظلوموں کی امداد، جہالت دور کرنا، پس ماندہ اور پچھڑے ہوؤں کو جن کو ذلیل اور ناپاک سمجھا جاتا ہے، ان کو آگے بڑھانا، ان میں عملی ذوق پیدا کرنا، خداپرستی اور اعلیٰ اخلاق کا سبق خود بھی پڑھنا اور معلم خیر بن کر دوسروں کو بھی پڑھانا، ہر ایک سے انصاف کا معاملہ کرنا۔ جو سب سے کٹھن خدمت انجام دیتے ہیں، تمہارے گھروں کو، گلی کوچوں کو صاف کرتے ہیں، تم ان کو ذلیل و ناپاک سمجھتے ہو، کیا یہ انصاف ہے؟

مسلمانو! ایسے ہو جاؤ کہ خدا کی سچائی کے لئے مضبوطی سے قائم رہنے والے اور انصاف کے لئے گواہی دینے والے رہو۔(سورہ مائدہ:۸)

(مراسلہ: صدق جدید لکھنؤ ۵/جولائی ۱۹۶۸ء ص:۷)

مکتوب بہ سلسلہ نصابِ مدارس

حضرت مولانا محمد میاں صاحبؒ کا ایک اہم مکتوب
مولانا فضل محمد (ضلع فقیر والی) کے ایک سوال کے جواب میں

حضرت مہتمم صاحب دامت برکاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج گرامی !

کئی روز ہوئے گرامی نامہ صادر ہوا تھا، احقر اپنی کاہلی یا مشغولیت کے باعث جواب نہیں دے سکا، اس تاخیر کو معاف فرمادیں۔

فسادات کی بناء پر اپنے احباب، بزرگوں اور رُفقاءِ کرام کی طرف سے تشویش رہتی ہے، خدا کرے آپ سب حضرات بہمہ وجوہ بعافیت ہوں۔

آپ معاف فرمادیں آپ کو غلط فہمی ہوئی، احقر نصاب کے بارے میں مبصر کبھی بھی نہیں تھا۔ اب تو چند سال سے جیل خانہ میں گوشہ نشینی کی زندگی بسر کی اور باہر آیا تو دفتر مرکزیہ جمعیۃ علماء ہند میں محرری کی خدمت انجام دے رہا ہوں، جو لفظ ''نظامت'' کی ''عملی حقیقت'' ہے۔ ایسی حالت میں احقر کا کچھ لکھنا نابلد کی تحریر ہوگی مگر ارشادِ گرامی کی تعمیل بھی ضروری معلوم ہوتی ہے، لہٰذا سب سے پہلے احقر یہ واضح کردینا ضروری سمجھتا ہے کہ تبدیلِ نصاب کے بارے میں احقر کچھ زیادہ روشن خیال نہیں واقع ہوا، بلکہ بڑی حد تک احقر مقلد ہے۔ موجودہ نصاب میں جو کچھ تبدیلی کی ضرورت معلوم ہوتی ہے اور جسے احقر ضروری سمجھتا ہے مگر وہ تبدیلی صرف جزوی ترمیم ہے تنسیخ نہیں۔

پرائمری اور ابتدائی درجات میں تو احقر کی یہ خواہش ہے کہ ان کا نقشہ وہی ہو جو سرکاری پرائمری سکولوں کا ہوتا ہے، البتہ اس میں مذہبیات کا اضافہ آپ کر دیں مگر وہ نہایت سہل ہو کہ بچے بآسانی اس کو برداشت کرلیں، اس طرح کسی مسلمان کو اس کا موقع نہ رہے گا کہ وہ آپ کے مدرسہ میں اپنے بچے کو نہ بھیجے۔

وہ پرائمری تعلیم جو پرائمری اسکول میں دی جاتی ہے آپ کے ہاں بھی دی جائے گی، اس پر قرآنِ حکیم اور دینیات کا اضافہ ہو جائے گا، گورنمنٹ بھی آپ کے بچے کو جبری تعلیم سے مستثنیٰ کر سکتی ہے اور آپ کے یہاں پڑھنے والے بچے مقدمات کی دست برد سے محفوظ رہیں گے لیکن درجاتِ حفظ بالکل علیحدہ ہوں اور تا اختتامِ حفظ بچے کے دماغ کو منتشر نہ کیا جائے۔

ابتدائی تعلیم کے بعد بچے کو فارسی یا عربی کی طرف متوجہ کرایا جائے۔

ایک خیال یہ ہے کہ فارسی صرف زبان کی تعلیم بیکار ہے۔

عربی کی ابتدائی کتابیں اُردو میں ہونی چاہئیں۔

فارسی صرف ان کو پڑھائی جائے جو اِس زبان کو حاصل کرنا چاہیں، مطلب یہ ہے کہ فارسی زبان عربی کا ذریعہ تعلیم نہ رہے بلکہ انگریزی زبان کی طرح علیحدہ زبان قرار دیا جائے اور صرف اُن کو پڑھائی جائے جو اِس کو زبان کو سیکھنا چاہتے ہیں۔

عربی زبان کے لیے اُردو زبان کو ذریعہ تعلیم بنایا جائے؟ یہ خیال درست ہے ! مگر احقر کے خیال میں اب تک جو کتابیں اُردو میں لکھی گئی ہیں اُن سے عربی تعلیم میں اور طوالت ہو جاتی ہے، لہٰذا اگر علم الصیغہ اور نحو میر کا ترجمہ اُردو میں ہو جائے تو احقر کے خیال میں وہ بہتر اور مختصر رہے گا۔

عربی درجات کے نصاب میں اس قدر ترمیم تو ضروری ہے کہ ''منطق اور فلسفہ جو علومِ الٰہیہ'' ہیں متون پڑھا کر نفسِ مسئلہ کی تعلیم اور اس کی تمرین پر زور دیا جائے، شروح کی طوالت کو حذف کر دیا جائے، البتہ متون میں بعض مناسب اضافہ کر دیا جائے، مثلاً معانی

میں مختصر المعانی حذف کر کے تلخیص المفتاح کے بعد معانی کی کوئی اور کتاب پڑھائی جائے۔
(اس کے متعلق مولانا عبدالحق صاحب مدنی (مدیر جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مراد آباد) سے استصواب کیا جائے۔

''نحو''اور''ادب'' کی تعلیم کا طرز کیا ہو، پہلے ادب ہو یا پہلے نحو وصرف؟ اس مسئلہ میں آپ مولانا معراج الحق صاحب اُستاذ (وصدرالمدرسین) دارالعلوم دیوبند ضلع سہارنپور سے مشورہ فرمایئے۔

''فنونِ آلیہ'' کے سلسلہ میں ''جغرافیہ اور تاریخ'' کا اضافہ ازبس ضروری ہے، کچھ کتب تاریخ وجغرافیہ کا اُن کو مطالعہ کرایا جائے، مطالعہ کی بہتر صورت یہ ہے کہ چند طلبہ کی چھوٹی سی جماعت بنا کر ہدایت کی جائے کہ ایک صاحب کتاب پڑھیں دوسرے سنتے رہیں، اس طرح کتابوں کا مطالعہ کرایا جائے اور ہر کتاب کے ختم پر اُس کا امتحان لے کر دوسری کتاب کے مطالعہ کی فرمائش کی جائے۔

رسول کریم، قصص القرآن، سیرۃ النبی، الفاروق، شاندار ماضی وغیرہ کا مطالعہ اسی طرح کرایا جائے۔

علومِ مقصودہ کے نصاب میں جو کتابیں ہیں اُن میں کمی کی شکایت ہے یعنی ضرورت سے بہت کم ہیں، زیادتی کی شکایت نہیں، لہٰذا احقر کے خیال میں کم کرنے کا سوال نہیں پیدا ہوتا صرف یہ کہ''کنزالدقائق اور شرح وقایہ'' کے بجائے''شرح نقایہ'' مکمل طور پر پڑھائی جائے۔

''الفوز الکبیر اور نخبۃ الفکر'' کی تعلیم لازمی ہے اور''الاتقان فی علوم القرآن'' کے بھی کچھ حصے داخل درس ہونے چاہئیں۔ خیر الاصول کے مطالعہ کا احقر کو شرف حاصل نہیں ہوا۔

''درستی اخلاق'' کے بارے میں احقر کا خیال ہوا کرتا ہے کہ طلبہ کی مختلف جماعتیں کر کے ایک ایک جماعت کو ایک ایک اُستاد کے حوالہ کر دیا جائے جو چوبیس گھنٹے ان کی نگرانی

رکھے۔ باہمی اختلاط و مربیانہ معاشرت سے ان کی تربیت کرتا رہے، ایسے مدرس اگر میسر آجائیں تو ان کی تلاش کرنی ضروری ہے اور ان کی تنخواہوں میں بخل اور بے جا کفایت شعاری سے کام نہ لیا جائے۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب قدس سرہ العزیز کی کتابوں اور اس قسم کی درسی کتابوں کے متعلق احقر کی رائے تو یہ ہے کہ ان کے لیے مستقل درجات تکمیل ہوں جن میں انگریزی، ہندی وغیرہ کی تعلیم بھی ہو اور تبلیغ وغیرہ کی عملی مشق بھی ہو، زمانہ درس میں تبلیغ کی عملی مشق مناسب نہیں۔

احقر نمبر ۷ کا ضمناً اور صراحۃً جواب دے چکا ہے اگر موقع مل سکا تو ''اربعین'' مصنفہ حضرت مولانا سیّد فخر الدین احمد صاحب اور رسالہ ''ہمارے پیغمبر'' کے نمونے احقر بھیجے گا، اگر مناسب سمجھیں تو ابتدائی تعلیم کے سلسلۂ دینیات میں داخل فرمالیں۔

والسلام

محمد میاں

مؤرخہ ۲۳؍ جمادی الاولی ۱۳۶۶ھ/ مطابق ۱۷؍اپریل ۱۹۴۷ء

☆☆☆☆☆

مکتوب بنام مولانا عبدالحق حقانیؒ پشاور

دفتر جمعیۃ علماء صوبہ آگرہ مراد آباد
مورخہ ۲۲؍ ربیع الثانی ۱۳۶۴ھ ۶؍ اپریل ۱۹۴۵ء یوم جمعہ

محترم المقام جناب مولانا عبدالحق صاحب زاد مجدکم
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

انتخاب امیر کے اہم ترین اور مبارک مقصد کے لیے علماء ومشائخ وعمائدین صوبہ یوپی کا نہایت ضروری اور اہم اجتماع بتاریخ ۲۰؍ جمادی الاولی ۱۳۶۴ھ مطابق ۳؍ مئی ۱۹۴۵ء بروز پنجشنبہ بمقام سہارنپور ہوگا۔ ہم خدام نہایت خلوص اور نیازمندانہ التجا کے ساتھ جناب والا کو اس اجتماع کی شرکت کے لیے دعوت دے رہے ہیں، یقین ہے کہ یہ مخلصانہ التجا قبول ہوگی۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ انتخاب امیر کے متعلق مختصر طور پر شرعی حیثیت سے اپنے خیالات ونظریات کو ظاہر کردیا جائے تاکہ کسی قسم کی کوئی غلط فہمی باقی نہ رہے اور شکوک واوہام کا ازالہ ہوجائے۔ جناب والا! اس مسئلہ کی اہمیت اور ضرورت بظاہر محتاج بیان نہیں کہ جب مسلمانوں کے بلاد پر کفاروں کا استیلاء وغلبہ ہوجائے تو مسلمانوں پر واجب ہے کہ اپنے نظام شرعی کے قیام وبقاء کے لیے مسلم والی (۱) منتخب کرلیں۔

سلطنت مغلیہ کے زوال یعنی تقریباً ڈیڑھ سو برس سے مسلمانان ہند پر فرض عائد ہوگیا ہے (۲)۔ سیدنا حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب قدس اللہ سرہ العزیز اور ان کے جانشینوں نے اس اہم ترین فریضہ کی طرف توجہ فرمائی اور تعمیل فرمان شریعت کا حق ادا کردیا مگر افسوس ان بزرگوں کے بعد غفلت، تساہل، باہمی مخالفت یا عدم مساعدت اسباب (۳)

کے باعث تقریباً ۸۰ سال پیشتر سے مسلمانان ہند نے اس عظیم الشان فریضہ کی اہمیت کو نظر انداز کردیا جس کا لازمی نتیجہ وہی ہوا جو ہونا تھا۔

کیا آج مسلمانان ہند کی اجتماعی زندگی باہمہ زہد وتقویٰ حقیقتاً ایک غیر شرعی زندگی نہیں ہے؟ ہم نے شخصی اور اجتماعی زندگی کے باہمی امتیاز اور ان کے احکام کی طرف کبھی توجہ نہیں کی نہ اجتماعی زندگی کی اہمیت کو کبھی مدنظر رکھا۔ ہم نے شرعی تنظیم کے بغیر صرف ادائیگی فرائض شخصی کو سعادت عظمیٰ اور وثیقہ نجات سمجھ لیا۔ حالانکہ نص حدیث کے بموجب یہ رہبانیت ہے جس سے اسلام نے برأت کا اعلان کیا ہے۔ اس اہم فریضہ کی ادائیگی میں ہم سے اب تک جو کوتاہی ہوئی ہو اس سے بری الذمہ ہونے کے لیے عنداللہ کوئی عذر معقول نہیں ہے۔ آپس کی جنگ وجدال، فروعی اختلافات اور حضرت امام ابوحنیفہ، امام بخاری اور حضرت عمر ابن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے امثال ونظائر کا فقدان عذر غیر مقبول ہے اور مسقط وجوب نہیں ''کما لا یخفیٰ''۔ کیونکہ اول الذکر اختیاری اور خود ساختہ شئ ہے اور ثانی الذکر کے غیر معتبر ہونے کے لیے سلف کی یہ نظیر موجود ہے کہ امامت عظمیٰ کے شرائط میں بھی حسب ضرورت تنزل اختیار کیا گیا ہے مگر یہ صورت اختیار نہیں کی گئی کہ جامع شرائط کے فقدان پر انعقاد امامت کے اصل وجوب کو بھی ساقط قرار دیا جائے، پس جب کہ آج ہم لوگوں کو تنبہ ہوگیا ہے اور اللہ جل شانہ کی توفیق نے بھی مساعدت فرمائی ہے تو اب اس فریضہ کی ادائیگی میں ادنیٰ تساہل بھی بدترین جرم ہے اور بالخصوص بنظر حالات موجودہ اور حوادث لاحقہ اب اس کا موقعہ بھی نہیں کہ کچھ اور تاخیر کی جائے بلکہ ہم سب پر واجب ہے کہ اس اہم امر کو فوراً انجام دیتے ہوئے اس تیزی سے قدم اٹھائیں کہ برسوں کی مسافت مہینوں میں اور مہینوں کی دنوں میں اور دنوں کی لمحوں میں طے ہوجائے۔ واللہ الموفق وھوالمعین۔

اور اگر خدانخواستہ آج بھی ہماری جماعت کے تنافس وتفاخر کا پہاڑ سنگ راہ بنا رہا اور فروعی اختلافات کی خلیج اس راہ میں حائل ہوتی رہی تو یاد رکھئے کہ سرزمین ہند میں جو حالت ہماری آج ہے مستقبل میں وہ اس سے بھی بدتر ہوجائیگی اور ہمارے علماء ومشائخ کی

یہ محترم جماعت اپنے طرز عمل سے تمام دنیا پر ثابت کردے گی کہ ان میں کام کرنے کی صلاحیت نہیں اور پھر اس جماعت کے لیے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ رہے گا کہ اصلاح امت اور وراثت انبیاء کے دعووں سے ہمیشہ کے لیے دست بردار ہو جائے۔

علماء کا فریضہ:

محترم غور فرمایئے ہدایت امت، فلاح و بہبود ملت، نظام شرعی کے قیام وتحفظ وغیرہ کی ذمہ داریاں عنداللہ کس جماعت پر عائد ہوتی ہیں؟ صرف علماء کرام اور ذی علم مشائخ ذی احترام پر، اور صرف انہیں پر کہ یہی حضرات قدرتاً اور من جانب اللہ مسلمانوں کے قائد ہیں، قیادت اور رہنمائی کی تمام ذمہ داری انہیں حضرات کے سر ہے، یہی حضرات شرعاً ارباب حل وعقد ہیں، لہٰذا اس اہم فرض کی بحسن خوبی انجام دہی صرف انہیں حضرات کا کام ہے اور اس کے لیے جس قدر بھی ایثار وقربانی کی ضرورت ہو اور جتنی بھی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے پامردی اور دلیری کے ساتھ ان کو برداشت کرنا ان کا طرہ امتیاز ہے اور موجب صد افتخار۔

امیر کی اہلیت:

مگر واقعہ یہ ہے کہ یہ فریضہ ایسا دشوار نہیں جیسا کہ عموماً خیال کرلیا جاتا ہے، صرف ایک چیز کی ضرورت ہے یعنی ذاتی اغراض اور مزعومہ شخصیت کے بے محل داشت و پرداخت کو قربان کردیا جائے۔ ظنون فاسدہ اور وساوس واوہام کاسدہ سے سینہ پاک کرلیا جائے، پھر قادر ذوالجلال کے واسطے اور دین اسلام کی خاطر ایک متحدہ مقصد میں اتحاد خیالات اور اتفاق عمل پیدا کرلیا جائے، صرف یہی نفی واثبات وثیقہ کامیابی ہے، ایک غلط تخیل ہمارے محترم علماء اور مشائخ کو اس فریضہ کی جانب اقدام سے مانع ہوتا ہے اور یہی غلط تخیل ہے جو ضرورت وجوب کے اعتراف واقرار کے باوجود ہمارے محترم بزرگوں کو متردد ومتفکر بنائے رکھتا ہے۔ یعنی یہ خیال کہ امیر شریعت کے اختیارات غیر محدود ہوں گے اتباع واطاعت کی کوئی حد نہ ہوگی، امیر مطلق العنان ہوگا اور اس لیے یہ امیر جس خیال ومشرب کا ہوگا اسی کے مطابق احکامات نافذ کرے گا جس کی اتباع تمام لوگوں پر شرعاً واجب ہوگی اور بصورت عدم

اتباع نقض بیعت ہوگا جو بدترین معصیت ہے اور اگر اپنی تحقیق کے خلاف امام کی ظاہری اتباع کی جائے تو تدین کے خلاف ہوگا۔ یہی خطرات ہیں جو اس سلسلہ میں اکثر حضرات کو پیش آتے ہیں۔ بیشک اگر یہ امیر ایسا مطلق العنان ہوتو ہر ایک ذی علم اور متدین شخص کے یہ شبہات اپنے مقام پر بہت صحیح ہیں۔

مگر واقعہ یہ ہے کہ (۱) امیر کے اختیارات محدود ہوں گے [۴] وہ نہایت مدبر اور مصالح شریعت سے واقف شخص ہوگا (۲) مسائل متفقہ منصوصہ [۵] کو نافذ کرے گا (۳) مقاصد و مسائل اعلاء کلمۃ اللہ پر ہمیشہ نگاہ رکھے گا اور ان کے متعلق خصوصیت سے احکام نافذ کرتا رہے گا (۴) اور وہ ایسے احکامات نافذ کرے گا جن سے بلا امتیاز فریق تمام امت مسلمہ کی فلاح و بہبود متصور ہو (۵) ایسے فروعی ومختلف فیہ مسائل کے اجراء اور تنفیذ کا اس سے کوئی تعلق نہ ہوگا جس کی اجتماعی زندگی میں حاجت نہیں ہوتی (۶) مختلف فیہ مسائل کی بحث وتحقیق کو نہیں روکے گا البتہ جنگ وجدال اور فساد کے رفع کرنے کی ہمیشہ کوشش کرتا رہے گا (۷) یہ نہیں ہوگا کہ اس کا ہر عمل ہر خیال تمام فرق اسلامیہ کے لیے واجب الاتباع ہو، چنانچہ جس عالم کی تحقیق امیر کی تحقیق کے خلاف ہو اور اس بناء پر اس مسئلہ خاص میں امیر کی اتباع نہ کرے تو وہ عالم ہرگز مستحق طعن نہیں ہوگا نہ اس کی بیعت ٹوٹے گی۔ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ کتنے مسائل ہیں جن میں حضرت عبداللہ ابن عمر اپنے والد ماجد خلیفہ دوم حضرت عمر سے اختلاف رکھتے تھے، کتنی جزئیات ہیں جن میں حضرت عبداللہ ابن مسعود حضرت عثمان سے متفق نہ تھے تو کیا آج تک کسی نے اس اختلاف کو نقض بیعت سمجھا؟ اور کیا ان حضرات نے اس فروعی اختلاف کے باعث دوسرے اجتماعی احکامات میں امیر کی اطاعت و اتباع سے روگردانی کی؟ ہرگز نہیں۔

پس آج کس قدر حسرت ناک بدنصیبی ہے کہ ہم ان مسائل کو جانتے ہیں اور پھر صرف ظنون، وساوس اور اوہام کی بناء پر ایک نہایت ضروری واجب بلکہ اہم الواجبات کی ادائیگی میں پس وپیش کرتے ہیں۔ یاویلتاہ۔

محترما! اگر ہمارا ایمان ہے **ان صلوتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العلمین** ۔ اور اگر ہم اصلاح وحیات امت کی ذمہ داری اپنے سر سمجھتے ہیں تو پھر ہمیں اس فریضہ کی ادائیگی میں ہرگز پس وپیش نہیں کرنا چاہئے، خود اعتمادی سے کام لیتے ہوئے اور قوت ایمان پر اعتماد کرتے ہوئے توکلاً علی اللہ فوراً اس کام کو انجام دینا چاہئے۔ چنانچہ بفضل اللہ تعالی وبحمدہ جمعیۃ علماء صوبہ آگرہ بعد غور وخوض اس فریضہ کی ادائیگی کی جانب متوجہ ہوئی، اور اس لئے اپنے اجلاس عام منعقدہ ۱۷؍تا ۱۹؍ جمادی الثانیہ ۱۳۶۳ھ بمقام مراد آباد میں مندرجہ ذیل تجویز بالاتفاق منظور کی۔ (تجویز نمبر ۹) مسلمانوں کی صحیح اسلامی زندگی جماعتی تنظیم پر موقوف ہے اور جماعتی تنظیم کا وجود امام اور امیر المومنین کے بغیر متصور نہیں، جن بلاد پر کفار کا تسلط ہوجائے اور احکام کفر جاری ہوں وہاں کے مسلمانوں پر بھی واجب ہے کہ وہ اپنے لئے ایک امیر اور والی مقرر کریں۔

جماعت علماء نے ابتداء قیام سے اس کی طرف مسلمانوں کی توجہ دلائی اور اس کی ضرورت اور وجوب شرعی سے آگاہ کیا ہے، تمام ہندوستان کے لیے ایک امام اور امیر مقرر کرنے کے راستہ میں بعض مشکلات حائل تھے اور ہیں، تاہم ہندوستان کے صوبوں میں صوبہ بہار کو یہ شرف حاصل ہے کہ اس نے ۱۹۲۱ء سے امارت شرعیہ قائم کرلی ہے اور آج تک امیر کے تحت مسلمان کام کر رہے ہیں۔

جمعیۃ علماء صوبہ آگرہ کا یہ جلسہ طے کرتا ہے کہ اس صوبہ میں بھی اس مبارک عمل پر اقدام کیا جائے، مقتدر عالم کو صوبہ کا ایک امیر الشریعت مقرر کرلیا جائے، اس کے ہاتھ میں امور شرعیہ کی باگ ڈور ہو اور اسکے احکام کی اطاعت مسلمانوں کیلئے موجب فلاح ونجات ہو اور اس کے سائے میں مسلمان اسلامی زندگی بسر کریں۔ چونکہ انتخاب امیر کا معاملہ نہایت اہم اور زیادہ سے زیادہ اجماع واتفاق بین المسلمین کا مقتضی ہے، اس لئے اس جلسہ کی رائے ہے کہ صوبہ کے علماء، زعماء کو اس امر کی ضرورت واہمیت اور اس کے حدود کی تعیین اور تاریخ کے تقرر کے ساتھ ایک دعوت نامہ ارسال کیا جائے تا کہ تاریخ معین پر علماء صوبہ کے اجتماع

میں صوبہ کے لیے امیر الشریعت کا انتخاب عمل میں لایا جائے۔الخ

جیسا کہ تجویز کے ابتدائی حصہ میں اشارہ کیا گیا مناسب یہی تھا کہ پورے ہندوستان کے لیے امیر الہند کا انتخاب پہلے ہوتا اس کے بعد صوبائی امیر منتخب کئے جاتے لیکن تجویز میں اس کے جواب کی طرف بھی اشارہ کر دیا گیا ہے یعنی وہ دشواریاں جن پر آج تک قابو نہیں حاصل ہوسکا اور جن کا ایک حل یہ بھی ہے کہ صوبائی امراء منتخب کر لیے جائیں جو امیر الہند کا انتخاب بآسانی کر دیں اور اس طرح مسلمانان ہند کا منتشر شیرازہ ایک مرکز پر متفق و متحد ہو جائے، اس کے علاوہ قابل توجہ یہ ہے کہ آیا ہندوستان کا تسلسل ہمارے لیے عذر ہوسکتا ہے؟ اگر بالفرض ہندوستان مرکزی حیثیت میں ایک معصیت کا مرتکب ہو تو کیا اس کی معصیت وعصیاں پر قائم رہنے کے لیے منتخب ہوسکتی ہے ، (یہ عبارت سمجھ میں نہ آسکی، اصل کتاب میں بھی اسی طرح ہے) کیا جناب والا نے خیال نہیں فرمایا کہ فقہائے کرام نے اس حکم کو صرف ملک تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ مستقلاً ہر بلد اور ہر شہر پر یہ حکم عائد ہوتا ہے، لہٰذا کسی کی سستی اور کوتاہی ہمارے تقاعد ولاپرواہی کے لیے وجہ جواز نہیں بن سکتی۔

ایک سوال یہ ہے کہ موجودہ وقت میں اس صوبہ کے امیر کے لیے کیا کیا شرائط ہونے چاہئیں؟ انتخاب کن اصول پر ہو اور امیر کا طریق کیا ہو؟ جواباً عرض ہے کہ چونکہ یہ کام شرعی اور سیاسی نقطہ نظر سے انجام دینا ہے، اس لئے ہر پہلو کا لحاظ ضروری ہے، پس اس قحط الرجال کے زمانہ میں اغراض ومقاصد شریعت کو مدنظر رکھ کر جن شرائط کے ساتھ امیر کا انتخاب ہونا چاہئے، وہ ہمارے نزدیک حسب ذیل ہیں۔ہمیں امید ہے کہ آپ بھی ان کو پسند فرمائیں گے:

(۱) عالم باعمل، صاحب فتویٰ، جس کا علمی حیثیت سے زمرہ علماء میں وقار اور اثر ہو، تاکہ علماء کرام اس کے اقتدار کو تسلیم کریں اور صاحب بصیرت ہو تاکہ نہایت تدبیر کے ساتھ احکامات نافذ کرے (۲) اگر وہ مشائخ طریقت میں بھی صاحب وجاہت ہو اور اس کے حیطہ اثر میں صوبہ کے مسلمانوں کی ایک معتد بہ جماعت بھی اس حیثیت سے موجود ہو تو یہ

بہت ہی بہتر اور نور علی نور کا مصداق ہو، تا کہ عوام وخواص اس کے اثر سے متأثر ہوں اور شرعی تنظیم اور اجتماعی قوت جلد سے جلد پیدا ہو سکے۔ (۳) حق گوئی وحق بینی میں نہایت بے باک ہو اور کسی مادی طاقت سے متأثر ومرعوب ہونے کا بظاہر اندیشہ نہ ہو (۴) مسائل حاضرہ میں بھی ایک حد تک صاحب بصیرت ہو اور تدبیر کے ساتھ کام کر رہا ہو، تا کہ ہمارا کام بحسن خوبی تیزی کے ساتھ آگے بڑھے۔ (۵) لاپرواہی اور خودرائی کے مرض سے پاک ہو۔

ہمارے خیال میں موجودہ وقت میں یہی شرائط مع لحاظ احکام شریعت بہت کافی ہیں بلکہ وہ معیار ہیں جس پر صوبہ ہذا میں دو ایک آدمی ہی پورے اتر سکتے ہیں۔ اب رہا اصول انتخاب تو ظاہر ہے کہ یہ کام شرعاً ارباب حل وعقد کا ہے جس کے مصداق علماء کرام اور ذی علم مشائخ ہیں اور یہ حق شرعاً انہیں کو حاصل ہے، اس کے بعد عوام کا فرض انقیاد واتباع ہے۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ تمام صوبہ کے ہر عالم اور ہر شیخ طریقت کا انتخاب کے وقت موجود رہنا یا کل کا انتخاب کرنا بھی ضروری نہیں، خلیفہ اول (رضی اللہ عنہ) کا انتخاب آپ کے پیش نظر ہے کہ بغیر موجودگی ارباب حل وعقد انتخاب عمل میں آیا اور اس کی صحت پر اجماع ہوا بلکہ تمام اہل مدینہ اور بلاد اسلامیہ میں انتخاب کے لیے کوئی اعلان بھی نہیں ہوا تھا، پس جمعیۃ العلماء کے اعلان عام اور دعوت خاص کے بعد جس قدر بھی علماء ومشائخ تاریخ مقررہ پر مجتمع ہوکر انتخاب فرمالیں گے، شرعاً وہ بالکل درست ہوگا اور بقیہ حضرات پر تسلیم وانقیاد واجب ہوگا۔ امیر کا طریق کار یہ ہوگا کہ چند چیدہ چیدہ علماء کی ایک مجلس شوریٰ ہوگی جس سے مشاورت کے بعد باصول شریعت امیر فیصلہ کرے گا، احکامات جاری ونافذ کرے گا جن کی نظریں قرون اولیٰ کے اندر موجود ہیں۔

محترما! آخر میں جناب والا سے مکرر گذارش ہے کہ ان تمام معروضات کو غور سے مطالعہ فرمائیے، اگر آپ کو اس سے اتفاق ہو تو اسی معیار کے مطابق ہمارے صوبہ میں سے جن حضرات کو آپ اہل سمجھتے ہوں اور بہتر سمجھتے ہوں، مہربانی فرما کر ان سے بھی استصواب کر کے تشریف لائیں اور اگر اس معیار کے علاوہ اس سے بہتر کوئی معیاری نظریہ حالات حاضرہ

باصول شریعت جناب کے خیال میں آئے تو ۲۲/اپریل ۱۹۴۵ء تک مولانا محمد میاں صاحب مدرسہ شاہی مرادآباد کے نام بھیج دیں۔

ضروری گزارشیں:

(۱) تشریف آوری کی اطلاع ۲۸/اپریل تک پہنچ جانی ضروری ہے تاکہ فرائض قیام و مدارات ایک نظم کے ساتھ بسہولت انجام پاسکیں اور جناب کو یا منتظمین کو پریشانی اور دشواری نہ ہو۔

(۲) جملہ خط و کتابت اور تشریف آوری کی اطلاع پتہ ذیل پر دیجئے:

مولانا محمد میاں صاحب شاہی مرادآباد (یوپی)

ضروری اطلاع: جمعیۃ علماء صوبہ کا دفتر ۲۶/اپریل ۱۹۴۵ء کو سہارنپور منتقل ہو جائے گا، لہٰذا ۲۶/اپریل سے دفتر صوبہ یا مولانا محمد میاں صاحب کے خطوط دفتر مجلس استقبالیہ سہارنپور کی معرفت ہونے چاہئیں۔

الداعیان: (مولانا) ابوالوفا (صاحب) صدر جمعیۃ علماء صوبہ آگرہ (مولانا سید) محمد شاہد (صاحب) فاخری، نائب صدر جمعیۃ علماء صوبہ آگرہ وسجادہ نشیں دائرۂ شاہ اجمل صاحب قدس اللہ سرہ العزیز الہ آباد ۲۳۔ مولانا حکیم انظار احمد (صاحب) نائب صدر جمعیۃ علماء صوبہ آگرہ، مولانا بشیر احمد صاحب ناظم اعلیٰ جمعیۃ علماء صوبہ آگرہ، مولانا محمد قاسم صاحب ناظم جمعیۃ علماء صوبہ آگرہ۔

☆☆☆☆☆

(۱) وضاحت کی ضرورت ہے۔ (۲) کیا اس اہم فریضہ کے لئے کچھ ہوا ہے۔

(۳) مساعدت اسباب کو واضح کیجئے۔ [۴] کیا تحدید جائز ہے شرعاً؟ اور تحدید کی زنجیروں میں مقید کرنے کے بعد وہ امیر ہے؟ اور تحدید کون کرے گا؟

[۵] ہر فریق اپنے خیال کو منصوص کہے گا، پھر غیر منصوصہ کی تنفیذ کون کرے گا؟

(بحوالہ مکتوبات مشاہیر بنام شیخ الحدیث مولانا عبدالحق صاحب، جلد اول ص: ۶۳۰ تا ۶۳۵)

☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حضرت مولانا اعزاز علی صاحبؒ

وفات: ۱۲/رجب ۱۳۷۴ھ، مارچ ۱۹۵۵ء
تحریر: مولانا محمد میاں ناظم جمعیۃ علماء ہند

(۱)

ایک عالم باعمل، زاہد ومتقی، سلسلۂ چشتیہ کے صاحب نسبت بزرگ، جن کی یہ تمام گراں قدر خصوصیات اس لیے مخفی تھیں کہ دیکھنے والوں کی نظریں آپ کی دوسری عظیم الشان خصوصیات کی تیز کرنوں سے خیرہ ہو جاتی تھیں۔ یہ عظیم الشان اوصاف تھے: شوقِ تدریس، ذوقِ تربیت، طلبہ اور تلامذہ پر ایسی شفقت کہ پدری شفقت بھی اس کے سامنے ہیچ تھی، درس وتدریس کے سلسلے میں شب وروز کی بے انتہا مشقت اور مستعدی، تصنیف وتالیف کا مبارک اور نتیجہ خیز شغف، دارالعلوم دیوبند کی جانب سے نظامت تعلیم وغیرہ مفوضہ خدمات میں بے پناہ انہماک۔ افسوس! علم وعمل اور زہد وتقویٰ کا یہ پیکر لاثانی سہ شنبہ کی صبح کو اس عالم کش مکش سے کنارہ کش ہو کر راحت فرمائے عالم جاوداں ہو گیا۔ إنا للہ وإنا إلیہ راجعون بقول مولانا حفظ الرحمٰن صاحب:

آفتاب فقہ وادب غروب ہو گیا۔

اس سانحہ کا ظاہری سبب:

حضرت موصوف ۳/مارچ کو موضع خانجہان پور تشریف لے جا رہے تھے، راستہ میں میرٹھ بھی قیام فرمایا اور وہاں جلسہ میں شرکت فرمائی، میرٹھ میں آپ کی ہمشیرہ بھی رہتی ہیں اور چھوٹے بھائی مولوی معراج علی صاحب فیض عام ہائی اسکول میں پروفیسر ہیں۔ اس سفر میں نہایت تکلیف دہ حادثہ یہ پیش آیا کہ ایک بیگ جس میں علم حدیث سے متعلق کسی

تصنیف کا مسودہ تھا، جو بہت کافی جانفشانی کے بعد مرتب ہوا تھا۔گم ہوگیا، دریائے علم کے شناور کے لیے اس سے زیادہ جاں گداز حادثہ کیا ہوسکتا ہے! چنانچہ اس کی تلاش میں ہر ایک امکانی کوشش عمل میں لائی گئی اور مایوسی کا صدمہ اس قدر شدید ہوا کہ سفر کا سارا پروگرام ملتوی کردینا پڑا، اور اس کے بعد سے کھانا بھی نہیں پیش کیا جاسکا، انتہا یہ کہ یہی صدمہ وجع قلب بنا، جس کی تکلیف سے تقریباً ۲۶ رگھنٹہ مضطرب اور بے چین رہ کر آپ نے داعیِ اجل کو لبیک کہا اور بقول مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب آپ علم پر شہید ہوگئے۔

پیدائش اور عمر:

اس انتہا کا آغاز چودھویں صدی ہجری کی ابتدا سے ہوا، سنہ ہجری کا پہلا دن گویا قدرتی سال گرہ ہوتا تھا، اس حساب آپ نے ۷۳ر سال ۲ر ماہ ۱۲ر دن عمر پائی اور عیسوی صدی کے حساب سے ۷۲ر سال بھی پورے نہیں ہوئے۔ بقول مولانا محمد عثمان صاحب چیئرمین میونسپل بورڈ دیوبند یہ ۷۴ر سال دو کاموں میں صرف ہوئے ہیں: تعلیم اور تعلم۔ ان دو مشغلوں کے علاوہ آپ کو دنیا کی کسی دلچسپی سے واسطہ نہیں تھا، اور بقول مولانا حفظ الرحمٰن صاحب: مولانا کے ذہن میں گناہ کا تصور بھی نہ آتا تھا۔

وطن:

حضرت مولانا کا آبائی وطن امروہہ ضلع مرادآباد محلّہ شاہی چبوترہ تھا؛ لیکن تقریباً پچاس سال سے آپ دیوبند میں قیام فرماتھے اور اب آپ نے دیوبند ہی کو اپنا وطن بنالیا تھا۔

ابتدائی تعلیم:

عربی کی ابتدائی تعلیم آپ نے شاہجہاں پور میں حاصل کی، حضرت علامہ مولانا محمد کفایت اللہ صاحب آپ کے استاذ تھے، اس ذکی اور ذہین استاذ کو اپنے اس ہونہار شاگرد پر اتنا اعتماد تھا کہ ایک مرتبہ جب اس زمانہ میں حضرت موصوف (مولانا کفایت اللہ صاحب مفتی اعظم ہند) نے کسی پادری سے مناظرہ کیا تو اسی شاگرد کو منتخب کیا تھا کہ وہ سوال وجواب قلم بند کرتا رہے۔ اس کے بعد جب آپ دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے تو شیخ الہند

حضرت مولانا محمود حسن صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز کی جوہر شناس شفقتوں نے آپ کو منتخب فرمالیا۔

تدریس:

تحصیل علم کے بعد سب سے پہلے آپ غالباً ضلع میرٹھ کے کسی مدرسے میں مدرس بنا کر بھیجے گئے، پھر آپ پورینی ضلع بھاگلپور صوبہ بہار تشریف لے گئے، وہاں چند سال خدمت تدریس انجام دیتے رہے، اس کے بعد حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہٗ العزیز سے درخواست کر کے تقریباً ۱۳۲۵ھ میں آپ دیوبند تشریف لے آئے اور اس مادر علمی کے لیے ہمہ تن وقف ہو گئے۔

مشاغل درس:

دنیا کی تمام نعمتوں میں سب سے زیادہ دلچسپی آپ کو درس سے تھی، انتہا یہ کہ آپ کا یہ مقولہ خاص شہرت رکھتا ہے:

''جنت میں بھی اگر پوچھا جائے گا تو یہی عرض کروں گا کہ مجھے حلقۂ درس درکار ہے۔''

۶ ر گھنٹہ یومیہ دارالعلوم دیوبند کے قواعد کے مطابق آپ کا درس ہوتا تھا، اس کے علاوہ نماز صبح کے بعد سے مدرسہ کے وقت تک، پھر دو پہر اذان ظہر سے لے کر نماز عصر تک، پھر نماز عصر کے بعد مغرب کے قریب تک، پھر بسا اوقات مغرب کے بعد اور عشاء کے بعد بھی آپ کے درس کا سلسلہ جاری رہتا تھا، اور اس طرح یومیہ چودہ پندرہ کتابوں کا درس روزانہ دیا کرتے تھے۔ زمانۂ تعطیلات میں بھی طلبہ آپ سے استفادہ کیا کرتے تھے، کاتب حروف محمد میاں نے کافیہ اور نفحۃ الیمن کا باب الامثال آپ سے رمضان شریف میں پڑھا تھا، عروض المفتاح اور حماسہ اذان عصر کے بعد سے نماز عصر تک کے وقت میں پڑھا تھا، علم الصیغہ، ہدایت النحو نماز صبح کے بعد تعلیمی گھنٹہ تک کے وقت میں پڑھے تھے۔ جب سے نظامت تعلیم اور افتا وغیرہ آپ کے سپرد ہوا اور آپ کو درد گردہ کا عارضہ لاحق ہو گیا تو چودہ

پندرہ اسباق کا سلسلہ نہیں رہا؛ لیکن چھ سات کتابوں کا سلسلہ تو وفات کے ایک دو روز پہلے تک جاری رہا۔

فنون درس:

ادب اور متعلقات ادب میں آپ کو خاص ملکہ حاصل تھا، مفردات اللغات کے آپ گویا امام تھے، اگر یہ کہا جائے کہ قاموس حفظ تھی تو بے جا نہ ہوگا، اقرب الموارد اور منجد بھی آپ کے مطالعہ میں رہا کرتی تھی، لیکن پھر آپ کی غیرت مند طبیعت نے گوارا نہ کیا کہ نصرانیوں کی تصنیفات سے استفادہ کریں، لہٰذا تشریح لغات میں قاموس، مفردات القرآن للامام الراغب اور فقہ اللغہ ثعالبی آپ کے مطالعہ کے لیے مخصوص ہوگئی تھیں۔

ادب کے علاوہ فقہ سے آپ کو شغف تھا، خصوصیت سے ہدایہ اخیرین جو فقہ کی سب سے اونچی اور سب سے مشکل کتاب ہے، اس کے تمام مضامین آپ کے سامنے گویا دست بستہ حاضر رہتے تھے۔ آپ کی مختصر اور جامع تقریر طلبہ کے تمام شکوک پہلے ہی دفعہ میں ختم کردیا کرتی۔

آپ کا حلقۂ درس نہایت پُرشوکت اور باوقار ہوتا تھا، طلبہ کو بلاضرورت سوال کرنے کی ہمت بھی نہیں ہوتی تھی، یہی وجہ تھی کہ تمام متعلقہ کتابیں آپ کے یہاں ختم تک ہوتی تھیں۔ حدیث وتفسیر سے بھی آپ کو بے انتہا تعلق تھا، اور ان سے وابستگی کو وہ اپنے لیے سب سے بڑی سعادت تصور کرتے تھے۔ بیضاوی شریف کا درس خاص شہرت رکھتا تھا، مگر اب چند سالوں سے آپ کا درس زیادہ تر فن حدیث میں مخصوص ہوگیا تھا، ترمذی شریف، شمائل ترمذی شریف، ابوداؤد شریف اور بخاری شریف جلد دوم آپ کے یہاں ہوتی تھیں، اور اول سے آخر تک نہایت اطمینان سے ہوتی تھیں۔

تصنیف وتالیف:

ان علوم کی خدمت آپ نے محض درس کے ذریعہ ہی نہیں کی؛ بلکہ حواشی اور تصنیفات سے بھی ان فنون کی خدمت کی، نورالایضاح کا حاشیہ غالباً سب سے پہلی تالیف

ہے، پہلے مختصر پھر اس کا تفصیلی حاشیہ لکھا، اسی زمانے میں کنز الدقائق کا حاشیہ بھی لکھا، ادب میں دیوان متنبّی، دیوان حماسہ، عروض المفتاح پر آپ کے ایسے مفید حواشی ہیں کہ جب سے یہ حواشی اہل علم کے سامنے آئے ہیں، باقی حواشی متروک ہوگئے ہیں۔ ادب کی مشہور کتاب **نفحۃ الیمن** کے بارے میں آپ کو شکایت تھی کہ اس کا مصنف چونکہ عیسائی ہے، اس لیے خصوصیت سے ایسی حکایتیں جمع کی ہیں، جن سے مسلمانوں کی معاشرت اور خلفاء اسلام کے متعلق دماغوں پر نفرت انگیز اثر پڑتا ہے، آپ نے اس شکوہ شکایت کی اشاعت کے بجائے ایک فعال مدبر کی طرح یہ بہتر سمجھا کہ کوئی نعم البدل پیش کر دیا جائے، چنانچہ **نفحۃ العرب** مرتب فرما کر اس کو شائع کرا دیا۔ خدا کے فضل سے اس کتاب نے خاص مقبولیت حاصل کی اور اب یہ کتاب عام طور پر مدارس عربیہ کے نصاب میں داخل ہو چکی ہے۔

گم شدہ مسودہ کیا تھا؟:

کاتب حروف (مولانا محمد میاں ناظم جمعیۃ علماء ہند) کا عرصہ سے خیال ہے کہ ترمذی شریف کے حاشیہ کی طرح مسلم شریف کا بھی مختصر حاشیہ مرتب ہو جائے، تو مسلم شریف کی یہ بے پناہ ضخامت اور اس کا عجیب وغریب سائز (جو صرف اس لیے ہے کہ حاشیہ کی جگہ نووی کی پوری شرح حاشیہ پر ہے) مناسب حد تک مختصر اور موزوں ہو جائے۔ ایک مرتبہ احقر نے حضرت مولانا فخر الدین احمد صاحب شیخ الحدیث جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مراد آباد سے درخواست کی اور ان کی خدمت میں پوری مسلم شریف اور حاشیہ کے لیے سادہ کاغذ ہر ورق کے ساتھ سلوا کر پیش کر دیئے، مگر جب مولانا موصوف کی مشغولیت اور دوسرے اعذار کے باعث کامیابی نہ ہو سکی تو احقر نے حضرت شہید علم مرحوم سے درخواست کی تھی، اس وقت تو حضرت نے محض سکوت فرمایا تھا؛ مگر پھر دوبارہ ایک مرتبہ گفتگو ہوئی تو آپ کے جواب سے احقر یہ سمجھا تھا کہ آپ نے یہ درخواست منظور فرمالی تھی اور اب اسی پر عمل ہو رہا ہے۔

چونکہ عادت یہ تھی کہ تکمیل سے پہلے ایسی چیز کا تذکرہ پسند نہیں فرماتے تھے؛ اس لیے احقر نے بھی زیادہ تحقیق وتفتیش نہیں کی، اب مسودہ کی گم شدگی کی خبر سے خیال ہوتا ہے

کہ شاید یہ احقر کی درخواست تھی، جو لب بام پہنچ کر اس طرح ناکام ہوئی۔ اگر یہ خیال صحیح ہے تو نہایت ہی المناک اور درد انگیز حادثہ ہے اور علم کے ہر ایک قدرداں سے درخواست ہے کہ وہ اس کی جستجو میں پوری کوشش صرف کر دے، اگر یہ گم شدہ خزانہ مل جائے تو اہل علم کے لیے بشارت عظمیٰ ہوگی۔

خیال تھا کہ ان کالموں کی ایک ہی اشاعت میں حضرت استاذ مرحوم کا مختصر تذکرہ آ جائے گا، مگر اس مختصر تذکرہ نے کالموں کی گنجائش ختم کر دی، اب مجبوراً ناظرین کرام کو دوسرے ایڈیشن کا انتظار کرنا پڑے گا۔

☆☆☆☆☆

(۲)

علم کو دولت لازوال کہا جاتا ہے، اس کی تعریف یہ کی جاتی ہے کہ ''یہ دولت جتنی خرچ کی جائے اتنی ہی زیادہ ہوتی ہے''۔ لیکن علم دین کے لیے دولت کا عنوان بھی ناکافی ہے، لسان نبوت علی صاحبہ الصلاۃ والسلام نے اس کو ''ترکہ انبیاء'' قرار دیا ہے۔ کس قدر خوش نصیب ہیں وہ جو اس ترکہ سے بہرہ یاب ہوں۔ قرآن حکیم میں منصب نبوت کے چار فرض بیان فرمائے گئے ہیں: تلاوت آیات اللہ، تزکیہ نفس، تعلیم الکتاب اور تعلیم الحکمت۔ ان چار فرائض کے علاوہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک خاص شان بیان فرمائی گئی ہے: حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَؤُوْفٌ رَحِيْمٌ (التوبۃ: ۱۲۸) یعنی وابستگان دامن کو کامیاب و سعادت مند بنانے کا غیر معمولی شوق جو طمع اور لالچ کے درجہ میں پہنچا ہوا ہے، ان پر غیر معمولی شفقت و عنایت ان کے نفع کی حرص اور ان کے معمولی نقصان سے بھی روحانی اذیت اور دماغی کوفت اور بے چینی۔

وہ بزرگ ہستی جس کا اسم گرامی زیب عنوان ہے، وہ خوش نصیب شخصیت تھی، جس کو قدرت کے دست سخاوت نے اس مقدس ترکہ کا حظ وافر اور حصۂ عظیم عطا فرمایا تھا، یہ بزرگ جس کے ذہن میں بقول مولانا حفظ الرحمٰن صاحب ''گناہ کا تصور بھی مشکل سے گزرتا

ہوگا'' نصف صدی تک دارالعلوم دیوبند کے مجمع البحار سے ترکۂ انبیاء علیہم السلام کی دولت بے کراں کو پوری اولوالعزمی اور فراخ حوصلگی سے لٹاتا رہا، ایسی فراخ حوصلگی کہ دریاؤں کے دہانے اور پہاڑوں کے آبشار اس کے سامنے شرمندہ ہوں، ایسی فراخ دستی کہ گل چیں کے دامن پُر ہو جائیں، ہاتھ تھک جائیں۔مگر اس کی گل پاشی اور گل ریزی میں فرق نہ آئے۔

تعلیم الکتاب والحکمت کے علاوہ تلامذہ اور متوسلین کے حق میں شفقت بے پایاں، بے پناہ ہمدردی، رحمت ورأفت اور ان کے فائدے اور نفع کی حرص وطمع وہ طرۂ امتیاز ہے جو اس وارث انبیاء علیہم السلام کو تمام ورثاء سے ممتاز کر کے احسان شناسوں کی نظر میں اس کا درجہ سب سے بلند کر دیتا ہے اور اس کو رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک وصف کا پرتو، نمونہ اور ایک جھلک بنا کر پیش کرتا ہے۔

کس قدر افسوس اور صدمہ کا مقام ہے کہ اس کے احسان شناس ہزاروں تلامذہ جو دنیائے اسلام کے چپہ چپہ میں پھیلے ہوئے ہیں، وہ پوری آرزو اور تمنا کے باوجود اس کو اس ضابطہ سے مستثنیٰ نہ کرا سکے، جو ہر ایک نفس منفوسہ کے لیے مقدر کر دیا گیا ہے۔۱۲ر رجب ۱۳۷۴ھ، ۸ر مارچ ۱۹۵۵ء یوم سہ شنبہ کی صبح کے سوا پانچ بجے اس کو کُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ (آل عمران: ۱۸۵) کے ضابطہ پر عمل پیرا ہونا پڑا۔ إنا لله وإنا إليه راجعون

چیست یارانِ طریقت بعد ازیں تدبیر ما

آج ہمارے سامنے چند چیزیں ہیں اور جذبۂ احسان شناسی کا مطالبہ ہے کہ ان پر عمل ہو:

(۱) دعائے مغفرت اور ایصال ثواب

حضرت مرحوم اپنے تلامذہ سے صرف اسی کے متوقع تھے اور رخصتی ملاقات اور اکثر وبیشتر خطوط میں اسی کی فرمائش کیا کرتے تھے۔ رمضان شریف کا مبارک مہینہ ہے، خدا توفیق دے کہ ہم اس موقع پر جس طرح اپنے رب کا حق پہنچائیں، رحمۃ للعالمین، رؤوف رحیم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے دامن مقدس سے وابستہ صحابہ کرام، آل اطہار، مشائخ

طریقت، اساتذہ مرحومین، اقارب متوفی، احباب متوفین کا حق پہنچائیں، اسی طرح بلکہ کچھ زیادہ خصوصیت کے ساتھ حضرت استاذ علیہ الرحمہ کا حق پہنچائیں، جو ہم پر ہر حال میں عائد ہوا ہے اور آپ کے لیے ایصال ثواب اور دعائے مغفرت کریں۔

(۲) ہمدردی وشفقت حضرت استاذ مرحوم کا اسوۂ خاص تھا، خداوند عالم توفیق بخشے کہ ہم اس کو اپنائیں، جن کو طلبہ علوم کی خدمت کا موقع میسر ہے، وہ طلبہ عزیز کے حق میں اور جو اس خدمت زریں سے محروم ہیں، وہ خدمت خلق کے مبارک جذبہ پر عمل پیرا ہو کر حضرت استاذ کے اس اسوہ کو زندہ اور پائندہ بنائیں۔

(۳) حضرت استاذ علیہ الرحمہ کی غیرت وخودداری تو اجازت نہیں دیتی، البتہ جب اپنے فرائض کا تذکرہ ہے تو غیر مناسب نہیں کہ پس ماندہ حضرت استاذ کی ضرورت مندی کی طرف بھی توجہ دلا دی جائے، حضرت کی سادہ زندگی اور غیر معمولی استغنا اور خودداری دیکھ کر خیال ہوتا تھا کہ کچھ پس انداز ضرور ہوگا؛ مگر اول تو غیر معمولی خودداری یہی اس خیال کی تردید کے لیے کافی تھی، اس خودداری اور استغنا کے ساتھ صلہ رحم اور جذبہ شفقت کا نتیجہ یہ ہے کہ وفات کے بعد ترکہ میں جو باقی تھا، وہ تقریباً ڈیڑھ ہزار روپیہ کا قرض تھا۔

اس سلسلہ میں اگر فرض شناسی کی توفیق ہو تو اپنا ہدیہ سید محمد شفیع صاحب دفتر محاسبی دارالعلوم دیوبند یا حضرت مہتمم صاحب دارالعلوم دیوبند کے نام منی آرڈر کر دیا جائے اور مصرف کے متعلق تصریح کر دی جائے۔

چند سبق آموز واقعات:

سوانح زندگی کے لیے تو ضخیم کتاب کی ضرورت ہے، صرف وہ واقعات جو اس نااہل خادم کے علم میں ہیں، ان کے لیے بھی بہت سے کالم درکار ہیں۔ اس وقت نہ ضخیم کتاب لکھنے کی مہلت ہے اور نہ بہت سے کالموں کی گنجائش ہے، صرف چند واقعات جن کا تعلق اوصاف سے ہے، جن کا بار بار ذکر سطور بالا میں آچکا ہے، یہاں ایسی ترتیب سے درج

کئے جاتے ہیں کہ ان کے عملی نمونے بھی سامنے آ جائیں۔

استغنا اور خودداری:

یہ خادم ناکارہ اس جماعت میں شریک تھا، جس کو حضرت مرحوم خارج میں علم الصیغہ پڑھایا کرتے تھے۔ ایک روز سبق ہو رہا تھا یا ہو چکا تھا، ایک صاحب تشریف لائے، جن کا لڑکا یا چھوٹا بھائی دارالعلوم میں حضرت موصوف کی زیرِ نگرانی رہا کرتا تھا، یہ صاحب رخصت ہونے لگے تو حضرت استاذ کے ذاتی مصارف کے لیے کچھ پیش کیا، حضرت استاذ نے منظور کرنے سے معذرت کی، اس نے بہت اصرار کیا تو فرمایا:

''کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ طلبہ کے جو سرپرست آیا کریں، میری نظر ان کی جیب پر رہا کرے کہ وہ کیا پیش کرتے ہیں''۔

ذاتی واقعات:

ناظرین کرام معاف فرمائیں اگر اس سلسلے میں کچھ اپنی باتیں بھی آ جائیں۔ غالباً ۱۹۲۶ء کا واقعہ ہے، جب کلکتہ میں جمعیۃ علماء ہند کا اجلاس زیرِ صدارت حضرت علامہ سید سلیمان صاحب ندوی ہوا تھا۔ حضرت الاستاذ المحدث مولانا انور شاہ صاحب کشمیری بھی اس اجلاس میں تشریف لے گئے تھے، اس وقت مدرسہ حنفیہ (آرہ شاہ آباد) کے اراکین نے حضرت موصوف سے ایک ایسے مدرس کی فرمائش کی تھی، جو مدرسہ حنفیہ میں ادب سے متعلق کتابیں پڑھا سکے اور طلبہ کو عربی کی مشق کرائے۔ حضرت الاستاذ المحدث نے دیوبند پہنچ کر حضرت شیخ الادب (رحمہما اللہ) سے مشورہ کیا تو محض از راہ شفقت و نوازش حضرت شیخ الادب رحمۃ اللہ علیہ نے احقر کا نام پیش فرما دیا جو منظور کر لیا گیا، اس وقت احقر کی عمر تقریباً بیس سال تھی، سبزہ آغاز تھا۔

دارالعلوم دیوبند کا نوخیز طالب علم جب ادیب کی حیثیت سے ایسے مدرسے میں پہنچا، جہاں کے مدرسین نہ پورے طور پر ہم مذاق تھے اور نہ دارالعلوم کی علمی عظمت کے قائل، بلکہ اساتذہ دارالعلوم سے ایک قسم کی چشمک نہاں خانۂ ضمیر میں چھپائے ہوئے تھے (اور

طلبہ ان ہی اساتذہ کے زیر اثر اسی رنگ میں رنگے ہوئے) پھر ان میں متعدد طلبہ وہ بھی جو نوعمر استاذ سے عمر میں بھی زیادہ اور مولویانہ شان میں بھی بڑھے ہوئے، تو تدریس کی سنگلاخ وادیوں سے گزرنے والے سمجھ سکتے ہیں کہ کس قدر مشکلات قدم قدم پر بلکہ درسی کتاب کی سطر سطر پر پیش آتی ہوں گی اور اس کو آزمائش کہئے یا حسن ظن کہ مدرسہ حنفیہ کے صدر المدرسین صاحب نے دیوان حماسہ، دیوان متنبّی، مقامات حریری وغیرہ کتب ادب کے ساتھ، ابوداؤد شریف، تصریح اور دلائل الاعجاز وغیرہ مختلف علوم وفنون کے ایک درجن سبق احقر کے حوالے کردیئے، جن میں بعض کتابیں ایسی بھی تھیں کہ پڑھنا تو درکنار، اُن کے مطالعہ کی نوبت بھی نہیں آئی تھی۔ مدرسہ کی لائبریری کا دامن کہ کسی شرح کا نام ونشان بھی نہیں، حل لغات کے سلسلے میں بھی صرف ایک کتاب منتہی الادب۔

ناز پروردہ بیس سالہ نوجوان جو پہلی مرتبہ وطن سے اتنی دور گیا تھا، اجنبی ماحول میں جس کا ایک ایک فرد ممتحن بنا ہوا تھا، ایک ایک لمحہ اس کے لیے صبر آزما تھا۔ اس آزمائش وابتلا کے دور میں احقر کا مرجع ذات برحق کے علاوہ حضرت شیخ الادب قدس اللہ سرہٗ العزیز کا دامن لطف وکرم تھا، احقر ہر تیسرے چوتھے روز حالات سے آگاہ کرتا، ہدایت یہ تھی کہ جو خط عربی میں نہیں ہوگا، اس کا جواب نہیں دیا جائے گا؛ لہٰذا خط لکھتے وقت بہ تکلف عرب بننا پڑتا تھا، مگر حضرت مرحوم کی سرپرستانہ شفقت ملاحظہ فرمائیے کہ عریضہ کا جواب فوراً ہی عربی میں دیا جاتا۔ اور جب یہ حقیقت بھی پیش نظر رہے کہ احقر کی طرح ہر زمانہ اور ہر ایک دور میں کئی کئی طلبہ زیر تربیت رہے ہیں اور سلسلہ مراسلات ان سے اسی طرح قائم رہا ہے تو حضرت کی بے پناہ مصروفیت اور شفقت بزرگانہ کی وسیع ذمہ داریاں انجام دینے کے لیے آپ کی بے پناہ جفاکشی کا بھی اندازہ کرنا آسان ہوجاتا ہے۔

بہرحال تاریخ ماضی کے جو چند سبق خواب وخیال کی طرح دماغ میں نقش ہیں، ان میں ایک یہ بھی ہے کہ عریضوں کے جواب میں ایک مرتبہ ایک فقرہ تحریر فرمایا، جس کا مفہوم یہ تھا: ''ضبط وتحمل اور صبر واستقلال سے کام لو، یہاں تک کہ ''علم'' ان کو آپ کے احترام پر مجبور

کردے، **حتی یضطرھم العلم إلیک**" یہاں علم کہاں تھا! جو کسی کو اور بالخصوص اس ممتحن ماحول کو اس ناکارہ کے احترام پر مجبور کرتا؛ مگر یہ صرف بزرگوں کی دعا تھی کہ چند ماہ بعد ہی یہ پیشین گوئی صادق آ گئی، اور جو امتحان لینے والے تھے، وہ سراسر تسلیم ورضا بن گئے، پھر تو حالت یہ تھی کہ محمد میاں کا ہر ایک "قول" سند تھا، اور اس کے پلہ کا نہ کوئی مدرس تھا اور نہ کوئی خطیب وادیب، محمد میاں کے نام سے بہت کم واقف تھے؛ البتہ "ادیب صاحب" خطاب چھوٹے بڑے کی زبان پر تھا (اگرچہ قطعاً بے جوڑ تھا) کسی ایسے ہی موقع پر احقر نے دعا کی درخواست کی تو فرمایا: "آپ کے فرمانے کی ضرورت نہیں، جب یاد پڑتی ہے تو خود دعا کی جاتی ہے"۔ یعنی فارغ التحصیل طلبہ سے بھی یہ تعلق رہتا تھا کہ ان کی تکلیف خود اپنی تکلیف بن جاتی تھی اور ان کی پریشانی کا اثر وہی ہوتا تھا جو خود اپنی پریشانی کا اثر دل ودماغ پر ہو، جس کی وجہ سے قلب مضطر بے ساختہ دعا پر مجبور ہو جائے۔

شیخ المشائخ سلطان الاولیاء حضرت شیخ نظام الدین چشتیؒ کا واقعہ مشہور ہے کہ کسی بے تکلف ارادت مند نے عرض کیا: "خدا کے فضل سے کسی قسم کا فکر دامن گیر نہیں؛ مگر پھر بھی حضرت والا افسردہ رہتے ہیں، جس کا اثر صحت پر بھی پڑ رہا ہے"۔ سلطان الاولیاء نے فرمایا: "بے شک مجھے اپنا کوئی فکر نہیں، ذاتی طور پر کوئی پریشانی بھی دامن گیر نہیں، مگر لوگ مجھ سے دعا کی فرمائش کرتے رہتے ہیں اور صورت یہ ہے کہ جب تک ان کی پریشانی خود اپنی پریشانی نہ بن جائے، دعا میں تاثیر پیدا نہیں ہوتی"۔ سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے۔ سلطان المشائخ کا یہ جواب حضرت استاذ مرحوم کے ارشاد کی تفسیر ہے۔

کوئی معاوضہ منظور نہیں:

کسی تعطیل کے موقع پر احقر وطن عزیز (دیوبند) حاضر ہوا، تو حضرت کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے ایک "صافہ" لیتا آیا، حضرت استاذ دیوبند سے باہر تشریف لے گئے تھے، اور جب تک احقر دیوبند رہا، واپسی نہیں ہوئی، تو احقر یہ صافہ مکان پر پہنچا گیا، اس طرح اس حقیر ہدیہ کی بالواسطہ پذیرائی تو ہوگئی مگر فوراً ہی گرامی نامہ پہنچا، جس میں طنز آمیز

شکریہ تھا، یعنی اس ہدیہ پر ناگواری کا اظہار فرمایا گیا تھا، پھر اس کے بعد احقر کو تو کبھی ہدیہ پیش کرنے کی توفیق نہیں ہوئی۔

البتہ اس کے برعکس حضرت کی طرف سے ہدایا برابر عطا ہوتے رہے اور انداز عطا کچھ ایسا ہوتا تھا کہ انکار کی گنجائش نہیں ہوتی تھی۔ تقریباً دو سال پہلے کا واقعہ ہے کہ مجلس شوریٰ کے اجلاس سے فراغت کے بعد احقر کو اپنے کمرے میں لے گئے اور راستہ میں آہستہ آہستہ فرمایا: ''اولاد خواہ کتنی ہی بڑی ہو جائے؛ مگر والدین کی نظر میں وہ بچہ ہی رہتی ہے، میرا تعلق آپ سے اسی قسم کا ہے''۔ احقر کے کان ارشاد گرامی کی طرف متوجہ تھے، قدم ساتھ ساتھ اٹھ رہے تھے اور دماغ ان کلمات کا محل ومنشا اور سیاق وسباق تلاش کرنے میں مصروف تھا، حجرہ میں پہنچ کر الماری کھولی اور ایک حیدرآبادی رومال عطا ہوا، اب اگر اولاد ہونے سے انکار کرتا تو اس عطیہ سے بھی انکار کرسکتا تھا۔

حج بیت اللہ شریف سے واپسی پر ملاقات ہوئی تو ایک رومال کی طرف اشارہ کر کے فرمایا: یہ رومال طواف بیت اللہ شریف کے وقت سر پر تھا، اور ساتھ ساتھ رومال پیش کر دیا۔ اب اس سعادت سے انکار ہی کا کیا موقع تھا! ایک مرتبہ غالباً عید کے موقع پر احقر بچوں کو کچھ دے آیا تو اس سے دو چند حضرت موصوف نے احقر کے بچوں کو عنایت فرمایا۔ یہ انداز منظوری ایسا عجیب وغریب تھا کہ پھر کچھ پیش کرنے کی ہمت ہی نہیں ہوئی۔

احقر کا بڑا لڑکا حامد میاں اور اس کا چھوٹا بھائی خالد میاں سلمہ دونوں حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی دامت برکاتہم کی مجلس میں حاضر تھے، اور حضرت شیخ الادبؒ بھی تشریف فرما تھے، حامد میاں حضرت شیخ الاسلام کی خدمت میں بڑی حد تک بے تکلف ہے، اس نے چھوٹے بھائی خالد میاں کے متعلق عرض کیا: یہ قرآن پاک حفظ کر چکا ہے، ترقی علم کے لیے دعا فرمائیے۔ حضرت شیخ الاسلام نے فوراً حامد میاں سے مٹھائی کا مطالبہ کر لیا۔ یہ فقیر ابن الفقیر تہی دست ہے، مسکرا کر مطالبہ کو ٹال دینا چاہا، حضرت استاذ الادب کا دست کرم فوراً آگے بڑھا اور مبلغ پانچ روپیہ حامد میاں کو عنایت ہوئے کہ مٹھائی منگاؤ؛ چنانچہ

مطالبہ کی تعمیل اور تقسیم شیرینی کی منزل بڑی آسانی اور مسرت سے طے ہوئی۔

مجلس ختم ہوئی تو دوسرے روز حامد میاں نے حضرت استاذ الادب کی خدمت میں پانچ روپیہ ادا کرنے چاہے تو سختی سے واپس کر دیئے کہ ''میں نے اپنے بچے کی خوشی میں صرف کئے ہیں، تمہیں واپس کرنے کا کیا حق!''

بات سے بات پیدا ہو رہی ہے اور مضمون طویل ہوتا جا رہا ہے، مقصد تو یہ تھا کہ خودداری، استغنا، بے نیازی، چھوٹوں پر شفقت اور ان کے لیے جانی اور مالی بار برداشت کرنے کی چند مثالیں سامنے آ جائیں۔ اللہ تعالیٰ ان نمونوں پر عمل کی توفیق بخشے۔

اب میں مولانا نسیم احمد صاحب فریدی امروہوی کی ایک طویل تحریر کا آخری فقرہ نقل کر کے یہ مضمون ختم کرتا ہوں:

''حضرت سید احمد شہیدؒ کے رفقاء خاص میں سے حضرت مولانا عبدالحی صاحب بڈھانوی کی جب وفات ہوئی تو سید صاحب کے بھانجے حضرت سید احمد علی صاحب شہید نے وزیر الدولہ (والی ٹونک) کو اس سانحے کی اطلاع دیتے ہوئے لکھا تھا:

مولانا کا غم مفارقت ایسا نہیں، جو ایک شخص یا چند اشخاص تک محدود ہو، یہ عام ماتم ہے، چاہیے کہ ہر مسلمان دوسرے سے ماتم کرے''۔

حضرت شیخ الادب کا سانحۂ ارتحال بھی ایسا ہی ہے، تمام مسلمان عموماً اور متوسلین دارالعلوم خصوصاً ایک دوسرے سے تعزیت کریں اور حضرت مولانا کے لیے دعاء مغفرت فرمائیں۔

☆☆☆☆☆

حضرت مولانا عبدالحق صاحب مدنیؒ

(مہتمم مدرسہ شاہی مرادآباد)

(ولادت: ۱۳۰۵ھ [۱۸۸۵ء] وفات: ۳۰/ذی قعدہ ۱۳۷۴ھ ۲۱/جولائی ۱۹۵۵ء)

مولانا محمد میاں صاحب

مولانا عبدالحق مدنی کا آبائی وطن دیوبند تھا، آپ کے والد مدینہ منورہ میں مقیم ہوگئے تھے، آپ وہیں پیدا ہوئے، وہیں تعلیم حاصل کی اور ایک عرصہ تک وہاں مقیم رہے، اس لئے مدنی کہلاتے ہیں۔ آپ نے مکمل تعلیم (الف با سے لے کر بخاری شریف تک) حضرت شیخ الاسلامؒ سے مدینہ منورہ میں حاصل کی اور انھیں سے بیعت ہوئے اور اجازت بیعت بھی حاصل ہوئی۔ ۱۳۴۱ھ (۱۹۲۲ء) میں ہندوستان آئے، تقریباً سال بھر اپنے وطن دیوبند میں رہے، اس کے بعد دارالعلوم کھڈہ کراچی حدیث و تفسیر کے استاذ بن کر تشریف لے گئے، وہاں چھ سال رہنے کے بعد مرادآباد آئے اور پھر یہیں کے ہوکر رہ گئے۔ (تفصیلی حالات کے لئے دیکھئے ماہنامہ ندائے شاہی، تاریخ شاہی نمبر [نومبر/دسمبر ۱۹۹۲ء] ضیاء الحق خیرآبادی

ایک عابد و زاہد، حامل قرآن، صادق اللہجہ، حق پرست و حق گو، جس کا علم ہم دوش عمل، جس کی راتیں تلاوت کلام اللہ کے انوار سے روشن، اوقات سحر چشم گریاں کی شبنم سے پرنم، تواضع پسند، جہان نواز، جس نے گذشتہ ہفتہ اس دار ناپائیدار کو الوداع کہا اور فانی زندگی کے ۷۲ سال گزار کر دار آخرت کی حقیقی زندگی حاصل کی۔ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ، (العنکبوت: ۶۴)

یہ مدنی عالم تقریباً ۱۹۲۵ء میں حجاز سے ہندوستان آیا، یہ حریت پسند ترکوں کا حامی

تھا، ترکی حکومت ختم ہوئی تو شریف حسین کے عہد حکومت میں ارض حجاز اس کے لیے تنگ ہوگئی۔ چند سال شام گزارے اور پھر ہندوستان آکر اپنے استاذ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی اور حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب (سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند) کے توسط سے اول مدرسہ عربیہ کھڈہ (کراچی) میں درس حدیث وقرآن کی شمع روشن کی، پھر تقریباً ۱۹۲۸ء میں سرزمین مرادآباد آپ کے باران فیض سے پہلی مرتبہ شاداب ہوئی۔

اول آپ کو مدرسہ امدادیہ مرادآباد میں درس حدیث وتفسیر کے لیے مدعو کیا گیا تھا، مگر جب ۱۹۳۰ء کی تحریک کانگریس کے سلسلہ میں مولانا فخرالدین احمد صاحب شیخ الحدیث جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مرادآباد اور کاتب حروف محمد میاں گرفتار ہوکر سرکاری مہمان بنادیئے گئے تو آپ نے اپنی خدمات مدرسہ شاہی مرادآبا کے لیے وقف کردیں۔

جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مرادآباد کی آزاد فضا آپ کی حریت نواز طبیعت کے لیے بیحد موزوں ثابت ہوئی، آپ بلا کسی معاوضہ کے فی سبیل اللہ ۲۵/سال تک مدرسہ شاہی کے اہتمام کی تمام تر ذمہ داریاں سنبھالے رہے اور مدرسہ ہر ایک لحاظ سے روز افزوں ترقی کرتا رہا۔

مرادآباد کی مشہور مرکزی مسجد ''شاہی مسجد'' اس آفتاب فیض کے لیے مشرق بنی جہاں آپ طلوع آفتاب کے وقت سے تقریباً ایک گھنٹہ بعد تک قرآن پاک کی تفسیر بیان فرماتے تھے۔ مرادآباد کے گوشہ گوشہ سے سیکڑوں قدرداں مرد وعورت اس درس میں حاضر ہوتے اور تھوڑے ہی دنوں میں اتباع سنت کا وہ رنگ ان پر غالب آجاتا جو ان کی زندگیوں کو ہمیشہ کے لیے نمونہ کی زندگی بنادیتا تھا۔ گزشتہ سال سے ان پروانوں کا ہجوم اس قدر بڑھ گیا تھا کہ پورے مجمع تک آواز پہنچانا مشکل ہوگیا تو ایک لاؤڈ اسپیکر مستقل طور پر نصب کرانا پڑا۔

مدرسہ شاہی کی طرح شاہی مسجد کی مرکزیت اور اس کی شہرت وعظمت میں بھی آپ کی برکت سے غیر معمولی اضافہ ہوا، اور آپ کے فیوض وبرکات کا ادنیٰ کرشمہ تھا کہ اس مسجد

نے پرانا چولا بدل کر عظیم الشان تعمیر کا نیا چولا زیب بدن کرلیا۔

درس قرآن کا انداز آپ کا ایسا عجیب وغریب تھا کہ پورے ہندوستان میں اس کی نظیر ملنی مشکل ہے، طرز ادا نہایت سہل اور شستہ، بلند سے بلند مفہوم اور مشکل سے مشکل مضمون کو آپ اس طرح پیش فرماتے تھے کہ عورتیں اور بچے بھی اس کو دلچسپ قصے کی طرح ذہن نشیں کرلیتے۔ درس قرآن کی طرح آپ کا وعظ بھی نہایت مفید اور دلدوز ہوتا، عام فہم تمثیلات سے ہر ایک کو دل نشیں کرادیتے تھے، سب چھوٹے چھوٹے جملے جو دل سے نکلتے تھے اور دل پر اثر کرتے تھے۔

اور سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ آپ کا پورا وعظ رطب ویابس سے پاک ہوتا تھا، موضوعات سے ہمیشہ اجتناب کرتے تھے، صرف کلام اللہ شریف یا احادیث صحیحہ سے آپ استدلال کرتے تھے، ''من ہمہ آفتابم ہمہ ز آفتاب گویم'' آپ کے حسب حال تھا۔

خاندان وطن اور تاریخ وفات:

آپ کا آبائی وطن ہی قصبہ دیوبند تھا جہاں آپ نے ۳۰؍ذی قعدہ ۱۳۷۴ھ ۲۱؍جولائی ۵۵ء کو ساڑھے تین بجے وفات پائی، اور جس کے متبرک قبرستان میں جہاں حجۃ الاسلام حضرت مولانا قاسم صاحب نانوتوی، شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب، عارف ربانی حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب جیسے اکابر دین آسودہ ہیں آپ کو مغرب سے چند منٹ پہلے دفن کیا گیا۔

قصبہ دیوبند کے مشہور عثمانی خاندان سے آپ کا تعلق تھا، آپ کے والد ماجد ڈاکٹر رفاقت علی صاحب انگریزی فوج میں ملازم تھے، فوج کو افریقہ جانے کا حکم ہوا تو ڈاکٹر صاحب بھی تعمیل حکم کے لیے ساحل سمندر پر پہنچے مگر جیسے ہی جہاز پر نظر پڑی ایک خاص جذبہ نے ایک دوسرے جہاز پر پہنچا دیا جو جدہ جارہا تھا، جذبہ یہ تھا کہ بحری سفر سب سے پہلے حج بیت اللہ کے لیے کرنا چاہیے، اس جذبہ نے قانون کے بندھن بھی ڈھیلے کردیئے اور جب آپ حج وزیارت کے مبارک مقصد میں کامیاب ہوچکے تو ہندوستان واپس آنے کے بجائے

ترکی فوج میں آپ ملازم ہوگئے۔

آپ ایک حاذق اور تجربہ کار ڈاکٹر تھے، آپ کی حسن خدمات نے آپ کو بہت جلد ''میجر'' کے عہدے پر فائز کردیا۔ ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم میں آپ نے ترکی حکومت کی بہت کافی امداد کی، یہاں تک کہ حکومت ترکی کے سقوط کے وقت آپ کی تیس ہزار گنی حکومت پر قرض تھی۔

ڈاکٹر صاحب نے مدینہ طیبہ میں مسجد نبوی کے قریب ایک چھوٹا سا مکان بھی بنوالیا تھا جو اب بھی موجود ہے، اور اس میں مولانا عبدالحق صاحب کی چھوٹی بہن مقیم ہیں۔ (جو بدقسمتی سے اب بالکل لاوارث رہ گئیں)

مولانا عبدالحق صاحب اسی سرزمین مقدس میں پیدا ہوئے، اسی متبرک آب وہوا میں نشوونما ہوا اور اسی دیار پاک کے علماء ومشائخ بالخصوص شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی مدظلہ العالی کے حلقۂ درس سے دولت علم فراہم کی، جس کو آپ عمر بھر لٹاتے رہے۔

مولانا عبدالحق صاحب صرف حافظ قرآن وعالم دین ہی نہ تھے بلکہ آپ رنگین طبع ادیب اور ساحر الکلام شاعر بھی تھے، آپ کے ادبی ذوق نے آپ کو اپنے زمانہ کا ابونواس، بحتری بنادیا تھا، عرب کے بہت سے شعراء آپ کے شاگرد تھے، آپ کی ادبی مجلسیں اب تک مدینہ طیبہ کے ہم عمر رؤسا کو یاد ہیں اور آپ کے استاذانہ عظمت کے سامنے شعراء مدینہ (منورہ) اب تک گردن جھکاتے ہیں۔ یہ ذوق ہندوستان پہنچنے کے بعد بھی باقی رہا۔

آپ کا غیر مطبوعہ دیوان سفر وحضر میں ساتھ رہتا تھا اور گرمی مجلس کے لیے آپ اپنے عربی اشعار وقصائد سے دوستوں کو محظوظ فرمایا کرتے تھے، مگر تقریباً دس سال سے آپ کے مذاق میں غیر معمولی انقلاب پیدا ہوگیا تھا، اشعار یا قصائد کا لکھنا تو درکنار پڑھنا بھی پسند نہیں کرتے تھے اور جب آپ کے دوست مولانا قاری محمد اسمٰعیل صاحب نے ایک مرتبہ آپ کا کلام مرتب کرنے کی خواہش ظاہر کی تو آپ نے شان بے نیازی سے فرمادیا، ان

اوراق پارینہ میں نہ مجھے الجھاؤ اور نہ اپنا وقت ضائع کرو۔ اس سال ایک صاحب کے شدید اصرار پر بیس اکیس اشعار سلطان سعود بن عبدالعزیز (ملک حجاز ونجد) کی شان میں کہے تھے جو کسی اخبار میں شائع بھی کیے گئے ہیں۔

حفظ کلام اللہ شریف نے آپ کے ادبی ذوق کو خاص جلابخش دیا تھا اور ادبی ذوق نے تلاوت کلام اللہ میں وہ کیف پیدا کر دیا تھا جو سننے والوں کو گرویدہ اور خود پڑھنے والوں کو بسا اوقات وارفتہ بنا دیا کرتا تھا۔ کیف زبان اور لہجہ سے گزر کر دل پر اثر کرتا اور رقتِ قلب چشم گریاں سے سیل اشک جاری کر دیتی تھی۔ مہمان نوازی عرب کا عام مذاق ہے، مولانا عبدالحق صاحب مدنی کے اوصاف میں یہ اضافہ بھی کر لیا جائے کہ مہمان نوازی کے ساتھ آپ کو کھانا پکانے کا بھی شوق تھا، اور اپنے اس کمال پر اتنا ناز تھا کہ کسی دوسرے کا پکایا ہوا کھانا بڑی مشکل ہی سے پسند آتا تھا۔ باہر سے آنے والوں کا کوئی دوست یا بزرگ اگر آپ کے یہاں قیام نہ کرتا تو آپ کی خفگی کو رفع کرنے کے لیے اس کو بار بار معذرت کرنی پڑتی، اور لامحالہ کسی وقت آپ کے یہاں کا پرتکلف کھانا ضرور کھانا پڑتا۔ آپ کا یہ دعویٰ تھا کہ آپ بہت کفایت شعار ہیں مگر جاننے والے یہ بھی جانتے تھے کہ آپ کی نظر میں روپیہ کی قدر ٹھیکرے سے زیادہ نہیں، بہت سے احباب آج بھی آپ کے مقروض ہیں۔ خدا کرے ان کو ادائیگی قرض کی توفیق ہو۔

۱۹۴۹ء کے سفر حجاز کا واقعہ ہے، مکہ معظّمہ سے مدینہ منورہ جانے لگے تو آپ نے اپنے دوست مولانا محمد صادق صاحب مجددی سے کچھ رقم قرض لی، کیونکہ خیال یہ ہو گیا تھا کہ موجودہ رقم مصارف کے لیے پوری نہ ہوگی، مگر مدینہ منورہ پہنچ کر ایک روز اپنی ہمیانی ٹوٹلی جو کمر سے بندھی رہتی تھی تو یکے بعد دیگرے سو روپئے کے تین نوٹ برآمد ہوئے۔ تین سو کی رقم اسی کی نظر سے چوک سکتی ہے جس کی نظر میں روپیہ کی قدر نہ ہو۔

مکہ معظّمہ کے مجددی خاندان سے آپ کے تعلقات بہت گہرے تھے، اسی خاندان کے سربرآوردہ فرد مذکورۃ الصدر مولانا محمد صادق صاحب مجددی ہیں جو کہ مکہ معظّمہ

کے بہت بڑے تاجر ہیں۔ یہ آپ کے بچپن کے جگری دوست تھے، ان کے چھوٹے بھائی مولانا محمد مدنی آپ کے تلمیذ رشید اور لاڈلے شاگرد تھے۔ مولانا قاری محمد اسمٰعیل صاحب مدنی اسی خاندان کے ایک فرد ہیں جو عرصہ سے ہندوستان میں مقیم اور اورینٹل کالج رامپور میں بحیثیت استاذ درس تجوید وقرأت کی خدمت انجام دیتے ہیں، مولانا موصوف اپنے ایک طویل ماتمی بیان میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

''مولانا عبدالحق صاحب مدنی قدس اللہ سرہ العزیز تحصیل علوم کے بعد ایک عرصہ تک مدینہ منورہ میں درس دیتے رہے پھر ایک عرصہ تک تجارت کی سنت بھی ادا کی۔ ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم میں ترکی حکومت کے فیصلہ کے مطابق باشندگان مدینہ طیبہ کے ساتھ دمشق (سوریا) منتقل کئے گئے، اور جب تک وہاں قیام رہا ایک بہت بڑے مدرسہ میں جو دمشق کی مشہور جامع مسجد ''جامع اموی'' کے قریب تھا آپ درس دیتے رہے، پھر مکہ مکرمہ واپس ہوئے تو مدرسہ صولتیہ میں خدمت درس شروع کر دی۔ آپ ۱۳۴۲ھ تقریباً ۱۹۲۱ء میں کراچی تشریف لائے۔''

پہلی رفیقۂ حیات جلاوطنی کے زمانہ میں شام میں انتقال کر چکی تھیں، مکہ معظمہ پہنچ کر دوسرا عقد کیا جن کی وفات کراچی میں ہوئی۔ ان کی وفات کے بعد شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب کی بھتیجی (مولانا حامد حسن صاحب کی صاحبزادی) سے عقد کیا جن کے فرزند حافظ محمد یحییٰ صاحب اور مولانا محمد اسمٰعیل صاحب اور دو بہنیں آپ کے وارث ہیں۔

☆☆☆☆☆

فسانۂ عبرت

کرشمۂ قدرت
مادّیات کے متوالوں کے لیے درسِ حقیقت

مولانا سید محمد میاں صاحب، مدرس مدرسہ قاسمیہ مراد آباد
وناظم جمعیۃ علماء مراد آباد (یوپی) رفیق ادارہ قاسم العلوم

نوٹ: سید الملت مولانا سید محمد میاں صاحب کا یہ مضمون نما افسانہ یا افسانہ نما مضمون دیوبند سے عتیق احمد صدیقی کی زیر ادارت نکلنے والے رسالہ قاسم العلوم میں شعبان ۱۳۵۳ھ (ص:۳۳) و رمضان ۱۳۵۳ھ (ص:۱۷) کے شماروں میں دو قسط میں شایع ہوا تھا۔ یہ مکمل طور سے نہ افسانہ کے ذیل میں آتا ہے اور نہ ہی اسے مضمون یا مقالہ کہا جا سکتا ہے۔لیکن یہ بات طے ہے کہ یہ درس عبرت سے معمور ایک ایسی کہانی ہے جس میں زیب داستان کے لیے کچھ فکشن کی شمولیت بھی ہے مگر اس کا بنیادی تخیل حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بچپن سے مستعار لیا گیا ہے، اس لیے اس کا تخیل مبنی برصداقت ہے۔اس اعتبار سے اس کو ''فسانہ عبرت'' کا نام دینا بالکل موزوں اور مناسب تعبیر ہوگی۔اور اس کہانی میں پنہاں عبرت وموعظت کے ساتھ اشاعت کا مقصد مولانا کے اس نمونۂ تحریر کو قارئین کے سامنے لانا ہے۔

اس افسانہ کے متعلق ڈاکٹر مفتی ابرار اجراوی اپنے مضمون **''مولانا سید محمد میاںؒ کی نثر نگاری''** میں لکھتے ہیں: اس افسانہ کی بُنت اور تعمیر میں کافی دقت نظری سے کام لیا گیا ہے۔کردار بھی کم ہیں اور وحدت تاثر جو افسانہ کی بنیادی شرط ہے، اس کی جلوہ گری بھی نظر آتی ہے۔ابتدا تا انتہا ایک سسپنس رہتا ہے، جو افسانہ کو افسانہ بناتا ہے۔وہ بہتر افسانہ نگار بھی ہو سکتے تھے، مگر مروجہ افسانہ نویسی سے مولانا کے احتراز کی وجہ بہت صاف تھی۔اردو افسانہ کو اس وقت بھی مہمل گوئی اور باطل خیالات کا مجموعہ سمجھا جاتا تھا۔علامہ سید سلیمان ندوی نے جو کچھ لکھا تھا وہ بالکل صحیح تھا۔حالاں کہ اس وقت اردو افسانہ پریم چند وغیرہ کی کوششوں سے اردو

ادب میں اپنی اہمیت منوا چکا تھا۔ اردو افسانہ کے حوالہ سے سید سلیمان ندوی نے لکھا تھا: ''ہمارے ملک میں افسانہ نویسی جس طرز کی جاری ہے، اسکے لئے نہ علم کی ضرورت ہے نہ مہارت انشاء کی، ہر وہ صاحب قلم جو دو انسانوں کی باتوں کو قید تحریر میں لانا جانتا ہو، وہ ہمارے ملک کا بڑا افسانہ نویس ہے، اس طرز تحریر میں نہ منطقی دلائل کی حاجت پڑتی ہے نہ فلسفیانہ نظریوں کی، نہ تاریخی معلومات کی نہ ادبی نکتہ دانی کی، نہ مذہبی علوم کی، بلکہ صرف اتنا سلیقہ کافی ہے کہ وہ مبتذل خیالات، سوقیانہ تصورات اور عریاں جذبات کو نامانوس ترکیبوں اور مضحکہ انگیز فقروں میں ادا کر کے نوخیزوں کو بہلا اور نوجوانوں کو لبھا سکے.....کیا علم و دانش کے بعد اخلاق و آداب بھی اس طبقہ سے رخصت ہو چکا ہے۔'' (شذرات معارف، علامہ سید سلیمان ندوی، فروری ۱۹۳۳ء)

<u>کل مولودٍ یولد علی الفطرۃ (الحدیث)</u>

شوقِ وطن

قابلِ دید ہے بے تابیِ دل کا مضموں حرف کوئی میرے مکتوب میں ساکن ہی نہیں

''رب العالمین.....خداوندا تیرا شکر.....میرے مولا تیرا ہزار ہزار شکر.....میرے پروردگار تیرے بہت بہت کچھ احسان ہیں.....صبح شام نہیں ہر گھڑی.....بلکہ ہر سانس تیرے احسانو ں کی بارش ہوتی رہتی ہے.....اللہ میاں تو نے بہت احسان فرمائے اور فرماتا رہتا ہے.....میں ادنیٰ احسان کے قابل بھی نہ تھی۔ سچ ہے تیرے معمولی احسان کا شکریہ بھی ادا نہیں کر سکتی.....اے میرے مہربان خدا! اے بے کسوں کی فریاد سننے والے! اے بچھڑے ہوؤں کو ملانے والے خدا! میری آواز سن!.....ایک کمزور کی فریاد سن!.....ایک گنہگار کی دعا قبول فرما!.....مجھے اس اجڑے دیار سے نکال دے!.....ایک دن ایسا لا کہ میں اس منحوس شہر سے نکل کر جہاز پر سوار ہوں..... ہاں جلد وہ گھڑی لا کہ اس نامبارک بستی کو خیر باد کہوں۔''

آخری شب کی تاریکی میں ''ہاجرہ'' کی یہ دردمندانہ دعا ایسی نہ تھی کہ عرش رحمان تک نہ پہنچ سکتی اور اجابت کا دروازہ کھٹکھٹا کر ربانی کرم کو اپنی طرف متوجہ نہ کر لیتی۔ ع

اجابت از درِ حق بہر استقبال می آید

کچھ زیادہ عرصہ نہ گذرا تھا کہ اس کے محبوب ترین شوہر ''شمیم'' کو اپنے مقصد میں

کامیابی نصیب ہوئی اور اپنے وطن واپس ہونے کا ارادہ کیا۔ ہاجرہ کی حالت نسوانی عوارض کے باعث ضرور ایسی تھی کہ اس کو سفر کی اجازت نہ دی جا سکتی مگر مضطربانہ شوق وطن نے ان تمام مصلحتوں کو نظر انداز کر دیا تھا۔

سفر:

فریاد کرنے والے کی فریاد اور ایک مضطر کی دعا اگر اثر نہ کرتی تو کون آج دعا کا قائل ہوتا؟ ہاں یہ ضرور ہے کہ دعا کے الفاظ میں کمی بیشی ہو جانے کے باعث اور بسا اوقات دعا کے مناسب آداب اور دعا کے متعلق ضروری توجہات نہ ہونے کے سبب انسان یہی خیال کر لیتا ہے کہ ہماری دعا میں کچھ اثر نہیں۔ ہاجرہ نے اپنی دعا میں صرف ایک ایسی گھڑی کی درخواست کی تھی جس میں وہ اس اجڑے دیار سے نکلے۔ چنانچہ اس کی دعا قبول ہوئی اور آج کی صبح وہ مبارک صبح ہے جس میں ہاجرہ اپنی دعا کی قبولیت محسوس کر رہی ہے۔ ہاجرہ کی زندگی میں یہ پہلی صبح ہے جو اس کو اپنی مسرت بیزیوں سے مست کیے ہوئے ہے، اٹھلاتی ہوئی نسیم کی ہر ہر جنبش اس پر فرحت کا عطر چھڑک رہی ہے، نازک خرام بادصبا کی روح افزا خرامش اس کی ہر آرزو کو غنچہ اور غنچہ کو گل شگفتہ بنا کر مہکا رہی ہے، آفتاب کا کرہ بھی آج ہاجرہ کی نظر میں شادمانی کا مجسمہ بنا ہوا ہے، سرور اور انبساط کی کرنیں منتشر ہو کر ہاجرہ سے ہم کنار ہو رہی ہیں اور حرارت کے بجائے ہزاروں امنگوں کی روح ہاجرہ کے بدن میں دوڑ رہی ہے۔ ہاجرہ سفر کے لیے تیار ہے، وہ اپنی چند روزہ سہیلیوں سے آج وداعی ملاقات کے وقت افسوس کا اظہار کر رہی ہے۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ اس کی آنکھیں بھی کچھ پرنم ہیں مگر اندرونی مسرت اس ظاہری افسوس پر بار بار خندہ زن ہے۔

سامان پہلے سے مہیا کر لیا گیا تھا، ابھی کچھ دن نہ چڑھنے پایا تھا کہ گاڑیوں پر ساما ن لادا گیا اور ایک گاڑی میں شمیم سوار ہو کر بندرگاہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ شمیم کی سواری کے ساتھ اور کچھ آگے پیچھے ہاجرہ کی پر تکلف زربفت پوش پنس تھی جو قیمتی جواہر سے مرصع تھی۔ پردوں کے کناروں پر بڑے موتیوں کے بیچ میں جھومکے نما سنہرے روپہلے خوبصورت قمقمے

آویزاں تھے۔ مدراس کی سڑکوں پر یہ پر تکلف سواری عجوبہ بنی ہوئی تھی اور دیکھنے والوں کو نوعروسی کا دھوکا معلوم ہوتا تھا۔ غرض اسی شان سے یہ دونوں فدا کارانِ مودت بندر پر پہنچے، جہاز تیار تھا، آج ہی روانگی کی تاریخ تھی۔ شمیم کی ذاتی وجاہت اور اور ہر دل عزیز تعلقات نے ٹکٹ کی خریداری اور پھر جہاز پر سوار ہونے کی تمام مشکلات میں بہت کچھ امداد کی اور یہ تمام ضرورتیں نہایت سہولیت سے انجام پا گئیں اور ابھی شام نہ ہونے پائی تھی کہ جہاز نے لنگر اٹھایا اور روانگی کی گھنٹی بج گئی اور مدراس بندرگاہ سے چین کی طرف جہاز روانہ ہو گیا۔

ورطہ ہلاکت:

دل کہ یک عمر بخون جگرش پروردم　　　عاقبت برسرم آورد بلا یا قسمت!

صیاد نے کب ناوک بے داد لگایا　　　جب شاخ سے ہم اڑنے کو پرتوں رہے تھے

''نیر'' اور ''ہاجرہ'' کو جہاز میں سوار ہوئے پورا ایک ہفتہ ہو گیا ہے۔ متواتر ایک ہفتہ کے سفر سے ان دونوں پر تکان کا اثر ضرور ہونا چاہیے تھا مگر ہاجرہ کا شوق وطن کچھ ایسا بڑھا ہوا ہے کہ یہ تمام مشقتیں و تکلیفیں اس کی نظر میں راحت بن رہی ہیں۔ اعزا اور اقربا کی تمنائے دیدار نے اس کے پر آرزو دل کو مسرتوں کا زاویۂ طرب بنا رہا ہے۔ فرسٹ کلاس کے دریچوں سے سمندری منظر اس کی قلبی فرحت میں ایک خاص رقص پیدا کرتا رہتا ہے، مگر نہ معلوم آج صبح سے ہاجرہ کے چہرے پر اداسی کیوں چھائی ہوئی ہے، طبیعت افسردہ ہے اور دل بیٹھا جاتا ہے۔ چونکہ کچھ خفیف سی دردسر کی شکایت بھی محسوس ہو رہی تھی، اس وجہ سے وہ اپنے کمرے میں بستر پر لیٹ گئی ہے اور غالباً کچھ غنودگی بھی آ گئی ہے۔

شمیم باہر کمرہ میں ایک آرام کرسی پر بیٹھا ہوا کوئی کتاب یا رسالہ دیکھ رہا تھا جو ابھی کسی دوست نے اسکولا کر دیا تھا۔ کتاب کے مطالعہ میں شمیم کا انہماک کچھ ایسا بڑھا ہوا ہے کہ پس و پیش کی خبر نہیں۔

''جہاز والو ہوشیار ہو جاؤ! جہاز خطرہ میں ہے۔'' کپتان جہاز کے خاص خلاصی کی ایک بھیانک آواز سنی، جس نے تمام جہاز والوں کی طرح شمیم کو بھی چونکا دیا۔ 'ہئیں! کیا

بات۔ خیر تو ہے....ارے میاں! کیا بات ہے، کیا کہہ رہے ہو....'' (شمیم نے گھبرا کر کچھ ایسے ہی الفاظ ادا کیے)

چپراسی: ''کپتان صاحب کا حکم ہے کہ میں اطلاع کر دوں کہ جہاز خطرے میں ہے، تم لوگ اپنا اپنا سامان کرلو۔'' غالباً شمیم اپنی کتاب میں ڈاکوؤں اور چوروں کا قصہ پڑھ رہا تھا، وہی خیال اس کے دماغ میں اب تک گشت کر رہا تھا۔ وہ گھبرا کر بولا ''کیا ڈاکوؤں نے حملہ کر دیا ہے؟ بندوق تیار کرلوں؟ (جیب کی طرف اشارہ کر کے) پستول تو اس وقت جیب میں تیار ہے۔ ڈاکو کہاں ہیں؟ کیا کپتان صاحب کو گھیر لیا ہے؟'' یہ کہتا ہوا فوراً زینہ پر چڑھا اور کپتان صاحب کے پاس پہنچا۔

شمیم: ''کپتان صاحب! ڈاکو کس طرف ہیں؟''

کپتان: ''ڈاکو کیسے؟''

شمیم: ''آپ نے ابھی اطلاع بھی دی ہے؟''

کپتان: ''میں نے؟''

شمیم: ''آپ کے آدمی نے ابھی اعلان کیا ہے کہ جہاز خطرے میں ہے۔''

کپتان: ''تو پھر....خطرہ کیا صرف ڈاکوؤں کا ہے۔''

شمیم: ''اف میرا خیال کہاں گیا ہے؟ یہ تو جہاز ہے، بیچ سمندر کے ڈاکو کہاں؟ اچھا پھر خطرہ کیسا؟''

کپتان: ''سمندر میں تلاطم ہے، موجوں نے گھیر لیا ہے، نیچے کے درجے میں پانی بھر آیا ہے، اسی تلاطم کے باعث جہاز راستہ سے ہٹ گیا ہے اور اس وقت دائیں اور بائیں دو پہاڑ ہیں، سامنے سے سمندر کی موجیں پہاڑ کے برابر اٹھ اٹھ کر جہاز سے ٹکرا رہی ہیں، پیچھے ہٹانے کی تدبیریں کر رہا ہوں مگر تمام بے سود۔''

کپتان کی یہ گفتگو سنتے ہی شمیم کے ہوش ضرور اڑنے لگے مگر اس حلم اور بردباری نے اس کو قابو سے باہر ہونے اور گھبرانے کی اجازت نہ دی جس میں شمیم خاص امتیاز رکھتا

تھا۔ وہ ایک گہری فکر میں مستغرق بے شک ہوگیا اور رفتہ رفتہ ایک ایک کر کے زینہ کی سیڑھیاں طے کر رہا تھا اور اس فکر میں غرق تھا کہ کیا کرنا چاہیے؟ خیال تھا کہ اپنی شریکِ درد اور رفیق عمر ہاجرہ کو اطلاع کر دے۔ چنانچہ وہ کمرے کی طرف بڑھا مگر اس کے بے خبر سونے نے اس کی شفقت کو اجازت نہ دی کہ اس کی میٹھی نیند خراب کر کے آنے والی مصیبت سے اس کے نازک دل کو دہلا کر ابھی سے پریشان کر دے اور بے چارگی کے جان فرسا غم میں اس کو بھی مبتلا کر دے۔ چنانچہ کچھ الفاظ زبان سے بڑبڑاتے ہوئے کہے جن کو ہم صاف تو نہیں سن سکتے لیکن جو کچھ آواز کانوں میں پڑی ان کا مطلب قریب قریب یہ تھا:

''قضائے الٰہی سوتے ہوئے پر نازل ہو تو پریشانی سے تو نجات مل جائے گی۔''

آج شمیم کے اطمینان اور سکون کو دیکھ کر ہم حیران رہ گئے جبکہ اپنے خیال کے عکس دیکھا کہ وہ اپنی اسی کرسی پر پہنچ کر حسب سابق کتاب دیکھنے میں مشغول ہوگیا، مگر ہاں صرف اتنا فرق تھا کہ پہلے کسی فن کی کتاب تھی اور اب اس کے ہاتھ میں مذہبی کتاب ہے جو اس کے عقیدہ کے مطابق منزّل من السماء ہے۔

''ما در چہ خیالیم و فلک در چہ خیال''

خوش مبتلا شدم بہلا ہائے بیکسی   اے وائے بیکسی من دوائے بیکسی

شمیم جیسا اطمینان اور صبر ہر ایک میں نہ تھا اور نہ اس کی طرح کسی دوسرے کو ہاجرہ کی میٹھی نیند کا خیال تھا۔ آن کے آن میں یہ خبر تمام جہاز میں پھیل گئی۔ تھرڈ کلاس کے آدمی تو پانی بھر جانے کی وجہ سے ہائے ہوئے میں تھے مگر سکنڈ اور فرسٹ کلاس کے آدمیوں نے ایک آنے والی مصیبت کی دہشت سے شور مچانا شروع کر دیا، ہر شخص اپنی حفاظت کی فکر کرنے لگا۔ جہاز کے بے ہنگام شور نے ہاجرہ کو چونکا دیا اور جب اس نے رفقائے سفر کو روتے ہوئے دیکھا تو قبل از وقت اس پر بھی گریہ طاری ہوگیا، لیکن دریافت کے بعد حقیقت کے انکشاف نے اس کے دل کو اندازہ سے زائد دہلا دیا۔ ہزاروں حسرتوں کے جمگھٹے میں اس کی زبان سے ایک آواز نکلی جو ہجوم کے شور کے باعث سنائی نہ دے سکی، مگر غالباً اس نے سینے پر ہاتھ

مارتے ہوئے یہ کہا تھا ''ہائے وطن''

ناظرین کو پہلے سے معلوم ہے کہ نسوانی عوارض کے باعث ہاجرہ کی ایسی حالت نہ تھی کہ وہ سفر کرسکتی مگر شوقِ وطن نے اس کی تمام دوراندیشیوں کو خاک میں ملا دیا تھا۔ اس دہشت انگیز وقت نے بے چاری ہاجرہ پر ایک نئی مصیبت اور ڈال دی جو تمام جہاز والوں سے نرالی تھی۔ وہ فوراً شدید درد میں مبتلا ہوئی اور زمین پر لوٹنے لگی۔

جوں جوں دیر ہوتی جاتی تھی جہاز کپتان کی خبر وقوعی پہلو سے اپنی تصدیق کراتی جاتی تھی۔ جہاز کا تیسرا درجہ تمام پانی میں چلا گیا تھا، ہوا کا ایک سخت جھونکا آیا اور سمندر کی ایک شدید موج نے جہاز سے ٹکرا کر اس کو داہنی طرف ہٹا دیا۔ جہاز اس جانب کے پہاڑ سے ٹکرایا اور چور چور ہوگیا۔

ہاجرہ اس درد کی حالت میں تھی کہ جہاز کے ٹکرانے سے وہ اپنی جگہ سے نیچے گر پڑی اور ایک بچہ کے تولد کے ساتھ ساتھ اس کی جان نے حق کی جانب رجوع کیا۔

شمیم اپنے ہوش اب تک باقی رکھے ہوئے تھا، جبکہ جہاز کے تختے بکھر رہے تھے۔ وہ غوطہ لگاتا ہوا ایک تختہ پر قابو پانے کی کوشش کررہا تھا، چنانچہ وہ اس میں کامیاب ہوگیا مگر اس کے سامنے اس کی جان سے پیاری ہاجرہ موجود تھی۔ وہ تختہ پر سوار ہوا اور ہاجرہ کا ہاتھ پکڑ کر اپنی جانب کھینچا اور اس کو بھی تختہ سے لٹکا دیا۔ تختہ ابھی تک پانی پر ٹھہرنے نہیں پایا تھا، مگر یہ ہاجرہ کا ہاتھ پکڑ چکا تھا اور کوشش کررہا تھا کہ تختہ صحیح حالت پر لے آئے لیکن اس کے ہاتھ کی غیر معمولی خنکی نے اس کو اپنی طرف متوجہ کیا، آواز دیتے ہوئے اس کے چہرہ کو دیکھا تو چہرہ زرد تھا، سر سے خون بہ رہا تھا، آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں اور روح پرواز کرچکی تھی۔ اپنی عمر کی ہمدرد رفیقہ یعنی ہاجرہ کی اس حالت نے شمیم کے صبر کی زنجیریں کاٹ ڈالیں، ہاتھ کانپنے لگے، بدن میں رعشہ پڑ گیا، تختہ کی اچانک حرکت نے رعشہ کی امداد سے اس کو اپنے اوپر سے دھکیل دیا اور وہ ہاجرہ کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ہوئے سمندر کی تہ میں بیٹھ گیا۔

اتنا تو ہم سے پوچھ لے اے ساحل نجات — کشتی وہ کس کی تھی جو سمندر میں رہ گئی

اس ہولناک نظارہ سے آفتاب کا چہرہ بھی زرد پڑ گیا اور آخر کار اس حادثہ کی برداشت نہ لاکر مغرب کی طرف منہ چھپانے کے لیے چل دیا۔ آسمان کے کناروں نے خونی واقعہ کی خبر دینے کے لیے سرخ لباس کی دھجیاں اپنے اوپر لپیٹ لی ہیں، یا سمندر کی موجوں نے کشتگانِ جہاز کے چھینٹوں سے آسمان کے کناروں کو رنگ دیا ہے، آسمان کے تاروں نے بھی اظہارِ ماتم کے لیے ایک سیاہ مجلس قائم کرنی شروع کر دی ہے۔

مگر ہم ابھی تک اس نوزائیدہ بچہ کی تلاش میں ہیں کہ آیا اسے بھی دست اجل نے اسی طرح ہلاکت کے گھاٹ اتار دیا جیسا کہ اور بادہ کشان جام عدم کو، یا قضا نے اس کے ساتھ کچھ اور کرم کیا؟

''ہاں! دیکھو وہ ایک تختہ جا رہا ہے جس کے ایک طرف نشیب والے حصے میں ایک چھوٹا سا بچہ پڑا ہوا سو رہا تھا۔ صورت سے معلوم ہوتا ہے کہ آج ہی کی پیدائش ہے مگر افسوس اس بچہ کی زندگی ناممکن ہے، اگر چہ خاندانی شرافت اور اس کے آبائی اخلاق اور ذکاوت کا لحاظ رکھتے ہوئے دعا یہ ہے کہ'' خداوندا! تو اس شریف زادہ کو اپنی اس امان میں رکھ جس سے تو نے موسی علیہ السلام کی حفاظت کی تھی، جبکہ وہ سمندر کی تہہ میں غرق ہونے والے تھے اور جس سے تو نے یوسف علیہ السلام کی نگہبانی کی تھی جبکہ وہ چاہ کنعان میں ڈال دیے گئے تھے اور جس سے تو نے ابراہیم علیہ السلام کو گلشن وگلستان کی راحت عطا فرمائی تھی جبکہ وہ نمرود کی دہکائی ہوئی دوزخ میں جھونک دیے گئے تھے، لیکن پھر یہ خیال آتا ہے:

کیا پھلے پھولے گی امید دل پر آرزو
یاس کے دامن پہ ہے یہ پرورش پائی ہوئی

کرشمۂ قدرت

بے کس بچہ کی حیرت انگیز حفاظت

خدا کو یوں کون مانتا؟ مگر حقیقت یہ ہے کہ دست قدرت کی پراسرار کارفرمائیاں تعجب انگیز کارناموں کی روشنیوں سے ہماری آنکھوں کو چکا چوند کر کے ہماری عقلوں کو مجبور کرتی ہیں

کہ چون و چرا کو چھوڑ کر اس کی بے چگون و بے چرا ذات کو ماننے کے لیے سر تسلیم خم کریں اور عجا ئب قدرت کے ہیبت انگیز نقشے انسانی قلوب کو مضطر کرتے ہیں کہ وہ ایک ایسی ذات کو جانیں اور پھر مانیں جس کی آفرینش کی کارفرمائیاں ہر سبب اور سبب کے سلسلہ سے اعلیٰ اور بالا ہیں۔

ایک بے چارے انسان کا نازک دل مصائب اور حوادث کی الجھنوں سے گھبرا کر آمادہ ہو جاتا ہے کہ اس فریادرس ہستی سے صاف انکار کر دے جس کو پرستاران الوہیت کی اصطلاح میں ''خدا'' کہا جاتا ہے مگر کارسازی کی دل فریب تصویریں مسکراتی ہوئی اس کے سامنے آتی ہیں اور نازک لبوں کی تبسم فرمائی سے اور چشم غماز کی عشوہ انگیزی سے اس کے دل و دماغ کو ایسا مسخر کر لیتے ہیں کہ معذرت اور عفوِ تقصیر کے علاوہ اس کو کوئی چارہ نہیں رہتا: ہاتھ جوڑتا ہے، پاؤں پڑتا ہے، ندامت کے آنسو بہاتا ہے اور تمنا کرتا ہے کہ اس کی بندگی قبول فرما کر لعنت کی بے پناہ توہین سے نجات عطا فرمائی جائے۔ لیکن یہی سراپا احتیاج خاکی پتلہ، اپنے وجود کے ہر حصہ میں دوسرے کا دست نگر انسان اقبال وظفر مندی کے ماحول میں، آسائش و آرام کی سرمستیوں میں، شوکت وسطوت کے ایوانوں میں، طرب ونشاط کے سایۂ ازل میں، شادمانی ومسرت کے غالیچوں میں، کامرانی وعشرت کی آرام گاہوں میں جب اپنے کو جاگزیں پاتا ہے تو بعض اوقات اس درجہ ازخود رفتہ ہو جاتا ہے کہ نشست و برخاست میں رعونت وتکبر، رفتار و گفتار میں پندار وخود پسندی، اخلاق وعادات میں دناءت وکمینگی کے آثار نمایاں، مگر ساتھ ہی قہرمان قدرت کا زبردست ہاتھ باطل تخیلات کی گردن مروڑتا ہوا اس کی نخوت اندود جبیں کو ذلت کے ساتھ زمین پر پٹک دیتا ہے اور اس کی ناک کو مٹی میں رگڑ رگڑ کر ذلت وخواری میں دھانس دیتا ہے۔

آخر کس کو خیال ہوسکتا تھا کہ اس طوفان وتلاطم کی قیامت صغریٰ کے بعد کوئی نوزاد بچہ زندہ رہ سکتا ہے! طوفان بھی ایسا کہ خدا کی پناہ! نہ اس میں جہاز کا پتہ رہا نہ جہاز بانوں کا، نہ کشتی رہی نہ اس کا ناخدا، غوطہ زنی کے سیکڑوں ماہروں اور ہزاروں تنومند پیراک جوانوں نے اپنی شناوری کے غرور پر لکھو کھا غوطہ لگائے مگر سمندر کی بے پناہ موجوں کے تھپیڑوں کے

سامنے ان کی بے انتہا مہارت چار پانچ منٹ سے زائد ان کی جان نہ بچا سکی اور خاص کر شمیم جس کو خصوصیت سے اس فن میں دعویٰ تھا، جس کی تمام عمر جہاز کے سفر میں اور دریاؤں کی سیر میں گذری تھی، فن شناوری میں سیکڑوں بازیاں جیتی تھیں، جن کے تمغوں سے اس کے پاس بکس بھرے ہوئے تھے۔ چنانچہ وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ ''میری موت دریا کے جھکولوں میں ہرگز نہیں آسکتی۔'' اور سابق واقعات کی بنا پر اس کا یہ خیال قرین قیاس بھی تھا، مگر موت کے عقل رُبا اور مجبور کرنے والے طمانچہ نے اس کی بے انتہا جدوجہد کے معاوضہ میں آج کے روز تباہی اور بربادی کے علاوہ اور کسی چیز کا تمغہ نہ دیا اور غالباً آج کے روز سب سے پہلے ملک الموت نے اسی کی روح پر ہاتھ صاف کیا۔ کیونکہ اور آدمی تو بہت دیر تک تہ و بالا ہوتے ہوئے نظر بھی آتے رہے مگر اس کو اس چیخ کے بعد کسی نے نہیں دیکھا جو ہاجرہ کی نعش دیکھ کر بے اختیار اس کے منہ سے نکلی تھی کہ ''ہائے ہاجرہ!''

مگر شب دیجور کے سیاہ پوش تارے تمام شب کی مجلس ماتم کے بعد ان شہیدانِ غربت کی پانی میں ڈوبی ہوئی نعشوں پر فاتحہ پڑھتے ہوئے مغرب کی طرف کو رخصت ہوئے اور افق مشرق کی پیرانہ سال بڑھیا نے اپنے پریشان اور سفید بالوں کو ان پردیسیوں پر توجہ کرتے ہوئے فریاد رسی کے لیے آفتاب کے سامنے بکھیرا اور شمسی شعاعوں کے انتقامی نیزے ان مظلومان بے وطن کا قصاص لینے کے لیے سمندر کی موجوں کے سامنے آئے تو دیکھنے والوں نے دیکھا کہ یہ نوزاد بچہ جس کی عمر اب بمشکل ۱۲؍ گھنٹے کی تھی، ایک تختہ پر لیٹا ہوا ایک کنارہ کی طرف جارہا ہے۔ ہم تو حیران رہ گئے اور خدا کی قدرت پر عش عش کرنے لگے۔ ہم نے بہت چاہا کہ قدرت ایزدی کے اس فلسفہ کو سمجھیں لیکن ششدر تھے! اور اس معمہ کا کوئی حل ہماری سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

مگر گذشتہ واقعات پر بہت زیادہ غور کرنے کے بعد کچھ یاد آیا اور صرف اتنا یاد آیا کہ درد سے بے ہوش ہو کر مرحومہ ہاجرہ جس جگہ گری تھی اس کے قریب میں کسی مصلحت سے خمیدہ تختے جہاز کی دیوار میں لگے ہوئے تھے۔ یعنی جہاز کی خوبصورتی کے لیے اس جگہ دیودار کے کچھ

ایسے تختے لگائے گئے تھے جن میں ایک موزوں گولائی رکھی گئی تھی، ان کا نصف حصہ اوپر کی دیوار میں نصب کر دیا گیا تھا اور نیچے کا نصف حصہ جو محرابی شکل میں باہر کو نکلا ہوا تھا، جو نیچے کے درجوں کے لیے چھجّے کا کام دیتا تھا، ان کے بیچ میں ایک سوراخ بھی رکھ دیا گیا تھا جو بالائی درجہ کی سطح کے برابر ہونے کی وجہ سے نالی کا کام بھی دیتا تھا۔ چنانچہ جو کچھ پانی اس سطح پر گرتا تھا وہ انھیں نالیوں کے راستہ سے باہر نکلتا تھا' ہمیں یہ بھی یاد آیا کہ 'جہاز جب ٹکرایا تھا تو سب سے پہلے یہ تختے ٹوٹ کر اندر کی طرف گر گئے تھے اور وجہ اس کی یہ تھی کہ یہ تختے نازک بھی تھے اور ہاجرہ جہاں گری تھی، اس تختہ کی کیلیں بھی کچھ نکل گئی تھیں اور پھر مرحومہ ہاجرہ گرتے وقت اس سے ٹکرائی بھی تھی۔' خیال پڑتا ہے کہ 'بچہ صرف اپنی حرکت سے اس میں نہیں جا پڑا تھا بلکہ جہاز کی اتفاقی حرکت نے بھی (جو اس کے موافق تھی) اس کی امداد کی تھی، تختہ چونکہ بڑا تھا، بچہ کا وزن اس کو نیچے نہ بٹھا سکا بلکہ اس کے وزن کا پتہ بھی نہ چلا۔ ہاں اس سوراخ نے اس موقعہ پر ایک خاص اور عجیب فائدہ یہ دیا تھا کہ تلاطم کی بوچھاروں سے جو کچھ پانی تختہ کے اوپر آ جاتا تھا، وہ اس سوراخ کے باعث تختہ کے نیچے پہنچ جاتا تھا اور اس وجہ سے تختہ کے خمیدہ حصہ میں پانی بالکل نہ ٹھہر سکا اور صرف بچہ ہی اس میں نہایت آرام سے پڑا رہا۔'

قدرت ایزدی کی عجیب کارپردازی تھی کہ اس خمدار حصہ نے بچہ کو گہوارہ کا آرام پہنچایا، بچہ کو دودھ تو میسر نہیں ہوا مگر کوئی تکلیف بھی نہ ہوئی۔ چنانچہ زیادہ تر وہ سوتا رہا۔

بہرحال اسباب خواہ کچھ بھی ہوں، مگر یہ ضرور کہنا پڑے گا کہ خدا کی قدرت نے اس بچہ کی حفاظت کی اور صرف اسباب اور آلات ہی اس کی حفاظت کیلئے کافی تھے اور سیکڑوں نفوس کے لیے یہ سامان کیوں نہ مہیا ہو گئے؟ ہمیں کہنا پڑتا ہے اور مجبوراً کہنا پڑتا ہے کہ صرف خدا کی قدرت اور اس کا ارادہ اور اس کی مشیت تھی جس نے بچہ کی حیات باقی رکھنے کیلئے یہ تمام سامان مہیا کر کے اپنی قدرت کی کرشمہ سازی کا نمونہ دنیا کے سامنے پیش کر دیا۔

(ماہنامہ قاسم العلوم دیوبند: قسط اول شعبان ۱۳۵۳ھ ص: ۳۳ تا ۳۶۔ قسط دوم رمضان ۱۳۵۳ھ ص: ۱۷ تا ۲۰
مدیر: عتیق احمد صدیقی [سابق مدیر الانصار])